حزب اللہ
تحریر: فاطمہ لغاری

• صرف اِک اندیشہ۔۔۔

مطلق العنان موجوں کی زد میں آجانے کا۔۔

تاریک رات میں جگمگانے والے ننھے جگنو کے بجھ جانے کا۔۔

قافلوں کے بھٹک جانے کا۔۔۔

اِک اندیشہ جس نے روک رکھا تھا۔۔

تلواروں کو ٹکرانے سے۔۔

گھوڑوں کو دوڑنے سے۔۔

جہازوں کو سمندر میں اترنے سے۔۔۔

وہ اندیشہ کہ جو روندا گیا۔۔

شیر اسلام کے قدموں تلے۔۔

اور پھر تلواروں کا ٹکرانا،

گھوڑوں کا دوڑنا،

فتح کے پرچم لہرانا۔۔

صدیوں تک جاری رہا۔۔۔

بے شک وہ فتح پانے والوں میں سے تھے۔۔۔!

• امیر المسلمین یوسف بن تاشفین۔۔!

دور دور تک پھیلا سمندر اور ساحل پر سر پٹختی لہریں۔ بادلوں پر براجمان پر جلال شہنشاہ خاور، لہروں کا شور، موجوں کی بے سکونی، سمندر کا بہاو۔ اِک مکمل منظر، ادھورا مکمل۔ وہ منظر جو لاکھ کوشش کے باوجود چشمِ انسانی میں سمویا نہ جاسکے۔ مزید دیکھنے کی للک، مزید سننے کی چاہ۔ سمندر اور بے انتہا محبت۔۔!

ساحل کنارے کھڑا وہ سمندر کو جس محبت سے تک رہا تھا، اس پر اِک محبوب سا گمان ہوتا تھا۔ اگر وہ شاعر ہوتا تو یقیناً اب تک کئی غزلیں اس محبوبہ کے نام کر چکا ہوتا مگر وہ نہیں تھا۔ وہ جندل تھا، جندل یوسف زئی!

جسے اپنی اس "کمزور محبت" پر افسوس تھا جو اسے شاعر بھی نہ بنا سکی۔

سفید شلوار قمیض میں ملبوس، شانوں کے گرد خاکی رنگ کی شال پھیلائے اک خوبرو جوان۔ عقاب سی نگاہیں جو دور تک اپنی دھاک بٹھادیں، سنہری رنگت، کھڑے نقوش اور چہرے کے جمال میں اضافہ کرتی سیاہ داڑھی۔ وہ اس قابل تھا کہ لہریں اس کی قدم بوسی کا شرف حاصل کریں۔ اور وہ اتنا سخی تھا کہ بخوشی لہروں کو اس کی اجازت دے رکھی تھی۔ نمی کا احساس اسے سانس روکنے پر مجبور کر رہا تھا یا محبوبہ کا دیدار، سمجھنا مشکل تھا۔ وہ سمجھنا بھی نہیں

چاہتا تھا اور سمجھانا بھی۔ وہ۔۔۔ بس سانس روکے ساحل پر سر پٹختی مطلق العنان موجوں کو دیکھ رہا تھا۔

"نمبر ایک، ہدف تمہاری طرف آ رہا ہے۔" اس کے کانوں میں دھیمی سی آواز گونجی تھی، اس نے پلک جھپک کر ایک بھرپور نگاہ سمندر پر ڈالی۔ لہریں ذرا دیر کے لیے ٹھہریں اور پھر دوبارہ ساحل پر سر پٹخنے لگیں۔ وہ اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ساحل کے کنارے پر چل رہا تھا۔

"ہدف کو دیکھ لیا گیا ہے۔" ہلکی سی آواز میں سرگوشی کی گئی تھی، جو اس کے کانوں میں لگے ایئرپوڈز کے باعث بآسانی دوسری جانب سنی گئی تھی۔ وہ اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ تلاطم خیز موجوں کا شور اس کے کانوں میں گویا میٹھا رس گھول رہا تھا۔ چہرے پر بے انتہا سکون لیے وہ نم ریت پر قدم رکھتا اپنے قدموں کی چھاپ چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔

"محترمہ آگے مت جائیں۔ محترمہ رکیں آپ اپنے بچے کے پیچھے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ محترمہ براہ مہربانی رکیں!" وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ بیک وقت اپنی تمام حسوں کو استعمال کرتے ہوئے اس نے آواز کے تعاقب میں نگاہیں دوڑائی تھیں۔ وہ ایک عورت تھی جو ایک سات سالہ بچے کے پیچھے بھاگتے ہوئے مسلسل گہرے پانی کی جانب بڑھ رہی تھی، تیز لہریں اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر اپنے دائیں طرف ڈالی جہاں اس کا ہدف لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ وہ مزید کچھ سوچے بنا تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

اس کے قریب پہنچتے ہی لہروں نے کسی محبوبہ کی طرح شرارت کر دکھائی تھی۔ وہ تیزی سے بچے کو اس کی ماں سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ کئی لوگوں کی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ اس نے بھی بنا رکے لہروں کے پیچھے گہرے پانی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ پانی کے اندر جاتے ہی ایکدم سے شور تھم گیا تھا۔ دنیا کہیں پیچھے چلی گئی تھی۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ خوبصورت، خطرناک، دل موہ لینے والی اور پھر، یہ خوبصورتی ہی تو تھی جو وہ سمندروں پر دل و

جان سے مر مِٹا تھا۔ یہ خطرہ ہی تو تھا جس نے اسے خطروں کا کھلاڑی بنا دیا تھا۔ یہ حسن و جلال ہی تو تھا جو کب اس کی ذات کا بھی حصہ بنتا چلا گیا وہ بے خبر رہا تھا۔

مسلسل اپنے بازوؤں کو حرکت دیتے ہوئے وہ نیچے جا رہا تھا۔ زندگی اور موت کے دہانے پر کھڑا وہ بچہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچا تھا۔ منہ سے نکلتے پانی کے بلبلے اس کا سانس لینا دشوار کر رہے تھے۔ وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اوپر، وہ دنیا جو اس دنیا سے کئی زیادہ خطرناک تھی۔ درندگی کی ہر حد کو پار کرتی دنیا

اور ایک جھٹکے سے وہ اُس دنیا سے نکل کر اِس دنیا میں آ گیا تھا۔ لمبے لمبے سانس لیتا وہ اب تیرتا ہوا کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کئی لوگ اس کے انتظار میں تھے۔ ساحل پر پہنچ کر اس نے بچے کو نم ریت پر لٹایا اور ایک نظر ڈری سہمی کھڑی اس کی ماں پر ڈالی پھر شال درست کرتا آگے بڑھ گیا۔

”تم پاگل ہو بالکل پاگل۔ بے وقوف عورت اگر میرے بچے کو کچھ ہو جاتا تو جان لے لیتا تمہاری!“ ایک مرد کے چلانے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے اپنا دایاں کان کھجایا پھر بالوں میں ہاتھ چلا کر انہیں خشک کرنے کی ذرا سی کوشش کی۔ پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی سفید گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا:

”میں ہدف کو کھو چکا ہوں۔“

گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے کسی احساس کے تحت گردن مروڑ کر پیچھے دیکھا۔ پچھلی نشست پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ چہرہ کھڑکی کی جانب موڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے چہرے کے خدوخال چھپ گئے تھے لیکن باوجود اس کے وہ انہیں پہچان چکا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے وہ پورے دھیان سے سماعت سے ٹکراتی رعب دار آواز کو سن رہا تھا؛

”جانتے ہو جب اندلس پر الفانسو نے قبضہ کرنا چاہا تھا تو مسلمانوں نے افریقہ سے مرابطین کی مدد مانگی تھی۔ امیر المسلمین یوسف بن تاشفین، جن کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ ”وہ تاریک رات کا مسافر تھا جس کے پاؤں کے نشان ان گنت قافلوں کے لیے روشنی کا کام دیتے رہے تھے۔ ایک قوم کی بے بسی دیکھ کر قدرت کے دریائے رحمت سے لہر اٹھی اور اندلس کی خاک پر آزادی کے موتی بکھیرنے کے بعد روپوش ہو گئی۔“
(نسیم حجازی)

وہ قرونِ اولیٰ کے مجاہدین میں سے تھے۔ شیر اسلام تھے، ان کے جانے کے بعد چار سو سالوں تک کسی نے آنکھ اٹھا کر اندلس کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن چار سو سال بعد سب ختم ہو گیا۔ اندلس تباہ ہو گیا۔ کلیسا کی آگ جو بھڑکی تو اندلس کے ہر گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہاں کے مسلمان جنہیں زبردستی اصطباغ دے کر عیسائی قرار دیا گیا جنہیں مورسکوز کہا جاتا ہے، اپنی جان بچانے کے لیے ہجرت کر کے مراکش چلے گئے۔ سننے میں ہجرت کرنا بہت آسان ہے جندل۔۔! مگر یہ کڑا وقت تھا، اندلس کی زمینیں کئی صدیوں تک ان مسلمانوں کے قہقہوں سے زرخیز رہی تھیں۔ کلیسا کی آگ نے انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر تو دیا تھا لیکن حال یہ تھا کہ مراکش کے کئی گھروں کی دیواروں پر آج بھی اندلس کے تباہ شدہ گھروں کی چابیاں لٹک رہی ہیں۔ اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی وہ اپنے اندلس واپس ضرور جائیں گے۔“

بولنے والے نے گہری سانس لی تھی۔ جندل نے آنکھوں میں پگھلتی نمی کو باہر نکلنے سے روکنے کے لیے ہونٹ بھینچے تھے۔ آنکھیں ایکدم سرخ ہونے لگی تھیں۔ کان گرم گرم اور لال ہو رہے تھے۔

”مورسکوز کے لیے لفظ ”مورسکو“ گالی بن چکا تھا یا طعنہ، لیکن وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ ان کے آباؤ اجداد

نے غلامی کی جن زنجیروں کو زیور سمجھ کر پہنا تھا آج ان کی نسلوں کے لیے وہ گلے کا طوق بن چکی ہیں۔ کلیسا اندلس کو مسلمانوں کے وجود سے "پاک" کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھا۔ ظلم و بربریت کی حد یہ کہ صدیوں بعد آج سے صرف چند سال پہلے مراکش میں مورسکوز کے ایک گھر میں آگ لگا دی گئی۔ گھر کے مالک کی لاش مسخ کر دی گئی، اس کی بیوی کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کا ایک نومولود بچہ ان ظالموں کے قدموں تلے بری طرح سے کچلا گیا۔ اور ایک، ایک کو تمہیں ڈھونڈنا ہے۔" گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

"جیسے آپ کا حکم کمانڈر!" اس نے سر کو ہلکا سا خم دیا تھا۔

"سمندر سے تمہاری محبت کو دیکھتے ہوئے میں نے تمہارے لیے Oceangraphy پر مبنی کورس ڈھونڈا ہے "چولا لانگ کارن" یونیورسٹی میں تین ماہ کا۔ تم "چھٹیوں" پر تھائیلینڈ جا رہے ہو۔" لفظ چھٹیوں پر زور دیا گیا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ نظر ایک لمحے کے لیے ڈیش بورڈ پر رکھی سنہرے رنگ کی چابی پر ٹکی تھی، وہ چابی جو اسے اس کے فریضے سے بے خبر نہیں ہونے دے گی۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے سیاہ سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ شام کے سائے ہر سو پھیل رہے تھے۔ نیلگوں آسمان خاموشی سے بس اپنا سایہ مہیا کر رہا تھا۔

☆☆☆

"میں ہدف کو کھو چکا ہوں۔" اس کے کانوں میں کسی کی دھیمی آواز گونجی تھی۔ وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتا آگے بڑھا تھا۔ نیلے رنگ کی جینز پر بنفشی رنگ کی شرٹ اور اوپر سیاہ جیکٹ پہنے بھوری رنگت والا وہ اونچا مرد خیام تھا، خیام حنفی۔۔۔!

اس کے ہلکے بھورے رنگ کے بال اور چہرے کے نقوش اس کے پاکستانی نہ ہونے کا ثبوت تھے۔ اسے پہلی نظر

میں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا وہ غیر ملکی تھا، لیکن کہاں کا؟ یہ اندازہ مشکل تھا۔ کہیں وہ عربوں کی جھلک دیتا تھا، کہیں وہ مغربی حسن کا مجسمہ تھا۔ لب و لہجے سے وہ پاکستانی بھی لگتا تھا اور جتنی فر فر وہ فارسی بولتا تھا وہ افغانی یا ایرانی بھی تو ہو سکتا تھا۔ بیک وقت بہت سے ممالک کے باشندوں کی مشابہت دینا اسے تھوڑا مشکوک بناتا تھا۔ اور جب وہ بولتا تھا تو وہ مکمل مشکوک ہو جاتا تھا، کیا وہ کسی مشہور گلوکار کا بیٹا تھا؟ ایک ہی وقت میں وہ پاکستانیوں کی طرح کھڑے کھڑے سنا بھی سکتا ہے، تو اگلے ہی لمحے اس کی آواز اتنی دھیمی اور مدھم ہو جاتی ہے کہ سننے والا بس سنتا رہے۔ اس کے بارے میں مبالغہ آرائی نہیں کی جاتی تھی، اس کی مختلف عادات اسے متاثر کن بناتی تھیں۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے تھا؟ اگر کیوں تھا کا سوال بھی پوچھا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ سب معمول کے مطابق تھا لیکن اپنی گاڑی میں بیٹھتے اُس شخص کی گردن میں آتا جھٹکا اور گردن کی ٹوٹتی ہڈی غیر معمولی کاروائی تھی۔ جتنی تیزی سے اس نے یہ کاروائی کی تھی اتنی تیزی سے اس آدمی کے کوٹ کی جیب سے چِپ نکالی تھی۔

"ہدف سے ہدیہ لیا جا چکا ہے۔" اس نے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سڑک کنارے چلتے ہوئے کہا تھا۔ وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ کوئی پیچھے سے اس کے بائیں شانے سے ٹکرایا تھا، صرف چند لمحوں میں چِپ کا تبادلہ ہوا تھا اور اس سے ٹکرانے والا شخص آگے بڑھ گیا۔ اس نے دیکھا تھا وہ ایک لمبا مرد تھا، مکمل سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس۔ سیاہ پینٹ پر سیاہ ہی شرٹ اور جیکٹ پہنے، سر پر سیاہ ہی پی کیپ ٹکائے اور کانوں کے پیچھے وہ پتلی سی ڈوریاں یقیناً سیاہ ماسک کی تھیں۔ صرف ایک نظر میں اس شخص کا مکمل جائزہ لینے کے بعد وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ وہ دوسری گلی کا موڑ بھی مڑتا اگر اچانک کوئی اس کا بازو نہ پکڑتا تو۔

"تم چھٹیوں پر جا رہے ہو۔" بھاری اور رعب دار آواز اسے اس وقت بہت بھلی معلوم ہوئی تھی۔ وہ مسکرایا۔ نگاہ

سامنے اٹھی۔ آواز کا مرکز وہ شخص دوسری گلی کے کنارے کھڑا تھا جس کی وجہ سے وہ اسے دیکھنے سے قاصر تھا مگر شاید اسے دیکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

"سالوں پہلے لائٹ ہاوس کو آگ لگانے والے مجرموں کو ڈھونڈو خیام حنفی! زندہ جل جانے والی اس عورت کے مجرم، اس کے بچوں سے باپ کا سایہ چھیننے والے قاتل، ایک بھائی سے اس کی بہن اور ایک بہن سے اس کا بھائی چھیننے والے ظالموں کے حساب کا وقت آگیا ہے۔ ان بچوں کو ڈھونڈو، ان کے مجرموں کو ڈھونڈو۔" اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں کچھ جاتا محسوس ہوا تھا، کوئی ہلکے وزن والی چیز جو اس کی جیب میں پناہ لے رہی تھی۔

"میری منزل؟" اس نے سوال داغا تھا۔

"تھائلینڈ!" اس کے ساتھ ہی اسے کچھ قدموں کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے اور پھر خاموشی۔ آنے والا جا چکا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنی جیب سے وہ چیز نکالی۔ وہ ایک کِلپ تھا، چھوٹا سا ہلکے گلابی رنگ کا کِلپ، دو معصوم بچوں کی داستان سناتا وہ کِلپ مستقبل میں اسے اس کے فریضے کی یاددہانی کا ذریعہ بننے والا تھا۔

☆☆☆

ہدیہ حاصل کرنے کے بعد اس کی منزل سڑک کنارے ریستوران تھا۔ سیاہ ماسک سے چہرہ ڈھکے، سیاہ پی کیپ سے پیشانی اور آنکھیں چھپائے متناسب رفتار سے چلتا وہ سڑک پار کر رہا تھا۔ کراچی کی اس مصروف شاہراہ پر شام کے اس پہر لوگوں کا رش لگا تھا۔ سڑک پر تیزی سے گزرتی گاڑیاں، ٹریفک کا شور۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن اس معمول کے مطابق میں ریستوران کی ایک میز کے گرد رکھی کرسی کو کھینچتا وہ بندہ غیر معمولی تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی ایک ویٹر نے آگے بڑھ کر اسے مینیو کارڈ پیش کیا تھا گویا وہ اسی کے انتظار میں تھا۔ غیر محسوس طریقے سے اس نے مینیو کارڈ کھول کر چِپ اندر رکھی تھی اور وہاں رکھے سفید رنگ کے کاغذ کے ٹکڑے کو اٹھا کر

کارڈ بند کر کے ویٹر کو پکڑا دیا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ ریستوران سے نکل کر سڑک کو کراس کر کے مختلف تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا۔ دائیں بائیں اور پھر بائیں گلی میں مڑ کر اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوئی تھی۔ اپنے آگے چلتے اس شخص کے سر پر پہنچ کر اس نے تیزی سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر گردن کو جھٹکا دیا تھا۔ چیخ کی آواز سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ ایک اور تنگ گلی سے گزرنے کے بعد اسے کوئی اپنے ہمقدم ہوتا محسوس ہوا تھا۔ وہ ہنوز چلتا رہا، اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم بے روزگاری سے تنگ آ گئے ہو۔" بھاری اور رعب دار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اگر اس کی پی کیپ نے اس کی آنکھیں نہ چھپائی ہوتیں اور اس کے ماسک نے اس کا چہرہ نہ ڈھکا ہوتا تو یقیناً وہ مسکراتا نظر آتا جیسے جندل، اور جیسے خیام۔

"تم اس مجرم کو ڈھونڈنے جا رہے ہو جس نے بحیرہ روم میں آگ لگا دی تھی، جس نے دو بچوں کو یتیم اور کئی جانوں کو قتل کر دیا تھا۔ جس نے ایک معصوم بچے کو بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا تھا اور جس نے ایک بچی سے اس کا بچپن چھین لیا تھا۔ تم اس سفاک اور ظالم انسان کو ڈھونڈو گے اور سزا دو گے۔" اس کے بڑھتے قدم تھمے۔ اس کے ساتھ چلتا وہ شخص بھی رک گیا تھا یقیناً۔

"تم تھائلینڈ جا رہے ہو۔" کئی پل خاموشی چھائی رہی۔ ہوا کی سرسراہٹ، تنگ اور خاموش گلی، پھیلتا اندھیرا اور بڑھتی ٹھنڈ، سب کچھ ہڈیوں کو جما دینے والا اور پراسرار سا لگ رہا تھا۔ کچھ پل یونہی خاموشی چھائی رہی۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی لوٹ رہا تھا، اور پھر خاموشی۔

اس نے ہنوز سر جھکائے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ وہاں سے ایک کاغذ برآمد ہوا تھا جو یقیناً اس نے نہیں رکھا تھا۔ وہ دھیرے سے کاغذ کو نگاہوں کے سامنے لایا۔

”میں اپنی تھمتی سانسوں کے تھمنے تک آپ کا منتظر رہوں گا امیر المسلمین! آگ کی لپیٹ میں آتا بحیرہ روم ایک بار پھر آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں اور بحیرہ روم، ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں امیر المسلمین! آپ کیوں چلے گئے؟ لوٹ آئیں ناں۔“

ایک معصوم بچے کی بے بسی ظاہر کرتے وہ الفاظ روح تک کو لرزا دینے والے تھے۔ کون جانتا تھا کہ اس بچے نے کتنی مشکلات کا سامنا کیا ہو گا؟

اس نے گہری سانس لے کر کاغذ کو اپنی جیب میں رکھا جو مستقبل میں اسے اس کے فریضے سے باخبر رکھنے والا تھا۔ سوچوں میں گم وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا۔ آسمان پر قابض ہوتے اندھیرے کو للکارتا ایک عقاب اس کے سر کے اوپر سے گزرا تھا۔ اس کی اگلی منزل یقیناً تھائیلینڈ کی سرزمین تھی۔

☆☆☆

• تین جنوری تھائیلینڈ

بینکاک کے ملگجے آسمان پر شہنشاہ خاور آج اپنے غیر حاضر رہنے کا فرمان سنا کر جا چکے تھے۔ صبح کے اس پہر ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا بیک وقت سرشار ہونے اور ٹھٹھرنے پر مجبور کر رہی تھی، منحصر انسانوں کی قوتِ برداشت پر تھا۔ بادلوں کے ذرا ذرا سے ٹکڑے ٹوٹے ہوئے تاروں کی مانند بکھرے ہوئے تھے۔ نیلا آسمان سمندروں کے عاشقوں کے لیے دنیا کے نقشے پر بحیرہ روم، بحر اوقیانوس، بحر الکاہل سا منظر پیش کر رہا تھا اور کہیں کہیں بکھرے بادلوں کے ٹکڑے سمندروں کے آگے بے بس جزیروں کی مانند تھے۔ ہلکی ہوا پر سکون لہریں تھیں۔ اور آسمان تلے زمین پر لوگوں کی چہل پہل، وہ سیاح لگ رہے تھے۔ سمندروں کے عاشق سیاح جو انہیں چھوڑنے پر رضا مند نہ ہوں۔ تھائیلینڈ کی سرزمین پر اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ان لوگوں میں نجانے کتنے لوگ سمندروں پر حکمرانی

کے خواب سجائے بیٹھے ہونگے۔ کتنے لوگوں نے پہاڑوں کو اپنی رہائش گاہ بنایا ہو گا۔ کتنے لوگوں نے زمین پر حکمرانی کو ترجیح دی ہوگی۔ غرض، روئے زمین پر ہر شخص بامقصد گھوم رہا تھا۔ خوابوں کے جگنوؤں کو نرمی سے مٹھی میں بند کیے اپنی منزل کی جانب رواں دواں۔ جادونگری ہو جیسے، کہیں رک کر مٹھی کھولیں گے تو خواب حقیقت بن کر سامنے کھڑے ہونگے۔ لیکن کچھ لوگ، کچھ لوگ بنا خوابوں کے جیتے ہیں، وہ حقیقت میں زندہ ہوتے ہیں۔ وہ آج کے لیے آج جیتے ہیں، وہ کل کے لیے آج خود کو نہیں روکتے۔ سڑک پر تیزی سے سائیکل کے پیڈل گھماتا وہ لڑکا بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ اپنا آج جینے والا، خوشنما، خوش طبع۔

سفید جاگرز میں مقید پاؤں اپنی رفتار سے اس مشقت کے عادی لگ رہے تھے۔ نیلے رنگ کی پینٹ پر سفید اپر پہنے، گہرے بھورے رنگ کے بال سیٹ کیے وہ پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سائیکل کے آگے ٹوکری لگی تھی جس میں اخباروں کا پلندا رکھا تھا اور پلندے کے ساتھ چھیڑ خانی کرتا وہ دودھ جیسے سفید رنگ کا خرگوش، جسے دیکھ کر بے ساختہ کیوٹ کہنے کا دل کرے۔ لیکن وہ لڑکا مختلف تھا۔ اس نے ایک اکتاہٹ بھری نظر اپنے خرگوش پر ڈال کر سائیکل کی رفتار کم کی تھی۔ وہ اب ایک عالیشان حویلی کے سامنے اپنی سائیکل روک رہا تھا۔ سائیکل کنارے پر کھڑی کر کے اس نے خرگوش کو گھورتے ہوئے جھپٹ کر اخبار اٹھائی اور گھنٹی پر انگلی رکھی۔ فوراً سے پہلے گارڈز نے دروازہ کھولا اور ایک لڑکی باہر نکلی۔

"آآ مم۔۔۔ میں اخبار دینے آیا تھا، جینی کہاں ہے؟" اس نے تھائی زبان میں پوچھا تھا۔

"جینی چھٹیوں پر گیا ہے، یہ مجھے دے دو۔" سفید رنگ کی جینز پر ہلکے گلابی رنگ کی شرٹ اور ہم رنگ ہی لانگ کوٹ پہنے گلے میں اسٹال ڈالے درمیانے قد کی وہ لڑکی یقیناً غیر ملکی تھی۔ کم از کم وہ اپنے چہرے سے تھائیلنڈ کی نہیں لگتی تھی جیسے وہ بھی نہیں لگتا تھا۔

"ارے یہ خرگوش کتنا پیارا ہے، معصوم سا۔" وہ لڑکی اس کے خرگوش پر نظر پڑتے ہی تیزی سے سائیکل کی طرف بڑھی تھی۔ "اس کا نام کیا ہے؟" وہ پیار سے اسے گود میں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرا نام بدر ہے اور یہ میرا خرگوش ہے۔ بدر کے "ر" سے اس کا نام روفی ہے۔" اس لڑکی نے بدر کے جواب پر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تھا۔ شاید اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ اس نے ایک اچھے، خوبصورت، خوبرو جوان لڑکے کی موجودگی میں پہلے اس کا نام پوچھنے کے بجائے اس کے خرگوش کا نام پوچھا تھا۔ یہ حقیقتاً ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔

"بدر، تم یہاں کے نہیں ہو؟" وہی سوال جو اس کا نام جاننے کے بعد ہر شخص پوچھتا تھا۔

"اگر دس سال کی عمر سے ایک شخص اس ملک میں رہ رہا ہے، اس کے پاس یہاں کی نیشنلٹی بھی ہے لیکن پھر بھی کوئی اسے یہاں کا ماننے پر تیار نہیں تو ہاں! میں یہاں کا نہیں ہوں۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر معصومیت سے مسکرایا تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی آنکھوں کے کنارے مسکرانے کی وجہ سے ہلکی سی سلوٹیں سی پڑی تھیں۔

"آئی ایم سوری بدر! میں بس متجسس ہو گئی۔ تمہارا خرگوش بہت پیارا ہے۔" وہ اس لڑکی کی معصومیت کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اس کا خرگوش پلکیں جھپکاتا اس لڑکی کو خود پر پیار نچھاور کرتا دیکھ رہا تھا۔ گھنا میسنا کہیں کا۔

"آپ یہاں نئی ہیں؟ مطلب یہاں کے تقریباً اسٹاف کو میں جانتا ہوں، آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔" جانے کیوں اس لڑکی کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی، اور اس نے خرگوش کو بھی واپس باسکٹ میں بٹھا دیا تھا۔ جانے کیوں؟

"میں ازابیلا وارلڈ ہوں، ابراہم وارلڈ کی اکلوتی بیٹی۔۔!" اس بار جانے کیوں مسکراہٹ بدر کے لبوں سے غائب ہوئی تھی۔ وہ بری طرح سے گڑبڑایا تھا۔

”سوسوری میم مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ اخبار لینے آئیں گی۔ سوری سوری میں بس جارہاہوں۔ پلیز میری شکایت مت لگائیے گا میری نوکری چلی جائے گی اور آئی فون بھی۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز قدرے کم تھی۔

”میں کام سے جارہی تھی، تم کھڑے تھے تبھی اخبار لے لی۔ مگر اب روز میں ہی اخبار لینے آؤں گی تمہارے خرگوش سے۔“ ازابیلا نے مسکراتے ہوئے روفی کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”جی جی ضرور۔“ وہ بس یہی کہہ سکا تھا۔ ازابیلا نے ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ بدر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ تھامے پورے وقار سے چلتی وہ لڑکی جسے اصولاً ابراہم وارلڈ کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے خاصا بگڑا ہوا ہونا چاہیے تھا وہ ویسی نہیں تھی۔ وہ مختلف سی تھی۔ اور آج اسے پتہ چلا تھا کہ تھائلینڈ میں کوئی تھا جو اس کی طرح کا مختلف تھا۔

☆☆☆

تھائی کھانوں کی خوشبو سے مہکتا ڈائننگ روم، شاندار عالیشان! مکمل سفید رنگ کا لبادہ اوڑھے یہ بڑا سا ہال جسے ڈائننگ روم کہا جاتا تھا جدید طرز پر بنا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ابراہم وارلڈ کی یہ حویلی یا ولا، کچھ بھی کہہ لیں۔ چھت پر لٹکتا فانوس اور دیوارو ں پر آویزاں پینٹنگز جنہیں دیکھ کر لب بے اختیار جدا ہو کر گول ہوں اور کہیں واؤ! بلاشبہ وہ کسی معروف مصور کے شاہکار کی بہترین جھلکیاں تھیں۔

کسی ایسے شخص کی مانند جو کافی وقت سے بھوکا ہو اور اچانک بھٹک کر یہاں آجائے اور بے اختیار تھائی کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے مجبور ہو کر میز کی طرف بڑھے اور گہری سانس لے کر اس اشتہا انگیز خوشبو کو اپنے اندر اتار کر لمبا سا ہاااااکرے۔ جی بالکل اسی کی مانند اگر میز کا جائزہ لیا جائے تو وہاں وہ سب کچھ تھا جو کئی دنوں سے بھوکا شخص

اپنے خوابوں میں دیکھ سکتا تھا۔

اب ذرا اس بھوکے شخص سے دھیان ہٹایا جائے تو محسوس کریں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ یہ کوئی ملازم نہیں ہے۔ قدم بھاری ہیں، آواز بوٹوں کی ہے۔ چمکتے چمچماتے۔ چاہیں تو اس بھوکے شخص سے کہیں اپنی شکل ان میں دیکھ لے۔ آواز قریب آرہی ہے، کوئی اندر آیا ہے۔ کوئی جو سرمئی رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس مکمل ٹھاٹ باٹ سے اب میز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی چوڑی پیشانی اور چمکتی آنکھیں، آنکھیں جن میں انوکھی چمک ہے۔ اور چہرہ، شیوزدہ چہرہ، جو لمحوں میں اپنی دھاک بٹھا دے۔

وہ، بارعب اور پر جلال، ابرہم وارلڈ۔۔!

ہلکا سا گلا کھنکھارتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھا تھا جو ملازم پہلے ہی کھینچ چکا تھا۔

کانٹے سے چیز آملیٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھ کر اس نے ایک طائرانہ نگاہ میز پر ڈالی پھر سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ملازم کو دیکھا۔

"ازابیلا کہاں ہے؟" آواز میں ٹھہراو تھا، سنجیدگی اور رعب۔

"میم نے کہا تھا جب آپ اٹھ جائیں تو انہیں اطلاع دے دی جائے وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں۔" ملازم نے سر جھکائے جواب دیا تھا۔ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ ملازم کے ہاتھ میں موجود فون تھرتھرایا تو اس نے فوراً سے کال اٹھا کر موبائل اس کے سامنے رکھ دیا۔

"بابا۔" آواز مانوس سی تھی۔ مدھم، محبت بھری۔

"کہاں ہو بیٹے؟" چائے کا کپ لبوں سے ہٹائے پوچھا گیا تھا۔

"بابا!!" وہ شاید ہنسی تھی۔ سر جھٹک کر، ذرا سا کھکھلا کر۔ ابراہم کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ "میں ایک

آخری بار پکا والا آخری بار ایک صحافی کے طور پر جائے قتل کا جائزہ لینے جا رہی ہوں۔ بلیومی بابا اس کے بعد میں سید ھا میرین سائنس کے کورس کے لیے فارم جمع کروانے جاؤں گی پکا پکا۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"اور کچھ؟" آنکھوں میں شرارتی چمک ابھری تھی۔

"اور، شاید میں آپ کے "تعلقات" کا فائدہ اٹھاؤں گی۔ شاید"!

"غلط فائدہ!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

"جی جی وہی بابا۔ اچھا میں پہنچ گئی ہوں یہاں۔ آپ سے رات میں ملتی ہوں۔ اللہ۔۔۔" وہ جلدی جلدی میں کچھ کہتے کہتے رکی تھی۔

"حافظ۔" جملہ ابراہم کی طرف سے پورا کیا گیا تھا۔

"سوری بابا۔ ماں کی وجہ سے عادت سی ہو گئی ہے۔" وہ شرمندہ ہوئی تھی۔

"تمہاری ماں کے خدا کو میں بھی مانتا ہوں بیٹے۔" بات غلط رخ پر جا رہی تھی۔ دونوں جانب عجیب بے چینی تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹی مذہب پر بحث کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ وہ اب بھی یہی کر رہے تھے۔ تبھی ازابیلا نے جلدی سے بائے کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ ابراہم نے فون ملازم کو پکڑایا اور خود آگے بڑھ گیا۔ اس کے باہر آتے ہی گارڈ نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ اسی چال سے چلتا گاڑی میں بیٹھا۔ دروازہ بند ہوا۔ اور سیاہ گاڑیاں ایک قطار کی صورت میں اس سفید گاڑی کے پیچھے چلنے لگیں۔ ان سب کی منزل وارلڈ گلاس کمپنی تھی۔

☆☆☆

"سمندر کے بارے میں کیا جانتے ہیں آپ؟" پراجیکٹر کے سامنے کھڑے پروفیسر کے سوال پر ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہوئے تھے۔ یہ تھائلینڈ کی چولالانگ کارن یونیورسٹی (Chulalongkorn University) کے ریسرچ ڈپارٹمنٹ کے فرسٹ سیشن کی کلاس تھی۔ جدید طرز کی لکڑی کی بنی میزوں کے گرد آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے طلباء مختلف شناختیں لیے اس وقت ایک ہی چھت تلے جمع تھے اور سرِ دست پروفیسر کے سوال پر اپنے اپنے نظریات پیش کر رہے تھے۔

"It is too.... Dangerous..!"

"It is just Wonderful , beautiful ...full of peace...!"
"Oceans are full of secrets.They are full of Mysteries, Stories.They are just Wow!"

غرض مختلف طلباء کی مختلف سوچ ان کے الفاظ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ پروفیسر مسکراتے ہوئے سب کو سن رہے تھے۔ آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ اور پھر سب کے خاموش ہونے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے میں جڑے لب آزاد کیے تھے۔

"سمندر زندگی ہے۔

"The ocean stirs the heart, inspires the imagination and bring eternal joy to the soul..."

سمندر خطرہ ہے۔ آپ سمندر میں جائیں۔ اگر اچانک بادل گرج اٹھے اور بجلی کڑکی اور یہ کڑکتی بجلی سمندر پر گری تو؟ اگر کوئی شارک اپنا جال بچھائے آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ملے آپ کو تو؟ اگر آپ کا سامنا Blue Hole سے ہو جائے تو؟" انہوں نے ڈرامائی وقفہ دیا۔ طلباء کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ "سمندر جادو نگری ہے۔"

طلباء تعجب سے مسکرائے تھے۔"ہاں سمندر جادونگری ہے۔ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ سمندر ہر چیز کو اپنی جانب کیوں کھینچتا ہے؟ سمندر میں جانے والی کوئی چیز واپس کیوں نہیں لوٹتی؟ انسان زندہ سمندر کی گہرائی میں جاتا ہے، اور اپنی باقی تمام سانسیں سمندر میں لے کر، اپنی باقی زندگی وہاں جی کر مردہ لوٹ آتا ہے۔ سمندر میں کچھ تو ہے کہ جو اس کی گہرائی میں گُم ہو جائے تو گُم ہی ہو جاتا ہے۔ کچھ تو۔۔۔"!

وہ خاموش ہوئے۔ ایک طائرانہ نگاہ پوری جماعت پر ڈالی۔ سب سمندر نامی جادونگری کے سحر میں گم تھے۔ کوئی مسکرا رہا تھا، کوئی دلچسپی سے پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی کھوئے کھوئے سے انداز میں پراجیکٹر پر نظر آتی بحرالکاہل کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

"اچھا بتائیں دنیا کا اصل حکمران کون ہوتا ہے؟ مذہبی بحث سے گریز کریں۔۔!" پروفیسر کے سوال پر طلباء نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا تھا اور پھر جماعت میں چند آوازیں ابھری تھیں۔

"وہ جس کے پاس طاقت ہو۔"

"وہ جو ہتھیار کے زور پر زمینیں فتح کرے۔"

"جو ورلڈ بینک کا مالک ہو۔"

"جو سمندروں کا فاتح ہو۔ سمندر جس کی محبت ہوں، اور لہریں جسے سلام کریں۔ اور جس کے لیے سمندری طوفان موجوں کے سفیر بنیں۔ اور جس کے لیے پانچ سمندر ایک ہو جائیں اور لہریں جسے راستہ دیں۔ سمندروں کا اصل حکمران سمندروں کا عاشق ہوتا ہے، جس کے دل کی دنیا کو سمندر فتح کر چکے ہوں۔" جواب غیر متوقع تھا۔ طلباء اب مڑ مڑ کر بولنے والے کو دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر نے مسکرا کر دائیں جانب قطار میں بیٹھے لڑکے کو دیکھا تھا۔

"یور نیم مین؟" مسکراتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

"جندل یوسف زئی!" بھوری آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری تھی۔ پروفیسر اب اسے سراہ رہے تھے اور وہ خاموشی سے پروفیسر کے پیچھے پراجیکٹر پر نظر آتی بحرالکاہل کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔
ایک محبوب، برسوں سے دیدارِ محبت کو ترسا محبوب، اپنی اکلوتی محبت کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"جندل میں بتا رہی ہوں اگر مجھے خبر ملی کہ تم سمندر کے آس پاس بھی بھٹکے ہو تو اگلی فلائیٹ سے تھائیلینڈ آوں گی اور کانوں سے پکڑ کر پاکستان لے آوں گی تمہیں۔" کمرے میں ٹہلتے ہوئے موبائل کان سے لگائے غصے سے تیز تیز بولتی وہ سعاد تھی، سعاد یوسف زئی۔ ہلکے سرمئی رنگ کے عام سے لباس میں وہ خاص سی لڑکی جندل کی اکلوتی بہن تھی۔ کتھئی آنکھیں اور چہرے کے نقوش، جندل سے بالکل مختلف تھے۔ وہ دونوں بالکل بھی بھائی بہن نہیں لگتے تھے۔

"آپی میں بتا رہا ہوں مجھے اگر خبر بھی ملی کہ آپ نے پھر سے اپنے چھوٹے معصوم شریف بھائی پر شک کیا ہے تو سمندر میں کود جاوں گا۔" جندل کی دھمکی پر وہ رکی۔ ماتھے پر تیوری چڑھائے سامنے دیکھا۔

"تم جا کر تو دکھاؤ سمندر کے پاس ٹانگیں توڑوں گی تمہاری۔" دوسری جانب وہ سعاد کی بات پر بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"اچھا اچھا توڑ لیجیے گا لیکن یقین کریں میں سمندر سے علیحدگی اختیار کر چکا ہوں۔ آپ کے کہنے پر ہی تو طلاق دی تھی اسے۔" شرارت بھری آواز پر سعاد نے دانت پیسے تھے۔

"جندل! سدھر جاؤ تم۔"

"اچھا اچھا سوری۔ نہیں جا رہا سمندر کی طرف۔ آپ بتائیں کیا کر رہی ہیں؟" سعاد گہری سانس لے کر بیڈ پر بیٹھی

تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔ آج کل اسکیچنگ کررہی ہوں" اس نے چند پل کا وقفہ لیا پھر گویا ہوئی۔ "جندل، میں اپنے ایک بھائی کو تقریباً کھو چکی ہوں۔ مزید حوصلہ نہیں ہے ہاں۔" اس کی آواز بھاری ہوئی تھی۔ نمی کا ہلکا سا تاثر اس نرم سی آواز میں گھل کر جب جندل کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے کچل کر رہ گیا تھا۔

"میں اپنا خیال رکھوں گا آپی، آئی پرامس۔ ویسے بھی میں یہاں ایم فل کرنے آیا ہوں، سمندر سے میرا کیا واسطہ ؟!" وہ مسکرادی تھی۔ کچھ دیر مزید اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے فون بند کر کے بیڈ پر رکھا پھر خود اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پاس آئی۔ دوسری منزل پر بنے اس کمرے کی کھڑکی سے نیچے کا سارا منظر نظر آتا تھا۔ سڑک، سڑک سے گزرتی گاڑیاں۔ زندگی کی ریل پیل، وقت کی رفتار، ہر چیز۔

"ان خفا خفا سی نگاہوں سے غرناطہ کو مت دیکھو سعاد! غرناطہ کے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔"

مدھم لیکن بھاری مردانہ آواز سماعت سے ٹکرانے پر اس نے تیزی سے نگاہوں کا رخ بدلا تھا۔ جانے کیوں اسے کراچی کی یہ مصروف شاہراہ غرناطہ کی سڑک لگ رہی تھی۔ اور یہ کمرہ، الحمراء جس کی اونچائی پر کھڑے ہو کر وہ غرناطہ سے گفت وشنید میں مصروف تھی۔ اور تبھی وہ آیا تھا اور پھر۔۔۔

وہ تیزی سے کھڑکی بند کرتی پلٹ گئی تھی۔ جانے کیوں وہ بے وقت یاد آجاتا تھا۔ یا شاید ہر وقت۔

☆☆☆

"محترمہ آپ اندر نہیں جاسکتیں۔"

وہ ایملی کے ساتھ اس چھوٹے سے ڈپارٹمنٹ کے سامنے کھڑی تھی جس کی کھڑکی سے "میکس ویل باربارا" نامی آدمی نے رسی سے لٹک کر خودکشی کی تھی۔ بیشتر لوگ اسے قتل قرار دے رہے تھے کیونکہ چند ماہ قبل یہ شخص

مسلمانوں کے نبی کی گستاخی میں ملوث ثابت ہوا تھا۔ مسلمان "شدت پسند" ہیں، لہذا اس قتل کے تمام اشارے انہی کی طرف جا رہے تھے۔

وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی تھی جب دروازے پر کھڑے پولیس والے نے اسے روکا تھا۔

"مجھے کون روکے گا؟" اس نے اس لڑکے کو گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ یہ محترمہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" سامنے سے پولیس انسپکٹر آتا دکھائی دیا تھا۔

"سر یہ میم زبردستی۔۔" اس لڑکے کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ازابیلا نے ایک کارڈ انسپکٹر کی طرف بڑھایا تھا۔

کارڈ کو بغور دیکھ کر اس نے نگاہ اٹھا کر ازابیلا کو دیکھا۔

"انہیں جانے دو۔" وہ مسکرائی۔ "لیکن صرف آپ جا سکتی ہیں۔" ازابیلا نے گردن ترچھی کر کے ایمِلی کو دیکھا پھر اسے یہیں رکنے کا اشارہ کر کے خود اندر کی طرف بڑھ گئی۔

ایک کمرے، ٹی وی لاؤنج سے منسلک اوپن کچن اور ایک اٹیچ باتھ روم پر مشتمل یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ سادگی کی مثال تھا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ میز پر رکھا اور خود تیزی سے کمرے کی طرف بڑھی۔ جہازی سائز بیڈ کے دائیں طرف وہ کھڑکی تھی جہاں لاش لٹکی ہوئی ملی تھی۔ پورے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ باتھ روم میں آئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا کوئی بھی چیز چونکا دینے والی نہ تھی۔ وہ اپنا پورا اطمینان کر کے باتھ روم سے نکل رہی تھی جب بیسن کے نیچے اسے کچھ نظر آیا تھا۔ لال گاڑھا خون اور قلم کی نوک۔۔!

اس نے جھک کر قلم کی نوک کو اٹھایا۔ وہ کسی کالے بال پین کی نوک تھی۔ اس نے ایک نگاہ خون کے چھوٹے سے قطرے پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکلی۔ کچھ دیر بعد وہ پورا اپارٹمنٹ دیکھ چکی تھی لیکن کہیں بھی اسے قلم نہیں ملا تھا۔

اس نے ایک نگاہ اپارٹمنٹ کے دروازے پر ڈالی جس کے پار پولیس افسر اس کی جلد واپسی کا منتظر تھا، پھر قلم کی نوک اپنے کوٹ کی پاکٹ میں دھیان سے رکھی۔ میز سے ہینڈ بیگ اٹھایا، پورے اپارٹمنٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔

ایملی کے ساتھ باہر جاتے ہوئے اس کی سماعت سے ابراہم وارلڈ کے کہے گئے الفاظ ٹکرا رہے تھے:

"تفتیش کے وقت ایک کیل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کیل کسی گھوڑے کا ہو سکتا ہے اور گھوڑا کسی افسر کا۔ افسر کسی فوج کا، اور فوج کسی ملک کی۔ ایک کیل کے پیچھے ایک دشمن ملک ہو سکتا ہے، اور اس ملک کے ساتھ پوری دنیا ہو سکتی ہے ازابیلا۔۔"!

☆☆☆

اے نیلے آسمان تلے میلوں پر پھیلے بحرالکاہل!

تمہاری موجوں میں سکوں ہے تو کیوں ہے؟

کیا تم بھی اس بے ضمیر قوم سے ہو گئے ہو جسے نہیں فرق پڑتا غلامی سے

اسیری سے، جھکنے سے

عزت نفس کے مجروح ہونے سے

یا تم بھی خود کو آزاد سمجھتے ہو؟

اپنے دشمن کے پہرے میں آزاد؟!

یا تم آج بھی سوئے ہوئے ہو؟

کیا نہیں جگا پایا کوئی تمہیں آج بھی؟

کسی کے روح پرور الفاظ آج بھی تمہیں جھنجھوڑ نہیں سکے؟

تم اتنے پر سکوں کیوں ہو؟!

سنو اے بحر الکاہل!

قومیں مٹ جاتی ہیں مگر ان کی حرارت باقی رہتی ہے

وہ قومیں جو مزاحمت کریں۔

مصلحت پسند قومیں تاریخ کے ورق پر دھبہ ہیں

جسے مٹانا عقلمندی اور سینے سے لگائے رکھنا بدترین بے وقوفی ہے۔

سنو بحر الکاہل!

تاریخ کے صرف وہی ورق قابلِ تعظیم ہیں، جو خون سے رنگے گئے ہوں۔

خون، مجاہدوں کا۔ دلیروں کا، شیروں کا

جو حسین خواب دیکھنے کے لیے سوئے رہتے ہیں

وہ دشمن کے ہاتھ اپنی شاہ رگ پر پاتے ہیں

تمہیں جاگنا ہو گا بحر الکاہل!

تمہیں مزاحمت کرنی ہو گی اے بے کراں بحر۔!

بحر الکاہل کی مطلق العنان موجوں نے زور و شور سے آگے بڑھ بڑھ کر ان الفاظ کی سمت کا تعین کرنا چاہا تھا۔ الفاظ، جھنجھوڑ دینے والے۔ دور دور تک پھیلا بحر الکاہل، بے کراں بحر الکاہل بے سکوں ہوا تھا۔ لہریں تیزی سے سر اٹھا رہی تھیں اور انہی کوششوں کے دوران وہ کامیاب ٹھہریں۔ انہوں نے ڈھونڈ لیا تھا اسے۔ وہ جو اس لمبے اونچے بحری

جہاز کے عرشے پر کھڑا آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے بحرالکاہل کو دیکھ رہا تھا۔ آپ اسے جانتے ہیں بحرالکاہل بھی اسے جانتا ہے۔ وہ سمندروں کا عاشق نہیں تھا، وہ اس قوم سے تعلق رکھتا تھا جس کے لیے سمندروں کو روندا گیا تھا اور جس کے لیے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازوں نے لہروں کے شور کو دبایا تھا۔ وہ سمندروں کا عاشق نہیں تھا۔ سمندروں کے لیے وہ قابلِ عزت تھا۔ وہ، خیام حنفی!

اس نے سر جھکایا تھا۔ کئی آنسو گال پر لڑھکتے اس کی داڑھی میں جذب ہوئے تھے۔ وہ اونچا لمبا مرد رو رہا تھا، وہ واقعی رو رہا تھا۔ سمندر کا پرسکون ہو جانا، قوموں کا بے ضمیر ہو جانا، مزاحمت کا ترک ہو جانا، اسے رلا رہا تھا۔

وہ اب اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ بحری جہاز تھا یا ایک نئی دنیا، عیش و آرام کی ہر سہولت مہیا تھی یہاں۔ مسافر سمندروں میں بھی اپنی عیش و آرام کی زندگی ترک نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اب آنکھوں میں سنجیدگی لیے آرٹ گیلری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خوبصورت سی آرٹ گیلری جو کئی مصوروں کی مصوری سے مزین تھی۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا جیسے اپنی منزل جانتا ہو۔

"پانچ سو ڈالرز۔"

"سات سو ڈالرز۔"

"ہزار ڈالرز۔" دام دام کی بولیاں لگ رہی تھیں، طرح طرح کے لوگ تھے۔ مصور کا شاہکار بکنے جا رہا تھا۔

"تین ہزار ڈالرز۔"

وہ اب لوگوں کے ہجوم سے ہٹ کر کھڑا غور سے اس تصویر میں بکھرے رنگوں کو دیکھ رہا تھا جو مصور نے نجانے کیا سوچ کر بکھیرے تھے۔ جو بھی تھا، ان رنگوں کا امتزاج، نیلے پانیوں کا سنگم اور ان پر موجود جنگی بحری جہاز۔ سیاہ آسمان پر کڑکتی بجلی اور قیاس میں بادل کسی شیر کی طرح گرج رہے تھے۔ ڈوبتا بحری جہاز اور سب سے بلند جہاز کے

بادبان پر لہراتا جھنڈا۔ بحری قزاقوں کی نشاندہی کرتا جھنڈا، سیاہ رنگ کا۔ دیکھنے والے ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر رہ جائیں۔ رنگوں کا وہ سنگم، بہترین سنگم تھا۔

بولیاں اب بھی جاری تھیں اور سات ہزار ڈالرز تک پہنچ چکی تھیں۔

"بیس ہزار ڈالرز۔۔۔!" اس آواز پر ایک لمحے کے لیے ہال میں خاموشی چھا گئی تھی۔ سب نے آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے اپنے عقب میں دیکھا تھا۔ لمبا اونچا قد لیے، سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ شخص پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نظریں پینٹنگ پر ٹکائے کھڑا تھا۔۔

"کوئی اور ؟!" دام لگوانے والا اب سب کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سب خاموش رہے، پینٹنگ اس کی ہوگئی تھی۔ اس نے مہنگے داموں اسے خریدا تھا، کیوں ؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ پینٹنگ ہاتھ میں لیے آرٹ گیلری سے نکلتے ہوئے اس نے بغور پینٹنگ کے کونے میں لکھے اس نام کو دیکھا تھا۔

"عالیان ابنِ اعظم"!

☆☆☆

اس کی سائیکل شام کے اس پہر سرخی مائل آسمان تلے سڑک پر پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ وہ صبح والے لباس میں ہی موجود تھا فرق صرف شانوں سے لٹکے بیگ کا تھا اور اس ٹوکری کا جو اب خالی تھی۔ نہ وہاں اخباروں کا پلندا تھا نہ ہی روفی۔

وہ تیزی سے پیڈل گھماتا اس فلیٹ کے پاس آیا تھا۔ سائیکل سڑک کنارے کھڑی کر کے وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ مسلسل سیڑھیاں پھلانگنے کے بعد وہ اب تیسری منزل پر کھڑا دروازہ بجا رہا تھا۔ اندر موجود انسان یا تو بہرہ تھا یا موجود ہی نہیں تھا۔ یا اس سے چھپ رہا تھا، نکما نالائق۔ اس نے ایک آخری بار پوری قوت سے دروازہ بجایا

اور دروازہ کھل کر زور سے دیوار سے جالگا۔ اس نے بے اختیار نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تھا۔

”ہیلو ہیلو کوئی ہے؟“ وہ دھیرج سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کمرہ کچن سب خالی تھا تو دروازہ کیوں کھلا تھا؟ وہ اب تذبذب کا شکار بالکونی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور تبھی اسے اپنا شکار نظر آیا تھا۔ ریلنگ پر چڑھ کر کھڑا خودکشی کی کوشش میں مصروف بندہ اس کا قدیم شکار تھا۔ جو آج اس کے ہاتھ لگ ہی گیا تھا۔

”ہے، جیم تم میرے پیسے ادا کیے بنا نہیں مر سکتے۔ سنا تم نے؟“ اس نے تیزی سے جیم کو اس کی جیکٹ کے کالر سے پکڑ کر نیچے اتارا تھا۔ ”دیکھو میں ایک غریب آدمی ہوں تین تین جابز کرتا ہوں تو دو وقت کا کھانا کھاتا ہوں، تم میرا حق مار کر مرے تو سیدھا جہنم کا ٹکٹ کٹے گا۔ پہلے میرے پیسے دو پھر شوق سے کرنا خودکشی۔ اس کے بعد بھی ٹکٹ جہنم کا ہی کٹے گا۔ حرام موت مرنے جا رہے ہو۔“ وہ تیزی سے ایک ہی سانس میں سب کہہ گیا تھا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں پیسے رکھے ہیں لے لو اور دفعان ہو جاو۔ اور یہ اپنی غربت کا رونا مت پیٹا کرو۔ سب جانتے ہیں تم اپنا پیٹ کاٹ کر آئی فون کا نیا ماڈل لینے کے چکر میں ہو۔“ جیم کا موڈ بگڑ چکا تھا۔

”جو بھی ہے۔ میں کم از کم تمہاری طرح حرام موت کی خواہش نہیں رکھتا۔ اور پیسے ایسے مت دو جیسے تم مجھ پر احسان کر رہے ہو، تم میرے قرض دار ہو اور اب اور زیادہ ہو گئے ہو۔ میں نے تمہیں جہنم کی آگ سے بچایا ہے۔ انسان کے بچے بنو ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہو۔“ اس نے جیم کو شرم دلانی چاہی تھی۔ جیم نے دانت پیس کر اسے دیکھا پھر اسے کالر سے پکڑ کر زور سے کھینچا تھا۔ اس کی گردن پر زور دے کر جیم نے اسے ریلنگ سے نیچے کا نظارہ کروایا تھا۔

”اپنی ان ٹماٹر جیسی آنکھوں سے دیکھو نیچے ایک باونڈری لائن ہے جہاں میرا بٹوہ گر گیا ہے، اگر تمہیں مجھے جہنم سے بچانے کا اتنا ہی شوق ہے تو ایک دوست ہونے کے ناطے تم آرام سے نیچے اتر کر مجھے میرا بٹوہ لا کر دے سکتے

ہو۔"

"جنگلی انسان چھوڑو مجھے۔" اس نے تیزی سے اپنا آپ اس کی گرفت سے آزاد کروایا تھا۔"ذراسی بھلائی کیا کرو فری ہو جاتے ہیں۔ جہنم سے بچایا ہے تمہیں جہنم سے۔ ایک کپ چائے پلاو اور پیسے لاؤ میرے۔ گھر میں بچے آ گئے ہونگے ٹیوشن کے ذرا جلدی کرو۔" وہ جیم کو گھورتے ہوئے صوفے پر دراز ہوا تھا۔

"اپنے پیسے لو اور دفعان ہو جاو۔ تم میرا مہینے کا راشن ہفتے میں ختم کر دیتے ہو۔ خدا تم سا دوست نامی دشمن کسی کو نہ دے جو آستین کا سانپ بن کر ہر وقت ڈسنے کو تیار ہے۔" اس نے ایک بے زار سی نگاہ مسلسل بکواس کرتے جیم پر ڈالی پھر دونوں بازو سر کے نیچے رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

یہ ایک خاموش پیغام تھا جیم کے لیے کہ اب اگر اس کا مرحوم باپ بھی قبر سے اٹھ کر آ جائے تو بدر کو وہاں سے بنا چائے پلائے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

"She sells the seashells by the seashore.."

اس آواز سے جھلکتی معصومیت سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ آواز ایک بچے کی تھی۔ اب ذرا آواز کی سمت کا تعین کرتے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ کے اندر جھانکا جائے بلکہ اندر تشریف آوری لے جائی جائے تو سرِ دست ہل ہل کر Tongue Twister پڑھتے ان بچوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ دھیان رہے ان کی شکلوں کو دیکھ کر مغالطے میں مت پڑیے گا یہ کوریئن، جاپانی یا چینی نہیں ہیں یہ تھائی بچے ہیں۔ چھوٹے، معصوم۔ ان چھوٹے اور معصوم بچوں سے بے نیاز صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا اخبار پڑھتا وہ بڑا بچہ، جس کا تعارف جندل یوسف زئی کے نام سے ہو چکا ہے۔

"جندل بھائی۔" ایک بچے نے اچانک رک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی۔" وہ اخبار رکھتا بچے کی طرف متوجہ ہوا۔

"سر بدر کہاں ہیں؟ آج میں جلدی گھر جاؤں گا دادی کے ساتھ مارکیٹ جانا ہے۔" جندل نے گہری سانس لی۔

"آجائے گا، یہیں کہیں کسی سے پیسے بٹور رہا ہو گا۔" اس کے منہ بسور کر کہنے پر سب بچے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگے۔

"اوئے بدمعاشوں تم لوگ پڑھنے آئے ہو یا دانت نکالنے؟" آواز اسی کی تھی، سر بدر کی۔

"سر ہم تو پڑھنے آئے ہیں لیکن آپ کا پڑھانے کا موڈ نہیں ہو رہا تو چلے جاتے ہیں۔" گلابی رنگ کی فراک میں ملبوس اس سات سالہ بچی نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تاکہ تمہارے ابا میری سیلری کاٹیں۔ ایک بات دھیان میں رکھو بچوں!" سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آئی فون تو میں لے کر رہوں گا!" وہ اچھل کر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اور پھر وہاں سے کھسکتا بچوں کے برابر میں فرش پر بیٹھا۔ اپنی پشت صوفے سے ٹکالی۔ جندل نے ایک بےزار نگاہ اس پر ڈالی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایپل کمپنی نے آئی فون چودہ کا ماڈل لانچ کر دیا ہے۔" آہستہ سے اس کے سر پر پہاڑ توڑا گیا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑے جندل کو دیکھا۔

"لالے ابھی بارہ کے لیے تین تین جابز کر رہا ہوں چودہ کے لیے سڑک پر بیٹھ کر بھیک مانگوں گا کیا؟!" سب بچوں کے معصوم قہقہے بلند ہوئے تھے۔

"تم جیسے ڈجیٹل بھکاری کو کوئی ٹکہ نہ دے۔" وہ ایک بار پھر اخبار اپنے سامنے پھیلا چکا تھا۔ بدر نے گم سم سی نظروں سے اسے دیکھا پھر سامنے بیٹھے بچوں کو۔

"سر ٹشو۔" ایک بچی نے اس کی طرف ٹشو بڑھایا تھا۔ جو بھی تھا اسے اپنے چھوٹے سے سر پر ترس آتا تھا۔ اتنے کیوٹ سے سر تھے اس کے۔ بدر نے خاموشی سے ٹشو اس سے لیا۔ آنکھوں میں غیر موجود آنسو پونچھے پھر گہری سانس لی۔

"ورلڈ بینک پر بھی ڈاکا ڈالنا پڑا ناں تو ڈالوں گا، دیکھتا ہوں کون روکتا ہے مجھے؟!!" سب کی دبی دبی سی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر سب کو زبردست گھوری سے نوازا۔

"She sells the seashells by the seashore.."

آوازیں پھر سے شروع ہو گئی تھیں۔ ہل ہل کر پڑھتے بچے، ان کی کاپیاں دیکھتا بدر اور صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھتا جندل۔ سرخی مائل آسمان، ڈھلتا سورج، سب مکمل تھا۔ مکمل ترین۔

☆☆☆

سرخی مائل سائبان تلے لکڑی کی میز کے گرد رکھی کرسیوں پر بیٹھیں وہ دو لڑکیاں، ایک گلابی رنگ کے لانگ کوٹ پر ہلکے کتھئی رنگ کا اسٹول گلے میں ڈالے بغور اپنے سامنے رکھے کافی کے کپ کو دیکھ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کپ کے اطراف میں طواف کر رہی تھی۔ اور دوسری مکمل مغربی لباس میں ملبوس بے فکری سے فرنچ فرائز کے ساتھ انصاف کر رہی تھی۔ وقفے وقفے سے ٹھہر کر اس گم سم سی لڑکی کو دیکھنے کا عمل بھی جاری تھا۔ اس کی زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔ وہ مزید خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی تبھی تھوڑی دیر بعد وہ بولنا شروع کر چکی تھی۔

"یہ مسلمان بہت زیادہ عجیب نہیں ہیں؟! صرف ایک انسان کی وجہ سے قتل کر دینے کو تیار۔ اور انسان بھی کون؟ جو صدیوں پہلے دنیا سے رخصت ہو چکا ہو۔" اس نے ٹشو سے اپنے ہاتھ صاف کیے پھر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ازابیلا نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر کندھے اچکا دیے۔

"ایک ہندو کبھی نہیں چاہے گا کوئی سرِ عام اس کے خداؤں کو گالیاں دے۔ ایک بدھسٹ طیش میں آجائے گا اگر کوئی اس کے مذہب کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے۔ یہودی اور عیسائی بھی ہرگز چپ نہیں بیٹھیں گے ایمِلی! مسلمانوں نے وہی کیا جو سب کرتے لیکن۔۔" وہ رکی۔ ایک نگاہ آسمان پر ڈالی جو دھیرے دھیرے سیاہی میں نہانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ نگاہیں آسمان سے پھسلتیں ایمِلی پر ٹکیں۔ "تم نے انکوی زیشن کے بارے میں سنا ہے؟" وہ جانچتی نگاہوں سے ایمِلی کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کم آن بحث کو لمبا مت کرو ایک سمپل سا سوال کیا تھا میں نے بلکہ اپنی رائے پیش کی تھی۔ تم ہر بار کی طرح آج بھی ابھی بھی ٹیررسٹ مسلمانوں کی طرف داری کر رہی ہو۔ تمہیں نہیں لگتا تم ذہنی طور پر تقریباً والی مسلمان ہی ہو گئی ہو؟!" وہ بے زار ہوئی تھی۔ ازابیلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر بند کر دیے۔

ایمِلی وہ انسان نہیں تھی جسے وہ اپنی بات سمجھا پاتی۔ اس نے گہری سانس لی۔

"میں کسی خدا کو نہیں مانتی ایمِلی! میں خدا کا انکار بھی نہیں کر پاتی۔ میرے اردگرد مذہب کا ایک دائرہ ہے جس کے ایک کونے پر میری ماں اسلام لیے کھڑی ہے، میرا باپ یہودیت لیے کھڑا ہے۔ میرے ہم وطن بدھ مت کے پیروکار ہیں اگر کوئی خدا ہے تو وہ خدا اپنے بندوں کو ایک بھی نہیں کر پایا؟! حتیٰ کہ میرے ماں باپ کو بھی؟!" ایمِلی ہونٹ کاٹتی تذبذب سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اپنے خدا سے دعا کرو ایمِلی۔ جو بھی سچ ہے مجھ پر کھل جائے۔ میں اس پچھتاوے کا شکار نہیں ہونا چاہتی کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ فریب تھا۔ حقیقت سات پردوں میں چھپی تھی۔ فریب کا جال تھا۔ دیکھنا محال تھا۔" وہ جا چکی تھی۔ اس کی ہیل کی ٹک ٹک، ایمِلی سن سکتی تھی۔ اور اس کے الفاظ بھی، جو اب تک اس کی سماعت سے ٹکرا رہے

تھے۔

”خدا اپنے بندوں کو ایک بھی نہیں کر پایا؟! حتیٰ کہ میرے ماں باپ کو بھی؟“!

ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے گزرنے ہر اس نے جھر جھری لی تھی۔ یہ لڑکی کچھ منفرد تھی۔ یہ ایمِلی کی سوچ تھی۔ حقیقت میں ازابیلا تاریک رات کے ان ہزاروں مسافروں میں سے ایک تھی جو کسی جگنو کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ روشنی سامنے تھی، مگر مستقل اندھیرا ان کی بینائی لے چکا تھا۔

☆☆☆

اسپتال کا کاریڈور، کسی مرض کی تشخیص، درد سے کراہتے انسان، تڑپتے مرتے لوگ، سسکیاں، آہیں، چیخیں۔ یہ اونچی دیواریں سب کچھ خود میں سموئے خاموش کھڑی تھیں۔ جیسے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے ہوں کہ خبردار! کوئی راز نہ آشکار ہو جائے۔

کمرہ نمبر انتیس۔ بند دروازے کھلے۔ بھاری قدموں کی چاپ، ان کا رکنا، ٹھہرنا اور پھر بستر مرگ پر پڑے اس شخص پر نگاہیں دوڑانا۔ وہ شخص جس کے سر کے بالوں سے ایک نشان سیدھ میں آتا ٹھوڑی تک جا رہا تھا۔ ایک بازو کٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں ناکارہ ہو چکی تھیں۔ مشینوں میں جکڑا وہ شخص اپنا تقریباً سب کچھ کھونے کے باوجود زندہ تھا۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ ایسے جیا نہیں جا سکتا تو جان لے کہ موت سب پر مہربان نہیں ہوتی۔ یہ اپنے وقت پر آتی ہے، دھیرے سے، اچانک ایک بھیانک خواب کی طرح۔ درد، تکلیف، تڑپ، پل بھر میں سب سے آشنا کرواتی ہے اور ساتھ لے جاتی ہے۔ سامنے لیٹے شخص کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ تبھی وہ زندہ تھا۔ اسے زندہ رکھا گیا تھا۔

”بیس سال کا عرصہ بہت زیادہ ہے، اسے اب اٹھ جانا چاہیے۔“ ایک سرگوشی، احتیاط سے بھری سرگوشی۔ جیسے ڈر ہو کہ یہ سفید اونچی دیواریں سن نہ لیں۔ بول نہ دیں، راز نہ کھلے، موت نہ آئے۔

”ہم اس شخص کو نہیں کھو سکتے۔ یہ واحد ثبوت ہے، گواہ ہے بیس سال پہلے لگی آگ کا!“ یہ سرگوشی دوسرے انسان نے کی تھی۔ آواز مزید ہلکی تھی۔

”اسے مرنا نہیں چاہیے، یہ مر گیا تو اس کی موت کئی مزید لوگوں کی موت کا سبب بنے گی۔ اسے زندہ رہنا چاہیے ہر حال میں“!!

بس۔ ایک بار پھر دروازے کی چرچراہٹ، بھاری قدموں کی چاپ، لاک میں گھومتی چابی کی کلک اور بس۔

دیواروں نے مزید سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ شخص اب بھی دنیا و مافیہا سے بے گانہ لیٹا ہوا تھا اور اس کے سرہانے، بائیں طرف مشین پر نظر آتی دھڑکنوں کی رفتار جن میں بتدریج کمی آ رہی تھی۔

موت بھی اتنی لمبی سزا نہیں دیتی۔ یہ سب پر مہربان نہیں ہوتی لیکن اسے کچھ پر رحم آ ہی جاتا ہے۔ جیسے اس شخص پر اور جیسے گزرے وقت پر۔

☆☆☆

تیز ہوا کسی لشکر کی مانند پورے کراچی کا محاصرہ کیے کھڑی تھی۔ گرد و غبار اڑ اڑ کر آنکھوں کے آگے چھا رہا تھا۔ ٹریفک میں پھنسی گاڑیاں، پیدل چلتے مسافر کوئی بھی گرد و غبار کے لشکر سے محفوظ نہ تھا۔ اس مصروف شاہراہ پر اگر دور تک نگاہ دوڑائی جائے تو ایک لڑکی ہلکے سرمئی رنگ کے گاؤن میں ملبوس، سیاہ اسکارف سے نقاب کیے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی اس چھوٹی اور تنگ گلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نقاب سے جھانکتی بھوری آنکھوں میں احتیاط، جھجھک اور تذبذب دیکھا جا سکتا تھا۔ تیز ہوا اسے اس کا گاؤن پھڑپھڑا رہا تھا۔ سیاہ اسکارف پر دھیرے دھیرے گرد و غبار کے نشانات چھپ رہے تھے۔

”سعاد آپی، آپ؟“ وہ ٹھٹھک کر رکی تھی۔ اس کے سامنے ہریرہ کھڑا تھا۔ جندل کا شاگرد اور اس کا پڑوسی۔ وہ

گڑبڑا کر ارد گرد دیکھنے لگی۔ ہریرہ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر بول اٹھا۔ "کوئی کام ہے تو مجھے بتا دیں آپی۔ موسم اتنا خراب ہو رہا ہے آپ کو نہیں نکلنا چاہیے تھے باہر۔ جندل بھائی نے وعدہ لیا تھا مجھ سے کہ آپ کا خیال رکھوں گا۔"

ہریرہ کی بات سن کر اس نے گہری سانس لی تھی۔

"تم پریشان مت ہو، میں یہاں اپنی دوست سے ملنے آئی تھی بس سامنے ہی ہے اس کا گھر۔ تم جاؤ بے فکر ہو کر۔"

نقاب سے جھانکتی آنکھوں نے تاثر دیا تھا کہ وہ مسکرائی تھی۔

"پکا ناں؟" اسے اب بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں پکا۔"

"ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں اور آپ کو کوئی بھی کام ہو تو مجھ سے کہیے گا۔ اللہ حافظ۔" وہ مڑ چکا تھا۔ سعاد کی نگاہوں نے اس کا تب تک پیچھا کیا جب تک وہ گلی سے نکل نہیں گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ تیزی سے مڑی اور اس چھوٹے سے کیفے ٹیریا میں داخل ہوئی۔ خراب موسم کی وجہ سے یہاں اتنا رش نہیں تھا۔ وہ کسی خالی میز کی تلاش کے بجائے تیز تیز قدم اٹھاتی کاونٹر پر پہنچی تھی۔

"مجھے ان سے بات کرنی ہے ہر حال میں۔ آج، ابھی اور اسی وقت!" اس کی آواز پر کاونٹر پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر تیزی سے کھڑا ہوا۔

"سعاد بیٹی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس سوال پر سعاد نے بمشکل خود کو قابو کیا تھا۔

"میں نے کہا مجھے ان سے ملنا ہے۔ کیسے؟ کیوں؟ میں کچھ نہیں جانتی آپ بلائیں انہیں فوراً!" اس کی آواز میں سختی پیدا ہوئی تھی۔

"سعاد بیٹی میں نہیں جانتا کہ کیا بات ہے کہ تم اتنی عجلت میں ہو۔ لیکن وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں وہ تم سے نہیں

مل سکتے۔ موسم بہت خراب ہے، بارش کے امکانات ہیں تمہارا باہر رہنا ٹھیک نہیں۔ جندل کو پتا چلا تو بہت ناراض ہو گا۔ جو بھی بات ہے تم مجھے بتا دو یا پھر تھوڑا انتظار کرو۔ میں فوراً انہیں تمہارا پیغام دے دیتا ہوں وہ وقت ملتے ہی تم سے ملنے آئیں گے، ٹھیک ؟!" سعاد نے گہری سانس لی تھی۔

"آپ سب کب تک مجھے اس سب سے دور رکھ پائیں گے ؟میرے دو بھائی آپ لے چکے ہیں۔ میرے والدین آپ کی غلطیوں کی سزا بھگت چکے ہیں۔ مجھے اس بھری دنیا میں اکیلا کر کے، غیر محفوظ کر کے آپ میرے تحفظ کی بات کر رہے ہیں ؟!" اس کی آواز میں چھپے درد کو محسوس کیا جاتا تو کوئی دل پتھر کا نہ رہ پاتا۔

"سعاد! میں نہیں چاہتا تمہیں اپنے کہے الفاظ پر ندامت ہو۔ لوٹ جاؤ۔ جس دن تم نے اس راہ کے کانٹوں کو قبول کر لیا میں اس دن خود تمہیں خوش آمدید کہنے آؤں گا۔ سرِ دست لوٹ جاؤ!" ادھیڑ عمر وہ شخص واپس اپنے کام میں مشغول ہو چکا تھا۔ سعاد نے لال ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"ظلم کے خلاف لڑنے والے انسان آج بے رحمی کی ہر حد پار کر چکے ہیں!" وہ ایک اچھی تیر انداز تھی۔ طنز کے زہر میں بِھیگے کمان سے نکلے اس کے تیر ہمیشہ نشانے پر لگتے تھے۔ وہ پلٹ رہی تھی جب ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جندل کو تمہارے ان الفاظ پر بہت افسوس ہو گا سعاد!" اسے لگا تھا کسی نے کوئی سخت زنجیر اس کے قدموں میں ڈال دی ہو، یا بھاری پہاڑ اس کے سر پر دے مارا ہو۔ وہ خود کو اچانک ایکدم سے بہت بڑے بوجھ تلے محسوس کر رہی تھی۔ نقاب میں چھپا چہرہ ضبط کے مارے لال پڑ رہا تھا۔ کئی آوازیں تھیں جو اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں:

"اور جب وہ کسی محاذ پر جاتے ہیں، تو ہزاروں بہنوں کے محافظ بھائیوں کی بہنیں اگر ایک طرف دروازے کی چوکھٹ تھامے ان کا انتظار کرتی ہیں تو دوسری طرف وہ اپنی حفاظت آپ کا سامان کرتی ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے

ناں آپی! ہزاروں بہنوں کی ناموس کی خاطر میدانِ کارزار میں نکلنے والے بھائیوں کی اپنی بہنیں بنا کسی تحفظ کے ہوتی ہیں"!

"میں چاہتا ہوں جب میں لوٹوں تو میری ہمشیرہ اپنی مسکراہٹ سے میرا استقبال کریں۔ آپ کا اخی آپ کا سر کبھی نہیں جھکائے گا آپی۔"

"تم نے دخترِ غرناطہ کی کہانی سنی ہے سعاد؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام کا یہ فرزند طویل عرصے بعد کبھی لوٹے تو تمہیں دخترِ اسلام کے روپ میں اپنے شانہ بشانہ کھڑا پائے؟"

آواز ایکدم بدلی تھی۔ اس نے سختی سے اپنی آنکھیں میچی تھیں۔

کچھ دیر بعد کراچی کی اس مصروف شاہراہ پر وہ لڑکی گرد و غبار کے جال میں کہیں گم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"اگر وہ جنگلی انسان جیم مجھے دو ہزار تحفتاً دے دیتا تو اب تک میرے پاس پچاس ہزار جمع ہو چکے ہوتے۔ اگر آنند کی دادی اس کی اس ماہ پہلی پوزیشن آنے پر انعام کے طور پر مجھے پانچ ہزار دے دیتیں تو اس ملک کے خزانے میں کوئی کمی نہ آتی۔ اور اگر۔۔" اس "اگر" کے بعد بدر کی کہانیاں بہت بڑی اور کثیر تعداد میں تھیں۔ ایک دن وہ یہ بھی کہہ چکا تھا کہ "اگر جندل اپنا گردہ "تحفتاً" اسے دے دیتا تو اس کی زندگی میں کچھ خاص تبدیلی نہ آتی کہ جو باعثِ تکلیف ہو، بس اس "غریب بدَر" کی زندگی بدل جاتی۔"

اس وقت بھی وہ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا کیلوں کے ساتھ انصاف کرتا "اگر" کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا تھا کہ لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر کانوں میں ہینڈ فری ٹھونس کر بیٹھا جندل اسے نہیں سن رہا تھا۔

"لالے تم مجھے سن رہے ہو؟" جواب ندارد۔ "جب ایسی گونگی بہری زندگی گزارنی ہے تو مر جانے کا پلان زیادہ اچھا

ہے۔ کیا ہو گا اگر یہ لالا مرنے سے پہلے مجھے ایک گردہ دے دے؟" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ مقابل کو اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا، ٹکہ فرق نہیں پڑا تھا۔

"لالے سن رہے ہو؟!!" وہ اس کا ہینڈ فری اتارتا اس کے کان میں چلایا تھا۔ جندل نے بے زاری سے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ بیڈ سے اتر کر چپل پاوں میں اڑسی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دھاڑ کی آواز سے کمرے کا دروازہ بند ہونے پر بھی اپنی جگہ آنکھیں پھاڑے بیٹھا بدر نہیں ہلا تھا۔ جیسے جم گیا ہو۔ اس کا جمنا بنتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیڈ کی سفید چادر پر پانچ سو کا کڑکتا نوٹ رکھا تھا جو یقیناً جندل کی جیب سے گرا تھا۔

چھ ماہ کی انتھک کوششوں کے بعد اس کے پاس آخر کار پانچ سو کم پچاس ہزار جمع ہو چکے تھے۔ اس کا جمنا بنتا تھا۔

☆☆☆

وہ اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سڑک کنارے چلنے لگا تھا۔ سیاہ روشنائی میں ڈوبا آسمان اس کا سائبان تھا، چاند ہمسفر اور تارے راہبر۔ اک سکوت تھا، جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے ذرا دیر بعد اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ تاریک رات میں منزل سے بے پرواہ ہو کر وہ سوچوں میں گم قدم اٹھا رہا تھا۔

سفید رنگ کی پینٹ پر ہلکے کتھئی رنگ کی شرٹ اور ہم رنگ ہی جیکٹ پہنے، عجب سکون کے تاثر دیتا وہ اب گلی کا موڑ مڑ رہا تھا جس کے بعد بڑی شاہراہ شروع ہوتی تھی۔ گاڑیوں کا ہجوم، نہ وہ سناٹا نہ وہ تاریک رات۔ بینکاک کی یہ مصروف شاہراہ رات کے اس پہر بھی خالی نہ تھی۔ وقت کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ انسان بہت آگے بڑھ رہا تھا، اور اس آگے بڑھنے میں وہ اپنا ماضی تقریباً بھلا چکا تھا۔ جو نہیں بھولے تھے وہ بھولنے کی کوششوں میں غرق تھے۔

”میں نے روشنی میں اِک چاند کو مایوس پایا ہے،

میں نے دشت و صحرا میں سمندر کو اجنبی ہوتے دیکھا ہے۔“ وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ اس کے ہمقدم ہوتا وہ شخص بھی رک گیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا تھا۔ مقابل کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت کا احساس اجاگر ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ اس سے بغلگیر ہو رہا تھا۔

”ضرار تم۔“

”جندل میں۔“ وہ خوش طبع خوبرو جوان ہلکا سا مسکرایا تھا۔ جندل نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

”اس اجنبی سے ملک میں اجنبی لوگوں کے درمیان میں نے کسی بہت ”اپنے“ کو پایا ہے،

میں نے زندگی کی بھاگ دوڑ میں وقت کو بدلتے دیکھا ہے۔“ ضرار نے ان الفاظ پر گردن کو خم دیا تھا۔

وہ دونوں اب سڑک کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔

”کیسے آنا ہوا تمہارا؟“ ضرار نے گہری سانس لی تھی۔

”میں شاید نہ آتا لیکن تمہیں مطلع کرنا از حد ضروری تھا اور ساتھ ہی ایک دوست سے ملنا تھا۔“ جندل نے گردن ترچھی کیے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جندل! میں تمہیں نہیں بتانا چاہتا کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے ہم سنبھال نہ سکیں یا جس کے لیے تمہیں پریشان کیا جائے۔ لیکن مجھے لگا تھا کہ اگر میں تمہیں نہیں بتاؤں گا تو تم ناراض ہو گے اور یہ کہ اس کا تعلق سرِ دست تم سے ہے تو تم بہتر جانتے ہو گے۔“ وہ تمہید باندھ رہا تھا۔ جندل اس کے مدعے پر آنے کا منتظر تھا۔ اس نے ایک نظر جندل پر ڈالی پھر گویا ہوا۔ ”تمہاری ہمشیرہ! وہ آج آئی تھیں۔“ ضرار نے سر جھکایا تھا۔

”وہ ٹھیک تو ہیں ناں ضرار؟“ وہ بے چین ہوا تھا۔

"وہ ٹھیک ہیں بالکل ٹھیک ہیں۔ آج انہوں نے کمانڈر سے ملنے کے لیے ضد کی۔ وہ بہت پریشان تھیں تمہارے لیے اور۔۔۔" وہ رکا۔ نظر اٹھا کر جندل کو دیکھا جس کی نگاہوں میں کئی سوال تھے۔ "اور تمہارے بھائی کے لیے۔"

جندل نے گردن پیچھے گرا کر گہری سانس لی تھی۔

"جندل دیکھو تم براہِ مہربانی ان سے بات کر و یار۔ میں جانتا ہوں یہ مشکل ہے بہت مشکل اور اس صورت میں کہ جب آپ اپنے ماں، باپ، بھائی کو کھو چکے ہوں تو یہ حد سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے لیکن ایک قوم کو سہارا دینے والے ستون ہمیشہ تنہا ہی ہوتے ہیں۔ کسی شاہ جہاں کے خواب کی تعمیر کے لیے پسینہ بہانے والے معمار "کسی" شاہ جہاں کا خواب نہیں ہوتے۔ قومیں خون مانگتی ہیں، قومیں جان مانگتی ہیں اور تب جب قومیں ٹھنڈی پڑ چکی ہوں تو یہ خون دگنا اور جان کا قرض چوگنا ہو جاتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں؟" اس نے مفاہمت انگیز نگاہوں سے جندل کو دیکھا جس نے محض سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"دیکھو میں تمہیں سمجھ سکتا ہوں میں ابھی خود اپنی آپی سے پٹ کر آرہا ہوں، دیکھو!" اس نے اپنی دائیں آنکھ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جندل نے سڑک پر لگی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بغور اس کی دائیں ابرو سے نیچے آنکھ تک جاتی خون کی لکیر کو دیکھا تھا۔ خون جمنے کی وجہ سے وہ لکیر ذرا کالی سی ہو گئی تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔ ضرار بھی اسے ہنستا دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"تمہیں تو بہت برا تھپڑ پڑا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تھپڑ نہیں مکے وہ بھی جمی ہوئی بند مٹھی کے۔" ضرار نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"تو اب تم چاہتے ہو میں بھی ایسے ہی کچھ مکوں کا مزہ چکھوں، ٹھیک؟"

"ہاں۔ قسمے مکے کھا کر نیند بہت اچھی آتی ہے، کوشش تو کرو۔" دونوں کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔

”وہ حرم آپی نہیں ہیں، وہ سعاد آپی ہیں۔ سعاد یوسف زئی! اگر انہیں غصہ آگیا ناں تو یقین کرو میری لاش پر بیٹھ کر تم لوگ افسوس کر رہے ہو گے کہ کاش مرحوم پٹھان برادری سے نہ ہوتا۔“ اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

”ہاں، اور میری تو شاید تمہیں لاش بھی نہ ملے!“ ضرار کی بات پر گلی کا موڑ مڑتے وہ دونوں ہنس دیے تھے۔ ”ویسے تمہیں پتہ ہے میں کتنی مشکل سے اپنی ہنسی روکتا ہوں جب مجھے سعاد کو سعاد بیٹی کہنا پڑتا ہے۔ لائک سیریسلی سعاد بیٹی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ گردن گرا کر ہنسا تھا۔ جندل نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں اب ایک اور گلی کا موڑ مڑ رہے تھے۔

وہ مصروف شاہراہ اور اس کی رعنائیاں کہیں پیچھے چلی گئی تھیں۔ اب وہی اندھیر آسمان تھا، وہی راہبر وہی ہمسفر۔ البتہ خاموشی میں کبھی کبھی دونوں کے بولنے کی آواز گونجتی اور کبھی ہنسنے کی۔ اور جہاں ضرار موجود ہو وہاں یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی خاموش رہ سکے بھلے وہ انسان ہوں یا جانور۔ جیسے ابھی گلی کے نکڑ پر بیٹھا کتا انہیں دیکھ کر اپنی مخصوص ”دل موہ لینے والی“ دھن شروع کر چکا تھا اور وہ دونوں سر بچا کر نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہے تھے۔

☆☆☆

"ازابیلا سوگئی؟" کمرے میں داخل ہوتے وارلڈ نے بیڈ پر بیٹھی قانتہ کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

"جی۔ آپ کا پوچھ رہی تھی لیکن آپ جناب مصروف تھے۔ وہ بھی تھکی ہوئی آئی تھی، آتے ہی سوگئی اب بس صبح کا سورج ہی اسے اٹھا سکتا ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

”اپنے باپ پر گئی ہے ناں۔“ وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑا اپنی گھڑی اتار رہا تھا۔

”آپ کو نہیں لگتا آپ نے اسے صحافت سے ہٹا کر اس کے ساتھ غلط کیا ہے؟“ قانتہ کی پر سوچ آواز پر وہ پلٹا اور بیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

”میں نہیں چاہتا وہ کسی بھی قسم کی سیاست میں پڑے!“ قانتہ کے لیے جواب غیر واضح تھا۔

”مگر وہ صحافت میں تھی!“ اس نے جیسے یاد دلایا تھا۔

”صحافت کی سیڑھی سیاست کی منزل تک جاتی ہے قانتہ! میں ہماری اکلوتی بیٹی کو کسی قسم کے خطرے میں نہیں پڑنے دینا چاہتا۔“ وہ گہری سانس لے کر قانتہ کے برابر میں بیٹھا تھا۔

”لیکن آپ مشکل وقت میں اس کے لیے سب کر سکتے تھے۔ صحافت اس کا شوق تھا، اس نے اپنی زندگی کے چھ سال اس میں لگائے ہیں!“ قانتہ کا اعتراض اب بھی باقی تھا۔

”میں اس پر ایسے حالات آنے ہی کیوں دوں جب وہ میری یا کسی کی مدد کے انتظار میں ہو؟ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے قانتہ!“ اس نے گردن ترچھی کیے برابر میں بیٹھی قانتہ کو دیکھا تھا۔

”میں نے ہار مانی!“ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔

”میں نے اپنی جیت آپ کے نام کی۔“ وارلڈ کے لبوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ قانتہ نے لاجواب ہو کر اسے دیکھا تھا۔

”جناب اب اٹھیں اور میرے لیے اچھی سی کافی بنا کر ٹیرس میں آجائیں۔ میں سرِ دست دو چاند ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں چھپی شرارت کو محسوس کر کے قانتہ نے اسے گھورا تھا۔

”عمر دیکھی ہے اپنی آپ نے؟“

”بالکل! پانچ کم پچاس۔“

”اور حرکتیں دیکھی ہیں؟“

”کیا میری عمر کے لوگوں کے لیے چاند کو دیکھنے پر بھی پابندی عائد ہوتی ہے قانتہ؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ قانتہ نے گہری سانس لی تھی۔

یا وہ جلد ہار مان لیتی تھی یا وارلڈ لاجواب کر دیتا تھا۔ سمجھنا ذرا مشکل تھا۔

”قانتہ! کافی۔۔“ ٹیرس سے آتی آواز پر وہ سوچوں کو جھٹکتی تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ رات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مزید تاریک ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ۔

☆☆☆

جیسے ہر قافلہ اپنی منزل پر پہنچ کر بکھر جاتا ہے، ویسے ہی ہر رات صبح میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جیسے بعض قافلے بھٹک جاتے ہیں، ویسے ہی بعض راتیں اپنے نہ مٹنے والے نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ کبھی نہ ختم ہونے والی تاریک راتیں۔

تھائلینڈ میں نمودار ہوتا سورج اپنے ساتھ کئی پیغام لایا تھا۔

بھٹکے ہوؤں کے لیے پیغامِ امید،

اور منزل پر پہنچنے والوں کو خوش آمدید!

سیاہ ہموار سڑکوں پر حسب معمول گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ زندگی کی ریل پیل شروع ہو چکی تھی۔ یا یوں کہیں کہ وہ ایک لمحہ جس میں ایک پل کے لیے سب اندھیر ہو جاتا ہے، وہ لمحہ مٹ چکا تھا۔ زندگی بس ایک لمحے کے لیے رکی، ٹھہری اور پھر چل پڑی۔

سڑک کنارے پر سوچ نگاہوں سے آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتا وہ لڑکا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ کسی ایسے مسافر کی

مانند جو کسی قافلے کا ساتھ چاہتا ہو۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس بھورے رنگ کی شال شانوں کے گرد پھیلائے وہ اپنے مخصوص لباس میں بہت ہی خاص لگتا تھا۔ لکھاری مزید اس کے بارے میں لکھتا اگر دور سے ایک سائیکل سوار اسے اپنی جانب متوجہ نہ کرتا تو۔

وہ تیزی سے آیا تھا۔ پیڈل گھماتے ہوئے وہ اچانک کھڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ بلند کیے تھے۔ نتیجتاً اس کا دایاں ہاتھ جندل کے سر پر زور سے لگا تھا۔ وہ واپس سیٹ پر بیٹھا اور کچھ آگے جا کر سائیکل روکی۔ مسکراتے ہوئے مڑ کر جندل کو دیکھا جو خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

”لالے! صبح بخیر۔“ وہ سائیکل موڑتا اس کے قریب آرہا تھا۔

”اس صبح میں خیر کیسی جس کی شروعات ہی تمہاری اوٹ پٹانگ حرکتوں سے ہو۔“ وہ غصے میں تھا۔ لالا غصے میں تھا، اس کے کان لال ہو گئے تھے اور دماغ گرم ہو چکا تھا۔ یہ واقعی اچھی بات نہیں تھی کہ کسی کو ”تھپڑ“ مار کر صبح بخیر کہا جائے۔

”خیر ہی خیر ہوتی ہے لالا! قسم سے تمہیں تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ ورنہ یہ تھائی لوگوں کو سر پر چپیڑ مارو تو قتل کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ ابھی بھی دولڑکے انتقام کے چکر میں میری سائیکل کے پیچھے بھاگ بھاگ کر بری طرح رگڑے گئے ہیں۔“ کتنے فخر سے بتا رہا تھا وہ بدتمیز۔ جندل کی غصے بھری نگاہ اس کے چہرے سے پھسلتی ٹوکری میں بیٹھے روفی پر ٹکی جو گاجر کھانے میں مصروف تھا۔ روفی نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا، جندل نے روفی کو دیکھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دانت بری طرح سے بدر کے ہاتھ میں گاڑے تھے۔

”روفی!! بدتمیز جانور چھوڑو!“ وہ چلایا تھا۔ روفی معصومیت سے اسے دیکھتا پیچھے ہٹ گیا۔ بدر نے ایک نگاہ اپنے ہاتھ پر روفی کے دانتوں کے کارنامے پر ڈالی اور پھر قہر آلود نگاہ روفی پر ڈالی۔

"صبح بخیر مصعب الزر قاوی عرف بدر!" اس نے سر اٹھا کر جندل کو دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ بدر کی صبح کا بہترین آغاز یقیناً جندل کے لیے خوشگوار ثابت ہوا تھا۔

وہ چند قدم ہی چلا تھا جب سامنے سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی تھی۔ سیاہ رنگ کی گاڑی۔ گاڑی کی رفتار معمولی تھی۔ تبھی جب گاڑی اس کے برابر سے گزر رہی تھی تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے اس شخص کی جھلک دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ گاڑی آرام سے اس کے برابر سے گزر گئی۔ اس کی نگاہوں نے دور تک گاڑی کا پیچھا کیا۔ جانے کیوں اس شخص کی جھلک اسے کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر خیام کی تصویر ابھری تھی۔ اس تصویر اور اس جھلک میں خاصی مشابہت تھی۔

☆☆☆

"گڈ مارننگ بابا۔" ڈائننگ روم میں داخل ہوتی ازابیلا نے ابراہم وارلڈ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مارننگ بیٹے۔" وارلڈ نے جواب دیتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا جو اب کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی۔

"السلام علیکم ماں۔" اس نے قانتہ کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" قانتہ نے بغور اس کے چہرے پر آئے تاثرات کو دیکھا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو وارلڈ سے ملتے ہوئے اس کے چہرے پر تھی اب غائب ہو چکی تھی۔

"آج آپ جلدی اٹھ گئے؟" اس نے اپنے لیے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہماری بیٹی کا یونیورسٹی میں پہلا دن ہے سوچا نیک دعائیں دے دیں۔" وارلڈ کے جواب پر اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"میں نے چھ سال اس یونیورسٹی میں گزارے ہیں بابا۔ فرق بس یہ ہے کہ اب ایک سال کے وقفے سے جا رہی

ہوں۔" اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔

"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کل جس کیس کے لیے گئی تھیں، اس کا کچھ پتہ چلا؟" وارلڈ کے سوال پر اس نے لب کاٹتے ہوئے اسے دیکھا پھر چائے کا کپ میز پر رکھا۔

"بابا مجھے وہاں سے۔۔۔"

"سر، خیام سر آئے ہیں۔" ایک ملازم نے اندر آکر اطلاع دی۔ ازابیلا کی بات بیچ میں ہی رہ گئی تھی۔ وارلڈ نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں جلدی تو نہیں ہے ازابیلا؟" اس نے جواباً نفی میں سر ہلایا تھا۔

"پھر آؤ تمہیں ایک متاثر کن انسان سے ملواتا ہوں۔" وہ کہہ کر جا چکا تھا۔ ازابیلا نے گہری سانس لی۔ قانتہ نے بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں ازا؟"

"کچھ نہیں۔ یہاں باتوں سے زیادہ ضروری کام ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر اب وہ رنگ نہیں تھے۔ قانتہ اس کے الفاظ پر غور کرتی گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆☆☆

"نیلے پانیوں اور رنگوں کے اس بہترین سنگم کو اپنی آنکھوں میں اترنے کے بعد دل میں اترنے سے روک نہیں پایا میں۔ اور نتیجتاً یہ بطور تحفہ آپ کے پاس لے کر حاضر ہوا ہوں۔" آواز کافی سنجیدہ اور مرعوب کر دینے والی تھی۔ ازابیلا ایک لمحے کے لیے رکی پھر مہمان خانے میں چلی آئی۔ ایک صوفے پر وارلڈ بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے شیشے کی میز پر کسی مصور کا شاہکار رکھا تھا۔ اور مہمان، اپنی طرف اس کی پشت ہونے کے باعث وہ اسے دیکھ نہ سکی تھی۔

"میں تمہاری پسند کو داد دیتا ہوں خیام! یہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔" وارلڈ مسکرایا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ازابیلا پر ٹکی۔

"آؤ ازابیلا۔ میرے مہمان سے ملو۔ یہ ہے خیام حنفی! میری کمپنی کا مینیجر۔ کچھ ہی دن ہوئے ہیں یہ یہاں کمپنی کی مین برانچ میں آیا ہے۔ پہلے یہ دوسری برانچ میں کام کرتا تھا۔" اس نے ذرا توقف کیا پھر گویا ہوا۔ "خیام یہ میری بیٹی، ازابیلا وارلڈ۔" وارلڈ نے دونوں کا تعارف کروایا تھا۔ خیام اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا یہ اٹھنا دونوں باپ بیٹی نے محسوس کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس کے نام سے ازابیلا کو اندازہ ہوا تھا کہ اسے خیام کو سلام کرنا چاہیے اور یقیناً یہ بات خیام کے لیے حیران کن تھی۔

"وعلیکم السلام۔" ازابیلا کی نگاہ میز پر رکھی اس پینٹنگ پر ٹکی تھی۔

دلکش مناظر! ڈوبتا بحری جہاز، اٹھتی موجیں، لہروں کا تلاطم، کڑکتی بجلی اور گہرا سیاہ آسمان۔

"خوبصورت! یہ واقعی دل موہ لینے والا شاہکار ہے۔" خیام نے سر کو خم دیا تھا۔

"یہ بندہ خود بھی قابلِ تعریف ہے ازابیلا!" وارلڈ کی بات پر وہ مسکرائی۔

"بابا کو متاثر کرنا بہت مشکل کام ہے، میرے لیے یہ ناممکن بن چکا ہے۔ آپ کے لیے میں بہت حیران ہوں۔"

"ناممکن کو ممکن بنتے دیر نہیں لگتی اگر ارادے ٹھوس ہوں!" وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

"بابا مجھے دیر ہو رہی ہے اب اجازت چاہوں گی۔" وارلڈ نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ وہ اب خیام کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بعض ناممکن اتنے ٹھوس ہوتے ہیں کہ پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اللہ حافظ۔" وہ جا چکی تھی۔ کمرے سے نکلتے ہوئے جانے کیوں اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ جانے کیوں؟!

☆☆☆

”میں جان لے لوں گی اس ضرار کی احمد!“ کمرے میں ٹہلتی حرم غرائی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کے سادہ سے لباس میں موجود شانوں پر دوپٹہ ٹکائے لمبے سیاہ بال چٹیا میں باندھ کر دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر پچھلے آدھے گھنٹے سے کمرے میں ٹہلتی وہ غصے سے لال ہو چکی تھی۔ بیڈ پر بیٹھے احمد نے بغور اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے موبائل سائیڈ پر رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”تم اسے سمجھنے کی کوشش تو کرو یار حرم! وہ بچہ نہیں ہے اپنا اچھا برا سب جانتا ہے۔“ احمد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی جو اس کی امیدوں پر پورا اترتے ہوئے ناکام ٹھہری تھی۔

”وہ جوان ہے، دماغ گھوما ہوا ہے اس کا۔ میں اسے ان چکروں میں نہیں پڑنے دے سکتی۔ کسی صورت نہیں۔ آخر تُک کیا ہے اس سب کی؟!“ احمد نے تھکی تھکی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”حرم! وہ جو کر رہا ہے غلط نہیں کر رہا۔ وہ جوان ہے اور اپنی جوانی کا صحیح استعمال کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا، اگر میری تم سے شادی نہ ہوتی تو یقیناً میں بھی اسی راہ کا راہی ہوتا۔ ہر وہ جوان جس کی غیرت جوش مارتی ہے اسی راہ کا راہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گلے میں غلامی کا طوق اور ہاتھوں میں چوڑیاں پسند نہیں کرتے حرم!“ حرم نے رک کر سخت نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

”تم اس کی طرفداری مت کرو احمد!!“ وہ جھلا کر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ”یہ لڑکا کسی دن مرے گا میرے ہاتھوں یقیناً! وہاں سعاد جندل کی وجہ سے پریشان ہے۔ میرے ساتھ تو پھر بھی تم ہو لیکن وہ تو اکیلی ہے بالکل۔ آخر یہ لڑکے چاہتے کیا ہیں؟!“ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرایا تھا۔ احمد نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

”ایک قوم کے گناہوں کا کفارہ اگر چند نوجوان ادا کر سکتے ہیں، تو بس اسی کوشش میں سرگرداں ہیں ہم آپی!“ حرم

نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ، ضرار ابنِ ولید!

”آپ کو اور سعاد آپی کو ہم پر فخر ہونا چاہیے۔ ان کے بھائی اس قوم کی بیٹیوں کے محافظ بن کر کھڑے ہیں۔ دینِ اسلام کے لیے دشمنانِ اسلام کے آگے پہاڑ بن کر کھڑے ہیں، جسے گرانا اپنی جان سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ میں صرف آپ کا بھائی نہیں ہوں آپی! میں اس باپ کا بیٹا ہوں جو اس ملک کی سرحدوں پر مارا گیا تھا، مجھے اس ماں نے لوری دی ہے جس نے اپنے شوہر کی حفاظت کے لیے اپنی شاہ رگ کٹوائی تھی۔ میں اس زمین کا مکین ہوں جو خون مانگتی ہے، میں اس دین کا پیروکار ہوں جو صبر کے ساتھ قربانی مانگتا ہے۔ میں ضرار ہوں آپی! میرے باپ نے جس عظیم شخصیت کے نام پر میرا نام رکھا تھا آپ اس کی بہادر بہن جیسی بن جائیں ناں۔ اس نقاب پوش کی طرح جس نے اپنے بھائی کی تلاش میں دشمن کی صفوں کو چیر ڈالا تھا۔ میں ضرار بنتا ہوں، آپ خولہ بن جائیں۔“

اس کی آواز میں نمی کا ہلکا سا تاثر گھلا تھا۔ لبوں پر اداسی سے بھری تبسم تھی اور آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔ حرم تیزی سے آگے بڑھی تھی اور اسے خود سے لگایا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو ضرار محسوس کر رہا تھا۔ اس نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے بیڈ پر بیٹھے احمد کو دیکھا۔ احمد نے مسکراتے ہوئے اسے اپنا انگوٹھا دکھایا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”تم ٹھیک ہو ناں؟ درد تو نہیں ہو رہا یہاں؟“ وہ آنکھ کے قریب اس کا زخم دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ضرار نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”مانا کہ آپ مکے مارنے میں خاصی مہارت رکھتی ہیں اور عرصہ دراز سے اپنے شوہر نامدار پر آزماتی آ رہی ہیں، لیکن اس سب کے باوجود آپ کے یہ مکے میری ہڈیاں کبھی نہیں توڑ پائیں گے۔ بہت سخت جان ہوں میں!“ اس نے فخر سے کالر جھاڑے تھے۔ حرم سر جھکا کر ہنس دی تھی اور اسی ہنسی کے دوران اس نے ایک زوردار مکا ضرار کے ناک

پر جڑ دیا تھا۔

”اوئی اللہ جی!! یار آپی ناک کا مذاق نہیں ہوتا ہاں۔“ وہ اپنی ناک کو پکڑ کر چلاتا صوفے پر بیٹھا تھا۔

”تم نے غلط بندے کو چیلنج کیا تھا ضرار!“ احمد کی بات پر اسے واقعی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ مگر اب کیا فائدہ تھا ناک کی ہڈی تو تقریباً اپنی جگہ سے ہل چکی تھی ناں۔

☆☆☆

اس نے گزشتہ دن میرین سائنس کے اس کورس کی پہلی کلاس ہی نہیں لی تھی جس کی وجہ سے آج وہ خاصی جھنجھلاہٹ کا شکار تھی۔ تمام چیزیں تعارفی مراحل سے گزر چکی تھیں۔ سائنس میں اسے بالکل انٹرسٹ نہیں تھا، وہ زبردستی یہاں اس جماعت میں بٹھائی گئی تھی۔ آج لیکچر دینے والے پروفیسر سمندر کی گہرائی، تہیں، چٹانیں اور پتہ نہیں کیا کیا پڑھا رہے تھے۔ وہ ہونقوں کی طرح کبھی پروجیکٹر پر نظر آتی سلائیڈس کو دیکھ رہی تھی کبھی مسلسل بنا رکے بولتے پروفیسر کو۔ وہ کچھ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟!

کلاس ختم ہوتے ہی وہ اپنی چیزیں سمیٹتی کھڑی ہوئی تھی۔ لانگ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے گاڑی کی چابی برآمد کرنا چاہی تھی مگر چابی ندارد۔

وہ پورا بیگ چھان چکی تھی۔ کرسی کے آگے پیچھے دائیں بائیں وہ ہر جگہ دیکھ چکی تھی۔ اس نے چابی اپنے لانگ کوٹ کی جیب میں ہی ڈالی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا۔ مسلسل تلاش کے اس عمل سے وہ کوفت کا شکار ہو رہی تھی اور یہ کوفت رفتہ رفتہ غصے میں تبدیل ہو رہی تھی۔

”بائیں جانب، چوتھی قطار، نیلی جینز، دائیں پاکٹ!“ عقب سے آتی آواز پر اس نے کہنے والے کو دیکھنے کے بجائے الفاظ پر غور کرتے ہوئے بائیں جانب نگاہیں دوڑائیں اور پھر تیزی سے اس طرف بڑھتی چوتھی قطار پر نیلی جینز اور

سفید ٹی شرٹ میں ملبوس اس لڑکے کے سر پر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ لڑکا آج صبح یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اندھوں کی طرح اس سے ٹکرایا تھا۔ وہ پہلے ہی اسے کچا چبانے کو تیار تھی اور اب اس کی یہ حرکت اسے اس لڑکے کو سالم نگلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"میری چابی؟" آواز میں غصے کا عنصر شامل تھا۔

"کونسی۔۔۔" اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک زناٹے دار تھپڑ اس لڑکے کو رسید کر چکی تھی۔ پوری جماعت میں ایکدم خاموشی چھاگئی تھی۔ سب کی نگاہوں کا مرکز ازابیلا اور غصے سے لال پیلا ہوتا وہ لڑکا تھا۔

"کیا بات ہے ازابیلا؟" اس کی کلاس کے سی آر نے پوچھا تھا۔

"اس کی دائیں پاکٹ میں میری گاڑی کی چابی ہے لیکن یہ نالائق ماننے سے انکاری ہے۔" اس کی بات سن کر سی آر آگے بڑھا اور اس لڑکے کو کھڑا کیا۔ اگلے ہی لمحے چابی برآمد ہو چکی تھی۔

"آئی ایم سوری میں بس مذاق۔۔۔" وہ لڑکا منمنایا تھا۔

"تم نے اس اخلاق سے گرے ہوئے مذاق کے لیے غلط جگہ اور غلط انسان کا انتخاب کیا مسٹر مائک!" وہ اسے سنا کر مڑ گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ باہر آئی تھی۔

اور اب جو سوال اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا وہ یہ تھا کہ "وہ آواز کس کی تھی؟"

یونہی سوچوں میں گم راہداری میں چلتے ہوئے اسے اچانک ٹھوکر لگی تھی۔ وہ لڑکھڑائی تھی۔ نگاہ فرش پر گری قلم کی نوک پر ٹکی تھی۔ وہ تیزی سے نیچے بیٹھی اور وہ نوک اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تبھی طلباء کا ہجوم آیا تھا۔ کسی نے قلم کی اس نوک کو ٹھوکر ماری تھی، وہ لڑکھڑاتی ہوئی ایک اور طالب علم کے قدموں سے ٹکرائی۔ ازابیلا فوراً کھڑی

ہوئی۔

اور تبھی اس نے پایا کہ، طلباء کے اسے جمِ غفیر میں وہ قلم کی اس نوک کو کھو چکی تھی۔

☆☆☆

”اِزا بیٹے اتنے غصے میں کہاں جا رہی ہو؟“ اپنے کمرے سے نکلتی قانتہ نے اسے غصے سے سیڑھیاں پھلانگتے دیکھ کر پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

”ماں میں اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی!“ وہ یہ کہنا چاہتی تھی لیکن بمشکل اپنے الفاظ دباتی ہوئی وہ ہونٹ بھینچے نیچے آئی۔

”کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو؟ آج کا دن اچھا نہیں گزرا کیا؟“ قانتہ نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے تھے۔

”ماں! کیا میں آپ کو یہ نہ بتاؤں کہ مجھے لگتا ہے میری زندگی ہی اچھی نہیں گزر رہی۔ ایک روبوٹ کی طرح بن چکی ہوں میں۔ میں یہ سب کبھی محسوس نہ کرتی لیکن یقین کریں میں اسے اب بہت زیادہ محسوس کرنے لگی ہوں بہت زیادہ!“ وہ سر ہاتھوں میں دیے صوفے پر بیٹھی تھی۔ قانتہ نے ترس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”انسان کی زندگی جب بے مقصد ہو تو یہ احساسات کسی گِدھ کی طرح اس کی رُوح کو نوچتے ہیں ازا!“ وہ اپنی ماں کو روکنا چاہتی تھی۔ وہ اسے کہنا چاہتی تھی کہ اس وقت وہ یہ سب نہیں سن سکتی، براہِ مہربانی۔

”تم مان کیوں نہیں لیتیں ازا کہ تم حقیقت جان چکی ہو؟ تمہیں تاریک رات میں روشنی نظر آچکی ہے، بھلے ایک ذرا سی جھلک ہی۔“ وہ اسے نہیں روک پائی تھی، ہمیشہ کی طرح۔ ”تم حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں ازا؟! ہر چیز تمہارے سامنے ہے۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں نہیں جانتی تم پچھلے کئی دنوں سے ٹھیک سے سوئی نہیں ہو؟ تم اپنی اس زبردستی کی مسکراہٹ سے اپنے باپ کو دھوکے میں ڈال سکتی ہو مگر مجھے نہیں ازا! تم راتوں کو ڈر کر اٹھ جاتی ہو،

تمہیں مندر کی گھنٹیاں بے چین کرتی ہیں۔ تم مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتی ہو۔ عرصہ ہوا تم اپنے باپ کے ساتھ سیناگوگ (یہود کی عبادت گاہ) نہیں گئیں۔ کیوں ازا کیوں؟! مذہب کا وہ دائرہ جو تمہارے گرد بنا ہوا ہے اسے توڑ کر روشنی کو کیوں نہیں تھام لیتیں؟ تم مذہب کو چھوڑ کر ''دین'' کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ ازا ہر چیز واضح ہے۔ کسی کھلی کتاب کی مانند سب تمہارے سامنے ہے۔ فیصلہ تو کرو''!

وہ خاموش ہوئی تھی اور یہیں ازابیلا کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وارلڈ جتنا اس سے مذہب کے موضوع پر بحث کرنے سے احتیاط برتا کرتا تھا، قانتہ اتنا ہی مذہب کے موضوع پر اس سے بحث کرتی تھی۔ اور یہی بات اس کے اور قانتہ کے درمیان کبھی نہ گرنے والی دیوار کھڑی کر چکی تھی۔ عرصہ ہوا تھا، اس نے اس دیوار کو گرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ آہستہ سے صوفے سے اٹھی تھی۔ نگاہ اٹھا کر قانتہ کو دیکھا تھا۔

''کاش بابا یہودیت پر ایمان نہ لاتے، کاش آپ مسلمان نہ ہوتیں۔ کاش میں تھائیلینڈ میں نہ ہوتی یہاں کے لوگ بدھ مت کے پیروکار نہ ہوتے۔ مذہب کا یہ دائرہ میرے گرد نہ ہوتا ماں! میرا باپ، میری ماں، میرے ہم وطن سب ایک ہوتے۔ ایک ہی مقصد کے لیے جینے والے۔ گر ایسا ہوتا تو میرے فیصلے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مگر یہ سب کاش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ نماز بھی پڑھی ہے اور بابا کے ساتھ سیناگوگ بھی گئی ہوں۔ مندر کا گھنٹہ بجنے کا انتظار بھی کیا ہے میں نے۔ عقل آئی تو خود کو ہر چیز سے پیچھے ہٹتے پایا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ماں! اب جو قدم بھی اٹھاوں گی، اس پر ڈٹ جاوں گی۔ اس قدم اٹھانے میں صدیاں بھی لگ جائیں تو پروا نہیں۔ زیاد کے پاس جا رہی ہوں، انتظار مت کیجیے گا۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے ان کے دائیں طرف سے نکل کر چلی گئی تھی۔ اور قانتہ، وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو چکی تھی۔

☆☆☆

”تم مان کیوں نہیں لیتیں ازا کہ تم حقیقت جان چکی ہو؟ تمہیں تاریک رات میں روشنی نظر آچکی ہے، بھلے ایک ذرا سی جھلک ہی۔“

”مذہب کا وہ دائرہ جو تمہارے گرد بنا ہوا ہے اسے توڑ کر روشنی کو کیوں نہیں تھام لیتیں؟ تم مذہب کو چھوڑ کر ”دین“ کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ ازا ہر چیز واضح ہے۔ کسی کھلی کتاب کی مانند سب تمہارے سامنے ہے۔ فیصلہ تو کرو“!

اس نے مسلسل سماعت سے ٹکراتی آوازوں سے تنگ آکر اسٹیئرنگ پر زور سے ہاتھ مارا تھا۔ اس کی گاڑی بہت تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ غصہ، بے چینی، بے بسی ہر طرح کے احساسات لمحہ لمحہ اسے دین و دنیا کی اس جنگ میں بہت پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے سنگ جنگ کی نوعیت بڑھ رہی تھی۔

اور جانتے ہیں کیا؟ بظاہر ایک بہت پرسکون انسان بیک وقت بہت سی جنگیں لڑ رہا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ تب پتہ چلتا ہے جب ہم کسی کھلی کتاب کی طرح اس انسان کو پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ جیسے ازابیلا کو۔

اس کی گاڑی کئی جگہ ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اور بالآخر وہ اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ بینکاک کی یہ عالیشان لائبریری، اس کی عارضی منزل۔

وہ تیزی سے گاڑی لاک کرتی لائبریری کی طرف بڑھی تھی۔ اندر ایک الگ ہی دنیا تھی، کتابوں کی دنیا۔ خاموشی میں بولتی کتابیں ہر طرف موجود تھیں۔ لائبریری میں حسب معمول سکوت چھایا ہوا تھا۔ وہ ایک نگاہ ارد گرد ڈالتی اس مخصوص بلاک کی طرف بڑھی تھی جہاں اسے زیاد مل سکتا تھا۔ کمپیوٹر کے آگے بیٹھے کام میں مصروف لوگوں نے اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی البتہ آخری کونے پر بیٹھے اس لڑکے نے اسے اپنے سامنے بیٹھتا دیکھ کر سر اٹھا

کر اسے دیکھا تھا۔

"شام بخیر ازا۔" الفاظ اردو میں ادا کیے گئے تھے۔ آواز میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ نرمی بھی تھی۔ سیاہ رنگ کی پی کیپ سر پر ٹکائے جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتا وہ لڑکا زیاد تھا، اس کا ماموں زاد۔

"شام بخیر!" اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر اپنا سر کرسی پر ٹکایا تھا۔ زیاد چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے گویا ہوا۔

"پریشان ہو؟"

"تمہیں کیسے پتہ؟" وہ دونوں حسب معمول اردو میں گفت و شنید کر رہے تھے۔

"تم مسلسل پہلو بدل رہی ہو، تمہاری نگاہوں کا مرکز ایک ہی نقطہ ہے۔" ازابیلا نے گہری سانس لی تھی۔

"بابا نے مجھے میرین سائنس کا کورس کرنے کا کہا ہے۔ پہلی کلاس ہی مِس ہو گئی۔ آج کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ منحوس مائک سے ٹکر ہو گئی، اسی منحوس کی منحوس حرکت پر اسے تھپڑ جڑ دیا۔ اور گھر آتے ہی ماں کے ساتھ الجھ پڑی۔ میرے ستارے گردش میں ہیں زیاد!" زیاد نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

"واہ! تم تو علم نجوم پر بھی یقین کرنے لگیں۔ غالباً ستاروں کو خدا مانتے ہوئے ان پر ایمان لانے والی ہو۔" ازابیلا نے اسے زبردست گھوری سے نوازا تھا۔

"مذاق مت کرو!" اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"اچھا، نہیں کرتا۔ بتاؤ کیا چاہتی ہو؟" وہ ایکدم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ازابیلا بھی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"خدا اپنے بندوں کو "ایک" کیوں نہیں کرتا زیاد؟" اس کے لہجے میں برسوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ زیاد نے بغور اسے دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے ازابیلا کو اشارہ کیا تھا۔ وہ جواباً اس

کے ہمراہ لائبریری سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ”تمہاری امی مسلمان ہیں، تمہارے بابا مسلمان تھے تبھی تم بھی مسلمان ہو۔ تمہارے لیے مذہب ایک امتحان نہیں بنا زیاد تمہیں یہ خود نہیں چننا پڑا۔ تمہیں حقیقت تلاش نہیں کرنی پڑی۔ مجھے اس امتحان میں کیوں ڈالا گیا ہے؟ میں نے اپنی زندگی کے سترہ سال بنا کسی مقصد کے صرف کیے ہیں۔ اب نہیں کر سکتی ناں! یہ ممکن تھا ناں کہ میری ماں بھی یہودی ہوتی یا میرا باپ بھی مسلمان ہوتا۔ خدا یہ کر سکتا تھا اس نے کیوں نہیں کیا؟!“ وہ دونوں اب لائبریری سے باہر سیڑھیوں کے پاس کھڑے تھے۔ شام کے سائے ہر سو پھیل چکے تھے۔ ان کے سامنے لمبی کشادہ سڑک تھی جس کے دائیں بائیں اونچے درخت لگے تھے۔ لوگوں کی چہل پہل جاری و ساری تھی۔

”مذہب ماں باپ سے وراثت میں نہیں ملتا ازا! مذہب انسان خود چنتا ہے۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ مذہب تو ان کا بھی ہے جن کے ماں باپ نہیں ہوتے۔ کچرے کے ڈھیر میں ملے بچے، یتیم خانوں میں پلتے بچے۔ ازا مذہب سب کا ہوتا ہے۔ انسان کو چناؤ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے انٹرمیڈیٹ کے بعد ہر طالب علم کے پاس اختیار ہوتا کہ وہ کسی بھی شعبے کا چناؤ کرے۔ منحصر طالب علم پر ہے، وہ کیا سوچ کر کس کا چناؤ کرتا ہے؟ میں اپنے اسلاف کے دین پر مطمئن ہوں، میں نے اسے ہی سینے سے لگایا ہے۔ قانتہ پھوپھو نے بھی یہی کیا ہے اور وارلڈ انکل نے بھی۔ تمہارے اردگرد موجود یہ لوگ بھی اپنے مذہب کو سچا مانتے ہوئے اسی کے پیروکار ہیں۔ ان سب کے بعد اب تمہاری باری ہے ازا! تم اپنے لیے کس کا چناؤ کرتی ہو؟ سچ یہ ہے کہ حقیقت وہ نہیں جو دوسرے تمہیں بتائیں گے، حقیقت وہ ہے جسے تم خود تسلیم کرو گی۔ تم یہودیت چنو گی، تمہیں یہود سچے لگیں گے۔ تم عیسائیت کا چناؤ کرو گی تمہیں عیسائیت حقیقت لگے گی۔ تم اسلام کے سچے ہونے پر ایمان لاؤ گی، تم جان دے دو گی لیکن اپنی بات کو جھٹلاؤ گی نہیں۔ فیصلہ تمہارا ہے ازا صرف تمہارا“!

اس نے گردن ترچھی کیے ازابیلا کو دیکھا تھا جو پر سوچ نگاہوں سے کشادہ سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں کے وقفے سے انتظار ختم ہوا وہ بول اٹھی تھی۔

"اگر میں اسلام قبول کرلوں تو؟!" زیاد نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ کہہ نہ سکا تھا اور جب اس نے کچھ کہا تھا تو وہ حیران کر دینے والا تھا، "تم اپنی راہ کے پھولوں کو ہٹا کر ان کی جگہ کانٹے بچھاؤ گی ازا!" وہ اس کی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔ اسے تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے تھا اور وہ بجائے خوش ہونے کے اسے تنبیہہ کر رہا تھا، عجیب۔

"کیسے؟"

"شاید تم بہت جلد یہ بات سمجھ جاؤ لیکن سرِ دست تم اسے نہیں سمجھ پاؤ گی۔" ازابیلا نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر پھر وہ رک گئی تھی۔ دونوں چند لمحے خاموش رہے۔ اور اسی خاموشی کے دوران اچانک شور اٹھا تھا۔ ایک گاڑی قابو سے باہر ہوتی سامنے سے آرہی تھی۔ لوگ چلاتے ہوئے گاڑی کے راستے سے ہٹ رہے تھے۔ گاڑی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی اور صرف ایک منٹ بعد وہ زوردار دھماکہ ہوا تھا۔ لوگوں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ وہ گاڑی پوری قوت سے دوسری گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ زیاد اور ازابیلا نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری گاڑی ہے ناں؟" ازابیلا نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ لوگ ڈرائیور کو گالیاں دیتے تباہ شدہ گاڑی کے اندر جھانک رہے تھے۔ وہ دونوں وہیں کھڑے رہے تھے۔ ایمبولینس آگئی تھی۔ ڈرائیور کو اسٹریچر پر ڈالا گیا تھا اور تب ازابیلا کو بری طرح سے جھٹکا لگا تھا۔

"زیاد یہ مائک ہے جسے میں نے تھپڑ مارا تھا!" وہ جانے کیوں چلا اٹھی تھی۔ "زیاد زیاد کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے وہاں سے قلم کی نوک ملی تھی اور اس کے بعد سب بدلنے لگا ہے۔ وہ نوک یونیورسٹی میں بھی ملی اور یہ ایکسیڈنٹ۔ زیاد کچھ

بہت غلط ہونے جا رہا ہے میرا یقین کرو۔" وہ شدید بوکھلاہٹ کا شکار ہوئی تھی۔ زیاد چند پل اسے دیکھتا رہا پھر اسے بازو سے پکڑ تا ساتھ لے جانے لگا۔ پارکنگ ایریا میں کھڑی گاڑیوں سے گزر کر وہ اپنی گاڑی کے پاس آیا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا۔

"مجھے ہر بات تفصیل سے بتاؤ ازا!" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"کل میں میکس کی جائے قتل پر گئی تھی۔ وہاں مجھے خون کے ایک قطرے کے ساتھ قلم کی نوک ملی۔ یونیورسٹی میں جب مائک نے میری گاڑی کی چابی چھپائی تو ایک آواز آئی جس سے مجھے پتہ چلا کہ چابی اس کے پاس تھی۔ جتنی دیر میں میں نے چابی لی کہنے والا جا چکا تھا۔ میں کلاس سے باہر نکلی تو مجھے ٹھوکر لگی اور پھر مجھے ویسی ہی قلم کی نوک ملی۔ جانتی ہوں یہ معمولی ہے لیکن اگر یہ معمول کے حالات میں ہوتا تو یہ معمولی ہوتا۔ میکس کے قتل کا اس سے کوئی نہ کوئی جوڑ ہے۔ اور پھر یہ مائک، میں نے سب کے سامنے اسے تھپڑ مارا تھا۔ یہ اسٹیون بار بارا کا چھوٹا بیٹا ہے، نہ تو اس کا دماغ گھوما تھا نہ اسے خودکشی کا شوق تھا۔ یقیناً اس میں کوئی دوسرا ہے جس نے یہ ایکسیڈینٹ کروایا ہے۔ کوئی ہے جو اس سب پر نظر رکھے ہوئے ہے زیاد! میں نے ایسے کئی کیسز دیکھے ہیں لیکن جانے کیوں اب گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔" وہ بے بس ہوئی تھی۔ زیاد نے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔

"انکل کو بتایا تم نے؟"

"میں انہیں بتانے لگی تھی مگر پھر خیام نامی ان کا کمپنی مینیجر آ گیا تو بات۔۔۔"

"خیام؟" زیاد چونکا تھا۔

"خیام۔۔۔ حنفی۔" ازابیلا نے اسے پورا نام بتایا۔

"ازا! میری بات دھیان سے سنو۔ اس شخص سے دور رہو۔ وہ بہت خطرناک ہے، کوئی بعید نہیں کہ اس سب کے

پیچھے بھی وہی ہو۔" ازابیلا نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"تم اسے جانتے ہو؟"

"میرا پرانا دشمن ہے وہ! ایک بہت ہی چالاک شخص جو ہر بار مختلف پہلوؤں سے وار کرتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں؟"

ازابیلا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ کچھ کہنے لگی تھی جب اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا موبائل نکال کر کان سے لگایا اور آگے جو کچھ اسے سننے کو ملا تھا وہ اس کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔

☆☆☆

وہ دھیرے سے لاک میں چابی گھما کر دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئی تھی۔ ہلکے سرمئی رنگ کے گاؤن پر سیاہ اسکارف سے نقاب کیے وہ اپنا ہینڈ بیگ میز پر رکھتی صوفے پر بیٹھنے لگی تھی جب اس نے کھڑکی کے پاس کسی کو کھڑا پایا۔

"تمہارے گھر کے باہر لگے پودے بڑے ہو گئے ہیں سعاد!" ایک بھاری گھمبیر آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"کوئی بعید نہیں کہ کل انہیں بھی جدا کر دیا جائے۔" اس کے لہجے میں طنز کا عنصر گھل چکا تھا۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس وہ شخص مڑا تھا۔ کشادہ پیشانی، تیکھے نقوش اور چہرے کی تمکنت میں اضافہ کرتی داڑھی اس کی شخصیت کو پر جلال بنا رہی تھیں۔

"وہ نہیں آئے؟"

"نہیں۔"

"میرے بھائیوں کو مجھ سے جدا کرنے کے بعد شاید ہی وہ کبھی میرا سامنا کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔"

”ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے بعد شاید ہی تم خود سے سامنا کرنے کا حوصلہ کر سکو سعاد!“ طنز کے وہ تیر اسے بری طرح زخمی کر گئے تھے۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکی تھی۔

”تمہارے بھائی تم سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ آج بھی تمہاری ایک پکار پر سب چھوڑ کر تمہارے پاس آئیں گے۔ بشرطیکہ سعاد! تم انہیں ان کے فرض سے غافل نہ ہونے دو۔ کیا تم وہ بہن نہیں بن سکتیں جو اپنے بھائیوں کو تھپکی دے کر سلانے کے بجائے ان کی غیرت کو جگانا جانتی ہیں؟ اور وہ جو اپنے بھائیوں کے وہ چہرے دیکھنا پسند کرتی ہیں جو وقت کی گرد و غبار سے اٹے ہوں اور ہاتھ خراش زدہ ہوں اور لباس خون آلود ہو؟ کیا تم دخترِ اسلام نہیں بن سکتیں سعاد؟ تم کیسے اپنے لیے اپنی تمام بہنوں کی عزتوں کا سودا کرنا چاہتی ہو؟ تم کیسے اپنے بھائیوں کی غیرت کو سلا کر فلسطین کی ماؤں کی عزتوں کو لٹتا دیکھنا پسند کر سکتی ہو؟ تم کیسے دخترانِ اسلام کے سروں پر چادر ڈالنے کے بجائے ان کی چادریں نوچ سکتی ہو؟ کیسے سعاد کیسے؟“!

اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ نقاب سے جھانکتی بھوری آنکھوں میں پگھلتی نمی اپنا راستہ بنانے کی تگ و دو میں تھی۔

”ایسا وقت نہ آنے دو کہ تمہارے بھائی تمہیں اپنی بہن کہنے پر شرمندہ ہوں!“ اور یہ آخری وار پوری طرح سے اس کی جان نکال چکا تھا۔ وہ کسی اونچے پہاڑ کی مانند گری تھی۔ پل بھر میں اس کی ذات ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

”خود کو سنبھالو سعاد! اپنے بھائیوں پر ماتم کرنے کے بجائے دخترِ اسلام بنو جو اپنے بھائیوں کی حفاظت کے لیے دشمن کی صفوں تک کو چیر دے۔ اگر یہ نہیں کر سکتیں تو کم از کم ان پر آنسو بہانے کے بجائے ان کی کامیابی کی دعا کرو!“ کہنے والا کہہ کر جا چکا تھا اور وہ اپنی جگہ پتھر کی ہو چکی تھی۔ اسے لگا تھا وہ ابھی یہیں ڈھیر ہو جائے گی۔ الفاظ سے کیے گئے وار اسے ختم کرنے میں کامیاب ٹھہرے تھے۔

اور جو کسر باقی تھی وہ سماعت سے ٹکراتے ان الفاظ نے پوری کر دی تھی:

”کبھی خود کو شام کی بیٹیوں کی جگہ رکھ کر سوچنا سعاد! یقین جانو جان نکلتی محسوس ہوتی ہے۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام کا یہ فرزند طویل عرصے بعد کبھی لوٹے تو تمہیں دخترِ اسلام کے روپ میں اپنے شانہ بشانہ کھڑا پائے؟“

☆☆☆

اپنی پوری رفتار سے دوڑتی سرمئی رنگ کی گاڑی کے اس اونچے فلیٹ کے سامنے رکتے ہی گاڑی کے دونوں طرف کے دروازے تیزی سے کھلے تھے۔ ازابیلا تیزی سے اندر کی جانب بڑھی تھی۔ زیاد بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

”گاڈ پلیز اسے کچھ نہ ہو گاڈ پلیز۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی لفٹ کے بٹن دبا رہی تھی۔ لفٹ کے کھلتے ہی وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔ زیاد کے اندر آتے ہی اس نے ایک ساتھ کئی بٹن دبائے۔ سرمئی رنگ کا لوہے کا دروازہ بند ہوا، لفٹ اوپر جانے لگی۔

”گاڈ ہیلپ می۔ پلیز سیف ہر پلیز پلیز۔“ وہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھوں کو رگڑتی سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ زیاد نے بغور اسے دیکھا تھا۔ سر اونچا کیے آنکھیں بند کیے خدا سے درخواست کرتی وہ لڑکی اسے تھوڑی عجیب لگی تھی۔ ایک طرف وہ خدا کو ماننے سے انکار نہیں کرتی تھی لیکن دوسری طرف وہ کسی ایک خدا کو بھی نہیں مانتی تھی۔ ہر مشکل گھڑی میں وہ نجانے پھر کس خدا سے مانگا کرتی تھی؟ کس امید سے مانگا کرتی تھی؟!

لفٹ کا دروازہ کھلنے پر زیاد سوچوں کو جھٹکتا ازابیلا کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ مہرون رنگ کے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ ازابیلا نے دروازہ بجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا مگر دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا□۔

”نو نو پلیز!“ وہ بوکھلا کر اندر آئی تھی۔ لاونج میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رکی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت

ہوئی تھیں۔ چہرے پر یکے بعد دیگرے کئی رنگ آجا رہے تھے۔ بکھرا ہوا سامان، شیشے کی ٹوٹی ہوئی میز، الٹ دیے گئے صوفے، کھڑکیوں سے نوچے گئے پردے، غرض پورا گھر الٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ بے سدھ سی نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ٹانگوں میں جیسے جان نہ رہی تھی۔

"ازا!" زیاد ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔

"وہ اسے مار دے گا زیاد! وہ ظالم وحشی انسان ایملی کو مار دے گا۔" اس کی کتھئی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ زیاد نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ "وہ اپنی جان بچا کر یہاں آئی تھی۔ اس کی ماں کے بعد اس کا سوتیلا باپ اس کے خون کا پیاسا تھا۔ وہ جنگلی یہاں بھی پہنچ گیا۔ میں اسے اب کیسے بچاؤں گی؟!" اس نے سر اٹھا کر زیاد کو دیکھا تھا۔

"ہم اسے ڈھونڈ لیں گے ازا! ہم ڈھونڈ لیں گے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ کھوکھلی تسلی۔ اس بڑے ملک میں، اس بھری دنیا میں وہ ایک یتیم لڑکی کو کیسے ڈھونڈ سکتے تھے؟!

ایملی اس کی ایک "اچھی" دوست نہیں تھی۔ وہ اسے سمجھ نہیں سکتی تھی لیکن ہاں یہ بات بھی حقیقت تھی کہ وہ اس کی "واحد" دوست تھی۔ ایملی کے ماں باپ اس کے بچپن میں ہی علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی ماں کے پاس یو کے چلی گئی تھی جہاں اس کی ماں اس کے سوتیلے باپ کے ساتھ رہ رہی تھی، جسے باپ کہنا وہ باپ لفظ کی توہین سمجھتی تھی۔ اس شخص کے ہاتھوں اپنی ماں کا قتل ہوتے دیکھنے کے بعد وہ تھائیلینڈ آ گئی تھی۔ یہ تنہا اور بے سہارا لڑکی وارلڈ گلاس کمپنی میں ملازمت کے لیے آئی تھی جہاں اس کی ملاقات ازابیلا سے ہوئی تھی۔ سرسری سی اس ملاقات کے بعد بہت جلد انہوں نے دوستی کے مراحل طے کیے تھے۔ لیکن اب وہ واپس جا چکی تھی۔ اپنی ذات تک محدود رہنے والی ازابیلا، جس نے پہلی بار کسی سے دوستی کی تھی، ایک بار پھر تنہا ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"بدر سر بات سنیں۔" بچوں کے درمیان بیٹھ کر ایک بچے کی کاپی چیک کرتے بدر نے آنند کی آواز پر سر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ چور ہیں ؟!" بدر نے دائیں ابرو اٹھا کر سنجیدگی سے اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں، پچھلے ہفتے ورلڈ بینک پر ڈاکہ میں نے ڈالا تھا اور یہی نہیں بلکہ میں ایک اسمگلر بھی ہوں۔ دنیا میں ایک بڑی تعداد میں اسمگلنگ میرے انڈر ہوتی ہے اور میں دہشت گرد بھی ہوں، نائن الیون والا سانحہ میری سرپرستی میں ہوا تھا۔" آنند نے ہونقوں کی طرح اسے دیکھ کر ایک نگاہ صوفے پر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھے جندل پر ڈالی جو بدر کی بکواس پر اپنے کانوں میں ہینڈ فری ٹھونس چکا تھا، اور پھر وہ واپس بدر کی طرف متوجہ ہوا۔

"کونراڈ کہہ رہا تھا کہ جیم سر نے کہا ہے کہ بدر سر کی شاگردی میں رہنے والے تمام بچے صرف اس وجہ سے اپنی جماعت میں سب سے زیادہ نمبر لے جاتے ہیں کیونکہ بدر سر پیپر سے ایک دن پہلے رات کے وقت پرنسپل کی آفس کی دیوار پھلانگ کر جاتے ہیں اور پیپر کاپی کر کے آجاتے ہیں۔" آنند نے اسے تفصیل بتائی۔

"جیم اپنے پیسوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور اس سے پہلے کہ میں بھی کھو بیٹھوں تم انسان کے بچے بن کر پڑھو اپنا۔" بدر نے اسے گھورا تھا۔ آنند منہ بناتا واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

بدر اپنے کام کی طرف واپس لوٹنے لگا تھا کہ کہیں سے بھاگ کر آتا روفی جھٹ اس کی گود میں آن بیٹھا تھا۔

"نالائق جانور! میں صبح والی بات پر غصے میں ہوں، اترو میری گود سے۔" اس نے روفی کو ٹہوکا دیا تھا۔ روفی نے واپس اس کی گود میں کھسکتے ہوئے معصومیت سے اسے دیکھا تھا۔

"میں نہیں مانوں گا!!" بچے اب بدر اور روفی کے "لاڈ" دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھے کھی کھی کر رہے تھے۔ روفی نے

اس کی بات پر ایکدم اس کی گود میں لوٹ پوٹ ہونا شروع کر دیا تھا۔ بدر نے دانت پیستے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی گود سے اتارا تھا۔

”جان لے لوں گا تمہاری“!

اور اگلے ہی لمحے روفی نے پوری قوت سے اس کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔ اب صورتحال کچھ ایسی تھی کہ روفی اس کے گلے میں بازو اٹکائے اس کی گردن سے جھول رہا تھا اور بدر مسلسل اسے جھٹکنے کی کوشش میں تھا۔ لیپ ٹاپ پر کام کرتے جندل نے ایک نگاہ ان دونوں نمونوں پر ڈالی پھر گہری سانس لیتا واپس اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

وہ ایک گیم تھی، عام سی گیم۔ بچوں کے کھیلنے کی۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے یہی گیم کھیل رہا تھا۔ پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیڈ کے پاس سائیڈ ٹیبل پر جلتے لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ کتھئی رنگ کی آنکھوں میں اب نیند کے ہلکے ہلکے تاثرات دکھائی دینے لگے تھے مگر اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ جس مقصد کے لیے گیم کھیل رہا تھا اس کے مکمل ہونے سے پہلے وہ یہاں سے اٹھنے والا نہیں تھا۔

گیم میں وہ اب کئی بندوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک لیپ ٹاپ کی اسکرین پر کوئی پیغام آیا تھا۔

”کیا ہم کھیل سکتے ہیں؟“ وہ مسکرایا۔ دھیرے سے، کھل کر۔

”خوش آمدید!“ جواب دینے کے بعد اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کا ساتھی اب اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اور تقریباً پانچ منٹ بعد اسے ایک اور پیغام موصول ہوا۔

”جیت کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟“

”بھیڑیوں کے جھنڈ میں جب لومڑ گھس آئیں تو یہ لفظ نا آشنا ہو جاتا ہے۔“

”اور ہار؟“

”بھیڑیے جب خود کو پہچان لیں تو لومڑ کے حصے میں ہار آتی ہے“!

”قدیم دیواریں کیا پیغام دیتی ہیں؟“

”لا غالب الا اللہ!“ وہ ایک بار پھر مسکرایا تھا۔ یقین دہانی ہو چکی تھی وہ دونوں اب اصل بات کی طرف آنے والے تھے۔

”اب تک کیا کر سکے ہو؟“ سوال پوچھا گیا تھا۔

”لڑکی کو الجھا چکا ہوں۔ شاید ہی اس معاملے کا کوئی سرا اس کے ہاتھ لگ سکے۔ تم بتاؤ؟“

”لڑکی سے مل چکا ہوں، جلد ہی اس کے لیے قابلِ بھروسہ بن جاوں گا۔ تیسرے آدمی کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں“!

”آ جائے گا وہ بھی سامنے۔ فی الحال اس لڑکی کو سنبھالو تم۔ اسے اتنا الجھا دو کہ یہ پیچھے ہٹ جائے“!

”کام تسلی بخش ہو گا۔“ مسکراتے ہوئے آخری پیغام لکھا گیا تھا۔

سیاہ روشنائی دھیرے دھیرے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ خاموش اور تاریک رات میں ٹمٹماتے تارے کچھ سمجھ نہ آنے پر الجھن کا شکار تھے، جیسے آپ!

☆☆☆

رات کے اس پہر جب پوری دنیا خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی تو سجدے میں گرا وہ وجود دھیرے دھیرے سسک رہا تھا۔ اس کی آہیں اور سسکیاں ہر سو چھائے سکوت میں دراڑ ڈال رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ زار و قطار رو رہی تھی۔ اپنے رب کے حضور رو رہی تھی۔

وہ گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ وہ گناہ جو بیشتر افراد روز کرتے تھے۔ وہ گناہ جو بہت معمولی سمجھے جاتے تھے مگر اس لڑکی نے اپنے چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو پہاڑ جتنا بھاری بنایا ہوا تھا۔ وہ روز ان گناہوں کی معافی مانگتی تھی مگر روز وہ ناکام ٹھہرتی تھی۔

اس کی ہر شب شبِ دو جیر اور ہر صبح تاریک صبح تھی۔ وہ ہر صبح مایوس ہو کر سجدے سے اٹھتی تھی اور ہر رات نئی امنگ کے سنگ سجدے میں گرتی تھی۔ وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے گناہوں کو دھونا چاہتی تھی۔ لیکن جانے کیوں، دل تھا کہ بے سکون ہی رہتا تھا؟!

اس کے گناہ بڑے نہیں تھے۔ لیکن اس کے لیے بڑے اور چھوٹے کا فرق ختم ہو چکا تھا۔ وہ ہر گناہ کو گناہ سمجھتی تھی۔ وہ، سعادیوسف زئی۔

☆☆☆

وقت کی دی گئی مہلت ختم ہوتے ہی سیاہ تاریک پردہ چیر دیا گیا تھا۔ اس تاریک پردے سے پھوٹتی روشنی ایک اور صبح کا پیغام لائی تھی۔ یہ صبح بھی ان ہزاروں صبح جیسی تھی جو تاریک راتوں کی تاریکی کو زندگی سے مٹانے میں ناکام ٹھہری تھیں۔

ناکام صبح، ناکام زندگی، ناکام لوگ۔

"محترمہ دھیان سے!" کسی کی تیز آواز پر وہ ایکدم چونک کر پیچھے ہٹی تھی۔ آج وہ یونیورسٹی کلاس سے تقریباً ایک

گھنٹہ پہلے آگئی تھی اور اب خیالوں میں گم ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ دماغ میں چھڑی جنگ میں اپنا دفاع کرتے ہوئے وہ بیگ شانے پر ٹکائے پر سوچ نظریں زمین پر گاڑے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کے پیچھے سے آواز آئی تھی۔ اگر وہ فوراً پیچھے نہ ہٹتی تو یقیناً اس اونچے ستون سے اپنا دفاع کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا۔

"دماغ میں چھڑی جنگ میں اپنا دفاع کرتے ہوئے آپ کو دنیا سے بے گانہ نہیں ہونا چاہیے۔" وہ پلکیں جھپکتی پلٹی تھی۔ اس کے مقابل کھڑا لڑکا چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ ازابیلا نے بغور اسے دیکھا تھا۔ اس کی کتھئی آنکھیں بہادری اور جرات کی آئینہ دار تھیں۔ چہرے پر چھائے تاثرات میں خود اعتمادی اور نرمی کے عناصر کا امتزاج ہو رہا تھا۔ ہلکے بادامی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس، بھورے رنگ کی شال شانوں پر ڈالے وہ اسے غیر ملکی لگا تھا۔

"آپ کا شکریہ۔ میرا دھیان نہیں تھا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ اس لڑکے نے اپنی گردن کو خم دیا تھا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ ازابیلا وارلڈ ہیں؟ کل جس بہادر لڑکی نے اس لڑکے کو تھپڑ مارا تھا؟!" وہ اپنے لیے بہادر کا لفظ سن کر مسکرائی تھی۔

"کسی کو تھپڑ مارنے والے بہادر ہوتے ہیں؟" وہ سوال کے بدلے سوال کر رہی تھی۔

"بالکل! اگر وہ جرات و بہادری کا پیکر بن کر اپنا دفاع کریں تو وہ بہادر کہلانے کا حق رکھتے ہیں"!

"آپ کی تعریف؟"

"کبھی کسی نے کی ہی نہیں!" اس لڑکے نے بے فکری سے کندھے اچکائے تھے۔ وہ مسکرائی تھی۔

"نام؟"

"جندل یوسف زئی"!

”تعلق کہاں سے ہے؟“

”منکر نکیر کے پڑوس میں رہتا ہوں۔“ ازابیلا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ جندل نے اس کا چونکنا محسوس کیا تھا۔

”افغانستان؟“ کچھ لمحوں پہلے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

”نہیں۔ پاکستان!“ اس نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

”شکریہ جندل! آپ سے مل کر اچھا لگا۔“ اس نے یہ الفاظ اردو میں ادا کیے تھے۔

”آپ کو اردو آتی ہے؟“

”نہیں! بس کچھ الفاظ۔ تھائلینڈ میں بہت سے پاکستانی آتے ہیں۔ بس انہی سے تھوڑی بہت سیکھی۔“ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

”میں مان ہی نہیں سکتا۔ آپ نے جندل کہا ہے، جبکہ یہاں کے لوگ مجھے زبردستی ”جوندول“ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر کسی زبان کے کچھ الفاظ سیکھنے سے لہجہ بھی اسی زبان کے لحاظ سے ڈھل جاتا تو اب تک میں سندھی میں ”ڈیڈر“ بولنا سیکھ چکا ہوتا۔“ ازابیلا نے چہرہ موڑ کر اپنی ہنسی روکنا چاہی تھی۔

”اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی بات ٹھیک ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نالائق ہیں مسٹر جندل! میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ کا ایک بار پھر شکریہ۔ فی امان اللہ۔“ وہ تیزی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ لبوں پر اب بھی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ راہداری میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

”حرم حرم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو یار۔“ سعاد حرم کی مسلسل ضد سے جھنجھلائی تھی۔ وہ دونوں اس وقت حرم کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ دیواریں ہلکے سرمئی رنگ کی تھیں۔ فرنیچر سیاہ رنگ کا تھا۔ کمرے کے درمیان میں جہازی سائز بیڈ تھا جس کے اوپر کسی خطاط کی خطاطی تھی۔ رنگوں کے خوبصورت امتزاج اور احساسات کو الفاظ کی لڑی میں پرو کر ایک خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے اسے ہی فاتح مانتے ہوئے خطاط نے ”لا غالب الا اللہ“ کے الفاظ لکھے تھے۔ بیڈ کے دائیں جانب سنگھار میز تھی اور اس کے بائیں طرف ڈریسنگ روم۔ کمرہ سادگی اور خوبصورتی کی مثال تھا۔ جیسے یہ پورا گھر اور جیسے اس گھر کے لوگ، اور جیسے ان لوگوں کے دل۔ دل۔۔ دلنشین! واپس سعاد اور حرم کی طرف متوجہ ہوا جائے تو سعاد کی دہائی پر بیڈ کراون سے ٹیک لگا کر بیٹھی حرم نے بے فکری سے پاپ کارن سعاد کی طرف بڑھائے تھے۔ سعاد نے منہ بسور کر اسے دیکھا تھا۔

”مسئلہ کیا ہے تمہارا ہاں؟“ حرم پاپ کارن ایک طرف رکھتی سیدھی ہو کر بیٹھی۔ سعاد نے جواباً آنکھیں گھمائی تھیں۔ ”دو سال بڑی ہوں تم سے ٹھیک؟ بڑی بہن ماں کی جگہ ہوتی ہے ٹھیک؟ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچوں ٹھیک؟ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم پچھلے دو سالوں سے پڑھائی سے فارغ ہو چکی ہو، تو شادی سے انکار کیوں؟!“ سعاد نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

”دوست ہو ناں دوست ہی بنو خدا کا واسطہ ہے۔“ سعاد نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے تھے۔

”اور اگر میں دوست سے بڑھ کر کچھ بننے کی کوشش کروں تو؟“ حرم کی پر اسرار مسکراہٹ سعاد کو کچھ مشکوک سی لگی تھی۔

”کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”چھوڑو تم۔ مجھے بس ایک سالڈ ریزن بتاؤ تمہیں شادی کیوں نہیں کرنی؟ جندل گھر ہوتا نہیں ہے کب تک تم اکیلی

رہو گی ہاں؟"

"مجھے نہیں کرنی شادی نہیں کرنی بس نہیں کرنی۔ تم اپنے دماغ سے یہ فتور نکال دو ٹھیک ہے؟" سعاد بری طرح سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئی تھی۔

"کیوں؟"

"ہر بات کے پیچھے وجہ کا ہونا ضروری نہیں۔" سعاد نے گہری سانس لے کر تکیے پر اپنا سر رکھتے ہوئے ٹانگیں لمبی کی تھیں۔ حرم نے دانت کچکچا کر بیڈ پر دراز ہوتی سعاد کو دیکھا تھا پھر پاس پڑا کشن اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

"شادی تو تمہاری کروا کر دم لوں گی میں۔" سعاد نے کشن سر کے نیچے رکھتے ہوئے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے تھے۔

"آپی میں باہر جا رہا ہوں کوئی کام ہے؟" کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ضرار کی آواز پر سعاد بجلی کی تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔

"مری رہو۔ اسے پتہ ہے تم یہاں ہو، نہیں آئے گا۔" سعاد نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ بستر پر دراز ہو گئی۔ حرم آنکھیں گھماتی کمرے کے دروازے کی طرف متوجہ ہوئی جس کے پار ضرار کھڑا تھا۔

"اپنی ہڈیاں بچوا کر آنا یہی کافی ہے۔" سعاد کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔ باہر کھڑے ضرار نے اپنی عزت افزائی پر منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

"کہیں تو عزت رکھ لیا کریں۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔

"جاتے ہو یا یہیں میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں۔"

"جا رہا ہوں۔" وہ پلٹنے لگا تھا پھر کچھ سوچ کر رکا۔ ایک نظر کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ "آپی جندل کی ہمشیرہ

سے کہیے گا جندل سلام دے رہا تھا۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا تھا۔بیڈ پر لیٹی سعاد بجلی کی تیزی سے اٹھی تھی۔

"ضرار رکو بات سنو۔ضرار۔۔حرم یار روکو اسے۔" وہ ضرار کو آوازیں دے کر حرم کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وہ جا چکا ہے سعاد۔" حرم نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔سعاد چند لمحے ہونٹ کاٹتی اسے دیکھتی رہی۔پھر اثبات میں سر ہلا کر واپس بیڈ پر بیٹھی۔کچھ دیر بعد خیالوں میں گم اس کی سماعت سے یہی الفاظ ٹکرا رہے تھے،

"آپی جندل کی ہمشیرہ سے کہیے گا جندل سلام دے رہا تھا۔"

"آغا جان بابا کا خط آیا ہے وہ آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔" کسی ننھی بچی کی کھکھلاتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"زندگی کی دوڑ میں فریب کے مرغولوں کے پار حقیقت دیکھنے کی کوشش کرنے والی پیاری لڑکی کو میرا الوداعی سلام! پھر ملیں گے سعاد۔۔!" سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے لکھے وہ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے تھے۔ وہ ہونٹ کاٹتی آنکھیں میچ گئی تھی۔

☆☆☆

بینکاک کے وسط میں یہ بڑی سی عمارت اپنی پوری شان کے ساتھ کھڑی ہے۔اسے کھڑا کرنے میں سالوں لگے ہیں، کئی آنکھوں کے دیکھے گئے خوابوں کی تعبیر ہے یہ۔اس عمارت کے قریب جایا جائے تو بآسانی "وارلڈ گلاس کمپنی" کی شیشے سے بنی چمکتی تختی دیکھی جا سکتی ہے۔عمارت کے باہر گارڈ چوکس کھڑے ہیں۔ان گارڈز کی نظروں سے بچ کر اگر اندر جایا جائے تو ایک الگ ہی دنیا ملتی ہے، مشینری کی دنیا۔

انسان نامی روبوٹس ہر طرف نظر آئیں گے۔کاؤنٹر پر بیٹھی سیاہ رنگ کے لباس میں موجود اس لڑکی سے لے کر

شاندار آفس میں بند دروازے کے پیچھے بیٹھے مرد حضرات تک ہر شخص دن رات کسی روبوٹ کی مانند کام کر رہا ہے۔ وجہ ان سب کے سر پر کھڑا وہ شخص ہے جس کا ماننا ہے کہ وہ چند پیسوں کے عوض ان ”انسانوں“ کی صحت اور ان کا وقت خرید رہا ہے۔ وہ جو چاہے ان سے کروا سکتا ہے۔ یہ کمپنی دن بہ دن عروج کی منازل طے کر رہی تھی۔ یہاں کام حد سے زیادہ تھے اور کام کرنے والے لوگ گن گن کر رکھے جاتے تھے اور ان لوگوں کی جیبوں میں اتنا پیسہ ڈالا جاتا تھا کہ کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی شکایت لبوں پر لائے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان ”روبوٹس“ کا کام صرف اور صرف تیل، گیس یا بجلی سے چلنے والی مشینری کو چلانا تھا بس۔

کمپنی کی پچھلی طرف دور تک پھیلا کارخانہ تھا جہاں ”آئینہ سازی“ کا کام ہوتا تھا۔ وہ ایک شخص جس نے کمپنی کو سنبھال رکھا تھا، کارخانے کا نگران بھی وہی تھا۔ وقت کا پابند، اصولوں کا پابند، پرفیکشنسٹ۔

بقول یہاں کے کام کرنے والے روبوٹس کے ”یہ شخص خوامخواہ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ یہ اگر کہیں جا کر چھوٹا سا ڈھابہ بھی کھولے تو اس کی محنت اس ڈھابے کو چند سالوں میں اس کمپنی کی ٹکر پر لا کر کھڑا دے گی“!

مگر وہ شخص اس کمپنی کے ساتھ خاصا مخلص تھا اور سب کو اسی کا مشورہ دیا کرتا تھا بلکہ ڈنڈے کے زور پر اس پر عمل کروایا کرتا تھا۔۔

وہ دیکھیں، وہ شخص آ رہا ہے۔ بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ آنے والے ایک نہیں دو ہیں۔

بنفشی رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس مرعوب کر دینے والی شخصیت، ابراہم وارلڈ!

اور ان کے برابر میں انہیں تمام تفصیلات سناتا سیاہ رنگ کے کوٹ پینٹ میں ملبوس خیام حنفی! وہ شخص خیام حنفی تھا۔

”اس دفعہ جو Silicon آیا ہے اس کی کوالٹی میں فرق ہے۔ اگر ہم اسی سے شیشے کا نیا اسٹاک تیار کریں تو کمپنی کو کروڑوں کا نقصان ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ اگر ہم بہتر کوالٹی والا سلیکون منگوا کر دونوں کا ملاپ کر کے شیشہ بنائیں تو

یہ بہتر خیال ہو گا لیکن اپنے کام کے ساتھ خیانت ہو گی جو کسی صورت اس کمپنی کو زیب نہیں دیتی۔" وارلڈ نے ہلکا سا مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تو پھر کیا چاہتے ہو؟"

"آپ کی طرف سے اجازت نامہ! میں فرڈنینڈز کمپنی کے ساتھ تمام ڈیلز کینسل کرنا چاہتا ہوں، اس کے بدلے ہم دوسری کمپنیز کے ساتھ بہترین کام کر سکتے ہیں۔"

"جو بہتر لگے کرو۔ بس کسی بھی طرح اسٹاک جلدی تیار کرواؤ ہمارے پاس صرف ایک ہفتہ ہے اس کے بعد آرڈر بھیجنا ہے۔"

"شکریہ سر!" وہ سر کو ذرا سی جنبش دیتا وہیں رک گیا۔ وارلڈ ایک نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

خیام کی نگاہ راہداری کے کونے میں کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسے کسی دُھن پر جھومتے اس لڑکے پر پڑی۔ لڑکے نے اسے دیکھا، اس نے لڑکے کو دیکھا۔ اور اگلے ہی لمحے لڑکا جتنی رفتار سے اپنے کام کی طرف واپس جا سکتا تھا وہ جا رہا تھا۔

☆☆☆

"رکیں رکیں۔ بات سنیں، جندل!" وہ بیگ شانے پر ٹکائے سڑک کے کنارے موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے آگے بڑھ رہا تھا جب اسے عقب سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ ماتھے پر ہلکے سے بل ڈالتا پلٹا تھا۔

"اُف اُف میں آپ کو کب سے آوازیں دے رہی ہوں سن کیوں نہیں رہے تھے؟" وہ شاید کافی دیر سے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی تبھی اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ دونوں گھٹنوں پر ہاتھ جمائے جھک کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس سے شکایت کرتی وہ اسے مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کا اسٹیمنا اتنا کمزور ہے۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔ سیدھے کھڑے ہو کر بھورے رنگ کا اسٹول ٹھیک کرتی ازابیلا نے رک کر اسے دیکھا۔

"ہاں کیونکہ میں بھاگنے کے بجائے سکون سے تعاقب کرنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔" اس نے بھی جواباً کندھے اچکائے تھے۔

"میرے تعاقب کے لیے آپ کو کس نے مجبور کیا؟" وہ آنکھیں سکیڑے پوچھ رہا تھا۔ ازابیلا نے گہری سانس لی۔

"مجھے ایک اچھے "ہادی" کی ضرورت ہے، کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ۔۔۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اچانک کسی نے زور سے جندل کے سر پر تھپڑ مارا تھا۔ جندل کا سر جھکا تھا، ازابیلا نے چونک کر پیچھے دیکھا تھا جہاں ایک سائیکل سوار اپنی سائیکل تھوڑا دور جا کر واپس موڑ رہا تھا۔ ازابیلا نے واپس اپنا چہرہ جندل کی جانب موڑا جو غصے سے لال ہو چکا تھا۔

"کیسا دیا لالے؟" وہ کھنکتی آواز بدر کی تھی۔ اخلاق سے عاری بدر!

"گوڈے گوڈے تک عشق میں ڈوبے شاعروں سے پوچھو کہ وہ اس وقت اِس قدر غافل کیوں ہیں جبکہ برف اور گرم سورج کی شعاوں کا امتزاج ہو رہا ہے اور مرکزیہ چہرہ ہے، انہیں اپنے الفاظ کا درست استعمال کرنا نہیں آتا کیا؟!" اس نے جندل کے سفید رنگ کو لال ہوتے دیکھ کر اس پر چوٹ کی تھی۔ ازابیلا بے اختیار ہنس دی تھی۔ بدر نے گردن ترچھی کیے اسے دیکھا پھر فوراً سائیکل سے اترا۔

"سوسوری ازابیلا میم! میں نے آپ کو بالکل نہیں دیکھا۔" وہ جندل کی خونخوار نظروں کو نظر انداز کرتا ازابیلا کی طرف متوجہ ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔ روفی کہاں ہے؟" اس نے سائیکل کی خالی ٹوکری کو دیکھ کر سوال داغا تھا۔

"میں یونیورسٹی سے آرہا ہوں، وہ گھر پر آرام فرما ہے۔" اس نے گردن کو خم دیا پھر دانت نکال کر جندل کو دیکھا۔

"ویسے آپ لالے کے ساتھ کیا کر رہی ہیں؟ مطلب آپ جانتی ہیں اسے؟" ازابیلا نے جندل کو دیکھا۔ جندل نے ازابیلا کو اور اس سے پہلے وہ بدر کے سوال کا جواب دیتی جندل بیچ میں بول اٹھا تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں ازابیلا فی الحال مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ان شاء اللہ میں کل آپ کی بات سننے ضرور آؤں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ازابیلا کا جواب سنے بغیر بدر کا کان پکڑا تھا اور زبردستی اسے اپنے ساتھ کے جانے لگا۔

"لالے کان چھوڑ یار۔ اوئے لالے نہ کر، یار سائیکل میری ادھر کھڑی ہے چھوڑ۔ دیکھ تجھے صبح والی دال کی قسم چھوڑ دے۔" بدر کا مسلسل چلانا اور جندل کا اس کی چیخوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا کان پکڑ کر اسے گھسیٹ کر لے جانا۔ وہ تب تک یہ منظر دیکھتی رہی جب تک وہ اس لمبی گلی کا موڑ نہ مڑ گئے۔ اس نے تب تک پلک نہیں جھپکی جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد اس نے گہری سانس لیتے ہوئے نگاہیں جھکائی تھیں اور اسی لمحے وہ بری طرح ٹھٹھک کر رکی تھی۔ جہاں کچھ دیر پہلے بدر کھڑا تھا وہاں اب قلم کی نوک گری ہوئی تھی۔ ویسی ہی سیاہ بال پین کی نوک۔ اس نے جھک کر اپنی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان اسے اٹھایا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نوک کو دیکھتے ہوئے اس کی سماعت سے بدر کے الفاظ ٹکرائے تھے۔

"میں یونیورسٹی سے آرہا ہوں۔"

"بائیں جانب، چوتھی قطار، نیلی جینز، دائیں پاکٹ"!

"میرا نام بدر ہے۔" اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ آخری سوال جو اس کے دماغ میں کسی ہتھوڑے کی مانند برس رہا تھا وہ یہ تھا کہ "کیا بدر ہی قاتل ہے؟ اور اگر نہیں تو یہ قلم یہاں کیوں ہے؟ یا پھر جندل؟"!

☆☆☆

"لالے خدا پوچھے گا تم سے۔ بہت ظالم ہو قسم سے۔ دیکھو تو سہی۔ کسی پٹھان کا کان لگ رہا ہے یہ۔ کھینچ کھینچ کر حالت کیا کی ہے اس کی تم نے؟ اور دیکھو ٹماٹر کی طرح لال ہو رہا ہے ٹماٹر کی طرح!" وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے کان کی بربادی پر مسلسل جندل کو صلواتیں سنا رہا تھا جو دروازے کے پاس کھڑا سینے پر ہاتھ باندھے سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا یہ ڈرامہ کب بند ہو گا؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بدر نے صدمے سے اسے دیکھا۔

"ایک تو میرا کان ہاتھی ورگا کر دیا ہے اوپر سے میرے جذبات، احساسات کا مذاق اڑا رہے ہو۔ لالے تم اچھا نہیں کر رہے میرے ساتھ ہاں!" اس کی دو نمبر والی اداکاری پھر شروع ہو چکی تھی۔ جندل نے گہری سانس لی پھر جانے کے لیے مڑا۔

"رکو ناراض ہو کر مجھے جانا چاہیے ڈرامہ ہِٹ جائے گا اس سے۔" وہ ایکدم اسے پیچھے کرتا آگے جانے لگا اور تبھی دھاڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"کہاں ہے یہ بدر! مہینے کی چھ تاریخ ہے اور اس نے کرایہ نہیں دیا۔ پچھلے دو ماہ سے یہ مجھے ٹرخا رہا ہے۔ اب آج یا تو یہ کرایہ دے یا اپنا سامان سمیٹے۔" بدر نے خوف سے جندل کو دیکھا پھر فوراً پلٹا اور جندل کے پیچھے ہو گیا۔

"لالے آج بچا لے آئندہ کبھی تھپڑ نہیں ماروں گا پکا وعدہ۔ بس آج بچا لے۔ غریب بندہ ہوں یار اجنبی ملک میں کہاں دھکے کھاتا پھروں گا پلیز!" مالک مکان ان دونوں کو دیکھ چکا تھا اور اب خراماں خراماں ان کی طرف چلا آ رہا

تھا۔ اس کے پیچھے ٹیوشن والے بچوں کی فوج تھی اور یقیناً اس موٹے آدمی کے لیے دروازہ بھی انہوں نے ہی کھولا تھا۔ بدر نے دانت کچکچا کر بچوں کو دیکھا تھا جو معصومیت سے اپنے "سر" کا بنتا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"جندل اس سے کہو کرایہ دے ورنہ سامان باندھے اپنا۔" اس آدمی نے چٹکی بجائی تھی۔ جندل نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"کتنا کرایہ ہے؟"

"تیس ہزار!" جندل ایک نظر اس پر ڈالتا کمرے سے نکل گیا۔ مالک مکان نے خود کو نظر انداز کرتے بدر کو سخت گھوری سے نوازا اور یہی کام جواباً بدر نے کیا تھا۔ مالک مکان اسے کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے جندل کی آواز آئی۔

"یہ لیں اپنے پیسے اور اگلی بار تمیز سے آیئے گا۔ ہم چند پیسوں کے عوض آپ کا یہ گھر خرید لیتے ہیں، لہٰذا جو آپ کا نہیں اس کی آڑ میں رعب جمانے کی کوشش نہ کیا کریں۔" بدر خوشی و مسرت کے ملے جلے جذبات آنکھوں میں سموئے جندل کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لے یا پھر کسی اچھے دوست کی طرح خوشی سے ایک آدھ دھموکا تو اس کی کمر پر جڑ ہی دے۔ "جائیں!" مالک مکان غصے سے دانت کچکچاتا باہر نکل گیا۔ بچے بھی آہستہ آہستہ ادھر ادھر کھسکنے لگے۔

"اوئے لالے اس موٹے مالک مکان کو غصہ چڑھ گیا تو دونوں کو نکال دے گا گھر سے۔" بدر کی بات پر جندل نے کندھے اچکائے تھے۔

"اس کے بیٹے کا علاج چل رہا ہے، فی الحال اسے پیسوں کی ضرورت ہے یہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ ایویں ہی تو تمہارے پچیس ہزار کرایے کے بدلے میں تیس ہزار اڑا کر نہیں لے گیا۔" بدر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑے

اسے دیکھا۔

"اور تم نے اصل کرایہ جانتے ہوئے بھی اسے تیس ہزار دے دیے؟"

"میں نے نہیں تم نے دیے ہیں۔" وہ اونچائی سے اس کے سر پر پہاڑ توڑ چکا تھا۔ بدر نے ہراساں نگاہوں سے اسے دیکھا پھر تیزی سے باہر کی طرف آیا تھا۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے کبڈ کھولا تھا اور یہاں اسے اپنا سیونگ باکس کھلا ہوا ملا تھا۔ وہ بے اختیار نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے کمرے میں جھانکتے بچے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی دبانے کی چکروں میں تھے۔ ان کے "سر" لٹ چکے تھے۔ اپنے کمرے میں جندل آرام سے بیڈ پر دراز ہوا تھا۔ وہ بدر سے تھپڑ کے بدلے خاصا مہنگا حساب وصول کر گیا تھا۔ اب اسے چین کی نیند آنی تھی۔

اور بدر، وہ اپنے کمرے میں کبڈ کے پاس فرش پر بیٹھا خاموشی سے اس باکس کو دیکھ رہا تھا۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ جندل کا انتقام اتنا سخت ہوگا وہ کبھی اسے تھپڑ نہ مارتا۔ کاش وہ اسے نہ مارتا، اے کاش۔

☆☆☆

روشنی میں نہائے کمرے میں وہ بیڈ کراون سے ٹیک لگائے لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ دائیں ہاتھ میں کافی کا کپ تھا جسے وہ وقفے وقفے سے لبوں تک لے جاتی اور گرم کافی کے گھونٹ بھرتی۔ گہرے کتھئی رنگ کے بالوں میں سفید رنگ کا ہیڈ بینڈ ٹکا کر ڈھیلا ڈھالا جوڑا بنایا گیا تھا جس سے نکلتی کچھ لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں اور جنہیں وقفے وقفے سے کانوں کے پیچھے اڑسنے کا عمل بھی جاری تھا۔

لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین کی سفید روشنی، روشن کمرے کی وجہ سے اس کے چہرے تک پہنچنے سے قاصر تھی۔ دھیرے دھیرے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی وہ مصروف سے انداز میں اپنی میلز دیکھ رہی تھی جب اسی وقت اسے ایک میل موصول ہوئی۔ میل بھیجنے والا اس کے لیے اجنبی تھا۔ جیسے ہی اس نے میل کھولی تو شروع کے الفاظ

پڑھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ اس نے کافی کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بغور میل پڑھنے لگی۔

"میں جانتی ہوں ازابیلا کہ تم وہ کال موصول کر کے فوراً میرے گھر گئی ہو گی اور وہاں مچی تباہی دیکھ کر تم میرے لیے پریشان بھی ہوئی ہو گی۔ ایک دوست ہونے کے ناطے میں یہ حق بھی رکھتی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ٹھیک ہوں۔ میرے سوتیلے باپ کی آمد کا مجھے بروقت پتا چل گیا تھا اور میں جیک کے ساتھ بروقت وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہی۔ میں اس وقت نیویارک کے مصروف شہر میں ہوں۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کی پانچویں منزل کے ایک کمرے سے تمہیں یہ میل لکھ رہی ہوں۔ جیک کھانا لینے گیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ کچھ دن نیویارک میں رہنے کے بعد ہم انگلینڈ چلے جائیں گے۔ ہم جیک کے والدین سے ملیں گے، پھر شادی کر لیں گے اور شاید باقی پوری زندگی وہیں گزرے گی۔ مجھے یقین ہے مَیں تمہیں اپنے متعلق مطمئن کرنے میں کامیاب ٹھہری ہو نگی۔

جاتے جاتے یہ کہوں گی کہ تم جس بھی مذہب کا چناؤ کرو تو سوچ سمجھ کر کرنا۔ ذرا دیکھ بھال کر۔ سچ بتاؤں تو مجھے تم پر رشک آتا ہے اور ساتھ ہی ترس بھی۔ رشک اس لیے کہ تم کسی بھی مذہبی پابندی یا کسی بھی حد سے آزاد ہو۔ تم سب کر سکتی ہو اور ترس اس لیے کہ تم اپنی آزادی سے خفا ہو۔ تم ہماری طرح حدود میں بندھنا چاہتی ہو۔ لیکن پھر بھی تم جو فیصلہ کرو گی مجھے اسے جاننے کا اشتیاق رہے گا۔ یہ میل اکاونٹ بند کر رہی ہوں اگر تم نے اپنا اکاونٹ نہ بدلا تو ممکن ہے کسی دن دوبارہ میں تم سے رابطہ کر سکوں۔

ازابیلا، میں آخر میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ نیویارک کی اس بھاگتی دوڑتی زندگی کا عکس ہوٹل کی کھڑکی سے نیچے مصروف شاہراہ پر دیکھتے ہوئے جہاں ہر گاڑی دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے، میں بہت سکون

محسوس کر رہی ہوں۔ شاید زندگی میں پہلی بار میں اتنی پر سکون ہوں۔

ایمِلی فرڈینڈز"!

☆☆☆

کراچی کے وسط میں اونچی عمارتوں کے درمیان اس درمیانے سائز کے گھر میں حسب معمول رات کے گیارہ بجتے ہی تاریکی چھاگئی تھی۔ سیڑھیوں پر جلتی مدھم بتیوں سے لاونج میں ہلکے سنہری رنگ کی روشنی رات کے اس تاریک زدہ منظر کو خوبصورت بنا کر پیش کر رہی تھی۔ دفعتاً کسی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کوئی لاونج میں داخل ہوا۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا وہ باورچی خانے میں آیا اور اندھیرے میں سوئچ بورڈ تلاش کر کے بٹن دبایا۔ ایک لمحے میں سارا باورچی خانہ روشنی میں نہا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو شیلف پر اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے ہوشیار رہنے کا الارم دیا تھا۔

"رک جاؤ۔ گرم کر دیتی ہوں، ٹھنڈا ہو گیا ہے۔" اس نے کان کھجاتے ہوئے مڑ کر سیڑھیاں اترتی حرم کو دیکھا تھا۔

"آپ سو جائیں میں خود کر لوں گا۔" وہ کھسیانا ہوا تھا۔ حرم اسے گھوری سے نوازتی باورچی خانے میں آئی۔ کھانا نکال کر اوون میں گرم کیا پھر ٹیبل پر لگا دیا۔ تب تک وہ منہ ہاتھ دھو کر ٹیبل کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے کھانا شروع کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ حرم کو اپنے سامنے بیٹھتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے رکا۔

"آپ نے کھانا کھالیا؟" وہ اب نوالہ بنا رہا تھا۔

"ہاں۔" ایک لفظی جواب پر ضرار نے بس سر کو جنبش دینا کافی سمجھا۔ "بات کرنی ہے تم سے"!

"جی جی۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی ورنہ دماغ تو خطرے کی گھنٹی تب ہی بجا چکا تھا جب حرم اپنی نیند قربان کر کے اس کے لیے نیچے آئی تھی۔

"میری ایک پرانی دوست ہے۔ وہی رہتی تھی بس۔ آج اس کی اور اس کے بھائی کی شادی بھی ہو گئی!" رات کے گیارہ بجے، اسے مکمل اپنی طرف متوجہ کر کے سنجیدگی سے کہی گئی یہ بات اسے مذاق لگی تھی۔ بھلا اس وقت اس بات کا کیا کام؟!

"تو؟" اب وہ یہ سب حرم کو تو نہیں کہہ سکتا تھا ناں۔ آنکھ کے قریب زخم کا نشان وہ ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

"تو یہ کہ مسٹر ضرار ولید! تمہیں کوئی لڑکی اچھی لگتی ہے تو بتاؤ ورنہ میں اپنے تئیں کوئی لڑکی ڈھونڈ کر تمہاری شادی کر دیتی ہوں۔ بلکہ میں لڑکی ڈھونڈ چکی ہوں تم بس پہلی بات کے لیے تسلی دو مجھے۔"

آہ ضرار! وہ ایسے حرم کو دیکھ رہا تھا جیسے حال ہی میں بنا پاگلوں کا کوئی ڈاکٹر خود میں پاگلوں والی تمام خصوصیات پالے۔

"پہلی بات، اس دنیا میں ہر لڑکی میری بہن ہے۔ دوسری بات، میں شادی نہیں کروں گا۔ آپ کو اگر اپنی دوست اور اس کے بھائی کی شادی کا غم لگا ہوا ہے تو احمد بھائی زندہ باد، کروا دیں ان کی دوسری شادی۔"

"نہیں آپی، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" کتنا شریف تھا ناں وہ۔ بھلا دماغ میں آئے الفاظ کو زبان سے ادا کر کے اسے جان سے تھوڑی جانا تھا۔ بے وقوف نہیں تھا وہ۔

"تو بس پھر میں صبح ہی تمہارا رشتہ کنفرم کرتی ہوں۔"

"کس سے؟" اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا تھا۔ کاش وہ نہ لگاتا۔

"سعاد سے۔" اور یہ اسے لگا تھا اچھو! پانی اس کی ناک میں چلا گیا تھا۔ وہ گلاس میز پر رکھتا کھانسنے لگا تھا۔ حرم بند

مٹھی پر ٹھوڑی جمائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپی کیا کہہ رہی ہیں؟ نیند میں ہیں کیا؟ جندل کی ہمشیرہ کو میں اپنی بھی بہن سمجھتا ہوں۔ کچھ بھی کہہ دیتی ہیں آپ!“ وہ ٹشو باکس سے ٹشو نکالتا حرم کو اس وقت بہت پیارا لگا تھا۔

”تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان میں ہر لڑکے کی آج کی جان سے عزیز بہن کل کی بیوی ہوتی ہے۔ تم بھی تیاری پکڑ لو۔“

ضرار نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

”آپی وہ میرے لیے بالکل آپ کی طرح ہیں۔ بہن سمجھتا ہوں انہیں۔“ اس نے احتجاج کیا تھا۔

”بہن سمجھنے سے بہن ہو نہیں جاتی۔“ وہی تاریخی جملہ جو ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے۔

”خدا کا واسطہ ہے یار!“ وہ جھنجھلا کر میز پر ہاتھ مارتا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے حرم مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے باورچی خانے سے نکلتا دیکھ رہی تھی۔ ضرار دی معصوم کو غصہ آگیا تھا۔

☆☆☆

میل پڑھنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے انگڑائی لی اور لیپ ٹاپ گود سے اٹھا کر سائیڈ پر رکھا۔ سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھا کر اس نے کسی کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا۔ چند بیلوں کے بعد ہی کال اٹھا لی گئی۔

”السلام علیکم۔“ زیاد کی نیند میں ڈوبی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”وعلیکم السلام۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک بہت اچھی خبر ہے زیاد۔“ وہ چہکی تھی۔

”کیا؟“ دوسری طرف زیاد نے جمائی لی تھی۔

”ایمِلی بالکل ٹھیک ہے مجھے اس کی میل ملی۔ وہ اور جیک شادی کرنے والے ہیں۔“

”تو؟“ ازابیلا کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”تو؟ میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ ایمِلی ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ تم سمجھ رہے ہو ناں؟“

”تم نے رات کے ایک بجے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے ازا؟“ ازابیلا نے رک کر دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا پھر زبان دانتوں میں دبائی۔

”میں خیام سے ملی۔“ اس کی بات پر زیاد کی ساری سوئی ہوئی حِسیں بیدار ہوئی تھیں۔

”کب؟ کیوں؟ کیسے؟ میں نے تمہیں منع کیا تھا ازا۔“ ازابیلا نے مسکراہٹ دبائی تھی۔

”وہ کیا ہے ناں کہ مسٹر زیاد تاشفین! اس وقت رات کے ایک بج رہے ہیں تمہیں بھی بہت نیند آ رہی ہو گی اور میں بھی خاصی تھک چکی ہوں تو اس موضوع پر ہم صبح بات کریں گے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر کال کاٹ چکی تھی۔

مسکراتے ہوئے اس نے موبائل سائیڈ پر رکھا۔ اسی وقت موبائل بج اٹھا۔ موبائل کی روشن اسکرین پر زیاد کالنگ لکھا آ رہا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر آف کر دیا۔

ازابیلا کا اصول تھا:

”جو اس کی خوشی میں خوش نہیں ہو سکتا وہ خوش ہونے کا حق نہیں رکھتا۔“

جیسے کہ زیاد۔ وہ جانتی تھی وہ ساری رات اب پریشانی سے ٹہلتے ہوئے گزارنے والا تھا۔

☆☆☆

گہری اندھیر رات ایسے بھاگی تھی جیسے کسی نے اسے گھوڑے پر سوار کر کے گھوڑے کو چابک رسید کر دیا ہو۔

تاریک رات کا پردہ چاک ہوتے ہی روشن صبح کے سورج کے لیے راستہ صاف کیا گیا۔ آج اتوار تھا۔ لوگ چھٹی منا رہے تھے تبھی سڑکوں پر اتنا رش نہیں تھا جتنا عموماً ہوتا تھا۔ وہ واک کرنے کے بعد اب واپس گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سے سرمئی رنگ کے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس وہ سر جھکائے گہری سوچوں میں گم تھا۔ آج اسے تھائلینڈ آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ وقت کتنی جلدی گزرتا ہے ناں؟

وہ پہلے سعاد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ضرار کی دی گئی اطلاع کے بعد وہ اس سے ناراض تھا۔ اس نے اسے کوئی کال نہیں کی تھی اور سعاد نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ وہ جانتا تھا اس بار بھی ہمیشہ کی طرح وہ اسے منانے کے لیے کال کرے گا، کان پکڑ کر معافی مانگے گا اور اسے بہت مشکل وقت دینے کے بعد وہ اسے معاف کر دے گی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ عادت سے مجبور امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس بار اس کی بڑی بہن ہی اسے منائے گی اور یہ امید ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنی ساکھ کھو رہی تھی۔

سعاد کے بعد وہ اب تھائلینڈ میں گزرے ایک ہفتے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس ایک ہفتے میں سمندر کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کے علاوہ سمندر سے گہرے انسانوں سے بھی ملا تھا جیسے کہ ازابیلا! وہ لڑکی دلچسپ تھی۔ وہ بیک وقت ایک مسافر اور راہنما لگتی تھی۔ ایسا مسافر جو خود بھٹک گیا ہو اور ایسا راہنما جو بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کرے۔ یہ سب صرف قیاس تھا ورنہ حقیقت اتنی جلد کھلنے والی نہ تھی وہ جانتا تھا۔

ازابیلا کے بعد وہ اب پاکستان میں گزرے اپنے آخری ایام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے حرم اور احمد یاد آئے تھے۔ اسے ضرار کے قہقہے اور احمد کی باتیں یاد آئی تھیں۔ اور انہی قہقہوں اور مسکراہٹوں کے درمیان اسے اپنا لپٹنا یاد آیا تھا۔ ذہن کی اسکرین پر جھما کا ہوا تھا اور منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ یادوں کی رو میں بہتا وہ ایک ہفتہ قبل پاکستان

جا پہنچا تھا۔

"خیام یار بتاؤ ناں کیا کہوں آپی کو؟ گھر کا دروازہ کھولتے ہی وہ پہلا سوال یہ کریں گی کہ پچھلے دو دنوں سے کہاں تھے؟ اب میں انہیں یہ تو نہیں بتا سکتا ناں کہ پانچ چھ قتل کرنے میں مصروف تھا۔" وہ کمرے میں ٹہلتا خیام سے مدد مانگ رہا تھا جو بے فکری سے اخروٹ کھانے میں مصروف تھا۔

"سن رہے ہو یا قوت سامعہ سے محروم ہو چکے ہو؟!" اس نے جھنجھلا کر پوچھا تھا۔ خیام نے اخروٹ منہ میں ڈال کر ہاتھ جھاڑے پھر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔" وہ شرٹ کے کف مروڑتا جندل کے قریب آیا۔

"کیا؟!" جندل کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ خیام نے جواب دینے کے بجائے سختی سے بند مٹھی کا گھونسا اس کے گال پر جڑ دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن خیام نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بنا دائیں ٹانگ کھینچ کر اس کے پیٹ پر ماری تھی۔ وہ درد سے دوچار ہوتا پیچھے ہٹا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" جندل نے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے گھورا تھا۔

"رکو تو۔" وہ مزے سے کہتا آگے بڑھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک اور مکا جندل کے گال پر جڑتا جندل نے پھرتی سے اپنی دائیں ٹانگ اس کی ٹانگ پر مارتے ہوئے اس کے بائیں جانب سے نکل کر اپنا بچاؤ کیا تھا۔ خیام نے مڑتے ہی ہوا میں مکا لہرایا تھا جو بدقسمتی سے جندل کی ناک پر لگا تھا۔ ناک سے خون کے قطرے گرنے لگے تھے۔ جندل نے سنبھل کر وار کرنا چاہا تھا لیکن خیام اس کا وار روکتا اس کے گھٹنے پر اپنا پاؤں مارتا اسے گھٹنوں کے بل بٹھا چکا تھا۔

"سعاد سے کہنا ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گیا تھا جو مار پیٹ کر سڑک پر پھینک گئے تھے۔ پھر اسپتال سے مرہم پٹی کروا کر گھر پہنچے ہو۔" اپنی بات مکمل ہوتے ہی اس نے جندل کے دائیں گال کو پھر بائیں گال کو اپنے مکوں کا نشانہ بنایا تھا۔

اس کی دائیں آنکھ سے ذرا اوپر جِلد پھٹ چکی تھی۔ خون جیسے انتظار میں بیٹھا تھا فوراً نکلنے کو بے تاب ہوا تھا۔

"اور یہ آخری!" اس نے اس بار اس کی گدی پر مکا جڑ دیا تھا۔ جندل گردن پکڑتے ہوئے کراہا تھا۔ خیام نے گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے حلیے کو دیکھا پھر ہاتھ جھاڑے۔ صوفے کے پاس جا کر پلیٹ میں بچا آخری اخروٹ منہ میں ڈالا پھر صوفے کے بازو پر لٹکا اپنا کوٹ اٹھایا۔ ایک نگاہ جندل پر ڈالی پھر مسکراتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"مل نہ پائے گر اس جہاں میں،

مل ہی جائیں گے آسماں میں۔

عرش کے تلے سائبان میں،

راہ وہ رہے بس دھیان میں۔۔۔

جس کے موڑ پر جنت بریں!

سربلند ہو دوستانِ دیں"!

دھیمی آواز میں گنگناتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا۔ بمشکل اپنے سہارے پر کھڑا ہوتا جندل اس لمحے کو کوس رہا تھا جب اس نے خیام سے مشورہ مانگا تھا۔

☆☆☆

اس نے واک کر کے واپس آتے ہوئے سڑک کے سرے سے نمودار ہوتے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ سائیکل کے پیڈل تیزی سے گھماتا اپنے سامنے ایک لڑکے کو دیکھ کر وہ کھڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ سیدھے کیے تھے۔ اپنی دُھن میں مگن وہ لڑکا اپنے سر پر لگنے والے تھپڑ کے باعث ہوش میں آیا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ اس سائیکل سوار کے پیچھے

بھاگا تھا جو اب ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ لڑکا زیادہ دیر اس کا پیچھا نہیں کر سکا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

”صبح بخیر ازابیلا میم!“ بدر اسے دیکھ چکا تھا تبھی اس کے سامنے سائیکل روکی تھی۔

”صبح بخیر! تم جانتے ہو بدر کسی دن یہ تھائی لوگ تمہارے تھپڑوں کی وجہ سے تمہیں جان سے مار دیں گے۔“ بدر مسکرایا۔

”قتل اتنے آسان ہوتے تو روفی اس وقت میری سائیکل کی ٹوکری میں بیٹھا گاجر نہ کھا رہا ہوتا۔“ اس کی بات پر جہاں ازابیلا نے اسے گھوری سے نوازا تھا وہیں روفی نے بھی ازابیلا کا ساتھ دیا تھا۔

”اتنے پیارے سے خرگوش کے قتل کے منصوبے بناتے ہوئے تمہیں بالکل ترس نہیں آئے گا اس پر بدر؟!“ وہ روفی کے بال سہلاتی کہہ رہی تھی۔

”اس کو مجھ پر ترس آتا ہے؟ جب دل کرتا ہے دانت گاڑ دیتا ہے سالا!“ لفظ ”سالا“ اس نے اردو میں کہا تھا۔ ازابیلا نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

”پہلی بات مجھے اردو آتی ہے لہٰذا کسی غلط فہمی میں مت رہنا کہ تم روفی کو سالا کہو گے اور میں انجان رہوں گی۔ دوسری بات تم اس کے قتل کے منصوبے بناؤ گے تو بدلے میں اس سے کیا امید رکھ سکتے ہو؟“ بدر نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

”پہلی بات مجھے کافی حیرت ہوئی یہ جان کر اور حیرت سے زیادہ افسوس ہوا کہ آپ کو اردو آتی ہے۔ دوسری بات میری کزن بھی آپ کی طرح اسی کی طرفداری کرتی ہے حالانکہ میرے دادا بھی۔ آخری بار وہ اس کی وجہ سے میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس گھنے میسنے روفی کے لیے لوگ مجھ جیسے خوبرو جوان کو نظر انداز کر دیتے

ہیں۔ آپ میرا دکھ سمجھ سکتی ہیں ازابیلا میم ؟!" اس نے ڈرامائی انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں۔ کیونکہ میرے پاس کوئی خرگوش نہیں ہے۔ اور اب تم جاؤ تمہیں اخبار آگے بھی دینی ہے۔ میں نے تمہارا وقت ضائع کیا۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ اس بڑے سے ملک میں آپ پہلی ہیں جو مجھے اچھی لگی ہیں ورنہ یہاں کے لوگ تو مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر میری کوئی بڑی بہن ہوتی تو آپ جیسی ہوتی۔" بدر کی بات پر ازابیلا نے رک کر اسے دیکھا۔

"تم اکلوتے ہو؟"

"پتا نہیں۔ کیونکہ یہ جواب امی ابو دیتے ہیں اور میرے امی ابو نہیں ہیں۔ دادا پر مجھے ذرا شک ہے اور میری کزن اور میں ایک دوسرے کو ایڈ اپٹڈ کہتے ہیں جبکہ حقیقت میں ہم دونوں کو شک ہے کہ ہم دونوں ہی ایڈ اپٹڈ ہیں تو سرِ دست میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ازابیلا بے اختیار ہنس دی تھی۔

"تمہیں دیر ہو رہی ہے بدر"!

"ٹھیک ہے میم! پھر ملتے ہیں۔"

"تم مجھے آپی کہہ سکتے ہو۔ یا جو بھی مطلب اگر میرا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو تم جتنا ہوتا اور شاید مجھے یہی کہتا۔" جانے کیوں اس نے یہ بات کہی تھی۔ وہ خود سمجھ نہیں پائی تھی۔

"فی امان اللہ بیلا باجی!" بدر نے فوراً اپنی سائیکل کے پیڈل گھمائے تھے۔

"بدتمیز بدر رکو تم ذرا!" وہ پیچھے سے چلائی تھی۔

"آپ نے ہی کہا تھا بیلا باجی کہ میں آپ کو کچھ بھی کہہ کر پکار سکتا ہوں۔!" وہ تیز آواز میں کہتا جا چکا تھا۔ اور ازابیلا،

وہ گندے گندے منہ بنا رہی تھی۔ کہاں ازابیلا اور کہاں بیلا باجی ؟!

کوئی تُک تھی بھلا ؟!

☆☆☆

”مل نہ پائے گر اس جہاں میں،

مل ہی جائیں گے آسماں میں۔

عرش کے تلے سائبان میں،

راہ وہ رہے بس دھیان میں۔۔۔

جس کے موڑ پر جنت بریں!

سربلند ہوں دوستانِ دیں“!

خیالوں سے باہر آتے ہی وہ مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں گنگنایا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی، بہت بڑی غلطی۔ اسے نہیں گنگنانا چاہیے تھا کسی نے پیچھے سے آکر اس کی گدی پر مکا مارتے ہوئے اس کے بڑھتے قدم روکے تھے۔ جندل نے سنبھلتے ہوئے جوابی وار کے طور پر فوراً سے پہلے پلٹتے ہوئے اپنے دایاں ہاتھ کام میں لا کر مقابل کے جبڑے تک ہلا دیے تھے۔ اور پھر وہ رکا تھا۔ نگاہیں ساکت ہوئی تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں اپنی جگہ سے پھیل کر تھوڑی بڑی ہوئی تھیں۔ مقابل بھی ٹھہر چکا تھا اور اس کی حیرت دیکھ کر مسکرا بھی رہا تھا۔

”خیام تم۔“ وہ آگے بڑھ کر اس کے گلے لگا تھا۔

”مل نہ پائے گر اس جہاں میں،

مل ہی جائیں گے آسماں میں۔

عرش کے تلے سائبان میں۔" وہ گنگنایا تھا اور جندل کو یہ ماحول جو کچھ دیر پہلے تک اجنبی تھا اب ایکدم دوستانہ لگنے لگا تھا۔

"راہ وہ رہے بس دھیان میں،

جس کے موڑ پر جنت بریں۔

سربلند ہوں دوستانِ دیں!" جندل نے اسے مکمل کیا تھا۔ خیام نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"تمہارے زخم ٹھیک ہوگئے؟" جندل نے رک کر اسے گھورا تھا۔

جندل نے خیام کو دیکھا۔ خیام نے جندل کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں سڑک پر اندھا دھند ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ سڑک خالی ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے، نالائق کہیں کے۔

☆☆☆

"سعاد میں غرناطہ سے واپس جا تو رہا ہوں لیکن میرے دل کی کچھ دھڑکنیں یہیں رہنے پر اصرار کر رہی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ میں یہاں سے جاتے ہی Heart arrhythmia کا شکار ہو جاؤں۔۔۔"!

"اپنے اردگرد دیکھو سعاد تم کسی شاعر کے خوابوں کی دنیا میں قدم رکھ چکی ہو۔ تم اندلس پہنچ چکی ہو سعاد!" وہ پہلا انسان تھا جس نے اسے کسی شاعر کے خوابوں کی دنیا میں خوش آمدید کہا تھا۔

"تم اتنا غصہ کیوں کرتی ہو؟! اس برف جیسے موسم میں تمہارا غصہ جم کیوں نہیں جاتا؟!" وہ اس کے غصے سے سخت نالاں تھا۔

"تم یہ نہیں کر سکتیں سعاد! سعاد سعاد رکو۔" وہ اسے قرطبہ کے اونچے مینار کی طرف بھاگتا دیکھ کر چلایا تھا۔

"کیا میں یہ امید رکھوں کہ کسی دن ہم دوبارہ الحمراء کی انہی قدیم دیواروں کے پاس ملیں گے۔ ایک دیوار کے ایک

پار میں دوسرے پار تم! میں فرزندِ اسلام کے روپ میں اور تم دخترِ اسلام کے روپ میں۔ پھر ہم الحمراء کی ان دیواروں کے سائے میں ایک نئی کہانی لکھیں گے۔۔"!

"سعاد تم پھر غصہ کر رہی ہو۔ اب اگر تم نے غصہ کیا تو یہ برف تمہارے منہ پر دے ماروں گا!" وہ ایک بار پھر جھنجھلایا تھا۔

"سنو! یہاں سے جاتے ہی بھول مت جانا مجھے ٹھیک ہے؟! ایک اچھا ساتھی تو میں بن نہیں سکتا لیکن ان چند دنوں میں اندلس کی ان گلیوں میں تمہیں گھماتے ہوئے میں ایک اچھا گائیڈ تو ثابت ہوا ہی ہوں ناں؟"!

"جانے کیوں میں تمہیں الوداعی سلام نہیں کہہ پا رہا۔ مجھے لگتا ہے جس لمحے میں مَیں تمہیں الوداعی سلام کہوں گا میں وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔"

"قرطبہ کے اس ٹھنڈے فرش پر برف میں بھیگتے ہوئے میں تم سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم آئندہ مجھ پر غصہ نہیں کرو گی۔ جب تک تم وعدہ نہیں کرو گی میں یہیں کھڑا رہوں گا اور تب تک کھڑا رہوں گا جب تک جم نہ جاؤں اور پھر لوگ کہیں گے کہ مرحوم دیکھنے میں تو خاصا عقلمند لگتا تھا۔" وہ اختتامی الفاظ پر ذرا سا ہنسا تھا۔

"فی امان اللہ سعاد! غصہ مت کرنا پلیز۔" اس نے التجا کی تھی۔

اور یہیں اُس کی بس ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتی ٹھنڈے فرش پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ آنکھوں سے گرتے آنسو ٹھوڑی سے لڑھکتے گردن بھگو رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ وہ مزید "اسے" سننے سے انکاری تھی اور "وہ" خاموش ہونے سے انکاری تھا۔ اس کی ضد میں وہ تباہ ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے کسی برف کی مانند وہ پگھل رہی تھی۔ آنکھوں سے سیلاب رواں تھا۔ گھٹنوں میں سر دیے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اس کے صبر کی حد یہاں ختم ہو جاتی تھی۔

"زندگی کی دوڑ میں فریب کے مرغولوں کے پار حقیقت دیکھنے کی کوشش کرنے والی پیاری لڑکی کو میرا الوداعی سلام! پھر ملیں گے سعاد۔۔"!

☆☆☆

"برمودا تکون بحر اوقیانوس میں واقع ایک مخصوص علاقے کو کہا جاتا ہے۔ اس علاقے کا ایک کونا برمودا، دوسرا پورٹوریکو اور تیسرا امیلبورن سے متصل ہے اور ان تینوں کونوں کے درمیانی حصے کو برمودا تکون یا مثلث کہا جاتا ہے۔

اس مقام سے چند ایسی داستانیں وابستہ کی گئی ہیں کہ جن کی وجہ اسے "شیطانی تکون" کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ان داستانوں میں انسان کا غائب ہو جانا، جہازوں کا کھو جانا، جیسے غیر معمولی اور مافوق الفطرت واقعات شامل ہیں۔ یہ واقعات یا داستانیں سائنسی اصولوں کے مطابق سائنس میں قابل قبول نہیں ہیں اور وجہ ان کا بنا کسی ثبوت کے ہونا ہے۔" پروفیسر نے رک کر ایک نگاہ پوری جماعت پر ڈالی۔ تمام طلباء کو اپنی جانب ہمہ تن گوش پا کر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

"بہت سی داستانیں ایسی بھی گزری ہیں کہ جن کی وجہ سے برمودا تکون کو ایک افسانوی مقام سے زیادہ کچھ سمجھنے سے انکار کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ حقیقت سات پردوں میں چھپی ہے۔ برمودا تکون کا راز آج بھی حل نہیں ہو سکا۔ آج بھی سائنس صرف تکے مار رہی ہے یا اپنے خیالات پیش کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برمودا تکون وجود رکھتا ہے۔

بعض مفکرین کے مطابق برمودا تکون میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں برطانوی اور امریکی فوجی اڈے تھے۔ اور لوگوں کو ان فوجی اڈوں سے دور رکھنے کے لیے یہ افسانوی واقعات مشہور کر دیے گئے۔ اور اب چونکہ ان اڈوں

کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تو عرصہ ہوا ایسے کوئی واقعات پیش نہیں آئے۔ سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں کہ جہاں قطب نما کام نہ کرتا ہو جبکہ برمودا کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہاں قطب نما کام کرنا چھوڑ دیتا ہے لہذا ان مفکرین کے یہ خیالات مزید پختہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس بات کے حقیقی ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب یہاں جہازوں کی گمشدگی کے واقعات پیش آنے لگے تو دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجیز کا استعمال کر کے کچھ جہاز وہاں بھیجے گئے اور وہ جہاز بھی آج تک لاپتہ ہیں! یہ جہاز کہاں گئے؟ ان جہازوں پر سوار افراد کہاں گئے؟ کوئی نہیں جانتا!

برمودا تکون بحر اوقیانوس میں جس مقام پر ہے وہاں تحقیقی ٹیم کے مطابق تین مختلف اطراف سے طوفان آسکتے ہیں جو کسی بہت بڑی لہر کو بننے کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح کی بڑی لہر بھی ان جہازوں کو ڈبو سکتی ہے، اور ان کی یہ بات تجربے میں بھی کامیاب ٹھہری۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ جہاز ڈوب بھی جاتے ہیں تو ان کا ملبہ کہاں جاتا ہے؟!

برمودا کے بارے میں سب سے پہلے جونز نامی ایک رپورٹر نے ستمبر 1950 میں ایک آرٹیکل لکھا۔ جس میں اس نے اس خطے میں پیش آنے والی عجیب وغریب وارداتوں کا ذکر کیا۔ 1952 میں Fate میگزین میں ایک آرٹیکل شایع ہوا جس کا عنوان تھا:

"Sea mystery at our back door."

اس مضمون میں امریکی نیوی کی فلائٹ 19 کا بھی ذکر کیا گیا جو کہ 5 بمباروں پر مشتمل تھی اور اچانک غائب ہو گئی۔ اس مضمون میں پہلی بار ایک مخصوص تکون کا ذکر کیا گیا جسے بعد میں برمودا تکون کہا گیا۔ فلائٹ 19 کے بارے میں یہ بتا تا چلوں کہ American legion میں ایلن ایکرٹ نے لکھا ہے کہ اس پرواز کے لیڈر کے

آخری الفاظ کچھ یوں تھے:

”ہم سفید پانی میں داخل ہو رہے ہیں۔ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ پانی سبز ہے نہیں سفید ہے۔“ مزید تفتیش کے بعد یہ بھی لکھا گیا کہ یہ جہاز مارس کی طرف اڑ گئے۔“

پروفیسر نے ڈرامائی وقفہ لیا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک لیے سب کو دیکھا۔ ماحول عجیب سنسنی خیز سا ہو رہا تھا۔ طلباء کا تجسس بڑھ رہا تھا۔ پروفیسر مسکراتے ہوئے پھر گویا ہوئے۔

”اس سب کے بعد دوسری جانب سے اگر برمودا کو مزید پڑھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ برمودا افسانوی مقام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ برمودا کے بارے میں جتنے توہمات تھے ان سب کا جواب 1975 میں چھپنے والی کتاب

" The barmoda triangle mystery solved "

میں دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہازوں اور کشتیوں کے غائب ہونے کے واقعات میں کئی جگہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً کئی ایسے جہاز جو کسی دوسرے سمندر میں کسی اور مقام پر غائب ہوئے انہیں بھی برمودا سے منسوب کر دیا گیا۔ کئی مرتبہ غائب ہو جانے والی کشتیاں واپس مل گئیں لیکن ان کی واپسی کی رپورٹ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ 2013 میں World wide fund for nature نے جہاز رانی کے لیے دنیا کے دس خطرناک پانیوں کی فہرست مرتب کی۔ یہ فہرست اس بنیاد پر تھی کہ کن علاقوں میں بحری جہازوں کو سب سے زیادہ حادثات پیش آئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فہرست میں برمودا تکون کا نام کہیں نہیں تھا۔“

”برمودا حقیقت ہے یا افسانہ یہ بات آج بھی نہیں کھل سکی۔ اسی لیے اس کا شمار Unsolved mysteries میں ہوتا ہے۔ شاید کل یا شاید کسی نئے زمانے میں یہ راز بھی آشکار ہو جائے اور کون جانتا ہے کہ

تب ہم پر کیا حقیقت کھلے گی؟!" پروفیسر نے گہری سانس لی۔ طلباء جو کب سے سانس روکے بیٹھے تھے دھیرے سے مسکرائے تھے۔

"یہ بہت دلچسپ تھا سر"!

"واقعی میں! مجھے وہاں جانے کا اشتیاق ہو رہا ہے۔" ایک لڑکے کے کہنے پر سب مسکرا دیے تھے۔ پروفیسر کی کلاس کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اور انہیں سلام کرتے کلاس سے باہر نکل گئے۔ طلباء کی آخری قطار میں کونے میں بیٹھا وہ لڑکا، اپنی جگہ سُن بیٹھا پراجیکٹر پر نظر آتی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

نیلا پانی، طوفان سے بنتی بڑی لہریں، ڈوبتے جہاز، پراسرار مقام۔

"ہم سفید پانی میں داخل ہو رہے ہیں۔ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ پانی سبز ہے نہیں سفید ہے۔"

پانی سبز ہے، نہیں سفید۔ سبز، سبز۔

☆☆☆

بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے زمین کے ایک چھوٹے سے گوشے پر موجود چولا لانگ کارن یونیورسٹی کے اندر معمول کے مطابق چہل پہل جاری تھی۔ دور تک پھیلے اونچے درخت اور ان درختوں کے بیچ میں بنے راستے پر پاؤں رکھتے ہوئے سیدھ میں جائیں تو یہ راستہ ایک جگہ جا کر کیفے ٹیریا پہنچتا ہے۔ خوبصورتی سے بنا کیفے ٹیریا طلباء کی پسندیدہ جگہ تھی، فوڈی طلباء کی۔ مختلف میزوں کے گرد بیٹھے طلباء گپ شپ میں مصروف تھے۔ انہی میزوں میں سے کونے والی میز کے گرد وہ بیٹھی تھی۔ وہ، آپ کی ازا ہماری بیلا باجی۔

موبائل کی روشن اسکرین پر نظریں جمائے وہ ساتھ ہی جوس کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ آج اس کا موڈ کافی بہتر تھا۔

آج برمودا ٹرائی اینگل کے بارے میں سن کر اسے پہلی بار سمندر کو پڑھتے ہوئے مزہ آیا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی صحافت والی زندگی کو بری طرح یاد کر رہی تھی۔ اس کا سمندر میں کوئی کام نہیں تھا۔ زمین پر کم مسئلے تھے جو وہ سمندروں کی طرف چل پڑتی؟!

خیالوں میں گم، جوس کے گھونٹ بھرتے ہوئے اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ کب کوئی اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا تھا۔ یا آنے والا خاصا محتاط تھا یا وہ یہاں حاضر ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھی۔

"آپ ہمیشہ دنیا و مافیہا سے بے گانہ رہتی ہیں؟!" اس نے چونک کر سامنے دیکھا تھا اور اسی چونکنے میں جوس کے چند قطرے اسٹرا سے چھلک کر اس کے سفید کوٹ پر داغ چھوڑ گئے تھے۔ وہ مقابل کو زیرِ لب مسکراتا دیکھ کر لب دانتوں میں دبا گئی تھی۔

"مجھے جواب مل گیا۔۔۔ آپ کا شکریہ۔" وہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا۔ بدتمیز!

"ایسے اچانک آ کر بیٹھ نہیں جاتے مسٹر جندل! آداب و اخلاق ہمیں سکھاتے ہیں کہ سامنے کھڑے ہو کر آپ کو اجازت لے کر اور وہ بھی ایسے کہ خیالوں میں گم بندہ اچانک چونک نہ جائے، پھر بیٹھنا چاہیے اگر اجازت مل جائے تو!" اس نے اپنی خجلت مٹانے کے لیے اسے خاصا لمبا درس دیا تھا۔

"اخلاق و آداب نے یہ نہیں بتایا کہ اگر آپ دو تین بار "بندی" کو آواز دیں اور وہ نہ سنے تو کیا کرنا چاہیے؟!" اس نے "بندی" پر زور دیا تھا۔

"آئی ایم سوری، میں بس یہاں نہیں تھی۔" اس نے ہار مانی تھی۔

"اٹس اوکے نو پرابلم۔" اس نے چہرے کا رخ ذرا سا موڑ کر نگاہ ارد گرد ڈالی پھر کرسی سے ٹیک لگا کر سیدھا ہو کر بیٹھا۔ اور یہی وہ موقع تھا جب ازابیلا نے ٹھہر کر بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ ہلکے بادامی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس

خاکی رنگ کی شال دونوں شانوں سے گزار کر آگے سے اس کا ایک کونا بائیں کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ اور چہرہ، کشادہ پیشانی پر دائیں ابرو سے ایک سنی پلاسٹ ٹیڑھی ہو کر اوپر جا رہی تھی۔ چہرے پر چند خراشیں بھی تھیں۔ اور پھر اس کی نظریں اس کے ہاتھ پر ٹکی تھیں، بایاں ہاتھ جس پر پٹی بندھی تھی۔

”کسی سے پِٹ کر آئے ہیں؟“!

”پاکستان میں ہوتا تو یہ ممکن تھا لیکن یہاں یہ ناممکن سا ہے۔ چھوٹا سا ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا۔“ وہ مبہم سا مسکرایا تھا، جھوٹا۔ ازابیلا نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اگر وہ اس وقت ایک صحافی کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھی ہوتی تو یقیناً اسے اپنے سوالوں میں پھنسا کر ثابت کر دیتی کہ وہ پِٹ کر آیا ہے۔ لیکن آہ، وہ صحافت کو الوداع کہہ چکی تھی۔

”کل آپ کچھ کہنے آئی تھیں؟“ جندل نے بغور اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر اثبات میں ہلایا پھر آگے ہوئی۔ دونوں کہنیاں میز پر رکھیں۔

”جندل میں۔۔۔“ جندل کے عقب میں کسی کو دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی تھی۔ جندل نے ماتھے پر بل ڈالے مڑ کر دیکھنا چاہا تھا مگر وہ اسے روک چکی تھی۔

”نہیں دیکھیے گا۔ جندل، آپ میرے گروپ میمبر ہیں۔ ہم یہاں ایک ٹاپک ڈسکس کرنے بیٹھے ہیں۔ آپ بالکل بھی غیر ملکی نہیں ہیں اور آپ زیادہ بولنا پسند نہیں کرتے۔“ جندل ناسمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جندل کے عقب میں وہ لڑکا ازابیلا کو دیکھ چکا تھا اور اب انہی کی طرف آ رہا تھا۔

”ہیلو گائز!“ آفت ٹپک پڑی تھی۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے ازابیلا نے تھپڑ مارا تھا۔ ڈھیٹ!

”کیسی ہو ازابیلا؟“ وہ لڑکا دونوں ہاتھ ٹیبل کے کنارے پر رکھتا جھکا تھا۔ ازابیلا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات

ابھرے تھے، وہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹاتی کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی ۔

"میں ٹھیک ہوں۔ امید ہے تم بھی ہو گے، تھپڑ زیادہ زور کا نہیں تھا ناں۔ اور نہ ایکسیڈینٹ مزے کا تھا۔ افسوس کے ساتھ تم بچ گئے۔" وہ لڑکا ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ تھپڑ بالکل زور کا نہیں تھا اور نہ ایکسیڈینٹ مزے کا۔"

"میں نے یہی سوچ کر مارا تھا کہ تم عادی ہو۔ ایکسیڈینٹ کے لیے افسوس ہے مجھے۔" وہ اسے تپا رہی تھی۔ جندل کسی خاموش تماشائی کی طرح دونوں کو دیکھ اور سن رہا تھا۔

"میری کافی دن سے ابراہم انکل سے بات نہیں ہوئی، وہ ٹھیک تو ہیں؟" ازابیلا زیرِ لب مسکرائی تھی۔

"کم آن مائک! اب تم بچوں کی طرح بابا سے میری شکایت لگاؤ گے؟ تم مرد کب بنو گے؟!" وہ اسے اچھے طریقے سے رگڑ چکی تھی۔ بلکہ مسل کر پیروں تلے دے چکی تھی۔ مائک کے چہرے پر آتے جاتے مختلف رنگوں کو دیکھ کر ایک "خاموش تماشائی" مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

"یہ کون ہے؟" وہ اب جندل کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"انسان، جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔" جواب جندل نے دیا تھا۔ ازابیلا نے آنکھوں کے اشارے سے اسے خاموش کروانا چاہا مگر وہ اسے یکسر نظر انداز کر گیا۔

"اگر تم بھی دیکھ سکتے ہو تو یہاں سب ہی انسان ہیں۔ نام؟"

"میں اپنا نام جاننے کا اعزاز آپ کو کیونکر دوں؟" چچ چچ، بیچارہ مائک۔ اس نے شیروں کی کچھار میں ہاتھ ڈالا تھا۔

"تمیز ہے تم میں؟"

"میرے جواب کے بعد میرے سوال کا جواب آپ دے چکے۔ ہم لمبے پراسس سے بچ گئے۔"

"تم۔۔۔۔"

"مائک اگر مزید ذلیل نہیں ہونا تو تم گھر چل سکتے ہو۔" آواز ان کے دائیں طرف سے آئی تھی۔ ان تینوں نے آواز کے تعاقب میں نگاہیں دوڑائی تھیں۔ کہنے والا کہہ کر جا چکا تھا۔ وہ صرف اس کی پشت دیکھ سکے تھے۔ مائک نے دانت کچکچا کر جندل کو دیکھا۔

"تم سے تو میں نپٹ لوں گا، جانتے نہیں ہو تم مجھے۔ خود سے ایسا رویہ رکھنے والوں کی جان لے لیتا ہوں۔" اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا تھا۔ میز پر رکھا جوس کا گلاس چھلکا تھا۔ ازابیلا نے دانت کچکچا کر واپس جاتے مائک کو گھورا تھا۔ جندل نے مسکراتے ہوئے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر میز پر گرے جوس کے اوپر پھینکے تھے۔

"وہ کون تھا؟"

"مائک کا بڑا بھائی، مارک باربارا۔ اس سے خاصا بہتر! سلجھا ہوا، سنجیدہ اور عقل مند۔ یہ تو نمونہ ہے پورا۔" ازابیلا نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ "آپ کو اس کے منہ نہیں لگنا چاہیے تھا۔ یہ حد سے زیادہ بدتمیز ہے۔ بابا کی اور انکل کی گہری دوستی کا لحاظ میرے سامنے یہ کر لیتا ہے مگر کسی اور کے سامنے یہ بدتمیزی و بدتہذیبی کی ہر حد پار کر جاتا ہے۔" اس نے گہری سانس لی تھی۔

"دیکھ لیں گے اسے بھی۔ فی الحال تو اگلے لیکچر کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج بھی آپ کی بات سننے کا موقع نہیں مل سکا۔" اس نے معذرت خواہ نگاہوں سے اسے دیکھا ۔

"کوئی بات نہیں۔ باتیں اہمیت نہیں رکھتیں۔" وہ پھیکا سا مسکرائی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اپنا اسٹول ٹھیک کیا، اسے خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئی۔ جندل نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

”ضرار رات گھر نہیں آیا تھا؟“ سنگھار میز کے قد آور شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے احمد نے پوچھا تھا۔

”آیا تھا۔ وہ جانتا ہے جتنا بھی بھاگ لے لوٹنا اسے یہیں ہے۔“ حرم کبڈ سے اس کا کوٹ نکال لائی تھی۔

”حرم! بے چارے کی بات سمجھو۔ زبردستی نہ کرو اچھا نہیں ہے یہ۔“ احمد نے شیشے میں اپنے پیچھے نظر آتے حرم کے عکس کو دیکھا تھا۔ حرم نے کوٹ آگے بڑھایا تھا۔ وہ خاموشی سے کوٹ پہن کر اس کی طرف پلٹا تھا۔

”میں زبردستی نہیں کر رہی۔ نہ وہ نہ سعاد، دونوں مجھے راضی نہیں کر پا رہے۔ احمد وہ کوئی ٹھوس وجہ تو بتائیں انکار کی۔ سعاد کو شادی نہیں کرنی، ضرار کو سعاد سے شادی نہیں کرنی۔ کیوں؟ بس نہیں کرنی۔ ہے کوئی تک؟“ اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ احمد مسکراتے ہوئے اسے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتا دیکھ رہا تھا۔

”شاید دونوں کو کچھ وقت چاہیے۔“ اس نے ایک آخری کوشش کی تھی۔

”زندگی وقت نہیں دیتی احمد! وقت وقت نہیں دیتا۔“ اس نے نظریں اٹھا کر خود سے تھوڑا لمبے احمد کو دیکھا تھا۔ احمد نے اس کے آگے سر جھکایا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اس کے بال سیٹ کرنے لگی تھی۔

”مجھے سعاد اچھی لگتی ہے۔ وہ بہادر ہے۔ ہاں وقت نے اسے تھوڑا کمزور بنا دیا ہے اور شاید وہ مایوسی کا شکار بھی ہے لیکن احمد، میں نے اس کمزور ہوتی سعاد کو ایک مضبوط سہارا لیتے دیکھا ہے۔ وہ بہت کمزور ہوتی جا رہی ہے لیکن وہ اپنے رب کے اتنے قریب ہوگئی ہے کہ وہ سب سے زیادہ مضبوط ہوگئی ہے۔ آج اسے دیکھتی ہوں تو لگتا ہی نہیں ہے یہ وہی دو برس پہلے والی سعاد ہے۔ وہ بس مجھے اچھی لگتی ہے۔ وہ ایک اچھی بھابھی ثابت ہوگی۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر باندھتی پیچھے ہٹی تھی۔

”تم کہہ رہی ہو تو ایسا ہو گا۔ لیکن مجھے ضرار بھی اچھا لگتا ہے۔ تو ذرا دیکھ کر ہاں۔“ وہ ذرا سا سر جھکا کر ہنسی تھی۔

”جندل سے میں بات کروں یا تم کرو گے؟“

"تم کرو۔"

"نہیں ناں، سعاد سے بڑی ہوں بات منوالوں گی۔ ضرار سے بھی بڑی ہوں بات منوالوں گی۔ جندل سے بھی ہوں تو بڑی لیکن، تم پورے پانچ ماہ زیادہ بڑے ہو۔ مجھے امید ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔"

"جیسے آپ کا حکم!" احمد نے گردن کو خم دیا تھا۔ اس کی بیوی ماں کے مرتبے پر فائز ہونے والی تھی۔ وہ بس اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ کوئی بحث، نہ روک ٹوک۔ وہ جو چاہتی تھی وہ اسے کرنے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی حرم بھی اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے خوش تھے۔

"میں ضرار کو کمرے سے نکالوں منہ لپیٹے پڑا ہے تم آجاؤ نیچے ناشتہ لگا دیا ہے۔" وہ اسے تاکید کرتی کمرے سے نکل گئی تھی۔ احمد نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ سیڑھیاں اترتی دائیں طرف ضرار کے کمرے کے پاس پہنچی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بجایا۔ ضرار کو آواز دی، جواب ندارد۔

وہ دروازہ کھولتی اندر چلی آئی۔ کمرہ ایسے سمٹا ہوا تھا جیسے رات یہاں کوئی آیا ہی نہ ہو۔ حالانکہ وہ آیا تھا اس نے فجر کی نماز میں بذات خود اسے دیکھا تھا۔ وہ قدم بڑھاتی آگے آئی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ کھڑکی کے پار تنگ سی گلی تھی اور پھر دیوار جس کے پار دوسرا گھر تھا۔ وہ نالائق دیوار پھلانگ کر چھتوں کو ٹاپتا ہوا کہیں دور پہنچ چکا تھا۔

نالائق۔۔۔ بدتمیز!

☆☆☆

وہ فائل ہاتھ میں لیے اپنے ساتھ چلتے لڑکے کو تاکید کرتا اپنی آفس سے نکل کر راہداری میں چل رہا تھا۔ سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس ہمیشہ کی طرح سنجیدگی کے تاثرات چہرے پر سجائے دیکھنے والوں کو مرعوب کرتا وہ قدم اٹھا رہا

تھا۔ اس کی چال میں تیزی تھی اور احتیاط اتنی کہ بوٹوں کی آواز سنائی دے نہ قدموں کی چاپ۔

"خیام بات سنو۔" وارلڈ اپنی آفس سے نکلا تھا۔ وہ فائل اس لڑکے کو پکڑاتا ان کے مقابل جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں جب ساتھ کھڑے ہوتے تھے تو فیصلہ مشکل ہو جاتا تھا کہ اصل "باس" کون ہے؟

"جی کہیں۔" وارلڈ کچھ کہنے لگا تھا پھر اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔ چہرے پر آنکھ کے کنارے پر اور دائیں گال سے ٹھوڑی تک چند خراشیں تھیں۔ اور دایاں ہاتھ، آہ وہ پٹی میں جکڑا تھا۔

"کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟"

"جی، معمولی سا ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا۔" جھوٹا کہیں کا۔

"صحیح۔ دھیان رکھا کرو۔ کل والی میٹنگ۔۔۔" وارلڈ اس سے مختلف سوالات کرتا اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ مکمل توجہ کے ساتھ اسے سنتا وہ دل ہی دل میں جندل کو لعن طعن کر رہا تھا۔ چپ کر کے مار کھا لیتا وہ تو کون سے پیسے لگ جانے تھے اس کے؟ کوئی حرج بھی تو نہیں تھا ناں اس میں؟ تھا کیا؟!

☆☆☆

ان سب سے ہٹ کر اب اگر جائزہ لیں مائک بار بارا کا!

جس کے مرد ہونے پر آپ کی ازا اور ہماری بیلا کو شک ہے۔

عالیشان کمرہ، مکمل روشن اور جدید طرز کا بنا ہوا۔ بھورے رنگ کے صوفے جن میں سے ایک پر مائک بیٹھا اپنی عزت کا مزید جنازہ نکلنے کے انتظار میں تھا۔ جہازی سائز بیڈ اور اسے کے برابر میں سائیڈ ٹیبل اور پھر اس کے بعد فاصلے پر شیشے کی دیوار۔ دیوار کے پار نظر آتے منظر پر نگاہیں ٹکائے ایک شخص وہاں کھڑا تھا۔ سرمئی رنگ کے کوٹ پینٹ میں ملبوس اونچا اور لمبا مرد۔

”بھائی۔“ کتنا بے صبر اتھا وہ اپنی عزت کے جنازے کے لیے، چچ چچ۔

اس کا بھائی پلٹا تھا۔ سنہری رنگت اور شیو زدہ چہرہ، گہرے سیاہ بال اور گہری بھوری آنکھیں۔ اس کی آنکھیں ذہانت کی آئینہ دار تھیں۔ چہرے پر سختی تھی جو سٹپٹانے پر مجبور کر دے۔ وہ واقعی سلجھا ہوا۔ ذہین اور سمجھدار لگتا تھا، اور مرد بھی۔

”تم آئندہ ازابیلا کے آس پاس نظر نہیں آؤ گے۔“ وہ فیصلے سناتا تھا۔ حکم دیتا تھا۔

”لیکن بھائی اس نے مجھے تھپڑ۔۔“

”وہ نہ مارتی تو میں مارتا!“ وہ اس کی بات صفائی سے کاٹ چکا تھا۔ مائک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کسی لڑکی کے ساتھ اور لڑکی بھی ازابیلا جیسی تمہیں یہی بے ہودہ مذاق ملا تھا کرنے کو؟! اور معافی کے بجائے مزید ذلیل ہونے پہنچ گئے تھے وہاں؟ تم ایک نہیں دس تھپڑوں کے لائق ہو مائک! اپنا بندوبست کسی اور یونیورسٹی میں کرو اور اگر نہیں پڑھنا تو کہیں چلے جاؤ۔ یہاں سے نکلو اور دیکھو مرد کیسے بنتے ہیں۔“ وہ اپنی بات مکمل کر چکا تھا۔ اور مائک، وہ صدمے سے اپنے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھی وہ ابھی بیٹھے بیٹھے رونا شروع کر دیتا۔ بے چارہ مائک!

”کہاں جاؤں؟“ وہ حکم لیتا تھا۔

”اسپین۔“ بس، وہ حکم لے کر چلا گیا۔ حکم دینے والا واپس باہر کے نظاروں پر نگاہیں ٹکائے کھڑا ہو گیا۔ اونچے پہاڑ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر جھکے سفید بادل، نرم کسی مخمل کی طرح۔ ہلکا آبی آسمان اور پہاڑوں کے پیچھے چھپا ذرا سا دکھائی دیتا سورج۔ اس نے منظر پر پردے ڈال دیے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ گہرا اور طویل۔

☆☆☆

وہ میز پر رکھے سخت کاغذ پر جھکی پوری توجہ سے چند لکیریں کھینچ رہی تھی۔ سیاہ نم بال دائیں شانے پر پھسل گئے تھے۔ دوپٹہ شانے سے جھلک کر گود میں آن گرا تھا۔ چہرے پر بے فکری اور بے اعتنائی تھی۔ ہر چیز سے بے خبر وہ اپنی مکمل توجہ ان لکیروں پر مرکوز کیے بیٹھی تھی جو وقفے وقفے سے مختلف زاویوں سے وجود میں آرہی تھیں۔ مکمل گہری خاموشی میں قلم کی آواز دراڑ ڈال رہی تھی۔

اس کے سامنے لکڑی سے بنا اسٹینڈ تھا۔ خوبصورت اور نفیس سا جس پر کتابیں رکھی گئی تھیں۔ دائیں طرف ٹیرس کی طرف کھلنے والا دروازہ تھا اور بائیں طرف ذرا فاصلے سے مزید کتابیں رکھی تھیں۔ یہ کمرہ جندل کی محنت سے وجود میں آیا تھا۔ یہاں رکھی ایک ایک چیز اس نے ترتیب دی تھی۔ یہاں رکھی تمام کتابیں اس کی تھیں۔ نوہ کتابوں کا دیوانہ تھا اور سعاد کا کتابوں سے تعلق بس یونیورسٹی تک کا تھا، پھر رشتہ ختم۔ دونوں کی راہیں جدا۔

اب ذرا توجہ دیں کمرے کے کھلتے دروازے پر اور وہاں سے سر نکالتی حرم پر۔ پھر دیکھیں کرسی پر بیٹھی سعاد کو جو ہنوز اپنے کام میں مشغول تھی۔ آنے والی کی آمد سے بے خبر ہے۔ آنے والا، بے خبر۔

”اہم اہم۔“ حرم نے گلا کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ سعاد کا ارتکاز ٹوٹا۔ نئی زندگی لیتی وہ لکیر ہاتھ کے ہلنے سے کاغذ کے کونے تک پھیل گئی۔ اس نے گہری سانس لی پھر پینسل رکھ دی۔

”السلام علیکم۔ کیسے مزاج ہیں؟“ وہ کرسی کھینچتی اس کے برابر میں بیٹھی تھی۔

”وعلیکم السلام۔ اچھے تھے اب تک تو۔“ حرم نے اس کی بات میں چھپا مطلب سمجھنے پر اسے گھورا تھا۔

”جو بات میں کرنے آئی ہوں ناں تمہارے مزاج ایسے اچھے ہونگے کہ کبھی خراب نہیں ہونگے۔“ حرم نے فخر سے گردن اٹھائی تھی۔

”اللہ خیر کرے۔ آخری بار جب تم نے یہ کہا تھا تو جندل کا ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے میر اطوطا مر گیا تھا۔

اور اس سے پہلے میں مرتے مرتے بچی تھی۔ اور اس۔۔۔"

"اچھا بس بس۔" حرم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "ثابت کر دو تم میں منحوس ہوں۔ لیکن جو بھی ہے آج تو اپنی بات کہہ کر جاؤں گی۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

"سن لیتے ہیں۔ چائے پیو گی؟" وہ کرسی سے اٹھنے لگی تھی جب حرم نے اس کا بازو پکڑ کر اسے واپس بٹھایا تھا۔

"بیٹھو تم۔ چائے بھی پی لیں گے پہلے میرا ایک سوال ہے۔" حرم نے بغور سعاد کو دیکھا۔ "تمہیں ضرار کیسا لگتا ہے؟" سعاد پہلے اس کا سوال سمجھ نہ سکی تھی۔ سمجھ آنے پر بھی وہ کم فہمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئی تھیں۔ آنکھیں قدرے سمٹ کر چھوٹی چھوٹی ہو گئی تھیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب؟ تمہیں کیسا لگتا ہے وہ؟" حرم نے منہ بسورا۔

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" دھڑکنیں منتشر ہونے لگی تھیں۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

"میں تمہیں اپنی بھابھی بنانا چاہتی ہوں۔ تمہیں اگر کوئی اعتراض ہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے میں وہ اعتراض دور کر دوں گی۔ تم بس ہاں میں جواب دینا ٹھیک ہے؟" وہ کیا کہہ رہی تھی سعاد بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس کا ذہن شروع کے الفاظ پر ہی اٹک گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دماغ سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم پاگل ہو حرم! یہ ناممکن ہے۔ ضرار، ضرار نہیں۔" وہ دبی دبی آواز میں چلائی تھی۔ آنکھوں میں بے انتہا خوف تھا۔ خوف، کسی کو کھو دینے کا، عہد کے ٹوٹ جانے کا، دلوں کے روٹھ جانے کا۔

"ضرار کیوں نہیں؟!" حرم بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سعاد کا یہ ردعمل اس کے لیے حیران کن سے زیادہ پریشان کن تھا۔

"وہ۔۔ میں۔۔۔" اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ اس وقت الفاظ کا چناؤ کرنا اسے بے پناہ مشکل لگا تھا۔ وہ چند لمحے حرم کو دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلایا۔

"ضرار نہیں اور کوئی بھی نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گی۔" وہ کہہ کر جا چکی تھی۔ حرم نے گہری سانس لی تھی۔ اسے کچھ ڈھارس ملی تھی۔ سعاد کا ردعمل دیکھ کر اسے لگا تھا اسے ضرار سے کوئی مسئلہ ہے۔ لیکن اسے شادی سے مسئلہ تھا، اور ضرار کو سعاد سے۔ اور حرم ان دونوں کے یہ مسئلے جلد حل کرنے والی تھی، حرم دی گریٹ۔

☆☆☆

وہ کچن میں کھڑا اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔ سفید شرٹ کے کف مروڑ رکھے تھے۔ اس کی ہتھیلی سے اوپر تک ایک نشان تھا۔ نشان ایسے کہ جیسے کوئی دومنہ والا خنجر یا کسی شیر کا پنجہ ہو جس نے ہتھیلی سے اوپر اور کہنی سے ذرا نیچے تک اس کے بازو کو چیرا ہو۔ یہ نشان ہمیشہ سے اس کی ذات کا حصہ تھا۔۔ اب دونوں ایک دوسرے کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن وہ دنیا سے آج تک یہ نشان چھپاتا آیا تھا۔ جیسے اگر یہ ظاہر ہو گیا تو اس کی زندگی سے سکون مٹ جائے گا اور شاید وہ بھی۔

اس کے بال نم تھے اور ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ شاید وہ ابھی نہا کر نکلا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں کسی عقاب سی جرات اور حوصلے کی آئینہ دار بنی ہوئی تھیں۔ وہ شیلف سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اس کے برابر میں شیلف پر موبائل رکھا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے موبائل پر نظر ڈالتا کچھ سوچ رہا تھا۔ کسی کو سوچ رہا تھا، سعاد نے آج بھی کال نہیں کی تھی۔ ضدی پٹھانی!

چائے پک چکی تھی۔ وہ گہری سانس لیتا کپ میں چائے انڈیلنے لگا۔ چائے ڈال کر اس نے چولہا بند کیا۔ کف نیچے کیے نشان چھپایا پھر کپ اٹھایا، بائیں ہاتھ میں موبائل پکڑا اور کچن سے باہر نکل آیا۔ لاؤنج میں آتے ہی بچوں کے قہقہے اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ اور یہاں کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔

بدر، ہاں وہ چار نئے بچوں کے پاس بیٹھا انہیں اپنا تفصیلی تعارف کروا رہا تھا۔

بدر کا تفصیلی تعارف کچھ یوں ہوتا تھا:

"میرا نام مصعب الزرقاوی ہے۔ میرے دادا کا نام کعب الزرقاوی ہے۔ دونوں نام بہت بھاری ہیں تبھی میں نے دادا کے کعب میں جیم لگا کر ان کا نام جیکب کر دیا ہے اور اپنا مصعب کے ب سے بدر! یہ میرا خرگوش ہے۔ بدر کے ر سے اس کا نام روفی ہے۔"

بدر جندل کو کچن سے نمودار ہوتا دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کس سے پِٹ کر آئے ہو لالے؟" وہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑتا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی تھی۔

"تمہارے انتقام کی بھینٹ میں چڑنے والی میری جمع پونجی کا ازالہ کرنے آئے ہیں۔ میں نے کہا ناں آئی فون تو میں لے کر رہوں گا۔" جندل نے ان بچوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر باقی بچوں پر۔ یہ گھر بدر کی مرہونِ منّت گھر کم چڑیا گھر زیادہ لگ رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"بہت ذلیل انسان ہو تم بدر!" جاتے جاتے وہ اسے القابات سے نوازنا نہیں بھولا تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ شور وغل کی آوازیں کمرے کے باہر ٹھہر گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا بیڈ پر بیٹھا۔ بھاپ اڑاتا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور موبائل کی اسکرین روشن کی۔ وہ سعاد کا نمبر

ملانے والا ہی تھا کہ احمد کی کال آنے لگی۔ وہ موبائل کان سے لگا تا بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے ٹانگیں لمبی کر گیا۔

"السلام علکیم یا اہل القبور!" احمد کی چہکتی آواز پر وہ مسکرایا۔

"وعلیکم السلام یا کاہل الوجود!" دوسری جانب احمد ہنسا تھا۔

"کیسے یاد کیا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"پہلے خیریت پوچھو سب کی نکمے لڑکے۔" اسے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا تھا۔ ڈھیٹ جندل جسے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، نالائق۔

"سعاد آپی ٹھیک ہیں۔ حرم آپی خوش ہیں۔ آپ جناب کے ٹھاٹ لگے ہوئے ہیں۔ رہا بےچارہ ضرار تو اس کے گھر بدر ہونے کی خبر موصول ہو چکی ہے۔ وجہ جاننے کا اشتیاق رکھتا ہوں۔ جان کی امان دی جائے تو رازدار بننے کی خواہش ہے۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر لائے کسی "شاہ" کے حضور پیش تھا۔ شاہ کے حضور ایک شاہ، جسٹ واؤ۔

"حرم نے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں بھلا۔ ایک شادی شدہ انسان کچھ کر سکتا ہے بھلا؟!" احمد کی بے بسی پر اسے حقیقتاً ترس آیا تھا۔

"اللہ خیر کرے کہیں جان تو نہیں مانگ لی؟"

"جان نہیں حیات مانگی ہے۔"

"جان ہے تو حیات ہے۔ حیات مانگ کر تو جان اور دل دونوں مانگے ہیں۔ جان سکتا ہوں کس کے لیے؟"

"تمہاری ہمشیرہ، سعاد کے لیے!" وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکا تھا۔ آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔

"حیات صرف اس کی نہیں تمہاری بھی مانگی گئی ہے۔ دے سکتے ہو؟" وہ چند لمحے خاموش رہا تھا۔ صرف چند لمحے،

پھر اس نے سینے میں قید سانس خارج کی۔ پلکیں جھپکیں اور سر کو جنبش دی۔

”ضرار نے میری حیات اسی دن لے لی تھی جب اس نے آپی کی جان بچائی تھی۔ میں اس کا قرض دار ہوں، انکار نہیں کروں گا۔ لیکن آپی کے الفاظ کا احترام کروں گا۔ وقت مانگتا ہوں، ان کی مرضی جاننا چاہتا ہوں۔“ احمد نے سکون کی سانس لی تھی۔

”وقت دیا جاتا ہے۔ میں ذرا یہ خبر اپنی زوجہ کو سنا دوں۔ امید ہے وہ بھی سعاد کی طرف سے اچھی خبر لائیں گی۔“

”رشتے والے آنٹی انکل بنے ہوئے ہیں کیا؟“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

”تمہیں مدد کی ضرورت ہے کیا؟!“ دوسری طرف بھی احمد تھا۔

”نہیں۔ یہ کام خود کروں گا آپ سے سبق سیکھ لیا ہے۔“ وہ بھی پھر جندل تھا۔

”میری زوجہ نے سن لیا ناں تو پہلے تمہارا جنازہ اٹھے گا پھر تمہارے گھر میں شادیانہ بجے گا۔“

”شادیانے گھروں میں بجتے ہیں مکانوں میں صرف سکوت راج کرتا ہے۔ جنازے مُردوں کے اٹھتے ہیں جو اَمر ہو جائیں وہ اَبدی حَیات پاتے ہیں۔۔۔“!

اس کی آواز، ڈھلتے سورج کی سماعت سے ٹکراتی آخری آواز تھی۔ ہلکا آتشی آسمان اور اس پھر پھیلتی سیاہی، ایک لمحے کو سب ٹھہر گئے تھے۔ اس کے الفاظ، سر اٹھاتے چاند کے لیے پیغامِ حیات لائے تھے۔

☆☆☆

”السلام علی۔۔“ وہ اپنی دھن میں مگن لاونج میں داخل ہوتے ہوئے قانتہ کو سلام کرنے لگی تھی جب اس کی نگاہ صوفے پر قانتہ کے برابر میں بیٹھے زیاد پر پڑی۔ وہ فرصت سے اسے گھورنے میں مصروف تھا۔ اس نے نگاہوں کا رخ قانتہ کی طرف کیا۔ ”علیکم ماں۔“ اس نے سلام مکمل کیا۔ قانتہ کا پھولا چہرہ اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہا تھا۔

”کیا ہوا؟! تم کیوں آئے ہو؟ مطلب کب آئے ہو؟“ اس نے قانتہ کے گھورنے پر فوراً سوال بدلا تھا۔

”بتانے آیا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ لڑائی کی ہے۔“ وہ جو نجانے کیا سمجھے بیٹھی تھی اس الزام پر منہ کھولے زیاد کو دیکھ رہی تھی۔

”پوچھیں اس سے پھوپھو۔ اتنی زبان چلائی ہے اس نے۔ مجھے یتیم، بے سہارا، مسکین اور غریب ہونے کے طعنے دیتی ہے یہ۔ سگا بھتیجا ہوں آپ کا لیکن سوتیلا کہتی ہے مجھے۔“ ازابیلا نے دانت کچکچاتے ہوئے اسے دیکھا پھر جھک کر اس کے کوٹ کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں لائی۔

”کیا مصیبت ہے؟ پہلے ہی وہ بہت سناتی ہیں تم مزید بکواس کرو۔“ زیاد نے کمر پر ہاتھ باندھ کر اسے سخت نظروں سے گھورا۔

”تم نے مجھے مجبور کیا تھا۔ میری کال نہیں اٹھا رہی تھیں۔ لائبریری بھی نہیں آئیں تو کیا کرتا؟ مجھے بتاؤ تم خیام سے کیوں ملیں؟ اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں ازا تو کسی دن بینکاک میں آگ کی طرح یہ خبر پھیلے گی کہ معروف بزنس مین ابراہم وارلڈ کی بیٹی کئی ماہ لاپتہ ہونے کے بعد قتل کر دی گئی۔ خدا کا خوف کرو یار! تم نہیں جانتی کتنا بڑا ڈاکو ہے وہ۔“ ازابیلا چند پل کچھ کہہ نہ سکی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر زیاد کو اپنے الفاظ کے چناؤ پر افسوس ہوا تھا۔ اس نے گہری سانس لی پھر گویا ہوا۔ اس بار لہجہ قدرے نرم اور آواز قدرے ہلکی تھی۔

”ازا! تم ابراہم وارلڈ کی بیٹی ہو، اکلوتی بیٹی۔ کون جانے کب کون انکل کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر تمہیں ان کے خلاف استعمال کرے۔ تمہیں ان سب خطروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ خیام، میں جانتا ہوں وہ انکل کا ملازم ہے لیکن یقین کرو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں یہ شخص ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے آیا ہے۔ جیسے اس نے بابا کے ساتھ کیا تھا۔“

”رکو رکو زیاد رکو تم، نہیں ملی میں اس سے۔ اور کیا تم مجھے یہ سب سمجھاؤ گے؟ کون ہے وہ؟!“ وہ اس الجھی ہوئی کہانی

کو سن کر الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

"میں تمہیں کسی دن سب بتاؤں گا، سب کچھ۔ لیکن فی الحال براہ مہربانی کسی طرح کے بھی خطرے کو مول مت لو۔ اس قلم کی نوک کا پیچھا بھی چھوڑ دو۔ میری بات کا مان رکھنا ازا!" وہ منت کر رہا تھا۔ اور ازابیلا، اس کا تجسس مزید بڑھ رہا تھا۔ وہ قلم کی نوک اور خیام، اسے اس سب میں مزید دلچسپی ہو رہی تھی۔ زیاد جس انداز میں منت سماجت کرتا اسے اس سب سے دور رہنے کا کہہ رہا تھا، وہ دراصل انجانے میں اس کے تجسس کو بڑھا رہا تھا۔ وہ ازابیلا وارلڈ تھی، اتنی آسانی سے پیچھا کیسے چھوڑ دیتی؟!

"ٹھیک ہے۔ میں دور رہوں گی اس سب سے، پکا۔" اس نے زیاد کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔ زیاد نے سکون کی سانس لی تھی۔

"لیکن مسٹر، یتیم، مسکین، بے سہارا، غریب! تم مجھے سب بتاؤ گے۔" زیاد نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔ وہ سر کو جنبش دیتی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اور زیاد، وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر قانتہ کے بلانے پر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اندھیر رات میں چمکتے چاند کی روشنی اس کے کمرے کی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ مکمل اندھیرے میں ڈوبا کمرہ کھلی کھڑکی سے آتی روشنی سے بالکل ذرا سا روشن تھا۔ اتنا کہ کمرے میں موجود نفس کو دیکھا جا سکے۔ دونوں ٹانگیں لٹکا کر بیڈ پر بیٹھا کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے دونوں ہاتھ باہم ملائے وہ کسی کے انتظار میں تھا۔ کس کے؟!

ہر طرف چھائے سکوت پر کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش میں پیدا ہونے والی آواز نے چابک رسید کیے تھے۔ وہ فوراً سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کھڑکی کی طرف آ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ آنے والے نے اس کا ہاتھ تھاما اور کود کر

اندر آ گیا۔ اس نے فوراً کھڑکی بند کی، کھڑکی پر پردے ڈالے اور سوئچ بورڈ کی تلاش میں نکلا۔ بٹن دباتے ہی سارا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ اس نے مڑ کر بیڈ کے پاس کھڑے اس شخص کو دیکھا جو سیاہ جینز پر سیاہ ہوڈی پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر ماسک لگا تھا سر پر ہُڈ گری ہوئی تھی۔ یقیناً جب وہ اس طرف آ رہا تھا تو اس اندھیر رات میں اسے اندھیرے کا حصہ ہی سمجھا گیا ہو گا۔

''کوڈ ملا؟'' جندل کے سوال پر آنے والے نے اثبات میں سر ہلایا پھر سر پر گری ہُڈ دائیں ہاتھ سے پیچھے گرائی۔ ہلکے بھورے رنگ کے بال ذرا سے پھسل کر ماتھے پر گرے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ماسک اتارا اور جندل نے روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ وہی تھا جو سمندروں کا عاشق نہیں تھا۔ وہ وہی تھا جو سمندروں کے لیے قابلِ عزت تھا۔ اور جو بیک وقت عربی اور مغربی حسن کا مجسمہ لگتا تھا۔ وہ خیام تھا، خیام حنفی۔

جندل اس کے گال پر خراشیں دیکھ کر مسکراتا ہوا بیڈ پر بیٹھا۔ خیام نے سائیڈ ٹیبل سے ٹیک لگاتے ہوئے ہوڈی کی جیب سے ایک کاغذ نکالا۔

''یہ دیکھو ان اعداد و شمار کو حل کرنا ہے۔ یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ ہمیں جلدی کرنا ہو گی۔'' وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے کاغذ قلم کو اٹھاتا بیڈ پر جندل کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھا۔ جندل نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا پھر بغور اس پر لکھے اعداد و شمار کو دیکھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ذہن کے گھوڑے دوڑاتے ان اعداد و شمار کو حل کرنے میں مصروف تھے۔ ایک منٹ، پانچ منٹ آدھا گھنٹہ۔ دو گھنٹے، تین گھنٹے، اور دونوں نے راز پا لیا تھا۔

''آدم، غروب آفتاب، سوموار!'' خیام نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''اتنی تعداد میں لوگ بینکاک کے بڑے شہر میں سوموار کے دن غروب آفتاب کے وقت کہاں موجود تھے؟'' جندل نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

”کوڈ دینے والے نے خاصی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اب ہمیں بس یہ جاننا ہے اور تیسرا آدمی ہمارے سامنے ہو گا۔“ وہ اب اپنا لیپ ٹاپ کھول رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چلنے لگی تھیں۔ خیام ایک بار پھر ان اعداد و شمار کو دیکھنے لگا۔ ہر عدد کا پہلا حرف ہر تیسرے عدد کے آخری حرف سے ملتا تھا اور ہر عدد کا آخری حرف ہر دوسرے عدد کے پہلے حرف سے ملتا تھا۔ جیسے ایک، ایک کا الف تیسرے عدد کے آخر میں تھا اور ایک کا کاف دوسرے عدد کے شروع میں تھا۔ ان تمام یکساں حروف کو نکال کر بچنے والے حروف کو ان تمام یکساں حروف سے ضرب دینے کے بعد تفریق کر کے انہیں یہ الفاظ ملے تھے۔

آدم، غروب آفتاب، سوموار۔

”میں نے پا لیا۔ سوموار کے دن غروب آفتاب کے وقت عام طور پر بینکاک کی مین لائبریری میں لوگ اتنی ہی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ تیسرا آدمی لائبریری میں ہے خیام۔“

”سوموار کے دن غروب آفتاب کے وقت ہم لائبریری جا رہے ہیں۔“ اس نے گویا حکم صادر کیا تھا یا فیصلہ سنایا تھا۔

”مطلب ہم صبح جا رہے ہیں تیسرے آدمی سے ملنے۔“ خیام نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ بند کھڑکی کے پار رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر لمحے تاریکی بڑھ رہی تھی۔ ایک دائرہ ہو جیسے، ایک نقطے پر جب تاریکی حد سے زیادہ بڑھ جائے گی تو مٹ جائے گی۔ تاریکی کے دامن سے روشن صبح نمودار ہو گی۔ ایک نئی صبح، ایک نیا دن، ایک نیا راز۔

☆☆☆

وہ ایک گہرے سمندر میں تھی۔ سمندر گہرا نیلا تھا جس کی گہرائی میں جاتے ہوئے وہ گہرے نیلے سمندر کو گہرے سیاہ رنگ میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہر

گزرتے لمحے کے ساتھ اس پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ٹھہر رہی تھی۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پانی گہرا سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ مزید کوشش نہیں کر پا رہی تھی۔ پانی کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ نہیں سیاہ، نیلا۔ اور پھر اس نے اپنی جان نکلتی محسوس کی تھی۔ وہ ہوش و حواس کھو رہی تھی۔ پانی اسے خود میں سمیٹ رہا تھا اور وہ بکھرتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر اس نے محسوس کیا تھا کہ، وہ جان دے چکی ہے۔

وہ ایکدم ڈر کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پسینے میں شرابور تیز سانس لیتی وہ خوف سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جھٹکے سے وہ بیڈ سے اٹھی اور سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا۔ پورا کمرہ روشن ہو گیا۔ تیز ہوتے تنفس کے ساتھ وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈالنا چاہا تو ہاتھوں کی کپکپاہٹ کی وجہ سے جگ زمین بوس ہو گیا۔ اس نے شیشے کی بکھری کرچیاں اور زمین پر گرے پانی کو دیکھا تھا۔ اچانک اسے قے آئی تھی۔ وہ فوراً واشروم کی طرف بھاگی تھی۔ بیسن پر جھکتے ہوئے اس نے نل کھولا اور پھر وہیں قے کر دی تھی۔ پانی مسلسل بہہ رہا تھا اور وہ نڈھال سی بیسن پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے ہمت کر کے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے۔ ڈھیلے ڈھالے جوڑے سے نکلتی چند لٹیں بھیگ گئیں۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ آنکھیں لال ہو رہی تھیں، بے انتہا خوف اور نقاہت۔ جسم سے جان نکل رہی تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لیتی واشروم سے باہر آئی۔ ایک نظر شیشے کی بکھری کرچیوں پر ڈالی پھر کمرے سے باہر آئی۔ اسے کھلی فضا میں سانس لینا تھا۔ اسے چھت پر جانا تھا مگر اس وقت اس حالت میں اس کے لیے چلنا محال ہو رہا تھا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے، ٹانگیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اسے لگا تھا اگر وہ کچھ دیر مزید کھڑی رہی تو یہیں ڈھیر ہو جائے گی۔

بمشکل خود کو سنبھالتی وہ سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ ہر ایک قدم بڑھانے کے بعد وہ گہری سانس لیتی۔ آنکھیں زور

سے ہیچتی۔ لڑکھڑاتے ہوئے وہ چھت پر آئی تھی۔ چھت کے چاروں جانب چھوٹی سی چار دیواری تھی۔ جس سے بآسانی گھر سے ملے گھر کی چھت کو دیکھا جا سکتا تھا اور پھلانگا بھی۔

اس کے اوپر چاند تھا اور تارے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا، اسے ٹھنڈ محسوس ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ ایک دیوار کے پاس کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھ دیوار پر رکھے۔ بالکل ایسے جیسے نیچے جھانکنے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔

"الٰہی رحم!" اس نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں بند کی تھیں۔ کھلی فضا میں، کھلے آسمان تلے چاند کی روشنی میں نہاتے ہوئے گہری سانسیں لیتے ہوئے وہ خود کو اب قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ایک سکون سا اترا تھا دل میں اور دماغ میں، کچھ دیر پہلے دیکھے گئے خواب کا اثر دھیرے دھیرے جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ آنکھوں میں اب نمی تھی۔ تنہائی کا احساس تھا۔ لیکن اب وہ لال نہیں تھیں، اب وہ بہتر نظر آ رہی تھی۔

یونہی سامنے دیکھتے ہوئے اس نے دیکھا تھا ایک سایہ، اندھیرے میں ڈوبا سایہ جسے چاند کی روشنی آشکار کر رہی تھی۔ جو مختلف چھتوں کو پھلانگ رہا تھا۔ اور رخ، وہ اسی کی طرف تھا۔ اس کی سانسیں تھمنے لگی تھیں۔ تنفس بگڑنے لگا تھا۔ دل تھمنے لگا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ اس کے اور سائے کے درمیان صرف دو چھتوں کا فاصلہ ہے تو وہ پوری قوت سے چیخ اٹھی تھی۔ اس کی چیخ لرزا دینے والی تھی، دل دہلا دینے والی۔

☆☆☆

وہ تاریک سڑک تھی۔ بے انتہا تاریک۔ حیرت انگیز طور پر ایک ہی وقت میں تمام اسٹریٹ لائٹس بجھ گئی تھیں۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ سیاہی میں ڈوبا وہ ہر چند قدم چلنے کے بعد رک کر سڑک کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھتا پھر دوبارہ چلنے لگتا۔ اس کا تنفس پھولا ہوا تھا۔ چہرے پر بے انتہا خوف تھا۔ دونوں ہاتھوں کو رگڑتا وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر سامنے نگاہیں دوڑائیں۔ پھر وہ پیچھے پلٹا۔ اسے دور سے ایک

سایہ اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ اس کی سانسیں تھمنے لگی تھیں۔

”مائک، بھاگنا مت۔“ سایہ اس کے قریب آ گیا تھا۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

”کک۔۔ کون ہو۔۔ تت تم؟ کیوں بلایا ہے مجھے؟“ وہ اچھا خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کے مقابل وہ شخص اب اس کے کافی نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اس شخص کے عقب میں چاند تھا۔ چاند اور اس کی روشنی، جسے وہ شخص اپنی پشت پر روکے ہوئے تھا۔

”سنا ہے ہر خاندان کا آخری چراغ کافی بد تہذیب ہوتا ہے۔ ایسے چراغوں کو بجھا دینا بہتر ہوتا ہے!“ اس نے تیزی سے جمے ہوئے دائیں ہاتھ کا مکا مائک کے منہ پر مارا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ اگلا شخص اس کے سنبھلنے تک اپنی ٹانگ کام میں لا کر اسے درد سے دوچار کر گیا تھا۔ مائک نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی تھی اور نتیجتاً اگلے ہی لمحے وہ سڑک پر ڈھیر تھا۔ وہ شخص اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھا سختی سے بند ہاتھ کے مکے اس کے گال پر رسید کر رہا تھا۔ ایک دو۔۔ تین۔۔۔ یہاں تک کہ وہ کالے دستانے خون آلود ہو گئے۔ مائک ہوش و حواس کھونے کے قریب ہو گیا۔ وہ شخص ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”جان دینے والوں کو جان لینے کی دھمکی دینا فضول ہے مسٹر مائک! یہ الفاظ یاد رکھنا۔“ مائک نے بند ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ چاند کی روشنی میں نہایا وہ مکمل سیاہ لباس میں موجود تھا۔ نہ چہرہ واضح تھا نہ آنکھیں۔ ہاتھ، تو ان پر بھی دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔

وہ شخص جانے لگا تھا مگر پھر رک گیا۔ پلٹ کر سڑک پر گرے مائک کو دیکھا پھر واپس آیا۔ مائک پر جھکا اور زوردار مکا اس کی گردن کے ایک طرف رسید کیا۔ پھر گردن کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔ اندھیرے میں چلتے

چلتے وہ گم ہو گیا۔

پیچھے سڑک پر گرا مائنک بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد وہ وارلڈ سے گپ شپ کر کے واک کے لیے باہر آئی تھی۔ وارلڈ نے اسے ایک گارڈ کو ساتھ لے جانے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ اس نے وارلڈ کی بات کا مان رکھا تھا۔ مگر گارڈ بے چارہ اپنی موٹی توند کے ساتھ زیادہ دیر اس کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پایا اور پھر کچھ دیر بعد وہ گلیوں ہی گلیوں میں ازابیلا کو کھو چکا تھا۔

گارڈ کے سائے سے آزاد ہونے کی تسلی کرنے کے بعد اس نے اپنی رفتار کم کی تھی۔ چاند کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہوئے وہ منزل سے انجان بس بینکاک کی گلیوں میں گھوم رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح، بے فکری سے اور آزادی سے۔

وہ زیاد کی باتوں پر غور کر رہی تھی اور اس قلم کی نوک پر۔ بدر اور جندل پر بھی، اور خیام پر بھی۔ جانے کیوں اچانک سے اس قتل کے بعد سب بدلنے لگا تھا۔ جندل منظر عام پر آیا پھر بدر، پھر خیام پھر ایملی غائب ہوئی اور وہ قلم کی نوک ہر بار ایک نئی جگہ پر ملنے لگی۔ سب کچھ بہت الجھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سرا نہیں تھا جسے تھام کر وہ کہانی کے آخر تک پہنچ جاتی۔ سب کچھ بہت عجیب سا تھا۔ کون جانتا تھا کہ سب کچھ محض اتفاقاً تھا یا کوئی ترتیب دیا گیا کھیل؟!

"آواز نہ آئے۔ خاموشی سے تم مر و گے۔" وہ ایک سرگوشی تھی۔ اس کے بڑھتے قدم فوراً تھمے تھے۔ سرگوشی اس کے بہت قریب سے کی گئی تھی۔ وہ گلی کے کنارے پر تھی۔ ذرا سا رخ موڑنے پر وہ نئی گلی کا سرا دیکھ سکتی تھی۔ کسی کی سسکی اس کے کانوں میں پڑی اور تب اسے سب یاد آنے لگا۔ تھائلینڈ اکیلی عورت کے لیے غیر محفوظ ہے۔

یہاں عورتوں کو اپنی حفاظت کا سامان آپ کرنے کے تحت رات کے وقت تنہا ٹیکسی میں بیٹھنے سے بھی منع کیا جاتا ہے۔ گلیوں میں ہونے والے چوری اور اغوا کے کیسز کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اس نے اس سب کو جھٹکنا چاہا تھا۔ وہ اتنی کمزور نہیں تھی، اپنی ہمت پر بھروسہ کرکے اس نے رخ موڑا تھا۔ وہ نئی گلی کے سرے پر کھڑی تھی۔

اس نے دیکھا تھا، ایک شخص مکمل سیاہ لباس میں ملبوس سیاہی میں ڈوبا ہوا دوسرے شخص کو دیوار سے لگائے کھڑا تھا۔ دوسرا شخص دبی آواز میں رو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش جانے پہچانے سے تھے۔ وہ جیک تھا، ایملی کا بوائے فرینڈ جیک۔

اور پھر اس ظالم شخص نے شیشے کا ایک ٹکڑا نکالا تھا جو چاند کی ذرا سی روشنی میں چمکا تھا اور اگلے ہی لمحے اس شخص کی شاہ رگ کاٹ چکا تھا۔ خون کے کچھ چھینٹے ازابیلا کے ماتھے اور ہاتھ پر پڑے تھے۔ اس نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ روکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے انسانیت کا قتل ہو چکا تھا۔

اس شخص نے ازابیلا کو دیکھا۔ دھیرے سے دستانے میں چھپا اپنا خون آلود ہاتھ اٹھایا۔ انگشت شہادت اپنے لبوں تک لے گیا۔ اور بس، اسے خاموش کروا دیا۔ ازابیلا نے دیکھا تھا اس کے چہرے پر ماسک تھا اور آنکھیں کچھ سر پر گری ہُڈ اور کچھ اندھیرے کے باعث نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرکے وہ جا چکا تھا۔ ازابیلا نے کپکپاتے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے اور ایک خوف بھری نگاہ اس لاش پر ڈالی اور پھر وہ جتنی رفتار سے بھاگ سکتی تھی وہ بھاگ رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں تیزی سے بھاگتے ہوئے اسے اپنے گال بھیگتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی، اس

کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اور پھر اس کا رونا سسکیوں میں بدل گیا۔ رفتار مزید تیز ہو گئی۔ بینکاک کی گلیوں میں بھاگتے ہوئے تاریک ہوتی رات کے ساتھ وہ کہیں گم ہو گئی۔

☆☆☆

وہ بگڑتے تنفس سے بھاگتی ہوئی جب وارلڈ ہاؤس کے دروازے پر پہنچی تو اس کا حال دیکھ کر چوکیدار نے بوکھلاہٹ میں جلدی سے دروازہ کھولا۔ اس کے خون آلود ہاتھ اور خطا اوسان وہاں کھڑے گارڈز کو بھی چونکا گئے تھے۔

"میم آپ ٹھیک ہیں ؟!" کسی نے ہمت کر کے اس سے پوچھا تھا۔ وہ رکی نہیں تھی نہ اس نے جواب دیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اندر کی جانب بڑھی تھی۔ گارڈز اس کے پیچھے لپکے تھے۔ مرکزی دروازے سے وارلڈ ہاؤس کے اندرونی حصے تک کی مسافت میلوں دور جا پہنچی تھی۔ اس کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دوڑتے گارڈز کے بوٹوں کی آواز اندھیر رات میں چھائے سکوت میں حائل ہو رہی تھیں۔

"میم رکیں پلیز آپ ٹھیک نہیں ہیں۔" اس نے دیکھا تھا کہ وارلڈ ان بھاری بوٹوں کی آواز اور گارڈز کی آواز پر باہر نکل آیا تھا۔ وہ رک گئی۔ پتھریلی نظروں سے وارلڈ کو دیکھا۔ دھڑکنوں کی رفتار سست پڑ گئی۔ سانسیں تھمنے لگیں۔ اس نے پلک جھپکی۔ ایک دوسرے میں پیوست لب جدا ہوئے۔ "بابا۔۔۔" ٹانگوں نے مزید ساتھ دینے انکار کر دیا۔ وہ گرنے لگی تھی۔ وارلڈ نے آگے بڑھ کر اسے تھاما تھا۔ وہ اس کے مضبوط بازوؤں میں جھول گئی۔

"ازابیلا بیٹے آنکھیں کھولو۔" وہ اس کا گال تھپتھپا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ رگڑ رہا تھا۔ دیوانہ وار اس کی پیشانی چوم رہا تھا۔ گارڈز ساکت کھڑے ابراہم وارلڈ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سنجیدہ شخص گویا پتھر ہو، اپنی بیٹی کے لیے موم سے بھی زیادہ نرم تھا۔ اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔

”فوراً گاڑی نکالو فوراً!“ وہ چلایا تھا۔

”ازابیلا بیٹے بابا کی طرف دیکھو آنکھیں کھولو بچے۔“ اس کی آواز مدھم ہوتی جارہی تھی۔ اندھیر رات نے وہ منظر بھی دیکھا تھا جب وارلڈ ہاؤس کے دروازے کھلے تھے اور ایک قطار کی صورت میں کئی سیاہ رنگ کی گاڑیاں سڑک پر آگے پیچھے دوڑتی ہوئی دور نکل گئی تھیں۔ پھر وہی سکوت، وہی خاموشی۔

☆☆☆

وہ حرم سے ناراض ہو کر گھر سے نکلا تھا اور وہ تب تک واپس نہ آنے کی قسم اٹھا چکا تھا جب تک حرم اپنا فیصلہ بدلنے والی نہیں تھی۔ لیکن شومئی قسمت کہ جب کمانڈر سے اس نے رات ایجنسی میں گزارنے کی اجازت مانگی تھی تو کمانڈر نے تاریخی جواب دیا تھا۔

”گھر سے لڑ کر آئے ہو تو تمہارا اگلا قدم ایجنسی سے باہر کی طرف اٹھنا چاہیے۔ ہم ایک اور ”سعاد“ کو نہیں بھگت سکتے“!

وہ بے چارہ، معصوم، بے سہارا خون کے آنسو روتے دل کو سنبھالتا اپنا سامنہ لے کر واپس گھر کی طرف جارہا تھا۔ انا کا مسئلہ تھا ورنہ وہ ضرور اچھے بچوں کی طرح دروازے سے جاتا۔ ناک ذرا اونچی تھی تو وہ گھر سے ملے گھر کا فائدہ اٹھاتا مزے سے چھتیں ٹاپتا خراماں خراماں گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ خاموشی تھی سناٹا تھا کسی طوفان کی آمد تھی۔ دل بچہ تھا سمجھ نہ پایا اس خاموشی کا مطلب کیا ہے؟! دماغ سو چکا تھا، چھٹی حس کو سلا دیا گیا تھا تبھی وہ آنے والے خطرے کی بو سونگھ نہ پایا۔ کوئی جاگ رہا تھا تو وہ ”وہ“ تھا۔ نگاہیں ارد گرد دوڑاتا وہ ایک آخری چھت ٹاپنے لگا تھا جس کے آگے اس کا گھر تھا۔ اس کا کمرہ اور نرم بستر۔ اس کے قدم اٹھانے سے پہلے ہی اس کے گناہگار کانوں نے ایک چیخ سنی تھی۔ نسوانی چیخ جو ایک ہی تھی لیکن خاصی لمبی تھی، جاری و ساری۔

اس نے چونک کر سر اٹھا کر رات کے اندھیرے میں روشن چاند کی روشنی میں بغور سامنے دیکھنا چاہا۔ وہاں جندل کے گھر کی چھت پر ایک سایہ کھڑا تھا جو یقیناً سعاد تھی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ کہانی سمجھ گیا لیکن مقابل ذرا کوڑھ مغز تھی۔ مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔ شاید وہ اس کا اشارہ سمجھ جائے چپ ہو جائے رحم کھالے لیکن مقابل اشاروں کی بات سمجھنے والوں میں سے نہیں تھی۔

اسے ایک آخری حل نظر آیا تھا۔ وہ تیزی سے چھت پھلانگتا فاصلہ کم کرنے لگا تھا۔ اپنے گھر کی چھت پر پہنچ کر اس نے ایک اور چھلانگ سعاد کے پاس لگائی تھی۔ سعاد تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بھاگتی سیڑھیوں اور چھت کے درمیان حائل دروازے کو بند کر گئی۔ وہ خاموش ہو گئی تھی، وہ کامیاب ٹھہرا تھا۔ ہاتھ جھاڑتے ہوئے وہ بند دروازے کو دیکھ کر گردن ترچھی کر کے ہنس دیا تھا۔

"سعاد، میں ہوں ضرار۔" دوسری جانب بند دروازے سے پشت لگائے لمبے لمبے سانس لیتی سعاد کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ حیرت سے سامنے دیکھے گئی۔

"ضرار؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"جی میں۔" آواز میں شرارت تھی۔ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔ چہرہ غصے اور شرمندگی کے باعث لال پڑنے لگا تھا گویا اس کے پٹھان ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے دروازے سے ہٹ کر پلٹ کر دروازے کو دیکھا۔

"گورخر۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے غرائی تھی۔ ضرار نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

"تمہارے لیے کیا تمہاری بہن نے گھر کے دروازے بند کر دیے تھے جو چوروں کی طرح چھتیں پھلانگ رہے تھے؟ تم ضرار تم نے پچھلی بار بھی یہی کیا تھا۔ گھر میں گھس آنے والے وہ ڈاکو میری جان لیتے یا نہ لیتے تمہاری اینٹری نے میری تقریباً جان نکال لی تھی۔" وہ غصے میں تھی لا حد غصے میں۔ ظاہر ہے اس کی اس حرکت نے اسے ڈرپوک

اور بے وقوف ثابت کیا تھا۔ ضرار کے سامنے اس کی تذلیل ہوئی تھی، یہ عزت کا معاملہ تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں سعاد، گھر والوں سے ذرا ان بن ہوئی ہے تبھی یہ طریقہ استعمال میں لانا پڑا۔ بہت معذرت!"

سعاد نے گہری سانس لی تھی۔ عجیب منظر تھا۔ ضرار کھلی چھت پر کھڑا چاند کی روشنی میں مسکراتے ہوئے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ دروزے کے پار سعاد لال چہرہ لیے اپنی سانسیں بحال کر رہی تھی۔ خاموشی ہی خاموشی تھی۔ سکوت، جسے توڑا تھا گھر کی بجتی گھنٹی نے۔

"جائیں۔ آپ کی چیخ نے محلے والوں کو بھی جگا دیا ہے۔ براہ مہربانی میری موجودگی کا مت بتایئے گا۔"

"تم یہیں کھڑے رہنا، اگر گئے تو حرم کو بتا دوں گی کہ تم چھتوں کو ٹاپتے پھر رہے ہو۔" اسے دھمکی دیتی وہ نیچے چلی گئی۔ ضرار مسکراتے ہوئے چھت کے دائیں طرف کونے میں کھڑا ہوا□۔ وہ یہاں سے صحن کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ہریرہ اس سے اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا اور وہ اسے مطمئن کر رہی تھی۔□ ضرار کی طرف پشت تھی۔ لمبی سی چادر کو اپنے گرد اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے جیسے ہی دیکھا کہ ہریرہ نے جانے کے لیے قدم اٹھایا ہے وہ فوراً پلٹ گیا۔ سیڑھیوں کے دروازے کے پاس کھڑا وہ انتظار کرنے لگا۔ انتظار زیادہ لمبا نہیں تھا اسے کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر سعاد کی آواز۔

"جندل رات کے اس وقت گھر آتا تھا تو اکثر بھوکا ہوتا تھا۔ تم نے کھانا کھایا ہے؟"

"نہیں، لیکن مجھے بھوک نہیں۔ آپ بس اجازت دیں اب گھر جاؤں گا۔" اس نے تکلف کا مظاہرہ کیا تھا۔

"حرم سے چھپ رہے ہو تو صبح ناشتہ بھی نہیں ملے گا۔ سوچ لو!" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ دال میں کچھ کالا تھا۔ یا شاید پوری دال ہی کالی تھی۔ وہ سعاد کو اچھے سے نہیں جانتا تھا مگر جانتا تھا۔□ وہ اتنی مہربان نہیں تھی۔

”میں کرلوں گا کچھ۔ آپ فکر نہ کریں۔ جندل کو اس کی بہن کا آسرا تھا مجھے نہیں ہے اسی لیے پریشان نہ ہوں میں بھوکا نہیں رہوں گا۔“ وہ ہنسنا چاہتا تھا، گردن گرا کر بہت سارا۔

”لیکن۔۔“ سعاد دال نہ گلتے دیکھ کر پریشان ہوئی تھی۔

”میں جاؤں سعاد؟“ اس کی شرارت بھری آواز پر وہ منہ بسور کر رہ گئی۔”فی امان اللہ۔“ سعاد کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ اسے اللہ کی امان میں دیتا چھت کے کنارے کی طرف بڑھا۔ پھر ٹھہر کر ذرا سی گردن ترچھی کر کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔

دروازہ کھولتی سعاد نے دھم کی آواز پر دانت کچکچائے تھے۔ اس کا اچھا خاصا پلان تھا اسے کھانے کا کہہ کر یہاں بٹھانے کا اور پھر حرم کو بلوا کر اس سے پٹوانے کا۔ مگر وہ سمجھدار تھا سمجھ گیا تھا۔

”گورخر!“ وہ بڑبڑائی تھی۔

☆☆☆

تاریک اندھیر رات اور روشن صبح میں چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ ایک وہ دنیا جو اسپتال کے اس کمرے سے باہر تھی اور ایک یہ دنیا جو اس کمرے میں بستر پر لیٹے وجود سے تھی، میلوں کی مسافت پر ٹھہر گئی تھیں۔ ساری رات کا جاگا وارلڈ یونہی اس کے سرہانے کھڑا اس کا منتظر تھا۔ اس کی کھلتی آنکھوں کا، اس دنیا کا، اس زندگی کا جو اس کی آنکھوں میں بستی تھی۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی تمام حیات کا کُل سرمایہ تھی۔ اس کی جان تھی، حیات تھی۔ اپنی حیات کو اس تکلیف میں دیکھنا اس کے لیے ازحد مشکل تھا۔ ایسا ہی کچھ حال ازابیلا کے دائیں جانب کھڑی قانتہ کا تھا۔ وہ آنکھیں موندے ایسے لیٹی تھی جیسے دنیا سے خفا ہو کر آنکھیں موند لی ہوں۔ خفگی اتنی تھی کہ نہ رحم آتا تھا نہ ترس۔ بائیں ہاتھ پر برنولہ لگا ہوا تھا اور پھر ڈرپ، مسلسل چلتی ایک ایک قطرہ اس کے جسم میں انڈیلتی،

زندگی کا پیام لاتی۔

طویل انتظار کے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وارلڈ اور قانتہ بے اختیار اس پر جھکے تھے۔ ڈاکٹرز کو بلایا گیا تھا۔ بس ایک پردہ ہٹا تھا اور اسپتال میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو جیسے۔

دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر اس نے خاموش نگاہوں سے وارلڈ کو دیکھا۔

"ڈرا دیا تھا آپ نے بیٹے۔" وہ اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ گیا تھا۔ قانتہ نے اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا تھا۔ اور وہ، وہ ابھی تک وہیں تھی۔ اسی گلی میں، اسی جائے قتل پر۔

اس نے قانتہ سے اپنا ہاتھ چھڑوایا پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ وارلڈ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی۔ ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ کاروائی ہونے لگی۔ اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے کا مشغلہ جاری رہا۔

"ازا کیا ہوا ہے تمہیں؟ خدا کا واسطہ ہے کچھ بولو بچے۔" قانتہ گڑگڑائی تھی۔ وہ کیسے اسے بتاتی اس نے انسانیت کا قتل ہوتے دیکھا ہے۔ وہ انسانیت کو بچا نہ پائی۔ وارلڈ جو اس کے ہوش میں آنے پر پرسکون ہوا تھا اب مزید پریشان ہو گیا تھا۔

"بیٹے کچھ تو بولو۔ کوئی مسئلہ ہے؟ کل رات کیا ہوا تھا؟ کچھ دیکھا ہے آپ نے؟!" منتیں، سوال، گذارشات۔ خاموشی، سکوت، مایوسی ناامیدی اور واپسی۔ پلٹتے قدموں کی چاپ، دروازہ بند ہونے کی آواز اور طویل انتظار۔

☆☆☆

"مائک، تم مجھے سن رہے ہو؟" کوئی جانی پہچانی آواز۔ دھندلا سا منظر، دھیرے دھیرے کھلتی آنکھیں۔ سوال سوال اور سوال۔ وہ آنکھیں کھول چکا تھا لیکن منظر اب بھی دھندلا تھا۔ آوازیں صاف تھیں دماغ دھیرے دھیرے کام کرنے لگا تھا۔ عقل والا کام نہیں!

"سب نظر۔۔ نہیں آرہا۔" بولتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا اس کے جبڑے تقریباً ٹوٹ چکے ہیں یا ہل چکے ہیں۔

"مارنے والا خاصا تجربہ رکھتا تھا۔ تم شاید اگلے تین سے چار دن سب دھندلا دھندلا ہی دیکھو۔ تمہاری بائیں آنکھ کافی متاثر ہوئی ہے۔" آواز مارک کی تھی۔ طنزیہ لہجہ، کھڑوس انسان، بدتمیز انسان۔ چھوٹا بھائی موت کے منہ سے واپس آیا ہے مگر مجال ہے لہجے میں ذرا بھی کوئی محبت ہو۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی؟! وہ اندر ہی اندر کلس کر رہ گیا۔

"وہ کون تھا؟" افف، ٹانگ میں بھی درد تھا اور گردن کے پیچھے بھی اور کمر میں بھی اور آنکھ تو ناکارہ ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اور جبڑے تو ویسے ہی ہل چکے تھے دانت بھی ایک دو تو لازمی ٹوٹے ہی ہونگے۔ مارنے والا خاصا تجربہ رکھتا تھا آفٹر آل۔

"یہی سوال میرا ہے!" سنجیدگی، غصہ، احساسِ تذلیل۔

"میں نہیں جانتا۔"

"مطلب اسٹیون بار بارا کے مہان بیٹے نے بیچ سڑک ایک ایرے غیرے سے چپ چاپ مار کھالی۔ تم واقعی مرد نہیں ہو مائک!" وہ اسے گھوری سے نوازتا بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کو اسے تلاش کرنا چاہیے اور ایسا سبق سکھائیں کہ اس کی آئندہ سات نسلیں یاد رکھیں۔"

"تم اپنی نسلوں کی فکر کرو!" سنجیدگی سے کہا گیا۔ احساسِ تذلیل کے مارے اس کا چہرہ لال پڑا تھا۔ ہونٹ بھینچ لیے

گئے تھے۔ مارک اپنی بات کہہ کر جا چکا تھا۔ اور وہ، اس کا دل چاہا تھا زمین پھٹے اور وہ اپنے مجرم کو اس میں گاڑ دے۔ بزدل تھا خود زمین میں سما نہیں سکتا تھا۔ ڈرتا تھا، مجال نہیں تھی کہ مارک کے بارے میں ایسا سوچ بھی سکے۔

☆☆☆

وہ فجر کی نماز کے بعد اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تھی۔ مکمل نیلے رنگ کی بڑی سی چادر میں چھپی وہ دودھ چولہے پر رکھ رہی تھی جب اچانک کوئی اس کے گلے سے لگا تھا۔ وہ ڈر کر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی □۔ وہ سعاد تھی، اس کا یہ انداز حرم کے لیے کافی حیران کن تھا۔

"سعاد تم ٹھیک ہو؟" وہ پریشانی سے اسے خود سے جدا کرتی اسے دیکھنے لگی۔ وہ رو رہی تھی۔ گال بھیگے ہوئے تھے۔ آنسو وہ کمزور باڑ توڑ چکے تھے جسے گذشتہ رات پار کرنے کی کوششیں ناکام گئی تھیں۔

"سعاد کیا ہوا ہے؟" وہ اس کے ہاتھ تھامتی پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے رونے میں مزید اضافہ ہوتے دیکھ کر اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا۔

"سعاد سعاد تم مجھے ڈرا رہی ہو۔ خدا کا واسطہ ہے کچھ بتاؤ کیا ہوا ہے؟" وہ اس کا سر سہلاتی اس کی منتیں کر رہی تھی۔

"میں۔۔۔ میں ڈر گئی تھی۔۔۔ حرم۔۔ میں ڈرتی ہوں موت سے۔۔۔ اور اور۔۔۔ ج۔۔ جدائی سے۔۔ میں مرنا نہیں چاہتی حرم میں مرنا نہی چاہتی۔" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ سسکیوں کے ساتھ رو دی تھی۔ آنسو گرم سیال کی طرح گالوں پر بہہ رہے تھے۔ گال، ناک اور آنکھیں لال لال ہونے لگی تھیں۔ حرم نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

"ایسی باتیں مت سوچا کرو پاگل لڑکی! تمہاری عمر بہت لمبی ہو گی۔ محبت کرنے والے مرتے نہیں ہیں سعاد!" سعاد خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ رونا وہ بھول چکی تھی۔ ذہن ان الفاظ پر ہی اٹک گیا تھا۔ کاش کاش وہ حرم کو بتا سکتی کہ،

محبت کرنے والے ہی تو مر جاتے ہیں۔ محبت جرم ہے اور موت سزا ہے۔ معافی تو وجود ہی نہیں رکھتی۔

”کوئی خواب دیکھا ہے تم نے رات کو؟“ وہ اس کے سوال پر سر اثبات میں ہلا گئی۔

”خواب کو خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔“ خواب، خواب تو اس نے جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھے تھے۔ وہ خواب جو خواب سمجھ کر خواب دکھانے والا بھول چکا تھا، افف۔

”پاگل ہو تم اتنا روتا ہے کوئی؟ بیٹھو ادھر میں چائے بناتی ہوں پھر مل کر پیتے ہیں۔ موڈ ٹھیک کرو اپنا۔“ وہ اسے کھینچ کر کرسی پر بٹھاتی تاکید کر رہی تھی۔ سعاد اب بھی خاموش رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی نگاہ کچن کے دروازے کے پاس نظر آتے اس سائے پر پڑی تھی۔ یہ سایہ، وہ سایہ۔

ضرار، وہ باتیں سن چکا تھا۔ ایک بار پھر احساسِ تذلیل، ایک بار پھر وہ اس کے سامنے ڈرپوک اور بے وقوف ثابت ہوئی تھی۔ وہ دانت کچکچاتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ وہ سایہ تیزی سے غائب ہو گیا۔ سعاد نے حرم کا بازو پکڑا اور تیزی سے اسے باہر لائی۔

”کہاں؟“

”چلو میرے ساتھ۔“ وہ غصے سے کہتی حرم کے ہمراہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ ضرار کے کمرے کے پاس رک کر اس نے ہاتھ سے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ حرم کم فہمی سے اسے دیکھتی آگے بڑھی اور دروازہ کھولا۔

اور پھر اس کی نظر کھڑکی کے پاس کھڑے ضرار پر پڑی جو دروازہ کھلنے کی آواز پر بس چھلانگ لگانے والا تھا۔

”رکو رکو تم آج تو گئے۔“ حرم نے تیزی سے پیچھے سے آ کر اس کا کان پکڑ کر مروڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ فرش پر تھی دوسری کھڑکی پر تھی۔ برے وقت میں پکڑا گیا تھا بے چارہ۔

”تمہیں کیا لگا تھا مجھے پتہ نہیں چلے گا ہاں۔ بولو آئندہ کرو گے ایسے؟“ وہ اس کا کان مروڑ رہی تھی۔

"کان چھوڑیں آپی کان چھوڑیں۔" وہ چلایا تھا۔"اور یہ میرے جن دشمنوں نے مخبری کی ہے ناں ان سے سارے حساب چکاؤں گا میں۔" وہ اپنا کان چھڑواتا پورے عزم کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"ابھی بھی زبان چل رہی ہے۔ جنگلی خر تم مرو گے آج۔" وہ اسے کان سے کھینچتی کھڑکی سے ہٹاتی بیڈ کے پاس لائی۔

"آئندہ کرو گے ایسے ؟!" غصے سے اسے گھورا گیا۔کان پر مزید زور دیا گیا۔

"سور نہیں کروں گا کان چھوڑیں۔۔!!!" وہ چلا اٹھا تھا۔

اس کی چیخیں، لاونج میں صوفے پر بیٹھی سعاد کے لیے باعثِ راحت تھیں۔ دل کا سکون تھیں، ٹھنڈک تھیں۔ ہائے، سارے حساب چکتا ہو گئے تھے، صرف چند لمحوں میں۔

☆☆☆

"کہاں جا رہے ہو؟" صوفے پر بیٹھا بدر گود میں بیٹھے روفی کے بال سہلاتا مشکوک نگاہوں سے جندل کو دیکھ رہا تھا۔

"تم چلو گے؟" جھک کر جاگرز کے تسمے باندھتے جندل نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"کہاں؟"

"ازابیلا کی عیادت کرنے۔ وہ اسپتال میں ہے، وجہ نہیں جانتا۔" وہ اسے برائے نام تفصیل بتاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"باجی خاتون تو اچھی ہیں ویسے۔ جانا چاہیے۔ کیوں روفی؟" اس نے روفی کے بال سہلاتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

جواباً روفی اچھل کر اس سے لپٹ گیا تھا۔ جندل نے گہری سانس لے کر دونوں نمونوں کو دیکھا پھر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ دونوں اسپتال کی راہداری میں قدم رکھ چکے تھے۔ ازابیلا کے

کمرے کا نمبر پوچھ کر وہ دونوں اب لفٹ میں دوسری منزل پر جا رہے تھے۔ سرمئی رنگ کے لوہے کے دروازے کے کھلتے ہی دونوں راہداری میں آئے اور مطلوبہ کمرہ نمبر دیکھ کر دونوں رک گئے۔ کمرے کے دروازے پر دو گارڈز کھڑے تھے۔ ان کا نام پوچھنے کے بعد ان میں سے ایک اندر خبر دینے چلا گیا۔

"بدر، ہم غلطی کر چکے ہیں۔ نکمے نالائق انسان پھول تو ٹیکسی میں ہی بھول آئے ہو۔" جندل نے دانت کچکچا کر بدر کو دیکھا جو اس کی بات سن کر تعجب سے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ سالا ٹیکسی والا، میں ابھی لاتا ہوں گدھے کو۔" بدر سر پر ہاتھ مارتا الٹے قدموں واپس بھاگا تھا۔ جندل کی نگاہوں نے تب تک اس کا پیچھا کیا جب تک وہ لفٹ میں نہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ آگے بڑھا۔ دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ اندر گیا اور پھر فوراً ہی باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بُکے تھا، خوبصورت سفید اور لال پھولوں کا بُکے

"آپ اندر چلے جائیں۔" گارڈ کے کہنے پر وہ سر کو ذرا سی جنبش دیتا کمرے کے اندر آیا تھا۔ ہر آسائش مہیا کرتا یہ بڑا سا کمرہ ازابیلا کے شایانِ شان تھا۔ ہر چیز خوبصورت اور نفیس تھی۔ یہ کمرہ کسی اسپتال کا کمرہ کم فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرہ زیادہ لگ رہا تھا۔

وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا اور پھول سائیڈ ٹیبل پر رکھے۔

"آپ کا اسٹیمنا واقعی میں کمزور ہے ازابیلا!" وہ مسکرایا تھا۔ بیڈ پر بیٹھی ازابیلا نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ صبح سے اس کے کئی ہم جماعت اور جاننے والے اس کی عیادت کے لیے آ چکے تھے، جندل بھی انہی میں سے ایک تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ جواب نہ پا کر فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔ ازابیلا نے سر اثبات میں ہلا دیا پھر ہاتھ سے اسے

سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اچانک سے اسپتال آنے کی نوبت کیونکر پیش آئی؟ کل تک تو بالکل ٹھیک تھیں آپ۔" اور ازابیلا کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام منظر لہرائے تھا۔ وہ قتل، وہ سرگوشی، خون آلود دستانے اور اس کا بھاگنا۔ سب سب!

"جندل۔" اس کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔ گال پر ایک آنسو لڑھکا تھا۔ اس نے بیڈ کراون پر سر ٹکائے گردن ترچھی کر کے بائیں طرف بیٹھے جندل کو دیکھا۔ "کسی کا قتل کرنا کتنا آسان ہوتا ہے؟" وہ جانے کیوں اس سے پوچھ رہی تھی۔ صبح سے خاموشی کا اوڑھا لبادہ اتار پھینکا تھا۔ تھکن کی آخری منزل تھی۔

"قتل آسان نہیں ہوتے، قتل میں جان صرف مقتول کی جاتی ہے لیکن نقصان قاتل کا ہوتا ہے۔ ایک جان سے جاتا ہے دوسرا روح سے جاتا ہے۔ مرنے والا مر جاتا ہے ازابیلا! جینے والا ہر لمحہ مرتا ہے۔ قتل سہل نہیں ہوتے!" وہ اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ آنکھیں میچ کر ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکیوں کو روکنے کی کوشش میں تھی۔

جندل نے بغور اس کے دھلے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر دائیں گال کے دائیں طرف ذرا نیچے ایک نشان تھا۔ ایک تیز دھار خنجر کی چوٹ یا سخت رگڑ، وہ نشان کچھ جانا پہچانا تھا۔ اور تب اس نے جانا تھا کہ، ماضی کے نشان صرف وہ ہی نہیں چھپاتا تھا۔ ازابیلا بھی پردہ رکھتی تھی۔ نجانے کیسے لگا تھا اسے یہ نشان؟!

"لوگ عادی کیوں ہو جاتے ہیں؟ کسی کی شاہ رگ کو، کسی کانچ سے کاٹتے ہوئے ان کے ہاتھ کیوں نہیں کپکپاتے؟!" وہ اپنے گالوں کو رگڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"عادی ایسے ہی نہیں ہو جاتے ازابیلا! انہیں کچھ بہت اچھا، کسی بہت بہترین کی امید ہوتی ہے۔ ایک قتل، ایک جان، بدلے میں سو جانیں غلام! قتل انسان خود نہیں کرتا۔ انسانی مقاصد اور انسانی خواہشات ہی قابیل کو ہابیل کا قاتل بناتے ہیں۔ مقاصد اور خواہشات، زندگی اور موت، آغاز اور انجام۔ کیا سمجھیں؟" وہ اختتام میں مسکراتے

ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”کسی کا مقصد قتل کیسے ہو سکتا ہے جندل؟! انسان یہ کیسے کر سکتا ہے؟!“ وہ بے بس ہوئی تھی۔

”زندگی کا مقصد موت ہی تو ہے ازابیلا! موت شاہ رگ کے کٹنے سے آئے یا دل کے رکنے سے، کوئی فرق پڑتا ہے بھلا؟ شاہ رگ کاٹنا اور دل روکنا یہ تو ہر زمانے کا دستور ہے۔ دو شاہ ایک زمانے میں نہیں رہ سکتے۔ ایک قاتل ہو گا دوسرا مقتول، ایک ظالم ہو گا دوسرا مظلوم، ایک غالب ہو گا دوسرا مغلوب“!

”یہ تفریق کیوں؟“!

”امتحان لینا مقصود ہے۔ ایک کو جان دے کر دوسرے کی لے کر، آنکھیں کس کی برستی ہیں؟ اطاعت کون کرتا ہے؟ معلوم تو ہو صداقت کس میں ہے اور صدیق کون ہے؟“!

”مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہیں جندل!“ وہ اس کے بے چارگی سے کہنے پر ہنس دیا تھا۔

”ابھی آپ ٹھیک ہو جائیں۔ ہم کسی دن کھل کر بات کریں گے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈال کر وہ جانے کے لیے مڑا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے سیاہ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک چاکلیٹ برآمد کیا۔

”آپ سیب کھا کھا کر تنگ آ گئی ہو نگی۔“ اس نے چاکلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ازابیلا مسکرا دی۔ جندل نے رک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی نم تھیں، چہرے کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ اور مسکراہٹ میں وہ توانائی نہ تھی۔

وہ اسے سلام کرتا باہر نکل آیا۔ ازابیلا دیر تک بند دروازے کو تکتی رہی۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے راہداری میں چلتا جندل آنکھوں کے آئینے میں کسی کی ابھرتی تصویر کو بار بار جھٹک رہا تھا۔ دل بار بار گواہی دے رہا تھا۔

"ازابیلا وہ نہیں ہے۔ نہیں ہے، نہیں ہے"!

شک تھا۔ شک، شک کی آخری منزل انکار۔ انکار، انکار کی آخری حد اقرار۔

☆☆☆

اس نے آدھے گھنٹے کی محنت کے بالآخر ٹیکسی والے کو پکڑ ہی لیا تھا۔ اسے ٹھیک ٹھاک سنا کر، اس کے ساتھ جھگڑا کر کے جب وہ مزید آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے اسپتال پہنچا اور جب بیلا باجی نے اسے بتایا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے یہ پھول جندل دے کر گیا ہے تو اس کا دل کیا تھا وہ اس لالے کا سر پھاڑ دیتا۔ ورنہ دانت تو توڑ ہی دیتا، ٹھیک ہے تنہا ملنا تھا تو ساتھ لے جانے کی آفر ہی کیوں کی؟! اور اگر آفر کی ہی تھی تو سڑکوں پر ایک گھنٹہ خوار کیوں کروایا؟! ذلیل انسان۔

"ظلم ہوا ہے میرے ساتھ بیلا باجی!" وہ معصومیت سے کہتا سائیڈ ٹیبل پر رکھی پلیٹ میں پڑے سیبوں میں سے ایک سیب اٹھا رہا تھا جو غالباً قانتہ ازابیلا کے لیے رکھ کر گئی تھی۔ لیکن اس کا بھی تو قصور نہیں تھا ناں؟ توانائی تو اس کی بھی ضائع ہوئی تھی۔

"بھائی کا ساتھ دینا چاہیے آپ کو۔ چل کر اس لالے کے دانت توڑ کر آتے ہیں۔ عربی والا خبیث!" اس نے سر جھٹکتے ہوئے سیب میں اپنے دانت گاڑے تھے۔ سیب وہ واحد چیز ہے جس پر انسان اپنا غصہ بہترین طریقے سے نکال سکتا ہے، جتنا زیادہ غصہ اتنی طاقت سے دانت گاڑ دو۔

"مہذب لوگ بہنوں کے سامنے گالیاں نہیں دیتے بدر!" اس کی بیلا باجی بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"گالی نہیں ہے۔ عربی میں خبیث برے کو کہتے ہیں۔" ایک بار پھر سیب میں دانت گاڑے گئے۔ زور سے، جان لگا

کر۔

”سمجھدار ہو۔“ آواز مردانہ تھی۔ ازابیلا نے سر اٹھا کر بدر کے پیچھے کھڑے وارلڈ کو دیکھا تھا۔ اور بدر، وہ اس آواز کو جمِ غفیر میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وارلڈ وارلڈ، وہ اس کی شخصیت کا فین تھا۔ وہ اس کے ہر انداز میں ڈھلنا چاہتا تھا۔ وہ قالب جس میں وارلڈ نے خود کو سمیٹا تھا وہی قالب چاہتا تھا۔ اس کا چلنا، اٹھنا، بیٹھنا، بولنا، مسکرانا، ہنسنا، غصہ کرنا، وہ اس کی ہر عادت ہر انداز پر غور کرتا تھا۔ اسے اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ وارلڈ سے کبھی براہِ راست نہیں ملا تھا۔ یونہی سڑک پر جب کئی گاڑیاں قطار میں جاتیں، گاڑیاں سیاہ رنگ کی ہوتیں، لوگ انہیں جگہ دینے لگتے تو وہ سمجھ جاتا تھا آنے والا وارلڈ تھا۔ کوئی میٹنگ کوئی ملاقات جب ٹی وی پر آتی وہ تب اسے دیکھا کرتا تھا اور اکثر وہ وارلڈ گلاس کمپنی کے باہر اس کے انتظار میں کھڑا ہوتا تھا۔ کبھی نہ کبھی وارلڈ باہر آئے گا اور وہ ایک جھلک تو دیکھ ہی لے گا۔ بدر نے اپنا بچپن اس ملک میں گزارا تھا۔ اس شہر میں گزارا تھا۔ وارلڈ اس کے لیے ہیرو تھا۔ ایک آئیڈیل، بچپن کا ہیرو، جوانی کا آئیڈیل۔

لیکن، اس سب کے باوجود اس کی ان تمام تر سوچوں سے انجان وارلڈ کے لیے وہ ایک معمولی اخبار والا تھا۔ ایک اخبار والا، ان کی بیٹی کے سامنے مزے سے بیٹھا سیب کھا رہا تھا۔ دلچسپ!

وہ سیب سائیڈ پر رکھتا اٹھ کھڑا ہوا اور لب کاٹتے ہوئے پیچھے مڑا۔

”گڈ مارننگ سر۔“ غالباً وارلڈ کو دیکھ کر سرخی میں چھپتی اس کی شام نیلگوں آسمان پر صبح کی مانند ہوگئی تھی۔ ازابیلا نے اس کی بوکھلاہٹ پر بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

”آپ کی تعریف جناب؟“ وہ پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ ڈالے ذرا سا مسکراتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ مزید تذبذب کا شکار ہو رہا تھا۔

”میرا نام بدر ہے اور یہ میرا اخر گوش ہے۔ بدر کے ”ر“ سے اس کا نام روفی ہے۔“ لعنت! اس کا دل کیا تھا خود کو ایک دو چپیڑیں تو جڑ ہی دے۔ ازابیلا نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بے قابو ہوتی ہنسی پر قابو پایا تھا اور وارلڈ وہ ذرا سا ہنس دیا تھا۔

”بدر! کیا کرتے ہو؟“

”اخبار بیچتا ہوں سر۔“ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”اچھے خاصے گھرانے کے لگ رہے ہو اور پڑھے لکھے بھی۔ اپنی جوانی اس معمولی سے کام میں کیوں ضائع کر رہے ہو؟“

”آئی فون کے لیے سر!“ زبان پھسل گئی تھی، کمبخت۔

”آہ یہ نئی نسل کے نرالے شوق۔“ وارلڈ نے گہری سانس لی تھی۔

”لوگ تو آئی فون کے لیے گردے بیچ دیتے ہیں، میں تو پھر بھی اخبار بیچتا ہوں سر“!

”خواہشات کے پیچھے مت بھاگو لڑکے!“ وارلڈ نے اپنا چمکتا آئی فون اس کی طرف بڑھایا تھا۔

”صدقہ نہیں لیتا سر!“ گھر جا کر وہ اس لمبی ہوتی زبان کو کاٹے گا، ضرور کاٹے گا۔ روفی کا اثر تھا، جنگلی روفی۔

”تمہیں کیسے پتا میں اپنی بیٹی کا صدقہ دے رہا ہوں؟!“ زبان اس بار وارلڈ کی بھی پھسل گئی تھی۔ ازابیلا کا جاندار قہقہہ بلند ہوا تھا۔ بدر کے چہرے کی رنگت فق ہوئی تھی۔ وارلڈ نے ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے خجلت سے اپنا دایاں کان کھجایا تھا۔

”اس معصوم چہرے کو دیکھ کر سب صدقہ ہی دیتے ہیں، تحفہ نہیں سر!“ بے چارہ بدر، معصوم بدر۔

”نوکری کیوں نہیں کرتے کہیں اچھی جگہ پر؟“

”انگلش میں بی ایس کر رہا ہوں، صبح کے وقت یونیورسٹی جاتا ہوں۔ اس سے پہلے اخبار بیچنے کا کام مناسب ہے۔ یونیورسٹی کے بعد پارٹ ٹائم جاب پر کوئی رکھتا نہیں۔ تجربہ چاہیے انہیں۔ حالانکہ میں خاصا تجربہ کار ہوں سر! میں نے نہ صرف اخبار بیچی ہے میں نے دودھ بھی بیچا ہے اور جب بچپن میں مَیں یہاں آیا تھا تو لوگوں کی گاڑیاں صاف کرتا تھا۔ مجھے پلمبنگ کا کام بھی آتا ہے اور بجلی کا بھی۔ میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں اور میں چوکیدار بھی بن سکتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ تھا، بالکل سنجیدہ۔

وارلڈ نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔ ”صرف ایک آئی فون کے لیے؟“!

”پہلے احتیاج تھی۔ اب ہاں آئی فون کے لیے، سر۔“ وہ دھیما سا مسکرایا تھا۔ ازابیلا نے بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت معصوم تھا بہت زیادہ۔ جانے کس مجبوری نے اسے دس سال کی عمر میں ایک اجنبی ملک میں تنہا لا کھڑا کیا تھا؟! جانے بدر کی کہانی کیا تھی؟! اس کا ماضی؟!

”ازابیلا بیٹے آپ جمعرات کو بدر کو آفس لے آیئے گا۔ مجھے ایسے محنتی لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔“

”جی بابا۔“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا تھا۔

”میں اخبار بیچنا نہیں چھوڑوں گا سر، نہ ہی ٹیوشن۔ آپ مجھے شام میں تین گھنٹے کا کوئی بھی کام دے سکتے ہیں۔“

وارلڈ نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

”آئی فون؟“!

”یس سر“!

☆☆☆

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ لائبریری میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا جب کسی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے آنے والے کو دیکھا۔ سرمئی رنگ کے ٹراؤزر پر سفید رنگ کا اپر پہنے کرسی کھینچ کر بیٹھتا وہ لڑکا خیام تھا جس نے اجازت لینے کے بعد جواب کا انتظار کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ آج سوموار کے دن انہیں یہاں پر تیسرے آدمی سے ملنا تھا۔

"کتاب ملی تمہیں؟" وہ جندل کے سامنے میز پر رکھے کتابوں کے انبار میں سے ایک کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، شاید آنے والی ہو۔" اس نے سرسری سی ایک نظر خیام پر ڈالی پھر کتاب پر جھک گیا۔ خیام نے نگاہ اٹھا کر اس کے عقب میں دیکھا۔ بینکاک کی ہموار سڑکوں پر سایہ فگن آسمان جہاں غروب ہوتا سورج اپنی سرخ رنگ میں ڈوبی رعنائیاں دکھا رہا تھا۔ شفق کے وہ جلوے دیکھنے والی آنکھ کو یک قلم ٹھہرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ لائبریری کا سکوت، کتابیں اور وہ منظر۔ دھڑکنوں میں انتشار پیدا ہونا تو لازم و ملزوم تھا۔

"زئی کئی دنوں سے نظر نہیں آیا۔ جانے کیوں کسی محبوبہ کی طرح روٹھ بیٹھا ہے۔ لاکھ سمجھانے پر سمجھتا نہیں ہے کہ عشق تو سمندر رہے مگر محبت تو یوسف زئی ہی ہے ناں! وہ ہے کہ سمجھتا نہیں دل ہے کہ مانتا نہیں۔ ہر دور میں عشق والے کڑے امتحان سے گزرے ہیں۔ عشق بھی لازم ہے، محبت کی ناراضگی بھی منظور نہیں۔ حل بتاؤ دماغ کافی الجھن کا شکار ہے۔" جندل نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر کے میز پر رکھی۔ خیام نے نگاہوں کا رخ اس کی طرف کیا۔ کوئی مان سکتا تھا وہ اتنے دکھ سے اپنے عقاب کی بات کر رہا تھا جس کا نام اس نے زئی رکھا ہوا تھا۔

"انسان کو اتنا سخت دل تو ہونا ہی چاہیے کہ محبت ہو یا عشق، جب ملنے کے آثار نہ ہوں تو خاموشی اختیار کر سکے۔" خیام نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"زئی اور سمندر کے لیے کبھی سخت نہیں ہو پایا میں۔ وہ جان ہیں اور جان ہے تو جہان ہے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب نہ جان ہو گی نہ جہان!" آواز نہ جندل کی تھی نہ خیام کی۔ عجیب پھنسی پھنسی سی آواز تھی جندل کے عقب سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا تھا مگر پستول کی نال اپنی گردن پر محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سامنے دیکھا تو خیام بھی کسی ایسی ہی صورتحال سے دوچار تھا۔

"اتنی جلدی قیاس!" وہ دونوں ذرا سا مسکرائے تھے اور اگلے ہی لمحے دونوں نے برق رفتاری سے پستول کی نال اپنی گردن سے ہٹا کر حملہ آوروں کے بازو مروڑے تھے۔

وہ دو لوگ تھے مکمل سیاہ لباس میں ملبوس۔

جندل نے پیچھے ہٹ کر خود کو وار سے بچایا تھا اور اگلے ہی لمحے زوردار لات سامنے والے کے پیٹ میں ماری تھی۔ اور پھر گھونسے پھر ہاتھ کی کوئی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی خیام نے اپنے مقابل کی گردن کو جھٹکا دیا۔ چیخ کی آواز آئی اور اس کی گردن لڑھک گئی۔ اس نے جندل کو دیکھا جو اب دونوں بازو اس حملہ آور کے گرد باندھے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ حملہ آور اپنا پورا زور لگا رہا تھا۔ ایک منٹ، دو منٹ اور بس وہ بے جان ہو گیا۔ جندل نے اسے چھوڑ دیا وہ فرش پر جا گرا۔

"کیمرا!" وہ دونوں تیزی سے پلٹے تھے۔ سامنے دیوار پر ایک کیمرا نصب تھا۔ خیام تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ اسے توڑنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا۔ بغور اسے دیکھا پھر گہری سانس لی۔

"بند ہے۔"

"حیرت ہے۔"

"انہوں نے ہی کیا ہو گا۔" جندل نے اس کی بات پر سر کو ذرا سی جنبش دی۔ پھر لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا سوچنے لگا۔ خیام اب بھی کیمرے کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے بغور آنکھیں سکیڑ کر کیمرے کو دیکھا۔ وہ بالکل ڈھیلا سا دیوار سے اٹکا ہوا تھا۔ کوئی کنیکشن کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کیمرے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ الٹ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ اس کے پیچھے چھوٹے سے سوراخ سے نظر آتی کسی چیز پر پڑی۔ ہاتھ بڑھا کر اپنی انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے جب اس نے اس چیز کو نکالا تو وہ قلم کی نوک تھی، دو قلم کی نوکیں۔

"جب کسی کی موت کا فیصلہ سنایا جاتا ہے تو قلم کی نوک توڑ دی جاتی ہے۔" جندل نے خیام کے ہاتھ میں قلم کی نوکوں کو دیکھ کر سرگوشی کی تھی۔ خیام نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ دو، ہم دو۔ فیصلہ کس کی موت کا ہوا ہے؟" اس کا یہ سوال کئی لمحوں تک وہاں موجود کتابوں سے ٹکراتا رہا تھا۔ اس کی آواز کی سنسناہٹ کے اثر سے سکوت کرچی کرچی ہوا تھا۔

"وہ دو، ہم دو۔ فیصلہ کس کی موت کا ہوا ہے؟"

☆☆☆

"کہاں جا رہی ہو؟" اسے سنگھار میز کے سامنے مکمل تیاری کے ساتھ کھڑا دیکھ کر کمرے میں داخل ہوتے زیاد نے سوال کیا تھا۔ وہ مصروفیت کی وجہ سے اسپتال اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اور اب جب اسے اس کے شام کو گھر آنے کی خبر ملی تو وہ فوراً یہاں پہنچ گیا۔ وہ ازا کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

"تم بھی چلو، راستے میں سب بتاؤں گی۔" وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر زیاد کی جانب پلٹی۔ گہرے کتھئی رنگ کی جینز پر ہلکے بادامی رنگ کا کوٹ پہنے سفید رنگ کا پرنٹڈ اسٹول گلے میں ڈالے سر پر سفید رنگ کا ہی ہیڈ بینڈ جمائے شانے سے ذرا نیچے تک جاتے بالوں کو کھلا چھوڑے وہ بالکل تیار تھی۔ کل رات والی نقاہت، خوف سب کو پیچھے چھوڑ کر وہ اب

ہشاش بشاش اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"تم پھر سے کسی مصیبت میں پڑو گی ازا!" اس نے اسے سخت گھوری سے نوازا تھا۔

"چلو تو سہی یار۔" وہ منہ کے زاویے بگاڑتی اسے بازو سے کھینچتی باہر لائی۔ تیزی سے اس کے ہمراہ سیڑھیاں پھلانگ کر لاؤنج سے گزرتے ہوئے قانتہ کو سلام کرنے کی زحمت کیے بنا وہ باہر آئی جہاں گارڈز کی ایک فوج اس کے ہمراہ جانے کا اشتیاق لیے کھڑی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔

"دو آدمی کافی ہیں۔"

"میم لیکن سر۔" ایک گارڈ منمنایا۔

"کافی!!" اس نے اپنی بات پر زور دیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وارلڈ ہاؤس کا دروازہ کھلا اور ازابیلا کی سفید رنگ کی گاڑی اور اس کے ساتھ گارڈز کی سیاہ رنگ کی گاڑی تیزی سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ زندگی کی رفتار کا مقابلہ کرتیں وہ گاڑیاں وارلڈ ہاؤس کو پیچھے چھوڑتیں جب ایک گلی کے پاس رکیں تو معلوم ہوا کہ وہ اسی مقام پر آئی تھی جہاں کل رات قتل ہوا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ گلی کے کونے میں ایک اسٹور کی طرف بڑھی۔

"ازا تم مجھے بتاؤ گی کیا ہو رہا ہے؟" زیاد اس کی تیز رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا اپنا سوال غالباً بیسویں دفعہ دہرا رہا تھا۔ وہ اس کا سوال بیسویں دفعہ ہی نظر انداز کرتی اندر آئی۔

"مجھے کل رات کی سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنی ہے۔" اس کے حکم پر اپنے کام میں مگن دکاندار نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا لیکن اس کے پیچھے اسلحے سے لیس گارڈز کو کھڑا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھ رہی تھی۔

"یہ دیکھو۔ وہ آدمی یہاں سے گزرا۔ یہ سیاہ لباس میں ملبوس۔" اس نے اندھیرے میں اس گلی سے گزرتے ایک

سایے کی طرف اشارہ کیا۔ زیاد نے بغور اس سایے کو دیکھا۔ اس کیمرے کی رسائی جہاں تک تھی وہاں سے پہلے ہی وہ آدمی غائب ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان گلیوں میں ہر ہر دکان میں کھڑی سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھ رہی تھی لیکن ہر جگہ سے وہ بندہ غائب تھا۔ اس واقعے کی کسی سی سی ٹی وی فوٹیج میں جھلک تک نہیں تھی۔ وہ بندہ بھی نہیں تھا۔ اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ، وہ تمام سی سی ٹی وی فوٹیجز مٹائی جا چکی تھیں جو اس کے لیے اس قتل کے کیس میں کارآمد ثابت ہونے والی تھیں۔

"ازا تم بلاوجہ اس سب میں پڑ رہی ہو۔ عین ممکن ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے تمہاری پچھلی سرگرمیوں کے متعلق تمہیں محض ڈرانے کے لیے ایک ڈراما رچایا ہو تاکہ تم اس سب سے دور رہو۔" زیاد اس کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اسے سمجھا رہا تھا۔

"میں خاموش نہیں رہوں گی زیاد! انسانی جان اتنی سستی نہیں ہے کہ کسی کا منہ بند کروانے کے لیے کسی بھی انسان کو اٹھا کر اس کی شاہ رگ پر کانچ پھیر دیا جائے گا۔ زیاد اس نے یہ کام بہت صفائی سے کیا تھا۔ ایک لمحے میں اس کی شاہ رگ کاٹی تھی۔ خون کے وہ چھینٹے میرے ہاتھوں اور چہرے کو داغدار کر گئے تھے۔ میں نے موت کو دیکھا تھا زیاد موت کو۔ آج کوئی اور تھا عین ممکن ہے کل میں اس کی جگہ پر ہوں۔ میں خانوش نہیں رہوں گی۔ ابھی انسانیت باقی ہے۔"

"لیکن ازا۔۔۔"

"میم یہ آپ کے لیے آیا ہے۔" زیاد کی بات مکمل ہونے سے پہلے ایک گارڈ پھولوں کا ایک گلدستہ تھامے اس کے پاس آیا۔ ازابیلا کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پھول گارڈ کے ہاتھ سے لیے۔ وہ خوبصورت سے سفید رنگ کے پھول تھے اور ان پھولوں کے درمیان ایک کارڈ رکھا تھا۔ اس نے انگشت شہادت اور انگوٹھے

کے درمیان اس کارڈ کو اٹھایا۔

"آپ خاموش نہیں رہیں گی تو خاموش کروادی جائیں گی۔

پیاری ازابیلا۔" اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔ زیاد نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا۔ ازابیلا کی نظر پھولوں کے درمیان اس چھوٹی سی قلم کی نوک پر ٹکی۔

جب کسی کی موت کا فیصلہ سنایا جاتا ہے تو قلم کی نوک توڑ دی جاتی ہے۔

"مجھے لگتا ہے تم اپنے لیے پیچھے ہٹنے کی تمام راہیں بند کر چکی ہو ازا۔" زیاد نے دکھ سے کہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے میرے لیے منزل کی طرف جانے والے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں زیاد۔" اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا تھا۔ پھول اس کے ہاتھ سے گر پڑے تھے اور پھر سڑک کے درمیان وہ بھاری بھر کم گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے بری طرح کچلے گئے تھے۔ نرم وتروتازہ پھول ان کے لیے زندگی کے تمام دروازے بند کیے جا چکے تھے۔

☆☆☆

اندلس (اسپین)، یہ خوبصورت ملک آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کو خود میں سمیٹے مغرب کے ایک گوشے میں جلوہ افروز ہے۔

قدیم اندلس، قدیم ہسپانیہ، جدید اسپین۔

مگر قدیم زمانے میں جینے والوں اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے یہ آج بھی اندلس ہی ہے تو ہم اسے اندلس ہی کہیں گے۔

تاریخ میں یہ ملک خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ مشرق میں اگر برصغیر "Golden Sparrow" (سونے کی

چڑیا) کہلانے کا حق رکھتا تھا تو مغرب میں اندلس نے اپنے آپ کو "Golden paradise" (سنہری جنت) کہلوایا تھا۔

غرناطہ کے اس خوبصورت شہر کے چاروں اطراف پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ غرناطہ کا تمام تر حسن اپنی چاردیواری میں قید کیے "الحمرا" مضبوطی سے اپنی جگہ جم کر کھڑا تھا۔ سیاحت کے شوقین افراد قطاروں کی صورت میں الحمرا کی طرف رواں دواں تھے۔ الحمرا غرناطہ کا دل تھا۔ غرناطہ والوں کا کُل سرمایہ تھا۔ کیسے ممکن تھا سیاح اسے دیکھے بنا اندلس کے حسن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر عین الیقین کا دعوہ کرتے؟!

اور الحمرا، وہ ہمیشہ کی طرح آنے والوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتا تھا اور جانے والوں کی اشک بہا آنکھوں کو دوبارہ آنے کا پیام دے کر ان کے اشکوں کو آنکھوں کے پیالے سے گرنے نہ دیتا تھا۔ الحمرا رلانے والوں میں سے نہیں تھا۔ البتہ، تاریخ شاہد ہے کہ تاریخ کے طالب علم یہاں آکر اپنے اشکوں کو روک نہیں پاتے تھے۔ وہ الحمرا کی بے بسی پر روتے تھے اور زاروقطار روتے تھے۔ اور الحمرا، وہ جانتا تھا اب شاید ہی کوئی رونے کے سوا اس کے لیے کچھ کرنے کی ہمت رکھتا ہو، شاید۔

اور پھر الحمرا سے نگاہیں ہٹا کر ان بلند و بالا عمارتوں پر نگاہیں دوڑائی جائیں تو قطار میں مضبوطی سے جم کر کھڑی ان عمارتوں میں آپ کو ایک ہوٹل کی بلند عمارت نظر آئے گی جس کی تیسری منزل پر کھڑکی سے "مائک باربارا" غرناطہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز تھی میز پر کافی کا بھاپ اڑاتا کپ رکھا تھا۔

اس کے چہرے پر زخموں کے نشان اب تک تازہ تھے۔ آنکھیں اب بھی سوجی ہوئی تھیں۔ جبڑے اور کمر اور ٹانگ اور گردن، تقریباً پورا جسم اب بھی درد کر رہا تھا۔ مارنے والا خاصا تجربے کار تھا ناں۔

اس سب کے باوجود درد سے ٹوٹتے جسم کو گھسیٹتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے طعنے سننے کے بعد وہ اگلی فلائٹ سے

تھائی لینڈ سے اندلس آ گیا تھا۔ اس نے اسٹیون کے انگلینڈ سے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا، وہ بس مارک کی نظروں سے دور جانا چاہتا تھا۔ ورنہ کوئی بعید نہیں تھی کہ وہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے اپنے ہی سگے بھائی کو اپنا قاتل بنا بیٹھتا۔ یقیناً اس میں قصور اس کا ہی ہوتا مارک کو قصوروار ٹھہرا کر وہ جہنم میں نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس نے گہری سانس لی اور سر کو ذرا جھٹکا دیا تو گردن میں اٹھتے شدید درد کے باعث اس نے بمشکل اپنی چیخ روکی تھی۔ دانت کچکچانے کی کوشش کی تو جبڑوں میں اٹھتے درد نے اسے "اوور ایکٹنگ" کرنے سے باز رکھا۔

اس نے دل ہی دل میں اس "تجربے کار" کو لعنت بھیجی جس کا یقیناً وہ مستحق نہیں تھا۔ پھر کافی کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ کافی گرم تھی بہت زیادہ گرم، اس کا منہ جل گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کپ لبوں سے ہٹا کر میز پر پٹخا تو کافی اس کی شرٹ پر چھلک گئی۔ اس نے کافی کے کپ کو سخت گھوری سے نوازا تو جواباً کپ نے اسے منہ چڑایا۔ جیسے کہہ رہا ہو "اور کرو اوور ایکٹنگ۔۔"!

"مے آئی کم ان سر؟" آنے والا اس کے ہٹلر بھائی کا جاسوس تھا جو بنا دروازہ کھٹکھٹائے کمرے کے اندر آ کر ڈھیٹ بن کر دانت نکالتا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے؟" اففف، وہ یہ تین الفاظ بول کر شدید درد سے دوچار ہوا تھا۔

وہ ڈھیٹ جاسوس آگے آیا اور ایک لفافہ اس کے سامنے میز پر رکھا۔

"یہ آپ کے لیے آیا ہے۔" مائک نے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک تصویر برآمد ہوئی۔

وہ ایک لڑکی تھی جو الحمرا کے اونچے مینار پر کھڑی تھی۔ ہلکے گلابی اور سفید رنگ کے امتزاج کا گاؤن پہن رکھا تھا اور چہرے کے گرد سفید رنگ کا حجاب باندھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے گال

لال ہو رہے تھے اور مسکرانے کی وجہ سے آنکھوں کے کنارے پر ہلکی سی سلوٹیں سی پڑ رہی تھیں۔ وہ یک ٹک اس تصویر کو دیکھے گیا۔ غرناطہ کا سارا حسن جیسے الحمرا کے اس مینار پر سمٹ کر آ گیا تھا۔

وہ جاسوس اس کی محویت کو دیکھ کر کھنکھارا تھا۔ وہ ہوش میں آیا پھر لفافہ دیکھا تو وہاں سے ایک ٹوٹا قلم بر آمد ہوا اور ساتھ ہی اس قلم کی ٹوٹی نوک۔

"اس لڑکی کا نام ؟!" اس نے گہری سانس لے کر پوچھا تھا۔

"سعادیوسف زئی، دو سال پہلے اندلس آئی تھی۔ اس کے بعد کہاں گئی؟ کہاں رہتی ہے؟ تعلق کہاں سے ہے؟ کچھ خبر نہیں۔" مائک نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر اس جاسوس کو جانے کا اشارہ کیا۔ "مارک سر کو بتاؤں؟"

"خدا کی قسم اگر تم نے بھائی کو اس کے بارے میں بتایا تو میں غرناطہ کے چوک پر تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا!!" وہ چلایا تھا۔ وہ جاسوس سٹپٹا کر باہر کی طرف بھاگا تھا۔ مائک نے گہری سانس لے کر نگاہ قلم کی ٹوٹی نوک پر ڈالی۔

"جب کسی کی موت کا فیصلہ سنایا جاتا ہے تو قلم کی نوک توڑ دی جاتی ہے۔"

اس نے نگاہوں کا رخ اس تصویر کی طرف کیا۔

"اس لڑکی کا نام ؟"

"سعادیوسف زئی۔"

☆☆☆

وہ اپنے لیے چائے بنا کر گھر سے منسلک اس چھوٹے سے باغیچے میں آئی تھی۔ باغیچے میں ایک جانب میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھ کر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑا چائے کا بھاپ اڑاتا کپ میز پر رکھا۔ یہ باغیچہ اس کی محبت تھا۔ والدین کی وفات کے بعد جب وہ جندل کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی تو دونوں نے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کیا

تھا۔ ایک کمرہ جندل کا ایک اس کا۔ ایک اور کمرہ جندل کا جسے اس نے لائبریری میں منتقل کیا تھا اور صحن سے منسلک یہ جگہ اس کی جسے اس نے باغیچہ بنایا تھا۔

وہ اکثر جندل سے اپنے باغیچے کی تعریف کرتے ہوئے کہتی تھی، ”میرا باغیچہ خوبصورت اور خوشبودار پھولوں سے مہکتا ہے۔ اس میں بڑھتے درختوں نے گھر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ تمہاری لائبریری نے اس گھر کو کوئی فائدہ نہیں دیا۔“

اور جندل مسکراتے ہوئے جواب دیتا تھا، ”میری کتابوں نے آپ کو باغیچے کی پرورش کرنا سکھائی ہے۔“

اور پھر وہ دونوں کافی دیر تک ”میرا باغیچہ میری لائبریری“ پر بحث کرتے تھے۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ میز پر اس کی اسکیچنگ بُک کے اوپر رکھا موبائل بج اٹھا تھا۔ اسکرین پر جندل کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ پھر موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں؟“ آواز سے صاف خفگی جھلک رہی تھی۔

”بالکل ٹھیک۔ تم کیسے ہو؟“

”بڑی بہن ناراض بیٹھی ہے۔ کیسا ہو سکتا ہوں؟“!

”کچھ دیر پہلے تک میں تم سے بہت ناراض تھی مگر اب یقین کرو جندل مجھے بہت سوچنے پر بھی یاد نہیں آرہا میں تم سے ناراض کیوں ہوئی تھی۔“ وہ مسکرائی تھی۔ آنکھوں کے کناروں پر ذرا سی سلوٹیں سی پڑی تھیں۔

”اور میں بھی اب ٹھیک ہو گیا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے جواب آیا تھا۔ وہ مسکرائی پھر موبائل کان سے ہٹا کر اسے ویڈیو کال کی۔ کال فوراً اٹھا لی گئی۔ اسکرین پر بیڈ پر بیٹھا جندل نظر آنے لگا وہ جھک کر جوتوں کے تسمے کھول رہا تھا۔

موبائل اس نے سائیڈ ٹیبل پر کھڑا کر کے رکھا ہوا تھا۔

"جندل یہ دیکھو میں نے پچھلے کچھ دنوں میں کیا کِیا ہے؟" وہ اسے متوجہ کرتی اپنی اسکیچنگ بُک کھولنے لگی۔ ایک صفحے پر وہ رکی۔ جندل نے بغور اس تصویر کو دیکھا۔ تصویر میں دو بہن بھائی تھے۔ بھائی کے ہاتھ میں کتاب تھی بہن کے ہاتھ میں پھول تھا، جندل یوسف زئی اور سعاد یوسف زئی کا بچپن

وہ مسکرایا۔ سعاد نے صفحہ پلٹا۔ ایک مرد اور عورت ایک نومولود بچہ گود میں لیے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے کے خدوخال سے جندل لاکھوں میں انہیں پہچان سکتا تھا۔

"امی، بابا اور۔۔" وہ رک گیا۔ سعاد نے گہری سانس لی۔

"اور ہمارا چھوٹا بھائی جندل۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔ پھر اس نے بُک بند کر دی اور کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھی۔ "کبھی دروازے پر دستک ہوتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ ہمارا بھائی لمبی مسافت طے کرنے کے بعد گھر لوٹ آیا ہے۔ جندل وہ لوٹ آئے گا ناں؟!" اور یہ وہ سوال تھا جس کے جواب میں جندل کے پاس صرف خاموشی ہوتی تھی۔ کون جانتا تھا اس بے رحم دنیا نے اسے جینے بھی دیا تھا یا نہیں؟!

"تم جواب نہیں دوگے۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ جندل نے گہری سانس لی۔

"آپی آپ سے بات کرنی ہے۔" اس نے گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔

"ہاں کہو۔" وہ نم آنکھوں کو رگڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ جندل بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گویا ہوا۔

"آپ جانتی ہیں کہ۔۔ میں جانتا ہوں کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ لیکن چھوٹے بھائی بھی جب "بھائی" ہوں تو بہنوں کے لیے "بڑے" بن جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا میں یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہوں یا نہیں۔ آپ نے مجھے

یہ حق دیا ہے یا نہیں، لیکن میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ضرار سے شادی کریں گی ؟!" سعاد نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ التجا بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ جندل بول اٹھا۔ "اگر آپ کو اعتراض ہے تو میں وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ میں بہت مان سے کہہ رہا ہوں آپی آپ مجھے اپنا ہمراز بنا سکتی ہیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا اور آپ کی ہر خواہش کا احترام کروں گا۔" کتنا مان تھا اس کے لہجے میں۔ سعاد کو اپنا آپ بکھرتا محسوس ہوا تھا۔ اس مان کو تو عرصہ ہوا وہ فراموش کر چکی تھی۔

"تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے جندل۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"میں نے آپ کی مشکل آسان کر دی ہے آپی۔ آپ کے ہر فیصلے کا احترام کروں گا۔ جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہو گا۔" وہ نگاہیں پھیر گئی تھی۔ پھر اس نے بھرائی آواز میں کہا تھا "میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گی۔" اور کال کاٹ دی۔

اشک جو نکلنے کو بے تاب تھے قطرہ قطرہ گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ شفق کا حسن بکھیرتا آسمان اس پر سایہ کیے کھڑا تھا۔ خاموش، عرصے سے خاموش آسمان۔

اور اسی اثنا میں کسی کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"کیف الوصول الٰی سعاد دونھا

قلل الجبال و دونھن حتوف۔"

"وائے مشکلات ! کہ محبوبہ سعاد تک رسائی کیونکر ممکن ہو ؟! کیونکہ اس کی راہ میں بلند و بالا پہاڑ اور ہلاکتوں کا ایک طویل سلسلہ حائل ہے۔"

اسے یاد آیا تھا جب پہلی بار یہ شعر پڑھا گیا تھا تو اس نے یخ بستہ موسم میں برف والا پانی اس اشعار چور کے سر پر

انڈیل دیا تھا۔

شعر، اشعار چور اور یخ بستہ موسم جو سعاد کے غصے کو جمانے میں ہمیشہ ناکام رہتا تھا۔

☆☆☆

وقت ایسے بھی بازی پلٹ سکتا ہے اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ زندگی یوں بھی بدل سکتی ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی حالت اس انسان کی سی تھی جسے تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوج ثریا کی طرف روانہ کر دیا گیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ایک لمحے کو چشم میں سمونا اسے اس وقت بے حد مشکل لگا تھا۔ نظریں کسی ایک منظر پر اٹھتی تھیں تو وہ سانس روکے بنا پلک جھپکے اسے دیکھے جاتا اور تب تک دیکھتا رہتا جب تک اس کی بیلا باجی دور سے اسے آوازنہ لگاتیں۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچتا اور یہاں ایک نیا حیران کن منظر اس کے سامنے ہوتا۔ پھر وہی کیفیت اور وہی بیلا باجی کی پکار۔ عمارت کے مرکزی دروازے سے لے کر اندرونی حصے تک اور اندرونی حصے سے یہاں کے ”باس“ کی آفس تک کا پندرہ سے بیس منٹ کا سفر اس نے آدھ پون گھنٹے میں طے کیا تھا۔

جی۔ آپ ٹھیک سمجھے۔ ہمارے بدر ”وارلڈ گلاس کمپنی“ میں پہلی بار داخل ہو رہے ہیں۔ اس نے بچپن سے اس عمارت کو سائیکل پر بیٹھ کر دور سے دیکھا تھا۔ آج یہاں کے باس کی بیٹی ”بیلا باجی“ کے ہمراہ ایک بھائی کی حیثیت سے چلتے ہوئے وہ خود کو ساتویں آسمان پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے یہ احساسات حق پر تھے۔

”گڈ ایوننگ میم۔“ راہداری میں چلتے ہوئے انہیں وارلڈ کی سیکریٹری ملی۔ ازابیلا رک گئی۔ وہ بھی رک گیا۔

واللہ! وہ ادنیٰ سی ملازم بھی اس کے مالک مکان کی بیوی کی طرح اپنی عمر کا لحاظ کیے بنا فل ٹپ ٹاپ کھڑی تھی۔ بدر نے فوراً دل میں استغفر اللہ کا ورد کرتے ہوئے نظریں پھیری تھیں۔ اس کی تمام تر توجہ بس اس عمارت پر ہونی

چاہیے تھی۔

"بابا؟" لہجہ سپاٹ تھا۔

"میم وہ جا چکے ہیں کسی اہم میٹنگ کے سلسلے میں۔ اور آپ کے لیے انہوں نے تاکید کی ہے کہ آپ آئیں تو آپ کو خیام سر کے پاس لے جایا جائے۔" وہ لڑکی کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجائے کہہ رہی تھی۔ ازابیلا نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"ان کی آفس؟"

"میں آپ کو لے چلتی ہوں۔ براہِ مہربانی آئیں۔" وہ دونوں اس لڑکی کے پیچھے چل پڑے۔ ازابیلا نے کسی احساس کے تحت گردن ترچھی کر کے بدر کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے آنکھیں زور سے میچے زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ ازابیلا اپنا کان تھوڑا قریب لائی تو "استغفر اللہ" کا مسلسل ورد اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ اپنی ہنسی روک نہیں پائی تھی۔ سامنے دیکھتے ہوئے وہ دلکشی سے ہنس دی تھی۔ بدر نے بائیں آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

"بدر تم بہت معصوم ہو۔" اس نے دل سے اعتراف کیا تھا۔

"واللہ بیلا باجی! مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایسی خاتون سے بھی واسطہ پڑے گا۔" وہ ہنوز آنکھیں میچے ہوئے تھا۔ ازاں بیلا نے کھل کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"تم تو یونیورسٹی بھی جاتے ہو؟"!

"اوہ! وہاں بدر نہیں بدر دی اندھا پڑھتا ہے۔ کالا چشما لگا کر گھومتا ہوں۔" اس نے بے فکری سے شانے اچکائے۔ ازابیلا نے حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھا۔

"واقعی؟!" وہ بے حد حیران تھی۔

"اور نہیں تو کیا! پہلے سیمسٹر کے مڈز کے بعد ہونے والے ایکسیڈنٹ میں عارضی طور پر اندھا نہ بنتا تو لڑکیوں نے نظر مار دینی تھی۔ شریف لڑکا ہوں کوئی بھی لڑکی دل دے بیٹھتی۔ معصوم ہوں اندھا ہوں تبھی تو یونیورسٹی کی ہر لڑکی نے اپنا بھائی بنایا ہوا ہے۔ ایک بہن چائے کا کپ دلا دیتی ہے، دوسری بہن کلاس تک لے جاتی ہے۔ تیسری بہن اسائنمنٹس بنانے میں مدد کر دیتی ہے چوتھی بہن لنچ بھی کروا دیتی ہے۔ مزے کی چل رہی ہے لائف۔" وہ مزے سے کہہ رہا تھا اور ازابیلا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنا چالاک تھا وہ۔

"تم بہت تیز ہو بدر۔"

"ایک بات پر قائم رہیں بیلا باجی۔" وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ وہ دونوں خیام کی آفس کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ان کے آگے چلتی لڑکی نے وہاں بیٹھے لڑکے سے خیام کی اندر موجودگی کے بابت پوچھا۔

"سر کارخانے راؤنڈ پر گئے ہیں۔ کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔"

"لیکن انہیں میم کی آمد کے بارے میں پتا تو تھا۔"

"ہاں لیکن میم لیٹ ہو گئیں تو وہ چلے گئے۔" لڑکے نے کندھے اچکا دیے اور اس لڑکی کو اپنی شامت نظر آنے لگی۔ ازابیلا سے کچھ کہتی تب بھی ڈانٹ سنتی اور خیام کے پاس جاتی تو الگ رسوائی تھی۔

"آئی ایم سو سوری میم، میں نے سر کو بتایا تھا لیکن وہ چلے گئے۔ آپ بس دو منٹ انتظار کریں ہم انہیں ابھی آپ کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ جسٹ ویٹ فار ٹو منٹس۔" اس نے منت کی تھی۔ ازابیلا نے گردن ترچھی کیے اسے دیکھا۔

"بدر تم اندر آفس میں انتظار کرو۔ میں آتی ہوں۔" وہ بدر کو کہتی پلٹ گئی۔

"میم میم، میم رکیں۔" وہ لڑکی اسے روکتی رہ گئی۔ وہ اسے نظر انداز کرتی کارخانے کی طرف بڑھی تھی۔ کارخانہ

اسی عمارت کی پچھلی جانب تھا اور کافی فاصلے پر تھا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد کارخانے میں خیام کا مقام معلوم کر کے اس آفس جیسے کمرے کے باہر کھڑی دروازے پر دستک دے رہی تھی جہاں وہ پایا جاتا تھا۔ مثبت جواب ملنے پر وہ اندر آ گئی۔

یہ ایک درمیانے سائز کا کمرہ تھا اور کارخانے سے بالکل الگ تھلگ سا تھا۔ چاروں طرف بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے کہ بآسانی ہر زاویے سے کمرے کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ ایک طرف میز تھی جس پر تازہ تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ پھولوں کی مہک سے کمرے کا ماحول مسرور کر دینے والا ہو رہا تھا۔ کمرے کے بالکل درمیان میں آتش دان کی طرح چھوٹی سی جگہ بنی تھی جہاں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ان شعلوں کے پاس وہ کھڑا تھا۔ خیام حنفی!

ہاتھوں پر موٹے دستانے چڑھائے وہ لوہے کی راڈ سے سلیکون کے مرکب کو شعلوں کے درمیان دیے کھڑا تھا۔ اس کی آہٹ پر بھی ہنوز اپنے کام میں مشغول رہا۔ وہ گرم سلیکون لیے پلٹا اور اسے ایک لوہے کے اوزار سے کچھ اس انداز سے گزارا کہ وہ ایک گلدان کے قالب میں ڈھل گیا۔ اس نے اس گلدان کو ذرا فاصلے پر آگ کے ہلکے سے انگاروں پر رکھ دیا جو ایک چھوٹے سے دڑبے کی سی جگہ پر جل رہے تھے۔ وہ اپنا کام مکمل کر کے پلٹا اور ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

”گڈ ایوننگ مادام۔“ وہ اپنے دستانے اتار رہا تھا۔ ازابیلا نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا جو آگ کی وجہ سے آگ جیسے لال ہو رہے تھے۔ وہ اب دستانے ایک طرف رکھتا کمرے سے منسلک واش روم کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو ہاتھ اور چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ نم سیاہ بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ میز کے گرد رکھی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھا اور میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلنے لگا۔

"کھڑی رہیں گی؟!" وہ مخاطب اس سے ہی تھا لیکن متوجہ جگ سے گلاس میں گرتے پانی کی طرف تھا۔

"اس جدید زمانے میں جہاں اس کمرے سے باہر ہزاروں مشینیں خود یہ آگ سے کھیلنے کا کام کرتی ہیں تو آپ کیوں قدیم دور کے اس طریقے کو اپنائے ہوئے ہیں؟" اس نے اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کر کے سوال کے بدلے سوال پوچھا تھا۔

"قدیم دور میں جینے والے قدیم طریقے ہی اپناتے ہیں۔" اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ ذرا وقفہ دیا۔ پھر پانی پی چکنے کے بعد گلاس میز پر رکھا۔ "یہ طریقہ قدیم نہیں ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں کانچ ایسے ہی بنتا ہے۔ اور اسی میں مزہ ہے۔" وہ اب دائیں ہاتھ پر دستانہ چڑھا رہا تھا۔ ازابیلا خاموش رہی۔ وہ دستانہ چڑھانے کے بعد ان انگاروں کے پاس آیا اور لوہے کی راڈ کی مدد سے وہ گلدان وہاں سے نکالا جو اب مکمل تیار تھا۔ بس اسے ٹھنڈا ہونا تھا پھر وہ قابل استعمال تھا۔ ازابیلا نے گہری سانس لی۔ اسی اثنا میں اس کی نظر میز پر رکھے کانچ کے ٹکڑے پر پڑی۔ آڑا ترچھا کٹا یہ کانچ کا ٹکڑا، اندھیری رات میں چاند کی روشنی میں چمکتا وہ کانچ کا ٹکڑا۔ دونوں بے حد مماثلت رکھتے تھے۔

"یہ کسی کا قاتل بن سکتا ہے؟" وہ بظاہر بہت معمولی سے انداز میں پوچھ رہی تھی جبکہ اندرونِ دل وہ بہت سے واہمات کا شکار تھی۔ کیا ہو اگر زیاد ٹھیک ہو؟ خیام واقعی اچھا انسان نہ ہو؟!

"بالکل۔ شاہ رگ کا مقام متعین کریں اور بہت آرام سے یہ کانچ پھیر دیں۔ آپ کے ہاتھ نہ کپکپائیں اور پلک نہ جھپکنے پائے!" وہ بہت آرام سے کہتا واپس کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ ازابیلا چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

"کبھی تجربہ ہوا؟" اس نے جانے کیوں یہ سوال پوچھا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ سچ کچھ بھی ہو جواب منفی ہی آنا تھا۔ خیام نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا گویا اس کے سوال کے پیچھے مقصد سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

"کرنا چاہوں گا۔" جواب اس کی سوچ کے مطلق برعکس تھا۔

"اگر کوئی آپ کے بنائے کانچ سے کسی کو قتل کرے تو؟"!

"میں آئینہ ساز ہوں مادام! اسے خریدنے والی عوام ہے۔ میں اسے بنا کر اس کی تمام تر ذمہ داریوں سے نکل جاتا ہوں۔ آگے منحصر عوام پر ہے وہ اسے کیسے استعمال کرتی ہے؟"

اس کا جواب لاجواب تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ تشنگی تھی اور بس تشنگی تھی سچ کو تلاشنے کی اور سچ، وہ جلد سامنے نہیں آتا۔ سات پردوں کو چاک کرنے کے لیے جان لگانی پڑتی ہے۔

☆☆☆

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا حجاب بنا رہی تھی۔ دائیں کان کی طرف ایک پن سیٹ کرنے کے بعد جب اس نے بائیں کان کی طرف پن لگائی تو چہرہ نقاب میں ڈھک گیا۔ اس نے رک کر ایک تفصیلی نگاہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا پھر جانے کے لیے پلٹی۔ نیلے رنگ کے عبائے میں سیاہ اسکارف سے نقاب کیے بائیں ہاتھ میں ہینڈ بینگ تھامے وہ کمرے کا دروازہ بند کرتی باہر آئی۔ ابھی وہ لاؤنج میں ہی تھی جب گھر کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ہینڈ بیگ صوفے پر پھینکا پھر لاونج سے گزرتی باہر آئی۔

”کون؟“ اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا تھا۔

”پیزا بوائے میم۔“ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا پھر غصے سے دانت کچکچائے۔ اس کے آرڈر کرنے

کے ایک گھنٹے بعد تک جب پیزا نہیں آیا تھا اور اس کے بار بار کال کرنے پر اس ڈیلیوری بوائے کا نمبر بند جا رہا تھا تو وہ جو اس وقت کچھ پکانے کے موڈ میں نہیں تھی اور بھوک بھی تیز لگی تھی، اب حرم کے گھر جا کر کھانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اور اب جب وہ اتنی محنت کے بعد جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی تو وہ نام نہاد پیزا بوائے اس کے دروازے پر کھڑا تھا۔

وہ غصے سے آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا، پیزا اس کے ہاتھ سے لیا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ غصے میں وہ بے چارے کو پیسے دینا بھی بھول گئی تھی، بے چارہ پیزا بوائے۔

وہ پیر پٹختی لاونج میں آئی۔ پیزا میز پر رکھا اور دھم سے صوفے پر بیٹھی۔ نقاب ٹھوڑی پر ٹکایا اور پیزا کا ڈبہ کھولنے لگی۔ اس نے جیسے ہی اسے کھولا تھا، اس کے منہ سے زوردار چیخ نکلی تھی۔ ڈبے میں پیزا کے بجائے چھپکلیاں تھیں، چھپکلیاں!!

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان ربڑ کی چھپکلیوں کو دیکھا۔ اسی اثنا میں گھنٹی بجی۔ جو یقیناً اس کی چیخ سے محظوظ ہوتے "پیزا بوائے" نے بجائی تھی۔ وہ پیزا کے ڈبے کا منہ بند کر کے ڈبہ ہاتھ میں لیے لال پڑتے چہرے کے ساتھ باہر آئی۔ نقاب ٹھوڑی سے اوپر اٹھایا اور دروازہ کھولا۔ بھرپوری قوت سے ڈبہ پیزا بوائے کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکا غالباً اس حملے کے لیے تیار تھا تبھی تیزی سے نیچے ہوا۔ ڈبہ پیچھے جا گرا۔ چھپکلیاں سڑک پر بکھر گئیں۔ سعاد نے لال انگارہ ہوتی آنکھوں سے اسے گھورا۔ اس پیزا بوائے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ مکمل پیزا بوائے کے گیٹ اپ میں موجود دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں اڑسے مسکرا کر اسے دیکھتا وہ ضرار ولید تھا، بدتمیز ضرار۔

"آپس کی بات ہے ویسے، اب تو آپ کی چیخوں سے محلے والے بہرے ہونے لگے ہیں۔" اس کے دائیں کان میں

خارش ہوئی تھی۔ غالباً سعاد کی چیخ کا اثر ابھی تک تھا۔

”تم تم ضرار کسی دن جان لے لو گے میری!!“ وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ ضرار نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ نقاب سے جھانکتی لال ہوتی آنکھوں میں غصہ تھا، بے انتہا غصہ۔

”مجھے مروانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی آپ نے۔ میں تو بس انتقام لیا ہے۔ معصوم سا انتقام!“ اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”جنگلی خر تم مر جاؤ گے کسی دن میرے ہاتھوں!“ اس کا غصہ تھا کہ کسی صورت کم ہی نہ ہوتا تھا۔

”کسی نے کچھ کہا کیا؟“ اس نے اپنے بائیں کان کو بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے رگڑا تھا۔

”تم۔۔۔“

”واہ! بات پکی سمجھوں پھر میں؟“ سعاد کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ اور ختم کرنے والی کہیں سے نمودار ہونے والی حرم تھی۔

ان دونوں کی رنگت فق ہوئی تھی۔ دونوں ہکا بکا حرم کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حرم یہ بات آگے بھی بڑھا چکی تھی۔ حیرت و صدمے کی حالت میں حرم کو جس انداز سے وہ دونوں دیکھ رہے تھے حرم کو ٹوٹ کر دونوں پر پیار آیا تھا۔ ظالم سماج!

سعاد نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ضرار کو دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔ سعاد کے دیکھنے پر اس نے نظریں چرائی تھیں۔ وہ بھی نگاہوں کا رخ موڑ گئی۔ ضرار نے افسوس سے حرم کو دیکھا۔

”آپ نے غلط کیا آپی۔“ اس کے لہجے میں کچھ تھا جو حرم کو بری طرح سے چبھا تھا۔ وہ شکستہ نظروں سے دور جاتے ضرار کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے نگاہوں کا رخ موڑا۔ سعاد بھی وہاں کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ خفا خفا سی نگاہ اس پر

ڈال کر وہ دھیرے سے قدم اٹھاتی گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ حرم نے بچوں کی طرح منہ بنایا تھا۔

”میں نے کیا کیا بھلا؟“

اس نے کچھ کیا تھا کیا؟

☆☆☆

”میرا نام مصعب الزر قاوی ہے۔ بچپن میں اماں ابا کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادا نے تن و تنہا پالا ہے۔ ایک عدد چڑیل کزن ساتھ رہتی تھی۔ بچپن سے نکما، نالائق، ہڈ حرام اور ذلیل و خوار رہا ہوں۔ ایک بار دادا کے طعنوں سے تنگ آ کر سڑک پر ”رُل“ رہا تھا کہ ایک آدمی ملا جو ہاتھ دیکھ کر قسمت کا بتاتا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دکھایا تو اس نے میرے نام کو میری ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھا۔ بس اسی دن مصعب کے ب سے اپنا نام بدر رکھ دیا۔ دس سال کی عمر میں دادا انگلی پکڑ کر یہاں چھوڑ گئے۔ دو سال تک ان کے کسی رشتے دار کے پاس رہا۔ پڑھائی جاری رکھی، کام وام بھی سیکھتا رہا۔ دو سال بعد وہ بھی تنگ آ گئے گھر سے نکال دیا۔ تب تک عقل آ چکی تھی۔ کسی کے گھر کام کرنے لگ گیا۔ زندگی گزرنے لگی۔ یونیورسٹی میں آیا تو ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ اب اسی میں رہتا ہوں۔ صبح اخبار بیچتا ہوں پھر یونیورسٹی جاتا ہوں۔ شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ رات کو اپنا پڑھتا ہوں۔ بہت مزے کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اور ہاں میرے پاس ایک خرگوش بھی ہے بچپن سے۔ بدر کے ر سے اس کا نام روفی ہے۔“

اس نے اپنی آپ بیتی ختم کی پھر دلکش مسکراہٹ لبوں پر سجائے سامنے بیٹھے خیام کو دیکھا جو سپاٹ چہرے کے ساتھ اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس نے نگاہوں کا رخ ازابیلا کی طرف کیا جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ بیلا باجی شاکڈ تھیں۔

”ڈگری؟“

”بی ایس کر رہا ہوں انگلش میں۔ تیسرا سیمسٹر مکمل ہو چکا ہے۔ آج کل چھٹیاں ہیں۔ کبھی موڈ بنے تو وقت گزارنے یونیورسٹی چلا جاتا ہوں۔ تجربہ بہت ہے۔ آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں اس پر بیٹھ کر پورا بزنس بھی سنبھال سکتا ہوں بشرطیکہ جیب میں آئی فون ہونا چاہیے۔“ ازابیلا مسکرا دی تھی۔ خیام کا چہرہ ہنوز سپاٹ رہا۔

”اگر میں تمہیں جاب نہ دوں تو؟“

”ایسے کیسے نہیں دیں گے؟ وارلڈ انکل کو شکایت کر دوں گا آپ کی۔ میری جاب نہ لگی تو آپ کا بھی ادھر رہنا مشکل کر دوں گا ہاں بتا رہا ہوں۔“ وہ ایک معمولی اخبار والا اسے دھمکی دے رہا تھا اور اتنے پر اعتماد انداز میں۔ جیسے اسے اپنا آئی فون نہ ملا تو دوسروں کا بھی چھین لے گا ہاں!

”وارلڈ سر!“ خیام نے لفظ ”سر“ پر زور دیا۔

”بیلا باجی کے بابا انکل ہونگے ناں، سر۔“ اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ خیام نے ترچھی نگاہوں سے پاس کھڑی ازابیلا کو دیکھا جو اب دانتوں سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

”ام، مسٹر خیام آپ کو بدر کو جاب پر رکھنا چاہیے۔ آئی مین یہ خاصا محنتی لڑکا ہے۔“ ازابیلا نے اس کی سفارش کی تھی۔ وہ مزید سینہ چوڑا کر کے کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ خیام نے نگاہوں کا رخ واپس اس کی طرف کیا۔

”آپ کا خلوص جناب؟“ اس کے لہجے میں واضح طنز تھا۔

”صرف آئی فون کے ساتھ سر۔“ اس کے لہجے میں واضح فخر تھا۔ ازابیلا نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ کم از کم یہاں تو اپنا آئی فون نامہ نہ کھولتا۔ تھوڑی تو لاج رکھ لیتا اس کی۔

”ازابیلا مادام! آپ کو اگر کمپنی سے کوئی شکایت تھی تو براہِ راست ہمیں اطلاع دے دی جاتی۔ کم از کم آپ کو کمپنی کا مستقبل داؤ پر نہیں لگانا چاہیے تھا۔“ وہ اپنے سامنے میز پر کھلی فائل بند کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ازابیلا نے التجا بھری

نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اور بدر، وہ ڈھیٹ کرسی پر ویسے ہی پھیل کر بیٹھا تھا۔ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"مسٹر مصعب الزر قاوی! آپ کل سے اس کمپنی کے مینیجر کے باڈی مین کی خدمات انجام دیں گے۔ اگر آپ میں کوئی صلاحیت دیکھی گئی تو اس کی بنا پر آپ کے مستقبل کا فیصلہ لیا جائے گا۔" اس نے فیصلہ سنایا پھر ایک طرف سے نکل گیا۔ آفس کے دروازے کے بند ہونے کی آواز پر بدر تیزی سے اچھل کر کھڑا ہوا۔

"اس کمپنی کا منیجر کون ہے بیلا باجی؟" اس کی نگاہوں میں جھلکتا تجسس ازابیلا کو محظوظ کر گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے آئی۔

"مسٹر خیام حنفی، پیارے بدر۔" وہ کسی بڑی بہن کی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ چلا کر آگے بڑھ گئی۔ اور بدر، وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا تھا۔ اس بار "وارلڈ گلاس کمپنی" کا مستقبل داؤ پر نہیں لگا تھا بلکہ "مصعب الزر قاوی عرف بدر" کی پوری حیات ہی داؤ پر لگ چکی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا ریلنگ تھامے سر اونچا کیے اندھیرے میں چراغاں کیے چراغ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چراغ جو برسوں سے تاریک راتوں میں چراغاں کرتا آیا تھا۔ جو بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلاتا تھا اور جو ناامیدی کے گھرے بادلوں کے درمیان پھوٹتی امید کی ننھی سی کرن کو اس طویل چھت پر آشکار کرتا تھا جس نے پوری زمین پر اپنا سایہ کیا ہوا تھا۔ وہ اس سرد اور جمتے چاند کو محویت سے دیکھتا سوچوں کے طوفان میں پھنس گیا تھا۔ وہ طوفان جو آجکل بہت زیادہ آنے لگے تھے، غالباً مون سون کی بارشوں کی طرح۔

"آپی کو نجانے کیا ہو گیا ہے؟ میں ان سے کیسے شادی کر سکتا ہوں بھلا؟ وہ جندل کی ہمشیرہ ہیں اور وہ۔۔۔ بس میں

کیسے ان سے شادی کر سکتا ہوں یار؟ وہ اتنی اچھی ہیں۔ ہاں بس غصے کی تیز ہیں لیکن پھر بھی۔ مطلب میں خود کو برا نہیں کہہ رہا میں بھی اچھا ہوں لیکن پھر بھی مطلب، مطلب یہ نہیں ہو سکتا ناں!" وہ لبوں کو جنبش دیے بنا بغیر آواز کے اپنے آپ سے گفت و شنید میں مصروف تھا۔ چاند کو تکتے ہوئے اسے اپنی سوچیں بھی منجمد ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ شاید وجہ وہ آنکھیں تھیں جن کی تصویر اس کی آنکھوں کے آئینے میں ابھری تھی۔ بے انتہا حیرت خود میں سموئے بہت سے سوالوں کو جواب دہ آنکھیں۔

"میں ان سے شادی نہیں کر سکتا وہ میرے لیے قابلِ احترام ہیں!" اس بار اس کے لبوں میں بھی جنبش ہوئی تھی اور الفاظ بھی آواز کے ساتھ ادا ہوئے تھے۔ اور وہ بے چارہ اس سے بے خبر رہا تھا۔

"شادی کے بعد وہ تمہاری بیوی ہو گی تو مزید قابلِ احترام ہو جائے گی۔"

"ہاں لیکن پھر بھی وہ جندل کی ہمشیرہ ہیں۔" ایک اور اعتراض۔

"تم اس کے علاوہ کسی اور لڑکی سے شادی کرو گے تو وہ بھی کسی نہ کسی کی بہن ہی ہو گی۔"

"لیکن سعاد کی بات الگ ہے۔ انہیں میں نے ہمیشہ ایک خاص درجے پر پایا ہے۔" اور یہی وہ وقت تھا جب اس بے خبر کو اس کی بے خبری کی سزا کے طور پر اس کا کان کسی کی سخت پکڑ میں آیا تھا۔

"نالائق کہیں کے! جب سعاد کا خاص مقام ہے تو شادی میں کیا حرج ہے ہاں؟ کیوں ڈرامہ رچایا ہوا ہے؟" وہ ہکا بکا چاند کی روشنی میں حرم کو دیکھ رہا تھا۔ تو کیا وہ با آواز خود سے باتیں کر رہا تھا؟ واللہ!

"آپی یار کیوں ضد کرتی ہیں؟ آپ کو پتا ہے وہ بھی آپ کی طرح کی ضدی ہیں۔" وہ اپنا کان حرم کی گرفت سے چھڑواتا اپنی خجلت پر قابو پاتے ہوئے جھنجھلایا تھا۔

"مگر وہ بہت معصوم ہے۔" اور ضرار کے ذہن کی اسکرین پر اس کی لال انگارہ آنکھیں ابھری تھیں جو اسے کچا

چبانے کو ہمہ وقت تیار تھیں

"ہاں بہت معصوم ہیں۔" لہجے میں جانے کیوں طنز کا عنصر شامل تھا۔

"اور وہ جندل کی طرح خوش مزاج اور خوش طبع ہے۔" ایک اور خوبی۔

"میں نے تمہیں کہا تھا ضرار کہ اس راستے کو مت اپنانا، مگر تم نے میری ایک نہ سنی اور اپنی جان کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ پکڑے جاتے تو لاش بھی نہ ملتی ہمیں تمہاری نالائق کہیں کے!" اس کے ساتھ ہی جمے ہوئے ہاتھ کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے ہٹا تھا۔ "اپنی شکل مت دکھانا مجھے تم ورنہ مارے جاؤ گے"!

اس نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔ جندل کی طرح خوش مزاج اور خوش طبع، اسے واقعتاً ان الفاظ کو ہضم کرنے میں دقت پیش آئی تھی۔ بے انتہا دقت!

"او گورخر جواب دو گے اب؟ ہاں نہ؟" حرم اسے خیالوں میں گم دیکھ کر بے زار ہوئی تھی۔ ضرار نے ٹھہر کر اسے دیکھا اور کئی پل بس دیکھتا رہا۔ پھر اس کے لب واں ہوئے۔

"میں سعاد کے جواب کا احترام کروں گا۔" وہ کہہ کر نظریں جھکاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اور حرم، وہ خوشی سے اچھلی تھی۔

"واللہ ضرار! تم نے اپنی بہن کو خوش کر دیا ہے۔ جیتے رہو گورخر۔" وہ وہیں بالکونی سے چلائی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ضرار نے اس کی بات پر برے برے منہ بنائے تھے۔

☆☆☆

اسپتال کے کاریڈور میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا بیس سال سے بستر مرگ پر دنیا ومافیہا سے بے خبر پڑا وہ وجود بیس سال بعد زندگی کی نوید ساتھ لایا تھا۔ ایک کال کی گئی تھی اور کئی بھاری بوٹوں کی آواز اسپتال کے کاریڈور میں سنی گئی تھی۔ تیز تیز اٹھتے قدم ہر لحظہ کمرہ نمبر انتیس کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ کئی انجان چہرے تھے، چہرے پوشیدہ تھے۔ جیسے کوئی راز ہو۔ راز، رازدار۔

"معلوم ہوتا ہے وقت بدلنے والا ہے۔" دھیمی سی آواز تھی۔ اندازہ تھا، قیاس تھا۔

"انتقام کی آگ بھڑکنے والی ہے۔" غصہ تھا، جنون تھا۔

"قبل از وقت تخمینہ مت لگاؤ۔ مجھے جلد از جلد اس سے ملنا ہے۔" جلدی تھی، الجھن تھی۔

بھاری بوٹوں کی آواز کمرے کے قریب پہنچ گئی۔ آواز تھمی، دروازہ کھلا۔ آنے والے اندر چلے گئے۔ دروازہ بند نہیں ہوا۔ کانچ سی خاموشی ٹوٹی، شور بلند ہوا۔

"کمرے میں کوئی نہیں ہے۔" سب حیران ہوئے۔ حیران پریشان ہوئے۔ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ صفائیاں پیش کی گئیں۔ جھڑکا گیا۔ معافی مانگی گئی، درخواست کو قابلِ قبول نہ سمجھا گیا۔

"وہ شخص اہم تھا۔ میرے لیے، تمہارے لیے، بحیرہ روم کے لیے!! وہ واحد گواہ تھا، واحد گواہ۔ وہ رازدار تھا اسے راز افشاں کرنا تھا، وہ ہزاروں جانوں کا محافظ تھا۔ اب روزانہ کئی معصوم جانیں جائیں گی اور خون ہمارے ہاتھوں پر ہو گا کہ ہم اس واحد گواہ کی حفاظت نہ کر پائے۔ ہم نے اپنا نقصان کر دیا ضرار ولید!" آواز بلند ہو گئی تھی۔ کمرے سے باہر کھڑے اسلحے سے لیس افراد سر جھکائے کھڑے تھے۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی باہر آیا۔ وہاں کھڑے افراد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"سر۔" آنے والے نے اپنا نقاب اتار دیا۔ اس کی سنہری رنگت واضح ہوئی۔ اور گہرے کتھئی رنگ کی آنکھیں جن

میں غصہ تھا۔ جبڑے تن گئے تھے، مٹھیاں بھینچ لی گئی تھیں۔

"آج کی تاریخ میں اس شخص کو ڈھونڈو! جان لگاؤ، چوکس ہو جاو۔ اگر کوئی شخص ہمارے کڑے پہرے میں اغوکیا جاسکتا ہے تو جان لو کہ دشمن کے ہاتھ ہماری شاہ رگ پر پہنچ گئے ہیں۔ میں اس غلطی کا ازالہ چاہتا ہوں، میں اس گناہ کا کفارہ چاہتا ہوں چاہے جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔" آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

"حکم آپ کا ہے کمانڈر!" سب نے ایک آواز ہو کر جوش اور جذبے سے کہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سب پر ڈالی تھی۔ اس کی نگاہوں میں غصے اور جنون کے عناصر کا امتزاج ہو رہا تھا۔ وہ سب اس کے ایک حکم پر ارد گرد پھیل گئے تھے۔

"ضرار سر۔" کوئی تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔ "سر، پچھلے دروازے کے پاس ہمارے دو آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں۔" آنے والا شدید بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ ضرار یک ٹک اسے دیکھے گیا اور پھر وہ تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف بھاگا تھا۔ اسے لگا تھا کہ، یہ پوری عمارت اس کے سر پر گرادی گئی تھی۔

دشمن کی جانب سے پہل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"یہ تمہاری کافی۔" زیاد نے کافی کا کپ اس کے سامنے میز پر رکھا۔ صوفے پر بیٹھی ازاں یلانے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا جو اب اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

"تو، ہم کہاں تھے؟" وہ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر دونوں ہاتھ باہم ملا کر آگے ہو کر بیٹھا۔

"خیام حنفی۔"

"وہ آئینہ ساز ہے۔" زیاد کے کہنے پر اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"بالکل! اور قتل بھی کانچ کے ایک ٹکڑے سے ہوا تھا۔ مگر ہم اسے قاتل نہیں کہہ سکتے۔" اس نے جھک کر کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔ جھکنے کی وجہ سے کمر پر گرے گہرے کتھئی رنگ کے بال ذرا سا پھسلتے ہوئے شانوں پر آگرے۔

"کیوں نہیں؟ وہ ایک ڈاکو ہے ازا!" زیاد نے منہ کے زاویے بگاڑے۔ اٹھے کندھے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"ہر بار کچھ غیر معمولی ہونے پر قلم کی نوک بھی بر آمد ہوتی ہے۔ قلم کا تعلق مطلقاً کس سے ہوتا ہے؟!" وہ اپنے سوال سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"طالب علم سے، استاد سے۔ رکو، قلم کا مطلقاً تعلق الفاظ سے ہوتا ہے۔" زیاد کی بات پر اس نے کافی کا کپ لبوں سے لگائے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ گرم گرم کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے کپ لبوں سے ہٹایا پھر گویا ہوئی۔ "الفاظ کا وجود کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ کتابیں، کتابیں لائبریری میں ملتی ہیں زیاد! لائبریری لائبریرین کے وجود سے پھلتی پھولتی ہے۔ قلم لائبریرین تک آپہنچا، لائبریرین تم ہو۔ تو کیا قاتل تم ہو؟" اس نے دائیں ابرو اٹھائے پوچھا تھا۔ زیاد منہ کے زاویے بگاڑتا سینے پر ہاتھ باندھے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"تم کچھ نہیں کر رہیں خیام کو کوور کرنے کے علاوہ۔" اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"ویسے بتاؤ تو سہی۔ تم قاتل کن کن وجوہات کی بنا پر نہیں ہو سکتے؟" وہ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جن وجوہات کی بنا پر آپ جناب قاتل نہیں ہو سکتیں محترمہ! وارلڈ انکل نے بتایا نہیں کہ تفتیش کی شروعات خود سے کی جاتی ہے پھر خود سے جڑی ہر چیز اور ہر انسان سے۔" وہ آغاز میں چڑ کر کہتے کہتے اختتام میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ازابیلا نے کافی کا کپ لبوں سے لگائے گرم گرم کافی کو اپنے اندر انڈیلا۔

"تو اس سب کے بعد میں قاتل نہیں ہوں۔ لیکن تم کیوں نہیں ہو؟!" اس نے زیاد کے برے برے منہ بنانے پر

بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"کیونکہ میں شرفا، غربا، مساکین و مفلسین کی آل اولاد میں سے ہوں۔" وہ بگڑ گیا تھا۔ ازابیلا کھل کر مسکرائی تھی۔

"اگر شرفا ہٹا دو تو باقی تمام خصوصیات کی بنا پر تم ایک قاتل ثابت ہو سکتے ہو۔"

"جی بالکل بجا فرمایا آپ نے! مجھے ازحد افسوس ہے کہ یہ شرفا کی خاصیت جسے آپ نے میرے آباؤ اجداد کی شخصیات میں مفقود قرار دیا ہے، آپ کی شخصیت میں بھی مفقود ہی ٹھہری ہیں۔ شریف لوگ شرفا کو انہی کے گھروں میں قاتل نہیں کہتے ازا!" کافی کا گھونٹ بھرتی ازابیلا کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مان لیا تم قاتل نہیں ہو۔" وہ ہنستے ہوئے کافی کا کپ میز پر رکھ رہی تھی۔ "اب ذرا بتاؤ تمہارے خیال میں خیام قاتل کیوں ہے؟"

"قتل کیوں کیے جاتے ہیں؟" زیاد نے سوال کے بدلے سوال کیا تھا۔

"امم۔۔۔ غربت؟ انتقام۔ کوئی پرانی دشمنی؟" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ "لیکن خیام غریب نہیں ہے تمہاری طرح!" اس نے "تمہاری طرح" پر زور دیا۔ "مزید یہ کہ ہو سکتا ہے اس کی کوئی پرانی دشمنی ہو میکس ویل باربارا سے اور جیک سے؟ لیکن میکس ویل باربارا اور جیک کا دور دور تک آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا اور فرض کریں اگر تھا بھی تو قاتل صرف خیام کیوں؟! قلم کی نوک مجھے جندل اور بدر کے پاس بھی ملی تھی۔" زیاد نے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھا۔ ان کی کہانی مزید الجھ گئی تھی۔

"جندل اور بدر کون؟"

"جندل میر اہم جماعت اور بدر اخبار والا ہے۔ بدر کو کل کی تاریخ میں ہی خیام کے باڈی مین کی جاب ملی ہے۔" زیاد کے ماتھے پر سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

"ان دونوں کا آپس میں تعلق؟"

"ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ اپارٹمنٹ شیئر کیا ہے بس۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"کوئی مشکوک حرکت؟"

"وہ تو خیام نے بھی نہیں کی۔ باوجود اس کے تم اسے قاتل ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" ازابیلا کی سوئی واپس وہیں اٹک گئی تھی۔

"ازا! میں اسے جانتا ہوں۔ تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو یار۔" اس نے گذارش کی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن پھر وہی "کیوں" کا سوال پیدا ہوتا ہے۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہم اس کا جواب کیسے ڈھونڈنے جا رہے ہیں؟!" وہ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں خیام پر بس نہیں کروں گی۔ میں جندل سے بات کروں گی اور بدر سے بھی۔ اور ہر اس شخص سے جس کے سامنے قلم کی نوک ملنے والا سانحہ پیش آئے گا۔" اس نے ہینڈ بیگ اٹھایا پھر کوٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالی۔

"اکیلی آئی ہو؟"

"نہیں! بابا کے مسلط کردہ گارڈز بھی ہیں۔" اس نے بےزاری سے آنکھیں گھمائیں پھر ناک پر بڑے بڑے سیاہ شیشوں والا چشمہ ٹکایا۔ گلے میں ڈالا اسٹول ٹھیک کیا پھر زیاد کو دیکھا۔

"میں کل مندر جاؤں گی۔ بدھ مت کے بنیادی عقائد کو جاننا ہے۔ میں جانتی ہوں اس سب میں بھی وقت درکار ہے اور دونوں کیسز کو ساتھ لے کر چلنا از حد مشکل ہے مگر مجھے یہ کرنا ہے۔ مندر جانے کے بعد میں سینا گوگ جاؤں گی اور پھر شاید تمہارے پاس آؤں یا شاید کسی اور کے دروازے پر دستک دوں؟!" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے بات کے اختتام پر شانے اچکا دیے۔

"فی امان اللہ ازا۔" وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ ازابیلا سر کو ذرا سی جنبش دیتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ زیاد نے بغور میز پر رکھے کافی کے کپ کو دیکھا۔ کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ وہ اسے ادھورا چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

اندلس میں آج برف پڑ رہی تھی۔ سالوں بعد اندلس جیسے گرم خطے میں پڑنے والی برف نے ہر انسان کو جہاں حیران کیا تھا وہیں سب خوش بھی تھے، بے حد خوش۔ سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بلند عمارتوں کی چھتوں پر برف کی تہہ جم گئی تھی۔ بادلوں سے گرتی یہ بے داغ سفیدی اندلس کو اس بڑھیا کا سا لبادہ اوڑھا رہی تھی جس کے بالوں میں چاندنی اتر آئی ہو۔ ہر انسان کا اٹھتا ہر قدم اس سفیدی پر اپنی چھاپ چھوڑ رہا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں چھاتہ لیے گرم کپڑوں میں سردی سے اپنا بچاؤ کر رہے تھے۔ چھوٹے بچے روئی جیسی نرم برف ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔ انہی بچوں میں سے ایک بچے نے برف کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھایا اور زور سے ایک راہ گیر کو مار دیا۔ یخ بستہ برف سر پر پڑتے ہی اسے دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ وہ پلٹ کر ان بچوں کو گنجا کرنا چاہتا تھا مگر سرِ دست اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ وہ دل ہی دل میں بچوں کو لعن طعن کرتا تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ سفید رنگت کچھ ٹھنڈ کی وجہ سے لال پڑ رہی تھی کچھ غصے کا اثر تھا۔ سیاہ جینز پر گہرے کشمشی رنگ کی جیکٹ پہنے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے گلے میں مفلر ڈالے وہ ہوٹل کی طرف رواں دواں تھا۔ اس ٹھنڈ میں بھی اس کا دماغ خاصا گرم تھا۔ وہ، مائک بار بارا۔

ہوٹل کے اندر داخل ہو کر وہ تیزی سے لفٹ کی طرف بھاگا۔ تیسری منزل پر آ کر وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اپنے کمرے کے دائیں جانب اس جاسوس کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ دھاڑ کی آواز میں دروازہ کھلا۔ بیڈ پر بیٹھ کر قہوہ پیتا وہ جاسوس اچھل کر کھڑا ہوا۔ مائک تیزی سے آگے آیا، اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا اور کھینچتے

ہوئے دیوار سے لگایا۔ اس کے ہاتھ سے کپ چھوٹا اور گرم گرم قہوہ مائک کے ہاتھ کو جلا گیا۔ اس نے غصے سے دانتوں سے اپنے دائیں ہاتھ کے دستانے کو کھینچا۔ ہاتھ پورا لال پڑ چکا تھا۔ جلن کے مارے جان نکل رہی تھی مگر فی الفور اسے اس جاسوس سے نمٹنا تھا۔

"میں نے کہا تھا کہ اگر تم نے اس لڑکی کے بارے میں بھائی کو بتایا تو غرناطہ کے چوک پر سولی پر لٹکا دوں گا میں تمہیں۔ کہا تھا ناں؟" وہ حلق کے بل چلایا۔

"ج۔۔جی سر۔" جاسوس کی آواز کانپ گئی۔ اس کی گردن پر زور بڑھا۔

"تو بھائی کو کیوں بتایا تم نے؟!" ایک زوردار مکا اس کی ناک پر پڑا تھا۔

"آپ تو سولی پر لٹکا کر چھوڑ دیتے۔ مارک سر کو نہ بتاتا تو وہ پھانسی کے بعد لاش بھی کتوں کے آگے ڈال دیتے۔" اس نے کافی ہمت جمع کر کے کہا تھا۔ مائک نے ایک اور مکا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا جب کسی نے پیچھے سے آ کر اس کا ہاتھ روکا۔ وہ غصے سے پلٹا تھا اور اسی پلٹنے کے دوران کسی کا زوردار تھپڑ اس کے گال کی زینت بنا تھا۔ وہ زمین بوس ہوتے ہوتے بچا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تھا۔ بمشکل اپنی آنکھوں کو کھول کر اس نے سامنے دیکھا تو جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ وہاں اس کا سگا بھائی کھڑا تھا۔

"تمہیں انسانوں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی کیا؟!" آنکھوں میں غصہ و غضب تھا۔ آواز میں طیش تھا۔ مائک کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ "تم جاؤ جیم۔" وہ جیم نامی جاسوس سر کو جنبش دیتا وہاں سے نکل گیا۔ مارک نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی پھر صوفے کی طرف بڑھا۔

"مجھے وہ لڑکی چاہیے۔" اس نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔ اپنی شامت کے لیے قدرے بے چین تھا، بے چارہ۔

"جانتے ہو کون ہے وہ؟!" مارک صوفے پر بیٹھ کر سنجیدگی سے سوال کر رہا تھا۔

"کون ہے ؟!" وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ آواز قدرے کم ہو گئی تھی۔

"سعاد یوسف زئی! اس کا بھائی ایک جاسوس ہے۔ اس کا باپ ایک جاسوس تھا۔ اس کے دادا بحری جہاز کے کپتان تھے۔ وہ خود کسی جاسوس سے کم نہیں! اس کے آگے پیچھے کئی اسلحے سے لیس لوگ عام لباس میں اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ اس کے قریب بھی جاؤ گے تو اپنے گردوپیش میں موت کے سوا کچھ نہ دیکھ پاؤ گے۔ اس کڑے پہرے میں تم چاہتے ہو وہ لڑکی تمہیں ملے ؟"!

"آپ ہی تو کہتے ہیں مجھے مرد بننا چاہیے۔" وہ منمنایا تھا۔

"یہ مردانگی نہیں بے وقوفی ہے۔"

"کچھ بھی کر کے مجھے بس وہ لڑکی چاہیے بھائی۔"

"کیا کرو گے اس کے ساتھ ؟"

"اچھی لگتی ہے۔" اس نے نظریں چرائی تھیں۔ مارک کی آنکھوں میں دیکھ کر جھوٹ بولنا از حد مشکل تھا۔ مارک نے آنکھیں سکیڑ کر جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ اس کے قریب آیا۔

"وہ لڑکی کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے جس کے گلے میں پٹا ڈال کر تمہارے حوالے کر دوں۔ یاد رکھنا مائک! اس کی طرف جانے والی ہر راہ پر اس کی حفاظت کے لیے تم سب سے پہلے مجھے کھڑا پاؤ گے۔" انگشت شہادت اٹھا کر اسے تنبیہہ کی گئی تھی۔ مائک کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ مارک ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالتا آگے بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ دھم سے بیڈ پر ڈھیر ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے اس نے زوردار لات پاس پڑی میز کو ماری تھی۔

"میں اسے لے کر رہوں گا بھائی!!" وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ راہداری سے گزرتے مارک نے اپنی کنپٹی سہلائی تھی۔ وہ مائک کا مستقل بندوبست کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے لیے چائے بنا کر لاونج میں آئی تھی۔ کپ میز پر رکھے لیپ ٹاپ کے برابر میں رکھ کر صوفے پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر گلے میں مفلر کی طرح ڈالا پھر دھم سے صوفے پر بیٹھی۔ لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر نگاہیں جمائیں اور ساتھ ہی چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ گرم گرم چائے سے حلق تر کر کے کپ واپس میز پر رکھا اور توجہ سے میلز دیکھنے لگی۔

اس کے عقب میں لاؤنج کی سفید رنگ کی دیوار تھی۔ دیوار پر بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی جس میں دائیں جانب سیاہ رنگ کا ایک لشکر تھا اور بائیں جانب سفید رنگ کا۔ درمیان میں خون تھا۔ بے حد خون!

اسی پینٹنگ کے برابر میں ایک اور چھوٹا سا فریم آویزاں تھا جس میں دور دور تک پھیلا سبزہ جگمگا رہا تھا۔ اونچے بلند پہاڑ اور ان پہاڑوں کی چوٹی پر سورج کی شعاوں سے چمکتی دودھ جیسی سفید برف!

ایک طرف امن تھا دوسری طرف جنگ تھی۔

ایک طرف سعاد تھی دوسری طرف جندل تھا۔

ان دونوں کی سوچ کے مختلف زاویے ان دو تصاویر سے واضح ہو رہے تھے۔ ایک امن کی علم بردار تھی، دوسرا جنگ کا حامی تھا۔

لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر نظریں جمائے میلز دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک نقطے پر جم گئی تھی۔ یہ میل اسے "ڈیفینس سینٹرل لائبریری" کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے تیزی سے میل کھولی ساتھ ہی چائے کا گھونٹ اندر

اتارا۔ جیسے جیسے وہ میل پڑھ رہی تھی ویسے ہی اس کی آنکھیں خوشی و مسرت کے ملے جلے جذبات سے پھیل رہی تھیں۔ میل پڑھ کر اس نے جلدی جلدی جوابی میل لکھی اور فوراً سے موبائل اٹھایا۔ کسی کا نمبر ملا کر اس نے موبائل کان سے لگایا۔ چند بیلوں کے بعد ہی کال اٹھالی گئی تھی۔

"حرم مجھے جاب مل گئی ہے۔ ایز آلائیبریرین کراچی کی ڈیفینس سینٹرل لائیبریری میں۔" اس کی آواز نے لاؤنج میں چھائی کانچ سی خاموشی کو چھناکے سے توڑا تھا۔ وہ اب حرم کو مزید تفصیلات بتارہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے سنگ اس کی آواز دھیمی ہوتی جارہی تھی۔

گھر سے ملے گھر پر سایہ عاطفت کی مانند کھڑا فلک شفق کی رعنائیاں دکھارہا تھا۔ سرخی مائل آسمان غروب ہوتے سورج کو الوداعی پیام دے رہا تھا۔ سیاہ چاشنی ہر چیز پر غالب ہونے کے عزم کے ساتھ دھیرے دھیرے سرخی مائل فلک پر اپنی جگہ بنارہی تھی۔

☆☆☆

"روفی کھالوناں یار تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" وہ ہاتھ میں گاجر پکڑے مسلسل بیڈ پر منہ بنا کر لیٹے روفی کی منتیں کر رہا تھا۔ "روفی اب میں آخری بار انسانوں کی طرح کہہ رہا ہوں منہ کھولو جلدی۔ میں پہلے ہی اس جیم کی وجہ سے غصے میں ہوں وہ فون نہیں اٹھارہا۔" اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔ روفی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر گردن پہلے دائیں طرف ہلائی پھر بائیں طرف۔ اس کی طرف سے صاف انکار تھا۔

"ابے سالے اب رک ذرا۔" وہ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا اور روفی کو گود میں لیا۔ وہ دائیں ہاتھ سے زبردستی اس کا منہ کھول رہا تھا۔ روفی نے غصے سے اسے دیکھا پھر اپنے دانت اس کے ہاتھ میں گاڑ دیے تھے۔

"بدتمیز جانور!" وہ درد کے مارے بلبلاتے ہوئے پیچھے ہٹا تھا۔ "جاو دفعان ہو جاو۔ نہیں کھانا تو پڑ جاؤ منہ لپیٹ کر۔

مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہاری منتیں کرنے کا۔" وہ اپنا ہاتھ سہلاتا غصے سے بیڈ سے اٹھا۔ وہ کمرے سے نکل رہا تھا جب سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل بج اٹھا۔ وہ پیر پٹختا سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھا اور موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

"کیا مشکل پیش آئی ہے؟!" روفی کو گھورتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

"مسٹر مصعب الزرقاوی بات کر رہے ہیں؟" دوسری طرف کوئی لڑکی تھی۔

"جی ہاں۔ فرمائیے؟"

"آپ کے لیے خیام سر کا پیغام ہے۔" خیام کے نام پر اس کی تمام حِسیں جاگ اٹھی تھیں۔ "ان کا کہنا ہے کہ آپ کل صبح سات بجے آفس پہنچ جائیں گے۔ آپ اپنی باقی تمام جابز سے ریزائن دے رہے ہیں۔ یہاں آپ کو ان تمام جابز سے ملنے والی سیلری دگنی کر کے دی جائے گی۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی سوال، سر؟" لڑکی اس کی مسلسل خاموشی پر کم فہمی سے پوچھ رہی تھی۔

"اگر میں دوسری جابز نہ چھوڑوں تو؟!" اسے اپنی آواز دھیمی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اب نہ وہ غصہ تھا نہ چڑچڑا پن۔

"خیام سر کو اپنی شکل مت دکھایئے گا!" ٹکہ سا جواب تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا۔ اس عرصے میں وہ روفی کو گھورتا رہا جو اب منہ لپیٹ کر بیڈ پر پڑا تھا۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ جواب دے رہا تھا۔ "میں کل مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا، شکریہ۔" فون رکھتے ہوئے جانے کیوں اس کے ہاتھوں میں جان نہیں رہی تھی۔

اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی۔ کہیں کچھ برا ہونے جا رہا تھا۔ کچھ بہت برا، جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

• شہر ہے بینکاک۔ وقت ہے صبح ساڑھے سات بجے کا۔

میلوں پر پھیلی ہموار سیاہ سڑکوں پر دوڑتی گاڑیوں کا تعاقب کرتے ہوئے وارلڈ گلاس کمپنی کے دروازے پر پہنچیں تو یہاں "روبوٹس" کی آمد آمد تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، آنے والے آرہے تھے اور مکمل تیاری کے ساتھ آرہے تھے۔ چوکیدار جس نے ساری رات بندوق شانے پر لٹکائے اندھیرے میں نیند کو خود پر حاوی ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گزاری اب سامان باندھے اپنے بستر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسرے چوکیدار اپنی جگہ سنبھال چکے تھے۔ صفائی کرنے والا صفائی کر رہا تھا، ہر کوئی دوڑ دوڑ کر کام کرنے میں مصروف تھا۔

اسی اثنا میں دور سیاہ ہموار سڑک کے سرے سے ایک سائیکل سوار نمودار ہوا۔ تیزی سے سائیکل کے پیڈل گھماتا وہ اسی طرف آرہا تھا۔ سائیکل پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے وہ اپنی سفید شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے اندر کی طرف بڑھا۔ ریسپشن پر بیٹھی لڑکی نے اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر اسے گھوری سے نوازا۔ وہ اسے نظر انداز کرتا آگے بڑھنے لگا جب اس لڑکی نے اسے روکا۔

"تم پہلے دن ہی دیر سے آئے ہو۔" اس پر رعب جمایا جا رہا تھا۔ وہ پلٹا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا۔

"آپ کہنے کا تکلف کرو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اور ہاں میں صرف خیام سر کو جوابدہ ہوں!" وہ آنکھیں گھماتا واپس مڑ گیا۔ وہ لڑکی کلس کر رہ گئی۔ وہ مزے سے آگے بڑھتا خیام کی آفس کی طرف رواں دواں تھا۔ ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے اس نے پینٹ کی جیب سے چیونگم نکالی اور اسے منہ میں ڈالا۔ اسے چبا کر اس نے منہ ذرا سا گول کرتے ہوئے اس کا بڑا سا غبارہ بنایا۔

"مسٹر مصعب الزر قاوی!" اور یہ اس کا غبارہ پھٹا تھا۔ چیونگم اس کے منہ پر چپک گئی۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ

ڈال کر کھڑے خیام نے سنجیدگی سے بائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔ اس نے تیزی سے چیونگم اندر کی۔

"یس سر، سوری سر۔" وہ گڑبڑایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والا اعتماد پل میں ہوا ہوا تھا۔

"تیس منٹ لیٹ"!

"سوری سر۔ آئندہ نہیں ہو گا سر۔" خیام نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھا پھر پلٹ گیا۔ بدر نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اس کی پشت کو گھورا پھر تیزی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"سر آپ نے کہا تھا کہ میری پروموشن بھی ہو گی میری کارکردگی کی بنا پر۔ جان سکتا ہوں مجھے اس کے بعد کونسی سیٹ ملے گی؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

"فی الحال میرے باڈی مین ہو، بعد میں وارلڈ سر کے باڈی مین ہو گے۔" اس نے حیرت و صدمے کی ملی جلی کیفیت سے خیام کو دیکھا۔ اس کی تو قسمت ہی خراب تھی۔

"سر آپ سے ایک اور بات کرنی ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس کے ساتھ راہداری کا موڑ مڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ خیام خاموش رہا۔ غالباً اسے بولنے کی اجازت دی۔ "آپ مجھے بدر کہا کریں۔" اس نے ایک نگاہ خیام کے سپاٹ چہرے پر ڈالی پھر مزید تفصیل دینے کی احتیاج سمجھی۔ "میرا مطلب ہے کہ مجھے اب سب بدر کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ اور مصعب نام ویسے بھی میرے لیے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ مطلب بدر اچھا نام ہے تو آپ بس بدر کہا کریں۔" وہ دروازہ کھول کر اپنی آفس میں آگیا۔ بدر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ خیام نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"بدر کا مطلب کیا ہے؟"

"چودھویں کی رات کا مکمل چاند۔"

"اور مصعب کا؟"

"سردار۔" وہ ایک قدم آگے آیا۔ اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔

"افسوس کی بات یہ ہے کہ تمہاری شخصیت دونوں ناموں پر پورا نہیں اترتی۔ تو تمہیں مصعب بلایا جائے یا بدر کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔ بدر نے صدمے سے اسے دیکھا جو اپنی میز کی طرف جا رہا تھا۔

"میں کام پر آتے ہی کافی پیتا ہوں۔ شام کو پانچ سے چھ تک میں کارخانے میں ہوتا ہوں اور وہاں مجھے مزید ایک کپ کافی چاہیے۔ اس کے علاوہ تمام چیزیں تم باہر ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی سے پوچھ سکتے ہو۔" وہ فائل کے کاغذ الٹتے ہوئے اسے حکم دے رہا تھا۔ بدر نے نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔

"اور ہاں۔ اسے آپ کہنے کا تکلف کر لینا!" بدر نے زور سے آنکھیں میچی تھیں۔ اس نے سن لیا تھا وہ جو اسے نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے باہر آیا۔ ریسیپشن کی طرف بڑھتے ہوئے اسے اس لڑکی کی نگاہیں اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ سے ایک طرف کھڑا ہوا۔

"مجھے خیام سر کے معمولات کی تفصیل چاہیے۔" اس نے حکم نہیں دیا تھا اس نے دھیمے لہجے میں گذارشاً کہا تھا۔ اس لڑکی نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔

"میں دیتی ہوں۔" وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور پھر اس سے رہا نہیں گیا۔ ایک کاغذ پر مکمل تفصیل لکھنے کے بعد وہ گردن گرا کر ہنس پڑی۔

"مسٹر بدر صرف خیام سر کو جوابدہ ہیں۔" وہ ہنس رہی تھی، بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ بدر دانت پیستے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل کیا تھا وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن ہائے رے آئی فون!

شاید جان لے کر ہی چھوڑے گا۔ کمبخت!

☆☆☆

وہ دو گھنٹے کا لیکچر لینے کے بعد کلاس سے باہر آئی تھی۔ بیگ دائیں شانے پر ٹکائے وہ سرسری سی نگاہ اپنے گردوپیش پر ڈالتی گراؤنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حسب معمول گہرے کتھئی رنگ کے بالوں پر ہیڈ بینڈ ٹکایا ہوا تھا، ڈھیلا ڈھالا بندھا جوڑا اب رفتہ رفتہ کھلنے لگا تھا۔ چہرے پر پڑتی سورج کی شعاؤں سے سنہری رنگت چمک رہی تھی۔ دماغ ہمیشہ کی طرح پہیلیوں میں الجھا ہوا تھا۔

''ازابیلا۔'' یونہی چلتے ہوئے کوئی اس کے ہمقدم ہوا تھا۔ اس نے گردن ترچھی کرکے جندل کو دیکھا۔

''جندل۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''کیسی ہیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''بالکل ٹھیک۔ اب تو واقعی میں بالکل ٹھیک ہوں، جب سے مائک کے مستقل طور پر یہاں سے جانے کا سنا ہے۔'' وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ جندل نے گردن ذرا سی ترچھی کرکے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مائک چلا گیا؟''

''بالکل، میں بہت خوش ہوں جندل۔'' اس نے ننھے بچے کے سے انداز میں ذرا سی بانہیں پھیلائے خوشی سے کہا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے اونچے درختوں کے درمیان چل رہے تھے۔ اردگرد طلباء کا ہجوم تھا۔

''جندل، سمندر میں دلچسپی ہے آپ کو؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ جندل زیرِ لب مسکرایا تھا۔

''یہ بالکل ایسے ہے جیسے آپ شراب کے نشے میں مدہوش انسان سے پوچھیں کہ اسے شراب پی کر نشہ چڑھتا ہے؟!'' ازابیلا اس کی مثال پر مسکراہٹ دبا گئی۔ ''سمندر عشق ہے میرا، ازابیلا!'' اس نے قدرے توقف سے کہا

تھا۔

”واو! میرے علاوہ سب یہاں سمندر کی محبت میں آئے ہیں۔“

”آپ کو سمندر میں دلچسپی نہیں؟!“ وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ ازابیلا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے صاف انکار کیا تھا۔

”میں صحافی ہوں جندل، صحافت میں میرا شاندار مستقبل تھا۔ جب میں مزید آگے بڑھنے کے خواب دیکھ رہی تھی تو بابا نے قدم روک دیے۔ انہوں نے ہاتھ میں فارم تھمایا اور یہاں بھیج دیا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ آواز دھیمی ہوگئی تھی۔ ”یونو واٹ جندل، میں شاید اب کچھ عرصہ یونہی ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتی رہوں۔ جب تک بابا کو میرے مقابلے کا کوئی لڑکا نہیں مل جاتا۔ جیسے ہی انہیں کوئی لڑکا ملے گا وہ میری شادی کر دیں گے کیونکہ ان کے خیال میں اس بھری دنیا میں مجھے خطرہ ہے اور کوئی ہونا چاہیے جس کا ساتھ انہیں میرے متعلق مطمئن کر سکے۔ اس کے بعد میں ماں جیسی زندگی گزاروں گی۔ کوئی مستقبل نہیں۔ بس ایک معروف بزنس مین کی بیوی کا اسٹیمپ لگوا کر گھر میں بیٹھ جانا۔ کبھی پارٹیز میں چلے جانا اور اگر ماں کی طرح مذہبی ہوگئی تو وہ بھی نہیں۔“ وہ تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جندل نے بغور اسے دیکھا تھا۔ ازابیلا کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس دنیا میں ہر انسان کوئی نہ کوئی غم، کوئی نہ کوئی گھاؤ سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ ذرا سا چھیڑو تو خون رسنے لگتا ہے۔

”میں یقین نہیں کر پا رہا کہ ابراہم وارلڈ کی اکلوتی بیٹی کے الفاظ ہیں یہ۔“ اس نے جھرجھری لی تھی۔ ازابیلا تلخی سے مسکرائی۔

”یہ حقیقت ہے جندل، ہم جیسے امیر ماں باپ کے بچے اندر سے بہت غریب ہوتے ہیں۔ وقت، محبت، توجہ، کوئی سمجھنے والا، کوئی سمجھانے والا، ہم اپنی پوری زندگی ان سب کی کمی کے ساتھ جیتے ہیں۔ یہ وہ دولت ہوتی ہے جو ہر

انسان کی زندگی کا کُل سرمایہ کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ ہم جیسے لوگ اس دولت سے محروم رہتے ہیں۔"

اس نے ذرا سا سر جھکایا تھا۔ وہ دونوں ڈپارٹمنٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ دونوں کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ جندل ایک قدم آگے بڑھاتا اس کے روبرو آن کھڑا ہوا۔ نگاہیں اس کی چمکتے چہرے پر پڑیں۔ پھر چہرے سے پھسلتیں دائیں گال کے کنارے کان کے قریب اس جگہ پر جہاں وہ نشان تھا، جسے اس نے ہمیشہ کی طرح میک اپ میں چھپایا ہوا تھا۔

"اور آپ؟ آپ کیا چاہتی ہیں؟!" ازابیلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ مبہم سا مسکراتا آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں سورج تھا۔ وہ اس کے اور سورج کے درمیان کسی دیوار کی مانند کھڑا تھا۔ وہ چند پل خاموشی سے یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ پھر اس نے پلک جھپکی۔ لب وا ہوئے۔

"میں۔۔ میں صحافت کے بعد کچھ الگ کرنا چاہتی ہوں۔ جیسے میں لوگوں کے عقائد پر ریسرچ کرنا چاہتی ہوں۔ میں غالب اور مغلوب کی فلاسفی سمجھنا چاہتی ہوں۔ اور ہاں، میں سیاحت کرنا چاہتی ہوں۔" وہ مزید کچھ کہتے کہتے رکی۔ ٹھہر کر جندل کو دیکھا۔ "لیکن میرے چاہنے سے فرق نہیں پڑتا۔" اس نے مایوسی سے کندھے اچکائے تھے۔

"عقائد کے بارے میں ریسرچ کی شروعات کہاں سے کریں گی؟ سیاحت کے لیے آپ کی پہلی ترجیح کا شرف کسے حاصل ہوگا؟" وہ آنکھوں میں انوکھی چمک لیے مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کے مایوس کن الفاظ کو یکسر نظر انداز کیا گیا تھا۔

"امم۔۔۔ کتابیں فرسٹ، اس کے بعد گوگل۔ اور پھر لوگوں سے سوال کروں گی۔ سیاحت کے لیے گوانٹاناموبے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جندل حیرت سے اسے دیکھتا ہنس دیا تھا۔

"واقعی؟"

"ہاں، میں وہاں جاکر پوری رپورٹ بناؤں گی اور حقیقت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی۔" وہ شرارتاً مسکرائی تھی۔

"اور پھر لوگ کہیں گے کہ ازابیلا وارلڈ دنیا کی پہلی سیاح ہیں جنہوں نے سیاحت کے لیے گوانٹاناموبے کا چناؤ کیا۔

سیاح یا صحافی؟"

"اممم۔۔۔ صحافی جس نے سیاحت اختیار کی۔" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"داد دیتا ہوں آپ کی پسند کی۔" وہ ہنس دی تھی۔

"آپ کو بھی ساتھ لے جاؤں گی گوانٹاناموبے۔" بے اختیار اس نے کہا تھا۔ پھر وہ رک گئی۔ جندل کے لبوں سے غائب ہوتی مسکراہٹ نے اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔

"گوانٹاناموبے میں بے گناہ مسلمانوں کی اکثریت دیکھتے ہوئے میرا قیاس ہے کہ ہم وہاں قیدی بن کر ہی جاسکتے ہیں، ازابیلا۔" وہ سنجیدہ ہوا تھا۔

"اممم۔۔ پھر ہم برمودا چلیں گے، ٹھیک؟" وہ ہنس دیا تھا ۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر ہنس دی تھی۔ جندل، وہ کتنی آسانی سے اس کا موڈ بحال کر گیا تھا۔ اس نے نہیں پوچھا تھا کہ اس کے لیے اس کی چاہت کیوں معنی نہیں رکھتی؟ وہ اس کی پسند پوچھتا گیا تھا وہ جواب دیتی گئی تھی۔ آج اسے معلوم ہوا تھا وہ کیا چاہتی تھی؟ اگر وہ کچھ کر سکتی تو کیا کرتی؟! جندل کے سوالات اور ان پر اپنے ردعمل کے بارے میں غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ، جندل یوسف زئی انسانی دماغ سے کھیلنا جانتا تھا۔ وہ انسانی نفسیات کو بہترین طریقے سے سمجھتا تھا۔

اور کون جانتا تھا کہ یہ جاسوس ماضی میں کوئی سائیکالوجسٹ رہ چکا ہو؟

☆☆☆

زندگی کا اصول ہے، انسان جس چیز سے جتنا بھاگتا ہے وقت اسے بے دردی سے لا کر اسی چیز کے آگے پٹخ دیتا ہے۔ جیسے کہ سعاد! وہ کتابوں سے بھاگنے والی لڑکی کتابوں کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اس کے گردوپیش میں کتابوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کتابیں تھیں، کہانیاں تھیں، ایک نئی دنیا تھی۔ حقیقت کے پردے چاک کرتی ایک منفرد دنیا جس کا ہر لفظ دُریکتا کی مانند تھا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس اونچی دیوار کے پاس آئی۔ ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب اٹھائی۔ اس کتاب کو تھامتے ہوئے جانے کیوں اس کے ہاتھ کپکپائے تھے۔

"میں کتابوں کے عشق میں ڈوبا لڑکا کتابوں سے غداری کر بیٹھا۔ میں نے محبت کی بھی تو اس لڑکی سے جسے کتابوں کا کاف بھی نہیں پسند! واللہ سعاد غضب ہو گیا ہے۔ ہم اہلِ وفا بے وفائی کے جرم کے مرتکب ٹھہرے ہیں۔" اس نے گہری سانس لے کر آنکھوں کو میچتے ہوئے کئی آنسوؤں کو اپنے اندر اتارا تھا۔ آنکھ کے پانی کے کچھ قطروں کو روک لینا چاہیے۔ ان کا تسلسل سے بہنا اس نمکین پانی کو بے مول کر دیتا ہے جس کی ایک جھلک روٹھے ہوؤں کو مناتی ہے اور بچھڑے ہوؤں کو ملاتی ہے۔

روٹھے ہوئے، بچھڑے ہوئے، ملن۔

"السلام علیکم میم۔" اس چہکتی نسوانی آواز پر اس نے تیزی سے بھیگی آنکھوں کو رگڑا پھر ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے پلٹی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ غالباً اٹھارہ یا انیس سال کی نوجوان لڑکی تھی۔ مہرون رنگ کے عبائے میں ملبوس سرمئی رنگ کا حجاب اوڑھے معصومیت چہرے پر سجائے وہ کسی نازک سی گڑیا کی مانند تھی۔ بھوری رنگت، کنتھئی آنکھیں اور وہ پرخلوص دلکش مسکراہٹ، سب زیر کرنے والا تھا۔

"آپ کا آج پہلا دن ہے ناں یہاں؟" سعاد نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں اپنا کام تقریباً مکمل کر چکی ہوں اور آپ کو فی الحال کام سمجھنے میں وقت لگے گا تو پہلے آئیں میں آپ کو پوری لائبریری کا وزٹ کرواتی ہوں اور اس سے پہلے ہم چائے پیتے ہیں۔" وہ لڑکی مسکراتے ہوئے سعاد کو ساتھ لیے آگے بڑھی۔

"آپ کا نام؟"

"سعاد! سعاد یوسف زئی۔"

"کتنا پیارا نام ہے ناں۔" سعاد مسکرا دی۔ "میرا نام افق ہے۔ افق بنت فہد!" وہ دونوں افق کے کیبن میں آ چکے تھے۔ افق نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کا کہا پھر خود چائے کا کہنے لگی۔ سعاد نے ایک تفصیلی نگاہ پورے کیبن پر ڈالی پھر وہ میز کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں لیپ ٹاپ رکھا تھا، اس کے برابر میں ایک کتاب۔ لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر جگمگاتی تحریر اور عنوان کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ افق کسی کتاب پر تبصرہ لکھ رہی تھی۔ کتاب کے برابر میں اور میز کے کونے پر چھوٹے سے فریم میں ایک تصویر جکڑی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے بچے، آم سے لدے درخت کے سائے میں کھڑے ان دو بچوں میں سے ایک افق تھی۔ وہی رنگت وہی نقوش اور وہی معصومیت۔ اور دوسرا بچہ یقیناً اس کے لیے اجنبی تھا۔

"یہ میرا کزن ہے۔ مصعب عرف بدر۔ پیارا ہے ناں؟" وہ شرارتاً گویا ہوئی۔ سعاد سر کو جنبش دیتے ہوئے مسکرا دی۔ وہ بچہ مسکرا رہا تھا تو اس کی آنکھوں کے کناروں پر سلوٹیں سی پڑ رہی تھیں۔ اس کے منہ سے بے اختیار کیوٹ نکلا تھا۔ افق زیر لب مسکرائی۔

"اب تھائلینڈ میں ہوتا ہے۔ یہ تصویر کچھ ماہ پہلے اسی نے بھجوائی ہے۔ ہم دس سال پہلے ملے تھے۔ وہ دس سال کا تھا

میں نو کی۔ آج وہ بیس کا ہے میں انیس کی۔ ہمیشہ کی طرح اس سے ایک قدم پیچھے۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے۔ "ویسے یہ پاگل ہے پورا، آئی فون پر مرتا ہے۔ دیوانہ ہے دیوانہ۔" وہ یقیناً بدر کے آئی فون پر غصہ تھی۔ بے حد غصہ۔

"ٹھیک ہے افق، دیوانے کو چھوڑو تم چائے پکڑ کر لاؤ۔ میں چائے پینے سے پہلے کام نہیں کر سکتی۔" اس کے کندھے اچکا کر کہنے پر افق ہنس دی۔

"چائے کے عاشق! ابھی لائی بس۔" وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے نکل گئی۔ سعاد نے مبہم سا مسکراتے ہوئے نگاہوں کا رخ اس تصویر کی طرف موڑا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ پھر اسے کچھ نظر آیا۔ وہ آگے کو جھکی۔ بغور تصویر کے کنارے پر لکھی تحریر پڑھنے لگی ۔

"مجھے دیوانہ کہنے والے دیوانے اس دیوانگی پر دل و جان سے دیوانے ہوئے ہیں۔ دیوانے پر دیوانے، ہائے!" وہ ہنس دی تھی۔ بے اختیار، کھلکھلا کر۔

دیوانہ، دیوانے، دیوانگی۔

☆☆☆

وہ اسے اطلاع دینے آیا تھا، اس کے مہمانوں کی آمد کی اطلاع۔ دروازہ کھول کر جب وہ اندر آیا تو سامنے کا منظر دیکھتے ہوئے الفاظ لبوں پر آنے کی جسارت نہ کر سکے۔ وہ تذبذب سے اس منظر کو دیکھتا رہا پھر دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔

آفس کی اونچی کھڑکی کے پاس، جس کے پار ہموار سیاہ سڑک اور اس کے دائیں بائیں درختوں کے سائے میں قطار میں کھڑی گاڑیاں، نیلا فلک اور روئی جیسے بادل دل افروز منظر پیش کر رہے تھے، وہیں وہ جائے نماز بچھائے ہاتھ

باندھے کھڑا تھا۔ کوٹ راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر دی گئی تھی۔ پینٹ ٹخنوں تک موڑی جا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے بنا پلک جھپکے اسے دیکھتا رہا۔

وہ خود اتنا مذہبی نہیں تھا۔ بچپن سے عادت تھی پانچ وقت نماز پڑھ لیتا تھا، رمضان کے مہینے میں روزے رکھ لیتا تھا اور ہفتے میں ایک بار قرآن کی تلاوت کر لیتا تھا۔ وہ جن حالات سے گزرا تھا اس کا یہ معمولی مذہبی ہونا بھی غنیمت تھا۔ اور اب جانے کیوں سانس روکے خیام کو دیکھتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ وہ بدر اپنا کچھ بہت قیمتی کھو چکا ہے۔ وہ محبت کی آتش جسے اک ذرا سی چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے وہ بجھ چکی تھی۔ وہ اسی دن بجھ چکی تھی جس دن اس کے دادا اسے تنہا ایک اجنبی ملک میں چھوڑ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ظلم ہوا تھا، اس نے اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔

اس نے سینے میں قید سانس خارج کی پھر ذرا سا سر جھکایا۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے آفس کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں جائے نماز تھا۔ شرٹ کے کف مڑے ہوئے تھے، بالوں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں۔ اس نے جائے نماز خیام کے برابر میں بچھایا پھر کسی ننھے بچے کی طرح جو اپنے بڑے کی معصومانہ تقلید کرتا ہے، آنکھیں بند کرتے ہوئے تکبیر ادا کی پھر دونوں ہاتھ باندھ لیے۔ خیام اب سجدے میں تھا۔ سامنے کھڑکی کے پار سڑک پر کئی سیاہ گاڑیوں کی آمد ہوئی تھی۔ گاڑیاں رکیں۔ گارڈز نے فوراً گاڑیوں سے اترتے ہی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ ایک گاڑی سے ابراہم والرڈ اترا۔ دائیں بائیں دو گارڈز کے ساتھ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ خیام نے سر سجدے سے اٹھایا تھا۔

☆☆☆

"ایک بات پوچھوں سر؟" وہ جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے خیام نے کسی فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"آپ اکیلے رہتے ہیں یہاں؟" فائل کا مطالعہ کرتا خیام ٹھہر گیا۔ اس نے سر اٹھا کر کم فہمی سے بدر کو دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے سوال کا مقصد سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ "میرا مطلب ہے آپ کے والدین، بہن بھائی، بیوی بچے؟ کبھی دیکھا نہیں انہیں۔" وہ خاصے اعتماد سے اس کے سامنے کرسی پر دراز ہو رہا تھا۔ وہ گھبراہٹ، وہ جھجھک اب کہیں منہ چھپا کر بھاگ گئی تھی اور وجہ ظاہر ہے خیام کی وہ مسکراہٹ تھی جسے اس نے آئینے میں اس کے نظر آتے عکس میں دیکھا تھا، تب جب وہ نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔ اتنا کھڑوس بھی نہیں تھا اس کا باس۔

"والدین حیات نہیں ہیں۔ اکلوتا ہوں۔ زوجہ نے بغداد میں سکونت اختیار کی ہوئی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر واپس اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ بدر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھا۔ بیوی بچوں والی بات اس نے تو مذاق میں کہی تھی۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟!" وہ تقریباً چلا ہی تو اٹھا تھا۔ خیام نے سر کو ذرا سی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

"بچے؟"!

"ایک بیٹا۔" وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"سر، آپ واقعی شادی شدہ ہیں؟ مطلب لگتے نہیں ہیں۔ کبھی خیال بھی نہیں آیا مجھے تو کہ آپ۔۔۔ آئی کانٹ بلیو دس!" وہ حیران تھا، بے حد حیران۔

"کیوں؟ ہم میں اور تم میں کیا فرق ہوتا ہے؟" فائل ایک طرف رکھ دی گئی اور ساتھ ہی دوسری فائل اٹھالی گئی۔

"ہاں ناں۔ وہ ذرا زندگی سے بے زار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بے چارے بے چارگی کا ثبوت ہوتے ہیں۔ آپ تو، مطلب آپ کو دیکھ کر تو کسی کو خیال تک نہ آئے اس بات کا۔" خیام نے سنجیدگی سے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہو گیا؟!" کافی ڈھیل دی جا چکی تھی۔ اب رسی کھینچنے کا وقت تھا غالباً۔

"سوری سر۔" اس نے تھوک نگلا۔ اس کا باس اتنا بھی اچھا نہیں تھا۔

"وارلڈ سر کے پاس جا رہا ہوں پھر کارخانے جاؤں گا۔ وہیں آ جانا۔" اسے حکم دیتا وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی پر جھولتا کوٹ اٹھا کر کندھوں پر ڈالا۔ ٹائی کی ڈھیلی ناٹ درست کی۔ کانچ کی میز پر رکھی قیمتی رسٹ واچ کلائی پر باندھی۔ اپنا آئی فون اٹھایا پھر ایک سنجیدہ نگاہ بدر پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر بدر نے سر جھٹکا۔

"آئی فون کی مستی ہے۔ ورنہ ان جیسے کھڑوس باس کو کوئی اپنا شوفر بھی نہ رکھے۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے۔ دروازہ کھلا۔ "سمجھتے کیا ہیں خود کو؟ دو پیسے دے کر بولنے کا حق بھی چھین لیں گے؟ اتنا ہی برا لگتا ہوں تو مسکرا کر کیوں دیکھ رہے تھے؟ جھوٹے، دغاباز، دوغلے۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ دروازے پر کھڑا خیام آگے آیا۔ بدر کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے میز سے فائل اٹھائی۔ بدر نے تھوک نگلا۔ وہ ایک سفاکانہ نگاہ اس پر ڈالتا آگے بڑھ گیا۔ وہ سانس روکے سامنے دیکھتا رہا۔ اس کی نوکری پکا اس کے ہاتھ سے جانے والی تھی۔

☆☆☆

دور تک پھیلا سمندر۔ ساحل پر سر پٹختی لہریں جو ہر لحظہ تیزی سے آتیں اور پوری جان لگا کر ساحل سے ٹکراتیں۔ رکتیں، ٹھہرتیں، واپس چلی جاتیں۔ فلک پر بادلوں کے پیچھے سے ذرا سا نظارہ کرواتا مِہر مُنور سمندر کی ان مُطلق العِنان لہروں کو سنہرے رنگ کی وہ روشنائی بخش رہا تھا جو وہاں کھڑے ہر عاشقِ سمندر کے لیے دل افروز تھی، دلکش تھی، دل۔۔۔ دلنشین تھی۔

آئینے سے صاف شفاف پانی سے ٹکراتیں وہ سنہری نیم گرم شعائیں اور وہ خوبصورت منظر جو ان شعاؤں کے لہروں سے ٹکرانے پر اور لہروں کے ساحل پر سر پٹخنے پر وجود میں آتا تو بس وہی باقی رہ جاتا۔ ہر چیز مفقود قرار دے دی

جاتی۔ بس سمندر اور صرف سمندر۔

ٹراؤزر چڑھائے پانی میں دور تک جاتا نم مٹی کے احساس کو کچلتا وہ عاشق، لہریں بڑھ بڑھ کر اس کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر رہی تھیں۔ وہ اس نمی کے احساس کو اپنے اندر اتارتا پر سوچ نگاہیں دور تک پھیلے سمندر پر گاڑے آگے بڑھ رہا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں تک پانی میں ڈوبا وہ شاید آج تیرنے کے ارادے سے آیا تھا۔

عشق کا ذکر ہوا ہے، عاشق کی آمد ہوئی ہے۔ محبت کو حسد کیوں نہ ہو گی؟ کوئی آنکھیں سکیڑے گا، ناک چڑھائے گا، منہ بنائے گا پھر جتن کرے گا عاشق کو عشق سے دور کرنے کے۔

آواز آئی تھی کسی عقاب کی، اس نے تیزی سے سر اٹھایا تھا۔ وہ عقاب عین اس کے سر کے اوپر اڑان بھر رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھا گیا۔ اس کا زئی لوٹ آیا تھا۔

زئی نیلگوں آسمان پر دائرے میں ایک چکر کاٹ کر اس کے پھیلائے ہوئے دائیں بازو پر بیٹھا۔ زئی غصے میں تھا۔ اس نے موٹے دستانے نہیں پہن رکھے تھے، کوئی احتیاطی تدابیر نہیں تھیں۔ نتیجتاً زئی کے تیز پنجے اس کا بازو زخمی کر گئے۔ اور وہ، وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اس سے خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔

"اب بھی کیوں آئے؟ بد تمیز جانور!" زئی مچلا تھا۔ اس کے بازو سے خون کی بوندیں گری تھیں۔ اور تبھی اس کی نگاہ زئی کے پنجے پر پڑی۔ وہ کچھ ساتھ لایا تھا اور غالباً اس کے آنے کا نصب العین وہی تھا۔ اس نے دھیرے سے اس کے پنجے سے وہ چٹھی نکالی۔ چھوٹا سا وہ رقعہ کھول کر اس نے ایک نگاہ زئی پر ڈالی پھر رقعے کی طرف متوجہ ہوا۔

"لائبریری پہنچو!" وہ کم فہمی سے اس پیغام کو دیکھے گیا۔

"کس کا پیغام لائے ہو زئی؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زئی نے خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈالی تھی پھر اپنے پر پھیلائے تھے، اونچی پرواز بھری تھی۔ وہ سر اونچا کیے اسے دیکھ رہا تھا اور تبھی اس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔

”تیسرا آدمی!“ وہ بڑبڑایا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے سمندر سے دور ہو رہا تھا۔ عاشق کا اٹھتا ہر قدم عشق کی حدوں سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

”آپ جا رہی ہیں؟“ افق اسے اپنا سامان سمیٹتا دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، عشاء کی اذانیں ہونے والی ہیں۔ مغرب کے بعد ٹیکسی ڈھونڈنا ویسے بھی مشکل کام ہے۔“ میز پر بکھری کتابیں سمیٹتے ہوئے جواب دیا گیا۔

”واو، یہ لے کر جا رہی ہیں۔“ افق کی نگاہ اس کے ہینڈ بیگ کے برابر میں رکھی کتابوں پر پڑھی۔ وہ آگے بڑھی اور کتابوں کو دیکھنے لگی۔ ”نسیم حجازی کو پڑھتی ہیں آپ؟“ وہ اشتیاق سے کتابوں کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

”نہیں، میرا بھائی پڑھتا ہے۔ کسی نے مجھے کہا تھا مجھے انہیں پڑھنا چاہیے۔ بس آج نظر آئیں تو اٹھالیں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ افق نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا پھر سامنے ایک ریک کی طرف بڑھی۔

” ”اندھیری رات کے مسافر“ کے ساتھ آپ ”اور تلوار ٹوٹ گئی“ نہیں اٹھائیں گی۔ یوسف بن تاشفین، اندھیری رات کے مسافر، شاہین اور کلیسا اور آگ۔ یہ چاروں ناول اندلس کی تاریخ کا آئینہ ہیں۔ سیریز کی طرح!“ اس نے ”یوسف بن تاشفین“ اٹھا کر اس کے آگے بڑھائی۔ وہ مسکراتے ہوئے کتاب تھام گئی۔

”شکریہ افق۔“ افق نے سر کو خم دیا۔ اس نے کتابوں کی جسامت دیکھی پھر اپنے ہینڈ بیگ پر نگاہ ڈالی۔ گہری سانس لے کر اس نے نقاب ٹھوڑی سے اٹھا کر ناک پر ٹکایا۔ پھر دائیں ہاتھ میں کتابیں پکڑیں اور بائیں ہاتھ میں ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اسی اثناء میں میز پر رکھا اس کا موبائل بج اٹھا۔ افق نے ہنستے ہوئے موبائل اسے تھمایا۔ اس نے کال اٹھا کر موبائل کان سے لگایا پھر افق کو سلام کرتی باہر کی جانب بڑھ گئی۔

"حرم جلدی جلدی بولو کیا کام ہے؟ ضروری بات نہیں ہے تو فون رکھو میں ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں پہلے۔" وہ لائبریری کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں اپنے سسرال جا رہی ہوں، تمہیں مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ احمد ساتھ ہے لیکن وہ کل ہی واپس آجائے گا البتہ میں یہاں ایک دو ہفتے رہوں گی۔ ویسے اور کوئی پریشانی نہیں ہے مجھے لیکن یہ نکما ضرار۔ دو راتوں سے گھر تو نہیں آیا، آئے گا بھی نہیں۔ آپا بھی تو کھانا وانا خود بنالیتا ہے۔ بس احمد کا مسئلہ ہے۔ تم دیکھ لو گی؟" حرم کی بات پر سڑک کنارے ٹیکسی کا انتظار کرتی سعاد نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"احمد بھائی کو بھی سیکھ لینا چاہیے اب ہر کام۔ خیر میں کرلوں گی۔ ضرار کے کھانے میں زہر ملانا چاہوں گی۔" اسے اب تک اس خر پر غصہ تھا۔

"شرم کرو، مستقبل کا شوہر ہے تمہارا۔" وہ ہنس دی تھی۔ سعاد خاموش ہوگئی تھی۔ حسب عادت دانتوں سے لب کاٹتے ہوئے وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس نے کال بند کردی۔ اب نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی نہ مزاج اچھا تھا

دور کہیں مسجد سے عشاء کی اذان ہونے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے سڑک کنارے کھڑی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ موبائل میں بیلنس نہیں تھا کہ وہ آنلائن ابر ہی منگوا لیتی۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ شام کے سائے اب اندھیرے میں منہ چھپانے لگے تھے۔ وہ مسلسل انتظار سے تھکنے لگی تھی۔ بے زاری سے سڑک کے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ سڑک کے سرے سے نمودار ہوتے کچھ آدمیوں پر ٹکی تھی۔ اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

وہ عام آدمی ہوتے تو اس کے لیے زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن وہ "کرائے کے قاتل" تھے۔ ہاتھوں میں پستولیں

تھیں۔ رخ اسی کی طرف تھا۔ دوبارہ وہ ان کے ہاتھوں مرتے مرتے بچی تھی، وہ انہیں لاکھوں انسانوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ قریب آچکے تھے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تو وہاں سے مزید دو آدمی بر آمد ہوئے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی تو اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی محسوس ہوئی۔

"بالآخر! آپ سے ملاقات ہوگئی محترمہ۔" ایک لڑکا مکمل سیاہ لباس میں موجود سیاہ ہی نقاب سے اپنا چہرہ ڈھکے اپنی پستول منفرد انداز میں انگلیوں پر گھماتا نہایت شستہ انگریزی میں کہتا آگے آیا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے حجاب کے پار کان میں لگے آلے میں سے سبز شعائیں نکلی تھیں۔ سگنلز ملے تھے اور اسی کے ساتھ ہی کسی کی آواز کان میں لگے آلے سے نکل کر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ "وہاں کون ہے سعاد؟"

"اچھا سوال ہے مگر میں جواب نہیں دوں گا۔" وہ خباثت سے مسکرایا تھا۔ اس کی نقاب سے جھلکتی آنکھیں مسکرانے کی وجہ سے تھوڑی سی پھیلی تھیں۔

"میرے پاس مت آنا!" وہ پیچھے ہٹنا چاہتی تھی مگر چاروں جانب سے گھیرا تنگ تھا۔ وہ لڑکا ہنس دیا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"موت تو پاس آتی ہے ناں، اسے آنا پڑتا ہے۔ روک سکتی ہیں؟"

"کوئی جوابی وار مت کرنا۔ انہیں تھوڑی دیر روکے رکھو بس تھوڑی دیر۔"

وہ اپنی آنکھیں میچ گئی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ بے اختیار اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

"جندل، پلیز آجاؤ۔ جندل۔۔ زیاد میں مشکل میں ہوں، براہ مہربانی آجاؤ! زیاد پلیز۔۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو

لڑھکتا ہوا نقاب میں جذب ہوا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ”زیاد زیاد آجاؤ۔ جندل سنو میں مشکل میں ہوں۔“ وہ رو رہی تھی۔ چاروں جانب سے اسے گھیرے میں لیے وہ آدمی بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ وہ لڑکا بغور اسے دیکھتا گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سعاد کی اردو وہ سمجھ تو نہیں سکا تھا البتہ اس کے لیے گئے نام اسے تجسس میں ڈال گئے تھے۔

”سنا تھا تم کسی جاسوس سے کم نہیں ہو۔ لیکن تم تو اس کے یک قلم برعکس نکلیں۔ اور یہ جن کے نام تم لے رہی ہو، ان میں سے ایک تمہارا بھائی ہو گا۔ اور دوسرا کون؟“ اس لڑکے نے سرگوشی کی تھی۔ سعاد نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ آنسو ابل ابل کر آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

”جندل، زیاد آجائیں۔ اللہ میری مدد کریں پلیز انہیں بھیج دیں۔“ اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ فلک کو اپنی لپیٹ میں لیتا اندھیرا اس خالی سڑک کو اپنے تنگ گھیرے میں لے رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں یہ دیکھا جاسکتا تھا کہ، ایک لڑکی سعاد اسلحے سے لیس افراد کے گھیرے میں بے یار و مددگار کسی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

☆☆☆

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے کارخانے کے اس کمرے میں بیٹھا خیام کا انتظار کر رہا تھا جس نے اسے کارخانے میں جانے کا کہا تھا اور خود وہ بس دس منٹوں میں آرہا تھا اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بے زاری سے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ چکر لگاتے ہوئے وہ کبھی رک کر کمرے کے چاروں جانب لگے آئینوں میں ہر زاویے سے اپنا جائزہ لیتا اور پھر ٹہلنے لگتا۔ اسے یہ جاب بہت بورنگ لگ رہی تھی۔ سارا دن ایک انسان کے آگے پیچھے بھاگنا؟! اف!!

وہ کمرے میں کمر پر ہاتھ باندھے چکر کاٹتے ہوئے رکا۔ گردن ترچھی کر کے خیام کی راکنگ چیئر کو دیکھا پھر اس کی

طرف بڑھا۔ دھم سے کرسی پر بیٹھ کر وہ گول گول گھومنے لگا۔ ”خیام، میرے لیے کافی لاؤ۔“ وہ تخیل میں خیام دی باڈی مین کو حکم دے رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ کہنی میز پر رکھ کر آگے ہوا پھر نزاکت سے وہاں رکھی فائل اٹھائی۔ وہ خیام کے انداز میں دائیں ابرو چڑھائے فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

یونہی سرسری نگاہ کاغذات پر ڈالتے ہوئے وہ چونکا۔ یہ کوئی نقشہ تھا، وارلڈ گلاس کمپنی کا نقشہ۔

وہ ذرا سا جھک کر نقشے میں وارلڈ کی آفس تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے خیام کی آفس دیکھی۔ اور اس کے بعد جب وہ کارخانے کے اس کمرے کو نقشے میں ڈھونڈنے لگا تو وہ بری طرح سے ٹھٹکا تھا۔ نقشے میں اس کمرے سے منسلک ایک تہہ خانہ دکھایا جا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر کمرے کو دیکھا پھر نقشے میں نشان دہ جگہ کو۔ نقشے میں اس آتش دان کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا، نقشے کی تصویر لی پھر فائل بند کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ کارخانے سے نکلتے ہوئے اس کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔

خیام کے پاس یہ نقشہ کیا کر رہا تھا؟ اس تہہ خانے سے خیام کا کیا تعلق تھا؟ اور سب سے اہم سوال، خیام کون تھا؟!

وہ راہداری پار کر کے خیام کے آفس میں آیا تو دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ فوراً اندر آیا۔ اس کے اندر آتے ہی میز پر براجمان روفی ایک ہی جست میں اس کے سینے پر پہنچا تھا۔

”روفی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ بدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ روفی اب اس کی گود میں بیٹھا معصومیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تم تو جانور ہو، جواب کہاں سے دو گے؟“ وہ بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔ ریسپشن پر بیٹھی وہ لڑکی اسے آتا دیکھ کر اپنے تمام کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”روفی یہاں کیسے آیا؟“

”یہ تمہارا خرگوش ہے؟“ اس لڑکی کے سوال پر وہ تپ گیا۔

”نہیں پڑوسیوں کا ہے۔“ لڑکی نے ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔

”یہ خرگوش بقول تمہارے تمہارا روفی، کمپنی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کوئی اسے اندر نہیں آنے دے رہا تھا، خیام سر نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اسے اندر لائے، اپنی آفس میں بٹھایا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ عجلت میں باہر نکلے اور کہا میں گھر جا رہا ہوں، بس۔“ بدر نے کم فہمی سے اس لڑکی کو دیکھا پھر روفی کو۔

”خیام سر روفی کو کیسے جانتے ہیں؟ روفی سے ملنے کے بعد وہ عجلت میں چلے کیوں گئے؟ ہے روفی تم نے سر سے کیا کہا ہے؟!“ وہ روفی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ لڑکی ہنس دی۔

”یہ جانور ہے، تمہیں جواب نہیں دے گا۔“ بدر نے سر اٹھا کر اس لڑکی کو گھورا۔

”میں بھی جا رہا ہوں گھر۔“ ناک سکیڑتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ اس کے دماغ میں ابھرتے سوالات میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

خیام سر کو روفی نے کیا کہا؟ وہ عجلت میں چلے کیوں گئے؟ وہ روفی کو کیسے جانتے ہیں؟

☆☆☆

”کہاں جا رہی ہو ازا؟“ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ازابیلا کو تفکر سے دیکھ رہی تھی۔

”مندر۔“ اس نے سرسری سا جواب دیا تھا۔

”تم وہاں نہیں جاوگی ازا!“ اس کے حاکمانہ انداز پر وہ اچھنبے سے اسے دیکھتی پلٹی تھی۔

”کیوں؟“ بھنویں اکھٹی کیے پوچھا گیا تھا۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتی۔“

”وجہ؟“

”ازا، تم وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟ خدا کا واسطہ ہے مت پڑو اس سب میں۔ براہِ مہربانی رک جاؤ۔ میں تمہاری ماں التجا کرتی ہوں تم سے ازا!!“ وہ اس کے آگے گڑگڑائی تھی۔ ازابیلا بنا پلک جھپکے یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

”آپ ہی تو چاہتی تھیں میں سچ کو تلاش کروں۔“ اس کی آواز قدرے ہلکی تھی۔

”سچ وہاں نہیں ہے ازا۔“

”پھر کہاں ہے؟“

”سچ اسلام میں ہے۔ تم اسلام کو اپنی اولین ترجیح کیوں نہیں بناتیں؟“

”کیوں؟“ ایک اور سوال۔

”ازا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟! ہوش میں آؤ۔“ وہ تقریباً چلا اٹھی تھی۔ ازابیلا کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ ”میں ہرگز یہ قبول نہیں کروں گی کہ تم میری بیٹی ہو کر بدھ مت کی حامی بنو یا یہودیت کی۔ تم ہمیشہ اسلام کو پیچھے دھکیلتی آئی ہو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ مقام اور مرتبہ جو تمہارے دل میں یہودیت اور بدھ مت کے لیے ہے، وہ اسلام کے لیے نہیں؟ کیوں تم اسلام سے بھاگتی ہو ازا؟“ اس کی تیز آواز، اس کا چلانا، اس کے الفاظ، سب اس کا صبر آزمارہے تھے۔ وہ صبر جو بس اب ختم ہونے کو تھا۔ وہ زور سے مٹھیاں بھینچے ہوئے تھی۔ لب پوری قوت سے دانتوں میں دبائے ہوئے تھے۔ دماغ کی شریانوں میں خون کھولنے لگا تھا۔

”خاموش کیوں ہو اب؟ جواب دو مجھے۔ کون تمہیں اسلام سے دور رہنے پر مجبور کرتا ہے؟ تمہارا باپ؟“ اور یہاں اس کی صبر کی تمام حدیں ختم شد۔ دانتوں میں دبے نچلے ہونٹ سے خون کی ایک بوند گری تھی۔

”آپ ماں آپ! آپ ہیں جو مجھے اسلام سے دور رکھتی ہیں۔ آپ ہیں جن کی وجہ سے میں اسلام سے بھاگتی ہوں۔ آپ ہی وہ شخصیت ہیں جس کی وجہ سے اسلام میری اولین ترجیحات میں شامل نہیں ہے!“ اس کی بلند آواز پورے

لاونج میں گونجی تھی۔ قانتہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کبھی سوچا ہے آپ نے میں آپ سے کیوں دور ہوں؟ کیوں میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی؟ ماں وجہ صرف اور صرف آپ ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں تلاش کے سفر پر نکلے بنا آپ کی تقلید میں اندھوں کی طرح اسلام پر ایمان لے آؤں۔ میں ساری زندگی آپ کی طرح گزار دوں۔ دن میں پانچ نمازیں پڑھ لوں، صبح میں قرآن کی تلاوت کرلوں اور پھر آگے جو چاہے کروں۔ آپ چاہتی ہیں میں اس مذہب کو قبول کروں جسے آپ نے بھی قبول نہیں کیا۔ بتائیں کیا اسلام صرف نماز اور قرآن تک محدود ہے؟ کیا آپ کا مذہب اتنا مختصر ہے؟! میں بہت حیران ہوتی ہوں جب میں باہر کسی مسلمان کو دیکھتی ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کہ وہ مسلمان کہلانے کا حق نہیں رکھتے یا آپ؟ وہ غدار ہیں یا یہ دھوکے بازی آپ کر رہی ہیں؟ میں ایسا مذہب کیوں کر قبول کروں کہ جس کے پیروکار ہی تفرقے کی بنا پر بٹے ہوئے ہیں۔

ماں، آپ نے ہمیشہ اسلام مجھ پر مسلط کرنا چاہا ہے۔ آپ نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ آپ کا خدا کیا کہتا ہے؟ آپ نے کہا نماز پڑھنی ہے، قرآن پڑھنا ہے اور مذہب ختم! میں نے سنا ہے اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔ تو آپ کا یہ کونسا اسلام ہے جو صرف نماز قرآن تک محدود ہے؟!" وہ رکی۔ آنکھوں میں آنسو امڈنے لگے تھے۔ ناک لال ہو رہی تھی۔ اب مزید بولنے میں اسے دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے ذرا توقف کے بعد گہری سانس لی تھی۔

"اور جہاں تک بات ہے بابا کی تو وہ آپ سے لاکھ گنا اچھے ہیں۔ وہ آپ کی طرح اپنے مذہب کو مجھ پر مسلط نہیں کرنا چاہتے۔ وہ میرے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ مجھے سچ دکھانا چاہتے ہیں، آپ کی طرح اندھیر کنویں میں نہیں دھکیلنا چاہتے۔ آپ کبھی ان جیسی نہیں ہو سکتیں۔ کبھی نہیں ماں!" اس کی آنکھ سے آئینے جیسا چمکتا شفاف آنسو گال پر گرا تھا پھر گال سے لڑھکتا ٹھوڑی سے پھسل گیا۔ قانتہ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے

یہ ماننے میں، اقرار کرنے میں دقت ہو رہی تھی کہ سامنے کھڑی لڑکی اس کی ازا تھی، اس کی اپنی بیٹی۔

"تم۔۔۔ تم میری ازا نہیں ہو۔ تم میری بیٹی نہیں ہو۔" ا کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔ ازابیلا نے صدمے سے انہیں دیکھا تھا۔

"ماں پلیز۔" کئی آنسو اس کے گال پر لڑھکتے چلے گئے۔

"مت کہو مجھے ماں، تم میری ازا نہیں ہو!" وہ اونچی آواز میں بڑبڑائی تھی۔ ازابیلا نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکی دبانے کی کوشش کی تھی۔ وہ آنسو بہاتی تیزی سے پلٹی تھی۔ اور تب اس نے اپنے سامنے وارلڈ کو کھڑا پایا تھا۔ وہ حیرت وصدمے کی ملی جلی کیفیات سے قانتہ کو دیکھ رہا تھا۔ ازابیلا تیزی سے آگے بڑھتی اس کے سینے سے لگی تھی۔

"بابا۔۔۔ میں نے ان سے۔۔۔ بدتمیزی کی۔۔۔ بابا آئی ایم سوری۔" وہ رو رہی تھی، ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ قانتہ کسی پتھر کے مجسمے کی مانند اپنی جگہ جم کر کھڑی وارلڈ کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، گویا چوری پکڑی گئی ہو۔ وارلڈ کی آنکھوں میں کچھ منفرد سا تھا۔ بہت سی کرچیاں، کانچ جیسے مان کی کرچیاں اور دکھ۔ درد، درد کی انتہا۔ اس کے سینے پر گرتا ازابیلا کا ہر آنسو اس درد کو بڑھا رہا تھا۔ بنا پلک جھپکے قانتہ کو دیکھتے ہوئے اس نے ازابیلا کے گرد حصار باندھا تھا۔ گویا اسے اپنی حفاظت میں لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں چبھتیں وہ کانچ کی کرچیاں آج اسے باور کرا گئی تھیں کہ اس کی بیٹی اپنے ہی گھر میں محفوظ نہیں تھی۔

She was mentally tortured by her mother..!

☆☆☆

لائبریری میں کانچ سی مقدس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے ہر سو پھیل رہے تھے۔ یہ اندھیرے لائبریری کی ان کھڑکیوں کے پاس آکر اپنا زور لگانے کے باوجود ان برقی قمقموں کے آگے ہار گئے تھے۔ روشنی میں

تنہائی لائبریری کے ایک ریک کے سامنے کھڑا وہ ہاتھ میں کوئی کتاب لیے اس کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ سفید پینٹ پر سبز شرٹ پہنے، بھورے رنگ کی لیدر کی جیکٹ پہنے جس کی زپ کھول رکھی تھی، وہ بظاہر بے فکری سے کھڑا تھا۔ مگر اب پچھلے دو گھنٹے سے انتظار کرتے کرتے اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ گہرے کتھئی رنگ کے بال پیشانی پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں اب الجھن کے عنصر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے کچھ سوچ کر گہری سانس لی پھر کتاب بند کر کے ریک پر رکھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا لائبریری کے بالکل آخر والے صوفوں پر آیا اور ایک صوفے پر دھم سے دراز ہو گیا۔

اس کے برابر میں ایک صوفہ چھوڑ کر دوسرے صوفے پر ایک بندہ، مغربی اور عربی حسن کا زندہ و جاوید مجسمہ، ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والا لڑکا کتاب اپنے چہرے کے آگے پھیلائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ جندل کے صوفے پر گرنے پر اس نے کتاب کا صفحہ پلٹا۔

"میں اب بے زار ہونے لگا ہوں۔" وہ جھک کر اپنے جوتوں کے ڈھیلے ہو چکے تسمے کھول رہا تھا۔

"تمہیں کس نے بلایا؟" کتاب ہنوز چہرے کے آگے تھی۔

"زئی آیا تھا۔ تمہیں؟"

"روفی آیا تھا، تمہارے ساتھ جو لڑکا اپارٹمنٹ شیئر کرتا ہے اس کا خرگوش۔" جوتوں کے تسمے کھولنے کے بعد انہیں واپس باندھتے جندل کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔

"بدر تمہارے پاس نوکری کر رہا ہے ناں؟"

"ہاں۔" کتاب پڑھتے ہوئے پیشانی کو انگشت شہادت اور انگوٹھے سے رگڑا گیا۔

"مجھے لگتا ہے یہ تیسرا آدمی کسی چڑیا گھر میں کام کرتا ہے۔" وہ جوتوں کے تسمے باندھ کر اب صوفے سے ٹیک لگا کر

بیٹھ رہا تھا۔

"ایک بار ہاتھ لگے جتنا ذلیل کروا رہا ہے، اسی چڑیا گھر میں قیمہ نہ بنایا تو خیام نام نہیں۔" پہلو بدلا گیا تھا۔

"تھائی الفاظ دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں ابلنے لگی ہیں۔ ایک جیسے تو ہیں سارے۔" بات بدلی گئی تھی۔

"سعاد کیسی ہے؟" موضوع بدلا گیا تھا۔

"ٹھیک ہیں۔ شادی ہونے لگی ہے ان کی۔ جواب دیا نہیں ہے انہوں نے مگر ہاں میں ہی ہو گا۔" اس نے اپنی داڑھی کھجائی تھی۔ کوئی قریب سے بھی انہیں دیکھتا تو اسے بالکل شک نہ ہوتا کہ وہ دونوں گفت وشنید میں مصروف ہیں۔

"کون سولی پر چڑھنے لگا ہے؟" کتاب میں یقیناً کوئی ایسی بات لکھی تھی کہ خیام کھل کر مسکرایا تھا۔

"ضرار ولید۔"

"بے چارے کے دن گنے جا چکے ہیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔

"تمہارے بھی گنواتا ہوں۔"

"میں شادی شدہ ہوں، ایک بچے کا باپ ہوں، گستاخ!" جندل نے گردن ترچھی کر کے اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"تمہاری اس خیالی بیوی اور بچے کو تمہارے دن گنوائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا، میرا یقین کرو۔"

"اپنی فکر کرو۔ تم تو خیالی بیوی سے بھی محروم ہو۔"

"بہن ویسے ہی جان لینے پر تلی ہے۔ بیوی آ گئی تو زندہ دفنا دے گی۔" اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ اسی وقت کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ تین لڑکے ان کی طرف آئے۔ ایک جندل اور خیام کے درمیان والے صوفے پر بیٹھا۔ ایک جندل کے بائیں طرف اور ایک خیام کے دائیں طرف۔

خیام کتاب پڑھ رہا تھا، جندل صوفے کے ساتھ کھیل رہا تھا اور وہ لڑکے۔۔۔

ان دونوں کو بیک وقت اپنی پسلیوں پر پستول کی نال محسوس ہوئی تھی۔

”آواز نہیں! تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔“ درمیان میں بیٹھے لڑکے نے سرگوشی کی تھی۔ جندل اور خیام ہنوز اپنے کاموں میں مگن رہے۔ اس لڑکے نے غصے سے دانت پیسے۔ پھر اس کے اشارے پر باقی دو لڑکوں نے انہیں زبردستی صوفوں سے اٹھایا۔ پستول کی نالیں اب ان کی گردن کی پچھلی طرف رکھی جا چکی تھیں۔ وہ دونوں خاموشی سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

”چلو۔“ وہ رکے رہے۔ کھڑے رہے۔ ان لڑکوں نے انہیں دھکا دیا۔ ان دونوں نے پلٹ کر وار کرنا چاہا مگر تبھی کسی کی آواز سنائی دی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ ان دونوں نے چونک کر سامنے دیکھا تھا۔ وہاں کھڑا لڑکا یہاں کا ایک لائبریرین تھا۔ دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں یقیناً یہاں آرام سے اپنا بچاؤ کر لیتے مگر اب ”ع-وام“ کے سامنے وہ اپنا آپ ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔

زیاد، وہ کسی لڑکے کی کتاب لینے لائبریری کے اس حصے میں آیا تھا۔ اور یہاں اس نے دو ”معصوم“ لڑکوں کو تین اسلحہ سے لیس لڑکوں کے زیرِ حراست پایا تھا۔ وہ سانس روکے ان سب کو دیکھ رہا تھا، گویا حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور پھر لمحوں میں فیصلہ ہوا تھا، لمحوں میں سب بدلا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی پریشانی جاتی رہی۔ وہ پرسکون ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر نگاہوں کا رخ جندل اور خیام کی طرف کیا جو اپنا اگلا لائحہ عمل سوچ رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا۔ پھر گردن کو ذرا سا خم دیا تھا۔

یہ اشارہ تھا۔ زیاد کی طرف سے اشارہ۔ اشارہ کہ حزبُ اللّٰہ کا حرکت میں آنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

حزب اللّٰہ۔۔۔!

☆☆☆

یہ ایک تہہ خانہ ہے۔ اندھیر کوٹھڑی ہے جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔ خاموشی اتنی ہے کہ چند لمحوں بعد انسان کو اپنے زندہ ہونے پر بھی شک گزرے۔ کانچ سی اس خاموشی پر کچھ سلاسل کی آواز نے چابک رسید کیا تھا۔ اوپر سے سیڑھیاں گری تھیں۔ روشنی چھنا کے سے اندر آئی تھی۔ اندھیرا منہ لپیٹ کر بھاگا تھا۔ خاموشی کی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ کچھ قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ پھر وہ رک گیا۔ سیڑھیاں واپس کھینچ لی گئیں۔ اس نے بایاں ہاتھ بلند کیا۔ دو انگلیاں برابر کھڑی کیں، اشارہ دیا گیا۔ اور پورا تہہ خانہ روشنی میں نہا گیا۔

قدیم پلستر ہوئی دیواریں جو سالوں سے اونچے ستونوں کا سہارا لیے کھڑی تھیں۔ انسانی خون کی خوشبو اور زخموں کی کھرچ اس تہہ خانے میں رچی ہوئی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ انسانی خون لگا تھا۔ خون جو کچھ تازہ تھا اور کچھ کالا ہو چکا تھا۔ ایک کونے میں مختلف اوزار بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پٹہ جس پر کیلیں لگی ہوئی تھیں، وہ ڈرل مشین جیسا اوزار جس نے حال ہی میں کسی کے سینے میں چھید کیا تھا۔ وہ کرنٹ کی مشینیں جس کے جھٹکوں کی زد میں آ کر کئی انسانوں نے اس تہہ خانے میں تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ ان کی چیخیں اس تہہ خانے کی قدیم دیواروں میں

دراڑیں ڈال گئی تھیں۔ ان کا خون ان دیواروں پر رنگا گیا تھا۔ وحشت، درندگی، بربریت کی داستان سناتا یہ تہہ خانہ لاکھوں لوگوں کی ہڈیوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ کسی اونچے مینار کی مانند!

مکمل سیاہ لباس میں ملبوس، ہڈ سے سر، پیشانی اور آنکھیں ڈھکے، ماسک سے بقیہ چہرہ ڈھکے، ہاتھوں پر دستانے چڑھائے وہ شخص، جس کے ایک حکم پر یہاں زندہ وجاوید انسانوں کو چیر پھاڑ کر کتوں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ وہ اب کوئی نیا حکم سنانے آیا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ دائیں طرف بنے ایک کمرے میں آیا۔ دروازہ دھیرے سے کھسکایا۔ کسی کے کراہنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اندر ایک شخص زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو کٹا ہوا تھا اور ٹانگیں ناکارہ تھیں۔ چہرہ جھلسا ہوا اور خون آلود۔ سلامت رہ جانے والے بازو کو اوپر کر کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال کر لوہے کی سلاخ سے باندھا ہوا تھا۔ وہ بری طرح درد سے کراہ رہا تھا۔ ہر پندرہ منٹ بعد اس پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ پھر اس پر یخ بستہ پانی پھینکا جاتا تھا، زخموں کو کھرچا جاتا تھا۔ جلن سے اس کی چیخیں تہہ خانے کے در و دیوار کو ہلا دیتی تھیں۔ مگر حیوانیت کی ہر حد عبور کرتے درندوں کے قہقہوں کے آگے اس کی چیخیں ہمیشہ ماند پڑ جاتی تھیں۔

"کیسے ہو مائیکل؟" آواز کمپیوٹر سے بدلی جا رہی تھی۔ کوئی جواب نہیں تھا۔ "افسوس ہے تم پر، بے کار میں مجھ سے دشمنی مول لی۔ زندگی گنوا بیٹھے ہو اپنی۔ بازو کٹ گیا، ٹانگیں ناکارہ ہو گئیں۔ چہرہ دیکھنے کے قابل نہیں۔ کیا ملا تمہیں میرے خلاف جا کر؟" وہ جھک کر مائیکل کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سکون۔" مائیکل زخمی سا مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ، وہ ہر ظلم پر بھاری ہو گئی تھی۔ ہر رنج کا اختتام بن گئی تھی۔

"کام کی بات کرتے ہیں۔ حزب اللہ تم سے کیا چاہتی ہے؟"

"تمہاری موت۔" بولتے ہوئے مائیکل کے منہ سے خون ابل ابل کر نکل رہا تھا۔ خون کے چند چھینٹے اس شخص کے چہرے پر بھی پڑے۔ وہ مسکرایا۔

"تمہیں اپنی حالت پر رحم نہیں آتا؟"

"مجھے تم پر رحم آتا ہے درندے! جس دن حزبُ اللہ کے ہاتھ تمہاری شاہ رگ پر ہونگے اس دن ہر مظلوم تمہارے چہرے پر تھوکے گا۔ تم اپنے ہی خون میں ڈوبو گے۔ تم حزبُ اللہ سے بھاگ نہیں سکو گے۔ وہ تمہارے کیے ہر ظلم کا حساب لیں گے۔ تم اپنے کیے ہر عمل پر پچھتاؤ گے۔ عنقریب خدا ان مجاہدوں کو بھیجے گا جو ہر مظلوم کے سائبان ثابت ہونگے۔" وہ تھک گیا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ سامنے کھڑا وہ شخص اس کی حالت دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"لگتا ہے تم جندل اللہ کا خوبصورت اختتام بھول گئے ہو۔ ان کی چیخیں آج بھی میرے کانوں میں میٹھا رس گھولتی ہیں۔ ان کے خون سے آج بھی میری زندگی رنگین ہے!" اس نے گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔

"تم ظالم جانور!" مائیکل اس کبوتر کی مانند پھڑپھڑایا تھا جسے بلی نے اپنے شکنجے میں لے لیا ہو۔

"خدا تم سے حساب لے گا او درندے! وہ تمہیں جندل اللہ کی تاریخ دہرانے نہیں دے گا۔ وہ حزبُ اللہ کو بھیجے گا جس کے سامنے تم خود کو بے بس پاو گے۔ اس دن جندل اللہ کی چیخیں تمہاری روح کو چھلنی کریں گی اور حزبُ اللہ کے ہاتھ تمہاری شاہ رگ کو کاٹیں گے۔ تم تڑپ تڑپ کر مرو گے بالکل ویسے جیسے تم نے جندل اللہ کو مارا تھا۔۔" مائیکل زور زور سے چلا رہا تھا۔ وہ آدمی ہنستا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوا۔ مائیکل دم سادھے بند دروازے کو دیکھے گیا۔ اس کی آنکھوں سے بہتا نمکین پانی رخساروں

کو بھگونے لگا۔ زخم جلنے لگے۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ سر لوہے کی سلاخ پر گر گیا۔

"خدا۔۔۔ حزبُ اللہ کو بھیج۔۔۔ جندل اللہ۔۔۔ کا انتقام۔۔۔" وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

کمرے کے باہر وہ شخص اب سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ زنجیروں کے کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ سیڑھیاں اوپر کھینچ لی گئیں۔ دروازہ بند ہوا۔ اور پھر پورا تہہ خانہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

درندوں کا اپنی درندگی کو مخفی رکھ کر شرافت کا لبادہ اوڑھنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

☆☆☆

•باب: دوم

(حصہ اول)

•فردوس المفقود*

میلوں پر پھیلے بحرِ ذخار میں آج منفرد سا تموّج تھا، تلاطم ہی تلاطم۔ لہریں جوش سے اٹھتیں، گرتی پڑتیں ہوا کے ساتھ چلتیں ساحل پر سر پٹخ رہی تھیں۔ کسی کی آمد آمد تھی۔ فلک پر چھائے بادل اپنا سائبان پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔ معلوم ہوتا تھا یہ بادل بھی صحرا نشینوں کی ہمسفری میں صحرا سے ہی چل پڑے ہوں۔ لہریں اٹھتیں، سمندر ٹھاٹھیں مارتا۔ جھاگ سا پانی پھیلتا، ساحل کی مٹی نم ہوتی اور پھر ایک لمحے کے لیے یہ عمل رکتا۔ ایک نئی لہر تیار ہوتی، ایک بار پھر سمندر میں تموج پیدا ہوتا۔

سمندر بے چین تھا، آفتاب پہلو بدل رہا تھا۔ بادل پیاسے تھے، ہوا میں نمی گھل رہی تھی۔ انتظار انتظار اور بس انتظار۔ انتظار طویل تھا، انتظار صدیوں کا، انتظار سالوں کا۔ سمندر کے آگے وہ جنت تھی جس کے لیے صحرا سے

نکلے صحرا نشین سمندر کو روندتے ہوئے اس جانب آ نکلے تھے۔ سمندر کے پیچھے بہت دور وہ صحرا تھا جو ان صحرا نشینوں کی جدائی پر تڑپ اٹھا تھا۔ صحرا سے فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بلد الاندلس کی طرف فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا۔ اور پھر وقت آن پہنچا۔ دور سے فلک کے سائبان میں بحری جہاز نمودار ہوئے۔ قطار میں چلتے سمندر کو روندتے بحری جہاز۔ ہوا میں تیزی آئی، سمندر مچل اٹھا۔ لہروں سے بنتی جھاگ سانس روکے ان جہازوں پر نظریں ٹکائے انہیں دیکھنے لگی۔

"لنگر ڈال دو۔ امیر کا حکم ہے لنگر ڈال دو۔" شور بلند ہوا۔ ایک امیر کا حکم اور کئی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ ہی دیر میں لنگر گرا دیے گئے تھے۔ ذرا سا وقفہ، پیاسے بادلوں کی تڑپ، سمندر کا تموج، لہروں میں تلاطم اور پھر بھاری قدموں کی آواز۔ آہ جبل الطارق! اسے اس عرب و بربر فوج کے امیر کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا تھا، جس کا منور چہرہ دیکھ کر سمندر کا جوش ٹھنڈا پڑا تھا۔ وہ شجاعت اور بہادری کی آئینہ دار آنکھیں، وہ اس فوج کا امیر تھا۔ بے خوف اور نڈر، ضبط کی انتہا اور جرات میں بے مثال۔

اندلس کا نجاتِ دہندہ طارق بن زیاد!

اس نے صرف ایک حکم دیا تھا۔ چند الفاظ تھے محض چند الفاظ۔ حکم بجا لایا گیا اور پھر جبل الطارق نے سانس روکے وہ منظر دیکھا تھا جب ان تمام کے تمام بحری جہازوں کو آگ لگا دی گئی۔ فلک ششدر رہ گیا۔ سمندر اس شجاعت پر تھم گیا۔ فلک کو چھوتی آگ اور فرزندانِ اسلام سے مخاطب مجاہدِ دین کے وہ روح پرور الفاظ، بے داغ آسمان گواہ تھا کہ اس نے شجاعت و جرات کا ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ تھم چکا سمندر ششدر تھا کہ یہ بہادری بے مثال تھی۔ جہازوں کو پکڑتی آگ گواہ تھی کہ فیصلہ کر لیا گیا تھا، یا فتح یا شہادت۔

یہ غازی، یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عَالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی تھی صدیوں سے زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے

وہ بجلی کہ تھی نعرہ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کردے

نگاہ مسلماں کو تلوار کردے۔

(طارق کی دعا میدانِ اندلس میں۔

• علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ)

☆☆☆

• دوبرس قبل

”حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں دفاعی جہاد کا حکم ہے۔ ہتھیار لے کر غیر مسلم ممالک پر دھاوا بول دینا مطلقاً ایسے ہے جیسے لوٹ مار کرنا۔“ پروفیسر کی بات پر جماعت میں بیٹھے کئی طلباء کے سر تائید میں ہلے تھے۔ مکمل ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے طلباء نے پروفیسر کی بات پر اپنی سوچ کا اظہار تین گروہوں میں بٹ کر کیا۔ کچھ طلباء کے سر تائید میں ہلے، کچھ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور کچھ نے لاپرواہی و لاتعلقی کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔ یہ منظر ہے کراچی آئی بی اے یونیورسٹی کے بی اے کے ڈپارٹمنٹ کا۔ تھائیلینڈ کی سرزمین کو وہیں چھوڑ کر آپ وقت میں پیچھے آئے ہیں، دو سال پہلے۔

”جہاد کی الگ تشریح ہوتی ہے اور دنیا فتح کرنے کی لالچ ایک الگ چیز ہے۔ اس لالچ کو جہاد کا نام دے دینا یقیناً ناقابلِ معافی اَمر ہے۔“ پروفیسر کی بات پر ایک بار پھر طلباء نے پچھلا ردعمل ہی دہرایا۔ البتہ پچھلی قطار میں کونے میں بیٹھا ایک لڑکا ضبط سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”میں کچھ کہنا چاہتا ہوں سر! آزادی رائے کے حق کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔“ کئی گردنیں گھومی تھیں۔ ان میں

ایک وہ بھی تھی۔ وہ، سعادیوسف زئی۔

"شیور مین۔" پروفیسر دونوں ہاتھ کمر پر باندھے آگے آئے۔ وہ لڑکا سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھتا گویا ہوا۔

"فرض کریں آپ اور میں اسی پر سکون ماحول میں کسی عام سے مسئلے پر گفت وشنید میں مصروف ہیں۔ ماحول از حد پر سکون ہے، آپ بالکل بھی جھنجھلاہٹ یا بے سکونی کا شکار نہیں ہو رہے۔ اسی اثناء میں ایک شخص بدحواسی میں ہمارے پاس آتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ "ہمارے ملک پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے۔ دشمن کی فوج ہر جگہ تعینات ہو چکی ہے۔ غداروں نے ہمارا وطن بیچ دیا ہے۔" یہ خبر پتھر بھی سنیں تو ریزہ ریزہ ہو جائیں مگر یہ خبر سننے والے آپ اور میں ہیں پروفیسر! یہ ہم ہیں جن کا یہ نظریہ ہے کہ جب تک دشمن پہل نہ کرے تب تک جنگ کرنا انسانیت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ہتھیار لے کر دشمن کے خلاف میدانِ کارزار میں نکلنا لوٹ مار کے مترداف ہے۔ یہ خبر سن کر آپ کیا کریں گے پروفیسر؟ آپ کے ملک پر دشمن قبضہ کر چکا ہے۔ اس کی فوج ہر جگہ تعینات ہے، آپ کیا کر سکتے ہیں؟" وہ رکا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکا۔ پروفیسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ سب دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ "آپ کچھ نہیں کر سکتے پروفیسر! کیونکہ دشمن آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ چکا۔ آپ انتظار میں تھے کہ دشمن پہل کرے تاکہ آپ دفاعی جہاد لڑ سکیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دشمن نے انتظار نہیں کیا کہ آپ تیار ہوں تو وہ لڑائی شروع کرے۔ اس نے چند ضمیر فروش انسانوں کو خریدا اور آپ کے ملک پر فوج کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی اور آپ نے، میں نے، ہم نے اپنا ملک تھال میں رکھ کر دشمن کو بیچ دیا۔ ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے رہے کیونکہ اقدامی جہاد لوٹ مار کے مترادف ہے۔

میں حیران ہوں ازحد حیران ہوں پروفیسر کہ آج فتنے اور فساد اس قدر بڑھ گئے ہیں، یہود کی بیماریاں کسی طاعون کی طرح مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں کہ ایک پروفیسر اپنے طلباء کو یہ تو بتا رہے ہیں کہ اسلام میں دفاعی جہاد کا حکم ہے

کہ جب دشمن آپ کے ملک پر چڑھائی کرتا ہے تو آپ پر فرض ہے کہ اپنے ہتھیار اٹھا کر مقابلے کے لیے میدان میں نکل آئیں۔ لیکن وہ یہ کیوں چھپا رہے ہیں کہ ہر وہ شخص جو اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے اس پر فرض ہے کہ وہ خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچائے۔ یہاں اقدامی جہاد ضروری ہو جاتا ہے۔ روم، ایران انہوں نے مدینہ پر چڑھائی نہیں کی تھی پر مجاہدینِ اسلام، اسلام کا پرچم اٹھا کر خدا کی راہ میں خود سے کئی گناہ بڑی فوجوں کے مقابلے کے لیے میدان میں آ نکلے تھے۔ انہوں نے انتظار نہیں کیا تھا کہ کب ان کے دشمن ان پر چڑھائی کریں گے؟ سوری ٹو سے پروفیسر لیکن یہ بیماری یہود میں تھی کہ وہ لا الہٰ الا اللہ کو دیکھ کر الا اللہ پر ہاتھ رکھ دیتے اور لا الہٰ کو زبان پر لاتے۔ سچ کو چھپانے کی بیماری یہود میں ہے پروفیسر! افسوس ہے کہ یہ بیماری مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکی ہے۔۔!" وہ خاموش ہوا تو کئی پل اس کی آواز سب کے کانوں میں گونجتی رہی۔ اس کے دماغ کی شریانیں غصے و ضبط کی وجہ سے ابھری ہوئی تھیں۔ چہرے کی رنگت لال پڑ رہی تھی اور لہجہ بھاری تھا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر ساکت نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ طلباء پہلو بدل رہے تھے۔ اور اس سب میں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی سعاد واحد تھی جس نے مسکراتے ہوئے اس کی جرات اور بہادری کو سراہا تھا۔

☆☆☆

"وہ لڑکا، لکھ کر رکھ لو سعاد وہ کل یونیورسٹی سے باہر ہو گا۔ نجانے کون ہے اور آخری سال کے آخری مہینے میں کہاں سے ٹپک پڑا ہے۔ مگر جو بھی ہے بہت بہادر اور نڈر ہے۔" وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ چلتی لڑکی کے تبصرے سن رہی تھی۔

"پروفیسر کو ایسے کرارے جواب ہی ملنے چاہئیں۔ پچھلی بار جب انہوں نے محمد بن قاسم کے خلاف بات کی تھی تو کاش یہ لڑکا ہوتا۔ واللہ! وہ بہت جرات مند ہے۔" اس لڑکی نے منہ بسور کر اسے دیکھا پھر اپنی راہ الگ کر لی۔ سعاد

مسکراتے ہوئے کیفے ٹیریا کی طرف بڑھی۔ سوچوں میں گم قدم اٹھاتے ہوئے اچانک وہ پوری قوت سے کسی کے کندھے سے ٹکرائی تھی۔

"آئی ایم سو سوری۔" وہ فوراً سنبھلتے ہوئے معذرت کر رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ لڑکا سنجیدگی سے کہتا مڑنے لگا جب سعاد کی نظر اس کے چہرے پر پڑی۔

"آپ؟"

"میں؟" اس لڑکے نے کم فہمی سے پوچھا۔

"آج آپ نے جس صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ ٹوبی آنیسٹ ہم میں سے کوئی بھی آج تک اتنی بہادری کا مظاہرہ نہیں کر پایا کہ یونیورسٹی سے نکالے جانے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔" وہ لڑکا آنکھیں چھوٹی کیے اس لڑکی پر نگاہیں ٹکائے مسکرایا تھا، ذرا سا ہلکا سا۔

"میرا نام زیاد تاشفین ہے۔"

"میں سعاد، سعاد یوسف زئی"!

یہ ان دونوں کا پہلا تعارف اور پہلی ملاقات تھی۔

☆☆☆

•ایک ماہ بعد

•اندلس

دور دور تک پھیلی سیاہ ہموار سڑک پر دھیرے دھیرے اندھیرے کی لپیٹ میں آتا آسمان اپنا سایہ کیے کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا اس سرد موسم میں شام کے آخری پہر ٹھٹھرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مالاگا کے اس ایئرپورٹ پر حسب

معمول لوگوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ سیاحوں اور مقامی لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور اس ہجوم سے بالکل الگ ایک لڑکی، فٹ پاتھ پر اپنا ٹیچی رکھے اس پر چڑھ کر بیٹھی تھی۔ ہلکے بنفشی رنگ کے عبائے میں ملبوس سفید اور گلابی رنگ کا حجاب اوڑھے وہ خفا خفا سی نظروں سے سڑک پر گزرتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بھوری رنگت اور سردی سے لال ہوتے گال اس کی خفگی کو الگ سا تاثر دے رہے تھے۔ گال پھولے ہوئے تھے، دونوں کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹکا کر چہرے کو بند مٹھیوں کا سہارا دیا ہوا تھا۔ اس کے مطلق پیچھے روشنیوں میں جکڑا " Aeropureto De Malaga" لکھا جگمگا رہا تھا۔ وہ اندلس میں تھی، ہسپانیہ کے اندلس میں۔

"آپ کو کسی گائیڈ کی ضرورت ہے سینیوریتا؟" اسے اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کا ہاتھ سیدھا اس کے قدموں میں رکھے ہینڈ بیگ کی طرف گیا تھا۔ اس کا پورا ارادہ تھا کہ وہ تیزی سے اٹھے گی اور پیچھے کھڑے لڑکے کو فوراً سے پیشتر ہینڈ بیگ مارے گی۔ پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے دوسرا وار اس کے پیٹ پر کرے گی اور پھر سر پر۔ ختم شد، تمام شد!

وہ تیزی سے اٹھی اور پلٹتے ہوئے پوری قوت سے ہینڈ بیگ سامنے کھڑے لڑکے کو دے مارا۔ لڑکا فوراً جھکا اور اس کا وار خالی گیا۔ اس نے پلک جھپک کر اس لڑکے کو دیکھا۔ پھر صدمے سے منہ کھولا۔

"تم؟!" وہ خوش تھی، حیران تھی یا خفا تھی۔ اس کے روبرو کھڑا وہ لڑکا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

"جی میں۔ تم پر ہسپانیہ کی آب و ہوا نے کچھ زیادہ جلدی اثر نہیں کر دیا؟" وہ منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"کیسے؟" اس نے بھی آنکھیں گھمائی تھیں۔

"کسی راہ چلتی لڑکی کو روکنا، کوئی بات کرنا یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے صرف تمہیں بلایا تھا، تم نے تو

مارنے تک کا پلان بنالیا۔" اس نے کندھے ڈھیلے چھوڑے۔ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا پھر پیر پٹختی رخ موڑ کر واپس اپنے ٹیچی پر بیٹھ گئی۔ بالکل اسی انداز میں، کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر معصومیت سے دونوں بند مٹھیاں گالوں پر ٹکادیں۔

اس کے پیچھے کھڑا وہ لڑکا مسکرایا تھا، دھیرے سے ہلکا سا۔ بھورے رنگ کی پینٹ پر کتھئی رنگ کی جیکٹ پہنے، بغل میں تکیہ دبائے، ناک پر چشمہ ٹکائے، سر پر سیاہ پی کیپ جمائے آنکھیں چھوٹی کر کے مسکراتا وہ لڑکا زیاد تھا۔ زیاد تاشفین!

پچھلے ہفتے ان کے آخری امتحان ہوئے تھے اور پھر سب یونیورسٹی کو الوداع کہہ کر اپنی اپنی راہ ہولیے تھے۔ سعاد، جسے وہ اس ایک ماہ میں تھوڑا بہت جان چکا تھا، کو الوداع کہتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سینیوریتا کبھی اسے اندلس میں فٹ پاتھ پر بیٹھی ملیں گی۔ اب وہ خوش تھا، اندلس میں اسے اپنا آپ اب اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے برابر میں فٹ پاتھ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"کیسی ہیں سینیوریتا سعاد؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔ وہ خفا تھی، ہسپانیہ کے اندلس سے۔ "سینیوریتا؟" اسے ہنوز خاموش دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ اس نے ذرا سا آگے ہو کر اس کے سامنے چٹکی بجائی تھی۔ سعاد نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"بھوک لگی ہے مجھے۔" وہ جھنجلائی تھی۔ وہ چند پل حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔

"تو اٹھو، قریبی ریستوران سے کھانا کھالو۔" اس نے آسان حل پیش کیا۔

"ایک پھوٹا یورو نہیں ہے میرے پاس۔" وہ روہانسی ہوئی۔

”تو سفری چیک یوروز میں بدلوا لو، کیا مسئلہ ہے؟“ ایک اور حل پیش پیش تھا۔

”آج سنڈے ہے۔“ وہ اب تقریباً رو دینے کو تھی۔ زیاد اب ساری کہانی سمجھ گیا تھا۔ آج اتوار تھا اور بینک بند تھے۔ لمبی سی ہاا کرتے ہوئے اس نے اس کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا تھا۔ سعاد نے کسی پتھر کی تلاش میں سڑک پر نگاہیں دوڑائی تھیں۔ وہ احتیاطی تدابیر اپناتا فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”آجاو۔ آج کا کھانا میری طرف سے۔ اور تمہیں ایک گائیڈ کی بھی۔۔۔۔“

”ریستوران اس طرف ہے۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ سعاد فوراً سے پیشتر اٹھ کھڑی ہوئی اور دائیں طرف اشارہ کر کے ٹیچی گھسیٹنے لگی۔ زیاد نے گہری سانس لی پھر اس کے ہاتھ سے ٹیچی لیا۔

”ریستوران تک قلی کا ایک یورو لوں گا۔“ اطلاع دی گئی۔

”لے لینا۔ مجھے ابھی بس کھانا کھانا ہے۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی تقریباً بھاگ رہی تھی۔ اور زیاد، وہ اس کی عجلت پر مسکرایا تھا۔ ایک بات تو طے شدہ تھی، سعاد یوسف زئی کے لیے بھوک ناقابلِ برداشت تھی۔

سڑک پر چلتے ہوئے ہوا کے ہلکے سے جھونکے نے دونوں کو سرشار کیا تھا۔

☆☆☆

ریستوران کے بھاری دروازوں نے باہر کی ہنگامی زندگی اور اندر کی پرسکون اور خاموش زندگی کے درمیان دیوار قائم کر دی تھی۔ مختلف میزوں پر مختلف لوگ بیٹھے کھانے کے ساتھ انصاف کر رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی سیاح تھے جو اس کے ساتھ ہی فلائیٹ میں تھے ورنہ رات کے دس بجے سے پہلے یہاں کے مقامی لوگ کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

ایک میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھا زیاد سینے پر ہاتھ باندھے فرصت سے کھانے کے ساتھ انصاف کرتی سعاد کو دیکھ

رہا تھا۔ جیکٹ اتار کر کرسی پر لٹکا دی تھی۔ لبوں کو ہلکی ہلکی تبسم نے مسلسل اپنے تنگ گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ اس کے سامنے وہ بالکل کسی بچی کی طرح کھانا کھا رہی تھی جو نجانے کتنے عرصے سے بھوکی ہو۔ اس کے برعکس زیاد نے صرف کافی منگوانے پر اکتفا کیا تھا۔ بقول اس کے وہ پہلے ہی اتنے مہنگے ریستوران میں لا کر اسے لوٹ چکی تھی، اب وہ مزید رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

''سینیوریتا۔'' اس نے کچھ سوچ کر میز کا کونا بجایا۔ سینیوریتا نے ٹھہرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے سر کو ذرا سی جنبش دے دی۔ ''آپ مجھے ایک گائیڈ کے طور پر ہائر کر رہی ہیں!'' اس بار سینیوریتا نے رکنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اس نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھا۔

''کیوں؟''

''اس اجنبی ملک میں تنہا آپ کیسے رہیں گی؟'' وہ اس کے لیے فکر مند تھا یا اپنی خالی جیب کے لیے، اندازہ لگانا ذرا مشکل تھا۔

''ٹھیک ہے۔ فری آف کوسٹ ناں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زیاد کی آنکھیں چشمے کے پیچھے سے مسکراتے ہوئے ذرا سی پھیلیں۔ وہ آگے ہوا۔ دائیں کہنی میز پر رکھی پھر ذرا سا اس کی طرف کو جھکا۔ ''چالیس یورو پڑے! پاکستانی یہی کوئی پانچ سے چھ ہزار ہونگے۔'' اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔ سعاد نے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھا۔

''تم ایک ہفتے کے چالیس ہزار مانگ رہے ہو!'' وہ دبا دبا سا چلائی۔

''صرف یہی نہیں۔ رہائش آپ کی طرف سے ہو گی اور کھانا بھی!'' سعاد نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ مزے سے کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔ ''بولیں قبول ہے؟ ابھی میں سستے میں کام چلا رہا ہوں اور بھروسے کا آدمی ہوں، سوچ

لیں۔" سعاد نے منہ کے زاویے بگاڑے پھر کافی کا کپ لبوں سے لگایا۔ کافی بے حد کڑوی تھی، اس کا اندر تک سب کچھ کڑوا ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر کہیں آنے جانے کا کرایہ آدھا آدھا کریں گے۔ اب اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ اپنے بھائی سے لڑ کر آئی ہوں۔ وہ پڑھائی کے لیے یو کے جا رہا تھا، مجھے غصہ آیا کہ وہ مجھے نہیں لے کر جا رہا۔ تبھی ضد کر کے اگلے دن ہی اپنے اندلس جانے کا اعلان کر دیا۔ وہ بے چارہ منع کرتا رہا مگر پھر میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالے اور یہاں بھیج دیا۔ اس نے سنڈے کو بینک بند ہونے کی اطلاع بھی دی تھی مگر میں نے دھیان نہیں دیا۔ اس پر غصہ تھا تبھی کھانا نہیں کھایا۔ اور میں اس کے دیے گئے پیسے بھی غصے میں وہی پھینک آئی ہوں، تم سمجھ رہے ہو ناں؟" وہ روہانسی ہوئی تھی۔ زیاد کو اس کے غصے پر غصہ اور اس کی معصومیت پر ترس آیا تھا۔

"ٹھیک ہے منظور ہے۔ اب اگر تم نے کھانا کھالیا ہے تو چلو ہوٹل تک چھوڑ آؤں۔" وہ اپنا بٹوہ نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"ہوٹل؟"

"جہاں تم رہو گی۔" وہ آپ سے تم پر آیا تھا۔ اس وقت وہ ایک گائیڈ کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تھا۔

"میں ہوٹل کے کرایے بھروں تو کل سڑک پر بھیک مانگوں گی۔ کوئی اور انتظام کرو!" وہ حیرت سے اسے دیکھے گیا۔

"لڑکی تم کہاں رہو گی پھر؟ میں تو کبھی ادھر کبھی ادھر۔ چھٹیاں منانے آیا ہوں، اکثر تو ٹرین میں ہی رات گزرتی ہے۔"

"اب نکالو کوئی حل۔ میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔" اس نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے۔ زیاد نے بے بسی سے اسے

دیکھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں بل ادا کر کے باہر سڑک پر سعاد کی رہائش کا بندوبست کرنے کے لیے دماغ کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

مالاگا کا پر رونق شہر رات کے اندھیرے میں برقی قمقموں سے چمک رہا تھا۔ صاف ستھری ہموار سڑکیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے کنارے لگیں اسٹریٹ لائٹس۔ لوگوں کی چہل پہل جاری و ساری تھی۔ فلک پر براجمان چاند سر جھکائے خاموشی سے انہیں تک رہا تھا۔ دفعتاً اس خاموشی میں سعاد کے بڑھتے قدم ٹھہرے۔

"زیاد، یہاں کے مقامی لوگ مہمان نواز ہوتے ہیں ناں۔ کیونکہ ان کی رگوں میں عربوں کا خون ہے اور عرب مہمان نواز ہوتے ہیں۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ زیاد نے آنکھیں سکیڑے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہی کہ ہم آج کسی ہسپانوی کے ہاں مہمان ہونگے۔" اس نے کسی بچے کی طرح اچھل کر تالی بجائی۔

"سینوریتا! آپ کو دیکھ کر یہ ہسپانوی پہلے سر سے سینے تک صلیب کا نشان کھینچیں گے پھر "خدا ہمیں موروز سے بچائے" کہتے ہوئے نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔" اس کے طنزیہ کہنے پر سعاد نے آنکھیں گھمائیں۔

"یہ صرف تم نے تخمینہ لگایا ہے۔ آؤ اکڑ بکڑ بمبے بو کرتے ہیں۔" وہ آگے بڑھی اور کچھ دیر بعد وہ ہر گھر پر انگلی رکھتے ہوئے اکڑ بکڑ پڑھ رہی تھی۔

"اسی نوے پورے سو

سو سے نکلا دھاگا۔۔۔۔" زیاد مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا جو ہر گھر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اکڑ بکڑ پڑھنے میں مصروف تھی۔ اور پھر وہ اختتام پر پہنچی۔ "کھانے پینے والا ہے۔۔۔۔ بے شاااا" اسے غالباً یہ گھر پسند

نہیں آرہے تھے تبھی اس کا شاا لمبا ہوتا جارہا تھا۔ "شاااا۔۔۔۔رااام!" آخر کار وہ ایک گھر کے سانے رک گئی۔

"ہم آج رات یہاں قیام کریں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے گھنٹی بجائی۔ زیاد لب دانتوں میں دبائے سینے پر ہاتھ باندھے اس کی کاروائیاں دیکھنے لگا۔ آخر کار دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص باہر آیا۔

"السلام علیکم سر۔" اس نے عربوں کے سے انداز میں زور دے کر بمشکل حلق سے ع نکالا تھا۔ زیاد نے چہرہ ترچھا کر کے اپنی مسکراٹ چھپائی تھی۔ ان انکل نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پار سے سر تا پیر اس کا جائزہ لیا پھر ناک سکیڑ کر سر سے سینے تک صلیب کا نشان کھینچا۔

"خدا ہمیں موروز سے بچائے!" اور دھاڑ سے دروازہ اس کے منہ پر بند! زیاد قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ سعاد برے برے منہ بناتی پیچھے ہٹی۔

"ٹھیک ہے مگر ہر بار تم ٹھیک نہیں ہو گے۔ اس گھر میں دیکھتے ہیں۔" اس نے اگلے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ زیاد اپنی ہنسی روکتا سنجیدہ ہوا۔ دروازہ کھلا اور اب کی بار ایک خاتون باہر آئیں۔

"السلام علیکم یا حبیبتی!" اس بار ع کے ساتھ ساتھ ح بھی حلق سے نکالا گیا تھا۔ اس عورت نے سر تا پیر اس کا جائزہ لیا پھر ایکدم آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ زیاد ایکدم سیدھا ہوا۔ وہ عورت اب اسے گلے لگائے عربی میں نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ وہ بس نا سمجھی سے اسے دیکھتی مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ عورت اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ سعاد نے مڑ کر مسکرا کر زیاد کو دیکھا پھر دونوں بھنویں اچکا کر زبان نکال کر اسے چڑاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔

اس عورت نے اندر آکر اسے صوفے پر بٹھایا اور دوبارہ عربی میں جانے کیا کیا بولنے شروع ہو گئیں۔ وہ ان کی ہر بات کے جواب پر بس سر اثبات میں ہلا رہی تھی اور دعا کر رہی تھی وہ خاتون کوئی سوال نہ پوچھ رہی ہوں۔

اور پھر اس کی دعاؤں میں زیادہ اثر نہیں تھا۔ ان خاتون نے کوئی سوال پوچھا، اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ خاتوں نے پریشانی سے اسے دیکھا پھر عربی میں کچھ کہا۔ وہ سمجھ گئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔

"نو عربی اونلی انگلش۔" بس، اس نے یہی کہا تھا اور خاتون نے غصے سے اسے گھورا۔ اس کا بازو پکڑا، اسے باہر لائیں، دروازہ کھولا اور دھکا دیا۔ پھر اونچی آواز میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے نم ہوتی آنکھوں سے سامنے دیکھا جہاں وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"وہ اپنی کسی عرب دوست کے انتظار میں تھی، اسے لگا تم ہی ہو وہ۔" وہ دلکشی سے مسکرایا۔ سعاد کا دل کیا آگے بڑھ کر اس کے دانت توڑ دے۔

"مورخوں نے عربوں کے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، یہ تو نہایت بد تمیز قوم ہے۔" اسے غصہ آنے لگا تھا۔ زیاد کھل کر مسکرایا تھا۔

"تم میرے گھر چل سکتی ہو۔" اس نسوانی آواز پر دونوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہاں ایک ادھیڑ عمر خاتون کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا تھا جس نے انہیں سہارا دیا ہوا تھا۔ "میں تمہیں کب سے دیکھ رہی ہوں تم گھر کی تلاش میں ہو۔ آج رات میری مہمان بنو تا کہ تمہیں اندازہ ہو کہ مورخوں نے عربوں کے بارے میں مبالغہ آرائی نہیں کی ہے۔" وہ ہکا بکا انہیں دیکھے گئی۔ شکل سے تو وہ کوئی ہسپانوی لگ رہی تھیں مگر اردو میں ان کی گفت وشنید کو سننے کے بعد سمجھنا بھی اسے حیران کر گیا تھا۔

اس نے خجلت سے اپنا کان کھجایا پھر سر کو جنبش دی۔ اور پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں ان خاتون کی تقلید میں قدم اٹھا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ اندھیر سائے جنہوں نے فلک پر اپنے پنجے گاڑ دیے تھے، اب دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ فلک کے پردوں کو چیرتی چھن سے آتی روشنی متواتر ان گھروں سے ٹکرا رہی تھی۔ درمیان میں ہموار سڑک تھی اور دائیں بائیں اونچے گھر۔ گھروں کی کھڑکیوں پر اندلسی خاسمین (یاسمین) رکھے ہوئے تھے، پوری گلی ان کی مہک سے مہک رہی تھی۔ گلی کے درمیان میں ایک بچہ سائیکل چلاتا دور جا رہا تھا۔ لوگ گھروں سے نکل رہے تھے۔ گلی کے سرے پر کلیسا کا اونچا لمبا مینار پوری قوت سے زمین میں پنجے گاڑے کھڑا تھا۔ تیز چمکتا مہر منور کلیسا کے مینار کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ٹن کی آواز سے کلیسا کا گھنٹا بجا تھا۔ راہ چلتے بیشتر لوگوں نے سر سے سینے تک صلیب کا نشان کھینچا تھا جیسے گھنٹے کی آواز پر جواب دیا ہو۔

اب ذرا اس گلی کے آخری گھر پر نظر ڈالی جائے تو یہ وہی گھر تھا جہاں سینیوریتا سعاد اپنے گائیڈ کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔ گھر کا آہنی گیٹ خاکی رنگ کا تھا اور دیواریں سفید تھیں۔ گیٹ کے کھلتے ہی دائیں طرف گول جاتی سیڑھیاں ہیں جو گھر کی چھت تک جاتی ہیں جہاں سے پوری گلی کا منظر دیکھا جا سکتا ہے اور اگر گیٹ سے سیدھا اندر جائیں تو درمیان میں بچھایہ کارپیٹ آپ کو لاونج تک پہنچائے گا۔ سفید رنگ کی دیواریں جن پر مختلف تصاویر آویزاں تھیں۔ جدید طرز کے صوفے، کانچ کی میز اور ایک طرف وہ جدید طرز کا آتش دان، خوبصورت اور چھوٹا سا۔

صوفوں پر دو معتبر خواتین بیٹھی تھیں۔ ایک معتبر ایک سینیوریتا!

سینیوریتا سعاد اندلس کی سیر کو جانے کے لیے تیار تھیں۔ گلابی رنگ کے عبائے پر سیاہ رنگ کا حجاب اوڑھ رکھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے چائے پیتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے لاؤنج پر ڈالی پھر سامنے بیٹھی خاتون کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟'' وہ خاتون سیاہ ٹراوزر پر سرمئی سویٹر پہنے ہوئی تھیں۔ چہرے کے گرد سیاہ رنگ کا

حجاب اوڑھا ہوا تھا جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا۔

"ہمیشہ سے، میں ہسپانوی مسلمان ہوں۔ مور سکوز سے موروز! میرا بیٹا اور بہو ایک کار ایکسیڈینٹ میں مر گئے۔ میرا پوتا حامد تب ڈیڑھ سال کا تھا۔ میں نے ہی اسے پالا ہے اور اب اس عمر میں یہ میرا واحد سہارا ہے۔" انہوں نے ذرا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ سعاد کی نگاہ لاؤنج میں داخل ہوتے حامد پر پڑی۔ درمیانہ قد اور وہی مغربی حسن۔ سنہرے بال اور گوری رنگت، ٹھنڈ کی وجہ سے لال ہوتی ناک، غرض ہر ادا مغربی تھی۔

اس کی نگاہیں حامد سے پھسلتیں اس کے ساتھ چلتے زیاد پر ٹکیں۔ سفری بیگ شانوں پر لٹکائے، بغل میں اپنا تکیہ دبائے وہ موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے چل رہا تھا۔ بھورے رنگ کی پینٹ پر گہرے کتھئی رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں سفید لوفرز میں مقید تھے۔ کلائی پر قیمتی (لنڈے والی) رسٹ واچ باندھی ہوئی تھی۔ ناک پر چشمہ بٹھایا ہوا تھا۔ اندھا گائیڈ!

"سلام دادی۔" اس نے موبائل جیکٹ کی جیب میں اڑستے ہوئے سر کو خم دیا۔

"وعلیکم السلام۔ کل تم سے تعارف نہیں ہو سکا، تم اور سعاد میاں بیوی۔۔۔"

"یہ میرا گائیڈ ہے۔ پرائیویٹ گائیڈ ہائر کیا ہے میں نے۔" ان کے آگے بولنے سے پہلے ہی سعاد بول اٹھی تھی۔ ان کا زیادہ بولنا ٹھیک نہیں تھا ناں۔

"زیاد بھائی جیسا گائیڈ ملا ہے۔ آپ اندلس میں حقیقی معنوں میں جینے والی ہیں۔" حامد نے تبصرہ دیا تھا۔ زیاد نے سر کو خم دیا تھا، سعاد نے اس کے تبصرے کو احسن طریقے سے نظر انداز کیا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"سان سباستیان"!

"سان سباستیان میں آج بُل فائٹ ہے، ضرور دیکھنے جانا۔" دادی نے اسے تاکید کی تھی۔

"سینیوریتا؟" زیاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"بُل فائٹ، ٹرائے کرتے ہیں۔" اس نے کندھے اچکائے پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا پھر ان خاتون سے بغلگیر ہوئی۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر اس نے معصومیت سے پہلے اپنے ٹیچی کو دیکھا پھر زیاد کو۔ زیاد نے گہری سانس لی پھر آگے آیا۔

"دویوروز!" وہ اس کا ٹیچی گھسیٹا باہر جا رہا تھا۔

"تم کوئی سفری بیگ لے لو۔ اسے کہاں اٹھائے پھرو گی؟ اور مزید یہ کہ یہ ایڈریس دے رہی ہوں۔ غرناطہ میں میری جاننے والی خاتون ہیں یہ۔ تم ان سے ملو گی تو مجھے خوشی ہو گی۔" انہوں نے ایڈریس لکھ کر اسے تھمایا۔ سعاد نے سر کو جنبش دی پھر انہیں سلام کرتی باہر آ گئی جہاں زیاد کندھے پر اپنا سفری بیگ ڈالے، بغل میں تکیہ دبائے اور دائیں ہاتھ سے اس کا ٹیچی گھسیٹتے ہوئے منہ بنائے گھر سے نکل رہا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ وقت کے گھوڑے پر سوار شہسوار نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

☆☆☆

بُل فائٹنگ کو ہسپانوی ثقافت کا قدیم اور روایتی حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ دنیا کے چند ملکوں میں یہ مقبول کھیل ہے۔ بُل فائٹنگ ایک جسمانی مقابلہ ہے جس میں عام طور پر ایک کھلے میدان میں ایک آدمی قواعد یا ثقافت کے مطابق ایک بیل کو قابو کرنے یا جان سے مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کھیل مختلف طریقوں سے کھیلا جاتا ہے جس میں گائے یا بیل کے اطراف رقص کرنا یا جانور کے سینگوں سے باندھی گئی شے کو اتارنے کی کوشش کرنا شامل ہے۔ بُل فائٹنگ کی سب سے مشہور شکل ہسپانوی طرز کی بُل فائٹنگ ہے، جو ہسپانیہ، پرتگال، جنوبی فرانس، میکسیکو،

کولمبیا، ایکواڈور، وینزویلا اور پیرو میں رائج ہے۔ اس کھیل کے لیے استعمال ہونے والے بُل رنگز میں سب سے قدیم 1700 میں قائم ہونے والے سیویلا اور رونڈا ہیں جو ہسپانیہ میں واقع ہیں۔ سب سے بڑا بُل رنگ میکسیکو میں میکسیکو پلازہ کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں قریباً 48،000 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش موجود ہے۔ جانوروں کی فلاح و بہبود، مالی امداد اور مذہب سمیت مختلف خدشات کی وجہ سے بُل فائٹنگ کا کھیل متنازعہ ہے۔ اگرچہ بعض جگہ پر اس کو خون کا کھیل سمجھا جاتا ہے، غیر ملکی اسے وحشیانہ اور ظالمانہ کھیل قرار دیتے ہیں۔ بھلا جس کھیل میں ہر بار کئی بل، متعدد گھوڑے اور کبھی کبھار انسان بھی ہلاک ہو جائیں وہ کھیل کیونکر کہلایا جاسکتا ہے؟ باوجود اس کے ہسپانوی بُل فائٹنگ کو فنون لطیفہ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر تھوڑے سے مزے کی خاطر ایک دو بُل اور چند گھوڑے ہلاک ہو جائیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟

مقامی طور پر اس کی وضاحت ثقافتی تقریب یا ورثہ کے طور پر کی جاتی ہے۔ اس خونی کھیل میں ہر سال تقریباً اڑھائی لاکھ افراد موت کی نظر ہو جاتے ہیں۔ اس کھیل میں حیرت کی بات یہ ہے کہ زخمی ہونے والے افراد کی گنتی نہیں کی جاتی، ہاں مگر یہ ریکارڈ ضرور رکھا جاتا ہے کہ کتنے بیل اس کھیل میں شامل ہوئے۔ ایک غیر سرکاری ویبسائٹ کے مطابق، 2013 میں ہسپانیہ میں کُل 661 بُل فائٹس کے دوران 47 افراد زخمی ہوئے تھے۔ بُل فائٹنگ بیشتر ممالک میں غیر قانونی ہے، لیکن یہ اسپین اور پرتگال کے بیشتر علاقوں کے ساتھ ساتھ کچھ امریکی ممالک اور جنوبی فرانس کے کچھ حصوں میں قانونی حیثیت رکھتی ہے۔ ہسپانیہ میں یہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہاں تک کہ ہسپانیہ کا عظیم بُل فائٹر مونا لیتے جب لِنارس کے کسی غیر معروف رنگ میں ہلاک ہوا تو سرکاری طور پر اس کی موت کا سوگ منایا گیا۔

بُل فائٹر کو میٹاڈور کہا جاتا ہے وہ ایک مخصوص مگر منفرد نظر آنے والا لباس پہن کر یہ کھیل کھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ بُل

فائٹنگ میں بُل فائٹر کے بعد اسٹیج پر سب سے اہم کردار بُل ہوتا ہے۔ ہسپانیہ میں متعدد ایسے فارمز ہیں جہاں بُل فائٹنگ میں حصہ لینے والے بہترین بُل پائے جاتے ہیں۔ ان کی اعلی قسم کی پرورش کی جاتی ہے۔ اس دوران کسی انسان کو ان کے درمیان بھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا کہ کہیں انسانوں سے میل جول کی وجہ سے بُل اپنے جنگلی اور جوفناک اطوار نہ کھودے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بُل میدان میں داخل ہوتا ہے تو لوگوں کا شوروغل اسے پریشان کیے رکھتا ہے۔

بہترین بُل فائٹنگ کے لیے بُل کا وحشی اور ناتجربہ کار ہونا ضروری ہے۔ کوئی بھی بُل اگر فائٹنگ میں جیت جائے اور اسے دوبارہ لڑنے کا موقعہ دیا جائے تو پچھلے تجربے کی بنا پر وہ فائٹر کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بُل اگر لڑائی میں ہلاک نہ ہو تو میدان سے باہر لا کر اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ شروع شروع میں جب یہ قانون عائد نہیں ہوا تھا تو ایک ہی رنگ میں سینکڑوں بُل فائٹرز اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ چنانچہ یورپ نے ان تمام عیسائی شہزادوں کو مذہب سے باہر نکال دینے کی دھمکی دی جن کی ریاستوں میں بُل فائٹنگ رائج تھی۔ اور پھر سب کے باہم متحدہ فیصلے کی بنا پر یہ قانون رائج کیا گیا۔ لیکن ہسپانیہ کے کئی قصبوں میں اس قانون کا احترام نہیں کیا جاتا۔ ان قصبوں کے باشندے اتنے غریب ہیں کہ وہ ہر لڑائی کے لیے الگ بُل نہیں خرید سکتے۔ اور نتیجتاً تجربہ کار بُل کے ہاتھوں کئی بُل فائٹرز ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی بُل کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک سیزن میں سولہ بُل فائٹروں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔۔!

☆☆☆

بگل کی تیز آواز گونجنے پر شوروغل کی آوازیں تھم گئیں۔ اصطبل کے پاس کھڑے بوڑھے آدمی نے اصطبل کا دروازہ کھول دیا۔ ایک بھاری بھرکم کالے رنگ کے بُل نے میدان میں قدم رکھے۔ اور اسی کے ساتھ ہی پورا

میدان لوگوں کی "ہے تورو" کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔ لوگ کھڑے ہو ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ بُل فائٹنگ کا آغاز ہوا اور یہ آغاز فائٹر کے بجائے اس کے معاونین نے کیا۔ وہ سرخ جھنڈ الہراتے بُل کو مشتعل کر رہے تھے جس سے بُل ان کے پیچھے بھاگتا اور اس کی رفتار میں کمی آتی۔

اور پھر کچھ دیر بعد بُل فائٹر نے میدان میں قدم رکھے۔ سعاد سانس روکے سامنے دیکھنے لگی۔ یہ وہ کھیل تھا جس میں بقول زیاد کے بُل کی موت اور بُل فائٹر کی فتح یقینی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں۔ زیاد اس سب سے انجان اپنا تکیہ گود میں رکھ کر دونوں کہنیاں اس پر جمائے موبائل میں گیم کھیل رہا تھا۔ اسے بُل اور بُل فائٹر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بُل فائٹر اپنی سرخ کیپ بُل کے سامنے لہرا رہا تھا، بُل غصے سے نتھنوں کو پھیلائے بُل فائٹر کو دیکھ رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر جب اس نے بُل فائٹر پر وار کرنا چاہا تو بُل فائٹر تیزی سے ایک طرف ہو گیا اور بُل دور جا کر رکا۔ وہ پلٹ کر دوبارہ واپس آیا اور اس بار بھی بُل فائٹر نے یہی کیا۔ اس کا مقصد مختلف حربے آزما کر بُل کو تھکانا تھا۔ بُل فائٹ کا ایک راونڈ مکمل ہوا تو شور و غل کی آوازوں میں تیزی آئی۔ لوگ لبوں کو گول کر کے زور سے سیٹیاں بجا رہے تھے، تالیاں پیٹ رہے تھے۔ اگلا راونڈ ان سب کے لیے دلچسپ ہونے والا تھا۔

کچھ دیر وقفہ لے کر صدر کے کیبن کی گھنٹی بجی اور بُل فائٹ کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ اس بار میدان میں بُل کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اور پھر دور سے ایک گھڑ سوار میدان میں داخل ہوا۔ گھڑ سوار کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ بُل چند پل حیرت اور کم فہمی سے اس عجیب مخلوق کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر اپنے سینگھ زور سے گھوڑے کے پیٹ میں مارے۔ گھوڑے پر بیٹھے گھڑ سوار نے اپنا نیزہ بُل کی گردن میں گھونپ دیا۔ وہاں سے تیزی سے خون رسنے لگا۔ بُل نے ضبط سے کام لیتے ہوئے ایک زوردار ٹکر گھوڑے کو ماری۔ گھوڑا لڑکھڑایا، گھڑ سوار نے ایک بار پھر بُل کی گردن

میں نیزہ گھونپنا چاہا مگر بُل بہادری دکھاتے ہوئے گھوڑے پر حملہ آور ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ گھوڑے کو ہلاک کر چکا تھا۔ گھڑ سوار الٹے پاؤں میدان سے بھاگ رہا تھا۔

"بُل بہادر ہے، تبھی اس نے زخم کھانے کے باوجود دوبارہ گھوڑے پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر ڈالا۔" ایک ہسپانوی لڑکی کی آوز اس کی سماعت سے ٹکرائی □۔

"چلو آگے دیکھتے ہیں۔ اس بار تو پکا یہ بزدل نکلے گا۔" ایک اور لڑکی نے اپنی رائے دی۔ اور پھر اس کی سماعت سے سوں سوں کی آواز ٹکرائی۔ کوئی رو رہا تھا کوئی جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے حیرت سے سر جھکائے ہی گردن ترچھی کر کے برابر میں بیٹھی سعاد کو دیکھا۔ لال ہوتی ناک، بھیگے گال اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔۔ واللہ!

وہ ٹشو سے اپنی ناک رگڑتی سوں سوں کر رہی تھی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔

"تم رو رہی ہو؟" آواز میں حیرت پنہاں تھی۔

"گھوڑا مر گیا۔۔۔بُل۔۔۔زخمی ہو گیا۔۔۔ یہ کیسا کھیل ہے؟" کئی آنسو قطار کی صورت میں اس کے گالوں پر لڑھکے۔ زیاد کا دل کیا تھا وہ اپنا سر پیٹ لے۔

"اب تمہارے رونے سے یہ کھیل تو بند نہیں ہو گا ناں۔ آنکھیں بند کر کے دیکھ لو کچھ نہیں ہو گا۔" وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔ سعاد نے خفا خفا سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں۔۔ دیکھنا۔۔۔ چلو بس۔۔" ایک بار پھر۔۔ کئی آنسو۔۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔

"اتنے مہنگے ٹکٹ لیے ہیں یار کچھ تو خیال کرو۔ یہ جو اوپر عوام دیکھ رہی ہو ناں یہ انتظار میں بیٹھی ہے کہ کب کوئی نازک دل سیاح روتا ہوا یہاں سے بھاگے اور وہ اس کی سیٹ پر قبضہ جمائیں۔ چپ کر کے بیٹھی رہو۔" وہ اسے ڈپٹتا

واپس اپنی گیم کی طرف متوجہ ہوا۔

سعاد نے نم آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ وہاں بُل ایک اور گھوڑے کو ہلاک کر رہا تھا۔ بُل خود بھی حد سے زیادہ زخمی ہو چکا تھا۔ بُل کی ٹھوکر سے گھوڑا دور جا کر گرا۔ گھوڑے کا لال اور گرم خون چاروں اطراف میں پھیلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پانی نئے سرے سے امڈنے لگا۔ اور پھر وہ رکی نہیں تھی۔ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتی وہ تیزی سے وہاں سے بھاگی تھی۔ زیاد بوکھلا کر اس کی تقلید میں بھاگا تھا۔ دو ہسپانوی لڑکوں نے عجلت میں ان کی سیٹوں پر قبضہ جمایا تھا۔

"سعاد سعاد کیا ہو گیا ہے رکو تو سہی۔" وہ اسے آوازیں دیتا اس کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ سعاد کے بڑھتے قدم رکے۔

"وہ گھوڑا۔۔" سسکی، آنسو۔۔۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔۔

"کیا یار! ہر بُل فائٹ کا یہ انتہائی اہم حصہ ہوتا ہے، ہاں تنقید بھی اسی پر زیادہ ہوتی ہے مگر لوگ کہتے ہیں کہ اگر مزے کی خاطر چند گھوڑے ہلاک ہو جائیں تو کیا قباحت ہے؟"!

"کونسا مزہ؟ وہ بے چارے بے زبان جانور۔۔۔" ٹپ ٹپ ٹپ۔۔ زیاد بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اسے اس کے رونے پر غصہ آ رہا تھا، اسے اپنی سیٹیں جانے پر، پیسوں کے رائیگاں جانے پر غصہ آ رہا تھا مگر وہ اتنی معصومیت سے اس کے سامنے آنسو بہا رہی تھی کہ وہ اس پر غصہ کر بھی نہیں پا رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اس وقت اس کے انڈر تھا۔ وہ اس پر کیسے غصہ کر سکتا تھا؟!

"اچھا آؤ تمہیں سان سباستیان کی سیر کرواؤں۔" اس نے اپنی جیب سے ٹشو نکالتے ہوئے کہا تھا۔ سعاد نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا جو اب ٹشو اس کی طرف بڑھائے کھڑا تھا۔

"مجھے نہیں کرنی۔ مجھے ابھی رونا ہے۔" زیاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے اتنا رونے کے بعد اب بھی رونا تھا؟

”سینیوریتا! بُل فائٹ کے اختتام پر ان گھوڑوں کا جنازہ اٹھے گا۔ آپ ان کی قبر پر جتنے آنسو بہانا چاہیں بہا لیجیے گا لیکن فی الحال چلیں۔ اگر کسی پادری کا یہاں سے گزر ہو گیا اور اس نے آپ کو روتے دیکھ لیا تو میں بیچ چوراہے پر سولی پر لٹکایا جاؤں گا۔“ اس نے بگڑ کر کہا تھا۔ سعاد نے منہ بسورا پھر اس کے ہاتھ سے ٹشو لے کر اپنی نم آنکھیں پونچھیں۔

”اب کہاں جائیں گے؟“

☆☆☆

”اور میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بُل بزدل ہے۔“

”وہ بزدل نہیں تھا، بس بری طرح زخمی ہو گیا تھا تبھی جلدی مارا گیا۔“

”اسے بزدلی ہی کہتے ہیں، اس نے تیسرے گھوڑے پر پلٹ کر وار نہیں کیا تھا۔ وہ بزدل تھا!“ ان دونوں کے آگے چلتے دو ہسپانوی مرد آپس میں بُل فائٹ پر بحث کر رہے تھے۔ بُل فائٹ دیکھنے کے بعد اب لوگ کیفے کا رخ کر رہے تھے اور کچھ کا رخ بیچ کی طرف تھا۔ کیفے کے پاس پہنچ کر زیاد نے ایک ترچھی نگاہ اس خاموش سی سینیوریتا پر ڈالی پھر اپنا سفری بیگ اتارا اور کیفے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ بغل میں دبے تکیے کو سر کے پیچھے رکھ لیا۔ سعاد نے دائیں ابرو اچکائے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میری کافی اور سینڈوچ یہیں بھجوا دینا پلیز!“ وہ مسکرایا۔

”یہاں؟“

”کوئی مسئلہ ہے؟“ اس نے دونوں بازو پھیلائے بے فکری سے پوچھا۔ سعاد نے نفی میں سر ہلایا پھر اندر چلی گئی۔ وہ وہیں بیٹھا سڑک سے گزرتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ وہی ہسپانوی لوگ، درمیانہ قد، گوری رنگت، مغربی نقوش۔ ان

میں سے کچھ لوگ پلٹ پلٹ کر عجیب نظروں سے اسے گھور رہے تھے، ان کا گھورنا بنتا تھا۔

اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ کسی سمندر کی مانند نیلا آسمان اور جزیروں کی مانند جگہ جگہ بادل کے ٹکڑے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا بادلوں کے ان ٹکڑوں کو اپنے ساتھ لیے پھر رہی تھی۔ ایک جگہ پر سفید رنگ کی باریک سی لکیر تھی جیسے ابھی یہاں سے کوئی راکٹ گزرا ہو یا کوئی جہاز۔ وہ ایسی ہی کوئی شام ہو گی ناں جب مستنصر نامی اندلس میں آیا ایک اجنبی یونہی کیفے کی دیوار سے ٹیک لگائے اپنے منگوائے گئے مشروب کے انتظار میں بیٹھا ہو گا۔ اور ایسا ہی کوئی دن ہو گا جب اس اجنبی نے بُل فائٹنگ دیکھی ہو گی اور کسی کے اپنی تصاویر اتارنے پر تلملایا ہو گا۔ وقت گویا وہیں تھم گیا تھا اور آج سالوں بعد آیا اندلس میں یہ اجنبی اسی اجنبی کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ آج اُس اجنبی کا سفر نامہ اِس کے سفری بیگ میں بھری کتابوں میں سے ایک کتاب میں الفاظ کی صورت میں قید تھا۔ اور کون جانے کل اندلس میں آئے اِس اجنبی کا سفر نامہ سالوں بعد کسی اور اجنبی کے سفری بیگ میں بھری کتابوں میں سے ایک کتاب میں الفاظ کی صورت میں قید ہو۔ وقت خود کو دہراتا ہے ناں۔

”ایکسکیوز می سینیور۔“ کسی نسوانی آواز پر اس نے گردن ترچھی کر کے سامنے دیکھا جہاں ایک ویٹریس نوٹ بک لیے کھڑی تھی۔

”اپنا آرڈر نوٹ کروالیں۔“ اس نے چہرہ گھما کر شیشے کی دیوار کے پار سامنے ہی ایک میز کے پاس بیٹھی سعاد کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ کھل کر مسکرایا۔

”لکھیے سینیوریتا!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ویٹریس اس کے انداز پر مسکرادی تھی۔ شیشے کی دیوار کے پار کرسی پر بیٹھی سعاد نے پہلو بدلا تھا۔ اس نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے اپنا آرڈر نوٹ کروایا۔ ویٹریس اس کا آرڈر نوٹ کر کے اندر چلی گئی۔ وہ مزے سے واپس سڑک پر نظریں جمائے بیٹھ گیا۔

ویٹریس اندر آئی تو سعاد نے اسے اپنے پاس بلایا، نوٹ بک لی اور غصے سے اس کی نوٹ کروائی ہر چیز پر لکیر لگادی۔

”میم بس؟“ ویٹریس پریشان ہوئی۔

”بالکل۔ باہر لے آیئے گا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور باہر آگئی۔ کیفے کا دروازہ کھلنے کے احساس پر زیاد نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

”تم کیوں باہر آگئیں؟“ اس کا غصے سے لال ہوتا چہرہ زیاد کو اس وقت بہت بھلا لگ رہا تھا۔

”کوئی مسئلہ ہے؟“ تپ کر کہا گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”رکو، میں ابھی آیا۔“ وہ اسے رکنے کا کہہ کر اندر گیا اور وہاں سے کرسی کھینچ لایا۔

”اب بیٹھ جائیں سینیوریتا۔“

”ہر لڑکی سے مسکرا کر بات نہیں کرتے سینیور!“ اسے آگاہ کیا گیا تھا۔

”کیوں بھلا؟“ مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا گیا۔

”کیونکہ ہر لڑکی سینیوریتا نہیں ہوتی، کچھ سینیورا بھی نکل آتی ہیں۔“ وہ گردن ترچھی کر کے ہنس دیا تھا۔ سعاد تلملا کر رہ گئی تھی۔

”بدتمیز سینیور!“ وہ بڑبڑائی تھی۔ ویٹریس باہر آئی۔ اس نے ٹرے آگے کی۔ زیاد نے دونوں کافی کے کپ اٹھائے۔ اسے شکریہ کہا پھر ایک کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ خفا خفا سی نظروں سے اسے دیکھتی کپ تھام گئی تھی۔

☆☆☆

”کسی بھی قوم پر جب زوال آتا ہے تو ہر شخص غالب اور مغلوب کے نظریے میں قید ہو جاتا ہے۔ امیر امیر تر اور غریب غریب ترین ہوتا رہتا ہے، ظلم و ستم اپنی تمام حدیں پار کرتا ہے۔ انسانوں کی بستی میں درندے اپنے پنجے گاڑ دیتے ہیں، نوچ ڈالتے ہیں، چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اندرونی تفرقے، اتحاد کا مفقود ہو جانا، ذاتی مفاد کو ترجیح دینا، اپنی قوم کا خون چوسنا، یہ وہ بیماریاں ہیں جو اگر کسی قوم میں ظاہر ہو جائیں تو تاریخ شاہد ہے کہ ایسی قوم ہمیشہ نیست و نابود ہوئی ہے۔ ایسی اقوام پر ہمیشہ دوسری قومیں مسلط کر دی گئی ہیں۔ ایک قوم کا زوال دوسری قوم کا عروج ہوتا ہے اور ہر عروج کی انتہا زوال کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ ہر غالب مغلوب ہوتا ہے اور ہر مغلوب سر اٹھا کر جیتا ہے۔ سر جو جھکنے کے لیے اٹھتا ہے۔

اندلس پر بھی ایسا ہی وقت آیا تھا۔ اندلس کی قوم گلنے سڑنے لگی تھی۔ اندلس کسی پہاڑ کی طرح تھا۔ ایسا پہاڑ جس کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ نسیم حجازی لکھتے ہیں کہ: ایک گری ہوئی دیوار کو دوبارہ استوار کیا جا سکتا ہے، لیکن گرے ہوئے پہاڑ کو دوبارہ کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ کون سمیٹے گا مٹی کے ان ذرات کو؟ کون سہارا دے گا اسے؟“!

دور دور تک پھیلے سمندر پر نگاہیں ٹکائے وہ بول رہا تھا اور وہ سانس روکے اسے سن رہی تھی۔ وہ میز کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پانی کی کوئی لہر اس طرف آتی تو اسے اپنے قدموں میں نمی کا احساس ہوتا تھا۔ پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر پڑتے تھے۔ خنک ہوا اور نیم اندھیر رات نے منظر مزید دل افروز کر دیا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی جب لہروں سے ٹکراتی تو ہر چشم انسانی کے ساتھ تارِ نظر کا سانحہ پیش آنا لازمی امر ہو جاتا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ نگاہیں دور دور تک پھیلے پانی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی مدھم آواز ہوا کے ساتھ سفر کرتی سعاد کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ ذرا وقفے سے سمندر سے نگاہیں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھتی تو چاند کی مدھم روشنی میں اسے

وہاں تاریک سائے کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا۔ یہ اندازہ لگانا از حد مشکل تھا وہ اندلس کی کہانی سنا رہا تھا یا اپنی؟ جیسے وہ خود اس زمانے میں جیا ہو، جیسے اس نے خود اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا ہو۔ جیسے اس نے جبل الطارق پر کھڑے ہو کر سحر کا انتظار کیا ہو، اس سحر کا جسے صرف اندلس کے لیے طلوع ہونا تھا۔ پھر وہ جبل الطارق پر کھڑا ہو کر چلایا ہو؛ اب تاریک رات مٹ چکی۔ اب جبر کے اندھیرے لوٹ چکے۔ اب طلوع ہونے والی سحر صرف ہماری ہے، صرف ہماری۔ ہمارے اندلس کی!

اس امید پر لڑ رہا ہوں جبر کے اندھیروں سے،

طلوع جو سحر ہو گی وہ سحر ہماری ہو گی۔

”تاریخ کے اوراق میں لکھا گیا ہے کہ اندلس سے یہ گھرے بادل ہٹانے کے لیے آنے والے شہسواروں میں پہلا شہسوار طارق بن زیاد تھا۔ طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر کا آزاد کردہ بربر غلام اور ایک جرنیل!

اس شہسوار کی آمد کے پیچھے واقعہ رقم کیا جاتا ہے کہ کاونٹ جولین جس نے دوبار مسلمانوں کے حملے کو ناکام بنایا، خود موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے اندلس پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ دراصل اندلس میں رواج تھا کہ امرا کی بیٹیاں ملکہ کی خدمت گاروں کے ساتھ تربیت پاتی تھیں۔ جولین کی بیٹی جس کا نام فلورنڈا بتایا جاتا ہے، وہ بھی راڈرک جو اس وقت اندلس کا بادشاہ تھا، کے محل میں مقیم تھی۔ راڈرک فلورنڈا کی خوبصورتی کی طرف مائل ہوا اور غلط قدم اٹھا بیٹھا۔ فلورنڈا نے اس کی خبر اپنے باپ کو بھیجی تو جولین راڈرک کے پاس آیا۔ راڈرک نے اس کی خاصی عزت افزائی کی، بربریوں کے حملوں کے بارے میں مشورے کیے اور پھر رخصت ہوتے وقت جولین سے فرمائش کی کہ وہ افریقہ سے اس کے لیے باز بھیجے جس پر جولین نے جواب دیا؛

”اس مرتبہ میں ایسے باز بھیجوں گا جو آپ نے کبھی نہ دیکھے ہونگے۔“

بربر قوم حریت پسند اور جنگجو تھی۔ اس نے عربوں کی اطاعت بھی عربوں کو خاصا مشکل وقت دینے کے بعد قبول کی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ مشکلات افریقہ کی فتوحات کے دوران پیش آئیں۔ جس وقت اندلس کے پہاڑ کی بنیادیں کھوکھلی ہورہی تھیں تو اسی وقت افریقہ میں نئی سحر طلوع ہورہی تھی۔ اسلام کا سورج اپنی شعاؤں سمیت افریقہ کے فلک پر چمکنے لگا تھا۔ یہ وہ سحر تھی جس کی روشنی اندلس تک پھیلی تھی۔

عرب گورنر موسیٰ بن نصیر نے جب خلیفہ زمان، ولید بن عبدالملک سے اپنے گھوڑوں کا رخ اندلس کی طرف موڑنے کے لیے اجازت مانگی تو خلیفہ نے احتیاطاً پہلے کچھ سواروں کو بھیجنے کا حکم دیا۔ عرب صحرا نشین تھے، اندلس سمندر کے سینے پر تھا، احتیاط تو لازم تھی۔

موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ کا حکم بجالاتے ہوئے پہلے پانچ سو سواروں کا ایک دستہ تیار کر کے طریف نامی ایک بربر غلام کی سالاری میں اندلس کی طرف روانہ کیا۔ جولائی 710ء میں اس دستے نے الخضراء پر حملہ کیا اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو کر لوٹ آیا۔ اندلس کی تاریک راتوں کے پردے میں شگاف پڑ گیا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے طریف کی کامیابی کے بعد سات ہزار سواروں پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا۔ یہ لشکر طارق بن زیاد کی سالاری میں 9 جولائی 711ء میں جبل الطارق پر لنگر انداز ہوا۔

طارق بن زیاد، اس نے اپنے سامنے موت اور پیچھے سمندر کو دیکھا تھا۔ لشکر کے حوصلے پست ہوئے تو سالار نے اپنے جہازوں کو جلانے کا حکم دے دیا۔ میدان جنگ میں کوئی راہ فرار نہیں!

”اے مسلمانو! جنگ کے میدان سے اب مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے پیچھے۔ صبر اور مستقل مزاجی کے علاوہ اب تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارے دشمن کے پاس فوج بھی ہے اور اسلحہ جنگ بھی۔ تمہارے پاس بجز تمہاری تلواروں کے اور کچھ بھی نہیں۔ اگر تم اپنی عزت و

ناموس بچاؤ، دشمن جو تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے بڑھا آرہا ہے اس کے دانت کھٹے کر دو۔ اس کی قوت کو ختم کر دو۔ میں نے تم کو ایسے امر کے لیے نہیں پکارا جس سے میں گریز کروں۔ میں نے تم کو ایسی زمین پر لڑنے کے لیے آمادہ نہیں کیا جہاں میں خود لڑائی نہ کروں۔ اگر تم نے ذرا بھی ہمت سے کام لیا تو اس ملک کی دولت و حشمت تمہارے جوتوں کی خاک ہو گی۔ تم نے اگر یہاں کے شہسواروں سے نپٹ لیا تو خدا کا دین اور رسول اللہ کا حکم یہاں جاری و ساری ہو جائے گا۔ یہ جان لو جدھر میں تم لوگوں کو بلا رہا ہوں ادھر جانے والا پہلا شخص میں ہوں۔ جب فوجیں ٹکرائیں گی تو پہلی تلوار میری ہو گی جو اٹھے گی۔ اگر میں مارا جاؤں تو تم لوگ عاقل و دانا ہو کر کسی دوسرے کا انتخاب کر لینا مگر خدا کی راہ میں جان دینے سے منہ نہ موڑنا اور اس وقت تک دم نہ لینا جب تک یہ جزیرہ فتح نہ ہو جائے۔“

جہازوں کو آگ لگا دی گئی۔ پوچھا گیا، یا امیر اب وطن کیسے لوٹیں گے؟ جواب دیا گیا کہ مسلمان جس جگہ کو فتح کرتے ہیں وہی ان کا وطن ہوتا ہے۔ فاتح ٹھہرے تو یہی وطن، ورنہ شہید کہلائیں گے۔“

سمندر کی ایک لہر زور و شور سے ان کی طرف بڑھی تھی۔ قدموں میں نمی کا احساس اس نمی سے زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا جو دل کو پگھلا رہی تھی۔ خنک ہوا میں اتنی خنکی نہیں تھی جتنی اس کے لہجے میں گھل چکی تھی۔ لہروں میں وہ زور و عزم نہ تھا جو ان الفاظ میں تھا۔

”طارق بن زیاد کا پہلا مقابلہ تھیوڈمیر والی مرسیہ کے ساتھ ہوا۔ تھیوڈمیر راڈرک کا تجربہ کار جرنیل تھا مگر میدان جنگ میں شکست کھا کر وہ بدحواس ہو کر بھاگا اور محل پہنچ کر راڈرک کو کچھ اس طرح اطلاع دی۔

”ہمارے ملک پر کچھ ایسے لوگوں نے حملہ کیا ہے جن کا وطن معلوم ہے نہ اصلیت کہ کہاں سے آئے ہیں۔ زمین سے نکلے یا آسمان سے اترے؟“

افریقہ کے باز اندلس میں اپنے پنجے گاڑ چکے تھے!

راڈرک نے اس اطلاع کے بعد ایک لاکھ کا لشکر جمع کیا۔ جنگ کی تیاریاں فوری طور پر شروع کر دی گئیں۔ طارق بن زیاد کو جب ان جنگی تیاریوں کی خبر ملی تو اس نے موسیٰ بن نصیر کی طرف پیغام بھیجا جس کے جواب میں موسیٰ بن نصیر نے مزید پانچ ہزار مجاہدین کا لشکر بھیج دیا۔ اس طرح ایک لاکھ اندلسی فوج کے مقابلے میں بارہ ہزار مجاہدینِ اسلام میدان جنگ میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ عجیب منظر ہو گا ناں، ایک طرف راڈرک کی ٹڈی دل فوج دوسری طرف اندلس کے نجاتِ دہندہ! جن کے پاس نہ رسد و کمک تھی اور دشمن کی نسبت اسلحہ بھی بہت کم۔ جنگ کے نقارے بجے۔ گھوڑے دوڑے، تلواریں ٹکرائیں۔ ان گھوڑوں کے ٹاپوں سے اڑتی دھول نے سب دھندلا کر دیا۔ جنگ ایک ہفتے تک جاری رہی۔ آٹھویں روز طارق بن زیاد نے بھرپور حملہ کیا۔ سابق بادشاہ وٹیزا کے رشتہ دار راڈرک کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ راڈرک کی فوج کا دایاں و بایاں بازو انہی کی کمان میں تھا جبکہ قلب کی کمان خود راڈرک کے ہاتھ میں تھی۔ طارق بن زیاد نے پورا زور قلب پر ہی لگایا۔ عرب و بربر اس بہادری سے لڑے کہ مسیحی لشکر میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ راڈرک کے بارے میں رقم کیا جاتا ہے کہ وہ سمندر عبور کرنے کی کوشش میں لہروں کی نذر ہو گیا تھا۔“

سمندر کی ایک اور لہر ان کی طرف آئی، پانی کے چند چھینٹے چہرے پر پڑے۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے مکمل نکل آیا۔ لہروں کا شور بڑھا، ہوا کی رفتار میں تیزی آئی۔ اس نے گردن ترچھی کر کے اس اجنبی کو دیکھا۔ ہاں وہ جبل الطارق پر چلا یا ہو گا۔ اس نے فتح کی نوید سنائی ہو گی۔ اس نے اندلس کے نجاتِ دہندہ کی قبا بوسی کا شرف حاصل کیا ہو گا۔ اس نجاتِ دہندہ کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اٹھنے والی دھول نے ماضی کی دردناکیوں کو دھندلکے کی لپیٹ میں دیا ہو گا۔ اس نے اس عظیم فاتح کے گھوڑے کی لگام تھامی ہو گی۔ ہاں اس نے نوید سنائی ہو گی، اے اندلس! تمہاری سحر طلوع ہو گئی۔ تم آزاد ٹھہرے۔ وہ اس فاتح کے شانہ بشانہ لڑا ہو گا۔ کون جانے اندلس کے نجاتِ دہندہ کے لشکر

میں ایک اجنبی، گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اندلس میں طلوع ہونے والی سحر کے لیے میدانِ کارزار میں جبر کے اندھیروں سے لڑا ہو۔ شانہ بشانہ، برابر برابر۔۔!

لہروں کا شور، پانی کے چھینٹے، چاند کی روشنی، ایک اجنبی!

"اندلس کی مرکزی حکومت کو شکست دینے کے بعد طارق بن زیاد نے اپنے لشکر کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے مختلف شہروں کی طرف روانہ کیا۔ مسلمانوں نے پہلا حملہ اسیجہ پر کیا جہاں گاڈ ایسٹ کی شکست خوردہ فوج جمع ہو رہی تھی، انہیں یہاں بھی فتح حاصل ہوئی اور تاریخ کے مطابق قرطبہ کی فتح کا سہرا مغیث رومی کے سر بندھا۔ اس کے بعد مالقہ اور غرناطہ فتح ہوئے۔ طلیطلہ کے باشندے مسلمانوں کی آمد کا سن کر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمان اندلس کے طول و عرض میں اسلام کا پرچم لہرا رہے تھے۔

اسی دوران، کچھ ایسا ہوا جس کی تاریخ شاہد ہے۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو اپنے گھوڑے کو لگام دینے کا حکم دیا۔ طارق بن زیاد نے حکم عدولی کرتے ہوئے اپنے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی رکھیں اور فتوحات کو جاری رکھا۔ اس فاتح نے اس حکم عدولی کی سزا بھرے لشکر کے درمیان کوڑے کھا کر بھگتی۔ کتنے عظیم تھے ناں وہ، اُف تک نہ کی۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے قرمونہ، اشبیلیہ اور ماورہ کو فتح کیا اور طلیطلہ میں طارق سے آملے۔ ہسپانیہ کے شمالی حصے کی تسخیر دونوں کی متحدہ فوجوں نے کی اور سرقونہ، ارغون اور برشلونہ کے علاقے فتح کیے۔"

وہ رک گیا۔ اس کی طرف بڑھتی لہر پیچھے جانے لگی۔ اسے لگا کہانی ختم ہوئی۔ وہ ذرا سی گردن ترچھی کر کے چاند کی مدھم روشنی میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی سے اس کی آنکھیں کسی شفاف آئینے کی مانند لگ رہی تھیں جس میں چاند کا عکس سمندر کی لہروں کے ساتھ ڈبڈبا رہا تھا۔ وہ مسکرایا تھا، ذرا سا، ہلکا سا۔ اسے واقعی لگا

اب کہانی ختم ہوئی۔ اس نے گردن گھمائی، نظریں اس لہر پر ٹکائیں جو ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کہانی ابھی باقی تھی۔

”میں اس مشرقی لڑکی کو یہ کیونکر نہ بتاؤں کہ جب طارق بن زیاد مغرب میں فتح کے جھنڈے گاڑ رہا تھا تو خلیفہ زمان کے حکم پر حجاج بن یوسف سترہ سالہ محمد بن قاسم کی سالاری میں ایک لشکر سندھ کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ اس لشکر کا مقابلہ راجہ داہر سے ہوا۔ سترہ سالہ یہ سالار فتح یاب ٹھہرا اور پھر پورے سندھ میں اسلام پھیلنے لگا۔ مغرب کا نجاتِ دہندہ طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور مشرق میں محمد بن قاسم۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کے کردار سے متاثرین افراد نے باقاعدہ اس کے بت بنا ڈالے تھے جسے اس نے فوراً گرانے کا حکم دیا تھا۔

اسی دوران، خلیفہ زمان ولید بن عبدالملک کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بھتیجا سلیمان بن عبدالملک تخت پر بیٹھ گیا۔ 95ھ میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد بے پناہ مالِ غنیمت لے کر سلیمان بن عبدالملک کے دربار میں حاضر ہوئے۔ سلیمان بن عبدالملک نے کچھ لوگوں کے مطابق محض اپنی ذاتی رنجش کی بنا پر اور کچھ کے مطابق موسیٰ کی کسی نافرمانی پر موسیٰ بن نصیر کو جیل میں ڈال دیا۔ کسی سردار کی سفارش پر اسے رہا کر دیا گیا مگر سلیمان بن عبدالملک نے اس پر کئی لاکھ کا تاوان جرمانے کی صورت میں عائد کیا۔ موسیٰ بن نصیر یہ بھاری رقم ادا نہ کر سکا اور اسلام کے اس فرزند نے اپنی زندگی کے باقی ایام نہایت تنگ دستی میں گزارے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر کو آخری بار حجاز کے کسی گاؤں میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

طارق بن زیاد نے فتح اندلس کے بعد اور سلیمان کے تخت نشین ہونے کے بعد اپنی باقی تمام زندگی گمنامی میں گزاری۔ کون جانے وہ عظیم مجاہد کن حالات سے گزرا۔ جبر کے اندھیروں سے لڑنے والوں کے لیے نجاتِ دہندہ بن کر آنے والا شخص خود ان اندھیروں میں گم ہو گیا۔

اور محمد بن قاسم، اسے عجلت میں سندھ سے حجاز بلایا گیا۔ جانے کس گناہ کی بنا پر سلیمان بن عبد الملک کی جانب سے اس مجاہد کو موت کی سزا سنادی گئی۔ کہتے ہیں کہ محمد بن قاسم حجاج بن یوسف سے عوام کی دشمنی کی بھینٹ چڑھا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم کو فرزندِ اسلام ہونے کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس عظیم انسان نے اپنے آخری وقت میں اس قوم پر افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ،

”افسوس! لوگوں نے مجھے کھو دیا۔ اور کھویا بھی کس جوان کو، جو مصیبت کے وقت ان کے کام آئے اور سرحدوں کی مضبوطی کے لیے نہایت مناسب ہو۔“

موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، فاتح سندھ محمد بن قاسم، یہ مجاہدین اگر مزید عرصہ حیات رہتے تو دنیا فتح کر ڈالتے۔ ان کا انجام ایسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان کے ساتھ ظلم ہوا۔ ظلم کے خلاف لڑنے والے اپنے ساتھ ہوئے ظلم کے خلاف لڑ نہ سکے۔ انہیں بے بس کر دیا گیا۔ تصور تو کرو حجاز کے ایک گاؤں میں موسیٰ بن نصیر جیسا عظیم مجاہد بھیک مانگ رہا ہے۔ اندلس کا نجاتِ دہندہ طارق بن زیاد گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو چکا ہے۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے سر پر جلاد کھڑا ہے۔ تمہیں اپنی سانسیں تھمتی محسوس ہونگی سعاد!

ہم وہ قوم ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹا ہے۔ غلامی کی ان زنجیروں کو بہ خوشی اپنے قدموں میں ڈالا ہے۔ ہم وہ ہیں جس نے محمد بن قاسم کے سر پر جلاد کھڑا کیا، طارق بن زیاد کو گمنامی کے اندھیروں میں دھکیلا اور موسی بن نصیر سے اس کی تلوار چھین لی۔ ہم نے اپنی شاہ رگ خود کاٹ دی۔ ہم اپنے قاتل خود ٹھہرے۔ عالمِ اسلام کی تاریخ کا یہ وہ رستا ہوا زخم ہے جس پر مرہم لگانے کی ہر کوشش رائگاں جاتی ہے۔ ہماری مائیں اب محمد بن قاسم جیسے شاہ سوار نہیں جنتیں۔ کوئی طارق اب میدان میں نہیں آتا اور کسی موسیٰ کی تلوار کی گرج اب سنائی نہیں دیتی۔ اب ہر سو سکوت ہے۔ اور اسی سکوت کے پیچھے عذاب ہے، پکڑ ہے۔ ان مجاہدین کی قاتل قوم غالب کیسے رہ

سکتی تھی؟ مسلمانوں پر ایک بار پھر دوسری قومیں مسلط ہونے لگیں۔ اندلس، بغداد، سمرقند، بخارا، عالمِ اسلام کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوا۔ ایسا باب جس کے پہلے صفحے کو مسلمانوں کے خون سے رنگا گیا۔ جبر کے اندھیرے لوٹ رہے تھے۔۔"!

وہ ساکت تھی، بالکل ساکت۔ کوئی جنبش نہیں، لہریں ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ فلک سائبان کیے کھڑا دیا تھا، چاند روشنی میں نہار رہا تھا۔ مگر وہ دونوں وقت میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ سامنے سمندر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور جب اسے لگا تھا کہ کہانی ختم ہونے کو ہے، تو وقت نے پلٹا کھایا اور کہانی پھر وہیں آرکی تھی۔

اور جب قومیں گلنے سڑنے لگتی ہیں۔۔۔

☆☆☆

ایک صبح سان سباستیان میں۔ خوبصورت صبح!

اس نے ہوٹل کی بلند عمارت کی دوسری منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردے ہٹائے تو سامنے ٹھاٹھیں مارتے سمندر نے اسے صبح بخیر کہا۔ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ یہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ اسے سمندر اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کھولی پھر کہنیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکائے سر نیچے جھکایا۔ لوگوں کی چہل پہل اور سیاحوں کا ہجوم سان سباستیان میں ہو چکی صبح کا پیغام دے رہا تھا۔ سامنے ہی خاسمین کے پھولوں کا اسٹال لگا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ اسٹال کے پاس کھڑے لوگوں میں وہ اجنبی بھی کھڑا تھا۔ سینیور زیاد! سیاہ رنگ کی پینٹ شرٹ میں ملبوس، سیاہ پی کیپ سر پر ٹکائے وہ سنجیدگی سے اسٹال پر کھڑے کسی آدمی سے گفت وشنید میں مصروف تھا۔ وہ چند پل وہیں نظریں ٹکائے کھڑی رہی پھر کھڑکی بند کر کے وہاں سے ہٹ گئی۔

وہ فریش ہو کر ہوٹل کی عمارت سے نکل کر آئی تو اس کا رخ اسٹال کی طرف تھا۔ اسٹال کے پاس پہنچ کر اس نے گردو پیش میں نگاہیں دوڑائیں تو اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ تھوڑا آگے بڑھی تو وہ خاسمین ہاتھ میں لیے ایک طرف جا رہا تھا۔ اس نے بھی اسی کی تقلید میں قدم بڑھا دیے تھے۔

وہاں قریب ہی ایک بینچ رکھی تھی۔ بینچ کے کنارے پر سات سالہ ایک بچی اپنی ہیٹ ہاتھ میں لیے چہرہ جھکائے بیٹھی تھی۔ زیاد کا رخ غالباً اس بچی کی طرف ہی تھا۔ وہ بینچ کے پاس آیا اور اس بچی کے قریب بیٹھ گیا پھر پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔

"گراسیا سینیور۔" وہ بچی ہلکا سا مسکرائی۔

"کیا ہوا ہے؟" انداز دوستانہ تھا۔

"نادا۔" اداسی سے جھکا سر مزید جھک گیا۔ خاسمین کا سفید پھول ہاتھ سے لڑھک کر نیچے گر گیا۔

"I found a little sad fairy.."

اس بچی نے آنکھیں پھیلائے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا پھر خوشگوار حیرت سے مسکرائی۔

" Beneath the shade of paper tree.
I know a little sad fairy,
who was blown away by the wind one night!"

وہ دونوں لہک لہک کر ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے۔ زیاد نے مسکرا کر اس بچی کو دیکھا۔

"اس فیری کا نام؟"
"کیتھلین، سینیور"!

"خالد حسینی کے یہ الفاظ کہاں سے سیکھے؟" وہ اس کی گود میں خاسمین کا پھول رکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”موم نے سکھائے ہیں۔ آپ کہاں سے ہیں سینیور؟“ وہ خاسمین کا پھول اپنی ناک کے قریب لے کر گئی پھر گہری سانس لے کر اس کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

”پاکستان۔“ وہ مسکرایا۔ بچی نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔ ”موروز کا ملک ہے۔“ وہ اس کی طرف جھکا تھا۔ بچی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ مور ہیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گیا۔

”راہبہ ہلینا کہتی ہیں کہ موروز سے بات نہیں کرنی چاہیے، وہ گندے ہوتے ہیں۔“

”میں اچھا والا مور ہوں، میرا یقین کرو۔“ اس کے شرارت سے کہنے پر فاصلے پر کھڑی سعاد ہنس دی تھی۔ زیاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر ہلکا سا مسکرا دیا۔

”گڈ مارننگ سینیوریتا۔“

”مارننگ سینیور۔“ وہ بچی کے بائیں طرف بیٹھی۔

”یہ کون ہیں؟“

”سعاد۔“ جواب سعاد کی طرف سے آیا تھا۔

”فیری۔ “I found a beautiful fairy..I know a beautiful fairy.. اس نے سعاد پر نگاہیں ٹکائے مدھم سی سرگوشی کی تھی۔ وہ خوبصورتی سے اس کی سرگوشی کو نظر انداز کر گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے واپس بچی کی طرف متوجہ ہوا۔

”کل بُل فائیٹ دیکھی؟“

”بالکل بالکل۔ کل والا بُل بزدل تھا اور بُل فائٹر، وہ میرا آئیڈیل ہے۔ آپ نے دیکھا اس نے کیسے آخر میں نیزہ بُل

کی گردن کے آر پار کیا تھا۔ وہ حقیقی ہیرو ہے۔" وہ جوش سے کہہ رہی تھی اور سعاد حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زیاد اس کے تاثرات سے محظوظ ہوا تھا۔

"کیتھلین۔" کسی کی کڑکتی آواز سنائی دی۔ کیتھلین نے ایکدم خاموش ہو کر سامنے دیکھا پھر ڈر کر کھڑی ہوئی۔ خاسمین کا پھول اس کی گود سے نیچے گرا۔

"راہبہ۔" اس نے اپنے سر سے سینے تک صلیب کا نشان کھینچا۔ راہبہ نے اسے سخت گھوری سے نوازا۔

"خدا تمہیں ہدایت دے۔" اپنے سینے پر صلیب کا نشان کھینچتے ہوئے زیاد اور سعاد کو گھورا گیا۔ پھر وہ کیتھلین کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔ کیتھلین نے مڑ کر دونوں کو دیکھا پھر اداس مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کی طرف الوداعی ہاتھ ہلا دیا۔

"یہ اپنے بچوں میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت بھر رہے ہیں۔ اتنا ظلم کیوں؟" سعاد نے جھک کر سڑک پر گرے پھول کو اٹھاتے ہوئے غم و غصے سے کہا تھا۔ زیاد نے گہری سانس لی۔

"یہ کیتھولک کافی شدت پسند ہوتے ہیں۔ کچھ ان کے عقائد کا اثر ہے کچھ ماضی کا عمل دخل ہے۔ ان کی بنسبت آرتھوڈوکس عیسائی بہتر ہوتے ہیں۔" وہ گہری سانس لیتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سعاد نے بھی اس کی تقلید کی۔

"آرتھوڈوکس؟ عیسائیت کے بارے میں کیا جانتے ہیں سینیور؟!" وہ اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر قدم بڑھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے مہر منور کی روشنی میں اسے دیکھا۔ ایک نیا قصہ شروع ہونے لگا تھا، ایک نئ کہانی۔

☆☆☆

”الفریڈ ای گاروے، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مقالے ”عیسائیت“ میں لکھتا ہے کہ:

”عیسائیت کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی، موحدانہ اور کفارے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعے پختہ کر دیا گیا ہے۔

اخلاقی مذہب سے اس کی مراد وہ مذہب ہے، جس میں عبادتوں اور قربانیوں کا اصل مقصد کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنا نہ ہو بلکہ ان کا تمام تر تعلق خدا کی رضا اور روحانی کمالات حاصل کرنے سے ہو۔

تاریخی مذہب سے اس کی مراد ہے کہ اس مذہب کا محور فکر عمل ایک تاریخی شخصیت ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

کائناتی مذہب ہونے سے اس کی مراد ہے کہ یہ مذہب کسی خاص رنگ و نسل کے لوگوں کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لیے ہے۔

موحدانہ کا لفظ وہ اس لیے استعمال کرتا ہے کہ عیسائیت میں تین اقانیم کی اصطلاح استعمال کرنے کے باوجود ان کو ایک خدا تسلیم کیا گیا ہے۔

تین اقانیم سے یہاں مراد باپ، بیٹا اور روح القدس ہیں۔ یعنی عیسائیت میں خدا ان تین اقانیم کا مرکب ہے اور اسے ہی عقیدہ تثلیث کہا جاتا ہے۔ اس عقیدے میں بہت سی متضاد باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً بعض عیسائی علماء کے نزدیک تین اقانیم سے مراد باپ، بیٹا اور روح القدس ہیں۔ جبکہ بعض کے مطابق تین اقانیم سے مراد باپ، بیٹا اور حضرت مریم ہیں۔ ظاہر ہوا کہ وہ عقیدہ جو عیسائیت کی بنیاد ہے، اسی عقیدے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں“!

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ سڑک کنارے چلتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ نیلے فلک پر براجمان مہر منور کی تپش کو بادلوں نے زمین پر پہنچنے سے روکا ہوا تھا۔ بادل ایک قطار کی صورت میں ڈھال بنائے آسمان پر بکھرے ہوئے تھے۔ سیاحوں کی آمد ورفت شروع ہو چکی تھی۔ ان سیاحوں میں ہر ایک کی زبان پر بُل فائٹ ہی تھی۔

”باپ سے مراد خدا کی ذات ہے۔ مطلب عیسائی حضرات خدا کو باپ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہے اسی طرح مخلوقِ خدا، خدا کی محتاج ہے۔ اور جس طرح باپ بیٹے پر شفیق اور مہربان ہوتا ہے اسی طرح خدا اپنی مخلوق پر شفیق اور مہربان ہے۔

بیٹے سے مراد باپ کی مطلب خدا کی صفت کلام ہے۔ لیکن یہ انسانوں کی صفت کلام جیسی نہیں ہے بلکہ ایک الگ وجود رکھتی ہے۔ اور خدا کی یہی صفت حضرت عیسیٰ کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یسوع مسیح کو بیٹا کہا جاتا ہے۔

روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور صفت محبت ہے۔ یعنی اس صفت کے ذریعے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت کلیم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے۔

عقیدہ تثلیث کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تین اقانیم شخصیات پر مشتمل ہے۔ خدا کی ذات (باپ)، خدا کی صفت کلام (بیٹا)، باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور صفت محبت (روح القدس)۔ یہ تین اقانیم الگ الگ خدا ہیں لیکن تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوا کہ جب تینوں کو الگ الگ خدا مان لیا تو پھر ایک خدا کیسے ہوا؟

عیسائی علماء نے طرح طرح کی مثالوں اور طرح طرح کے انداز سے اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی

تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ اسی سوال کی بنیاد پر عیسائیت میں کئی فرقے بنے جنہیں بدعتی کہا گیا۔ عیسائی علماء نے آخر میں یہ تک کہہ دیا کہ اگر ہم تینوں اقانیم کو خدا مان لیں تو ہم عقیدہ توحید کو سلامت نہیں رکھ سکتے۔ لہذا بات وہیں اٹک گئی کہ تینوں الگ الگ خدا ہیں مگر تین خدا نہیں ہیں ایک خدا ہے۔

بعض پادری یہ کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن میں کچھ ایسے الفاظ ہیں جن کا انسانی عقل ترجمہ نہیں کر سکتی یا وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ جیسے حرف مقطعات! ان کے معنی صرف اللہ کو معلوم ہیں اسی طرح تین اقانیم کا ایک خدا ہونا، یہ راز بھی خدا کو ہی معلوم ہے۔ مگر ساری بات یہ ہے کہ اسلام میں یہ حرف مقطعات کسی مومن کے بنیادی عقیدے پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ جبکہ عیسائیت میں تو اولین عقیدہ ہی عقیدہ تثلیث ہے۔ جب بنیادی عقیدے میں شکوک و شبہات ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ یہ مذہب سچا ہے؟!" وہ گہری سانس لے کر رکا۔ گردن ذرا سی ترچھی کر کے ساتھ ساتھ برابر برابر چلتی سعاد کو دیکھا جو انگلیوں پر تین ایک ایک تین کرتی، عجیب الجھن کا شکار ہوئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔۔ ہلکا سا۔۔ ذرا سا۔۔

"اس کے بعد ہے عقیدہ حلول و تجسم۔ عیسائی حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ خدا کو اپنے بندوں سے محبت تھی، اس لیے اس نے اپنی صفت محبت کے ذریعے اقنوم ابن کو دنیا میں بھیج دیا، تا کہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔ اہم بات یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک بیٹے (صفت کلام) کو حضرت عیسیٰ میں حلول کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ بیٹا خدائی چھوڑ کر انسان بن گیا۔ بلکہ وہ پہلے خدا تھا اب انسان بھی ہے۔ یعنی اس عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ بیک وقت انسان بھی تھے اور خدا بھی۔ عقیدہ توحید یہاں پر نگلیکٹ ہو گیا۔ اتھاہ سوال یہ ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی شخص مخلوق بھی ہو اور خالق بھی، انسان بھی ہو اور خدا بھی۔ اس سوال کے جواب میں بھی کئی فرقے ابھرے۔ کچھ نے حضرت عیسیٰ کو خدا ماننے سے انکار کر دیا اور بدعتی کہلائے۔ ایک فرقہ پولسی فرقہ کہلایا

جس نے بین بین راستے کا چناؤ کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کو فرشتہ قرار دیا۔

ایک اور ان کا عقیدہ ہے عقیدہ حیات ثانیہ۔ جس کے مطابق حضرت عیسیٰ سولی پر وفات پانے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گئے اور حواریوں کو کچھ ہدایات دینے کے بعد آسمان پر تشریف لے گئے۔

چوتھا اور آخری عقیدہ، عقیدہ کفارہ۔ بعض لوگوں کے مطابق یہ عقیدہ عیسائیت کی جان ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جو ان کے مطابق اپنی پیچیدگی کی وجہ سے غیر عیسائی دنیا میں بہت کم سمجھا گیا ہے۔ اس عقیدے کے مطابق حضرت آدم کو جب اللہ نے جنت میں ہر شے کی آزادی دی اور ایک پھل کھانے سے منع کیا اور جب حضرت آدم نے وہ پھل کھالیا تو وہ گناہ کے مرتکب ٹھہرے۔ یہ گناہ کافی سنگین تھا کیونکہ جب ہر شے کی آزادی تھی تو حضرت آدم کے لیے بجا آوری بڑی آسان تھی۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے بس ایک پھل کھانے سے روکا گیا جس سے رکنا نہایت سہل تھا۔ اور جب یہ بجا آوری سہل تھی تو نافرمانی کا گناہ بھی اتنا ہی سنگین ہو گا۔ ان کے مطابق نافرمانی کئی گناہوں کی جڑ ہے۔ لہٰذا یہ گناہ کئی گناہوں کا مجموعہ بن گیا۔

اب اس سنگین گناہ کی حضرت آدم کو یہ سزا ملی کہ وہ دائمی موت یا دائمی عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ مزید یہ کہ عیسائیوں کے مطابق یہ گناہ حضرت آدم سے ہر انسان میں منتقل ہو گیا۔ تبھی عیسائیت میں یہ عقیدہ ہے کہ ہر انسان گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ خدا اتنا مہربان ہے، وہ کیونکر کسی ایک انسان کے گناہ کا بوجھ پوری انسانیت پر لادے گا؟

اس کے بعد خدا کو یہ منظور نہیں تھا کہ ساری انسانیت اس گناہ کا بوجھ اٹھائے تو اس نے ایک ایسے شخص کو بنایا جو تمام انسانیت کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے اور خود اصلی گناہ سے معصوم ہو۔ اس عظیم مقصد کے لیے خدا نے بیٹے کو چنا۔ اس نے قربانی دی اور اس کی موت تمام انسانیت کے لیے کفارہ ہو گئی۔ لیکن یسوع مسیح کی یہ قربانی صرف

عیسائی حضرات کے لیے ہے یعنی جو ان کی تعلیمات پر ایمان لائیں اور اس کے لیے اصطباغ لینا از حد ضروری ہے۔ وہ بچے جو اصطباغ لینے سے پہلے مر جاتے ہیں خدا نے ان کے لیے جہنم تیار کی ہے۔ وہ جہنم کے اس حصے میں جائیں گے جو مومنوں کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے بنایا گیا ہے اور پھر وہ جنت میں چلے جائیں گے۔"

"عجیب!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ "یہ سب واقعی بہت عجیب ہے۔ بہت زیادہ۔" اس نے جھرجھری لی تھی۔

"ہمیں یہ سب عجیب لگنا بھی چاہیے سینیوریتا! ہمارا عقیدہ یہی رہا ہے کہ حضرت آدم سے گناہ نہیں غلطی ہوئی تھی۔ وہ غلطی جس کی انہوں نے خدا سے معافی بھی مانگی تھی۔ اللہ نے اس دنیا میں انسانوں کو اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے سزا کے طور پر نہیں۔ موت خدا سے ملاقات کا ذریعہ ہے سزا نہیں ہے۔ اللہ کسی ایک انسان کی غلطی کا بوجھ پوری انسانیت پر نہیں ڈالتا۔ ہر بچہ جو اس دنیا میں پہلی سانس لے معصوم ہوتا ہے جب تک کہ وہ عقل والا نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے کسی معصوم شخص پر ظلم نہیں کرتے وہ تو رحمن ہیں اور رحیم! اللہ نے جہنم مومنوں کے گناہوں کو پاک کرنے کے لیے نہیں، بطور سزا بنائی ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ وہ دونوں رک گئے۔ اس کے ہاتھ میں موجود خاسمین کے پھول کی بھینی بھینی خوشبو نے ان کے گرد حصار قائم کیا تھا۔ زیاد نے بینچ کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کا کہا۔ اس کی ٹانگیں مسلسل چلنے کی وجہ سے شل ہو چکی تھیں لہٰذا وہ فوراً سے پیشتر بیٹھ گئی۔

"موجودہ عیسائیت وہ عیسائیت نہیں ہے، جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے دی۔ موجودہ عیسائیت کا بانی پولس نامی ایک شخص ہے جو پہلے یہودی تھا اور جس نے بعد میں دعویٰ کیا کہ دوران سفر اس نے آسمان پر یسوع مسیح کو دیکھا اور پھر وہ ان پر ایمان لے آیا اور حواریوں کے ساتھ تبلیغ دین کا کام سرانجام دیتا رہا۔ بعد میں جب اس نے دین کی

تعلیمات میں ردوبدل کرنا شروع کی تو حواریوں نے اس سے تعلق ختم کرلیا۔

خود عیسائی علماء بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ پولس نے حضرت عیسیٰ کی تمام تعلیمات کو مسخ کرڈالا اور موجودہ عیسائیت کا بانی وہی ہے۔

لوئی وینک لکھتے ہیں کہ:

"اگر پولس نہ ہوتا تو عیسائیت یہودی مذہب کا ایک فرقہ بن جاتا اور کوئی کائناتی مذہب نہ بنتا۔"

پولس کے سوانح نگار، جیکسن لکھتے ہیں کہ:

"اور اگر پولس نہ ہوتا تو عیسائیت مختلف ہوتی، اور اگر یسوع نہ ہوتے تو عیسائیت ناممکن تھی۔"

مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ "موجودہ عیسائی مذہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، وہ تمام تر پولس کی ایجاد ہے۔ اس بنا پر اس کا صحیح نام "عیسائیت" کے بجائے "پولسیت" ہے۔

عقائد کے بعد صلیب کا نشان آتا ہے، جسے عیسائی حضرات نہایت عزت دیتے ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی تک اس نشان کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ اسے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ شاہ قسطنطین کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ اپنے ایک حریف سے جنگ کے دوران اس نے غالباً خواب میں آسمان میں صلیب کا نشان بنا دیکھا اور پھر بعد میں اس کی والدہ سینٹ ہلینا کو ایک صلیب ملی جس کے بارے میں لوگوں کا قیاس تھا کہ یہ وہی صلیب ہے جس پر حضرت عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی۔ اس کی یاد میں عیسائی حضرات تین مئی کو ایک جشن مناتے ہیں، جس کا نام ہے "دریافت صلیب"۔

اس کے بعد عیسائیت میں فرقے!

تین سے زائد ہیں ویسے تو مگر عصرِ حاضر میں اہم تین ہیں۔ آرتھوڈوکس یہ روس والے، کیتھولک ہسپانیہ،

اٹلی، فرانس اور تقریباً آدھے یورپ میں یہی ہیں اور پروٹسٹنٹ۔ امریکہ، انگلینڈ، جرمنی، ڈنمارک یہ سب تقریباً اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مغربی کلیسا جسے رومن چرچ بھی کہتے ہیں یہ کافی اثر ورسوخ رکھتا ہے۔ پوپ، بشپ یہ سب یہیں سے ہوتے تھے۔ پوپ کو یہاں تک اختیارات دیے گئے تھے کہ وہ مذہبی عقائد میں بھی ردوبدل کر سکتا تھا۔ انہی عقائد کے مسئلے میں مشرقی کلیسا مغربی کلیسا سے الگ ہوا اور آرتھوڈوکس وجود میں آیا۔ اسی طرح پروٹسٹنٹ بھی چند عقائد کی بنیاد پر کیتھولک چرچ سے الگ ہوئے۔ کیتھولک میں شدت پسندی پائی جاتی ہے، عظیم مثال ہسپانیہ ہے۔ آرتھوڈوکس کی تعلیمات حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے قریب قریب ہیں لیکن مکمل وہی نہیں ہیں۔ امریکہ اور انگلینڈ والوں کا حال تمہارے سامنے ہے۔" اس نے ہاتھوں پر غیر موجود مٹی جھاڑی۔ گویا پیسہ ختم کھانا ہضم، اب اٹھ جائیں۔

"ٹوبی آنیسٹ مگر میں ابھی تک تین ایک ہیں۔ تین تین ہیں لیکن تین تین نہیں تین ایک ہیں، پر اٹکی ہوئی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زیاد ہنس دیا تھا۔ بادلوں کی اوٹ سے مہر نے ذرا سا چہرہ نکالا اور پھر چھپ گیا۔ خاسمین کی خوشبو، خنک ہوا، سمندر کا شور، سان سباستیان کی حسین صبح۔

☆☆☆

"تمہارا شکریہ، سینیور زیاد۔" سینڈوچ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے زیاد نے رک کر اسے دیکھا۔

"کس لیے؟"

"شاید، مجھے معلومات فراہم کرنے کے لیے اور شاید ایک اچھا گائیڈ ثابت ہونے کے لیے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"تمہارا بھی شکریہ۔" سعاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "شاید، یہاں آنے کے لیے۔ اور شاید مجھے ہائر

کرنے کے لیے۔ تم نہ ہوتیں تو شاید میں لوٹ جاتا۔" سعاد نے رک کر اسے دیکھا۔ زیاد نے نگاہوں کا رخ موڑ لیا۔

"تم نہ ہوتے تو شاید میں بھی لوٹ جاتی۔ تم جانتے ہو میں بس ضد میں یہاں آئی ہوں، مجھے اکیلے سفر کرنے کا تجربہ نہیں ہے۔ اگر اس شام تم نہ ملتے تو کون جانتا تھا میں اگلی فلائٹ سے ہی واپس چلی جاتی، بنا اندلس کو دیکھے۔"

"تو مطلب ہم دونوں ایک دوسرے کے شکر گزار ہیں؟ اس خوشی میں تمہارا بل میں پے کروں گا اور میرا تم۔"

اس کے مسکرا کر کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

"تمہیں کتنے دن ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے؟"

"تمہارے آنے سے دو دن پہلے آیا ہوں۔ مالاگا اور میڈرڈ کی سڑکوں پر آوارہ گردی کی ہے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"تم نے مجھے مالاگا نہیں دکھایا!" اس نے بچوں کی طرح منہ بنایا۔

"کیونکہ ہمیں بُل فائٹنگ دیکھنی تھی سان سباستیان میں۔ اور تمہارا احسان مند ہوں کہ تجربہ بہت اچھا رہا۔" اس نے جل کر کہا تھا۔ سعاد نے ایک ادا سے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"ہم مشرقی لڑکیاں ذرا نرم دل ہوتی ہیں۔"

"اور ہم مشرقی لڑکے سنگلاخ چٹانوں سے سخت ہوتے ہیں۔" وہ کیوں پیچھے رہتا؟

"واقعی؟ تم مشرقی لڑکے ہار جاتے ہو۔" اعتماد سے کہتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ نے اپنا حصار باندھا تھا۔

"اور ذرا بتانا پسند کریں گی، کس سے؟!" وہ دائیں کہنی میز پر ٹکاتا آگے کو جھکا۔ وہ بھی دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتی آگے ہوئی۔ "ہم مشرقی لڑکیوں سے۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"وہ اس لیے کہ ہم مشرقی لڑکے ذرا غیور ہوتے ہیں۔ ہم جن کے محافظ ہوتے ہیں، ان کا ہارنا ہماری غیرت پر وار

کرتا ہے۔" وہ کھکھلا کر ہنس دی تھی۔

"اور پھر تم غیور مشرقی لڑکوں کی اس غیرت کو تمہاری مشرقی مائیں زن مریدی کا نام دیتی ہیں۔" وہ گردن گرا کر ہنسی تھی۔ زیاد برے برے منہ بناتا پیچھے ہٹا تھا۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھی، بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کناروں پر ہلکی سی سلوٹیں سی نمودار ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں اب پانی جمع ہونے لگا تھا۔ وہ دانتوں سے لب کاٹتا اسے دیکھتا رہا۔

"سینیوریتا سعاد"!

"کہیے سینیور زیاد۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہا تھا اور پھر اس کے لال ہوتے کانوں کو دیکھ کر وہ پھر ہنس دی تھی۔ "تمہیں غصہ آ رہا ہے۔" ہنستے ہوئے اسے اطلاع دی گئی۔

"میرے کانوں پر مت جائیں یہ غیرت سے لال ہو رہے ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا پھر اپنی پی کیپ اتار کر میز پر رکھی۔ اسے اب گرمی لگنے لگی تھی۔

"او کے او کے۔ اب نہیں ہنس رہی، غیور مشرقی لڑکے!" اس نے غیور مشرقی لڑکے پر زور دے کر کہا۔ زیاد نے گردن ترچھی کر کے اسے نظر انداز کیا۔ وہ مسکراہٹ دباتی کافی کی طرف متوجہ ہوئی۔ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ وقفے وقفے سے سینیور زیاد کو دیکھ رہی تھی جو ہنوز چہرہ ترچھا کر کے بیٹھا تھا۔ ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اپنے آپ کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔ غیور مشرقی لڑکا!

"اچھا ناں بس، ہو گیا اب۔ اتنا برا منہ بنا کر تو مت بیٹھو۔ مجھے پھر سے ہنسی آ رہی ہے۔" زیاد نے چہرہ اس کی طرف موڑ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا جو دانتوں سے لب کاٹتی اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آج رات ہم سان سباستیان میں ہی گزاریں گے۔ تم لمبے سفر سے آئی ہو، کل بھی سفر کیا تھا۔ آج آرام کرو۔ پھر

کل رات قرطبہ جانے والی ٹرین پکڑیں گے۔" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر اس کی بات پر سعاد نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"میں واقعی بہت تھک گئی ہوں۔ سان سباستیان میں کوئی ایسی جگہ جہاں ہم شام کو چلیں؟" کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے زیاد نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"امم۔۔۔ہاں!" اس کے ذہن میں کوئی خیال کوندا تھا۔ یہ انتقام کا وقت تھا، غیور مشرقی لڑکے کے انتقام کا۔ اور پھر وہ سعاد کو دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا۔ "ہم ضرور چلیں گے۔ تمہارے لیے سرپرائز ہے۔" سعاد نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں چھوٹی کیے مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر ذرا سا سر جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کی پشت پر لٹکی جیکٹ اٹھائی اور بازو پر ڈالی۔ "شام میں ملتے ہیں پھر۔"

"کہاں جارہے ہو؟"

"تمہارے لیے سرپرائز تیار کرنے۔" وہ شرارت سے مسکراتا باہر نکل گیا۔ سعاد گردن گھما کر مشکوک نگاہوں سے اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔ وہ کچھ گڑبڑ کرنے جارہا تھا، اس کے انداز سے ہی لگ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھی جب کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ اس نے کسمسا کر ذرا سی آنکھیں کھولیں اور پھر نیند خراب ہونے پر برے برے منہ بناتی اٹھ بیٹھی۔ کمر پر گرے لمبے سیاہ بالوں کو جلدی جلدی جوڑے میں باندھ کر دوپٹہ اٹھا کر سر پر ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

”جی کہیے؟“ اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر سامنے کھڑی ورکر سے پوچھا۔

”آپ کے لیے کال آئی ہے۔“

”میرے لیے؟ کون ہے؟“ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”انہوں نے نام نہیں بتایا بس آپ کو بلایا ہے۔ جلدی آجائیں پلیز۔“ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر دروازہ بند کر دیا۔ اگلے دس منٹ میں وہ نیچے جانے کے لیے مکمل تیار تھی۔ ہلکے مہرون رنگ کے عبائے میں ملبوس سفید رنگ کا حجاب چہرے کے گرد اوڑھے اس نے ایک طائرانہ نگاہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر ڈالی پھر جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے کی طرف بڑھی تھی۔ لفٹ سے نکل کر جب وہ نیچے آئی تو کاونٹر پر فون پکڑ کر کھڑے لڑکے نے شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آپ نے بہت دیر کی سینیوریتا۔“ اس نے جواباً کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے فون اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگایا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ موبائل کہاں ہے آپ کا؟“ دوسری طرف سے زیاد کی آواز سن کر اس نے سکون کی سانس خارج کی تھی۔

”بند پڑا ہے، نام تو بتا دیتے میں ڈر گئی تھی۔“ اس نے شکایت کی تھی۔

"اپنا نمبر بتائیں اور موبائل آن کریں۔ لوکیشن بھیج رہا ہوں فوراً پہنچیں۔" وہ عجلت میں تھا تبھی شاید اس کی دوسری بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔

"میں، آن نہیں کروں گی۔ آپ کوئی اور طریقہ ڈھونڈ لیں۔" دونوں طرف سے اچانک آپ آپ کی گردان شروع ہو گئی تھی۔

"سینیوریتا! ضدمت کریں براہِ مہربانی۔" اس نے التجا کی تھی۔

"سینیور میں منع کر رہی ہوں ناں! آپ مجھے لوکیشن سمجھا دیں میں ٹیکسی ڈرائیور کو بتا دوں گی۔" دوسری طرف وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر اسے راستہ سمجھا کر دس منٹ کے اندر اندر پہنچنے کا حکم سنا کر فون بند کر دیا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے سامنے کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کو دیکھا۔

"کوئی مسئلہ ہے سینیوریتا؟" لڑکا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ابھی میں راستہ دہرا رہی تھی۔ آپ نے سنا؟!" اس لڑکے نے کم فہمی سے اسے دیکھا پھر سر نفی میں ہلا دیا۔ اس نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا۔ "پتہ نہیں کیا الا بلا بتایا تھا۔" لڑکے کو اس کی حالت پر ہنسی آئی تھی جسے وہ فوراً رخ موڑ کر چھپا گیا تھا۔

اور وہی ہوا تھا جس کا سینیور زیاد کو ڈر تھا۔ وہ دس منٹ کے بجائے دو گھنٹوں بعد مقررہ مقام پر پہنچی تھی۔ ڈرائیور نے کرایہ چار گنا زیادہ مانگا تھا کیونکہ وہ اسے پورا سان سباستیان گھما چکی تھی۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اپنے روبرو کھڑے زیاد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے سنجیدگی سے اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

"کرایہ۔ میں جلدی جلدی میں ہینڈ بیگ بھول گئی۔" اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بمشکل اس کی منمناہٹ سن پایا تھا۔

"کتنا؟"

"پانچ یوروز۔" جھکا سر مزید جھکا تھا۔ وہ جیکٹ کی جیب سے بٹوہ نکالتا آگے بڑھ گیا۔ ٹیکسی والے کو فارغ کر کے جب وہ واپس آیا تو وہ وہیں اسی حالت میں کھڑی تھی۔ "آئی ایم سوری۔" وہ گہری سانس خارج کرتا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ڈر کیوں گئی تھیں؟" مطلب اس نے عجلت میں بھی اس کی بات دھیان سے سنی تھی۔ غلط ہوا تھا!

"مجھے لگا بھائی کی کال ہے۔" وہ معصومیت سے پلکیں جھپکاتی کہہ رہی تھی۔

"تو بھائی سے ڈرنا کیوں؟"

"کیونکہ۔۔۔ بھئی بتایا تھا ناں لڑ کر آئی ہوں۔ موبائل بند کیا ہوا ہے۔ اسے پتہ بھی نہیں ہے میں زندہ سلامت اندلس پہنچی بھی ہوں کہ نہیں اور بالفرض پہنچ بھی گئی ہوں تو آگے کیا حال ہیں؟ اب ظاہر ہے، ہے تو چھوٹا لیکن ہے تو بھائی ناں؟! کھڑے کھڑے سنا دے گا اس عقلمندی پر!" اس نے برے برے منہ بناتے ہوئے بات مکمل کی۔ زیاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم اس بے چارے کو اتنا تنگ کر رہی ہو؟ صرف غصے کی وجہ سے؟"

"بے چارہ مت کہو اسے، لڑ پڑوں گی!" اسے آگاہ کیا گیا۔ "ایک نمبر کا جنگلی خر ہے۔ خود بتاؤ بہن کو چھوڑ کر محترم یو کے جا رہے ہیں، اس وقت خیال نہیں آیا تھا کہ بہن اکیلی ہو گی پیچھے؟" وہ لڑاکا خواتین کی طرح کمر پر ہاتھ باندھے غصے سے کہہ رہی تھی۔

"تم بہن بھائی کی لڑائی میں مَیں نہیں پڑ رہا۔ چلو اب۔" وہ جھرجھری لیتا آگے بڑھ گیا۔ سعاد نے غصے سے اس کی پشت کو گھورا پھر اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

"میں اس پر نہیں بیٹھوں گی۔" اس نے گویا اعلان کیا۔

"کیوں نہیں بیٹھو گی؟" سوال کیا گیا۔

"ڈر لگتا ہے بھئی۔ ایسے کیسے بیٹھ جاؤں۔" اس نے سر تا پیر اپنے سامنے کھڑے گھوڑے کو دیکھا۔ سفید رنگ کا خوبصورت سا گھوڑا جس کے لمبے سفید بال گردن پر ترتیب وار پھیلائے گئے تھے اور جو دائیں جانب سے اس کی گردن کو ڈھک چکے تھے۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں بالکل سیاہ۔ ان سیاہ آنکھوں میں ڈبڈباتا پانی عجب فسوں سا قائم کر رہا تھا۔ وہ چند لمحے اس خوبصورت گھوڑے کو دیکھے گئی جس کی لگام زیاد کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اس نے زیاد کو دیکھا جو دوسرے ہاتھ سے عربی نسل کے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا۔

"دیکھو ہم اس پہاڑ کی چوٹی تک جائیں گے اور پھر واپس آجائیں گے۔ میں نے کرایہ بھرا ہے کرایہ! ہم چل رہے ہیں۔" وہ حکم جاری کرتا ایک ہی جست میں گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا۔ وہ حیرت سے اس کی پھرتی کو دیکھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرصے سے اس کا عادی رہا ہو، جیسے اس نے کئی سفر گھوڑے کی پیٹھ پر طے کیے ہوں۔

"چلیں سینیوریتا۔" اس نے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا پھر گھوڑے کو۔ اور پھر اگلے ہی لمحے وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔ یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں تھا، اسے اب اندازہ ہوا۔ زیاد نے اسے لگام پکڑائی پھر اپنے گھوڑے کا رخ پہاڑ کی طرف کیا۔

"گھوڑا اگر ادھر ادھر جانے لگے تو صحیح سمت کی طرف لگام کھینچنا۔ مثلاً دائیں جانب جانا ہو تو دائیں طرف لگام کھینچنا۔ ٹھیک ہے؟" وہ اس کی ہدایت پر اچھے بچوں کی طرح سر ہلا گئی۔ زیاد نے ایک مسکراتی نگاہ اس کے ڈرے ڈرے چہرے پر ڈالی پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا برق رفتاری سے سرسبز پہاڑ کی طرف بھاگا تھا۔ تیز ہوا نے اس

کے گرد حصار قائم کیا تھا۔ بال اڑ کر ماتھے پر بکھر گئے تھے۔ اس نے لگام بائیں ہاتھ میں پکڑ لی۔ گھوڑا اونچی نیچی ڈھلوانوں کو پار کرتا بلندی کی طرف بڑھنے لگا۔ بلندی پر چڑھتے ہوئے اسے لگا کہ، آسمان اس کی طرف جھکا چلا آرہا ہے۔ گویا کوئی جادو ہو، کوئی سحر ہو، کوئی کشش ہو۔

پستی سے نگاہ اٹھائی جائے تو بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک گھڑ سوار، نیلے سائبان تلے بلندی کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ اور پھر وہ رک گیا۔ لگام کھینچ لی گئی۔ کسی احساس کے تحت اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے گھوڑے کا رخ موڑا اور نیچے کی طرف آنے لگا۔ ڈھلوان سے گزر کر جب وہ نیچے آیا تھا تو وہ آنکھیں بند کیے اسی حالت میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔ اس کی آمد پر، گھوڑے کے ذرا سے بدکنے پر بھی اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ وہ مسکرایا پھر اپنا گھوڑا اس کے گھوڑے کے برابر میں کھڑا کیا۔ اس کے گھوڑے کی پیٹھ سہلائی اور اتنی زور سے اسے تھپکا کہ گھوڑا اچانک بدک کر پوری رفتار سے بھاگا تھا۔ سعاد کی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ زیاد نے اپنے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور جس راستے سے واپس آیا تھا اسی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی سماعت سے ٹکراتی سعاد کی چیخیں اسے بہرا کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

”سینوریتا آنکھیں کھولیں۔ آپ زندہ ہیں۔“ تیز ہوا کی وجہ سے اور اپنی چیخوں کی وجہ سے وہ بمشکل اس کی آواز سن پائی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو اپنے اور پہاڑ کی چوٹی کے درمیان بہت کم فاصلہ پایا۔ زیاد پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا اور اب گھوڑے کا رخ شہر کی طرف موڑ چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی پھر گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑیں۔ گھوڑا اپنی اسی رفتار سے چلتا چوٹی پر پہنچا۔ اس نے شہر کی طرف رخ کر کے لگام کھینچ لی۔ زیاد نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

”تم رو رہی ہو؟“ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ چہرہ لال پڑ چکا تھا۔ نگاہوں میں خفگی ہی خفگی

تھی۔

"مسلسل چیخنے کی وجہ سے ہے۔" لہجے سے خفگی ہی خفگی جھلک رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"سامنے دیکھو۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ نمی کو پیچھے دھکیلا پھر نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے لگا سب تھم چکا ہے۔

اس کے سامنے تین پہاڑوں کے درمیان گھرا اسان سباستیان تھا۔ درمیانے پہاڑ پر وہ کھڑے تھے۔ پہاڑوں نے سبز چادر اوڑھ رکھی تھی۔ شہر ذرا سی شام ڈھلنے پر برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا تھا۔ مدھم ہوتا نیلا آسمان شہر کی طرف جھکا ہوا تھا۔ شہر کی سیدھ میں میلوں پر پھیلا بے کراں بحر تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا سمندر، مطلق العنان موجیں۔ اک ساحر کا سحر تھا کہ جس نے اسے مسحور کیا تھا۔ خاموشی خاموشی، ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اور سمندر کی بدولت ذرا سی نم نم سی فضا۔

کچھ چیزوں اور لوگوں سے محبت نہیں ہوتی لیکن مجبور کر دیا جاتا ہے۔ ہر سانس قرض لے لی جاتی ہے۔ وہ قرض، جو جان دے کر چکایا جائے۔

☆☆☆

قرطبہ، قدیم رومی شہر۔

قرطبہ کو ایسی اداس اور حسین عورت سے تشبیہہ دی جاتی جس کے حزن کا سبب کوئی نہیں جانتا۔ قرطبہ دُور افتادہ اور تنہا۔

قرطبہ، عبدالرحمن الداخل۔

"عہد بنو امیہ۔ سن 756 عیسوی۔ ایک نوجوان شہزادہ جس کے گرد و پیش میں اس تاریک رات کی تاریکی اپنے پنجے

گاڑ چکی تھی کہ جب شاہی خاندان کو دمشق میں قتل کر دیا گیا۔ وہ شہزادہ جو بمشکل اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگا تھا، آج کسی فاتح کی مانند قرطبہ کے ایک پہاڑ کی چوٹی سے نمودار ہوا تھا۔

سن 750 عیسوی کی اس رات جب شاہی خاندان کا قتل عام ہوا، اور وہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا تو اس وقت اس کے ساتھ اس کا بھائی یحییٰ اور ایک غلام بدر کے سوا کوئی نہ تھا۔ عبدالرحمن، اس کی سماعت سے اپنے خاندان کی چیخیں ٹکرا رہی تھیں فریادیں تھیں، ماؤں کے آنسو تھے اور وہ کتنا بے بس تھا۔ وہ ان سب کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا، بہت پیچھے جہاں اب سب ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ عبدالرحمن نے پہلے فلسطین کا رخ کیا، پھر مصر کا اور اس کے بعد بے سروسامانی کی حالت میں وطن کی تلاش میں پھرتا رہا۔ دوسری جانب عباسی امویوں کا دمشق اجاڑ رہے تھے۔ دارالخلافہ بغداد منتقل کیا جا رہا تھا۔ عبدالرحمن جو در در بھٹک رہا تھا، کسی پر اپنی اصل شناخت بھی ظاہر نہیں کر سکتا تھا مبادا کہیں کوئی عباسیوں کا جاسوس نہ نکل آئے۔ عالمِ اسلام میں امویوں کا سفید پرچم اتار کا عباسیوں کا سیاہ پرچم لہرایا جا رہا تھا۔ فلسطین کے ایک مقام پر حکومتی کارندوں نے اسے جا لیا اور اس جھڑپ میں اس کا بھائی یحییٰ مارا گیا۔ جبکہ غلام بدر اور عبدالرحمن بھاگنے میں کامیاب ٹھہرے۔ اندھیری رات میں ان کے قافلے کو جس راہ کی طرف اک ذرا سی روشنی کی جھلک دکھائی دی وہ راہ افریقہ کی طرف جاتی تھی۔ اس نے گھوڑوں کا رخ افریقہ کی جانب کر دیا۔"

اس نے سر سیٹ کی پشت پر ٹکا لیا۔ آنکھیں موند لیں۔ سعاد نے کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائیں تو ہر منظر کو کاٹ کر بھاگتی ٹرین کی تیز رفتاری کے سوا وہ کچھ محسوس نہ کر سکی۔ چاند کے نمودار ہوتے ہی وہ سان سباستیان سے قرطبہ جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔ اور اب اسے لگنے لگا تھا کہ یہ ٹرین آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہی ہے۔ بہت پیچھے، عبدالرحمن کے دور میں۔ وہ عبدالرحمن کے عبدالرحمن سے امیر عبدالرحمن الداخل ہونے تک

کے سفر میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ ٹرین کی رفتار مزید بڑھی۔ وہ مزید پیچھے جانے لگے۔

”عبد الرحمن کی رگوں میں شاہی خاندان کا خون دوڑتا تھا۔ اقتدار جن کو وراثت میں ملتا ہے۔ اس کے چچا کے یہ الفاظ اس کے دماغ پر دستک دینے لگے تھے:

”ایک بڑی آزمائش کے بعد نوجوان عبد الرحمن ہی بنو امیہ کی شان و شوکت دوبارہ زندہ کرے گا۔“

افریقہ میں اسے مسلمانوں کی اندلس کی طرف پیش قدمی کی خبریں موصول ہوتی رہتی تھیں۔ اس نے بدر کو اندلس روانہ کیا۔ بدر وہاں سے دلچسپ خبریں لے کر لوٹا۔ اندلس کی گورنری اس وقت امیر یوسف الفہری کے پاس تھی۔ عرب قبیلہ قیس عیلان اس کا اتحادی تھا۔ یہ صورت حال عبد الرحمن کی اقتدار کی راہ ہموار کر سکتی تھی۔ عبد الرحمن نے کچھ باغیوں کی حمایت حاصل کر لی۔ بیشتر باغی تیزی سے اس کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جو بنو امیہ کے وفادار تھے اور کچھ وہ جو موجودہ امارت سے غیر مطمئن تھے۔ وہ امیر عبد الرحمن الداخل کہلایا جانے لگا۔

اگلے ایک سال میں عبد الرحمن بڑی حد تک فوج جمع کر چکا تھا۔ 756ء میں اس کی ملاقات امیر یوسف الفہری سے قرطبہ کے محاذ پر ہوئی۔ یہ نڈر کمانڈر قرطبہ کے اس محاذ پر فاتح ٹھہرایا اور عبد الرحمن اول کہلایا جانے لگا۔ پچیس سال کے اس نوجوان امیر کے پاس اپنا کوئی جھنڈا تک نہ تھا جسے فتح پر لہرایا جاتا اور پھر لشکر کے کسی سپاہی نے اپنا سبز عمامہ اتارا اور فضا میں لہرا دیا۔

عباسیوں سے امیر الفہری کی شکست برداشت نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے عبد الرحمن کے قتل کے لیے بن مغیث کی سرکردگی میں ایک لشکر اندلس کی طرف روانہ کیا۔ بن مغیث متعدد شہروں کو زیر کرتا قرمونہ کی فصیلوں تک پہنچ گیا۔ عبد الرحمن اس وقت قرمونہ کے القصر میں محصور تھا۔ محاصرہ تنگ ہوتا گیا یہاں تک کہ بن مغیث کو یقین

ہو گیا کہ عبد الرحمن اور اس کے ساتھی ہتھیار ڈال دیں گے۔ ایک شب عبد الرحمن نے بہادری اور جرات کا مظاہرہ کرتے اپنے دادا ہشام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی تلوار کی میان توڑ کر الاو میں پھینک دی اور میدان میں آ کھڑا ہوا۔ وہ اس جرات و بہادری سے لڑا کہ بن مغیث کی پوری فوج ہراساں ہو کر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ عبد الرحمن نے بن مغیث اور عباسی خلیفہ المنصور کے چند سرداران کے سر قلم کر کے حج کے موقع پر خلیفہ کو بھجوائے۔ سیاہ چادر میں لپٹے ان سروں کو جب دوران طواف المنصور کے قدموں میں ڈالا گیا تو اس نے بن مغیث کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے کہ میرے اور قریش کے اس عقاب کے درمیان سمندر حائل ہے“!

اس کے بعد عبد الرحمن الداخل کو ”صقرِ قریش“ یعنی قریش کا باز، کا لقاب دیا گیا۔“

وہ رک گیا۔ وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تخیل سے نکل کر کسی مصور کی مصوری کی طرح اس چٹیل میدان کا منظر لہرا رہا تھا، جہاں ہر جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک بڑی فوج قریش کے عقاب کو اونچی لمبی اڑان بھرتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور پھر دوران طواف المنصور کے قدموں میں اس کے سرداران کے سر گرا دیے گئے۔

”شکر ہے کہ میرے اور قریش کے اس عقاب کے درمیان سمندر حائل ہے!“ اتنا خوف، اتنی بہادری؟ اتنی جرات و استقامت؟ کیسے؟!!

”بقاء اور امارت سے فرصت ملی تو عبد الرحمن نے بنو امیہ کے اس درخت کو پانی دینے کا سوچا جس کی دمشق سے اکھاڑی گئی جڑوں کو عبد الرحمن نے اندلس کی زرخیز مٹی میں ڈھانپ دیا تھا۔ اس نے پتھریلے پہاڑوں اور بنجر وادیوں سے گھرے قرطبہ کو ”اموی دمشق“ بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ قرطبہ کو انتظامی و جمالیاتی خوبیوں کا مرکز بنانا

چاہتا تھا۔ ایسا مرکز جس کی شاخیں پورے اندلس میں پھیل جائیں۔ عبد الرحمن اول نے سب سے پہلے شہر کے انتظامی ڈھانچے پر توجہ دی۔ شاہراؤں کے جال بچھائے گئے، پل تعمیر کیے گئے۔ مساجد اور مدارس قائم کیے گئے۔ پانی کی فراہمی کا موثر نظام بنایا گیا۔ دمشق اور شامی پیڑ یہاں اگائے گئے۔ زیتون، کینو، لیموں وغیرہ کی بھرپور کاشت کی گئی۔ اس بے آب و گیاہ مغربی خطے کی گویا تقدیر بدل دی گئی۔

اندلس کا شہر اشبیلیہ جو بعد میں Seville کہلایا، شام کے شہر حمص سے اس قدر مشابہ تھا کہ شاعروں نے اسے "اندلس کا حمص" کہا ہے۔ بعد میں جب کبھی اندلس کے مسافروں نے مشرق کا سفر کیا، انہیں اس بات پر خوشگوار حیرت محسوس ہوئی کہ شامی شہر انہیں اپنے گھر کی یاد دلاتے تھے۔ عبد الرحمن نے دمشق میں واقع ایک باغ کی یاد میں دارالحکومت میں ایک وسیع و عریض باغ تعمیر کروایا جس کا نام "الرصافہ" رکھا۔ یہیں پر عبد الرحمن نے اپنے ہاتھوں سے اندلس میں پہلا کھجور کا درخت لگایا۔ اس تنہا کھجور کے درخت کو دیکھ کر عبد الرحمن نے جو اشعار کہے وہ آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

تبدت لنا وسط الرصافہ لغنۃ

تنات بارض الغرب عن بلد النخل

رصافہ کے وسط میں کھجور کا ایک تنہا درخت نظر آیا جو نخلستان کی آبادی سے جدا ہو کر مغربی زمین میں آ گیا ہے۔

فقلت شبیھی بالتغرب والنوی

وطول اکتناج مق بنی وان اھلی

میں نے اس سے کہا کہ تو غریب الوطنی، جدائی اور بال بچوں سے طول و فراق میں میرے مشابہ ہے۔

نشات بارض انت فیہ غریبہ
فمثلک فی الانصاء والمتنای مثلی

تو نے ایسی سرزمین میں نشو نما پائی جہاں تو بالکل ہی پردیسی ہے۔ میری مثال اپنے وطن سے دور دراز مقام پر جدا کیے جانے پر تیری مانند ہے۔

سرخ بالوں والے اموی شہزادے عبدالرحمن جس کے بالوں کی دولٹیں ہمیشہ اس کے چہرے پر جھولتی تھیں، اس عظیم فاتح نے ایک شاندار محل کی بنیاد رکھی جس کا نام دمشق محل تھا۔ باوجود اس کے کوئی عمارت، کوئی باغ اس کے اسلاف کی تعمیرات کے ہم پلہ نہ ہو سکا۔ اور بالآخر 786 عیسوی میں اس نے عظیم تاریخی مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی۔ اس عظیم تاریخی مسجد کی بنیاد اس قدیم عمارت کی محرابوں اور ستونوں کی یاد میں رکھی جس سے محبت عبدالرحمن کے اموی خون میں دوڑ رہی تھی۔ اس کے اسلاف کی مسجد، مسجد امیہ!" وہ مسکرایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک نمودار ہوئی تھی۔ وہ چمک جو آنکھوں میں تیرتی نمی کے ساتھ ڈبڈباتے ہوئے اچانک ابھری تھی۔ اس نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے نگاہیں کھڑکی کے پار نظر آتے منظر پر ٹکائیں۔ اندھیری رات کا اندھیرا اس عروج تک پہنچ چکا تھا جہاں سے زوال کا آغاز ہوتا تھا۔ وہ عین عروج و زوال کے در پر کھڑے تھے۔

"تعمیر کی غرض سے عبدالرحمن الرصافہ چھوڑ کر قریبی القصر میں آ ٹھہرا۔ القصر ان محلات کو کہتے ہیں جہاں اس وقت کے بادشاہ سکونت اختیار کرتے تھے۔ عبدالرحمن روزانہ دو گھنٹے مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کی طرح کام کرتا۔ اپنی پیٹھ پر اینٹیں اٹھاتا۔ اس صقرِ قریش نے عرب کے صحراؤں میں پھوٹنے والے اس نور کی یاد تازہ کر دی تھی جنہیں رب العالمین نے رحمت العالمین کے لقب سے نوازا۔

ابھی مسجد کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ہر جگہ ملبے کا ڈھیر تھا۔ عبدالرحمن کو اندازہ تھا کہ اس کے پاس وقت بہت

کم ہے۔ چنانچہ حکمِ افتتاح جاری کر دیا گیا۔ ملبہ کے ڈھیروں کو پردوں سے چھپایا گیا۔ فرش پر قالین بچھائے گئے۔ سفید قبا پہن کر سرخ بالوں والے عبدالرحمن نے مسجد کے محراب میں کھڑے ہو کر خطبہ و نماز کی ادائیگی کر کے مسجد کے افتتاح کی سعادت حاصل کی۔ اس کے چند روز بعد تیس دسمبر 788 میں عبدالرحمن کا انتقال ہو گیا۔ اس کی نماز جنازہ مسجد قرطبہ میں پڑھائی گئی۔

قرطبہ، اس کی تعمیر اگلے کئی بادشاہوں کے زمانے تک جاری رہی۔ پورے پانچ سو سال تک اللہ اکبر کی آواز اس بے مثال مسجد قرطبہ میں گونجتی رہی جہاں آج عیسائیوں کو عبادت کے لیے بلانے والے گھنٹے کی آواز گونجتی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد جب مسجد عیسائیوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے مسجد کے چند ستون اکھاڑ کر وہاں حضرت مریم کا مجسمہ نصب کر دیا۔ پھر قرطبہ کے چند پادریوں نے کارلوس پنجم کو اس بات پر قائل کر لیا کہ کیتھولک ہسپانیہ میں مسلمانوں کی یہ عبادت گاہ کلیسا کی توہین ہے لہذا اسے اکھاڑ کر یہاں عظیم الشان کلیسا کی بنیاد رکھی جائے۔ کارلوس کی اجازت پر مسجد کے قلب کو پھوڑا گیا۔ کئی ستون اکھاڑے گئے۔ دیواریں کو ادھیڑ دیا گیا۔ سوائے اس حصے کے جو کلیسا کے نقشے میں نہیں تھا، مسجد کا کوئی حصہ محفوظ نہیں رہا۔ اور پھر بقول مستنصر حسین تارڑ ”خوبصورتی کی اس لاش پر انہوں نے کلیسا کی دیواریں اٹھائیں۔ کنول کا جنگل مرجھا گیا۔“

کارلوس جب ان کا یہ عظیم الشان کارنامہ دیکھنے آیا تو اس نے غم و غصے سے افتتاح کی رسم ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے پادریوں سے کہا کہ؛

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم کیا کرنے والے ہو تو تم کبھی یہ نہ کر پاتے۔ کیونکہ جو کچھ تم نے یہاں تعمیر کیا ہے وہ دنیا میں کہیں بھی بنایا جا سکتا تھا اور جو کچھ تم نے تباہ کر دیا وہ روئے زمین پر کہیں نہیں دیکھا جا سکتا۔“

جیمز مشنر اس کلیسا کو ”عظیم بدصورتی“ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ہٹن لکھتا ہے کہ ”یہ گندا کلیسا ایک ناقابل یقین پاگل

پن کا مظاہرہ ہے۔ خود نمائی، دکھاوٹ اور بازاری پن کا مظاہرہ۔ ایک ایسی ظالمانہ قربانی جو پادریوں نے اپنی مذہبی ہوس کی بھینٹ چڑھادی۔ یہ عمارت عظیم کلیسا کے بجائے ایک قبحہ خانہ لگتی ہے۔"

جانتی ہو مسجد قرطبہ کی تکمیل میں باسٹھ سال کا عرصہ لگا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ناں؛

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مُبیں

تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر

قلبِ مسلماں میں ہے، اَور نہیں ہے کہیں

آہ وہ مردانِ حق! وہ عرَبی شہسوار

حاملِ خُلقِ عظیم، صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب

ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خِرد راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی

خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں۔"

اس نے نگاہیں کھڑکی سے نظر آتے آسمان پر ڈالیں۔ خاموش فلک، ٹرین کی رفتار سے تیزی سے کٹتا فلک۔ فلک جس کے عین قلب کو چیرا جا رہا تھا۔ اندھیرے کی چادر میں تناؤ پیدا ہوا تھا۔ مدھم سی نیلی روشنی فلک کے عین قلب سے پھوٹی تھی۔ اور ٹرین کی رفتار نے اسے کاٹ دیا۔ ہر سو اندھیرا، ہر سو خاموشی، زوال زوال زوال اور قرطبہ۔۔

قرطبہ دور افتادہ اور تنہا!

☆☆☆

اے حَرَمِ قُرطُبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خِشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔

وہ دونوں سفری بیگ شانوں پر ڈالے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے رومن برج کو پار کر رہے تھے جسے سمندر نے اپنی ہتھیلی پر لیا ہوا تھا۔ ان کے دائیں بائیں صاف شفاف نیلا پانی لہروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ سامنے زرد رنگ کی دیواریں تھیں گویا کسی قلعے کی فصیلیں ہوں۔ وہ سانس روکے مسجد کی محرابوں پر نظریں ٹکائے قدم بڑھا رہے تھے، جو قلعے کی فصیلوں کی مانند دیواروں کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔ دیواروں کے قلب کو چیر کر اندر جانے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ انہوں نے برج پار کیا تو زرد رنگ کی اینٹوں سے جڑی اس دیوار کو کسی محراب کی صورت میں اپنے سروں پر سائبان کرتے ہوئے پایا۔ وہ اندر آ گئے۔ دائیں طرف لمبی اونچی سفید دیوار تھی۔ ان کا رخ بائیں طرف تھا۔ بائیں طرف القصر تھا۔ اور القصر کے ساتھ سفید دیواروں سے چنا گیا راستہ تھا جہاں سے بادشاہ القصر سے نکل کر

مسجد قرطبہ جایا کرتے تھے۔ انہوں نے اس راہ پر اپنے قدم بڑھا دیے۔ مسجد قرطبہ بس چند قدموں کے فاصلے پر تھی، بس چند قدم۔

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

تیری بِنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

وہ مسجد کے پہلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ اونچے لمبے بھاری ستون جنہوں نے مسجد کی چھت کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ چونکہ ان ستونوں کی اوسط بلندی مسجد کی مجوزہ چھت کی بلندی سے کہیں کم تھی اسی لیے ہر ستون پر دوہری محرابیں تعمیر کی گئیں اور انہیں چھت تک لے جایا گیا تھا۔ تمام ستونوں کے زیریں حصے نہایت ملائم اور چمکیلے تھے۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ اپنے سامنے موجود اس نرم و ملائم ستون پر رکھے تھے۔ وہ لمس، لاکھوں عقیدت مندوں کے کندھوں اور ہاتھوں کا پُر تقدس لمس۔ وہ لمس جس نے دل کو گرمی بخشی اور پھگلتا پانی آنکھوں کے راستے سے باہر آنے لگا۔ اس نے گہری سانس لے کر مسجد کی فضا میں موجود مقدس خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا۔ یہیں کہیں، شاید سرخ بالوں والے اموی شہزادے کی خوشبو موجود ہو۔ یا ان عظیم لوگوں کی جنہوں نے ان ستونوں کو کھڑا کیا۔ اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

تیرے در و بام پر وادیِ اَیمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

عبد الرحمن نے مزدوروں کی طرح اس مسجد کی تعمیر میں کام کیا۔ وہ اپنی کمر پر اینٹیں اٹھاتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا اس کا آخری وقت قریب ہے تبھی حکم افتتاح جاری کیا گیا۔ سفید قبا میں ملبوس سرخ بالوں والے عبد الرحمن کو مسجد قرطبہ کا پہلا امام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اس کی زمیں بے حدود، اس کا اُفق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نِیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

وہ اس مقام پر کھڑی تھی جہاں صدیوں پہلے عبد الرحمن نے امامت باندھی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ سرخ و سفید پتھروں سے آراستہ یہ مقام کتنا خوش قسمت تھا کہ جسے عبد الرحمن کی قبابوسی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ منظر دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں۔ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ اور پھر اسے کوئی مانوس آواز سنائی دی۔ وہ اسے سر اٹھانے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ سر کا پچھلا حصہ ذرا سا پیچھے کو گرا کر ٹھوڑی اونچی کی۔ وہ مسجد کی دیواروں پر لکھی قرآنی آیات کو بہ خوبی دیکھ سکتی تھی۔

ایسی مٹی میں نمو پائی ہے تو نے،

جو اجنبی اور انجان ہے تجھ سے۔

تو مری طرح ہے، دور ہے گھر سے۔

اس کے قدم خود بخود بڑھ رہے تھے۔ جیسے وہ ان راستوں سے آشنا ہو۔ ایک ڈور تھی، اک سحر تھا جس میں وہ باندھی جاچکی تھی۔ وہ خود بخود کھنچتی چلی جارہی تھی۔ اسے ڈور کے سرے پر جانا تھا۔ اس نے مکمل مسجد کا طواف کیا تھا، اپنے گردوپیش سے بے گانہ ہو کر۔ قرطبہ کسی کو کسی اور کا رہنے دیتا ہے بھلا؟!

قرطبہ

دور افتادہ اور تنہا

میں ایک کالے خچر پر سوار ہوں۔

میرے تھیلے میں چند زیتون ہیں،

اور آسمان پر پورا چاند۔

میں کبھی بھی قرطبہ نہیں پہنچ پاؤں گا۔

میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا۔

کالا خچر، سرخ چاند!

وہ اس چھوٹے کمرے نما مقام پر بھی آئی تھی جہاں ہر سو خاموشی ہی خاموشی تھی۔ وہ سمندر کو سن سکتی تھی۔ سمندر کا شور، لہروں کا تلاطم۔

عبدالرحمن اور بادشاہ زمان اسی کمرے سے جنگ کے نقارے سنتے ہونگے۔ یہاں کبھی تلواروں کے ٹکرانے کی آوازیں بھی گونجی ہونگی۔ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے بھی یہ کمرہ آشنا ہوا ہو گا۔ اور شاید یہی وہ مقام ہو جہاں

بادشاہ صرف خود کو سننے آتے ہوں، جیسے وہ۔ خاموشی، خاموشی، سکوت، سکوت۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ ہر سو اندھیرا چھا گیا۔ مکمل اندھیرا۔ اس نے دیوار کو ٹٹولا۔ دیوار پر ابھرے ابھرے الفاظ لکھے تھے۔ اس نے ان الفاظ کو چھوا۔ ہاتھ کپکپا گئے۔ لمس مانوس سا تھا۔

لا۔۔ الہ۔۔ اور پھر ایمان تھا۔ الا اللہ! اس نے آنکھوں کھول لیں۔ ہر طرف مکمل روشنی تھی۔ ویسی ہی۔۔ روشن قرطبہ! وہی خوشبو، وہی خوشبوؤں کا شہر۔ اداس قرطبہ۔۔ سسکی۔۔ ٹپ ٹپ ٹپ!

قرطبہ کو اس اداس اور حسین عورت سے تشبیہہ دی جاتی ہے جس کے حزن کا سبب کوئی نہیں جانتا۔

میں قرطبہ کبھی نہیں پہنچ پاؤں گا۔

الرصافہ بھی مسجد امیہ کے ہم پلہ نہ ہو سکا اور پھر مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی گئی۔

وہ کھلے آسمان تلے کھڑی تھی۔ نظریں اس اونچے مینار پر تھیں جہاں سے صدیوں پہلے اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی تھیں۔ آج وہاں مکمل خاموشی تھی۔ وہ خاموشی جس نے صدیوں پہلے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے

عشقِ بلاخیز کا قافلہ سخت جاں!

قرطبہ

دور افتادہ اور تنہا

میں ایک کالے خچر پر سوار ہوں۔

میرے تھیلے میں چند زیتون ہیں،

اور آسمان پر پورا چاند۔

میں کبھی بھی قرطبہ نہیں پہنچ پاؤں گا۔

میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا۔

کالا خچر، سرخ چاند!

موت مجھ پر نظریں جمائے دیکھ رہی ہے،

قرطبہ کے میناروں سے!

آہ! یہ طویل راستے۔

آہ! میرا بہادر خچر۔

آہ! انجام یہ کہ موت میری منتظر ہو،

اس سے پیشتر کہ میں قرطبہ پہنچوں۔

قرطبہ

دور افتادہ اور تنہا

شاعر قرطبہ نہیں پہنچ سکا۔ موت ہواوں کو چیرتی ہوئی آئی اور اس کا تعلق اس دنیا سے ختم ہو گیا۔

قرطبہ، دور افتادہ اور تنہا۔

رصافہ کے وسط میں کھجور کا ایک تنہا درخت نظر آیا جو نخلستان کی آبادی سے جدا ہو کر مغربی زمین میں آ گیا ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ تو غریب الوطنی، جدائی اور بال بچوں سے طول و فراق میں میرے مشابہ ہے۔

تونے ایسی سرزمین میں نشو نما پائی جہاں تو بالکل ہی پردیسی ہے۔ میری مثال اپنے وطن سے دور دراز مقام پر جدا کیے جانے پر تیری مانند ہے۔

میں ایک بید کے درخت کی مانند ہوں۔

ہوا تھم جائے تو،

میں ساکت کھڑا رہتا ہوں۔

اور اگر ہوا چلے تو،

میں بھی حرکت میں آجاتا ہوں۔

قبتہ الاسلام و مجتمع اعلام الانام۔ اُم القریٰ و قرارۃ اولیٰ الفضل والتقیٰ۔۔ اُم البلاد قرطبہ!

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے

رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے۔

☆☆☆

میں ان ہزاروں لوگوں جیسی ہوں جو اپنا ماضی یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ وقت میں تین پہر ہوتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی اور مستقبل ساتھ ساتھ ہیں برابر برابر۔ انسان حال میں خود کو مار کر مستقبل کے حال میں بہتری چاہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حال بجز فریب کے کچھ نہیں۔ یہ ایک لمحہ یہ حال ہے، مگر لمحہ تو پلک جھپکنے میں گزر گیا اور ماضی ہو گیا۔ ایک اور لمحہ، ایک اور ماضی۔ حال تو اس سب میں کہیں نہیں ہے۔ میں، آپ، ہم سمجھتے ہیں ناں عصرِ حاضر حال ہے مگر ذرا غور کریں جس عصرِ حاضر کو ہم حال کہہ رہے ہیں وہ تو کب کا ماضی کا حصہ بن چکا۔ وقت بس دو پہروں میں سفر کرتا ہے۔ ماضی اور مستقبل۔ حال تو وہ لکیر ہے، وہ باؤنڈری لائن ہے جو ماضی

کو مستقبل سے جدا کیے ہوئے ہے۔ اس سب میں وہ ایک لمحہ جو حال ہے، جسے ماضی بننا ہے۔ اسی ایک لمحے میں خود کو مارنا صرف مستقبل میں حال کے ایک لمحے کے لیے جو ماضی بنا چاہتا ہے ؟! یہ فریب ہے۔ یہ ماسوا فریب کے کچھ نہیں۔ جال ہے آنکھوں کا، نگاہوں کا۔

اب ذرا ماضی اور مستقبل کو دیکھیں۔ دونوں ساتھ ساتھ ہیں برابر برابر ہیں۔ جو ماضی بھول گیا اس نے اپنے ساتھ مستقبل میں ظلم کیا۔ صرف ایک بھول کی وجہ سے وہ مستقبل میں وہی غلطیاں دہرائے گا۔ تاریخ خود کو دہراتی ہے، وقت خود کو دہراتا ہے کیوں ؟! امتحان لینا مقصود ہے! ہم ماضی میں گرے۔ ہم نے لمحوں میں اوج ثریا سے تحت الثریٰ تک کی منزل طے کی۔ پھر ہم نے بھلا دیا اسے۔ جو بھول گیا وہ تباہ ہوا۔ اب مستقبل میں جب ہم تحت الثریٰ سے اوج ثریا تک کی منازل طے کریں گے تو بھول چکے ہونگے کہ ایک راہ وہ بھی ہے جو پستی تک جاتی ہے۔ ایک رات وہ بھی ہے جس میں بجز اندھیرے کے کچھ نہیں۔ ایک قافلہ وہ بھی ہے جس کے امیر کارواں نے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں۔ ایک گناہ وہ بھی ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔ گناہ کونسا ؟! گناہ، سیاسی گناہ، قوموں کا گناہ۔ ماضی کو بھول جانے کا گناہ! تاریخ شاہد ہے اس گناہ میں مبتلا ہونے والی قومیں برباد ہوئیں، تباہ ہوئیں۔ پستی کی طرف گرادی گئیں۔ یہ گناہ اجتماعی گناہ ہے۔ یہ فرد کو نہیں قوم کو تباہ کرتا ہے۔ آسمان سے پتھر نہیں برستے نہ ہی زمین الٹ دی جاتی ہے۔ نہ طوفان آتا ہے نہ چہرے بگڑتے ہیں۔ کچھ اس سے بھی برا ہوتا ہے۔ ظالم و کاہل حکمران مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ عیش و نشاط عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ غیرت مر جاتی ہے۔ اور غیرت کا مرنا کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ایک لفظ ہے "غلامی"، غیرت کی قبر میں غلامی سانپ کی طرح موجود ہوتی ہے۔ ہمہ وقت ڈسنے کو تیار! قومیں زہر آلود ہو جاتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ آنسو متواتر بہتے ہیں یہاں تک کہ بینائی کھو دی جاتی ہے۔ ماضی کو بھول جانا وہ اجتماعی گناہ ہے جس کا کفارہ خون دے کر ادا کیا جاتا ہے۔ خون فرزندوں کا، خون عزتوں کا، خون

غیرت کا اور خون آزادی کا۔

اس نے دھیرے سے سجدے سے سر اٹھایا تھا۔ کئی آنسو گالوں سے لڑھکتے حجاب میں جذب ہو گئے۔ اس نے انگشت شہادت اٹھائی۔ عظیم اللہ کی وحدانیت کی شاہد ٹھہری۔ رک کر دائیں طرف چہرہ گھمایا۔ سلامتی بھیجی اور یہی عمل بائیں طرف دہرایا۔ پھر وہ رک گئی۔ ٹھہر کر سامنے دیکھا۔ وہ مسجد قرطبہ کے محراب میں بیٹھی تھی۔ ہاں وہیں، جہاں اموی شہزادے عبد الرحمن نے پہلی بار امامت کروائی تھی۔ وہ یک ٹک سرخ و سفید اس دیوار کو دیکھے گئی۔ یہ تشنگی ختم کیوں نہیں ہو رہی تھی؟ صبح سے شام ہوئی اور اب بس رات ہونے کو ہے بلکہ ہو گئی ہے۔ اس قدیم مسجد میں کونسا سحر ہے جس کا کوئی رد نہیں۔ کیوں جو یہاں آیا بس یہیں کا ہو کر رہ گیا کہ جب تک نکالا نہ گیا؟ ان اونچے ستونوں اور ان چمکیلی محرابوں میں یہ کشش کیوں ہے کہ سانس لینا محال ہو جاتا ہے؟!

"خوبصورت ہے ناں۔" مدھم سی سرگوشی کی گئی تھی۔ یہیں کان کے پاس کی گئی سرگوشی۔ وہ سر ہلا گئی۔ اقرار کیا۔ دل و جان سے اقرار کیا۔ ہار مان لی۔۔ ہار۔۔ شکست!

"میں قرطبہ کی محرابوں کو خوابوں میں دیکھوں گی۔ ان ستونوں کا وہ پر تقدس لمس مجھے کہیں کا رہنے نہیں دے گا۔ میں شکست کھاؤں گی، منہ کے بل گروں گی۔" نم آنکھیں، نم لہجہ، بھیگی آواز۔ وہ چہرہ ترچھا کیے یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ وہیں بیٹھا تھا وہ بھی، اپنی جیکٹ فرش پر بچھائے جس نے جائے نماز کی کمی کو پورا کیا تھا، اس نے بھی یہیں اس کے برابر میں نماز پڑھی تھی۔ قرطبہ کے محراب میں۔

"شکست کس سے؟"

"قرطبہ سے۔"

"قرطبہ نے تمہارا یہ حال کر دیا ہے۔ تم الحمرا جا کر کیا کرو گی؟" وہ مسکرایا تھا۔ ہلکا سا، ذرا سا۔ چشمے کے شیشوں کے

پار آنکھیں مسکرانے کی وجہ سے پھیل کر بڑی ہوئیں۔

"قرطبہ میں دل دیا ہے۔ الحمراء میں جان دوں گی۔" جان، الحمراء، سرخ قلعہ۔ سرخ رنگ خون کا، خون دلوں کا۔

"قرطبہ کو دل دیا ہے۔ الحمرا کو جان دو گی۔" اس نے تصحیح کی تھی۔ اسے غالباً اس کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔ وہ سرخ قلعے میں جان دینے کی بات کر رہی تھی۔ اپنی سانسیں بحال تھیں، دوسروں کا سانس لینا محال کر رہی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ فرش پر بچھی اپنی شال اٹھاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بہت فرق ہے۔ الحمرا جانوں کا قرض نہیں رکھتا۔ وہ دلوں پر حاوی ہوتا ہے۔ جو دل کسی اور کو دے چکا اس کا خون الحمرا قبول نہیں کرتا۔" وہ بھی اپنی جیکٹ اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سیاہ رنگ کی شال نفاست سے اپنے دائیں کندھے پر ڈالتے ہوئے پلٹ گئی۔ وہ جیکٹ کندھوں پر ڈالتا اس کے پیچھے آیا۔

"ان موروں کی مثال اس بوڑھی عورت کی سی ہے جس نے اپنا جوان جہاں بیٹا زندہ درگور کر دیا ہو۔" کسی سیاح کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ الفاظ میں طنز تھا، طنز زوال پر تھا۔

وہ مسجد کا احاطہ پار کر گئے۔ قدم بڑھے اور سحر ٹوٹ گیا۔ دلوں پر ایکدم بھاری بوجھ آن گرا۔ قدم قدم من من بھر کے ہو گئے۔ راستے طویل اور دشوار ہو گئے۔

☆☆☆

وہ مسجد قرطبہ سے باہر نکلے تو یوں معلوم ہوا گویا صدیوں کا سفر پل میں طے ہو چکا ہو۔ قدیم مسجد کے دروازے کی دہلیز سے نکلتے ہی سب بدل چکا تھا۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ ہموار سیاہ سڑکیں، پوری رفتار سے دوڑتی جدید گاڑیاں، ہر سو چمکتے برقی قمقمے، اونچی عمارتیں۔ چہل پہل، دائیں بائیں بڑے بڑے کیفے جن کے سامنے فٹ پاتھ پر حسب معمول رات کے دس بجتے ہی کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ ہسپانوی ان کرسیوں پر بیٹھے کھانے میں مشغول ساتھ

ساتھ شراب کے گھونٹ بھرتے مدہوش ہونے کو تھے۔ سڑک کنارے ایک آدمی گٹار لیے کھڑا تھا اور دوسرا اپنی سریلی آواز میں ہسپانوی زبان میں نجانے کونسا گانا گا رہا تھا۔ شراب کا نشہ، دھیمی موسیقی، چاندنی میں کسی ماہر تیراک کی طرح تیرتی رات، لمحہ لمحہ گزر رہا تھا۔ نشہ عروج پر تھا، موسیقی دھیمی ہوتی جا رہی تھی، ہسپانوی بس مدہوش ہونے کو ہیں۔

"صرف پانچ یوروز میں جو آپ چاہیں اور شراب مفت۔ آیئے سینیور۔" کیفے کے باہر کسی کی میز پر کھانا رکھتے ایک آدمی نے ہانک لگائی۔ زیاد نے گردن ترچھی کر کے سعاد کو دیکھا۔

"صبح والا سینڈوچ اور کافی مفقود ہو چکے ہیں۔ سان سباستیان میں ساحل کنارے وہ تلے ہوئے آکٹوپس جنہیں میں نے بے خبری میں کھا لیا تھا اب سارا نظام درہم برہم کر چکنے کے بعد آخری وارننگ دے رہے ہیں۔ آفر اچھی ہے مگر دھیان سے اس بار تلے ہوئے کیڑے مکوڑے نہ کھلا دیں۔ اور ہم کڑچ کڑچ کرتے مزے سے کھا بھی جائیں!" اپنی موجودہ حالت کی تفصیل بتاتے ہوئے اسے ابکائی آئی تھی۔ آکٹوپس۔۔ تلا ہوا۔۔۔ آخ تھووو!

"میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں سینیوریتا سعاد!" وہ کیونکر نہ سمجھتا؟ اس کے پیٹ میں بھی تو تلا ہوا آکٹوپس اپنی بے انت ٹانگیں لپیٹے آرام فرما تھا۔

وہ اپنے مصنوعی آنسو پونچھتی پلکیں جھپکتی اس کے ساتھ سامنے ایک میز کی طرف بڑھی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس کے نتھنوں سے شراب کی بو ٹکرائی تھی۔ اسے عجیب متلی سی ہونے لگی تھی۔

"گندے ہسپانوی!" اس نے جھرجھری لی تھی۔ زیاد ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈال کر آرڈر نوٹ کروانے لگا۔ وہ گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔ موسیقی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھے سینیور زیاد آرڈر لکھوا کر انگلش ٹو اسپینش ڈکشنری گود میں رکھ کر مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اس نے کیفے کی طرف

نگاہیں دوڑائیں۔ وہ اب سامنے موٹی توند والے ہسپانوی کو دیکھ رہی تھی جو ایک لمبی سی ڈکار لے کر وہیں میز پر سر ٹکائے شراب کے نشے میں مدہوش ہو چکا تھا۔ اس نے برے برے منہ بنائے پھر بددلی سے میز پر لکیریں کھینچنے لگی۔ وقفے وقفے سے سینیور زیاد کو دیکھنے کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ وہ بالکل ایک اچھا گائیڈ نہیں تھا۔ اسے چاہیے کہ کتاب ایک طرف رکھ کر اس کی بوریت کے خاتمے کے لیے سامان کرے مگر وہ تو بالکل ہی آداب و اخلاق سے عاری تھا۔

سپیر اسینیور! پشتو اور ہسپانوی زبان کے دو الفاظ کے مرکب سے زیاد کا ایک نیا لقب وجود میں آ چکا تھا۔

ہسپانوی بالکل مہمان نواز نہیں ہیں۔ اتنی دیر ہو گئی ہے مگر کھانا ابھی تک غائب! سستے میں کام چلانے کے نقصانات۔ وہ موٹی توند والا آدمی، کم از کم خاتون کا ہی لحاظ کر لیتا۔ گندا! اُفف۔۔ میز پر بھی شراب گری ہوئی ہے۔ گندے! آج رات کہاں گزرے گی؟ یہ ہسپانوی تو نشے میں مدہوش ہیں۔ کون رہنے دے گا اپنے گھر؟ جیب خالی ہو گی۔ واپس کیسے جاؤں گی؟! یا اللہ کیا آپ میرا غصہ ختم نہیں کر سکتے؟ جندل اس کا حقدار ہے، غلطی اسی کی ہے۔ جنگلی خر نہ ہو تو!

"سینیوریتا!" وہ مصروف سے انداز میں ڈکشنری سے سر اٹھاتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ، اس کے چہرے پر نظریں ٹکائے برے برے منہ بنا رہی تھی۔ وہ حیران ہوا پریشان ہوا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ وہ ہوش میں آئی۔

"حد ادب گستاخ! بادشاہ سلامت مراقبے میں مصروف تھے۔" اس نے ناک بھوں چڑھا کر اسے ملامت کی۔

"یہ کونسا مراقبہ تھا جو مجھے دیکھتے ہوئے ہو رہا تھا؟!" بدتمیز! کوئی ادب نہیں ہے۔ منع کرنے کے باوجود سوال کیے جا رہا ہے۔ سپیر اسینیور!

"کام کی بات کرو۔" بادشاہ نے جان چھڑائی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھے گیا۔ ویٹر میز پر کھانا رکھ رہا تھا۔ وہ

کرسی سے ٹیک لگائے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ کم گھور زیادہ رہی تھی۔ مہرون حجاب میں اس کے سفید گال دمک رہے تھے، ستواں ناک غصے کی وجہ سے سیکڑی جا چکی تھی۔ اور آنکھوں میں برقی قمقموں کی وجہ سے انوکھی چمک سی ابھر رہی تھی۔ آنکھیں، جو مسکراتی تھیں تو ان کے کناروں پر سلوٹیں سی نمودار ہوتی تھیں۔ اور جن میں بسا اوقات بلاوجہ پانی تیرنے لگتا تھا، جیسے کہ اب۔ اور پھر اس پانی میں ہر منظر ڈبڈبا جاتا تھا، جیسے اس وقت ان میں سنہری روشنیاں ڈبڈباتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ یک ٹک ان آنکھوں کو دیکھے گیا تھا۔ انہیں اتنا خوبصورت نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یا کم از کم ان کی خوبصورتی اس پر آشکار نہ ہوتی۔ یا اس کی نگاہ ان آنکھوں کی طرف نہ اٹھتی۔ ویٹر کھانا رکھ کر جا چکا۔ اس بار سینوریتا کو چٹکی بجانی پڑی۔ وہ ہوش میں آیا۔ ہڑبڑایا، بوکھلایا۔

"توس افوس سون پیر اسیوس!" ہڑبڑاہٹ میں الفاظ کی ادائیگی ہوئی۔ بادشاہ کی شان میں گستاخی ہوئی۔ بھلا اس زبان میں بات کیونکر کی گئی جس سے بادشاہ سلامت نا آشنا ہیں؟ ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچی۔

"ترجمہ؟" آنکھیں سیکڑی گئیں۔ وہ فوراً چہرہ موڑ گیا۔

"خود ہی ڈھونڈ لو۔" کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا گیا۔ نگاہ اٹھانے سے گریز کیا گیا۔ وہ آگے بڑھی۔ میز پر رکھی ڈکشنری اٹھائی اور اس کے سر پر دے ماری۔

"ہوش میں آؤ!" وہ نادان تھا۔ دل پر دی گئی پہلی دستک پر ہی کمزور پڑ گیا۔

"بولو۔" باہمت تھا۔ سنگلاخ چٹانوں سا سخت تھا۔ فوراً سنبھل گیا۔

"آج رات کہاں بسیرا کرنا ہے؟ میں ہوٹل کا کرایہ نہیں بھروں گی!" سوال اور ساتھ ہی تنبیہہ۔ آگے جو کچھ کرو ہمارا کیا واسطہ!

"ہاسٹل دیکھا ہے میں نے ایک۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہاسٹل میں بمشکل کوئی سنگل کمرا ملتا ہے۔ میں تو گزارا کر لوں گا،

تم؟"!

"دیکھیں گے۔ مل جاتا ہے مسٹر یو کو بھی مل گیا تھا۔" وہ بے فکری سے کندھے اچکاتی کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ گہری سانس لیتا سر کرسی کی پشت پر ٹکا گیا۔ آنکھیں موند لیں۔ عجیب سا احساس تھا۔ دل کی گستاخی۔۔ گستاخ سینیور! وہ ایک نظر اس پر ڈالتی بے فکری سے کھانا کھانے لگی۔ اب ٹھیک ہے!

☆☆☆

"توس جوس سین پیر اسیوس۔ یہی کہا تھاناں؟" انہوں نے رات قرطبہ کے کسی ہاسٹل میں گزاری تھی۔ سعاد نے صحیح کہا تھا کسی مسٹر کو بھی ہاسٹل میں سنگل کمرہ مل گیا تھا تو اسے بھی مل سکتا تھا۔ اور اسے مل بھی گیا تھا۔ لیکن چوہوں سے بھرا، گندہ، پراسرار سا۔ کھڑکیوں کے ہک ٹوٹے ہوئے تھے۔ پنکھا داغ مفارقت دے چکا تھا۔ تقریباً رات ایک بجے تک وہ اس کے ساتھ مل کر کمرے کی صفائی کرتا رہا۔ اس نے کئی چوہوں کو مارا، کچھ کو بل میں گھس جانے پر مجبور کیا۔ ایک چھپکلی اس کے ہاتھوں شہید ہوئی۔ کھڑکیوں کو جیسے تیسے اس نے کھولنے کی کوشش کی تو ہک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا الگ سے کرایہ بھرا تھا اس نے اور پھر جب وہ تھکا ہارا ٹوٹتے ہوئے بدن کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا تو دروازہ کھولتے ہی خراٹوں کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ خراٹے، کسی بوڑھے شخص کے، خراٹے کسی ہسپانوی خاتون کے اور خراٹے ان چھ افراد کے جن کے ساتھ اس نے اس چھوٹے سے کمرے میں رات بسر کی تھی۔

اور اب، زندہ سلامت وہ ہاسٹل سے نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ چلتی اس بے مروت پٹھانی نے جھوٹے منہ بھی نہ شکریہ کہا تھا نہ تو اس سے پوچھا تھا کہ اس کی شب کیسی بسر ہوئی؟! احساس مر چکا ہے۔ انسانیت کی قبر ملبے کا ڈھیر بن چکی ہے۔

"توس افوس سون پیراسیوس!" اس نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق جملے کی درستگی کی۔ کیونکہ جن الفاظ کو اس نے جس طرح بگاڑا تھا اگر ان کا کچھ اور مطلب ڈکشنری میں نکل آتا تو یقیناً قرطبہ کو ہی اس کی آخری آرامگاہ ہونے کا شرف حاصل ہوتا۔

"توس۔۔ مل گیا۔۔ افوس کہاں ہے۔۔ افوس۔۔" اس نے گردن ترچھی کرکے اسے دیکھا پھر گہری سانس لیتا کیفے کی طرف بڑھ گیا۔ رات کھایا کھانا حتیٰ کہ آکٹوپس کی بے انت ٹانگیں بھی گذشتہ رات کی مشقت کے بعد ہضم ہوچکی تھیں۔ اس نے اپنے لیے بھرپور ناشتہ منگوایا تھا جبکہ سعاد نے بھوک نہ ہونے کی وجہ سے سینڈوچ اور کافی پر اکتفا کیا تھا۔ وہ کچھ دیر تو خاموشی سے اسے ڈکشنری میں سر دیے الفاظ کا مطلب ڈھونڈتے دیکھتا رہا پھر سر میں اٹھتی ٹیسوں کی وجہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اسے قریبی میڈیکل اسٹور جانا تھا۔

"افوس۔۔ مل گیا۔۔۔ اب سون۔۔ سون۔۔ کیا مصیبت ہے۔ انسانوں کی طرح اردو میں نہیں بات کرسکتے تھے۔" وہ جھنجھلائی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھتے زیاد نے خوبصورتی سے اسے نظرانداز کیا۔ پانی کے ساتھ پیناڈول نگلی پھر ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ سینڈوچ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس نے ٹھہر کر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

"پیناڈول میرے پاس تھی، مطلب ہے۔ لے لیتے۔" وہ خاموش رہا۔ وہ اس کی خاموشی پر منہ کے زاویے بگاڑتی گائیڈ بک کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ فضول میں نخرے دکھا رہا تھا۔ رات تک تو ٹھیک تھا اب کیوں دماغ گھوما ہوا تھا؟!

"پیراسیوس۔۔ پیاری، خوبصورت۔ توس افوس سون پیراسیوس، تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں۔ مل گیا مجھے مل گیا۔" جوش سے کہتے ہوئے اس نے ڈکشنری میز پر رکھی پھر زیاد کو دیکھا۔ وہ ناشتے کے ساتھ انصاف کر رہا تھا، اسے یکسر نظرانداز کیے ہوئے تھا۔

رات کو، ہڑبڑاہٹ میں کھوئے کھوئے سے انداز میں یہ الفاظ ادا کرنے والا زیاد تاشفین تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ

اس کی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ رات کو جب اسٹریٹ لائٹس کی سنہری روشنیوں کا عکس اس کی آنکھوں میں ڈبڈبا رہا تھا۔

”تم نہ آتیں تو شاید میں واپس چلا جاتا۔۔ سون پیراسیوس۔۔ خوبصورت ہے ناں؟۔۔۔ قرطبہ کو دل دیا ہے، الحمرا کو جان دو گی۔۔ سینیوریتا آپ زندہ ہیں۔۔۔ پیراسیوس“!

وہ گلا کھنکھارتے ہوئے پیچھے ہوئی تھی۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو آنکھوں کے ذریعے دماغ میں محفوظ کر رہا تھا۔ وہ اب کافی کا کپ اٹھا رہی تھی۔ اس نے کافی کا گھونٹ بھرے بنا کپ واپس رکھ دیا۔ وہ ارد گرد دیکھنے لگی۔ وہ اپنا ناشتہ چھوڑ کر مکمل اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”سینیوریتا۔“ وہ کچھ کہنے والا تھا کہ سعاد نے ڈکشنری اٹھالی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ وہ جواب ہسپانوی زبان میں ہی دے گی۔ وہ جلدی جلدی صفحے پلٹ رہی تھی پھر ایک صفحے پر وہ رکی۔ دو سے تین بار لفظ بنا آواز کے دہرایا پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”گراسیا (شکریہ)۔“ وہ شکریہ کہہ کر بات ختم کر چکی تھی۔ وہ رکا، ٹھہرا، اسے دیکھا۔ پلک جھپکی پھر سر کو ذرا سی جنبش دیتا اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کافی کے گھونٹ بھرتی گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔ وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھتا سوچ رہا تھا کہ، صرف چند دنوں بعد جب ان دونوں کی راہیں جدا ہو جائیں گی تو کسی نئی منزل کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے انجانے راستوں پر اسے اندلس کی یہ صبح یاد آئے گی جب اس نے ایک مشرقی لڑکی کو نرم پڑتے دیکھا تھا۔ نرم، نرم دل۔۔ نرمی۔ کہ راستہ آسان ہوا، محبت پہلی دستک دے چکی۔

☆☆☆

مدینہ الزہراء مطلب روشن شہر! شاندار شہر! یہ شہر قرطبہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس شہر کی بنیاد اموی خلیفہ عبدالرحمن سوم الناصر نے رکھی۔ یہ مسلمانانِ اندلس کے لیے دل سی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ اسی شہر کی مضبوط دیواروں کے پار اندلس کا دارالحکومت تھا۔ خلیفہ کا القصر بھی یہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کا اس شہر کی تعمیر کا مقصد اپنی طاقت دکھانا تھا۔ اس شہر کی بنیاد سیاست پر رکھی گئی تھی۔ اس شہر کی تعمیر میں چالیس سال کا عرصہ لگا اور کھنڈرات میں تبدیل ہونے کے لیے بہت تھوڑا سا وقت۔

یہ شہر طوائف الملوکی کے دور میں تباہ و برباد ہوا۔ خلیفہ عبدالرحمن سوم الناصر کے بیٹے الحکم دوم نے کافی حد تک سلطنت کو سنبھال لیا تھا مگر اندرونی سازشوں کی وجہ سے سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی پڑتی گئیں۔ کئی خلفاء قتل ہوئے، کئی کے خلاف ان کے اپنے بھائیوں نے بغاوت کی اور پھر سلطنت قرطبہ کی لاش پر ملوک الطوائف نے اپنی اپنی علیحدہ ریاستوں کا اعلان کر دیا۔ مسلسل خانہ جنگی کی وجہ سے اس بے مثال شہر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ شاہی محل کی قیمتی نوادرات کو بھی مالِ غنیمت جان کر لوٹا گیا۔ اس شہر کی تعمیر میں جو قیمتی پتھر استعمال ہوئے تھے انہیں بھی اٹھا لیا گیا تھا۔ یہ شہر ایسے دفن کر دیا گیا تھا جیسے کبھی تھا ہی نہیں! 1910ء میں کھدائی کے ذریعے اس شہر کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی مگر شہر کے 112 ہیکٹر حصے میں سے صرف دس یا گیارہ فیصد حصے کو کھودا جا سکا۔

مدینہ الزہراء جو اندلس کا دل تھا، جس کے دفن ہونے کے ساتھ ہی اندلس کی تباہی کی داستان شروع ہوئی۔ آج اس شہر کے کھنڈرات پر اختتام ہفتہ پر لوگ سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ کسی ایک مقام کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا جاتا ہے یہاں موروں کے خلیفہ کا القصر تھا، یہاں ان کی مسجد تھی، اور یہ دربار تھا۔

اب سب دفن ہو چکا۔ مور ختم کر دیے گئے، مور نکال دیے گئے، مور مار دیے گئے۔ جو بچ گئے وہ نہ زندوں میں رہے نہ مردوں میں۔

☆☆☆

”اندلس میں بنو امیہ کا شاندار دور حکومت 773ء سے 1008ء تک قائم رہا تھا۔ اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ 1008ء اور پانچویں صدی ہجری! یہ اندلس کا نازک ترین دور تھا۔ وہ عظیم الشان سلطنت جس کی مضبوط جڑوں نے مغرب کو مرعوب کیے رکھا، وہ عظیم باغ جس کی عبدالرحمن الداخل کی آل اولاد نے تین صدیوں تک آبیاری کی، وہ عظیم راہنما جنہوں نے اپنے خون سے اس زمین کی پیاس بجھائی اور جان دے کر اسے وطن کہا۔ وہ عظیم سلطنت تباہ ہوئی، وہ باغ خزاں کی زد میں آگیا، وہ عظیم راہنما ناپید ٹھہرے۔ اندلس یتیم ہو گیا۔ اندلس پر ایسے حکمران مسلط کر دیے گئے جو عیش پرست تھے۔ اور حکمران۔۔۔

اگر کوئی بربریوں کے توسط سے تخت پر بیٹھتا تو اگلے دن عربوں کے ہاتھوں سولی پر لٹکا دیا جاتا۔ کسی کو سیاست دان تاج پہناتے تو اگلے دن وہ تاج علماء ایک نئے بادشاہ کے سر پر رکھ رہے ہوتے تھے اور سابق بادشاہ کی لاش یہیں کسی غسل خانے سے برآمد ہوتی۔ کئی بادشاہوں کی لاشیں قید خانے میں سڑتی رہتیں۔ اندلس، طوائف الملوکی کا شکار ٹھہرا تھا۔

قرطبہ، اموی شہزادے عبدالرحمن کا قرطبہ، اموی دمشق، وہ ایک ایسی لاش کی مانند ہو چکا تھا جسے چاروں جانب سے گدھ نوچ رہے تھے۔ قرطبہ بھی تباہ ٹھہرا۔

اندلس کی ہر ریاست ایک الگ سلطنت کے طور پر وجود میں آچکی تھی۔ غرناطہ اور اس کے قریبی علاقوں پر بنی زیری قابض تھے۔ سرقسط اور لاورہ پر بنو ہود کا سکہ چلتا تھا۔ طلیطلہ پر بنو ذالنون، اشبیلیہ پر بنو عباد، قرطبہ پر بنی جہور، قرمونہ پر بنی رزال اور مالقہ پر بنی حمود۔ ان کے علاوہ بھی کئی مزید علاقے تھے جہاں کئی مزید مختلف سلطنتیں قائم تھیں۔

اور ان سلطنتوں کے سلطان بھی کیسے بھلا؟ پیشہ وارانہ مجرم۔ ہیرے جواہرات سے مرصع لباس پہنے، سونے کے تخت پر براجمان سلطان۔

یہ سلطان اپنے لیے القابات کے چناؤ میں عباسی خلفاء سے پیچھے نہ تھے۔ الناصر، المنصور، المقتدر باللہ، المؤید باللہ، المعتصم باللہ، الموفق باللہ، المعتضد باللہ، المعز رباللہ اور المامون باللہ۔۔۔ واللہ!

ان حکمرانوں کے درباروں میں مفکروں، سیاستدانوں، اور علماء کی جگہ شاعروں اور مسخروں نے لے لی تھی۔ ہر امیر کی خدمت کے لیے شاعروں کا ایک گروہ موجود ہوتا تھا، جس کا نصب العین صرف امیر کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا نہ تھا بلکہ دوسرے امرا کی مذمت کرنا بھی تھا۔ لہٰذا شاعر حضرات صرف قصیدہ گوئی پر ہی نہیں ہجو گوئی کے فن میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ عوام اپنے حکمرانوں سے جینا سیکھتی ہے، انہی کی انگلی پکڑتی ہے، انہی کے پیچھے دوڑتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امرا کے عشرت خانوں میں اگر مشاعرے عروج پر تھے تو ایسے ہی مشاعرے ماہی گیروں، کمہاروں، ملاحوں، مزدوروں، کسانوں کی جھونپڑیوں میں بھی ہوا کرتے تھے۔ قرطبہ، علم کا وہ دروازہ جس کی تلاش میں دنیا بھر سے طالب علم اندلس کا رخ کرتے تھے اب آلات موسیقی کا گھر بن چکا تھا۔ جہاں نیزہ بازی، تیر اندازی اور تلوار بازی کے مقابلے ہوا کرتے تھے اب وہاں بس یہی فکر حائل تھی کہ فلاں امیر کے عزیز از جان شاعر نے جس امیر کے خلاف ہجو لکھی ہے، اب کون ہے جو اس عظیم ہجو کے مقابلے میں ہجو گوئی پر طبع آزمائی کرے گا؟!

نسیم حجازی اندلس کے اس دور کے لیے لکھتے ہیں کہ:

"جب کسی قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں تو اس کا شعر و ادب بھی اس کے لیے افیون کا کام دیتا ہے۔ زندہ قوم کے شاعر شاہراہ ترقی میں قوم کے نقیب بن جاتے ہیں اور ان کا کلام بعض اوقات مردوں میں بھی

زندگی کی حرارت پھوک دیتا ہے۔ فارغ البالی کے دور میں اکثر قومیں فنون لطیفہ کی دلدادہ بن جاتی ہیں۔ لیکن اہل اندلس کے لیے یہ فارغ البالی کا دور نہ تھا۔ وہ اس وقت بھی شعر کہتے تھے جب گھٹنوں تک خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں اس وقت بھی طاوس ورباب سے عشق تھا جبکہ تباہی اور بربادی کی آگ ان کے گھروں تک پہنچ چکی تھی"!

وہ رک گیا۔ سورج کی سنہری کرنوں کی ہلکی سی جھلک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سیاہ داڑھی پر جیسے ذرا ذرا سے سونے کے ذرات گر رہے ہوں، وہ چہرہ موڑ گئی۔ اس کے سامنے ملبے کا ڈھیر تھا۔ تباہ شدہ مدینہ الزہراء۔ عبدالرحمن الناصر کا مدینہ الزہراء اسی آگ کی لپیٹ میں آیا ہوگا جو طوائف الملوکی کے دور میں اہل اندلس کے گھروں پر دستک دے رہی تھی۔ اور آگ تو پھر سب راکھ کر ڈالتی ہے۔ سیاہ پتھر، سیاہ ستون، ملبے کا ڈھیر، مدینہ الزہراء!

"قسطلہ کا عیسائی حکمران فرڈنینڈ اول اندلس میں اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر کئی اسلامی ریاستوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ وہ متحارب فریقوں میں سے ایک سے صلح کر کے دوسرے کی سرحدوں پر لوٹ مار کرتا اور پھر بعد میں تیسرے سے مل کر دوسرے کے ساتھ وہی کہانی دہراتا۔ ملوک الطوائف فرڈنینڈ کو اپنا محافظ اور سرپرست سمجھ کر بھاری سے بھاری اخراج ادا کرتے تھے۔ آخرکار فرڈنینڈ نے اپنا اصل چہرہ دکھایا اور بطیوس کے حکمران مظفر سے چند شہر اور سرقطہ کے علاقے اپنی ریاست میں شامل کر لیے۔ اندلس میں اشبیلیہ کے بعد طلیطلہ کی سلطنت سب سے طاقتور تھی۔ فرڈنینڈ نے جب طلیطلہ پر چڑھائی کی تو یہاں کے حکمران نے بھی اخراج دینا قبول کیا اور اشبیلیہ کے حکمران نے بھی اسی رسم کو آگے بڑھایا۔ فرڈنینڈ اول کی موت کے بعد الفانسو ششم نے صلیب کا جھنڈا جبل الطارق پر نسب کرنے کا عہد کیا۔ الفانسو نے بھی فرڈنینڈ کے ہی طریقہ کار کو اپنایا اور اندلس کی ریاستوں کو اپنے قبضے میں لیتا گیا۔ اخراج بڑھتے گئے اور پھر یہ آخری حد بھی پار ہوئی کہ اگر عوام اپنی رگوں سے خون نچوڑ کر بھی اپنے حکمرانوں

کے قدموں میں ڈالتی تو وہ بھی کافی نہ تھا۔ اندلس کے مسلمان کسی نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔ اندلس کی تاریک راتیں جبل الطارق پر نمودار ہونے والے سورج کے انتظار میں تھیں۔ مگر اس بار یہ سورج جبل الطارق سے نہیں جزیرہ الخضراء سے نمودار ہوا تھا۔ یوسف بن تاشفین کے جہاز لنگر انداز ہو چکے تھے"!

اس کے رکنے پر اور اس کی آواز کے دھیمے ہونے پر سعاد نے بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ تیزی سے اپنے دائیں طرف رکھی پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ وہ بے چارہ غیور مشرقی لڑکا اس کھلے میدان میں بیٹھا کب سے بول رہا تھا، غیرت کے مارے پانی مانگ نہیں سکتا تھا تو اسے تو خیال کرنا چاہیے تھا ناں کہ اسے پیاس بھی لگ سکتی ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اس سے پانی کی بوتل لے کر منہ سے لگا گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ سارا پانی غٹا غٹ پی چکا۔ پانی پی کر بوتل کو توڑ مروڑ کر نشانہ لے کر کوڑے دان میں ڈال دیا۔

"ایک یورو!" اس نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ ہنس دیا تھا۔ وہ منہ کے زاویے بگاڑتی ستون سے ٹیک لگاتی اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ انتظار ختم ہوا۔

"وہ نجات دہندہ افریقہ کا رجل عظیم یوسف بن تاشفین تھا جو جزیرہ الخضراء سے کسی شاہین کی مانند نمودار ہوا تھا۔ مرابطین کا سلطان! سادہ اور بے لوح اس سلطان نے افریقہ کے وحشی قبائل میں اسلام کا صور پھونکا تو وہی وحشی قبائل انسانیت کے حقوق کے علمبردار ہو گئے۔ اس کے ایک طرف مجاہدینِ اسلام ہوتے تھے اس کے ایک اشارے پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار! اور دوسری طرف علمائے کرام جنہوں نے افریقہ میں اسلام کا نور پھیلانے کے فرض کو نبھانا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھا ہوا تھا۔ مرابطین کی سلطنت کا یہ وہ بے تاج بادشاہ تھا جو خیموں میں رہتا تھا اور کھجور کی چٹائیوں پر بیٹھتا تھا۔ جو کھانے میں سوکھی روٹی اور کھجوروں کو ترجیح دیتا اور خود کوئی فیصلہ لینے سے پہلے علمائے کرام سے مشورہ کرتا کہ آیا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟! میں اللہ اور اس کے رسول کے احکامات

کے خلاف تو نہیں جارہا؟! یوسف بن تاشفین وہ سلطان تھا کہ اگر کہیں سے گزرتا تو لوگ اس کی قبا پکڑ کر فریاد کرتے۔ کہیں چرواہے اس کے گرد جھمگٹا ڈال دیتے۔ کسی کو کوئی روک ٹوک نہیں۔ اگر کبھی کوئی اسے سلطان کا مرتبہ دینا چاہتا تو وہ معذرت کرلیتا، مجھے عام انسان ہی رہنے دیجیے!

الفانسو نے جب اخراجات میں اس قدر اضافہ کرلیا کہ ملوک الطوائف کو اپنی ریاستیں ہاتھ سے پھسلتی محسوس ہوئیں تو اشبیلیہ کے حکمران معتمد نے تمام ریاستوں کے حکمرانوں کو جمع کیا۔ ان سب سے یوسف بن تاشفین کو اندلس بلانے کی اجازت لینا چاہی۔ سب نے انکار کیا۔ مرابطین کا سلطان اندلس آکر اگر ان کے لیے الفانسو سے لڑے گا تو الفانسو کو شکست دینے کے بعد اس کا اگلا شکار ملوک الطوائف کے تخت ہوں گے! وہ سب تباہ و برباد کردے گا۔ بادشاہ غلام ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جائیں گے۔ وہ ان سے ان کے عیش چھین لے گا۔

آخر میں معتمد نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ:

”میں قشتالیہ میں سور چرانے پر افریقہ میں اونٹ چرانے کو ترجیح دوں گا“!

اندلس کے مسلمانوں کی فریادیں جب یوسف بن تاشفین کی سماعت سے ٹکرائیں تو وہ علماء سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی مدد کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ملوک الطوائف نے یوسف بن تاشفین کے سامنے شرط رکھی کہ وہ اندلس کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔ گویا آؤ، ہمارے لیے لڑو اور لوٹ جاؤ۔ یوسف بن تاشفین نے ہامی بھرلی۔ اندلس کی تاریک راتوں میں روشنی کی ننھی سی کرن نظر آنے لگی۔ بھٹکے ہوئے قافلوں کو ایسا امیر کارواں ملنے والا تھا جو قافلے کو منزل تک پہنچانے والا تھا۔

یوسف بن تاشفین کے جہاز جزیرہ الخضراء میں لنگر انداز ہوئے۔ ایک بار پھر اندلس میں چھائی تاریکی کو مٹانے کے لیے سمندروں کو روندا گیا۔ ایک بار پھر افریقہ کے عقابوں نے اندلس کی زمین پر اپنے پنجے گاڑے۔

الفانسو کی طرف خط بھیجا گیا۔ اسلام قبول کرو، یا ہتھیار ڈال دو، بصورت دیگر جنگ ہو گی۔ الفانسو نے جوابی خط میں گردن اکڑا کر جنگ کے لیے دعوت دی اور ساتھ ہی اپنی فوج کی طاقت اور تعداد سے امیر یوسف کو ڈرانے کے بعد چند گالیوں سے بھی کاغذ کو سیاہ کیا۔ اندلس کے لوگ جو آگ پر لوٹ کر بھی شاعری کرتے تھے، امیر یوسف کے لیے جوابی خط کے طور پر ڈھیروں اشعار لکھ لائے۔ سادہ طبیعت کے مالک امیر یوسف نے سب کو انکار کر کے الفانسو کے ہی خط کے پیچھے "جو زندہ بچے گا، دیکھ لے گا۔" لکھ کر الفانسو کو بھجوا دیا۔

الفانسو کے ساتھ امیر یوسف کی جنگ 480 ہجری میں زلاقہ کے میدان میں ہوئی۔ امیر یوسف اور معتمد کی متفقہ فوج یعنی کل اسلامی لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی جبکہ ان کے مقابلے میں عیسائی لشکر ساٹھ ہزار کی تعداد میں تھا۔ مسلمانوں کے لشکر کے سامنے اپنی عظیم فوج کو دیکھ کر الفانسو نے کہا تھا کہ:

"جیالے جوانوں کی یہ فوج شیطانوں، فرشتوں اور بھوتوں کو بھی شکست دے سکتی ہے۔"

وہ انسانوں کا ذکر بھول گیا تھا تبھی شکست کھا گیا۔ مسلمانوں کی فوج جرات و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کی تعداد سے بے پرواہ ہو کر لڑی۔ نعرہ تکبیر بلند ہوا اور گھوڑوں کے دوڑنے سے اٹھنے والی دھول میدان میں چھا گئی۔ معتمد، شاعری کے نشے میں دھت رہنے والا معتمد، وہ کسی شیر کی طرح اس میدان میں دشمنوں پر گرجا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں شیر تھا۔ مگر وہ شیر جو نشے میں دھت رہنے کا عادی ہو! زلاقہ کے میدان سے الفانسو کے صرف پانچ سو سپاہی زندہ رہنے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ قید ہوئے، کچھ زخمی ہوئے اور چند فرار ہونے میں کامیاب ٹھہرے۔ خود الفانسو بہت مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور اپنی ایک ٹانگ ضائع کروا بیٹھا۔

زلاقہ کا مطلب ہے "پھسلتا ہوا میدان"۔ اس میدان جنگ کو زلاقہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ جنگ کے دن اس قدر خون بہا کہ قدم جمانا مشکل ہو گیا تھا۔ مسیحی ذرائع اس جنگ کو "Battle of sagrajas" کے نام سے

پکارتے ہیں۔ فاتح یوسف بن تاشفین اہل اندلس کی نظر میں نجات دہندہ تھا۔ وہ نجات دہندہ جس نے انہیں الفانسو سے بچایا تھا۔ مگر اب وہ لوٹ رہا تھا۔ وعدے کے مطابق جنگ جیت کر افریقہ کا رجل عظیم افریقہ کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ایک طرف اہلِ اندلس کی فریادیں تھیں۔ اے امیر ہمیں ملوک الطوائف نامی بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مت جائیں۔ وعدہ نبھانا لازم تھا، امیر یوسف لوٹ گئے۔ وہ ایک ننھی سی کرن، روشنی کی جو اندلس کے فلک پر نمودار ہوئی تھی، مدھم ہوتے ہوتے بجھ چکی تھی۔ بھیڑیوں نے اپنی عوام کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ مشاعروں کے دور کا ایک بار پھر آغاز ہو چکا تھا۔ عیاش حکمرانوں نے گدھوں کی طرح اندلس کو نوچنا شروع کر دیا تھا۔“!

اس کی آواز میں نمی کا تاثر گھلا تھا۔ وہ رک گیا۔ سعاد نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ اندلس کی تاریخ سخت سے سخت دل کو بھی پگھلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھوں کو رگڑا پھر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اس سے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں اس مقام پر تھیں جہاں بادشاہ کا دربار لگتا تھا۔ عیاش حکمران، عیاشی، قوم کی فریادیں، ظلم کی انتہا۔۔ زوال زوال اور زوال!

”مسلمانوں میں جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو عیسائی جو زلاقہ میں بری طرح شکست کھانے کے بعد چوہوں کی طرح بلوں میں دبکے ہوئے تھے، گیدڑوں کا روپ دھار کر باہر نکل آگئے۔ الفانسو ششم نے اندلس کی کئی ریاستوں پر حملہ کیا۔ کئی کو اپنے قبضے میں بھی لے لیا۔ عیاش حکمرانوں کی عیاشی خطرے میں پڑ گئی۔ ریاستوں کا خزانہ خالی ہو گیا۔ اخراج دینے کے لیے عوام کو پیسا گیا پھر بھی بات نہ بنی تو ایک بار پھر افریقہ پیغام بھیجا گیا۔ اس بار بھی امیر یوسف نے مسلمانانِ اندلس کی صدا پر لبیک کہا تھا۔ وہ آئے۔ عیسائی حصن اللیط کے قلعے میں مصحور تھے۔ محاصرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا گیا۔ امیر یوسف کے ساتھ تمام ریاستوں کے حکمران تھے۔ مگر وہ حکمران جنہیں خطرہ تھا کہ امیر یوسف ان کا تخت نہ چھین لیں۔ انہوں نے امیر یوسف کی پیٹھ پر وار کیا اور میدان جنگ چھوڑ کر بھاگے۔ نتیجتاً

میدان جنگ کئی مجاہدین اسلام کے خون سے رنگین ہوا۔ بالآخر امیر یوسف فاتح ٹھہرے۔ عیسائی شکست سے دوچار ہوئے۔

اس بار عوام نے ٹھان لی تھی کہ امیر یوسف سے انصاف کروانا ہے۔ علماء نے باقاعدہ فتوے دیے کہ مسلمانان اندلس کو ان بھیڑیوں کے درمیان چھوڑنا ٹھیک نہیں! عدالت لگی اور ہر ایک کو کٹھرے پر بلایا گیا۔ یہ عدالت عام عدالت نہیں تھی۔ یہ تلواروں کے سائے میں میدان جنگ میں لگنے والی عدالت تھی۔ مرابطین کے سلطان نے اندلس کے چیدہ چیدہ شہروں کو فتح کیا اور وہاں اپنے لوگ مقرر کیے۔ بعد ازاں اپنے چچازاد سیر بن ابو بکر کو اپنا نائب مقرر کر کے اپنے وطن واپس لوٹ گئے۔ سیر بن ابو بکر فولاد سے زیادہ سخت تھا، جس کے ہاتھ تمام عیاش حکمرانوں کی گردنوں پر تھے۔ اندلس کا ہر شہر فتح ہوا۔ زلاقہ اور حصن اللیط کے شہیدوں کو خون کا حق ادا ہوا اور اس بار، اس بار اندلس کا فلک مکمل روشن تھا۔ اور یہ فلک اگلے چالیس سال □ ، یعنی چار صدیوں تک روشن رہا۔ مراکش کے صحرا کا عظیم سپہ سالار، افریقہ کا رجل عظیم، یوسف بن تاشفین، اندلس کا نجات دہندہ، امر المسلمین کے لقب سے نوازا گیا۔ مسلمانوں کا امیر!

نسیم حجازی لکھتے ہیں:

افریقہ کا رجل عظیم ایک تاریک رات کا مسافر تھا جس کے پاؤں کے نشان ان گنت قافلوں کے لیے روشنی کا کام دیتے رہے۔ ایک قوم کی بے بسی دیکھ کر قدرت کے دریائے رحمت سے لہر اٹھی اور اندلس کی خاک پر آزادی کے موتی بکھیرنے کے بعد روپوش ہو گئی۔

علامہ اقبال نے شاید انہی کے لیے کہا ہے:

اے سوارِ اشہب دوراں بیا

اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

خیز و قانونِ اخوت ساز

دہ جامِ صہبائے محبت باز

دہ باز در عالم بیار ایّامِ صلح

جنگجویاں رابدہ پیغامِ صلح

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر

چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی

کاروانِ زندگی رامنزلی

اے زمانے کے گھوڑے کے سوار اور اے امکانات کی دنیا کو روشن کرنے والے، آ اور دنیا میں اخوت اور محبت کے جذبات پھر سے پیدا کر۔ دنیا میں صلح کا زمانہ واپس لا اور جنگجوؤں کو امن کا پیغام دے۔ دنیا کے باغ میں خزاں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، تو اس میں بہار بن کر آ۔ بنی نوعِ انسان کی فصل کا حاصل اور زندگی کے کارواں کی منزل تو ہی ہے۔"

"اندلس کی کہانی کا خوبصورت اختتام۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی تھی۔ زیاد نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں نے اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ وہ قدیم اندلس میں نہیں تھی۔ وہ ہسپانیہ میں مدینہ الزہراء کے کھنڈرات میں بیٹھی تھی۔ اندلس کی کہانی کا کبھی بھی خوبصورت اختتام نہیں ہوا تھا، کیونکہ ہر عروج کے بعد زوال ہے۔ اور جو قومیں زوال سے اٹھنے کی کوشش نہیں کرتیں وہ مزید پستی کی طرف جاتی ہیں۔ تحت الثریٰ تک!

☆☆☆

”یہ لے جاؤ۔ مجھے رونا آرہا ہے۔“ وہ اپنا ٹیچی کمرے سے باہر نکالتی نم آواز میں اسے کہہ رہی تھی۔ ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑے زیاد نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر ٹیچی پر۔

”میں یاد دلاتا چلوں کہ تم نے گائیڈ ہائر کیا ہے! تم نے تو مجھے ملازم سمجھ لیا ہے۔ تم مجھ سے سوئیپر کے کام بھی لیتی ہو، تم مجھ سے قلی کے کام بھی کرواتی ہو۔ کرایے بھی بھرواتی ہو۔ کھانے کا بل پے کرواتی ہو۔ میں غریب ہوں یار!“ وہ جھنجھلایا تھا۔ اس نے غلط کیا تھا! وہ پٹھانی رو رہی تھی۔ قرطبہ سے جانے پر پہلے ہی دل کے حالات نازک تھے، اب سارا نزلہ اس پر گرنا یقینی تھا۔

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے ہاں؟! اس دن اگر تم نے ذرا سا کرایہ بھر دیا تو کیا سڑک پر آ گئے ہو؟ اور کونسے کام کروائے ہیں میں نے؟! صرف دو سے تین ذرا سے چوہے مروا دیے، ایک عدد چھپکلی اور ذرا سی صفائی کر دی تم نے کمرے کی کیونکہ مجھے ڈسٹ الرجی ہے تو کب تک نخرے دکھاؤ گے؟! اس دن بھی منہ بنائے پھر رہے تھے آج پھر مجھے سنا رہے ہو۔ میری بلا سے بھاڑ میں جاؤ۔ میں کانٹریکٹ ختم کر رہی ہوں۔ تمہارے میرے راستے اب الگ۔ اب چاہے میڈرڈ جاو یا مالاگا، غرناطہ جاؤ یہ قشتالیہ، مجھے شکل مت دکھانا اپنی!“ اس نے بمشکل اپنی آواز دھیمی رکھی تھی۔ چہرہ ایکدم غصے سے لال لال ہونے لگا تھا۔ آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔

”ذرا سے چوہے۔ ذرا سی چھپکلی اور کہاں کی ڈسٹ الرجی سینیوریتا؟! یہ ڈسٹ الرجی اس وقت کہاں تھی جب آپ مدینہ الزہراء کے کھنڈرات میں مزے سے پتھر پر چڑھ کر بیٹھی تھیں۔ ارد گرد مٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تب تو کوئی الرجی نہیں تھی آپ کو؟!“ وہ آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر گڑبڑائی۔ پھر دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔

"اب تم ایک خاتون کو ڈرامے باز ثابت کرو گے غیور مشرقی لڑکے؟" تیر ٹھاہ کر کے اس کی غیرت پر لگا تھا۔

"میں ہرگز یہ نہیں کروں گا ظاہر ہے نہیں"!!

"ہاں ورنہ غیرت سے تمہارے کان لال ہو جائیں گے۔" اس کے تیزی سے بات کاٹنے پر زیاد نے منہ کے زاویے بگاڑے۔

"میرا مذاق مت بناؤ مجھے سنجیدہ لو! آئندہ تم کسی ہوٹل میں اپنی رہائش کا انتظام کرنا، میں کہیں کسی میدان میں خیمہ لگا کر سو جاوں گا لیکن ہر شہر جا کر کسی ہاسٹل کی چھٹی منزل پر پہلے تمہارا سامان چڑھانا اور پھر تمہارے لیے چوہے، چھپکلیاں مارنا، سوئیپر بننا مجھ سے نہیں ہو گا۔ میری طرف سے معذرت!" اس نے سر کو خم دیا۔

"ہاں کیونکہ تم نے تو اس ہفتے کی فیس لے لی ہے، میں ہوٹل میں ہونگی اور تم بھاگ جاؤ گے۔ اب کیا تمہارے ارادے چور بننے کے ہیں؟!" زیاد کا دل کیا تھا وہ اپنا نہیں تو اسی کا سر پیٹ ڈالے۔ اپنا نقصان کیوں کرنا بھلا؟!

"میں غیور مشرقی لڑکا ہوں، چوری ڈاکا مجھے زیب نہیں دیتا!" اس نے گویا اعلان کیا۔

"ورنہ غیرت سے کان لال ہو جاتے ہیں۔" اس نے آنکھیں گھمائیں۔ مکمل اسے تپا کر چھوڑا۔ وہ دانت کچکچا گیا۔

"اس ہفتے کی جو فیس لی ہے وہ واپس کرو اور کانٹریکٹ کو پھاڑ کر کوڑے دان میں ڈال دو۔ میں کسی اور گائیڈ کو ہائر کرلوں گی۔ اور یہ میں خود ہی لے جاوں گی!" وہ ایک ادا سے کہتی زیاد کے پاس رکھا ٹیچی اٹھانے کے لیے آگے آئی تھی جو بالکل سیڑھیوں کے کنارے پڑا تھا۔ زیاد نے اس کے پہنچنے سے پہلے ٹیچی کو وہاں سے ہٹالیا۔ وہ اسے پکڑنے لگی تھی کہ اپنا ہی عبایا پاؤں میں آیا۔ وہ اوندھے منہ سیڑھیوں سے گرنے لگی تھی جب وہ فوراً سے پیشتر اس کے اور سیڑھیوں کے درمیان اپنا بازو حائل کر چکا تھا۔ اس کی پیشانی زیاد کے بازو سے ٹکرائی تھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر دوسرے ہاتھ سے اسے سہارا دے کر سیڑھیوں سے پیچھے کیا۔

"یہاں سے گرتیں تو لاش بھی نہ ملتی۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"اور تم میری لاش ڈھونڈنے کے بجائے میرا سامان سمیٹ کر بھاگ جاتے۔" وہ بھی سنجیدہ تھی۔

"مجھے افسوس ہے تم میرے ارادے سے باخبر ہو۔ بہرحال دھیان سے چلا کرو ہر بار سیڑھیاں نہیں ہونگی کبھی غرناطہ کی برجیں یا قرطبہ کی فصیلیں بھی ہو سکتی ہیں۔۔۔"!

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ قدموں میں رکھا اپنا سفری بیگ کندھے پر ڈال کر تکیہ بغل میں دبا کر اس کا ٹیچی گھسیٹتا سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔ سعاد نے ریلنگ سے نیچے جھانک کر اسے دیکھا۔

تو، یہ اتنا لڑتا کیوں ہے؟! غیور مشرقی لڑکا۔۔۔ واللہ!

☆☆☆

وہ نم آنکھوں سے قرطبہ کے اس اونچے مینار کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہاں سے نہیں جانا تھا۔ قرطبہ، اموی دمشق، صرف چند قدم اور یہ شہر صرف ماضی کی ایک یاد بن جانے والا تھا۔ بھولا بسرا قرطبہ، وہ قرطبہ کی محرابوں کو کبھی نہیں بھلا پائے گی۔

میں ایک بید کے درخت کی مانند ہوں۔۔

اس دیوار کا وہ پر تقدس لمس جس پر اس کا ایمان لا الہٰ الا اللہ درج تھا، جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا تھا اور وہ سجدہ جو مسجد قرطبہ کے فرش پر ادا ہوا تھا۔ وہ اس سب کو پیچھے چھوڑنے والی تھی۔

میں ایک بید کے درخت کی مانند ہوں،

ہوا تھم جائے تو ساکت کھڑا رہتا ہوں۔۔

وہ یہاں سے نہیں جا پائے گی۔ وہ کیسے جا سکتی تھی؟! اموی شہزادے عبدالرحمن کی سلطنت قرطبہ کو چھوڑ کر۔ وہ

قرطبہ جس کی سڑکوں پر بڑے بڑے عالم وفاصل لوگ ہاتھوں میں کتابیں لیے پھرتے تھے۔ وہ قرطبہ جو خوشبوؤں کا شہر تھا۔ وہ اداس تھا مگر حسین بھی تو تھا۔

اور اگر ہوا چل جائے تو میں بھی حرکت میں آجاتا ہوں۔

کھجور کا تنہا درخت، اجنبی اپنے وطن سے دور۔ قرطبہ کی اسی چوٹی سے عبدالرحمن کسی فاتح کی مانند نمودار ہوا تھا، اپنی سلطنت میں، اپنے قرطبہ میں۔

وہ نہیں جا سکی۔ وہ رک گئی۔ وہ پیچھے پلٹی اور پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔ ہوا نے اس کا ساتھ دیا۔ گالوں پر نمی کا احساس ہوا۔ آنسو بہتے گئے، راستہ صاف ہوتا گیا۔ وہ سامان گاڑی میں رکھ کر پلٹا اور پھر اسے وہاں نہ پا کر اس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

"سعاد سعاد۔۔۔ سعاد رکو۔۔ سعاد!" وہ اسے قرطبہ کے مینار کی طرف بھاگتا دیکھ کر چلایا تھا۔

اور کوئی حیرت نہیں، اگر کوئی قرطبہ میں آکر دیوانہ ہو جائے۔

☆☆☆

ایک شب، اشبیلیہ میں۔

"روایت ہے کہ سانتا کروز میں ایک سو گیارہ چوک ہیں۔ ہر چوک کے پاس ایک قدیم لالٹین ہے اور ہر لالٹین کے پاس ایک آوارہ گرد بیٹھا ہوتا ہے۔ تم دیوانہ بھی کہہ سکتی ہو۔" سفری بیگ کندھوں سے اتار کر بغل میں دبا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر وہ ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

سانتا کروز کا گھوم گھوم کر جائزہ لیتی سعاد نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ "وہ سامنے ایک سو گیارہواں چوک خالی ہے۔ تم بیٹھ سکتے ہو۔" ہاتھ سے اس کے عقب میں اشارہ کر کے وہ پلٹ گئی۔ وہ مدھم سا مسکراتے ہوئے آنکھیں موند گیا۔

وہ تھک چکا تھا،بے حد تھک چکا تھا۔ اسے اشبیلیہ دیکھنے سے پہلے سونا تھا بہت سارا سونا تھا۔

سانتا کروز اشبیلیہ میں وہ قدیم محلہ ہے جہاں مسلمانوں کے دور حکموت میں یہودی رہائش پذیر تھے۔ بعد میں عیسائی حکموت کی طرف سے یہودی اندلس سے نکال دیے گئے۔ کچھ مار دیے گئے اور کچھ کو غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارنا پڑی۔

یہ محلہ اپنے تیئں بہت خوبصورت ہے۔ ہری بھری گھاس ہر طرف نظر آئے گی۔ پودے، سبزہ، پھولوں کی مہک۔ قدیم روشن لالٹینیں اور تنگ گلیاں۔ جدیدیت کے اس دور میں بھی یہاں ماضی کے مٹے مٹے سے مدھم سے آثار کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ رات کے دس بجے برقی جگنوؤں سے روشن سانتا کروز اپنی مثال آپ تھا، بے مثال تھا۔

”تو، راہبہ تھریسا سانتا کروز کی گلیوں سے متاثر ہو کر کہتی ہیں کہ؛ جو لوگ اتنے خوبصورت شہر میں پاکیزہ رہتے ہیں، کمال کرتے ہیں۔“ اس نے آنکھیں کھول لیں۔

”یہ اتنا مشکل کام نہیں جو جگہ جگہ صلیب لگائی ہوئی ہے۔ کہیں تو بخش دیتے۔“ اس نے منہ کے زاویے بگاڑے۔ اشارہ اس کھمبے کے اوپر سیدھ میں کھڑی صلیب کی طرف تھا جس کے نیچے وہ بیٹھا تھا۔

”آپ دار الحرب میں ہیں سینیوریتا“!

”اندلس کی زمین مسلمانوں کے خون سے زرخیز ہوئی ہے۔ کئی معماروں کا پسینہ ہے جس نے اندلس کے ہر پتھر کو موتی میں بدلا ہے۔ دل نہیں مانتا اسے دار الحرب کہنے پر۔ یہ دار الاسلام تھا، حال تو پھر فریب ہے۔ مستقبل کا حال تو نہ میں جانوں نہ تم!“ وہ مسکرائی۔ دھیرے سے، ہلکا سا۔

”یہ سب کہنے میں بہت اچھا ہے۔ مگر جب انہی معماروں کی زبانیں اور ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں تو قدم خود بخود

پیچھے ہٹتے ہیں سینیوریتا!" اس کی آواز کئی پل ہوا کے ساتھ سفر کرتی ارد گرد گونجتی رہی۔ وہ خاموش رہی۔ سانتا کروز کی گلیوں میں روشنی سے لڑتا اندھیرا اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ وہ فاتح ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

"اشبلیہ کا امیر معتمد باللہ ایک بلند پایہ شاعر تھا مگر قسمت نے اسے مظلوم عوام پر حکمران بنا دیا تھا۔ اس کے امرا، وزراء، خواجہ سرا، ملازم سب کے سب شاعر تھے۔ معتمد کے باپ نے جب شلب کی فتح کے لیے فوج روانہ کی تو اس کا سپہ سالار معتمد کو مقرر کیا۔ محاصرہ شلب کے دوران معتمد کی ملاقات ابن عمار سے ہوئی۔ *[1] بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب معتمد گیارہ سال کا تھا تو اسے صوبہ دلبا کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اسی گورنری کے دوران اس کی ملاقات ابن عمار سے ہوئی جو خچر پر سوار مسرت سے اشعار پڑھ رہا تھا۔ اس کی خوشی کی وجہ جو کا ایک توبرا تھا جو اسے حال ہی میں ملا تھا۔ *[1]

ابن عمار نے معتمد کی شان میں پہلا قصیدہ لکھ کر ہی اسے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ دونوں کے درمیان دوستی کے پھول کھلے اور انہی پھولوں نے اشبلیہ کے پھولوں کو اجاڑ دیا، وہ پھول زہریلے تھے۔ معتمد سپاہیانہ خصلتوں کا مالک تھا۔ وہ بہادر تھا اور جرات مند بھی۔ وہ میدان جنگ میں شیر کی طرح گرجتا تھا۔ اگر اسے اچھے لوگوں کی دوستی نصیب ہوتی تو یقیناً اندلس میں آیا خزاں کا موسم بہار کو خوش آمدید کہتا۔ مگر اس کی دوستی ابن عمار سے ہوئی تھی جو شان و شوکت کا بھوکا تھا۔ معتمد نے جب سلطنت کی باگ دوڑ سنبھالی تو ابن عمار کو شلب کا گورنر مقرر کیا۔ ابن عمار نے سب سے پہلے اس شخص کو چاندی کی ایک تھیلی بھیجی اور کہا کہ اگر اس دن تم مجھے جو کے بجائے گندم دیتے تو آج میں تمہیں چاندی کے بجائے سونا دیتا۔ معتمد کے دربار میں شاعروں کی کمی نہ تھی مگر وہ ابن عمار کی جدائی نہ برداشت کر سکا اور اسے شلب کی گورنری سے ہٹا کر سلطنت کی وزارت اس کے ہاتھ میں دے دی۔

ایک شب معتمد اور ابن عمار دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے دریا کی سطح میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔"

وہ رک کر اسے دیکھنے لگا جو بغور اپنے سامنے وادی الکبیر کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پانی کی سطح پر لہریں سی بن رہی تھیں۔ پانی جس پر چاند کا عکس نمایاں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تو وہاں بے انت تاروں کی حکمرانی میں آفتاب کھڑا تھا۔ سالوں پہلے بھی، وہ ایسی ہی کوئی شب ہو گی۔۔ مسرت بخشتی، ٹھنڈی۔ دلکش آسمان اور موتیوں کی طرح بکھرے تارے۔۔

"نسیم کے جھونکوں سے پانی کی موجیں زرہ بن گئیں*

معتمد نے پانی کو دیکھتے ہوئے یہ مصرع کہا۔ ابن عمار ابھی دوسرا مصرع سوچ ہی رہا تھا کہ کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

اگر پانی کی سطح منجمد ہو جاتی تو لڑنے والے کے کام آسکتی۔*

معتمد کا دل اس مصرع پر زیر ہوا اور اس نے اپنے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ خاتون کو اس کے القصر پہنچایا جائے۔ القصر میں معلوم ہوا کہ وہ رمیک کی لونڈی تھی جسے سب رمیکیہ کہتے تھے۔ معتمد نے اسے اپنی ملکہ بنالیا۔

شاہ اشبیلیہ معتمد، ابن عمار اور رمیکیہ وہ لوگ ہیں جنہیں اقتدار و ہوس نے یوں دھکیلا کہ ان کے درمیان میں اشبیلیہ پس کر رہ گیا۔ رمیکیہ سے شادی کے بعد معتمد کی زندگی مزید رنگین ہوگئی۔ حق گو اس بات سے نالاں تھے کہ رمیکیہ نے معتمد کو عیش و نشاط میں مبتلا کر رکھا ہے۔ معتمد اس کے ہر حکم کو پورا کرنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا تھا۔ شعر و نغمہ کی مجلسوں کا نظام ابن عمار نے سنبھال رکھا تھا اور حرم کے عیش و نشاط کو رمیکیہ نے اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ معتمد اس سب کے نشے سے کبھی باہر نہیں نکلتا اگر الفانسو اشبیلیہ کے دروازے پر دستک نہ دیتا تو۔۔! الفانسو سے لڑنے کے لیے معتمد نے یوسف بن تاشفین کی مدد مانگی۔ یوسف بن تاشفین الفانسو کو شکست

دینے کے بعد وعدے کے مطابق ان کے گرتے ہوئے تخت کو سہارا دے کر واپس افریقہ چلا گیا۔ معتمد ایک بار پھر شعر و شاعری میں ڈوب گیا۔ جنگ زلاقہ کے چودہ برس بعد عیسائی فوجیں اندلس کے دروازوں سے ٹکرانے لگیں۔ امیر المسلمین یوسف بن تاشفین نے عیسائیوں کی فوج کو شکست دینے کے بعد اندلس کے علاقے فتح کرنا شروع کیے۔ معتمد اپنے قلعے میں محصور ہو گیا۔ سب اسے سمجھاتے رہے کہ اطاعت قبول کرلو مگر وہ اس لمحے بھی شعر پڑھتا تھا۔

میں شکست نہیں کھا سکتا، میں نے ذرہ بکتر کے بغیر بھی جنگیں لڑی ہیں۔

مرابطین اشبیلیہ کی فصیل کو توڑ کر اندر داخل ہوئے اور معتمد کا تخت و تاج الٹ کر رکھ دیا۔ معتمد کو گرفتار کر کے افریقہ بھیج دیا گیا۔ اس کے آخری ایام کافی مشکل میں گزرے۔ علامہ اقبال نے دورانِ قید اس کے حالات ایسے بیان کیے ہیں؛

اک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رُخصت ہُوا، جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حُر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
مَیں پشیماں ہوں، پشیماں ہے مری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھِنچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی
جو مری تیغِ دو دم تھی، اب مری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی۔۔"!

وہ خاموش ہوا۔ اس نے وادی الکبیر کے پانی کو دیکھتے ہوئے جھرجھری لی۔ ''ہم معتمد کا القصر دیکھنے ضرور جائیں گے۔''

''مرابطین نے معتمد کے القصر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں، اور اس کے عزت داروں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں۔ معتمد کی مہربانیوں سے جو القصر عیش و نشاط کا ڈھیر بنا تھا، مرابطین اسی ڈھیر پر اپنی سلطنت قائم نہیں کر سکتے تھے۔ ہر شے کو زیر و زبر کر دینا ہی اولین شرط ہے!''

اس نے گہری سانس لی۔ ''ماضی کے القصر اور اب جو القصر اشبیلیہ میں ہے اس میں بہت فرق ہے۔ تم پھر بھی اسے دیکھنا چاہو گی؟'' وہ گردن ترچھی کیے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''مکمل ماضی نہ سہی مگر ماضی کے مٹے مٹے نشانات تو ہونگے ناں!'' وہ کندھے اچکا گئی۔

اسے معتمد کے لیے تھوڑا دکھ ہوا تھا۔ کاش اس کی دوستی ابن عمار سے نہ ہوتی، کاش اس کی ملاقات رمیکیہ سے نہ ہوتی تو شاید آج اندلس۔۔۔

وادی الکبیر کے پانی سے ہوا کا تیز جھونکا گزرا۔ پانی میں لہریں سی پیدا ہوئی اور چاند کے عکس کو پھیلا دیا۔ آسمان پر جم کر کھڑے بے انت تارے ان دونوں پر اس تاریکی میں بھی روشنی کیے کھڑے تھے، جو وادی الکبیر میں اٹھتی لہریں دیکھ رہے تھے۔

وہ، اندلس میں دو اجنبی۔۔۔ اندلس میں دو مسافر!

سینیوریتا سعاد اور سینیور زیاد!

☆☆☆

جب باد نسیم چلتی ہے تو غرناطہ کے اشتیاق میں

سوزش قلب اور سوزش دید پیدا ہوتا ہے۔

خدا غرناطہ کی ہر گھاٹی کو

برسنے والے بادلوں سے سیراب فرمائے۔

یہ وہ شہر ہے جس کے گھروں میں حسن رچ گیا ہے۔

اور یہ وہ سرزمین ہے جس کے شوق دید میں غم غلط ہوتا ہے۔

اے بلند ترین غرناطہ تجھے خدا کی قسم ہے بتا

کیا اک سرگرداں اور گریاں شخص کے لیے تیری طرف کوئی راہ ہے؟

مجھے اس کے مناظر کی تروتازگی اور وادیوں کی عمدگی نے

مشتاق بنادیا ہے اور یہی چیز ہں آنکھوں کی طراوت ہیں۔

اے مخاطب دیکھ اور جب تو دیکھے گا

کہ قصر الحمرا سے تجھ تک گلِ لالہ کا سلسلہ قائم ہے۔

جب غرناطہ کے بلند مقام پر پھریرے لہراتے ہیں۔

اس وقت گویا شفق پر بجلیاں چمکتی ہیں۔

دریائے شنیل نے نیام سے ہندی تلوار کھینچ لی ہے

جس پر موتی اور عقیق جڑے ہوئے ہیں

اس کے درخت پیلو سے جب خوشبو پھیلتی ہے

تو دانہ مشک کی خوشبو کا دھوکہ ہوتا ہے

اور جب چشمِ ابر اشک ریز ہوتی ہے

تو اس کے باغوں میں بابونہ کے غنچے کھل جاتے ہیں۔

(بن حسّان)

سرزمین غرناطہ! وہ جادوئی شہر کہ جس کے جادو کا نہ کوئی رد ہے نہ توڑ۔ نہ تدبیر ممکن ہے نہ انکار!

غرناطہ کی طرف اٹھتا ان کا ہر قدم دھڑکنوں کی رفتار کو سست کر رہا تھا۔ غرناطہ وہ سحر تھا جس نے پاکستان سے انہیں سخت ڈور میں جکڑ رکھا تھا، اس ڈور کا سرا یہاں آکر کھلنا تھا۔ کھلنا تھا یا مزید الجھ جانا تھا؟! دو مسافر، سفری بیگ کندھوں پر ٹکائے دھیرے سے آگے بڑھے۔ ساتھ ساتھ، برابر برابر۔ ان کے اٹھتے قدم غرناطہ کی زمین پر رکے۔ وقت گویا تھم گیا۔ ہوائیں ساکت ہوئیں، فضائیں معطر ہوئیں، دھڑکنیں منتشر ہوئیں، سانس لینا محال ہوا۔

اشبیلیہ روشنیوں کا شہر ہے، قرطبہ خوشبوؤں کا شہر اور غرناطہ، غرناطہ بس غرناطہ ہے۔ ایک نابینا گداگر نے جب غرناطہ کے ایک دروازے پر دستک دی تو وہاں کے مالک نے اپنی بیوی سے کہا، ”اس شخص کو بھیک دو کہ غرناطہ جیسے شہر میں ہونا اور نابینا ہونا، اس سے بڑی اذیت کوئی نہیں۔“

آج اہلِ غرناطہ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں، ”یہ آفت معمولی ہے، غرناطہ کے چھن جانے کے غم سے کہیں کم!“ وہ اداس ہوں تو پوچھا جاتا ہے، ”خیر تو ہے غرناطہ تو نہیں چھن گیا؟“!

دونوں نے گردنیں ترچھی کر کے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مسکرا دیے۔ یہ وہ سرزمین ہے کہ جہاں جو آیا کبھی پلٹ کر واپس نہ گیا جب تک کہ نکالا نہ گیا۔ یہاں سے واپسی کٹھن ہے، ناممکن ہے۔

”رات ہو گئی ہے۔“ اطلاع دی گئی ہے۔ روشنیوں میں نہائے غرناطہ پر ایک نگاہ ڈالی گئی۔

"یہ رہا ایڈریس۔" اس نے رقعہ آگے بڑھا دیا۔ وہ کچھ لمحے رقعے کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا اور ناکام ہونے پر قریب ہی ایک ہسپانوی شخص کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے غرناطہ کو دیکھنے لگی۔ غرناطہ، اندلس میں مسلمانوں کی آخری ریاست۔ ماضی کے وہ ادوار اب جدیدیت کی روشنیوں کے آگے اپنی چمک کھو بیٹھے تھے۔ مگر وہ محسوس کر سکتی تھی۔ غرناطہ کی فضاؤں میں، ماضی کی رونقیں، خون کی خوشبو، تلواروں کی گرج، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، آنسو اور پھر وقت کا پہیہ جو الٹا گھومنے لگا تھا۔ ٹک ٹک ٹک!

"ہم قریب ہی ہیں۔ بس چند گلیوں کے بعد ہے یہ گھر۔ کیفے الکزابا کے پاس۔" وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ جدید ہموار سڑکوں کو عبور کرتے ہوئے وہ اپنی منزل کے قریب ہو رہے تھے۔ رات گہری ہو رہی تھی۔

"سینیور زیاد! تم نے مجھے غرناطہ کی کہانی نہیں سنائی۔" اس نے شکوہ کیا تھا۔ وہ غرناطہ پہنچ چکی تھی مگر غرناطہ کی کہانی سے انجان تھی۔ غرناطہ کے ماضی سے انجان۔

"غرناطہ کی کہانی میں تمہیں غرناطہ کے الحمرا میں بتانا چاہتا ہوں۔ بارہ شیروں کے صحن میں۔" وہ مسکرایا پھر نظر بھر کر اسے دیکھا۔ "سنیں سینیوریتا۔"

"ہاں۔" وہ اس گھر کے قریب پہنچ چکے تھے جس کا پتہ انہیں سان سباستیان میں ہسپانوی خاتون نے دیا تھا۔ زیاد نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"میری امی نہیں ہیں جو میری غیرت کو زن مریدی کا نام دیں۔۔" اس نے یہ بات اتنی اچانک کہی تھی کہ وہ بری طرح بوکھلائی تھی۔ اس کی امی کی تعزیت کرتی یا اس کی بات میں چھپے مطلب کو سمجھتی؟! "اور میرا کوئی خاندان نہیں ہے جو میری غیرت کو یہ نام دینے کا حق رکھتا ہو۔" چشمے کے پار، اس کی آنکھیں مسکرائی تھیں۔ وہ پینٹ کی

جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا مسکراتے ہوئے اس پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔ وہ اڑتی ہوئی رنگت لیے دعا کر رہی تھی کہ دروازہ کھل جائے۔ مگر وہ نہیں کھلا۔

"مجھے سن کر افسوس ہوا۔" اس نے تھوک نگلا۔

"میں ہارنا چاہتا ہوں، تم سے۔ میں ہار چکا، تم سے۔۔ سینیوریتا سعاد!" اس نے آنکھوں میں بے پناہ حیرت سموئے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھیں حیرت کی وجہ سے پھیل کر بڑی ہوئی تھیں۔ غرناطہ کی تمام روشنیاں ان آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ ننھے جگنوؤں کی مانند!

"کیا تم، سینیوریتا سے۔۔ سینیوراتک کا سفر طے کرنا چاہو گی۔۔ میرے ساتھ؟!" وہ دیوانہ تھا، احمق تھا، دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔ جانتا تھا صرف چند دن بعد وہ واپس جا رہی تھی، اندلس سے۔ خود وہ پاکستان میں نہیں رہتا تھا کیسی بچوں والی بات تھی۔ سپیرا سینیور!

"یہ ناممکن ہے۔" اس کے لب واں ہوئے تھے۔

"یہ ممکن ہے۔ پلیز۔" لہجے میں التجا در آئی تھی۔ اور پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ فوراً اپنا رخ دروازے کی طرف موڑ گئی۔

"میں پاکستان سے ہوں۔ اندلس میں آئے تیسرا ہفتہ ہونے کو ہے۔ مجھے سان سباستیان میں ملنے والی ایک ہسپانوی خاتون نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا تھا آپ کو اطلاع دے دیں گی۔" وہ ایک ہی سانس میں جلدی جلدی بول رہی تھی۔ دروازے پر کھڑے بوڑھے ہسپانوی ملازم نے اس کی تقریر پر نا سمجھی سے سر تا پیر اس کا جائزہ لیا پھر اس کے عقب میں کھڑے زیاد کو دیکھا۔ اشارے سے اسے اپنے پاس بلا کر ہسپانوی زبان میں کچھ کہا جو وہ دونوں سمجھنے سے قاصر رہے۔ بوڑھے نے گہری سانس لی پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انہیں اپنی بات سمجھانے کی

کوشش کی کرنے لگا۔

”سینیورا، نو نو۔ یو سینیوریتا، کم کم۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کا کہہ رہا تھا۔

”گھر کی مالکن گھر پر نہیں ہیں مگر اسے پیغام دے کر گئی ہیں کہ آپ لوگ آئیں تو آپ کو اندر بٹھا دے۔“ قریب ہی کھڑا ایک ہسپانوی بچہ جو اس سب سے محظوظ ہو رہا تھا، بوڑھے ملازم کے الفاظ کی انگریزی میں ترجمانی کرتا آگے آیا۔

”گراسیا۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ ”اب بچے کو ہسپانوی زبان میں کیا کہتے ہیں؟!“ وہ جھنجھلائی۔ بچہ ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ ان دونوں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

”یہ کیا کر رہے ہو؟ غیور مشرقی لڑکے تم اب چوری بھی کرو گے؟!“ وہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے بے ساختہ چلائی تھی۔

”کافی پیو گی؟“ وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتا سکون سے پوچھ رہا تھا۔ سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس سیاہ ہی پی کیپ سر پر ٹکائے وہ فرصت سے ایک ایک کیبنٹ کو کھول کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ شیلف پر نمکو، بسکٹس، پیسٹریز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کی حرکتیں دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر فریج کی طرف بڑھی۔ اگر غیور مشرقی لڑکا چور بن سکتا تھا تو وہ کونسی دلیل دے کر خود کو روکتی؟!

فریج کھول کر اس نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں پھر سامنے رکھے چاکلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے جیسے ہی چاکلیٹ اٹھایا کسی نے پیچھے سے آ کر چاکلیٹ اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔

”یہ میرا ہے۔“ وہ اس کے عین پیچھے کھڑا فریج کے اندر جھانکتے ہوئے اسے مطلع کر رہا تھا۔ ”تم یہ لے سکتی ہو۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر آئسکریم اٹھا کر اسے پکڑائی پھر پلٹ گیا۔ وہ ایک بار پھر گہری سانس لیتی کاونٹر سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی۔ وہ اب شرٹ کے بازو اوپر چڑھاتا دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھ رہا تھا۔ وہ بغور اسے دیکھے گئی۔ وہ ایک اچھا لڑکا تھا۔ اچھا مشرقی لڑکا! جس کے ساتھ وہ ہمیشہ محفوظ محسوس کرتی آئی تھی۔ وہ اپنی حدود میں رہنے والا لڑکا تھا، عزت کی حفاظت کرنے والوں میں سے تھا۔ ادب کے دائرے میں رہتا تھا۔۔۔ اور۔۔ اور۔۔ کسی نے اس کے پاس کرسی رکھی تھی۔ ہاں، اسی غیور مشرقی لڑکے نے۔

"تم بیٹھ کر اپنے دل و دماغ کو میرے بارے میں رائے کا اظہار کرنے کا کہہ سکتی ہو۔" وہ مسکرا کر کہتا پلٹ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"زیاد۔۔ آئی ایم سوری لیکن تمہیں نہیں لگتا کہ۔۔۔"

"آپ کو زیاد تاشفین نے پیغام نہیں بھیجا سینیوریتا! آپ کو ایک معمولی لڑکے نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ آپ کو اپنا ہمسفر بنانا چاہتا ہے۔ آپ اندلس میں ملنے والے اجنبی زیاد کو دماغ سے نکال کر صرف اس لڑکے کے پیغام پر غور کر سکتی ہیں؟ براہِ مہربانی!" وہ چند لمحے یک ٹک اسے دیکھے گئی پھر خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ اسے مشکل میں ڈال چکا تھا۔

☆☆☆

رات کو ملازم نے انہیں ان کے کمرے دکھا دیے تھے اور ساتھ ہی اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا تھا کہ اس کی مالکن آج نہیں آنے والیں۔ تھکن سے چور ہوتے جسموں کے ساتھ جب دونوں اپنے بستروں پر لیٹے تھے تو دنیا جہاں کا ہوش نہ رہا تھا۔ صبح تقریباً دس بجے دونوں اپنے اپنے کمروں سے نکلے تھے اور سامنے ہی گھر کی مالکن، یعنی اپنی میزبان خاتون کو پایا تھا۔

"گڈ مارننگ آنٹی۔" سعاد مسکراتے ہوئے ان سے بغلگیر ہوئی تھی۔ ان خاتون نے بھی کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا تھا۔

"تم دونوں رات ٹھیک سے سوئے؟" دونوں نے فرمانبردار بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میری دوست کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اچانک جانا پڑا اور رات بھی وہیں قیام کیا۔ حامد کی دادی نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم دونوں آؤ گے۔ معذرت بچوں میں تمہیں خوش آمدید نہ کہہ سکی۔" وہ سعاد کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھاتے ہوئے پشیمانی سے کہہ رہی تھیں۔

"ارے آنٹی کوئی بات نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ ہماری رات بہت اچھی گزری۔" زیاد خاموشی سے دوسرے صوفے پر بیٹھتا دونوں کی پُر تکلف گفتگو سن رہا تھا۔

"ناشتہ کر لیا تم دونوں نے؟"

"نہیں۔ آپ کروا دیں گی تو بہت مہربانی۔"

"میں ابھی کہہ کر آتی ہوں ناشتے کا۔ تم دونوں بیٹھو۔" وہ انہیں تاکید کرتیں اٹھ کر چلی گئیں۔

"غرناطہ دیکھنا ہے یا پہلے الحمرا چلنا ہے؟" زیاد کے سوال پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"الحمرا چلیں؟"

"ٹھیک ہے۔ اور کل صبح کا ناشتہ ہم کیفے الکزابا کے باہر لگی میزوں پر کریں گے۔ اگر تم ان خاتون کو ناشتے کی تیاری کا حکم نہ دے دو تو۔۔"!

"ٹھیک ہے نہیں کہوں گی۔ تمہیں اعتراض تھا تو کہہ سکتے تھے۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

"مجھے اعتراض تمہاری اب تک خاموشی پر بھی ہے۔" زیاد نے جیسے اسے کچھ یاد دلایا تھا۔ تبھی ملازم ہاتھ میں ٹرے

لیے وہاں آیا تھا۔ ٹرے میز پر رکھی پھر چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ زیاد واپس سعاد کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے فیصلے لینے نہیں آتے۔ تم بھائی سے ملنے آجانا۔" وہ کچھ لمحے سوچنے کے بعد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ زیاد نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ٹرے میں رکھا کافی کا کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خفا خفا سی نظروں سے اسے دیکھتی کپ تھام گئی۔

"ناراض ہو؟"

"خیال رکھنا کہیں مجھ سے ہارتے ہارتے مجھے نہ ہار جاؤ!" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر زیاد نے کم فہمی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"سعاد۔۔"

"تم خدا جانے کہاں کے رہنے والے ہو؟ خدا جانے کون ہو؟ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ تو پھر اس سب کی تُک کیا بنتی ہے؟!" وہ جھنجھلائی تھی۔

"تمہیں جاننا چاہتا ہوں تبھی تو ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ تمہیں یہ کیوں لگ رہا ہے کہ پہلے جاننا ضروری ہے؟ ایک طرف مجھے غیور مشرقی لڑکا کہتی ہو، میری غیرت یہ گوارا کرے گی کہ پہلے تمہیں جاننے کے لیے تعلق قائم کروں۔ سالوں تک گھسیٹوں اور پھر کہوں کہ تم میرے مطابق نہیں؟! سمجھ رہی ہو ناں۔۔؟" وہ نرمی سے اسے سمجھاتا اپنی نشست کے کونے پر بیٹھا تھا۔ "مجھے اس موقع پر مولانا رومی کا وہ قول یاد آرہا ہے۔

I once had a thousand desires. But my one desire to know you,
All else melted away..."

وہ کتابیں پڑھتا تھا۔ لفظوں کی مار مارنا بخوبی جانتا تھا۔ ٹھیک تاک کر اور سیدھا نشانے پر! وہ چند لمحے خاموش رہی۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بچپن مراکش میں گزرا، لڑکپن پاکستان میں۔ جوانی کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ تم فیصلہ کرو کہاں سے ہوں؟" وہ مسکرایا تھا۔ دھیرے سے، ہلکا سا۔ اسے کیسے بتاتا کہ جن کا کوئی خاندان نہیں ہوتا وہ کہیں کے نہیں ہوتے، وہ کہیں کے نہیں رہتے۔

"مجھے یہ آفر کیوں دے رہے ہو؟"

"توس افوس سون پیراسیوس۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "کسی شاعر کے خواب کی دنیا، اندلس میں میری ملاقات ایسی لڑکی سے ہوئی جو کسی شاعر کا خواب ہو سکتی ہے۔ میں یہ خواب دیکھنے کا حق چاہتا ہوں!" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

وہ لب دانتوں میں دبائے تذبذب سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم شاعر ہو؟"

"شاعر نہ سہی۔۔ اشعار چور ہی سہی!" وہ سہولت سے کندھے اچکا گیا۔ سعاد نے لمبی سانس لیتے ہوئے گردن صوفے کی پشت پر گرائی تھی۔

"دیوانے ہو تم، پاگل کر دو گے مجھے۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑائی تھی۔

"میں ہاں سمجھوں؟" اس نے قدرے احتیاط سے پوچھا تھا۔

"بھائی سے رابطہ کرو۔ مجھے یہ چند دن غرناطہ میں سکون سے رہنے دو۔ ورنہ میں تمہیں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔ میں ہو جاؤں گی بالکل ہو جاؤں گی!" اس کی حالت دیکھ کر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا جیسے کہ۔۔ وہ پاگل ہو چکی تھی۔ مگر کہہ نہیں سکتا تھا، مجبوری تھی۔

"دیوانی!" وہ بڑبڑاتے ہوئے کافی کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ وہ اب سر ہاتھوں میں دیے بیٹھی تھی۔ زبان پر ورد جاری تھا۔ یہ پاگل ہے، احمق ہے۔ مجھے بھی کر دے گا، دیوانہ کہیں کا۔

☆☆☆

کسی سیاح نے پوچھا

یہ کس کے لہو کی خوشبو ہے؟

ہواؤں میں، فضاؤں میں۔۔

پلٹ کر یوں کہا میں نے،

کوئی سولی چڑھا ہو گا۔

یا پھر گولی چلی ہو گی۔

یہ مقتولوں کی دھرتی ہے۔۔

یہ منصوروں کی دھرتی ہے۔۔!

وہ قصرالحمرا میں تھے۔ غرناطہ کے الحمرا میں! ان کے دائیں بائیں دونوں جانب سبز اونچے درخت تھے۔ درمیان میں سیدھ میں جاتا راستہ تھا۔ وہ راہ جس پر پڑتا ہر قدم دھڑکنوں کو منتشر کر رہا تھا۔ بس کچھ قدم اور پھر وہ ان قدیم دیواروں کو دیکھ رہے ہونگے۔ وہ قدیم دیواریں جہاں ہر سُو یہ پیغام درج تھا، لا غالب الا اللہ!

"اشبیلیہ معتمد کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ قرطبہ اموی شہزادے عبدالرحمن الداخل کی مرہون منت بلندیوں تک پہنچا۔ اسی طرح غرناطہ کا ذکر کرتے ہوئے الحمرا کے اولین معمار محمد الاحمر کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ الاحمر ایک ایسے دور میں غرناطہ کی سلطنت پر تخت نشین ہوا کہ جب قشتالیہ کا عیسائی حکمران فرڈیننڈ، اشبیلیہ اور قرطبہ جیسی عظیم ریاستوں کے دروازوں پر تیر برسا رہا تھا۔ الاحمر صرف اپنی ریاست بچانے کی خاطر فرڈیننڈ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا اور اس نے فرڈیننڈ کی اشبیلیہ کو زیروزبر کرنے کی مہم میں اپنی سپاہ میں پانچ سو سوار فرڈیننڈ کو مہیا کیے۔

یہ ایک قابلِ افسوس اور نا قابلِ تلافی حرکت تھی۔ جب الاحمر اس مہم سے واپس آیا تو عوام الناس نے ”الناصر والغالب“ کے نعرے لگائے۔ وہ اپنی حرکت پر سخت پشیمان ہوا اور گھوڑے سے اتر کر سر جھکا کر بولا ”ولا غالب الا اللہ“۔ یہی نعرہ بنو نصر کی نشانی بنا۔ یہی وہ پیغام تھا جسے الحمرا کی قدیم دیواریں اپنی ہم رکابی میں لیے ہوئی ہیں۔

اشبیلیہ کو زیر وزبر کرنے کے بعد الاحمر کو اس کا ضمیر ملامت کرتا رہتا اور کیوں نہ کرتا کہ اس نے بنو نصر کے اس جھنڈے کو مسلمانوں کی لاشوں پر گاڑا تھا۔ اس کے ضمیر کی یہی ملامت الحمرا کی بنیاد کی وجہ بنی۔ الاحمر بذات خود مزدوروں کو ہدایات دیتا۔ الحمرا کی تعمیر میں اتنی عجلت سے کام لیا گیا کہ راتوں کو بھی مشعلوں کی روشنی میں کام جاری رکھا گیا۔ الاحمر الحمرا کی بنیاد ڈالنے کے کچھ عرصے بعد جب ایک بغاوت کو کچلنے کے لیے غرناطہ سے نکلا تو راستے میں الاحمر کا گھوڑا بدکا اور اسے نیچے گرا دیا۔ الاحمر کو الحمرا لایا گیا، اسے خون کی الٹی آئی اور الاحمر نے وہیں الحمرا کی برجوں تلے جان دے دی۔ اس کی نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد جبل سبیقہ کی ایک گھاٹی میں اسے دفن کر دیا گیا۔

بعد ازاں، جب غرناطہ کا آخری سلطان ابو عبد اللہ غرناطہ سے نکالا گیا تو وہ اپنے آباؤاجداد کی قبروں سے ان کی ہڈیاں بھی نکال کر لے گیا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں عیسائی حکمران اس کے اجداد کی بے حرمتی نہ کریں۔ الاحمر۔ قلعہ الحمرا کی بنیاد رکھنے والا الاحمر بھی انہی میں سے ایک تھا جن کی ہڈیاں ابو عبد اللہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“

وہ دیکھ سکتی تھی اپنی آنکھوں کے عین سامنے وہ دیواریں، سرخ دیواریں اور ان پر درج پیغام۔ وہ سانس روکے انہیں دیکھے گئی۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہیں کہیں فاصلے پر پانی کا فوارہ بہہ رہا تھا۔ دھار کی صورت میں گرتے پانی کا شور جو کسی موسیقی کی مانند دل کے تار چھیڑ رہا تھا اور اس کی نمی جو ہوا میں گھل چکی تھی۔ وہ نمی جو اب دلوں پر اثر

کرتی جذبات کی رو میں بہتی آنکھ کے راستے اشکوں کی صورت میں نکلنے کو بے تاب ہوئی تھی۔ سب تھم چکا تھا۔ سب ساکت تھا بالکل منجمد۔ پانی بہہ رہا تھا۔ دیواریں خاموش تھیں۔ اور وہ، وہ مبہوت سی بس انہیں دیکھ رہی تھی۔

" "الحمرا" عربی زبان کا لفظ ہے، مطلب "سرخ رنگ"۔ اس قلعے کی فصیلیں سُرخ رنگ کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قلعے کا نام اس وجہ سے الحمرا رکھا گیا ہو۔ البتہ کئی عرب تاریخ دان کہتے ہیں کہ اس قلعے کی تعمیر کا کام رات کے وقت بھی جاری رکھا گیا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے مشعلوں کے ذریعے روشنی مہیا کی جاتی تھی اور اس روشنی میں قلعے کی دیواریں سُرخ لگتی تھیں۔ ان کے مطابق قلعے کا نام اسی وجہ سے الحمرا پڑ گیا تھا۔

الحمرا محض ایک قلعہ نہیں ہے بلکہ یہ بذات خود ایک شہر ہے۔ یہ قلعہ جو القصبہ (Alcazaba) کے نام سے مشہور ہے، اس کی اونچی فصیلیں اور باغات، وسیع و عریض صحن اور جادوئی محل، ایک خوبصورت شہر کا سا منظر پیش کرتے ہیں۔ کئی جگہوں پر پانی کے فوارے ہیں۔ ان فواروں سے دھار کی صورت میں بہتا پانی بھی الحمرا کی سرخ اینٹوں پر لگے خون کے رنگ کو نہیں مٹا سکتا۔۔"!

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی بارہ شیروں کے صحن میں آئی تھی۔ اس صحن میں جہاں وہ فوارہ بہہ رہا تھا وہیں بارہ شیروں کے پاس۔ الحمرا پر سائبان کی مانند جھکے نیلے آسمان کا عکس وہ اس صاف شفاف پانی میں دیکھ سکتی تھی۔ یہ منظر جادوئی منظر تھا۔ ایک لمحے کو گمان ہوتا تھا کہ یہ سب سراب ہے۔ پر ایک لمحے کو بھی نہیں، یہاں ہر لمحے کسی جادوئی دنیا کا سا گمان ہوتا تھا۔ اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر پانی کی نمی کو اپنی انگلیوں کے پوروں پر محسوس کیا۔ پانی ٹھنڈا تھا، ٹھنڈا برف۔

اور میں اس وقت خواب دیکھ رہا ہوں کہ

میں فوارے کی سرگوشیوں میں قید خواب تو نہیں دیکھ رہا۔۔۔

”ہسپانیہ میں عربوں کے دَور کے بارے میں ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ”عربوں کے باغات جنت کی ایک جھلک ہیں۔“ ان باغات میں اسلام کا اثر پایا جاتا ہے۔ ایک ہسپانوی مصنف کے مطابق ”قرآن میں جنت کو ایک خوبصورت باغ کہا گیا ہے، جس میں پانی کی ندیاں بہتی ہیں۔“ الحمرا کی سجاوٹ میں بڑے پیمانے پر پانی استعمال ہوا ہے۔ یہ اُن لوگوں کے لئے جنت سے کم نہیں تھا جو صحراؤں میں رہنے کے عادی تھے۔ جن ماہروں نے الحمرا کے باغ لگائے، اُنہوں نے فضا کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کثرت سے پانی استعمال کِیا۔ وہ جانتے تھے کہ فواروں اور آبشاروں سے پانی کے گِرنے کی آواز کانوں میں موسیقی کی طرح پڑتی ہے۔ اُنہوں نے بہت سے تالاب بھی لگائے۔ وہ جانتے تھے کہ جب اِن تالابوں میں اندلس کے نیلے آسمان کا عکس پڑتا ہے تو جگہ کُھلی لگتی ہے۔

ایک مصنف الحمرا کے حسین مناظر کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

اپنے کمرے میں سے
میں فوارے کی سرگوشیاں سن رہا ہوں۔
انگور کی ایک بیل
اور سورج کی ایک کرن
دونوں سیدھے میرے دل میں اترتے ہیں
اور میں اس وقت خواب دیکھ رہا ہوں کہ
میں فوارے کی سرگوشیوں میں قید خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

الحمرا میں مسلمانوں کے بعد مغربی اقوام آئیں۔ انہوں نے اس قلعے کی تعمیرات میں مزید اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ الحمرا میں دو قسم کے فن تعمیر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو عربوں کا پیچیدہ اور باریک کام دوسری طرف مغربی اقوام

کا بھاری کام۔ فن تعمیر کے جن اصولوں پر الحمرا کی بنیاد ڈالی گئی انہی اصولوں پر قدیم یونان کی عمارتیں بھی بنائی گئی تھیں۔ ایک ماہر کا کہنا ہے کہ "شمالی افریقہ کے مسلمان فنِ تعمیر کے سنہری اصول پر عمل کرتے تھے یعنی پہلے عمارت تعمیر کرو پھر اس کے سادہ پتھروں کو سجاؤ۔"

ایک مصنف نے الحمرا کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس سے زیادہ شاندار عمارت دُنیا میں نہیں پائی جاتی۔"

وہ اس ایوان میں کھڑی تھی جہاں، کبھی سامنے تخت پر بیٹھے ازابیلا اور فرڈیننڈ کے آگے کرسٹوفر کولمبس دوزانو ہو کر جھکا تھا۔ یہیں اس نے امریکہ کی تلاش کے لیے اجازت مانگی تھی۔ اور یہیں اسی ایوان میں، ازابیلا نے اپنے بحری جہاز اسے مہیا کیے تھے۔ وہ ایوان جہاں مسلمانوں کی تقدیر لکھی جاتی تھی، اسی ایوان میں آنے والے وقت میں مسلمانوں پر عذاب بن کر نازل ہونے والی قوم کے لیے وطن ڈھونڈنے کی اجازت دی گئی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس سرخ دیوار کو چھوا تھا، اور اس پر ابھرے ان الفاظ کو۔ عربوں کا باریک کام۔۔ وا اور، لا نہیں، غالب غلبہ پانے والا، الا سوائے، اور پھر وہ بلند ہستی جس کے آگے سب ہیچ ہے۔ اس نے گہری سانس لے کر الحمرا کی فضاؤں میں بسی خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا۔ ہوا میں گھلی نمی، فوارے سے گرتے پانی کا شور، نیلا آسمان، اور وہ خوشبو، الحمرا کی فضاؤں میں بسی خوشبو۔

"الحمرا وہ قدیم جادوئی عمارت، جو ایک جادوئی شہر میں اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑے کھڑی ہے۔ وہ قلعہ جو پہاڑیوں کے درمیان میں ہے۔ وہ قلعہ جس کی قدیم دیواریں خدا کی فتح کا پیغام دیتی ہیں۔ جو بے بس ہیں، مجبور ہیں مگر ایسی تاریخ اپنے سینوں پر رقم کیے ہوئی ہیں کہ جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ الحمرا کی دیواریں مختصر سا پیغام دیتی ہیں۔ وہ پیغام، جو ہر فاتح کو اس کی فتح کی حقیقت بتاتا ہے۔

لا غالب الا اللہ

نہیں کوئی غالب سوائے اللہ کے۔۔۔"!

وہ الحمرا کے پیچھے سیر انو ادا نامی پہاڑی سلسلے کی اونچی برفانی چوٹیوں میں سے ایک چوٹی پر کھڑے تھے۔ الحمرا پر نظریں جمائے، ان کے وجود ساکت تھے بالکل ساکت۔ نہ تیز ہوا کے جھونکے ان میں جنبش پیدا کر پا رہے تھے نہ ہی ٹھٹھرنے پر مجبور کر دینے والا سرد موسم۔ الحمرا کا جادو چلا تھا، گہرا فسوں ٹھہرا تھا، نہ رد تھا نہ توڑ تھا۔ دونوں اسی حالت میں کھڑے تھے۔ کمر سیدھی کیے بالکل منجمد۔

☆☆☆

"یہ اس صدی کی بات ہے کہ جب اندلس میں مسلمانوں کی بے مثال سلطنت اندورنی سازشوں اور مسلمانوں کے کمزور پڑتے ایمان کی وجہ سے کھوکھلی پڑ رہی تھی، بھر بھری سی ہو کر ریت کے ذروں کی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں سے پھسل رہی تھی۔ اندلس کی سلطنت سکڑتی ہوئی غرناطہ تک محدود ہو چکی تھی۔ قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ، ہر ریاست، ہر شہر عیسائیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ عیسائی حکمران، ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈنینڈ، دونوں اپنے مذہب کی خاطر لڑنے والی اس مقدس جنگ کی خاطر متحد ہو چکے تھے۔ دونوں نے اس مقدس جنگ میں مسلمانوں کا نام سرزمینِ اندلس سے مٹانے کے لیے شادی کر کے اپنی افواج کو متحد کیا تھا۔ اس وقت جب مسلمانوں کی گرتی ہوئی سلطنت کو سہارا دینے والے مجاہدین دن بہ دن گر رہے تھے، تو عیسائی حکمران پوری قوت سے اور بھرپور عزم کے ساتھ اندلس کے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ غرناطہ پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن، بنو نصر سے تعلق رکھنے والا وہ مردِ مجاہد جس نے بھرے دربار میں عیسائی بادشاہ فرڈنینڈ کے سفیر کو جو اخراج مانگنے آیا تھا، یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ "غرناطہ کے دار الضرب میں اب بجائے سونے کے سکوں کے فولادی شمشیریں تیار ہوتی ہیں تاکہ عیسائیوں کی گردنیں اڑائی جائیں۔" ابوالحسن کے اس جوانمردانہ جواب نے عیسائیوں کو مبہوت و

مرعوب کر دیا تھا۔ فرڈنینڈ اور ملکہ ازابیلا نے اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کی انہی تیاریوں کے دوران ابوالحسن نے عیسائیوں کے ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ جواباً فرڈنینڈ نے شہر الحمہ پر قبضہ کر کے وہاں لوٹ مار مچائی اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اسلام کا یہ فرزند ابوالحسن جس وقت اس شہر کو بچانے کی کوششوں میں سرگرداں تھا تو دوسری طرف اس کا اپنا بیٹا اپنے باپ کی پیٹھ میں خنجر گھونپ چکا تھا۔ سلطان ابوالحسن کا بیٹا ابوعبداللہ غرناطہ، المیریہ اور بسطہ پر اپنی خودمختار سلطنت کا اعلان کر چکا تھا۔ مسلمانوں کی یہ چھوٹی سی ریاست بھی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اس بٹی ہوئی ریاست نے عیسائیوں کے حوصلے مزید بلند کر دیے۔ ابوالحسن بیٹے کی اس حرکت سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے بھائی الزاغل کے پاس مالاگا چلا گیا۔ غرناطہ کی عوام ابوعبداللہ کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ وہ بہت کم الحمرا سے باہر نکلتا تھا۔ اپنے باپ سے غرناطہ چھیننے کے بعد وہ عیسائیوں کی ایک ریاست پر حملہ کرنے کے لیے گیا اور وہاں اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے قید ہو گیا۔ عیسائیوں نے ابوعبداللہ کے بدلے میں سپاہی مانگے۔ معاہدہ طے پایا اور ابوعبداللہ واپس آ گیا۔ مگر اس کی واپسی کو عوام نے قبول نہیں کیا اور انہوں نے ابوالحسن کو تخت پر بٹھا دیا۔ ابوعبداللہ باپ کے خلاف سینے میں زہر چھپائے المیریا چلا گیا۔ اس دوران ابوالحسن کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی الزغل تخت نشین ہوا۔ الزغل کا دورِ حکومت نہایت تکلیف دہ اور مصائب سے بھرا تھا۔ ایک طرف اس کا سگا بھتیجا اس کی پیٹھ میں خنجر کی نوک کی طرح چبھ رہا تھا دوسری طرف عیسائی فوجیں غرناطہ کی فصیلوں پر یلغار کر رہی تھیں۔ اس دوران تمام مسلمان ریاستیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتی رہیں۔ الزغل اپنی تمام تر کوششیں کرتا رہا کہ کسی طرح مسلمانوں کی اس گرتی ہوئی سلطنت کو اپنا کندھا مہیا کر کے اسے دوبارہ کھڑا کر دے مگر، جو قوم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹنے کو تیار ہو، صرف چند افراد اس قوم کے گناہوں کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ جو قوم اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنے کو تیار ہو، وہاں کا تنہا حکمران اس قوم کے گلے سے یہ پھندا

نہیں نکال سکتا۔ الزغل نے اس پھندے کو کچھ وقت کے لیے ڈھیلا ضرور کر دیا تھا۔ مگر کچھ وقت کے لیے۔۔! جب وہ ایک مہم سے واپس غرناطہ آیا تو اس کی پیٹھ میں خنجر اتارا جا چکا تھا۔ ابو عبد اللہ نے الحمرا پر قابض ہو کر اپنی مکمل بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ الزغل اس زخم کو برداشت نہ کر سکا اور افریقہ چلا گیا۔ وہاں کسی نے اپنی دیرینہ رقابت کی وجہ سے اسے اندھا کر دیا اور غرناطہ کے اس آخری مجاہد سلطان نے نے اپنی باقی زندگی فیض کی گلیوں میں بھیج مانگ کر گزاری۔ اس کی قبا میں ایک سرخ رنگ کا پیوند تھا جس پر لکھا تھا، "یہ اندلس کا بے بس بادشاہ ہے۔" غرناطہ کی سلطنت، بس گرنے کو تھی۔۔۔"!

الحمرا کے ایوان میں ایک ستون سے ٹیک لگائے وہ چھت پر نگاہیں گاڑے کھڑا تھا۔ سعاد چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ دھیرے دھیرے لال پڑ رہا تھا۔ آنکھیں قدرے سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ انجام جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا، ویسے ہی وہ کمزور پڑ رہا تھا۔ اور کیوں نہ پڑتا؟! غرناطہ، جسے عرب شاعروں نے سرخ انار سے تشبیہ دی ہے، یہ اسلام کے ماضی کا وہ رستا ہوا زخم ہے جسے کبھی کوئی مندمل نہیں کر سکا۔ کیونکہ جب ایک طرف بغداد، سمرقند، بخارا، فارس جیسی عظیم الشان ریاستیں وحشی منگولوں کے قدموں تلے روندی جا چکی تھیں تو دوسری طرف مغرب میں غرناطہ جیسی بے مثال سلطنت جو عرب اور بربر خون سے رنگین زمین پر کھڑی تھی، مسلمانوں کی اپنی سازشوں کے نتیجے میں ہی اپنی ساخت کھو رہی تھی۔ یہ ریاست گر رہی تھی، اندلس میں مسلمانوں کی آخری ریاست۔

"ابو عبد اللہ زیادہ عرصہ غرناطہ پر حکمرانی نہیں کر سکا۔ غرناطہ اس کے لیے پھانسی کا پھندہ ثابت ہوا جو اس نے خود اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ لیکن قدرت کو اسے ایک موقع دینا منظور تھا۔ موسیٰ بن ابی غسان جیسا بہادر، جرات مند اور دلیر مجاہد اس کا سپہ سالار اندلس کے مسلمانوں کی آخری امید بن کر سامنے آیا۔ ابو عبد اللہ کے دربار میں جب

فرڈنینڈ کا سفیر ابو عبد اللہ کو ہتھیار ڈال دینے کی پیشکش کرنے آیا تو موسیٰ بن ابی غسان نے اسے منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا تھا: ” فرڈنینڈ کو کہنا کہ اگر وہ ہمارے ہتھیار چاہتا ہے، تو خود آ کر ہم سے چھین لے “!

1491ء میں فرڈنینڈ اور ازابیلا پچاس ہزار فوج کی معیت میں غرناطہ کے سامنے ویگا میدان میں داخل ہوئے۔ دس روز کے اندر اندر فرڈنینڈ نے سانتافی نامی ایک شہر تعمیر اکروایا اور حلف اٹھایا کہ جب تک غرناطہ فتح نہیں کر لیں گے تب تک گھروں کو نہیں لوٹیں گے۔ غرناطہ کے گرد پھیلے ہوئے تمام باغوں اور فصلوں کو آگ لگا دی گئی۔ مسلمان بے بسی سے ان شعلوں کو دیکھ رہے تھے جو ان کی خوراک کی ترسیل کو جلا کر بھسم کر رہے تھے۔ باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ مسلمان غرناطہ میں محصور ہو گئے۔ بھوک کی وجہ سے آبادی مرنے لگی۔

ابو عبد اللہ کے حوصلے پست پڑنے لگے اور بالآخر اس بدنصیب انسان نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ، جسے سنتے ہی الحمرا کے در و دیوار کانپ اٹھے تھے۔ موسیٰ بن ابی غسان، اسلام کا بہادر فرزند اس فیصلے کے بعد تن و تنہا غرناطہ سے نکلا اور عیسائی فوج کا مقابلہ کرتا شنیل کے پانیوں میں اتر گیا۔ یہ مرد مجاہد اندلس کے دفاع میں اٹھنے والا آخری ہاتھ تھا اور اندلس کی سرزمین میں دفن آخری مسلمان!

2 جنوری 1496 کو، ابو عبد اللہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اپنے اجداد کی قبروں سے ان کی ہڈیاں سمیٹیں اور الحمرا کی کنجیاں لے کر معاہدے کے مطابق اس مسجد کے قریب پہنچا جسے آج کلیسا سان سباستیان کہا جاتا ہے۔ اس بدنصیب بادشاہ نے وہ کنجیاں عیسائیوں کے حوالے کر دیں۔ وہ کنجیاں، الحمرا کی نہیں تھی سعاد! وہ کنجیاں اسلام کی تھیں۔ وہ کنجیاں ان شہیدوں کی عظمت کی گواہ تھیں جن کا خون اندلس کی سرزمین پر گرا تھا۔ وہ کنجیاں ان بیڑیوں کی تھیں جو اب مسلمانانِ اندلس کے قدموں میں ڈالی جانی تھیں۔۔ مسلمان تباہ ہوئے، اندلس میں اسلام کی آخری ریاست ختم ہوئی۔ عیسائی افواج فتح مند ٹھہریں۔ ابو عبد اللہ نے بدقسمت بادشاہ کا لقب پایا جو تاریخ نے کبھی کسی

مسلمان بادشاہ کو نہیں دیا۔ اس بدقسمت بادشاہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بغیر غرناطہ اور الحمرا پر نگاہ ڈالے شہر سے نکل گیا۔ شہر سے دور ایک مقام پر رک کر اس نے نم آنکھوں سے مڑ کر غرناطہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کی ماں نے حقارت سے تاریخی الفاظ کہے تھے:

"جس شے کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہیں کر سکے، اس کے چھن جانے پر عورتوں کی طرح آنسو مت بہاو۔۔!" جس مقام پر ٹھہر کر ابوعبداللہ نے مڑ کر الحمرا کو دیکھا تھا اس مقام کو آج "مور کی آخری آہ" کہا جاتا ہے۔

ابوعبداللہ کو گمنام راستوں سے مراکش بھیجا گیا۔ تاریخ میں ہے کہ وہ کبھی مراکش نہیں پہنچ سکا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اس کی اولاد افریقہ میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ اس بدقسمت شخص کا انجام قدرت نے ایسے ہی لکھ رکھا تھا۔ لیکن غرناطہ۔۔۔"

وہ رک گیا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔ پیشانی کی رگیں ابھری سی تھیں۔ وہ چند پل ہونٹ کاٹتا اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا۔ اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے وہ الحمرا سے باہر آیا۔ وہ اسے اس برج کے وسیع میدان میں لایا تھا جو جبل سبیقہ پر کچھ یوں پھیلا ہوا ہے کہ اس کے تین اطراف تو شہر غرناطہ کے بام و در پر نظر پرواز کرتی ہے اور چوتھی جانب نگاہیں قصر الحمرا پر جا ٹکتی ہیں۔

"اس برج پر! غرناطہ کی بلند ترین عمارت پر، اس سامنے والی دیوار پر۔۔ باب العدل میں سے گزر کر، باب الخمر کو پار کر کے، فصیل سے چمٹی پگڈنڈی پر چل کر، عیسائی پادری اور کاونٹ ٹیوڈلا اس برج کی چوٹی پر پہنچے تھے۔ کاونٹ کے ہاتھوں میں قشتالیہ کا پرچم تھا اور ایک پادری چاندی کی صلیب اٹھائے ہوئے تھا۔ اسی میدان میں آٹھ سو برس سے بلند ہلال کو نوچ کر صلیب گاڑ دی گئی تھی۔ قشتالیہ کا پرچم لہرایا گیا۔ اندلس کے آسمان پر چمکتے تارے یوں ٹوٹ کر

بکھرے کہ پھر کبھی نمودار نہ ہوئے۔ اندلس کے آسمان پر غلامی کے تاریک سائے بکھر گئے۔ ہر سُو۔۔۔چار سُو۔۔۔"!

اس کی آنکھ سے ایک آنسو پھسل کر گال پر گرا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ آسمان روشن تھا بالکل روشن۔ کیونکہ صلیب کے بلند ہوتے ہی جن لوگوں کی تاریک راتوں کا آغاز ہوا تھا وہ اندلس سے نکال دیے گئے تھے۔ اب یہاں کون تھا جس کی غلامی پر اندلس کا آسمان اپنے تارے توڑ کر ماتم کرتا؟ اب کون تھا جس کے لیے یہ روشن آسمان اپنی روشنی کو دھتکارتا؟! کوئی بھی تو نہیں۔۔۔!

"غرناطہ چھن گیا۔ بوڑھوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں، عورتیں یوں بین کرنے لگیں جیسے بیوہ ہو گئی ہوں۔ بچے بلک بلک کر رونے لگے گویا یتیم ہو گئے ہوں۔ ازابیلا اور فرڈیننڈ الحمرا پر قابض ہو گئے۔ وہ فاتح ٹھہرے تھے۔ کچھ عرصہ، صرف کچھ عرصہ مسلمانوں کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا گیا جو ایک صیاد شکار کے ہاتھ لگنے تک اس کے ساتھ کرتا ہے۔ مسلمانوں کو خوب کھلایا پلایا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی حالت اس شخص کی سی ہو گئی جو خوب سیر ہونے کے بعد بس سونا چاہتا ہو۔ اسے کسی چیز سے کوئی غرض نہ ہو۔ مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو یوں مار دیا گیا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے جب یہودیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے تو وہ یہ دیکھنے سے قاصر تھے کہ یہود کے بعد ان کی باری تھی۔ کوئی ایسا ستم نہ تھا جو اس دوران یہود پر نہ آزمایا گیا ہو۔ تاریخ کے طالب علم یہ پڑھ کر حیران ہوتے ہیں کہ جب یہود کو اندلس کی سرزمین سے دھکے دے کر نکالا گیا تو یہ ترک تھے جنہوں نے انہیں اپنی زمین میں خوش آمدید کہا۔ اور پھر یہ وہی یہود تھے جنہوں نے ترکوں کی زمین میں ترکوں کی سلطنت "سلطنت عثمانیہ" کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ عیسائیوں کے بعد مسلمانوں پر عذاب بن کر نازل ہونے والے یہ وہی یہود تھے جو جب اندلس میں مسلمانوں کے ساتھ تھے تو ان کا وہ دور "سنہری دور" مانا جاتا ہے۔

اور مسلمان، ان کی آنکھیں تب کھلیں جب محکمہ احتساب نے یہود کو اندلس سے ختم کرنے کے بعد اپنی نگاہیں ان کی طرف پھیر لیں۔ مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جانے لگا۔ کسی بھی گھر کا دروازہ توڑ کر کسی شخص کو محکمہ احتساب والے لے جاتے اور اس پر ایسے ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے کہ تاریک زندانوں کے در و دیوار کانپ اٹھتے۔ وہ شخص جو اپنے جرم تک سے بے خبر ہوتا، اس ظلم کے آگے ہتھیار ڈال کر اپنے ناکردہ گناہوں کا اقرار کرتا اور ان انسانوں کے نام بھی بتا دیتا جنہیں وہ جانتا تک نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں وہ لوگ بھی محکمہ احتساب کے مہمان بنتے اور وہ تاریک قید خانے ایسے خوفناک منظر دیکھتے جن کے تصور سے تاریخ کانپ اٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ عیسائی تاریخ خود محکمہ احتساب پر نادم اور شرمندہ ہے!

بھرے مجمعے میں مسلمانوں کے ہجوم کو اصطباغ دے دیا جاتا اور وہ عیسائی قرار پاتے۔ پھر اس گناہ کی پاداش میں کہ وہ دل سے عیسائی نہیں ہوئے محکمہ احتساب حرکت میں آتا اور انہیں تاریک قید خانوں میں ڈال دیتا۔ ان کی چیخیں، وہ انہی در و دیوار سے ٹکرا کر دم توڑ دیتیں۔ ان تاریک قید خانوں میں جانے والے کسی مسلمان نے اگلی صبح کا سورج نہیں دیکھا۔

مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ مسلمان جن کے دلوں میں ایمان کی چنگاری ٹھنڈی پڑ چکی تھی، اس وقت جب وہ اپنے ایمان کی وجہ سے طرح طرح کے خوفناک مظالم کا شکار تھے تو ایمان کی وہ چنگاری ایکدم بھڑک اٹھی تھی۔ مسلمانوں نے اس راکھ کو سینے سے لگایا تھا جو ان کے قرآن مجید کے بھسم ہونے سے وجود میں آئی تھی۔ مسلمانانِ اندلس کی تمام کتب جلا دی گئیں۔ جن سائنسی کتب کو قابلِ قبول سمجھا گیا وہ آج یورپ کی لائبریریز میں ہیں اور جن سے یورپ بھرپور استفادہ حاصل کر رہا ہے۔

اسی دوران الحمرا کے در و دیوار نے وہ دل شکن منظر بھی دیکھا تھا جب ایک شام، الحمرا کے ایوان میں کرسٹوفر

کولمبس ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈنینڈ کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا تھا۔ اس نے بادشاہ اور ملکہ سے نئی دنیا کی دریافت کے بعد اسے آباد کرنے کے لیے کچھ بحری جہاز مانگے تھے۔ اور پھر یہیں سے جہاز لے کر وہ نئی دریافت شدہ دنیا (موجودہ امریکہ) کے لیے نکلا تھا۔

اپریل فول، یہ پہلی بار مسلمانانِ اندلس کے ساتھ منایا گیا تھا کہ جب انہیں کہا گیا کہ انہیں ان جہازوں میں مسلمان ممالک میں بھیجا جا رہا ہے۔ وہ زبردستی جہازوں میں ٹھونسے گئے، جو جانے کو تیار نہ ہوئے وہ محکمہ احتساب کے حوالے کیے گئے۔ یہ ایسا بھیانک مذاق تھا کہ جس کا تصور ہی گنگ کر دیتا ہے۔ وہ جہاز سمندر میں ڈبو دیے گئے۔ مسلمان ختم کر دیے گئے۔ جو بچ گئے، وہ غلام بنا کر نئی دریافت شدہ دنیا امریکہ میں لے جائے گئے۔ یعنی، یہ اندلس سے نکالے گئے مسلمان تھے جنہوں نے امریکہ کی زمین کی آبیاری کی۔

اور پھر تاریخ ایک ایسا وقت بھی بتلاتی ہے کہ جب اندلس میں ایک مسلمان بھی باقی نہیں رہا تھا، ایک بھی نہیں۔ وہ اندلس جس پر آٹھ سو برس مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اب دار الاسلام کے بجائے دار الحرب بن چکا تھا۔ اندلس چھن چکا تھا۔ اندلس سے اسلام کا نام مٹ چکا تھا۔ تُف ہے ان مسلمانوں پر جو ایک ہندو لیڈر کے یہ کہنے کے باوجود اپنی غیرت کو سلائے ہوئے ہیں کہ، ”اگر مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود اسپین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹایا جا سکتا ہے تو ہندوستان میں کیوں نہیں؟“!

آج بھی اندلس کی فضاؤں میں، تلواروں کی گرج گونجتی ہے۔ گھوڑے ہنہناتے ہیں، قدیم زندانوں سے مسلمانوں کی چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ کلیسا کی طرف سے اٹھی آگ میں بھسم ہوتا قدیم اندلس آج بھی ہسپانیہ میں جگہ جگہ اپنے نقش گاڑے ہوئے ہے۔ تاریخ میں پھر کبھی ایسی سلطنت قائم نہ ہو سکی جو سقوطِ غرناطہ کا غم کم کر سکے۔ ڈر ہے کہ کہیں قطرہ قطرہ گرتا یہ خون، خون نچوڑ ہی نہ لے۔ پھر سب ختم ہو جائے گا۔ بس یہی پیغام باقی رہے گا،

لا غالب الا اللہ"!

اندلس کے آسمان پر، اس وسیع میدان کے اوپر جھکے فلک پر ایک عقاب عین ان کے سروں کے اوپر سے گزرا تھا۔ اس نے اونچی پرواز بھری تھی، تیز رفتار کے ساتھ وہ بلندیوں کو چھوتا بادلوں کے پار چھپ گیا تھا۔ عقاب، آزادی کا عقاب!

[1] * سقوط اشبیلیہ کے بعد ابوالقاء صالح بن شریف الرندی الاندلسی کا کہا گیا مرثیہ "قصیدہ نونیہ" سقوط غرناطہ کے بعد اندلس کی درست منظر کشی کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ؛

ہر چیز جب مکمل (عروج پر پہنچ جائے) ہو جائے تو اس کے نقصان (زوال) کا آغاز ہو جاتا ہے

چنانچہ کسی بھی انسان کو عمدہ زندگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے

یہ تو بدلتے ہوئے حالات ہیں جیسا کہ تم نے مشاہدہ کیا

اگر کسی کو ایک زمانہ خوشی دیتا ہے تو کئی زمانے اسے تکلیف بھی دیتے ہیں

یہ دنیا ہمیشہ کسی ایک کی نہیں رہتی

نہ یہ کسی ایک حال پر قائم رہتی ہے۔" پھر کچھ بادشاہوں کے زوال کا ذکر کرنے کے بعد وہ کہتا ہے؛

"الجزیرۃ (جزیرۃ اندلس) پر ایسی آزمائش آن پڑی ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا

جو اگر احد یا ثہلان پہاڑ (نجد کا ایک عظیم پہاڑ) پر آ گرتیں تو یہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے

اسے (اندلس کو) اسلام میں حاسدانہ نظر لگی چنانچہ اس پر آزمائشیں آن پڑیں

یہاں تک کہ اس (اسلام) سے شہر اور علاقے خالی ہوتے چلے گئے

پس بلنسیہ سے پوچھئے کہ مرسیہ کا کیا ہوا

اور شاطبہ یا جیان اب کہاں ہیں

اور کہاں ہے قرطبہ دارالعلوم

جہاں کتنے ہی علماء کا مرتبہ بلند ہوا

اور کہاں ہے حمص (اشبیلیہ) اور اس کی سبزہ پوش شادابیاں

اور اس کا دریا (وادی الکبیر) جس کا پانی میٹھا اور لبالب بھرا تھا

یہ عظیم شہر اندلس کے ستون تھے

پس جب یہ ستون ہی نہ رہے تو سقوط اندلس سے کون روک پائے گا

مسلمان شدت غم سے اس طرح روتے ہیں

جیسا کہ شدید محبت کرنے والا اپنے محبوب کی جدائی پر روتا ہے

ان دیار پر جو کہ اسلام سے خالی ہو گئے

اسلام سے دوری ان کا مقدر ٹھہری اور کفر نے ان میں ٹھکانہ بنالیا

جہاں مساجد کو کلیساؤں میں بدل دیا گیا

اور اب ان میں ناقوس اور صلیبوں کے علاوہ کچھ نہ بچا

یہاں تک کہ محراب بھی روتے ہیں حالانکہ وہ جامد (پتھر) ہیں

اور یہاں تک کہ منبر بھی روتے ہیں حالانکہ وہ محض پتھر ہیں۔

اے غافل (ان علاقوں کے مسلمانوں کو خطاب جو ابھی تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے) اور تیرے لئے زمانے میں نصیحت ہے

اگر تو اونگھ یا خواب غفلت میں ہے تو زمانہ (دشمن) بہت بیدار ہے۔

راحت و آرام سے گھومنے پھرنے والے جسے اپنا وطن بہت لبھاتا ہے

کیا حمص کے بعد بھی انسان کو وطن دھوکہ دے سکتے ہیں

یہ وہ مصیبت ہے (اندلسی شہروں کا سقوط) جس نے اپنے سے پچھلے تمام مصائب کو بھلا دیا

اور عرصہ دراز گزرنے کے باوجود بھی اس مصیبت کو بھلایا نہیں جاسکے گا۔

اے عمدہ تضمیر شدہ گھوڑوں پر سوار ہونے والے (مسلمانان افریقہ کو خطاب ہے)

(ایسے گھوڑے) گویا وہ دوڑ کے میدان میں عقاب ہوں

تیز دھار کاٹ دینے والی ہندی تلواریں اٹھائے ہوئے

گویا وہ (تلواریں) گرد و غبار کے اندھیرے میں چنگاریاں مارتی ہوئی آگ ہوں

کیا تمہارے پاس اہل اندلس کی کوئی خبر ہے

ان کے متعلق باتیں تو اب تمام سواروں کی زبانوں پر زد عام ہیں

اسلام میں یہ باہمی قطع تعلقی و سنگ دلی کیسی

جب کہ تم اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی ہو

کیا تم میں خوددار نفوس نہیں ہیں جو بلند پایہ ہمت کے مالک ہوں

کیا خیر اور نیکی کی بنیاد پر مدد کرنے والے تم میں ختم ہو گئے

ہائے کون ہے اس قوم کیلئے جسے عزت کے بعد ذلت سے دوچار ہونا پڑا

جن کی حالت میں یہ تبدیلی کفار و سرکشوں نے کی

کل وہ اپنے گھروں میں بادشاہوں کی مانند تھے

اور آج وہ بلادِ کفر میں غلام ہیں

اگر تُو انھیں دیکھے تو حیران و پریشان بغیر کسی رہنما کے ہوں گے

ان کے اوپر دشمن نے مختلف رنگ کے ذلت کے لباس پہنا رکھے ہیں

پس اگر تو فروخت کے وقت ان کا رونا دیکھے تو

یہ معاملہ تجھے اتنا عظیم دکھائی دے کہ تجھ پر غم و یاس کے بادل چھا جائیں۔

ہائے کتنی ہی ماؤں اور بچوں کے درمیان جدائی ڈال دی گئی

جس طرح جسم سے روح کھینچ لی جاتی ہے

اور کتنی ہی بچیاں جو طلوع ہوتے سورج کی مانند حسین تھیں

گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہوں

ایک دشمن اسلام اسے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود مکروہ کام کیلئے ہانکتا ہوا لے جاتا ہے

اور آنکھ ہے کہ رو رہی ہے اور دل حیران ہے

ایسے مناظر پر ہی تو دکھ اور جلن کے مارے دل پگھلتا ہے

اگر دل میں اسلام اور ایمان کی دولت باقی ہے۔ ※[1]

☆☆☆

”اندلس اتنا پیارا کیوں ہے زیاد؟“ وہ دھیمی آواز میں کسی سرگوشی کی مانند اس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ دونوں کیفے الکزابا کے باہر رکھی میزوں میں سے ایک میز کے گرد رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ، اس مشرقی لڑکی کے عین عقب میں بادلوں کے سائے میں الحمرا کھڑا تھا۔ اس کا سفید حجاب میں چمکتا چہرہ، وہ دعوہ کر سکتا تھا کہ اندلس کا تمام تر حسن یہیں سمٹ آیا تھا۔ غرناطہ کی گلیوں میں رچا حسن اسے ادھار دے دیا گیا تھا۔ یا ہمیشہ کے لیے عنایت کر دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کو اتنا اچھا نہیں ہونا چاہیے، بالکل بھی نہیں!

”زیاد، تم یہیں ہو؟“ وہ اس کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ سوچوں کو جھٹکتا ہوش میں آیا۔

”ہاں، کہو کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے اپنا کان رگڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ سعاد نے منہ کے زاویے بگاڑ کر اسے دیکھا۔

”سِپیرا اسینیور! میں کب سے تم سے بات کر رہی ہوں اور تم نے کچھ نہیں سنا؟!“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”معذرت ناں۔“ وہ بچوں کی طرح منمنایا۔ سعاد نے ایک خفا سی نگاہ اس پر ڈالی پھر گہری سانس لی۔

”کیا یہ سچ ہے کہ اندلس کے لوگ مخلوط قوم ہیں؟ یعنی میں نے کسی سے سنا تھا کہ ان لوگوں کی شریانوں میں جو عرب و بربر خون دوڑ رہا ہے وہ صرف چند فیصد ہے! ان کے نقوش، ان کی عادات و اطوار ہر چیز مغربی اقوام سے میل کھاتی ہے۔ اموی شہزادہ عبد الرحمن سوم الناصر، اس کا قد لمبا تھا۔ رنگت گوری تھی، آنکھیں نیلی تھیں اور بالوں کا رنگ سرخ! اور کہا جاتا ہے کہ یہ سرخ رنگ بھی وہ خود رنگا کرتے تھے تاکہ عرب نظر آئیں۔ ورنہ اگر یہ مخلوط قوم اور انگریز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں تو کوئی فرق معلوم نہ ہو۔ مطلب میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ، کیا موجودہ ہسپانیہ میں ہسپانوی لوگوں میں عربوں والی کوئی بات نہیں ہے؟!“ وہ دونوں ہاتھ باہم ملائے میز پر

رکھے اس کی طرف آگے کو جھکی پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے دھیرے سے سر کو جنبش دی تھی۔

”یہ سچ ہے۔ ان کی شریانوں میں دوڑتا عرب و بربر خون جب تک نکال کر دیکھ نہ لیا جائے تب تک معلوم نہیں ہو سکتا کہ ان کے اسلاف عرب و بربر تھے۔ اور یہ فطری سی بات ہے۔ کسی بھی قوم پر جب غیر قومیں مسلط ہو جاتی ہیں، تو وہ مسلط کردہ قوم اور اس سرزمین پر پہلے سے موجود قوم باہم تعلقات قائم کرتی ہے۔ اور آئندہ نسلیں مخلوط ہوتی ہیں۔ عرب شہزادے یہاں آئے، بربر سلاطین بھی یہاں آئے، مغربی اقوام پہلے سے موجود تھیں۔ صحرا نشین عرب اور سمندر کے سینے پر دریا کی مانند بہتے اندلس کے رہنے والے، جب یہ دو قومیں ملیں تو وہ قوم وجود میں آئی جو آج موجودہ ہسپانیہ میں نظر آتی ہے۔ مگر دیکھو، غور کرنے کی بات ہے کہ ایسا کیا ہوا کہ ان لوگوں میں عربوں والی کوئی عادت نہ رہی؟! اگر ہم یہ کہیں کہ ہسپانوی لوگ بالکل ہی مغربی قوموں کا طرز اپنا چکے ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ تم یہاں دیکھو گی یہاں کئی باتیں، کئی ایسی روایات ہیں جو عربوں کی روایات سے میل کھاتی ہیں۔ ہسپانوی زبان کو دیکھ لو، کئی الفاظ عربی کے ہیں مگر بگاڑ دیے گئے ہیں۔ غرناطہ میں کچھ ایسے مسلمان محلے بھی ہیں جہاں آج بھی قدیم رواج قائم ہے۔ وہاں کے قہوہ خانوں میں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ انتظامات ہیں! تو۔۔ بالکل کافی حد تک غور کیا جائے تو یہ مخلوط قوم عربوں سے میل کھاتی ہے مگر۔۔۔ بہت کم!

وجہ جاننے کے لیے پیچھے جاؤ۔ تاریخ کو کھنگالو، کیا ایمان کے لحاظ سے اندلس کے آخری سلاطین کمزور نہیں پڑ گئے تھے؟ کیا ان میں مغربی اقوام کا اثر نہیں آ گیا تھا؟ ان میں انتشار پھیل گیا، نفاق بڑھ گیا۔ وہ اپنی نفسانی خواہشات کے اسیر ہو گئے۔ کچھ اسلاف کو بھلا دینے کی وجہ سے کچھ مغرب کا اثر تھا۔ آسان مثال دوں؟

تاریخ میں مزید پیچھے جاؤ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں۔ آپ کی خلافت کا دورانیہ بارہ سال تھا۔ چھ سال بہت امن و امان سے گزرے مگر آخری کے چھ سالوں میں مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا، نفاق

بڑھتا چلا گیا۔ کیوں؟ کیونکہ۔۔ اس وقت کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واجمعین وفات پا چکے تھے۔ وہ صحابہ جو رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شانہ بشانہ ہر محاذ پر لڑے، جنہوں نے اپنی زندگیوں کو ان کے لیے وقف کر دیا، وہ صحابہ کرام وفات پا رہے تھے۔ اور ان کی آل اولاد کے دل اس ایمان سے خالی تھے جنہوں نے صحابہ کرام کو ستاروں کی مانند بنا دیا تھا۔ ان کی آل اولاد میں وہ جذبہ نہ تھا، جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ، مسلمانوں نے اپنے خلیفہ کو شہید کر ڈالا۔ مسند خلافت کے لیے جنگیں لڑی گئیں اور نتیجہ؟ خلافت راشدہ ختم ہو گئی۔ امت مسلمہ تفرقوں میں پڑ گئی۔ اب دیکھو، کیا موجودہ عرب کو دیکھ کر تم کہہ سکتی ہو کہ یہ وہی عرب ہے جہاں خدا کی تلوار نیام سے نکلی تھی؟! عرب شہزادے غلام بن چکے ہیں۔ ایک کم عقل اور ناسمجھ مسلمان بھی یقین سے کہہ سکتا ہے کہ اگر فتنہ و فساد کے دور میں مسلمانوں میں سے کوئی مرد مجاہد اٹھا تو وہ ان عرب شہزادوں میں سے تو ہرگز نہ ہو گا! وہ فلسطین میں ایک بچہ ہو سکتا ہے جسے اسرائیلی فوج پابند سلاسل کر کے لے جا رہی ہے، یا وہ کشمیر کا جوان ہو سکتا ہے مگر وہ کوئی عرب شہزادہ نہیں ہو سکتا! لیکن۔۔

ایک اور بات! خدا دلوں کو پلٹنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو دلوں پر مہر لگا دے، چاہے تو سیاہ دل کو ایمان کی روشنی سے منور کر دے۔ انہی عرب شہزادوں میں سے ایک شہزادہ اٹھا تھا جس نے سپر پاورز کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسامہ بن لادن! وہ مرد مجاہد جس نے عیش و عشرت کی زندگی ٹھکرا کر پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ آج عیش پرست لوگ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بند ہو کر مظلوم مسلمانوں کی چیخوں کو اپنی سماعت سے ٹکرانے سے روک کر منہ اٹھا کر کہہ دیتے ہیں کہ "اسامہ بن لادن دہشتگرد تھا!" واللہ۔۔ میں ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ، ساری دنیا اس کے خلاف اٹھ گئی تھی، باطل اس کے خلاف یکجا ہو گیا تھا کیونکہ وہ دہشتگرد تھا۔ تو ان دہشتگردوں کا کیا جو اس رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں کنسرٹس کرواتے ہیں اور غیر مسلم قوتوں کے جوتے ٹھیک کرتے

ہیں؟! دونوں طرف عرب شہزادے ہیں، مگر فرق واضح ہے۔

اب واپس حال میں آؤ۔ یہ مخلوط قوم، جو اپنے اسلاف کو بھلا چکی ہے۔ عین ممکن ہے سعاد! کہ کل انہی میں سے کوئی جوان اٹھے جو ان مظلوموں کا سہارا بنے جنہیں ظالم اپنے قدموں تلے توندر ہے ہیں۔ شاید یہ مخلوط قوم ہی کل عالم اسلام کے لیے نجات دہندہ بن کر آئے؟! یہ سچ ہے کہ یہ سب سن کر گمان ہوتا ہے کہ ہم وہ خواب دیکھ رہے ہیں جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ طائف کے اوباشوں میں سے ایک نوجوان سپہ سالار اٹھے گا اور فاتح سندھ کہلائے گا؟"!

وہ ٹھہر گیا۔ ذرا سا مسکرا کر سعاد کو دیکھا جو مبہوت سی اسے سن رہی تھی۔ وہ کتنے آسان الفاظ میں اسے ہر بات سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس ذخیرہ تھا، معلومات کا ذخیرہ۔ سعاد کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ جو کتابوں سے دل لگا لے، دنیا اس سے دل لگانے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ کیسے؟ جب وہ الفاظ ہی الفاظ میں کھیل جاتا تھا، اور ہر مشکل بات کو سہل بنا دیتا تھا تو انسان دم بخود رہ جاتا تھا۔ آہ کتابیں، جو ان کا ہو جائے، دنیا اس کی ہو جاتی ہے۔

"کہاں کھو گئیں؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لیتی سر نفی میں ہلا گئی۔ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے ٹھہر کر زیاد کو دیکھا۔ دماغ میں ایک خیال کوندا، آنکھوں میں چمک ابھری۔ زیاد نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا گویا اس کا دماغ پڑھنے کی کوشش کی ہو۔ وہ آگے ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ لب واں ہوئے۔

"اسامہ بن لادن، اگر تم بھرے مجمعے میں ان کا دفاع کرو گے تو لوگ تمہیں نوچنے کے لیے بے تاب ہونگے۔ محمد بن قاسم، آج کی نوجوان نسل کے سامنے ان کا نام لو گے تو وہ حقارت سے منہ پھیر لیں گے۔ امیر المومنین عمر ثالث جنہیں دنیا ملا عمر کے نام سے جانتی ہے، تم ان کی طرفداری کرو گے تو ایجنٹ کہلاؤ گے۔ تم میں اتنی ہمت کہاں سے

آتی ہے کہ تم کسی کے سامنے بھی یہ سب باتیں آسانی سے کر لیتے ہو؟ کیسے؟!" وہ اس کے سوال پر مسکرایا تھا۔
بالکل ہلکا سا، ذرا سا۔

"یہ آج کی نسل جن کی میڈیا بھرپور ذہن سازی کر چکا ہے یہ وہی دیکھتی ہے جو انہیں دکھایا جاتا ہے۔ یہ وہی سنتی ہے جو انہیں سنایا جاتا ہے۔ یہ کبھی بھی حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ ان کی مثال اس گلی سڑی قوم سی ہے جو زوال کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ جس میں فتنہ و فساد برپا ہے، انتشار آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ فرقہ واریت کے جھنڈے بلند ہیں۔ اس قوم کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور اب بھربھری سی ہو کر ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسل رہی ہیں۔

وہ لوگ، جن کے دماغ مفلوج ہیں۔ جن کی حالت اگلوں سے بھی گئی گزری ہے۔ یہ اس شخص کی طرح ہیں جس کا نشہ پورا نہ ہو تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ چیختے ہیں، چلاتے ہیں۔ یہ اپنے اسلاف کو اپنی زہریلی باتوں کا نشانہ بناتے ہیں۔

اور جانتی ہو جب برصغیر ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا تو برطانیہ نے کہا تھا کہ یہ قوم جو آج آزادی کی خوشی منا رہی ہے، ہم ان کی ایسی ذہن سازی کریں گے کہ کل یہ انہی اسلاف کو اٹھ کر گالیاں دے گی جو اس آزادی کا سبب ہیں! انہوں نے یہ کر لیا سعاد!

فاتح سندھ محمد بن قاسم سندھ میں اسلام کو لایا تھا۔ اور آج اسی سندھ سے نوجوان نسل اٹھ کر اسی فاتح سندھ کو ٹارگٹ کلر کہتے ہیں۔ امیر یوسف بن تاشفین، انہوں نے اندلس کو طوائف الملوکی سے نجات دلائی تھی۔ اور آج تاریخ دان اٹھ کر کہتے ہیں کہ امیر یوسف اقتدار کے پیچھے تھا! صرف یہی نہیں۔۔ تاریخ مزید ستاروں سے بھری ہوئی ہے۔ صحابہ کرام کو دیکھ لو۔ آج صحابہ کرام بھی اس بدنصیب قوم کی زہریلی باتوں سے محفوظ نہیں۔۔۔!

مطلب سعاد دیکھوناں، کون پاگل اپنے ہی ہیرو کے خلاف کھڑا ہوتا ہے؟ وہ تو بہترین میں سے بھی بہترین تھے۔ تو آج ان کے خلاف بولتے ہوئے ہماری زبان کیوں نہیں لڑکھڑاتی یا ان کے خلاف لکھتے ہوئے ہمارا قلم کیوں نہیں کانپتا؟! کہتے ہیں کہ۔۔ وہ لوگ جو نبیوں کے زمانے میں پیدا ہوئے ان کا امتحان سخت تھا۔ عین ممکن تھا وہ نبی کا انکار کرتے اور جہنمی بنتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نبی کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنی آخرت سنوار لیتے۔ آج جو لوگ ان عظیم شخصیات کے خلاف بولتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ۔۔ وہ جن کے خلاف کھڑے ہو رہے ہیں وہ اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ طے کر چکے۔ اب ان کا وقت ہے، اور جانے انجانے میں وہ اپنی آخرت تباہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ ایک چھوٹی سی بات ذہن نشین کر لی جائے تو اس بگڑے معاشرے میں بہت کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔۔"!

وہ خاموش ہوا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھتی رہی۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھا رہا پھر ویٹر کو بنے بل لانے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے زیاد کی نگاہیں شیشے کے اس گلاس سے ٹکرائی تھیں۔ اور پھر اس چمچ سے جسے سعاد نے سیدھا کر کے رکھا ہوا تھا۔ وہ بری طرح سے چونکا تھا۔ چمچ کو دیکھتے ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں پہلو بدلا تھا۔ وہاں کسی کا عکس نظر آرہا تھا۔ کوئی جو مسلسل ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے دایاں پاوں زمین پر مارتے ہوئے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ تھوڑی دیر ٹھہرا پھر چپکے سے چمچ اٹھا کر کھڑا ہوا۔

"مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ تم یہاں سے سیدھا گھر چلی جانا۔" عجلت میں کہہ کر وہ سعاد کا جواب سنے بنا پلٹا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ سعاد نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔ اسی وقت اس کے دائیں جانب سے کوئی شخص تیزی سے گزرا۔ اس نے چونک کر گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس شخص نے بھی گردن موڑ کر اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑیں۔ اس کی نگاہیں وہ عجیب سی تھیں۔۔۔ وہ اندر تک کانپ کر رہ گئی تھی۔ وہ شخص آگے بڑھ گیا مگر وہ کچھ لمحے ساکت و منجمد اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ اس کے عقب میں جھانکتے الحمرا پر جھکے فلک پر سیاہی پھیل رہی تھی۔

بس تھوڑا وقت مزید درکار تھا، پھر اس سیاہی کے مزید گہرا ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی الحمرا برقی جگنوؤں سے چمک اٹھنے والا تھا۔

☆☆☆

غرناطہ میں اچانک ہونے والی موسلا دار بارش نے موسم کو بے حد سرد کر دیا تھا۔ دور پہاڑوں کے درمیان روشنیوں میں نہایا الحمراء آسمانی آنسوؤں میں بھیگ رہا تھا۔ بادل زور سے گرج رہے تھے، گویا اس کی ویرانی پر بین کر رہے ہوں۔ بجلی کی کڑک ایک لمحے کو سہمنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جدید غرناطہ میں بھیگتی سڑکیں ویران ہونے کو تھیں۔ لوگ بھاگ بھاگ کر کسی چھت کے سائبان تلے جمع ہونے کی کوششوں میں تھے۔ وہ یہ تمام مناظر دیکھتی حیران و پریشان سڑک کنارے کھڑی تھی۔

کیفے سے نکل کر وہ دو گھنٹے سڑکوں پر پھرتی رہی تھی۔ وہ اب تک کئی شاپنگ مالز گھوم چکی تھی۔ اس نے غرناطہ میں مسلمانوں کا قدیم محلہ بھی دیکھ لیا تھا اور وہ قہوہ خانے بھی جن کا زیاد نے ذکر کیا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ جب گھر جانے کا سوچ رہی تھی تو اس کی سماعت سے کوئی سریلی آواز ٹکرائی تھی۔ وہ دو تین آدمی تھے جو سڑک پر گٹار لیے کھڑے تھے۔ وہ موسیقی، وہ اسے جانتی تھی۔ اس کا نام Memories of Alhambra تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی اسے سنتی رہی اور ہوش میں تب آئی جب گہرے سیاہ بادل اچانک آسمان پر نمودار ہوئے۔ بادل زور سے گرجے، بجلی ایکدم چمکی۔ اچانک سے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اور اسی اثناء میں اپنے ارد گرد اجنبی راستوں کو دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ گھر جانے کا راستہ بھول چکی تھی۔ اس نے قریب ہی ایک ہسپانوی خاتون کو مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر وہ انگریزی سے ناآشنا تھیں۔ وہ چند لمحے پریشانی کی حالت میں دائیں بائیں دیکھتی رہی۔ بارش اپنا زور پکڑ رہی تھی۔ وہ مزید یہاں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی تبھی سڑک کے دائیں طرف قدم

بڑھا دیے۔ اپنے ہینڈ بیگ کو سر کے اوپر اس طرح سائبان بنالیا کہ حجاب بھیگنے سے بچا رہا۔

”اللہ جی بس آج گھر پہنچا دیں۔“ وہ آنکھیں بند کیے بڑبڑاتی ہوئی دائیں طرف ایک گلی میں داخل ہوئی۔ اور تبھی اس کے ذہن میں جھما کہ ہوا۔ وہ کیفے الکزابا کا کسی سے بھی پوچھ کر گھر پہنچ سکتی تھی۔

اس نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں۔ گلی کے دائیں طرف ایک ہسپانوی مرد کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

”کیا آپ مجھے کیفے الکزابا کا راستہ بتادیں گے؟“

”دو گلیاں مڑ جائیں سامنے ہی سڑک پر نظر آ جائے گا۔“

”گراسیا۔“ وہ تیزی سے کہہ کر اپنے قدم بڑھانے لگی تھی۔ وہ اب مکمل بارش میں بھیگ چکی تھی۔ اسے جلد از جلد گھر پہنچنا تھا۔

”سینیوریتا، آپ وہی ہیں ناں جو صبح اس مور کے ساتھ تھیں؟“ کسی نے شستہ انگریزی میں اس سے پوچھا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔ اس کے عین پیچھے وہی مرد کھڑا تھا۔ وہی صبح والا، مگر اس وقت وہ بہت خوفناک نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں جن سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پستول تھام رکھی تھی۔

اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہوا تھا۔ وہ خوف سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ وہ شخص ڈھٹائی سے دو قدم آگے آیا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو بھاگتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ وہ شخص اس کے پیچھے تھا یا نہیں وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیفے الکزابا کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے ایک اور ویران گلی میں قدم رکھا تھا۔ غرناطہ کی ویران گلیاں۔۔۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ہاتھ پاؤں ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ پورا وجود کانپ رہا تھا۔ دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کی تھیں۔ بادل زور

سے گرجے تھے۔ بجلی ایک لمحے کو پورے آسمان پر پھیل کر سمٹ گئی تھی۔

"سعاد بچو۔۔" کوئی چلایا تھا۔ پوری قوت سے چلایا تھا۔ جان لگا کر چلایا تھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں کھولیں اور اسی لمحے ٹریگر پر زور پڑا تھا۔ پستول چلنے کی تیز آواز گونجی تھی۔ گولی اسے لگنی تھی، بالکل لگنی تھی لیکن وہ اس تک پہنچ ہی نہیں سکی تھی۔ اس نے خوف سے بند کی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ڈرتے ڈرتے اپنے دائیں طرف دیکھا تو وہاں بھیگی سڑک پر کوئی شخص اس گولی چلانے والے کے سینے پر بیٹھا اس پر بے تحاشا مکوں کی بارش برسا رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں بھی اسے پہچان سکتی تھی۔ وہ زیاد تھا، سینیور زیاد!

وہ تیزی سے آگے آیا تھا اور ٹریگر پر زور پڑنے سے پہلے ہی اس شخص کو زمین پر گرا چکا تھا۔ گولی سعاد کی طرف نہیں بڑھی تھی بلکہ زیاد کے بازو پر لگی تھی۔ اس کے بازو سے نکلتا خون سڑک پر موجود بارش کے پانی میں گھل رہا تھا۔ وہ شخص جس پر وہ مکے برسا رہا تھا اب لہولہان ہو چکا تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے نکلتا خون عنقریب اس کے جان سے جانے کا پیغام دے رہا تھا۔ اور جب وہ بالکل مرنے کے قریب ہو گیا تو وہ ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ قہر آلود نگاہ اس زندہ لاش پر ڈال کر وہ سعاد کی طرف بڑھا تھا۔ وہ وہیں ساکت کھڑی تھی۔ حیرت اور صدمے کی سی کیفیت میں بالکل منجمد!

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے اپنے سامنے کھڑے زیاد کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں بے پناہ خوف لیے اس پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ خوف، ایک لمحے میں اسے کھو دینے کا خوف۔

وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ آنسو قطار کی صورت گالوں پر بہتے گئے۔ بارش کا پانی ان آنسوؤں کو زیاد کی نظروں سے چھپانے میں ناکام رہا۔ وہ آگے بڑھا، اپنے کندھوں پر ٹکی شال اتاری اور اس کے شانوں پر پھیلا دی۔ گویا اسے اپنی حفاظت میں لیا تھا۔ جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ سن کھڑی رہی۔ وہ خاموشی سے

چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا۔ رومال سے اس کے گالوں سے نمکین پانی کے نشانات مٹانا چاہے۔ اس کی کوشش ناکام گئی، وہ متواتر رو رہی تھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اسے کلائی سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگا تھا۔

اور بارش کے پانی میں بھیگتی سڑکوں پر۔۔

اندلس میں آئے دو اجنبی۔۔۔

بے پناہ خوف دلوں میں لیے۔۔

اندھیری رات کے اندھیرے میں۔۔

کہیں گم ہو گئے تھے۔۔!

☆☆☆

"آرام سے آرام سے، بس آ گیا میں۔" مسلسل بجتی گھنٹی پر بوڑھا ملازم اونچی آواز میں بڑبڑاتا ہوا دروازے تک آیا اور جھٹکے سے پورا دروازہ کھول دیا۔ بجلی ایکدم زور سے کڑکی۔ بادلوں کی گرج کسی شیر کی دھاڑ سے کم نہ تھی۔ بجلی کی چمک میں بوڑھے ملازم نے آنکھیں چھوٹی کیے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا پھر خاموشی سے راستہ دے دیا۔ وہ اسے ساتھ لیے اندر آیا تھا۔

"اے خداوند! تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟" لاؤنج میں بیٹھی خاتون نے ان دونوں کو دیکھ کر ڈر کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

زیاد کے بازو سے نکلتا اور روتی ہوئی سعاد، کوئی بھی انہیں دیکھتا تو یقیناً دل پکڑ لیتا۔

"آپ پلیز سعاد کو دیکھ لیں گی۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں۔" اس کے گذارشاً کہنے پر وہ خاتون آگے بڑھ کر سعاد کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھانے لگیں۔

”تم بتاؤ گے مجھے یہ سب کیا ہے؟“!

”ابھی وقت نہیں۔ آپ سعاد کا خیال رکھیے گا مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“

”تم زخمی ہو۔“ وہ تیزی سے کہہ کر پلٹنے لگا تھا جب سعاد کی نم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ عجلت میں کہتا باہر نکل گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ بعض دفعہ پلٹ کر دیکھنا قدموں میں زنجیریں ڈال دیتا ہے، بعض دفعہ جینا محال کر دیتا ہے۔

”تم کمرے میں آؤ۔ یہاں ٹھنڈ ہے بہت۔“ وہ اس کا بازو پکڑتیں اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے کر جا رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ ان کے ساتھ چلنے لگی۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ زیاد کے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ مفلوج ذہن کے ساتھ!

☆☆☆

اس کی آنکھ صبح موبائل کے بجنے سے کھلی تھی۔ چکراتے ہوئے دماغ کو تھامتے ہوئے اس نے اٹھنا چاہا مگر ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کئی پل یونہی بے سدھ لیٹی رہی۔ ذہن خالی خالی سا تھا۔ کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ چھت کو گھورتی رہی۔ چپ چاپ خاموشی سے۔ اور پھر۔۔ یہ چھت اس کے لیے انجان تھی۔ وہ کہاں تھی؟! غرناطہ میں! جواب حاضر تھا۔ اور ساتھ ہی غرناطہ کی اس خوفناک رات کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ جیسے تیسے گھر پہنچی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں۔ غالباً ان خاتون نے اسے نیند کی گولی دے دی تھی۔ تبھی وہ گہری نیند سوتی رہی۔

موبائل ایک بار پھر زور سے چنگھاڑا تھا۔ اس بار وہ اٹھنے میں کامیاب رہی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھایا اور اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھا۔ کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کیے بنا اس نے فون اٹھا لیا۔

”السلام علیکم آپی۔ کیسی ہیں آپ؟ ٹھیک تو ہیں ناں؟ کہاں ہیں اور فون کیوں بند ہے اتنے دنوں سے؟! جانتی ہیں کتنا

پریشان رہا ہوں میں ؟!" جندل کے بولنے پر اسے یاد آیا تھا کہ اس کا موبائل تو بند تھا۔ اب کس نے آن کیا؟!

"میں، ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟" اس کے باقی تمام سوالات کو نظر انداز کیا گیا۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں۔ آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ آپ سچ میں ٹھیک ہیں ناں؟ کوئی پریشانی تو نہیں؟ اس وقت کہاں ہیں؟"

"غرناطہ۔" ایک اور مختصر جواب۔

"آپی، آپ رو رہی ہیں؟" وہ اس کے نا چاہنے کے باوجود اس کی آواز میں گھلی نمی محسوس کر گیا تھا۔ وہ خود کو روک نہیں پائی تھی۔ تبھی سر گھٹنوں میں دیے رو دی تھی۔ بے تحاشا۔۔ بے انتہا۔۔! دل میں جمع جتنا غبار تھا آج جندل کے سامنے نکال دیا تھا۔ وہ حیران پریشان اس کی سسکیاں سنتا رہا تھا۔

"میں نے۔۔۔ میں نے تمہیں۔۔ بہت یاد کیا۔۔ جندل!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اسے بہانہ گڑھنا تھا۔ اسے کیسے بتا دیتی کہ کل رات وہ کسی کی پستول کی زد میں تھی؟ اگر بھاگتی نہ تو عزت جاتی، اور بھاگی تو جان موت کی دہلیز پر تھی، آر یا پار۔

"آپ کی فلائٹ بک کروا دوں؟"

"ہاں، اس اتوار کی۔" اس نے اپنے بھیگے گالوں کو رگڑا۔

"اتوار میں چار دن ہیں۔" اطلاع دی گئی۔

"رہ لوں گی۔" تسلی دی گئی۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ اسے اندلس میں گزرے دنوں کے بارے میں بتاتی رہی تھی۔ البتہ ذہن میں سوال اب بھی کھٹک رہا تھا۔ اس کا فون کس نے آن کیا تھا؟

☆☆☆

وہ جندل سے بات کرنے کے بعد فریش ہونے چلی گئی تھی۔ کافی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو بال بھیگے ہوئے تھے۔ غالباً نہا کر نکلی تھی۔ سنگھار میز کے قد آور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بال سکھائے پھر انہیں اوپر سے کیچر میں باندھ دیا۔ نیچے سے بال کمر پر بکھر گئے۔ دوپٹہ لے کر سر پر ڈالا اور بیڈ پر بیٹھ کر اپنا ہینڈ بیگ کھنگالنے لگی۔ وہ ابھی اسی کام میں مصروف تھی کہ کمرے کا دروازہ بجا۔

"میں ہوں، زیاد۔"

"آ جاؤ۔" وہ ہینڈ بیگ سائیڈ پر رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کمرے کا دروازہ کھولتا ٹرالی گھسیٹتا اندر آیا تھا۔

"صبح بخیر۔" زیاد نے نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی مکمل توجہ ٹرالی پر تھی۔ وہ خاموش رہی۔ "میں تمہارے لیے ناشتہ لایا ہوں۔ آنٹی چرچ گئی ہیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ انہیں دیر ہو جائے گی، تم اٹھ جاؤ تو ناشتہ پہنچا دوں۔" وہ تفصیل بتاتے ہوئے اس کے لیے ناشتہ نکال رہا تھا۔ وہ ہنوز خاموش رہی۔ وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے لبوں کو دانتوں سے کاٹتا چپ چاپ ناشتہ نکالنے لگا۔ توجہ کا مرکز اس وقت صرف ناشتہ تھا۔

وہ ناشتہ اس کے سامنے بیڈ پر رکھ چکا۔ ٹرالی سائیڈ پر رکھ دی۔ چائے بھی بنا کر پیش کر دی۔ باجود اس کے وہ چپ چاپ ویسے ہی کھڑی رہی۔ اس پر نظریں جمائے، کچھ خفگی سے کچھ غصے سے۔

"سعاد۔۔۔" اس بار نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ لب دانتوں میں دبائے۔ سعاد کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بالکل سپاٹ۔ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری چہرہ!

"تم ٹھیک ہو؟" وہ تھوڑا پریشان ہوا تھا۔

"سوال یہ ہے کہ تم ٹھیک ہو؟ رات زخمی تھے تم۔ باجود اس کے کس ضروری کام سے گئے تھے ہاں؟!" اس کی آواز خود بخود بلند ہوتی گئی تھی۔ چہرہ ایکدم غصے سے لال پڑنے لگا تھا۔

"میں زخمی نہیں تھا۔ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ مطلب بس ذرا سا زخم دے کر نکل گئی تھی۔ وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔" اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے پھر کرسی کھینچ کر بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے اسے گھورتی رہی۔ زیاد نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دانت کچکچاتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"تم رونا چاہتی ہو؟" سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟" طنزیہ پوچھا گیا تھا۔

"اپنا کندھا پیش کر سکتا ہوں۔" اس نے بہت آرام سے کہہ دیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے بنا پلک جھپکے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا سا مسکرا دی۔ وہ رات زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا، اب ہونا چاہتا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے ایک بار جندل اپنے لفنگے دوست کے ساتھ کالج سے بھاگ کر آیا تھا۔ دو چار لڑکوں کو بھی پیٹ کر آئے تھے برخوردار۔ مجھے معلوم ہوا تھا تو رکھ کر دو تین تھپڑ جڑ دیے تھے۔ تھپڑ اتنے زور کے نہیں تھے لیکن باوجود اس کے اس کے منہ سے بے تحاشا خون نکلا تھا۔ تمہیں یقین آیا؟" وہ مسکراتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے معصومیت سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"تجربہ کرنا چاہو گے؟ خون نکلنے کی گارنٹی دے رہی ہوں۔" وہ ایکدم سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ سعاد نے محظوظ ہوتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا تھا۔ "میرا فون تم نے آن کیا تھا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلایا گیا۔ "آنٹی سے کہا تھا انہوں نے کیا تھا۔ مجھے لگا شاید تم اپنے بھائی سے بات کر کے اپنا بوجھ بانٹنا چاہو۔ کم از کم، وہ خوش قسمت ہے کہ تمہارے تھپڑ سے بھی محفوظ رہے گا۔" اس نے کان کھجاتے ہوئے بات مکمل کی۔

"گر اسیا، یہ واقعی میرے لیے بہت اچھا ثابت ہوا۔" وہ دلکشی سے مسکرائی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے ہلکی

سی سلوٹیں سی نمودار ہوئی تھیں۔ زیاد نے جواباً سر کو خم دیا تھا۔ وہ اب چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ وہ چند لمحے اردگرد دیکھتا رہا۔ وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا پھر آگے ہوا۔ دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائیں۔

"میں ڈر گیا تھا۔ زندگی میں، ایک عرصے بعد مجھے خوف آیا تھا۔" سعاد نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سنجیدگی سے اس پر نظریں جمائے بول رہا تھا۔ "تم نے، سالوں بعد مجھے خوف نامی احساس سے آشنا کروایا ہے سعاد! دوبارہ ایسا مت کرنا۔ میں خوف کے ساتھ نہیں جی سکتا۔ جس دن میں ڈر گیا، اس دن سب تباہ ہو جائے گا۔ میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ یہ خوف مجھ سے میرا سب کچھ چھین لے گا۔ میں بہت بڑی غلطی کا مرتکب ٹھہرا ہوں سعاد! میں نے تمہیں اپنی کمزوری بنالیا ہے۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا مگر یہ میرے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ جانے کب کیوں کیسے تم مجھے بے حد عزیز ہو گئیں۔ تمہیں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں تاحیات تنہا رہا ہوں صرف اس خوف کی وجہ سے جو کل رات مجھ پر وارد ہوا تھا۔ اگر کل تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر پاتا۔" وہ حیرت سے اسے دیکھے گئی۔ وہ بے بس نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ کس خوف کی بات کر رہا تھا اور خوف سے بھلا خوف کیوں؟ وہ اس کی کمزوری کیسے بنی اور یہ غلطی کیسے ہوئی؟ بے تحاشا سوال تھے۔ خود سامنے بیٹھا وہ شخص سراپا سوال تھا۔

اس دن پہلی بار مجھے اندازہ ہوا تھا کہ صرف میں نہیں تھی جس کے دل میں چھپا خوف اس کے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ میرے سامنے بیٹھا وہ شخص بھی، کچھ انہی حالات سے گزرا تھا جن سے میں گزری تھی۔ اور پھر زندگی کے اس مقام پر جب ہم دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ ہم اپنے خوف سے پیچھا چھڑا چکے ہیں تو ایک ہی رات میں، ایک ہی وقت، ایک ہی لمحے میں ہمیں وہیں دھکیل دیا گیا تھا جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی۔ میں اسی جلتے ہوئے گھر میں تھی، انہی

بھسم ہوتے وجودوں کے پاس۔ اور زیاد؟ وہ کہاں جا پہنچا تھا؟

"مجھے تم سے محبت ہے۔ میں اندلس سے جانے کے بعد کبھی واپسی کا نہیں سوچتا۔ مگر اب صرف تمہارے لیے لوٹوں گا۔ میں ضرور آؤں گا۔" اس کے لہجے میں عزم تھا۔ وہ مبہوت سی اسے دیکھے گئی۔

"میں، تمہارا۔ انتظار کروں گی۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کے بات مکمل کی تھی۔ زیاد نے خوشگوار حیرت آنکھوں میں سموئے اسے دیکھا تھا۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ دھیرے سے۔۔ ہلکے سے۔۔

"میں اس انتظار کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نگاہ اس پر ڈال کر وہ جانے کے لیے مڑا۔ پھر کچھ سوچ کر رکا۔ ٹھہرا اور اس کی طرف مڑا۔ "تم رویا مت کرو یار۔ سیریسلی پوری ٹماٹر بن جاتی ہو روتے ہوئے۔" مسکراہٹ دبا کر کہتا وہ پلٹ گیا۔ سعاد نے خفا خفا سی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔

"تم ایک نمبر کے جنگلی خر ہو۔"

"میں تمہیں بالکل بھی سپیرا اسینیوریتا نہیں کہوں گا۔" اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"خود ہو گے منحوس۔ جنگلی گدھے۔ بہت برے لگتے ہو تم مجھے!" وہ بند دروازے کے پار سے چلائی تھی۔ لاؤنج کی طرف جاتے زیاد نے اپنے کان کھجائے تھے، وہ بس بہرا ہونے کو تھا۔

☆☆☆

"دلِ بی دوست دلی غمگین است۔۔۔"!

اس کے ساتھ غرناطہ کی گلیوں میں پھرتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں گنگنایا تھا۔ سعاد نے مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں فارسی آتی ہے؟"

”فارسی، عربی، ترکش، اردو، یونانی، لاطینی، انگریزی، کوریئن، چائینیز اور تین ماہ ہونے کو ہیں تھائی بھی سیکھ چکا ہوں۔“ اس نے گردن ترچھی کر کے زیاد کو دیکھا تھا۔

”واقعی؟“

”کوئی شک؟“ وہ مسکرایا۔

”زندگی میں صرف زبانیں ہی سیکھی ہیں کیا؟“ وہ ناک سکیڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں۔ کتابیں بھی پڑھی ہیں اور سفر بھی کیے ہیں۔ تم آوارہ گردی بھی کہہ سکتی ہو۔“ وہ اب ایک تنگ گلی میں داخل ہوئے تھے۔ گلی کے دونوں اطراف میں اونچے سفید رنگ کے گھر تھے جن کی کھڑکیوں پر پھول رکھے ہوئے تھے۔ کچھ پھول جھک جھک کر آنے والوں کو سلام کر رہے تھے۔ گلی میں داخل ہوتے ہی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھر اوپر کی طرف اٹھتے جا رہے تھے۔

”سفر تو ٹھیک ہے۔ مگر کتابیں؟ تم کیا بہت بہت زیادہ والی کتابیں پڑھتے ہو؟ کتابی کیڑے ہو؟“ اس نے ناک بھوں چڑھائے پوچھا تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ لڑکا اس کے مزاج کے بالکل مختلف جا رہا تھا۔ بھائی انکار کرے نہ کرے وہ یقیناً انکار کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

”ہاں کتابیں، ڈھیروں کتابیں۔ یہ جو تمہیں طوطے کی طرح اندلس کی کہانی سنائی ہے یہ میری مہینوں میں اندلس کے بارے میں پڑھی گئی کتابوں کا صرف ایک چوتھائی حصہ ہے۔ بلکہ اس سے بھی مختصر ترین!“ وہ رک گیا تھا۔ وہ اب شہر سے بلندی پر کھڑے تھے۔ ان کے عین سامنے پہاڑوں میں گھرا الحمرا تھا۔ چاروں طرف غرناطہ کے پر رونق شہر کی رونقیں تھیں، دل موہ لینے والیں۔ ”اندلس کی تاریخ گہرائی میں پڑھنے کے لیے نسیم حجازی کو پڑھو۔ اس کے علاوہ ”اندلس میں اجنبی“ سفرنامہ ہے مستنصر حسین تارڑ کا۔ تم وہ ضرور پڑھنا۔ انت ہے بالکل۔“ وہ

اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں سے انجان الحمرا پر نظریں ٹکائے اسے کتابوں کے نام گنوا رہا تھا۔

"تمہارے مستنصر حسین تارڑ نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ سان سباستیان والے آکٹوپس کھلا دیتے ہیں؟" اس نے گردن ترچھی کر کے سر ذرا اونچا کر کے آنکھیں چھوٹی کیے اپنے برابر میں کھڑے سینیور زیاد کو دیکھا۔

"بتایا تھا، میں بھول گیا۔" اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بھنویں اکھٹی کرتا اس کی طرف مڑا۔ "تمہارے مسٹر نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ ہاسٹل کی چھٹی منزل پر چوہوں سے بھرا کمرہ ملتا ہے؟" وہ بھی اسی کے انداز میں آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"بتایا تھا۔ مطلب دکھایا تھا۔ ڈرامے میں سین مزے کا تھا، تبھی میں نے کہا حقیقت میں تجربہ کیا جائے۔" ذرا توقف کیا۔ "اور بات سنیں سینیور زیاد! اس کا نام مسٹر یوہے یو۔ تمہارا مسٹر مت کہو۔" اس کے چڑ کر کہنے پر وہ چہرہ ترچھا کر کے ہنس دیا تھا۔ وہ اس کے ہنسنے پر خجلت کا شکار ہوئی۔ "ہنسو مت۔ ڈرامہ دیکھنا یہ۔ میموریز آف الحمراء۔ بہت انت ہے۔" اس کی ہنسی پر اسے ٹوکنے کے ساتھ ہی مشورہ بھی دیا گیا۔ وہ فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتا فوراً سنجیدہ ہو کر سر اثبات میں ہلا گیا۔ وہ خاموشی سے الحمراء کو دیکھنے لگی۔ قدیم الحمرا، سرخ زمین، سرخ قلعہ۔ یہ سرخ قلعہ کسی سے خون سے رنگا گیا ہے۔ اس کے لیے دل نہیں خون دیا گیا ہے۔ خون جسے بھلا دیا گیا۔ الحمرا ویران پڑ گیا۔

"سینیوریتا۔" زیاد نے نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکائیں۔ سورج کی سنہری شعاوں میں چمکتا سرخ حجاب کے ہالے میں مقید یہ چہرہ اسے عزیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ دل اتنا بے اختیار کیوں ہوتا ہے؟ "یہ ہماری غرناطہ میں آخری شام ہے۔" وہ اسے اطلاع دے رہا تھا۔ رات کو ٹرین سے وہ غرناطہ سے بارسیلونا جائیں گے اور وہاں سے اپنے وطن کی طرف پرواز بھریں گے۔

"آخری نہیں ہے۔ میں یہاں دوبارہ آؤں گی۔ میں بار بار آؤں گی۔ میں تب تک آؤں گی جب تک الحمرا میں جان

نہیں دے دیتی۔" زیاد نے اس کی بات پر خفا خفا سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"تمہیں پتہ ہے زیاد میری خواہش ہے، جب میں جان دوں ناں تو عنقا اپنا سریلا گیت گائے۔ جب میری آخری سانسیں چل رہی ہوں تو اس وقت عنقا آگ میں جل رہا ہو۔ وہ بھسم ہو جائے اور میرا اختتام ہو۔ تمہیں کبھی کہیں عنقا درد بھرا گیت گاتا سنائی دے، یا تم کسی بھسم ہو چکے عنقا کی راکھ سے نئے عنقا کو وجود میں آتے دیکھو تو سمجھ جانا، جسے تم محبت کہتے ہو، وہ دغا دے گئی۔ میں یقیناً تمہارے ساتھ ظلم نہیں کرنا چاہوں گی مگر خواہش تو پھر خواہش ہے۔ تم نے وولوز آف سرنو گریٹس کی کہانی سنی ہے؟ سرنو گریٹس کا ڈیتھ میوزک؟" زیاد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ سعاد کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ یہ وہی نمی تھی جو کبھی بھی کہیں بھی چمکنے لگتی تھی۔ ظاہر ہے وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ بس دوسروں کے ساتھ ظلم کرتی تھی۔ وہ رلانا جانتی تھی۔

"ویسے، میرا دغا دے جانا قابلِ قبول ہے۔ تم نے اگر محبت کی راہ میں بے وفائی کے کانٹے بچھائے تو جرم ناقابلِ معافی ہو گا۔ اس راہ پر تم ہی مجھے لائے ہو۔" الزام اس کے سر دیا۔ خود جان بھی لیں تو سر بلند! مقابل پر سوچنا بھی حرام! ظالم سینیوریتا۔۔!

"از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس۔

ہم اہل دل سے محبت اور خلوص کے سوا کچھ مت پوچھو۔" وہ مسکرا دی۔ پھر سر جھٹک کر ہنس دی۔ وہ ابھی بھی خفا تھا۔ تبھی اسے ہنستا دیکھ کر رخ موڑ گیا۔

"غیور مشرقی لڑکے، مجھے کتابوں کا نام سن کر نیند آتی ہے۔ تم تو چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا ہو یار۔ میں انکار کر دوں یا تم پیچھے ہٹ رہے ہو؟" زیاد نے بے انتہا حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت بھری انوکھی چمک تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"واقعی؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔ سعاد نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ زیاد نے بے اختیار اپنی پی کیپ اتاری تھی۔

"واللہ سعاد غضب ہو گیا! میں کتابوں کے عشق میں ڈوبا لڑکا کتابوں سے بھاگنے والی لڑکی سے محبت کر بیٹھا۔"

"پیچھے ہٹ رہے ہو؟" وہ شرارتاً پوچھتے آگے ہوئی۔

"پیچھے کھائی ہے، ہٹ جاؤں؟" وہ بھی پھر زیاد تھا۔

"دھکا دوں؟" وہ تو پھر سعاد تھی ناں۔ سعاد یوسف زئی۔۔ چالاک پٹھانی! اسے آگے کیوں بڑھنے دیتی؟ سر فخر سے بلند رہے، لبوں پر مسکان رہے، زندگی میں شان رہے۔ وہ اپنے الفاظ سے پیچھے ہٹ کر کیونکر یہ ثابت کرتی کہ وہ بھی ہار گئی تھی۔ اسے مات دی تھی تو خود بھی اسی چال سے گری تھی۔ مگر بات پردہ راز میں تھی۔ راز میں ہی رہنی تھی۔۔ خبردار!

☆☆☆

"الحمرا جانوں کا قرض نہیں رکھتا۔ وہ دلوں پر حاوی ہوتا ہے۔ جو دل کسی اور کو دے چکا الحمرا اس کا خون قبول نہیں کرتا۔"

"غرناطہ وہ ساحر ہے جس کے سحر سے دنیا آج بھی نہیں نکلی۔ غرناطہ کا جادو دلوں پر چلتا ہے تو انہیں چیر کر رکھ دیتا ہے۔ اہل غرناطہ کبھی اداس ہوں تو ان سے پوچھا جاتا ہے، خیر تو ہے غرناطہ تو نہیں چھن گیا؟"

ٹرین چلنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے رفتار پکڑ رہی تھی۔ وہ دور جا رہی تھی۔ دور، غرناطہ سے دور، الحمرا سے دور۔

"سنو الحمرا! میں سعاد یوسف زئی ہوں۔ تمہارے لیے آنسو بہانے والے بہت ہیں مگر جب جان دینے کی بات آئے تو تم مجھے اپنے لیے جان دینے والوں کے ہراول دستے کی پہلی صف میں کھڑا پاؤ گے۔ مجھے یقین ہے تم پر صلیب کا جو

بھاری بوجھ لاد دیا گیا ہے، یہ کسی دن منہ کے بل گرے گا۔ تم آزاد ہو گے الحمرا، تم اپنے اسلاف کی طرف لوٹو گے"!

الحمرا کی سرخ دیواریں اور وہ شاہی ایوان، وہ صبح سے شام ان ایوانوں میں گھومی تھی۔ بارہ شیروں کے میدان میں وہ بارش میں بھیگی تھی۔ الحمرا نے اس کی دیوانگی کو اوج پر پہنچایا تھا۔ اس نے سر کو خم دے کر اعتراف کیا تھا۔

"غرناطہ اتنا خوبصورت کیوں ہے؟ یہ جادوئی شہر اپنے جادو کا راز کیوں نہیں بتاتا؟ میں یہاں آئی۔ اب واپس کیسے جاؤں گی۔ بالکل وہی احساس جو مجھے قرطبہ سے جاتے وقت ہو رہا تھا۔ قرطبہ کو تو دل دیا تھا ناں۔ اب دیکھو یہاں سے گئی تو جان سے جاؤں گی۔۔!" بارش کی ہلکی پھوار ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ غرناطہ کی گلیوں میں کھڑے بھیگ رہے تھے۔ مگر نمی کا وہ احساس جو دل کو پگھلا رہا تھا، ہر وہ قطرہ جو دل پر گر رہا تھا۔۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔۔ اس کا مقابلہ بارش کے ان قطروں سے ممکن نہ تھا۔ وہ نمی غرناطہ کے سحر کی تھی۔ وہ قطرہ غرناطہ کا جادو تھا۔ غرناطہ دل پر براجمان تھا۔ اور سر پر غرناطہ کی بارش برس رہی تھی۔ ان دونوں نے شاید ہی زندگی میں کبھی ایسا خوبصورت منظر دیکھا تھا۔

"کیا میں کبھی غرناطہ لوٹوں گی؟ اس زمین پر جس کے لیے خون دیا گیا ہے، کیا میں دوبارہ قدم رکھ پاؤں گی؟! واللہ۔۔۔ غرناطہ تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

ٹرین غرناطہ کی حدوں سے نکل گئی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے زور سے آنکھیں میچی تھیں۔ کئی آنسو قطار کی صورت میں گالوں پر لڑھکتے چلے گئے تھے۔ اس نے اپنا سر سیٹ پر ٹکا دیا تھا۔

"میرا کندھا ہمہ وقت اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہے، سینیوریتا!" وہ بند آنکھوں سے ہنس دی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے چہرہ موڑ گیا تھا۔

"میرے ہاتھ میں بھی خارش ہو رہی ہے۔" وہ اب اپنے گال رگڑ رہی تھی۔

"وہ اس لیے کہ تمہیں میری سیلری دینی ہے بارسیلونا کے ایئرپورٹ پر۔"

"ہم، واقعی لوٹ رہے ہیں؟"

"نہیں مذاق مذاق میں جا رہے ہیں۔ واپس آ جائیں گے فوراً۔" وہ شرارت سے کہتا سعاد کے منہ کے بگڑتے زاویے دیکھ کر محظوظ ہوا تھا۔

"بدتمیز سینیور! تم بالکل بھی میرے جذبات نہیں سمجھ سکتے۔"

"ہاں کیونکہ ہم مشرقی لڑکے سنگلاخ چٹانوں سے سخت ہوتے ہیں۔ تم مشرقی لڑکیوں کے نرم جذبات کہاں سے سمجھیں گے؟!" وہ اپنی کیپ اتار کر بالوں میں ہاتھ چلاتا انہیں ماتھے پر بکھیر رہا تھا۔

"تم منہ تُڑوا بیٹھو گے اپنا۔" وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

"ہونے والا شوہر ہوں۔ ٹوٹے ہوئے منہ کے ساتھ جاوں گا تو تمہارا بھائی دور سے ہی ہاتھ ہلا دے گا۔" اس نے شرارتاً کہتے ہوئے اپنی پی کیپ اس کے حجاب کے اوپر ٹکائی تھی۔ پھر ٹانگیں لمبی کر کے اپنا تکیہ سر کے نیچے رکھا تھا۔ وہ غالباً سونے کی تیاریوں میں تھا۔

"بدتمیز مت بنو زیاد! میرے ہاتھ میں خارش بڑھ رہی ہے۔" اس نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ جو آنکھیں موند چکا تھا، اس کی بات پر ذرا سا مسکرایا۔

"زیادہ خارش، زیادہ پیسے۔ اللہ حافظ۔ شب۔۔۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سعاد نے اس کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ وہ ایکدم بوکھلا کر سیدھا ہوا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس شیرنی کو دیکھا تھا۔

"سوؤں نہیں کیا؟"

"ایک خاتون کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ مت بھولو تمہیں چوبیس گھنٹوں کا پے کرتی ہوں۔ ابھی بھی ڈیوٹی پر ہو، سیدھے ہو کر بیٹھو فوراً۔" وہ اسے آنکھیں دکھاتی اس پر رعب جما رہی تھی۔ وہ معصومیت سے اسے دیکھتا رہا پھر فرمانبردار شاگرد کی طرح سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے سخت گھوری سے نوازتی کھڑکی کے پار مناظر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سرعام پیٹ دیتی ہیں یہ سینیوریتا! الہٰی آبرو رکھنا بڑا نازک زمانہ ہے۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ وہ کھڑکی پر جھکتی اپنی مسکراہٹ چھپا گئی تھی۔

☆☆☆

بس ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ بس ایک قدم۔ ایک قدم بڑھانے پر وہ بارسیلونا کے ایئرپورٹ میں داخل ہو جاتی۔ پھر وہاں ایک بند کمرے میں جاتی اور وہاں سے اپنے وطن کے لیے پرواز بھرتی۔ وہ اندلس سے لوٹ جانے والی تھی۔ اس کا اٹھنے والا قدم اندلس کی سرزمین پر آخری قدم تھا۔

اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ نیلا شفاف نیلگوں آسمان۔ سفید روئی جیسے بادل جو ٹکڑوں میں بٹے آسمان پر تیر رہے تھے۔ جیسے سپاہی ہوں اور دستوں میں بٹ کر فضائی حدود میں رہ کر اپنے ملک کا پہرہ دے رہے ہوں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں نمی سی تھی۔ گویا صبح بارسیلونا میں بارش ہوئی تھی۔ وہ سرمئی گاؤن میں ملبوس تھی۔ زیاد کی دی ہوئی بھوری شال اپنے شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ دائیں ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھام رکھا تھا۔ سیاہ حجاب کے ہالے میں مقید چہرہ ٹھنڈ اپڑ رہا تھا۔ گال ذرا سے لال لال ہو کر دمک رہے تھے۔ حجاب کے اوپر زیاد کی سیاہ پی کیپ ٹکا رکھی تھی۔ وہ جانے کے لیے مکمل تیار تھی، مکمل تیار۔

وہ اس کے عقب میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے الوداع کہنے کے لیے دھڑکتے دل کے ساتھ پلٹی تھی۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ زیاد نے دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں نمی پگھل رہی تھی۔ وہ اداس تھی، اندلس سے جانے پر اداس اور شاید اسے الوداع کہنے پر بھی۔ کون جانے؟

”فلائیٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ وہ پلک نہیں جھپک رہی تھی۔ وہ یقیناً اپنے آنسو چھپانے کی کوششوں میں تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ہونٹ کاٹتی چپ چاپ وہیں کھڑی رہی۔ پھر ذرا سا سر جھکایا۔ آنسو گویا انتظار میں تھے، فوراً گال پر لڑھک گئے۔ اس نے تیزی سے دائیں ہاتھ سے گالوں کو رگڑا پھر سر اٹھایا۔ مزید دو آنسو پلکوں کی باڑ توڑتے ہوئے سامنے آ گئے۔ اس نے بے بسی سے لب زور سے بھینچے تھے۔ وہ اس کی کمزور کوششوں کو دیکھتا ہلکا سا مسکراتے ہوئے آگے آیا۔ اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے رومال تھام کر زور سے مٹھی میں دبایا۔

”اب تم ایسے روؤ گی تو مجھے بھی مجبوراً ساتھ چلنا پڑے گا تمہارے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ بالکل ذرا سا، ہلکا سا، اپنے اسی ازلی انداز میں۔

”میں نہیں رو رہی۔“ سوں سوں کرتے ہوئے ذرا توقف کیا۔ ”تم کب لوٹ رہے ہو؟“ نگاہیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ نظریں ملی تھیں۔ اس بار، زیاد کو اپنا عکس ان آنکھوں میں ڈبڈباتا نظر آیا تھا۔ توس افوس سون پیراسیوس!

”بس دو دن بعد میں بھی نکل جاؤں گا یہاں سے۔ سینیوریتا۔۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ”میں جلد لوٹوں گا۔ تمہارے لیے، بہت جلد!“ اس کے لہجے میں چھپے عزم کو محسوس کرتے ہوئے اس نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ زیاد کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"یہ تمہاری کیپ۔" اس نے یاد آنے پر فوراً اپنے سر سے پی کیپ اتار کر اسے پکڑائی۔ زیاد نے پی کیپ پکڑ کر واپس اس کے سر پر ٹکا دی۔

"تم رکھو۔ یہ یہاں زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔" اس نے لب دانتوں میں دبا کر تذبذب سے زیاد کو دیکھا۔

"شال؟ رومال؟ اور سیلری؟"!

"جب تم بہت غیر محفوظ محسوس کرو تو یہ شال تمہیں یاد دلائے گی کہ اندلس میں ایک رات کوئی تمہارا محافظ بن کر آیا تھا۔ یہ رومال تمہیں دلائے گا کہ، وہ محافظ جلد لوٹے گا۔ اور میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں اندلس میں فری آف کوسٹ گائیڈ کی خدمات پیش کرتا ہوں۔" سعاد نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکراہٹ دبا تا شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سپیرا سینیور!

"تم بہت بدتمیز ہو۔۔!" وہ خفا ہوئی تھی۔ وہ مسکراتا رہا۔ وہ خائف نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ چپ چاپ کچھ کہتا رہا۔ وہ چپ چاپ کچھ سنتی رہی۔ پھر اس نے لبوں کو حرکت دی۔ الفاظ اکٹھے کیے، لب واں ہوئے۔

"میرے لیے تمہیں الوداع کہنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے سعاد! جانے کیوں میں تمہیں الوداعی سلام نہیں کہہ پا رہا۔ مجھے لگتا ہے جس لمحے میں مَیں تمہیں الوداعی سلام کہوں گا، میں وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ ہم پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔"

"تم نے وعدہ کیا ہے تم لوٹو گے۔" اس نے مان سے کہا تھا۔

"میں ضرور لوٹوں گا۔ اور سنو! یہاں سے جاتے ہیں بھول مت جانا مجھے، ٹھیک ہے؟ ایک اچھا ساتھی تو شاید میں نہیں بن سکا لیکن ان چند دنوں میں اندلس کی گلیوں میں تمہیں گھماتے ہوئے میں اچھا گائیڈ ثابت تو ہوا ہی ہوں ناں؟!" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ڈھیروں پانی اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگا تھا۔ رومال پر اس کی گرفت مضبوط

سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

"تم بہت اچھے ہو۔۔" بالآخر اس نے اعتراف کیا تھا۔ زیاد نے کھل کر مسکراتے ہوئے گردن کو خم دیا تھا۔

"وہ یاد ہے ناں؟" وہ اس کے پوچھنے پر تیزی سے اثبات میں سر ہلا گئی۔ وہ اس کی عجلت پر مسکرایا۔ "کیا یاد ہے؟"

"توس افوس سون پیر اسیوس!" وہ اسے بتاتے ہوئے مسکرائی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے ہلکی سی سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔ وہ یک ٹک انہیں دیکھے گیا۔ سب کچھ۔۔ ہر منظر دھندلا ہوتا گیا تھا۔۔ ہر آواز خاموش ہوتی گئی تھی۔۔ وہ ہوش میں آیا تھا جب ایئرپورٹ پر جہاز کے جلد ہی اڑان بھرنے کا اعلان ہوا۔

"میں جاؤں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے اپنا ٹیچی لیا تھا۔ "فی امان اللہ۔" وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ہونٹ کاٹ رہا تھا، اسے روک رہا تھا۔ وہ پریشان ہوئی تھی۔

"سینیور زیاد۔۔۔"

"فی امان اللہ۔۔۔ سعاد! غصہ مت کیا کرو پلیز۔۔!" اس نے آخر میں التجا کی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ پھر جانے کے لیے مڑ گئی۔ بائیں ہاتھ سے ٹیچی کو گھسیٹتے ہوئے اس نے ایک قدم بڑھایا تھا۔ پھر دوسرا اور تیسرا۔۔۔ وہ دور جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے دور۔ پھر کئی قدم بڑھے، وہ جا چکی۔ وہ وہیں تنہا کھڑا رہ گیا۔ تیز ہوا کا جھونکا اس کے پاس سے گزرا۔ اس نے ٹھنڈ کے احساس پر اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں اڑسے۔ نگاہیں ابھی تک اس دروازے پر تھیں جہاں سے وہ گئی تھی۔

اور پھر اس نے دیکھا تھا، وہ جس دروازے سے گئی تھی اسی دروازے سے بھاگتے ہوئے واپس آ رہی تھی۔ اسے لگا یہ خواب ہے۔ مگر وہ حقیقت میں اس کے سامنے تھی۔ اتھل پتھل ہوتی سانسیں، تیزی سے دھڑکتا دل، وہ گہری

سانسیں لے رہی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں کہ یہ پی کیپ مجھے کس کی یاد دلائے گی؟" وہ پھولتے ہوئے تنفس کو بحال کرتی پوچھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے حیران پریشان کھڑا رہا۔ پھر اس کے کسی بچے کی طرح اپنا بازو ہلانے پر ہوش میں آیا۔

"یہ تمہیں۔۔ میری یاد دلائے گی۔۔ صرف میری!" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے حجاب سے پھسلتی پی کیپ واپس اس کے حجاب پر ٹکائی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

"اور تم مجھے کیسے یاد کرو گے؟"

"تمہاری آنکھیں۔۔ تمہاری مسکراہٹ۔۔ تمہارے قہقہے۔۔ مجھے تمہیں بھولنے ہی نہیں دیں گے جو یاد کرنے کی نوبت آئے۔" وہ یقین کے ساتھ کہتا کندھے اچکا گیا تھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ ایک آخری اعلان ہوا۔ وہ کھڑی رہی۔ زیاد نے آگے بڑھ کر اس کی نگاہوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ "سینیوریتا۔۔۔" وہ ہوش میں آئی پھر تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ جانے کے لیے پلٹی۔ قدم بڑھائے گئے۔ اس بار اٹھے قدم اسے ہمیشہ کے لیے اندلس سے جدا کرنے والے تھے۔ وہ جا چکی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ جانتا تھا اس بار وہ نہیں لوٹے گی۔ اس کے عین اوپر سے جہاز گزرا تھا۔ بلند، بہت بلند مقام پر پرواز بھرتا جہاز!

اس نے گہری سانس لی پھر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے اپنا چشمہ اتارا۔ چشمے کے عین وسط میں زور دیا، چشمہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اس نے پاس رکھے کوڑے دان میں چشمہ اچھال دیا۔ کچھ آگے جا کر اس نے جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ موبائل سے سم نکال کر اسے ٹکڑوں میں تبدیل کیا پھر اپنے قدموں میں گرا کر اسے بری طرح مسل کر آگے بڑھ گیا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے موبائل بھی دیوار پر دے مارا تھا۔ موبائل ٹکڑوں میں بدل گیا۔ غیر محسوس انداز میں جیب سے ایک آلہ نکالا۔ سیاہ رنگ کا

آلہ جس کی سوئی اس کے کان میں گھستی چلی گئی تھی۔ آلہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

"زیاد سر! ہدف ہمارے سامنے ہے۔" بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"اس کی ایک ایک ہڈی توڑ دو۔ آئندہ کسی خاتون کے سامنے کھڑا ہونے کی جرات نہ کر سکے!" اس کی آواز میں اب نہ وہ نرمی تھی نہ رحم۔ اب چہرہ سپاٹ تھا اور آواز میں سفاکی تھی۔ وہ اب چلتے چلتے اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔ چہرے پر ماسک چڑھالیا تھا اور سر پر پی کیپ آ ٹکی تھی۔

بارسلونا کے نیلگوں آسمان نے وہ منظر بھی دیکھا تھا جب فٹ پاتھ پر چلتا ایک لڑکا دائیں بائیں اپنی گردن کو جھٹکا دیتا اب مکمل اپنا حلیہ بدل چکا تھا۔ وہ اب سینیور زیاد نہیں تھا، وہ بہروپیہ تھا بہروپیہ۔

☆☆☆

وہ اپنے وطن لوٹ آئی تھی۔ وہ کمرہ جس کے اندر وہ اندلس میں گئی تھی، جس کے دروازے بند تو اندلس میں ہوئے تھے مگر کھلے کراچی میں تھے۔ وہ اپنا سامان گھسیٹتی ضروری کاغذی کاروائیاں پوری کرواکر ایئرپورٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ انسانی جم غفیر پر نظریں ٹکائے اس نے ایک دیوار کے سہارے اپنا سامان رکھا پھر موبائل نکال کر آن کیا۔ چند نمبر ملائے اور موبائل کان سے لگایا۔ کال فوراً ہی اٹھالی گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" خلاف توقع حرم کے گھر کے نمبر پر کی جانے والی کال ضرار نے موصول کی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ حرم گھر پر ہے؟"

"جی آپی گھر پر ہیں۔ آپ واپس آگئی ہیں کیا؟" اس کا لہجہ ایکدم بدلا تھا۔ آواز میں ایکدم پریشانی کے عناصر گھل گئے تھے۔

"ہاں ابھی بس ایئرپورٹ پر ہوں۔"

”سعاد سعاد میری بات سنیں۔ آپ فوراً نکلیں وہاں سے۔ سعاد فوراً نکلیں وہاں سے۔“ وہ پریشانی کے عالم میں چلایا تھا۔

”ضرار کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟“ وہ اس کے چلانے پر حیران ہوئی تھی۔

”سعاد میں کہہ رہا ہوں نکلیں وہاں سے فوراً۔ دیر مت کریں سعاد!!“ وہ ایک بار پھر چلایا تھا۔ پریشانی کے عالم میں۔۔غصے سے۔۔!وہ موبائل کان سے لگائے اپنا سامان پکڑتی تیزی سے باہر کی طرف بڑھی تھی۔ اردگرد نگاہیں دوڑاتی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر جا رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ موت کے منہ سے نکل رہی تھی۔ اس کا اگلا قدم اٹھا تھا۔ وہ ایئرپورٹ سے باہر سڑک پر کھڑی تھی۔ اسی وقت دھماکہ ہوا تھا۔ عین اس کے عقب میں، زوردار دھماکہ۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھتی نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ کان سن ہو گئے تھے۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے عقب میں بجز آگ کے کچھ نہ تھا۔ اس کی سماعت سے انسانی چیخیں ٹکرائی تھیں۔ خون ہر طرف خون۔ انسانی لاشوں کے پرخچے اڑے ہوئے تھے۔ زخمیوں کا کراہنا اور زندوں کا مردوں میں اپنے اپنوں کو ڈھونڈنا۔ وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ سب اس کی آنکھوں کے عین سامنے تھا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔ خون کی ایک چھوٹی سی ندی وجود میں آئی تھی۔ انسانی گوشت جا بجا بکھرا ہوا تھا۔ سب، ختم ہو چکا تھا۔ وہ آنکھوں میں پگھلتی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ رخ اس جگہ کی طرف تھا جہاں صرف ایک منٹ پہلے انسانی جم غفیر تھا۔ مسکراہٹیں تھیں، قہقہے تھے۔ اور اب وہاں بجز لاشوں کے کچھ نہ تھا۔ آہیں تھیں، چیخیں تھیں۔ وہ مفلوج ہو چکے دماغ کے ساتھ سن کھڑی یک ٹک یہ منظر دیکھتی رہی۔ ان چیخوں، آہوں کے درمیان ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی،

”سعاد سعاد میری بات سنیں۔ آپ فوراً نکلیں وہاں سے۔ سعاد فوراً نکلیں وہاں سے!“ ضرار، وہ جانتا تھا یہاں

دھماکہ ہونے والا ہے۔ اس نے اسے بچالیا تھا۔ وہ بچالی گئی تھی۔ مگر اس لمحے وہ دعا کر رہی تھی کہ کاش وہ بھی انہی مردوں میں سے ہوتی، کم از کم وہ اپنے قریبی عزیزوں کو دہشت گردی میں ملوث نہ دیکھتی۔ کم از کم وہ انہیں انسانیت کا قاتل بنتے نہ دیکھتی۔ ضرار، وہ جانتا تھا یہاں دھماکہ ہونے والا ہے، کیونکہ یہاں دھماکہ کروانے والا وہی تھا۔

☆☆☆

اس دن میں نے اپنے گردوپیش میں سب بدلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ میرے اردگرد کی دنیا اتنی پرسکون نہیں تھی، جتنی میں نے محسوس کی تھی یا جتنی میں اب تک سمجھتی آئی تھی۔ دنیا تو بہت آگے نکل چکی تھی۔ اتنی آگے کہ میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے انسانی خون کا ندی کی صورت میں بہنا اور انسانی گوشت کے اس طرح لمحے کے اندر اندر پرخچے اڑنے کا منظر بچپن میں دیکھا تھا۔ تب جب میرا گھر آگ کی زد میں آیا تھا۔ بابا، ماں، سب اس آگ میں جل کر بھسم ہو گئے تھے۔ اور آج اسی آگ میں مجھے اپنا آپ جلتا محسوس ہو رہا ہے۔ جانتے ہیں کیوں؟
وہ چپ چاپ کھڑی خاموش نظروں سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا وجود بالکل ساکت تھا۔ جسم میں جیسے جان نہ تھی۔ وہ ایئرپورٹ سے یہاں تک ضرار کی بھیجی گئی گاڑی میں آئی تھی۔ آنے والا کون تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ اور پھر اسی ڈرائیور نے جو کافی دیر سے متذبذب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، آگے بڑھ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھنٹی بجی، اس نے ہاتھ ہٹایا اور بغیر اس پر نگاہ ڈالے وہ مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ساتھ ہی اس کے عقب میں وہ گاڑی برق رفتاری سے وہاں سے غائب ہو گئی۔ دروازہ کھولنے والی حرم تھی۔ اس نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا۔
"اچانک سرپرائز دیا یار تم نے۔ پتہ ہے اتنا یاد کیا میں نے تمہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سعاد چپ

چاپ اسے دیکھے گئی۔

"آؤ اندر چلیں۔ مجھے تمہارے ساتھ ڈھیروں باتیں کرنی ہیں۔" وہ اسے ساتھ لیے اندر آئی تھی۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ اوپر کو اٹھی تھی۔ بالکل سیدھ میں، سیڑھیوں کے پاس۔۔ ریلنگ کو تھامے وہ وہیں کھڑا تھا۔۔ بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ صدمے سے، بے یقینی سے، بنا پلک جھپکے۔ حرم اس کی محویت کو محسوس کرتے ہوئے آگے آئی۔ اس کے آگے چٹکی بجا کر اسے ہوش میں لانا چاہا۔

"حرم وہاں ایئرپورٹ پر۔۔" اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ ضرار نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کھڑی کر کے اپنے لبوں پر رکھ دی تھی۔ اسے خاموش کروالیا گیا تھا اور وہ خاموش ہوگئی۔ نظریں اس سے ہٹا کر حرم کو دیکھا۔ "مجھے چائے چاہیے۔ سر میں درد ہے۔" حرم چند پل اسے دیکھتی رہی۔ اس کی غائب دماغی، اس کی خاموشی کو وہ محسوس کر چکی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ایک نگاہ ضرار پر ڈالی پھر پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج میں بس وہی رہ گئی۔ پھر وہ آگے بڑھی۔ ریلنگ کو تھامتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے اٹھتے قدم، وہ قریب آرہی تھی۔ آخری سیڑھی کے پاس کھڑا ضرار پیچھے ہٹا۔ وہ اوپر آگئی۔ بالکل اس کے روبرو کھڑی ہوئی۔ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ سعاد کی آنکھوں میں کئی سوال تھے، ضرار کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔ وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جواب نہیں دے گا، گویا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اسے بنا پلک جھپکے دیکھتی رہی یہاں تک کہ آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے ریلنگ کا سہارا لیا۔

"سعاد آپ ٹھیک نہیں ہیں۔" بس یہی کہا تھا اس نے۔ سعاد کا ہاتھ اٹھا تھا اور پوری قوت سے اس کے گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا تھا۔ چٹاخ کی آواز گونجی تھی۔ اس کا سر جھکا تھا، وہ کئی پل سر اٹھا نہیں پایا تھا۔ اور جب سر اٹھایا تھا تو اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی جرات نہیں کی تھی۔

"تم کیسے جانتے تھے کہ ایئرپورٹ پر دھماکہ ہوگا؟" ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی آواز دھیمی رکھی تھی۔ وہ خاموش رہا۔ نظریں جھکائے رکھیں۔ سعاد کو غصہ آنے لگا۔ صدمے کی جگہ غصہ حاوی ہونے لگا۔ "کچھ پوچھ رہی ہوں میں ضرار ولید!" اس بار وہ چلائی تھی۔ پوری قوت سے چلائی تھی۔ ضرار نے نگاہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"وہ سوال نہ کریں جن کا میں جواب نہ دے سکوں۔" سنجیدگی سے کہا گیا تھا۔ بے انتہا سنجیدگی، سپاٹ چہرہ، بے تاثر لہجہ۔

"تم انسانیت کا خون بہاؤ اور میں سوال بھی نہ کروں؟ خون کی ندی قائم کر دی ہے تم نے ضرار خون کی! تم انسان سے درندے کیسے بن گئے ہاں؟ اتنا کیسے گر سکتے ہو تم، کیسے؟؟!" اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ دماغ کی شریانیں ابھر رہی تھیں۔ مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں، وہ بس برسنے کو تیار تھیں۔

"جو دکھ رہا ہے، حقیقت وہ نہیں ہے سعاد!" وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اب بھی کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔

"تو بتاؤ حقیقت کیا ہے؟"!

"وہ سوال نہ کریں، جن کا میں جواب نہ دے سکوں!" اس بار وہ نہیں رکی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا تھا۔

"حقیقت تم بتاؤ گے نہیں۔ جو دکھ رہا ہے وہ حقیقت ہے نہیں۔ کسے بے وقوف بنا رہے ہو ہاں؟! وہاں خون دیکھ کر آئی ہوں میں، خون اور لاشیں۔ وہ خون جس سے تمہارے ہاتھ رنگے ہیں۔ کیسے جانتے تھے تم کہ وہاں دھماکہ ہونے والا ہے؟ اور مجھے کیوں بچایا ہاں؟! جب اس حد تک گر چکے تھے تو مزید گر جاتے۔ وہیں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ کم از کم میں اس تکلیف سے نہ گزرتی کہ وہ لوگ جنہیں میں نے ہمیشہ عزیز رکھا وہ قاتل ہیں درندے ہیں۔

وہیں مر جاتی تو اس خوف کے ساتھ یہ چند سانسیں نہ لیتی کہ میرا بھائی جو تمہارا بہترین دوست ہے، کہیں وہ بھی اس سب میں ملوث تو نہیں ؟! کہیں یہ درندگی کا لبادہ اس نے بھی تو نہیں اوڑھ لیا؟ تم جانتے ہو وہ میرا کل اثاثہ ہے! آج تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ کاش تم مجھے نہ بچاتے۔ کاش وہیں میرا اختتام ہوتا۔" کئی آنسو، قطار کی صورت میں اس کے گالوں پر بہتے چلے گئے تھے۔ ضرار نے دھیرے سے اپنا گریبان اس کی گرفت سے چھڑوایا تھا۔

"کاش آپ سوچ سمجھ کر بولنا سیکھ لیں۔" اس بار، اس نے تاثر دیا تھا۔ آنکھوں میں کچھ ٹوٹ کر بکھرا تھا، شاید مان۔ اور آواز میں درد کے عناصر گھل گئے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ "جلد نتیجے اخذ مت کیا کریں سعاد! بعض دفعہ حقیقت وہ نہیں ہوتی جو نظر آتی ہے۔ اور بعض دفعہ صحیح وقت بھی نہیں ہوتا کہ حقیقت کھل کر سامنے آئے۔ ایسے موقعوں پر انتظار کرتے ہیں، درست وقت کا۔ اور الفاظ روک لیتے ہیں۔ ورنہ بعد میں پچھتاوا مقدر ہوتا ہے۔۔"!

"جندل، جندل قاتل نہیں ہے؟ جندل نے کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیاناں؟!" وہ اب وہ سعاد نہیں تھی۔ وہ اس وقت ایک کمزور سی بہن تھی جس کا بھائی اس کا کل اثاثہ تھا۔

"اس پر یقین نہیں ہے تو کم از کم خود پر یقین کر لیں۔ جندل آپ کا بھائی ہے۔" وہ زخمی سا مسکرایا تھا۔ وہ اپنے گال رگڑتی پیچھے ہٹی تھی۔

"تم میرے سامنے مت آنا۔ تب تک جب تک مجھے اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ اگر نظر آئے تو اس بار تھپڑ پڑا ہے، اگلی بار جان سے ماردوں گی۔" اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ اس نے نم آنکھوں کو رگڑتے ہوئے بھیگی آواز میں کہا تھا۔ اور پھر وہ سیڑھیاں اترتی وہاں سے چلی گئی۔ وہ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ خاموشی

سے، دکھ سے۔

اس دن، میں نے یقین کرنا سیکھا تھا۔ ضرار نے صحیح کہا تھا۔ میں جندل پر یقین نہیں کر سکتی تو مجھے خود پر یقین کرنا چاہیے۔ وہ میرا بھائی ہے، وہ کیونکر کوئی غلط راہ اختیار کرے گا؟ میں جندل سے ملی۔ محبت اور خلوص سے ملی۔ ہم نے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیں۔ وہ چھٹیوں پر آیا تھا۔ ہم نے بہت وقت ساتھ گزارا۔ میں نے اس پر اندھا اعتماد کیا۔ وہ میرا بھائی تھا، مجھے اس پر یقین تھا، مان تھا۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ ہمارے درمیان سب ٹھیک رہا۔ البتہ، ضرار اس دن کے بعد سے گھر نہیں آیا۔ حرم پریشان تھی۔ اسے چھوٹا سا پیغام موصول ہوا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے شہر سے باہر ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی مگر میں جانتی تھی وہ میری وجہ سے گیا تھا۔ اس نے اچھا کیا تھا۔ یہاں ہوتا تو شاید میں اسے مار دیتی۔ میں واقعی ایسا کر بیٹھتی کیونکہ مجھ میں ایسا کرنے کی ہمت تھی! میں وہ لڑکی ہوں جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا آشیانہ جلتے دیکھا ہے۔ میں نے رات کی تاریکی میں ان گولیوں کی آوازیں سنی ہیں جنہوں نے میرے ماموں کو چھلنی کیا تھا۔ میرا ماضی تاریک ہے اور حال اندھیر! جس وقت میں جندل پر اندھا اعتماد کر رہی تھی میں بھول چکی تھی کہ، میرے ساتھ وہ بھی تاریک ماضی رکھتا ہے۔ اس کے پاس وجوہات ہیں کہ وہ انتقام کی آگ میں غلط راہ پر نکل جائے۔ میں بھول گئی تھی، جندل نے مجھے یاد دلا دیا۔ میں پھر کبھی نہ بھول سکی۔

☆☆☆

اس دوران، غالباً دو ماہ تک سب بالکل ٹھیک رہا۔ جندل دو ہفتے کی چھٹیاں گزار کر واپس یو کے چلا گیا۔ میں نے مصروف رہنے کے لیے کئی کام شروع کر دیے۔ میں ان دو ماہ میں ایک اچھی شیف بن گئی۔ میری کوئی امی نہیں ہیں ناں تو میں اچھی شیف بن گئی۔ سمجھ رہے ہیں ناں؟! میں نے اپنے باغیچے کا بے حد خیال رکھا۔ میں نے موویز دیکھیں، ڈرامے دیکھے۔ ہاں، اس دوران میں نے کئی بار جندل کی لائبریری میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مگر میں

اندر نہیں جاپائی۔ مجھے کتابوں سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے جندل کی کتابوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ رومانوی داستانوں پر مبنی ناول نہیں پڑھتا، اس کی ہر ایک کتاب چیخ چیخ کر حقیقت بتاتی ہے۔ وہ سیاست پڑھتا ہے۔ اس کی لائبریری میں پچاس فیصد وہ کتابیں ہیں جنہیں بین کر دیا گیا ہے۔ مختلف کالمز ہیں، اخباریں ہیں اس کی لائبریری، وہ بہت عجیب ہے۔ مجھے جندل کی کتابوں سے ڈر لگتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے ناں۔ میں حقیقت کو جاننا چاہتی تھی۔ ضرار مجھے کچھ بتانے پر راضی نہیں تھا، کتابیں اپنی خدمات پیش کرنے پر ہر لمحہ تیار تھیں۔ مگر میں ان کے پاس جانے پر راضی نہیں تھی۔ میں کتابوں کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ جندل کی کتابیں تھیں۔ وہاں مجھے صرف تلخ حقیقت ملے گی۔ سازشیں بے نقاب، اقصیٰ کے آنسو، یوم الغضب، انسانیت موت کے دروازے پر، یہود کی چالیس بیماریاں، یہودی پروٹوکولز، تلبیس ابلیس، تزک ہٹلری، طالبان کے دیس میں، فتوحات شام، تلاش حق، گوانتاناموبے، خطبات مجاہد، آزادی ہند۔۔۔ میں صرف ان کتابوں کے نام دیکھ کر ہی پیچھے ہٹ جاتی تھی کجا کہ ان کو پڑھنا۔۔!

وہ ایک ایسا ہی دن تھا۔ میں معمول کے کاموں سے فارغ ہوئی تو حرم گھر آگئی۔ یہاں بتاتی چلوں کہ ان دو ماہ میں ضرار گھر نہیں آیا تھا۔ میں حیران تھی بے حد حیران۔ میرا اس پر غصہ ختم ہو چکا تھا مگر اس کے لیے میرے کہے گئے الفاظ حرف آخر تھے؟ وہ صحیح وقت کے انتظار میں تھا اور اگر صحیح وقت نہ آیا تو کیا وہ واقعی کبھی نہیں لوٹے گا؟ وہ احمق ہے۔۔ احمق!

”یونیورسٹی میں سیمینار ہے۔ امریکہ کی کسی بڑی یونیورسٹی کے کوئی پروفیسرز آرہے ہیں۔ ہم چل رہے ہیں، فارغ بیٹھنے سے اچھا ہے۔“ اسنیکس کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے حرم نے اسے اطلاع دی تھی۔ اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ دونوں اپنی نشستیں سنبھال کر بیٹھی تھیں۔ اسٹیج پر کوئی پروفیسر اپنی داستان حیات سنا رہے تھے۔ اس یونیورسٹی سے یہ ڈگری لی، یہاں سے فلاں سبجیکٹ میں ماسٹرز کیا۔ یہاں سے پی ایچ ڈی کی۔ آہ، اسے نیند آنے لگی

تھی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بھرپور جمائی کی تھی اور تھوڑا سا کھسکتے ہوئے سر کرسی پر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ عین اسی لمحے اسے محسوس ہوا تھا کوئی اس کے دائیں طرف آکر بیٹھا ہے۔ اس نے توجہ دینا ضروری خیال نہیں کیا اور آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔ غالباً پندرہ منٹ بعد اسے آڈیٹوریم میں ہل چل سی محسوس ہوئی تھی۔

وہاں بیٹھے طلباء، یونیورسٹی کے پروفیسرز، انتظامیہ سب بے چینی سے اپنی نشستوں پر پہلو بدل رہے تھے۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ بائیں طرف گردن گھما کر حرم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ لال پڑ رہا تھا۔ ضبط کے مارے، غصے سے۔ اس نے نظریں اسٹیج پر ٹکائیں۔ وہاں مہمان پروفیسر اپنی تقریر میں مصروف تھے۔ اس نے ان الفاظ پر دھیان دیا۔ وہ سُن ہو گئی، بالکل سُن۔ چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

وہ خاصے نازیبا الفاظ تھے جو وہ اسلام کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ پروفیسر کیونکر اس موضوع تک آ پہنچے تھے اور مزید حیرت کی بات کوئی انہیں روک نہیں رہا تھا۔ بات یہیں نہیں ختم ہو گئی بلکہ ان کے زبان سے نکلتے زہریلے الفاظ اب امت مسلمہ کے نبی کے کردار پر اٹھنے لگے تھے۔ مختلف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ آڈیٹوریم میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

اسی لمحے کوئی چیز اس کے قدموں میں گری۔ اس نے چونک کر نیچے دیکھا۔ اس کے دائیں طرف بیٹھا وہ لڑکا جھک کر اس کے قدموں میں گرا اپنا موبائل اٹھا رہا تھا۔

"معذرت۔" دھیمی آواز میں کہتا وہ سیدھا ہوا۔ سعاد کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹکی۔ وہ لڑکا اپنی پی کیپ نیچے کرتا اپنا چہرہ چھپاتا اپنا موبائل جیکٹ کی جیب میں اڑسنے لگا۔ اس کی کوشش بے کار گئی۔ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

"زیاد۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ "زیاد تم یہاں کب۔۔۔" اگر وہ واقعی زیاد تھا تو اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے بائیں ہاتھ پر زور دیتے ہوئے اسے خاموش کروایا تھا۔ اسے خاموش کروا کر وہ تیزی

سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لڑکا نشستوں کو پار کرتا نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا رخ اسٹیج کی طرف تھا۔ مختلف لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ بے چینی سے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے اسے ڈھونڈنے لگی۔ عین اسی لمحے شیشے کی کوئی بھاری چیز چھناکے کی آواز سے ٹوٹی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ وہاں وہ پروفیسر، خون میں لت پت اسٹیج پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ کسی نے بھاری گلدان اس کے سر پر مارا تھا۔ شیشے کی کرچیاں جا بجا اس کے سر میں گھس چکی تھیں۔ چہرے پر خون ہی خون تھا۔ انتظامیہ حرکت میں آئی تھی۔ کئی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ لوگوں کا جمِ غفیر اسٹیج پر جمع ہوا تھا۔ اس کی نظر اس جمِ غفیر سے نکلتے زیاد پر ٹکی تھی۔ وہ باہر جا رہا تھا۔ چہرہ پی کیپ سے ڈھکے، احتیاط بھری چال سے، وہ تیزی سے اس کی طرف بھاگی تھی۔ طلباء کو دھکیلتے ہوئے، لوگوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ آڈیٹوریم سے باہر نکلی تھی۔ یونیورسٹی کا وسیع میدان اونچے درختوں کے سائے میں اس کے سامنے تھا۔ یہاں بھی ہر طرف بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں تیزی سے زیاد کو تلاش کرنے لگیں۔ اسے زیاد کی جھلک دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بھاگی۔ بگڑتے ہوئے تنفس کے ساتھ، منتشر ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ وہ بھاگ رہی تھی، پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ فاصلہ کم ہو رہا تھا، زیاد اپنی رفتار کم کر چکا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ اس کے قریب آنے پر تیزی سے اس کی طرف مڑا اور اسے کلائی سے پکڑتے ہوئے راستے سے ہٹا کر دیوار سے لگایا۔

"کیا کر رہی ہو تم؟" وہ سخت نظروں سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

"تم۔۔ تم نے پھینکا ہے۔۔ گلدان۔۔" اسے لگ رہا تھا اس کا دل رک جائے گا۔ آنکھوں میں جہاں بے یقینی تھی وہاں بے پناہ خوف امڈ آیا تھا۔ وہ آوازیں سن سکتی تھیں ان قدموں کی جو پروفیسر کے قاتل کی تلاش میں نکلے تھے۔ قاتل اس کے سامنے تھا۔ عین روبرو کھڑا تھا۔

"سعاد، میرے پیچھے مت آنا!" وہ اس کا ہاتھ چھوڑتا جانے کے لیے مڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے آگے آئی تھی۔

"تم یہاں سے بھاگ نہیں پاؤ گے۔ زیاد پلیز، گھر چلو۔ وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔" اس نے آنکھوں میں امڈتی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے التجا کی تھی۔

"احمق مت بنو، ہٹو راستے سے۔" دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ وہ بہت قریب تھے۔ بس چند قدموں کے فاصلے پر۔ زیاد نے اس کے دائیں طرف سے نکل جانا چاہا تھا جب سعاد نے تیزی سے اس کا بازو پکڑا تھا۔

"تم میرے ساتھ چلو گے!" اس نے اس بار التجا نہیں کی تھی، حکم دیا تھا۔ اور پھر اسے بازو سے کھینچتے ہوئے یونیورسٹی کے پچھلے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

"سعاد ضد مت کرو۔ میں یہاں سے نکل سکتا ہوں!" وہ جھنجھلایا تھا۔ جھنجھلاہٹ میں اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑوایا تھا۔ سعاد نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں اب خوف کی جگہ غصے نے لے لی۔ اور پھر اس کا ہاتھ اٹھ چکا تھا۔۔۔ چٹاخ کی آواز گونجی تھی۔ زیاد نے بائیں طرف کو جھکا سر اٹھاتے ہوئے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ بے پناہ حیرت سے۔۔۔ بے پناہ حیرت!

"ایک لفظ مزید منہ سے نکلا تو یہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی!" انگشت شہادت اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے اسے دھمکی دی تھی۔ بھاری بوٹوں کی آواز اب اس طرف آ رہی تھی۔ باہر نکلنے کے تمام راستے بند کرنے کا حکم جاری ہونے والا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتی اسے اپنے ساتھ لیے تیزی سے باہر کی طرف بڑھی تھی۔ اس بار، وہ خاموشی سے اس کے ساتھ کھنچتا چلا گیا تھا۔ تھپڑ کھانے کے بعد، بالکل اچھے بچوں کی طرح۔

☆☆☆

بیسمنٹ میں داخل ہو کر اس نے پہلے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر تمام بتیاں جلائیں پھر مڑ کر دروازہ بند کیا۔ زیاد دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ وہ درمیان میں گرے گرد آلود سامان کو پیچھے ہٹاتی راستہ صاف کرنے لگی۔ کام مکمل کر کے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے زیاد کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتا۔ سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس، سیاہ پی کیپ ماتھے پر ٹکائے، وہ بہت بدل چکا تھا۔ اس کے ناک پر چشمہ نہیں ٹکا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور آنکھیں بدلی بدلی سی تھیں۔ ان کا رنگ، اندلس میں بھورا تھا۔ اور اب سرمئی تھا، جو یقیناً حقیقی نہیں تھا، بہروپیہ۔

"کیسی ہو، سینیوریتا؟" وہ قدم بڑھاتا اس کے روبرو آن کھڑا ہوا۔

"تم کون ہو؟" اس کی آواز کپکپا گئی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو گال پر گرے تھے۔

"میں زندگی میں کبھی لاجواب نہیں ہوا ما سوائے اس شخص کے آگے جس نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟" وہ بدتمیز مسکرایا تھا۔ وہ رو رہی تھی، وہ مسکرا رہا تھا۔۔ سپیرا سینیور!

"یہ خلیل جبران ہے۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"تم نے کتابیں پڑھنا شروع کر دیں کیا؟" مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"میں رو دوں گی، بات مت بدلو!" اس نے بے دردی سے اپنے گال رگڑتے ہوئے دھمکی دی۔

"مجھے لگا تم تھپڑ مارو گی۔" ڈھیٹ۔۔ مہا ڈھیٹ!

"زیاد۔"

"سعاد، نام کتنے ملتے جلتے ہیں ناں؟" لبوں پر بکھری مسکراہٹ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ بس اب وہ ہنس دے گا اور وہ واقعی ہنس دیا۔ اس کی حالت دیکھ کر ہنس دیا۔ وہ غصے و بے بسی سے ہونٹ دانتوں تلے دبا گئی۔

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔" وہ کہہ رہا تھا اور دوسری طرف۔۔ٹپ ٹپ ٹپ!"یار میرے پاس رومال نہیں ہے اس وقت، رونا تو بند کرو۔" مسکراہٹ اس کے لبوں سے غائب ہوئی تھی۔ وہ اس کے رونے پر پریشان ہو چکا تھا۔

"تم سب بہت برے ہو، سب کے سب۔ جو لوگ مجھے عزیز ہوتے ہیں وہ قاتل بن جاتے ہیں۔ تم، ضرار اور کون جانے کہ جندل بھی! کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟! یا حقیقت وہ ہے جو میں دیکھ رہی ہوں یا حقیقت وہ ہے جس کی بنا پر تم سب نے اپنے ہاتھ خون سے رنگ لیے ہیں۔ کیوں زیاد کیوں؟!" وہ سسک اٹھی تھی۔ ٹانگوں میں جان نہیں رہی تھی۔ پنجوں کے بل نیچے بیٹھتے ہوئے وہ بے اختیار ہو کر رو دی تھی۔ دائیں ہاتھ کی بند مٹھی فرش پر رکھے چہرہ جھکائے آنسو بہاتی وہ ریت کے ذروں کی طرح بکھر رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے نیچے بیٹھا تھا۔ چہرہ ذرا سا جھکا کر اس کے جھکے چہرے کو دیکھنا چاہا تھا۔

"حقیقت وہ ہے، جس پر یقین ہے۔ جس پر ایمان ہے، جہاں اعتماد ہے، وہ حقیقت ہے۔ باقی سب سراب ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ سعاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"زیاد، خدارا مجھے بتا دو تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے التجا کر رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"دو کپ کافی اور اسنیکس وغیرہ ہوں تو لے آؤ۔ رونا بند کرو پھر بات کرتے ہیں۔" وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتا ٹانگیں پھیلا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے گال رگڑتی سر اثبات میں ہلا گئی۔

☆☆☆

جب وہ اس کے سامنے اسنیکس اور چاکلیٹ سے بھری ٹرے رکھ رہی تھی تو وہ بغور اس کے دھلے دھلے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اوپر جا کر روئی تھی۔ کافی بنانے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگتے جبکہ وہ پچیس منٹ بعد نیچے آئی

تھی۔ یقیناً وہ روئی تھی، بے تحاشا روئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، بالکل سرخ۔ اور چہرہ لال پڑ رہا تھا۔ سیاہ حجاب کے ہالے میں مقید سرخ پڑتا چہرہ۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کافی کا کپ اٹھایا۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے دیوار کے دائیں طرف ٹیک لگا کر اسی کی طرح فرش پر بیٹھ گئی۔ زیاد نے ہاتھ میں پکڑا کافی کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ خاموشی سے کپ تھام گئی۔

"ضرار کون ہے؟" وہ چاکلیٹ اٹھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے کافی کا گھونٹ بھر کر کپ اپنے دائیں طرف فرش پر رکھ دیا۔

"ضرار جندل کا دوست ہے۔ شاید کبھی وہ میرا بھی دوست تھا۔" اس نے فرش پر نگاہیں گاڑے جواب دیا تھا۔

"ان سے بدگمان کیوں ہو؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کافی کے گھونٹ بھرتا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے سوال پر تلخی سے مسکرائی تھی۔

"ضرار نے، میں نہیں جانتی کیوں لیکن اس نے ایئرپورٹ پر دھماکہ کروایا تھا۔ دو ماہ پہلے، جس دن میں اندلس سے واپس آئی تھی۔ جندل اس کا دوست ہے، گہرا دوست۔ کیسے ممکن ہے وہ اس میں ملوث نہ ہو؟! میں نے جندل کے بارے میں یقیناً یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا مجھے اس پر یقین تھا، نہیں خود پر یقین تھا۔ مگر اب، اگر تم قاتل بن سکتے ہو تو وہ کیوں نہیں؟!" وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ کاش جو باتیں عرصہ دراز سے پردہ راز میں تھیں، وہ کبھی نہ کھلتیں۔ وہ سعاد کا یہ بکھرا بکھرا سا روپ نہ دیکھتا۔ کاش ان کی دوبارہ ملاقات ان حالات میں نہ ہوتی۔

"سعاد، جندل تمہارا بھائی ہے۔ فرض کر و وہ اس دھماکے میں ملوث ہے، وہ کیونکر اس دن دھماکہ کروائے گا جس دن اس کی بہن کی وہاں موجودگی کا امکان ہو گا؟" سعاد نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر مسکرایا تھا۔ ہلکا سا، ذرا سا، اپنے اسی ازلی انداز میں۔ "اور ضرار، وہ تمہارے بھائی کا گہرا دوست ہے اور بقول

تمہارے تمہارا ابھی دوست رہ چکا ہے۔ تو وہ کیونکر یہ قدم اٹھائے گا؟ سنگدل سے سنگدل انسان بھی اپنے سینے میں وہ نرم گوشہ رکھتا ہے جو اس کے اپنوں کے نام پر دھڑک اٹھتا ہے۔ وہ اسے کبھی بھی اس کے اپنوں کو تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا، انسان مر سکتا ہے مگر اتنا نہیں گر سکتا۔ یاد رہے میں نے انسان کہا ہے! جو انسان حیوانیت کی حدود پار کر چکے ہوں ان پر یہ قائدہ لاگو نہیں ہوتا!" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ چکی تھی۔ اسے ایک لمحے کو اپنی بے وقوفی پر غصہ آیا تھا۔ زیاد ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ جندل اور ضرار اس کی وہاں موجودگی کا جانتے ہوئے کیوں ایسا قدم اٹھائیں گے۔ مگر۔۔

"اور اگر وہ حیوانیت کی حدود پار کر چکے ہوں، تو؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف سموئے، اسے دیکھتے ہوئے جواب کافی کا کپ لبوں سے لگا رہا تھا۔

"حیوانیت کی طرف گرنا آسان ہوتا ہے کیا سعاد؟! انسان سدا بلندی کی آرزو رکھتا ہے۔ بلندی کی یہ جستجو اسے انسان بنائے رکھتی ہے۔ مگر بلندی کی جستجو جب ہوس میں بدل جائے تو وہ حیوانیت کی طرف گرتا ہے۔ وہ بلندی سے پستی کی طرف پٹخ دیا جاتا ہے۔ وہ روشنی سے اندھیرے کی طرف آجاتا ہے۔ حیوانیت کی طرف گر جانے والے عام نہیں ہوتے سعاد! ان کے چہرے مکروہ ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں زہریلی ہوتی ہیں۔ ان کے ہاتھ خون سے رنگین ہوتے ہیں۔ ان سے کبھی کوئی استفادہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ان سے گھن آتی ہے۔ ان کی روح بدبودار ہوتی ہے۔ ان کے اخلاق گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے دل سیاہ ہوتے ہیں۔ حیوانیت دلوں پر اترتی ہے، جس طرح روحانیت دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن روحانیت دلوں کو نرم بناتی ہے، شبنم کے قطرے کی طرح ٹھنڈا اور گلاب کی پتیوں سا نرم! مگر حیوانیت دل کو دل نہیں رہنے دیتی۔ وہ پتھر کا ہو جاتا ہے اور اس سے بھی سخت! حیوانوں کی روح مر جاتی ہے۔ درندگی ان پر قابض ہو جاتی ہے!" اس نے ذرا توقف کیا پھر گویا ہوا۔ "تم خود فیصلہ کرو۔ کیا

وہ دونوں واقعی یہ حدود پار کر چکے ہیں؟!" اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا، تیزی سے ہلایا تھا۔ خوف سے جھر جھری لیتے ہوئے، وہ مسکرا دیا۔ کپ فرش پر رکھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائی۔

"تم بہت معصوم ہو سعاد۔" اس نے لب دانتوں میں دبائے زیاد کو دیکھا۔

"تم نے پروفیسر کو قتل کر دیا۔ اور میں جانے کیوں تمہاری جان بچانے کی خاطر تمہیں یہاں لے آئی۔ اور اب میں تم سے ایسے باتیں کر رہی ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ میں واقعی بہت معصوم ہوں۔" وہ لب دانتوں میں دبائے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے چہرہ موڑ گیا تھا۔

"میں نے دو سال اس شخص کے پیچھے صرف کیے ہیں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔ سعاد ایکدم سیدھی ہوئی۔ "دو سال کہنے میں بہت آسان ہیں مگر ایک شخص جس کے خلاف ثبوت حاصل کرنا ایسے ہو جیسے دودھ سے سفید بال نکالنا۔ اس کے پیچھے دو سال صرف کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے یہ مشکل کام کر لیا۔ میں کامیاب ٹھہرا۔ اندلس میں چھٹیوں پر نہیں آیا تھا۔ میں آخری گواہ سے ملنے آیا تھا۔ وہ شخص یاد ہے جس نے تم پر پستول تانی تھی؟" وہ اس کے پوچھنے پر اثبات میں سر ہلا گئی۔ "وہ بھی میری طرح اس آخری گواہ کے پیچھے تھا۔ میں اس صبح گواہ سے ملنے گیا تھا مگر تب وہ آدمی اس کا کام تمام کر چکا تھا۔ بعد میں میرے تعاقب میں وہ تم تک پہنچا اور اپنے ساتھ ظلم کر بیٹھا۔" اس نے گہری سانس لی۔ سعاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا کیا تم نے اس کے ساتھ؟"!

"ایک ایک ہڈی توڑ دی!" وہ مسکرایا۔ سعاد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "میں اس کی آنکھیں نکال دینا چاہتا تھا، جو تم پر اٹھی تھیں۔ اور ہر شخص کے ساتھ یہی کروں گا جو تم تک پہنچے گا!" اس کا لہجہ ایکدم سخت ہوا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ وہ واقعی دیوانہ تھا۔۔ احمق۔۔۔ بے وقوف!

”بہر حال، اسی شخص سے مجھے باقی تمام ثبوت ملے۔ دوماہ کے اندر اندر عدالت میں کیس درج کروایا۔ اور واہ رے یہ حکومت! انہوں نے باعزت اس گستاخ رسول کو بری کر دیا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے الفاظ کے زہر سے کوئی شخصیت محفوظ نہیں تھی۔ کون سے نبی نہیں تھے، کون سے صحابی نہیں تھے، اور کون سے علماء نہیں تھے جن کے خلاف اس شخص نے زہر نہیں اگلا تھا۔ دو سالوں میں مکمل اور ٹھوس ثبوت جمع کرنے کے بعد جب میں عدالت میں جاتا ہوں تو وہاں پہلے آئیں بائیں شائیں کی جاتی ہے بعد میں ملزم کو باعزت بری کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ نامور شخصیت اس غلام حکومت کی مہربانی سے جیل کی سلاخوں کا دیدار کر لیتی تو اس حکومت کا تخت الٹ دیا جاتا۔ انصاف قائم ہوتا تو یہ حکومت بین الاقوامی نظروں میں آجاتی۔ وہ کیونکر ایک سپر پاور ملک سے ٹکر لے سکتے تھے؟! یہ رشوت خور، پیسے کے پجاری، اپنے دین کا سودا کرنے والے جو دھوکے سے مسند حکومت پر چڑھ بیٹھے ہیں اور انصاف کے نام پر غلامی کا سرٹیفکیٹ تھماتے ہیں، یہی حیوان ہیں سعاد! اگر ایک عام مسلمان بھی اس شخص کا ایک کالم بھی پڑھ لیتا تو ممکن ہی نہیں کہ وہ شخص اگلی سانس اس دنیا میں لے پاتا! دو سال کی انتھک محنت کے بعد عدالت سے ناکام و نامراد لوٹنے کے بعد مجھے اعلیٰ پائے کے تعلیم یافتہ افراد کی محفل میں وہ منظر دیکھنا پڑا جو ایک مسلمان کی غیرت پر وار ہے! وہاں بے شمار لوگوں میں کوئی ایسا سچا مسلمان نہیں تھا جو اٹھ کر اس حیوان کی زبان بند کر سکتا؟ نہ انتظامیہ حرکت میں نہ آئی نہ کسی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ محض اپنی نشستوں پر پہلو بدلنے سے ان اسلام دشمنوں کو روکا نہیں جا سکتا! آخری حل یہی تھا۔ گستاخ رسول کی سزا۔۔ سر تن سے جدا“!

اس کے لہجے میں عزم تھا۔ بھرپور اعتماد تھا۔ آنکھوں میں سختی تھی، چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ حقیقت کھول کر اس کے سامنے رکھ چکا تھا۔ وہ کئی پل کچھ بول نہ سکی تھی۔ ایک طرف وہ ٹھیک تھا، مگر اس الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا کے دور میں کئی ایسے ہتھیار تھے جن سے معصوم مسلمانوں کو زیر کیا گیا تھا۔ کئی ایسے سوال تھے جو بے بنیاد

تھے، اور ہر مسلمان کے دل و دماغ پر قابض ہو چکے تھے۔ یہ سوال اس کے ذہن میں بھی تھے۔ وہ انہیں لبوں پر بھی لے آئی تھی۔

"مگر یہ آخری حل تو ہر گز نہیں ہے۔" اس نے اعتراض اٹھایا۔ زیاد نے چاکلیٹ کو دانت سے کاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔ گویا بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔ "اگر کورٹ میں انصاف نہیں ملا، اگر حکومت کی مسند پر عیار اور لٹیرے لوگ بیٹھے ہیں تو، تو ضروری تو نہیں ہر شخص کا حساب اس دنیا میں ہی ہو جائے۔ خدا سب سے بڑا عادل ہے اس کے غضب سے تو کوئی نہیں بچ سکتا ناں!" وہ بالکل ایسے ہی اعتراض کی امید رکھتا تھا تبھی پر سکون رہا۔

"خدا نے نیکی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کا حکم بھی دیا ہے، سینیوریتا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر! اگر برائی کو پھیلنے دیا جائے تو انسان امانت میں خیانت کا مرتکب ٹھہرے گا۔ انسان اس دنیا میں خدا کا دین پھیلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اور خدا کا دین نیکی کا حکم دیتا ہے۔ ہم ہر برائی کا حساب لینے کے بجائے اس سے ہاتھ کھینچ لیں اور معاملہ آخرت پر چھوڑ دیں تو عنقریب اچھائی کا اس دنیا سے نام و نشان مٹ جائے گا! پھر آپ کی نظر میں اس کا کیا حل ہو گا؟!" وہ اسے لاجواب کر چکا تھا۔ وہ کئی لمحے کچھ بول نہ سکی تھی اور پھر اس نے ایک اور اعتراض اٹھایا تھا۔

"لیکن قتل بھی تو آخری حل نہیں! تم آگے بڑھ کر انہیں روک سکتے تھے، انتظامیہ کی مدد لے سکتے تھے۔ اگر وہ سب اپنی نشستوں پر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے تو یقیناً ان میں اتنی غیرت باقی تھی کہ تمہاری بات پر تمہارا ساتھ دیتے۔ تم جانتے ہو تمہارے اس جذباتی پن کی وجہ سے اسلام کا دوسرے مذاہب کے لوگوں پر کیا تاثر پڑا؟! تم جیسے جذباتی لوگوں کی انہی حرکتوں کی وجہ سے لوگ مسلمانوں کو شدت پسند کہتے ہیں۔ یورپ، امریکہ ہر غیر مسلم ملک میں مسلمان بدنام ہو کر رہ گئے ہیں۔ تم جیسے ہی جذباتی لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہم پر دہشتگردی کا ٹھپہ لگ گیا ہے۔۔"!

وہ مزے سے اسے سنتا چاکلیٹ کھا رہا تھا۔ اس کے بات ختم کرنے پر وہ چاکلیٹ کا ریپر دور اچھال کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ چندپل خاموشی سے اسے دیکھا پھر کندھے اچکا دیے۔

"میں تو بھول ہی گیا تھا او بابا نے کچھ دن پہلے مسلمانوں سے پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے جامعہ مسجد میں جمعے کی نماز پڑھی تھی۔" وہ اس کی بات پر بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی جواب مسکراتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا رہا تھا۔ "وہ کیا نام ہے اسپین کے وزیر اعظم کا؟ اس نے کل ہی تو اعلان کیا ہے کہ وہ قرطبہ مسجد مسلمانوں کو واپس کر دے گا۔ اور یہ تو میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ موساد نے فلسطین میں لاکھوں مسلمانوں کی سرپرستی کا ذمہ لے لیا ہے اور اب میری اس ایک حرکت کی وجہ سے سب اسلام دشمن بن گئے ہیں۔" وہ ہنس دیا تھا۔ عجیب خالی پن سا تھا اس کی ہنسی میں۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"سینیوریتا! جن لوگوں کے ہاں اسلام کے بدنام ہونے کی بات آپ کر رہی ہیں وہ اسلام دوست نہیں اسلام دشمن ہیں جان لیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے پروپیگنڈے کے پیچھے یہ لوگ ہوتے ہیں۔ اسلام پر سب سے زیادہ اعتراض کرنے والے بھی یہی اور اسلام کے معاملے میں بڑے سے بڑے نقاد بھی یہی۔ ان کے آگے جھک کر آپ اسلام کو بدنام ہونے سے نہیں بچا سکتیں۔ اصول یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی زبانیں گدی سے کھینچ لی جائیں!" وہ اب دوسرا چاکلیٹ اٹھا رہا تھا۔

"لیکن یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تم کب تک کس کس کے سر پر گلدان مارتے پھرو گے ہاں؟! کس کس سے لڑو گے اور کیوں لڑو گے؟ کسی کی جان اتنی سستی ہے کیا کہ جب دل میں آیا اٹھ کر قتل کر دو گے؟!" وہ جھنجھلائی تھی۔ وہ سکون سے چاکلیٹ کا ریپر کھولتا اسے سنتا رہا غالباً اس کے خاموش ہونے کے انتظار میں تھا۔

"کوئی تمہارے بابا کے بارے میں کچھ کہے۔ کچھ بہت برا، بہت غلط تو کیا کرو گی؟" اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا گیا

تھا۔

"اس سے لڑوں گی ظاہر ہے۔ کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ میرے بابا کو کچھ کہے۔" وہ مسکرا دیا۔

"تمہارے سامنے گلدان ہو تو وہ اس کے سر میں دے مارو گی ناں؟" وہ آنکھوں میں انوکھی سی چمک لیے اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ معصومیت سے سر اثبات میں ہلا گئی تھی۔ "اگر اس گلدان کے لگنے سے اگلا بندہ مر جائے تو اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہو گا ناں؟" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"تم اپنے سوال کا جواب لے چکی ہو۔ تم اپنے بابا سے محبت کرتی ہو۔ کسی کو مار بھی دو گی ان کے لیے۔ میں نے تو پھر اس کے لیے مارا جس سے عالم اسلام کا پور پور محبت کرتا ہے۔" وہ خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ "اگر تمہیں تمہارے تمام سوالوں کے جواب اب بھی نہیں ملے تو کسی دن فرصت سے بیٹھ کر اس شخص کے آرٹیکلز پڑھنا۔ مجھے امید ہے تم مجھے سمجھ جاؤ گی۔"

"لیکن باوجود اس کے میں اسے قتل کرنے پر تمہاری حمایت نہیں کروں گی۔ زیاد قتل، قتل! قتل اتنے سہل ہوتے ہیں؟! میں حیران ہوں بہت زیادہ حیران! تم نے، گلدان اٹھایا اور کمال مہارت سے اس کی طرف پھینکا۔ ایک عام آدمی اگر یہ کام کرتا تو عین ممکن ہے وہ انگریز بچ جاتا۔ مجھے سچ بتاؤ یہ تمہارا پہلا قتل ہے؟!" وہ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتی پوچھ رہی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اس نے شدت سے اس کے جواب کے انتظار کے دوران دعا کی تھی کہ اس کے شکوک و شبہات غلط ثابت ہوں۔ مگر۔۔

"قتل سہل ہوتے ہیں، پہلا قتل سہل نہیں ہوتا! یہ بالکل بھی میرا پہلا قتل نہیں ہے، میں اب تک جتنی جانیں لے چکا ہوں مجھے ان کی گنتی یاد نہیں۔" کتنے سکون سے کہا تھا اس نے۔ کتنا پرسکون تھا وہ۔ اور سعاد، اسے لگا تھا کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ کہیں کچھ بہت قیمتی چیز، چھناکے سے ٹوٹی تھی۔ مان، ہاں

اس کا مان ٹوٹا تھا۔

"تم، قاتل ہو۔" اس کی آواز قدرے دھیمی تھی۔ وہ بمشکل اسے سن پایا تھا۔

"ہاں، میں قاتل ہوں۔" اس نے اقرار کیا تھا۔ بنا کسی خوف کے۔ جرات سے، بہادری سے! وہ اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھتی بے اختیار سر دیوار پر ٹکا گئی تھی۔ نظریں چھت پر جا ٹکی تھیں۔ زیاد بغور اسے دیکھے گیا۔ اپنے دہن پر رکھے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، آنکھوں میں نمی پگھلنے لگی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اسے اس وقت اپنی سنگین غلطی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بہت غلط کیا تھا، اسے سعاد کو یہ نہیں بتانا چاہیے تھا۔

"سعاد، تم ٹھیک ہو؟" وہ پریشانی سے پوچھتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ سختی سے اپنی آنکھیں میچ گئی تھی۔

"بچپن میں غالباً تیرہ سال کی عمر میں َمیں نے وہ آوازیں سنی تھیں۔" وہ دونوں بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹے فرش کو تکتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ "وہ زنجیریں تھیں قدموں میں پڑی زنجیریں۔ بہت سے لوگ تھے جو پابندِ سلاسل تھے۔ وہ بھاگ رہے تھے۔ ان کے قدموں میں پڑی زنجیروں کا وہ شور، مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں محسوس کر سکتی ہوں۔ ان میں بھاگنے کی سکت نہ تھی۔ وہ بہت خوفزدہ تھے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ پھر رات کی تاریکی میں، گھٹاٹوپ اندھیرے میں نشانہ لیا گیا۔ اور فائر کھول دیے گئے۔ ایک دو تین، نہیں وہ بہت سارے تھے۔ زیادہ وہ، وہ بہت ساری گولیاں تھی۔ وہ بہت سارے قیدی تھے۔ وہ بہت سارا خون تھا۔" اس کی آواز کپکپا گئی تھی۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ اس کے آگے کیے تھے۔ اسے اس وقت اپنے انہی ہاتھوں پر وہ خون نظر آ رہا تھا۔ آنسو گرم سیال کی مانند گالوں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ "اس دن، نہیں اس رات، اس رات میں نے پہلا قتل ہوتے دیکھا تھا۔ ماں اور بابا تو گھر میں آگ لگنے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے مگر وہ، اس رات وہ قتال ہوئے تھے۔ قیدی۔ جو بے گناہ تھے۔۔ ان کے سینوں میں، ان کے دلوں میں، ان کے وجود میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو

چھلنی نہ کی گئی ہو۔ مرنے والوں سے زیادہ مارنے والے تھے۔ بیس منٹ تک مسلسل فائرنگ ہوتی رہی تھی اور پھر ایسی خاموشی چھا گئی گویا قبرستان ہو۔ میں اس رات سو نہیں سکی تھی۔ اور اس رات کے بعد میں کبھی سونا نہیں چاہتی تھی۔ صبح گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اخبار والا آیا۔ اخبار میں پہلی سرخی جانتے ہو کیا تھی؟" وہ نظر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرخ ہوتی آنکھیں دیکھ کر وہ ایک لمحے کو خوف زدہ ہوا تھا۔ سعاد ٹھیک نہیں تھی وہ ٹھیک نہیں تھی۔

"عالیان یوسف زئی! دہشتگردوں کا سربراہ جو اتنی تعداد میں اسلحہ خفیہ طور پر افغانستان پہنچا رہا تھا، کل رات پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔" اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ گھٹنوں پر سر دیے وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھے گیا۔ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا وہ اس وقت اپنا آپ مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ یہ لڑکی سعاد، سعاد یوسف زئی! وقت کے دیے گئے گھاؤ سے بری طرح گھائل تھی۔ وہ اسے مزید زخمی کر گیا تھا گویا اس بار دل میں خنجر اتار دیا تھا۔

"زیاد، میرے ماموں عالیان وہ دہشتگرد نہیں تھے۔" وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ "وہ معصوم تھے بہت معصوم! انہیں اچانک پولیس لے گئی تھی۔ وہ ہمارے، میرے اور جندل کے واحد سرپرست تھے۔ کوئی نہیں تھا جو ان کے لیے بھاگ دوڑ کرتا۔ ہفتہ، دو ہفتے یہاں تک کہ مہینہ گزر گیا اور پھر دو ماہ بعد اخبار میں خبر چھپی کہ وہ پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ اس دن، اس دن مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ اپنے ارد گرد ہر چیز سے۔ سب سے زیادہ، قتل سے۔ میری ماں، میرے بابا، آغا جان، اور پھر ماموں ایک ایک کر کے میں نے سب کو کھو دیا۔ شاید میں بابا کی موت پر بھی اتنی غمزدہ نہیں تھی جتنا ماموں کے قتل نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے خود گنی تھیں ان کے جسم میں لگیں وہ گولیاں۔ وہ سات تھیں، پوری سات! دہشتگردوں کا انجام شاید یہی ہوتا ہے۔ وہ بے دردی سے مارے جاتے

ہیں۔ پولیس مقابلے ہوتے ہیں۔ اور کیسے ؟ دو ماہ سے قید انسانوں کو سلاسل میں پابند کر کے کھلے میدان میں بھیڑ بکریوں کی طرح چھوڑا جاتا کہ دوڑو! بھاگ سکتے ہو تو بھاگو۔ اور ان کے بھاگتے ہی پیچھے سے پستولوں کے فائر کھول دیے جاتے ہیں۔ حیوانیت یہ ہوتی ہے زیاد!" وہ خاموش ہوئی۔ رک کر گہری سانس لی پھر اپنے بھیگے گالوں کو رگڑا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ "مجھے، پولیس سے فوبیا ہے۔ ماموں کے قتل کے بعد میں اٹھارہ سال کی عمر تک کراچی نہیں آئی تھی۔ اور جب آئی تو دل میں وہی خوف زندہ تھا جو یہاں سے جاتے وقت تھا۔ جندل اور میری ذمہ داری بابا کے کسی جاننے والے نے اٹھائی تھی۔ جب تک جندل بڑا نہیں ہو گیا۔ اور جب وہ بڑا ہوا، تو میں دن رات اس خوف کے سائے تلے سانس لینے لگی کہ کہیں وہ انتقام کے چکر میں نہ پھنس جائے۔ وہ جوان ہے، مرد ہے۔ وہ بالکل یہ کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ یہ کر بھی چکا ہو تو وہ مجھے نہیں بتائے گا کیونکہ مجھے خون سے، قتل سے، اور قاتل سے ڈر لگتا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں مزید دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا تبھی نظریں چرا گیا۔ سر جھکا گیا۔

"اب تم سمجھے ؟ وہ خوف جو بچپن سے میرے اندر پنپتا آیا ہے وہ اب بڑا ہو چکا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو مگر مجھے ہر قاتل ظالم اور مقتول مظلوم لگتا ہے۔ میرا بھائی، ضرار اور پھر تم، تم سب کے ہاتھوں پر لگا خون دیکھ کر مجھے تم سب سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔ تم سب ظالم ہو، اور پتہ ہے زیاد۔" وہ اپنے گالوں کو رگڑ کر اپنا چہرہ اس کے قریب لائی۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "میں خود پر جبر کر کے اپنے فوبیا سے لڑ کر پولیس کو فون کروں گی اور کہوں گی میرے گھر میں ایک قاتل موجود ہے۔ تم نے میرے سامنے اعتراف کر کے اپنے ساتھ ظلم کیا ہے"!

"تم مجھے ان کے حوالے کرو گی جو خود قاتل ہیں؟" اس کے طنزیہ کہنے پر وہ مسکرائی۔

"اسے فارمیلٹی سمجھو"!

"تم واقعتاً ایسا کرو گی سعاد؟" اسے جیسے ابھی بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں۔"

"اس کے بعد تم اپنے بھائی اور ضرار کو بھی ان کے حوالے کرو گی، ٹھیک؟" وہ ایکدم چونکی۔ زیاد کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ "انصاف کا تقاضا یہی ہے، تم ان کے ساتھ بھی وہی کرو جو میرے ساتھ کرنے والی ہو"!

"انہوں نے اعتراف نہیں کیا۔"

"تم تسلی دے رہی ہو خود کو۔"

"مجھے مت الجھاؤ زیاد۔۔۔!" وہ دبا دبا سا چلائی۔

"میں انتظار کر رہا ہوں۔ تم جا سکتی ہو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے راستے سے بھی ہٹ گیا۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھاری قدموں کے ساتھ وہ باہر کی طرف بڑھی تھی۔ "کاش ہم ان حالات میں نہ ملتے سعاد، کاش تم حقیقت کو سمجھ سکتیں۔" وہ دکھ سے کہہ رہا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گی۔ "محبت کرتا ہوں تم سے۔ اگر کسی طرح میں یہاں سے نکل گیا تو دعا کروں گا کبھی تم سے ملاقات نہ ہو۔ میں اس احساس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا کہ تم، میرے ساتھ غیر محفوظ محسوس کرتی ہو کیونکہ میں ایک قاتل ہوں۔"

"ایک لفظ اور مت کہنا۔" وہ غرائی تھی۔ آواز جانے کیوں کپکپا گئی تھی۔

"میرے ہاتھوں پر خون ہے۔ اس خون کو تم مٹاؤ گی، جان لے کر۔" وہ رک نہیں رہا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹتی غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ "میں تمہیں کبھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ میں تمہیں کبھی بھلانا نہیں چاہوں گا۔ کاش ہمارے راستے ایسے جدا نہ ہوتے۔" وہ ٹھہرا، ذرا سا مسکرا کر اسے دیکھا جس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ آگے آیا، بالکل اس کے روبرو کھڑا ہوا۔

"جاؤ اب، واپس آؤ گی تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گی۔" اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر گرتے آنسوؤں کو پونچھا تھا۔ اس کے پاس رومال نہیں تھا۔ وہ خود یہ کام کر رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی تھی۔ رخ موڑا تھا اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ وہ وہیں کھڑا رہا، چپ چاپ، غمگین نظروں سے اس بند دروازے کو دیکھتا۔ وقت اچانک سے اس قدر بدل کیسے سکتا ہے؟! ابھی تو وہ موت کے منہ سے نکلا تھا۔ اور اب واپس موت کے دہانے پر کھڑا تھا۔ بس ایک فون کال، سائرن بجاتی گاڑیاں، بھاری بوٹوں کی آواز، ہاتھوں میں ڈالی گئیں ہتھکڑیاں، بند ہوتے دروازے، کمرہ عدالت کے مناظر، پھانسی گھاٹ، اور ختم شد۔

☆☆☆

اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ بالکل آسان نہیں تھا۔ وہ پولیس جو اس کی نظر میں درندوں کے سوا کچھ نہ تھے، آج کیسے وہ زیاد کو ان کے حوالے کر سکتی تھی؟ مگر زیاد۔۔ زیاد، وہ قاتل تھا وجہ جو بھی ہو وہ ایک قاتل تھا اور یہی حقیقت تھی، وہ چاہ کر بھی اسے جھٹلا نہیں پا رہی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ دماغ کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، دل بھی عجیب مشکل کا شکار تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر کوشش بے کار گئی۔ ذہن کے پردوں پر مختلف مناظر لہرانے لگے اور سماعت سے وہ آوازیں ٹکرائیں جو اسے یہ کام کرنے پر مجبور کر سکتی تھیں۔

وہ وہیں کھڑی تھی۔ اسی چھت پر جہاں اس نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ مسلسل بیس منٹ تک ہوتی فائرنگ اور پھر خاموشی۔ قبرستان سی خاموشی، بعد ازاں اس نے خود کو سرد خانے میں پایا تھا جہاں پولیس مقابلے میں مارے جانے والے دہشتگردوں کی لاشیں اپنے ورثاء کے انتظار میں تھیں۔

”ان کے جسم میں سات گولیاں لگی ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹس کے مطابق یہ مرنے سے پہلے کافی اذیت کا شکار رہے ہیں۔ ان کے جسم پر طرح طرح کے زخم ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے یہ کافی عرصہ زیر تشدد رہے ہیں۔ ان کے قدموں میں رگڑ کے نشان ہیں۔ جیسے ان کے قدموں میں سختی سے بندھی زنجیریں ہوں اور یہ جان لگا کر بھاگے ہوں۔ میں بس یہی کہوں گا کہ ان کے آخری دن، کافی اذیت ناک گزرے ہیں۔“

”ایک، دو، تیسری سینے پر، چوتھی ٹانگ پر، پانچ، چھ اور ساتویں پشت پر۔ سات گولیاں۔۔“ وہ خود گولیوں کے مقام تعین کرتی انہیں گن رہی تھی۔ وہ سات تھیں، سات گولیاں۔ اور گھاؤ تو ان گنت تھے، بے انت تھے۔

”قتل سہل ہوتے ہیں، پہلا قتل سہل نہیں ہوتا۔ ہاں! میں قاتل ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ قدم جانے کیوں لڑکھڑائے تھے۔

”آغا جان، وہ۔۔ وہ سمندر میں گم ہو گئے ہیں آپی۔ انہیں سمندر سے بے پناہ محبت تھی، سمندر نے انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آغا جان کا قتل ہوا ہے۔ جندل بچہ ہے، یا تو وہ بتا نہیں رہا یا اسے بتانے سے منع کیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ آغا جان کا قتل ہوا ہے!“ مانوس مانوس سے بھاری مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے ماموں کی آواز، عالیان یوسف زئی کی۔

وہ واشروم میں بیسن کے پاس کھڑی نل سے بہتے پانی کی دھار کو دیکھ رہی تھی۔ صاف شفاف پانی۔ وہ اچانک خون میں بدلنے لگا تھا۔ سرخ گاڑھا خون۔۔ اور گرم۔۔ جیسے ابھی جسم سے نکلا ہو۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔

”میں قاتل ہوں! قتل سہل ہوتے ہیں، پہلا قتل سہل نہیں ہوتا۔ میں نے جتنی جانیں لی ہیں ان کی گنتی یاد نہیں۔“ وہ ڈر کر پیچھے ہٹتی واشروم سے نکلی تھی۔ پانی اب بھی بہہ رہا تھا، پانی یا شاید خون۔

”انصاف کا تقاضا یہی ہے، تم ان کے ساتھ بھی وہی کرو جو میرے ساتھ کرنے والی ہو“!

”انہوں نے اعتراف نہیں کیا۔“

”تم تسلی دے رہی ہو خود کو۔“

وہ کمرے سے نکل کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی تھی۔ اس کا موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ موبائل صوفے پر پھینک کر وہ کچن میں آئی اور سینک کے پاس کھڑے ہو کر نل کھولا۔ دھار کی صورت میں بہتے پانی کے چھپاکے چہرے پر مارے پھر نل بند کر کے چہرہ خشک کرتی پلٹ گئی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پانی چڑھایا اور لاونج میں آئی۔

میرے ہاتھوں پر خون ہے۔ اس خون کو تم مٹاؤ گئی، جان لے کر۔“ اس نے موبائل اٹھایا تھا۔ چند نمبر ملائے تھے۔ موبائل کان سے لگایا۔ بیل جاتی رہی۔ پہلی، دوسری، تیسری۔۔ چوتھی بیل پر کال اٹھالی گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے خود کو کہتے سنا تھا؛

”وہ یہاں ہے، میرے گھر میں۔ مجرم، قاتل پروفیسر البرٹ کا۔“ وہ سب ختم کر چکی تھی۔ ایکدم سے، بالکل اچانک سے۔

☆☆☆

وہ دیوار کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بغور دیوار پر آویزاں اس گرد آلود تصویر کو دیکھتا، اس کی آمد سے انجان یا شاید جان کر انجان بن رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا، کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

”زیاد۔“ وہ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد خود اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے پکار بیٹھی۔ وہ گہری سانس

لیتا رخ اس کی طرف موڑ گیا۔ بالکل اس کے روبرو کھڑا تھا وہ۔ اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے۔ چہرہ جو پیلا پڑ رہا تھا۔ آنکھیں، جو اس تمام عرصے میں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اور ہاتھ جو کانپ رہے تھے۔ اس نے جو فیصلہ لیا تھا وہ اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ اپنے فوبیا سے لڑی تھی۔ اس نے ایک قاتل کو قاتلوں کے حوالے کیا تھا۔ اس نے، درندوں کو اپنی درندگی دکھانے کا موقع مہیا کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔

"تم نے پہلا قتل کیوں کیا؟" وہ جانے کیوں یہ سوال کر رہی تھی۔

"تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے سعاد! تمہاری وہ دوست جس کے ساتھ یونیورسٹی آئی تھیں اس کے گھر چلی جاؤ۔ پولیس آئے گی تو تم سوالات کی زد میں آؤ گی۔ کچھ عرصہ یہاں سے غائب رہو تو بہتر ہے!" وہ اب بھی اس کی فکر کر رہا تھا۔ اسے اب بھی اس کی حفاظت کو یقینی بنانا تھا۔

"کس چیز نے تمہیں قاتل بننے پر مجبور کیا؟"

"وہی جس نے تمہیں مجھے پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور کیا۔" اس بار اس نے سعاد کے سوال کا جواب دیا تھا۔۔ مسکراتے ہوئے۔۔ ہلکا سا مسکراتے ہوئے۔۔ بالکل ذرا سا۔ اپنے اسی ازلی انداز میں! "تم اپنے ایک خوف کی وجہ سے دوسرے خوف سے لڑیں۔ تم نے ایک خوف کو دوسرے پر حاوی ہونے دیا۔ میں نے بھی یہی کیا تھا۔ مگر میں جیت گیا، تم ہار گئیں۔ آج میں بے خوف ہوں اور تم اب بھی خوف کی زد میں ہو!" کتنی تلخی تھی اس کے لہجے میں۔ بظاہر تاثرات نرم تھے، مگر لہجہ سخت تھا۔ وہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو سچ مان رہی تھی، اس کا یقین کر رہی تھی۔

"میں کمزور ہوں، تم سنگلاخ چٹانوں سے سخت ہو۔" وہ زخمی سا مسکرائی تھی۔۔ نم آنکھوں سے۔۔ ہلکا سا۔۔ زیاد کا شدت سے دل چاہا تھا وہ کھل کر مسکرائے۔ بس آخری بار وہ ان سلوٹوں کو دیکھ لے جو اس کے کھل کر مسکرانے پر

اس کی آنکھوں کے کناروں پر وجود میں آتی ہیں۔ بس ایک آخری بار!

"ہماری جنگ ایک سی تھی۔ ہم دونوں کمزور تھے۔ ہم نے فیصلے وقت کی مناسبت سے لیے ہیں، سعاد!" وہ ایک قدم بڑھاتا اس کے قریب آیا۔ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ہمیں اپنے فیصلوں پر پشیمان نہیں ہونا! اپنے فیصلے پر ڈٹ جاؤ جو تم نے کیا ہے۔ اب تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں، تم نے جو کیا ٹھیک کیا۔ یہی وقت کی مانگ تھی، یہی اس سب کا حاصل تھا۔ انسان کو ہر مشکل فیصلہ لیتے وقت اپنے سینے سے دل کو نکال دینا چاہیے، تاکہ کوئی ایسی طاقت نہ ہو جو اس کے فیصلے کو بدل سکے"!

"آئی ایم سوری۔" اس نے لب دانتوں میں دبا کر سسکی روکی تھی۔ وہ اپنے دل کو نہیں نکال سکتی تھی۔ وہ کمزور تھی، اس نے یقین کر لیا تھا۔

"میں ابھی زندہ ہوں۔" وہ جیسے خفا ہوا تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے تھے کہ پولیس موبائلز کے سائرن کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کو دروازے پر جا ٹکی تھیں۔ پھر نگاہوں کا رخ موڑا گیا۔ وہ دل پر جبر کیے الوداعی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے معذرت خواہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

گاڑیوں کے سائرن کا شور تھما تو گھر کی گھنٹی بجنے لگی۔ باقاعدہ چنگھاڑنے لگی۔ اسے لگا تھا اس کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ دروازہ کھولنے کی جسارت نہیں کر سکے گی۔ وہ یہیں ڈھیر ہو جائے گی۔

"چلو اب جاؤ۔ جتنی دیر سے دروازہ کھولو گی اتنا زیادہ شک میں آؤ گی۔" وہ سنجیدگی سے کہتا خود آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ وہ سنگلاخ چٹانوں سا سخت تھا جسے نہ وقت کی آندھیاں اپنی جگہ سے ہلا سکتی تھیں، نہ تند و تیز طوفان اسے اپنے قدموں تلے روند سکتے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی دروازے کی طرف آئی۔ ایک آخری نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر سر جھکا کر آنسوؤں کو اندر اتارا۔ گالوں کو رگڑنے لگی تھی کہ وہ بے اختیار آگے آیا۔

"آخری بار اجازت دو گی۔ جبکہ میرے پاس رومال نہیں ہے۔" سعاد نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی تو نہ تھا سوائے محبت کے۔ اس کا اٹھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہا۔ وہ اس کے آنسو پونچھ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"خدا حافظ۔" وہ مزید وہاں نہیں رک سکی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ نظریں جھکائے اپنے ہاتھ پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتا۔۔ چپ چاپ۔۔ خاموش۔

☆☆☆

دروازہ کھلتے ہی پولیس حرکت میں آئی تھی۔ کئی نوجوان اپنی بھاری پستولیں سنبھالتے پورے گھر میں پھیل چکے تھے۔ وہ چپ چاپ ساکت کھڑی ان کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ دو اسلحہ سے لیس نوجوان بیسمنٹ کی طرف بڑھے تھے۔ اس نے سانس روکے انہیں اندر جاتا دیکھا تھا۔ بس کچھ دیر پھر وہ اسے ساتھ لیے واپس آئیں گے۔ پھر ہتھکڑیاں اور تفتیش، اقرار یا انکار جو بھی، مگر سزا صرف موت۔ اس نے مضبوطی سے پاس رکھی کرسی کو پکڑا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا پولیس انسپکٹر فرصت سے گھر کا جائزہ لینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کرسی پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ دو منٹ گزر چکے تھے۔ اس کی نظریں اس انسپکٹر کی وردی پر تھیں اور اس کی پستول پر۔ وہ پیچھے دھکیلی جا رہی تھی اسی رات میں۔ وہ چھت پر تھی، فائرنگ کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ بھاگتے قدم اور وہ، وہ خون، اس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ دھڑکنیں سست پڑنے لگی تھیں۔ اس کے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔

"مجرم آپ کے۔۔" انسپکٹر کچھ کہنے لگا تھا کہ وہ دو نوجوان باہر آئے۔

”یہاں کوئی نہیں ہے سر۔“ اس نے حیرت سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ وہاں بس وہی دونوں تھے۔ زیاد ان کے ساتھ نہیں تھا۔ ”ہم گھر کی تلاشی لے چکے ہیں، یہاں کوئی نہیں ہے سر!“ ایک اور آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ یک ٹک سامنے دیکھے گئی۔ وہ صرف چند لمحوں میں کیسے غائب ہو سکتا تھا؟ صرف چند لمحوں میں؟

”آپ نے ہمیں غلط معلومات دے کر ہمارا وقت ضائع کیا ہے محترمہ!“ انسپکٹر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے، دماغ نے کچھ سوچنے سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس واپس جا رہی تھی۔ بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ گاڑیوں کے سائرن بجے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا پھر اپنے قدم بڑھائے۔ وہ بیسمنٹ میں آئی تھی جہاں کچھ لمحے پہلے وہ موجود تھا۔ یہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ کیسے بھاگ سکتا ہے؟! وہ اسی جگہ پر آئی جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھا تھا۔ وہاں فرش پر، اس کے کپ کے پاس چاکلیٹ کے ریپر کو الٹا کر کے رکھا ہوا تھا۔ وہ پنجوں کے بل نیچے بیٹھی۔ دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان اس ریپر کو اٹھایا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”فریب کے مرغولوں کے پار حقیقت دیکھنے کی کوشش کرنے والی پیاری سی لڑکی کو میرا الوداعی سلام۔۔۔ سینیوریتا سعاد!“ اس نے زور سے ریپر کو اپنی مٹھی میں بھینچا تھا۔ کئی آنسو قطار کی صورت میں گالوں پر بہتے چلے گئے تھے۔ لبوں سے سسکی نکلی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دھڑکنیں خطرناک حد تک سست پڑ رہی تھیں۔ اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ اس نے دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہی اور نتیجتاً چکرا کر گری۔ اس کا سر فرش سے جا ٹکرایا۔ آنکھیں موندلی گئیں۔ جسم بے جان ہو گیا۔ وہ ابھی بھی آنکھیں بند کر گئی تھیں۔ وہ چہرہ موڑ گئی تھی حقیقت سے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ جا چکا تھا۔ اس کی زندگی کی کتاب میں زیاد تاشفین کا باب ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

زیاد کے جانے کے ایک ہفتہ بعد تک پروفیسر البرٹ کے قاتل کی تلاش کے لیے پولیس کوششیں کرتی رہی۔ مگر مجرم کو یا زمین نگل گئی تھی یا وہ آسمان پر چلا گیا تھا۔ کوئی نشان، کوئی ثبوت کچھ نہیں تھا۔ وہ احساس جو مجھے اندر سے مار رہا تھا، کہ میں نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے پولیس کو فون کیا تھا، اب دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔ زیاد جا چکا تھا۔ وہ جہاں بھی ہو گا محفوظ ہو گا، یقیناً وہ اب کسی نئے قتل کی تیاریوں میں بھی مشغول ہو چکا ہو گا اور وہ بھول چکا ہو گا کہ، کوئی ہے جو اس کے دیے گئے گھاؤ سے بری طرح زخمی ہے۔

ایک ہفتے تک سب ٹھیک رہا۔ کوششیں جاری رہیں مگر پھر ایک دن پولیس آئی۔ میرے گھر کے دروازے پر نہیں، بلکہ ایک اور گھر کے دروازے پر۔ پولیس آئی اور چلی گئی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ بعد ازاں اخبار میں خبر چھپی جس کی سرخی تھی کہ، "پروفیسر البرٹ کے مجرم کی بھاگنے میں مدد کرنے والا لڑکا گرفتار"!

جانتے ہیں وہ لڑکا کون تھا؟ ہریرہ نامی جندل کے شاگرد کا سترہ سالہ بھائی! وہ سترہ سالہ لڑکا اس بھاری الزام کی زد میں آیا تھا۔ اس کی ماں اپنے جوان بیٹے پر روتی تھی، لوگ انگشت بدنداں تھے۔۔ اور میں، میں احساس جرم کے بوجھ تلے دب گئی۔ وہ میں تھی ناں جس نے زیاد کی بھاگنے میں مدد کی تھی۔ وہ لڑکا معصوم تھا، بہت معصوم جو قتل کے معاملے کو ٹھنڈا کرنے کے چکر میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کچھ دن گزریں گے۔ پھر ایک اور معصوم کی تصویر کے ساتھ خبر چھاپ دی جائے گی کہ قاتل پکڑا گیا! یہی قانون ہے ناں؟! ظالم و جابر لوگوں کے آگے مانند پہاڑ جم کر کھڑے ہو جانا اور مظلوم و معصوم عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے جرائم چھپانے کے لیے آگے کر دینا۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی اصل مجرم کون تھا؟! اور جب اس دن، قانون کے نام پر دھبہ ثابت ہونے والے وہ ظالم لوگ، سڑک کنارے ہریرہ کے سترہ سالہ بھائی کو کتوں کی خوراک بننے کے لیے پھینک کر چلے گئے تو اس دن میں نے جانا کہ

اصل مجرم میں تھی۔

زیاد حق پر تھا۔ وہ درندے تھے درندے! اور میں ان درندوں کو درندگی دکھانے کا موقع فراہم کرنے والی ایک سنگدل لڑکی! ہریرہ کا بھائی کومہ میں تھا۔ پروفیسر البرٹ کے مجرم کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ مجرم کی تصویر نہیں دکھائی گئی تھی۔ نہ ہی نام ظاہر کیا گیا تھا۔ کون جانے وہ زیاد تھا یا کوئی اور؟ کوئی اور معصوم جو پولیس کا نام صاف کرنے کے لیے سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مجھے سب معصوم لگ رہے تھے، زیاد بھی۔ ان سب کی مجرم میں تھی۔ میرے ہاتھوں پر دو لوگوں کا خون تھا۔ میں۔۔۔ میں کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہتی تھی مگر کس سے؟ کوئی نہیں تھا جو اس کھیل کی حقیقت جانتا تھا۔ میں اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی مگر کوئی اس کھیل کے پس منظر سے واقف نہیں تھا۔

جب اعتراف کے لیے کوئی تھا ہی نہیں تو کس کے آگے میں خود کو مجرم ثابت کرتی؟! بس تبھی میں خاموش ہو گئی۔ میں مزید کچھ کر بھی کیا سکتی تھی؟! میں اندر ہی اندر، ختم ہو رہی تھی۔ روزانہ اسپتال جانا اور ہریرہ کے بھائی کے سر پر گھنٹوں کھڑے رہنا میرا معمول بن چکا تھا۔ میں گھنٹوں موبائل کو تکتی رہتی اس آس میں کہ شاید۔۔ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر زیاد کوئی پیغام میرے لیے بھیجے۔ اور جب میں مایوس ہو کر موبائل رکھتی تو صرف ایک ہی بات ذہن میں گونج رہی ہوتی تھی، کیا ہو اگر وہ پکڑا جا چکا ہو؟ کیا ہو اگر سولی پر زیاد کو ہی چڑھایا گیا ہو؟! بس، میرے لیے سانس لینا محال ہو جاتا تھا۔ ایسے وقت میں میں نے جانا تھا کہ قتل ہونے والا ایک بار مرتا ہے، قتل کرنے والا بار بار مرتا ہے۔ ہر پل مرتا ہے، ہر لمحہ مرتا ہے!!

☆☆☆

وہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھی۔ سفید بڑی سی چادر میں لپٹی وہ آنکھیں بند کیے خدا سے گفتگو میں مشغول تھی۔ شاید معافی مانگ رہی تھی، اپنے جرم کی۔ یہ سچ تھا کہ اس کے سوا کوئی اس کھیل کے پس منظر سے واقف نہیں تھا، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ خدا کی ذات وہ واحد ذات تھی جو ہر کھیل کے پس منظر اور انجام سے واقف تھی۔ وہ خدا کے سامنے اعتراف جرم کر سکتی تھی اور وہ کرتی بھی تھی۔

اس نے ہاتھ منہ پر پھیر کر آنکھیں کھولیں تو جندل کو اپنے سامنے بیٹھا پایا۔ وہ کب آیا تھا وہ انجان رہی تھی۔ نہ قدموں کی چاپ نہ کوئی آہٹ، وہ اب اس خاموش آمد کی عادی ہو چکی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ غالباً وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے آگے ہوا۔ اس کے گود میں رکھے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے، مضبوطی سے، محبت سے۔۔

"آپ کو کچھ بتانا ہے۔ جو میں سالوں سے آپ سے چھپاتا آیا ہوں۔" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ تو کیا، وقت آن پہنچا تھا؟ "ناراض تو نہیں ہونگی ناں؟" اس کے معصومیت سے پوچھنے پر وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ وہ جواب نہ پا کر مایوس ہوا۔ قدرے توقف سے وہ گویا ہوا۔

"آپی میں، میں نے تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔" اس نے بہت آرام سے اس کے سر پر پہاڑ توڑا تھا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھے گئی۔ بنا پلک جھپکے، سانس روکے۔ "آج سے، کئی سال پہلے بابا کی وصیت کے عین مطابق!" اس کی آواز دھیمی پڑی تھی۔ سعادنے جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑوائے تھے۔ بے یقینی اور حیرت کی جگہ اب دکھ نے لے لی تھی۔

"بابا کا انجام یاد ہے تمہیں؟" اس کے تلخی سے کہنے پر جندل نے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ہر ذی نفس کا انجام موت ہے۔ بابا کی موت بہترین تھی۔۔"!

"جندل، تم نے جندل اللہ میں شمولیت اختیار کی ہے؟!" وہ بمشکل ضبط کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ جندل نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"حزبُ اللہ میں! جندل اللہ ختم ہو چکی ہے۔"

"تم۔۔۔" وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔ انتہائی بے بسی سے اسے دیکھا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"آپی میں، میں بابا کی وصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ آپ جانتی ہیں یہ ہونا تھا، آپ آج تک خود کو تسلی دیتی آئی تھیں۔ بابا نے خود میری چھٹی سالگرہ پر الزر قاوی سر سے بات کی تھی اور میں اسی دن حزبُ اللہ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ آپ کو اس سب سے انجان رکھا گیا تھا کیونکہ، حالات نے اجازت نہیں دی تھی۔ ماموں کی شہادت کے بعد آپ کے فوبیا سے سب واقف تھے۔ لہذا یہی قرار پایا کہ جب تک ہو سکے آپ کو اس سب سے انجان رکھا جائے۔ میں تاعمر یہ کرنے کو تیار تھا مگر اب، شاید یہ ممکن نہیں۔ مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔" اس نے پر امید نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"تم اس سب کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟ تم چھوٹے تھے تم سے یہ بات سب نے حتیٰ کہ ماموں نے بھی چھپائی تھی کہ بابا جندل اللہ کے کمانڈر تھے، تو اب تم اس سب کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟! اور اب میری مدد کیوں درکار ہے تمہیں جبکہ سارے فیصلے خود لیتے آئے ہو؟"

"آپی، میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ راستہ جسے آغا جان کی مخالفت کے باوجود بابا نے اختیار کیا، اسی راستے کا راہی بننا میرا مقصد تھا اور ہے۔ دادا کی وفات کے بعد جب میں کراچی واپس آیا تھا تو حالات یکسر بدلتے گئے۔ ماں اور بابا دونوں کا سایہ چھن گیا۔ ماموں واحد آسرا تھے تو وہ بھی وقت کے طوفانوں کی زد میں آ گئے۔ جس دن میں پندرہ سال کا ہوا تھا تو الزر قاوی سر نے کاغذ کا وہ ٹکڑا میرے سامنے کر دیا جس پر بابا کے دستخط تھے۔ اس کاغذ پر

لکھی تحریر کے مطابق بابا مجھے الزرقاوی سر کو سونپ چکے تھے! ان کی خواہش تھی کہ وہ خواب جسے انہوں نے اپنی آنکھوں میں سجایا تھا، ان کا بیٹا اس کی تعبیر بنے۔ اور تب جب جندل اللہ کو ختم کر دیا گیا تھا تو میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ان افراد میں شامل ہو جاوں جو حزب ُ اللہ کی بنیاد رکھنے جا رہے تھے! میں حزب ُ اللہ کے پہلے دستے میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا ہوں۔ دو سال، جب آپ کے مطابق میں کراچی میں ضرار کے گھر تھا اپنی پڑھائی کے سلسلے میں تو، دراصل اس وقت میں پہاڑوں پر دشمن کا مقابلہ کرنا سیکھ رہا تھا۔" وہ نظریں جھکا گیا تھا۔ سعاد بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی۔ اس کا مان یقین اور بھروسہ سب جندل کے قدموں تلے کچلا جا چکا تھا۔ سب کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا تھا۔ کانچ کے یہ ٹکڑے اب بری طرح اسے گھائل کر رہے تھے۔

"دو سال کی ٹریننگ کے بعد جب واپس آیا تو آپ بھی کراچی آ چکی تھیں۔ مجھے تھوڑا مشکل وقت دیا آپ نے مگر اس دوران میں ان گنت محاذوں پر گیا۔ اور ابھی یو کے پڑھنے نہیں گیا تھا مشن پر گیا تھا۔ اور واپس اس لیے نہیں لوٹا ہوں کہ وہاں دل نہیں لگا، بلکہ مشن مکمل ہو چکا ہے۔ میں کامیاب ٹھہرا ہوں!" اس کی آواز مزید دھیمی ہو گئی تھی۔ سعاد سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ سر اپنی کامیابی کا بتاتے ہوئے مزید جھک گیا تھا۔

"اب کیوں بتا رہے ہو یہ سب؟" بہت دیر کے بعد اس نے خود کو کہتے سنا تھا۔

"کیونکہ شک آپ کو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسرا، اب مزید پڑھائی کا بہانہ کرنا ممکن نہیں۔ تیسرا، آپ کو بھروسے میں لینا چاہتا ہوں۔"

"میں اس شخص پر کیسے بھروسہ کروں جو جانے کتنی جانوں کا خون اپنے ہاتھوں پر لگائے بیٹھا ہے۔" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ جندل نے صدمے سے اسے دیکھا تھا۔

"آپی، بھائی ہوں آپ کا۔"

"کیسے بھائی ہو؟ اب تک جھوٹ بولتے آئے اور، اور جس چیز سے جانتے ہو مجھے نفرت ہے اسی میں ملوث ہو؟ قاتل بن گئے ہو تم بھی؟"!

"آپ میرے مقصد پر شک نہ کریں آپی! یہی وہ راستہ تھا جسے بابا نے چنا اور جس کی مجھے تربیت دی گئی۔" لہجہ سخت ہوا تھا، تاثرات نرم تھے۔ "میں راتوں کو سو نہیں پاتا۔ میں خواب میں ایک بچہ دیکھتا ہوں جس کے گھر سے آگ اپنی پیاس بجھا رہی ہے۔ اور جس کی ماں زندہ جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ اور اس کا باپ وہ ابھی جل رہا ہے۔ اس کی چیخوں میں، فالوجہ کے لوگوں کی چیخیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور شام کی مائیں بین کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ فلسطین کے جوان گولیوں کی زد میں نظر آتے ہیں۔ اور گوانتانامو بے میں اذیت کی نئی داستانیں رقم ہوتے دیکھتا ہوں۔ میں سو نہیں پاتا۔

دِمشق رو رہا ہے، عِراق تباہ ہو گیا ہے۔ کَشمیر لُٹ رہا ہے، بوسنِیا میں آج بھی مسلمانوں کی لاشیں جمع کی جا رہی ہیں۔ میں کیسے سو سکتا ہوں؟!" وہ نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"لیکن، اگر تم بھی یوں جانیں لوگے تو تم میں اور ان میں فرق کیا رہ جائے گا؟!" اسے اپنی آواز بہت کمزور سی لگی تھی۔

"یہ کہ انہوں نے ایک بچے کے سامنے اس کی ماں کی جان لی تھی۔ میں دنیا کے سامنے ان کی جانیں لے رہا ہوں۔"!

"انتقام لے رہے ہو؟"

"نہیں، لاکھوں بچوں کو یتیم ہونے سے بچا رہا ہوں۔ جب تک جان ہے انہیں بچاؤں گا۔ میرے بعد خدا کسی اور کو

اٹھائے گا۔ وہ جو ہمیں شدت پسند اور دہشتگرد نہیں کہے گا آپی! اس کے لیے ہم قرون اولیٰ کے مجاہدین کے خادم ہونگے۔ اس کے لیے ہم یوسف، طارق، محمد اور فاتح ہونگے۔ اس کے لیے ہم خدام اسلام ہونگے۔ اس کے لیے ہم "حزبُ اللہ" ہونگے۔۔۔"!

وہ جواب دے چکا۔ تمام دلیلوں سے نئے سوالات کا راستہ مسدود کر دیا۔ وہ خاموش رہی۔ سر جھکا کر آنکھوں میں چھلکتی نمی کو اندر اتارا پھر جائے نماز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا تمہیں کامیاب کرے۔" اس پر نگاہ ڈالے بنا وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ چپ چاپ وہیں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

"جندل اللہ کی بنیاد ان دنوں رکھی گئی جب تمام دنیا مسلمانوں کے خلاف ایک ہو گئی تھی۔ عراق میں دہشتگردی کے نام پر لاکھوں بے گناہ مسلمان مارے جا چکے تھے۔ افغانستان الگ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ فلسطین، شام، دمشق ہر ہر کونے میں مسلمان بری طرح غیر مسلم قوتوں کے قدموں تلے مسلے جا رہے تھے۔ نائن الیون کے سانحے نے مسلمانوں پر دہشتگردی کا جو ٹھپہ لگا دیا تھا، اس کا داغ کروڑوں مسلمانوں کی جانیں لینے کے بعد بھی نہیں مٹ رہا تھا۔ ایسے میں چند عظیم لوگوں نے جندل اللہ کی بنیاد رکھی تھی۔
بابا جندل اللہ کے پہلے دستے میں شامل تھے۔ انہیں قرطبہ دارالعلوم میں ٹرین کیا گیا تھا۔ جب وہ مکمل تیار ہو گئے تو جندل اللہ والے حرکت میں آئے۔ کئی معرکے ہوئے، جن میں وہ کامیاب ٹھہرے اور نتیجتاً دنیا کی نظروں میں آ گئے۔ وہ آخری بحری سفر جو میں نے آغا جان کے ساتھ کیا تھا وہ محض آغا جان کی ضد تھی۔" وہ گہری سانس لے کر رکا۔ سعاد نے تعجب سے اسے دیکھا جو میز کے کناروں پر ہاتھ جمائے اس کی طرف جھک کر کھڑا تھا۔

”آغا جان بابا کو مزید خطرے میں جاتا نہیں دیکھ سکتے تھے، تبھی ان کے نہ ماننے پر انہیں دھمکی دے کر نکلے تھے کہ جب تک وہ جندل اللہ سے علیحدہ نہیں ہوجاتے وہ مجھے واپس نہیں لائیں گے! بابا کے لیے جندل اللہ سے الگ ہونا ناممکن تھا۔ انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ آغا جان کے ڈوب جانے کے بعد جب میں واپس آیا تھا تو کچھ دنوں میں ہی جندل اللہ کے دو کمانڈر پکڑے جا چکے تھے۔ بعد ازاں ہمارے گھر کو بھی آگ لگ گئی اور بابا جاں بحق ہوگئے۔ جندل اللہ کی بنیادیں کھوکھلی پڑ گئیں اور پھر یہ تنظیم ختم کر دی گئی!

کچھ عرصے بعد، دوبارہ ایک میٹنگ ہوئی جس میں جندل اللہ میں موجود کمزوریوں پر غور کیا گیا۔ کافی غور و فکر کے بعد حزب اللہ کی بنیاد رکھی گئی۔ حزب اللہ میں وہ تمام کمزوریاں مفقود کر دی گئیں جو جندل اللہ میں تھیں۔ اب میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ جندل اللہ اور حزب اللہ میں کیا فرق ہے!“ وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔

”جندل اللہ میں صرف ان لوگوں کے خلاف ایکشن لیا جا رہا تھا جو اسلام کو ناپید کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ جندل اللہ میں ثبوت اکٹھے نہیں کیے جا رہے تھے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ بنا ثبوت کے ایکشن میں آ رہے تھے پر وہ ثبوت دنیا کو نہیں دکھا رہے تھے کیونکہ اس طرح جندل اللہ کے ظاہر ہونے کا خطرہ تھا! آج حزب اللہ جب بھی کسی کے خلاف ایکشن میں آتی ہے تو سب سے پہلے اس کے خلاف اکٹھے کیے گئے تمام ثبوت آؤٹ کر دیے جاتے ہیں۔ اسکرین کے پیچھے ایسے بہت سے دماغ موجود ہیں جو صرف اس چیز پر کام کر رہے ہیں کہ کوئی ویبسائٹ یا کوئی بھی ان ثبوتوں کو مٹا نہ پائے۔

مزید، ایک ایسا وقت آیا تھا جب لوگوں کے دلوں میں جندل اللہ کے خلاف خطرناک حد تک زہر بھر چکا تھا۔

کیوں؟ کیونکہ جندل اللہ صرف اپنا کام کر رہی تھی، ان کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو اپنا کام سمجھائیں۔ ان کے پاس لوگ نہیں تھے جو جندل اللہ کے مقاصد کو ظاہر کریں۔ انہیں خطرہ تھا کہ ایسا کرنے سے جندل اللہ خطرے میں پڑ جائے گی اور نتیجتاً یہ تنظیم ختم ہو گئی۔ آج حزب اللہ میں دو گروپس ہیں۔ ایک وہ جو لڑتے ہیں دوسرے وہ جو اس لڑائی کے اصل مقاصد کے متعلق لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں، جو تبلیغ کرتے ہیں۔ اساتذہ، علماء، مصنفین غرض ہر طرح کے لوگ۔

حزب اللہ خدا کے اس حکم پر عمل پیرا ہے،

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبہ 122)

"اور ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ مسلمان سب کے سب کوچ کریں، سو کیوں نہ نکلا ہر فرقے میں سے ایک حصہ تا کہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو ان کو ڈرائیں تا کہ وہ بچتے رہیں۔"

اور نتیجتاً لوگ حزب اللہ سے نفرت نہیں کر پا رہے حالانکہ میڈیا اسے دہشتگرد ثابت کرنے کی تمام کوششیں کر رہا ہے۔ ہر وار کر رہا ہے مگر حزب اللہ کو اس مقام پر نہیں پہنچا پا رہا جس پر انہوں نے جندل اللہ کو پہنچا دیا تھا۔

میں ابھی یو کے ایک دہشتگرد گروپ کے پیچھے گیا تھا۔ کل رات اس کے خلاف تمام ثبوت سوشل میڈیا پر دے دیے گئے ہیں۔ جانے کتنے دماغ کل سے اسی کام میں مشغول ہیں کہ کسی طرح انہیں مٹایا نہ جا سکے۔ صبح ہم اس گروپ کا نام و نشان مٹا دیں گے اور تب کوئی نہیں ہو گا جو یہ کہہ سکے کہ دہشتگردوں کو مرنا دہشتگردی ہے!!

حزب اللہ بالکل درست راہ پر ہے آپی! میں چاہتا ہوں کہ، آپ۔۔ ان لوگوں میں شامل ہو جائیں جو

حزب ُ‌اللہ کے مقاصد بیان کرتے ہیں۔ آرٹیکلز کے ذریعے، کالمز کے ذریعے اور بہت کچھ۔ ہر وہ ہتھیار جو ہمارا دشمن ہمارے خلاف استعمال کررہا ہے ہم اسی ہتھیار سے اسے منہ توڑ جواب دیں۔ آپ یہ کریں گی ناں؟" وہ پرامید نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے میز پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کے دماغ میں اس وقت بہت کچھ چل رہا تھا۔ جیسے کہ، زیاد نے پہلے ثبوت اکھٹے کیے تھے پھر قتل کیا تھا۔ یعنی، زیاد حزب ُ‌اللہ میں سے تھا!! وہ آنکھیں میچتی سر سیٹ پر ٹکا گئی۔

"مجھے کچھ وقت دو جندل۔ مجھے صحیح اور غلط کو ٹھیک طرح سے سمجھنے دو□۔" وہ آنکھیں موندے کہہ رہی تھی۔ جندل ذرا سا مسکرا دیا۔ اسے یقین تھا وہ مان جائے گی۔ اور سعاد، اسے آج جندل بہت بڑا اور سمجھدار لگا تھا۔ وہ بڑا ہو گیا تھا اور آج اس نے جانا تھا کہ وہ بالکل، عالیان کی زبان بولتا تھا۔ وہ بالکل عالیان یوسف زئی جیسا تھا۔ ہو بہو۔۔۔!

☆☆☆

یہ جگہ آبادی سے ذرا دور تھی۔ اونچی نیچی ڈھلوانیں سر کرتی گاڑی مختلف موڑ مڑتی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا جندل وقفے وقفے سے ایک نگاہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی سعاد پر ڈالتا سنجیدگی سے بیٹھا تھا۔ اور سعاد، وہ سر جھکائے ہاتھوں کو رگڑنے میں مصروف تھی۔ وہ اب تک، اب تک اس سب کو قبول نہیں کر پا رہی

تھی۔ شاید وجہ زیاد تھا۔ اگر وہ صرف قتل کی بنا پر اسے پولیس کے حوالے کر سکتی تھی تو اب انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے ہی سگے بھائی کے خلاف بھی کھڑی ہو جاتی۔ اور یہیں آکر اس کی بس ہو جاتی تھی۔ وہ کمزور پڑ جاتی تھی۔ جو بھائی اس کا سب کچھ تھا اس کے خلاف کیسے کھڑی ہو جاتی؟ اور اس کے خلاف کھڑے ہونے کا مطلب اپنے مرحوم باپ کے خلاف کھڑا ہونا؟! اگر اس کے بابا اس کی نظر میں صحیح راہ پر تھے، تو جندل بھی تو اسی راہ کا راہی تھا۔ اور اگر وہ دونوں صحیح تھے تو کچھ نہیں پر زیاد کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ افف زیاد۔۔۔!

وہ گہری سانس لیتی سر اونچا کر کے سیٹ پر ٹکا گئی تھی۔ نظریں سامنے سڑک پر تھیں۔ انجان راستے تھے، بے نام منزل تھی۔ نہ جاننے کی جستجو تھی، نہ جاننے کی آرزو تھی۔ گاڑی مختلف راستوں سے گزرتی کسی کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔ مختلف عمارتوں کو پار کرتی گاڑی اس گھر کے قریب آکر رکی۔ جندل دروازہ کھول کر باہر نکلا پھر اس کی طرف آیا۔ آگے بڑھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ ناراض تھی، وہ اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموش نگاہ اس پر ڈالتی باہر نکل آئی۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے آیا اور گھر کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد آہنی دروازہ کھلا۔ جندل نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔۔ چپ چاپ۔۔ خاموش نگاہوں سے گردوپیش کا جائزہ لیتی۔

”آپی۔“ وہ خفگی سے کہتا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لایا۔ چھوٹا سا یہ صحن شاید ابھی دھویا گیا تھا، فرش گیلا تھا۔ دیواروں کے ساتھ رکھے پودوں پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ اسے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھا۔ وہ لاونج میں داخل ہوئے تو وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ جندل اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود لاونج سے منسلک کچن کی طرف بڑھا۔ فریج کھولا، وہاں سے جوس نکالا۔ کیبنٹ میں سے گلاس اٹھائے، ٹرے میں رکھے۔ اور ٹرے کاونٹر پر رکھ کر مڑ گیا۔ فریج کھولا اور اب وہاں سے دودھ نکال کر چولہے پر رکھ دیا۔ وہ جیسے اس سب کا عادی تھا۔ وہ نہیں

جانتی تھی وہ کس کے گھر آئے تھے مگر جس طرح جندل کچن میں کھڑا کام کر رہا تھا اسے یہی لگا تھا کہ یہ جندل کا اپنا گھر تھا۔ چائے پکنے کے لیے رکھ کر وہ ٹرے اٹھا کر جب واپس پلٹا تو وہ صوفے کے پاس کھڑی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر نگاہوں کا رخ موڑ کر لاؤنج کا جائزہ لینے لگی۔ وہ بے بسی سے لب دانتوں میں دبا گیا۔

چھوٹا سا لاؤنج جس کی دیواریں سفید رنگ کی تھیں۔ ایک طرف کو صوفے رکھے تھے، بیچ میں میز تھی اور پھر سیدھ میں دو کمرے تھے۔ گھر ایک طرف تو چھوٹا تھا مگر وہیں سادگی اور خوبصورتی کی مثال تھا۔ اس چھوٹے سے گھر پر بھی کافی محنت کی گئی تھی۔

جندل نے ٹرے میز پر رکھی پھر التجا بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بیٹھ جائیں ناں۔۔" اور وہ پھول۔۔ صوفوں کے پاس کتنی نفاست سے رکھے ہوئے تھے۔۔ تازہ بالکل۔ خوشبودار۔۔

"بہت ضدی ہیں یار آپ!" خفگی سے کہتا وہ جوس کا ایک گلاس لے کر دائیں طرف والے کمرے کی طرف بڑھا۔

"امامہ، آپ کے مہمان آئے ہیں۔" وہ کمرے کے اندر گیا اور پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ بس کچھ ہی دیر گزری اور دوسرے کمرے سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔

سرمئی رنگ کے لباس میں ملبوس، لمبا قد اور پتلی دبلی سی وہ لڑکی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے آگے آئی اور اسے گلے لگایا۔ سعاد تذبذب سے اس سے لگی کھڑی رہی پھر پیچھے ہٹی۔

"کیسی ہو؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ، بہت معصوم سی تھی۔ لبوں کو گھیرے میں لیے۔۔ گہری سی۔۔

"میں ٹھیک، آپ کیسی ہیں؟" انگلیاں مروڑی گئی تھیں۔

"الحمدللہ۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ امامہ نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ وہ گلاس تھام کر لبوں سے لگا گئی۔

"میرا نام امامہ ہے۔ جندل نے بتایا تو نہیں ہو گا یقیناً!" گلاس میز پر رکھتے ہوئے سعاد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اور تم سعاد۔۔ جندل نے بتایا ہے یقیناً!" سعاد نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا ۔ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ اور چہرے پر بلا کی معصومیت۔ سفید رنگت اور سیاہ آنکھیں، چہرہ جو سیاہ حجاب کے ہالے میں قید تھا۔ گال ذرا سے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بول رہی تھی تو لہجہ نرم اور شستہ اور آواز دھیمی تھی۔ نرم و نازک سی وہ لڑکی، اسے بہت سمجھدار اور معصوم سی لگی تھی۔ جاذب نظر اور دلنشین!

"جندل آپ کو کیسے جانتا ہے؟"

"جندل اور میرے شوہر ساتھ کام کر چکے ہیں۔" مسکراہٹ۔۔ آنکھوں کی چمک۔۔ انوکھی چمک، معصوم مسکراہٹ!

"اور آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

"جندل کی وجہ سے۔۔" اسے اب سمجھ نہیں آیا مزید کیا سوال کرے۔ امامہ چند لمحے مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا آگے ہوئی ۔ اس کے گود میں رکھے ہاتھ اپنے نرم و ملائم ہاتھوں میں لیے۔

"سعاد۔ کیوں تنگ کر رہی ہو جندل کو؟" آواز میں وہی نرمی تھی، چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی۔

"شکایت لگا دی اس نے؟"

"وہ پریشان ہے۔۔ کل کہہ رہا تھا، امامہ دنیا کو تسخیر کرنے والی جماعت کا یہ کارندہ اپنی بہن کے آگے گھٹنے ٹیک چکا

ہے۔ مگر معافی پھر بھی نہیں مل رہی۔ میرا جرم اتنا بڑا تو نہیں ہے؟"!

"وہ۔۔۔وہ قاتل بن چکا ہے۔" اس کی آواز میں تلخی کے عناصر شامل ہوئے تھے۔

"وہ مجاہد بن چکا ہے۔ وہ خدا کی راہ میں جدوجہد کرنے والا بن چکا ہے۔ وہ دین اسلام کا محافظ ہے، وہ خدا کی جماعت میں سے ہے۔ وہ حزب ُ اللہ میں سے ہے!" وہ خاموش رہی۔ نظریں جھکالیں۔ "سعاد۔۔۔اس وقت عالم اسلام کو ان گمنام مجاہدوں کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے حکمران نااہل ہیں، غیر قومیں ہمارے دل و دماغ پر قابض ہو چکی ہیں۔ ہم اپنے اسلاف کے طریقہ کار کو بھلا چکے ہیں۔ ہم اپنا ماضی یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ دشمن ہر طرف سے وار کر رہا ہے، ہر حربہ آزما رہا ہے۔ اور ہم اس کا کوئی وار خالی نہیں جانے دے رہے۔ ہمارے اخلاق، ہمارا ایمان، ہماری روایات، تہذیب و تمدن۔۔ ہر ہر چیز پر دشمن کا قبضہ ہے۔ ہر چیز کو دشمن گھائل کر چکا ہے۔ اس دوران اگر کچھ لوگ خدا کے دین کی جنگ کے لیے اٹھتے ہیں، تو وہ مجاہدین میں سے ہیں! یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایک ہاتھ میں دشمنانِ اسلام کو زیر کرنے کے لیے ہتھیار اور دوسرے ہاتھ میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے مسلمانوں کی کتاب ہے۔ یہ خدا کے سپاہی ہی نہیں خدا کی جماعت ہیں۔ انہوں نے خدا کا رنگ اپنایا ہوا ہے، یہ صبغتہ اللہ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ انسان خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے۔ اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ اور جن کے لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ اللہ کی جماعت ہیں اور یہی جماعت غالب ہونے والی ہے!

سعاد۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارا بھائی خدا کی جماعت میں سے ہے۔ وہ دین کا علم اٹھائے ہوئے ہے، وہ ہمارے اسلاف کی جھلک دیتا ہے۔ وہ اللہ کا سپاہی ہے سعاد!" امامہ کی باتیں۔۔ بہت خوبصورت تھیں۔ اس کا نرم لہجہ اور

دھیمی آواز مسرور کر دینے والی تھی۔ ایک لمحے کو وہ سب بھلائے بس یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی۔ وہ ٹھیک تھی، ہر طرح سے ٹھیک تھی۔ وہ حق پر تھی بالکل حق پر تھی! اب اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر کو خم دے کر ہتھیار گرائے تھے۔۔ ہار مانی تھی۔۔ ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔

امامہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ آگے بڑھ کر دھیرے سے اسے گلے سے لگا یا۔

"پریشان مت ہو، جندل تسخیر کر دینے والوں میں سے ہے۔" اسے تسلی دی گئی۔ وہ بس مسکرا دی۔۔ ہلکا سا۔۔ ذرا سا۔۔ کسی کے ازلی انداز کے عین مطابق!

چائے پک چکی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور جندل باہر آیا۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا، ان دونوں کی طرف اس کی پشت تھی۔ خاموشی سے کچن میں جا کر اس نے چائے نکالی پھر ٹرے میں کپ سجا کر ٹرے کاونٹر پر رکھی۔ اور کچن سے نکل کر لاونج کے دروازے کے پاس کھڑا ہوا۔

"تمہاری بہن ضدی نہیں ہے جندل"!

"جی جی بالکل بھی نہیں ہیں۔۔" سعاد نے بغور ان دونوں کو دیکھا تھا۔ امامہ کی نظریں سعاد پر تھیں۔ اور جندل، وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ نگاہیں کچن کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

"تم آئندہ اسے پریشان نہیں کرو گے"!

"بالکل نہیں کروں گا بس یہ گارنٹی دلوا دیں کہ یہ بھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گی"!

"بے فکر رہو لڑکے۔۔"

"آپ کا یقین کر رہا ہوں، مایوس مت کیجیے گا۔ باہر جا رہا ہوں، ملاقات کا وقت ختم ہو جائے تو آپی کو باہر بھیج دیجیے گا۔۔۔ اللہ حافظ۔" بنا ان کی طرف نگاہ اٹھائے وہ باہر چلا گیا۔ سعاد نے گردن موڑ کر اسے باہر جاتے دیکھا پھر کم

فہمی سے امامہ کو دیکھا۔

"آپ پردہ کرتی ہیں؟" امامہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چائے لانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ سعاد۔۔ اسے کچھ دیر پہلے کا یہ منظر بہت بھایا تھا۔ اپنے بھائی کی نظروں میں امامہ کے لیے اتنا احترام۔۔ اسے واقعی یہ بہت اچھا لگا تھا۔ اور پھر کس کو اچھا نہیں لگتا محترم ہونا؟!

کچھ دیر کے بعد۔۔ بقول جندل کے جب وہ ملاقات کا وقت ختم ہونے پر باہر آئی تو گاڑی کے بانٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا جندل فوراً سیدھا ہوا۔ کان سے لگا موبائل فوراً سے پہلے جیکٹ کی جیب میں اڑسا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے برابر میں گاڑی کے بانٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی۔ نظریں سیاہ سڑک پر ٹکائیں۔

"امامہ کون ہے؟" وہ اسی سوال کی امید رکھتا تھا۔

"امامہ کے والد۔۔ جندل اللہ میں تھے۔ اور بھائی اور شوہر حزبُ اللہ میں۔" اس نے سڑک پر نگاہیں گاڑے جواب دیا تھا۔

"ہیں؟" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ رخ اس کی طرف موڑا۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے نفی میں سر ہلا گیا۔

"بھائی کو شہید ہوئے تین سے چار سال ہونے کو ہیں۔۔ اور شوہر دو سال پہلے شادی کے ایک ماہ بعد مشن پر گیا تھا۔ کبھی واپس نہیں لوٹا۔ وہ بھی شہید ہو چکے ہیں۔" اس کے چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات تھے۔ سعاد سانس روکے اسے دیکھے گئی۔ وہ لڑکی۔۔ اس سب کے بعد بھی ڈٹ کر کھڑی تھی۔۔ اتنی بہادری؟ اتنی جرات؟!

"تو۔۔ وہ ایک شہید کی بیٹی، شہید کی بہن اور شہید کی بیوہ ہے۔۔" اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی۔ جندل اثبات میں سر ہلا گیا۔

"اپنا نومولود بچہ بھی کھو چکی ہیں۔۔۔" ایک اور راز آشکار کیا گیا تھا۔ اس نے بے اختیار جھر جھری لی تھی۔

"وہ بہت بہادر ہے جندل۔۔۔"

"آپ بھی بن جائیں۔۔" اس نے کان کھجاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا سا مسکرا دی۔ مسکراتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور اسے گلے سے لگایا تھا۔

"مجھے تم پر۔۔۔ فخر ہے، اخی!" آہ جندل۔۔ وہ سعاد کو بھروسے میں لے چکا تھا۔ وہ کامیاب ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

یہ انصاف کا تقاضا نہیں تھا میں جانتی تھی۔ مگر اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں جذبات میں آکر دو زندگیاں برباد کر چکی تھی، اب مزید کا گناہ اپنے سر نہیں لے سکتی تھی۔ میں اب لڑنا چاہتی تھی۔۔ اپنے ڈر سے۔۔ وہ ڈر جو میرے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ مجھے خون سے ڈر لگتا ہے، قتل اور قاتل سے۔۔۔ مگر اب جندل میری یہ سوچ بدلنے میں ایک حد تک کامیاب ہو چکا تھا کہ، ہر قاتل انسانیت کا قاتل نہیں ہوتا! کچھ قتل انسانیت کو بچانے کی خاطر کیے جاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ ظلم ہوتے دیکھنا اور اس پر خاموش رہنا انسانیت کا قتل ہے، مگر اس ظلم کے خلاف جدوجہد میں شریک ہونا، ہتھیار کے زور پر ظلم کے خلاف لڑنا یا اس کے خلاف آواز اٹھانا یا پھر ظالم کو اس کے ظلم سے آگاہ کرنا یعنی فرعون کو اس کی فرعونیت سے آگاہ کر کے وارننگ دینا۔۔ کہ اگر ہتھیار نہ ڈالے تو ہر چیز پر قادر ذات، ظلم کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے لیے پانیوں کے بیچ سے راستے بنا دے گی۔ یعنی۔۔۔ برائی کو روکنا ہر گز بھی انسانیت کا قتل نہیں ہے۔۔۔ کیا سمجھے؟!

"جندل جندل اٹھو جلدی اٹھو۔" اس نے بیڈ پر لیٹے جندل کو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ رات دیر سے گھر آیا تھا۔ آنکھیں نیند کی کمی کی وجہ سے لال ہو رہی تھیں۔ اب بھی بمشکل آنکھیں

کھول کر اس نے سعاد کو دیکھا تھا۔

"مجھے وہ سب سیکھنا ہے جو تم نے پہاڑوں پر سیکھا ہے!" جندل کو لگا تھا اس نے غلط سنا ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھے گیا۔ منہ کھولے۔۔ بھنویں اکھٹی کیے۔۔ حیرت سے۔۔ کم فہمی سے۔۔

"دوبارہ کہیں۔"

"مجھے مجاہدہ بننا ہے۔" اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ جندل کو جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

"آپی۔۔ نیند میں ہیں؟"

"تم میرے لیے اتنا نہیں کر سکتے جندل؟" وہ سنجیدہ ہوئی۔ کمر پر ہاتھ باندھے اسے چیلنج کیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ایک ہی جست میں بیڈ سے اترا۔

"میں آپ کے لیے سب کر سکتا ہوں۔ اب دیکھیے گا واپس لوٹنے پر مجبور نہ کیا تو میرا نام جندل نہیں!" وہ بھی ضد میں آیا۔ وہ مسکرائی۔۔ کھل کر۔۔ پھر ہنس دی۔۔ کھلکھلا کر۔

☆☆☆

یہ وقت فجر سے ذرا پہلے کا تھا۔ آسمان پر ابھی اندھیرا تھا مگر اندھیرے کے عین قلب میں سے نیلی روشنی بھی بس پھوٹنے کو تھی۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا میں شبنم کی نمی تھی۔ سڑکیں شبنم سے دھلی ہوئی تھیں۔ اس کھلے وسیع میدان میں کھڑا جندل اپنی گھڑی کو دیکھتا کسی کا منتظر تھا۔ سیاہ جینز پر سیاہ اپر پہنے، سر پر سیاہ ہی پی کیپ ٹکائے وہ بالکل تیار تھا سعاد کے لیے۔ پاؤں سفید جاگرز میں مقید تھے۔ غالباً وہ اپنی ورزش سے فارغ ہو چکا تھا۔

اور پھر اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ نمودار ہو چکی تھی۔ سفید جاگرز میں مقید پاؤں، سیاہ ڈھیلا ڈھالا ٹراوزر اور سیاہ ہی گھٹنوں سے ذرا اوپر تک آتی شرٹ پہنے۔ سفید حجاب کے ہالے میں مقید چہرہ اور آنکھوں میں انوکھی

چمک۔۔۔وہ بھی بالکل تیار تھی!

”دوڑیں۔۔ جتنا تیز دوڑ سکتی ہیں دوڑیں!“ گھڑی کو دیکھتے ہوئے اسے حکم ملا تھا۔ اس نے سر کو خم دیا تھا۔۔ اور پھر جب سیاہ آسمان کی چادر کے عین قلب سے نیلی روشنی پھوٹی تھی تو یہ منظر صاف دیکھا گیا تھا کہ ایک لڑکی۔۔ اس کھلے وسیع میدان میں جتنا تیز دوڑ سکتی تھی، دوڑ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار سے۔۔۔ عزم کے ساتھ۔۔ جنون کے ساتھ۔۔!

”آپ کے حوصلے بلند ہوں، قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ یاد رہے وہ ایک لمحہ جس میں آپ کمزور پڑیں گی، آپ کو موت کے منہ میں لے کر جا سکتا ہے!“ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ ٹانگیں شل ہونے لگیں تھی۔ آنکھیں بند ہونے کو تھیں۔ دھڑکنوں کی رفتار سست پڑی تھی۔ جندل کی کڑکتی آواز سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ ہار رہی تھی۔۔ وہ گر رہی تھی۔۔۔ اور پھر اس کے قدم ڈگمگائے۔ وہ لڑکھڑائی اور منہ کے بل گری۔ دائیں آنکھ کی محراب سے خون نکلا۔ گھٹنوں پر بھی چوٹ آئی۔ کوئی ہاتھ اس کے لیے آگے نہیں بڑھا۔

”آپ کی پشت پر آپ کے حوصلے بلند رکھنے والا کوئی نہیں۔ آپ تنہا ہیں اور تنہا ہی لڑیں گی۔ آپ کا جھکا سر کسی کی نہیں مگر صرف آپ کی ہار ہے۔ آپ کے ڈھیلے پڑتے کندھے امید کے کئی چراغ بجھا دے گا۔ سر اٹھائیں سعاد! گردن سیدھی رکھیں، نگاہ سامنے ہو۔! آپ کا دشمن آپ کے اٹھنے کا انتظار نہیں کرے گا! اٹھیں سعاد۔۔۔ جو گر جائے وہ روندا جاتا ہے۔ کچلا جاتا ہے، مسل کر رکھ دیا جاتا ہے! یہ سر جھکنے کے لیے نہیں ہے سعاد!“ اس کی بلند آواز اس وسیع میدان کے ہر کونے میں گونجی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ناکام رہی۔ اس نے زور سے آنکھیں میچیں۔ چھلے ہوئے ہاتھوں کو زور سے بھینچا۔۔ گھٹنے پر زور دیا اور پھر۔۔۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔۔ جھکا سر اٹھایا۔ گردن سیدھی کی۔ نظریں سامنے مرکوز کیں۔ اس کے سامنے وسیع میدان تھا۔۔ نہیں دشمن۔۔ ہاں

دشمن! اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، دو۔۔ تین۔۔ اور پھر وہ دوڑنے لگی۔۔ پوری رفتار سے۔۔۔ پورے عزم کے ساتھ۔۔ کیونکہ۔۔ دشمن انتظار نہیں کرتا! کیونکہ۔۔ جو گر جائے وہ قدموں تلے روندا جاتا ہے۔۔!

"ہاتھ بالکل سیدھے۔۔ یہ بالکل بھی نہ کانپیں۔ نظریں سامنے۔۔ سانس روک لیں۔۔ شور کو تھمنے دیں۔۔ نشانہ لیں۔۔ بالکل قلب میں۔۔ اور ٹریگر دبا دیں۔" اس نے ٹریگر پر زور دیا تھا۔ خالی میدان میں فائر کی تیز آواز گونجی تھی۔ ہوا کی رفتار سے نکلی گولی عین اس درخت کے تنے کے قلب میں پیوست ہو گئی۔ وہ مسکرائی۔ فخر سے جندل کو دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا بالکل سنجیدہ۔۔ چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"جنگ کے میدان میں وہ ایک نگاہ جو آپ داد حاصل کرنے کے لیے اٹھائیں گی، آپ کو بری طرح گھائل کر دے گی۔ فائر کریں اور تب تک کریں جب تک جسم میں جان ہے سعاد! حوصلے بلند رکھیں یہاں تک کہ آپ کا دشمن پیچھے ہٹ جائے۔ گولی چلائیں سعاد!" وہ چلایا تھا۔ ٹریگر پر زور پڑا تھا۔ ایک دو تین۔۔ اور لگاتار فائرنگ ہونے لگی۔ مسلسل۔۔ متواتر۔۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ نشانے چونکنے لگے۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ چمکتی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئی۔ ہتھیلیاں نم پڑنے لگیں۔ پستول اس کے ہاتھ سے پھسل کر گری۔ وہ بے جان ہو کر پنجوں کے بل نیچے بیٹھی تھی۔۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔

"یہ بہت مشکل ہے۔۔ یہ آواز۔۔۔ یہ آواز دلوں کو چیر دینے والی ہے۔" اس نے بند مٹھی کو مٹی سے رگڑا تھا۔ آنکھوں میں نمی پگھلنے لگی تھی۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ اپنے خوف سے لڑ رہی ہیں۔ یہ خوف سالوں کے عرصے میں آپ کے ساتھ بڑا ہوا ہے۔ آپ کو یقین ہے آپ کچھ عرصے میں اسے مات دے سکتی ہیں؟" وہ اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اس نے سر اٹھایا۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔

"یقیناً میں کر سکتی ہوں!" اس کے عزم کو دیکھ کر وہ کھل کر مسکرایا۔ پھر ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جیکٹ کی پچھلی طرف اڑسی پستول نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"شروع ہو جائیں۔ آپ کو لڑنا ہے۔۔ اپنے خوف سے۔۔ وہ خوف جو آپ کی روح تک میں سما گیا ہے۔ یعنی آپ کو اپنے آپ سے لڑنا ہے!" وہ چند لمحے پستول کو دیکھتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھوں کو جھٹکا دیا پھر پستول پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے ہاتھ سیدھے کیے۔ نگاہیں سامنے مرکوز کیں۔ سانس روکا۔۔ نشانہ لیا۔۔ اور ٹریگر دبا دیا۔ وہی تیز آواز گونجی۔۔ اس نے ٹریگر پر زور دیا۔۔ دو۔ □ ۔۔ تین۔۔ کئی میگزینیں خالی ہو گئیں۔ اس نے مشق جاری رکھی۔۔ کیونکہ۔۔ اسے لڑنا تھا، اپنے خوف سے۔۔ اپنی روح کے ایک حصے سے۔۔ اسے لڑنا تھا خود سے!

☆☆☆

اور پھر یہ وہی میدان ہے جہاں اندھیر چادر کے قلب سے پھوٹتی نیلی روشنی نے دو ماہ قبل وہ منظر دیکھا تھا جب پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے وہ منہ کے بل گری تھی۔ آنکھ کی محراب سے خون نکلا تھا۔ ہاتھ چھل گئے تھے، گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی۔ آج۔۔۔ آج دو ماہ بعد وہ اسی میدان میں اسی طرح بلکہ اس سے بہتر رفتار میں دوڑ رہی تھی۔ وہ لڑکھڑائی نہیں تھی۔۔ وہ گری نہیں تھی۔۔ اس کی ٹانگیں شل نہیں ہوئی تھیں، نہ سانس پھولا تھا۔

"نیچے!!" تیز آواز پر اس نے بھاگتے ہوئے قلابازی کھائی تھی۔ ایک دو تین یکے بعد دیگرے کئی قلابازیاں کھاتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھی اور دوبارہ دوڑنے لگی۔ منزل پر پہنچ کر وہ رکی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔۔ کسی فاتح کی طرح وہ خوشی سے چلائی تھی۔

"میں نے کر لیا جندل!!!" دور کھڑا جندل اپنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔۔ ٹھیک پانچ منٹ!

اس کے ہاتھ بالکل سیدھے تھے۔ پیشانی چمک رہی تھی۔ نگاہیں بالکل نشانے پر تھیں۔ سانس روک کر اس نے ایک لمحے کا وقفہ کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ تیز آواز کے ساتھ ایک گولی پستول سے نکل کر ہوا کو چیرتی ہوئی جندل کے ہاتھ میں موجود کانچ کی بوتل سے ٹکرائی تھی۔ کانچ چھناکے سے کرچی کرچی ہوا تھا۔ اس نے سانس روکے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔۔ مسکراتے ہوئے اس نے کندھے اچکا دیے۔ وہ کر چکی تھی۔۔ دو ماہ کی کڑی مشقت کے بعد۔۔۔ وہ کامیاب ہو چکی تھی۔۔!

"لوکیشن بھیج رہا ہوں۔ کل وقت پر وہاں چلی جایئے گا۔ میں آج جا رہا ہوں تو اگلا ایک ماہ آپ کسی اور کی شاگردی میں رہنے والی ہیں۔" وہ پستول میں میگزین ڈالتے ہوئے اسے اطلاع دے رہا تھا۔

"تو کیا ٹریننگ ختم نہیں ہوئی؟" اس نے ٹھہر کر جندل کو دیکھا۔

"یہ شروعات تھی۔ اب جو آپ سیکھنے والی ہیں، وہ آپ کی حقیقی معنوں میں نیندیں اڑانے والا ہے۔" وہ اسے ڈرا رہا تھا۔۔۔ اور وہ۔۔ نہیں ڈر رہی تھی۔ جب اتنا سب کچھ کر چکی تھی تو اس ایک ماہ میں اس کا کیا بگاڑا جا سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کب آؤ گے؟"

"اب آپ کو یہ سوال پوچھنا چھوڑ دینا چاہیے۔" وہ سر پر پی کیپ ٹکا رہا تھا۔

"اوکے۔ تمہاری پڑھائی کب ختم ہو گی؟" وہ سینے پر ہاتھ باندھے استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ جندل نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"نہیں جانتا۔ جلد لوٹوں گا ان شاء اللہ۔۔۔ اب اجازت دیں۔" وہ سر کو خم دیتا آگے آیا۔ سعاد نے آگے بڑھ کر اس کی ٹیڑھی پی کیپ ٹھیک کی۔ "اللہ کی امان میں۔" اس نے ایک مسکراتی نگاہ سعاد پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے دور تک جاتا دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ جا چکا تھا۔۔۔ اور جلد لوٹنے والا تھا۔

☆☆☆

"کیسی ہیں؟" وہ کافی کا کپ لیے زینوں پر بیٹھی تھی جب کوئی اس کے برابر میں آکر بیٹھا۔ اس نے گردن ترچھی کر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اس آواز کو پہچانتی تھی تبھی سکون سے کافی کا کپ کبوں سے لگا گئی۔

"ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟" کافی کا گھونٹ بھر کر اپنے اور اس کے درمیان میں زینے پر رکھا۔

"اچھا ہوں۔ سوری کہنے آیا تھا۔"

"کہو۔" وہ سنجیدہ تھی۔۔ بالکل سنجیدہ۔۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو دکھ پہنچایا۔ مگر اب تو آپ سب حقیقیت جان گئی ہیں ناں؟" اس کے پوچھنے پر سعاد نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کے برابر میں بیٹھا۔۔ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتا۔۔ ضرار ولید! وہ لوٹ آیا تھا۔

"ہاں۔۔ لیکن تم سے معافی نہیں مانگوں گی۔ موقعے کی مناسبت سے میرا ردعمل بالکل ٹھیک تھا!" اسے اپنی انا بہت عزیز تھی۔ سر جھکنا نہیں چاہیے، عزت نفس مجروح نہ ہونے پائے!

"میں کبھی نہیں چاہوں گا آپ کی انا کو میری وجہ سے ٹھیس پہنچے۔" وہ مسکرایا۔ سعاد نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ "آپ کے ہاتھ۔۔۔" اس نے اس کی توجہ اس کے ہاتھوں کی طرف دلائی۔ اس نے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ ان پر جگہ جگہ خراشیں تھی۔ کہیں کہیں سے جلد بھی پھٹی ہوئی تھی۔۔ یہ ہمیشہ سے۔۔ ایسے نہیں تھے۔ یہ بہت نرم و نازک تھے۔۔ مگر اب۔۔ یہ سخت مشقت کے عادی سخت ہاتھ بن چکے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرادی۔

"ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب یہ کسی نازک لڑکی کے ہاتھ نہیں ہیں، یہ سخت محنت کش ہاتھ ہیں۔"

"آپ بہت بدل گئی ہیں سعاد"!

"شاید۔۔" وہ کندھے اچکا گئی۔ پھر کچھ یاد آنے پر ٹھہر کر اسے دیکھا۔ "کیا تم اب بھی جواب نہیں دے سکتے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے سر جھکا گیا۔

"وہ ٹریپ تھا۔ ایئرپورٹ پر۔۔ الزرقاوی سر کی آمد سے پہلے میں دس افراد کو وہاں بھیج چکا تھا۔ جب ٹریپ کے بارے میں پتہ چلا تھا تو وقت بہت کم تھا۔ تین بم موقعے پر پکڑ لیے اور جو آخری رہ گیا اس نے تباہی مچا دی۔ ان دس افراد میں سے صرف دو لوٹ پائے تھے۔ عوام کا جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔۔ وہ بس زخمی ہوئے تھے"!

"آئی ایم سوری۔۔۔" وہ پشیمانی سے لب کچلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کس لیے؟"

"تھپڑ کے لیے۔۔"

"آپ ہمیشہ سے ایسی تھیں، میں عادی ہو چکا ہوں۔" وہ ہنس دیا۔ ذرا سا سر جھکا کر وہ مسکرا دی۔۔۔

☆☆☆

وہ اگلے دن جندل کی بھیجی گئی لوکیشن کے مطابق اس گھر کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ اپنے ڈھانچے سے یہ اس کالونی میں بنے گھروں جیسا ایک گھر ہی تھا۔ اس نے گھنٹی بجائی اور کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آئی تو خلاف توقع یہ ایک معمولی گھر کے بجائے چھوٹی سی ایجنسی معلوم ہوتی تھی۔ باغیچے سے گزر کر وہ اندر آئی تو کسی نے اسے اس کی منزل بھی دکھا دی۔ راہداری سے گزر کر وہ اس آفس کے دروازے کے باہر کھڑی ہوئی۔ اس کی دستک پر مثبت جواب آیا اور وہ اندر آ گئی۔ آفس کا ماحول ایئرکنڈیشنڈ تھا۔ سامنے شیشے کی میز رکھی تھی اور میز کے پار ایک لڑکا اس کی طرف پشت کیے کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی آگے آئی۔

حسب معمول عبائے میں ملبوس، چہرے کو حجاب کے ہالے میں قید کیا ہوا تھا۔ اس کے کھنکھارنے پر وہ لڑکا موبائل کان سے لگائے پلٹا تھا۔ اس لڑکے پر نگاہ پڑتے ہی اس کی چیخ نکلی تھی۔

"تم!!!" اس کے حیرت سے چلانے پر لڑکے نے ناگواری سے اسے دیکھا اور موبائل کان سے ہٹا کر میز پر پٹخا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔

"وہی جو تم کر رہی ہو۔" اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے جواب دیا تھا۔ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ "کام کی بات کرتے ہیں۔ میرا نام خیام حنفی ہے۔ ایک ماہ تک تمہیں استاد کی خدمات دے رہا ہوں۔ تو وقت ضائع کیے بنا ہم شروع کرتے ہیں۔" وہ سنجیدہ تھا بالکل سنجیدہ۔۔ اور سعاد۔۔ وہ حیران تھی بے حد حیران۔۔ اس کے ساتھ بہت برا مذاق ہوا تھا۔

"مجھے یقین کرنے دو کہ تم خیام حنفی تم! وہ نکما، نالائق لڑکا جو میرے بھائی کے ساتھ مل کر اسکول اور کالج میں لڑکوں کی ہڈیاں توڑتا تھا، کالج کی دیواریں پھلانگتا تھا۔۔ تم حزب اللہ میں سے ہو؟! تم جندل کے ساتھ ہو؟!" خیام نے ٹھہر کر پہلے نکمے اور نالائق والی تعریف ہضم کی پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب یہی نکما تمہارا استاد ہے۔ عزت سے پیش آؤ!" حکم دیا گیا تھا۔ رعب جمایا گیا تھا، وہ مرعوب ہوئی تھی۔ آخر کار جو بھی تھا، وہ اس کا استاد تھا!!

خیام نے اسے خاموش دیکھ کر پاس پڑے ایک کاغذ کو مروڑا پھر اس کی طرف اچھالا۔ وہ مہارت سے اسے پکڑ گئی۔

"آپ ایک بند کمرے میں ہیں، کاغذ کا یہ ٹکڑا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دروازے کے پار سے آپ کو کچھ قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ کوئی کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ یہ کاغذ آپ کو چھپانا ہے، چھپائیں!" وہ سنجیدگی سے کہتا سینے پر ہاتھ لپیٹ گیا۔ وہ چند لمحے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھتی رہی پھر ایکدم اچھلی۔

"وہ دیکھو چڑیا۔۔" اس نے خیام کے عقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ وہ نہیں مڑا۔۔ خاموشی سے۔۔ سنجیدگی سے۔۔۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔۔

"آپ ایک بند کمرے میں ہیں۔ وہاں کوئی کھڑکی کھلی نہیں ہے کہ چڑیا نظر آسکے!" وہ خجل ہوئی۔ خجلت سے ٹھوڑی کھجائی۔ پھر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ کاغذ کو زور سے مٹھی میں بھینچا۔ اسے تروڑا، مروڑا۔ پھر اسی کے سامنے۔ ۔نہایت بہادری سے اسے منہ میں ڈال کر نگل لیا۔ خیام نے پلک جھپکی۔ آگے آیا۔ دونوں ہاتھ میز کے کناروں پر ٹکا کر ذرا سا جھکا۔ "آپ نے کاغذ پر لکھا پیغام نہیں پڑھا، آپ اسے ہرگز ضائع نہیں کر سکتیں!" اسے کھانسی آئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگی۔ خیام نے سپاٹ چہرے کے ساتھ میز پر رکھا پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ گلاس تھام کر لبوں سے لگا کر غٹا غٹ ایک ہی سانس میں پانی پی گئی تھی۔

"یہ لو۔" ایک اور کاغذ کا ٹکڑا اس کی طرف پھینکا گیا تھا۔ وہ مہارت سے اسے پکڑ گئی۔ وہ اپنا موبائل میز سے اٹھا کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایک نظر اس ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والے لڑکے پر ڈال کر کاغذ کے ٹکڑے کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں میز پر۔۔ چند فائلیں رکھی تھیں۔ ایک لیپ ٹاپ، پانی کا گلاس۔۔ چند قلم۔۔ خیام کی رسٹ واچ، اور بس۔۔ وہ چند لمحے سب کو دیکھتی رہی پھر کاغذ کو مروڑا۔ اسے بالکل مروڑ کر فائل کھولی۔ اور فائل کے قلب میں کنارے پر چھپا دیا۔ وہ کاغذ فائل کے قلب میں سفید رنگ کے کور میں گھل مل گیا۔ اس نے ہاتھ جھاڑے۔ گلا کھنکھارا۔ خیام نے موبائل سے سر اٹھا کر گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ پھر موبائل جیب میں اڑستا آگے آیا۔ ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ میز کے آگے درمیان میں کھڑی تھی۔ درمیان میں لیپ ٹاپ رکھا تھا اور نیلے رنگ کی فائل! اس نے اگلی نگاہ اس کے ہاتھ پر ڈالی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ فائل کی سیدھ پر میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ

آگے آیا فائل کھولی اور پلک جھپکنے میں وہ کاغذ برآمد کرلیا۔ وہ جو کچھ دیر قبل آنکھوں میں انوکھی چمک لیے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی، دم بخود رہ گئی۔

"جب کچھ چھپاتے ہیں، تو اپنا مقام بھی تبدیل کر لیتے ہیں مادام!" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کرسی سے ذرا ٹیک لگا کر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سعاد نے منہ بسور کر اسے دیکھا تھا۔ یہ لڑکا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔۔ بالکل بھی نہیں!!

☆☆☆

"وہ نکما نالائق خیام حنفی! غیر ملکی اور اجنبی لڑکا جو صرف لوگوں کی ہڈیاں توڑنا جانتا ہے۔ جانے کتنی بار کالج سے نکالا جا چکا ہے۔ کالج کا کوئی چور راستہ ایسا نہیں جو اسے معلوم نہ ہو، کوئی دیوار ایسی نہیں جو اس نے نہ پھلانگی ہو۔ وہ خیام حنفی جس نے تمہارے ساتھ مل کر لڑکوں کو پیٹنے پر مجھ سے تھپڑ کھایا تھا اب میرا ہی استاد بن بیٹھا ہے؟! خدا گواہ ہے اس سے برا مذاق آج تک کسی نے نہیں کیا میرے ساتھ!" وہ تڑخی تھی۔

"فکر مت کریں آپی! وہ شریف لڑکا ہے خواتین کے سامنے باز رہتا ہے۔" جندل کے پرسکون انداز میں کہنے پر وہ کلس کر رہ گئی تھی۔

اگلے ایک ماہ میں میں نے خیام سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ تالے کھولنا، اداکاری کرنا، آواز بدلنا، حالات پر قابو پانا، کوڈ ورڈنگ سمجھنا، جھوٹ بولنا اور کمال مہارت سے بولنا، اپنا بچاؤ کرنا، لوگوں کی ہڈیاں توڑنا۔۔(خیام نے ہڈیاں توڑنے والا سبق اسے تفصیلاً پڑھایا تھا۔ کون سی ہڈی ٹوٹنے سے انسان جاں بحق ہوتا ہے، کس سے معذور ہوتا ہے، کس سے موت کا سا درد محسوس کرتا ہے۔ خاصا تجربہ رکھتا تھا وہ اس سب میں آفٹر آل!)

ایک ماہ بعد میں بالکل تیار تھی۔ جندل واپس آچکا تھا اور میں اس کے ساتھ ایجنسی گئی تھی۔ میں بس حزب اللہ میں

سے ہونے والی تھی۔۔!

میں آفس میں الزر قاوی سر کا انتظار کر رہی تھی۔ میرے دائیں طرف جندل کھڑا تھا اور بائیں طرف خیام! مجھے مستقبل میں کیا کرنا تھا اس سب کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ کچھ دیر کے بعد الزر قاوی سر اندر آئے۔ وہ بلند قامت شخص۔۔وہ چہرہ۔۔ میں لاکھوں انسانوں کے ہجوم میں پہچان سکتی تھی۔ کچھ دیر پہلے الزر قاوی سر میرے لیے اجنبی تھے۔۔ مگر اب میں انہیں بہت اچھے سے جانتی تھی!

میں سعاد یوسف زئی۔۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی اور دو بھائیوں کی اکلوتی بہن! میرا بھائی جندل اور دوسرا بھائی۔۔ جو ابھی حال ہی میں اس دنیا میں آیا تھا۔ میں اس کا نام نہیں جانتی کیونکہ وہ صرف دو دن کا تھا جب وہ ہم سے بچھڑ گیا اور اس وقت وہ بے نام تھا! وجہ بتاتی ہوں۔۔ وہ ستمبر کا مہینہ تھا۔۔ یکم ستمبر جب آغا جان کے ساتھ بحری سفر پر گیا جندل تنہا لوٹا تھا۔ اسے یہاں لانے والا کون تھا؟ وہ آٹھ سالہ جندل تنہا یہاں تک کیسے پہنچا میں نہیں جانتی۔ بس اس نے آتے ہی اطلاع دی تھی کہ آغا جان سمندر کی آغوش میں جا سوئے ہیں۔ یہ خبر ہمارے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ تبھی اس دوران کسی کو بھی میرے چھوٹے بھائی کا خیال نہیں آیا۔ ٹھیک دو دن بعد یعنی تین ستمبر کی رات مجھے بہت زیادہ گرمی محسوس ہوئی۔ میرا بستر جل رہا تھا۔ ہمارے گھر میں آگ لگ چکی تھی، کیسے؟ میں نہیں جانتی! جندل بھاگتا ہوا میرے کمرے میں آیا تھا۔ ہم نے لوہے کی کوئی بھاری چیز اٹھا کر کھڑکی کے شیشے کو توڑا تھا۔ کھڑکی کے نیچے چند لوگ ہمارے منتظر تھے۔ جندل نے فوراً سے پہلے جست لگائی تھی۔ میں ابھی وہی کھڑی تھی کہ۔۔ میں نے دیکھا تھا ایک شخص۔۔ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے سڑک پار کر رہا تھا۔ اس شخص نے مڑ کر دیکھا۔ روشن آگ کی روشنی میں میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ چہرہ جس کے نقوش وقت کے طوفان بھی میرے ذہن سے نہیں مٹا سکے تھے۔

اس رات ۔۔ماں اور بابا آگ کی نذر ہو گئے۔ سب کا کہنا تھا کہ اس ننھی جان کو بھی انہی کے ساتھ موت اپنی آغوش میں لے جا چکی ہے مگر میں نے اپنے بھائی کو زندہ دیکھا تھا۔ نہ ماموں نے میرا یقین کیا نہ جندل نے! ان کے نزدیک میں بچی تھی، اتنے بڑے حادثے سے گزری تھی ۔۔ ان کے نزدیک یہ سب میرا وہم تھا! مگر اس وقت ۔۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا یہ شخص گواہی دے سکتا تھا کہ میرا بھائی زندہ تھا، یہ میرا وہم نہیں تھا۔

اس دوران وہ خیام اور جندل کے ساتھ کیا باتیں کر رہے تھے میں کچھ نہیں سن پائی۔ جب جندل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تو جو الفاظ میرے منہ سے نکلے وہ سب کو حیران کر گئے تھے۔

"الزر قاوی سر جانتے ہیں ہمارا چھوٹا بھائی زندہ ہے! یہ وہی ہیں جنہوں نے اس رات اسے وہاں سے نکالا تھا۔"

جندل نے میرا یقین نہیں کیا۔ خیام کو میں صدمے کے زیر اثر لگی۔ الزر قاوی سر خاموش رہے ۔۔ انہوں نے مجھے جانے کا کہا۔ خیام مجھے لے کر باہر آ گیا۔ کافی دیر کے بعد جندل آفس سے نکلا۔ اس نے مجھے بس یہ اطلاع دی کہ ۔۔۔ میں غلط نہیں ہوں۔ ہمارا بھائی زندہ ہے، صحیح سلامت ہے۔ مگر ہم سے مل نہیں سکتا!

میں بہت چلائی تھی۔ میں نے بہت واویلا مچایا تھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے جندل پر حیرت تھی وہ الزر قاوی سر کے ایک حکم پر اپنے بھائی کو بھلانے کے لیے تیار تھا ۔۔!

"سعاد ۔۔ اگر سر ایسا کہہ رہے ہیں تو یقیناً کوئی ٹھوس وجہ ہو گی۔ کیا تم تھوڑا پر سکون ہو سکتی ہو؟"

"وہ بھائی ہے میرا!! سالوں میں نے امید رکھی ہے کہ ایک دن ہم ملیں گے اور اب جب سب کچھ واضح ہے تو میں کیسے اس سے نہیں مل سکتی؟" خیام نے مجھے بہت سمجھانا چاہا تھا۔ جندل ایک طرف خاموش کھڑا تھا ۔۔ کیونکہ وہ اگر بولتا تو تھپڑ کھاتا! مجھے ایک لمحے کے لیے اس سے نفرت ہوئی تھی ۔۔ بے پناہ نفرت۔ وہ اپنے بھائی پر کیسے کومپرومائز کر سکتا ہے، کیسے؟!

مگر وہ کر چکا تھا۔ یہی طے ہوا کہ جب وقت آئے گا تو ہم جلد ملیں گے۔ میں اور میرا بھائی! مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں تھا۔ میں ضد پر ڈٹی رہی۔ میں نے ایجنسی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کبھی حزب اللہ میں شمولیت اختیار نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ کرسی پر بیٹھی اپنے سامنے غصے سے ٹہلتے خیام کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پریشان تھا، کچھ سوچ رہا تھا۔۔ غصے میں تھا۔ وہ بار بار رک کر ایک سخت نگاہ سعاد پر ڈالتا جس پر وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیتی تھی۔ جندل میز کے ایک طرف سینے پر ہاتھ باندھے خاموشی سے کھڑا تھا۔ اس وقت وہ تینوں سخت ذہنی دباؤ میں تھے۔ جندل کے لیے یہ اپنی تنظیم کا معاملہ تھا، سعاد کے لیے یہ اپنے بھائی کا معاملہ تھا اور خیام کے لیے یہ۔۔۔

"سعاد ایک بار پھر سوچو۔ تم واقعی تنظیم میں شامل نہیں ہونا چاہتیں؟" وہ ٹھہر گیا۔ اس کے آگے میز پر دونوں ہاتھ ٹکائے ذرا سا جھکا۔ سعاد نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"مجھے میرا بھائی چاہیے۔" وہ اپنی ضد پر ڈٹی ہوئی تھی۔ خیام نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"میں نے تم پر بہت محنت کی ہے سعاد!" وہ خفا ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ خیام نے اس کے جواب پر اپنا سر گرایا۔ بال پھسل کر پیشانی پر جا گرے۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو۔ جو تمہیں آتا ہے وہ ضائع نہیں ہو گا۔ کبھی نہ کبھی۔۔ کسی نہ کسی طرح یہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ یہ تمہیں بچاتا رہے گا۔۔ مگر وعدہ کرو جو تمہیں آتا ہے کبھی اس کا غلط استعمال نہیں کرو گی!" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے تاکید کر رہا تھا۔

"نہیں کروں گی۔" اس نے سر کو جنبش دی۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ اپنا رخ جندل کی طرف کیا۔

"تم کیا کہتے ہو؟"

"اس سے کہیں اپنا منہ بند رکھے۔" جندل کے کچھ کہنے سے پہلے سعاد نے بلند آواز میں کہا تھا۔ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ "کل اگر کوئی اسے اپنی بہن کو چھوڑنے کا کہے گا تو یہ تنظیم کی خاطر وہ بھی کرلے گا۔ ہے ناں؟"

اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ جندل نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

"آپی۔۔۔"

"مت کہو مجھے آپی! اس سے کہیں چلا جائے یہاں سے۔" اس کی آواز مزید بلند ہوئی تھی۔

"جندل تم جاؤ۔۔ میں بات کرتا ہوں۔" جندل نے ایک بے بس نگاہ اس پر ڈالی پھر آفس کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہونے پر خیام آگے بڑھا اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر میز پر رکھے۔

"جندل پر غصہ ہو؟"

"نہیں ہونا چاہیے؟" وہ تڑخی۔

"سعاد۔۔۔ ٹھنڈے دماغ سے میری بات سنو۔ تم تھوڑا سا پرسکون ہونے کی کوشش کرو۔۔" اس نے پانی کا گلاس سعاد کی طرف بڑھایا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد گلاس تھام کر لبوں سے لگا گئی۔ پانی پی کر اس نے گلاس میز پر رکھا پھر گہری سانس لے کر سر سیٹ پر ٹکا دیا۔

"جندل سے بدلہ لینا چاہتی ہو؟" وہ چونکی۔ سر اٹھا کر کم فہمی سے اسے دیکھا۔ "اس نے سالوں تم سے اپنے حزب اللہ میں ہونے کی بات چھپائی۔ اور اب تمہارا ساتھ دینے کے بجائے تنظیم کا ساتھ دے رہا ہے۔ تم کچھ نہیں کرو گی؟" بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ اس ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والے لڑکے کے دماغ

میں بہت کچھ چل رہا تھا۔۔ کچھ ڈیئرنگ سا!

"میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ تجسس سے آگے ہوئی۔ خیام مسکراتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا گیا۔

"میرے ساتھ کام کرو۔"

"میں منع کر چکی ہوں، حزب اللہ میں نہیں آؤں گی۔" اس نے پہلو بدلا۔

"میں تمہارے انکار کا احترام کرتا ہوں۔ تمہیں کوئی حزب اللہ میں آنے کا نہیں کہہ رہا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے کا کہہ رہا ہوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔۔ مسلسل مسکرا رہا تھا۔۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"کیسے؟"

"سعاد تم جسمانی طور پر ہم سب سے کمزور ہو مگر یہاں سے۔۔" اس نے دماغ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب کے پاس ایک جیسا ہے۔ تم یہاں سے ہم سب کو مات دے سکتی ہو! جو جندل نے تمہیں سکھایا ہے وہ کوئی بھی سیکھ سکتا ہے۔ مگر جو تم نے اس ایک ماہ میں سیکھا ہے، وہ سب کے لیے نہیں ہے۔ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گی۔ تم دماغ سے کھیلو گی۔" وہ سنجیدہ تھا، بے حد سنجیدہ۔۔ وہ اس کی بات کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔۔

"میں جندل کو نہیں بتاؤں گی کہ میں تمہارے ساتھ کام کر رہی ہوں □۔ حساب برابر۔۔ اور میرا کام ہتھیار اٹھانا بھی نہیں ہو گا۔ میں ہیکنگ میں مہارت حاصل کرنے جا رہی ہوں؟" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہتی اختتام میں پوری بات سمجھ آنے پر مسکرائی تھی۔۔ کھل کر۔۔ جوش سے۔۔

"بالکل! میں اپنی محنت تمہیں ضائع کرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں مزید بہت سی چیزیں سیکھنی ہیں۔ اس کے بعد چاہو تو تم سب کر سکتی ہو، لیکن۔۔" لیکن کے ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ سعاد نے آنکھیں چھوٹی کر کے اس کے لیکن کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ "میری کچھ شرائط ہیں۔"

"مثلاً؟"

"تم مجھے آپ کہو گی۔ اچھے شاگرد استاد کو تم کہہ کر نہیں پکارتے!" وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ سعاد نے مسکراہٹ دبائے اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"لیکن سر نہیں کہوں گی!" اس بار خیام نے سر کو جنبش دی۔

"ہم دونوں کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہیں ہو گی! اپنے غصے کو قابو میں رکھو گی۔ پرسکون رہنے کی کوشش کرو گی"!

"بالکل بھی نہیں۔۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ آنکھوں کے کنارے سلوٹیں سی نمودار ہوئیں۔ خیام اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے کسی حکم پر سوال نہیں اٹھاؤ گی"!

"حالات پر انحصار کرتا ہے۔" وہ بے فکری سے کندھے اچکا گئی۔ خیام نے رک کر اسے دیکھا پھر ذرا سا مسکرا دیا۔

"امید ہے مجھے تمہارے ساتھ کام کر کے اچھا لگے گا۔" آہ۔۔۔ وہ خیام حنفی تھا! سیدھی بات کیونکر کرتا؟! وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ تم واقعی میرے ساتھ کام کر سکتی ہو!" سعاد نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ وہ باہر کی طرف بڑھنے لگا تھا جب وہ اسے پکار بیٹھی۔

"ایک سوال کا جواب دیں۔۔ آپ یہ سب میرے ساتھ ہمدردی کی بنا پر کر رہے ہیں یا۔۔؟" اس نے بات بیچ میں چھوڑی۔

"مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے سعاد! میں یہ سب صرف اس محنت کی وجہ سے کر رہا ہوں جو میں نے اس ایک ماہ میں تم پر کی ہے!" وہ کتنی آسانی سے اس کے منہ پر حقیقت آشکار کر گیا تھا۔ سعاد نے سر کو ذرا سی جنبش دی تھی۔ اسے اب۔۔۔ اس کی بھی عادت ڈالنی تھی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی کے پاس کھڑی بغور نیچے گلی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی۔ موسم بھی اداس اداس سا تھا۔ ہر طرف عجب خاموشی کا راج تھا۔ نیچے سڑک پر گلی میں اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ گلی کے کونے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کے معصوم قہقہے، ان کا کھلانا۔۔ وہ کسی آزاد پنچھی کی مانند تھے۔ ہر فکر سے آزاد بچے۔۔۔ معصوم بہت معصوم۔۔!

وہ بغور انہیں دیکھے گئی۔ بنا پلک جھپکے، سانس روکے۔ کوئی اس کی محویت میں مخل ہوا۔ اس کی سماعت سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز ٹکرائی۔ وہ فوراسیدھی کھڑی ہوئی۔

”وہ تمہاری طرف آرہے ہیں۔ کوشش کرنا دس منٹ تک انہیں روکے رکھو!“ اس کے کان میں لگے آلے سے آتی مردانہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی، بالکل بھی نہیں تھی۔ وہ تیزی سے کھڑکی بند کرکے کمرے سے باہر آئی۔ زینے پھلانگ کر اس نے جیسے ہی لاونج میں قدم رکھا تو تین اسلحے سے لیس افراد کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ چہروں کو ڈھکے وہ اپنی پستولوں کا رخ اس کی طرف کیے کھڑے تھے۔ اس کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔

”کوئی ہوشیاری مت کرنا۔ چیخنے کی کوشش کی تو پستول چل جائے گی!“ اسے دھمکی دی گئی۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے ایک اور قدم پیچھے ہٹی۔

”ڈرنا نہیں ہے سعاد! اس ڈر سے لڑنا ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک تمہیں اپنی حفاظت کرنا آتی ہے۔ پیچھے مت ہٹو۔ تمہیں انہیں روکنا ہے۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ اس نے زور سے آنکھیں میچی تھیں۔

”پاس آؤ اور کوئی ہوشیاری نہیں!“ بیچ میں کھڑا وہ شخص شاید ان کا سربراہ تھا۔ وہ پیلے پڑتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔ اپنی جگہ جم کر کھڑی رہی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں۔ ہتھیلیاں نم پڑنے لگیں۔ اس خاموشی

میں۔۔ وہ اپنی منتشر ہوتی دھڑکنوں کا شور سن سکتی تھی۔ اپنی سانسوں کی گرمائش محسوس کر سکتی تھی۔

"سعاد دھیرے سے قدم اٹھاو۔ آگے بڑھو۔ تم انہیں روک سکتی ہو۔ تم بہت بہادر ہو سعاد!" وہ اسے کسی بچے کی طرح بہلا رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر دوسرا۔۔

"ان سے دو قدم کے فاصلے پر رکو۔۔ ٹھیک دو قدم سعاد"!

"میں۔۔ نہیں کر سکتی۔۔" اس نے دبی دبی سی سرگوشی کی تھی۔

"تم کر سکتی ہو! تم کر لوگی بالکل کروگی۔ نظریں سامنے گاڑے رکھو، گردن سیدھی، کندھے ڈھیلے نہ پڑیں۔ ٹھیک دو قدم کے فاصلے پر"!

"جلدی کرو۔۔!" وہ شخص اب چلا اٹھا تھا۔ اس نے اپنے قدم بڑھائے۔ ٹھیک دو قدم کے فاصلے پر وہ ٹھہر گئی۔

"تم نشانے پر ہو۔ بالکل نشانے پر! جھکو اور اس کا نشانہ چونکنے دو۔ بائیں طرف والے کا بازو مروڑتے ہوئے پستول پکڑو اور سامنے والے کے پیٹ میں لات مارو ساتھ ہی پستول کے پچھلے حصے سے سر پر وار کرو۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی تیسرے آدمی کا نشانہ لے لو۔ خبردار گولی مت چلانا"!

پستول کی نال اس کی پیشانی کو چھونے لگی تھی۔ ٹریگر پر زور پڑا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سانس روکا اور جھکی۔ نشانہ خطا گیا۔ اس نے بائیں آدمی کے بڑھتے بازو کو مروڑتے ہوئے پستول چھینی اور پہلے والے کے پیٹ میں پوری قوت سے لات مارتے ہوئے پستول کے پچھلے حصے سے اس کے سر پر وار کیا۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے تیسرے آدمی کا نشانہ لے لیا۔

"خبردار جو کوئی آگے آیا۔" اس نے خود میں۔۔ ایک الگ سی جان محسوس کوئی تھی۔ الگ سی طاقت۔۔ اس کی آواز بلند تھی اور گردن بالکل سیدھی۔ کندھے ڈھیلے نہیں پڑے تھے، بازو سیدھا تھا ہتھیلیوں پر پسینہ نہیں تھا۔

نشانہ بالکل سیدھ میں تھا۔

"دیکھ کیا رہے ہو نالائق فائر کرو۔۔۔!" سربراہ چلایا تھا۔

"سعاد فائر!" اس نے ٹریگر پر زور دیا۔ عین موقع پر وہ شخص جھک گیا۔ نشانہ خطا گیا۔ وہ فوراً سے پہلے دروازے کی اوٹ میں ہوئی تھی۔

"وہ فائرنگ کر رہے ہیں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"جوابی فائر مت کرنا!" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے دروازے پر سر ٹکایا تھا۔ ایک۔۔ دو۔۔ تین۔۔ اور پھر ایک اور گولی چلی تھی۔ مگر یہ گولی باہر سے آئی تھی۔ چھناکے سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا۔ دروازے کی طرف بڑھتا وہ شخص ٹھیک کندھے پر گولی لگنے سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"باہر سے کوئی مدد کو آن پہنچا ہے۔ فوراً بھاگو!" ان میں سے ایک آدمی چلایا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ایک اور فائر ہوا۔ دھڑام سے ایک اور شخص زمین پر ڈھیر ہوا۔ تیسرے نے راہ فرار اختیار کرنا چاہی مگر اسے بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ فائرنگ رک گئی۔ ہر سو خاموشی چھا گئی۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔۔ چپ چاپ خاموشی سے۔۔ آنکھیں میچے۔۔ اس کے قدموں میں ان زخمی افراد کا خون گر رہا تھا۔ اس کی چپل خون آلود ہونے لگی تھی۔ گرم اور سرخ خون کے احساس نے اسے سانس روکنے پر مجبور کیا تھا۔ باہر زور سے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا۔ وہ وہیں دروازے سے لگ کر نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اسے کئی بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ نہ کھلنے پر وہ دیوار پھلانگ کر آئے تھے۔ بھاری بوٹوں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ وہ ایک نہیں تین تھے۔۔ پورے تین افراد!

"آپی۔۔" جندل بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔ اس کے۔ قدموں میں گرا خون۔۔ اور وہ زخمی افراد۔۔ وہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ "سعاد اٹھیں یہاں سے۔" کہنے والا ضرار تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ زخمیوں کا جائزہ

لیتے خیام نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی۔

”تم پر اتنی محنت کا کیا فائدہ جب تم اپنی حفاظت ہی نہ کر سکو سعاد یوسف زئی؟!“ اس کی آواز غصے سے بلند ہوئی تھی۔ جندل نے حیرت سے سعاد کو دیکھا تھا۔

”انہیں آپ نے نہیں مارا؟“ اس کی آنکھوں اور لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔

”انہیں۔۔ میں نے مارا ہے۔“ ضرار نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”لیکن کیوں؟!“ سوال پوچھتے ہوئے جندل کا لہجہ نرم تھا مگر چہرے پر سختی تھی۔ سعاد نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ”آپی جواب دیں۔۔“!

”میں نہیں کر پائی۔ میں نہیں کر سکتی۔ ٹریننگ کرنا بہت الگ۔۔۔ بات ہے اور۔۔۔ یوں مقابلہ کرنا۔۔ بہت الگ بات ہے۔۔“ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ جندل نے ایک سخت نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”کون مان سکتا ہے کہ یہ مادام اپنی ضد میں وہ سب بھی بھول تو نہیں بیٹھیں جو انہوں نے تین ماہ میں سیکھا ہے!“ خیام کا سخت لہجہ۔۔ جندل کی نظریں۔۔ اس کے بہتے آنسو۔۔ لب دانتوں میں دبائے کھڑا ضرار۔۔ ان کے قدموں میں مسلسل بہتا خون۔۔ وہ تین زندہ لاشیں۔۔ عجب پر اسرار سا منظر تھا۔ خوفزدہ کر دینے والا۔۔ ٹھہرنے پر مجبور کر دینے والا!

”ادھر آئیں۔“ وہ اس کی کلائی پکڑتا اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ اس کی سخت گرفت پر کئی آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ اسے ساتھ لیے بیسمنٹ میں آیا تھا۔ غصے سے ہاتھ مار کر بتیاں روشن کی تھیں۔ جھٹکے سے اسے درمیان میں کھڑا کر کے وہ پلٹا۔ دروازے میں کھڑے ضرار کے ہاتھ سے پستول لی اور اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

”نشانہ لیں۔۔ بالکل سامنے۔۔ تصویر کے عین قلب میں!“ اس نے ہونٹ بھینچے تھے۔ آنکھیں غصے کی شدت سے

سرخ پڑنے لگی تھیں۔ سعاد کا سر نفی میں ہلا تھا۔

"نشانہ لو سعاد!!" بلند آواز میں کہنے والا خیام تھا۔ وہ کانپ اٹھی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے پستول سیدھی کی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی مگر ہاتھوں کے کانپنے کی وجہ سے وہ نشانہ نہیں لے پائی۔ اس کے کندھے ڈھیلے پڑے۔ سر جھک گیا۔ آنسو متواتر بہنے لگے۔ جندل غصے سے دیوار پر ہاتھ مارتا باہر چلا گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔

"تم کبھی اپنے ڈر سے نہیں لڑ سکتیں!" خیام سخت نگاہ اس پر ڈالتا جندل کے پیچھے چلا گیا۔ اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ آنکھوں میں جمع ہوتے پانی نے سامنے آتے ضرار کا چہرہ دھندلا کیا تھا۔ وہ جھک کر فرش پر گری پستول اٹھا رہا تھا۔

"میں بہت بزدل ہوں۔۔" وہ روتے ہوئے اقرار کر رہی تھی۔

"اپ بہت بہادر ہیں۔ بس حالات سے نہیں لڑ سکیں۔۔"

"میں نے جندل کو ناراض کر دیا اور خیام کو بھی۔۔"

"جندل سے آپ ناراض تھیں! اور خیام کی فکر نہ کریں، اسے بس آپ کی فکر ہے۔"

"ایسے کرتے ہیں فکر؟ یوں چیخ کر چلا کر؟"!

"آپ کو اس پر غصہ ہے؟" وہ اس کے سوال پر آنسو بہاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔ ضرار نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی پستول اس کے آگے کی۔

"موقع ہے نکال لیں! جتنا زیادہ غصہ ہے، اتنے زیادہ فائر کریں۔ سمجھیں سامنے خیام کھڑا ہے اور نشانہ لے لیں۔"

وہ روتے ہوئے ہنس دی تھی۔

”یہ ہوئی ناں بات! آپ روتے ہوئے چڑیل لگتی ہیں۔“ سعاد نے ٹھہر کر خفگی سے اسے گھورا تھا۔ وہ مسکراہٹ دبا گیا۔ ”آجائیں باہر۔ معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے بھی ضرار کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

جندل معاملے کو سنبھالنے کے لیے پولیس کے ساتھ تھانے جا چکا تھا۔ خیام لاؤنج میں بیٹھا تھا، اسے باہر آتا دیکھ کر فوراً باہر کی طرف بڑھ گیا۔ ضرار نے بے بسی سے کندھے اچکائے پھر اس کے لیے پانی لینے کچن میں چلا گیا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر زینوں کی طرف بڑھی۔ دھیرے دھیرے زینے چڑھتے ہوئے وہ اپنے گال رگڑ رہی تھی۔

”سعاد پانی۔۔“ اسے اپنے عقب سے ضرار کی آواز سنائی دی۔

”آتی ہوں رکو۔“ وہ زینے چڑھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ کمرے کا دروازہ بند کیا۔ چند لمحے وہیں دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ پھر گہری سانس لے کر بیڈ پر بیٹھی۔

”کیسا رہا؟“ وہ سر ہاتھوں میں دیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ایکدم پرفیکٹ!“ خیام کی ستائش بھری آواز کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”ہم سب کو یقین دلا چکے ہیں کہ۔۔“

”کہ تم اب پہلے سے زیادہ کمزور پڑ گئی ہو۔ پہلے خوف تھا، اب ضد ہے“!

”میں ثابت کر چکی ہوں، میں آپ کے ساتھ کام کر سکتی ہوں“!

”تم اب تک کی میری سب سے زبردست شاگرد ثابت ہونے جا رہی ہو سعاد!“ وہ مسکرائی تھی۔ کھل کر مسکرائی تھی۔ دور سڑک پر پوری رفتار سے گاڑی دوڑاتے خیام کی آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری تھی۔ خیام، خیام حنفی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اپنی محنت ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

خیام کے ساتھ کام کرنا میری ضد تھی مگر رفتہ رفتہ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اس ضد کو یکسر نظر انداز کیے بس اپنی خوشی کے لیے کام کر رہی تھی۔ میں گھنٹوں اسکرین کے آگے بیٹھ کر اس کے مشن کی تفصیلات دیکھا کرتی تھی۔ کئی دن گزر جاتے تھے اور میں اپنے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالتی تھی۔ ہم ساتھ کام کر رہے تھے اور بہترین کام کر رہے تھے۔ میں جس دن کام نہیں کرتی تھی عجب بے چینی گھیرے میں لے لیتی تھی۔ خیام نے حزب اللہ میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے مجھ پر زور نہیں دیا تھا پر وہ ایسی چال چل گیا تھا کہ میں نا چاہتے ہوئے بھی حزب اللہ میں شامل ہو گئی تھی۔ اب مجھے یہ سب اچھا لگنے لگا تھا!!

جندل ایک کے بعد دوسرے مشن پر ہوتا تھا، ضرار کو اپنے کام تھے۔ رہ گئی حرم نامی میری دوست اور جندل کی جاسوسہ تو اس کا معاملہ بھی میرے کنٹرول میں تھا۔ میں خود کو بدل چکی تھی۔ جندل نے مجھے بتایا نہیں تھا پر امامہ بھی حزب اللہ میں تھی۔ جندل مجھے اس جیسا بنانا چاہتا تھا اور میں بنتی گئی۔ میں ہر طرح سے اسی کے قالب میں خود کو ڈھال گئی۔ سب بالکل ٹھیک جا رہا تھا۔۔ اور پھر۔۔

خیام تھائلینڈ چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو ماہ بعد جندل بھی چلا گیا۔ یعنی وہ دونوں ساتھ کام کرنے والے تھے۔ وہ دونوں اکثر ساتھ کام کرتے تھے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی میرے لیے مگر اس دن کچھ ہوا جو آنے والے وقت میں میری زندگی کو یکسر بدلنے والا تھا!!

مجھے خیام کی کال موصول ہوئی تھی۔۔

"تیار ہو جاو سعاد! تم تھائلینڈ آ رہی ہو۔"

”مگر ہمارے درمیان یہی طے پایا تھا کہ میں جو کروں گی یہیں سے کروں گی“!

”مجھے لگتا ہے۔۔مجھے یہاں تمہاری ضرورت ہے“!!

☆☆☆

•باب: دوم (حصہ دوم)

•آئینہ ساز

•اور جب آپ دنیا دیکھنے نکلتے ہیں

تو آپ کی راہ میں کسی بلند عمارت کی چھٹی منزل پر۔۔

کسی کھڑکی کے پاس چھپ کر بیٹھا سنائپر

آپ کا نشانہ لے رہا ہوتا ہے۔۔

یونہی اچانک آپ سے ٹکرانے والا وہ شخص۔۔

جو پی کیپ نیچے سرکاتا اپنا چہرہ چھپا چکا ہے۔۔

آپ کے دشمن کا جاسوس ہوتا ہے۔۔

وہ فقیر جو سڑک کے کنارے بیٹھا ہے۔۔

وہ اپنے کان میں لگے آلے سے سنگل ملنے کا منتظر ہے۔۔

اس کی نگاہیں آپ پر ٹکی ہوتی ہیں۔۔

اور وہ عورت جو کیری کاٹ گھسیٹتی آپ کے برابر چل رہی ہے۔۔

وہ آپ پر نگاہیں ٹکائے اپنا فون آن کر رہی ہے۔۔

لیکن یہ سب آپ نہیں دیکھ رہے۔۔

آپ دیکھ رہے ہیں راہیں کشادہ ہیں۔۔

منزل آسان ہے اور دنیا خوبصورت ہے۔۔

اس خوبصورت دنیا کے خوبصورت خیالوں میں مگن۔۔

جب آپ منزل کی طرف قدم بڑھا رہے ہوتے ہیں۔۔

تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر راستے سے ہٹاتا وہ شخص۔۔

جو آپ کو دیوار سے لگا کر آپ کے سامنے کسی دیوار کی مانند کھڑا ہے۔۔

وہ شخص آپ کا دشمن ہے کیونکہ دنیا آپ کی دوست ہے۔۔

سنائپر بے چینی سے پہلو بدل رہا ہے۔۔

وہ آپ کا نشانہ نہیں لے پا رہا آگے کوئی ہے۔۔

وہ جاسوس پریشانی سے ارد گرد دیکھ رہا ہے۔۔

وہ اپنا ہدف کھو چکا ہے۔۔

سڑک کنارے بیٹھے اس فقیر کے پیالے کو ٹھوکر لگتی ہے۔۔

وہ بڑبڑاتے ہوئے سڑک پر بکھرے سکے چن رہا ہے۔۔

وہ عورت فون پر کسی کو اطلاع دے رہی ہے۔۔

وہ آپ کو دیکھنے سے قاصر ہے اور وجہ۔۔

وہ شخص ہے جو آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا ہے۔۔

وہ شخص آئینہ ساز ہے۔۔

وہ آئینہ ساز جس کے بنائے آئینوں میں آپ دنیا دیکھ سکتے ہیں۔۔

وہ شخص آپ کا دوست ہے، دنیا آپ کی دشمن ہے۔۔

ہاں جب ساری دنیا آپ کی دشمن بن جاتی ہے تو آپ کو راہ سے ہٹانے والا وہ شخص۔۔

وہ شخص آپ کا محافظ ہوتا ہے۔۔

وہ شخص بہترین ہوتا ہے کیونکہ۔۔

وہ آئینہ ساز ہے!!

آج بادل خوب برسے تھے۔ سڑکوں کے کناروں پر خاصا پانی جمع تھا۔ جلتی بجھتی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی اس پانی پر پڑتے ہوئے کسی سنہرے جگنو کی مانند لگ رہی تھی۔ آسمان ان ویران تاریک گلیوں کی خوبصورتی پر گنگ تھا۔ بادل برس برس کر اب ہار مان چکے تھے۔ سیاہی ہر سُو پھیل چکی تھی۔ ان ویران گلیوں میں کسی ذی نفس کی موجودگی کا تصور مشکل تھا۔ گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپا چاند ان گلیوں پر روشنی ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور ایسے میں۔۔

سڑک پر جمع پانی میں کسی کے قدم پڑے۔ شڑاپ کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے وہ آواز دم توڑ گئی۔ اسٹریٹ لائٹس جو تقریباً بجھنے کو تھیں اس آواز پر بالکل بجھ گئیں۔ وہ پانی جہاں کسی کا قدم پڑا تھا، اس پر لالٹین کی سنہری روشنی پڑ رہی تھی۔ اندھیرے میں وہ ہیولا اب پانی میں پاؤں ڈالتا قدم بڑھاتا آگے جا رہا تھا۔ شڑاپ شڑاپ کی آواز ان ویران گلیوں میں چھائے سکوت پر ناگوار گزری تھی۔ پھر اس سکوت کی ناگواری کا لحاظ کرتے ہوئے آواز

دم توڑ گئی۔ وہ شخص رک گیا۔ لالٹین بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے دائیں ہاتھ سے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر ہلکی سی آہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔

"کون ہے؟" آواز سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ یقیناً وہ ہیولا اس شخص کی نیند میں مخل ہوا تھا۔ اس ہیولے نے جواب دینے کے بجائے لالٹین زمین پر رکھی۔ سر اٹھایا۔ چغے کی ہڈ سرک کر گردن کے پیچھے جا گری۔ اس شخص نے لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

"میں۔۔ دحیہ یوسف زئی!" آواز دھیمی تھی، لہجے میں تحمل تھا۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" لہجے میں ابھی بھی ناگواری تھی۔ سخت خفگی!

"سنا ہے علم کے متلاشی طالب علموں کے لیے قرطبہ دارالعلوم کے دروازے کھلنے لگے ہیں۔۔!" وہ شخص مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ۔۔ وہ چیلنجنگ تھی۔ اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ لالٹین اٹھاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ قرطبہ کی تاریک گلیوں میں پھر سے سکوت نے اپنے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

☆☆☆

"بالآخر! آپ سے ملاقات ہو گئی محترمہ۔" ایک لڑکا مکمل سیاہ لباس میں موجود سیاہ ہی نقاب سے اپنا چہرہ ڈھکے اپنی پستول منفرد انداز میں انگلیوں پر گھماتا نہایت شستہ انگریزی میں کہتا آگے آیا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے حجاب کے پار کان میں لگے آلے میں سے سبز شعائیں نکلی تھیں۔ سگنلز ملے تھے اور اسی کے ساتھ ہی کسی کی آواز کان میں لگے آلے سے نکل کر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ "وہاں کون ہے سعاد؟"

"اچھا سوال ہے مگر میں جواب نہیں دوں گا!" وہ خباثت سے مسکرایا تھا۔ اس کی نقاب سے جھلکتی آنکھیں

مسکرانے کی وجہ سے تھوڑی سی پھیلی تھیں۔

"میرے پاس مت آنا!" وہ پیچھے ہٹنا چاہتی تھی مگر چاروں جانب سے گھیرا تنگ تھا۔ وہ لڑکا ہنس دیا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"موت تو پاس آتی ہے ناں!، اسے آنا پڑتا ہے۔ روک سکتی ہیں؟"!

"کوئی جوابی وار مت کرنا! انہیں تھوڑی دیر روکے رکھو بس تھوڑی دیر"!

وہ اپنی آنکھیں میچ گئی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ بے اختیار اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

"جندل۔۔۔ پلیز آجاؤ۔۔۔ جندل۔۔۔ زیاد میں مشکل میں ہوں، براہ مہربانی آجاؤ! زیاد پلیز۔۔۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو لڑھکتا ہوا نقاب میں جذب ہوا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھتی چلی گئی تھی۔ "زیاد زیاد آجاؤ۔۔۔ جندل سنو میں مشکل میں ہوں۔" وہ رو رہی تھی۔ چاروں جانب سے اسے گھیرے میں لیے وہ آدمی بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ وہ لڑکا بغور اسے دیکھتا گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سعاد کی اردو وہ سمجھ تو نہیں سکا تھا البتہ اس کے لیے گئے نام اسے تجسس میں ڈال گئے تھے۔

"سنا تھا تم کسی جاسوس سے کم نہیں ہو! لیکن تم تو اس کے یک قلم برعکس نکلیں۔ اور یہ جن کے نام تم لے رہی ہو، ان میں سے ایک تمہارا بھائی ہوگا۔ اور دوسرا کون؟" اس لڑکے نے سرگوشی کی تھی۔ سعاد نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ آنسو ابل ابل کر آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"جندل۔۔ زیاد آجائیں۔ اللہ میری مدد کریں پلیز انہیں بھیج دیں۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ فلک کو اپنی لپیٹ میں لیتا اندھیرا اس خالی سڑک کو اپنے تنگ گھیرے میں لے رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں یہ

دیکھا جا سکتا تھا کہ۔۔

ایک لڑکی سعاد۔۔ اسلحے سے لیس افراد کے گھیرے میں بے یارو مددگار کسی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی!

اور پھر ہر پکار بے کار نہیں جاتی۔ سڑک کے سرے سے ایک تیز رفتار گاڑی نمودار ہوئی تھی۔ ان سب نے گردنیں موڑ کر اس گاڑی کو دیکھا جو اب ان کے قریب پہنچنے والی تھی۔ اور جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچی چار آدمی گاڑی کے دروازے کھولتے سڑک پر قلابازیاں کھاتے اپنی جگہیں سنبھال چکے تھے۔

"جھک جاؤ۔۔" وہ لڑکا چلایا تھا۔ ان چار آدمیوں کی طرف سے بھرپور فائرنگ ہونے لگی تھی۔ وہ لڑکا سعاد کو پیچھے ہٹاتا ایک طرف کو ہو رہا تھا جبکہ اس کے باقی ساتھ اپنی پستولیں تانے جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔

"کسے بھیجا ہے؟!" وہ سارا منظر دیکھتی دبی دبی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"ضرار کو!" اس نے اپنی نگاہیں ضرار کی تلاش میں دوڑائی تھیں۔ وہ وہیں اس دیوار کی اوٹ سے سعاد کو پیچھے ہٹاتے لڑکے کا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کے تقریباً ساتھی مر چکے تھے۔ اور تبھی اس لڑکے نے سعاد کو بازو سے دبوچتے ہوئے اپنے آگے کیا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی پر رکھی۔

"خبردار جو اب کوئی فائرنگ ہوئی ورنہ اس لڑکی کو مار دوں گا!" اس کے چلانے پر فائرنگ رک گئی۔ ضرار دیوار کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا۔ ہاتھ میں پستول تھی اور پستول لڑکے کے نشانے پر تھی۔ "پستول نیچے کرو، ورنہ۔۔۔" ضرار نے لب دانتوں میں دبائے سعاد کو دیکھا جو آنکھیں میچے کھڑی تھی۔ اسے ایک لمحے کو اس پر غصہ آیا تھا اور یہ غصہ اسی لمحے رفو چکر ہو گیا جب اچانک سے سعاد نے اس لڑکے کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر مروڑا تھا۔ ٹریگر پر زور پڑا تھا اور گولی اس لڑکے کے کندھے پر لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکا سنبھلتا ضرار اس کا نشانہ لے چکا تھا اور عین اسی لمحے کہیں فائر ہوا تھا اور ایک گولی ہوا کی رفتار سے ضرار کے بازو کو چیرتی ہوئی نکلی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے

گری تھی۔ کہیں سے کچھ آدمی بر آمد ہوئے تھے اور اس زخمی لڑکے کو لے جانے لگے۔ جاتے جاتے اس لڑکے نے مڑ کر ایک سخت نگاہ ضرار پر ڈالی تھی گویا اس کے نقوش ازبر کیے ہوئے ہوں۔ ضرار نے اپنے آدمیوں کو اشارہ دینا چاہا تھا مگر سعاد آگے آ گئی۔

"انہیں جانے دو۔۔ بس یہ لاشیں کافی ہیں!" اس کی آواز ڈبڈبائی تھی۔ وہ بے بسی سے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے آدمی اب تیزی سے ان لاشوں کو گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ صرف کچھ دیر بعد جب سڑک کے سرے سے ایک پولیس موبائل نمودار ہو رہی تھی تو سڑک بالکل خالی تھی۔ بس ذرا فاصلے پر وہ دونوں کھڑے تھے اور ان کے قدموں میں کچھ خون تھا۔

"انہیں بھی ابھی آنا تھا۔" وہ اپنے بازو کے زخم کو دباتا خون روکنے کی کوشش کرتا بڑبڑایا تھا۔

"مادام یاد رہے آپ کو پولیس فوبیا ہے۔" وہی سنجیدہ اور بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جھک کر اس کے قدموں میں گری کتابیں اٹھاتا ضرار کسی احساس کے تحت ٹھہرا۔ گردن ترچھی کر کے سعاد کو دیکھا جس کی نظریں پولیس موبائل سے اترتی پولیس پر تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف امڈ آیا تھا اور چہرہ پیلا پڑنے لگا تھا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے سے سرکتیں اس کے ہاتھوں پر ٹکیں جو اب دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے۔ "سعاد ریلیکس میں ہوں۔۔" وہ اسے تسلی دینے کے لیے آگے بڑھا۔ سعاد بے اختیار اس کا بازو دبوچتی اس کے پیچھے ہوئی تھی۔

"کیا ہوا ہے یہاں؟" پولیس انسپکٹر نے درشتگی سے پوچھا تھا۔

"یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ یہاں ڈاکو اور چوریوں سر عام گھوم رہے ہیں اور جب وہ واردات کر کے فرار ہو جاتے ہیں تو ہمارے ملک کی قابل پولیس آ کر پوچھتی ہے کہ یہاں کیا ہوا تھا؟!" اس کے کاٹ دار لہجے پر انسپکٹر

نے دانت پیسے۔

"تمیز سے لڑکے"!!

"تمیز ہی دکھارہا ہوں اور کچھ اپنی خاتون کی موجودگی کا احساس کررہا ہوں ورنہ چیخ چیخ کر پورے محلے کو بلا کر آپ کی قابلیت دکھانے کا ارادہ رکھتا تھا!" سعاد نے اس کے بازو پر زور ڈالا تھا۔ اسے خاموش ہونے کا اشارہ دیا تھا مگر وہ اپنی دھن میں کہے جارہا تھا۔ "عوام لوٹ لی جائے یا قتل کردی جائے آپ لوگوں کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بتارہا ہوں اب مزید میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ پہلے عدالت میں کیس کروں گا پھر ملک ہی چھوڑ دوں گا۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ کل کو میرے جنازے پر آکر آپ پوچھ رہے ہوں کہ مرحوم کا قتل کیسے ہوا؟!" انسپکٹر بہت مشکل سے اس کی باتیں سنتا خود کو سخت الفاظ کہنے سے روک رہا تھا۔ اور پھر اس کی نظر اس کے پیچھے چھپی سعاد پر ٹکیں۔

"یہ کون ہے؟" مشکوک نگاہوں سے دونوں کو دیکھا گیا۔

"بیوی ہے۔ آپ کہیں تو نکاح نامہ دکھادوں؟ بلکہ گواہ بھی پیش کردوں؟ واللہ میرا دماغ خراب ہورہا ہے۔ میرے راستے سے ہٹ جائیں ورنہ میں اپنی خاتون کی موجودگی کا لحاظ کیے بنا آپ سے لڑ پڑوں گا!" سعاد گنگ سی اس کی اداکاری کو دیکھ رہی تھی جو اب پولیس انسپکٹر کو پیچھے ہٹاتا اسے ساتھ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

"اپنا ایڈریس دو۔ تفتیش کے لیے آئیں گے ہم"!

"یہ فارمیلٹی بھی کیوں پوری کررہے ہیں؟"

"لڑکے اپنی زبان کو قابو میں رکھو"!

"میں تمہاری۔۔۔۔ اگر خاتون میرے ساتھ نہ ہوتیں تو چٹنی بنادیتا تمہاری۔" وہ غصے سے کہتا آگے آیا۔ کانسٹیبل کے ہاتھ سے کاغذ قلم کیا اور ایڈریس لکھ دیا۔

"اب جاؤں میں یا رات یہیں گزارنے کا حکم دے رہے ہیں؟" انسپکٹر نے سخت گھوری سے اسے نوازا پھر دانت پیستا پولیس موبائل کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد پولیس جا چکی تھی اور اسی لمحے ایک گاڑی ان کے سامنے آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے پر سعاد نے رک کر اسے سخت گھوری سے نوازا۔ وہ ذرا سی مسکراہٹ دباتا اندر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ گاڑی مختلف راستوں پر جاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆☆☆

زیاد کے اشارے پر ان دونوں نے بیک وقت اپنی کنپٹی سے پستولیں ہٹاتے ہوئے ان کا بازو مروڑا تھا۔ چیخ کی آواز کے ساتھ دونوں کے بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹی تھیں۔ تیسرا آدمی فوراً سے آگے بڑھنے لگا تھا مگر تب تک زیاد اس کی گردن پر پستول رکھ چکا تھا۔

"خبردار جو کوئی آواز کی۔۔" وہ تینوں اب ان تینوں کے زیر حراست تھے۔ جندل جھک کر زمین پر گری پستولیں اٹھا رہا تھا۔

"زیاد سب ٹھیک ہے وہاں؟" ایک لڑکے کی آواز آئی تھی۔ وہ سب چونکے تھے۔ اگر کوئی اس طرف آجاتا تو معاملہ بگڑ جاتا۔ زیاد نے تیزی سے اپنے برابر میں موجود ریک کو زوردار لات ماری تھی۔ دھڑام کی آواز سے ریک گرا اور کئی کتابیں زمین بوس ہو گئیں۔ "زیاد؟"

"سب ٹھیک ہے۔ بس یہ کتابیں گر گئی ہیں۔ میں سنبھال لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، جلدی کرو۔" انہوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"سنو تم تینوں! جان پیاری ہے تو چپ چاپ یہاں سے نکلو گے، سمجھے!" خیام نے سخت آواز میں کہا پھر وہ اور جندل ان تینوں لڑکوں کو لیے آگے بڑھے۔ زیاد کتابیں سمیٹنے لگا۔ وہ سب دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کے کندھوں پر

بازو پھیلائے باہر نکلے تھے، یقیناً اگر کوئی ان تین آدمیوں کی پسلیوں سے لگی پستولیں دیکھ لیتا تو اس دوستی پر قربان جاتا!

انہوں نے ابھی لائبریری سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی تھی۔ وہ تیزی سے دیوار کی اوٹ میں ہوئے تھے۔ اور اسی اثنا میں گولیوں کے سائے میں وہ تینوں آدمی ان کی حراست سے نکلتے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی انہیں جوابی فائرنگ کا موقع دیے بنا اور مقصد ظاہر ہے ان تین لڑکوں کو وہاں سے نکالنا تھا۔ خیام اور جندل نے تیزی سے اپنی پستولیں لوڈ کیں۔ جندل نے دیوار کی اوٹ سے اس تیسرے لڑکے کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی پشت پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ فائرنگ تھم گئی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ دو لڑکے بھاگ چکے تھے اور تیسرا جاں بحق ہو چکا تھا!!

جندل اور خیام فائرنگ کرنے والے آدمیوں کے پیچھے جانے کے بجائے اس شخص کی طرف آئے تھے جسے وہ مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟ بولو جواب دو!!" جندل اسے کندھے سے ہلاتے ہوئے سختی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی پشت سے نکلتا خون سیاہ سڑک کو سیراب کر رہا تھا۔ آنکھیں بند ہونے کو تھیں اور اسی لمحے اس کے لب پھڑ پھڑائے۔

"اس۔۔۔اس۔۔ٹیون۔۔بار۔۔بارا!" اسے خون کی قے آئی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جندل نے تعجب سے خیام کو دیکھا جو حیرت و بے یقینی سے اس مردہ شخص کو دیکھ رہا تھا یہ نام۔۔ کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برسنے لگا تھا!

اسٹیون باربارا!

☆☆☆

”آپ کیسے میرے ساتھ کیا وہ عہد بھلا سکتی ہیں قانتہ، کیسے ؟!“ وہ صوفے پر بیٹھا سر پیچھے گرائے انگشت شہادت اور انگوٹھے سے ناک کی ہڈی کو مسلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ قانتہ کسی مجرم کی طرح کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے ماحول میں تناؤ سا تھا۔ ابراہم وارلڈ، وہ اپنی بیٹی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ اس کی بیٹی کی طرف اٹھنے والے ہر ہاتھ کو وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا؛ اور اس کے لیے کھلنے والی زبان کو ہمیشہ کے لیے کاٹ دیتا تھا!! مگر اب مقابل اس کی بیوی تھی۔ اس کی بیٹی کی ماں!! ”کیا ہمارے درمیان یہ عہد نہیں ہوا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی ازابیلا پر اپنا مذہب مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرے گا؟“ وہ لب بھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ سختی تھی، ویسی ہی سختی لہجے میں تھی۔ چہرہ سپاٹ تھا، بے حد سپاٹ!

”میں۔۔۔ میں۔۔ اسے گمراہ ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔۔“ وہ بمشکل بول پائی تھی۔

”فار گاڈ سیک قانتہ! آپ کا یہ مذہب تب کہاں تھا جب میرے مذہب کو نظر انداز کر کے مجھ سے شادی کی تھی؟! میں مسلمان نہیں ہوں، میں بھی گمراہ ہوں۔ جائیں چھوڑ دیں مجھے!!“ اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ قانتہ نے سہم کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ایک عرصے بعد وارلڈ کو غصے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا مالک تھا۔ بہت پرسکون رہنے والا!!

”ابراہم آپ۔۔۔“

”میری ایک بات کان کھول کر سن لیں! آپ بیوی ہیں میری جانتا ہوں۔ لیکن ازابیلا میرا خون ہے۔ اگر بات اس پر آئی تو بھول جاؤں گا آپ کون ہیں؟! جو عہد کیا تھا اسے دہراتی رہا کریں تاکہ آئندہ ایسی غلطی سرزد نہ ہو۔ ورنہ یقین کریں میں آپ کی جان لے لوں گا! آپ کی وجہ سے آئندہ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تو ان آنسوؤں کے

خشک ہونے سے پہلے ہی میری اور میری بیٹی کی زندگی سے نکل جایئے گا!! ہم گمراہوں کے ساتھ ویسے بھی آپ کا گزارہ نہیں!" تلخ لہجے میں کہتا وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قانتہ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پتھر ہو چکی تھی۔ ابراہم کے الفاظ کافی سفاکانہ اور ظالمانہ انداز لیے ہوئے تھے۔ اس کے لہجے کی تلخی قانتہ کو اپنے حلق میں کانٹے کی طرح محسوس ہوئی۔ وہ قانتہ کے عین پاس سے گزر کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ وہی کھڑی رہی ساکت اور منجمد!

☆☆☆

"آپ ٹھیک ہیں؟" وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اندر جاتی سعاد سے پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ کئی پل وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر نگاہیں اس کے چہرے سے سرکتیں اس کے زخمی بازو پر ٹکیں جہاں سے گرتا خون سفید فرش کو داغدار کر رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ضرار! بے تحاشا خون کو دیکھنے کے بعد میں ٹھیک ہوں۔۔!" لفظ لفظ چبا کر تلخی سے کہتی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ضرار گہری سانس لیتے ہوئے اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ تیزی سے زینے پھلانگتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ضرار وہیں لاونج میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ پریشان تھا اور تھوڑا سا خوفزدہ! کیا ہوتا اگر وہ عین وقت پر نہ پہنچتا؟ سعاد اپنی ضد کی وجہ سے کبھی اپنے بچاؤ کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتی اور اور۔۔۔ آگے کچھ سوچنا ہی محال تھا۔ وہ اسے عزیز تھی، بے حد عزیز تھی۔ وہ عادی ہو گیا تھا اس کی حفاظت کرنے کا! وہ اس کے لیے بہت محترم تھی، ہمیشہ سے!!

اور سعاد۔۔۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا پھر دروازے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی۔ اس کے لیے آج کا یہ واقعہ نیا نہیں تھا، وہ اب عادی ہو چکی تھی۔ اس سب کی بھی اور ضرار کی بھی جو ہر بار اسے بچا لیتا تھا۔ یہ بھی

سچ تھا کہ اگر وہ نہ آتا تو خیام کسی اور کو بھیج دیتا کیونکہ ہر بار جب بھی وہ خطرے میں ہوتی تھی تو یہ ان دونوں کے پاس موقع ہوتا تھا جندل اور سب کو یہ باور کروانے کا کہ سعاد آج بھی اپنی ضد پر ڈٹی ہوئی ہے!!

یونہی دروازے سے ٹیک لگا کر کچھ سوچتے ہوئے اسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کبڈ کی طرف بڑھی تھی۔ اپنی مطلوبہ چیز اسے سامنے ہی مل گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ بھوری شال اٹھائی تھی جو۔۔۔ اسے یاد دلاتی تھی کہ ایک رات اس کی حفاظت کے لیے اندلس میں ایک محافظ آیا تھا!! اس نے وہ بھوری شال اپنے شانوں پر پھیلا دی۔ لب ہلکی سی تلخ مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ عین اسی لمحے اس کے حجاب کے پار کان میں لگے آلے سے نکلتیں سبز شعائیں سگنل ملنے کا پیغام دینے لگیں۔

"ضرار یہیں ہے؟"

"جی۔۔ آپ ٹھیک ہیں ناں؟ اور تیسرا آدمی ملا؟"!

"ہاں مل گیا۔۔ جانتی ہو وہ لڑکے جو لائبریری میں حملہ آور ہوئے تھے انہیں کس سے بھیجا تھا؟"

"کس نے؟" اس کی چمکتی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

"اسٹیون بار بارانے!" اس کی آنکھیں بے انتہا تعجب سے پھیلی تھیں۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکی تھی۔

"اسٹیون۔۔۔ خیام یہ وہی اسٹیون ہے؟!" اس کی آواز قدرے دھیمی تھی۔

"ہاں یہ وہی ہے۔ سعاد! یہاں کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔ تم جلدی سے ضرار کو فارغ کرو پھر بات کرتے ہیں۔"

اس کے لہجے میں کچھ بہت عجیب سا تھا۔۔ جیسے خوف۔۔ ہاں خوف۔۔۔ یہ پہلی بار تھا کہ خیام کے لہجے میں اس نے خوف کے عناصر محسوس کیے تھے۔ اس کے لیے یہ حیران کن تھا اور حیران کن سے زیادہ پریشان کن! کہ جو چیز خیام کو خوف میں مبتلا کر رہی ہے وہ واقعی بہت بری ہے!!

”مجھے بس دس منٹ دیں۔“ وہ تیزی سے کہتی کمرے سے نکل آئی۔ جب وہ سیڑھیاں اتر کر لاونج میں آئی تھی تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ ضرار اسے دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھا۔ اس نے فرسٹ ایڈ باکس میز پر رکھا پھر آگے آئی۔ بغور اس کے بازو کے زخم کا جائزہ لیا پھر باکس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اس کی تمام حرکات کا جائزہ لیتا مزید خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی زخم ہے۔“

”زخم زخم ہوتا ہے۔ معمولی یا گہرا نہیں!“ وہ اس کا زخم صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”میں نہیں مانتا! جسمانی زخم معمولی ہوتے ہیں اور روحانی گہرے!“ سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر کندھے اچکا دیے۔

”کیا فرق پڑتا ہے؟ علاج دونوں کا ممکن ہے!“ وہ اب اس کے بازو پر پٹی باندھ رہی تھی۔

”سوائے دل پر لگے گھاؤ کا!!“ اس نے زور سے پٹی پر گرہ باندھی تھی۔ وہ درد سے بلبلایا تھا۔”آرام سے ظالم۔۔“ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور گرہ باندھی گئی تھی۔۔ پورے زور سے۔۔ پوری طاقت سے! وہ درد کے مارے بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے پلٹ گئی۔

”یہ سب دل والوں کی باتیں ہیں۔۔۔“!

”تو۔۔ آپ دل والی نہیں ہیں؟!“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئی۔ لب بے چینی سے دانتوں تلے دبائے پھر آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔

”واللہ ضرار! تم دشمن کی گولی سے مرو نہ مرو میرے ہاتھوں ضرور ضائع ہو جاؤ گے اپنی اس بے لگام زبان کی وجہ سے!“ وہ اس کے تڑخ کر کہنے پر بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

”آپ جانتی ہیں میں آپ کا سب سے زیادہ احترام کرتا ہوں۔“ وہ کسی ننھے بچے کی مانند معصومیت سے اسے آگاہ کر رہا تھا کہ وہ اس کے لیے محترم تھی۔۔۔!

”بس یہی وجہ ہے کہ تم اب تک میرے ہاتھوں سے محفوظ ہو!!“ وہ سر جھٹک کر بڑبڑائی۔

”بہت ظالم ہیں یار آپ!!“ وہ ٹھہر سی گئی تھی ان الفاظ پر۔۔چونک کر ضرار کو دیکھا تھا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔وہ بے اختیار اپنی نظریں چرا گئی تھی۔وہ اس کی حرکت پر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”حرم اور احمد بھائی گھر نہیں ہیں۔اس وقت تو کھانے کی آفر بالکل نہیں کروں گی البتہ صبح ناشتہ کرنے آجانا۔“ اس نے حکم دیا تھا،رعب جمایا تھا!

”لیکن۔۔“

”اگر اگلے ایک منٹ میں تم یہاں سے گئے نہیں تو ناشتے میں زہر ملا دوں گی!“وہ اس کی بات کاٹتی درشتگی سے بولی۔ وہ رک گیا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا پھر سر کو ذرا سی جنبش دی۔

”میں کہہ رہا تھا اس کی ضرورت نہیں ہے۔اور وہ زہر ملا ناشتہ آپ کو مبارک ہو!“ اسے تپاتا ہوا وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ سعاد نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے دانت پیسے پھر نقاب ٹھوڑی پر ٹکایا۔ صوفے پر بیٹھی اور میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی الٹا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پانی کے گھونٹ بھرتی کسی سے کہہ رہی تھی کہ؛

”میں سن رہی ہوں، خیام سر“!

☆☆☆

”میں تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہاں آیا تھا۔ مجھے میکس ویل بار بارا کی چند مشکوک حرکات کی تصدیق کرنا تھی اور ساتھ ہی ثبوت اکھٹے کرنا تھے۔ مجھے کسی طرح میکس ویل بار بارا کے قریب ہونا تھا اور تبھی میری ملاقات ازابیلا سے ہوئی۔“ وہ ٹھہر گیا۔ وہ تینوں شیشے کی گول میز کے گرد رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ خیام کرسی سے ٹیک لگائے توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ عادت کے مطابق دائیں ابرو اچکا رکھی تھی۔ جندل دونوں ہاتھ باہم ملا کر میز پر رکھے آگے ہو کر زیاد پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اور زیاد۔۔ وہ دایاں بازو میز پر رکھے ترچھا ہو کر بیٹھا دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی تھا جو زیاد کی آواز سن رہا تھا۔۔ خیام کے کان میں لگے آلے کے پار دم سادھے اسے سنتی سعاد یوسف زئی!

”ازابیلا ابراہم وارلڈ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ کافی سمجھدار اور کچھ صحافت کی وجہ سے ہوشیار بھی ہے۔ میں یقیناً ازابیلا سے ہوئی ملاقات کو نظر انداز کر دیتا مگر پھر مجھے معلوم ہوا کہ ابراہم وارلڈ اور اسٹیون بار بارا کی آپس میں گہری دوستی ہے۔ ازابیلا اکثر اسٹیون کے گھر جاتی رہتی ہے وارلڈ کے ساتھ! یہ بات میرے لیے فائدہ مند تھی کیونکہ اسٹیون بار بارا میکس ویل بار بارا کا سوتیلا بھائی تھا! یہ بات پردہ راز میں رکھی گئی ہے کسی کو اس کی خبر نہیں حتیٰ کہ وارلڈ کے گھر میں بھی نہیں!

میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی جب مزید میں نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ میکس اور اسٹیون کا کم عمری میں ہی جائیداد پر جھگڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو بھائی ماننے سے انکاری تھے۔ مگر جائیداد کے جھگڑے کی وجہ سے دوریاں بڑھ گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ الزر قاوی سر ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ زیاد! اگر کسی شخص کے خلاف ثبوت اکھٹا کرنے ہوں تو اس کے دشمنوں سے گھل مل جاؤ۔ وہ تمہیں ایسا آئینہ دکھائیں گے جہاں ماسوائے اس شخص کی سیاہی کے کچھ نہ ہوگا! میں نے یہی اصول اپنایا اور ازا کا ماموں زاد بن

کر سامنے آیا۔ یہ کام میری سوچ سے بھی زیادہ آسان ثابت ہوا۔ ازا کی ماں کے گھر والے اس کی وارلڈ سے شادی کے بعد سے اس سے تعلق توڑے بیٹھے تھے اور سالوں بعد اگر اچانک اس عورت کی بہن اور بھتیجا اس سے ملنے آئیں تو وہ آگے بڑھ کر انہیں گلے لگاتی ہے۔ اس کے پاس یہ دیکھنے کی فرصت نہیں ہوتی کہ حقیقت میں اس کی بہن کسی کی پستول کی زد میں ہے۔ کوئی ہے جو زبردستی اس سے یہ کام کروا رہا ہے! کچھ ہم دونوں کے نقوش بھی حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے سے ہیں۔۔!

بہر حال۔۔ ازا کے ساتھ ساتھ وارلڈ نے بھی جلد ہی مجھے قبول کر لیا۔ ازا کے ساتھ میں با آسانی اسٹیون کے گھر جانے لگا۔ توقع کے عین مطابق مجھے وہاں سے میکس کے خلاف ثبوت ملنے لگے مگر پھر۔۔۔"

وہ رکا۔ جندل نے بے صبری سے اسے دیکھا۔ خیام دونوں بازو میز پر رکھتا آگے ہوا۔ زیاد کچھ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"مجھے اچانک میکس کے خلاف تمام ثبوت مل گئے۔ یوں گمان ہوتا تھا کسی نے وہ ثبوت مجھے مہیا کیے ہوں۔ ثبوت سب ٹھیک تھے، میکس مارا گیا۔ اور اس رات جب میں اس کا گلا گھونٹنے کے بعد اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لے رہا تھا تو وہاں اس کے بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے مجھے ازا کی تصویر ملی۔ ازا میکس کو نہیں جانتی تھی، ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا تو ازا کی تصویر میکس کے پاس کیونکر تھی؟! میرے لیے یہ حیران کن بات تھی اور پھر جان بوجھ کر میں نے وہاں واشروم میں قلم کی نوک اور خون کی بوندیں گرائیں۔ میں جانتا تھا ازا پہلی فرصت میں یہاں آئے گی اور یہ بھی کہ وہ اس قلم کی نوک کو تلاش کر لے گی۔ میں اسے اس کیس میں انوالو کرنا چاہتا تھا، تاکہ وہ خود پتہ لگائے کہ اس کی تصویر میکس کے پاس کیونکر تھی؟!

لیکن اس سے پہلے۔۔ میکس کے قتل سے دو دن پہلے۔۔ ازا کو ایک میل ملی۔ اس میل میں سالوں پہلے سمندر میں

ہوئے کسی حادثے کا ذکر تھا جس کی خبر کسی ٹی وی چینل یا اخبار نے شائع نہیں کی تھی۔ اس حادثے کا لنک جندل اللہ سے تھا اور میل کرنے والا کون تھا، میں نہیں جانتا۔ اسی رات وارلڈ کو ایک کال موصول ہوئی۔ اس کال کے صرف چند منٹ بعد ازا نے مجھے کال کی۔ وہ روئی تھی، بے تحاشا روئی تھی کہ وارلڈ نے اسے صحافت چھوڑنے کا حکم دیا تھا!! ظاہر ہے یہ قدم اس میل کے بعد اٹھایا گیا تھا۔ میں نے اس کال کو ٹریس کیا، وہ اسٹیون کے نمبر سے کی گئی تھی۔ مگر حیران کن بات یہ کہ جس وقت کال کی گئی اس وقت اسٹیون گھر نہیں تھا اور غلطی سے اس کا موبائل گھر رہ گیا تھا۔ یعنی وہ کال۔۔ اسٹیون کے گھر میں سے کسی نے کی ہے!! کال میں کہا گیا تھا کہ۔۔ ازا کو خطرہ ہے۔ اس کی صحافت کی وجہ سے ازا خطرے میں ہے!!

سمندر والا حادثہ، میکس کے پاس ازا کی تصویر، اور وارلڈ کو موصول ہوئی کال۔۔ قلم کی نوک کے ذریعے ازا کو دھمکیاں دینے والا میں تھا لیکن اب یہ قلم کی نوک میرے علاوہ بھی کوئی استعمال کر رہا ہے۔ ازا کی دوست ایملی کے بوائے فرینڈ جیک کا قتل اور پھر آج لائبریری میں ہوا حملہ! اس سب کے پیچھے جو بھی ہے وہ اسٹیون کے گھر میں سے ہے۔ اسٹیون کے دو بیٹے ہیں مارک اور مائک! اس کی بیوی ایلسا!! مجرم یا تو اسٹیون ہے یا اس کے بیٹے یا ملازمین میں سے کوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجرم ان کو آگے کر کے خود کو ہماری نظروں سے چھپا رہا ہو!!" وہ رک گیا۔ پھر گہری سانس لی۔

"تم دونوں کو میں نے بلایا ہے ۔ میکس کے خلاف جب اچانک مجھے ثبوت ملے تو سمجھ گیا تھا کہ گڑبڑ ہے۔ خیام کو تبھی بلا لیا اور جب وارلڈ کو وہ کال موصول ہوئی تو مجھے لگا اب جندل کو بھی آجانا چاہیے۔ ہم مجرم کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ اور یہ بہت مشکل ہونے والا ہے کیونکہ۔۔ ہم نہیں جانتے مجرم کا جرم کیا ہے؟"

"وہ سمندر والا حادثہ جس کا تم نے ذکر کیا، وہ کیا تھا؟" خیام نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔

"نہیں جانتا۔۔ ہمیں اس حادثے کے بارے میں بھی جاننا ہے۔ اب ہمارے شک کے دائرے میں چار لوگ ہیں۔ اسٹیون، وارلڈ، مارک اور مائیک! وارلڈ کے پیچھے خیام لگ چکا ہے، ازا کے ذریعے میں اسٹیون کے گھر تک پہنچ چکا ہوں۔۔ مگر جہاں تک میری رسائی نہیں ہے وہ ہے اسٹیون کے گھریلو معاملات! اور تم جانتے ہو کسی کے گھریلو معاملات کے بارے میں جاننا ہو تو اس گھر کا ملازم بن جانا چاہیے۔ آپ وہ دیکھیں گے جو دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے، آپ وہ سنیں گے جو دنیا نہیں سن سکتی۔ اور یہ جندل کرنے والا ہے!" جندل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لیکن میں میرین سائنس پڑھ رہا ہوں۔۔" اس نے احتجاج کیا۔

"اپنے عاشق سے طلاق لے لو، بھلے ایک لے لو بعد میں رجوع کر لینا۔" خیام زیاد کے جواب پر کھل کر مسکرایا تھا۔ جندل برے برے منہ بناتا پیچھے ہٹا تھا۔

"سنو۔۔ روفی کے ذریعے بدر کو اس سب میں کیوں گھسیٹا ہے تم نے؟" خیام نے جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال داغا۔

بدر۔۔ چن لیا گیا ہے۔ حزب اللہ کے لیے! وہ محنتی ہے، سمجھدار ہے اور سب سے بڑھ کر وہ اس دنیا میں سروائیو کرنا جانتا ہے۔ وہ سروائیور ہے!!" خیام نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ وہ قبل از وقت اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتا تھا۔

"بدر کو اپنے ساتھ کر لو۔ وہ کل آئے گا تمہارے پاس۔۔ چیختا چلاتا۔۔ تمہیں مجرم ثابت کرنے۔۔ موقع اچھا ہو گا۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ خیام نے گہری سانس لی۔ مطلب صاف تھا کہ زیاد گڑبڑ کر چکا تھا اور کچھ ایسا کر چکا تھا جو بدر کی نظروں میں اسے مجرم ثابت کرنے جا رہا تھا۔ "خبیث۔۔" وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا۔ زیاد اس تعریف پر مسکرا دیا۔

اور پھر جب وہ کافی بنانے کے لیے کچن کی طرف جا رہا تھا تو اسے اپنے عقب میں زیاد کی آواز سنائی دی۔

"سنو خیام! ازا کو میکس کے قتل کے لیے مجھ پر شک ہونے والا تھا، معاملہ صاف کرنے کے لیے میں نے تمہارا نام لے لیا۔ تم ایک غنڈے اور بد معاش ہو جس نے میرے بابا کا قتل کیا ہے!! قتل میں نے کیا ہے ثبوت مل سکتے تھے، قتل تم نے نہیں کیا ثبوت ملنا ناممکن تھے۔" وہ بات کے اختتام پر بے فکری سے کندھے اچکا گیا۔ خیام نے ذرا سی گرن موڑ کر دائیں ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"کالج کی دیواریں جندل پھلانگتا تھا اور اس کی بہن سے تھپڑ کھانے کی سعادت مجھے حاصل ہوتی تھی۔ اب قتل تم نے کیا ہے اور تمہاری کزن میرا گریبان پکڑنے والی ہے۔۔ تم جیسی ہی خبیث قوم ہوتی ہے جسے دنیا دوست کا نام دیتی ہے!" وہ تڑخ کر کہتا آگے بڑھ گیا۔ زیاد ڈھٹائی سے اپنی تعریف پر مسکرایا۔ اور اس کے برابر میں بیٹھا جندل۔۔ وہ عشق سے جدائی پر ابھی تک صدمے میں تھا!!

☆☆☆

وہ بیڈ پر آنکھیں میچے بیٹھا تھا۔ جیم اس کے بازو پر لگے زخم پر پٹی باندھ رہا تھا۔ اس کا خون تقریباً پورا گھنٹہ بہتا رہا تھا جس کی وجہ سے اب اسے نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔۔ کچھ نقاہت کی وجہ سے اور کچھ خوف کی وجہ سے۔ آنے والے وقت کے خوف کی وجہ سے! وہ اپنا کام مکمل نہیں کر پایا تھا جس کی وجہ سے وہ کٹھرے میں کھڑا ہونے والا تھا اور دوسرا اس کا بھائی مارک! اسے وہاں سے بچانے والا وہی تھا اور اب ظاہر ہے وہ پورا اسکرپٹ تیار کر رہا تھا جس میں مائک کے لیے ڈھیروں گالیوں کے ساتھ تلخ کلامی درج ہونے والی تھی۔

"بھائی کو تم نے بتایا تھا کہ میں اس لڑکی کو مارنے جا رہا ہوں؟" اس کی پٹی کر کے فرسٹ ایڈ باکس اٹھاتے جیم نے گڑبڑا کر اسے دیکھا اور تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"خدا کی قسم میں نے نہیں بتایا۔ کاش بتا دیتا۔۔ اب وہ میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔" مائک اس کے گڑبڑانے کی وجہ سمجھ گیا۔ جیم کو مائک کا نہیں مارک کا ڈر تھا۔ ذلیل انسان!!

"تم تم جیم تمہیں لگتا ہے کہ اگر بھائی تماری لاش کتوں کے آگے ڈالیں گے تو ان کے مقابلے میں مَیں تمہارے کفن دفن کا انتظام کروں گا؟! خدا کی قسم میں تمہاری لاش کو نوچنے والے کتوں کو بھی بھیڑیوں کے آگے ڈال دوں گا!!"

جیم نے سہم کر اسے دیکھا تھا۔ مائک سخت نظروں سے اسے گھورتا دروازے کی طرف متوجہ ہوا جس کے پار بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا دل ایکدم زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔ دروازہ کھلا اور مارک اندر آیا۔ تیزی سے اس کی طرف آکر اس کا گریبان پکڑ کر اسے بیڈ سے کھڑا کر کے جھٹکے سے دیوار سے لگایا۔

"میں نے کہا تھا سعاد سے دور رہو!!" اپنے دائیں ہاتھ سے مائک کے گلے پر زور دیتے ہوئے اس نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ آہ۔۔ اس کا سرد لہجہ۔۔ وہ غصے میں چیخ لیا کرے، چلا لیا کرے مگر اس لہجے میں بات نہ کرے جو انسان کو اپنا خون جماتا محسوس ہوتا ہے!!

"بھائی۔۔ میں اسے۔۔" وہ تکلیف کے مارے کچھ بول نہ سکا۔ اس کی گردن پر مارک کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔

"اگر تم وہاں مارے جاتے تو جانتے ہو کیا عذاب نازل ہوتا ہم پر؟ کون نہیں جانتا مرد مائک باربارا کو!! ہماری عزت خاک میں مل جاتی کہ اسٹیون باربارا کا بیٹا ایک لڑکی کو اغوا کرنے کے لیے دس آدمی لے کر گیا جنہیں مروا کر خود بھی مر گیا!!" مائک نے سختی سے آنکھیں میچی تھیں۔ چہرہ اس ٹھیک ٹھاک بے عزتی پر تمتما اٹھا تھا۔ مارک نے جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی۔ وہ گردن سہلاتا کھانسنے لگا۔ "شکر کرو تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ اگلی بار اس لڑکی کے

آس پاس بھی نظر آئے تو بھول جاؤں گا تم میرے بھائی ہو!" انگشت شہادت اٹھا کر اسے وارن کیا گیا۔ مائک نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ کو اس لڑکی کی اتنی فکر کیوں ہے؟ کیا لگتی ہے وہ آپ کی؟!" وہ جانے کے لیے مڑا تھا جب اس کے عقب میں مائک کی زبان پھسلی تھی۔ اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "مجھے اس لڑکی کی نہیں اس خاندان کی فکر ہے۔ اس خاندان کی عزت ہے، نام ہے جو تم خاک میں ملانے جا رہے ہو۔۔ مرد بنو مائک مرد!!" سخت آواز میں کہتا وہ جیم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔ جیم نے ترحم بھری نگاہوں سے مائک کو دیکھا۔ مائک نے جواباً اسے گھوری سے نوازا۔ وہ سٹپٹا کر کمرے سے باہر بھاگا تھا۔

"میں اس لڑکی کو مار کر ثابت کروں گا کہ میں مرد ہوں بھائی!!" اس نے دائیں ہاتھ کی بند مٹھی صوفے کے بازو سے ٹکراتے ہوئے کہا تھا۔

جیم تیز تیز قدم اٹھاتا مارک کے پیچھے آیا۔ مارک کی رفتار تیز تھی وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ تقریباً بھاگ رہا تھا۔

"سعاد کی لوکیشن مائک کو کیسے معلوم ہوئی؟" وہ ایسے ہی سوال کی امید کر تا تھا۔ مارک رک گیا۔ سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ جیم گڑبڑایا۔

"وہ۔۔ میرا دوست ہے بدر۔۔ اسے یہ کام آتے ہیں۔ بس اسی سے لوکیشن ٹریس کروائی۔" وہ کان کھجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا کرتا ہے وہ؟"

"حال ہی میں وارلڈ گلاس کمپنی میں جاب ملی ہے اسے۔" مارک نے ٹھہر کر پرسوچ نظروں سے اسے دیکھا پھر سر

کو جنبش دی۔

"اس لڑکے کا پورا ڈیٹا مجھے چاہیے اور ساتھ ہی اسے کل میرے آفس لے آو۔" وہ حکم دیتا آگے بڑھ گیا۔ جیم تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا تھا مارک اسے مائک کے پلان کے بارے میں نہ بتانے پر کھری کھری سنائے گا مگر یہاں تو معاملہ الٹا تھا۔ وہ اس معاملے میں بالکل پر سکون تھا جیسے۔۔۔ جیسے شاید اس کے پاس کوئی اور معاملہ ہو جو اس سے کہیں زیادہ توجہ طلب اور گھمبیر ہو!!

☆☆☆

وہ بھاگ رہا تھا پوری قوت کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اس کے شانے پر سفری بیگ ٹکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اسٹریٹ لائٹس کی جلتی روشنیوں میں اس کی سفید شرٹ کو داغدار کرتا وہ خون واضح دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ خون جو اس کی پسلیوں سے نکلتا شرٹ کو داغدار کرتا اس کی راہ میں بہتا جا رہا تھا متواتر و مسلسل! اس کے سفید جاگرز خون آلود ہو چکے تھے۔ اس کی چمکتی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمایاں تھیں۔ سانس پھولا ہوا تھا، دھڑکنیں منتشر تھیں مگر وہ کسی کی پرواہ کیے بنا، بنا رکے بس بھاگ رہا تھا۔

بینکاک کی تنگ اور تاریک گلیوں میں اس کے بھاگنے سے عجب سر سراہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ خون تک کو جما دینے والی اس سرد خاموشی پر اس کے بھاگتے قدموں کی چاپ چابک رسید کر رہی تھی۔ وہ انہی تنگ گلیوں کا موڑ مڑتا شہر کی مصروف شاہراہ پر آیا تھا جہاں رات کی تاریکی کہیں دور جا بسی تھی۔ ہر طرف رونقیں تھی، چہل پہل تھی۔ اس نے تیزی سے سفید شرٹ کے اوپر پہنی سبز جیکٹ کو ذرا سا سرکا کر اپنا زخم چھپانے کی کوشش کی اور بھاگنا جاری رکھا۔ بھاگتے ہوئے وہ اچانک کسی سے ٹکرایا۔ ٹکرا کر گرا۔ درد کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس سے ٹکرانے والا شخص اسے دیکھ کر چلنے کی ہدایت کر رہا تھا، جسے نظر انداز کرتا وہ تمام تر ہمت جمع کر کے اٹھا۔

ٹھہر کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں لوگوں کے جم غفیر میں بھی وہ ان بھاری بوٹوں کی آوازیں سن سکتا تھا جو عنقریب اس تک پہنچنے والے تھے۔ وہ اپنا سفری بیگ سنبھالتا تیزی سے بھاگتا ہوا فون بوتھ کی طرف آیا۔ وہاں قطار میں دو لوگ کھڑے تھے۔ اس نے جھٹکے سے دونوں کو پرے دھکیلا اور فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ پورا وجود تھر تھرا رہا تھا۔

"تم۔۔ بدتمیز یہ کیا حرکت ہے؟" اس کے دھکیلنے پر چوٹ کھانے والے وہ دونوں افراد چلائے۔ بیل جانا شروع ہو گئی۔ اس نے کسی خوف کے تحت مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ں س کچھ قدموں کے فاصلے پر!! کال اٹھا لی گئی۔

ہیلو؟"

"خ۔۔ خی۔۔ خیام۔۔ ح۔۔ حنفی؟" اس کی آواز کپکپا گئی۔ ماتھے سے پسینے کی بوند لڑھکتی ہوئی اس فون پر رکھی اس کی بند مٹھی پر گری۔

"جی، آپ کی تعریف؟"

"وہ مار دیں گے۔۔ وہ م۔۔۔ میرے پیچھے ہیں۔۔ وہ۔۔ مجھ تک پہنچ جائیں گے!" وہ جلدی جلدی کہتا پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ ان بھاری بوٹوں کی آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"کون مار دے گا؟ براہ مہربانی اپنی بات کی وضاحت کریں۔"

"بینکاک۔۔ آرٹ گیلری۔۔ صبح سات بجے۔۔ وہ مجھ تک پہنچ جائیں گے۔۔ ان سے پہلے پہنچیں۔۔ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔۔ وہ قاتل۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عین اس کے عقب میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ لوگوں کی چیخیں بلند ہوئی۔ وہ تیزی سے فون چھوڑ کر بھاگا۔ اسے پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ان بھاری بوٹوں کی آواز اپنے بالکل قریب محسوس کر رہا تھا۔۔ وہ اس کی موت چاہتے تھے اور وہ۔۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے زندہ

رہنا تھا اور اسی زندگی کی خاطر وہ جان لگا کر بھاگ رہا تھا۔ اس کی پسلیوں سے بہتا خون اس کی جان نکال رہا تھا۔ پل پل مرتا وہ شخص ایک لمحے میں مرنے سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔۔ اس سے دور اس فون بوتھ پر اس تار سے لٹکتے فون میں کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ہیلو۔۔ ہیلو آپ سن رہے ہیں؟ ہیلو؟؟!" کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اور وہ اس پکار کو سننے کے لیے بہت دور جا چکا تھا!!

☆☆☆

"اسٹیون بار بارا! اپنے باپ کی پہلی اولاد ہے۔ اس کا بھائی میکس ویل بار بارا اس کے باپ کے گناہ کا گواہ ہے۔۔!" وہ تیزی سے لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتی اسکرین کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ کافی کا کپ میز پر رکھتا خیام چونکا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اسٹیون کے باپ کی دوسری شادی کے کوئی قانونی کاغذات نہیں ہیں! میکس کی پیدائش والے دن اسپتال کے مریضوں کی ہسٹری چیک کی ہے۔ وہاں ایک عورت ہے جس کا تمام خرچہ اسٹیون کے باپ نے اٹھایا ہے۔ اس عورت کے ساتھ اس کے شوہر کا نام نہیں ہے! اور وہی عورت میکس کی ماں ہے! میکس کی پیدائش کے ٹھیک دو دن بعد وہ ڈاکٹر جس نے میکس کی ماں کا کیس سنبھالا تھا ایک کار ایکسیڈنٹ میں ماری گئی۔ تمام ثبوت مٹا دیے گئے۔ آپ کو اب بھی شک ہے؟" وہ راکنگ چیئر کو گھماتی اب دوسرے لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتی پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔ جاری رکھو۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کافی کا گھونٹ بھرا۔

"تو قانونی طور پر اسٹیون اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ ہو سکتا ہے جب میکس نے اپنے باپ کی موت کے بعد جائیداد کا مطالبہ کیا ہو تو اسٹیون نے اسے جائیداد میں سے حصہ دینے سے انکار اسی وجہ کی بنا پر کیا ہو! کیونکہ قانونی طور پر اسٹیون ہی اپنے باپ کی کُل جائیداد کا تنہا وارث ہے!!

میکس کی ماں کی کوئی خبر نہیں۔ عین ممکن ہے وہ مر چکی ہو۔ میکس نے اپنی تمام حیات اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں گزاری۔ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہا اور نتیجتاً مارا گیا۔ میکس کے ریکارڈ میں مزید کچھ نہیں۔" وہ گہری سانس لیتی سامنے میز پر رکھے گلاس میں جگ سے پانی انڈیلنے لگی۔

"اسٹیون؟"

"اپنے سوتیلے بھائی کی طرح غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔ ایک بڑے دہشتگرد گروہ کو پال رکھا ہے اس نے، جس کے ثبوت کی تلاش حزب اللہ شروع کر چکی ہے۔ ابراہم وارلڈ واحد گہرا دوست ہے، جس سے دوستی بن مطلب کے ہے۔ بزنس کے میدان میں ابراہم کی ٹکر پر کھڑا ہے۔ دو بیٹے ہیں مارک اور مائک۔ مارک باپ کی کمپنی سنبھال رہا ہے اور مائک۔۔ مشکوک بندہ ہے۔ ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے یہ آخری بار اسی یونیورسٹی میں تھا جندل کے ساتھ! بعد ازاں اندلس چلا گیا اور پھر۔۔ خیام خیام آگے ڈیٹا کیلئر کر دیا گیا۔ اس کے پاسپورٹ پر آخری فلائٹ تھائلینڈ سے اندلس تک کی ہے۔ مگر جس ہوٹل میں اس نے رہائش اختیار کی، وہاں کے ریکارڈ کے مطابق وہ کل رات ہی روانہ ہو چکا ہے!! سی سی ٹی فوٹیجز کے مطابق وہ وہاں سے نہیں نکلا"!!

خیام دونوں ہاتھ میز پر رکھے جھکا تھا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"کچھ بھی کر کے مائک کو ڈھونڈو! پتہ لگاؤ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس کا موبائل؟"

"ٹریس نہیں کیا جا سکتا۔"

"پاسپورٹ؟"

"عین ممکن ہے وہ شناخت بدل چکا ہو"!

"صحیح ہے۔۔ تلاش جاری رکھو اس کی۔ اور۔۔ مارک اور اسٹیون کو بھی کسی قیمت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!"

وہ سیدھا کھڑا ہوا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"سعاد۔۔ اسٹیون وارلڈ کا دشمن ہو سکتا ہے؟"

"اگر آپ ان کے باہم تعلقات دیکھیں تو یہ مشکل سا لگتا ہے۔"

"اس مشکل کو آسان کرو۔ اسٹیون وارلڈ کی ٹکر پر کھڑا ہے۔ کیا یہ دو لوگوں کے مابین دشمنی کی وجہ نہیں ہو سکتی؟"

"یہ ہو سکتی ہے لیکن۔۔۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی خیام کا فون بج اٹھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر جگمگاتے انجان نمبر کو دیکھا پھر فون کان سے لگا یا۔

"ہیلو؟"

"خ۔۔ خی۔۔ خیام۔۔ ح۔۔ حنفی؟" اس کی سماعت سے کسی کی کمزور اور لاغر آواز ٹکرائی۔ لہجے میں خوف تھا بے حد خوف! اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

"جی، آپ کی تعریف؟"

"وہ مار دیں گے۔۔ وہ میرے پیچھے ہیں۔۔ وہ مجھ تک پہنچ جائیں گے!" بولنے والا جو بھی تھا کسی خطرے میں تھا۔ مگر کس خطرے میں اور کون؟!

"کون مار دے گا؟ براہ مہربانی اپنی بات کی وضاحت کریں۔"

"بینکاک۔۔ آرٹ گیلری۔۔ صبح سات بجے۔۔ وہ مجھ تک پہنچ جائیں گے۔۔ ان سے پہلے پہنچیں۔۔ وہ اچھے لوگ نہیں۔۔ وہ قاتل۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ خیام کے ماتھے پر بل پڑے۔ اسی وقت اسے فون کی دوسری طرف فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ بہت سا شور جمع ہونے لگا۔ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر رہا۔

"ہیلو ہیلو۔۔ آپ سن رہے ہیں؟ ہیلو؟؟" کال جاری تھی مگر دوسری طرف کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے اسکرین کو دیکھا اور پھر کال کٹ گئی۔ وہ کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ ایک شخص نے رات کے دو بجے اسے کال کی کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ کوئی جو اچھا نہیں ہے! اور یہ کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے آرٹ گیلری میں۔۔ ان لوگوں سے پہلے جو اس تک پہنچ جائیں گے۔۔ اُفف!!!

"خیام؟" سعاد کی آواز پر اس نے گہری سانس لی۔

"سب بہت الجھتا جا رہا ہے، سعاد"!

"آپ کو کس پر شک ہے؟" وہ قدرے دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"کچھ بھی قبل از وقت قیاس ہو گا مگر۔۔ تمام ثبوت اسٹیون کے خلاف جاتے ہیں!! عین ممکن ہے، زیاد کو میکس کے خلاف ثبوت دینے والا اسٹیون ہی ہو۔ مجھے لگتا ہے زیاد استعمال ہوا ہے سعاد!!" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا اس بات سے انجان کہ۔۔ دوسری جانب سعاد یوسف زئی اس ایک نام پر اٹک گئی تھی۔۔ زیاد زیاد زیاد۔۔ تیسرا آدمی زیاد تھا!! زیاد۔۔ کیا وہ زیاد تا شفین تھا؟! اور خیام۔۔۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں اب ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اگر زیاد استعمال ہوا تھا تو مطلب حزب اللہ آشکار ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اجنبی جب آشکار ہو جائیں تو ختم کر دیے جاتے ہیں، مار دیے جاتے ہیں۔۔ تو کیا ایک بار پھر جند اللہ کی تاریخ دہرائی جانے والی تھی؟ کیا حزب اللہ کے ساتھ وہی ہونے والا تھا جو جند اللہ کے ساتھ ہوا تھا؟! کیا ہر بار۔۔۔ مسلسل پستی کی طرف گرتی قوم کو سہارا دینے والے ہاتھ۔۔۔ کاٹ دیے جائیں گے؟!

☆☆☆

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پگھلتی رات کا زور ٹوٹا تھا۔ آسمان پر بچھی سیاہ تاریک چادر کے عین قلب سے روشنی پھوٹی تھی جو لمحہ لمحہ پورے آسمان پر قابض ہو گئی تھی۔ ہلکا آبی آسمان اور ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مسرت بخش تھے۔ وہ دائیں ہاتھ میں کتاب تھامے اپنے کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آیا تھا۔ اسے رات کچھ خوشی اور کچھ جوش کے باعث نیند نہیں آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ بالکل تازم دم تھا۔ صحن میں قدم رکھتے ہی جہاں ٹھنڈی ہوا اسے اپنے ہمقدم ہوتی محسوس ہوئی وہیں ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یا عابد الحرمین لو ابصر تنا

لعلمت انک فی العبادۃ تلعب

من کان یخضب خدہ بدموعہ

فنحورنا بدمائنا تتخضب

او کان یتعب خیلہ فی باطل

فخیولنا یوم الصبیحۃ تتعب۔"

اس کے قدموں میں گویا زنجیریں پڑ گئی تھیں۔ وہ آواز۔۔ بہت مدھم اور نرم سی تھی۔ گویا کوئی گلوکار تھا مگر نہیں۔۔ وہ گلوکار نہیں ہو سکتا تھا۔۔ یہ الفاظ کسی گلوکار کے منہ سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اتنا سحر اتنا جادو۔۔ یہ معمولی نہیں تھا۔ وہ یک ٹک سامنے دیکھے گیا۔ وہاں چھت تک جاتے زینوں میں سے پہلے زینے پر وہ بیٹھا تھا۔ آبی آسمان نے جس پر اپنا سائبان کیا ہوا تھا اور ہوا جس کے گرد محاصرہ کیے کھڑی تھی۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا اور لب حرکت کر رہے تھے۔

"ریح العبیر لکم و نحن عبیرنا

رھج السنابک والغبار الاطیب

ولقد اتانا من مقال نبینا

قول صحیح صادق لایکذب

لایستوی وغبار خیل اللہ فی

انف امری ودخان نار تلھب

ھذا کتاب اللہ ینطق بیننا

لیس الشھید بمیت لایکذب۔"

ایک ایک لفظ محبت سے ادا ہو رہا تھا۔ اسے اپنے گردو پیش کا منظر دھندلا ہوتا نظر آیا یہاں تک کہ سامنے بیٹھے ساحر کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ مبہوت سا اسے دیکھتا۔۔۔شاید وہ ساحر بھی اس کی نظریں خود پر محسوس کر چکا تھا تبھی وہ خاموش ہو گیا۔ سحر ٹوٹا، منظر صاف ہونے لگا۔ وہ ایکدم ہوش میں آیا۔ وہ لڑکا اب اسی کی طرف آرہا تھا۔

"السلام علیکم!" آواز میں بے حد نرمی تھی۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ ہلکے بھورے رنگ کے بال ہوا کے باعث پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ بھوری آنکھوں میں عجب چمک سی تھی۔ رنگت دودھ جیسی تھی اور نین نقوش۔۔۔واللہ! سامنے کھڑا وہ شخص مغربی اور عربی حسن کا مجسمہ بنا ہوا تھا!!

"وعلیکم السلام۔۔"

"میرا نام سنان ہے۔ سنان حنفی! آپ غالباً کل رات آنے والے مہمان ہیں؟" وہ بے اختیار سر اثبات میں ہلا گیا۔ وہ ابھی تک مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا وہ اسے آگے کیا کہے یہاں تک کہ سنان خود پوچھ بیٹھا۔

"اور آپ کی تعریف؟"

"میں دحیہ۔۔ دحیہ یوسف زئی! پاکستان سے آیا ہوں۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"موسٹ ویلکم مین!" اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے دحیہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔ "اور آپ؟" وہ جواب جانتے ہوئے بھی سوال کر رہا تھا۔ شاید وہ اسے بولنے دینا چاہتا تھا۔۔

"میں اندلسی ہوں۔ اندلسی یا ہسپانوی کچھ بھی کہہ لیں۔" اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔ دحیہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ۔۔ وہ جان چکا تھا وہ اندلسی ہے۔ کیونکہ اندلس ہی تو وہ سلطنت تھی جہاں عربی اور مغربی حسن کا ملاپ ہوا تھا۔ یہ اندلسی ہی تو تھے جو مغربی اور عربی حسن کے مجسمے تھے!!

"سنان۔۔۔ درس گاہ کب چلنا ہے؟" اس انجان آواز پر وہ چونکا۔ چونک کر سامنے دیکھا جہاں سے ایک لڑکا ان کی طرف آ رہا تھا۔ ان کے پاس آکر اس نے سوالیہ نظروں سے پہلے سنان پھر دحیہ کو دیکھا۔

"یہ دحیہ یوسف زئی ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

"خوش آمدید!! میں معاویہ بن اعظم۔ مراکش سے۔۔" اس کی طرف ہاتھ بڑھایا گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس ہاتھ کو بھی تھام گیا۔۔

یہ ان تینوں کی پہلی ملاقات تھی!! ایک نئے سفر کا اغاز تھا!!

* [1] محمد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ 177ھ میں حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ نے مجھے طرسوس (کے محاذ پر) کچھ اشعار لکھوائے اور مجھے حکم دیا کہ میں یہ اشعار مکہ پہنچ کر حضرت فضیل بن غیاض رحمۃ اللہ کی خدمت میں پیش کروں۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

اے حرمین شریفین کے عابد اگر آپ ہم مجاہدین کو دیکھ لیں

تو آپ جان لیں گے کہ آپ تو عبادت کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

اگر آپ کے آنسو آپ کے رخساروں کو تر کرتے ہیں

تو ہماری گردنیں ہمارے خون سے رنگین ہوتی ہیں

اور لوگوں کے گھوڑے فضول کاموں میں تھکتے ہیں

مگر ہمارے گھوڑے تو حملے کے دن تھکتے ہیں

عنبر و زعفران کی خوشبو آپ کو مبارک ہو جبکہ ہماری خوشبو تو

گھوڑے کے کھروں سے اڑنے والی مٹی اور اللہ تعالیٰ کے راستے کا پاک غبار ہے

ہم آپکو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان سناتے ہیں

ایسا فرمان جو بلاشبہ درست اور سچا ہے

جمع نہیں ہو سکتی اللہ کے راستے کی مٹی

اور دوزخ کی بھڑکتی آگ کسی شخص کی ناک میں

یہ اللہ کی کتاب ہمارے درمیان اعلان فرما رہی ہے کہ

شہید مردہ نہیں ہوتا یہ فرمان بلاشہ سچا ہے۔

محمد بن ابراہیم رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ خط حضرت فضیل کو پہنچا دیا۔ انہوں نے جب پڑھا تو رونے لگے اور فرمایا ابو عبد الرحمٰن (عبد اللہ بن مبارک) نے بالکل سچ بات فرمائی اور مجھے نصیحت کی۔ ⁕ [1]

☆☆☆

وہ تیز رفتار گاڑی مختلف راستوں سے گزرتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ توجہ سے ڈرائیونگ کرتا خیام بائیں ہاتھ سے اسٹیرنگ تھامے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے ناک کی ہڈی رگڑ رہا تھا۔ انداز میں بے چینی و اضطراب تھا۔ وہ جلد از جلد آرٹ گیلری پہنچنا چاہتا تھا!!

سات بجنے میں ٹھیک پانچ منٹ تھے جب وہ پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی پارک کر رہا تھا۔ آرٹ گیلری ابھی بند تھی اور دو گھنٹوں سے پہلے کھلنے کے کوئی امکان بھی نہ تھے۔ وہ چند لمحے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے سر اونچا کر کے آرٹ گیلری کی عمارت کو دیکھتا رہا پھر پاس رکھی بینچ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ جس سے ملنے آیا تھا، وہ یقیناً اسے ڈھونڈ لے گا۔ صبح صبح کا وقت تھا تبھی سڑکیں ابھی خالی تھیں۔ اکا دکا لوگ وہاں سے گزر رہے تھے۔ کچھ صبح کی ورزش سے فارغ ہو کر اب گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ دکانیں ابھی بند تھیں۔ اس نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ سات بجنے میں دو منٹ تھے۔ وہ بینچ سے ٹیک لگائے بغور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ اس کی نظر سامنے سے آتے شخص پر پڑی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کا سر نقاہت کے باعث جھکا ہوا تھا۔ سفید شرٹ خون آلود تھی۔ پسلیوں سے خون اب قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا گویا جسم کا سارا خون نچڑ چکا ہو۔ سفید جاگزر پر جگہ جگہ خون کی ننھی بوندیں گری ہوئی تھیں۔ کہیں خون جم چکا تھا اور کہیں تازہ تھا۔۔

وہ خیام سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اور خیام کو لگا کہ۔۔۔ کسی نے کوئی بھاری پہاڑ اس کے سر پر دے مارا ہو۔ وہ ڈیوڈ تھا۔ کمپنی کے اہم ترین ملازمین سے ایک!! اس کی یہ حالت خیام کے لیے ناقابلِ سمجھ تھی۔ ڈیوڈ کی ٹانگوں میں مزید جان نہیں بچی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ وہ زمین بوس ہونے لگا تھا۔ خیام تیزی سے بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اس کی نظر ڈیوڈ کے پیچھے

کھڑے اس شخص پر ٹکی۔ سیاہ لباس میں ملبوس ماسک سے چہرہ ڈھکے وہ شخص، ڈیوڈ کا نشانہ لے کر کھڑا تھا۔ خیام نے چونک کر ڈیوڈ کو دیکھا جو گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا تھا۔ ٹریگر پر زور پڑا تھا۔۔

"نہیں رک جاؤ!" وہ چلانا چاہتا تھا مگر آواز بیٹھ گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ ٹریگر دب گیا۔ پستول سے نکلی گولی ہوا کی رفتار کو چیرتی ڈیوڈ کی پشت میں پیوست ہوئی تھی۔ اور پھر دوسرا فائر ہوا۔۔ گولی اس کے دماغ میں سراخ کرتی ہوئی نکلی تھی۔ خیام نے بے یقینی سے یہ منظر دیکھا۔ وہ شخص۔۔ اس کی نقاب سے جھلکتی آنکھیں۔۔ ان میں خیام کو اپنے لیے تمسخر محسوس ہوا تھا۔ ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی اور وہ شخص فرار ہو گیا۔ خیام نے پنجوں کے بل نیچے بیٹھتے ہوئے ڈیوڈ کی نبض دیکھی۔۔ وہ جان دے چکا تھا۔۔ پوری رات وہ ایک لمحے میں مرنے سے بچنے کے لیے لمحہ لمحہ مرا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے جسم کا سارا خون نچڑ چکا تھا۔ اور اب۔۔ جب اسے لگا تھا وہ اپنی جان میں بچانے میں کامیاب رہا ہے، تو اس کے جسم میں جان ہی باقی نہ رہی تھی۔۔ وہ جان دے چکا تھا!!

☆☆☆

وہ صوفے پر بیٹھا جھک کر اپنے جاگرز کے تسمے باندھ رہا تھا جب بدر اپنے کمرے سے نکلا۔ اس نے سر اٹھا کر بدر کو دیکھا جو کچن کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اس کی کل بدر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ رات گھر آیا تھا تو بدر سو چکا تھا۔ اور اب وہ نک سک سا تیار کمرے سے نکلا تو حیرت انگیز طور پر خلاف معمول خاموشی سے کچن میں چلا گیا تھا۔ جندل کے لیے یہ تعجب کی بات تھی کیونکہ وہ بدر کو جانتا تھا۔ وہ بہت بولتا تھا!!

کچھ دیر کے بعد وہ کچن سے نکلا تو ہاتھ میں گاجر تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتا روفی گاجر کو دیکھ کر اچھلنے لگا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا اور جھک کر روفی کو گود میں بٹھا کر گاجر اسے تھمائی۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔ چہرہ بے تاثر تھا۔

"بدر۔۔ تم ٹھیک ہو؟" اس سے رہا نہ گیا تھا۔ وہ بدر کی خاموشی کا عادی نہیں تھا۔ بدر نے سر دھیرے سے اثبات

میں ہلا دیا۔

”تم یونیورسٹی نہیں جا رہے؟“

”نہیں۔۔ میں پڑھائی چھوڑ رہا ہوں۔“ جندل نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”جاب کی وجہ سے؟“

”ہاں۔۔“ ایک لفظی جواب دے کر وہ روفی کو صوفے پر بٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صرف کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا اور بغیر روفی کو پیار کیے باہر نکل گیا۔ جہاں جندل اس کے بدلے بدلے سے رویے پر حیران تھا وہیں روفی ششدر رہ گیا تھا۔ جندل جانتا تھا بدر خیام کی وجہ سے پریشان ہو گا مگر وہ زیاد کے کیے گئے اقدام کے بعد چیخنے چلانے کے بجائے خاموش ہو جائے گا یہ واقعی پریشان کن بات تھی۔۔ اور روفی۔۔ یہ پہلی بار تھا کہ بدر بغیر اسے پیار کیے چلا گیا تھا!!

☆☆☆

”ازابیٹے۔۔“ وہ موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے زینے اتر رہی تھی جب وارلڈ نے اسے پکارا۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا پھر تیزی سے زینے اترتی ان کے پاس آئی۔

”جی بابا۔۔۔“ اس کا لہجہ نم تھا اور آنکھیں سرخ۔ چہرے پر انتہا کی معصومیت تھی۔ گلے میں بھورے رنگ کا

اسٹول ڈال رکھا تھا۔ بالوں میں ہیئر بینڈ ٹکا کر انہیں کھلا چھوڑا ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری بچے۔۔ میں تمہیں دنیا سے بچانے کی کوشش میں یہ فراموش کر بیٹھا کہ تم اپنے ہی گھر میں بھی۔۔ غیر محفوظ ہو سکتی ہو!!" اس کے لہجے میں کچھ تھا۔۔ دکھ۔۔ہاں بہت سارا دکھ۔ ازا بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی۔

"ماں کو غلط مت سمجھیں بابا۔۔"

"وہ تمہارے سارہ زیادتی کر گئی ہے۔۔" اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ وارلڈ نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگایا تھا۔

"تم میرا کُل سرمایہ ہو ازابیلا! میں تمہارا باپ۔۔۔ تمہارے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔ آئندہ تم کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔ بھلے پھر بات تمہاری ماں کے متعلق ہی کیوں نہ ہو!! ٹھیک؟" وہ تائیدی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سر اثبات میں ہلا گئی۔ اسے ایکدم بہت محفوظ سا محسوس ہوا تھا۔۔ وہ اس دنیا میں اکیلی نہیں تھی۔ وہ کسی بھی جنگ میں اکیلی نہیں تھی۔۔ بھلے وہ جنگ مذہب کی ہو۔۔ اس کا باپ ہر قدم پر اس کے ساتھ تھا!!

"آج شام یونیورسٹی سے آفس آ جانا۔ مجھے تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔۔" وہ مسکرایا۔ ازابیلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"عظیم ابراہم وارلڈ کو کیونکر کسی کے مشورے کی احتیاج ہو سکتی ہے؟"

"جب سامنے ازابیلا وارلڈ ہو تو یہ احتیاج خود بخود پیدا ہوتی ہے اور زور و شور سے بڑھتی ہے۔۔" وہ ہنس دی۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

وہ تقریباً آٹھ بجے گھر پہنچا تھا۔ وہ جلد از جلد کمپنی جانا چاہتا تھا۔ اسے کمپنی میں ڈیوڈ سے منسلک ہر بات ہر چیز پر غور کرنا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو موبائل وائبریٹ ہوا۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر نظریں جمائیں تو وہاں سعاد کا لمبا چوڑا پیغام جگمگا رہا تھا، اس کی توقع کے عین مطابق! اس نے ایک سرسری سی نگاہ اس پیغام پر ڈالی۔

وہاں آج وہ آفس کس رنگ کا لباس پہن کر جائے گا سے لے کر وہ کس سے کیا بات کرے گا اور لنچ میں کیا منگوائے گا، آفس سے کب نکلے گا ہر ہر بات لکھی تھی۔ سعاد دعوہ کرتی تھی کہ اگر خیام نے ان دو ماہ میں وارلڈ کلاس کمپنی میں اپنا نام بنایا ہے تو اس کے پیچھے صرف اور صرف سعاد یوسف زئی ہے!! جس طرح ہر بادشاہ کے تخت کے پیچھے ایک چالاک وزیر ہوتا ہے، ہر سلطان کی سلطنت کے پیچھے اس کا خاص دوست ہوتا ہے ویسے ہی خیام کے پیچھے کوئی نہیں پر سعاد یوسف زئی تھی! خیام اس کے اس دعوے سے انکار نہیں کرتا تھا مگر وہ اسے صحیح بھی نہیں مانتا تھا کیونکہ خیام اس کا استاد تھا نہ کہ وہ اس کی۔۔!!

کچھ دیر کے بعد جب وہ ڈریسنگ روم سے نکلا تو سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال سیٹ کرتے ہوئے اس نے ایک نگاہ موبائل کی روشن ہوتی اسکرین پر ڈالی جہاں اب "ہونہار شاگرد از گالنک" لکھا جگمگا رہا تھا۔ وہ کلائی پر رسٹ واچ باندھ کر موبائل اٹھاتا کمرے سے باہر آگیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا آلہ غیر محسوس طریقے سے اپنے کان میں لگایا پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور چھٹی پر تھا تبھی گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے سنتے ہوئے جو کہہ رہی تھی؛

"آج کی تاریخ میں آپ ابراہم وارلڈ سے نہیں ملیں گے۔ آپ کی دو دن پہلے ہی ان سے ملاقات ہوئی ہے، روز روز نہیں ہونی چاہیے۔ چونکہ آج آپ سیاہ رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہیں تو آپ کا موڈ آج خراب ہونا چاہیے۔ آپ آج دو

ورکرز کو کمپنی سے نکالیں گے"!

"اس کی ضرورت نہیں ہے سعاد"!

"یہ اسکرپٹ میں شامل ہے۔ آپ ردوبدل نہیں کریں گے!!" وہ اس کی بات پر ذرا سا مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے نچلا لب دانتوں میں دبا گیا۔

"باقی ساری باتیں پڑھ لیجیے گا مین پوائنٹس میں نے بتا دیے ہیں۔ میں لائبریری جا رہی ہوں، فارغ ہوتے ہی آپ سے بات ہوتی ہے۔"

"تم لائبریری نہیں جاؤ گی"!

"کون روکے گا؟"

"میں۔۔ یہ اسکرپٹ میں شامل ہے۔ تم ردوبدل نہیں کرو گی۔" وہ اس کے الفاظ اسی کو لوٹا گیا تھا۔

"آپ اس آدمی سے ملنے گئے؟"

"ہاں۔۔ میں بس اس تک پہنچ چکا تھا۔۔ مگر وہ اس سے پہلے پہنچ گئے۔ اسے مار دیا گیا۔ وہ ڈیوڈ ہے۔ کمپنی کا سارا سروے جن لوگوں نے سنبھالا ہوا ہے وہ ان میں سے ایک ہے۔ میرا خیال ہے اسے کسی ذاتی وجہ کی بنا پر نہیں مارا گیا۔ کمپنی میں کچھ گڑبڑ ہے سعاد"!

"تو۔۔ ہم پتہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی سامان تھا جب وہ آپ کو ملا؟" وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں مگر اس میں صرف ایک نوٹ بک، کچھ قلم، تھوڑے پیسے اور کچھ کپڑے ہیں۔ اس کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔" وہ کندھے اچکاتا اسٹیرنگ گھما رہا تھا۔

”نوٹ بک دیکھی؟“

”خالی ہے۔۔۔کوئی خفیہ پیغام نہیں ہے۔“ سعاد نے لب دانتوں میں دبائے۔

”اب کیا کرنے جارہے ہیں؟“

”کمپنی جاؤں گا۔اس کا کچھ سامان اس کی آفس میں ہو گا۔“

”آمم۔۔۔خیام میں ایک لنک بھیج رہی ہوں۔اگر اس کا لیپ ٹاپ یا موبائل ملتا ہے تو اس لنک کو وہاں کھولیں۔ میں آسانی سے سارے ڈیٹا تک رسائی حاصل کرلوں گی۔“ وہ اب لیپ ٹاپ پر جھکی تیزی سے انگلیاں چلارہی تھی۔

”یہ کرنے کے بعد ساتھ ہی ان لوگوں کو ٹریس کرنے کی کوشش کرو جو کل تمہیں مارنے آئے تھے۔مائک کا کچھ پتہ چلا؟“

”ہاں۔۔وہ تھائلینڈ واپس آچکا ہے۔البتہ کل وہ کہاں تھا یہ معلوم نہیں ہو سکا۔“

”سعاد۔۔ایک اور بات ہے۔۔“

”کہیں۔۔“

”مجھے ایک بندے کا پورا بایو ڈیٹا چاہیے۔کہاں پیدا ہوا سے لے کر اب تک سب کچھ“!!

”کون؟“

”مصعب الزرقاوی عرف بدر“!!

☆☆☆

وہ کمپنی پہنچا تو معلوم ہوا کہ خیام ابھی تک نہیں آیا۔ وہ خاموشی سے بنا کسی سے بات کیے خیام کی آفس میں چلا گیا۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ سب جانتے تھے بدر کو روکنا فضول ہے۔ وہ وہی کرے گا جو اسکی ناقص عقل کہے گی!!

آفس میں داخل ہو کر اس نے گہری سانس لی پھر میز کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھوں میں ذرا ذرا سی سرخی پیدا ہو رہی تھی۔ اس خاموشی میں اسے دو لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو آپس میں گفت و شنید میں مصروف تھے۔

"بدر کیا تم میرے لیے ایک کام کر سکتے ہو؟"

"خدا کی قسم جیم میں تمہیں دوبارہ قرض نہیں دوں گا"!!

"میں قرض نہیں لے رہا بلکہ اگر یہ کام کر دو تو میں تمہیں اچھی رقم بطور انعام دوں گا۔"

"رشوت دے رہے ہو؟ کام بتاؤ؟"

"ایک لڑکی کی لوکیشن ٹریس کروانی ہے۔ پلیز بدر یہ کام کر دو ورنہ میرا باس میری جان لے لے گا۔"

"مجھے تم شروع سے ہی مشکوک لگتے تھے۔ بتانا ذرا کون لڑکی ہے؟ کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟"!

"یار ایسی بات نہیں ہے۔ جیسا تم سمجھ رہے ہو ویسا کچھ نہیں ہے۔ اصل میں باس اس لڑکی کو پسند کرتے ہیں، مگر وہ کہاں ہے یہ نہیں جانتے۔ کیوں دو محبت کرنے والوں کے بیچ میں آ رہے ہو۔ کر دو ناں لوکیشن ٹریس تمہیں تمہارے آئی فون کی قسم"!!

"میں صرف اس دوستی کی وجہ سے یہ کام کر رہا ہوں ورنہ واللہ! تم مجھے ایسے کاموں کے لیے قائل نہیں کر سکتے"!!

اس نے بے اختیار آنکھیں میچی تھیں۔ دل پر ایک بھاری بوجھ آن گرا تھا۔ اس نے بنا کسی تصدیق کے جیم کو اس

لڑکی کی لوکیشن بھیج دی تھی۔ جانے جیم کے باس نے اس کے ساتھ کیا کِیا ہو گا؟ اور رہی سہی کسر آج صبح ڈیوڈ کے قتل کی خبر سن کو پوری ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح احساس جرم کے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ کیا ہوا اگر وہ لڑکی بھی۔۔۔ اور آگے اس کے لیے سوچنا محال ہو جاتا تھا۔

وہ اسی کشمکش میں بیٹھا تھا جب آفس کا دروازہ کھلا۔ خیام اندر داخل ہوا۔

"سر آپ کے لیے وارلڈ سر کی کال آئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کسی بھی طرح ڈیوڈ کے مسئلے سے پولیس کو دور رکھیں۔" خیام نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر اس لڑکی کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکی چلی گئی تو وہ بدر کی طرف متوجہ ہوا جو وہیں خاموش بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم! کیسے ہو مصعب؟" آہ وہ لہجہ۔۔ اس میں بے حد نرمی تھی۔ آواز ہشاش بشاش سی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر خیام کو دیکھا جو نرمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بدر ہونٹ بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھوں میں پھلکتی نمی کے باعث خیام کا چہرہ دھندلا ہو چکا تھا۔ وہ چاہ کر بھی خیام کو جواب نہیں دے پایا تھا۔

"تم ٹھیک ہو مصعب؟" ایک آنسو بدر کی دائیں آنکھ سے گرتا گالوں سے لڑھکتا اس کی داڑھی میں جذب ہوا۔ اس نے سر جھکا کر باقی آنسوؤں کو روکنا چاہا۔ خیام چند پل اسے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگا گیا تھا۔ بدر۔۔ اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلی تھیں۔ آج ایک عرصے بعد کسی نے اس طرح اسے گلے سے لگایا تھا۔ بے یقینی کی کیفیت میں سامنے دیکھتے ہوئے کئی آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔ خیام اس کی کمر تھپک کر پیچھے ہٹا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"میں بہت برا ہوں۔۔ میں نے۔۔ میں نے اپنی صلاحیت کا غلط استعمال کیا، سر!" وہ آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کہہ رہا

تھا۔

"کیا بات ہے مصعب؟ کیا کِیا ہے تم نے؟" وہ چونکا تھا۔ بدر معمولی بات پر رونے والوں میں سے نہیں تھا۔۔ اگر وہ رو رہا تھا تو یقیناً کچھ غلط ہوا تھا!!

"سر۔۔ جیم نے کسی لڑکی کی لوکیشن ٹریس کرنے کا کہا تھا، میں نہیں کرنا چاہتا تھا مگر دوستی کی خاطر مجبور ہو گیا۔ میں نہیں جانتا اس لڑکی کے ساتھ اس کے باس نے کیا کیا ہو گا؟ اگر کچھ غلط ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا"!

"مصعب۔۔ تمہارے پاس لڑکی کی کوئی تصویر ہے یا نام جانتے ہو؟" خیام نے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ بدر نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اپنی پینٹ کی جیب سے موبائل نکال کر وہ تصویر نکالی اور اسکرین خیام کے سامنے کی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح ٹھٹھکا تھا۔

وہاں۔۔۔ الحمرا میں۔۔ بازو پھیلائے گلابی حجاب چہرے کے گرد مقید کیے۔۔ بے فکری سے کھڑی وہ سعاد یوسف زئی تھی۔ وہ بے اختیار اس کی تصویر سے نظریں چرا گیا تھا۔ اسے اب سعاد کو نقاب میں دیکھنے کی عادت تھی!!

"اس تصویر کو ڈلیٹ کر دو بدر!" وہ اس کا کندھا تھپتھپاتا اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں؟"

"بیٹھو۔" بدر خاموشی سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اب تفصیل سے بتاؤ سب کچھ۔۔" اور بدر۔۔ وہ اپنے اور جیم کے درمیان ہوئی ساری باتیں اسے بتا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ خیام کو یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہے حالانکہ کل تک بلکہ اب بھی اسے خیام پر شک تھا۔۔ تو سامنے بیٹھے اس شخص میں ایسا کیا تھا کہ۔۔ وہ جو بات کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا وہ اسے بتا رہا تھا؟!

”جیم کا باس کون ہے؟“

”مائیک۔۔اسٹیون بار بارا کا چھوٹا بیٹا۔ آپ جانتے ہونگے انہیں وہ وارلڈ سر کے دوست ہیں۔“ خیام نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ اپنے دماغ میں اٹھتے کئی سوال اور کئی سوالوں کے ملتے جوابوں کو نظر انداز کرتا وہ بظاہر بہت پر سکون سے انداز میں بدر سے کہہ رہا تھا؛

”دوستی جتنی بھی گہری ہو مصعب، کبھی اس دوستی کے لیے وہ کام مت کرنا جس پر بعد میں تمہیں تمہارا ضمیر ملامت کرے۔ یہ دنیا اتنی خوبصورت نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے۔ یہاں ہر شخص بہروپیہ ہے، ہر چیز سراب ہے۔ لوگ بالکل بھی وہ نہیں ہیں جیسا تم انہیں دیکھتے ہو، کیونکہ تم وہ دیکھتے ہو جو وہ تمہیں دکھانا چاہتے ہیں۔۔ تم بہت بہادر ہو مصعب! سوچ سمجھ کر فیصلہ لینا سیکھو۔ خود کو کھلونا مت بننے دو!!“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”مگر اب کیا کروں؟ واللہ سر میں جب تک اس لڑکی کی سلامتی کا یقین نہیں کر لیتا مجھے چین نہیں آئے گا۔“

”فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو گا ان شاء اللہ!“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بدر اس کے تسلی دینے پر ذرا سا مسکرا دیا تھا۔ خیام نے ٹھہر کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر میز کی دراز سے فائل نکال کر باہر کی طرف بڑھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اس کے پوچھنے تک خیام جا چکا تھا۔ اور ایک بار پھر۔۔خیام اس کی نظروں میں مشکوک ہوا تھا۔ وہ اچھا تھا۔۔۔کم از کم اس وقت جب وہ ظالم باس نہیں بنا ہوا تھا تو وہ اچھا تھا۔۔ مگر اب چونکہ وہ ظالم باس کے روپ میں آ چکا تھا تو وہ مشکوک بن چکا تھا۔ اور اسی شک کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے بدر بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ راہداریوں میں بھاگتا خیام کو ڈھونڈ رہا تھا!!

☆☆☆

وہ اپنی آفس میں بیٹھا بے دلی سے فائل کے کاغذات پلٹ رہا تھا۔ چہرے پر کچھ غصہ اور کچھ بے زاری تھی۔ وہ مائک کی وجہ سے پریشان تھا۔ کچھ پریشان اور کچھ غصہ تھا۔ مائک اس کا بھائی تھا اسے عزیز تھا۔ وہ مائک کو اس راہ پر جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا بالکل بھی نہیں!!

آفس کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ اس نے کم فہمی سے سر اٹھا کر سامنے کھڑے اس لڑکے کو دیکھا۔ وہ باہر منع کر کے آیا تھا کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ اور وہ لڑکا۔۔ سیاہ پینٹ پر سبز ٹی شرٹ پہنے، ماتھے پر سفید پی کیپ ٹکائے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

”سر میں نے انہیں منع کیا تھا مگر انہوں نے سنا ہی نہیں۔۔“ اندر داخل ہوتی اس کی سیکریٹری نے کمزور احتجاج کیا۔

”آپ کے نامرد بھائی کو میں نے مارا تھا!“ مارک نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔۔ بالکل سپاٹ!

مارک نے دھیرے سے اپنی سیکریٹری کو جانے کا اشارہ کیا پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم جانتے ہوں میں یہیں تمہاری جان بھی لے سکتا ہوں۔“ مارک نے دائیں ابرو اچکا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

سامنے کھڑا وہ لڑکا مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے سر جھکا گیا۔

”مائک آپ کا ہی بھائی ہے۔۔ اس نے بھی یہیں دھمکی دی تھی اور جان سے جاتے جاتے بچا تھا!!“ مارک نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سنجیدگی سے اسے کہتا وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یقیناً میں نے اس آفر کو پسند کیا۔“ وہ لڑکا مسکرا کر کہتا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے جانچتی نگاہوں سے اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جندل۔۔ جندل ہوسف زئی!“ وہ اپنی پی کیپ سر سے اتار کر میز پر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"جاب"!

"اور میں کیونکر تم پر اتنا مہربان ہونے والا ہوں؟"

"میں بطور اسٹوڈنٹ تھائلینڈ آیا ہوں۔ ضرورتمند ہوں۔ پیچھے حالات بگڑ گئے ہیں مجھے جاب کی ضرورت ہے۔ اور ویسے بھی آپ کو اپنے بھائی کی خطاؤں کا ازالہ کرنا چاہیے۔ اسے بتانا چاہیے کہ ایک لڑکی کے سامنے کسی کو مارنے کی دھمکی نہیں دیتے۔ اگلا انسان اگر غیرت مند ہو تو منہ توڑ جواب دیتا ہے، منہ توڑ دیتا ہے"!!

"تم جا سکتے ہو!" جندل مسکرایا۔ دھیرے سے مسکرایا پھر آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر میز پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"دنیا آپ کی عزت کرتی ہے مارک بار بارا! کیا ہو اگر انہیں پتہ چلے کہ آپ کا بھائی۔۔ مائک بار بارا آپ کے برعکس ایک عزت دار شخص نہیں ہے۔ وہ عزت تار تار کرنے والوں میں سے ہے۔ ایک گھٹیا ترین شخص! مزید گہرائی میں جانے کی مجھے نہیں لگتا مجھے ضرورت ہوگی کیونکہ۔۔" وہ رکا پھر گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب کیا۔ "اسٹیون بار بارا کا سمجھدار بیٹا اتنی عقل تو رکھتا ہی ہے کہ خود ہی سمجھ جائے اور مجھے ثبوت پیش کرنے کی زحمت بھی نہ کرنی پڑے!!" مارک کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ جندل کی مسکراہٹ اسے اپنے ارد گرد آگ لگاتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچی تھیں۔

"تمہیں واقعی لگتا ہے یہ میرے لیے مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے؟" وہ بہت ضبط کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"یقیناً یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا! لیکن کیا ہو اگر میں مائک کو یہ گھٹیا پن وراثت میں ملا ہے، یہ ثابت کرنے کے لیے مزید جانچ پڑتال کروں اور ثبوت پیش کر دوں تو بار بارا گروپ عرش سے فرش پر آگرے گا۔ بظاہر دوسروں کی

عزتوں کا محافظ اصل میں اپنے بھائی اور بڑوں کے گھٹیا پن کو چھپانے کی کوششوں میں سرگرداں ہے، یہ جان کر عوام کو واقعی دکھ پہنچے گا۔ آپ منافق کہلائیں گے۔ ایک عزت دار شخص کے لیے یہ شرم کا مقام ہو گا کہ لوگوں میں اس کے لیے عزت کا لفظ مذاق بن جائے اور کس کے لیے۔۔ صرف بھائی کے لیے؟!" وہ ہنس دیا۔ ہنستے ہوئے چہرے کا رخ موڑ گیا۔ مارک کی آنکھیں ضبط کے مارے سرخ ہونے لگیں۔

"کیوں کر رہے ہو یہ سب؟"

"احتیاج! احتیاج انسان سے سب کروا لیتی ہے۔ یہ ایک انسان کو درندہ بننے پر بھی مجبور کر سکتی ہے اور ایک مظلوم سے مظلوم شخص کو ظالم ترین بھی بنا سکتی ہے"!!

"اور میں کیسے یقین کروں کہ تم صرف احتیاج کی خاطر یہ کر رہے ہو؟"!

"آپ کے پاس یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہے؟!" اس کے تمسخرانہ انداز پر مارک کو اپنا وجود دھواں دھواں ہوتا محسوس ہوا تھا۔ سامنے بیٹھا وہ لڑکا اسے بلیک میل کر رہا تھا صرف اس ذلیل مائک کی وجہ سے!! اس سے زیادہ بے بسی کا احساس اسے کبھی نہیں ہوا تھا، کبھی نہیں!

"اور اگر میں تمہیں جاب نہ دوں تو؟"

"میری بات سنیں مارک بار بار! میں تھائلینڈ اسٹوڈنٹ ویزا پر آیا ہوں۔ اسی لیے مجھے یہاں ایک اچھی جاب ملنا مشکل ہے۔ اگر آپ مجھے جاب نہیں دیں گے تو میں مائک کے خلاف تمام ثبوت پبلک کر دوں گا۔ نتیجتاً آپ عرش سے فرش پر گریں گے۔ اور چونکہ مجھے تو جاب ملنی ہی نہیں ہے تو یہ ہم تو ڈوبیں گے، تمہیں بھی لے ڈوبیں گے والی کہانی ہو گی۔ آگے اپ خود سمجھدار ہیں!" وہ بے فکری سے کندھے اچکا گیا۔

"کیا کرنا چاہتے ہو؟!" وہ بہت ضبط کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"میں۔۔۔ایک اچھا شیف ہوں"!!

☆☆☆

وہ ڈیوڈ کی آفس میں داخل ہو کر تیزی سے اس کی میز کی طرف بڑھا تھا۔ وہاں سامنے ہی لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور ساتھ ہی جلدی سے اس کے باقی سامان کی تلاشی لینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہاں سے اس کا موبائل بھی بر آمد ہو چکا تھا۔ اس نے موبائل میز پر رکھ کر اپنا موبائل نکالا جہاں سعاد لنک بھیج چکی تھی۔ اس نے لنک کھولا اور پھر اس کے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا وہ پاسورڈ مانگ رہا تھا۔ پاسورڈ کھولنا اس کے لیے بے حد آسان تھا۔ وہ تیزی سے لیپ ٹاپ پر جھک کر انگلیاں چلانے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے اندازہ ہوا کہ ڈیوڈ کے لیپ ٹاپ کا پاسورڈ کھولنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ خود ایک ہیکر تھا!!

اس نے موبائل اٹھا کر جلدی سے سعاد کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"پاسورڈ کھولنا مشکل ہے۔"

"کھولنا مشکل ہے تو توڑ دیں! یہ سسٹم بھیج رہی ہوں، اپنے موبائل کے ذریعے لیپ ٹاپ میں انسٹال کریں۔ یہ پاسورڈ نہیں مانگے گا!!" خیام نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ دروازہ کھلا۔ اس نے تیزی سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہاں بدر کھڑا تھا۔ وہ بدر کو دیکھ کر سکون کی سانس خارج کرتا واپس لیپ ٹاپ پر جھکا اور سعاد کا بتایا گیا کام کرنے لگا۔ بدر حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ وہ ڈیوڈ کی آفس میں کیا کر رہا تھا؟ اور اس کے پاس ڈیوڈ کا موبائل اور لیپ ٹاپ کیوں تھا؟ کہیں ڈیوڈ کے قتل میں خیام۔۔۔۔ وہ جھرجھری لیتا آگے آیا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں سر؟"

"دروازہ بند کرو مصعب!" وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا جہاں سسٹم انسٹال ہونے میں بس چند سیکنڈ باقی تھے۔ بدر وہیں کھڑا رہا۔ سانس روکے اس کی حرکتوں کو دیکھتا رہا۔ سسٹم انسٹال ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا موبائل اٹھا کر کان سے لگایا جہاں سعاد کی کال چل رہی تھی۔

"لیپ ٹاپ کا ڈیٹا لینے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"بس پانچ منٹ!" عین اسی لمحے آفس کے باہر کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔۔

"میرے پاس تین منٹ ہیں، جلدی کرو۔" سعاد سے بات کرتے ہوئے۔۔ اس نے نظر اٹھا کر بدر کو دیکھا تھا۔۔ اور وہ ایک نگاہ۔۔ بدر کو لگا تھا جیسے خیام نے اسے کوئی حکم دیا تھا۔ اور وہ بلا چوں چراں اس حکم پر سر جھکانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس ایک نگاہ کے بعد۔۔ اس نے خود کو دروازے کی طرف جاتا محسوس کیا۔ وہ آفس کے دروازے پر پہنچا تو آفس کی طرف آتے دو گارڈز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو بدر؟"

"تم اندر نہیں جا سکتے!" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر گارڈز نے رک کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"خیام سر نے منع کیا ہے"!

"ہمیں وارلڈ سر کا حکم ہے، راستے سے ہٹو۔" ایک گارڈ زبردستی اندر جانے لگا۔

"میں نے کہا تم اندر نہیں جاؤ گے!!" وہ چلایا تھا۔ گارڈز نے حیرت سے اس کے اس روپ کو دیکھا تھا۔ "اگر تم نے ایک قدم اور بڑھایا تو خدا کی قسم وارلڈ سر کو تمہاری لاش ملے گی!!" گارڈز وہیں رک گئے۔ وہ انہیں سخت نظروں سے گھورتا اندر آ گیا۔ لیپ ٹاپ بند کرتے خیام نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ نڈھال سا دروازے کے ساتھ لگ کر

کھڑا تھا۔ اسے اپنے ارد گرد ہوتی ان عجیب چیزوں اور۔۔۔ اپنے اچانک سے بدلتے رویے کو سمجھنے کے لیے وقت چاہیے تھا!! فی الحال وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ۔۔ وہ خیام کی اس ایک نگاہ پر۔۔ اس ایک نگاہ سے مرعوب ہونے پر۔۔ اسے کیوں بچا رہا تھا۔۔

سسٹم انسٹال ہو چکا تھا۔ خیام لیپ ٹاپ بند کرتا سیدھا کھڑا ہوا۔ اس نے میز کے دائیں طرف سے نکلنے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ پرنٹر چلنے کی آواز آئی۔ وہ رک گیا۔ کم فہمی سے بھنویں ملائے اس نے چہرہ ترچھا کر کے دیوار کے پاس میز پر رکھے پرنٹر کو دیکھا جہاں سے ایک کاغذ نکل کر آرہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ گرم گرم وہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لیا پھر پرنٹر کو دیکھا۔ یقیناً یہ ڈیوڈ تھا جس نے پرنٹر پر وقت سیٹ کیا تھا۔ اسے سات بجے خیام سے ملنا تھا اور اٹھ بجے آفس آنا تھا، اگر وہ آفس نہ آیا تو خیام اس کی آفس میں آئے گا اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے یہ کاغذ پرنٹ ہو گا۔ اس نے کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھا جو خالی تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔

"سگریٹ پیتے ہو مصعب؟" دروازے سے لگ کر کھڑے بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس کا سوال سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ خیام نے اس کے جواب نہ دینے پر مڑ کر اسے دیکھا۔

"لائٹر ہے؟"

"نہیں سر۔" وہ نفی میں سر ہلا گیا۔ خیام سر کو جنبش دیتا میز کی طرف بڑھا۔ تیزی سے درازوں کو چیک کرتا وہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"میں لے آؤں کسی سے؟" اس کی آواز قدرے دھیمی تھی۔

"نہیں۔" اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی تھی۔ اس نے سرمئی رنگ کی وہ چھوٹی سی شیشی اٹھائی جو آئیوڈین کی تھی پھر وہ کاغذ اٹھایا اور آئیوڈین کاغذ پر چھڑکنے لگا۔ پھر دراز سے لائٹر اٹھایا جو یقیناً ڈیوڈ کا تھا۔ لائٹر جلا کر آگ کاغذ کے

قریب کی۔ کچھ ہی دیر میں کاغذ پر لکھے الفاظ واضع ہونے لگے۔

"NI437C1"

ان ابھرے ابھرے حروف کو پڑھتے ہوئے خیام کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کسی کا پتہ تھا۔ اس نے موبائل نکال کر جلدی سے اس کی تصویر لی پھر آفس سے منسلک واشروم کی طرف بڑھا۔ کاغذ کو توڑا مروڑا اور پانی میں بہادیا۔ جب وہ واپس آیا تو بدر کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"سر۔۔ اگر یہ واقعی کوئی خطرناک کیس ہے تو۔۔ آپ کی انگلیوں کے نشانات پکڑے جاسکتے ہیں۔" خیام نے رک کر اسے دیکھا۔ بدر کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ ایک طرف خیام اس کے لیے مشکوک تھا اور دوسری طرف۔۔ وہ خیام کے لیے فکر مند تھا! وہ مسکرادیا۔

"فکر مت کرو، اس کیس میں پولیس کو انوالو نہیں کیا جائے گا۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"وارلڈ سر نے کہا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"مگر انہوں نے ایسا کیوں کہا ہے؟"

"فرض کرو مصعب پولیس یہ ثابت کر دے کہ ڈیوڈ کسی ذاتی مسئلے کی وجہ سے قتل نہیں ہوا۔ اگلا شک اس کمپنی پر جائے گا۔ اور کمپنی کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ وارلڈ سر کبھی نہیں چاہیں گے کہ کمپنی کے لیے یہ سوال اٹھے کہ کیا یہ اتنی بڑی کمپنی اپنے ایک ورکر کی حفاظت بھی نہیں کر سکتی؟"!

"لیکن سر۔۔۔ اس اتنی بڑی کمپنی کو کیونکر اس چھوٹے سے سوال سے کوئی فرق پڑے گا؟!" کچھ سوچتے ہوئے بدر نے سوال کیا تھا۔ خیام اس کے سوال پر ٹھٹھک کر رکا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کہ کمپنی کو کیوں اس چھوٹے سے

مسئلے سے فرق پڑے گا؟!

"مصعب تم نہیں جانتے تم نے کیا سوال اٹھایا ہے۔" وہ تیزی سے کہتا آفس کا دروازہ کھولتا باہر کی طرف بھاگا تھا۔ بدر نے حیرت و کم فہمی سے اسے دیکھا۔ یا تو خیام پاگل ہو چکا تھا یا وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ جو بھی تھا بگڑا ہوا تھا۔ بگڑا ہوا اور الجھا ہوا!

☆☆☆

"تو۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟" وہ تیزی سے ہاتھ چلاتا ٹماٹر کاٹ رہا تھا جب پاس کھڑی لڑکی نے اس سے پوچھا۔

"جندل یوسف زئی!" وہ اب سوپ میں چمچ چلا رہا تھا۔

"دکھنے میں تو اچھے خاصے ہو۔۔ پڑھے لکھے بھی لگتے ہو۔۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو تم کر رہی ہو!" وہ کیبنٹ سے باول نکال رہا تھا۔

"ہا۔۔ میری تو قسمت یہاں لے آئی۔۔ ورنہ اس بڑھیا کی خدمت پر میں موت کو ترجیح دیتی۔۔" وہ گہرا سانس لے کر کہتی جندل کو چونکا گئی تھی۔

"بڑھیا؟"

"ایلسا کی بات کر رہی ہوں۔ مارک اور مائک کی ماں۔۔ فالج کی مریضہ ہے۔ نہ بول سکتی ہے، نہ چل پھر سکتی ہے۔ بستر پر پڑی ہوتی ہے کسی مردہ وجود کی طرح۔ خدا کی پناہ!" وہ جھرجھری لیتی کاونٹر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ جندل کے ہاتھ اب سست روی سے چل رہے تھے۔ سبز شرٹ پر سیاہ ایپرن چڑھائے توجہ سے کام کرتا وہ اس لڑکی کو اچھا لگا تھا۔ کسی ریاست کا شہزادہ ہو جیسے!! اس کی پی کیپ اس کے جھکے سر کی وجہ سے اس کے آدھے چہرے کو چھپائے ہوئے تھی۔ ظالم!

"اور ان کی یہ حالت کب سے ہے؟" جندل کی آواز پر وہ ہوش میں آئی۔ پاس رکھی باسکٹ سے سیب اٹھا کر دانتوں سے کاٹا۔

"دو سالوں سے! ویسے اس عورت پر انتہا کا ترس بھی آتا ہے۔ شوہر مہینوں مہینوں اس کی شکل نہیں دیکھتا۔ بڑے بیٹے کو فرصت نہیں ہے۔۔ بس چھوٹا بیٹا ہی ہے جو حقیقتاً اسے ماں کا درجہ دیتا ہے۔ اب وہ بھی مصروف ہے مگر جب بھی گھر آتا ہے پہلے اپنی ماں سے ملتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر اپنے دانت سیب میں گاڑے۔

"ایلسا کے اپنے کوئی گھر والے نہیں ہیں کیا؟"

"میرے خیال سے تو نہیں۔ مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے بیس سال ہونے کو ہیں مگر کبھی بھی ایلسا کے کسی گھر والے کے بارے میں نہیں سنا۔" اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔ جندل کا سوپ تیار ہو چکا تھا۔ وہ اب ٹرالی سیٹ کر رہا تھا۔ وہ لڑکی جھٹکے سے کاونٹر سے اٹھی اور شیلف پر رکھا نمک کا ڈبا اٹھایا۔ سوپ کے باؤل کے پاس آئی اور بے فکری سے نمک اس پر چھڑکنے لگی۔

"کیا کر رہی ہو؟ پاگل ہو کیا؟" اس کا ہاتھ روکتے ہوئے جندل نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔

"آج ہفتے کا دن ہے۔ ایلسا کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر آئے گا اور جب وہ ایلسا کا ہائی بی پی دیکھے گا تو دوائیاں بڑھائے گا۔" جندل نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔

"اور چونکہ ایلسا کی تمام تر ذمہ داری تمہاری ہے تو تم اس کی دوائیوں کے پیسوں سے سب کچھ کرو گی ماسوائے اس کی دوائیاں لینے کے!!" وہ لڑکی مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک سمجھے! اور اب باقی کام میرا۔ میں ہرگز ایلسا کے لیے اپنی خدمات میں کسی کی شراکت داری برداشت نہیں کر سکتی۔۔" مسکرا کر کہتی اپنے بالوں کو جھٹکتی وہ ٹرالی گھسیٹ کر لے جانے لگی۔ جندل نے افسوس سے اس کی

پشت کو دیکھا تھا۔ ہر شخص مطلبی ہے، ہر شخص منافق ہے۔ زمانہ ظالم ہے، انسان انسان نہیں شیطان ہے!!

وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر ایپرن اتار کر کچن سے باہر آیا۔ ایلسا کا کمرہ سامنے ہی تھا۔ وہ وہیں کھڑا اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ برتن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پھر کسی کی چیخ بلند ہوئی اور وہ لڑکی کمرے سے بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

"جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرو ایلسا کا بی پی خطرناک حد تک ہائی ہے۔۔ جلدی کرو اس کی حالت بگڑ رہی ہے!!" وہ چلاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ تمام ملازمین وہاں آچکے تھے۔ جندل کسی خاموش تماشائی کی مانند یہ سب دیکھ رہا تھا۔۔ اسے زمانے کے ظلم پر اپنی بے بسی کا احساس شدت سے ہوا تھا!

☆☆☆

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈیوڈ آخری بار گھر نہیں گیا۔"

"گارڈز کے مطابق وہ سات بجے کے قریب آفس سے نکلا ہے۔ بارہ بجے اس نے مجھے کال کی تھی۔ اور ہاں ان پانچ گھنٹوں میں وہ گھر نہیں گیا!" وہ کرسی پر جھولتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ سیاہ کوٹ کرسی کی پشت پر لٹکا رکھا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی ہوئی تھی، اور شرٹ کے بازو اوپر چڑھا رکھے تھے۔

"تو وہ کہاں تھا؟" وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور پھر اچانک اس کے ذہن میں خیال کوندا۔ وہ تیزی سے لیپ ٹاپ پر جھکی۔

"ڈیوڈ ان آدمیوں میں سے ہے جن کی کمپنی کے پرسنل ڈیٹا تک رسائی ہے۔ اگر وہ گھر نہیں گیا تو یقیناً اسے اندازہ ہو گا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ کوئی کمپنی میں سے ہی اس کے پیچھے ہو!! اور بالفرض اگر ایسا ہے تو۔۔ کمپنی کا کوئی فرد اسے کیوں مارنا چاہے گا؟ کمپنی کے عام ملازمین یہ کر نہیں سکتے اور بڑے بڑے عہدوں

والے یہ کیوں کرنا چاہیں گے؟! ڈیوڈ اپنے کام میں مہارت کی وجہ سے بہت خاص تھا!!" پہیلیاں ہی پہیلیاں تھیں۔ بہت الجھی ہوئی پہیلیاں جن کا کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔ وقت ریت کی مانند پھسل رہا تھا اور وہ ان پہیلیوں کو سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ یہ سب واقعتاً بہت مشکل ثابت ہونے جا رہا تھا!

وہ سوچوں میں گم سامنے دیوار کو تکتا لب دانتوں میں دبائے بیٹھا تھا جب دروازہ بجا۔ اس کے مثبت جواب دینے پر بدر اندر آیا۔

"سر سیکیورٹی کیمراز میں مسئلہ ہو گیا ہے۔ آپ کو سیکیورٹی روم میں بلایا جا رہا ہے۔" اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ اس کے کان میں لگے آلے کے پار یہ الفاظ سن کر سعاد کھل کر مسکرائی۔ خیام کے ذہن میں خیال کوندا۔

"تم جاؤ میں آتا ہوں۔" بدر سر کو جنبش دیتا باہر نکل گیا۔

"یہ تم ہو سعاد؟"

"بالکل! اب جائیں دیکھیں اگر سی سی ٹی وی فوٹیجز مٹا دی گئی ہیں تو یقیناً ڈیوڈ کا قاتل کمپنی میں موجود ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو۔۔ یقیناً ہم اسے بہر صورت ڈھونڈ ہی لیں گے۔" وہ اس کی بات سنتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹائی ٹھیک کرتا وہ کوٹ بازو پر ڈالتا باہر نکل گیا۔ بدر کے ساتھ جب وہ سیکیورٹی روم میں پہنچا تو وہاں بیٹھے وہ دونوں لڑکے اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا ہوا ہے؟"

"ایرر آ رہا ہے سر۔ ہم کچھ بھی دیکھنے سے قاصر ہیں۔" اس نے ایک نظر اسکرین کو دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"اور سمجھنے سے؟"

"سوری سر۔۔" ان دونوں کا سر شرمندگی سے جھکا تھا۔

"آنند کو بلاؤ۔ تب تک میں دیکھتا ہوں۔" وہ کرسی سنبھالتا اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دونوں لڑکے باہر نکل گئے۔ بدر بغور اسے دیکھنے لگا۔ صرف ایک منٹ بعد ایرر ختم ہو گیا یا شاید ختم کر دیا گیا!! وہ تیزی سے انگلیاں چلاتا کل کی فوٹیج ڈھونڈنے لگا۔ مطلوبہ فوٹیج ملنے پر اس نے جلدی سے اسے کاپی کر کے اپنے موبائل میں بھیجا۔ اس کام میں اسے صرف دو منٹ لگے تھے۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا۔ آنند کے ساتھ وہ دونوں لڑکے اندر آئے۔ بدر کی نظر اسکرین پر پڑی اور یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلی تھیں کہ۔۔ وہاں ایک بار پھر ایرر آرہا تھا۔ وہ ہکا بکا خیام کو دیکھے گیا جو پرسکون سا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسے جلدی ٹھیک کرو آنند"!

"اوکے سر۔" وہ ایک نگاہ بدر پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ وہیں ساکت کھڑا رہا۔

اپنے آفس میں آکر اس نے کوٹ واپس کرسی پر لٹکایا اور موبائل آن کیا۔ پہلے سعاد کو فوٹیج بھیجی پھر خود کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

یہ فوٹیج راہداری میں لگے کیمرا نے لی تھی کہ جب۔۔ ڈیوڈ بدحواسی کے عالم میں اپنے آفس سے نکلا۔ اس نے اردگرد دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملازمین اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ صرف کچھ ہی بچے تھے اور وہ بھی دوسری منزل پر تھے۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتا کندھے پر سفری بیگ ٹکائے وہاں سے نکلا۔ اس کا وجود تھرتھرا رہا تھا۔۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ چمکتی پیشانی سے پسینے کی بوندیں گر رہی تھیں۔ ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں۔۔ اور عین اسی لمحے۔۔ جب وہ راہداری پار کرنے والا تھا ایک تیز رفتار گولی اس کی پسلیوں میں جا لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا یقیناً جس نے گولی چلائی تھی وہ وہیں کھڑا تھا مگر کیمرا اس کی تصویر لینے سے قاصر تھا۔ اور پھر وہ پوری ہمت جمع کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکھڑا کر چلتا وہ تیزی سے بھاگنے

لگا۔ بھاگتے ہوئے وہ راہداری میں گم ہو گیا۔ اسے مارنے والا اس کے پیچھے نہیں گیا تھا۔۔ عین ممکن تھا کہ وہ کیمرا دیکھ چکا تھا تبھی اس نے اپنا رخ بدلا تھا!!

موبائل بند کر کے میز پر رکھتے ہوئے اس نے گہری سانس لی۔

"اگر قاتل کمپنی میں سے کوئی ہوتا تو فوٹیج مٹا دی جاتی۔۔ تو اب ثابت ہوا کہ قاتل کا کمپنی سے کوئی تعلق نہیں"!

"مگر یہ مت بھولو کہ ڈیوڈ جس خوف کے زیر اثر تھا اس نے اسی کی آفس میں اسے جکڑا تھا! مزید یہ کہ۔۔ ڈیوڈ کے کندھے پر سفری بیگ تھا۔ یہ وہی سفری بیگ ہے جو اس کے قتل کے وقت اس کے ساتھ تھا۔ اس میں کپڑے بھی تھے۔ یعنی سعاد! ڈیوڈ جانتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اور یہ صرف کل کی کہانی نہیں ہے۔ عین ممکن ہے اس کے قاتل اس کے پیچھے کئی دنوں سے ہوں اور کل وہ یہ شہر یا ملک چھوڑنے والا ہو!!" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔

"تو وہ کل بھاگنے کے بجائے آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟"

"اس نے کہا تھا وہ مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ اسے یقین تھا وہ اسے مار ڈالیں گے۔ ایسے میں اسے وہ راز کسی کو بتانا تھا شاید!" وہ اب دھیرے دھیرے کہانی کا ایک سرا سمجھنے لگے تھے۔

"اس نے خیام حنفی کو ہی کیوں چنا؟"!

"کیونکہ میں اس کمپنی کا مینیجر ہوں!" اس نے جوش سے میز پر ہاتھ مارا۔ "آہ سعاد میں اس کمپنی کے ساتھ بہت لویل ہوں۔ میں ہی ہوں جو اس کمپنی کو کسی بھی قسم کے نقصان سے بچانے کی کوششیں کر سکتا ہوں۔ لہٰذا اگر کسی کو لگے گا کہ کمپنی خطرے میں ہے تو وہ میرے پاس آئے گا"!!

"آپ کہنا چاہ رہے ہیں یہاں مسئلہ صرف کمپنی کا ہے؟"!

"تم ٹھیک سمجھیں!" سعاد نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"اس کے لیپ ٹاپ سے کچھ ملا؟"

"یہ بھرا پڑا ہے۔ مجھے تھوڑا وقت لگے گا اسے چھاننے میں۔ البتہ آپ کے دیے گئے ایڈریس کا پتہ لگ چکا ہے۔ جس آرٹ گیلری میں آپ کو ملنے کے لیے ڈیوڈ نے بلایا تھا، یہ اسی کے قریب ہے۔ آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں مگر صبح! اگر وہ شخص ڈیوڈ کا رازدار ہے تو یقیناً ڈیوڈ کے قاتل اس شخص کے پیچھے بھی ہونگے۔ ہم کوئی خطرہ نہیں مول سکتے۔"

"یہ بہتر رہے گا۔"

"اور سنو۔۔ تم پر حملہ مائک نے کروایا ہے۔ کیوں؟" سعاد کی آنکھیں اس کی بات پر تعجب سے پھیلیں۔

"مائک باربارا؟"

"ہاں! اسٹیون کے خلاف حزب اللہ کے ساتھ ساتھ تم بھی ثبوت ڈھونڈ رہی ہو۔ عین ممکن ہے کہ وہ اسی لیے تمہارے پیچھے ہیں۔۔ تم خطرے میں ہو سعاد!!" اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔ چہرے پر سختی تھی۔ سعاد نے گہری سانس لی۔

"اگر وہ مجھے جانتے ہیں تو یہ اچھا نہیں ہوا! بہر حال۔۔ میں کام جاری رکھوں گی۔ ہم ڈر کر پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔" وہ بول رہی تھی جبکہ خیام۔۔ وہ پرسوچ نظروں سے آفس کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سعاد۔۔۔"

"کہیں۔۔۔"

"تیار ہو جاو۔ تم تھائلینڈ آ رہی ہو!" وہ حکم دے رہا تھا۔ وہ چونک اٹھی تھی۔

”لیکن ہمارے درمیان یہی طے پایا تھا کہ میں جو کروں گی یہیں سے کروں گی!!“ اس نے اسے اپنا معاہدہ یاد دلایا تھا۔

”مجھے لگتا ہے۔۔مجھے تمہاری یہاں ضرورت ہے۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”استاد جی! آپ مان رہے ہیں کہ صرف مجھے آپ کی نہیں آپ کو بھی میری ضرورت ہے؟ سچ میں؟؟“!

”تمہیں اپنے بھائی کو ڈھونڈنے کے لیے میری ضرورت ہے اور ہاں! مجھے مجرم کو پکڑنے کے لیے اپنی شاگردہ سعاد یوسف زئی کی ضرورت ہے۔ اگر اسٹیون کے سامنے تم آشکار ہو چکی ہو تو بہتر یہی ہے کہ اب یہاں آ کر لڑو۔ کم از کم ہم ساتھ ہونگے، اور فتح یا شکست ساتھ جھیلیں گے!“ وہ اپنے ماتھے کو رگڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے پرسوچ انداز میں لب دانتوں میں دبائے۔

”میں۔۔مجھے وقت دیں خیام!“ وہ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”صرف کل تک کا وقت ہے! اور سنو۔۔ ضرار نہیں آیا؟ اصولاً تو حزب اللہ کے کسی کمانڈر کے ساتھ اسے اس وقت تمہارے گھر ہونا چاہیے تھا۔“

”میں نے منع کر دیا۔ آج کام زیادہ ہے تو طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے کل آنے کا کہا ہے۔ کل تک میں تھائیلنڈ آنے کے لیے بہترین بہانہ بھی سوچ لوں گی جو جندل کے جاسوسوں کو مطمئن کر سکے۔“ وہ اس کی بات پر ہلکا سا مسکرا دیا۔ عین اس لمحے دروازہ کھلا اور بدر اندر آیا۔

”آپ کو فوراً آنا چاہیے خیام سر!“ اس کے چہرے کی رنگت فق تھی۔ خیام ناسمجھی سے اسے دیکھتا اس کے ہمراہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"تم تم خیام حنفی تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ ڈیل کینسل کرنے کی؟ تمہیں اندازہ ہے تم نے میرا کتنا نقصان کیا ہے؟!"
وہ جیسے ہی بدر کے ہمراہ میٹنگ روم میں داخل ہوا تو ایک شخص اس کی طرف بڑھتا غصے سے چلایا۔ یہ فرڈنینڈ کمپنی کا سی ای او تھا!!

"آپ کا غصہ ایک طرف مسٹر لیکن آداب کے دائرے میں رہیں گے تو اچھا ہوگا۔" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا اس کے عین روبرو کھڑا ہوا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔

"اب تم مجھے آداب سکھاؤ گے؟ ہو کون تم؟ صرف ایک معمولی سے ملازم!! حیثیت کیا ہے تمہاری، ہاں؟!" وہ شخص غصے سے بکتا آگے بڑھا تھا اور عین اسی لمحے بدر کو اپنے قدم بڑھتے محسوس ہوئے تھے۔ وہ دھیرے سے خیام کے آگے آیا تھا۔ سخت نظروں سے اس شخص کو دیکھا۔

"سر اگر کہہ رہے ہیں کہ تمیز سے رہیں تو اس کا مطلب ہے تمیز سے!! اب اگر ایک قدم آگے بڑھایا تو کسی بھی آرڈر کی ضرورت محسوس کیے بنا آپ کو کمپنی سے اٹھا باہر پھینکوں گا!" وہ بدر تھا۔ اسے خود پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ سختی تھی اور آنکھوں میں حد درجے کا غصہ تھا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا اس شخص کا خیام سے اس لہجے میں بات کرنا۔۔ وہ نہیں جانتا تھا کیوں پر وہ اس شخص کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر گیا تھا۔ اس کے عقب میں کھڑا خیام دھیرے سے مسکرایا تھا۔ بدر واپس اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔۔۔ خیام سے ایک قدم پیچھے۔۔ ہاتھ باندھے نظریں سامنے ٹکائے!

"آپ اگر تمیز سے پیش آتے تو یقیناً میں اس ڈیل کی دس برائیاں بتا دیتا جو وارلڈ گلاس کمپنی کو نقصان پہنچانے والی تھی۔ مگر اب اس ڈیل کو کینسل کرنے کی یہی وجہ کافی ہے کہ۔۔۔ آپ اس لائق نہیں ہیں کہ آپ کو یہ پراجیکٹ دیا جائے! جو شخص ادب کرنا نہیں جانتا وہ زمانے میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور ایسا شخص کبھی آگے نہیں بڑھ

سکتا۔۔نہ وہ نہ اس کے ساتھ چلنے والے!!" وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کہتا اس شخص کو پل میں بہت کچھ جتا گیا تھا۔

"تمھیں اندازہ بھی نہیں ہے تم نے کیا کِیا ہے خیام حنفی! میری کمپنی کے شیئرز گر گئے ہیں۔ کمپنی کو مسلسل نقصان ہو رہا ہے یہاں تک کہ میرے پاس صرف یہ ہفتہ ہے عین ممکن ہے اگر حالات نہ بدلے تو کمپنی بند ہو جائے گی!"

اس بار۔۔اس کی آواز قدرے دھیمی تھی۔ رحم مانگتی نظروں سے اسے دیکھتا وہ سر جھکا گیا۔

"میں یقیناً آپ کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرتا مگر۔۔یہ بزنس کی دنیا ہے۔ یہاں ایک کا عروج دوسرے کا زوال ہوتا ہے۔ اور کون ہے جو عروج نہیں چاہتا؟! کل تک ہمیں زوال کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرنے والے اگر آج خود زوال کی طرف گرتے جا رہے ہیں تو یہ کمپنی انھیں سہارا دینے کے بجائے خود آگے بڑھنا پسند کرے گی! یہی دستور ہے جسے نہ اپنایا تو انسان بھاری بوجھ کی وجہ سے چاروں شانے چت ہو جائے گا، پورے وجود کے ساتھ گرے گا!!" میٹنگ روم میں۔۔ایکدم سناٹا چھا گیا تھا۔ سب دم بخود سے تھے۔ وہ شخص تعجب و بے یقینی سے خیام کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ہرگز اس سے اس سنگدلی کی امید نہ تھی۔ خیام سنجیدہ تھا بالکل سنجیدہ! چہرہ بے تاثر تھا۔ اور بدر۔۔وہ سانس روکے خیام کو دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص سچ بولتا تھا۔ حقیقت بیان کرتا تھا اور بہت آرام سے وہ آئینہ دکھا دیتا تھا جو انسان کبھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ ۔۔وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔۔یہاں ایک کا زوال دوسرے کا عروج ہوتا ہے۔ اور کون ہے جو عروج نہیں چاہتا؟ بھلے اس کے لیے دوسرا مسلسل پستی کی طرف ہی کیوں نہ گرتا جائے!!

"آپ جا سکتے ہیں۔" آواز میں سختی تھی۔ وہ شخص زہر کے گھونٹ بھرتا وہاں سے جانے لگا جب اس کی نظر دروازے میں کھڑے ابراہم وارلڈ اور ازابیلا پر ٹکی۔ وہ نظریں چراتا ایک طرف سے نکل گیا۔ وہ دونوں اندر آئے۔ خیام نے مڑ کر انھیں دیکھا۔

"سر آپ۔" وہ آگے بڑھا۔ وارلڈ نے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔

"تم دن بہ دن میری نظروں میں اپنا مقام بڑھا رہے ہو خیام!" وہ مسکرایا تھا۔ ان کی آواز سنتی سعاد نے غصے سے دانت کچکچائے تھے۔

"خیام میں نے منع کیا تھا آپ وارلڈ سے نہیں ملیں گے! میں نے دو گھنٹے لگائے تھے آج کا اسکرپٹ لکھنے میں۔۔ بد تمیز، گورخر، جنگلی نالائق خیام آپ کبھی میری بات نہیں مانتے!!!" وہ اس کے کان میں چلائی تھی۔ خیام نے مسکراتے ہوئے وارلڈ کو دیکھا پھر گردن کو ذرا سا خم دیا۔

"یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے!" وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ایک نمبر کے جنگلی گدھے ہیں آپ! مجھ سے اب کوئی امید مت رکھیے گا کہ میں تھائلینڈ آؤں گی"!!

"آپ کا آنا میرے لیے باعث شرف ہے مادام!" وہ ازابیلا سے مخاطب تھا۔ اور یقیناً وہ اس سے مخاطب نہیں ہوتا اگر اسے سعاد کو جواب نہ دینا ہوتا تو!!

"میں نے سنا ہے آج صبح یہاں کے ایک employee کا قتل ہوا ہے؟"

"جی بالکل۔ ڈیوڈ نام ہے مقتول کا"!

"بابا آپ کی اجازت ہو تو میں ڈیوڈ کی آفس دیکھنا چاہوں گی۔ پلیز!!" اس نے معصومیت سے وارلڈ کو دیکھا۔ وارلڈ گہری سانس لیتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گیا۔

"خیام تمہیں راستہ دکھا دے گا۔"

"تھینک یو سو مچ!" وہ کھل کر مسکرائی۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری۔ خیام نے بغور اس چمک کو دیکھا تھا۔ سماعت سے زیاد کی آواز ٹکرائی تھی۔ "وہ روئی تھی، بے تحاشا روئی تھی کہ وارلڈ نے صحافت کی طرف بڑھتے اس

کے قدم روک دیے تھے"!!

"چلیں؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ خیام سر کو ذراسی جنبش دیتا آگے بڑھا۔

"واللہ خیام واللہ! میرا دل کر رہا ہے آپ میرے سامنے ہوں اور میں گلا دبا دوں آپ کا! نالائق کہیں کے ایک اسکرپٹ پر عمل نہیں ہوتا ان سے!!" وہ ہنوز اس کے کان میں چلا رہی تھی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ پھر غیر محسوس طریقے سے ازابیلا سے ایک قدم پیچھے ہوتے ہوئے اس نے دبی دبی آواز میں کہا تھا،

"میرے کان میں مکھی کی طرح مت بھنبھناو سعاد"!!

☆☆☆

وہ آفس کا دروازہ کھولتا اندر آیا۔ اس کے پیچھے ہی ازابیلا اور بدر اندر آئے۔ بدر دروازہ بند کرتا دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ خیام پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پشت دیوار سے ٹکائے ازابیلا کو دیکھنے لگا جو میز کے پاس کھڑی بغور ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔

"قتل کب ہوا تھا؟"

"صبح سات بج کر پانچ منٹ پر"!

"آخری بار ڈیوڈ کہاں پایا گیا ہے؟"

"آفس میں۔۔ اس کے بعد نہیں معلوم وہ کہاں گیا۔ بس صبح آرٹ گیلری کے پاس اس کی لاش ملی۔" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتا اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

"پولیس کو انوالو کیا؟"

"کچھ خاص نہیں! ڈیوڈ لاوارث ہے اور لاوارثوں کی موت شاید یونہی ہوتی ہے۔ اجنبی راستوں پر۔۔ غیر متوقع

وقت میں وہ مار دیے جاتے ہیں۔۔ موت کے بعد کفن مل جائے بہت بڑی بات ہے۔ اس بھاگتی دوڑتی دنیا میں لاوارثوں کے لیے لڑ کر کوئی پیچھے نہیں رہ جانا چاہتا، مادام!'' ازابیلا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔۔ بالکل بے تاثر!

''اس کمپنی کا کیا جس کی ڈیوڈ نے پچھلے دس سالوں سے خدمت کی تھی؟ کیا کمپنی اس کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتی؟'' اس کے لہجے میں جھلکتی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے بدر نے خیام کو دیکھا۔ غالباً اس کا جواب سننا چاہا۔

''کمپنی اس کی اس دس سالہ خدمت کا انعام وقت کے ساتھ ساتھ دیتی رہی ہے۔ میں نے کہا ناں مادام! لاوارثوں کے لیے لڑ کر کوئی پیچھے نہیں رہ جانا چاہتا''!!

''ایک لمحے کے لیے سوچیں خیام! آج ڈیوڈ ہے، کل اگر آپ ہوں تو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

''آپ میرے لیے لڑیں گی؟'' وہ مسکرایا۔ ہلکا سا۔ ازابیلا نے لب دانتوں سے کاٹتے ہوئے اسے دیکھا جو صفائی سے بات گول کر گیا تھا!

''آپ ڈیوڈ کے لیے لڑیں گے؟'' ٹھیک تاک کر جواب دیا تھا اس نے۔

''کیا آپ یہ چاہتی ہیں؟''

''کیا آپ کے لیے میری چاہت معنی رکھتی ہے؟''

''بالکل! آپ وارلڈ سر کی بیٹی ہیں۔ آپ تقریباً میری باس ہیں۔'' اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔

''اگر میں آپ کی باس ہوں۔۔ تو میں آپ کو حکم دے رہی ہوں ڈیوڈ کے معاملے میں پولیس کو انوالو کریں یا کچھ بھی کریں! ڈیوڈ کے قاتل کو ڈھونڈیں اور ثابت کریں کہ۔۔ کچھ لوگ لاوارثوں کے لیے لڑتے ہوئے بہت آگے چلے

جاتے ہیں۔۔وہ دنیا کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں!" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی۔خیام نے پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"بدلے میں مجھے ایک وعدہ چاہیے!" وہ آگے آیا۔عین اس کے روبرو کھڑا ہوا۔آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔"آپ صحافت میں واپس آئیں گی!" اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔چند پل وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"آپ جانتے ہیں یہ ناممکن ہے!" وہ تلخی سے مسکرائی۔"میں بابا کے حکم کے خلاف نہیں جاسکتی"!

"کیوں؟ میں وارلڈ سر کے اصولوں کے خلاف جاکر ڈیوڈ کا مقدمہ لڑ سکتا ہوں، تو آپ کو کونسی چیز اپنے لیے لڑنے سے روکے ہوئے ہے؟"

"آپ مجھے الجھا رہے ہیں!!" وہ بے چین ہوئی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مادام!میری بات پر غور کیجیے گا۔کیا خود کو وقت کی آندھیوں کے سپرد کر دینا ازابیلا وارلڈ کو زیب دیتا ہے؟!وہ ازابیلا جو دوسروں کے لیے لڑتی تھی، کیا اپنی جنگ ہار جانا اس کے لیے مناسب ہے؟!" وہ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔دھڑکنیں منتشر ہوئی تھیں۔سامنے کھڑا وہ شخص۔۔۔اس کے بنائے گئے آئینوں میں سچائی دیکھنا کٹھن تھا۔جب وہ خود کو قدرے سنبھال چکی تھی تو وہ اسے توڑ رہا تھا۔۔اور وہ کمزور تو نہیں تھی کہ آسانی سے ٹوٹ جاتی!!ازابیلا بہت بہادر ہے!!

"آپ نے کبھی رشتوں کا نام سنا ہے خیام؟!یہ بہت انمول ہوتے ہیں۔ان رشتوں کے لیے انسان خود کو مار دیتا ہے میں نے تو بس اپنے شوق کو مارا ہے۔میں باغی نہیں بننا چاہتی کیونکہ سنا ہے۔۔۔جو بغاوت کرتا ہے وہ اپنے لیے بغاوت کھڑی کرتا ہے۔صحافت نہیں تو نہ سہی!" وہ کندھے اچکا گئی۔خیام چند پل اسے دیکھتا رہا پھر پلٹ گیا۔

"مصعب مادام کو وارلڈ سر کے آفس تک چھوڑ دینا!" وہ بدر کو حکم دیتا کمرے سے نکل گیا۔ازابیلا اس کے جاتے ہی

نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھی تھی۔

"کیا شخص ہے تمہارا باس بدر؟!" وہ سر ہاتھوں میں گراتے ہوئے ہوچھ رہی تھی۔

"میں خود پریشان ہوں بیلا باجی!!" اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی تھی اور پھر آفس میں خاموشی چھاگئی۔

☆☆☆

مکمل تاریکی میں ڈوبا یہ کمرہ برف جیسا یخ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ گلاس وال پر پردے ڈالے ہوئے تھے کہ چاند کی مدھم سی روشنی بھی اندر آنے سے قاصر تھی۔ وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے سر ہاتھوں میں دیے بیٹھا تھا۔ سر کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آنکھیں خطرناک حد تک سرخ پڑ رہی تھیں۔ وہ بے تحاشا خوف میں مبتلا تھا۔ خوف آنے والے وقت کا! اور پھر اس کے برابر میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔ مکمل خاموشی میں یہ تھرتھراہٹ عجب پراسرار سی لگی۔ موبائل کی روشن اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھ کر صحیح معنوں میں اسے اپنی ہوائیاں اڑتی محسوس ہوئیں۔ سانس روکے اس نے موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

"ہیلو۔۔۔بابا۔۔" اس کی آواز سرد سی تھی۔۔ سرد اور پر خوف سی۔۔

"تم سے ایک کام نہیں ہو سکا مائک؟ تم اس لڑکی کو کیسے جانے دے سکتے ہو؟ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ اس لڑکی کی ہر سانس تمہارے باپ کو موت کے قریب کر رہی ہے؟!" دوسری طرف اسٹیون غصے سے چلایا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹا۔

"آئی ایم سوری بابا۔۔ میں بس اسے مارنے والا تھا کہ۔۔"

"کہ؟؟ اپنے بہانے اپنے پاس رکھو! تم ایک لڑکی کو نہیں مار سکے۔ مائک تم تم ہمیشہ سے ہی بزدل تھے۔ نکمے اور نالائق! کچھ اپنے بھائی سے ہی سیکھ لو۔" بھائی کے طنز پر وہ تلملا اٹھا تھا۔ چہرہ مارے غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے

شدت سے اپنی کل ہوئی بے عزتی یاد آئی تھی۔

”خدا کی قسم اگر آپ اسی طرح مجھے بزدل کہتے رہے تو جو پہلا قتل میرے ہاتھوں ہو گا وہ بھائی کا ہی ہو گا!“ اس نے زور سے سائیڈ ٹیبل کو لات ماری۔ کانچ کی کئی چیزیں چھناکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتیں فرش پر بکھر گئیں۔ ٹیبل ایک طرف اوندھے منہ جا گری۔

”تم اتنے بہادر کبھی نہیں ہو سکتے!“ اسے ایک لمحے کے لیے اپنے باپ پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ اپنے ایک بیٹے کے ہاتھوں دوسرے بیٹے کے قتل کو بہادری کہہ رہا تھا۔ اسے زبردستی اکسا رہا تھا کہ وہ واقعی یہ کام کر ڈالے!

”تو۔۔ اگر میں بہادر نہیں ہوں تو اپنے اس بہادر بیٹے کے پاس جائیے۔ اس سے کہیں کہ آپ کے تمام مسئلے حل کر دے۔ لیکن وہ تو آپ کی پیٹھ پر چھرا گھونپ چکا ہے ناں؟ اس کی وجہ سے آپ اپنے ہی ملک نہیں لوٹ سکتے۔ آپ کا عظیم بہادر بیٹا مارک بار بارا۔۔ اس نے آپ کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اسی لیے اس وقت جو بیٹا ساتھ ہے اسی کو برداشت کر لیں۔ مجھے مت اکسائیں کہ میں بھی بھائی کے ساتھ ہو جاوں۔ جہاں تک بات ہے اس لڑکی کی تو۔۔ اس کی جان میں اپنے ہاتھوں سے لوں گا۔“ اس نے زہر آلود لہجے میں بات مکمل کرتے ہوئے موبائل زور سے بیڈ پر پھینکا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے اسے اپنے تن بن میں آگ لگتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے اس آگ میں خود کو نہیں، اپنے باپ کے اس بہادر بیٹے کو جلانا تھا جس سے چاہ کر بھی وہ نفرت نہیں کر پاتا تھا۔ اس سے ذلیل ہونے کے باوجود۔۔۔ وہ پلٹ کر وار کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بزدل ہی تھا جو اپنے قابلِ نفرت بھائی سے محبت کرتا تھا!!

☆☆☆

دھیرے دھیرے تاریک ہوتی رات ہر منظر اپنی تاریکی میں سمیٹ رہی تھی۔ سڑک کنارے ریستوران کی بلند و بالا عمارت برقی جگنوؤں کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ بیشتر افراد رات کی تاریکی سے لڑتی روشنیوں کے سائے میں سڑک کنارے لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔۔ وہ۔۔ مصعب الزرقاوی!

دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھے بے چینی سے دایاں پاؤں زمین پر مارتا وہ اردگرد دیکھتا کسی کے انتظار میں تھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، کسی کو فرصت نہیں تھی۔ اردگرد نظریں گھماتے ہوئے آخر کار اسے پارکنگ میں کھڑی ہوتی اس کی گاڑی نظر آ ہی گئی۔۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ گاڑی سے نکل کر سڑک پار کرتے ہوئے اسی طرف آ رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں۔۔ سنہری روشنیوں میں نہاتا خیام حنفی!

”آپ کو ایسا کیونکر لگا خیام کہ وہ شخص جو حزب اللہ کے لیے چنا جا چکا ہے، حزب اللہ اس کا ڈیٹا رہنے دے گی؟ ہر ہر چیز، ہر ہر بات مٹا دی گئی ہے مصعب کے متعلق“!

”تم آج کل مجھے بالکل بھی کوئی تسلی بخش کام کر کے نہیں دے رہیں، سعاد!“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نگاہیں اپنی راہ پر مرکوز تھیں۔

”باوجود اس کے میں تھائلینڈ نہیں آؤں گی! جب آپ میرے لکھے اسکرپٹ پر عمل نہیں کر سکتے تو مجھ سے یہ امید مت رکھیے گا!“ اس کے تڑخ کر کہنے پر وہ محظوظ ہوا۔

”آہ سعاد! تمہیں ایسا کیونکر لگتا ہے کہ میں نے تمہارا آنا نہ آنا تم پر چھوڑا ہوا ہے؟ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تم آ رہی ہو۔ تمہاری مرضی اس سلسلے میں کوئی معنی نہیں رکھتی!“ محظوظ ہو کر کہتا وہ مقابل کو سلگا گیا تھا۔

”میری بلا سے بھاڑ میں جائیں!!“ اس نے دوسری طرف زور سے کوئی چیز پٹخی تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔ بدر حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا جو ہنستے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ رہا تھا۔ اس کے باس کافی خوشگوار موڈ میں تھے!!

"کیسے ہو مصعب؟" وہ اپنا موبائل اور والٹ میز پر رکھتا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"شاید میں ٹھیک نہیں ہوں!!" وہ رکا۔ بغور اسے دیکھا پھر قدرے توقف سے گویا ہوا۔ "میں نے آپ کی آفس میں وہ نقشہ دیکھا تھا جس میں کسی تہہ خانے کی نشاندہی کی گئی تھی۔" وہ صاف گوئی سے کام لے رہا تھا۔ خیام نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ دل ہی دل میں ڈھیروں گالیوں سے اس خبیث زیاد کو نوازا جو ہر طرف سے اسے بدنام کرنے پر تلا ہوا تھا!!

"تو؟"

"تو یہ کہ وہ نقشہ آپ کے پاس کیوں ہے؟ اور روفی نے آپ کو کیا پیغام دیا تھا؟"

"مصعب! تم ایک طرف اپنے باس پر شک کر رہے ہو اور دوسری طرف اب تمہیں اپنے خرگوش کے خرگوش ہونے پر بھی شک ہونے لگا ہے؟ یاد دلاتا چلوں روفی تمہارے خرگوش کا نام ہے، کبوتر کا نہیں!!" بدر کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔

"مجھے سچ بتائیں"!

"ورنہ؟" اس نے دائیں ابرو اچکائی۔

"میں وارلڈ سر کو اس سب سے آگاہ کر دوں گا!" خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر کھسک کر آگے ہوا۔ بغور بدر کو دیکھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے مصعب کون ہو تم؟! صرف ایک معمولی سے ملازم جس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے۔ جو صرف ازابیلا کی سفارش پر کمپنی میں آیا ہے اور۔۔ جس کی حیثیت صرف ایک فضول شے سی ہے!! کس کو ہے تمہاری ضرورت؟ تم سے پہلے بھی میرے کام ہو رہے تھے تمہارے بعد بھی ہو رہے ہیں۔ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ہے

مصعب! اپنی طاقت ضائع مت کرو۔ یہاں کوئی تمہاری بات پر کان نہیں دھرے گا!!" سنہری روشنیوں میں دمکتا بدر کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ وہ لب بھینچے بمشکل ضبط کیے بیٹھا تھا۔ اور پھر بمشکل وہ بول پایا تھا: "میں ایک فضول شے نہیں ہوں، خیام سر!" یہ وہ لمحہ تھا کہ۔۔ اگر کوئی بھی بدر کو دیکھتا تو پگھل جاتا۔ اس کی معصومیت کے آگے ہتھیار ڈال دیتا مگر۔۔

"تم ہو مصعب! میں نے کہا ناں کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ہے"!!

"میں ثابت کروں گا میں ایک فضول شے نہیں ہوں"!!

"کیسے؟"

"آپ اپنی سیکریٹری کو اور ڈرائیور کو فارغ کر رہے ہیں۔ آج سے میں آپ کا سایہ بن کر آپ کے ساتھ رہوں گا اور آپ سے متعلق جو حقیقت مجھ سے مخفی ہے اسے تلاش کروں گا!" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے یہ سب کچھ کر کے تم اپنی اہمیت کو واضع کر سکتے ہو؟"

"میں ثابت کر سکتا ہوں کہ۔۔ آپ کو میری ضرورت ہے!!" وہ ہنس دیا۔ سر جھٹک کر ہنس دیا۔ بدر نے لب دانتوں میں دبائے۔

"تم میرا سایہ بن کر بھی رہو مصعب تب بھی تم اس کے سوا کچھ نہیں جان سکتے جس کی میں اجازت دوں۔ تم وہی دیکھو گے جو میں تمہیں دکھانا چاہوں گا، تم وہی سنو گے جو میں تمہیں سنانا چاہوں گا یہاں تک کہ تم وہی کرو گے جو میں تم سے کروانا چاہوں گا۔۔ تو کوشش جاری رکھو مصعب!" اور یہ وہ لمحہ تھا جب بدر کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر لہرایا جب خیام نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اور پھر آگے اس نے وہی کیا تھا جو وہ کروانا چاہتا تھا۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت سموئے اسے دیکھا تھا جو ذرا سا۔۔ بالکل ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔ سنہری روشنیوں

کے سائے میں بیٹھا یہ ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والا لڑکا اپنی چال چل چکا تھا۔ یہاں تک کہ۔۔ اسے اندازہ ہوا کہ۔۔ وہ اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ لے چکا تھا کیونکہ خیام یہی چاہتا تھا۔ افف افف! اسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"آج تم نے میری مدد کیوں کی؟" یہ وہ سوال تھا جس سے بدر بچنا چاہتا تھا۔۔ مگر خیام اسے ناممکن بنا چکا تھا۔

"وہ ایک احساس جو۔۔ آپ کے مجھے گلے لگانے سے میں نے محسوس کیا، اسی احساس نے یہ سب کچھ مجھ سے کروایا۔ آپ کی وہ ایک محبت بھری تھپکی۔۔۔ مجھے آپ کا مقروض بنا گئی۔۔ آپ نے مجھے خرید لیا، خیام سر!" وہ زخمی سا مسکرایا تھا۔

"تم بہت کم قیمت پر بکے مصعب!" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

"محبت سے زیادہ انمول کچھ نہیں۔ محبت کے آگے سب ہیچ ہے، بے مول ہے"!

"تم بہت معصوم ہو مصعب!" اس نے دل سے اعتراف کیا تھا۔ بدر نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں میں نمی پھگلتی محسوس ہوئی تھی۔ ایک طرف احساس جرم تھا دوسری طرف وہ احساس جس سے وہ سالوں بعد آشنا ہوا تھا۔ اسے نہیں یاد آخری بار اسے کس نے یوں گلے لگایا تھا؟ ہاں تب جب اس کے دادا اسے اس اجنبی سرزمین پر تنہا چھوڑ کر جا رہے تھے تب وہ بہت تڑپا تھا صرف ایک بار انہیں گلے لگانے کے لیے مگر وہ اس کی ہر خواہش ٹھکرا کر چلے گئے تھے۔۔ اور اب۔۔ سالوں بعد۔۔ جب خیام نے اسے گلے لگایا تو۔۔ اسے محسوس ہوا کہ بدر کو یہ شخص بہت عزیز ہو گیا تھا۔۔ وہ مشکوک تھا مگر تمام تر شکوک سے بلند تر وہ اسے عزیز ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔۔ ہر قدم پر۔۔ شانہ بشانہ۔۔ برابر برابر!!

کچھ دیر کے بعد وہ اداسی سے کھڑا اسٹرک پار کرتے خیام کو دیکھ رہا تھا۔ خیام جو سعاد سے کہہ رہا تھا کہ: "وہ بہت

معصوم ہے سعاد! مجھے ڈر ہے وہ اپنی اس معصومیت کا سہارا لے کر میرے دل میں گھر بنا لے گا۔ وہ مجھے عزیز ہو جائے گا سعاد"!

لمحہ لمحہ پگھلتی رات میں اس کی یہ خوف سے بھری سرگوشی کئی پل اس کے اپنے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔۔ اور اس سے دور۔۔ بے مقصد سڑکوں پر پھرتے بدر نے جب سر اٹھا کر تنہا چاند کو دیکھا تھا تو اسے اپنی آنکھوں سے لڑھکتی نمی اپنے گالوں پر محسوس ہوئی تھی۔ اس کے لبوں میں جنبش ہوئی تھی۔۔

"آپ مجھے ہر لمحہ۔۔ ہمیشہ۔۔ اپنے ساتھ یا خود سے ایک قدم پیچھے کھڑا پائیں گے سر! بدر جان دے کر بھی ساتھ نبھانے والوں میں سے ہے۔۔!!" اس کی آواز میں گھلتی نمی لمحہ لمحہ پھگلتی رات میں کہیں گم ہو گئی۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ دیر کے بعد تاریک رات کی تاریکی ہر منظر کو نگل گئی تھی!!

☆☆☆

یہ فجر کا وقت تھا۔ رات کا زور مکمل طور پر نہیں ٹوٹا تھا۔ ہوا میں شبنم کی نمی تھی۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر لمبی سی سفید چادر اوڑھے باہر صحن میں آئی تھی۔ چہرہ چمک رہا تھا البتہ آنکھیں بے آرامی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ باغیچے کے پاس کھڑی نم پودوں کو دیکھ رہی تھی۔ باغیچے میں پھیلی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ فضا میں شبنم کی نمی عجب سرور سا بخش رہی تھی۔ وہ سوچوں کے جال سے آزاد بس خاموشی سے اپنے چھوٹے سے باغیچے جو دیکھ رہی تھی کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ ابھی تو اندھیرا ابھی نہیں ختم ہوا تھا تو اس وقت کون آسکتا تھا؟ اس نے ایک نگاہ دروازے پر ڈالی پھر تیزی سے اندر آئی۔ زینے چڑھ کر اپنے کمرے کے ٹیرس میں آئی اور نیچے جھانکا۔ وہاں گلی میں ضرار کھڑا تھا۔ اور ساتھ ہی کوئی دوسر آدمی تھا۔ وہ گہری سانس لیتی پیچھے ہٹی۔ جلدی سے حجاب اٹھایا۔ چادر ایک طرف رکھی اور حجاب اوڑھا۔ ساتھ ہی چہرے پر سیاہ رنگ کا ماسک

لگایا۔ کبڈ سے شال نکال کر شانوں پر ڈالی اور پھر نیچے آئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے سنجیدگی سے انہیں دیکھتی سعاد بیٹھی تھی۔

"پرسوں آپ پر ہوئے حملے کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں سعاد؟ کوئی اندازہ کون تھے؟ کیوں آئے تھے؟!" ضرار کے برابر میں بیٹھا شخص اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور وہ دونوں جو اسی جواب کی امید رکھتے تھے ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔

"سعاد دیکھیں۔۔ ہم ہر وقت ہمیشہ آپ کی حفاظت کے لیے کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ تھوڑا سا تعاون کریں تو ہم اس سب سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں"!

"آپ بھی تھوڑا سا تعاون کرتے ہوئے مجھے میرے بھائی کے بارے میں بتا دیں۔ یقیناً سب ٹھیک ہو جائے گا!" اس کے طنزیہ کہنے پر ضرار پہلو بدل کر رہ گیا۔

"اپنے بھائی کے لیے۔۔ پلیز!!" وہ اس شخص کو دیکھ کر رہ گئی۔ اب بات بھائی کی تھی وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی تبھی گہری سانس لے کر گویا ہوئی۔

"میں نہیں جانتی وہ کون تھے۔۔ البتہ۔۔ ان کا سربراہ انگریزی بول رہا تھا۔ لہجے سے وہ غیر ملکی معلوم ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ۔۔۔ مجھے شک ہے وہ جندل کو جانتا ہے۔ اور میں نہیں جانتی یہ آپ کے لیے مددگار ثابت ہوگا یا نہیں لیکن۔۔ جب وہ منفرد انداز میں پستول گھماتا آگے آیا تھا تب۔۔ اس کے دائیں بازو پر ہتھیلی سے ذرا اوپر ٹیٹو بنا ہوا تھا۔" اس نے بات ختم کی۔ ضرار فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"آپ اس کی نشاندہی کر سکتی ہیں؟" وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ وہ اپنا موبائل نکالتا آگے ہوا۔ اسکرین اس کے سامنے کی۔ وہ چند لمحے مختلف تصاویر دیکھتی رہی پھر ایک تصویر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہی ڈیزائن تھا۔"

"بہت شکریہ سعاد! آپ کو کچھ اور یاد ہے؟ کچھ غیر معمولی؟"!

"نہیں۔۔" وہ شخص سر کو جنبش دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ حافظ۔ضرار جلد ہی اس مسئلے کو حل کرلے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔" الوداعی کلمات کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ ضرار اسے دروازے تک چھوڑنے گیا تھا۔ وہ اس کی واپسی تک وہیں بیٹھی رہی۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آگیا۔

"تم لوگ تھک نہیں گئے میری ضد سے؟!" جھک کر میز سے اپنا موبائل اٹھاتے ضرار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"نہ میں پیچھے ہٹ رہی ہوں، نہ تم لوگ میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال رہے ہو کب تک چلے گا یہ سب؟ کچھ اور نہیں تو کم از کم مجھے میری حال پر چھوڑ دو!" وہ اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرتا سیدھا کھڑا ہوا۔

"آپ چاہتی ہیں آپ کی حفاظت کرنا چھوڑ نا دیں؟!" وہ دھیرے سے سر اثبات میں ہلا گئی۔

"آپ کو لگتا ہے ہم یہ آپ کے لیے کر رہے ہیں؟!" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا صوفے پر بیٹھا۔ سعاد خاموش رہی تو وہ قدرے توقف سے گویا ہوا۔ "ہمیں آپ سے کچھ نہیں چاہیے سعاد! اس دن جب آپ حزب اللہ میں شمولیت اختیار کرنے سے انکار کر کے گئی تھیں ہمارے اور آپ کے راستے اسی دن جدا ہو گئے تھے۔ اگر کچھ ہے جو آپ کو اور ہمیں جوڑے ہوئے ہے تو وہ آپ کے بابا اور بھائی ہیں! جندل اللہ کا وہ کمانڈر جس نے تنظیم کی خاطر جان دے دی ہمارے لیے اتنی معنی رکھتا ہے کہ اس کے بعد ہم اس کی بیٹی کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ حزب اللہ کا وہ مجاہد جس نے تنظیم کی خاطر اپنی بہن کو تنہا چھوڑا ہوا ہے، اتنا حق رکھتا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں تنظیم اس کی بہن کی حفاظت کو یقینی بنائے۔ آپ سعاد آپ! آپ اگر ایک معمولی لڑکی ہوتیں تو کب کا ہم آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتے۔ مگر یہ وہ قرض ہے جو ہمیں ایسا کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ آپ

کے بابا، آپ کے دو بھائی۔۔۔ تنظیم کی نظر میں اگر آپ قابلِ احترام ہیں تو انہی کی وجہ سے! آپ بھلے حزب اللہ میں سے نہیں ہیں مگر حزب اللہ کا ہر مجاہد اس لڑکی کو جانتا ہے جس نے اپنے باپ کے بعد اپنے دو بھائیوں کو بھی تنظیم کے حوالے کیا ہوا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ۔۔ حزب اللہ چاہ کر بھی آپ سے منہ نہیں موڑ پا رہی۔۔ ہم چاہ کر بھی آپ کو آپ کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے۔" وہ اسے صرف چند الفاظ کی مدد سے۔۔ بہت کچھ باور کرا گیا تھا۔ یعنی ایک طرف وہ کچھ بھی نہیں تھی مگر ایک طرف وہ بہت کچھ تھی!

وہ چند لمحے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ خاموشی سے۔۔ لب دانتوں میں دبائے۔ اب اس بارے میں کچھ کہنے یا سننے کو باقی نہیں تھا۔ ماحول خاصا سنجیدہ تھا۔ ضرار اسے سننے کے لیے تیار تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے لگا اب وہ اپنی بات آسانی سے منوا سکتی ہے، کیونکہ بقول اس کے وہ اس کے لیے بہت محترم تھی! اور پھر کچھ دیر کے بعد وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی کہ: "مجھے یہاں سے جانا ہے۔۔ کہیں دور۔۔ کچھ وقت کے لیے میں اس سب سے بھاگنا چاہتی ہوں۔" ضرار نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ التجا کرتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مان سے یقین سے کہ وہ اسے منع نہیں کرے گا!

"کہاں جائیں گی؟"

"کہیں بھی بس یہاں سے دور۔" وہ کندھے اچکا گئی۔

"کب جانا ہے؟" وہ گہری سانس لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے فوراً مان جانے پر کھلکھلا اٹھی تھی۔

"تمہارا بہت شکریہ ضرار! اب تم حرم کو بھی منا لینا ٹھیک ہے؟!" انگشت شہادت اور انگوٹھے سے ناک کی ہڈی رگڑتے ہوئے ضرار نے رک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ آپ ان سے بات کیے بنا جا رہی ہیں؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔تم منالیناناں پلیز"!

"آپ کو لگتا ہے وہ میری سنیں گی؟" سعاد نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"کوئی حل نکال لوناں۔۔"

"دیکھیں سعاد! میں بخوشی ابھی آپ کی ٹکٹ بک کروا رہا تھا مگر اب میری طرف سے معذرت! میں جندل کو سنبھال سکتا ہوں مگر حرم آپی پر میرا زور نہیں چلتا۔ آپ برائے مہربانی پہلے ان سے بات کرلیں پھر مجھے بتا دیجیے گا تاکہ میں ٹکٹ بک کروادوں۔" وہ اسے نرمی سے دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سعاد نے غصے سے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔

"تم میرے لیے اتنا سا بھی اسٹینڈ نہیں لے سکتے؟ اور ایک وہ حرم ہے جو زبردستی تمہیں میرا شوہر بنانے پر تلی ہوئی ہے!!" غصے سے کہتے ہوئے وہ پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی تھی۔ ضرار نے حیرت سے دروازے کو دیکھا تھا جہاں سے ابھی وہ گئی تھی۔ شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ کر گئی ہے۔۔ اور جب اسے اندازہ ہوا تھا تو زینے چڑھتے ہوئے اس کا دل کیا تھا وہ اپنا سر دیوار میں دے مارے۔۔ اپنی جگہ منجمد کھڑا ضرار۔۔۔ دھیرے سے مسکرادیا تھا۔

☆☆☆

اس کے ہر اٹھتے قدم میں پہلے سے زیادہ احتیاط کا عنصر شامل تھا۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا وہ بینکاک کی ان تنگ گلیوں میں چھپے راز کو ڈھونڈنے آیا تھا۔ وہ بس اپنی منزل کے قریب ہی تھا جب اسے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی اس سے ایک قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ اس نے رفتار ہنوز دھیمی رکھی اور گلی کا موڑ مڑ گیا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ وہ رک گیا۔ اور اس کے پیچھے چلتا وہ شخص بھی ٹھہر گیا۔ گلی کے دونوں اطراف میں چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ان گھروں میں سے دو گھروں کے باہر تین آدمی کھڑے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آبی

اسمان تھا اور ہر سُو خاموشی تھی۔ یہ وہ منظر تھا جو کوئی معمولی آنکھ دیکھ سکتی تھی مگر۔۔۔ اس جاسوس کی آنکھ نے جو دیکھا تھا وہ دائیں طرف دوسرے گھر کی تیسری منزل کی کھڑکی میں چھپ کر بیٹھا وہ شخص تھا! اس نے سیاہ ہوڈی کی ہُڈ سر پر گرائی اور قدم پیچھے ہٹائے اور واپس مڑ گیا۔ اس کے پیچھے چلنے والا شخص انہی تنگ گلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد اسی گلی کے سرے سے ایک سائیکل سوار نمودار ہوا۔ تیزی سے پیڈل گھماتا وہ ان آدمیوں کے سر پر پہنچا اور دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ اس کے ہاتھ ان آدمیوں کے سروں سے ٹکرائے۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟" ان کے تپ کر کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنستا تیزی سے آگے چلا گیا اور کچھ فاصلے پر جا کر رک گیا۔ پھر سائیکل گھمائی اور ان کی طرف آتے ہوئے یہی عمل دہرایا۔ اس بار وہ آدمی غصے سے چلا اٹھے تھے۔ وہ سائیکل سوار محظوظ ہوا تھا۔ وہ بدر تھا۔۔ ہمارا بدر!

"لڑکے تمہیں اپنی جان پیاری نہیں ہے کیا؟" ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑا تھا۔

"دیکھیں انکل گریبان چھوڑیں میرا۔" اس کے کہنے پر مزید دو آدمی آگے آئے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں ہاتا پائی شروع ہو چکی تھی۔ کچھ مزید لوگ شور سن کر وہاں آ گئے تھے۔ اور اسی شور شرابے کے دوران۔۔ وہ سیاہ ہوڈی والا لڑکا سب سے نظریں بچاتا اس گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ بدر کے لگائے تماشے کی بدولت کوئی بھی یہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا حتیٰ کہ وہ شخص بھی جو گلی پر نظریں جمائے کھڑکی میں چھپ کر بیٹھا تھا۔

وہ اندر آیا تو ہر طرف خاموشی تھی۔ گھر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ہر چیز گرد آلود تھی گویا کافی عرصے سے یہاں صفائی نہ ہوئی ہو۔ وہ راستے میں پڑی چیزوں کو ہٹاتا آگے بڑھا۔ سوئچ بورڈ کو ڈھونڈ کر اس نے لاؤنج کی بتیاں جلائیں۔ چھوٹا سا لاؤنج، گرد آلود صوفے اور شیشے کی ٹوٹی ہوئی میز، بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑے۔۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا تھا وہ غلط مقام پر آ گیا ہے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ کسی کی آہٹ سنائی دی عین اس کے عقب میں۔ وہ تیزی

سے پستول نکالتا پیچھے مڑا۔

"تم آگئے۔ بہت دیر سے آئے ہو۔" وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ملگجے لباس میں عجیب سے حلیے میں وہ شخص اسے مشکوک لگا تھا۔ اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی جسے اس بوڑھے نے بخوبی محسوس کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خیام ہو ناں؟ ڈیوڈ کے لیے آئے ہو؟ آ جاؤ بیٹھ جاؤ۔" وہ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتا خود دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ خیام نے ہڈ سر سے سرکائی تو وہ پیچھے جا گری۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پستول ہنوز ہاتھ میں تھی۔

"آپ کون ہیں؟"

"تمہارے لیے بس یہ جاننا ضروری ہے کہ ڈیوڈ مجھ پر بھروسہ کرتا تھا، تم بھی کر سکتے ہو۔" اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"وہ مر گیا ہے؟"

"ہاں۔۔ کل صبح۔"

"وہ جانتا تھا وہ مر جائے گا"!

"اسے کون مارنا چاہتا تھا؟ وہ کس سے بھاگ رہا تھا؟!" بوڑھا آدمی گہری سانس لیتا ہوا آگے ہوا۔

"ٹھیک چار دن پہلے۔۔۔ اپنے آفس میں کمپنی کا بجٹ چیک کرتے ہوئے ڈیوڈ کو جس چیز نے چونکایا تھا وہ۔۔ وہ بھاری رقم تھی جو کمپنی کی طرف سے مارک بار بارا کے اکاونٹ میں ٹرانسفر کی گئی تھی۔ ڈیوڈ کے لیے یہ حیران کن بات تھی کیونکہ کمپنی نے مارک کے ساتھ ایسی کوئی ڈیل نہیں کی تھی۔ رقم بلینز میں تھی شک بنتا تھا! ڈیوڈ نے جب اس پر تحقیق کی تو وہ اس دنیا میں جا پہنچا جہاں اس کے آشکار ہوتے ہی اس کی موت کا فرمان سنا دیا گیا۔

ڈیوڈ۔۔ Sky 2 میں جا پہنچا تھا۔“

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر دھیرے دھیرے ہر راز کھل رہا تھا۔ اسے یہ سب ایک دلدل کی طرح محسوس ہوا تھا جہاں وہ دھنستا جا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں اور ہتھیلیاں نم ہو رہی تھیں۔ ایک عجب خوف سا تھا جو اسے اپنے حصار میں جکڑ رہا تھا۔

”سکائے ٹو، مارک باربارا کے زیر انتظار ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے۔ مارک، اپنا پرائیویٹ سیکیورٹی سسٹم بنانے جا رہا ہے!“ خیام نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مارک باربارا؟“

”ہاں۔۔ ڈیوڈ کے علاوہ کوئی اور بھی تھا جو اس سیکیورٹی سسٹم کے بارے میں جانتا تھا اور وہ بھی مارا جا چکا ہے“!!

”کون؟“ اس کی آواز قدرے مدھم تھی۔

”میکس ویل باربارا!!“ اور خیام کو لگا تھا کہ۔۔۔ ایکدم سے ہر طرف سناٹا چھا گیا ہے۔ ہر منظر دھندلا ہو چکا ہے۔ وہ سانس روکے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کا شک درست تھا۔ زیاد کو استعمال کیا گیا تھا۔ اور اگر زیاد استعمال ہوا تھا تو مطلب۔۔۔ جنگ شروع ہو چکی تھی! جنگ۔۔۔ سیاہ اور سرمئی کی۔۔ کیونکہ سفید کچھ نہیں ہوتا، کوئی نہیں ہوتا!!

”مارک ڈی ڈبلیو (D W) کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ اس کا یہ پراجیکٹ ہرگز قابلِ اعتراض نہ ہوتا اگر ڈیوڈ اس پراجیکٹ کی بنیاد کے بارے میں ہر چیز تفصیل سے نہ پڑھ لیتا۔ یہ پراجیکٹ تباہی پھیلانے والا ہے۔ قتل و غارت بڑے پیمانے پر ہو گی۔ سکائے ٹو میں فوج تشکیل دی جائے گی جو ظلم و بربریت کی داستان رقم کرے گی۔ مارک کمپنی کی دی گئی رقم سے وافر مقدار میں اسلحہ خرید چکا ہے۔ ڈیوڈ نے وہ تمام تر تفصیلات پڑھ لیں اور تبھی وہ مارا گیا۔“

”پراجیکٹ مارک کا ہے، مگر ڈیوڈ کو مارنے والا کمپنی میں اس کے پیچھے لگا تھا۔“

”تم سمجھ نہیں رہے لڑکے! سکائے ٹو جو سیکیورٹی سسٹم بنا رہا ہے اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ اس میں ایسے بھی لوگ ہیں جو سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہیں جو ”تمہاری“ کمپنی میں کام کرتے ہیں۔“ اس نے لفظ تمہاری پر زور دیا۔ ”ڈیوڈ کو مارنے والا مارک کا بھیجا گیا آدمی ہی ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ مارک کا وہ آدمی کمپنی میں کام کرتا ہے“!

”مگر مارک، بار بار اگروپ سے ہے۔ اور بار بار اگروپ سے کمپنی کے اچھے تعلقات ہیں!“ اس نے ایک اور سوال اٹھایا۔

”تمہیں نہیں لگتا کہ۔۔ یہ اچھے تعلقات دشمنی کی حد تک خطرناک ہو چکے ہیں۔ اسٹیون وارلڈ کا دوست ہے مگر مارک نہیں! مارک اپنے باپ کا دشمن ہے وہ وارلڈ کا سگا کیونکر ہو سکتا ہے؟!“ خیام نے بے اختیار نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

”مارک کو اسلحے کے لیے رقم کمپنی کی طرف س ملی ہے۔۔ کیا وارلڈ۔۔؟!“ اس نے سوال ادھورا چھوڑا۔

”نہیں وارلڈ نہیں۔۔ یہ کام کسی اور کا ہے اور جس کا بھی ہے اس کا نام اس چپ میں ہے جو ڈیوڈ کے پاس تھی۔ اس نے سکائے ٹو کے سیکیورٹی سسٹم کا پرسنل ڈیٹا چرا لیا تھا۔ وہ تم سے ملنے سے پہلے وہ چِپ مجھے دینے والا تھا مگر اسے مہلت نہ ملی۔ اب تمہارے جتنے بھی سوال ہیں ان کا جواب اس چِپ میں ہے۔“

اس کی نظریں اسکرین پر جمی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ڈیٹا ٹرانسفر ہونے میں صرف ایک منٹ تھا۔ اسے آفس کے باہر کسی کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی تھی۔ اس نے تیزی سے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جلدی سے کرسی سے اٹھ کر اس نے میز پر رکھا اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ قدموں کی چاپ اب قریب تھی۔ ڈیٹا ٹرانسفر ہو گیا۔ اس نے چِپ جلدی سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں اڑسی۔ اس کے ہاتھوں کی

کپکپاہٹ کے باعث چِپ اس کی جیب میں جانے کے بجائے نیچے فرش پر گری۔ وہ اس سے انجان رہا اور سانس روکے باہر کی طرف بڑھا۔ دروازے کی ناب گھماتے ہوئے اس کا پورا وجود خوف سے تھر تھرا رہا تھا۔ پسینے کی بوندیں پیشانی سے لڑھکتیں گالوں پر گر رہی تھیں۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے جلدی سے ارد گرد دیکھا اور باہر نکل گیا۔ اسے بمشکل آفس سے نکلے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ آفس کا دروازہ کھلا۔ کوئی اندر آیا۔ کوئی۔۔ جس نے چہرے پر سیاہ ماسک چڑھا رکھا تھا۔ بھاری بوٹ اس کی میز کے پاس رکے۔ وہ جھکا۔۔ پنجوں کے بل نیچے بیٹھا۔ سیاہ دستانے میں مقید ہاتھ آگے بڑھا اور خاموشی سے اس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان وہ سیاہ رنگ کی چِپ اٹھالی۔

"اور چِپ کہاں ہے؟" اس کے سنجیدگی سے پوچھنے پر بوڑھے شخص نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"وہ تمہارے پاس نہیں ہے؟"!

"میرے پاس کیسے آئے گی؟"

"تمہیں ڈیوڈ نے نہیں دی؟"

"نہیں۔۔ وہ مار دیا گیا تھا اس سے پہلے ہم ملتے۔"

"یا خدا! وہ چِپ یقیناً پھر اس کے آفس میں ہو گی۔ تم نے چیک کیا؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔ مگر وہاں تو ایسا کچھ نہیں تھا۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ۔۔ چِپ کمپنی میں موجود مارک کے آدمی کے ہاتھ لگ چکی ہے۔"

"نہیں۔۔ اگر چِپ مارک کو مل چکی ہوتی تو وہ میرے پیچھے اپنے آدمی نہیں لگاتا۔ چِپ کسی تیسرے بندے کے پاس ہے!" اس نے بے اختیار سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ خیام کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ اگر۔۔ چِپ آفس سے غائب

ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ کا لیپ ٹاپ اور موبائل بھی چِپ اٹھانے والے کی نظر میں آیا تھا۔ اور اگر ایسا ہوا تھا تو۔۔ سعاد کا اس لیپ ٹاپ کے سسٹم کو ہیک کرنا کسی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اور پھر اسی لمحے اس کی نگاہ اس بوڑھے پر ٹکی۔ وہ پیشانی کو پریشانی سے رگڑ تا بڑبڑا رہا تھا۔ اُس کی ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں۔ خیام کے ماتھے پر بَل پڑے۔ اس نے نگاہیں چھوٹی کر کے اُس شخص کو دیکھا۔

"مارک کے آدمی اگر تُم تک پہنچ چکے ہیں تو اب وہ کہاں ہیں؟!" بوڑھے شخص نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ خیام اس کے ہر ہر تاثر ہر حرکت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ نگاہیں بے اختیار خیام کے ہاتھ میں موجود پستول پر ٹکیں اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے لپک کر پستول اٹھانا چاہی مگر تب تک خیام پستول لوڈ کر کے اس کے ماتھے پر رکھ چکا تھا۔

"تم خریدے جا چکے ہو"!

"مجھے اپنی جان عزیز تھی۔ تم خدارا وہ چِپ انہیں دے دو۔" بوڑھا گڑگڑایا۔

"اب تک کتنے جھوٹ بولے ہیں تم نے میرے ساتھ؟!" اس کے لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔ آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔

"کوئی نہیں۔ اُس چِپ کے بغیر تم مارک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تمہارا یہ سب جان لینا اس کے لیے کسی قسم کا خطرہ پیدا نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ اب تک کیا کُچھ جان چکے ہیں؟"

"تم یہ کبھی نہیں جان پاؤ گے!" خیام پستول پر زور دیتا آگے بڑھا مگر عین اُسی لمحے ایک گولی عین اس بوڑھے کے سر میں سوراخ کرتی ہوئی نکلی تھی۔ اس سوراخ سے نکلتا خون دھار کی صورت میں اس کے چہرے پر بہنے لگا اور

اگلے ہی لمحے وہ ڈھیر ہو گیا۔ خیام نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے کشادہ سڑک اور سڑک کے پار اونچی عمارت نظر آ رہی تھی۔ یقیناً گولی یہیں سے آئی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے قدموں میں گرتے خون پر ڈالی پھر ٹھہر کر ان بوٹوں کی چاپ سنی جو تعداد میں لگ بھگ آٹھ تھے۔ دروازے کو بری طرح سے پیٹا گیا۔ یہاں تک کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آئے۔ نگاہیں اس کی تلاش میں کھڑکی کی طرف اٹھیں اور اسی لمحے میں خیام نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔

"پکڑو اُسے بھاگنے نہ پائے!" مکمل سیاہ لباس میں موجود وہ آدمی چلایا۔ سب تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر جب وہ کشادہ سڑک پر اُترے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ حیران کن طور پر صرف چند لمحوں میں وہ غائب ہو چکا تھا۔ کوئی غیر ماورائی مخلوق ہو جیسے!

☆☆☆

وہ پریشانی سے لیپ ٹاپ پر جھکی تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی جب اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے ایک نظر فون پر ڈالی جہاں "استاد جی" لکھا جگمگا رہا تھا۔ ماتھے پر بل ڈالے اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"خیام ڈیوڈ کے لیپ ٹاپ سے کچھ خاص بر آمد نہیں ہوا۔ سب کچھ نارمل ہے کچھ مشکوک نہیں ہے۔"

"کیونکہ ڈیوڈ کے قاتل تمام ڈیٹا ڈیلیٹ کر چکے ہیں۔ سعاد جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے نکلو۔ ابھی کے ابھی!" اس کی آواز سے جھلکتی پریشانی اس کے لیے خطرے کا الارم بجا گئی تھی۔ وہ تیزی سے موبائل رکھتی فوراً کھڑی ہوئی۔ کبڈ سے اپنا بیگ نکالا۔ جلدی سے لیپ ٹاپ اور موبائل اس میں رکھے۔ کبڈ سے لانگ کوٹ اور حجاب نکال کر وہ کھڑکی کی طرف آئی۔ وہاں نیچے گلی میں معمول کے مطابق اکا دکا لوگ کھڑے تھے۔ وہ تیزی سے کھڑکی سے پیچھے ہٹتی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

صرف دو منٹ بعد جب وہ باہر نکلی تو اس نے سیاہ رنگ کا ٹخنوں کو چھوتا لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے لیے گاؤن کا کام دے رہا تھا۔ سیاہ رنگ کا حجاب اور سیاہ ہی ماسک چہرے پر لگائے اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور دراز سے پستول نکالی۔ ساتھ ہی دو میگیزینیں اٹھائیں اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ جونہی اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا، ایک غیر معمولی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ کوئی اس کے گھر میں کودا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھول دیا گیا اور اسلحے سے لیس افراد گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ فوراً پلٹ کر کمرے میں آئی۔ کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ راستہ صاف تھا۔ اس نے بنا دیر کیے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں چھلانگ لگا دی۔ کمرے کا دروازہ زور سے کھولا گیا۔ دروازہ دیوار سے جا لگا۔ وہ شخص تیزی سے اندر آیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی نگاہ کھلی ہوئی کھڑکی پر ٹکی۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ وہاں وہ سیاہ لانگ کوٹ میں ملبوس لڑکی ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔

"ہدف بھاگ رہا ہے۔ میں دہراتا ہوں ہدف بھاگ رہا ہے۔" اس نے وائرلیس منہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔

اور ٹھیک دو منٹ بعد تین سیاہ رنگ کی بڑی گاڑیاں اس ٹیکسی کے پیچھے سڑک پر پوری رفتار سے دوڑ رہی تھیں۔

☆☆☆

اس نے ٹیکسی اس تنگ گلی میں رکوائی۔ کرایہ دے کر وہ جلدی سے باہر نکلی اور بنا پیچھے دیکھے تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ غیر محسوس طریقے سے گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے سر پر کتھئی رنگ کی پی کیپ ٹکائی تھی جس سے اس کی پیشانی اور آنکھیں چھپ گئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے اردگرد ایک نگاہ ڈالی اور پھر ایک گلی میں غائب ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نئی سڑک سے برآمد ہوئی۔ ہاتھ میں موبائل تھا، نظریں اسکرین پر تھیں۔ چہرہ

جھکا ہوا تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی ایک عام سی لڑکی لگ رہی تھی۔ وہاں کچھ مشکوک نہیں تھا۔ اسے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے صرف دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ چار سیاہ رنگ کی گاڑیاں اس کے تعاقب میں یہاں تک آن پہنچیں۔ وہ بنا توجہ دیے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ قریب آ گئے۔ گاڑی کا سیاہ رنگ کا شیشہ دھیرے دھیرے نیچے ہوا۔ وہ بے فکری سے سر جھکائے موبائل پر انگلیاں چلاتی رہی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص نے بغور اسے دیکھا۔ صرف ایک لمحہ۔۔ اور پھر شیشہ اوپر ہونے لگا۔ پچھلی گاڑیوں کو اشارہ ملا اور قطار کی صورت میں وہ چاروں گاڑیاں زن سے آگے بڑھ گئیں۔ اس کے بڑھتے قدم تھم گئے۔ سر اٹھا کر ایک مسکراتی نگاہ ان گاڑیوں پر ڈالی پھر پلٹ گئی۔ یہ راستہ اس کی منزل کی طرف نہیں جاتا تھا!

ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ کراچی کی اس مصروف شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ سڑک پر ہمیشہ کی طرف ٹریفک جام تھا۔ گاڑیوں کے ہارن، چیختے چلاتے لوگ ہمیشہ کی طرح اسے کوفت میں مبتلا کر گئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی رہی۔ اسی اثنا میں کوئی اس کے بائیں کان میں کھنکھارا۔

"کہاں ہو؟"

"دربدر پھر رہی ہوں، کوئی ٹھکانہ بتائیں جہاں پناہ لوں۔" اس نے مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے کسی احساس کے تحت پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں سامنے سے دو آدمی مکمل سیاہ لباس میں ملبوس اس کی طرف بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ دماغ نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے ایک نگاہ اس مصروف سڑک پر ڈالی، گویا راہِ فرار اختیار کرنا چاہی مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ عین اُس لمحے جب وہ بھاگنے کا سوچ رہی تھی فضا میں فائر کی آواز گونجی تھی۔ پستول سے نکلی گولی ہوا کو چیرتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی تھی۔ اسے جھٹکا لگا تھا۔ ارد گرد دھواں اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ خون فراوانی سے کندھے پر لگے زخم کے راستے نکلنے لگا۔ اس نے لب بھینچ کر درد برداشت کرنا چاہا۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا

جہاں ایک طرف چیخیں مارتے دور بھاگتے لوگ تھے تو دوسری طرف اس سے کچھ فاصلے پر وہ آدمی۔ انہیں اس کے سر پر پہنچنے میں کم و بیش دو منٹ لگنے تھے۔ اس نے سامنے دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ آگے بڑھی۔ جس طرف لوگوں کا ہجوم تھا، وہ وہاں جارہی تھی۔ لوگوں کے جمِ غفیر میں گھستے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے تعاقب میں لگے وہ آدمی اس جمِ غفیر میں اسے کھو چکے تھے۔ اور سڑک پر گرے اس خون کے پاس کسی کے سیاہ بوٹ نظر آئے۔ کوئی وہاں رکا، ٹھہرا پھر پنجوں کے بل بیٹھا۔ ہاتھ بڑھا کر وہ سیاہ آلہ اٹھایا جو خون میں ڈوبا تھا۔ اس سے نکلتی سبز شعائیں سگنل ملنے کا پیغام دے رہی تھی۔ اس شخص نے دھیرے سے اس آلے کو مٹھی میں دبایا پھر بنا کسی کی نظروں میں آئے انہی راستوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

"سر اب ہم کہاں جارہے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم ہوا کہ ڈیوڈ کو کس نے قتل کیا ہے؟" فرنٹ سیٹ پر بیٹھا بدر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ خیام کی گاڑی غیر معمولی رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھی کہ کچھ ہی دیر میں اسے ٹریفک پولیس روک لیتی۔ "سر رفتار کم کریں۔" وہ گاڑی کی رفتار مزید بڑھتے دیکھ کر بوکھلایا۔ خیام نے غصیلی نگاہ اس پر ڈالی۔

"میرے ساتھ ہوتے ہو تو سوال مت کیا کرو مصعب!" اس کے سخت لہجے میں کہنے پر وہ لب بھینچتا کھڑکی کے پار دیکھنے لگا۔ گاڑی مختلف سڑکوں سے گزرتی ایک کالونی میں داخل ہوئی اور پھر ایک اپارٹمنٹ کے سامنے رک گئی۔ خیام تیزی سے دروازہ کھولتا باہر نکلا۔ بدر نے بھی اس کی تقلید کی۔

"یہیں کھڑے رہو!!" وہ اسے اپنے ساتھ آتا دیکھ کر گاڑی کی چابی اس کی طرف اچھال کر اسے حکم دیتا آگے بڑھ گیا۔ بدر نے بچوں کی طرح منہ بسور کر اس کی پشت کو دیکھا پھر گہری سانس لی۔ جو بھی تھا اب وہ اس کے حکم کے

تابع تھا!!

اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ دوسری گھنٹی پر ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے کھڑے زیاد نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر مصروف سے انداز میں پلٹ گیا۔

"تمہیں کیسے خبر نہیں ہوئی کہ وہ لوگ میکس کے خلاف تمہیں استعمال کر رہے ہیں زیاد!" اس کی سخت آواز پر زیاد نے حیرت سے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے غلط کیا۔ اس کے چہرے پر پڑنے والا زوردار مکا اس کے جبڑے تک ہلا گیا تھا۔ ناک سے خون کی ننھی بوندیں گری تھیں۔ زیاد نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟!" آواز دھیمی تھی۔

"وہ ہمیشہ سے جانتے تھے کہ تم ایک جاسوس ہو!! تم اب تک استعمال ہوتے آئے ہو زیاد!" ایک اور مکا اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اسے غصہ زیاد کے استعمال ہونے پر نہیں تھا۔ اسے غصہ اپنی بے خبری پر تھا جو یہاں نکل رہا تھا۔ اس کی وجہ سے سعاد کی جان خطرے میں تھی۔ مزید یہ کہ۔۔ وہ اس سے رابطہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ڈی ڈبلیو کے آدمی اس کے پیچھے تھے۔ اور آخری بار جو آواز اس نے اپنے کان میں لگے آلے کے ذریعے سنی تھی وہ گولی چلنے کی تھی۔ اس کے بعد شاید سعاد آلہ گرا چکی تھی۔۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ گولی کسے لگی تھی؟!

"خیام آرام سے بتاؤ گے ہوا کیا ہے؟" زیاد نے ناک سے بہتا خون صاف کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"تمہاری وجہ سے وہ موت کے منہ میں پہنچ چکی ہے!!" اس نے مٹھیاں بھینچی تھیں۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ موجودہ صورتحال سے لاعلم تھا۔ صورتحال کو علم میں لانا چاہتا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟ سب ٹھیک ہے یہاں؟" اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے جندل نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

”میکس ویل بار بارا کے خلاف زیاد کو ثبوت اس لیے مہیا کیے گئے کیونکہ وہ اسکائی ٹو کے متعلق جان چکا تھا۔ وہ اسکائی ٹو کے لیے خطرہ تھا اور اسے راستے سے ہٹانے کے لیے زیاد کو استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ سے جانتے تھے کہ زیاد ایک جاسوس ہے“!

”لیکن کیسے؟“ جندل نے میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی الٹتے ہوئے پوچھا۔ پھر پانی کا گلاس زیاد کی طرف بڑھایا جو گہری سانس لیتا گلاس لبوں سے لگا گیا۔

”یہ تو اس سے پوچھنا چاہیے ناں کہ کیسے؟!“ وہ ایک بار پھر آگے بڑھا تھا جب جندل ان کے درمیان میں آیا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟ انسان کے بچے بنو۔ کیوں اتنے غصے میں ہو؟!“ جندل کے کہنے پر اس نے جھلا کر اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”ڈیوڈ کا قتل ہوا ہے۔ قتل اسکائی ٹو نے کروایا ہے۔ بار بارا گروپ کے زیر انتظام ایک پرائیویٹ سیکیورٹی سسٹم جو ایک چھوٹی سی فوج تشکیل دینے جا رہا ہے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سسٹم مارک کے زیرِ نظر ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ بار بارا گروپ میں سے کوئی مارک کی آڑ میں اپنا مکروہ چہرہ چھپا رہا ہو! ویسے بھی وہ شخص بِک چکا تھا۔“ وہ کرسی کھینچ کر کرسی پر بیٹھا۔ جندل نے خونخوار نظروں سے زیاد کو دیکھا جو اُس کی نظروں پر بری طرح گڑبڑایا۔ اس کے یہ دوست بہت خبیث تھے وہ جانتا تھا۔ اگر جندل اسے خیام کے ہاتھوں سے بچا رہا تھا تو کوئی بعید نہیں تھی کہ وہ خود اس کے ساتھ مل کر اسے پیٹ ڈالتا!

”تو۔۔ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“

”اگر وہ جان چکے ہیں کہ زیاد جاسوس ہے تو سرِ دست اس کھیل کو جاری رکھتے ہیں۔ انہیں یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے!“ وہ سوچ سوچ کر بولتا زیاد کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ازابیلا تم پر کتنا اعتماد کرتی ہے؟“

”جتنا ایک شخص اپنے دوست پر کرتا ہے۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی کیونکہ اسے یہ کہنے میں خاصی دِقت پیش آئی تھی۔ کیونکہ سامنے بھی وہ دونوں کھڑے تھے جنہیں وہ دوست کہتا تھا اور جن پر اسے ٹکا اعتبار نہیں تھا!

”ٹھیک ہے پھر، زیاد ازابیلا کے ساتھ نیویارک جائے گا۔ اس کی دوست ایملی کو ڈھونڈنے۔ ایملی کے بوائے فرینڈ کے ساتھ کیا ہوا ہے صرف وہی ہمیں بتا سکتی ہے۔“

”یہ ناممکن ہے ازابیلا پر اپنے باپ کی فرمانبرداری کا بھوت سوار ہے اور وارلڈ اسے کبھی وہاں نہیں جانے دے گا۔“ زیاد نے اعتراض اٹھایا۔ جندل اور خیام نے پہلے اسے دیکھا پھر ایک دوسرے کو۔ نظروں ہی نظروں میں اگلا لائحہ عمل طے ہوا۔

”ہم اس ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔“ وہ دونوں اپنے بازو چڑھاتے آگے آئے۔ زیاد بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے غلط کیا۔ جندل نے بیچ میں ٹانگ اڑا کر اس کا راستہ روکا۔ خیام نے زوردار لات اس کے پیٹ میں ماری۔

”ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈ سکتے ہیں!!“ وہ درد سے کراہا تھا۔

”اس سے بہتر کوئی نہیں ہو گا۔“ جندل کے ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر پڑا۔ عجب میدان جنگ بن گیا تھا اس کا اپارٹمنٹ۔ کرسیاں الٹ دی گئی تھیں۔ پردے گرا دیے گئے تھے۔ لیمپ اس کے قدموں میں چکنا چور ہو چکے تھے۔ وہ اسے بری طرح پیٹ کر کرسی سے باندھ چکے تھے۔

صوفے پر بیٹھے خیام نے ازابیلا کو کال ملاتے ہوئے ایک مسکراتی نگاہ زیاد پر ڈالی تھی۔ وہ اپنے منہ پر بندھے کپڑے اور کرسی کے پیچھے بندھے ہاتھوں کی وجہ سے مجبور تھا۔ مسلسل عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے وہ گردن دائیں سے بائیں ہلا رہا تھا۔ یقیناً وہ صدمے میں تھا۔ اس کے گال کے قریب جلد پھٹی ہوئی تھی۔ پیشانی پر گہرا زخم آیا تھا۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ گدھا اسی لائق تھا! کال اٹھا لی گئی۔

”ہیلو۔۔“ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے ازابیلا کی آواز سب سن سکے تھے۔

”اگلی بار اگر آپ نے کسی بھی قسم کا مشکوک قدم اٹھایا تو جسے آپ دوست کہتی ہیں، اسے کھو دیں گی!“ سنجیدگی سے کہہ کر اس نے ازابیلا کی بات سنے بنا کال کاٹ دی۔ اس نے موبائل صوفے پر پھینکا پھر جندل کو دیکھا جو قمیض جھاڑ رہا تھا۔

”تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟“

”لڑکیاں ہر جگہ فدا ہو جاتی ہیں۔“ اس کے منہ بگاڑ کر کہنے پر خیام مسکرا دیا۔

”شکر کرو لڑکیاں! یہاں لڑکے بھی فدا ہو چکے ہیں۔“ اس کے معنی خیزی سے کہنے پر جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”بدر کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں۔۔ وہی جسے میں نے خرید لیا ہے۔“ ہلکا سا ہنس کر کہتا وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تین دنوں کے اندر اندر اپنے جانے کا بندوبست کرو تم! یہاں رہے تو میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔“ زیاد نے غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ جندل مسکراہٹ دباتا باہر نکل گیا۔ خیام نے بھی باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

”وہ کون ہے جو۔۔۔ میری وجہ سے موت کے منہ میں ہے؟“ وہ اپنے منہ سے کپڑا ہٹانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کی آواز سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا خیام کسی معمولی انسان کے لیے اتنا جذباتی نہیں ہو سکتا تھا کبھی بھی نہیں! وہ رک گیا تھا۔ کئی پل خاموش رہا۔

”یقیناً میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا!“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ زیاد نے گہری سانس لے کر

اپارٹمنٹ کے بند ہوتے دروازے کو دیکھا پھر کرسی پر سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند گیا۔ وہ کہہ رہا تھا وہ نہیں بتائے گا، مطلب وہ نہیں بتائے گا!

☆☆☆

"اگلی بار اگر آپ نے کسی بھی قسم کا مشکوک قدم اٹھایا تو جسے آپ دوست کہتی ہیں اسے کھو دیں گی!" وہ کئی پل پتھریلی نظروں سے موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھتی رہی۔ اسے زیاد کے نمبر سے کال آئی تھی مگر کال اٹھانے پر نہ آواز زیاد کی تھی نہ ہی الفاظ۔ وہ جو بھی تھا اسے زیاد کو مارنے کی دھمکی دے رہا تھا اور یہ دھمکی اسے زیاد کے نمبر سے ملی تھی تو اسکا مطلب تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا زیاد اس کے قبضے میں تھا۔ ذہن میں یہ خیال آتے ہی وہ موبائل تھامے تیزی سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔ سیڑھیاں پھلانگ کر وہ لاونج سے گزرتی باہر آئی۔ ڈرائیور سے گاڑی کی چابی لی اور فوراً گاڑی میں بیٹھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی گاڑی سڑک پر رواں دواں تھی اور منزل زیاد کا اپارٹمنٹ تھا! حد سے زیادہ تیز رفتار میں گاڑی چلا کر وہ پانچ منٹ میں ہی اسکے دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے دروازہ بجانے کی نوبت نہیں آئی، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آئی۔ لاونج کا بکھرا سامان اس کے اوسان خطا کر گیا تھا۔ اس نے سُن ہوتے دماغ کے ساتھ ارد گرد دیکھا اور تبھی اس کی نظر ایک طرف کرسی سے بندھے زیاد پر پڑی۔

"زیاد!!!" وہ تقریباً چیخ ہی تو اٹھی تھی۔ تیزی سے اسکے پاس آکر اس کے بندھے ہاتھ کھولے۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی۔ ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"یہ سب۔۔" وہ کچھ کہہ نہیں پائی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے انگوٹھے سے لبوں پر لگا خون صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ چند پل نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ دائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ گال پر خراشیں تھیں۔ پیشانی سے خون بہہ رہا

تھا۔ ہونٹ کناروں سے پھٹے ہوئے تھے۔ اسے بہت بری طرح سے پیٹا گیا تھا۔ اور وجہ۔۔ ظاہر ہے وہ تھی!! نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ایک آنسو پلکوں سے جھول کر اس کے گال پر گرا ہے۔ پیشانی سے خون صاف کرتا زیاد ٹھہر گیا۔ "ازا۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"آئی ایم سوری۔ مگر یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ تم جانتے ہو تم میرے واحد دوست ہو میں تمہیں نہیں کھو سکتی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"میں جانتا ہوں ازا! خود کو دوش مت دو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" اسے بہلاتے ہوئے اس نے دل میں ان جنگلیوں کو گالیاں دیں۔ ازا کی آنکھوں میں چمکتی نمی کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں خیال کوندا۔ وہ اس وقت اپنا انتقام لے سکتا تھا بالکل لے سکتا تھا۔ تبھی وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اس خیام نے یہ سب ذاتی دشمنی کی وجہ سے کیا ہے۔ میرے باپ کے بعد وہ مجھے بھی اپنی نفرت کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ مگر وہ بھول رہا ہے میں بھی زیاد ہوں! اس کی سات نسلوں کو نہ رلایا تو۔۔"

"رکو رکو۔۔۔ خیام حنفی؟" ازابیلا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی بات کاٹے جانے پر بدمزہ ہوا۔ پھر دھیرے سے سر کو جنبش دی۔

"ہاں وہی۔۔ جس کے لیے تم میری بات کو جھٹلا رہی تھیں۔۔ وہی تھا جس نے تمہیں کال پر دھمکی دی۔ مجھے تو اب یقین ہو گیا ہے ایملی کے بوائے فرینڈ کے قتل میں بھی خیام ہی ملوث ہے۔" سر جھٹک کر کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ازابیلا نے لب بھینچ کر خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔ ضبط کے مارے چہرہ ایکدم لال پڑنے لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی تھی۔ زیاد گڑبڑا کر اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

"ازا رُکو۔۔ ازا اس کے پاس مت جانا۔۔ ازا بات سنو!!" وہ اسے آوازیں دیتا اس کے پیچھے آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ

چکی تھی وہ تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ”ازا یار بات سنو۔۔۔ ازا!!“ وہ اسے مسلسل بلا رہا تھا اور وہ اسے نظر انداز کرتی گاڑی آگے بڑھا چکی تھی۔

☆☆☆

”اسے تھوڑا ایڈٹ کروں کیا؟ ادھورا ادھورا سا لگ رہا ہے۔“ وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے انگشت شہادت ٹھوڑی پر رکھے پوچھ رہی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ درمیان میں میز تھی اور میز کے پار ضرار کھڑا تھا جو اس کے سوال پر ہاتھ میں پکڑا موبائل میز پر رکھ کر جھکا۔ لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف کیا پھر بغور وہاں لکھی تحریر پڑھنے لگا۔ امامہ بند مٹھی پر چہرہ ٹکائے اسے دیکھنے لگی۔ نقاب سے جھانکتی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح انوکھی چمک کے ساتھ ساتھ نرمی بھی تھی۔ جھک کر تحریر پڑھتے ضرار نے اس کی نظریں مسلسل خود پر محسوس کر کے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا دیکھ رہی ہیں؟“ اس کے معصومیت سے پوچھنے پر وہ مسکرائی۔

”سوچ رہی ہوں کچھ۔۔۔ قد کاٹھ بھی اچھا ہے، اس کے برابر کے ہو۔ رنگت بھی صاف ہے، اسی سے ملتی جلتی ہے۔ اخلاق بھی اچھا ہے، سوچ بھی بہترین رکھتے ہو۔ عادات بھی قابلِ تعریف ہیں۔ شریف لڑکے ہو، غیرت مند ہو۔ عزت کرنا جانتے ہو، زندگی میں ہر جگہ ہر چیز میں توازن برقرار رکھا ہوا ہے۔ مزاج میں بس فرق ہے۔ وہ تیز ہے ضدی ہے۔ تم نرم مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رضا میں راضی رہنے والے ہو۔ وہ لڑاکا ہے تم۔۔۔ صرف اس کے ساتھ لڑتے ہو۔“ ٹھہر ٹھہر کر بولتی وہ اپنی بات ختم کر کے مسکرائی۔ ضرار نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا۔

”کس کی بات کر رہی ہیں؟“ وہ اس کے معصومانہ سوال پر ہنس دی۔

”تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگو گے ضرار ولید!“ وہ بات سمجھ چکا تھا۔ جان چکا تھا وہ کس کی بات کر رہی تھی۔

چند پل وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھتا رہا، پھر سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

"وہ میرے لیے محترم ہیں۔ میں ان کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔ عین ممکن ہے وہ انکار کر دیں یا شاید اقرار کر دیں۔ مگر آپ اتنی جلدی امیدیں مت قائم کریں۔ قبل از وقت لگائی گئی امیدیں جب ٹوٹتی ہیں تو انسان پورے وجود کے ساتھ گرتا ہے۔ گر کر بکھرتا ہے!" اس کے نرمی سے کہنے پر امامہ نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہاں بس نرمی تھی بس نرمی۔۔ نرمی اور احترام۔۔ وہ محبت سے زیادہ عزت کا قائل تھا۔ تبھی اسکی آنکھوں میں محبت کے بجائے عزت ہوتی تھی، نگاہوں میں احترام ہوتا تھا۔۔ ہر پل ہر لمحہ۔ وہ عزت دینے والوں میں سے تھا!

"سنو ضرار۔۔۔ تمہیں سعاد بہت عزیز ہے ناں؟" وہ کچھ جاننا چاہ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے سر کو اثبت میں ہلا گیا۔

"ہم ساتھ رہے ہیں بچپن سے۔ جندل سے زیادہ ان کے ساتھ رہا ہوں۔ جندل تو بعد کی پیداوار ہے۔" وہ ہلکا سا ہنسا، پھر بات جاری رکھی۔ "جب وہ کراچی سے چلی گئی تھیں تو جندل سے زیادہ دُکھی میں تھا۔ نہیں جانتا کیوں مگر ہاں وہ مجھے عزیز ہیں۔ شاید میں عادی ہو چکا ہوں۔۔ گھر جاؤں تو حرم آپی کے ساتھ ساتھ وہ بھی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ مشکل میں ہوں تو مجھے ان کی ہر ممکن مدد کرنا ہوتی ہے۔ وہ خطرے میں ہوں تو مجھے ان کی حفاظت کرنا ہوتی ہے۔ ہاں مجھے وہ عزیز ہیں۔۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ کبھی اس سے آگے نہیں بڑھا میں۔ وہ بس میرے لیے محترم ہیں۔ کبھی ایسا سوچا ہی نہیں، سوچنا چاہوں بھی تو عجب احساس ہوتا ہے۔ ہم نمونے لگیں گے ایک ساتھ۔ وہ کسی اور کے ساتھ زیادہ اچھی لگیں گی۔۔ کوئی جو انہیں نہ صرف عزت دے محبت بھی دے۔ جن کے لیے وہ نہ صرف محترم ہوں بلکہ محبوب بھی ہوں۔ میں انہیں عزت دے سکتا ہوں مگر محبت نہیں!" وہ ٹھہر گیا۔ اس لمحے امامہ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے وہ حیران تھا کہ یہ وہ باتیں تھیں جن کا آج تک اس نے اپنے سامنے بھی اعتراف نہیں کیا تھا۔

"عزت ضروری ہوتی ہے ضرار! محبت تو بعد میں بھی ہو جاتی ہے۔ محبت تو سب کر لیتے ہیں، عزت کوئی کوئی کرتا

ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"امامہ آپی! جو ان کا ہمسفر بنے گا وہ انہیں عزت بھی دے گا اور محبت بھی۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کی عزت کی جائے، ان سے محبت کی جائے۔" وہ مدھم سا مسکرا دیا۔ امامہ نے گہری سانس لی۔ وہ اپنی طرف سے کوشش کر چکی تھی مگر ضرار کو اس کے نقطے سے ہٹانا ناممکن سا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ضرار مصروف سے انداز میں اپنا موبائل اٹھاتا پلٹا۔ اسی لمحے اس کی نگاہیں سامنے اٹھیں جہاں دروازے سے وہ اندر آ رہی تھی۔ اس کے قدموں میں واضع لغزش تھی۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ ضرار کی نگاہیں خون کے ان قطروں پر ٹکیں جو یکے بعد دیگرے فرش پر گر رہے تھے۔

"ضرار۔۔" اس کے لبوں میں جنبش ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ وہ مزید کھڑا نہیں رہ پائی اور اگلے ہی لمحے لڑکھڑا کر گری۔

"سعاد!!" وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ لیپ ٹاپ بند کرتی امامہ نے چونک کر سامنے دیکھا تھا جہاں وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

"سعاد سعاد کیا ہوا ہے؟ سعاد پلیز آنکھیں کھولیں۔" پنجوں کے بل نیچے بیٹھتے ہوئے اس نے التجا کی تھی۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ قطرہ قطرہ گرتا خون اس کے کوٹ کو داغدار کر رہا تھا۔ سیاہ کوٹ پر گرتا سرخ گرم گرم انسانی خون!!

☆☆☆

”سوچنے کی بات ہے سر۔۔اگر وہ بندہ واقعی بک چکا تھا تو وہ آپ کو صحیح خبریں کیونکر دے گا؟ مطلب ممکن ہے کہ یہ پرائیویٹ سیکیورٹی سسٹم جھوٹ ہو۔ وہ بس آپ سے چپ نکلوانا چاہتا ہو۔“ پر سوچ انداز میں انگشت شہادت ٹھوڑی پر رکھے وہ اپنے سامنے ٹہلتے ہوئے خیام کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کی ”سوچنے کی بات“ پر خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے پر پھیل کر بیٹھا تھا۔

”مصعب اتنا کیسے سوچ لیتے ہو تم؟“ اس کے سنجیدگی سے کہنے پر بدر نے فخریہ کالر جھاڑنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ مگر وہ اٹھے ہاتھ بات سمجھ آنے پر اٹھے ہی رہ گئے۔ اس نے منہ بسور کر خیام کو دیکھا جو دوبارہ ٹہلنا شروع کر چکا تھا۔

”عجیب جل ککڑے ہیں یار آپ۔“ وہ منہ بسور کر رہ گیا۔ خیام کا ٹہلنا جاری رہتا اگر اچانک آفس کا دروازہ نہ کھلتا۔ اس نے دائیں ابرو اٹھائے سامنے کھڑی ازابیلا کو دیکھا۔

”بات کرنی ہے آپ سے۔“ اس نے درشتگی سے کہا تھا۔ چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ بدر اس کے خطرناک تیور دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”آ۔۔ سر میں آپ کے لیے کافی لاتا ہوں۔“ وہ جانے کے لیے مڑا۔ پھر کچھ دماغ میں آنے پر رکا۔ ”ویسے ماحول کو دیکھ کر مشورہ دے رہا ہوں کافی کے بجائے جوس منگوا لیں۔۔۔ ٹھنڈا!“ اس کے مشورے پر خیام نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ فوراً گڑبڑا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد خیام ازابیلا کی طرف متوجہ ہوا۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”زیاد کو آپ نے مارا ہے؟ کال پر بھی آپ تھے ناں؟“ اس نے بمشکل اپنی آواز دھیمی رکھی تھی۔

”کون زیاد اور کونسی کال مادام؟“ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا وہ یک قلم انجان بنا تھا۔

"میرے ساتھ جھوٹ مت بولیں خیام! میں جانتی ہوں آپ کی زیاد کے ساتھ ذاتی دشمنی ہے اور یہ بھی کہ اس پر تشدد آپ نے ہی کیا ہے!" اس کی آواز ذرا بلند ہوئی۔

"اور آپ کو یہ کس نے بتایا؟" وہ ہنوز پرسکون تھا۔

"زیاد نے۔" اس نے لب بھینچے۔ خیام مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا۔ عین اس کے روبرو کھڑا ہوا۔

"اگر زیاد پر تشدد میں نے کیا ہوتا تو یہ بات آپ کو بتانے کے لیے میں اسے زندہ نہ چھوڑتا، اور آپ یوں میرے آفس میں آکر مجھ پر چلانے کے بجائے اس کی قبر پر آنسو بہا رہی ہوتیں۔۔۔ مادام!" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ ازابیلا نے سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"وہ ٹھیک کہتا ہے۔ تم ظالم ہو، منافق ہو یہاں سب برباد کرنے آئے ہو!!" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔۔ نفرت تھی۔

"سب سے پہلے اسے ہی برباد کروں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔ اس کی یہ اطمینان بھری مسکراہٹ ازابیلا کے پورے وجود کو جھلسا رہی تھی۔

"یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہو گا خیام حنفی! میں یہ نہیں ہونے دوں گی کبھی نہیں۔" اس نے انگشت شہادت اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تھی۔

"مثلاً کیا کریں گی آپ؟"!

"میں سب کو آپ کی حقیقت بتا دوں گی۔" وہ چند لمحے اس کی دھمکی پر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر ہنس دیا۔

"ثبوت مادام؟!" وہ ٹھہر گئی۔ ثبوت ہی تو نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ لب بھینچ گئی۔ "آپ جانتی ہیں آپ ایک عزت دار شخص کے آفس میں بلا اجازت داخل ہوئی ہیں۔ بنا ثبوت کے اس پر الزام لگائے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے دھمکایا بھی ہے۔ آپ ایک عزت دار شخص کی عزت پر حرف آنے کا سبب بنی ہیں، آپ جرم کی مرتکب ٹھہری ہیں مادام! آپ کا اگلا قدم تھانے میں بھی ہو سکتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ نڈر ہو کر۔۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔

"دھمکی دے رہے ہیں؟"!

"نہیں باخبر کر رہا ہوں۔ اگلی بار بنا ثبوتوں کے مت آیئے گا۔ یہ آپ کی ذات کو بے مول کر دیتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہتا پلٹ گیا۔ وہ خاموش نگاہوں سے سامنے دیکھتی رہی۔ وہ راکنگ چیئر پر بیٹھ کر میز پر رکھی فائل کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ چاہتے تھے میں صحافت کی طرف لوٹوں۔ میرے لوٹنے کے بعد وہ پہلا شخص خیام حنفی ہو گا جو مجھے اپنا حریف پائے گا!" وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی مگر مخاطب اسی سے تھی۔ خیام خاموش رہا۔ وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے جاتے ہی بدر نے دروازہ ذرا سا کھول کر اپنا سر نکالا۔ احتیاط بھری نگاہوں سے خیام کو دیکھا جو فائل کے مطالعے میں مصروف تھا۔

"ٹھنڈا جوس؟"

"خاموش مصعب!" اس نے جواباً اپنے پورے دانتوں کی نمائش کروائی۔

"جب بیلا باجی پٹر پٹر بول رہی تھیں تب انہیں تو خاموش نہیں کروایا۔" معصومیت سے پلکیں جھپکی گئیں۔ خیام نے ٹھہر کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"بلیک کافی مصعب!" سنجیدگی سے کہا گیا تھا۔

"آگیا اونٹ پہاڑ کے نیچے!!" بدر ہنس دیا۔ خیام سر جھٹک کر واپس اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ازابیلا اس کی توقعات کے برعکس کافی سمجھدار نکلی تھی۔ وہ جذباتی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے یقین تھا کہ وہ اس کے آفس میں آکر اس کا گریبان تو ضرور پکڑے گی، وہ اسے صرف "باخبر" کر کے گئی تھی۔ باخبر اس بات سے جس سے وہ کبھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا ازابیلا صحافت کی طرف ضرور لوٹے گی۔ ہر انسان اپنی پہچان کی طرف لوٹتا ہے۔۔ ہر انسان اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے۔

☆☆☆

وہ مسلسل دیوار پر لگی بڑی سی اسکرین پر نظریں جمائے آفس میں ٹہل رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ نظریں مسلسل اسکرین کو تکنے سے تھک جاتیں تو ایک نگاہ موبائل پر ڈال کر وہ دوبارہ ٹہلنے لگتا۔ مکمل سیاہ رنگ کے لباس میں موجود چہرے پر سیاہ ہی ماسک لگائے وہ اپنی پشت پر موجود ان پندرہ لوگوں جیسا ہی تھا۔ مختلف کرسیوں پر بیٹھے اپنے سامنے میزوں پر لیپ ٹاپ رکھے وہ سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ چہروں پر ماسک چڑھے ہوئے تھے۔ سیاہ جیکٹوں کی پشت پر سفید رنگ سے "ڈی ڈبلیو" لکھا ہوا تھا۔ ماحول میں خنکی کے ساتھ ساتھ عجب پراسراریت سی بھی تھی۔ مکمل خاموشی میں اس شخص کے ٹہلنے سے اس کے بھاری بوٹوں کی آواز ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر رک گیا۔ نظریں اسکرین پر ٹکائیں۔ پھر موبائل کو دیکھا۔

"سر سگنلز آرہے ہیں۔" ایک بھاری آواز اس آفس نما کمرے میں گونجی۔ اس شخص نے تیزی سے مڑ کر اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ صرف چند سیکنڈز بعد اسکرین پر ایک شخص نمودار ہوا۔ انہی کی طرح سیاہ لباس میں موجود!

"اس لڑکی کا کیا بنا؟" آواز میں سختی تھی۔

"وی آر سوری سر! وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔" اسکرین پر نظر آتے شخص نے سر جھکایا۔

"تم سب نکمے ہو۔ پہلے ڈیوڈ کے گھر سے وہ شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور ہم اس کا نام تک نہیں جان سکے اور اب وہ لڑکی جو لمحوں میں ہمارا کھیل بگاڑ سکتی ہے!!!" وہ باآواز بلند چلایا تھا۔ سب نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہونے لگی تھیں۔ ان میں قہر اتر رہا تھا۔ "کچھ بھی کرو اس لڑکی کو ڈھونڈو۔ اس کے گھر پر نظر رکھو۔ وہ کبھی نہ کبھی وہاں آئے گی۔ ارد گرد جتنے بھی گھر ہیں وہاں آنے جانے والے ایک ایک انسان کی خبر ملنی چاہیے۔ اگر وہ لڑکی نہ ملی تو تم سب کو زندہ گاڑ دوں گا!!" انگشت شہادت اٹھا کر اس نے سب کو وارننگ دی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی چمکتی بوندوں میں اضافہ ہوا۔ پاس پڑی میز کو لات مارتا وہ باہر نکل گیا۔ وہاں پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ سب اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ روشن اسکرین ایک بار پھر تاریک ہو گئی۔

☆☆☆

"جی سر۔۔۔ نہیں ابھی ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ فون کان سے لگائے گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ لہجے میں نرمی تھی، چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ برآمدے میں آکر وہ ٹھہر گیا۔ "سر ہم یہ سب کب تک خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہیں گے؟! اس کے خلاف کوئی ایکشن لینا چاہیے۔۔!!" اس نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا تھا۔ دوسری جانب سے ہمیشہ کی طرح اسے تسلی دی گئی۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا پھر کال بند ہونے پر فون جھنجھلا کر صوفے پر پھینکا۔ پلٹ کر پیچھے دروازے کو دیکھا جہاں کچھ گھنٹوں پہلے وہ پورے قد کے ساتھ گری تھی۔ اس نے خود کو کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا جتنا ان چند لمحوں میں اسے محسوس ہوا تھا۔ گہری سانس لیتا وہ دائیں طرف کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے پر دستک دینا چاہی مگر اندر سے آتی آواز پر ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہا۔

"امامہ۔۔اس لمحے مجھے لگا تھا کہ اب میرا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ میں تھک گئی ہوں یار اس سب سے۔۔۔ میں۔۔ میں اب اور یہ سب برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ یہ۔۔ سب بہت بھیانک۔۔ اور تاریک ہوتا جا رہا ہے۔۔ میں نہیں سہہ سکتی۔۔" وہ رو رہی تھی۔ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ وہ سن کھڑا رہا۔ دل پر ایکدم بوجھ سا آن گرا۔

"ٹھیک ہے۔۔ تنظیم مجھے میرے بھائی سے نہیں ملوا سکتی۔۔۔ میں جندل کی واپسی کا بھی مطالبہ نہیں کر رہی۔۔ مگر کسی طرح۔۔ مجھے اس سب سے نکال لیں۔ میں مرنا نہیں چاہتی امامہ! مجھے ابھی نہیں مرنا۔۔ پلیز!!" اس نے گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔ پھر دھیرے سے دروازے کھٹکھٹایا۔ کچھ ہی پل گزرے کہ دروازہ کھل گیا۔ امامہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔

"بات کرنی ہے ان سے۔" وہ دھیرے سے اس کے راستے سے ہٹ گئی۔ وہ اندر آ گیا۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی سعاد کی نگاہیں اس پر ٹکیں جو دروازے کے پاس کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ نے اور کب؟" وہ آنکھوں میں بے پناہ نرمی سموئے دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"وعدہ کرو تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے!" آواز میں نمی تھی۔ آنکھوں میں شفاف پانی چمک رہا تھا۔

"اگر آپ کو ضرورت نہیں ہوئی، تو نہیں آؤں گا۔" اس نے عہد نہیں کیا۔ بس یقین دلایا۔ وہ اس کی بات مان گئی۔ جانتی تھی وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔

"مجھے۔۔۔ اندلس جانا ہے!!" اس کے عقب میں۔۔ کھڑکی کے پار اس چھوٹے سے باغیچے میں کھلتے سفید رنگ کے موتیے کے پھول پر پیلے رنگ کی تتلی بیٹھی تھی۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا وہاں سے گزرا۔ ڈالیوں میں حرکت ہوئی اور پھول پر بیٹھی تتلی اڑ گئی۔

☆☆☆

اس نے جلدی سے سوپ کا باؤل ٹرالی میں رکھا۔ ایپرن اتار کر کاونٹر پر رکھا پھر ٹرالی گھسیٹتے ہوئے باہر آیا۔ ایک نگاہ گردوپیش میں ڈالی جہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ آج وہ وبالِ جان بھی چھٹی پر تھی۔ آہستہ سے ٹرالی گھسیٹتا وہ اس کمرے کے باہر کھڑا ہوا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا پھر ٹرالی گھسیٹتا اندر آگیا۔ اس گھر کے دوسرے کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی بہت کُشادہ تھا۔ ہلکے بھورے سے رنگ کی دیواریں جن پر جابجا مختلف پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سرمئی رنگ کا فرنیچر۔ دائیں طرف ڈریسنگ روم کو جاتا دروازہ اور بائیں طرف ذرا فاصلے پر سائیڈ ٹیبل اور پھر بیڈ۔ اس کی نگاہیں بیڈ پر لیٹے اس وجود پر پڑیں۔ ناکارہ وجود! چہرے سے جھلکتی نقاہت، پیلی رنگت، میلے کپڑے۔۔ منہ سے ٹپکتی رالیں۔۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف۔۔ اسے اس وجود پر ترس آیا تھا۔ اس نے دھیرے سے ٹرالی ایک طرف کی کیونکہ یہ وقت اس کے کھانے کا نہیں تھا۔ ایک سرسری سی نگاہ کمرے پر ڈال کر وہ سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ جلدی سے درازیں کھولیں۔ سامان الٹا پلٹا مگر کچھ کارآمد برآمد نہیں ہوا۔ وہ اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھا۔ وہاں رکھے مختلف کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کتابوں کو دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ ان کے درمیان میں رکھی فائل پر ٹکیں۔ اس نے جلدی سے فائل اٹھائی۔ یہ کسی اسپتال کی فائل تھی اور اندر یقیناً بیڈ پر پڑے اس ناکارہ وجود کی رپورٹس تھیں۔ اس نے جلدی سے پینٹ کی جیب سے موبائل نکالا پھر یکے بعد دیگرے تمام رپورٹس کی تصاویر لینے لگا۔ وہ اسی کام میں مشغول تھا جب اسے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی کمرے کی طرف آرہا تھا۔ قدموں کی چاپ بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ آنے والا تقریباً کمرے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے تیزی سے رپورٹس سمیٹیں۔ فائل بند کی۔ ناب گھمایا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

اندر داخل ہوتے مائیک نے ایک سرسری سی نگاہ اردگرد ڈالی پھر مسکراتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھا۔

"میں نے آپ کو بہت یاد کیا ماں۔" وہ جھک کر ایلسا کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ایلسا نے اسے دیکھتے ہی غوں غوں کی آوازیں نکالنا شروع کر دی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پہلو میں بیٹھا۔ محبت و عقیدت سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"طبیعت کیسی ہے آپ کی؟!" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

اس قد آور کبڈ کے اندر۔۔ سانس روک کر کھڑے جندل نے دھیرے سے سینے میں قید سانس خارج کی تھی۔

☆☆☆

"سر آپ اسے دیکھ سکتے ہیں؟" اس آواز پر اس نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے لڑکے کو تشویش سے دیکھا۔

"ہمیں ایک پیغام موصول ہوا۔۔ مائیکل کے لیے!" اس لڑکے کی بات پر اس نے حیرت سے اسے دیکھا پھر تیزی سے اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آیا۔ راہداری سے گزر کر وہ اس آفس میں پہنچا۔ وہاں دیوار پر نسب بڑی سی اسکرین پر کوئی پیغام جگمگا رہا تھا۔ وہ اسکرین کے سامنے کھڑا ہوا۔

"مائیکل تمہیں سلام دے رہا ہے، الزر قاوی!!" ضرار نے سانس روکے اس پیغام کو دیکھا۔

"فوراً اس پیغام کو ٹریس کرو۔" اس کے حکم پر کئی گردنیں اثبات میں ہلیں۔ وہ پریشانی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اسکرین کے سامنے ٹہلنے لگا۔

"سر اسے ٹریس نہیں کیا جا سکتا۔" ٹھیک وہی جواب موصول ہوا جس کی اسے امید تھی۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچے۔

"جواب لکھو۔" اس کے حکم پر وہ حرکت میں آئے۔ اسکرین پر اس کا لکھوایا گیا جواب چمکنے لگا۔ "مائیکل کہاں ہے؟"

"وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے۔ ملنا چاہو گے؟" کچھ ہی دیر بعد انہیں جواب مل چکا تھا۔ اس نے عقب میں بیٹھے لڑکے کو اشارہ کیا۔

"مائیکل کہاں ہے؟"!!

"الزر قاوی کہاں ہے؟!" اس نے ٹھہر کر اسکرین کو دیکھا۔ مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"اس ایڈریس پر الزر قاوی کو لاؤ اور مائیکل کو لے جاؤ!" اس پیغام کے ملتے ہی اسکرین پر ایرر آنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں میں تمام پیغامات مٹ چکے تھے۔ ڈیٹا کلیئر کیا جا چکا تھا۔

"اب ہم کیا کریں گے سر؟!" کسی نے سرگوشی کی تھی۔

"ہم مائیکل کو لینے جائیں گے!" اس نے دائیں ہاتھ کی بند مٹھی کرسی کے بازو پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ نگاہیں پرسوچ انداز میں تاریک اسکرین پر ٹکی تھیں۔ چہرہ ضبط کے مارے ہلکا سا لال پڑنے لگا تھا۔ دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے دشمن کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔۔

وہ۔۔

ضرار ولید!

☆☆☆

وہ آواز بہت مدھم سی تھی۔ بہت دھیمی اور ایک لے میں بہتی۔ عجب سی دھن جو دلوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اس نے کئی پل بس خاموشی کے ساتھ اس دھن کو محسوس کرنے میں گزار دیے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھا زیاد اس کی مسلسل خاموشی پر کوفت میں مبتلا ہوا تھا۔ جبھی اس نے آگے بڑھ کر اس کا موبائل اٹھا لیا۔ میوزک بند ہو گیا۔

"تم کب سے یہ فضول کام کرنے لگیں ازا؟" اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

"یہ دلوں پر کتنی جلدی اثر انداز ہوتی ہے، تم نے محسوس نہیں کیا؟! اس کا نام میموریز آف الحمراء ہے۔ غرناطہ کے بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان کہیں سڑک پر۔۔ یا کہیں راہ چلتے۔۔۔ کسی کیفے سے گزرتے ہوئے۔۔ یا کہیں بھی یہ میوزک ضرور سنائی دیتا ہے۔ لوگ اسے سننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

زیاد بے زار ہوا۔ اسے نہ غرناطہ میں شوق سے سنے جانے والے اس میوزک میں دلچسپی تھی نہ ازا کی باتوں میں۔

"ازا۔۔" وہ دھیرے سے آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں گھٹنوں پر رکھیں۔ "ہم نیویارک جا رہے ہیں!" اس نے گویا حکم صادر کیا تھا۔ ازابیلا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"تمہاری دوست ایملی کو ڈھونڈنے۔ اس کے بوائے فرینڈ کے قتل کی تحقیقات وہیں سے شروع ہونگی۔"

"مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ بابا کبھی اجازت نہیں دینگے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ان سے اجازت لے کون رہا ہے؟ ازا دیکھو میری بات سنو۔۔ میں یقیناً تمہیں یا خود بھی ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اب میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ اگر وہ میرے گھر پر آ کر مجھے ہی زدوکوب کر سکتے ہیں تو کوئی بعید نہیں کہ کل میرے اپارٹمنٹ سے میری لاش بھی برآمد ہو جائے۔ اور یقیناً میں یہ پسند نہیں کروں گا!" ازابیلا لب بھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی بات سمجھ رہی تھی مگر دوسری طرف جان سے عزیز باپ کا معاملہ بھی تھا۔

"مگر زیاد۔۔ بابا۔۔"

"ازا پلیز! اگر تم یہ نہیں کر سکتیں تو میں خود کر لوں گا۔ کل تک تم حق کے لیے لڑنا چاہتی تھیں یہ تمہاری ضد تھی۔۔ مگر میں اپنے لیے لڑنا چاہتا ہوں اور یہ میری ضد ہے۔ میں نیویارک جاؤں گا!" بھرپور عزم کے ساتھ کہتا وہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ ازا نے بے اختیار سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ اس نے سوچنے کے لیے صرف کچھ پل لیے تھے اور پھر وہ کہہ رہی تھی۔ "ہم نیویارک جائیں گے"!

☆☆☆

یہ وہ وقت ہے جب آسمان اور زمین پر سب تھم جاتا ہے۔ ہاں وہی وقت جب ڈوبتا سورج سمندر کے کنارے پر کھڑا ہے اور ایک تیز لہر، طوفانی اور وحشی لہر کچھ یوں اوپر اٹھتی ہے جیسے سورج کو ساتھ بہا کر لے جائے گی۔ کسی دیوار کی مانند سورج کے آگے کھڑی وہ مطلق العنان اور بپھری ہوئی لہر جس کے پار کچھ نظر نہ آئے۔ وہ لہر پورے جوش سے اٹھی تھی، ہر شور تھم گیا۔ اس وحشی لہر کے جوش کے آگے ہر جوش کو مات ملی۔ وہ بپھری لہر آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ آسمان اور زمین پر سب تھم گیا ہے۔ کچھ سنائی نہ دیا سوائے اس لہر کی بھیگی آواز کے۔ کچھ دکھائی نہ دیا ماسوائے اس بے لگام لہر کے۔ اور وہ لمحہ جب وہ لہر جوش سے آگے بڑھتی ہر چیز کو اپنے ساتھ بہاتی سورج کو اپنے ساتھ لے ڈوبی تو انہیں لگا وقت یہیں تھم گیا ہے۔ سب منجمد ہو گیا۔ شفق کی خوبصورتی اور سمندر کی یہ ادائیں سانس روکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ نم ہوا کا ایک جھونکا انہیں چھو کر گزرا۔ بیک وقت تینوں ہوش میں آئے۔ فوراً سے جھرجھری لی۔ آہ سمندر۔۔ یہ ہر انسان کو بے بس کیوں کر دیتا ہے؟ دل کا معاملہ ہو تو قابض ہو جاتا ہے اور جان کا معاملہ ہو تو جان لے کر چھوڑتا ہے۔ سمندر کسی سفاک محبوب کی طرح کیوں پیش آتا ہے؟!

"سنو دحیہ تم سمندر سے دغا کرنے کے بعد کیسے جی رہے ہو؟" پوچھنے والا سنان تھا۔ بغور دور تک پھیلے بے کراں سمندر کو دیکھتے ہوئے دحیہ مسکرا دیا۔

"میں نے دغا نہیں کی دوست! فرق یہ ہے کہ یہ نوجوان کپتان سمندر کو چھوڑ کر اس شہر میں آبسا جو سمندر کے سینے

پر بہتا ہے۔ یہ دغا تو نہ ہوئی، بیک وقت بَر اور بحر سے آشنائی ہے۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ یوں کہ اس کی آنکھوں کے کناروں پر سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔ اس کے برابر میں کھڑے معاویہ نے بغور ان سلوٹوں کو دیکھا تھا۔

"یہ کیسا "نوجوان کپتان" ہے، جس کی آنکھوں کے کناروں پر جھریاں پڑتی ہیں؟" اس کے سنجیدگی سے پوچھنے پر دحیہ اور سنان کی بیک وقت ہنسی چھوٹی تھی۔

"یہ خوبصورتی کی نشانی ہے عزیزم! مگر تم نہیں سمجھو گے۔" دحیہ نے اس کے کندھے پر بازو پھیلایا۔ معاویہ نے بچوں کی طرح ناک سکیڑی۔ "درس گاہ کب جانا ہے؟"

"رات کو ٹھیک آٹھ بجے!" سنان کے جواب پر دحیہ کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"رات کو؟ جماعت تو صبح نہیں ہوتی؟"

"تم اپنے چھوٹے دماغ پر زور مت دو۔ سمندر کی گود میں پلے ہو، دماغ میں بھی پانی بھر گیا ہے جس میں تمہاری عقل ڈبکیاں لگا رہی ہے۔" معاویہ نے انگشت شہادت سے اس کے سر کو کھٹکاتے ہوئے کہا تھا۔ سنان سر جھکا کر مسکراہٹ دبا گیا۔ دحیہ نے خفگی سے ناک سکیڑی۔ "ذرا بتانا تمہارے والد بزرگوار اپنے جوان بیٹے کو لینے کب آ رہے ہیں؟"

"وہ آئیں یا نہ آئیں لیکن اب اگر تم نے یہ سوال کیا تو واللہ میں تمہیں اس سمندر میں دھکا دے دوں گا۔" اس نے تڑخ کر کہا تھا۔ دحیہ سے یہ جاننے کے بعد کہ وہ اپنے والد جو بحری جہاز کے کپتان تھے، ان کے ساتھ یہاں تجارت کے سلسلے میں آیا تھا۔ یقیناً یہ صرف بہانہ تھا جو اگر وہ نہ گھڑتا تو اس کے والد کبھی اسے یہاں نہ لاتے۔ اور اس وقت جب ان کا جہاز اندلس کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو دحیہ نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور درس گاہ کا رخ کیا۔ اس

نے اپنے والد کی ہر پکار کو نظر انداز کیا۔ وہ اسے پکارتے رہے یہاں تک کہ دھمکی بھی دی کہ وہ واپس نہ آیا تو وہ سمجھ جائیں گے ان کا بیٹا مر چکا ہے۔ وہ ان کی تمام دھمکیاں ان سنی کر کے چلا گیا۔ جانتا تھا غلط کیا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سمندر کی گود میں وہ ایک شیر خوار بچے سے جوان لڑکا تو بن سکتا ہے مگر جوانی کے بعد بڑھاپے کی منزل تک کا سفر سمندر میں نہیں طے کیا جا سکتا۔ اسے علم حاصل کرنا تھا، اسے دنیا کو جاننا تھا۔ وہ دنیا جو سمندر کی دنیا سے کئی گنا زیادہ خوفناک اور بھیانک تھی۔ وہ شباب کی منزلوں کو چھو رہا تھا، جوانی کا جوش ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسے روکنا آسان نہیں تھا۔ تبھی اسے روکا نہیں جا سکا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب شاید ہی اسکے والد اندلس کا رخ کریں۔ اندلس کے ساحل پر شاید ہی کبھی ان کا جہاز لنگر انداز ہو۔۔ سنان نے اس کی کہانی کافی سنجیدگی سے سنی تھی لیکن معاویہ نے کوئی خاص ردِ عمل نہیں دیا تھا۔ البتہ اس وقت سے اب تک وہ بیسیویں بار یہ سوال پوچھ رہا تھا اور یقیناً اب اگر اس نے دوبارہ یہ سوال کیا تو دحیہ اسے سمندر میں دھکا دے دے گا۔

"مجھے تیرنا آتا ہے۔" وہ لاپرواہی سے کندھے اچکا گیا۔ دحیہ نے دانت کچکچائے۔ "سنان میرے دوست، عزیزم دلبرم، جانِ من، جنابِ من۔۔ کیا تم اپنی آواز کا وہ جادو چلاؤ گے جو ہر سننے والے کو بے ضرر کر دیتا ہے؟" سنان نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یقیناً نہیں دوستَم!" وہ رخ پھیر گیا۔ معاویہ نے مسکراہٹ دبائی۔

"ٹھیک ہے پھر ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق میں خود ہی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کیں۔ گلا کھنکھارا اور اس سے پہلے وہ حلق سے آواز برآمد کرتا سنان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "واللہ عزیزِ من! ہم پر یہ ظلم مت کرو۔ پچھلی بار تم نے حلق سے جو سُر برآمد کیا تھا تو اگلے تین دن تک میرے کانوں کے زخم نہیں بھرے تھے۔" اس کی التجا پر معاویہ اور دحیہ کے قہقہے بلند ہوئے تھے۔ سنان نے معصومیت سے دونوں کو دیکھا

پھر گویا ہار مانی تھی۔

ایک بڑی لہر ان کی طرف بڑھی تھی۔ جوش سے اور مکمل بپھری ہوئی وحشی لہر جو بس ڈبو دینا جانتی تھی۔ کانوں میں میٹھا رس گھول دینے والا شور بلند ہوا۔ دلوں کے تار چھیڑے گئے۔ پانی کے چھینٹے ان پر گرے۔ نمی کے احساس نے وجود کے پُور پُور کو مسرور کیا۔ لہر پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔

مل نہ پائے گر اس جہاں میں

مل ہی جائیں گے آسمان میں

عرش کے تلے سائبان میں

راہ وہ رہے بس دھیان میں۔۔

ان پر سایہ کیے کھڑی اس بڑی سی چادر پر بکھرا قرمزی رنگ سکڑنے لگا۔ اس کی جگہ چادر پر سیاہی کے دھبے گرے۔ جگہ جگہ بکھرے اور پھر دھیرے دھیرے پھیلنے لگے۔

جس کے موڑ پر جنتِ بَریں

سر بلند ہوں دوستانِ دین!

سرنگوں ہوں دشمنانِ دین!

☆☆☆

کمرے کے دروازے کے بند ہونے کی آواز پر اس نے دھیرے سے کبڈ کا دروازہ کھولا۔ ذرا سا آگے ہو کر ارد گرد دیکھا۔ مائک جا چکا تھا۔ وہ کبڈ سے باہر آگیا۔ ایک نگاہ بیڈ پر پڑے اس وجود پر ڈالی جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں انوکھی چمک۔ کچھ دیر پہلے والا خوف تھا نہ اضطراب۔ وہ آگے بڑھا اور ٹرالی گھسیٹتے ہوئے کمرے

سے باہر آ گیا۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہ احتیاط بھری نگاہ ارد گرد ڈالتا کچن کی طرف بڑھنے لگا جب اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی زینے اتر رہا تھا۔ وہ رک گیا۔

"سنو تم۔۔ میرے لیے جلدی سے جوس لے آؤ۔" حکم صادر کرنے والا مائک تھا۔ جندل نے لب بھینچ کر خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا تھا۔ جبڑے ایکدم تن گئے تھے۔ ٹرالی پر گرفت مضبوط ہوئی اور وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

مائک زینے اتر کر بے ڈھب طریقے سے صوفے پر گرا۔ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔ کال اٹھالی گئی تو اس نے موبائل کان سے لگایا۔

"میں اگر آپ کے کہنے پر بالفرض ان خاتون کی جان لے بھی لوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ فون کے پار کوئی ایسا انسان تھا جس کے سامنے سنجیدہ ہونا پڑتا تھا۔

"تم زندگی کے جس دوراہے پر کھڑے ہو وہاں تم اپنے فائدے کا نہیں سوچ سکتے مائک! تمہارے آگے کنواں اور پیچھے کھائی ہے۔ اس وقت تم صرف اپنے باپ کی جان بچانے کا سوچو گے۔ تمہیں سوچنا پڑے گا!" وہ بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو غصے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ یہ ذو معنی الفاظ تھے اور ان کا مطلب وہ بخوبی جانتا تھا۔

"تین ملیئن ڈالرز!" اس نے شرط رکھی تھی۔

"تمہارے باپ کی جان سے زیادہ قیمتی ہیں؟" اس کے باپ کی جان کی بولی لگی تھی۔ وہ ہار گیا۔ ہمیشہ کی طرح بے بسی ہو گیا۔

"کب قتل کرنا ہے؟"

"ٹھیک تین دن بعد!" کال کاٹ دی گئی۔ وہ لب بھینچتا موبائل صوفے پر پٹخ کر سر ہاتھوں میں گرا گیا۔ بے بسی کی انتہا تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا مارک کیوں اسے مرد بنانا چاہتا تھا۔ وہ ایک فیلیئر تھا، ہمیشہ ہار جاتا تھا۔ وہ کمزور تھا،

سب کا اسی پر بس چلتا تھا۔

"سر جوس۔" اسے اپنے قریب سے آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ نگاہیں سامنے کھڑے لڑکے پر ٹکیں تو ماتھے پر بل پڑے۔ کم فہمی سے اسے دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم وہی لڑکے ہو ناں جو اس دن ازابیلا کے ساتھ تھا؟ تم۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کی آواز ذرا بلند ہوئی۔

"میں نے اسے جاب پر رکھا ہے مائک!" جواب جندل کے بجائے اندر آتے مارک نے دیا تھا۔ جندل نے اسے دیکھتے ہوئے ذرا سے کندھے اچکا دیے۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے ٹرے سے جوس کا گلاس اٹھایا اور پوری وقت سے زمین پر دے مارا۔ "ابھی اور اسی وقت اسے فارغ کریں بھائی!!" وہ غصے سے چلایا تھا۔ مارک نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی۔

"آواز نیچی رکھو مائک! تم چیخنے چلانے کے علاوہ بھی کچھ کرتے تو اپنے ہی ملازموں کے ہاتھوں سڑک پر مار نہ کھاتے۔" اس کے طنزیہ کہنے پر وہ چونکا۔ چونک کر جندل کو دیکھا جو پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے صوفے سے ذرا سا ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ وہ کہیں سے بھی تو ملازم نہیں لگتا تھا۔ اور پھر وہ سمجھ گیا۔ اسے سمجھ آ گیا کہ مارک نے کس بارے میں بات کی تھی۔ غصے اور حیرت کے ملے جلے تاثرات آنکھوں میں سموئے اس نے مارک کو دیکھا۔

"آپ نے یہ جاننے کے باوجود اسے نوکری دی؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں، کیونکہ دوسری صورت پر مائک بار بار اکی عزت نیلام ہو جاتی!" زہر خند لہجے میں کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ مائک اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ تو کیا مارک اس کے ہر راز، اس کی ہر گھٹیا حرکت سے واقف تھا؟ اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔ جندل ایک نگاہ اس پر ڈال کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ تماشہ ختم ہو چکا تھا!

☆☆☆

”آپی سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اس بار آپ کی بات نہیں مانوں گا۔ میں انہیں بھیج رہا ہوں اور وہ جا رہی ہیں۔“

اس نے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے موبائل کان سے لگائے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر۔ میں آ رہی ہوں ابھی اور اس وقت! اگر سعاد کو جانا ہے تو اس سے کہو پہلے مجھے جواب دے نہ یا ہاں؟!“ حرم کے الفاظ پر وہ رکنے پر مجبور ہو گیا۔ بے بسی سے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اس نے ہونٹ بھینچے۔

”کیا چاہتی ہیں آپ؟“ وہ تھک کر پوچھ رہا تھا۔

”یہی کہ اگر سعاد کو جانا ہے تو پہلے ہم اس کی منگنی کریں گے پھر وہ جائے گی۔“ اس نے حیرت سے سامنے دیکھا تھا۔

اسے لگا حرم نے مذاق کیا ہے۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں یہاں آپ کو کہہ رہا ہوں ان کی جان کو خطرہ ہے اور آپ کو منگنی کی پڑی ہے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ کمرے سے نکلتی سعاد کے کان اس کی آواز پر کھڑے ہوئے۔

اس نے آنکھیں سکیڑے سامنے دیکھا جہاں اب وہ جھنجھلا کر صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔ ”آپ ان کی منگنی کروانا چاہتی ہیں تو شوق سے کروایئے گا مگر ان کے لوٹنے کے بعد!“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ سعاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے دروازہ کھولا اور واپس کمرے میں آ گئی۔ جلدی سے اپنے بیگ سے موبائل نکالا اور خیام کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پر کال اٹھا لی گئی۔

”مادام آپ ٹھیک ہیں؟“ انداز پر سکون تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ زندہ ہوں وہاں سے بچ نکلی مگر یہاں پھنس گئی ہوں۔ یہ لوگ میری منگنی کروا رہے ہیں خیام!“

دروازے پر نظریں جمائے وہ تقریباً رو دینے کو تھی۔

”تو کر لیں۔“ دوسری طرف وہ ہنوز پر سکون تھا۔

”ایسے کیسے کرلوں؟ مجھے نہیں کرنی ضرار سے شادی!“ وہ صدمے سے دبا دبا چلائی۔

”کس سے کرنی ہے پھر؟“ بے پرواہی سے پوچھا گیا۔

”نہیں کرنی کسی سے نہیں کرنی۔“ اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”اپنی بات پر قائم رہیں گی مادام؟“ وہ جیسے اس کا امتحان لے رہا تھا۔ وہ چونکی۔ ایک لمحے کو ٹھہری۔ وہ یہ سوال کیوں پوچھ رہا تھا؟ کیا وہ اس کا مذاق بنا رہا تھا؟ اور کیا وہ حقیقت جانتا تھا یا اس کے حالِ دل سے باخبر تھا؟

”خیام پلیز!!“ اس نے التجا کی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ یہ تمہیں منگنی کے بغیر تھائی لینڈ نہیں آنے دے رہے، یہی بات ہے ناں؟“ وہ سر اثبات میں ہلا گئی۔ جیسے وہ اس کے سامنے بیٹھا اس کے ہلتے سر سے اپنا جواب لے لے گا۔ ”تو کرلو منگنی۔ کل کی تاریخ میں ادھر آؤ، باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”آپ جانتے ہیں یہ صرف ایک رسم نہیں عہد ہوتا ہے عہد! یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ضرار کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی آپ مجھے اس عہد میں بندھنے کا کہہ رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ٹھنڈے دماغ سے سوچو لڑکی۔ کہہ رہا ہوں ناں سنبھال لوں گا سب۔ ضرار کی جگہ کوئی اور ہوتا تو منگنی نہیں کرنے دیتا تمہیں مگر یہاں ضرار ہے۔ اسے سب بتائیں گے تو سمجھ جائے گا۔“ وہ بہت آسانی سے کہہ رہا تھا۔ اسے کہہ رہا تھا کہ وہ صرف منزل تک پہنچنے کے لیے ضرار کو سیڑھی کی طرح استعمال کرے۔ وہ اس کے احساسات کے ساتھ کھیلے۔ اور بعد میں وہ اسے کسی بچے کی طرح ٹافی دے کر بہلا لے گا۔ وہ اس مذاق پر ہنس دی۔ کھوکھلی اور خالی پن سے بھرپور ہنسی۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں؟“

"تم نے مجھ سے حل مانگا ہے سعاد! اپنے جذبات کو ایک طرف رکھو اور کل کی تاریخ میں یہاں پہنچو۔ یہ میرا حکم ہے۔" اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

"میں اسے کیسے استعمال کرلوں؟ وہ آپ کا بھی دوست ہے، آپ اپنے ہی دوست۔۔" وہ اپنی بات مکمل نہیں کرپائی۔

"ہاں وہ میرا دوست ہے مگر دوستی کے لیے میں کام کو ایک طرف نہیں رکھ سکتا۔ وہ استعمال ہو رہا ہے تو ہونے دو۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑتا ہے۔ کچھ بھی!" درشتگی سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔ سعاد نے سانس روکے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔ یہ پہلی بار تھا وہ اس پر غصہ کر رہا تھا۔ پہلی بار اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد اس نے موبائل کی اسکرین روشن کی۔ ضرار کی چیٹ میں جاکر پیغام لکھنے لگی۔ ہیغام لکھ کر اس نے بنار کے پیغام بھیج دیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پیغام موصول کرلیا گیا۔ روشن اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو پڑھ کر وہ حیران ہوا تھا۔ اس نے بھیجنے والے کا نام دیکھا۔ وہاں سعاد کا نام تھا۔ اس نے دوبارہ پیغام دیکھا اور پھر کچھ دیر کے وقفے سے وہ پیغام حرم کو فارورڈ کر دیا۔ وہاں لکھا تھا کہ،

"منگنی کی رسم آج شام ہو جائے تو بہتر ہے۔ میں کل یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

وہ اس اونچے کوٹھی نما بنگلے سے باہر نکلا تو سکون کی گہری سانس خارج کی تھی۔ یہ گھر اس کے لیے کسی زندان سے کم نہیں تھا۔ عجب منافق لوگ، پیسے کے پجاری، طاقت کے نشے میں چور اور عزتوں کو قدموں تلوں روندنے والے وحشی۔ ماتھے پر پی کیپ ٹکائے سڑک کنارے چلتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ ہلکا آبی آسمان جہاں گہرے بادل جمع ہو رہے تھے۔ گھنگھور گھٹا چارہی تھی۔ آج بارش کے

امکان تھے۔ چشمِ ابر بس اشک بہا ہونے کو تھی۔ ہوا اپنے گرد و پیش میں ہر چیز کو کاٹتی، چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سگنل پر رکی گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ بیشتر لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ کچھ کا رخ اس حسین موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے تفریحی مقامات کی جانب تھا۔ ہر جان کے ساتھ زندگی کے عجب جھمیلے تھے۔

وہ یونہی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا جب جیکٹ کی جیب میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔ اس نے بنا رکے جیب سے موبائل نکالا۔ ساتھ ہی ایئرپوڈز برآمد کیے۔ یونہی سامنے نظریں ٹکائے ایئرپوڈز کانوں میں ٹھونسے اور نمبر دیکھنے کی زحمت کیے بنا کال اٹھا کر موبائل واپس جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

"میری منگنی ہوگئی ہے۔" دوسری طرف ضرار تھا۔ کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح وہ اسے باخبر کر رہا تھا۔

"کس سے؟" وہ کوئی تاثر دیے بنا چلتا رہا۔

"تمہاری ہمشیرہ سے۔" جواب چونکا دینے والا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔ رک کر آنکھیں سکیڑے سامنے دیکھا۔ وہاں ایک خاتون کیری کاٹ سنبھالے سڑک پار کر رہی تھیں۔

"مذاق کر رہے ہو؟"

"میری حسِ مزاح اتنی بری نہیں ہے۔" دوسری جانب وہ شاید تپا ہوا بیٹھا تھا۔ جندل نے سر جھٹکا۔ اسے یقین آگیا تھا۔ اس کی بہن نے اسے بتائے بنا منگنی کر لی تھی۔ وہ سعاد سے کسی بھی چیز کی امید کر سکتا تھا۔ کسی بھی چیز کی!

"مبارکباد دوں یا تمہاری آنے والی زندگی میں تمہاری بے بسی پر تمہارے لیے آنسو بہاؤں؟" وہ دوبارہ چلنے لگا۔ دونوں ہاتھ اب جیکٹ کی جیب میں تھے۔

"تمہاری ہمشیرہ جا رہی ہیں۔" اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا گیا۔

"کہاں؟"

"اندلس۔" اس نے سر کو ذراسی جنبش دی۔ اب اگر ضرار کہتا کہ اس کی بہن اندلس پہنچ چکی ہے تب بھی اسے حیرت نہ ہوتی۔ اس کی بہن کچھ بھی کر سکتی تھی۔ "ان کے جاتے ہی میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"تمہیں آنا چاہیے۔ میرے خبیث دوستوں میں سے ایک تو ورلڈ گلاس کمپنی کا مینیجر بن بیٹھا ہے اور دوسرا نیشنل لائبریری میں لائبریرین۔ میرے ساتھ ازلی دشمنی کی بنا پر مجھے ایپرن پہنا کر کچن میں بھیج دیا ہے۔ اور بنانا کیا ہوتا ہے؟ وہی روز روز کی مچھلی جسے دیکھ کر ہی متلی ہونے لگتی ہے اور وہ پھیکے سے سوپ جو ابلے ہوئے پانی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ آتے جاتے انہیں طرح طرح کے جوس چاہیے ہوتے ہیں جنہیں بناتے ہوئے میرا دل کرتا ہے کہ مشین میں پھلوں کی جگہ پر ان کی کھوپڑیاں گھمادوں اور رات کے کھانے میں ان کے استخواں کو مصالحہ جات لگا کر پیش کر دوں۔ واللہ! میں صبر کھو رہا ہوں۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ یہ سڑک اب یہاں سے دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ وہ بنار کے اسی دھیمی رفتار سے دائیں طرف مڑ گیا۔ یہاں سے اب ایک نئی کشادہ سڑک شروع ہوتی تھی۔

"میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا میرے دوست۔" گہری سانس لیتے ہوئے کہا گیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"سنو۔۔ تمہیں چند رپورٹس بھیجی ہیں۔ آج ہی ح۔زب۔ُ الل۔ہ کے کسی بہترین ڈاکٹر سے ملو۔ انہیں یہ رپورٹس دکھاؤ۔ مریض کس وجہ سے اس مرض کا شکار ہوا اور دیکھو کہیں کچھ مشکوک ہے؟ میں پوری تسلی چاہتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا اب اپنے گھر کی گلی میں داخل ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں تھوڑی دیر میں کال کرتا ہوں پھر۔" اس نے سر کو ذراسی جنبش دی۔ دوسری طرف سے

کال کاٹ دی گئی۔ وہ سست رفتار سے چلتا گھر کے پاس کھڑا ہوا۔ جیب سے چابی نکال کر لاک میں گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ برآمدے میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر کے بجائے کسی کباڑ خانے میں داخل ہوا تھا۔ سامنے بدر بے ڈھب طریقے سے صوفے پر گرا ہوا تھا۔ اس کے سینے پر روفی چڑھا ہوا تھا جو اس کی طرح مصروف سے انداز میں اسکرین کو تک رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ مڑ کر بدر کو دیکھتا، بدر اس کا سر سہلاتا اور وہ ذرا سا اچھل کر خوش ہوتا واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اس کی گود میں پاپ کارن تھے جن میں سے آدھے اس کے منہ میں جا رہے تھے اور باقی زمین بوس ہو رہے تھے۔ سامنے ایل سی ڈی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ میز پر رکھا اس کا فون مسلسل بجنے کے بعد تھک ہار کر بند ہو چکا تھا۔ اس کی جیکٹ نیچے کارپیٹ پر گری ہوئی تھی۔ جوتے ایک طرف اچھالے ہوئے تھے۔ میز پر ایک طرف شاپنگ بیگز الٹے پڑے تھے۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''تم آ گئے۔'' جندل پر نظر پڑتے ہی فوراً سیدھا ہوا۔ نتیجتاً گود میں رکھے پاپ کارن کارپیٹ پر الٹ گئے۔ وہ کھسیانا ہوا اور بات سنبھالنے کے لیے جلدی سے بولا۔ ''میں نے یہ شاپنگ کی ہے۔ کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اب ایک اصلی باڈی گارڈ کی طرح دکھنا چاہیے۔ میں نے یہ سیاہ پینٹ کوٹ بھی خریدا ہے اور ساتھ میں یہ آلہ بھی۔ اس سے میں اور خیام سر ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔ اور میں جلد ہی ایک پستول بھی خرید لوں گا جو ظاہر ہے میں چلاؤں گا تو نہیں مگر کسی کو دھمکانے میں وہ کارآمد ثابت ہو گی۔ تم کیا کہتے ہو؟'' اس نے تحسین مانگتی نظروں سے جندل کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بالکل سپاٹ۔ روفی اب نیچے گرے پاپ کارن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

''تمہارا آئی فون؟''

”اوہاں وہ۔۔اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ اب میں ایک کے بجائے دو دو آئی فون لیے پھرتا ہوں جو ظاہر ہے خیام سر کے ہوتے ہیں مگر میرے پاس ہوتے ہیں۔اور میرے پاس گاڑی بھی ہے جو ان کے نام ہے مگر اس کی چابی میرے پاس ہے۔مجھے اب اور کیا چاہیے؟“ وہ مسکرایا۔روفی ایک ہی کھیل سے بے زار ہوا تو واپس اس کی گود میں آگیا۔جندل پر نگاہ پڑتے ہی وہ مچلا۔بدر نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔وہ لاڈ سے اس کی گود میں اچھلنے لگا۔

”کیونکہ تم ایک باڈی گارڈ اور ایک ڈرائیور ہو بدر! کچھ بھی تمہارا نہیں ہے۔باوجود اس کے تم خود کو وقتی طور پر تسلی دے سکتے ہو اور اگر تم آئی فون کو واقعی بھلا چکے ہو تو یقین مانو اس ایک منٹ کے لیے میں دنیا میں سب سے زیادہ خوش انسان ہوں۔“ مسکرا کر کہتا وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔بدر نے خونخوار نگاہوں سے اس کی پشت کو گھورا۔مطلبی دنیا تھی، کوئی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا تھا۔وہ سر جھٹک کر واپس صوفے پر دراز ہوا۔روفی کے بال سہلاتے ہوئے اس نے نگاہیں اسکرین پر ٹکا دیں۔سرِ دست اسے یہ ڈرامہ ختم کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ نرمی سے اپنے سامنے بیٹھی سعاد کو دیکھ رہا تھا۔وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے بلانے پر یہاں پہنچا تھا۔وہ اپنے گھر نہیں جا سکتی تھی تو امامہ نے اسے اپنے گھر رہنے کی پیشکش کی تھی۔اس کے پاس یہ پیشکش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔صبح اس کا میسج پڑھ کر حرم نے فوراً اپنے سسرال سے یہاں کا رخ کیا تھا۔وہ پہلی بار امامہ سے ملی تھی۔وہ ضرار اور سعاد کے لیے بہت خوش تھی تبھی اس نے امامہ سے متعلق اور سعاد کے یہاں سے جانے کے متعلق زیادہ سوال نہیں پوچھے تھے۔شام کو عصر کے بعد ہی وہ انگوٹھی اس کی بائیں ہاتھ کی انگشت امانت کی زینت بنی جو ایک عہد کی یاد کے طور پر یہاں منتقل ہوئی تھی۔اور اس وقت۔۔سکڑتے ہوئے نیلے رنگ اور پھیلتی ہوئی سیاہی کے

آگے بے بس آسمان تلے بیٹھی وہ اسی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ اسے سب بتانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ضرار کو استعمال نہیں کر سکتی تھی، کبھی نہیں۔

"سعاد، آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" اس کی مسلسل خاموشی کو اس کی گھبراہٹ یا فطری حیا سمجھ کر اس نے خود پہل کرنا مناسب سمجھا۔ سعاد کی نظریں اس کے ہاتھ پر ٹکیں۔ وہاں بھی انگشت امانت میں اسی انگوٹھی جیسی انگھوٹی چمک رہی تھی۔ وہ نظریں پھیر گئی۔ یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا، کبھی نہیں۔

"سعاد؟" ایک بار پھر اسے پکارا گیا۔ اس نے گہری سانس اندر اتار کر بولنے کا فیصلہ کیا۔

"ضرار میں۔۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ کافی ہمت جمع کر کے بولی تھی۔ ضرار کے ماتھے پر بل پڑے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میرے لیے اس وقت سب سے زیادہ ضروری یہاں سے جانا تھا اور جب حرم نے منگنی کی بات کی تو مجھے اور کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس رشتے کے لیے ہاں میں نے صرف یہاں سے جانے کے لیے کی ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔" وہ ٹھہری۔ ٹھہر کر اسے دیکھا جو اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوز نرمی تھی۔ اور پھر جب وہ بولا تو آواز میں بھی دھیما پن تھا۔

"آپ۔۔۔ آپ کسی کی منتظر ہیں سعاد؟" وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ سعاد نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ بے یقینی اور حیرت سے۔۔ آنکھیں پھیلائے۔ وہ اس کی حیرت دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔ "آپ کی آنکھیں۔۔ یہ ہمیشہ ہر آہٹ پر چونکتی ہیں۔۔ جیسے کسی کی منتظر ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔ وہ حیران ہوئی۔ تو کیا اب دل کے رازوں پر گرا پردہ اٹھنے لگا تھا؟ "آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔۔ سعاد!" اس نے پلک جھپکی۔ جانے کس پہر پلکوں سے ایک آنسو جھول کر گرا اور نقاب میں جذب ہو گیا۔ وہ نظریں جھکا گئی۔

"ہم پہلی بار یونیورسٹی میں ملے تھے جہاں ہم ایک ماہ ساتھ رہے۔ یونیورسٹی کے بعد۔۔ ہماری ملاقات اندلس میں

ہوئی۔۔۔" وہ کسی داستان گو کی طرح اسے اپنی داستان سناتی چلی گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ ضرار کو اپنی داستان سناتے ہوئے وہ وہیں اندلس کی سڑکوں پر جا پہنچی ہے۔ وہاں سب سے پہلے۔۔ مالاگا کے ایئرپورٹ پر۔۔ اور اس فٹ پاتھ پر جہاں وہ اپنے ٹیچی پر چڑھ کر منہ بنائے بیٹھی تھی۔ جہاں اسے پہلی بار اندلس میں خوش آمدید کہا گیا۔ وہی لڑکا۔۔ بھورے رنگ کی پینٹ پر سبز شرٹ اور سیاہ جیکٹ پہنے، ماتھے پر پی کیپ ٹکائے، بغل میں تکیہ دبائے کندھے پر سفری بیگ لٹکائے اس کے ہم قدم ہوا تھا۔

رات کی تاریکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ریستوران اب مکمل طور پر برقی روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ کھلے آسمان تلے ایک میز کے گرد بیٹھے وہ دونوں اپنے ارد گرد ہوتی ان روشنیوں سے انجان تھے۔ ایک بول رہا تھا اور دوسرا سن رہا تھا۔ وہ لمحات جو اس کے لیے بہت خاص تھے اب داستان بن کر رہ گئے تھے۔ اور داستان بھی کیسی جو اگر اندلس کے سفر پر شروع ہوئی تو اندلس سے جاتے ہی ختم ہو گئی۔ وہ خاموش ہوئی تو وہ بے چین ہوا۔

"آپ دوبارہ کبھی نہیں ملیں اس سے؟" وہ آنکھوں میں نرمی سموئے دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

"بارسلونا کے ایئرپورٹ پر اسے آخری بار دیکھا تھا بس۔" وہ کندھے اچکا گئی۔ وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ ملے تھے۔ ان حالات میں جن میں انہیں ملنا چاہیے تھا۔ ایسے وقت میں جب ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ وہی تھی جس نے اسے یہاں سے جانے پر مجبور کیا۔ اور وہی تھا جس نے کہا تھا کہ اس کی خواہش ہے وہ پھر کبھی نہ ملیں! وہ دونوں دوبارہ کیسے مل سکتے تھے؟!

"اس نے دوبارہ آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔۔ اس نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ وہ اسپیشل فورسز میں ہے۔ ایک جاسوس۔۔۔ اور ایسے لوگ نمبر بدلتے

رہتے ہیں۔ شاید اس نے میرا نمبر کھو دیا ہو۔۔۔ اور وہ اس بڑے سے ملک میں مجھے کیسے ڈھونڈ سکتا ہے؟" وہ تلخی سے مسکرائی۔ جھوٹ بولنا بھی کتنا آسان ہو گیا تھا اس کے لیے۔ بنا کسی دقت کے۔۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ روانی سے جھوٹ بول رہی تھی۔ احساسِ جرم سے آنکھوں میں نمی پھلنے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ڈھونڈ سکتا تھا۔۔ اسے ڈھونڈنے کی ضرورت پیش ہی نہ آتی۔ وہ جہاں سے گیا تھا اگر وہیں لوٹ آتا تو اس گھر کے دروازے اپنے لیے کھلے پاتا اور گھر کے مکین کو اپنے لیے منتظر!

"اور آپ کو کوئی اندازہ ہے وہ کہاں ہو گا؟ کوئی اشارہ جو اس نے دیا ہو؟ کچھ ایسا جو اس کے مستقبل کے پلانز کے متعلق ہو؟" وہ آنکھیں سکیڑے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ آنکھیں چھوٹی کیے پر سوچ نگاہیں اس کے عقب میں گاڑیں۔ وہاں دوسری میز خالی تھی اور اس کے پار پھر سڑک تھی۔ سڑک سے گزرتیں بے شمار گاڑیاں تھیں۔ روشنی ہی روشنی تھی۔۔ کراچی روشنیوں کا شہر۔۔ جس کے ایک کونے میں کھلے آسمان تلے بیٹھی وہ لڑکی اپنی یادداشت کے پلندے پلٹ رہی تھی۔ پھر وہ چونکی۔ کچھ یاد آیا۔ کچھ الفاظ سماعت سے ٹکرائے۔

"تین ماہ پہلے میں نے تھائی سیکھی ہے۔" اس نے شاید یہی کہا تھا۔ یعنی ممکن تھا کہ وہ اندلس کے بعد تھائی لینڈ گیا تھا یا پھر یہ بھی ممکن تھا وہ اندلس آنے سے پہلے تھائی لینڈ گیا تھا؟ اور بالفرض اگر وہ مان لے کہ وہ اندلس کے بعد تھائی لینڈ گیا تھا تو اب تک ان دو سالوں میں وہ کہیں اور جا چکا ہو گا۔ کسی دوسرے ملک میں۔۔ دنیا کے کسی اور کونے میں۔۔ کسی اور روپ میں۔۔ اس کے چہرے پر اچانک سے آنے والے رنگ ماند پڑنے لگے۔ ایک بار پھر دل و دماغ میں مایوسی چھا گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے نہیں یاد اس نے کوئی ایسا اشارہ دیا ہو۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ دھیمی آواز میں ہلکا سا نمی کا عنصر شامل ہوا تھا۔ آنکھوں میں پھلکتے شفاف پانی نے اس ننھے سے قطرے کو دھکیلا تو وہ دھیرے سے پلکوں سے جھول کر گال پر لڑھکا۔

"محبت کرتی ہیں آپ اس سے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھلکتی نمی کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے نفی میں سر ہلا گئی۔ ایک اور آنسو سر کے ہلنے سے گال پر لڑھک گیا۔

"محبت اس نے کی تھی مجھ سے۔۔ میں نے تو بس ہار مانی تھی اس کی محبت کے آگے۔" اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ اور آواز میں واضع لغزش تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر ذرا سا سر جھکا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یہ کانپتی آواز، آنکھوں میں یہ نمی، بے ربط سے الفاظ۔۔۔ اس کے ذکر پر آپ کی یہ حالت ہے سعاد! اسے سامنے دیکھ کر کیا کریں گی؟ کیا پھر بھی دعوہ کریں گی کہ آپ کو اس سے محبت نہیں؟" وہ نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔۔ وہ اپنے آنسو چاہ کر بھی نہیں روک پارہی تھی، الفاظ میں ربط نہیں تھا، آواز میں لغزش تھی، دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔۔۔ کیا واقعی اب بھی اس کا دعوہ ٹھیک تھا؟

"تم۔۔۔ تم زبردستی مجھے اس سے محبت کروا رہے ہو۔" وہ کہہ کر ہنس دی۔ وہ بھی سر کو ذرا سا جھٹک کر ہنسا۔ وہ ہنسی جس میں خوشگواری کا شائبہ تک نہ تھا۔ "میں نہیں جانتی جب وہ میرے سامنے آئے گا تو کیا کروں گی؟ کیونکہ میں اسی کشمکش میں ہوں کہ وہ آئے گا بھی کہ نہیں؟" اس نے رک کر گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔

"میں جانتا ہوں آپ کیا کریں گی!" وہ دعوہ کرتے ہوئے آگے ہوا۔ دائیں کہنی میز پر ٹکائی۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "آپ کھینچ کر اس کے گال پر تھپڑ رسید کریں گی۔" وہ ہنس دی۔ سر جھکا کر، نم آنکھوں سے۔ وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہوا۔ "سچ بتائیں، کیا کبھی اسے تھپڑ مارا؟" اس نے بنا سوچنے کا وقت لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چہرہ موڑتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔ "ہنسو مت۔۔ وہ قابل تھا اس کے۔" وہ منمنائی۔

"بالکل۔۔ آپ بلاوجہ کسی کو تھپڑ نہیں مارتیں، میں جانتا ہوں۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ چھپانے کے

لیے اپنا انگوٹھا اپنے لبوں پر رکھے چہرہ موڑے بیٹھا تھا۔

”ضرار۔۔ کیا وہ کبھی واپس آئے گا؟“ وہ سنجیدہ ہوا۔ چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں نمی کی چمک بڑھ رہی تھی۔ وہ بے بسی سے لب بھینچ گیا۔

”میں اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کروں گا سعاد! میں اسے آپ کے پاس لاؤں گا، وعدہ رہا۔“ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا کہ وہ اس کا کھویا ہوا کھلونا اسے واپس لادے گا۔

”اور تم۔۔ کیا تمہیں برا نہیں لگا کہ میں نے تمہیں استعمال کیا؟“ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

”شاید لگا۔۔ مگر یہ احساس کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے رازدار بنایا ہے، اس احساس پر بھاری ہو گیا۔“ وہ مسکرایا۔ ہلکا سا۔۔ ”میں آپ کا مشکور ہوں سعاد کہ آپ نے خوش فہمیوں کی طرف میرے قدموں کو بڑھنے سے پہلے روک دیا۔ یہ آپ کا مجھ پر قرض رہا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔۔ جانے کیسے وہ اتنا صبر کر لیتا تھا۔ یا شاید وہ واقعی خوش تھا۔ شاید وہ خود اس رشتے سے خوش نہیں تھا۔۔ شاید۔ □ ۔وہ دل سے مسکرا رہا تھا۔ وہ کیسے جان سکتی تھی، سامنے بیٹھا شخص جاسوس تھا۔ اپنے جذبات و احساسات کو چھپانا بخوبی جانتا تھا۔

”ضرار۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔“ کئی آنسو گال پر لڑھک گئے۔

”خود کو احساسِ جرم سے نکالیں سعاد! آپ نے حقیقت سے مجھے باخبر کر کے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ آپ اسے ہی ڈزرو کرتی ہیں۔۔۔ یقیناً وہی وہ شخص ہو گا جو آپ کو محبت بھی دے گا، اور عزت بھی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی۔ ”صبح بارہ بجے کی فلائٹ ہے۔ تیار رہیے گا، لینے آجاؤں گا۔ اور یہ۔۔۔“ اس نے انگشت امانت کی زینت بنی انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”امانت ہے۔ حقدار کو دے دوں گا۔“ وہ کہہ کر پلٹ گیا۔

اپنا رخ موڑتے ہی اسے لگا کہ دل پر ایکدم سے بھاری بوجھ آن گرا ہے۔ قدم من من بھر کے ہو گئے۔ اس کے

عقب میں روتی سعاد کی سسکیاں سماعت سے ٹکرائیں۔ وہ اسے رونے سے منع نہیں کر سکا۔ اس کے لیے یہاں سے جانا مشکل ہو گیا۔ دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔۔ کندھوں پر ذمہ داری آن گری تھی۔ وہ اس رشتے سے واقعتاً خوش نہیں تھا، اس نے سعاد کے اقرار کا احترام کیا تھا اور اب اس کے انکار کے آگے بھی سر تسلیم خم کر کے پلٹا تھا۔ اسے جس چیز نے تکلیف دی تھی وہ اس کی آنکھوں سے لڑھکتے آنسو تھے اور اب اسے اس شخص کو ڈھونڈنا تھا جو ان آنسوؤں کو پونچھنے کا حق رکھتا ہو۔۔ یعنی۔۔

زیاد تاشفین!

☆☆☆

اس کی گاڑی اپنی پوری رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں۔ کانوں میں لگے آلے سے مسلسل ہدایات مل رہی تھیں۔ وہ اس شخص کے تعاقب میں تھا جس کے نمبر سے مائک کو کال موصول ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مقامات پر سگنل توڑے، معمول سے تیز رفتار میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی گاڑی کئی بار ٹکراتے بچی تھی۔ تیزی سے مختلف مناظر کو چیرتی وہ گاڑی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

"آگے موڑ ہے، دائیں طرف!" اس نے تیزی سے موڑ کاٹا۔ سامنے سے آتی گاڑی میں بیٹھا ڈرائیور بوکھلایا۔ بوکھلا کر اپنی گاڑی کو ایک طرف کیا اور نتیجتاً اس کی گاڑی دیوار میں لگی۔ وہ بنا رکے آگے بڑھتا چلا گیا۔

"تین کلومیٹر کا فاصلہ رہتا ہے۔ اگلے موڑ پر بائیں طرف مڑ جاؤ۔" اس نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھائی۔ سامنے موڑ آیا، اس نے بائیں طرف گاڑی موڑی۔ اس کی گاڑی سامنے سے آتی گاڑی کو دائیں طرف سے رگڑتی آگے بڑھ گئی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے پیشانی کو مسلا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس کی تیز رفتار کو

دیکھ کر سڑک پر جاتی ہر گاڑی اس کے راستے سے خود بخود ہٹ رہی تھی۔ عنقریب وہ ٹریفک پولیس کے نرغے میں جانا والے تھا!

"دوسری گلی مکان نمبر سولہ۔" اس نے سر کو جنبش دی۔ گلیاں تنگ تھیں، گاڑی کا آگے جانا ناممکن تھا۔ وہ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے آگے بڑھا۔ اس کالانگ کوٹ ہوا کے باعث پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بال اگر پی کیپ کی وجہ سے جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو یقیناً ماتھے پر بکھر جاتے۔ سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں پی کیپ سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ماسک تھا۔ گردوپیش میں ایک نگاہ ڈال کر وہ تیزی سے اس مکان کے اندر گھس گیا۔

مکان خالی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جلدی سے برآمدہ دیکھا پھر ایک کمرہ۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سامان سمٹا ہوا تھا، یا تو ہدف فرار ہو چکا تھا۔ یا وہ یہاں تھا ہی نہیں! وہ دوسرے کمرے میں آیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہیں سامنے ٹکیں۔۔ وہ کسی کے پاؤں تھے۔ مہنگے، چمکتے ہوئے کالے بوٹ۔۔ پاوں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ نیچے کرسی اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس نے نگاہیں دھیرے سے اوپر اٹھائیں۔ وہ شخص۔۔ تھائی شخص۔۔ مر چکا تھا۔ اس کے گلے میں مضبوط رسی کا پھندہ تھا۔ گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں سے آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں گرے ہوئے تھے۔ اس کے سبز کوٹ کی جیب میں اس کا موبائل تھا۔۔ موبائل جس کی اسکرین روشن تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ اس کے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ وہاں ایک مختصر سا پیغام جگمگا رہا تھا۔

"کل شام، آوٹ ڈور شوٹنگ کے لیے آؤ"!

اس نے سختی سے لب بھینچے تھے۔ موبائل پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی تھی۔ اور پھر وہ ہیڈ کوارٹرز میں خبر دے رہا تھا؛

"ہدف مر چکا ہے"!

☆☆☆

وہ تینوں لاؤنج میں رکھے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ماحول میں پراسرار سی مگر پر سکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے آگے ہو کر بیٹھے زیاد کی نظریں اپنے ہاتھ میں موجود اس خط پر تھیں۔خط پر لکھے الفاظ پر۔۔ہاں وہی خط جو ایک بچے کی تکلیف کا ترجمان تھا۔وہی خط جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔اسے جانے کیوں اس خاموشی میں اس بچے کی سسکیاں اپنی سماعت سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا خیام بغور اپنی نگاہوں کے سامنے تھامے اس کلپ کو دیکھ رہا تھا۔ گلابی رنگ کا خوبصورت اور نفیس سا کلپ کہ جو گزرتے وقت کی بے رحم آندھیوں سے محفوظ رہا تھا۔ تخیل میں اس کی نگاہوں کے سامنے اس بچی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔وہ کیسی ہو گی؟شاید سفید دودھیا رنگت،ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں،زیر کر دینے والی مسکراہٹ اور گال پر وہ نشان۔۔کسی چوٹ کا۔۔اس بچی کی مکمل تصویر جب ذہن کے پردوں پر ابھرتی تو وہ اسے فوراً جھٹک دیتا۔وہ بچی "اس بچی" جیسی نہیں ہو سکتی تھی،ناہی وہ "وہ بچی" ہو سکتی تھی۔ وہ تو۔۔۔اور یہیں وہ سوچوں کو جھٹک دیتا۔گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیتا۔

صوفے کے بازو پر کہنی ٹکائے گردن پیچھے گرائے اپنے سامنے رکھی سنہرے رنگ کی چابی کو دیکھتا جندل۔اس کے ذہن کے پردوں پر وہ منظر نمایاں ہو رہا تھا جب مراکش کے اس گھر کے مکینوں کو زندہ آگ میں جھونکا جا رہا تھا۔وہ اس بچے کی چیخیں محسوس کر رہا تھا جسے شاید سب نے مردہ تصور کر لیا ہو گا۔اور اس کی ماں،اس کا باپ۔۔وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا آشیانہ جلتے دیکھتے ہوئے ابدی نیند سو گئے ہونگے۔وہی آشیانہ جہاں کبھی انہوں نے مستقبل کے خواب پروئے ہونگے۔۔جہاں کبھی ان کی اولاد کی قلقاریاں اور معصوم قہقہے گونجے ہونگے۔۔اب ان کا معصوم بیٹا۔۔وہ اس بے رحم آگ سے اپنے وجود کو کیسے محفوظ رکھ پایا ہو گا۔

وہ سب گم سم سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے تھے۔ خاموش اور ساکت۔۔ گردوپیش سے باخبر رہتے ہوئے بھی بے خبر! وہ اپنے وطن سے دور اس زمین پر انہی کے لیے تو آئے تھے۔۔ ان بچوں کے لیے جو یقیناً اب وقت کی رفتار کو چیرتے جوان ہو گئے ہونگے۔ وہ بچے اب جانے کیسے دکھتے ہونگے۔ اور جانے وہ کس راہ کے راہی ہونگے۔ انتقام کی آگ میں بھسم ہوئے ہونگے، یا کندن بن چکے ہونگے؟ کون جانے؟!

"ازا کی ماں۔۔۔ وہ مرتد ہے۔" زیاد کی دھیمی آواز نے لاونج میں چھائے کانچ کے سکوت کو توڑا۔ ان دونوں نے حیرت سے گردنیں گھما کر اسے دیکھا۔ "وہ مسلمان ہونے کا ڈھونگ رچاتی ہے، مگر وہ مرتد ہے۔" اس کی نظریں ہنوز اس خط پر تھیں۔

"مگر کیوں؟"

"اس کا باپ یہودی ہے۔ اور ماں مرتد۔۔۔ دونوں اسلام دشمن ہیں۔ تم تصور نہیں کر سکتے ازا اپنی ماں کی وجہ سے اسلام سے کتنی بدگمان ہے۔" اس نے دھیرے سے خط پر مزین ان الفاظ کو چھوا تھا۔ مٹے مٹے سے الفاظ۔۔

"ان حربیوں کی گھٹیا ترین چالیں!" خیام کی آواز میں طنز کا عنصر شامل ہوا۔

"میں سوچتا تھا کہ۔۔۔ ازا کو جب معلوم ہو گا کہ اس کے گرد فریب کی دیواریں کھڑی ہیں۔ پکی دیواریں جن کے رنگ و روغن میں ہم نے اور کئی دوسروں نے اپنے حقیقی چہرے چھپا رکھے ہیں تو وہ بہادر لڑکی اپنے پورے وجود کے ساتھ گرے گی۔۔۔ گر کر بکھرے گی۔ مگر اب سوچ رہا ہوں کہ۔۔ جیسے خوف کو مارنے کے لیے اس خوف سے کئی گنا بڑے خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح ایک فریب کو بے اثر کرنے کے لیے اس سے کئی گنا بڑا فریب باثر رہتا ہے۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ اس کی ماں مسلمان نہیں مرتد ہے تو یقیناً اس کے لیے ہمارے دیے گئے زخم معمولی ہونگے۔۔۔ وہ بے اثر ہو جائیں گے۔" وہ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔ آواز میں کہیں کوئی دکھ یا رنج نہیں تھا۔

جندل اس تمام عرصے میں خاموش تھا۔ خیام کی نگاہوں کے سامنے اس کا وہ غصے سے تمتماتا چہرہ گھوما تھا۔۔ وہ اس لڑکی کی بہادری کا قائل تھا، وہ نڈر تھی اور سب سے بہترین وہ زیادہ جذباتی نہیں تھی۔ کچھ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ ازابیلا اس کی زندہ و جاوید مثال تھی۔

"وہ مجھے عزیز ہے۔۔۔ ازا۔۔ کبھی سوچا نہیں تھا کہ وہ لڑکی جو میرے لیے قطعی اجنبی تھی مجھے عزیز ہو جائے گی۔ وہ مجھے اپنا دوست مانتی ہے، میں اس کا مان رکھتا ہوں۔ وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے یار! اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" وہ جانے کیوں سینٹی ہو رہا تھا۔ کم از کم ان دونوں کو یہی لگا تھا۔ اس بات سے یکسر انجان کہ زیاد کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اسے یہ غیر معمولی دھڑکنیں عام طور پر محسوس نہیں ہوتی تھیں کہ مگر اس وقت وہ انہیں محسوس کر رہا تھا۔ ایسے جیسے۔۔۔ اس کی ہر کچھ دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن مِس ہو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے غیر معمولی بات نہیں تھی مگر اس کا محسوس ہونا اس کے لیے غیر معمولی تھا۔ وہ ازا کے لیے جذباتی ہو گیا تھا شاید بہت زیادہ۔

"وہ اچھی لڑکی ہے۔" جندل نے پہلی بار اس کے متعلق اپنی رائے قائم کی۔ زیاد نے سر کو جنبش دی۔ خط کو دیکھتے ہوئے کچھ یاد آنے پر اس نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے جندل کو دیکھا۔ "وہ کیسی ہے؟۔۔۔ تمہاری ہمشیرہ؟" اس کی آواز دھیمی تھی اور لہجے میں نرمی۔۔ اور آنکھیں۔۔ ان جاسوسوں کی آنکھیں کم کم ہی بولتی تھیں۔

"ٹھیک ہیں۔ منگنی کر لی ہے انہوں نے۔" اس نے آنکھیں گھما کر کہا تھا۔ اسے اپنا آپ اپنی بہن کی زندگی میں بہت بے وقعت سا معلوم ہو رہا تھا۔۔ کم از کم آج وہ بہت زیادہ یہ محسوس کر رہا تھا!

"مبارک ہو۔۔ کس سے؟" اس نے نگاہوں کا رخ واپس خط ہی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ضرار سے۔" خط کو دیکھتے ہوئے وہ ہنس دیا۔

”تمہیں وہ عزیز نہیں تھا کیا یار؟“ جندل خاموش رہا۔ کچھ لمحوں کے لیے پھر سے سکوت چھا گیا۔۔۔ اور کچھ لمحوں بعد وہ تینوں ہنس دیے۔ ہلکا سا۔۔ کھل کر!

خیام اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دھیرے سے بنا چاپ کے قدم اٹھاتے وہ گلاس وال کی طرف گیا۔ گلاس وال پر گرے پردوں کو جھٹکے سے دور ہٹایا۔ پردوں کے ہٹتے ہی یوں معلوم ہوا کہ جیسے تیز کڑکتی بجلی گلاس وال پر گری تھی۔ بادل ایکدم زور سے گرجے تھے۔ شیشے کے پار ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں ماحول کی پراسراریت میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک نے مزید اضافہ کیا۔ ایکدم سے شیشے پر پانی کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ تیز بارش سمندر کی کسی وحشی لہر کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ شیشے پر پانی کی بوندیں لڑھکنے لگیں۔ وہ وہیں کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

”کیا لگتا ہے ڈلیوری بوائے آئے گا اس بارش میں؟“ اس کے سوال پر جندل نے تیزی سے اٹھ کر شیشے کے پار ہوتی بارش کو آنکھیں چھوٹی کر کے دیکھا۔

”وہ نہیں آیا تو میری موت کے ذمہ دار تم لوگ ہوگے جو اپنے بھوکے دوست کو ایک وقت کا کھانا نہیں کھلا سکے۔“ وہ واقعی بھوک سے نڈھال تھا۔ اس زندان میں صبح شام مچھلی پکاتے ہوئے اور مشین گھماتے ہوئے اس کی بھوک مر جاتی تھی۔ پیٹ میں عجیب متلی سی ہوتی تھی۔ وہ کمزور نہیں تھا مگر ان تھائی لوگوں نے بھی مچھلی کی نسل کشی کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اور اب جب وہ خیام کے گھر آیا تو اپنے اس مشہور زمانہ وارلڈ گلاس کمپنی کے مینجر دوست کو دیکھ کر یعنی اس کے بھاری والٹ کو دیکھ کر اس کی بھوک کسی زخمی شیر کی طرح جاگ اٹھی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ عصرِ حاضر میں والٹ نہیں بینک اکاؤنٹس بھاری ہوتے تھے۔ والٹ میں تو بس ایک کارڈ ہوتا تھا۔۔ چھوٹا سا!!

"پیسے کون دے گا؟" گھر کی گھنٹی بجی تو انہیں ایک نئی فکر نے آن گھیرا۔ جندل نے فوراً سے پہلے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ "مجھے تو ابھی سیلری ہی نہیں ملی۔" خیام کی نظریں زیاد کی طرف اٹھیں جو یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے یہاں موجود ہی نہیں۔ "میں تو جدّی پشتی غریب ہوں۔ ایک معمولی سالائیبریرین۔ دو وقت کی روٹی بمشکل نصیب ہوتی ہے۔"

"شرم کرو خیام شرم! اتنی بڑی کمپنی کے مینیجر ہو دوستوں کو ایک وقت کا کھانا نہیں کھلا سکتے؟" خیام کے ہنوز سپاٹ چہرے کو دیکھ کر سے اندازہ ہوا اسے بھکاری دوست کہنا چاہیے تھا۔

"تمہیں کیا معلوم کہ اس بڑی سی کمپنی میں کوئی کام بنا سود کے ہوتا ہے بھی کہ نہیں؟ حرام ہے میرے دوست حرام ہے!" وہ نہایت صفائی سے بازی پلٹ گیا۔ جندل برے برے منہ بناتا پیچھے ہٹا۔ زیاد زیرِ لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنا بٹوہ ٹٹولنے لگا۔ پیسے برآمد ہونے پر وہ باہر کی طرف بڑھ گیا جہاں بارش میں ٹھٹھرتا ڈیلوری بوائے تقریباً پانچویں بار گھنٹی پر ہاتھ رکھ چکا تھا اور دروازے کھلنے سے پہلے نہ اٹھانے کی قسم کھا چکا تھا۔

یہ تقریباً پانچ منٹ بعد کا منظر تھا جب وہ تینوں کھانے کے ساتھ انصاف کر رہے تھے۔ زیاد توجہ سے اپنی پلیٹ پر جھکا ہوا تھا۔ خیام کوک کا ٹن منہ سے لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ پیزا کا ٹکڑا منہ میں لے کر جاتے جندل کو کچھ یاد آیا۔ اس نے رک کر دونوں کو دیکھا۔

"تین دن بعد ایک خاتون قتل ہو نگیں۔ قاتل مائک ہو گا۔" ان دونوں نے ٹھہر کر اسے دکھا۔ بھوک ایکدم مر گئی۔ "جس نمبر سے کال موصول ہوئی تھی مائک کو، اس نمبر کو ٹریس کیا تو جس شخص تک پہنچا اس نے خودکشی کر لی تھی۔"

"یقیناً یہ قتل ہے۔" خیام نے سر ہاتھوں میں گرایا۔ وہ دونوں اپنے سر اثبات میں ہلا گیے۔

”مائک کے تعاقب میں لگ جاؤ۔ وہ خاتون کون ہے؟ اسے کوئی کیوں مارنا چاہتا ہے ہمیں ہر ایک چیز سے باخبر ہونا ہے!!“ وہ اپنا اگلا لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔ ان کی آوازیں رفتہ رفتہ سرگوشیوں میں بدلتی جا رہی تھیں۔ گلاس وال کے پار بارش زور پکڑ رہی تھی۔ پرزور بارش جو تڑاتڑ برستی سب بہانے پر تلی ہوئی تھی۔ شیشے سے ٹکراتیں پانی کی بوندیں وہ مخصوص سی آواز پیدا کر رہی تھیں جو بارشوں سے محبت کرنے والے کے لیے کسی سُر کی مانند تھیں۔۔ اور ہاں یقیناً اگر سمندر سے محبت کی جا سکتی تھی تو بارشوں سے کیوں نہیں؟ تھا تو وہ بھی پانی اور یہ بھی آب! بس وہاں پانی پہاڑوں سے پھوٹتا تھا اور نہروں، ندیوں کو ساتھ لے جاتا ایک بڑے میدان میں گرتا تھا اور وحشی لہروں کی صورت میں اپنی راجدھانی قائم کرتا تھا۔ یہاں چشمِ ابر اشک بہا ہوتی تھی، کبھی دھیرے دھیرے اور جب کندھوں پر بوجھ بڑھتا، گرنے کا گمان ہوتا تو بنا رکے آنسو بہائے جاتے۔ کبھی کبھار یہ خوشی کے آنسو بھی ہوتے تھے۔ یعنی وہ بارش جو خوشگوار ثابت ہو۔ جب فضا کو نم مٹی کی خوشبو سے معطر کرنا مقصود ہو، آنکھوں سے گرتے نمکین پانی کو کئی نظروں سے چھپانا ہو، یا دلوں پر گہرا اثر چھوڑنا ہو تو چشمِ ابر دھیرے سے برسنے لگتی تھی۔ دونوں صورتوں میں چشمِ ابر کا برسنا مقصود تھا، منحصر تو پھر دل کے موسم پر تھا ناں۔۔ کیا وہاں کی زمین بنجر ہے جو بارش کے پانی سے ماسوائے دلدلوں کے کچھ نہ بن پائے؟ یا وہاں کی زرخیز زمین میں آئی بہار کے لیے بارش پیغام محبت لائی ہے اور کئی پھول کھل اٹھے ہیں؟۔۔۔ دل دل۔۔۔ موسم تو اسی کا ہوتا ہے۔۔ خزاں ہوں یا بہار۔۔ گر یہ موسم اچھا ہے تو خزاں کی مہربانیوں سے زرد ہو چکے پتوں میں بھی زندگی کی امنگ ڈھونڈی جا سکتی ہے وگرنہ بہار بھی بے معنی ہے۔۔!

☆☆☆

اور بارش صرف عصرِ حاضر میں تھائلینڈ کی زمین پر نہیں برسی تھی، ہاں برسوں پہلے وہ ایسی ہی رات اندلس کے آسمان پر بھی نمودار ہوئی تھی۔ تابڑتوڑ برستی بارش نے گلیوں کو پانی سے بھر دیا تھا۔ چھاتے لے کے ادھر ادھر بھاگتے لوگوں کے قدم پانی میں پڑتے تو شڑاپ شڑاپ کی آوازیں سماعت سے ٹکراتیں۔ وہ تینوں بھی انہی گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ چھاتوں کے بنا بارش میں بھیگتے طلباء جو اپنی جماعت کے لیے درس گاہ جا رہے تھے۔ ان کے راستے میں ایک گڑھا تھا جہاں بارش کی وجہ سے سے پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ بیک وقت ان کے قدم اس پانی میں پڑے تھے۔ شڑاپ کی تیز آواز گونجی تھی۔ تینوں مسکرائے پھر تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھے۔ ان کی منزل قریب ہی تھی۔ رات کے اس پہر قرطبہ کی گلیوں کو پار کرتے بارش میں بھیگتے وہ جنونی معلوم ہوتے تھے۔ یا حد سے زیادہ معصوم!

درس گاہ پہنچنے پر تینوں نے چھت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے مکمل پانی میں شرابور کپڑوں پر نگاہ ڈالی۔ ان کی حالت نازک تھی۔ پانی قطرہ قطرہ ان کی قمیصوں سے بہتا فرش پر گر رہا تھا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا یہ خیال برا ہے۔“ معاویہ نے ناک سکیڑی۔

”قرطبہ کی گلیوں میں بارش میں بھیگنے کا خیال سانس روک دینے والا ہے، دوستم!“ سنان نے اپنے ہلکے بھورے رنگ کے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ پانی کی کئی بوندیں ارد گرد گریں۔

”لیکن کم از کم ہم اس حالت میں جماعت میں داخل نہیں ہو سکتے۔“ دحیہ نے اپنے بھیگے جوتے اتارے ہوئے کہا۔

”ہم جماعت میں جائیں گے بھی نہیں۔۔ ہمیں کسی اور سلسلے میں بلایا گیا ہے۔“ معاویہ نے سنجیدگی سے کہا۔ دحیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بے یقینی اور حیرت سے اپنے سامنے رکھے نقشے کو دیکھ رہا تھا جس کے گرد وہ دائرہ بنا کر کھڑے

تھے۔ ان کے استاد انہیں سنجیدگی سے کچھ سمجھا رہے تھے مگر وہ کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ اس نے نگاہیں ترچھی کر کے معاویہ اور سنان کو دیکھا جو ہمہ تن گوش تھے۔ شاید وہ اس سب کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے اور شاید صرف اسے ہی اس سب سے انجان رکھا گیا تھا۔ اس کی سماعت سے بار بار اس کے استاد کے کہے گئے الفاظ ٹکرا رہے تھے کہ،

"ہم جندل اللہ کی بنیاد رکھنے جا رہے ہیں۔۔"

جندل اللہ۔۔۔یعنی "اللہ کا لشکر"!

☆☆☆

یہ شہر سے ذرا دور تنہا سی سڑک تھی جو اس اونچے پہاڑی سلسلے کی طرف جاتی تھی۔ پہاڑوں کو کاٹ کر بنایا گیا یہ راستہ جہاں خطرناک تھا وہیں پر اسرار اور خوبصورت بھی۔ تاریک رات میں اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس ویران سڑک پر پڑ رہی تھیں۔ جس مقام سے اس کی گاڑی گزرتی وہاں ایک لمحے کو روشنی چھا جاتی اور گاڑی کے گزرتے ہی وہ مقام اندھیرے میں ڈوب جاتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کی گاڑی کئی راستوں کو چیرتی اس اونچی پہاڑی کے پاس رکی۔ اس نے چابی نکالی پھر دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ارد گرد گہری مقدس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بنا چاپ پیدا کیے پہاڑی کی بلندی پر رک گیا۔ نظریں سامنے ٹکیں۔ وہاں نیچے ایک پر رونق شہر آباد تھا۔ اس ویران پہاڑی سے کوسوں دور، اسکی تاریکی سے انجان ایک پُر رونق شہر! وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ تاریک آسمان اس پر سایہ فگن تھا جس پر چمکتے چاند کی مدھم روشنی اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں کم کم ہی بولتی تھیں اور چہرہ ان سے بھی زیادہ خاموش تھا۔ گردن تک چڑھے ہوئے سفید رنگ کے سوئیٹر پر کالے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ دونوں ہاتھ سردی سے بچنے کے لیے کوٹ کی جیب میں

ڈالے ہوئے تھے۔ وہ اس ویران جگہ پر تنہا کھڑا کوئی پُراسرار شخص معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر اس کی یہ تنہائی زیادہ دیر باقی نہیں رہی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی اس کے عقب میں چلتا اس کے قریب آرہا تھا۔ اس نے پلٹنا گوارا نہیں کیا۔ وہ شخص اس کے برابر میں کھڑا ہوا۔ اسی پہاڑی کی بلندی پر۔۔۔ شہر پر نظریں جمائے۔

"حیران ہوں کہ دشمن بھی کیسا ہے جسے بنا چاپ کے چلنا بھی نہیں آتا؟ کیا تم یونہی اپنے دشمنوں کو خبردار کرتے ہو؟" اس کے الفاظ طنزیہ تھے مگر لہجے میں طنز کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بے تاثر تھا۔

"باخبر دشمن ہی بہترین ہے۔ گھناؤنی چالوں میں پھانسنے والا دشمن جو حیران کر دے!" آواز بھاری تھی۔ آنکھیں مسکرائی تھیں۔ اس نے اپنا رخ دھیرے سے اس کی طرف کیا۔ بھوری آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ پیشانی چاند کی مدھم روشنی میں چمک رہی تھی۔ کھڑے نقوش جو اس کی شخصیت میں رعب و دبدبہ بڑھا رہے تھے۔ سپاٹ چہرے والا وہ ضرار تھا، ضرار ولید!

"مائیکل کہاں ہے؟" نگاہیں سامنے کھڑے شخص کے چہرے پر پڑیں۔ چہرے پر ماسک چڑھا ہوا تھا۔ گویا احتیاط لازم تھی۔

"الزرقاوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ الزرقاوی تمہیں کبھی نہیں مل سکتا"!

"مائیکل کو بھول جاؤ!" وہ غرّایا۔ مقابل پرسکون رہا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا کہ الزرقاوی کے بغیر مت آنا"!

"کیا مائیکل وہاں ہے ابراہیم؟" ضرار نے کان میں لگے آلے کی مدد سے سے ہیڈکوارٹرز سے رابطہ کیا۔

"نو سر!" وہ مسکرایا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار! "مائیکل کے بغیر کیوں آئے ہو؟ یا میں یوں سمجھوں کہ تم تبادلہ کرنے نہیں کچھ کہنے آئے ہو۔ شاید وارن کرنے؟!" مقابل صبر کے گھونٹ بھرتا اسے دیکھتا رہا پھر وہ ایک قدم

آگے بڑھا۔ اپنے چہرے سے ماسک اتارا۔ ضرار کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکیں۔ طاقت کے نشے میں چور آنکھیں، مغرور ناک، سفید رنگت۔۔ یہ چہرہ اس کے لیے شناسا تھا۔ اسے پہلی بار اس نے اسٹیون کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ وہی تھا، مائک باربارا!

"میں تمہیں خبر دار کرنے آیا ہوں! حزب اللہ سے کہو میرے معاملات سے دور رہے۔ ورنہ یاد رہے، حزب اللہ کے لیے سزا تجویز کردی گئی ہے۔" وہ مسکرایا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری۔

"قید؟ یا پھر دہشت گردی کا الزام؟ جلا کر مار ڈالنا یا پھر ذہنی سرجری کر کے اپنے روپ میں ڈھالنا؟ کونسی سزا مائک؟" وہ سنجیدہ تھا۔ بالکل سنجیدہ۔۔ مائک نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ مزید ایک قدم آگے بڑھا۔ آگے کو جھکا۔ اس کے کان کے پاس۔۔

"Damnatio memorie!"

وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے سیدھا ہوا۔ ضرار طنزیہ مسکرایا۔

"پسند کو داد دیتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔ مائک پلٹ گیا۔

"امید ہے تم میری بات پر غور کرو گے۔ ہم طاقت میں تم سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتے ہم تمہیں کیسے برباد کریں گے!!" تیز آواز میں کہتا وہ دور جا رہا تھا۔ ضرار کی نگاہ اس کی ہتھیلی پر پڑی تھی۔ کوٹ کے بازو سے کوئی ٹیٹو جھانک رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔ سعاد کا دکھایا گیا ٹیٹو! یعنی یہ مائک کے ساتھ اس کی دوسری نہیں تیسری ملاقات تھی۔ وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہاں سے ذرا فاصلے پر وہ ایک گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

"ہدف اپنے راستے پر نکل چکا ہے۔" وہ اطلاع دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

"اوور!" اس کی سماعت سے جیسے ہی یہ الفاظ ٹکرائے دور کہیں دھماکہ ہوا۔ مائک کی گاڑی پر نسب بمب پھٹ گیا۔ کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز گونجی۔ پہاڑ کی پچھلی جانب آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اچانک سے تیز روشنی ہوئی۔ مائک کی گاڑی آگ کی لپیٹ میں آتی بل کھاتے ہوئے پہاڑی راستے سے نیچے گری۔ ایک اور دھماکہ ہوا۔۔ اور پھر ہر طرف سکوت چھا گیا۔ روشنی بجھ گئی۔ سب تاریک ہو گیا۔ ضرار نے سانس روکے پلک جھپکی۔

"اوور!" اس کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ انہی راستوں سے گزرتی وہ اب واپس شہر کی طرف جا رہی تھی۔ پہاڑ سے کچھ دور۔۔ غالباً تین کلو میٹر دور۔۔ وہ اسی سڑک پر تھا۔۔ خطرناک اور پر اسرار سی سڑک جب ایک بھاری وجود اس کی گاڑی کے شیشے پر گرا۔ کانچ چکنا چور ہو گیا۔ گاڑی لڑکھڑانے لگی۔ اس نے تیزی سے بریک پر زور ڈالا۔ گاڑی اس سڑک کے عین کنارے پر رکی۔ وہ تیزی سے باہر آیا۔ اس وجود کے مسخ ہوئے چہرے سے وہ اسے پہچان نہیں پایا۔ البتہ۔۔ اس کا ایک بازو کٹا ہوا تھا۔۔ اور ٹانگیں۔۔۔ وہ ضائع تھیں۔۔ وہ جان گیا یہ مائیکل تھا۔ اس کے سر سے اور جسم کے ہر حصے سے خون ابل ابل کر بہہ رہا تھا۔ کانچ بری طرح اس کے وجود میں کھب گیا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔۔ وہ مارا جا چکا تھا۔۔ پہلے اس کا چہرہ مسخ کیا گیا تھا، پھر اس پہاڑ سے نیچے پھینکا گیا تھا۔۔ مائیکل۔۔ مارا جا چکا تھا۔۔ سمندر میں ہوئے ظلم کے تمام ثبوت مٹا دیے گئے تھے۔۔ مسخ کر دیے گئے تھے!!

☆☆☆

اس کی فلائٹ بارہ بجے کی تھی۔ انہیں یہاں سے گیارہ بجے نکلنا تھا۔ دس بجے اس نے تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ گھر نہیں جا سکتی تھی جس کا اسے حد سے زیادہ افسوس تھا۔ اس کے گاؤن، حجاب سب وہیں تھے۔ امامہ نے اسے اپنے حجاب اور گاون دیے تھے مگر اسے اپنے والے ہی چاہیے تھے!!

"دیکھو ابھی دس بجے ہیں، ہم جلدی واپس آجائیں گے ناں پلیز۔" اس نے امامہ سے التجا کی تھی۔ اسے شاپنگ پر

جانا تھا۔ اسے اپنے لیے حجاب اور گاون لینے تھے مگر امامہ کی طرف سے صاف انکار تھا۔

"سعاد! تمہیں ضد کرنے کے بجائے اپنی تیاری شروع کرنی چاہیے۔ ضرار آنے والا ہو گا۔" امامہ نرمی سے کہتی کمرے سے نکل گئی۔ اس نے برے برے منہ بنا کر بند دروازے کو دیکھا۔ اسی اثنا میں اس کا موبائل بج پڑا۔ اس نے نمبر دیکھنے کی زحمت کیے بنا موبائل کان سے لگایا۔

"سعاد آپی، آپ کے اسکیچ تیار ہیں۔" اس کی سماعت سے نسوانی آواز ٹکرائی۔۔ نرم اور معصوم سی۔

"اپنے پاس رکھو۔ اب ضرورت نہیں رہی ان کی!" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن کیوں؟ میں نے اتنی محنت سے بنائے ہیں۔ یہ والا پچھلی بار سے زیادہ اچھا بنا ہے۔ یاد ہے پچھلی بار جو بنایا تھا آپ کے والدین، آپ اور دو بھائی؟ اس بار اور زیادہ پیارا بنایا ہے دن رات کی محنت سے۔ ایسے انکار مت کریں دل ٹوٹ جائے گا۔" وہ تقریباً رونے کو تھی۔

"میری بات کان کھول کر سنو تم! میں نے تم سے کوئی اسکیچ نہیں بنوائے ٹھیک ہے؟ اگر کسی کے سامنے یہ راز کھولا ناں تم نے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ سمجھیں؟!" اس کا مزاج درہم برہم ہو چکا تھا۔

"لیکن آپی۔۔۔" بہت معصومیت سے اسے پکارا گیا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"عنبر! میں فی الحال گھر نہیں ہوں۔ کچھ کام سے باہر ہوں، جیسے ہی واپس آؤں گی پھر تمہیں اطلاع دے دوں گی۔ تم آجانا اپنے اسکیچ کے ساتھ، ٹھیک ہے؟" عنبر نے مثبت جواب دیا۔ اس نے الوداعی کلمات کہہ کر کال کاٹ دی۔

اس کے پاس عنبر کو جھوٹے دلاسے دینے کو سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ورنہ کوئی بعید نہیں تھی وہ اس سے مایوس ہو کر اپنا اسکیچ لے کر حرم کے پاس پہنچ جاتی ساتھ ہی پیغام دے دیتی کہ سعاد آپی تک پہنچا دیں۔ اور پھر اس کا جھوٹ پکڑا جاتا کہ وہ ایک سے بڑھ کر ایک اسکیچ بناتی تھی۔ جبکہ سچ یہ تھا کہ وہ اس میدان میں اناڑی تھی، اس سے تو ایک

لائن سیدھی نہیں ڈلتی تھی!!

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ مکمل تیار آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ ہلکے آبی رنگ کا گاؤن پہنے سفید حجاب اپنے چہرے کے گرد اوڑھے، حجاب سے نقاب کے بجائے سیاہ ماسک لگائے وہ بالکل تیار تھی۔ اس نے پلٹ کر بیڈ پر رکھا اپنا سفری بیگ اٹھایا، ہینڈ بیگ اور موبائل دائیں ہاتھ میں پکڑے پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

اس کی توقع کے عین مطابق ضرار سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں؟" اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ وہ آگے آیا۔ اس کے روبرو کھڑا ہوا۔ "یہ مجھے دے دیں۔" اشارہ اس کے سفری بیگ کی طرف تھا۔ وہ ویسے ہی کھڑی رہی تو اس نے خود اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ بیگ لیتے ہوئے اس کی نگاہ اس کے بائیں ہاتھ پر پڑی تھی۔ وہاں انگشت امانت میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔ وہ جانے کیوں مسکرایا تھا۔ وہ بے چین ہوئی۔ وہ مسکراتا ہوا پلٹ گیا۔

گھر سے ایئرپورٹ تک تقریباً پون گھنٹے کا راستہ تھا۔ سڑکوں پر غیر معمولی رش کی وجہ سے وہ ایک گھنٹے بعد ایئرپورٹ پہنچے تھے۔ اس کی فلائٹ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ گاڑی پارک کر کے تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

"آرام سے چلو، کون پیچھے پڑا ہے تمہارے؟" وہ رک گئی۔ مزید اس کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکی۔ وہ پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ سعاد کے مطابق یقیناً طنز کرنے لگا ہوگا کہ وہ جو حزب اللہ میں شمولیت اختیار کرنے لگی تھی صرف پانچ منٹ ذرا سی تیز رفتار کے ساتھ چل تک نہیں سکتی تھی؟! "کاغذات بھی دکھانے ہیں۔ اس میں

وقت لگے گا۔ آجائیں۔" اس نے ٹھہر کر اس کے پریشان پریشان چہرے پر نظر ڈالی۔ آنکھوں میں شرارت بھری چمک ابھری۔ لب دانتوں میں دبائے پھر سست رفتار سے چلنے لگی۔ وہ اس کی رفتار پر مزید پریشان ہوا تھا۔ وہ اس کی پریشانی کو نظر انداز کرتی گردوپیش کا نظارہ کرنے لگی۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

"کسی بھی طرح کا مسئلہ ہو وہاں تو ضرور اطلاع دیجیے گا۔ واپس کب آئیں گی؟" وہ رک گیا۔ چہرہ ترچھا کر کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کبھی نہیں!" آنکھیں گھما کر کہتی وہ اس سے اپنا بیگ لینے کے لیے آگے آئی۔

"بھاگ رہی ہیں؟" وہ مسکرایا تھا۔ لہجے میں شرارت تھی۔ سعاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ فوراً مسکراہٹ چھپانے کے لیے لب دانتوں میں دبا گیا۔

"تم تھپڑ کھانا چاہتے ہو؟" وہ فوراً نفی میں سر ہلا گیا۔

"جا رہی ہوں میں۔۔ اللہ حافظ!" سنجیدگی سے کہتی وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ کچھ آگے جا کر رک گئی۔ ضرار کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ وہ پلٹی۔

"میں نے لائبریری سے کچھ کتابیں لی تھیں۔ اگر گھر جانے کا موقع ملے تو وہ ضرور واپس پہنچا دینا۔" اس نے شور کی وجہ سے تیز آواز میں کہا تھا۔ ضرار نے جواباً ہاتھ ہلا دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

اس کے بڑھتے ہر قدم کے ساتھ ان کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ وہ بہت آگے چلی گئی۔ وہ لوگوں کے جمِ غفیر میں کہیں بہت پیچھے رہ گیا۔ وہ وہیں کھڑا رہا حتیٰ کہ اس جہاز نے اڑان بھری۔ بہت بلندیوں تک جاتا جہاز۔۔ فاصلے اتنے بڑھ گئے کہ گویا کبھی مٹائے نہ جا سکیں۔

☆☆☆

وہ آفس میں بیٹھا فائل کے ورق پلٹ رہا تھا۔ نظریں فائل پر تھیں البتہ دماغ کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ ویسے بھی اسے یہ سب دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ یہ کام سعاد کا تھا! کس سے کیسے، کس طرح اور کب ڈیل کرنی ہے؟ کونسے معاملے کو کیسے سنبھالنا ہے سب وہی کرتی تھی۔ وہ تو بس مینیجر تھا۔۔ عام سا مینیجر۔۔ ہر اس باس کی طرح جو نام کا باس ہوتا ہے مگر اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے اپنے رائٹ ہینڈ کے کندھے بوجھل کرتا ہے۔۔ ہاں وہ اس کا رائٹ ہینڈ تھی، خیام حنفی کا رائٹ ہینڈ!

اس کا کوٹ کرسی کی پشت پر لٹکا ہوا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی ہوئی تھی۔ موبائل اور والٹ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ کف ذرا سے موڑے ہوئے تھے۔ کلائی میں مہنگی رسٹ واچ باندھ رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح لاپروا اور مغرور باس لگ رہا تھا۔ کم از کم اندر داخل ہوتے بدر کو وہ مغرور ہی لگا تھا!

وہ اندر آیا۔ دھیرے سے۔۔ ذرا ٹھہرا پھر آگے بڑھ کر اس کی فائل پر جب وہ ورق پلٹنے والا تھا، اسی وقت وہ سیاہ رنگ کا آلہ رکھ دیا۔ خیام نے ایک نگاہ آلے پر ڈالی پھر سنجیدگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس تھا۔ کانوں میں ایسا ہی آلہ لگا ہوا تھا۔ وہ اب ہر طرح سے ایک باڈی گارڈ لگ رہا تھا۔

"اسے کان میں لگاتے ہیں۔" اسے سرگوشی میں اطلاع دی گئی۔ بالکل ایسے جیسے وہ کسی ملک کا راز بتا رہا ہو۔ "یہ ایسے کام کرتا ہے کہ۔۔ آپ کہیں بھی ہوں میں آپ کو سن بھی سکتا ہوں اور آپ کو سنا بھی سکتا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔۔ بالکل سنجیدہ۔ خیام کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر اس نے آلے کے متعلق مزید اطلاعات فراہم کرنا مناسب سمجھا۔ "جب جب سگنلز ملیں گے۔۔ یعنی میں آپ سے یا آپ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے تو اس سے بالکل ذرا سی سبز شعائیں نکلتی ہیں جو ظاہر ہے آپ کے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے ٹھیک کہا تھا وہ شعائیں اس کے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ورنہ وہ خیام کے بائیں کان میں لگے آلے سے نکلتی وہ شعائیں دیکھ لیتا جو ظاہر

کررہی تھیں کہ دوسری طرف سعاد اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ٹھہری تھی۔ہاں وہی جو مزید سنجیدگی سے بدر کی بات نہیں سن سکی تھی اور کھکھلا کر ہنسی تھی۔خیام کے کان میں اس کے کھکھلانے کی آواز پڑی۔اس نے ٹھہر کر بدر کو دیکھا پھر اپنے بائیں کان سے وہ آلہ نکال کر بدر کے رکھے گئے آلے کے برابر میں رکھ دیا۔بدر نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔وہ کندھے اچکا گیا۔معصومیت سے۔۔بدر کو وہ اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہوا۔وہ خفا ہوا۔خفگی سے اسے دیکھا۔"میرے علاوہ بھی کوئی آپ کا باڈی گارڈ ہے؟"

"نہیں یہ مقام بس تمہارا ہے۔" وہ اس کی خفگی پر مسکرایا۔۔ہلکا سا۔۔

"تو پھر یہ کون ہے؟" آنکھ سے آلے کی طرف اشارہ کیا۔خیام نے جب دانتوں میں دبائے اس آلے کو اٹھایا اور واپس کان میں لگایا۔"یہ مِرَر ہے۔"

"آپ کا مِرَر؟" دائیں ابرو اٹھائے سوال کیا گیا۔

"نہیں۔۔۔یہ میرا مِرَر نہیں ہے۔بس مِرَر ہے۔وہ مِرَر جو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔تجربہ کرنا چاہو گے؟" وہ اثبات میں سر ہلاتا تجسس سے اس پر نظریں گاڑے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔خیام نے دایاں ہاتھ کان کے پاس لے جاکر آلے میں کوئی ننھا سا بٹن دبایا۔

"مِرَر مِرَر آن دی وال

ہو از دا فیئریسٹ آف دیم آل؟" وہ مسکرا رہا تھا۔۔نرمی سے۔۔ہلکا سا۔"مِرَر!" مِرَر کا جواب آگیا۔اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔بدر کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"ہاں مِرَر۔۔جانتے ہو آئینہ سب سے خوبصورت کیوں ہے؟" بدر نے اس کے سوال پر نفی میں سر ہلایا۔"کیونکہ آئینہ اتنا شفاف ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس میں اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔انسان خود کو جاننے کے لیے آئینے میں جھانکتا

ہے۔ آئینہ اس کی خوبصورتی کو بڑھائے یا سیاہی کو گھٹائے بنا اس کا ہو بہو عکس اس کے آگے کر دیتا ہے۔ اس کا ظاہر!! یہ عام سا آئینہ ہے۔۔ خاص وہ ہے جو باطن کا عکس دکھاتا ہے۔ جانتے ہو یہ خاص آئینہ کون ہے؟" وہ ایک بار پھر نفی میں سر ہلا گیا۔ وہ خاموشی سے اور اشتیاق سے اسے سن رہا تھا بالکل ویسے ہی جیسے آلے کے پار سعاد!

"انسان! ہر انسان آئینہ ہے۔ وہ خاص آئینہ جو باطن کا عکس دکھاتا ہے۔ کبھی اپنے مقابل کھڑے انسان کی آنکھوں میں دیکھو۔ ان میں مسرت ہے یا خوشی تو سمجھ جاؤ تم سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں۔۔۔ اور اگر تم اس انسان کی آنکھوں میں پانی کی طرح شفاف نمی دیکھو جس میں ماسوائے دکھوں اور رنجشوں کے کسی کا عکس نہ دکھائی دے تو سمجھ لو تم سے زیادہ بدصورت کوئی نہیں"!

"کیا آئینہ ساز کا بھی کوئی آئینہ ہوتا ہے، جس میں وہ اپنا باطن دیکھ سکے؟"

"ہاں۔۔ آئینہ ساز کا بھی ایک آئینہ ہوتا ہے۔ ایک آئینہ ساز وہ ہے جس نے خاص آئینوں کو بنایا۔ یعنی انسان کو یعنی خدا! تم انسان ہو دیکھو تمہیں ہر انسان میں خدا کی تخلیق کردہ خوبصورتی نظر آئے گی۔ یعنی اس آئینہ ساز کا بنایا ہر آئینہ اس کا عکس دکھاتا ہے ۔ اور ایک آئینہ ساز وہ ہے جس کے بنائے گئے آئینے ظاہر دکھاتے ہیں۔۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔۔ مَیں، اور کوئی بھی شخص جو آئینہ بناتا ہو۔ اس آئینہ ساز کا آئینہ بس ایک ہوتا ہے۔ کوئی بھی ایک شخص، جس کی آنکھوں میں جمع ہوتے پانی کے ذریعے وہ اپنے اندر جھانک سکے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی و مسرت کی چمک اسے بتلائے کہ اس دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں۔ اور اگر وہاں وہ رنجشوں اور غموں کے کچھ نہ پائے تو جان لے وہ اس دنیا کا بدصورت ترین شخص ہے!! کیا سمجھے؟" اس کے بات ختم کرنے پر بدر کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکرایا۔

"آپ کا آئینہ یہ ہے؟" ہاتھ سے اس کے کان کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔ یہ میرا مرَر نہیں ہے، یہ کسی اور کا مرَر ہے جسے جب تک اس کا مرَر ڈھونڈے تب تک میرے ساتھ کام کرے گا۔“ وہ مسکرا دیا۔ بدر کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”میرے متعلق یہ ذو معنی باتیں مت کریں ورنہ یہیں سے واپس چلی جاؤں گی۔“ وہ اس کے کان میں غرّائی تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔۔“

”تم اپنے دماغ پر زور مت دو۔ یہ فائل لے کر جاؤ آنند کو دو۔ اس سے کہو اس پر نظر ڈالے اور فائنل فائل تیار کر کے دے۔“ خیام نے فائل اس کی طرف سرکائی۔ بدر کی نگاہ اس آلے پر پڑی۔ خیام نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ ذرا ٹھہرا پھر گہری سانس لے کر وہ آلہ اپنے دائیں کان میں لگایا۔

”میرے کان میں چیخنا مت مصعب!“ اسے وارن کیا گیا تھا۔ وہ ایک کو بھگت رہا تھا اب دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، تبھی احتیاط لازم تھی۔

☆☆☆

اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سر کے علاوہ گویا پورا جسم سن تھا، وہ کچھ محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنا وجود بے جان سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سر کو جنبش دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں وہ کامیاب رہا۔ مگر کمزوری کی وجہ سے اگلے ہی لمحے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی پلکوں کی جنبش محسوس کرتے ہوئے کوئی اس پر جھکا۔

”تم مجھے سن سکتے ہو؟“ آواز جانی پہچانی سی تھی۔ اس نے پھر سے آنکھیں کھولنا چاہیں۔ وہ نہیں کھول پایا اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو دنیا جہان سے بے گانہ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کمزوری کے باعث ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔ پٹیوں میں جکڑا لاغر سا وجود جو حال ہی میں پہاڑ پر ہوئے اس حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اس کے سر پر کھڑے

مارک نے گہری سانس لی پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔ اسے باہر آتا دیکھ کر جیم اس کی طرف لپکا۔

"اب کیا کرنا ہے سر؟" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ مارک نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے انگشت شہادت اور انگوٹھے سے اپنی ناک کی ہڈی کو مسلا تھا۔

"مائک کیسا ہے؟" لفٹ کا آہنی دروازہ بند ہوا۔ وہ نیچے کی طرف جانے لگے۔

"وہ ٹھیک ہیں۔ شکر ہے عین وقت پر گاڑی بدل دی تھی ہم نے، ورنہ کون جانے اس وقت اس لڑکے کی جگہ پر وہ بستر مرگ پر ہوتے۔ بلکہ گاڑی جس کے ساتھ بدلی گئی وہ تو موقع پر ہی جان دے گیا۔ یعنی مائک سر تو اسپتال کے بجائے قبرستان میں ہوتے۔" وہ اپنی دھن میں کہتا گیا اور غلط کہہ بیٹھا تھا۔ جس کا اسے مارک کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ "سوری سر۔" اس نے پشیمانی سے کہتے ہوئے سر جھکایا۔

"مائک کے ساتھ رہو کسی سائے کی طرح۔ میں اس کی ہر حرکت اور ہر قدم سے باخبر رہنا چاہتا ہوں۔" وہ جیم کو حکم دیتا لفٹ کے رکنے پر باہر آیا۔ "وہ لڑکا۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟ تمہارا ہیکر دوست؟" وہ رک گیا۔ اپنا رخ اس کی طرف کیا۔

"بدر سر!" وہ گڑبڑایا۔

"اس سے رابطہ کیا تم نے؟" اس کے لہجے میں ذرا سختی در آئی۔

"سر وہ۔۔ میرا اس سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ میں آج اس کے گھر جاؤں گا ضرور۔۔ سوری سر۔۔" اس کے غصے سے بچنے کے لیے اس نے اختتام میں اپنی نااہلی پر معافی مانگنا ضروری سمجھا۔

"میرے کام وقت پر کیا کرو جیم! ورنہ بہت سے لوگ ہیں جو تم سے زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔" وہ سختی

سے کہتا آگے بڑھ گیا۔ بے بسی سے اس کی پشت دیکھتے ہوئے جیم کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ خدا غارت کرے اس بدر کو جو اپنے ساتھ ساتھ اس کا مستقبل بھی داؤ پر لگانے جا رہا تھا۔

☆☆☆

دو سال بعد اس نے ایک بار پھر اندلس کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اسے لگا وہ وقت میں پیچھے آ گئی ہے۔ وہیں مالاگا کے ایئرپورٹ جہاں سے اس کی زندگی میں غیر معمولی واقعات رونما ہونا شروع ہوئے اور پھر سب بدل گیا تھا۔ وہ وہیں اسی سڑک پر کھڑی تھی جہاں دو برس پہلے اسے ایک غیور مشرقی لڑکے کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔ بس تھوڑا سا فرق تھا۔۔ اس بار نہ وہ وہی والی سعاد تھی، نہ وہ لڑکا یہاں تھا!!

وہ پاکستان سے اندلس آئی تھی اور اب یہاں سے اسے تھائی لینڈ جانا تھا۔ اس نے گہری سانس اپنے اندر اتار کر فضا میں پھیلی خوشبو کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی تھی۔

”سینیوریتا، آپ کو کوئی مدد چاہیے؟“ کسی نے عقب سے اسے پکارا۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ وہاں تقریباً پندرہ سولہ سالہ لڑکا مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ ”آپ ٹھیک ہیں سینیوریتا؟“ لڑکے نے تشویش سے پوچھا۔ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

”یہاں کوئی قریبی شاپنگ مال ہے؟“ اس کے سوال پر لڑکے کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”میرے ساتھ آئیں۔“ وہ لڑکا آگے بڑھ گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں میچیں پھر اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ کانوں میں بار بار ”سینیوریتا“ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

مال قریب ہی تھا۔ تقریباً پانچ منٹ کے فاصلے پر۔ وہ اس لڑکے کا شکریہ ادا کر کے مال میں آ گئی۔ اس کی معلومات کے مطابق تھائی لینڈ کی فلائٹ میں ابھی دو گھنٹے تھے۔ اور ان دو گھنٹوں میں اسے یہیں انہی سڑکوں پر پھرنا تھا۔ اس

نے اگلا ایک گھنٹہ مال میں گزارا تھا۔ یقیناً وہ دو گھنٹے یہیں گزارتی اگر اسے بھوک کا احساس نہ ہوتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ریستوران میں بیٹھی اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔ کھانے کے ساتھ مکمل انصاف کرنے کے بعد جب اس نے بل منگوایا تو نوٹ بک اس کے آگے رکھ دی گئی۔ اس نے بک کو کھولا تو وہاں ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ غیر محسوس طریقے سے لفافے کو اٹھا کر اس نے پیسے بک میں رکھے پھر بک ویٹر کو پکڑا دی۔

"گراسیا سینیوریتا۔" ویٹر مسکرا کر کہتا آگے بڑھ گیا۔ وہ جلد ہی ریستوران سے نکل آئی۔ اس کے قدم اب واپس ایئرپورٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایئرپورٹ پہنچ کر وہ ویٹنگ ایریا میں رکھی ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ ہینڈ بیگ ایک طرف رکھ کر وہ لفافہ کھولا۔ اندر اس کا ٹکٹ موجود تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

"ٹکٹ مل گیا؟" بھاری مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"گراسیا سینیور!" وہی الفاظ، وہی ملک اور وہی لوگ۔۔ سب کچھ وہی تھا بس حالات بدل گئے تھے۔ وقت بدل گیا تھا۔ اب نہ وہ تھا، نہ سعاد وہی سعاد تھی۔

اسے جانے کیوں اپنی آواز نم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نمی کے پگھلنے کا احساس ہوا تو اس نے سر جھکا کر نمی کو اندر اتارا۔ اس وقت اس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ اس کے اردگرد لوگوں کے اس جمِ غفیر میں وہ اچانک کہیں سے نمودار ہو، اس کے سامنے آکر کھڑا ہو اور وہ اس سے کہہ سکے کہ، "تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا سینیور زیاد"!

☆☆☆

وہ بغور اپنے سامنے بیٹھے ڈاکٹر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت جندل کے کہنے کے مطابق اس کی بھیجی گئی رپورٹس ڈاکٹر کو دکھانے آیا تھا۔ آفس میں بس وہی دو لوگ موجود تھے۔ ماحول مکمل ایئرکنڈیشنڈ تھا۔

فضا میں دوائیوں کی مدھم سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے بیٹھا ڈاکٹر ناک پر چشمہ ٹکائے ورق الٹ رہا تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔۔ یہی کوئی پینتیس سال تک کی عمر کا ہو گا وہ۔۔ چہرے پر مٹھی بھر داڑھی تھی جو رعب سا قائم کر رہی تھی۔ آنکھیں ذہانت کی آئینہ دار تھیں اور انوکھی چمک سے لبریز!

"رپورٹس کے مطابق مریض کو فالج کا اٹیک تقریباً دو سال پہلے آیا تھا۔ اٹیک کچھ زیادہ نوعیت کا بھی نہیں تھا باوجود اس کے مریض کی اتنی بری حالت سمجھ سے باہر ہے۔" ڈاکٹر نے کندھے اچکا کر کہتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔

وہ چونک اٹھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ۔۔ ان کا علاج ممکن تھا۔ مریض بہت جلد ریکور کر جاتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مریض کے سرپرست یہ چاہتے ہی نہیں تھے۔ یہ ایک حد تک آسان کیس تھا۔" وہ رکا۔ ٹھہر کر ضرار کو دیکھا۔ "انہیں جو دوائیاں دی جا رہی ہیں، وہ ان کے لیے زہر ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ انہیں اندر ہی اندر ختم کر رہی ہیں۔" ضرار نے سختی سے لب بھینچے تھے۔

"تو کیا اب مریض کا علاج نہیں ہو سکتا؟"

"میں آپ کو ناامید نہیں کروں گا۔ جو دوائیاں انہیں دی جا رہی ہیں ابھی اسی وقت روک دیں۔ نئی دوائیاں تجویز کر رہا ہوں۔ ان کی پابندی کروائیں، ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ بہتری ضرور آئے گی۔" اس نے ڈاکٹر کی بات سمجھ کر سر کو ذرا سی جنبش دی۔ وہ حیران تھا بے حد حیران۔۔ سماعت سے بار بار وہی الفاظ ٹکرا رہے تھے، "مریض کے سرپرست یہ چاہتے ہی نہیں تھے"!

☆☆☆

”میں نیویارک جانا چاہتی ہوں بابا۔ پلیز روکیے گا مت!“ اس نے رک کر ایک نگاہ اس پیغام پر ڈالی پھر پیغام بھیج دیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق پیغام فوراً ہی دیکھ لیا گیا اور ٹھیک ایک منٹ بعد وارلڈ کی کال آنے لگی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے کال اٹھائی اور موبائل کان سے لگایا۔

”کیسے ہو بیٹے؟“ وارلڈ کی آواز سے مخصوص خوشگواریت جھلک رہی تھی۔ وہ مسکرائی۔ ”بالکل ٹھیک۔ مزید ٹھیک ہونے نیویارک جانا ہے۔“ دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ وہ اس کے جواب کی منتظر رہی۔

”اکیلی جاؤ گی؟“

”نہیں بابا۔ زیاد بھی جائے گا۔ پلیز انکار مت کیجیے گا پلیز پلیز!“ وہ اب التجا کرنے لگی۔ وارلڈ نے گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے۔ جلدی واپس آنا اور اپنی ماں کو بتا کر جانا۔“ وہ ایکدم خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھینک یو سو مچ بابا! میں ابھی ماں کو بتاتی ہوں۔۔“ خوشی سے کہتی وہ کچھ یاد آنے پر رکی۔ ”ویسے بابا۔۔۔ کچھ ہی دیر میں ایئرپورٹ جانا ہے ہمیں۔ آپ آئیں گے یا بس چلی جاؤں؟“

”سوری بیٹے۔۔ مجھے یہاں بہت کام ہیں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے لب بھینچ کر سر کو ذرا سی جنبش دی۔ ”آپ بھی۔۔ بابا!“ اس نے کال کاٹ دی۔ موبائل رکھ کر پر سوچ نگاہوں سے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے سے ٹراوزر پر سفید سوئیٹر پہنے رف سے حلیے میں، بالوں کو ڈھیلے جوڑے میں باندھے وہ ہمیشہ کی طرح سادگی کا پیکر بنی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں پہلے وہ دل سے اور بہت زیادہ خوش ہوئی تھی۔ اسے یاد نہیں پڑتا وہ

آخری بار کب ایسے خوش ہوئی تھی۔ شاید بہت عرصہ بیت چکا تھا۔ اب وہ ستائیس سالہ میچیور اور پریکٹیکل لڑکی تھی۔ اور شاید دنیا کے لیے میچیورٹی یہی ہے، کہ انسان سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لے اور خوش رہنا بھول جائے۔

اپنی سوچوں کو جھٹکتی وہ گہری سانس لے کر کمرے سے باہر آئی۔ زینے اتر کر وہ قانتہ کے کمرے میں آئی۔ دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اپنا سر دروازے سے نکال کر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ دروازہ بند کرتی باہر آگئی۔

"کوئی کام ہے میم؟" ملازم نے اس کی متلاشی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماں کہاں ہیں؟"

"میڈم تو دو دن پہلے ہی اپنے گاؤں چلی گئی تھیں۔ آپ نہیں جانتیں؟" ازابیلا کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"کب کیوں؟"

"وہ جس دن۔۔ میڈم آپ پر چلائی تھیں اور۔۔ آپ رو رہی تھیں۔۔ جب ابراہم سر آئے تھے۔ اسی رات وہ چلی گئی تھیں۔" ملازم نے سر جھکایا۔ وہ چند پل اسے دیکھتے رہی پھر آگے بڑھ گئی۔ سست رفتار سے زینے چڑھتے ہوئے وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس دن کے بعد سے قانتہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔۔ مگر وارلڈ بھی تو اس سے انجان تھے۔۔ اور زیاد نے بھی اس بارے میں اسے نہیں بتایا تھا۔ سوچوں میں گھری وہ اپنی ماں کے اچانک یوں بنا بتائے چلے جانے پر پریشان ہوئی تھی۔ کیا وہ اس سے ناراض تھیں؟!

☆☆☆

اس بڑے سے میدان میں مسلسل فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ایک کے بعد ایک گولی اس دائرے میں چھید کر رہی تھی۔ درختوں پر بیٹھے پرندے گڑبڑا کر اپنے آشیانے چھوڑ کر باہر نکلے تھے۔ ایک اور فائر ہوا تھا۔ عین

اس کے سر کے اوپر سے ایک پرندہ گزرا تھا۔ وہ رک گیا۔ گن نیچے کی۔ کانوں میں لگے ہینڈ فری اتارے۔ ایک نگاہ اردگرد ڈالی۔ اس کے دائیں بائیں قطار کی صورت میں بہت سے لوگ کھڑے اسی مشغلے میں مصروف تھے۔ وہ آوٹ ڈور شوٹنگ پر آیا ہوا تھا۔ پلان کے مطابق یہیں اسے اس شخص سے ملنا تھا۔ اسے یہاں آئے پندرہ سے بیس منٹ ہو چکے تھے مگر اس شخص کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ بے زاری سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک طرف چلنے لگا۔ بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ ناک پر چشمہ ٹکا تھا۔ چند ہی پل گزرے کہ کوئی اس کے ہم قدم ہوا۔

"آج رات کھیل شروع کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی آنا ہے۔" اسے اطلاع دی گئی۔ اس نے یونہی سر جھکا کر چلتے ہوئے گردن پر ہاتھ پھیرا۔ "بڑے پیمانے پر شرطیں لگ رہی ہیں۔ بہت خون دیکھنے کو ملے گا۔" بھاری مردانہ آواز میں پر اسراریت سی تھی۔ وہ رک گیا۔ "ایڈریس تمہیں مل جائے گا۔" اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ اپنا رخ اس کی طرف کیا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھا۔ نگاہیں ترچھی کر کے دائیں طرف کھڑے ہجوم کو دیکھا جو اب فاصلے پر تھا۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے نگاہوں کا رخ واپس اس کی طرف کیا۔

"اس کھیل کی شروعات پھر تمہارے خون سے ہو گی!" اگلے ہی لمحے اس نے اس شخص کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بنا ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر دوسرے سے اس کے کوٹ سے پستول نکال کر چھٹی یا ساتویں پسلی کے نیچے رکھی تھی۔

"اگر کوئی آواز کی تو ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔" خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آدمی سہمی نظروں سے سامنے دیکھتا اس کے آگے چلنے لگا۔ وہ دونوں پارکنگ ایریا کی طرف آئے۔ اس شخص نے متلاشی نظروں سے سامنے دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ زوردار لات اس کی ٹانگ پر رسید

کرتا بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے تیزی سے گن لوڈ کی اور اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ فائر کی آواز گونجی۔ گولی ہوا کی رفتار کو چیرتی اس کی ٹانگ میں جا لگی۔ خون دھار کی صورت میں فوارے کی مانند بہنے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے پیچھے سے آ کر اس کا گریبان پکڑا اور گاڑی کی طرف گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر ڈگی کھول۔ اسے اندر دھکا دیا اور ڈگی بند کر دی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے دھیرے سے چہرے پر لگا ماسک اتارا۔ وہ جندل تھا، جندل یوسف زئی!

اس نے فرنٹ سیٹ پر رکھے رومال کو اٹھایا۔ ماتھے پر پی کیپ ٹکائی، چہرے کو رومال سے چھپایا۔ پستول اپنے دائیں طرف رکھی پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

اور پھر آخر کار اس نے تھائیلنڈ کی سر زمین پر قدم رکھا تھا۔ اسی زمین پر جہاں اسے بلایا گیا تھا۔ جہاں شاید بہت کچھ بدلنے والا تھا۔ وہ ضروری کاغذی کاروائی کر کے جب باہر آئی تو محسوس ہوا یہاں کل تیز دھواں دار بارش ہوئی ہے۔ ہوا میں اب بھی نمی تھی، موسم ٹھنڈا تھا۔ نم مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ اس نے ایک مسکراتی نگاہ ارد گرد ڈالی پھر گردن گرا کر ٹھوڑی اونچی کر کے آسمان کو دیکھا۔ آسمان پر جگہ جگہ قطروں کی طرح سفید بادل بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے مسلسل برسنے کے بعد اب بھی برسنے کی چاہت ہو۔ جہاں بادل نہیں تھے وہاں سے نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے انہیں دیکھے گئی۔ عین اسی لمحے ایک جہاز۔۔۔ اس کی نگاہوں کے سامنے آسمان کی طرف اڑان بھرتا نظر آیا۔ وہ بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ ان بادلوں سے بھی زیادہ بلندی پر۔۔ انہی بلندیوں پر جہاں سے ابھی وہ ہو کر آئی تھی۔ جانے کیوں وہ اس جہاز کو دیکھتے ہوئے ٹھہر سی گئی تھی۔ وہ قریب ہی تھا، زیادہ اونچائی پر نہیں تھا۔ اس نے ابھی ابھی اڑان بھری تھی۔۔ اسے اپنی آنکھوں میں نمی پھلکتی محسوس ہوئی۔

اس نے بھنویں اکھٹی کیے سر جھکایا۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ اس نے ٹھہر کر گہری سانس لی۔ وہ اپنی اچانک سے اس حالت کی وجہ سمجھ نہیں پائی تھی۔۔ شاید یہ سب سمجھ سے باہر تھا۔۔ ہاں اگر وہ محسوس کرتی تو شاید اسے احساس ہوتا کہ اس جہاز میں۔۔ وہی جہاز جس نے ابھی حال ہی میں اڑان بھری تھی، اس میں اپنی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر بیٹھے زیاد نے بھی یہی سب محسوس کیا تھا۔ دھڑکنیں۔۔ جو غیر معمولی ہی ہوتی تھیں مگر وہ ان کے غیر معمولی پن کو محسوس نہیں کرپاتا تھا۔۔ اس وقت وہ انہیں محسوس کررہا تھا۔ وہ دونوں عجیب سے احساس میں گرفتار ہوئے تھے۔ وقت نے دونوں کو عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اور وقت۔۔۔ وہ گزر گیا۔۔ جہاز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ سر جھٹکتی گہری سانسیں لیتی آگے بڑھ گئی۔

وہ اپنے لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بغور اردگرد کا جائزہ لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ بینکاک، تھائیلنڈ کا سب سے زیادہ پررونق شہر! اونچی اونچی عمارتیں اور کشادہ سڑکیں۔ زندگی کی بھاگ دوڑ، طرح طرح کے لوگ۔ وہ ہر ایک چیز کا جائزہ لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ خیام کے دیے گئے ایڈریس کے مطابق اسے کسی ٹیکسی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جس کالونی میں رہتا تھا وہ تقریباً بیس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ مسلسل سفر کرنے سے اسے کچھ تھکاوٹ بھی محسوس ہورہی تھی۔ طبیعت بھی ذرا بوجھل تھی تبھی اس نے کھلی فضا میں، کھلے آسمان تلے پیدل چلنا مناسب سمجھا تھا۔ اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ کچھ موسم کی خوشگواریت وجہ بنی، کچھ ماحول میں آیا یہ بدلاؤ۔۔ وہ کافی حد تک بہتر محسوس کررہی تھی۔

ٹھیک بیس منٹ بعد وہ اس کالونی میں داخل ہوئی۔ اونچی اونچی عمارتیں، کھلے میدان، ہر طرف سبزہ۔۔۔ سب کچھ واقعی مسحور کن تھا۔ وہ اپنی دھن میں چلتی جارہی تھی جب کسی کی دبی دبی چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ٹھہر گئی۔ ماتھے پر بل ڈالے سامنے دیکھا جہاں چار اوباش لڑکے ایک لڑکی کو گھیرے میں لے کر کھڑے تھے۔ وہ لڑکی

دبی دبی آواز میں روتے ہوئے پیچھے ہٹ رہی تھی اور وہ لڑکے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے پھر گردوپیش میں نگاہ ڈالی۔ کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے اپنے قدم ان کی طرف بڑھائے۔

"پلیز میری مدد کریں، یہ مجھے ماردیں گے۔" اس لڑکی نے شستہ انگریزی میں اسے مخاطب کر کے مدد مانگی تھی۔ وہ رک گئی۔ سوالیہ نظروں سے ان اوباش لڑکوں کو دیکھا جو اب اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ "تم واقعی اسے ماردو گے؟"

"اپنے کام سے کام رکھو لڑکی!" ایک لڑکا غرایا۔ وہ مسکرائی۔ آنکھوں کے کنارے ہلکی سی سلوٹیں سی نمودار ہوئیں۔

"مگر وہ مدد مانگ رہی ہے۔" اس نے آنکھوں سے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر تم کسی سے مدد نہیں مانگنا چاہتیں تو فوراً یہاں سے چلی جاؤ!" وہی لڑکا دوبارہ غرایا۔ "یہ زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے باس!" ایک لڑکے نے اس کا سر تا پیر جائزہ لیتے ہوئے تبصرہ پیش کیا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔ سیاہ لانگ کوٹ میں ملبوس، سرخ رنگ کا حجاب چہرے کے گرد اوڑھے، سیاہ ماسک سے چہرہ ڈھکے، گلے کے گرد سرخ و سیاہ مفلر ڈالے وہ واقعی سب میں منفرد دکھ رہی تھی۔

"مجھے آج تک اپنی خوبصورتی پر شک تھا، اس شک کو یقین میں بدلنے کے لیے تمہارا شکریہ!" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"یہ ایسے نہیں مانے گی۔" ایک لڑکا دانت کچکچاتے ہوا آگے آیا۔ اس نے سعاد کے قریب پہنچ کر اس کے حجاب میں ہاتھ ڈالنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے ہی اس کا ہاتھ پکڑ چکی تھی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے اس کے ہاتھ کو

مروڑا۔ چیخ کی آوازیں سے کئی ہڈیاں چٹخ گئیں۔ اس نے پوری قوت سے بائیں ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر رسید کیا۔ وہ لڑکا درد کے مارے بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

”آگے مت بڑھنا لڑکی ورنہ گولی چلادوں گا!“ ایک لڑکے نے فوراً سے پہلے اس پر پستول تانی۔ وہ کوئی اثر لیے بنا آگے بڑھی۔ ”پستول اصلی ہے؟“

”کیا؟“ اس لڑکے نے حیرت سے سوال کیا۔ سعاد نے موقع کا فائدہ اٹھا کر جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے پستول لے کر ایک طرف پھینکی اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنے کوٹ کی جیب سے پستول برآمد کر کے ان پر تانی۔ ”یہ اصلی ہے۔۔ چلتی بھی ہے۔“ اگلے ہی لمحے اس نے گن لوڈ کر کے ٹریگر پر زور دیا۔ پستول سے نکلی گولی عین اس لڑکے کے سر کو اوپر سے گزرتی دیوار میں جالگی۔ سائیلنسر کی وجہ سے فائر کی آواز زیادہ دور تک نہیں گئی۔

”ہاتھ اوپر فوراً!“ اس نے حکم دیا۔ لڑکوں نے فوراً ہاتھ اوپر کر دیے۔ وہ لڑکی سہم کر اس کے پیچھے چھپ گئی۔

”اب قطار بناؤ اور یہاں سے شرافت سے نکلو۔“ ایک اور حکم دیا گیا۔ وہ ہاتھ اوپر کیے قطار بنا کر دائیں طرف جانے لگے۔ ”تم۔۔ ہاں تم رکو ادھر۔“ اس نے اس لڑکے کو اشارہ کیا جو بار بار اس پر غرایا تھا۔ اس لڑکے نے مدد طلب نظروں سے اپنے دوستوں کے دیکھا۔ اس کی نگاہیں ناکام و نامراد لوٹ کر سعاد کی طرف آئیں۔

”گھٹنوں کے بل بیٹھو۔“ لڑکا کھڑا رہا۔ ”بیٹھو ورنہ۔۔“ اس نے ٹریگر پر ذرا سا زور دیا۔ لڑکا فوراً گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے آئی۔ گن اس لڑکی کو پکڑائی پھر گلے کے گرد لپٹا مفلر اتارا۔ اچھے سے اسے اپنے دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹا اور اس لڑکے کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بنا زوردار مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔ ایک دو اور پھر تین۔۔ وہ بے درپے کئی مکے اس کے منہ پر رسید کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ اس نے رک کر اس لڑکے کو گھورا اور پھر اگلے ہی لمحے پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے سینے پر جڑ دیا۔ خون ابل

کر اس کے منہ سے نکل کر سڑک پر گرا۔ وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ کے گرد بندھا مفلر کھولا جو اب خون آلود ہو چکا تھا۔

"آپ نے اسے مار دیا؟" لڑکی نے سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگلی بار نظر آیا تو یہی کروں گی!" مفلر کو واپس اپنی گردن کے گرد لپیٹا۔ لڑکی سے پستول لے کر کوٹ کی جیب میں اڑسی اور بنا کچھ کہے آگے بڑھ گئی۔

"آپ کا شکریہ میڈم!" اس لڑکی نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "جلدی سے اپنی راہ لو۔ ہر بار تمہاری قسمت اچھی نہیں ہو گی!" اونچی آواز میں کہہ کر وہ بنا رکے آگے بڑھتی چلی گئی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ خیام کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنا ٹیچی ایک طرف کھڑا کیا۔ سر اونچا کر کے اپنے سامنے بڑے سے آہنی دروازے کو دیکھا۔

نگاہیں اوپر کو اٹھتیں ٹیرس میں کھڑے اس شخص پر ٹکیں۔ دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکائے آگے کو ہو کر کھڑا خیام حنفی! ہلکے بھورے رنگ کے بال جن کو ہوا نے دھیرے سے ماتھے پر بکھیرا تھا۔ اس نے خیام کو دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا۔ جواباً وہ نرمی سے اسے دیکھتا مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے دائیں پلک جھپکی ۔ وہ لب دانتوں میں دبا گئی۔

خیام نے پاس رکھی چابی اٹھا کر اس کی طرف پھینکی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح مہارت سے چابی کو پکڑا۔ مسکراتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ سر تک لے گئی۔ اسے سیلیوٹ کیا گیا تھا۔۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کے لیے اہم ہے۔۔ اور یہ کہ وہ اس کے حکم کے مطابق اس کے سامنے حاضر ہے۔۔

سعادیوسف زئی۔۔ وہ تھائلینڈ پہنچ چکی ہے!!

☆☆☆

وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ اپنے اردگرد کی صورتحال کو سمجھنے کے لیے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔ سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھی۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اسے بری طرح گھائل کیا گیا تھا۔

"اٹھ جاؤ، صبح ہوگئی ہے۔" بھاری مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر اسی لمحے اس پر پانی کی بالٹی الٹ دی گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھنے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے گرد پانی چھا گیا۔ وہ پانی میں مکمل بھیگ چکا تھا۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی تو خود کو بندھا ہوا پایا۔ اس نے سر دائیں بائیں ہلا کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ کسی بند کمرے میں تھا۔ فرش کچا تھا اور جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اسی کچے فرش پر کرسی گھسیٹی گئی۔ اس کے سامنے کرسی رکھی گئی۔ پھر وہ سیاہ لباس میں ملبوس لڑکا اس کے روبرو اس کرسی پر بیٹھا۔ ماتھے پر پی کیپ تھی اور چہرے پر سیاہ رومال بندھا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"کون ہو تم؟ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟" وہ دبا دبا سا چلایا۔ لڑکے نے بےزاری سے سر کو جھٹکا دیا۔ "تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں!" لڑکے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہی یہی! اسی لیے تو یہاں لایا ہوں تاکہ تفصیلاً مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" الفاظ میں طنز تھا البتہ آواز میں طنز کا شائبہ تک نہ تھا۔ "اب خود بولو گے یا طوطے کی طرح بلواوں؟" اس نے غصے سے نتھنے پھلا کر اس چھٹانک بھر لڑکے کو دیکھا۔

"تم پچھتاؤ گے۔ بہت زیادہ پچھتاؤ گے۔" وہ غرایا۔ وہ لڑکا بےزاری سے اسے دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی ایک طرف کی۔ جیب سے ایک رومال برآمد کیا۔ اسے اچھی طرح سے اپنے دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹا۔ وہ اس کے خطرناک تیور دیکھ کر گڑبڑایا۔ "میرے ساتھ کچھ بھی کیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں۔۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک

زوردار مکا اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اسے اپنے جبڑے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بنا ایک اور مکا اس کے گال پر جڑ دیا ساتھ ہی زوردار لات اس کے سینے پر ماری۔ کرسی الٹ گئی۔ اس کا سر زور سے فرش سے ٹکرایا۔ اسے اپنے سر سے کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ غالباً خون! گرم اور لال خون!! وہ لڑکا آگے آیا۔ اپنے جاگرز اس کی گردن پر رکھ کر زور دیا۔ اسے اپنی آنکھیں باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ اپنے پاؤں کو ہلکی سی حرکت دیتا دھیرے دھیرے اس کی گردن پر زور دیتا اسے چلانے پر مجبور کر گیا تھا۔ اس کی چیخوں کو نظر انداز کیے وہ بری طرح اس کی گردن کو اپنے جوتوں سے رگڑ رہا تھا۔ وہ چلاتا رہا۔ اس لڑکے نے زوردار لات اس کے سینے پر ماری۔ اسے اپنی ہڈیاں چٹختی ہوئیں محسوس ہوئیں۔

"رکو۔۔رک جاؤ۔" اس کا سانس پھول چکا تھا۔ پیشانی سے اور ناک سے خون رسنے لگا تھا۔ گردن بری طرح رگڑے جانے کے باعث خون میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی مگر وہ نہیں لے پایا۔ پانی کی بالٹی اس پر الٹ دی گئی۔ آبشار کی طرح خود پر بہتا پانی اس کے زخموں کو جلانے کے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ اس کے حلق سے خوفناک چیخیں برآمد ہوئی تھیں۔

"اب تم اچھے طوطے کی طرح بول سکو گے۔۔ تو شروع کرتے ہیں۔" جھٹکے سے اس کی کرسی سیدھی کی اور خود اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ "پہلا سوال! کون ہو تم؟" اس بار لہجے میں طنز کا شائبہ تھا۔

"میں۔۔۔ میں ان کا ملازم ہوں۔ وہ۔۔ اسکائے ٹو کے ممبران!" وہ لڑکا چہرہ ترچھا کر کے ہنس دیا۔ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "تمہاری اپنی کوئی پہچان نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ اسکائے ٹو والوں کے کتے ہو!" اس نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ زخم بری طرح جل رہے تھے۔ بولتے ہوئے شدید تکلیف کا سامنا تھا۔

"دوسرے سوال پر آتے ہیں۔ وہ خوفناک کھیل جو طے پایا گیا ہے، کس کے کہنے پر ہو رہا ہے، اور کیوں؟"

”ڈی ڈبلیو کا۔۔۔ آغاز ہو رہا ہے۔ اسکائی ٹو اپنا پراجیکٹ دنیا کے سامنے لائیں گے۔ اور طریقہ۔۔ رسم افتتاح اس خونی کھیل کے ذریعے ہو گی۔“ اس نے رک کر گہری سانس لی۔ وہ لڑکا آگے ہوا۔ جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔ ”کیسا خونی کھیل؟“

”انسانوں کی شطرنج! وہاں بساط بچھائی جائے گی اور زندہ انسانوں کو مہرہ بنایا جائے گا۔ وہاں خون بہایا جائے گا اور کثیر تعداد میں۔۔۔ وہ خون کی ہولی کھیلیں گے۔“ اس لڑکے نے آگے بڑھ کر اپنی مٹھی میں اس کے بال جکڑتے ہوئے اس کا سر اوپر کیا تھا۔

”کون؟“!

”میں نہیں جانتا۔ ہمیں جو حکم ملتا ہے ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔ ہمیں حکم دینے والے خود نہیں جانتے انہیں حکم کہاں سے ملا ہے۔ بس اس رسی کا سرا کہیں نہ کہیں جا کر اسکائی ٹو کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“ وہ اب درد کے مارے تیز آواز میں چیخ رہا تھا۔ اس لڑکے نے جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ اس نے منہ میں آتے خون کو فرش پر تھوکا۔

”مقام؟“

”میرا موبائل۔۔۔“ وہ کراہا۔ اس لڑکے نے اپنی جیکٹ کی جیب سے اس کا موبائل برآمد کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ ”وی ون۔۔ پاسورڈ۔“ لڑکے نے پاسورڈ لگایا۔ موبائل کھل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مقام بھی معلوم کر چکا تھا اور وقت بھی۔ وہ خون کھیل کل رات کے اندھیرے میں کھیلا جانا تھا!!

☆☆☆

وہ کچن میں آئی تو خالی فریج دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ وہ کچھ پکانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسے بھوک لگی تھی اور اس وقت اسے صرف کھانا تھا۔ وہ یونہی منہ بنائے اسے خالی منہ چڑاتے فریج کو گھور رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے گہری سانس لے کر زور سے فریج کا دروازہ بند کیا۔ اس زور آزمائی پر فریج تقریباً اپنی جگہ سے ہل گیا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے کچن سے باہر آئی۔ وہ سامنے ہی کمرے کے دروازے سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ آنکھیں بھی انہی کا ساتھ دے رہی تھیں۔ سعاد نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا؟ میں کوئی جوکر لگ رہی ہوں؟" وہ نفی میں سر ہلا گیا۔ "تو دانت کیوں نکال رہے ہیں؟" وہ ایک بار پھر نرمی سے اسے دیکھتا نفی میں سر ہلا گیا۔ "اف یار!! میری بات سنیں۔ آج تو ایسے بنا اجازت میرے گھر آ گئے ہیں مگر اب یہ دوسری چابی بھی میرے حوالے کر دیں۔ یہ شریف لڑکوں کے طور طریقے نہیں ہوتے۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا گیا۔ سعاد نے بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ مارا تھا۔ "محترمی و مکرمی جناب خیام حنفی! بھوک سے میرا دماغ پہلے ہی جگہ پر نہیں ہے، اسے مزید گھما کر کسی بھی قسم کی خطرناک صورتحال کے ذمہ دار صرف اور صرف آپ ہونگے۔ کچھ سمجھے؟" اور پھر۔۔۔اس نے جواباً نفی میں سر ہلا دیا۔ سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ سر دروازے پر ٹکائے ہلکا سا ہنس دیا۔

"اندر آؤ۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چابی کمرے کے دروازے کے لاک میں گھمائی پھر دروازہ کھول کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ سعاد نے گہری سانس لیتے ہوئے اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

"یہ ہے تمہارا کمرہ!" سعاد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کمرے کو دیکھا تھا۔ سامنے دیوار پر بڑی سی اسکرین نصب تھی۔ اس اسکرین کے ارد گرد کئی چھوٹی اسکرینیں اور پھر بیچ میں ایک میز رکھی تھی۔ میز پر دو ایل سی ڈیز

رکھی تھیں۔ اس میز کے دائیں بائیں دو مزید میزیں تھیں۔ جہاں ایک طرف تو ایسی ہی ایل سی ڈیز تھیں جبکہ دوسری طرف کچھ موبائل فونز، لیپ ٹاپ، موبائل سمز، ٹریکر اور کئی آلے رکھے تھے۔ وہ خوشی و مسرت کے ملے جلے جذبات سے یہ سب دیکھتی آگے بڑھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے جلدی سے میز کی درازیں کھولیں اور پھر بس اس کے لیے خوشی سے چیخیں مارنے کی کمی رہ گئی تھی۔ وہاں طرح طرح کے اسنیکس، چاکلیٹس اور مزید الا بلا رکھا ہوا تھا۔ اس نے دو تین اسنیکس نکال کر میز پر رکھے پھر کوٹ کے بازو اوپر چڑھاتی کی بورڈ پر جھکی۔ خیام اس کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑا ہوا۔

"کیمراز آن کرو۔ سب سے پہلے مائک کے کمرے کا!" اس نے مختلف کیز دبائیں۔ دیوار پر نسب ایک اسکرین روشن ہوئی۔ مائک کے کمرے کا منظر واضح ہوا۔ دوسری اسکرین پر وارلڈ کی آفس کا منظر اور پھر تیسری اسکرین پر مارک کی آفس کا منظر!

"اب لگ رہا ہے ناں یہ ایک ہیکر کا کمرہ!" تمام اسکرینیں اور ایل سی ڈیز روشن ہو گئیں۔ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے کرسی کا رخ خیام کی طرف موڑا۔

"تو۔۔ ہم شروعات کہاں سے کریں گے؟" وہ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

"ازابیلا سے!" جواب حاضر تھا۔ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دے کر رخ موڑ لیا۔

☆☆☆

"یہ تمہاری کافی!" زیاد نے کافی کا کپ اس کے آگے بڑھایا۔ وہ مسکراتے ہوئے کپ تھام گئی۔ وہ اس کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ "اب شروع کہاں سے کرنا ہے؟" ازابیلا نے کافی کا گھونٹ بھر کر کپ میز پر رکھا۔ ایک نگاہ اپنے سامنے اس کھڑکی کے پار حد نگاہ تک پھیلی بلند اور روشن عمارتوں پر ڈالی۔ ایسے ہی کسی ہوٹل کے کسی کمرے

میں۔۔۔یونہی نیویارک کی ان بلند عمارتوں پر نگاہ ٹکائے۔۔ایمِلی نے وہ میل بھیجی ہوگی۔۔جو شاید اس کی آخری میل ثابت ہونے جارہی تھی۔۔۔اس نے سر جھٹک کر اپنی توجہ سامنے میز پر رکھے لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر مرکوز کی۔

"ہم سب سے پہلے ایک ہیکر ہائیر کریں گے۔" زیاد نے بھنویں اکھٹی کیے اسے دیکھا۔"میں ایک صحافی رہ چکی ہوں۔زیادہ نہیں مگر تھوڑا بہت مجھے اندازہ ہے کہ تفتیش کیسے شروع کی جاتی ہے!" اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔زیاد آگے ہو کر اسکرین کو دیکھنے لگا۔"تم ہوتے تو ان میں سے کسے ہائیر کرتے؟" وہ چہرہ ترچھا کر کے اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے پوچھ رہی تھی۔زیاد نے آنکھیں سکیڑے اسکرین پر آئے مختلف ناموں کو پڑھا۔

"مسٹر اینڈریو!" ازابیلا مسکرائی۔اور پھر کچھ دیر بعد وہ مسٹر اینڈریو کو پیغام لکھ رہی تھی۔

اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔اسے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔کسی مس ایڈتھ کی جانب سے! اسکرین پر اب اس کا جواب نمودار ہونے لگا۔اس نے فیصلہ کن انداز میں انٹر کی دبائی۔پیغام چلا گیا۔

"رقم پوچھ رہا ہے۔تقریباً کتنی ہونی چاہیے؟" ازا نے پر سوچ نگاہوں سے اس پیغام کو دیکھا۔"دس کروڑ؟" وہ اس کے جواب پر ہنس دی۔"یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے مائی ڈیئر کزن"!

"پانچ ملیئن!!" اس کی آنکھیں حیرت سے کھلیں۔ازابیلا نے پیغام بھیج دیا۔پیغام موصول کر لیا گیا۔مثبت جواب آگیا۔ڈیل ہوگئی۔وہ کل صبح سے ساتھ کام کرنے والے تھے!

اسکرین کے پیچھے۔۔اندھیرے کمرے میں ہڈ سے چہرہ ڈھکے مسٹر اینڈریو نے مسکراتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔دھیرے سے ہڈ کو سر سے سرکا دیا۔اس کا چہرہ واضع ہوا۔۔وہ سعاد تھی، سعاد یوسف زئی!

اس نے مڑ کر پیچھے صوفے پر بیٹھے خیام کو دیکھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے تھمب اپ کا اشارہ دیا۔ اس نے جواباً گردن کو ذرا سا خم دیا تھا۔

☆☆☆

وہ کسی مصروف شاہراہ پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے پوری رفتار سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ایک کے بعد ایک گاڑی اس کے سامنے سے گزر کر نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہتھیلیاں نم تھیں۔ گلا خشک پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس کی نگاہیں سڑک کے دوسری طرف کھڑی اس بچی پر ٹکیں۔ وہ رو رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے ناک اور گال لال پڑ رہے تھے۔ وہ بچی روتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھی۔

”افق۔۔ رکو۔۔ آگے مت بڑھنا۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ آنکھوں میں نمی پگھلنے لگی۔ سامنے سے آتی گاڑی کا زوردار ہارن بجا۔ وہ بچی اس کی طرف دوڑی۔ وہ ایکدم چلا اٹھا تھا۔ ”افق!!!“ وہ اس کی طرف بھاگا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے پکڑ کر دوسری طرف کو جا گرا۔ سامنے سے آتی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے سہم کر خود سے لگی بچی کو دیکھا۔ وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے دھیرے سے اسے مزید خود میں بھینچتے ہوئے اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی ٹکائی تھی۔ آنکھوں سے کئی آنسو بے جان سے ہو کر گالوں پر لڑھک گئے۔

اس کی نیند ایکدم ٹوٹی۔ آنکھیں کھولتا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے کا ماحول یخ ٹھنڈا ہونے کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آنکھوں میں انجانا سا خوف تھا۔ وہ پیشانی کو مسل کر گہری سانسیں لیتا بیڈ سے اترا۔ سائیڈ ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھا کر پانی گلاس میں ڈالا پھر گلاس اٹھا کر صوفے پر آن بیٹھا۔

گلاس لبوں سے لگائے پانی کا گھونٹ بھر کر اس نے گلاس ایک طرف رکھا پھر سامنے رکھا لیپ ٹاپ کھولا۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن ہوئی۔ انگشت شہادت کو دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے اس نے کوئی تصویر کھولی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ سیاہ ٹراؤزر اور سیاہ اپر میں ملبوس، سر پر پی کیپ ٹکائے، سیاہ بالوں کو آزاد کیے مسکرا کر کیمرا میں دیکھتی وہ لڑکی۔۔ افق تھی۔ افق بنت فہد! اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ وہ یک ٹک اس تصویر کو دیکھتا سر صوفے کے بازو پر ٹکا گیا۔ آنکھوں میں جانے کیوں نمی پھگلنے لگی۔ انہی آنکھوں میں جہاں اس وقت ماسوائے محبت کے کچھ نہیں تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

"تم ہمیشہ مجھے ڈرا دیتی ہو چھپکلی!" سرگوشی کے سے انداز میں کہتے ہوئے اس کے لب ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ سماعت سے کسی کے معصوم الفاظ ٹکرائے تھے۔ "آئندہ مجھے چھپکلی کہا تو گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ کیا میں اتنی بری ہوں؟ دیکھیں دیکھیں کیا میری کوئی دم ہے؟ یا میری آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں؟ کیا میں دیوار سے چپک کر چل سکتی ہوں؟ کیا میں مچھر کھاتی ہوں؟ کیا میں واقعی چھپکلی جیسی ہوں؟" آخری جملے پر اس آواز میں نمی گھلنے لگی تھی۔ وہ گردن کو ذرا سا دائیں طرف ہلاتا سکون سے آنکھیں موند گیا۔

"اتنی سی ہو تم۔ اتنی سی!!" اس نے باقاعدہ اپنی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان فاصلہ کم کر کے اسے دکھایا۔ "بالکل چھپکلی کی طرح!" وہ معصوم سا قہقہہ۔ وہ خفا خفا سی نگاہیں، اس کا منانا۔۔ کسی کا نخرے دکھانا، لاڈ اٹھوانا۔ سب اس کے ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ وقت بہت جلدی گزر گیا تھا۔ وہ چھپکلی آج بیس سال کی ہو گئی تھی۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا؟!

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ مسکراتی نگاہ اس تصویر پر ڈالی پھر اپنا موبائل اٹھایا۔ کسی کو کال ملائی اور

موبائل کان سے لگایا۔

"السلام علیکم۔ رات کے اس وقت کال کی ہے، خیریت؟"

"وعلیکم السلام۔ کیا وقت ہو رہا ہے؟" اس کے سوال پر دوسری جانب ضرار چونکا۔

"دو بج رہے ہیں۔ تم ٹھیک ہو خیام؟"

"ہاں شاید۔۔۔ میرا ایک کام کرو گے بنا کسی سوال کے؟" اس کی آواز بہت ہلکی سی تھی۔ جیسے وہ سرگوشی میں بول رہا ہو۔ آنکھیں چھوٹی کیے نگاہیں اس تصویر پر گاڑی ہوئی تھیں۔ نرمی اور محبت سے اس تصویر کو دیکھتا وہ موبائل کان سے لگائے ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

اور جب ضرار اسے کہہ رہا تھا کہ "تم اسے یاد کرنے لگے ہو خیام!" تو اس وقت جواباً ذرا سا ہنس کر "کیا واقعی؟" کہتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ۔۔۔ ایک آنسو۔۔۔ پانی کا شفاف قطرہ موتی کی طرح چمکتا اس کی آنکھ سے پھسل کر گال پر لڑھک کر داڑھی میں جذب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اس کے دروازے پر تیسری بار گھنٹی بجی تھی۔ اس کے کام میں خلل پڑا تھا۔ وہ اونچی آواز میں بڑبڑاتی پیر پٹختی باہر آئی۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر اپنا سر باہر نکالا۔ "رات کے اس وقت کس کو اور کیا مصیبت پڑ گئی ہے؟" اس نے کاٹ دار آواز میں پوچھا۔ ضرار سہم کر ایک قدم پیچھے ہوا۔ وہ اپنے سامنے کسی اجنبی کو دیکھ کر ذرا سنجیدہ ہوئی۔

"آپ کون ہیں؟"

"آپ افق ہیں؟ افق بنت فہد؟" وہ معصومیت سے اثبات میں سر ہلا گئی۔ "آپ سعاد کو جانتی ہیں؟ سعاد یوسف زئی؟"

”جی بالکل۔ انہوں نے لائبریری میں جاب شروع کی تھی، مگر وہ بس ایک ہی دن آئیں۔“

”میں ان کا کزن ہوں۔ وہ کچھ مسائل کی وجہ سے اپنی جاب جاری نہیں رکھ سکیں گی۔ انہوں نے یہ کتابیں اٹھائی تھیں لائبریری سے، آپ واپس کر دیں گی؟“ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑا بیگ اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ خود کیوں نہیں دے دیتے لائبریری میں؟“ وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی۔

”مجھے ضروری کام آن پڑا ہے، میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اور کچھ دن تک نہ آؤں شاید۔ اگر آپ یہ فیور دے دیں مجھے تو آپ کا بہت شکریہ۔“ وہ مسکرا دیا۔ افق نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ ”اور یہ بھی۔“ اس نے ایک اور بیگ اور پھولوں کا ایک بُکے اس کے آگے بڑھایا۔ وہ کم فہمی سے اسے دیکھنے لگی۔ ”یہ کیا ہے؟“

”یہ یہاں آپ کے دروازے پر رکھا ہوا تھا۔ یقیناً کوئی آپ کے لیے رکھ کر گیا ہو گا۔“ ضرار نے وضاحت دی۔

”مگر۔۔ کون اور کیوں؟“ وہ پریشان ہوئی۔ ضرار نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ کا شکریہ۔“ وہ بیگ اور بُکے اس کے ہاتھ سے لے کر دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک طرف کتابوں والا بیگ رکھا اور خود بُکے اور دوسرا بیگ لے کر بیٹھی۔ سرخ و سفید پھولوں کا خوبصورت سا بکے جس پر چھوٹی سی چِٹ رکھی تھی۔ اس نے انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان اسے اٹھایا۔

”ہیپی برتھڈے مائی ڈیئر۔۔۔“ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ لکھنے والے نے آگے نقطے ڈالے ہوئے تھے گویا جو وہ لکھنا چاہتا تھا، لکھ نہیں پایا تھا۔ وہ کارڈ ایک طرف رکھ کر اس بیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ بیگ سے خوبصورتی سے پیک ہوئے دو تحفے نمودار ہوئے۔ وہ انہیں کھولنے لگی۔ ان تحفوں میں چاکلیٹس تھے □۔ بہت سارے چاکلیٹس۔ چاکلیٹس کے ساتھ ایک ڈبے میں سے چھوٹا سا کلپ نمودار ہوا تھا۔ سفید رنگ کا خوبصورت اور نفیس سا کلپ۔ جبکہ دوسرے میں سے مردانہ رسٹ واچ! وہ حیران ہوئی۔ پھر غور کرنے پر اس کی

نظر چاکلیٹس کے درمیان اس چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی۔ اس نے دھیرے سے اسے اٹھا کر وہاں لکھی عبارت کو پڑھا۔

”چاکلیٹس ٹھیک سے بانٹنا! بدر کا ایک چاکلیٹ جو ہمیشہ تمہارا ہوتا ہے، وہ پہلے ہی تمہارے گفٹ میں ڈال دیا ہے۔ تمہارا کلپ اس کی گھڑی سے زیادہ قیمتی اور خوبصورت ہے۔“ وہ ٹکٹکی باندھے بار بار اس پیغام کو پڑھ رہی تھی۔ کون تھا وہ جو جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ بدر کی چیزوں پر اپنا حق جماتی تھی؟ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے لیے آئے تحفوں پر بھی قبضہ کر لیتی تھی؟ کون کون؟ اس نے جلدی سے اپنا موبائل اٹھایا۔ بدر کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا۔ اسے عجیب سی وائبز آ رہی تھیں۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ کوئی ان کے اتنا قریب کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سب سے، اس کی عادات سے، حتیٰ کہ اس کی پسند سے صرف وہ، بدر اور اس کے دادا واقف تھے۔ تو اب یہ تحفے بھیجنے والا کون تھا؟! یہ سب سوچتے ہوئے اس کا دھیان اپنے برابر میں رکھے لیپ ٹاپ کی طرف نہیں گیا تھا جس کی اسکرین روشن تھی۔ اس کا وائی فائی آن تھا جو یقیناً خیام کی خوش قسمتی تھی اور وہ اسی کی بدولت کوسوں دور بیٹھا بند مٹھی گال پر ٹکائے مبہم سا مسکراتے ہوئے اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھا جب سائیڈ ٹیبل پر پڑا اس کا فون چھنگاڑ اٹھا تھا۔ وہ نیند میں ذرا سا کسمسایا اور پھر کروٹ بدل کر لیٹنے ہی لگا تھا کہ موبائل دوبارہ چیخ اٹھا تھا۔

”میری کال اٹھاؤ ورنہ جان لے لوں گی بدر!!“ وہ ایکدم اٹھ بیٹھا تھا۔ جلدی سے موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”اتنی رات کو کیا مصیبت پڑ گئی ہے؟“ وہ آنکھیں ملتا ہوا تقریباً نیند میں بڑبڑایا۔

”تمہارے لیے گفٹس آئے ہیں بدر۔“ افق کی بات پر وہ واپس بستر پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

"یہ بتانے کے لیے تم نے میری نیند خراب کی ہے؟" موبائل تکیے اور کان کے درمیان میں دبا کر اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں بند کیں۔

"بدر! بھیجنے والے کا نام بھی نہیں ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ کوئی بہت قریبی ہے، ہماری عادات سے اچھے طریقے سے واقف ہے۔" افق جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئی تھی۔

"یہ مسٹر جیکب کے ہی کام ہونگے یار!" وہ اب اونگھنے لگا تھا۔

"دادا برتھڈے نہیں مناتے۔ نہ ہماری نہ اپنی!!" وہ چلا اٹھی تھی۔ بدر نے جھٹ پٹ آنکھیں کھولیں۔

"ہمارا برتھڈے ہے آج؟"

"بالکل! اب بتاؤ کس نے بھیجے ہیں یہ گفٹس؟"

"مجھے کیا خبر۔ اللہ نے بھیجے ہیں۔ چپ کر کے انہیں ایک طرف رکھو اور سو جاؤ۔ فجر میں شکریہ ادا کر دینا اللہ کا۔" وہ مسکرایا تھا۔

"تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے بدر!" وہ خفا ہوئی تھی۔

"افق!!" نرمی سے نیند سے بوجھل آواز میں اسے پکارا گیا۔ "سو جاؤ یار۔ صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے، خیام سر کو وقت کے پابند لوگ اچھے لگتے ہیں۔" وہ دھیرے سے آنکھیں موند گیا۔

"تم جاب کر رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں۔۔ پڑھائی نہیں ہو رہی اب مجھ سے۔ اچھی جاب مل گئی تو بس چھوڑ دی پڑھائی۔" وہ بے فکری سے کہتا کروٹ بدل گیا۔

"تمہیں اندازہ ہے دادا کتنا غصہ ہونگے؟!" وہ تقریباً چیخ ہی تو اٹھی تھی۔

"مسٹر جیکب کو غصہ کرنے کے علاوہ کچھ آتا بھی کیا ہے!!" افق کا دل کیا تھا اپنا نہیں تو اسی کا سر پیٹ ڈالے۔ "تم اتنے ضدی کیوں ہو بدر؟"

"اس سوال کے جواب پر تحقیقات جاری ہیں۔ اب تم مجھے سونے کی اجازت دیتے ہوئے فون بند کرو گی؟"

"تم بہت بد تمیز ہو بدر"!

"لیکن ابھی تو میں صرف ضدی تھا؟"

"تم بد تمیز بھی ہو"!

"سونا ہے مجھے۔" وہ بچوں کی طرح منمنایا۔

"بھاڑ میں جاؤ میری طرف سے۔" وہ غصے سے کہتی فون بند کرنے لگی تھی جب بدر نے اسے روکا۔ "سالگرہ مبارک ڈیئر کزن!" وہ ٹھہر گئی۔ پھر خوشگواری سے ہلکا سا مسکرا دی۔

"تمہیں بھی سالگرہ مبارک مائی ڈیئر اسٹیپ کزن!" وہ ہنس دیا۔ دل سے۔۔ محبت سے۔۔ یہ لڑکی اسے دل و جان سے عزیز تھی۔ اس کی زندگی کا دائرہ اس لڑکی، اس کے دادا اور روفی کے گرد ہی تو گھومتا تھا۔ بہت محدود سے لوگوں کے گرد گھومتا زندگی کا یہ دائرہ بہت چھوٹا سہی مگر خوبصورت اور پر خلوص تھا۔ اپنوں سے دور تنہا اجنبی سی سر زمین پر اگر کبھی یہ اجنبیت کم ہوتی تھی تو وہ انہی کی بدولت ممکن تھا۔

☆☆☆

"آپ کو جو ای میل اس رات موصول ہوئی تھی۔ اسے بھیجنے والے کو ٹریس کیا گیا ہے تو ٹھیک شام سات بجے اسی ہوٹل سے سگنلز ملے ہیں۔ ایملی کا کمرہ نمبر 601 تھا۔ رکارڈز کے مطابق ایملی وہاں اکیلی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ ہوٹل کے تمام بلز اس نے خود کلیئر کیے ہیں۔ بعد ازاں میں نے ہوٹل کے کیمراز دیکھے ہیں تو کچھ حیران

کن معلوم ہوا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے زیاد نے چہرہ ترچھا کر کے برابر میں بیٹھی ازابیلا کو دیکھا۔ اپنے کانوں میں لگے ایئر پوڈز کی وجہ سے وہ باآسانی مسٹر اینڈریو کی بھاری اور مردانہ آواز سن سکتے تھے۔

"ایمِلی اسی رات آٹھ بجے ہوٹل سے نکل گئی تھی۔ وہ ٹیکسی میں گئی ہے۔ آخری بار اسے ہوٹل سے تیس کلومیٹر دور ایک سڑک کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے جہاں وہ ٹیکسی سے اتر جاتی ہے۔ آگے کوئی کیمرا نہیں ہے۔ اب آپ کیا کہتی ہیں؟" وہ خاموش ہوئی۔ اسکرین پر نظریں جمائے ازابیلا کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ گھنے کالے بالوں کو پیچھے لے جا کر کیچر میں قید کیا ہوا تھا جبکہ باقی بال کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ نگاہیں اسکرین پر ٹکی تھیں۔ ناک پر بڑا گول شیشوں والا چشمہ ٹکا تھا۔ نکھرا نکھرا سا چہرہ، کھڑے نقوش اور چمکتی پیشانی۔۔ وہ مکمل اپنے کام کی طرف متوجہ بارعب اور پرکشش لگ رہی تھی۔ اسے مسٹر اینڈریو کے روپ میں سامنے آنا یقیناً بہت اچھا لگا تھا۔

"وہ ٹیکسی جس پر ایمِلی آخری بار سوار ہوئی، اسے ٹریس کریں۔" ازابیلا نے پرسوچ نگاہیں سڑک پر ٹکائے کہا۔ سعاد سر کو ذرا سی جنبش دیتی تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگی۔ صرف ایک منٹ بعد وہ ازابیلا سے کہہ رہی تھی۔ "رچرڈ نامی بندے نے تقریباً دو سال پہلے یہ ٹیکسی خریدی۔ میں ایڈریس بھیج رہا ہوں، آپ اس سے مل سکتی ہیں۔" اس کی بات مکمل ہوتے ہی ازابیلا کو میل موصول ہوئی۔ اس نے لوکیشن آن کر کے مقام دیکھا۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی اپنی پوری رفتار سے سڑکوں پر دوڑتی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح اپنے وقت پر آفس پہنچ گیا تھا۔ خیام میٹنگ روم میں تھا اور وہ باہر ہر آنے جانے والے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب وہ اس کام سے بےزار آ کر منہ کھولے بھرپور جمائی لے رہا تھا، اس کی نگاہیں اندر آتے جیم پر ٹکی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا رخ دیوار کی طرف کر کے اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کی۔ جیم

اردگرد نگاہیں دوڑاتا اس کی تلاش میں آگے نکل گیا۔ وہ گہری سانس لیتا دیوار پر سر ٹکا گیا۔ اور پھر اس کی قسمت بری تھی بہت بری۔ اس نے خیام کی سابقہ سیکریٹری کے ساتھ جیم کو اس کی طرف آتے دیکھا۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

''ہیلو بدر۔ کیسے ہو؟ میری کالز کا جواب کیوں نہیں دے رہے تم؟'' وہ خوشدلی سے کہتا آگے بڑھا۔ بدر فوراً دو قدم پیچھے ہٹا۔ جیم کے لبوں سے مسکراہٹ دھیرے سے غائب ہوئی۔ ''کیا ہوا ہے بدر؟''

''یہاں کیوں آئے ہو؟'' بدر نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال داغا۔

''تم سے ملنے۔ تم کئی دنوں سے میری کالز نہیں اٹھا رہے تھے، مجھے فکر ہو رہی تھی تمہاری۔''

''کام بتاؤ جیم!!'' اس کی آواز میں سختی تھی۔ جیم نے گہری سانس لی۔

''مارک سر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے تمہارا پیغام مل گیا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔'' جیم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''بدر پلیز آج ہی مل لینا ان سے۔ تم میری مجبوری سمجھ سکتے ہو۔ پلیز!'' وہ التجا کرتی نگاہوں سے اسے دیکھتا پلٹ گیا۔ بدر لب دانتوں میں دبائے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اس لڑکے کو اپنا دوست کہتا تھا۔ ایک اچھا دوست!! مگر شاید یہ دوستی نہیں وقتی لگاؤ تھا۔ جیم نے اسے استعمال کیا۔ وہ استعمال ہو گیا اور جب اسے معلوم ہوا تو اس نے جیم سے تعلق ختم کر لیا۔ ہاں واقعی یہ دوستی نہیں تھی۔ اگر یہ دوستی ہوتی تو یقیناً وہ اس کے پیچھے جاتا۔ اس سے پوچھتا اس لڑکی کا کیا بنا جو بقول اس کے، اس کے باس کی محبت تھی؟ کیا وہ زندہ ہے اور اگر ہے تو کس حال میں؟! وہ اس سے کہتا کہ وہ اسے یقین دلائے اس میں بدر کا کوئی قصور نہیں۔ وہ ہرگز اس لڑکی کا مجرم نہیں ہے۔ اس کے تمام اندیشے بس اندیشے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ اس سے کہتا کہ۔۔۔ اسے یقین دلایا جائے کہ وہ جسے دوست کہتا تھا، اس کے ہاتھوں استعمال نہیں

ہوا!!

اس نے سختی سے لب بھینچے اپنا سر جھکایا تھا۔ جیم اس سے التجا کر کے گیا تھا۔ اگر وہ مارک سے نہیں ملے گا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر عین ممکن ہے مارک جیم کو نوکری سے نکال دے۔ وہ یہ نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ اسے مان رکھنا آتا تھا۔

"سر، مجھے جانا ہے۔" اس نے کان میں لگے آلے کو آن کرتے ہوئے کہا تھا۔ مڑ کر شیشے کے دروازے کے پار صوفے پر بیٹھے خیام کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، وہ اپنے سامنے بیٹھے اپنے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا۔ سنجیدگی سے ان پر نگاہیں ٹکائے اس نے غیر محسوس انداز میں سر کو ذرا سی جنبش دی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ اسے اجازت مل گئی تھی۔ اس نے پینٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالی پھر اسے ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اسے مارک سے ملنے جانا تھا۔

☆☆☆

ازابیلا کی جانب سے فارغ ہو کر اس نے نگاہیں اٹھا کر سامنے اسکرینوں پر دیکھا جہاں ایک طرف وارلڈ کے آفس کا منظر تھا جبکہ دوسری طرف خیام کے آفس کا۔ وارلڈ آفس میں نہیں تھے، البتہ خیام ابھی ابھی ہی آفس میں آیا تھا۔ اس نے میز کی دراز سے اسنیکس اور چاکلیٹ نکال کر اپنے سامنے رکھے پھر کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک چاکلیٹ اٹھا کر اس کا ریپر اتارنے لگی۔

"تو آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو یقین نہیں ہے کہ اسکائے ٹو مارک بار بار اکے انڈر رہے ہے؟" اس نے چاکلیٹ کو آہستہ سے دانتوں سے کاٹا۔ کرسی سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھے خیام نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہیں جو یہ ثابت کریں کہ مارک ہی اسکائے ٹو کا بنانے والا ہے۔ جندل کی فراہم کردہ

معلومات کے مطابق آج رات اسکائی ٹو اپنے پراجیکٹ "ڈی ڈبلیو" کا افتتاح کرنے جارہا ہے۔ یعنی۔۔اس شخص نے اسکائی ٹو اور ڈی ڈبلیو کے متعلق ایک حد تک مجھے درست معلومات فراہم کی ہیں۔ مگر غور کرو سعاد!" وہ پرسوچ نگاہوں سے سامنے دیکھتا آگے ہو کر بیٹھا۔ "وہ لڑکے جو ہمیں لائبریری میں ملے تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم پکڑنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس نے کہا تھا اسے ہمارے پیچھے اسٹیون بار بار انے بھیجا ہے۔ ضرار کو کل رات ملنے مائک آیا تھا۔ تمہارے پیچھے آنے والا بھی مائک تھا۔ اس شخص کے قول کے مطابق اسکائی ٹو مارک کے انڈر ہے۔"

"تو۔۔آپ کہہ رہے ہیں کہ اس سب میں یہ تینوں ہی ملوث ہیں؟" منہ کی طرف جاتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

"سعاد کیا ہو اگر یہ سب صرف شطرنج کی بساط پر بکھرے مہرے ہوں۔ عام سے سپاہی جنہیں بادشاہ اپنی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں آگے کر دے۔ یعنی۔۔کوئی ایسا شخص جو اسٹیون، مارک اور مائک کو صرف خود کو کور کرنے کے لیے استعمال کر رہا ہو؟"

"کیا ابراہم وارلڈ؟"

"شاید۔۔کوئی ایک ثبوت بھی اس کے خلاف نہیں جا رہا سعاد! یہی چیز ہے جو اسے مشکوک کر رہی ہے۔"

"ہمیں اسے ثابت کرنے کے لیے پہلے ان تینوں سے نبٹنا ہو گا۔ یقیناً کہیں نہ کہیں جا کر ہم اس شخص سے ملیں گے جو ان کی ڈوریاں ہلا رہا ہے۔"

"تو ہم اسٹیون سے شروع کرتے ہیں۔" وہ رکا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر سر ہاتھوں میں گرا یا۔ ذہن کی اسکرین پر تیزی سے کئی مناظر آئے۔ ڈیوڈ کا قتل، اس کا ڈیوڈ کی آفس جانا، وہاں سے اس بوڑھے شخص کے گھر کا پتہ ملنا اور پھر ہاں وہی بوڑھا شخص! "اس نے کہا تھا "تمہیں نہیں لگتا کہ یہ دوستی اب خطرناک حد تک دشمنی میں بدل چکی ہے۔"

یہی سعاد یہی!" اس نے تیزی سے سر اٹھایا۔ "اسٹیون اور وارلڈ کے درمیان دشمنی۔ اگر یہ بات سچ ہے تو عین ممکن ہے کہ اسٹیون کے بھیجے گئے وہ آدمی میرے پیچھے تھے۔ غور کرو دو لوگوں کے مابین وہ مضبوط رشتہ جسے دوستی کا نام دیا گیا آخر کیونکر ایک جھٹکے میں بکھر گیا؟ وہ بھی اسکائے ٹو کے قیام کے بعد؟! یقیناً یہ سب اسکائے ٹو کی وجہ سے ہوا۔ ہو سکتا ہے وارلڈ نے اسکائے ٹو کی مخالفت کی ہو، تبھی اسٹیون کا اصل ٹارگٹ یہ کمپنی ہے! ڈیوڈ کا قاتل اسی کمپنی میں ہے۔ یعنی اسٹیون کے بھیجے گئے آدمی وارلڈ گلاس کمپنی کے مینیجر کے تعاقب میں تھے"!!

"رکیں رکیں۔ وہ آپ کے پیچھے اپنے آدمی کیوں لگائے گا؟"

"یہی ہمیں جاننا ہے۔" اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچیں۔ "ایک اور بات اگر وہ میرے پیچھے تھے تو وہ اس وقت کیوں حملہ کرتے ہیں جب میرے ساتھ جندل تھا اور کیوں وہ جندل کو بھی یرغمال بنا لیتے ہیں؟"

"استاد جی میرا امتحان مت لیں۔ آپ کے الفاظ دہراتی چلوں کہ ایسی صورت میں دشمن کا مقصد ایک عام آدمی کو آپ کے خلاف استعمال کرنا ہوتا ہے۔ یعنی وہ تکلیف آپ کو نہیں اس آدمی کو دے گا۔ جو یقیناً آپ نہیں چاہیں گے!" اس کی بات سن کر خیام ہلکا سا مسکرا دیا۔ پھر اپنا موبائل اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں؟"

"دیکھتے ہیں کہ ڈیوڈ کے قتل میں اسٹیون ملوث ہے یا نہیں؟!" موبائل جیب میں ڈال کر کہتا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سعاد نے گہری سانس لے کر چاکلیٹ کا بقیہ حصہ منہ میں ڈال کر ہاتھ جھاڑے پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ اسے اب بہت سارے کام کرنا تھے۔

☆☆☆

وہ آدھا گھنٹہ پہلے نیند سے اٹھا تھا مگر بستر سے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ سر بوجھل بوجھل سا تھا۔ آنکھوں کے آگے منظر دھندلا رہا تھا۔ طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ کل رات اس نے ایک بار پھر خطرناک حد تک شراب نوشی کی تھی۔ اور اب اس کے آثار دھیرے دھیرے اس پر ظاہر ہو رہے تھے۔ آخر کچھ دیر بعد ہمت کر کے وہ چکراتے ہوئے سر کو سنبھال کر بیڈ سے اترا۔ دیوار کا سہارا لے کر چلتا ہوا وہ کمرے سے نکلا۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ چال میں واضع لڑکھڑاہٹ تھی۔

کچن میں آکر اس نے فریج کھولا اور وہاں سے سرکے کی بوتل نکالی۔ ڈھکن ہٹایا اور وہیں کھڑے کھڑے بوتل منہ سے لگالی۔ سرکہ فائدہ مند ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر میں اس کا چکراتا سر کچھ سنبھل چکا تھا۔ طبیعت ایک حد تک بحال ہو چکی تھی۔ وہ صوفے پر بے ڈھب انداز میں گرا لمبی سانس لے رہا تھا جب گھر کی گھنٹی بجی۔ وہ بے زاری سے بڑبڑایا پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ پوچھنے کی زحمت کیے بنا اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے کوئی لڑکی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرادی۔

"ہم بات کرسکتے ہیں؟" اس نے اس لڑکی کے برابر میں کھڑے لڑکے کو دیکھا۔ "آپ کو اسے ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی مس۔" وہ خباثت سے مسکرایا۔ زیاد اس کا منہ توڑنے کے لیے آگے بڑھنے لگا تھا جب ازابیلا نے اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے روکا۔

"اندر چل کر بات کریں؟"

"آیئے آیئے۔" وہ دروازہ کھول کر ایک طرف ہوا۔ وہ دونوں اندر آئے۔ انہیں صوفے پر بٹھا کر وہ اپنے لیے کرسی ڈھونڈنے چلا گیا۔ انہوں نے طائرانہ نگاہ اس چھوٹے سے گھر پر ڈالی جسے انہوں نے کباڑ خانہ سمجھنا مناسب سمجھا۔ ٹوٹا پھوٹا برائے نام قدیم فرنیچر، کچن میں شیلف پر بے شمار شراب کی بوتلیں، گرد آلود دیواریں اور فرش۔ ہر

طرف بکھرا ہوا سامان جسے بہت عرصے سے کسی نے ہاتھ تک لگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ گھر کا جائزہ لینے میں مصروف تھے کہ اسی اثناء میں انہیں کرسی کے گھسیٹنے کی آواز آئی۔ وہ آدمی کمرے سے برآمد ہوا۔ اپنے ساتھ کرسی کھینچ کر لایا تھا جو کرسی تھی بھی یا نہیں، وہ شک میں پڑ گئے تھے۔ وہ ان کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔

"تو کہیے مس، ہم پر نظرِ کرم کرنے کی نوبت کیسے آئی؟" آنکھوں سے اور لہجے سے وہی خباثت ٹپک رہی تھی۔ پیلے دانتوں کی نمائش کروانا ضروری سمجھا گیا تھا۔ زیاد بمشکل خود پر ضبط کرتا ازابیلا کے کان کے پاس جھکا تھا۔ "اب اگر اس نے کچھ بکا تو یقین کرو میں سب کچھ بھول کر اس کا منہ توڑ دوں گا!" ازابیلا نے اس کی سرگوشی کو نظر انداز کر کے اپنے موبائل کی اسکرین اس شخص کے آگے کی۔

"اس لڑکی کو جانتے ہو؟ سوچ کر جواب دینا!" وہ بغور موبائل کی روشن اسکرین پر نظر آتی تصویر کو دیکھنے لگا۔ تصویر میں کوئی تھائی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ فوراً نفی میں سر ہلا گیا۔

"یہ آخری بار تمہاری ٹیکسی میں دیکھی گئی ہے۔ یہ ایک مرڈر کیس ہے۔ لڑکی بری طرح گھائل تھی۔ اپنے آخری لمحات میں وہ حد سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ اس پر جسمانی تشدد کر کے اسے پُل سے نیچے پھینکا گیا ہے۔ اس لڑکی کی لاش اسی پُل کے نیچے پائی گئی ہے جہاں اسے آخری بار تمہاری ٹیکسی میں دیکھا گیا ہے۔ اب بھی تم یہی دعوہ کرو گے کہ تم نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا؟" اس کی نگاہیں اس شخص کے ماتھے پر چمکتی پسینے کی بوندوں پر تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ جسم دھیرے دھیرے تھر تھرا رہا تھا۔

"مم۔۔۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔ مم۔۔۔ میں نے بس حکم کی تعمیل کی۔" وہ اپنے خوف پر قابو پاتا بمشکل بول سکا تھا۔

"کس کے حکم کی؟"!

"میں نہیں جانتا۔ مجھے ایک کال موصول ہوئی، جس میں مجھے اس لڑکی کو ہوٹل سے اس پُل تک لانے کا کہا گیا۔ مجھے بھاری رقم دی گئی تھی۔ مم۔۔ میں نے اسے نہیں مارا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ گڑگڑایا۔

"وہ نمبر ہے تمہارے پاس؟" وہ آدمی جلدی سے اٹھا اور اپنا موبائل لایا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں نمبر اسے نوٹ کروایا۔

"لڑکی کو پُل تک چھوڑ کر تم فوراً وہاں سے چلے گئے؟ کچھ دیکھا، کچھ سنا؟"

"وہ۔۔۔ وہ اسے لے کر جا رہے تھے۔۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ میرا یقین کرو اس سب میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" وہ تقریباً رو دینے کو تھا۔ وہ دونوں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجھے پولیس کے حوالے مت کرنا۔۔۔ وہ مجھے مار دیں گے۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔" وہ دونوں اس۔ کی التجاؤں کو نظر انداز کرتے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہوتے ہی اس کی التجائیں تھم گئیں۔

☆☆☆

"ہم ڈیوڈ کے کیس کی تفتیش شروع کریں گے!" اس نے سنجیدگی سے کہہ کر ایک نظر دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے لوگوں پر دوڑائی جو اس کی بات پر اچھنبے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ جانتے ہیں اسکائے ٹو کے آدمی کمپنی میں بھی ہیں۔ وہ آپ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ خیام! وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں!!" وہ اس کے کان میں دبا دبا سا چلائی تھی۔

"سر آپ وارلڈ سر کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ میں نہیں کرنے دوں گا آپ کو یہ۔ آپ اپنے اور میرے مستقبل کے ساتھ کھیلنے جا رہے ہیں سر!!" بدر کی آواز ذرا بلند ہوئی تھی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

"لیکن سر۔۔۔ ابراہم سر نے تو منع کیا تھا۔" ایک لڑکا منمنایا۔ وہاں بیٹھے تمام لوگوں نے اس کی تاکید میں سر ہلایا۔

"وارلڈ سر سے میں خود بات کرلوں گا۔ مگر تب تک میں چاہوں گا کہ آپ سب اسے میرے لیے راز رکھیں۔"

"ہاں بالکل یہ لوگ آپ کا راز دل سے لگا کر رکھیں گے۔ سینے میں دبائے قبر میں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ واللہ خیام! کیوں دماغ گھمارہے ہیں؟"!

"براہ مہربانی انہیں یہ بھی بتادیجیے گا کہ بدر آپ کے ساتھ اس میں بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی نوکری بہت عزیز ہے!" دونوں کی آوازیں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ سامنے بیٹھے ورکرز اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے تھے۔ عجب شور سا پیدا ہوگیا تھا۔ اس نے سختی سے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹا۔

"ہم شروع کہاں سے کریں گے سر؟" ایک لڑکی نے سوال اٹھایا۔ سب خاموش ہوگئے۔ اس نے گہری سانس لی۔

"آپ سب ڈیوڈ کے قتل سے پہلے اس کے رویے پر غور کریں گے۔ اس کے مزاج میں کوئی خاص بدلاؤ؟ وہ کس پر کام کر رہا تھا؟ کوئی چیز جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو؟ سب کچھ!! مجھے ایک ایک تفصیل چاہیئے۔" اس کے حکم پر سب اثبات میں سر ہلا گئے۔

کچھ دیر بعد وہ میٹنگ روم سے نکل کر راہداری میں چلتا اپنے آفس کی طرف جارہا تھا۔ کانوں میں وہ دونوں مسلسل چیخ رہے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کو ہلکا سا دبایا تھا۔ وہ بہت جلد سر درد کا مریض بننے والا تھا۔ یقیناً!!

☆☆☆

وہ بار بارا کمپنی کے سامنے گاڑی پارک کر رہا تھا جب اس کی سماعت سے خیام کی آواز ٹکرائی تھی۔ "ہم ڈیوڈ کے کیس کی تفتیش شروع کریں گے!" وہ یقیناً اس سے مخاطب نہیں تھا۔ اس کا انداز حاکمانہ تھا۔ وہ حکم دے رہا تھا۔ اور یقیناً یہ حکم کمپنی کے ایمپلائیز کو مل رہا تھا۔ اور اگر ایسا ہو رہا تھا تو یقیناً غلط ہو رہا تھا۔ اپنی طرف سے اس نے بھرپور مزاحمت کی تھی مگر خیام فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اپنی بات سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا، وہ جانتا تھا۔

"تفتیش کرنی ہے تو خود کریں ناں سر! سب کو مت گھسیٹیں اس میں، ہمارے مستقبل کا سوال ہے۔" وہ اپنی دھن میں بولتا راہداری میں کھڑا لفٹ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ارد گرد کھڑے لوگ حیرت سے مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے تھے جو ان کے خیال میں خود سے باتیں کرنے میں مگن تھا۔

"میں تمہارا باس ہوں بدر! تم میرے باس بننے کی کوشش مت کرو!" اور ساتھ ہی دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا لفٹ میں چلا گیا۔ لفٹ کا آہنی دروازہ بند ہوا۔ لفٹ اوپر کی طرف اٹھنے لگی۔ تیسری منزل پر لفٹ رکی۔ آہنی دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر آ گیا۔ اسے جیم کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔

"اوہ بدر۔ شکر تم آ گئے۔ بہت شکریہ یار۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ بدر مسکرا بھی نہ سکا۔ جیم نے مارک سے اجازت لے کر اسے اندر جانے کا کہا۔ وہ آفس میں آ گیا۔ آفس میں قدم رکھتے ہی اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ آفس کا ماحول یخ ٹھنڈا تھا۔ مارک سامنے ہی میز کے پار رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر نظریں جمائے، سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس، سفید رنگت اور کھڑے نقوش۔۔ وہ بلاشبہ پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ سنجیدہ اور رعب دار۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا میز کے پاس آیا۔

"آؤ بدر بیٹھو۔" اس نے مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ کو جو بات کہنی ہے کہیں۔" دایاں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، کرسی سے ذرا ٹیک لگا کر کھڑا، چہرے پر بے تحاشا سنجیدگی اور لہجے میں سختی لیے وہ کہیں سے بھی "بدر" نہیں لگ رہا تھا۔ مارک نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا پھر سر کو ذرا جنبش دی۔ "ٹھیک ہے جیسے تم چاہو۔" وہ مسکراتے ہوئے آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر میز پر رکھے۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "جیم کو اس لڑکی کا ایڈریس تم نے دیا

تھا؟"

"جب جانتے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہیں؟" دوٹوک انداز میں جواب دیا گیا تھا۔ اس کا وقت ضائع کیا جارہا تھا، اسے یہ بالکل منظور نہیں تھا۔ پہلے ہی خیام سر نے دماغ گھمایا ہوا تھا اس کا۔

"میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ کام کرو۔ میرے آفس میں، میرے ایمپلائے بن کر!" بدر نے سنجیدگی سے دائیں ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "میں وارلڈ گلاس کمپنی میں اپنی جاب سے بہت خوش ہوں مسٹر مارک"!

"میں تمہیں چار گنا زیادہ سیلری دوں گا۔ وہاں تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک گارڈ یا ایک ڈرائیور؟ یہاں تمہارے انڈر کئی گارڈز اور ڈرائیور ہونگے!" اس کی آنکھوں میں وہ انوکھی چمک بدر کو بہت بری لگی تھی۔ وہ آگے آیا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھے جھکا۔

"چار گنا زیادہ پیسے منہ پر مار کر ہر وہ کام کروائیں گے جو ایک شریف انسان کو ہرگز نہیں کرنا چاہیئیں۔ میں تو اس پر آپ سے معذرت بھی نہیں کروں گا!" وہ مسکرایا۔

"اتنے بدگمان کیوں ہو بدر؟" مارک نے نرمی سے پوچھا۔

"کیونکہ خیام سر کہتے ہیں، جو آپ کو پیسے سے خریدنا چاہے وہ آپ کو خرید تا بعد میں ہے پہلے اپنی گندی ذہنیت اور مکار چہرے کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا، اور خیام سر کو ایسے لوگوں سے نفرت ہے!"

اس نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ مارک نے بھنویں اکھٹی کیے اسے دیکھا۔ "آئندہ اس ارادے سے میرے آس پاس بھی مت بھٹکیے گا۔۔!" ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر وہ پلٹ گیا۔ مارک خاموشی سے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔

وہ آفس سے نکل کر باہر کھڑے جیم کو نظر انداز کر کے لفٹ کی طرف بڑھا۔ لفٹ کا آہنی دروازہ کھلا، وہ اندر گیا اور دروازہ بند ہوا۔

"فٹے منہ تمہارا بدر۔ یہ کیا بکواس کر کے آئے ہو۔ جنگلی انسان، نکمے نالائق خیام سر کے فرشتوں کو بھی نہیں خبر ہو گی کہ انہوں نے یہ سب کب کہا ہے!" اس نے جھلا کر زوردار لات دروازے پر ماری۔ اس کا دل کر رہا تھا وہ اپنا سر پیٹ ڈالے۔ یا پھر اس لمبی زبان کو کاٹ ڈالے۔ یا کم از کم رکھ کر دو تھپڑ تو جڑ ہی دے خود کو۔ "دادا ٹھیک کہتے ہیں میں بہت بگڑتا جا رہا ہوں۔ پنگے باز بدر جو شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈال آیا ہے۔ کیا ضرورت تھی اتنی بکواس کرنے کی۔ بدر میرا تمہیں لعنت بھیجنے کا دل کر رہا ہے۔ جنگلی بدر، جاہل بدر!" اس نے سختی سے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑے۔ پھر زوردار لات لفٹ کے دروزے کو مارنے کے لیے ٹانگ اٹھائی۔ لفٹ رکی اور دروازہ کھل گیا۔ اس نے ٹانگ وہیں روک لی۔ باہر کھڑے لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑایا۔ ٹانگ فوراً نیچے کی۔ اپنے بال ہاتھوں سے جلدی سے ٹھیک کیے اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کھڑے لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے رہے۔ یقیناً وہ کوئی دیوانہ تھا!!

باہر آ کر گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے بے اختیار رونا آیا تھا۔ مگر اسے رونے کا وقت نہیں ملا تھا۔ خیام کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کہاں ہو مصعب؟"

"آپ کے حریفوں کی کمپنی کے باہر کھڑا ہوں۔" اس نے پاوں میں پڑے چھوٹے سے کنکر کو ٹھوکر ماری۔

"وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں آپ کی جاسوسی کر رہا ہوں، آپ میری جاسوسی کرنے کی کوشش مت کریں سر!" اس نے تنک کر کہا تھا۔

"گاڑی چاہیے مجھے!!" خیام نے اس کے جواب کو نظر انداز کیا۔

"کیوں؟ کہاں جانا ہے؟"

”مصعب۔۔۔ مجھ سے سوال مت کیا کرو!!“ اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

”تھوڑی دیر پہلے آپ بھی تو کر رہے تھے۔“ اس نے آنکھیں گھمائیں۔

”فوراً آفس پہنچو“!

”مجھے تھوڑی دیر ہو جائے گی۔ آپ ٹیکسی کروالیں۔“ اس نے بے فکری سے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دوسری طرف خیام چند پل کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”مصعب!!“ اس کے نام پر زور دیا گیا تھا۔

”آرہا ہوں، آرہا ہوں۔ کیا یاد کریں گے کیسا ڈرائیور ملا ہے۔“ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈال چکا تھا۔ جبکہ خیام نے اب مزید کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اسے اب واقعتاً سر میں درد ہونے لگا تھا!!

☆☆☆

یہ ویران کھنڈر نما جگہ تھی۔ عمارتیں ابھی تعمیر ہو رہی تھیں۔ صبح کے وقت تو یہاں یقیناً مزدوروں کا آنا جانا ہوتا ہو گا مگر اس وقت یہاں کسی ذی نفس کی موجودگی غیر یقینی تھی۔ گاڑی جھٹکے سے رکی۔ وہ دونوں گاڑی سے باہر نکلے۔ ان کے سامنے زیر تعمیر ایک عمارت تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ کچا فرش اور کچی دیواریں۔ جگہ جگہ سیمنٹ پڑا تھا۔ اینٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں موجود موبائل کی جلتی روشنی کی مدد سے وہ اس اندھیرے میں ارد گرد کا جائزہ لیتے احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے

”تم یہاں دیکھو، میں اوپر دیکھتا ہوں۔“ زیاد کے کہنے پر اس نے سر کو جنبش دی۔ وہ اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام کمرے دیکھ لیے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ عمارت خالی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں زیاد نیچے آتا

دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہاں کوئی نہیں ہے۔ مسٹر اینڈریو آپ کو یقین ہے سگنلز یہیں سے آرہے ہیں؟"

"بالکل یہی مقام ہے۔ موبائل آس پاس ہی ہے۔" اس نے یقین سے کہا تھا۔ زیاد ازابیلا کو لیے باہر کی طرف بڑھا۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر رکا۔ چونکہ اندھیرا ہلکا ہلکا پھیل رہا تھا اسی لیے اس نے گاڑی بند نہیں تھی تاکہ ہیڈلائٹس کی روشنی سے کچھ مدد ملتی رہے۔ وہ روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی اور وہاں کسی کا سایہ نظر آرہا تھا۔ اس نے ازابیلا کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے وہیں رہنے کا اشارہ کیا پھر خود آگے بڑھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ باہر آیا۔ وہ شخص دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ پیچھے کی طرف سے آیا اور اسے اپنی حراست میں لے لیا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی چیخ دبائی۔

"کوئی آواز نہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" اسے تسلی دے کر زیاد نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹایا۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ وہ دونوں آگے بیٹھے تھے۔ ازابیلا اس سے اس کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے تمام سوالوں کا جواب زیاد کی سخت نظروں کو دیکھ کر انسانوں کی طرح دے رہا تھا۔

"اس شخص کو جانتے ہو؟" ازابیلا نے موبائل کی اسکرین اس کے سامنے کی۔ لڑکے نے بغور تصویر کو دیکھا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے۔ "تم نے اسے کسی لڑکی کو لانے کا کہا تھا۔ یاد ہے؟" وہ لڑکا خاموش رہا۔ سہمی ہوئی نظروں سے زیاد کو دیکھا تو اس کی گھوری کو دیکھ کر وہ مزید سہم گیا۔

"مجھے حکم ملا تھا۔ میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔ میں بس اس لڑکی کو ان کے پاس لے کر گیا تھا۔ میں نے اسے نہیں مارا۔ میں قاتل نہیں ہوں۔" وہ گڑگڑایا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ازابیلا کو لگا تھا کسی نے اس کے سر پر پہاڑ

توڑ دیا تھا۔ وہ سناٹے میں رہ گئی تھی۔ زیاد نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی گردن کو دبوچا۔ ”کس کو مارا ہے تم لوگوں نے؟“

”ای۔۔۔ ایملی۔۔۔ وا۔۔ واٹسن۔“ اس کے گال پر زوردار مکا پڑا۔ وہ اوندھے منہ سیٹ پر گرا۔ ہونٹ کے کنارے سے خون بہنے لگا۔

”کس نے مارا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔۔ مجھے بس حکم ملا تھا۔ انہوں نے میرے بیوی بچوں کو یرغمال بنا لیا تھا۔ مجھے انہیں بچانا تھا۔ میں قاتل نہیں ہوں، میں نے اسے نہیں مارا۔۔“ وہ رو رہا تھا۔ زیاد تیزی سے باہر نکلا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اس لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکالا۔ ازابیلا اپنی جگہ سُن بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ سن نہیں پا رہی تھی۔ سماعت سے بار بار وہی الفاظ ٹکرا رہے تھے۔ ایملی مر چکی تھی۔ اس نے صرف ایملی کی موت کا جھوٹ بول کر اس ڈرائیور سے ساری بات اگلوائی تھی۔ مگر حقیقت یہ تھی اس کا جھوٹ بھی جھوٹ نہیں رہا تھا۔ ایملی ماری جا چکی تھی۔۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر گال پر گرا تھا۔

شیشے کے پار سڑک پر زیاد اس لڑکے سے مزید پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ جواب نہ دینے پر وہ اسے بری طرح مار رہا تھا۔ اس لڑکے کے پیٹ پر زوردار لات پڑی تھی۔ وہ قلابازیاں کھاتا سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچا۔ منہ سے تھوکوں کے ساتھ ساتھ خون بہہ نکلا۔ ہاتھ اور چہرہ بری طرح رگڑا گیا۔ اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے ٹوٹتے ہوئے جسم کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی۔ زیاد اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ ازابیلا کی نگاہ سڑک پر گرے خون پر پڑی۔ گرم اور لال انسان خون! اسی لمحے وہ ہوش میں آئی۔ تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی۔ زیاد نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا جب اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”وہ مر جائے گا زیاد۔۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ زیاد نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کا بازو پکڑے نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا بازو ازا کی گرفت میں تھا۔ سڑک پر گرا وہ لڑکا اٹھ کر بھاگنے لگا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے رہے۔ چپ چاپ، خاموشی سے!!

☆☆☆

”ایلسا کی حالت کب سے ایسی ہے؟“ وہ برتن سمیٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ کاونٹر پر چڑھ کر بیٹھی ملازمہ نے ناک بھوں چڑھا کر اسے دیکھا۔ ”دو سالوں سے۔ دو سالوں سے یہ وبالِ جان بنی ہوئی ہے۔“

”علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا؟“ وہ تمام برتن سینک میں ڈال کر اب انہیں دھونے کی تیاری کر رہا تھا۔

”نہیں۔ ویسے اچھا ہی ہے۔ بس تھوڑی مصیبت ہے لیکن عیش ہی عیش ہیں۔ اس کی وجہ سے میرا اور اس ڈاکٹر کا گھر چل رہا تھا۔ مارک سر بھاری رقم دیتے ہیں۔ مجھے اس کی خدمت کی اور اس ڈاکٹر کو اس کے علاج کی۔“ اس نے جوس کا گلاس منہ سے لگایا۔

”تو تم دو سال پہلے یہاں کام نہیں کرتی تھیں؟“

”کرتی تھی۔ پہلے میں کُک تھی پھر مجھے ایلسا کی خدمت پر مقرر کر دیا گیا۔ مجھے یہاں کام کرتے ہوئے سات سال ہونے کو ہیں۔“ اس نے جوس کا گلاس خالی کر کے شیلف پر رکھا۔

”واہ۔ اتنا لمبا عرصہ۔ پھر تو تم سب کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو گی۔“ اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے ٹوکری سے سیب اٹھایا۔ ”سب کچھ جانتی ہوں میں۔ تمہیں بتایا تھا ناں کہ مارک کا اپنی ماں کے ساتھ بالکل اچھا تعلق نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ یہ سب آپس میں بہت محبت سے رہتے تھے۔ اکثر اس گھر میں پارٹیز ہوتی تھیں۔ مہمان جمع ہوتے تھے۔ ابراہم وارلڈ کا نام سنا ہے؟“ اس نے رک کر جندل کو دیکھا۔ جندل نے نفی میں سر

ہلایا۔

"ارے اتنا مشہور آدمی ہے وہ۔ وارلڈ گلاس کمپنی کا مالک۔ اس کی بہت گہری دوستی ہے اسٹیون سر سے۔ وہ اکثر یہاں آتے تھے اپنی بیٹی کے ساتھ۔ اب تو آنا جانا کم ہو گیا ہے کیونکہ اسٹیون سر یہاں نہیں ہیں ناں۔"

"تو یہ سب اچانک کیوں بدل گیا؟"

"نہیں معلوم۔۔ بس اس دن وہ سب ہوا اور پھر سب بدل گیا۔" اس نے بے زاری سے سیب ایک طرف پھینکا۔ پھر زغند بھر کر جندل کے قریب آئی۔ "اس دن۔۔ اسٹیون اور ایلسا کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ ایلسا بہت زور زور سے اسٹیون پر چیخ رہی تھی۔ مارک اور مائک بھی وہیں کھڑے تھے۔ وہ کسی حقیقت کا سب کو بتانے کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ ہم سب ملازمین جمع ہو گئے تھے۔ مگر کوئی بھی کوئی بات نہیں سن سکا۔ ایلسا بس بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی کہ میں سب کی حقیقت بتا دوں گی۔ جبکہ اسٹیون، مارک اور مائک خاموش تھے۔ پھر اچانک ایلسا نے اپنا موبائل اٹھایا، وہ کسی کو کال ملانے لگی تھی کہ مارک آگے آیا۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھ سے موبائل چھینا، اسٹیون نے اسے زور سے تھپڑ مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گری۔ اس کا سر شیشے کی میز سے ٹکرایا۔ شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ ہم سب سہم گئے۔ ایمبولینس آئی۔ اور پھر کئی دنوں تک ان میں سے کوئی گھر نہیں آیا۔ ہفتے بعد تمام ملازمین کو فارغ کر دیا گیا۔ ایلسا مائک کے ساتھ گھر آئی۔ اپنا ناکارہ وجود لے کر!! مارک نے ہر ملازم کو نوکری سے نکال دیا۔ اسٹیون کم کم گھر آنے لگا۔ سب بدل گیا۔" اس نے گہری سانس لے کر اپنی بات مکمل کی۔

"تم کیوں یہاں ہو پھر؟"

"بتایا ناں۔۔ ایلسا کے لیے ہوں۔ اور ویسے بھی مارک سر بھاری رقم دیتے ہیں مجھے۔ کوئی بے وقوف ہی ہو گا جو اتنی بھاری رقم ملنے کے بعد اس واقعے کا کسی کے سامنے ذکر کرے گا۔ سب کو دولت سے مطلب ہے۔ مجھے بھی!!" وہ

جھٹکے سے بالوں کو کندھے پر ڈالتی جندل کا کندھا تھپتھپا کر باہر چلی گئی۔ وہ چپ چاپ بنا پلک جھپکے پانی کی بہتی دھار کو دیکھتا رہا۔ سب کچھ بہت الجھا ہوا تھا۔ مگر ایک بات واضع ہو چکی تھی۔ اسٹیون اور اس کے دونوں بیٹے مکمل طور پر اس کھیل میں شریک تھے۔ یہاں کوئی معصوم نہیں تھا۔ سب نے اپنے حصے کا گند پھیلایا ہوا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر سر جھکا گیا۔

☆☆☆

اس کی گاڑی اپنی پوری رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بدر گاہے بگاہے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے خیام پر نگاہ ڈال رہا تھا۔ سڑک پر نگاہیں ٹکائے چہرے پر سنجیدگی لیے وہ گہری سوچ میں گم تھا۔ بدر مسلسل خاموشی سے تنگ ہوا تو خاموشی توڑنے کا سوچ کر بول اٹھا۔ ”سر۔۔ آپ وارلڈ سر کے حکم کے خلاف صرف بیلا باجی کی وجہ سے جارہے ہیں؟“ خیام نے نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

”میں ایسا کیونکر کروں گا؟“

”بیلا باجی کا دل جیتنے کے لیے۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر لب دانتوں میں دباتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

خیام نے گردن ترچھی کر کے نگاہیں شیشے کے پار سڑک پر ڈالیں۔ ”مجھ سے سوال مت کیا کرو مصعب!“ بالکل وہی جواب جس کی وہ امید کرتا تھا۔ گہری سانس لے کر وہ سڑک کی طرف متوجہ ہوا۔ خیام گردن ترچھی کیے سائیڈ مِرَر پر نگاہیں ٹکائے بیٹھا تھا۔ سیاہ رنگ کی وہ جیپ مسلسل ان کے تعاقب میں تھی، اس کی توقع کے عین مطابق!

"ایملی مر چکی ہے سر۔" اس کی سماعت سے سعاد کی آواز ٹکرائی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔

"کیسے؟" گاڑی میں اس کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے سرکتیں اس کے کان پر ٹکیں۔ اس کے جبڑے تن گئے۔ اسے کسی اور کا یوں ہر وقت خیام کے ساتھ رابطے میں رہنا اچھا نہیں لگا تھا، بالکل بھی نہیں۔

"اس ڈرائیور نے جو نمبر دیا تھا، اسے ٹریس کر کے ایک لڑکے تک پہنچے ہیں جس نے ایملی کو ہوٹل سے نکالنے کا کہا تھا۔ لڑکے کے گھر والوں کو یرغمال بنا کر دھمکی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس لڑکے کے گھر والوں کو یرغمال بنایا تھا انہوں نے کوئی موبائل نمبر استعمال نہیں کیا۔ چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ البتہ سی سی ٹی وی کیمرا کی فوٹیج میں ان کی گاڑی نظر آئی ہے۔ گاڑی کا نمبر ٹریس کر لیا ہے۔ ایجنٹ 001 اور ازابیلا صبح وہاں جائیں گے۔"

"کسی بھی قسم کی صورتحال کے لیے تیار رہو۔" سنجیدگی سے کہا گیا۔

"اور آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟" سعاد کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی۔ بدر نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"سیٹ بدلو بدر!" بدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیا وہ مذاق کر رہا تھا؟ "جلدی!!" بدر نے سوال کرنے کا ارادہ ترک کر کے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی۔ ایک نگاہ سڑک پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے وہ فرنٹ سیٹ پر آیا جبکہ خیام نے فوراً سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسٹیئرنگ تھاما۔ یہ سب ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہوا تھا۔ خیام نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ بدر نے فوراً سیٹ بیلٹ لگائی۔

"سر سر آرام سے۔ رفتار کم کریں۔" وہ حواس باختہ ہو کر چلایا۔ گاڑی کی رفتار بڑھتی رہی۔ آگے موڑ آیا۔ خیام نے

تیزی سے موڑ کاٹا۔ بدر کی چیخیں بلند ہوئیں۔ گاڑی کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کی گاڑی کئی گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتی آگے بڑھ تھی۔ وہ کئی انجان سڑکوں سے گزرتے اپنی منزل سے دور نکل آئے تھے۔ خیام نے سائیڈ مِرَر میں دیکھا تو اب ان کے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ بدر نے حیرت سے اسے دیکھا، اسے اس وقت خیام ہوش و حواس میں نہیں لگا تھا۔

"وہ گاڑی کہاں ہے اس وقت؟"

"آپ سے دو کلو میٹر پیچھے۔ اگر آپ اسی رفتار سے اگلے موڑ پر بائیں طرف مڑیں اور وہاں سے یو ٹرن لیں تو دو منٹ تیس سیکنڈ میں آپ ان کے تعاقب میں ہونگے!" خیام نے سر کو ذرا جنبش دی۔ اور پھر سعاد کے کہنے کے مطابق اگلے موڑ پر وہ بائیں طرف مڑ گیا۔ ٹھیک دو منٹ تیس سیکنڈ کے بعد وہ اس سیاہ جیپ کو دیکھ سکتا تھا جو اس کے تعاقب میں تھی۔ ان کے درمیان دو مزید گاڑیاں تھیں۔ یعنی اس کے پکڑے جانے کے چانسز بہت کم تھے۔ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

"آآ۔۔ آپ کیا کر رہے ہیں سر؟" بدر نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم نے کبھی اپنا تعاقب کرنے والوں کا تعاقب کیا ہے مصعب؟!" آواز میں خوشگواری تھی۔ بدر کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ مگر اسے خیام کے ارادے کچھ کچھ سمجھ آنے لگے۔ گتھیاں سلجھنے لگیں۔

"آپ نے سب کو اپنے ارادے سے باخبر کیا کہ آپ ڈیوڈ کے کیس کی تفتیش کریں گے۔ ڈیوڈ کے قاتلوں تک یقیناً یہ بات پہنچی ہوگی اور وہ آپ کے تعاقب میں نکلے۔ آپ نے بروقت انہیں پکڑا اور اب آپ اپنے تعاقب کاروں کا تعاقب کر رہے ہیں تا کہ آپ ڈیوڈ کے قاتلوں تک پہنچ سکیں۔" وہ شہادت کی انگلی لہراتا ٹھہر ٹھہر کر بولتا خیام کا پلان دہرا گیا۔

"تم بہت دیر سے سمجھے مصعب!" جواباً بدر کندھے اچکا گیا۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ وہ سمجھ گیا تھا۔ خیام کو نہ سہی۔۔ خیام کا پلان ہی سہی!!

تقریباً آدھے گھنٹے تک سڑکوں پر ناکام ونامراد پھرنے کے بعد اس کے تعاقب کار اب واپس ہو رہے تھے۔ خیام نے بھی اپنی گاڑی ان کی تقلید میں واپسی کی راہ پر ڈال دی تھی۔ ٹھیک تیس منٹ پچیس سیکنڈ بعد ان کی گاڑی آہنی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ دروازے سے فاصلے پر کھڑی گاڑی میں بیٹھے بدر نے حیرت سے اس بلند عمارت کے ماتھے پر چمکتے نام کو دیکھا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ لب کھلے رہ گئے تھے۔

"آپ کہاں ہیں سر؟"

"بار بارا کمپنی کے باہر!" گاڑی میں اس کی آواز سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

اس نے جوس کا گلاس دائیں ہاتھ میں پکڑے بایاں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے نگاہیں نیچے دوڑائیں۔ نیچے شطرنج کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ سیاہ وسفید کپڑوں میں ملبوس زندہ وجاوید انسان اپنی اپنی جگہوں پر بت بنے کھڑے تھے۔ ان میں سے کوئی گھوڑا تھا، کوئی سپاہی، بادشاہ اور ملکہ۔ کھیل بھی وہی تھا اور مہرے بھی وہی ۔ چالیں چلنے والے بھی انسان ہی تھے بس ذرا فرق تھا۔ یہاں گرنے اور مرنے کے لیے بھی زندہ و جاوید انسان کھڑے تھے۔ وہ انسان جو سانسیں لے رہے تھے۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے، اور رگوں میں خون کی گردش جاری تھی۔ جن کے عین درمیان میں بساط کے باہر ایک آدمی بڑا سا ہتھوڑا لیے کھڑا تھا جسے دیکھتے ہی انسان کو اپنی روح فنا ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے جوس کا گلاس لبوں سے لگایا۔ کھیل بس شروع ہونے کو تھا۔

اس کے کوٹ کے کالر میں نسب سیاہ رنگ کا وہ چھوٹا سا کیمرہ یہ تمام منظر جندل اور خیام کو بھی دکھا رہا تھا۔

"تم یہاں کھڑے ہو۔ کھیل شروع ہونے والا ہے۔ نیچے نہیں آؤ گے؟" اس کے برابر میں کھڑے ہوتے آدمی نے مسکرا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے گلاس سے جھلکتے شراب کی بو نے اس کا سانس لینا محال کیا تھا۔ وہ بمشکل مسکرایا تھا۔ "یہاں سے نظارہ زیادہ اچھا ہے۔" مقابل خوشدلی سے مسکرایا۔

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ ویسے تمہیں اندازہ ہے کہ میٹنگ کب شروع ہو گی؟"

"ٹھیک گیارہ بجے!" اس نے کھل کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ سامنے کھڑے شخص نے سر کو جنبش دی پھر کھیل کی طرف متوجہ ہوا جو شروع ہو چکا تھا۔ ہر سُو پر اسرار سی خاموشی چھا گئی۔ سب اس دلچسپ کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ مہروں کے طور پر استعمال ہونے والے انسان اپنی جگہیں بدلنے لگے۔ ایک چال، دوسری اور پھر تیسری۔ سفید کو مات ہوئی۔ ہتھوڑا لے کر کھڑا شخص بساط کے اندر داخل ہوا۔ وہ اس کے ہر اٹھتے قدم کو گن رہا تھا۔ ایک۔۔ دو۔۔ تین۔۔ چار۔ وہ رکا۔ پلک جھپکی، ہتھوڑا بلند کیا۔ اور پھر سانس روکے وہ ہتھوڑا پوری قوت سے سفید لباس میں ملبوس اس شخص کے سر پر دے مارا۔ خون کا فوارہ اس کے سر سے دھار کی صورت میں نکلا۔ وہ شخص وہیں ڈھیر ہو گیا۔ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو گیا، دھڑکتا دل تھم گیا۔ سیاہ لباس میں موجود ایک شخص سامنے آیا اور اس مردہ شخص کو ٹانگوں سے پکڑا۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے کھیل سے باہر لے گیا۔ گھسیٹنے کی وجہ سے گاڑھے سرخ خون سے لمبی لکیر اس شخص کی تقلید میں کھنچتی چلی گئی۔ چالیں پھر سے شروع ہو گئیں۔ وہ اس سفاکانہ کھیل کو دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا تھا۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے وہ خون کی اس گاڑھی لکیر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اردگرد کھڑے تماشائیوں کے لیے کھیل ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ جبکہ اس کے لیے یہ کھیل لمحہ بہ لمحہ سفاک ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی نگاہوں کے سامنے تین لاشوں کو اٹھتے دیکھا تھا۔ یعنی گاڑھے سرخ خون کی تین

لکیریں!!

ایک بار پھر ہتھوڑا بلند ہو کر پوری قوت سے سامنے کھڑے شخص کے سر پر مارا گیا۔ خون کا فوارہ دھار کی صورت میں بہنے لگا۔ دھڑام کی آواز آئی۔ وہ شخص ڈھیر ہو گیا۔ اسے گھسیٹتے ہوئے کھیل سے باہر لے جایا گیا۔ گاڑھے سرخ خون سے ایک اور لکیر وجود میں آئی۔

"دلچسپ ہے ناں۔" اس کے برابر میں پراسراریت سے بھرپور سرگوشی کی گئی۔ وہ مسکرا دیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بجنے میں بس تین منٹ تھے۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے اپنے لبوں کو مسکراہٹ میں ڈھال کر وہ پلٹا۔ ایک لڑکے نے تیزی سے اس کا راستہ روکا۔

"کیا آپ کھیل سے سیراب ہو چکے ہیں؟" اس کے سوال پر وہ رک گیا۔

"ضرار ضرار جواب مت دینا۔ یہ کوڈ ہے۔" اس کی سماعت سے جندل کی آواز ٹکرائی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ سامنے کھڑے لڑکے نے سوالیہ انداز میں دائیں ابرو اٹھائی۔ "مجھے بس دو منٹ دو۔ وہ آدمی بے ہوش ہے۔" جندل کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ اس لڑکے کو دیکھ کر خفیف سا مسکرایا۔ لڑکے کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے ایک طرف کھڑے گارڈز کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ گارڈز مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتے اس کی طرف بڑھے۔

"سیراب ہونے کے لیے یقیناً ابھی بہت سا خون باقی ہے!" اس نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا تھا۔ گارڈز وہیں رک گئے۔ دوسری طرف جندل ساکت ہوا تھا۔ وہ لڑکا مسکرایا۔ "یقیناً! میرے ساتھ آیئے۔" وہ لڑکا آگے بڑھا۔ ضرار نے بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

"تم یہ کوڈ کیسے جانتے تھے؟"

”اتنا کچا کھلاڑی نہیں ہوں میں جندل یوسف زئی!“ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ جندل سر جھٹک کر رہ گیا۔

وہ آفس نما کمرے میں داخل ہوا جہاں اس سے پہلے سات سے آٹھ افراد بیٹھے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا دائیں طرف ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکا وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ وہاں بیٹھے لوگوں نے اسے دیکھ کر آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا اور پھر سیدھے ہو گئے۔ بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی آرہا تھا۔ یقیناً آنے والا اسکائے ٹو کا بانی تھا۔ وہ سانس روکے سامنے دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ کسی کے پاؤں اس سرخ کارپیٹ پر پڑے۔ اس کی نظریں اوپر کو اٹھیں۔ سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس پورے قد کے ساتھ کھڑا وہ مرد اسٹیون بار بارا تھا۔ ضرار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے گیا□ ۔ سب اس کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اسٹیون آگے بڑھا۔ وقار سے سربراہی کرسی پر بیٹھا۔ ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالی پھر لب وا کیے۔

”اسکائے ٹو میں آپ سب کو خوش آمدید! ہم اپنے پراجیکٹ ڈی ڈبلیو کا افتتاح کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہی آپ سب کو یہاں تک آنے کی تکلیف دینے کی وجہ ہے۔“ اس نے سر کو خم دیا۔ اس کے عقب میں دیوار پر نسب اسکرین روشن ہوئی۔ اسکرین پر سیاہ لباس میں موجود ایک پوری ٹیم کی تصویر نظر آرہی تھی جن کے سینے پر ڈی ڈبلیو کا بیج لگا تھا۔ چہروں پر ماسک چڑھے تھے، ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ سب کے سب اسلحے سے لیس تھے۔

”ڈی ڈبلیو پرائیویٹ سیکیورٹی سسٹم ہے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ تربیت یافتہ نوجوان ہے، جو ملک کی خفیہ ایجنسیز کو مات دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ دو ہفتے قبل ڈی ڈبلیو کے تربیت یافتہ نوجوان کارلوس کا مقابلہ انڈر ورلڈ کے ایجنٹ سے کروایا گیا اور نتیجتاً انڈر ورلڈ کے چار ایجنٹس مارے گئے۔ مختصر یہ کہ آپ سب کو ڈی ڈبلیو کے نوجوانوں

کی صلاحیتوں پر کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک باقاعدہ اور منظم فوج ہے۔ اس کے نوجوان نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ ہر طرح سے تربیت یافتہ بھی ہیں۔ یہ پراجیکٹ دس سال کے عرصے میں مکمل ہوا ہے۔ مجھے امید ہے آپ سب اس پراجیکٹ میں ہمارا ساتھ دیں گے اور اسے سراہیں گے۔" پورا کمرہ تالیوں سے گونج اٹھا۔ ضرار کی نگاہیں اسکرین پر پڑیں جہاں ایک کے بعد ایک تصویر آرہی تھی۔ ایک باقاعدہ منظم فوج! بڑے پیمانے پر قتل و غارت، دس سال کی محنت، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اعلیٰ تربیت یافتہ بھی، انڈر ورلڈ کے ایجنٹس۔۔۔ ایک ایک کر کے تمام الفاظ بار بار اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ مستقبل میں شہروں کو تباہ ہوتے دیکھ رہا تھا، قتل و غارت اور خونریزی ہونے والی تھی۔۔ جیسے ابھی وہ دیکھ کر آیا تھا۔ جیسے ابھی اس خونی کھیل میں خون بہہ رہا تھا۔ ایک اور بار ہتھوڑا بلند کیا گیا اور پوری قوت سے ایک شخص کے سر پر مار دیا گیا۔ سرخ گرم اور گاڑھا خون فرش پر بہنے لگا اور وہ شخص ڈھیر ہو گیا۔۔ یہ کھیل صرف ٹریلیر تھا، ایک چھوٹی سی جھلک! شروعات تو اب ہونے جا رہی تھی۔ قتل و غارت شروع ہو چکی تھی۔۔ اسی کے ساتھ ہی جنگ کا وقت بھی بس ہوا چاہتا تھا!!

☆☆☆

اس کی نگاہیں مسجدِ قرطبہ کے اونچے مینار پر ٹکی تھیں۔ وہی مینار جہاں سے اللہ اکبر کی صدائیں گونجا کرتی تھیں۔ وہی مینار جہاں اب خاموشی نے جالے بن لیے تھے۔ خوبصورت ترنم، دل کے تار چھیڑنے والے ساز گویا منہ پر کپڑا گرا کر رات کے اندھیرے میں کسی اور دیار کی جانب نکل پڑے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے بنا پلک جھپکے اس مینار کو دیکھ رہا تھا۔ مسجدِ قرطبہ کی قدیم دیوار سے ٹیک لگا کر یخ ٹھنڈے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا وہ اردگرد سے بے خبر تھا۔ اس کے بعد کئی لوگ یہاں آکر رخصت بھی ہو چکے تھے مگر وہ یہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے آج صبح آفتاب کو قرطبہ کے صحن میں طلوع ہوتے دیکھا تھا اور اب عنقریب وہ قرطبہ کے اسی صحن میں غروبِ آفتاب کو بھی دیکھنے والا تھا۔

اسے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی، اس نے پلکیں جھپکنا چاہیں تو پلکوں کے جھپکنے کے ساتھ ہی موتی کی طرح چمکتا نمکین پانی کا شفاف قطرہ پلکوں سے جھول کر گال پر لڑھک گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اس کی نظروں سے قرطبہ کا مینار اوجھل ہو گیا۔ وہ اب فرش کو تک رہا تھا۔ سفید رنگ کا دھلا ہوا فرش جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑتی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے تکتا رہا۔ اس نے پہلو بدلا جب اسے احساس ہوا کوئی اس کے برابر میں آکر بیٹھا ہے۔ مگر آنے والا اکیلا نہیں تھا۔ وہ دو لڑکے تھے۔ ایک اس کے دائیں طرف جبکہ دوسرا بائیں طرف بیٹھا تھا۔ جھکا ہوا سر مزید جھک گیا بالکل کسی مجرم کی طرح۔

"کس فیصلے پر پہنچے ہو؟" آواز مدھم سی اور نرم تھی۔ بولنے والا سنان تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے منزل کوسوں میل کے فاصلے پر جا پہنچی ہے۔ میں فاصلہ طے کرنا چاہتا ہوں اور کر بھی رہا ہوں مگر منزل اور راہی کے درمیان فاصلہ گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے۔ میں اپنے قدم پیچھے ہٹتے محسوس کر رہا ہوں۔ میں خود کو کسی ڈھلان کی طرف گرتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔ کسی آزاد پنچھی کی طرح۔۔ ہوامیں۔۔ بازو پھیلائے۔۔ بہت بلندی سی۔۔ بہت پستی کی طرف!!" اس کی آواز میں نمی گھلنے لگی تھی۔ صبح سے شام کے سفر میں وہ جو کچھ محسوس کر چکا تھا، اس نے چند مختصر الفاظ میں اسے بیان کر دیا تھا۔ تو کیا واقعی درد کو بیان کرنا اتنا سہل ہوتا ہے؟

"جانتے ہو دحیہ۔۔ عقاب کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ایک تنگ سی گھاٹی میں۔۔ اور جانتے ہو وہ پرواز کہاں کرتا ہے؟ بلندی کی طرف۔۔ بہت بلندی کی طرف۔ اونچائی اور پھر اونچائی۔۔ وہ نیچے کی طرف اترتا ہے، وہ پستی کی طرف آتا ہے۔ اس کی نگاہیں اپنے شکار پر ہوتی ہیں۔ وہ ایک ہی لمحے میں اپنے شکار کو جھپٹ کر ایک بار پھر بلندی کی طرف پرواز بھرنے لگتا ہے۔ وہیں سے۔۔ جہاں سے وہ آیا تھا۔ یعنی اپنے اصل کی طرف۔ تم سوچ رہے ہو گے اس

کا اصل تو وہ تنگ گھاٹی ہے؟ مگر وہ تنگ گھاٹی اس کا اصل نہیں صرف اس کی شروعات ہے۔ عقاب اپنی بلند پرواز اور تیز نگاہ کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ یہی اس کا اصل ہے۔ اور ہمارا؟ ہمارا اصل کیا ہے؟" وہ چند لمحوں کے لیے ٹھہرا۔ معاویہ اور دحیہ دلچسپی سے اسے سن رہے تھے۔ وہ ایسے ہی تھا، جب بولتا تھا تو سب خاموشی سے اسے سنتے تھے۔ اس کا انداز، اس کی مدھم آواز اور لہجے سے جھلکتی نرمی۔۔ انسان کو گردوپیش سے بے گانہ کر دیتی تھی۔ جیسے اس وقت وہ دونوں ہو چکے تھے۔ یہ سحر ابھی ٹوٹا نہیں تھا کہ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"عرب کی سرزمین پر بہار کا موسم آیا۔ ایک ننھے سے پھول کی کونپل پھوٹی۔ دھیرے دھیرے اس بہار نے اردگرد کے علاقوں اور پھر پورے خطہ عرب میں ڈیرہ جمالیا۔ نت نئے پھول کھلے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھولوں کی خوشبو عرب سے باہر کی دنیا میں پہنچی۔ دنیا معطر ہوئی تو ایسے ہی پھولوں کی آبیاری کی گئی۔ اور دنیا نے وہ وقت دیکھا جب تمام دنیا موسمِ بہار کے حصار میں تھی۔ پھر ایک دن تیز ہوا چلی۔ آندھی تھی یا طوفان۔۔ یکے بعد دیگرے باغ اجڑتے گئے۔ آندھی کا زور کم ہوا تو معلوم ہوا کہ اب کوئی باغ نہیں رہا تھا۔ جو پھول باقی تھے، انہوں نے اپنے آشیانے کو "باغیچوں" کا نام دیا تھا۔ آندھی کا زور کم ضرور ہوا مگر ہوا کے جھونکوں سے بدستور ان باغیچوں کو خطرہ رہا۔ دنیا اب وہ وقت دیکھ رہی ہے جب ہوا کے زوردار تھپیڑوں کے آگے ان باغیچوں کا قدم جمانا مشکل ہو رہا ہے۔۔ وہ باغ۔۔ وہ خلافتیں جنہوں نے تمام دنیا پر سایہ کیا، ٹوٹ کر بکھریں۔ خلافتِ امیہ، خلافتِ عباسیہ، خلافتِ عثمانیہ۔۔ یکے بعد دیگرے ہر خلافت اپنے پورے وجود کے ساتھ گری اور کئی آزاد ریاستوں کو جنم دیا۔ یہ آزاد ریاستیں بھی آگے جا کر کئی حصوں میں تقسیم ہوئیں۔ اب حال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ریاست ایسی نہیں جسے صحیح معنوں میں "آزاد ریاست" کا نام دیا جا سکے۔ نفاق، انتشار، بدامنی، قتل و غارت، خونریزی، جہالت، ظلم، سرمایہ داری، لوٹ مار غرض ہر طرح کی برائی اس معاشرے میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ کوئی ایسا شخص نہیں جو اس

سب سے محفوظ ہو۔ جو محفوظ رہنا چاہتے ہیں، وہ چونکہ اسی معاشرے کا حصہ ہیں تو کیچڑ کے چھینٹے ان کے دامن پر بھی گرے ہوئے ہیں۔ کہیں کوئی راہِ فرار دکھائی نہیں دیتی۔

ایسے میں پچھلوں کے نقش قدم پر چلنے کا عزم لے کر چند لوگ سر بلند کریں۔ دین کا علم اٹھائے، کلمہ حق سینے سے لگائے آگے بڑھیں اور جان لگا دیں تو اس میں کوئی برائی تو نہیں۔ یہ تو برائی کا خاتمہ ہے دحیہ! یہ بلندی سے پستی کی طرف نہیں، پستی سے بلندی کی طرف پرواز ہے۔ یہ ان عقابوں کا وقت ہے جنہوں نے تنگ گھاٹیوں میں جنم لیا ہے، اب انہیں بلندی کی طرف پرواز کرنا ہے۔ پستی کے گڑھوں سے نکل کر، آسمان کی بلندیوں تک۔ جہاں ان کا اصل ہے!!" وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ دحیہ نے سر اٹھا کر گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

"ایسا ہی خواب لے کر کئی تنظیمیں وجود میں آئی تھیں سنان! تم القا*عدہ کو فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ تنظیم جو اسلام کا علم لے کر اٹھی مگر اسلام دشمن عناصر کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ وہ تنظیم جن کی خاطر اس کے مجاہدوں نے اپنا تن من لٹا دیا، اور جن کے لیے لٹایا وہ انہیں دہشتگرد کہتے ہیں۔ تم داع*ش (دعوت اسلامیہ عراق شام) کو نہیں بھول سکتے جو اٹھی تو اسلام کے نام پر تھی مگر آج اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ تم خار*جیوں کو نہیں بھول سکتے جو بظاہر اسلام پسند ہیں۔ جو قرآن کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں، جن کا تمام وقت عبادت میں گزرتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے علاوہ ہر شخص کے حامی ہیں۔ ہزاروں جماعتیں اٹھی ہیں جنہوں نے اپنے نام کبھی اہل حق، کبھی اہلِ قرآن رکھے ہیں مگر یہی اپنے راستے بھول گئے۔ جن کے قافلے والوں نے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں اور جو اندھیروں کے راہی ہو گئے۔ یہ سب دیکھنے کے باوجود میں کیسے یقین کر لوں کہ آج جو جماعت خود کو "جندل اللہ" کا نام دے رہی ہے کیا وہ اللہ کے رنگ میں رنگی رہے گی؟ کیا یقیناً وہ کبھی صبغتہ اللہ سے منہ نہیں موڑے گی؟" وہ سوال جو اس رات کے بعد سے اس کے ذہن میں ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے، وہ

اندیشے جو اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے، اس نے سب کو کھول کر ان کے آگے بیان کر دیا تھا۔ اس سب سے چھٹکارہ پانے کا یہی آخری حل تھا۔

"جس تنظیم میں تم جیسے دور اندیش مجاہدین ہونگے وہ ہمیشہ صبغتہ اللہ میں رنگی رہے گی دحیہ! کیا تمہیں یقین ہے کہ خود کو اللہ کا لشکر کہنے والے لوگ جب اللہ کی راہ سے بھٹکنے لگیں گے تو تم انہیں ان کے گریبانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑو گے نہیں؟ سالار ہمیشہ بلند حوصلوں والا اور اپنے مقصد پر مر مٹنے والا ہوتا ہے۔ وہ اگر کبھی راہ سے بھٹک جائے تو کیا اس کے ہر سپاہی کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ اسے جھنجھوڑیں؟ گریبان سے پکڑ کر اسے راہِ راست پر لائیں؟ اگر وہ ہوش میں نہیں تو ہر حربہ استعمال کر کے اسے ہوش میں لایا جائے گا۔ اسے بتایا جائے گا وہ جس راہ کی طرف نکلنے لگا ہے وہ پستی کی طرف جاتی ہے۔ اور اس کے پیچھے چلتا لشکر بھیڑوں کے جھنڈ کی طرح اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے پستی کی طرف نہیں چلے گا پر وہ اپنا راستہ بدلے گا اور اسے بھی گریبان سے پکڑ کر اسی راستے پر لائے گا! تم سے کس نے کہا ہے دحیہ کہ حق کے راستے پر بھٹکنے کا اندیشہ نہیں ہوتا؟ بھٹکنے کا اندیشہ حق کے راستے پر ہی تو ہوتا ہے۔ جو بھٹکے ہوئے ہوں انہیں بھٹکنے کی کیا فکر؟ مگر اس اندیشے کی بِنا پر آنکھیں بند کر کے ایک کونے میں سسکتے رہنا، اپنی بے بسی کا واویلا مچانا اور آسمان سے خدا کے اترنے کا انتظار کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ خدا نے تو انسان کو اپنا نائب بنا دیا ہے ناں۔ نائب اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہے تو کیا سب پستی کی طرف گرتے رہیں گے؟ کیا کوئی نہیں اٹھے گا جو نائب کو اس راہ سے آگاہ کرے جہاں سے عقاب پرواز بھرتا ہے۔ ہاں وہی تنگ گھاٹی جو دیکھنے میں تنگ ہے مگر وہیں بلندیوں کی طرف پرواز کرنے والا عقاب جنم لیتا ہے۔ اندیشے کی بنا پر حال و مستقبل دونوں کے ساتھ کھیلنا کوئی اچھی بات تو نہیں دحیہ۔۔۔!" وہ ٹھہر گیا۔ دحیہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر سر جھکا گیا۔

"کیا اب بھی کوئی اندیشہ باقی ہے؟" معاویہ نے اپنی چپ کو توڑا تھا۔ دحیہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ

دونوں کھل کر مسکرا دیے۔

"تو مطلب تم آرہے ہو؟"

"پہلے وعدہ کرو۔ اگر کبھی میں راہِ راست سے بھٹک گیا تو دوستی کا حق نبھاتے ہوئے مجھے پستی کی طرف گرنے نہیں دو گے۔" اس نے پر امید نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سنان نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم اپنا راستہ یاد رکھیں گے دحیہ! وہی راستہ جس کے موڑ پر جنّتِ بریں ہے۔ وہی راستہ جو عرش کے سائبان تلے ہے۔ ہمیں وہاں ملنا ہے اور اسی ملاقات کے لیے ہم تمہیں کبھی وہ راستہ نہیں بھولنے دیں گے۔" معاویہ کے الفاظ پر وہ اندر تک سرشار ہوا تھا۔ دل پر جیسے ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور دونوں کے گلے لگ گیا۔ یہاں سے ان کی دوستی کا نیا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ حقیقی دوست جو ایک ایسی راہ پر نکلنے کو تیار ہو گئے تھے جو اس تنگ گھاٹی کی طرح تھی جہاں عقاب جنم لیتا ہے اور پھر بلندیوں کی جانب پرواز بھرتا ہے۔

☆☆☆

وہ تینوں اپنی نشستوں کے کونے پر بیٹھے بغور لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ ضرار میٹنگ کے بعد سیدھا خیام کے گھر آیا تھا جہاں جندل پہلے سے موجود تھا۔ میٹنگ کا ہر منظر وہ رکارڈ کر چکا تھا اور اس وقت وہ یہی رکارڈنگ دیکھ رہے تھے۔ اسکرین پر اب وہ منظر آرہا تھا جب اسٹیون میٹنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ خیام نے آگے بڑھ کر ویڈیو روک دی۔

"آخری اطلاعات کے مطابق اسٹیون تھائلینڈ میں نہیں تھا۔ اس کا اچانک یوں سامنے آجانا حیران کن ہے۔" جندل نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ضرار نے تائید میں سر ہلایا۔

”اسٹیون گھر بھی نہیں آیا؟“ خیام کے سوال پر جندل نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”کچھ مسِنگ ہے یہاں پر۔ وہ اچانک کیوں منظر عام پر آ گیا؟“!

”خیام، میکس ویل بار بار! کیا تمہیں نہیں لگتا کہانی دہرائی جا رہی ہے۔“ ضرار کے دماغ میں کچھ کلِک ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ باہم ملا کر سوچ سوچ کر بولنے لگا۔ ”ہم نہیں جانتے میکس کو کون مروانا چاہتا تھا مگر فرض کرو کہ میکس کے قتل کے پیچھے اسکائے ٹو ہے۔ میکس کو جب وہ راستے سے ہٹانا چاہ رہے تھے تو انہوں نے زیاد کو استعمال کیا اور دھیرے دھیرے میکس کے خلاف تمام ثبوت زیاد کے ہاتھ میں تھما دیے۔ اور اب اسٹیون! کیا اسٹیون کے ساتھ یہی سب نہیں ہو رہا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”لائبریری کے باہر جس لڑکے کو ہم نے پکڑا تھا اس نے اسٹیون کا نام لیا تھا۔ اسکائے ٹو کا بانی بن کر منظرِ عام پر آنے والا بھی اسٹیون ہے!“ جندل کی بات پر ضرار نے تائیدی نظروں سے اسے دیکھا پھر اپنی بات جاری رکھی۔

”صرف یہی نہیں! ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ کرنے پر مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ پچھلے ایک سال سے اسٹیون کے خلاف جو ثبوت اکٹھے کرنے میں مصروف تھے، ان میں سے پچاس فیصد ثبوت انہیں مل چکے ہیں۔ وہ رکارڈنگز جن میں وہ دہشگرد تنظیموں کے ساتھ مستقبل کے منصوبے بنا رہا ہے، تصاویر اور دستاویزات! جو کام پچھلے ایک سال سے چل رہا تھا وہ اچانک سے پچاس فیصد تک مکمل ہو گیا، کیسے؟“

”تم لوگ کہنا چاہ رہے ہو کہ۔۔ اسکائے ٹو اسٹیون کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہ رہا ہے؟“ خیام نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اور اس کام کے لیے وہ ایک بار پھر حزب اللہ کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔“ جندل نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ خیام کچھ سوچتے ہوئے آگے ہوا۔ ”مجھے یاد کرنے دو اس نے کیا کہا تھا؟“ وہ یادداشت کے

کاغذات کھنگالنے لگا۔ وہ اس بوڑھے شخص کے ساتھ بیٹھا تھا جو کہہ رہا تھا کہ ”اسٹیون وارلڈ کا دشمن ہے مگر مارک نہیں! مارک اپنے باپ کا دشمن ہے وہ وارلڈ کا سگا کیونکر ہو سکتا ہے؟“

”اس نے کہا تھا کہ مارک اپنے باپ کا دشمن ہے!! تو کیا اسٹیون کے خلاف تمام ثبوت فراہم کرنے والا مارک ہے؟“ ان کے سامنے ایک اور سوال تھا۔ جندل چند پل اسے دیکھتا رہا پھر جیکٹ کی جیب سے اپنا موبائل نکالتا آگے ہوا۔ لیپ ٹاپ کے ساتھ اپنا موبائل کنیکٹ کیا۔ کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور پھر لاونج میں اجنبی آواز سنائی دی۔

”تم زندگی کے جس دوراہے پر کھڑے ہو وہاں تم اپنے فائدے کا نہیں سوچ سکتے مائک! تمہارے آگے کنواں اور پیچھے کھائی ہے۔ اس وقت تم صرف اپنے باپ کی جان بچانے کا سوچو گے۔ تمہیں سوچنا پڑے گا“!

”تین ملیئن ڈالرز“!

”تمہارے باپ کی جان سے زیادہ قیمتی ہیں؟“

”کب قتل کرنا ہے؟“

”ٹھیک تین بعد!“ رکارڈنگ ختم ہو گئی۔ تینوں نے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کیا پھر جندل بول اٹھا۔ ”باپ کی جان بچانے کا سوچو گے! یعنی ہم درست اندازے پر پہنچے ہیں۔ اسکائی ٹو کا اگلا ٹارگٹ اسٹیون بار بار اہے“!!

”لیکن کیوں؟ میکس کا قتل کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ دولت کی وجہ سے لڑائی ہوئی۔ مگر آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ اسٹیون اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مرنے والا ہے؟“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کے پیچھے مارک نہ ہو؟ کوئی اور؟“ ضرار نے ایک اور سوال اٹھایا۔ جندل نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس ملازمہ نے کہا تھا کہ وہاں سب کھڑے تھے۔ اسٹیون، مارک اور مائک! جب ایلسا کسی کو کال کرنے لگی تو یہ

مارک تھا جس نے اپنی ماں کے ہاتھ سے موبائل چھینا اور یہ اسٹیون تھا جس نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ جبکہ مائک اس تمام عرصے میں خاموش رہا۔ ایلسا گھر لوٹی تو اسے لانے والا مائک تھا۔ گھر میں مائک واحد ہے جو ایلسا کا خیال رکھتا ہے۔ یعنی مائک ان دونوں باپ بیٹوں کے کرتوتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس میں اس حد تک ملوث نہیں ہے۔ اور فون پر مائک کو اس کے باپ کی جان کی دھمکی دی گئی۔ مائک، مارک کی نسبت عقل میں بھی اور طاقت میں بھی کمزور ہے۔ تو یہ دھمکی مارک کو کیوں نہ ملی؟"

"مارک ان کی دھمکیوں میں نہ آتا۔ وہ اپنے باپ کو کسی اور طرح سے بچانے کا سوچتا۔" ضرار کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے دھمکی دینے والا مارک ہی ہو؟!" جندل کی بات میں وزن تھا۔ وہ دونوں سر تائید میں ہلا گئے۔

"اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ کل کس کا قتل ہونا ہے؟ اور ساتھ ہی یہ کہ جس شخص کو تم نے یرغمال بنایا ہوا ہے اس سے کون رابطہ کرتا ہے؟! یقیناً اس کے بعد ہم بہت کچھ سمجھنے کے قابل ہونگے۔ بہت سی پہیلیاں سلجھنے لگیں گی۔" خیام نے گہری سانس لیتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگائی۔

"ڈیوڈ کے مسئلے کا کیا بنا؟"

"کام کر رہا ہوں اس پر۔ اگر ڈیوڈ کے قاتلوں تک پہنچ گیا تو وہ چِپ بھی ہمارے ہاتھ ہو گی۔" اس نے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے ناک کی ہڈی کو مسلتے ہوئے جواب دیا تھا۔ جندل چِپ کے ذکر پر چونکا تھا۔

"خیام تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ڈیوڈ وہ تمام ڈیٹا جو اس نے اپنی جان پر کھیل کر حاصل کیا صرف ایک چِپ تک محدود رکھے گا؟ کیا اس نے نہیں سوچا ہو گا کہ اگر وہ چِپ تمہارے ہاتھ نہ لگی تو اسکائے ٹو کے گھناؤنے کھیلوں سے دنیا

ہمیشہ انجان رہے گی؟" اس کے سوال پر وہ دونوں ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ اسنیکس کھاتی سعاد کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ رک گیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اس نے لب گول کر "واؤ" کہہ کر خیام کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

"یہ جندل تو خاصا عقلمند ہے۔ میں آج تک اسے عقلبند سمجھتی رہی۔" مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے اسنیک منہ میں ڈالا۔ جان بوجھ کر خیام کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر وہ کچڑ کچڑ کی آواز کے ساتھ دوبارہ اسنیکس کھانے میں مصروف ہوگئی۔ خیام صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اسے اس آواز کی وجہ سے اپنے کانوں میں عجیب گدگدی سے محسوس ہو رہی تھی جس کے آگے وہ بے بس تھا۔

"وہ ایک عام آدمی تھا۔ عین ممکن ہے اس نے واقعی اس نہج پر نہ سوچا ہو؟" ضرار کے سوال پر خیام نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ عام آدمی نہیں تھا۔ وہ کمپنی کے بہترین ایمپلائز میں سے تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ کمپنی کا سروے سنبھالنے والی ٹیم کا میمبر تھا۔ یعنی ایک طرح سے ایک ہیکر! اس نے یقیناً اس نہج پر سوچا ہو گا۔"

"تو یعنی اس نے اسکائے ٹو کا حاصل کردہ تمام ڈیٹا اس چِپ کے علاوہ بھی کہیں محفوظ کیا تھا۔ مگر کہاں؟"

"ضرار اگر تم ہوتے تو کہاں محفوظ کرتے؟ آج کل کے ڈجیٹل دور میں ایک چِپ سے زیادہ کونسی محفوظ ترین جگہ ہو سکتی ہے کہ تم اتنا حساس ڈیٹا جس کے حوالے کرو؟" خیام کے سوال پر وہ چند لمحے کچھ سوچنے لگا۔

"میں اپنے پرسنل لیپ ٹاپ کو سب پر ترجیح دیتا۔ محفوظ ترین کوڈز کا استعمال کر کے اس ڈیٹا کو محفوظ کرتا۔"

"ضرار نے مجھے مایوس کیا۔" چٹخارے لیتی سعاد نے کسی استاد کی مانند افسوس سے کہا۔

"اور تم جندل؟"

”میں وہ ڈیٹا اسی وقت منظر عام پر لے آتا۔ جب کوئی انہونی چیز منظر عام پر آجانے کے بعد بھلے وہاں سے مٹادی جائے تو وہ عوام کے ذہنوں میں نقش ہو جاتی ہے۔ ہزاروں تاویلیں اور صفائیاں پیش کی جائیں، عوام اسی بات پر ڈٹی رہے گی جو کچھ عرصے کے لیے منظر عام پر آئی اور پھر مٹادی گئی۔“

”ثابت کر دیا اس نے کہ میں ٹھیک سوچتی تھی۔ میرا عقلبند بھائی!“ ایک اور چٹخارہ۔۔

”اور تم؟“ خیام کو مخاطب کیا گیا۔

”میں یہ حساس ڈیٹا ایک چِپ کے بجائے دو چِپس میں منتقل کرتی۔ ایک آپ کے حوالے کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھتی اور دوسری زمین میں دبا دیتی۔ جیسے لوگ دفن شدہ خزانہ ڈھونڈنے نکلتے ہیں ویسے ہی آپ دفن شدہ چِپ ڈھونڈنے نکلتے۔“ بات کے اختتام پر ایک اور چٹخارہ!

”میں یہ حساس ڈیٹا ایک چِپ کے بجائے دو چِپس میں منتقل کرتا۔ ایک مطلوبہ شخص کو حوالے کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھتا اور دوسری زمانے کی نذر کر دیتا۔ یعنی اگر میں نے فون بوتھ پر کھڑے ہو کر کسی خیام کو کال کی ہوتی تو میں وہ چِپ اسی فون بوتھ کے آس پاس کہیں چھپا دیتا جسے صرف کوئی متلاشی ہی تلاش کر سکے!“ تھوڑی سی ردوبدل کے بعد سعاد کا جواب آگے پہنچا دیا گیا۔ وہ بدمزہ ہوئی تھی۔

”ٹھہرے جو استاد جی!!“ وہ بڑبڑائی۔

”تو۔۔ جندل کے مطابق دیکھا جائے تو ایسا کوئی ڈیٹا منظرِ عام پر نہیں دیا گیا۔ ضرار کے مطابق اگر دیکھیں تو ہمیں نئے سرے سے ڈیوڈ کے لیپ ٹاپ کی چھان بین کرنا ہو گی۔ اس میں کامیابی کے چانسز صرف بیس فیصد ہیں کیونکہ لیپ ٹاپ کا صفایا کیا جا چکا ہے جو بدقسمتی سے پہلے ڈیوڈ کے قاتلوں کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اور۔۔“ وہ ٹھہرا۔ دونوں نے منتظر نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”میرے مطابق ہمیں اس فون بوتھ کو تلاش کرنا چاہیے جہاں سے ڈیوڈ کی کال

موصول ہوئی تھی۔"

"میرے مطابق؟ میرے؟!!واللہ! جھوٹ بولتے ہوئے ذرا جو زبان کا ذائقہ بدلتا ہو آج کل کی نسل کا!!" وہ بھنا کر رہ گئی۔

"میری مانو تو۔۔سی سیٹی وی فوٹیجز دیکھو۔ عین ممکن ہے کہ ڈیوڈ کو اگر ایک چِپ تمہارے حوالے کرنی ہو تو دوسری کسی اور کے۔یعنی کوئی اور جو اس کی نگاہ میں "تمہاری طرح" کمپنی کا وفادار ہو۔"ضرار نے تمہاری طرح پر زور دے کر کہا۔وہ زیرلب مسکرادیا۔

"بدر کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جندل کے سوال پر دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔"وہ تمہارے ساتھ کام کرتا ہے۔تمہارے ساتھ ہوتا ہے،کسی سائے کی طرح۔عین ممکن ہے ڈیوڈ نے دوسری چپ اس کے حوالے کی ہو،اس یقین کے ساتھ کہ وہ تمہیں ضرور ملے گی"!!

"اگر ایسا ہوتا تو بدر اب تک اس کا ذکر کرچکا ہوتا۔" خیام نے اعتراض اٹھایا۔

"اور کیا ہو اگر بدر خود اس سے واقف نہ ہو؟!" اس کے لب پراسرار سی مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔خیام نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ایک حد تک یہ بھی ممکن تھا!

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔۔۔میرا بھائی عقلمند ہے بھئی!!" اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔دوسری جانب خاموشی چھائی رہی تھی۔وہ سب اپنی باتیں مکمل کرچکے تھے۔اب انہیں واپس کام پر لگنا تھا۔کام اور بہت سارا کام!

کچھ دیر بعد خیام ضرار کو رخصت کرنے دروازے پر آیا تھا جبکہ جندل نے بذریعہ دروازہ باہر جانے پر دیواریں پھلانگنے کو ترجیح دی تھی۔ضرار الوداعی کلمات کہنے لگا تھا جب غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں اوپر اٹھتیں دوسری

منزل کے اس کمرے کی کھڑکی پر ٹکیں۔ کھڑکی سے روشنی آرہی تھی جو کسی ذی نفس کی وہاں موجودگی کا اعلان کررہی تھی۔

"کیا کوئی آیا ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے خیام کو دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

"ہاں۔۔ ایک طالب علم کو ضرورت تھی۔ اوپر والا گھر ویسے بھی خالی ہوتا ہے تو اسے دے دیا۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ ضرار نے سمجھ کر سر کو جنبش دی پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد خیام نے گہری سانس لے کر سر اٹھا کر اوپر کھڑکی میں دیکھا جہاں کوئی ہیولہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً یہ روشنی نہیں تھی جس نے ضرار کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ اس ہیولے کی کارستانی تھی جو ضرار اوپر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"شریف لڑکا ہے۔" اس کی سماعت سے سعاد کی سرگوشی ٹکرائی۔

"مگر تمہاری حرکتیں بالکل بھی ایک شریف طالب علم والی نہیں ہیں!!" وہ تپ گیا تھا۔ وہ کھکھلا کر ہنسی تھی۔ خیام گہری سانس لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ کھڑکی میں کھڑا وہ ہیولہ بھی غائب ہو گیا۔ ہر سُو خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

یہ فجر کا وقت تھا جب آسمان پر ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیاہ تاریک چادر اوڑھ کر سویا ہوا آسمان جو بس ابھی کچھ دیر میں یہ چادر اتار پھینکنے والا تھا۔ سڑکیں ویران اور تاریک تھیں۔ گاؤں کی تنگ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انہی تنگ گلیوں میں سے ایک گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ سیاہ جینز پر تیز بھورے رنگ کا اپر پہن رکھا تھا جس کی ہوڈ سر پر گرا رکھی تھی۔ چہرے پر ماسک لگا ہوا تھا۔ سفید جاگرز مسلسل آواز پیدا کر رہے تھے۔ وہ گلی کے کنارے پر پہنچ کر اگلی گلی کا موڑ مڑ گیا۔ اسے ابھی اس گلی سے گئے بمشکل ایک منٹ ہوا تھا کہ گلی کے سرے سے ایک اور آدمی نمودار ہوا۔ مکمل سیاہ لباس میں ملبوس، پی

کیپ سر پر ٹکائے، چہرہ جھکا کر چلتا وہ نشانات کی پیروی کرتا آگے بڑھ رہا تھا، بنا کوئی آواز پیدا کیے!!

گلی کا موڑ مڑتے ہی اس نے دوسری گلی میں قدم رکھا۔ یونہی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے وہ دائیں قطار کے تیسرے گھر کے پاس رکا۔ ٹھہر کر احتیاط بھری نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا پھر دروازہ کھٹکایا۔ پہلی دستک پر دروازہ نہیں کھلا تو اس نے بنا رکے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کیا۔

”آ رہی ہوں، آ رہی ہوں۔ اتنی صبح صبح کسے مصیبت پڑ گئی ہے۔“ تھائی زبان میں کسی عورت کی بڑبڑاہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اپنا دایاں ہاتھ پیچھے لے جا کر پستول نکالی۔ سیاہ رنگ کی چمکتی ہوئی پستول! جلدی سے پستول لوڈ کی اور دونوں بازو سیدھے کر کے پستول کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ دروازہ کھل گیا۔ سامنے کھڑی عورت نے پستول پر نظر پڑتے ہی دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی چیخیں روکی تھیں۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف ابھرا تھا۔ سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ٹریگر پر زور دیا تھا۔ گلی کے نکڑ پر دیوار کی اوٹ میں چھپے اس آدمی نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔ چہرے کے نقوش واضع ہوئے۔ وہ ضرار ولید تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے اپنے اپر کی جیب سے پستول نکال کر لوڈ کرتے ہوئے گھر کے دروازے پر کھڑے مائک کا نشانہ لیا تھا۔

”مداخلت مت کرنا ضرار!“ اسے حکم دیا گیا تھا۔ ٹریگر پر زور بڑھایا گیا، ٹریگر دب گیا۔ پستول سے نکلی گولی اس عورت کے قلب میں پیوست ہوگئی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ آنکھیں۔۔ جن میں موت کا خوف تھا۔ موت جو ایک لمحے میں آئی تھی، اور سانسوں کی ڈور کاٹ گئی۔

مائک نے ایک نگاہ اس لاش پر ڈالی پھر پستول اپر کی جیب میں اڑس کر ایک احتیاط بھری نگاہ ارد گرد ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ ضرار کی نگاہوں نے تب تک اس کا تعاقب کیا جب تک وہ گلی کا موڑ نہ مڑ گیا۔ دروازے کے پاس اب شور

اٹھ رہا تھا، غالباً گھر کے دوسرے مکین جاگ اٹھے تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر سر جھکایا۔

”ابراہم وارلڈ کی بیوی قاتنہ۔۔۔ ماری جا چکی ہے!“ اس کی سرگوشی نے ایک لمحے کے لیے ہر شے کو سانس روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے مذہب کے لفظ سے ہی عجب گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور مذہب اس آزادی کو سلب کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ انسان اپنے بنائے ہوئے خداؤں کو پوجنا چاہتا ہے۔ سوچنے سے ہی عجیب کراہیت کا احساس ہوتا ہے کہ انسان پہلے خود اپنے خداؤں کو وجود میں لاتا ہے اور پھر دعوہ کرتا ہے کہ انہی خداؤں نے اس تمام کائنات کو بنایا ہے۔ مذہب انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہ انسان کو اپنا آپ، اپنی خواہشات مارنے پر ابھارتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب ایک سراب ہے۔ جھوٹے خداؤں کی پیروی کرنے والے جھوٹے انسانوں کا بنایا ایک جال جس میں پھنسنے والا قابلِ رحم ہوتا ہے“!!

وہ کئی پل چپ چاپ خاموشی سے اسکرین پر نظر آتے ان الفاظ کو دیکھتی رہی۔ یہ الفاظ جولیا کے تھے جو ملحد تھی۔ جولیا کی باتوں سے اسے اختلاف تھا اور صرف اسے ہی نہیں اس وقت اس آنلائن کیفے میں موجود ہر شخص کو جولیا کی باتوں سے اختلاف تھا۔ اسے اس کیفے میں شمولیت اختیار کیے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مذہب کی جس جنگ کا اسے سامنا تھا، وہ اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ سات سے آٹھ لوگوں پر مشتمل یہ تنظیم اس کے لیے اچھی ثابت ہوئی تھی۔ ہر شخص ایک الگ مذہب کا پیروکار تھا، سب کے خدا مختلف تھے۔ سب کو پڑھنا، جائزہ لینا اور پھر اپنا نظریہ قائم کرنا اس کے لیے یقیناً دن بہ دن دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے اس وقت جولیا کے الفاظ نے اسے حیران کیا تھا اور اب وہ دوسروں کے اظہارِ رائے کی منتظر تھی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جوزف کی جانب سے اظہارِ

رائے میں پہل کر دی گئی تھی۔

”انسان ہمیشہ سے ایک خدا چاہتا ہے۔ یعنی کوئی ایسی ذات جو اس سے مرتبے اور طاقت میں بہت زیادہ ہو۔ انسان نے حیوانات اور نباتات کو ہمیشہ اپنے فائدہ کے لیے استعمال کیا۔ یعنی یہ سب انسان کی نگاہ میں حقیر رہے۔ انسان نے ہمیشہ بلندی کی چاہ رکھی۔ اور اس بلندی تک پہنچنے کے لیے اسے ایک خدا کی ضرورت ہے۔ یعنی جس کی طرف دیکھ کر سر اٹھا کر وہ اوپر کی طرف بڑھے۔ ہر شخص کا ایک خدا ہے۔ دنیا میں لاکھوں مذاہب ہیں اور سب مختلف خداؤں کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کا مرتبہ ہر مذہب میں ایک سا ہے۔ خدا کی ذات سب سے بڑی ہے، وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے، اس سے زیادہ عقل والا کوئی نہیں اور سب سے بڑھ کر وہ اس پوری کائنات کا بنانے والا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں آکر ہر مذہب کی تعلیم ایک سی ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات ہے کہ وہ مشکل کے وقت کسی کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ پہلے انسان کو اور اگر انسان اس معاملے میں بے بس ہو تو وہ کسے پکارے؟ کیا وہ پکارے بنا رہ سکتا ہے؟ کیا وہ چپ چاپ محض ایک تماشائی کی مانند اپنا سب کچھ اجڑتے کوئے دیکھ سکتا ہے؟ نہیں! ایسے موقعوں پر اسے ایک ذات چاہیے، جو ہر چیز پر قادر ہو۔ جو اسے اس کی مشکلوں سے نکال سکے یعنی وہ جو مشکل کشا ہو! اور یہاں انسان کو ایک خدا کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ خدا کی ذات اپنا وجود رکھتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے ایک نجات دہندہ کی تلاش میں رہا ہے۔ ہم، ہم سے پچھلے اور ہم سے اگلے۔ ہر دور ہر زمانے میں یہی ہوا ہے۔ انسان کو ہمیشہ کسی نجات دہندہ کی تلاش رہی ہے۔ پھر ہر انسان نے اپنے اپنے مطابق اپنے نجات دہندہ قرار دیے ہیں۔ کچھ نے پتھروں کو پوجا، کچھ نے آگ کو، کسی نے انسانوں کو، کسی نے ایسے خدا کو جسے کبھی کسی نے نہیں دیکھا! مگر بات ایمان کی ہے، جس کے دل نے جس صدا پر لبیک کہا اس نے وہیں اپنا تن من لٹا دیا۔ یعنی خدا انسان کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ انسان اپنی ہی ذات کی تکمیل کے

لیے "خدا" کا محتاج ہے"!!

"دلچسپ۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری تھی۔ جوزف کے بعد کم من ہو نامی لڑکے نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہوا تھا۔

"مذہب انسان کی آزادی کو سلب نہیں کر لیتا بلکہ یہ مذہب ہی ہے جو انسان کی آزادی کا ثبوت ہے۔ کیا ہر شخص کو آزادی نہیں کہ وہ جسے چاہے اپنا خدا مان لے؟ اور پھر اس میں قباحت ہی کیا ہے؟ یہ ایک تفریح کی طرح ہے۔ ہفتہ بھر روزمرہ کے کاموں، بیوی بچوں اور جاب میں کھپنے کے بعد جب ہفتے کے اختتام پر انسان ذہنی سکون کے لیے چرچ چلا جائے یہ برا تو نہیں۔ میں یہاں اپنی بات کر رہا ہوں ورنہ بہت سے لوگ ہیں جو سینا گوگ، مندر اور پھر نام نہاد مسلمان مسجد جاتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے یہ ایک طرح کا سکون ہے جب میں ہفتے کے اختتام پر چرچ جاتا ہوں۔ وہاں کی خاموشی کو محسوس کرنا، آنکھیں موند کر بیٹھنا اور باپ، بیٹا، روح القدس کی بڑائی پر غور کرنا۔۔ یہ سب مجھے پسند ہے۔ اس وقت میں خود کو آزاد انسان محسوس کرتا ہوں۔ میرا مذہب مجھ پر کوئی غیر ضروری پابندی نہیں لگاتا۔ اگر میں کئی ماہ چرچ نہ جاؤں تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فادر مجھے جہنم کی نوید نہیں سنا دیتے کیونکہ ہمارے گناہوں کی معافی کے لیے یسوع مسیح اپنی جان کی قربانی دے چکے ہیں۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں، مجھے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اور میں حقیقتاً اس سب سے بہت خوش ہوں"!!

"یعنی مذہب کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے!" اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ اگلے پندرہ منٹ تک سب اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ اور بالآخر وہ پیغام بھی اس کی اسکرین پر ابھرا جس کی وہ منتظر تھی۔

"دنیا نے تین زمانوں میں سفر کیا ہے۔

Pre Modernism, Modernism, Post Modernism.

پہلا دور جب لوگ مذہب کے معاملے میں شدت پسند بن گئے۔ اس دور کی بہترین مثال عیسائیوں کی تاریخ میں یہ

لفظ ”محکمہ احتساب (انکوی زیشن)“ ہے۔ جس پر عیسائی تاریخ آج بھی شرمندہ ہے۔

دوسرا دور جب مذہب کو چھوڑ کر سائنس کی پیروی کی جانے لگی۔ سائنس کو خدا مانا گیا اور ہر اس چیز کو جھوٹا قرار دیا گیا جسے سائنس ثابت نہ کر سکی۔

اور تیسرا دور جو موجودہ دور ہے جس میں بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا۔ یعنی مذہب کے ساتھ ساتھ سائنس پر بھی یقین کیا گیا۔

قابلِ غور ہے یہ بات کہ آخر کس وجہ کی بنا پر دنیا کو دوسرے دور سے نکل کر تیسرے دور کی طرف سفر کرنا پڑا؟ جب انسانوں نے مذہب کا انکار کیا تو ایسا کیا ہوا کہ انہی انسانوں کو بین بین کا راستہ اختیار کرنا پڑا؟ زمانوں کی یہ تبدیلی، انسان کا پہلے زمانے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک کا سفر کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ مذہب انسان کی ”احتیاج“ ہے۔

کیا مذہب کے بغیر انسان کو اپنی زندگی بے معنی نہیں لگتی؟ کیا انسان صرف اس لیے اس دنیا میں آیا ہے کہ وہ بچپن سے لڑکپن تک کا سفر کرے اور شباب کی سرحدوں سے نکل کر بڑھاپے کی سرحدیں پار کر کے موت کے منہ میں اتر جائے؟ کیا بس یہی؟ اس کائنات میں چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان جسے جانوروں، حیوانات، نباتات پر برتری دی گئی وہ بے مقصد اس دنیا میں آیا ہے؟ ایسی صورتحال میں مذہب ہی وہ واحد رہنما ہے جو انسان کو وہ پرچہ تھماتا ہے، وہ تعلیمات دیتا ہے جو اسے بتلاتی ہیں کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

اور یہ ہر مذہب میں ہوتا ہے۔ جو لوگ انسانیت کو اپنا مذہب مانتے ہیں ان کے نزدیک انسان اس دنیا میں انسانیت کی بھلائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ انسانیت کی خدمت ہی ان کا واحد مقصد ہے۔ آسمانی مذاہب کے مطابق انسان کو

اس دنیا میں اس کا امتحان لینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ دنیا ان کے نزدیک کمرہ امتحان ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب بھی انسان کو اس کے مقصدِ حیات سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس کے باوجود اگر مان لیا جائے کہ انسان بے مقصد اس دنیا میں ہے تو وہ یہاں کیا کرے گا؟ موجودہ دور کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے ہمیشہ بلندی کی خواہش کی ہے؟ اس بلندی تک اسے کون لے کر جائے گا؟ یقیناً کوئی ایسا جو پہلے ہی بلندی پر ہو؟ مجھے پہاڑ پر چڑھنا ہے، مجھے چڑھنا نہیں آتا البتہ راستہ معلوم ہے۔ مجھے کسی کی مدد چاہیے تو کون ہے جو میرا ہاتھ تھام کر مجھے اوپر کی طرف کھینچے گا؟ یقیناً وہ جو پہلے سے ہی پہاڑ پر موجود ہے؟ پہاڑ پر موجود شخص نے میرا ہاتھ تھاما، مجھے اوپر کی طرف کھینچا، میں پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد کیا پہاڑ پر پہنچتے ہی میں انکار کر دوں کہ میں نے کسی کی مدد نہیں لی تھی؟ میں پہاڑ پر خود چڑھا ہوں؟ یہ تو کھلا تضاد ہے۔ اسی طرح انسان بلندی کی خواہش رکھتا ہے اور یقیناً اس بلندی تک پہنچنے کے لیے اس اس ذات کی پیروی کرنی ہے جو پہلے سے ہی بلندیوں پر ہو۔ اگر انسان انکار کر دے کہ وہاں بلندیوں پر کوئی نہیں تو وہ یہ فاصلہ کیسے طے کرے گا؟ وہ غلط قدم اٹھائے گا اور بلندی کی چاہ میں پستی کی طرف گرے گا جیسے ٹوٹتا ہوا کوئی تارہ!

مذہب انسان کی احتیاج ہے۔ ہر زمانے میں، ہر دور میں انسان مذہب پر یقین رکھتا آیا ہے۔ مذہب سے انکار تب ہوا جب مذہب میں شدت پسندی بڑھ گئی۔ مذہب کے نام پر مار دھاڑ، قتل و غارت ہونا شروع ہوئی۔ یہ دستورِ کائنات ہے، فطرت کا قانون ہے کہ جب بھی کوئی چیز حد سے بڑھ جائے تو مٹ جاتی ہے۔ مذہب میں شدت پسندی جب بے حد ہوئی تو مذہب سے انکار کر دیا گیا۔ لوگ سائنس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے دعوہ کیا کہ وہ انسان کے بنائے کسی مذہب کے پیروکار نہیں بنیں گے۔ ان کے نزدیک ہر مذہب انسان کا اپنا بنایا ہوا ہے، جھوٹا اور من گھڑت ہے۔ یہ ملحدین کہلائے۔ یعنی وہ لوگ جن کا کوئی مذہب نہ ہو۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا بھی

ایک مذہب ہے۔ مذہب کا انکار کرنے والے یہ لوگ سائنس کو پوجتے ہیں۔ جو سائنس نے کہا وہ سچ ہے، اس پر مہر لگ گئی۔ یقیناً میں یہاں سائنس کی مخالفت نہیں کر رہا۔ میں بس یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مذہب کا انکار کرنے والے جنہوں نے دعوہ کیا کہ وہ انسان کے بنائے کسی مذہب کو نہیں مانیں گے، انہوں نے آگے جا کر انسان کی بنائی سائنس کے آگے سر جھکا دیا۔ یعنی ان کا مذہب سائنس قرار پایا گیا۔ کیا یہاں ثابت نہیں ہوا کہ انسان مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا؟

کوئی ایسی ذات، کوئی ایسے شے، کچھ قانون وضابطے انسان کی احتیاج ہیں جو اس سے ہر طرح سے برتر ہوں، جنہیں وہ خدا مان سکے۔ جس کے آگے وہ گھٹنے ٹیکے، سر جھکائے اور جس کے آگے اس کا دل لبیک کہے۔ مذہب انسان کی آزادی سلب نہیں کرتا، نہ ہی انسان پر بے جا پابندیاں لگاتا ہے۔ یہ انسان کو سلیقہ سکھاتا ہے۔ میں کھانے کے طریقے سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے چمچ پکڑنا نہیں آتا، میں بہت گندے طریقے سے کھا رہا ہوں جسے دیکھ کر ہی انسان کراہیت محسوس کرتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شخص مجھے چمچ پکڑنا سکھا دے اور مجھے بتائے کہ کھانا کیسے کھایا جاتا ہے تو کیا میں اس پر الزام دھروں گا کہ اس نے میری آزادی سلب کر لی ہے اور مجھ پر بے جا پابندیاں لگا دی ہیں؟ مذہب انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی کہے کہ مذہب نے اس کی آزادی سلب کر لی ہے اور اس پر بے جا پابندیاں لگا دی ہیں تو یقیناً جو ایک جاہل شخص ہے جس کا "سلیقے" سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اس شخص کو دھتکار رہا ہے جو اسے کھانا کھانے کا طریقہ سکھانے لگا تھا۔ ایسا شخص جہالت میں ہے اور بہت فخر سے چیخ چیخ کر اپنی جہالت کا اعلان کر رہا ہے"!!

وہ گنگ ہو گئی تھی۔ ٹکٹکی باندھے بنا پلک جھپکے وہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ جواب عین اس کی سوچ کے مطابق

لاجواب کر دینے والا تھا اور دینے والا وہی تھا۔۔ خضر نعمانی! اس نے عادت کے مطابق خاموشی سے سب کی بات سنی تھی اور پھر جب وہ بولنے پر آیا تھا تو سب کو خاموش کرا گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔۔ لاجواب کر دینے والا!!

☆☆☆

اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت ہوا تھا۔ دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی تھی۔ اس نے موبائل میز پر رکھا۔ گہری سانس لے کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ یہ سب بہت اچانک ہوا تھا۔ اسے ابھی نہیں ہونا چاہیے تھا بالکل بھی نہیں!

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں کھڑے ہو؟" اپنے کمرے سے نکلتی ازابیلا نے اسے یوں پریشان کھڑا دیکھ کر پوچھا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھتا رہا جو اب اپنے لیے کافی بنانے جا رہی تھی۔ ابھی کل ہی تو وہ ایملی کی موت کے صدمے سے دوچار ہوئی تھی اور اب اس کی ماں۔ وہ کیسے اسے یہ خبر دے گا؟

"کافی پیو گے؟" اس نے پلٹ کر زیاد سے پوچھا۔ وہ اپنی سوچوں کو جھٹکتا سر نفی میں ہلا گیا۔ وہ چپ چاپ اپنے لیے کافی بنانے لگی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ کافی بنا کر وہ اس کے پاس آئی۔ کپ میز پر رکھا اور خود صوفے پر بیٹھی۔

"اینڈریو نے رابطہ کیا؟ اسے معلوم ہوا کہ کسی کیمرا نے ان آدمیوں کو دیکھا ہے؟" وہ اس سے سوال کرتے ہوئے کافی کا کپ اٹھانے لگی۔ زیاد اسے جواب دینے کے بجائے ایک گھٹنا قالین پر ٹکائے اس کے قدموں میں بیٹھا۔ وہ حیران ہوئی۔ زیاد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ لے کر میز پر رکھا۔ وہ مزید حیران ہوئی۔ کہیں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟" وہ خاموش رہا۔ وہ مزید بے چین ہوئی۔ "زیاد تم سے پوچھ رہی ہوں۔ سب ٹھیک ہے ناں؟" وہ نفی میں سر ہلا گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آئے۔ وہ

سب کو جھٹلاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔ "کیا ہوا ہے؟ جواب دو یار۔ تم پریشان کر رہے ہوں مجھے۔" اس کی آواز تیز ہوئی تھی۔ زیاد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تھے۔

"ازا۔۔۔ تمہاری امی۔۔۔ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔" اسے لگا تھا کسی نے کوئی بھاری پہاڑ اس کے سر پر توڑا تھا۔ وہ بے یقینی سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی زیاد جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ وہ اتنا برا مذاق بھی نہیں کر سکتا تھا مگر یہ سچ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنا اچانک یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے تو یہاں سے واپس جا کر اپنی ماں کو منانا تھا۔ وہ کیسے جا سکتی تھیں؟!

"زیاد۔۔۔ یہ سچ نہیں ہے؟ ہمارے ساتھ کوئی مذاق کر رہا ہے۔ ماں ٹھیک ہیں۔۔۔ ٹھیک ہیں ناں؟" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ وہ دھیرے سے نفی میں سر ہلا گیا تھا۔ ازا نے بے اختیار اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کیے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ بس چند لمحے وہاں بیٹھی پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئی۔ وہ بے بسی سے اس کی پشت دیکھ کر رہ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تو اس نے صوفے پر بیٹھ کر اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

ازابیلا کو رونا چاہیے تھا۔ وہ رو کیوں نہیں رہی تھی؟ وہ جانتی تھی زیاد اس سے جھوٹ نہیں بولتا تھا، وہ یہ بھی یقین کرنے لگی تھی کہ کوئی اتنا برا مذاق نہیں کر سکتا۔ تو وہ رو کیوں نہیں رہی تھی؟ اگر ایک طرف اسے ازابیلا کا رویہ پریشان کر رہا تھا تو دوسری طرف اسے فکر تھی کہ اب انہیں واپس جانا پڑے گا۔ اور جب تک وہ لوٹیں گے تمام ثبوت مٹا دیے جائیں گے۔ اور وہ یہ کبھی ہونے نہیں دے گا!!

☆☆☆

وہ کمپنی میں داخل ہوا تو خلاف معمول عجیب سی خاموشی کا احساس ہوا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے لیکن بہت بدلے بدلے سے تاثرات چہرے پر لیے۔ ماتھے پر بل ڈالے وہ خیام کی سابقہ سیکریٹری کے پاس گیا جو

قریب ہی کھڑی تھی۔

"خیام سر آ گئے ہیں؟" اس کے سوال پر وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ وہ مزید حیران ہوا۔ یہ لڑکی کبھی اتنی شرافت سے اسے جواب نہیں دیتی تھی۔ "یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟" لڑکی نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم نہیں جانتے؟"

"کیا نہیں جانتا؟" اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"آج صبح۔۔ ابراہم وارلڈ کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔" اس کے کان میں سرگوشی کی گئی تھی۔ اس نے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا۔ "واقعی؟" وہ لڑکی اثبات میں سر ہلا گئی۔ اس نے تاسف سے لب سکیڑے۔ ایک نگاہ اس لڑکی پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ خیام کے آفس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اندر سے مثبت جواب آنے وہ اندر آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح کوٹ کرسی کی پشت پر ڈالے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، رسٹ واچ میز پر رکھے اس کا مغرور باس لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم سر!" اس نے کھنکھارتے ہوئے سلام کیا۔ گویا خیام کے تاثرات دیکھنا چاہے۔

"وعلیکم السلام۔ پانچ منٹ لیٹ ہو۔" سنجیدگی سے جواب دے کر اسے آگاہ کیا گیا۔ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے گی مگر اس کے باس کے چہرے سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہو گا کہ وہ اس وقت کیا محسوس کر رہا ہے اور کیا سوچ رہا ہے؟!

"سوری سر۔" اس نے پشیمانی ظاہر کرتے ہوئے سر جھکایا۔ خیام نے ٹھہر کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کئی پل چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر لیپ ٹاپ بند کر کے ایک طرف رکھا۔

"سر اٹھاؤ مصعب!" اس نے سر اٹھا کر خیام کو دیکھا تھا۔ "بندھے ہوئے ہاتھ کھولو۔" اس نے ایک بار پھر حکم کی تعمیل کی۔ "اب بیٹھو۔" وہ اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "سر کیوں جھکایا تھا اور ہاتھ کیوں باندھے تھے؟" اس کے چہرے پر نرمی تھی البتہ لہجے میں سختی تھی۔ وہ بیک وقت ان دو متضاد تاثرات پر حیران ہوا تھا۔

"آپ باس ہیں۔ میں دیر سے آیا تھا تو معافی مانگنا چاہیے تھی ناں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اور کس نے کہا ہے کہ معافی مانگتے ہوئے سر جھکاتے ہیں اور ہاتھ باندھتے ہیں؟"

"یہ تو۔۔۔یہ ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ میں واقعی شرمندہ ہوں۔" وہ گڑبڑایا۔

"تو کیا تم ہو؟" اور یہاں بدر کی بس ہوگئی۔ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے نفی میں سر ہلا گیا۔ خیام نے گہری سانس لی تھی۔

"انسانوں کے آگے سر مت جھکایا کرو مصعب! چاہے وہ تم سے کتنے ہی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض دفعہ بہت بلند مقام پر موجود شخص بھی اللہ کی نظر میں سڑکوں پر بھیک مانگنے والے سے زیادہ حقیر ہوتا ہے، اور سڑک پر بھیک مانگنے والا شخص اللہ کی نظر میں بہت بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ تمہارا یوں سر جھکانا تمہارے سامنے کھڑے شخص کو تکبر میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اور جانتے ہو تکبر کی سزا کیا ہے؟ کیا ابلیس نے تکبر کیا تھا تو اللہ نے اس پر قیامت کے لیے لعنت و پھٹکار نہیں بھیجی؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کہا تھا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا؟

مصعب انسان کو انسان رہنے دینا چاہیے۔ انسان جب خدا بننے پر آتا ہے تو خدا کی مخلوق پر قہر بن کر ٹوٹتا ہے۔ اور انسان خدا خود نہیں بن جاتا۔ جیسے ایک بادشاہ خود کو سب سے اعلیٰ یونہی نہیں سمجھتا۔ اس کے دماغ میں یہ بات خوشامدی ڈالتے ہیں۔ اور ایسے لوگ جو اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر اپنا فائدہ حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جو خود کو خدا سمجھتا ہے اس میں اس کے ارد گرد کے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تمہارا کسی کے آگے سر جھکانا مقابل کو یہ سوچ دیتا ہے کہ وہ واقعی اس قابل ہے کہ اس کے آگے سر جھکایا جائے۔ آج تم جس کے آگے سر جھکا رہے ہو اگر وہ واقعی خدا بن کر بیٹھ گیا تو وہ تم ہو گے جو سب سے زیادہ اس کے ہاتھوں ذلیل ہو گے۔ وہ تمہیں ذلیل کر کے یہ ثابت کرے گا کہ وہ اعلیٰ مقام پر ہے اور تم حقیر ہو!! کیا تم واقعی حقیر ہو؟ جس طرح کمہار برتنوں کو محبت سے بناتا ہے، جس طرح آئینہ ساز پوری جان لگا کر محبت اور خلوص کے ساتھ ایک آئینے کو وجود دیتا ہے اسی طرح اللہ نے تمہیں بھی محبت سے بنایا ہے۔ اور یہ اللہ کی محبت کا تقاضا ہے کہ یہ سر اس کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے۔ تم ملازم ہو، کسی اعلی مرتبے پر فائز یا پھر معمولی سے معمولی ملازم! تمہارا سر کبھی کسی کے آگے نہ جھکے۔ تم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔ کیونکہ وہ صرف ایک ہی ذات ہے جس کے آگے انسان کی نگاہیں ہی نہیں مکمل انسان جھکتا ہے۔ کیا سمجھے؟" ہمیشہ کی طرح اپنی بات کے اختتام پر اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ بدر مبہوت سا اسے دیکھتا مسکرا دیا۔

"یہی کہ۔۔۔ میں بہت قیمتی ہوں اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ میں بے مول نہیں ہوں، خیام سر!" اس کی بات اسی کو لوٹائی گئی تھی۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"ہاں تم بے مول نہیں ہو۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے اقرار کیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"وارلڈ سر سے تعزیت کرنے۔ تم بھی آ رہے ہو۔" اس نے اپنا کوٹ پہنتے ہوئے کہا تھا۔ بدر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ رسٹ واچ کلائی میں ڈالتے ہوئے خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔ "میں نے کہا تھا کہ ڈیوڈ کی موت سے پہلے جس جس نے اسے دیکھا وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات یاد کر کے مجھے دے گا۔ تم بھی یہ کام کرو گے"!

”لیکن میں تو اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔“ وہ منمنایا۔

”کیا وہ تم سے کبھی نہیں ملا؟“ وہ دروازے کی جانب جاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”جس دن اس کا قتل ہوا تھا اس سے ایک دن پہلے وہ مجھے ملا تھا۔“ دروازے کھولتا خیام ٹھہر گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔ ”تم اس بارے میں ضرور لکھو گے!!“ اسے حکم دے کر وہ آفس سے نکل گیا۔ بدر نے گہری سانس لے کر اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ اسے اب فارغ ہوتے ہی اس حکم کی تعمیل کرنا تھی۔

☆☆☆

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ توقع کے عین مطابق شام تک تدفین ہو چکی تھی۔ صحن میں مہمان جمع تھے جنہوں نے گھر کے افراد کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ایک طرف اتنی بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی اور دوسری طرف سب کے اپنے غم تھے اسی لیے کسی کا دھیان اس اجنبی کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس کی نگاہیں صحن کے وسط میں سر ہاتھوں میں گرائے مسلسل آنسو بہاتی اس عورت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ قانتہ کی بہن تھی۔ وہ عورت جسے اس نے اپنی ماں بتلا کر ازابیلا سے اس کا تعارف کروایا تھا، وہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔ وہ یہاں ان سے فاصلے پر کھڑا تھا مگر باآسانی بتا سکتا تھا کہ وہ عورت کیا بڑبڑا رہی تھی۔ اس کی آواز دھیمی تھی مگر وہ بھی اچھی سماعت رکھتا تھا۔

”قانتہ کی بیٹی کہیں نظر نہیں آ رہی۔“ محلے کی کسی خاتون نے آواز لگائی۔ اور پھر جو ہوا تھا وہ اسے حیران کر گیا تھا۔ قانتہ کی بہن اپنا رونا دھونا بھول کر چیخ اٹھی تھی۔

”نہیں ہے اس کی کوئی بیٹی سنا تم نے!! قانتہ کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔۔!“ وہ ایکدم سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔ محلے کی تمام عورتوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ گھر والے اسے خاموش کروانے کے لیے آگے بڑھے مگر وہ سب کو جھٹکتی باآواز بلند چیخنے لگی تھی۔

"میں ازابیلا کی بات کر رہی ہوں دعا۔" وہ عورت منمنائی تھی۔

"نام مت لو اس منحوس لڑکی کا۔ وہ میری بہن کی بیٹی نہیں ہے۔ صرف اس کی وجہ سے میری بہن پر یہ وقت آیا ہے۔ میری بہن اس کی وجہ سے اپنی ساری زندگی ذلیل و خوار ہوتی رہی ہے۔ وہ اور اس کا باپ دونوں قاتل ہیں میری بہن کے!!" کسی نے آگے بڑھ کر چیختی چلاتی اس عورت کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس عورت کا باپ اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے کر گیا۔ محلے کے تمام لوگ انگشتِ بدنداں حیرت سے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ آپس میں چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے سب کی نظروں سے بچتا گھر سے نکل آیا۔ اس کا اب یہاں رہنا بے کار تھا۔ گاؤں کی تنگ گلیوں میں الجھے ہوئے سوال ذہن میں لیے اس نے کان میں لگا آلہ آن کیا۔

"ازابیلا۔۔ وہ قانتہ کی سگی بیٹی نہیں ہے۔" اس کی سرگوشی پر ایک لمحے کے لیے سب حیران ہوئے تھے۔ کئی رازوں سے پردہ اٹھ رہا تھا، اور کئی سے پردہ اٹھنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"ازا بیٹے کہاں ہو؟ ازا۔۔ ازا نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" یہ آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں دبکی گھٹنوں کے گرد بازو پھیلائے اپنا سر گھٹنوں میں دیے اپنی سسکیاں دبا رہی تھی۔ خوف نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ پانچ سالہ ازابیلا جس کا ننھا وجود دھیرے دھیرے خوف سے تھرتھرا رہا تھا۔ وہ سن سکتی تھی ان قدموں کی چاپ جو اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے آواز قریب آ رہی تھی اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے مزید خود میں سمٹنے کی کوشش کی۔ آنسو گرم سیال کی مانند گالوں پر بہتے رہے۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ آؤ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" اس کی ماں نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں خوف تھا، بے پناہ خوف۔

"مجھے یاد نہیں۔۔ میں بھول گئی۔" اس کے منہ سے سسکی نکلی۔ اس کی ماں نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا تھا۔ وہ چیخ اٹھی تھی۔ پے در پے کئی تھپڑ اس کے نرم گالوں پر برسائے گئے تھے۔ وہ چیختی رہی تھی، روتی رہی تھی۔

کوئی اپنی معصوم بیٹی کے ساتھ اس قدر ظلم کیسے کر سکتا ہے؟ وہ اکثر یہ سوچا کرتی تھی۔ تب تب جب اس کی ماں اسے نماز یاد کرواتی تھیں اور وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی آیت یا ارکانِ نماز میں سے کوئی رکن بھول جاتی اور اس کی ماں اسے سزائیں دیتی۔ کبھی جھلساتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑا کر کے کہتی تھی کہ یہی اس کا انجام ہو گا اگر اس نے نماز یاد نہ کی تو۔ کبھی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں مزید تازہ کر کے کہا جاتا تھا کہ یہ تکلیف اس تکلیف سے بہت کم ہے جس میں اسے جہنم میں مبتلا کیا جائے گا۔ اسے اپنی ماں کی ہر ہر بات یاد تھی۔ وہ اسے کبھی بھلا ہی نہیں پائی۔

اس کی ماں اس کے باپ کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھاتی تھی۔ وہ حیران ہوتی تھی کہ باپ سگا ہے تو کس قدر محبت دیتا ہے۔ ماں بھی تو سگی ہے تو اس قدر تضاد کیوں؟ ابراہم کے آگے اس کی ماں نے نہ کبھی اسے جھڑکا، نہ ڈانٹا اور نہ اس پر ہاتھ اٹھایا۔ اور دس سال کی عمر میں وہ یہ سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی کہ اس کی ماں اس کے باپ سے ڈرتی تھی۔ اس نے اس ڈر کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور آئندہ کبھی اس کی ماں اس پر دباؤ نہ ڈال سکی۔ اور آج۔۔۔ آج وہ سوچ رہی تھی کہ اب جب اس کی ماں مر چکی ہے تو کیا اس کے تمام تر مظالم کے باوجود جو اس نے ایک معصوم بچی پر ڈھائے، اس کی ماں کا مہربان خدا اسے اس جنت میں ڈال دے گا جس کا اس کی ماں ذکر کرتی تھی؟ کیا وہ وہاں

بہت خوش ہو گی؟ وہ چاہ کر بھی ان سوچوں کو جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ اسے یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا، بلکہ اسے تو اپنی ماں کے لیے بہترین کی امید رکھنی چاہیے تھی مگر ان زخموں کا کیا جو آج پھر ہرے ہو گئے تھے؟

اس نے دھیرے سے آنکھیں موندتے ہوئے سر بیڈ کراؤن پر ٹکایا تھا۔ سوچوں کا ایک دریا تھا جس میں وہ بہتی جا رہی تھی۔ اس نے اس دریا پر بند باندھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اور آخر یہی حل نظر آیا کہ وہ تنہائی سے نکلے۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ لاؤنج میں آئی تو زیاد وہیں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کوشش کی ہے مگر مجھے کوئی آج کی فلائٹ نہیں مل رہی۔ تم کہو تو ابراہم انکل سے بات کروں وہ کوئی بندوست کر دیں گے۔"

"فلائٹ کس لیے؟" وہ چونکی۔ زیاد نے آنکھیں سکیڑ ے اسے دیکھا۔

"تھائلینڈ کے لیے۔ تم جانا نہیں چاہتی؟"

"جا کر کیا کروں گی؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ازا۔۔ تمہاری ماں کا انتقال ہوا ہے۔ تم واقعی نہیں جانا چاہتیں؟" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

"میں کام مکمل کر کے جاؤں گی۔"

"ازا۔۔" نرمی سے کہتا وہ اس کے برابر میں بیٹھا۔ "تم روئی ہو؟" وہ دھیرے سے نفی میں سر ہلا گئی۔ وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔

"تم چاہتے ہو میں روؤں؟"

"شاید۔۔یہ تمہارے لیے اچھا ہو گا۔"

"تم بھی تو نہیں روئے۔۔تمہاری بھی تو پھوپھو تھیں وہ۔۔" وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اب نہیں روئیں تو کبھی نہیں رو پاؤ گی!" وہ اسے آگاہ کر رہا تھا۔وہ مسکرا دی۔"نہیں روؤں گی۔" اعتماد سے کہا گیا۔وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔

"اگر تم اپنا فیصلہ بدل لو تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔" وہ نرمی سے اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے کہہ رہا تھا۔وہ ہلکا سا مسکرا دی۔اسے یقین تھا وہ اب آئندہ بھی کبھی نہیں روئے گی۔اور یہ کہ اسے زیادہ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔وہ انجان تھی کہ۔۔۔زمانہ کبھی انسان کو اس تیزی سے کاٹتا ہے کہ خود سے کیا ہر وعدہ بھلا دیتا ہے۔پھر تمام زخم ہرے ہو جاتے ہیں اور کوئی مرہم کام نہیں کرتا۔زمانے کے دیے گئے زخموں پر بس وقت ہی مرحم لگا سکتا ہے، بھلے کچھ وقت کے لیے ہی سہی!!

☆☆☆

اس کی نگاہیں اپنے ہاتھوں پر ٹکی تھیں۔گندمی رنگ کے سخت مردانہ ہاتھ۔۔وہ ہاتھ جو کسی کی جان لیتے ہوئے ذرا بھی کپکپاہٹ کا شکار نہیں ہوئے تھے۔صرف چند لمحوں کے اندر وہ سانحہ ہوا تھا اور وہ۔۔مائک بار بارا ایک قاتل بن چکا تھا۔اپنے باپ کی جان بچانے کی خاطر وہ قاتل بن چکا تھا۔اور اسے قاتل بنانے والا اسی کا اپنی بھائی تھا!اسے قسمت کے اس مذاق پر ہنسی آئی تھی۔اس کا باپ تمام عمر جس بیٹے پر فخر کرتا آیا تھا، آج وہ اسی بیٹے سے اپنے باپ کی جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔اس بھیک کے لیے وہ ہر کام کر رہا تھا۔وہ اچھا بیٹا نہیں تھا نہ ہی ایک اچھا انسان۔وہ اچھا بن بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ برا بھی تو نہیں تھا۔اچھائی اور برائی کی اس جنگ میں وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بے بس تھے۔اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔وہ ہمیشہ سے بزدل تھا، اسی بزدلی کی مار مرنے والا تھا!!

”تم یہاں بیٹھے ہو؟ میں نے تمہیں آفس بلایا تھا۔“ سخت اور بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ہنوز اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے کھڑے مارک نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا۔

”وہ چھوٹا بچہ تھا۔۔۔ معصوم سا جو دنیا کے فریبوں سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کی کُل دنیا اس کے ماں باپ اور بڑے بھائی کے گرد گھومتی تھی۔ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش تھا۔۔۔ لیکن بس تب تک جب تک اس نے دنیا کو سمجھنا شروع نہیں کیا تھا۔“ اپنے ہاتھوں کو آپس میں ہلکا سا رگڑتے ہوئے وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ مارک نے اس کے چہرے کو پڑھنا چاہا تھا۔ وہاں ماسوائے دکھ اور بے بسی کے کچھ نہیں تھا۔ ”دنیا کو سمجھنے کے لیے پہلے گھر کو سمجھنا پڑتا ہے۔ گھر والوں کو، ان کے رویوں کو محسوس کرنا پڑتا ہے۔ اس بچے نے بھی یہی کیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا باپ ہر معاملے میں اس کا مقابلہ اس کے بھائی سے کرتا تھا۔ تمہارے بھائی نے پڑھائی کے میدان میں اتنے تیر مارے ہیں تم نے کیوں نہیں؟ یہ وہ۔۔۔ ہر معاملے میں اسے اس کے بھائی سے کمتر محسوس کروایا جاتا۔ نتیجہ وہی نکلا جو بچوں کے ساتھ ایسے رویوں پر نکلتا ہے۔ وہ بدتمیز، پھوہڑ، بزدل بنتا چلا گیا۔ اس کی ماں زندگی کے ہر قدم پر اس کے ساتھ تھی مگر یہ کافی تو نہیں تھا۔ اسے اپنے باپ اور بھائی کا ہاتھ تھام کر میدان میں اترنا تھا مگر یہ کبھی ممکن ہی نہیں ہوا۔ اور پھر ایک دن۔۔۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ قاتل ہے۔ کئی معصوم لوگوں کا قاتل، ایک فسادی، دہشتگرد۔ اس نے جانا کہ اس کا باپ اچھا انسان نہیں ہے۔ مزید حیرت اسے تب ہوئی جب اس کا بھائی بھی اسی میدان کا کھلاڑی نکلا۔ ایک قاتل!!“ وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ مارک نے سختی سے لب بھینچے۔ ”اس دن اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی اپنے باپ اور بھائی جیسا نہیں بنے گا۔ وہ ان سے نفرت نہیں کر پایا مگر پھر ان سے محبت بھی نہیں رہی۔ وہ بچہ۔۔۔ اپنے باپ اور بھائی سے مزید دور ہوتا چلا گیا۔ اس کی ماں بھی اس کے باپ اور بھائی کے عتاب کا نشانہ بنی۔ وہ اس وقت بھی خاموش رہا۔ اور پھر ایک دن ایسا آیا جب اسے اپنے باپ اور بھائی میں سے کسی

ایک کو چننا پڑا۔۔" وہ ٹھہر گیا۔ نگاہ اٹھا کر مارک کو دیکھا جو سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔"اس نے اپنے باپ کو چنا۔ کیونکہ اس کا باپ ایک حد تک گرا ہوا انسان تھا لیکن وحشی درندہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے باپ کی خاطر بنا کسی خوف کے، بنا رکے ایک لمحے میں ایک انسانی جان لے لی۔ وہ اپنے باپ کے لیے قاتل بن گیا اور اسے قاتل بنانے والا اس کا بھائی تھا!! جانتے ہیں وہ بچہ کون ہے؟" اس کے پوچھنے پر مارک خاموش رہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک قدم آگے بڑھا۔"وہ بچہ میں ہوں۔ مائنک بار بارا۔ اور اس کا بھائی مارک ایک وحشی درندہ جس نے اپنی ماں کو ایک ناکارہ وجود میں بدل دیا۔ جس نے اپنے باپ کو ایک مُہرے کی طرح استعمال کیا۔ وہ ایک انتہائی گرا ہوا درندہ ہے جو درندگی کی تمام حدیں پار کر چکا ہے۔ عنقریب وہ وحشی درندہ۔۔"

"مائنک!!" وہ دھاڑا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور پوری قوت سے مائنک کے گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔ چٹاخ کی تیز آواز گونجی تھی۔ اس کی دھاڑ پر بھاگ کر آتے ملازمین سناٹے میں رہ گئے تھے۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہوں نے مائنک کو دیکھا تھا جو لال گال لیے ہونٹوں کے کنارے سے خون صاف کرتا سر جھٹک کر ہنس دیا تھا۔

"برا لگا؟ حقیقت میں کتنی کڑواہٹ ہوتی ہے اندازہ ہوا؟"

"تم سب یہاں کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے!!" وہ ملازمین پر چلایا تھا۔ سب تیزی سے وہاں سے کھسک گئے تھے۔

"اب کیا کریں گے؟ ماں کا منہ بند کروانے کے لیے انہیں فالج کا مریض بنا دیا، چچا کو مروا دیا، بابا کی جان لینے کے درپے ہیں اور اب رہ گیا میں۔ میرے ساتھ کیا کرنے والے ہیں؟"

"تمہارے ساتھ جو ہوگا، وہ تم خود کرو گے"!

"تو کیا قتل کرنے کے بعد پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال کر خبر اڑا دیں گے بزدل مائنک نے خودکشی کر لی؟" وہ گردن

گرا کر ہنسا۔ مارک نے سختی سے مٹھیاں بھینچیں۔ "آپ جانتے ہیں بھائی۔۔ میں نے خود سے وعدہ لیا تھا کہ کبھی آپ جیسا نہیں بنوں گا۔ لیکن اب مجھے خود میں اور آپ میں بہت کم فرق دکھائی دے رہا ہے۔ بہت تھوڑا سا۔۔ کیونکہ میرے پاس آئیڈیل کے طور پر بس آپ اور بابا ہی تو تھے۔ آپ کو دیکھ کر ہی تو بڑا ہوا ہوں، اور نا چاہتے ہوئے بھی آپ جیسا بن گیا ہوں۔ سفاک قاتل! اور فکر مت کریں۔۔ سب جانتے ہوئے بھی مائک کبھی آپ کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپے گا۔ یہ کام آپ پر زیب دیتا ہے، میں کروں گا تو غدار کہلاؤں گا۔ آپ کریں گے تو خاندان کی عزت بچانے والا ہیرو بنیں گے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ "صبح ملتے ہیں۔" دھیرے سے اس کے آگے سر جھکایا پھر پلٹ گیا۔ مارک وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ اسے آئینہ دکھا کر جا رہا تھا، یہ اس کا خیال تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ مائک خود مارک کا آئینہ تھا جس میں اس نے اپنا عکس دیکھا تھا۔ سفاک وحشی درندہ!!

☆☆☆

جس فون بوتھ سے ڈیوڈ نے خیام کو کال کی تھی، وہ اس کے قریب قریب تمام کیمراز کی اس دن کی رکارڈ کی گئی فوٹیجز دیکھ چکی تھی مگر کہیں کچھ مشکوک نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی تھی، ارد گرد کھڑے تمام لوگوں کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھا تھا مگر سب معمول کے مطابق تھا۔ کہیں کچھ مشکوک یا توجہ طلب نہیں تھا۔ دسویں بار تمام فوٹیجز دیکھنے کے بعد اس نے تھک کر کرسی پر سر ٹکایا۔

"مسٹر اینڈریو۔۔" وہ ایکدم سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ ازابیلا کم از کم آج کی تاریخ میں اس سے رابطہ کرے گی۔ وہ ایک لڑکی تھی، اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ آج کی تاریخ میں اسے جو کام توجہ سے کرنا چاہیے تھا وہ تھا رونا۔ بس رونا۔۔ لیکن وہ اس سے رابطہ کر رہی تھی۔ کہیں کچھ غیر معمولی تھا یا پھر یہ لڑکی ہی غیر معمولی تھی!

”جن آدمیوں نے اس لڑکے کے گھر والوں کو یرغمال بنایا تھا، وہ ایک بار ایئرپورٹ پر دیکھے گئے ہیں۔ اس دن جب ایملی نیویارک آئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ اس ہوٹل کے پاس دکھائی دیے گئے ہیں جہاں ایملی مقیم تھی۔ بعد ازاں وہ چند دن کے لیے غائب رہے ہیں۔ کسی کیمرا نے انہیں نہیں دیکھا۔ ایملی کی موت والے دن وہ اسی پُل کی طرف جاتے دکھائی دیے گئے ہیں جہاں سے ایملی کو مار کر پھینکا گیا۔ اور آج سے ٹھیک ایک دن، دو گھنٹے، بیس منٹ اور پچیس سیکنڈ پہلے وہ ایک کلَب میں نظر آئے ہیں۔“ وہ سانس لینے کو رکی۔ ٹھہر کر اسکرین پر نظر آتی کلب کی تصویر کو دیکھا پھر گویا ہوئی۔ ”یہ کلب حال ہی میں جیکسن نامی آدمی نے خریدا ہے۔ یہ دیکھنے میں تو عام سا کلب ہے مگر یہاں پائے جانے والے بیشتر افراد قاتل ہیں۔ کچھ کا تعلق دہشتگرد تنظیموں سے ہے۔ آپ کو جن لوگوں کی تلاش ہے، وہ بھی یہیں مقیم ہیں۔ میں ایڈریس بھیج رہا ہوں۔ آگے آپ جو کہیں۔۔!“ اس نے بات ختم کر کے ایڈریس ازابیلا کو بھیج دیا۔

”میں کچھ دیر میں آپ سے رابطہ کرتی ہوں۔“ ازابیلا کی طرف سے پیغام موصول ہوا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اس سے دوبارہ رابطہ نہیں کرے گی۔ اس کلب میں اسے جو کچھ دیکھنے کو ملنے والا تھا، اس کے بعد یقیناً وہ اگلی فلائٹ سے تھائلینڈ پہنچ جائے گی!!

”استاد جی۔۔ آپ کو کوئی کام ہے؟“ اس نے دراز سے اسنیکس کا پیکٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

”اگر تم اسنیکس کھانے لگی ہو تو میں رابطہ منقطع کرنے لگا ہوں۔ خدا حافظ!“ اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے منہ بسور کر سامنے دیوار میں نسب اسکرین میں نظر آتے خیام کو دیکھا جو اپنے سامنے کاغذات کا پلندہ رکھ کر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا بدر کانوں میں ہینڈ فری لگائے سونے کی تیاریوں میں تھا۔

”اس کی بھی کیا زندگی ہے۔ آفس آؤ اور سو جاؤ۔“ اس نے حسرت سے کہتے ہوئے اسنیک منہ میں ڈالا۔ کرسی پر

جھولتے ہوئے اسنیکس کا مزہ لیتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے اسکرین پر جگمگاتے ایک پیغام پر ٹکی۔ وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ اسنیکس ایک طرف رکھے اور پیغام کھولا۔ جیسے جیسے وہ پیغام پڑھتی جارہی تھی اس کی آنکھوں میں حیرت ابھر رہی تھی۔ پیغام مکمل ہوتے ہی نیچے بھیجنے والے کا نام دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ ہوش میں آتے ہی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ کرسی سے اٹھی۔ کرسی کی پشت پر لٹکتا اپنا کوٹ اٹھایا، موبائل لیا اور تیزی سے باہر کو لپکی۔ اس پیغام کے موصول ہونے کے بعد وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرسکتی تھی۔۔ کوٹ پہنتے ہوئے زینے پھلانگ کر نیچے کی طرف جاتے ہوئے وہ بھول گئی تھی کہ اسے خیام کو بھی اطلاع دینی تھی!!

☆☆☆

وہ دنگ رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بنا جھجھکے ٹریگر پر زور دیا گیا تھا۔ پستول سے نکلتی گولی نے تیزی سے اس شخص کے دماغ کو چیرا تھا۔ خون دھار کی صورت میں اس کے چہرے پر بہنے لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ سناٹے میں رہ گئی تھی۔ سانس لینا دشوار لگا تھا۔

”ازا چلو یہاں سے۔“ زیاد نے تیزی سے اس کا بازو پکڑا۔ وہ فوراً اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑوا کر آگے بڑھی۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ اسے کلائی سے پکڑ کر دیوار کی اوٹ میں کیا۔ ”کیا کر رہی ہو؟ پاگل ہو گیا؟ دیکھ نہیں رہیں وہ کتنے خطرناک ہیں۔ ایک سیکنڈ میں تمہاری جان لے لیں گے۔“ وہ غصے سے غرایا تھا۔

”وہ۔۔ قاتل ہیں۔۔ ایملی کے۔۔ اور اب اس شخص کے۔“ اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ چہرے پر بے یقینی تھی۔ کوئی اتنا سنگدل کیسے ہو سکتا ہے؟ صرف ایک لمحے میں بنا کسی جھجک کے اتنی صفائی سے انسانی جان کوئی کیسے لے سکتا ہے؟

”ازا! یہ لوگ روزانہ نجانے کتنوں کو قتل کرتے ہیں۔ تم کس کس سے لڑو گی؟“ وہ نرمی سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

"صرف اس سے جو یہ سب کروا رہا ہے!" اس بار اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ وہ کمزور نہیں پڑ سکتی تھی۔ بالکل بھی نہیں!

"اور یہ ڈھونڈنے کا ہم کوئی اور طریقہ نکال لیں گے، ٹھیک ہے؟" وہ اسے بچوں کی طرح بہلانے لگا۔ ازابیلا کی نگاہ کلب سے نکلتے اس شخص پر پڑی۔ وہ سفید رنگ کی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ نیلے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس پوری شان کے ساتھ۔ وہ اس شخص کو جانتی تھی۔ یہ شخص مائک کے بہت قریب تھا۔ غالباً اس کا رائٹ ہینڈ!

"مجھے لگتا ہے اس کی ضرورت نہیں ہے اب۔" زیاد نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس کی نگاہیں اس کے عقب میں تھیں۔ زیاد نے پلٹ کر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ سفید رنگ کی وہ گاڑی اب سڑک پر دوڑتی دور جا رہی تھی۔ اس نے واپس ازابیلا کو دیکھا جس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔

"ازا؟"

"ہم واپس جا رہے ہیں، تھائلینڈ۔ اب یہاں کوئی کام باقی نہیں رہا۔" سخت لہجے میں کہتی وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ چند پل ناسمجھی سے اس کی پشت دیکھتا رہا پھر جلدی سے جیکٹ کی جیب سے موبائل برآمد کیا۔ اس سفید گاڑی کی نمبر پلیٹ کا نمبر اینڈریو کو بھیجا پھر اپنے کان میں لگے آلے کی طرف متوجہ ہوا۔

"مسٹر اینڈریو کیا آپ اس گاڑی کو ٹریس کر سکتے ہیں؟"

"سروِس موجود نہیں ہے۔ اینڈریو کو پریشان کرنے کے بجائے اپنا پیغام چھوڑ دیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا!" عجیب کارٹونوں جیسی آواز تھی۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ اس ایڈریس پر پہنچ چکی تھی جہاں اسے بلایا گیا تھا۔ یہ ایک کیفے تھا۔ اس وقت یہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اردگرد کئی میزیں خالی تھیں۔ وہ کاؤنٹر سے امیریکانو لے کر ایک میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ فرصت سے طائرانہ نگاہ اردگرد خوش گپیوں میں مصروف لوگوں پر ڈال کر اس نے اپنا ہینڈ بیگ میز پر رکھا۔ ناک سے پھسلتے چشمے کو واپس ناک پر ٹکا کر لمبی سانس لی تو چشمہ دھندلا ہو گیا۔

"اس کا بھی اپنا مزہ ہے۔" وہ محظوظ ہوئی تھی۔ سبز رنگ کے ٹخنوں کو چھوتے گاؤن میں ملبوس، ہلکے بھورے رنگ کا حجاب اوڑھے، چہرے کو ماسک سے ڈھکے وہ ہمیشہ کی طرح سب میں منفرد نظر آ رہی تھی۔ ناک پر ٹکا گول شیشوں والا چشمہ اسے معصومانہ سا روپ دیتا تھا۔ آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح معمولی سی نمی چمک رہی تھی جو اب چشمے کی وجہ سے ایک حد تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہتی تھی۔ وہ مزید رسک نہیں لینا چاہتی تھی، بالکل بھی نہیں۔

اس نے ایک نگاہ اپنے سامنے میز پر رکھی امیریکانو پر ڈالی۔ کیفے کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اس نے گردن دائیں جانب گھما کر دروازے کی طرف دیکھا، پھر بائیں جانب گھما کر کسی بھی قسم کی صورتحال سے بچنے کے لیے فرار کا کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہا۔ وہ ابھی اسی کام میں مصروف تھی کہ کوئی اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دائیں ابرو اٹھا کر سامنے بیٹھتے شخص کو دیکھا۔ کیفے کے دروازے سے اندر آتے مارک کے قدم وہیں ٹھہر گئے۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا متلاشی نگاہوں سے اردگرد دیکھتا رہا پھر واپس پلٹ گیا۔ سعاد کے سامنے بیٹھا شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے اپنی پی کیپ سر سے اتار کر میز پر رکھی۔

سیاہ بال جن پر کہیں کہیں سفیدی چمک رہی تھی۔ گندمی رنگت کی چوڑی پیشانی، ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں، کھڑے نقوش، چہرے پر سنجیدگی لیے اس کے سامنے بیٹھا یہ شخص اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس کی آنکھوں

میں ابھرتے اجنبیت کے تاثر کو دیکھ کر وہ شخص ہلکا سا مسکرا دیا۔

”کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟“ اس نے بھنویں ملائے سوال کیا۔

”نہیں۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ میں۔۔۔ عالیان بن اعظم!“ آواز بھاری تھی جس میں رعب کی جھلک تھی۔ وہ مرعوب ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ ”تم سعاد ہو ناں؟ سعاد یوسف زئی؟“

”معذرت کے ساتھ لیکن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ شاید کسی اور کو تلاش کر رہے ہیں، اور میں وہ نہیں ہوں۔ میں یہاں کسی سے ملنے آئی ہوں، میرا وقت مت ضائع کریں۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ وہ شخص جو اپنا نام عالیان بتا رہا تھا ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

”جانتی ہو میں نے تمہیں کیسے پہچانا؟ تمہاری آنکھیں۔۔ یہ بالکل دحیہ جیسی ہیں۔ اور انداز بھی۔ تم بالکل اپنے باپ پر گئی ہو۔“ وہ ایک لمحے کو دنگ رہ گئی تھی۔ سامنے بیٹھا شخص اس کے لیے قطعی اجنبی تھا، مگر اس کے بارے میں سب جانتا تھا۔ کیسے؟

”دیکھیے میں آپ سے کہہ رہی ہوں آپ کو غلط فہمی۔۔۔“

”جندل کیسا ہے؟ سنا ہے وہ بھی یہاں ہے۔“ اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ وہ چپ ہو گئی۔ وہ کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھی، نہ ہی اپنی حیرت کو ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا اس نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ ”وہ چھوٹا تھا جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ وہ بالکل اپنے ماموں پر گیا ہے۔ ہر طرح سے وہ عالیان جیسا ہے۔“ وہ محسوس کر رہی تھی کہ سامنے بیٹھے شخص کے لہجے میں ان کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ یہ شخص اس کے دشمنوں میں سے نہیں ہو سکتا تھا مگر باوجود اس کے وہ اس پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کی تمام باتوں کو نظرانداز کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ان سب فضولیات کے لیے کسی اور کو تلاش کر لیں۔" طنزیہ انداز میں کہتی سپاٹ چہرہ لیے وہ پلٹ گئی۔ وہ شخص چپ چاپ مایوسی سے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔ وہ کیفے سے نکل کر تیزی سے دیوار کی اوٹ میں ہوئی تھی۔ آنکھیں موند کر گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا پھر ذرا سا سر نکال کر کیفے کے دروازے کو دیکھا۔ وہ شخص وہاں سے نکل کر دائیں طرف کو جاتی سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اس کے تعاقب میں قدم بڑھا دیے۔ وہ بہت فاصلے سے اس کا تعاقب کرتی اس کے پیچھے کیفے سے کچھ دور نکل آئی تھی۔ وہ شخص کسی تنگ گلی میں مڑا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد وہ بھی اسی گلی میں آئی مگر یہ دیکھ کر وہ حیران ہوئی کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ گلی اتنی لمبی تھی کہ کوئی بھی ایک منٹ میں اسے پار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شخص اچانک کیسے غائب ہو سکتا تھا؟

وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ گلی کے نکڑ پر رک کر اس نے ارد گرد دیکھا پھر احتیاط سے گلی کا موڑ مڑ گئی۔ جیسے ہی وہ اگلی گلی میں داخل ہوئی کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے دیوار سے لگایا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ سامنے کھڑے شخص کے پیٹ میں لات مار کر اس کی گرفت سے آزاد ہوئی اور پلٹ کر اس کے چہرے پر وار کیا۔ وہ شخص تیزی سے جھکا، اس کا وار ضائع گیا۔ اس نے فوراً اس کی ٹانگوں میں اپنے پاؤں پھسا کر اسے گرانا چاہا مگر وہ شخص اس وار سے بھی بچ گیا۔ وہ سانس لینے کو رکی۔ عالیان نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے سر کو خم دیا۔

"کافی ہوشیار ہو۔ تمہاری اچھی تربیت ہوئی ہے۔" تحسین کے انداز میں گیا۔ وہ سختی سے مٹھیاں بھینچ گئی۔

"کون ہیں آپ؟"

"جاننا ضروری تو نہیں۔"

"آپ میرے متعلق سب جانتے ہیں اور میں آپ کے متعلق کچھ بھی نہیں۔ یہ زیادتی نہیں؟" اس نے کاٹ دار

لہجے میں کہا۔

”ہے تو لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ کندھے اچکا گیا۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ بول اٹھا۔ ”سنو سعاد! اگلی بار خیام کو بتائے بنا یوں باہر مت نکلنا۔ یہ تمہیں خطرے میں ڈال دے گا۔“ سنجیدگی سے اسے تاکید کی گئی تھی۔

”مجھے بلایا گیا تھا۔ مجھے مارک سے ملنا تھا مگر آپ نے سب برباد کر دیا“!

”وہ تمہیں کوئی ثبوت نہیں دینے والا تھا“!!

”میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں“!

”مگر یہاں بات صرف تمہاری حفاظت کی نہیں ہے۔ یہاں معاملہ ان تمام لوگوں کا ہے جو ایک مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ عالیان نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ ”اگلی بار دھیان رکھنا۔ میں چلتا ہوں۔“ نرمی سے اسے سمجھایا گیا۔ وہ سر اثبات میں ہلا گئی۔

”آپ مجھے نہیں بتائے گے کہ آپ کون ہیں؟“ وہ پلٹنے لگا تھا جب سعاد کے سوال نے اس کے قدم روکے۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں بس تم سے ملنا چاہتا تھا۔ سعاد یوسف زئی سے جو اپنے باپ پر گئی ہے۔ مجھے عرصے بعد اپنے دوست کی جھلک کسی میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔“ اس نے حیرت سے عالیان کو دیکھا تھا جو واپس پلٹ چکا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان گنگ ہو گئی۔ اس کے قدم اٹھے مگر عالیان نے انہیں روک لیا۔ ”میرے پیچھے مت آنا!“ اور اس کے ساتھ ہی وہ گلی کا موڑ مڑ گیا۔ وہ وہیں ساکت کھڑی خالی خالی نگاہوں سے اس راستے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے ابھی

وہ گیا تھا۔ تو کیا وہ اس کے باپ کا کوئی دوست تھا؟ اور اگر تھا بھی تو وہ اس کے متعلق اتنا سب کچھ کیسے جان سکتا تھا جبکہ ان کی یہ پہلی ملاقات تھی؟ وہ الجھ سی گئی تھی۔

☆☆☆

•پچیس جنوری تھائلینڈ

(شام، سات بج کر تیس منٹ)

اس کی نظریں اسکرین پر جمی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ڈیٹا ٹرانسفر ہونے میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ اسے آفس کے باہر کسی کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی تھی۔ اس نے تیزی سے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جلدی سے کرسی سے اٹھ کر اس نے میز پر رکھا اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ قدموں کی چاپ اب قریب تھی۔ ڈیٹا ٹرانسفر ہو گیا۔ اس نے چِپ جلدی سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں اڑسی۔ اس کے ہاتھ میز پر رکھی دوسری چِپ سے ٹکرائے۔ چِپ میز سے نیچے گری۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر فرش پر گری اس چِپ کو دیکھا پھر سانس روکے باہر کی طرف بڑھا۔ دروازے کی ناب گھماتے ہوئے اس کا پورا وجود خوف سے تھرتھرا رہا تھا۔ پسینے کی بوندیں پیشانی سے لڑھکتیں گالوں پر گر رہی تھیں۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے جلدی سے ارد گرد دیکھا اور باہر نکل گیا۔

وہ احتیاط سے ارد گرد دیکھتا پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ یونہی قدم اٹھاتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے پڑی۔ موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے بدر اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے اٹھتے قدموں کی رفتار تیز ہوئی۔ بدر کے قریب پہنچ کر وہ زور سے اس کے کندھے سے ٹکرایا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ چِپ اپنی جیکٹ کی جیب سے اس کے اَپر کی جیب میں منتقل کی۔ ”معذرت۔ میں دیکھ نہیں پایا۔“ بدر نے پشیمانی سے کہا۔ وہ نم پڑتی ہتھیلیوں کو

رگڑتا واپس پلٹ گیا۔ اس کی رفتار میں مزید تیزی آئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے آفس کے دروازے کے پاس آیا تھا۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر لگے کیمرے پر پڑی۔ اگلے ہی لمحے وہ جلدی سے ارد گرد دیکھ کر دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ دروازے سے سر ٹکائے اس نے لمبی سانسیں لے کر اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پیشانی پر چمکتی پسینے کی بوندوں میں اضافہ ہوا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

اس نے ارد گرد دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملازمین اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ صرف کچھ ہی بچے تھے اور وہ بھی دوسری منزل پر تھے۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتا کندھے پر سفری بیگ ٹکائے وہاں سے نکلا۔ اس کا وجود تھرتھرا رہا تھا۔۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ چمکتی پیشانی سے پسینے کی بوندیں گر رہی تھیں۔ ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں۔۔ اور عین اسی لمحے۔۔ جب وہ راہداری پار کرنے والا تھا ایک تیز رفتار گولی اس کی پسلیوں میں جا لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ شخص پستول ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ پوری ہمت جمع کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکھڑا کر چلتا وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے وہ راہداری میں گم ہو گیا۔ اس شخص نے ڈیوڈ کے تعاقب میں قدم اٹھایا ہی تھا کہ نگاہ دیوار پر لگے کیمرے پر پڑی۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ گیا۔

ٹھیک اسی وقت جب ڈیوڈ کے تعاقب میں موجود وہ شخص کیمرے کی آنکھ سے بچنے کے لیے اپنا راستہ بدل رہا تھا، کوئی سیکیورٹی روم میں داخل ہوا۔ سیاہ پینٹ پر سبز شرٹ پہنے، سر پر پی کیپ ٹکائے چہرے کو ماسک سے ڈھکے وہ شخص دھیرے سے آگے بڑھا۔ دیوار پر نسب اسکرینوں پر نظریں جمائے وہ میز پر جھکا۔ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے صرف دو منٹ لیے۔ ٹھیک دو منٹ بعد وہ سیدھا کھڑا ہوا اور ایک نگاہ ارد گرد ڈال کر کمرے سے نکل

گیا۔ وہ اس فوٹیج کو حذف کر کے کمرے سے نکل رہا تھا جو لفٹ کے قریب لگے کیمرے نے لی تھی جس میں ڈیوڈ بدر سے ٹکرایا تھا!!

☆☆☆

”بدر نے بتایا ہے کہ ڈیوڈ سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات اسی دن ہوئی تھی جس دن وہ آفس سے بھاگا تھا۔ اور وہ ملاقات بس لمحوں کی تھی۔ ڈیوڈ سامنے سے آرہا تھا، اچانک اس سے ٹکرایا اور آگے چل پڑا۔“ اس کے کان میں لگے ایئرپوڈز سے آتی خیام کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”اور اسی ٹکرانے کے دوران اس نے دوسری چِپ بدر کے حوالے کر دی۔“ وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ دور سے بھاگ کر آتا روفی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس نے پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر اسے گود میں لیا۔

”یقیناً اگر ہم صحیح اندازے پر پہنچے ہیں تو یہی ہوا ہو گا۔ بدر نے اس دن نیلے رنگ کا اپر پہنا ہوا تھا!“ خیام کی بات پر وہ چونکا۔ روفی کو گود سے اتار کر وہ اندر کی طرف بڑھا۔ روفی بھی اس کی تقلید میں اچھلتا کودتا اس کے پیچھے آیا۔ بدر کے کمرے میں آکر اس نے کبڈ کھولا۔ سامنے ہی نیلے رنگ کا اَپر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اَپر کی جیبیں کھنگالیں مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کی نگاہ سامنے رکھے ڈبے پر ٹکی۔ اس نے جلدی سے ڈبا اٹھا کر اسے کھول کر بیڈ پر الٹ دیا۔ بدر کی جمع پونجی بیڈ پر بکھر گئی۔ اس نے نوٹوں کو پھیلا کر دیکھا مگر وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ کچھ ہی لمحات میں وہ پورا کمرہ الٹ چکا تھا مگر چِپ برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ناامید ہو کر اپنا موبائل اٹھا کر بدر کو کال کی۔ کال پہلی ہی بیل پر اٹھالی گئی۔

”کہو لالے، کیسے یاد کیا؟“ بدر کی شوخ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”کچھ دنوں پہلے میں تمہارا اَپر پہن کر گیا تھا نیلے رنگ والا۔ اس میں مَیں نے چِپ ڈالی تھی، تم نے دیکھی ہے؟“

اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے یاد کرنے دو۔۔ ایک چِپ مجھے ملی تو تھی کچھ دن پہلے۔ میں نے اس ڈبے میں ڈال دی تھی جس میں مَیں پیسے جمع کرتا ہوں۔ وہاں دیکھو اور خبر دار جو میرے پیسوں پر گندی نظر ڈالی تو!“ جندل نے گردن موڑ کر سامنے بکھرے نوٹوں کو دیکھا پھر خالی ڈبے کو۔ ”اور لالے تم کس خوشی میں بِلا اجازت میرا اَپر پہن کر گئے تھے؟“ بدر اس پر چڑھائی کے لیے تیار ہوا تھا۔ اس نے کال کاٹنا مناسب تھا۔

”ملی؟“ خیام نے سوال کیا تھا۔

”چِپ یہاں سے بھی اٹھالی گئی ہے خیام!“ اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆

•پچیس جنوری تھائلینڈ

(رات، دس بج کر پندرہ منٹ)

اس نے رک کر گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا پھر دونوں ہاتھوں کو دیوار پر ٹکا کر کھڑکی سے اندر آیا۔ پی کیپ کو مزید سر کی طرف جھکا کر آنکھوں کو بھی چھپالیا۔ جلدی سے کبڈ کے پاس آکر اس نے کبڈ کا دروازہ کھولا۔ سامنے بدر کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے بغور تمام شرٹس کو دیکھا پھر کونے میں لٹکے نیلے رنگ کے اَپر کو باہر نکالا۔ جلدی سے اس کی جیبوں کو کھنگالا۔ جیبیں خالی تھیں۔ اس نے اَپر واپس کبڈ میں لٹکایا۔ اپر کبڈ میں لٹکاتے ہوئے اس کی نگاہ اس ڈبے پر پڑی جہاں بدر اپنے آئی فون کے لیے پیسے جمع کرتا تھا۔ اس نے ڈبا باہر نکالا اور اسے کھول کر بیڈ پر الٹ دیا۔ بیڈ پر بہت سے نوٹ بکھر گئے۔ اس نے نوٹوں کو پھیلایا تو نگاہ اس چِپ پر پڑی جو نوٹوں کے نیچے موجود تھی۔ اس نے جلدی سے چِپ اٹھا کر اپنی جیب میں اڑسی۔ تمام نوٹ واپس ڈبے میں ڈالے اور ڈبا بند کر کے واپس

کبڈ میں رکھا۔ جلدی سے کبڈ کا دروازہ بند کر کے وہ واپس کھڑکی کے پاس آیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکا کر کھڑکی سے چھلانگ لگائی۔ اس کا سر ریلنگ سے ہلکا سا ٹکرایا۔ پی کیپ سر سے پھسل کر سڑک پر گری۔ سیاہ بال جن میں کہیں کہیں سفیدی چمک رہی تھی ماتھے پر بکھر گئے۔ اس نے فوراً سے پی کیپ اٹھا کر اسے جھاڑا پھر واپس سر پر کَس کر ٹکا دی۔ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے۔ چِپ کی موجودگی محسوس کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ سڑک پر دور جاتے ہوئے وہ یونہی اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

☆☆☆

اس نے میز پر رکھی تمام فائلیں دیکھ لی تھیں مگر اسے اپنی مطلوبہ فائل نہیں ملی تھی۔ اسے صبح پریزینٹیشن دینی تھی اور حال یہ تھا کہ سارا مواد اس فائل میں تھا جو اب غائب تھی۔ اس نے بےزاری سے موبائل اٹھا کر بدر کا نمبر ملایا۔ کانوں میں ایئرپوڈز ڈال کر موبائل میز پر رکھا۔ دوسری بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"السلام علیکم سر"!

"وعلیکم السلام۔ آج صبح نیلے رنگ کی فائل رکھی تھی میز پر۔ تم نے دیکھی ہے؟"

"جی۔ وہ آنند نے کوئی فائل منگوائی تھی تو اسی کے ساتھ اس کے آفس چلی گئی۔ میں نے سوچا بس صبح لادوں گا اب۔ آپ کو ضروری چاہیے کیا؟"

"ہاں۔۔"

"میں لا دوں؟"

"نہیں بس چھوڑو۔ میں دیکھ لوں گا۔" دھیمی آواز میں کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ ایئر پوڈز کان سے نکال کر میز پر رکھے پھر موبائل اٹھایا۔ اس نے موبائل آن کیا تو وہ آن ہوتے ہی بند ہو گیا۔ بیٹری ختم ہو چکی تھی۔ اس نے موبائل میز پر رکھا پھر کبڈ کے پاس آیا۔ سبز رنگ کا لانگ کوٹ نکالا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھا کر اس دروازے کو دیکھا تھا جو ان سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا جو اوپر جاتی تھیں۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے کچھ سوچنے کے لیے وقت لیا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سعاد یقیناً سو چکی ہو گی۔ اسے جگانا اسے قطعی مناسب نہیں لگا۔ گہری سانس لے کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

کچھ لمحات بعد اس کی گاڑی وارلڈ گلاس کمپنی کے پارکنگ ایریا میں رکی تھی۔ وہ گاڑی سے نکل کر اندر کی طرف بڑھا۔

"سر آپ اس وقت؟" گارڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں ایک فائل رہ گئی تھی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تیسری منزل سے آگے لائٹ کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ لفٹ چل رہی ہے مگر باقی جگہوں پر کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے اچانک سے۔ آپ یہ ٹارچ لے جائیں۔" گارڈ نے ٹارچ اس کی طرف بڑھائی۔

"شام تک تو سب ٹھیک تھا؟"

"جی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ میں نے دو آدمی بھیجے ہیں وہ دیکھنے گئے ہیں۔" گارڈ کے تسلی دینے پر وہ سر کو جنبش دیتا آگے بڑھ گیا۔ راہداری سے گزر کر وہ لفٹ میں آیا۔ لفٹ کا آہنی دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند ہوا، لفٹ چوتھی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ چوتھی منزل پر لفٹ رکی۔ آہنی دروازہ کھلا، وہ باہر

آ گیا۔ ہر طرف مکمل اندھیرا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی اپنے راستے پر ڈالتا آنند کی آفس کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھول کر اس نے پلٹ کر ایک نگاہ ارد گرد ڈالی پھر آفس میں آ گیا۔ سامنے ہی میز پر مختلف فائلوں کا انبار لگا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھامے اپنی مطلوبہ فائل ڈھونڈنے لگا۔ صرف چند پل ہی گزرے تھے کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے کے پاس سے گزرا ہے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا، دروازے پر روشنی ڈالی مگر وہ بند تھا۔ وہ اپنا وہم سمجھ کر واپس فائلوں کی طرف متوجہ ہوا۔ عین اسی لمحے اسے کسی سرگوشی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ تیزی سے ٹارچ بند کر کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا۔ وہ دو لوگ تھے جو دروازے کی دوسری جانب کھڑے سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ اس نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آواز بہت دھیمی تھی۔ کچھ ہی لمحات میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ واپس لوٹ رہے تھے۔ اس نے ٹارچ آن کی۔ دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔ اس نے دائیں طرف روشنی ڈال کر راہداری میں دور تک دیکھا مگر وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں لیا تھا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس کی گردن پر اس شخص کی گرفت سخت ہونے لگی۔ اس نے تیزی سے اپنا پورا زور لگا کر اپنی گردن کو اس کے شکنجے سے آزاد کرتے ہوئے اسے دبوچ کر دوسری جانب پٹخا تھا۔ دھپ کی آواز سے وہ شخص سفید ٹائلوں کے فرش پر گرا تھا۔

"وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ جلدی کرو۔" آواز قریب سے ہی سنائی دی۔ وہ دو لوگ تھے جو راہداری کے سرے سے نمودار ہوئے۔ مکمل سیاہ لباس میں ملبوس آدمی جن کے سینوں پر ڈی ڈبلیو کا بیج لگا تھا۔ خیام کو وہاں کھڑا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ ایک نے آگے بڑھ کر اسے مکا مارنا چاہا، وہ تیزی سے نیچے جھکا۔ اور اگلے ہی لمحے میں دوسرے آدمی کو دبوچ کر فوراً سے پہلے پلٹ کر پہلے آدمی کو زوردار لات ماری۔ وہ آدمی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے

شکنجے میں پھسے آدمی نے پورا زور لگا کر اپنی گردن اس کی گرفت سے آزاد کروائی اور اگلے ہی لمحے میں جست لگا کر اسے فرش پر پٹخا تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرایا تھا۔ وہ شخص اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھا پے در پے اس پر مکے برسانے لگا تھا۔ اسے اپنے ناک سے سرخ گاڑھا خون بہتا محسوس ہوا۔ منہ میں خون کا ذائقہ گھلنے لگا۔ ایک اور مکا اس کے گال پر رسید کیا گیا۔ اس نے تیزی سے لات اٹھا کر پیچھے کھڑے شخص کو ماری اور کروٹ لے کر اپنے سینے پر چڑھ کر بیٹھے آدمی کو گرایا۔ دوسرا آدمی تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا مگر تب تک وہ فرش پر گرے آدمی کی پستول اس شخص پر تان چکا تھا۔

"آگے مت آنا۔" بولتے ہوئے اس کے منہ سے خون کی بوندیں نکل کر فرش پر گریں۔ اس نے سر جھکا کر منہ میں آتا خون فرش پر تھوکا۔ اسی وقت کئی بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ پوری عمارت جو کچھ پل پہلے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اب روشنی میں نہا گئی۔ ایک لمحے کے لیے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لفٹ سے تین چار آدمی برآمد ہوئے تھے۔ وہ جیسے ہی اس کی طرف بڑھنے لگے اس نے ٹریگر دبا دیا۔ فائر کی آواز نے سناٹے کو چیرا۔ پستول سے نکلی گولی ہوا کی رفتار کو چیرتی اس شخص کے قلب میں پیوست ہو گئی۔ وہ وقت ضائع کیے بنا قلابازی کھا کر زینوں کی طرف بھاگا۔ کسی نے پیچھے سے فائر کیا۔ گولی اس کے دائیں طرف سے گزرتی ریلنگ سے ٹکرائی۔ وہ فوراً دیوار سے لگ کر کھڑا ہوا۔ زینوں کی دوسری جانب سے دو مزید آدمی برآمد ہوئے۔ زینوں کے سرے پر کھڑے آدمیوں نے اس پر اپنی پستولیں تان کیں۔ اس کے لیے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اس نے گہری سانس لے کر سر دیوار پر ٹکایا۔ پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"ہتھیار گرا دو!!" ایک آدمی چلایا۔ اس نے لب بھینچتے ہوئے سوچنے کا وقت لیا۔ عین اسی وقت ایک بار پھر پوری عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اگلے ہی لمحے تیزی سے جھک کر فائر کھول دیے۔

وہاں کھڑے دو آدمی فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ زینوں کے سرے پر کھڑے آدمی اس کی طرف بڑھے مگر تب تک وہ اوپر بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی اپنی راہ پر ڈالتے تیزی سے اس کے پیچھے بڑھے تھے۔ پانچویں منزل کے زینوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والوں پر فائرنگ کرنا چاہی مگر پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ فوراً زینوں کی طرف بھاگا۔ زینے پھلانگ کر اس نے پانچویں منزل کی راہداری میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے تین مزید آدمی نمودار ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے اندازہ ہوا تھا کہ کمپنی پر حملہ ہو چکا تھا۔ پوری عمارت قبضے میں لی جا چکی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر ایک نظر ہاتھ میں موجود پستول پر ڈالی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں۔ گال پر خون چمک رہا تھا۔ ہونٹوں کے کنارے پھٹے ہوئے تھے۔ اس نے پستول فرش پر پھینک دی۔ وہ آدمی فتح سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ ایک آدمی نے آگے آتے ہوئے اسے پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خیام نے تیزی سے اس کا بازو پکڑ کر مروڑا تھا۔ چیخ کی آواز اس کی ہڈی چٹخنے گئی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنا جوتا اس کے گھٹنے پر مار کر اسے گرایا تھا۔ اسی لمحے فائر کی آواز گونجی۔ پستول سے نکلی گولی اس کی طرف بڑھی تھی۔ اسے جھٹکا لگا تھا۔ اپنے اردگرد دھواں اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ پانچویں یا چھٹی پسلی کے نیچے درد کی ایک لہر اٹھی تھی۔ خون فوارے کی طرح نکلتا اس کی سفید شرٹ کو داغدار کر گیا تھا۔ اسی لمحے ایک اور فائر ہوا تھا۔ اسے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ پورا وجود دہل کر رہ گیا تھا۔ کندھے میں درد کا شدید احساس ہوا تھا۔ بال بکھر کر ماتھے پر آ گرے تھے۔ اس نے نے بمشکل ریلنگ کا سہارا لے کر اپنے قدم فرش پر جمائے رکھے تھے۔

☆☆☆

وہ گھر آکر کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے وقت ضائع کیے بنا سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اسے یہاں نیند کم کم ہی نصیب ہوتی تھی اور آج جب یہ موقع ملا تھا تو وہ بالکل بھی یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

صوفے پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند میں چلی گئی۔ اس بات سے قطعی انجان کہ صوفے کے سامنے میز کے پار دیوار پر لگی اسکرین پر وہ منظر نظر آرہا تھا جب خیام کو دونوں اطراف سے گھیرا جاچکا تھا۔ وہ اب فائرنگ کے بعد دو آدمیوں کو گرا کر پانچویں منزل کے زینوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔

اس کی آنکھ ٹھیک پانچ گھنٹوں بعد کسی عجیب سے احساس کے تحت کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر ایک نگاہ سامنے نسب اسکرینوں پر ڈالی اور پھر دوبارہ لیٹنے ہی لگی تھی کہ چونک کر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسکرین کو دیکھا۔ وہاں خیام کھڑا تھا۔ تین آدمیوں میں گھرا زخمی خیام! پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں۔ گال پر خون چمک رہا تھا۔ ہونٹوں کے کنارے پھٹے ہوئے تھے۔ اس نے پستول فرش پر پھینک دی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ جلدی سے میز پر رکھا آلہ اٹھا کر کان میں لگایا۔

”خیام مجھے سن رہے ہیں؟ خیام؟!!“ اس نے خوف سے اسکرین کو دیکھتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا تھا۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ خیام اپنا آلہ کھو چکا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب چوتھی منزل پر اس شخص نے اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے اسے فرش پر پٹخا تھا۔ فرش پر گرے خون میں بھیگا وہ آلہ سبز شعاؤں کی وجہ سے سبز رنگ کا لگ رہا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس پر اپنا پیر رکھا۔ چیخ کی آواز کے ساتھ آلہ ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

اور ٹھیک اسی وقت جب وہ گولی خیام کی طرف بڑھی تھی اسے اپنے اردگرد سب کچھ ختم ہوتا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی ابھری تھی۔

”کسی بھی قسم کی صورتحال کا سامنا ہو، تمہیں پریشان نہیں ہونا۔ اپنے حواسوں میں رہنا ہے اور سوچنا ہے کہ اس

وقت تم کیا کر سکتی ہو؟" کانوں میں خیام کی دھیمی آوز کسی سر گوشی کی مانند سنائی دی۔ اس نے مضبوطی سے کرسی کو پکڑا تھا۔

"اگر کبھی میں میسر نہ ہوا تو کیا کرو گی؟"

"اپ کی باتیں دہراؤں گی۔ استاد جی کہتے ہیں گہری سانس لو۔ دماغ کو اس گھوڑے کی طرح آزاد کرو جو لمبے سفر سے آیا ہو۔ ایک پل کے لیے ہر فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ پھر اٹھو۔ نئ امید کے ساتھ گھوڑے پر زین باندھو۔ دماغ کو سوچنے دو۔ سوچو کہ اس وقت میں کر سکتی ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟"!

وہ دھیرے سے کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ آنکھوں کے آگے بار بار نمی پردے بُن رہی تھی جنہیں وہ اپنی شرٹ کے بازوؤں سے پونچھتی اپنی پوری توجہ اسکرین پر آتے اعداد و شمار پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ ایک لمحہ جب تمہیں لگے کہ کھیل ختم ہونے والا ہے، تمہیں مات ملنے والی ہے، تو بازی اُلٹ دو۔ تم یہ کر سکتی ہو سعاد"!

"اور اگر کھیل ختم ہو گیا ہو تو؟" نمکین پانی کا ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے جھول کر کی بورڈ پر گرا تھا۔

"تو اگلی بازی کے لیے تیار رہو"!

"بازی جان کی ہو تو؟"

"جان دے دیں گے!!" ایک اور گولی اس کی طرف بڑھی تھی اور اس کے کندھے کو چیرتی ہوئی نکلی تھی۔ اس نے ڈر کر سختی سے آنکھیں میچی تھیں۔ کی بورڈ پر حرکت کرتی انگلیاں ایک لمحے کے لیے تھم گئیں۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف لیے اس نے اسکرین کو دیکھا۔ وہ ریلنگ کو تھامے بمشکل اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ ایک آدمی اس کی

طرف بڑھا۔ وہ اپنی جگہ پر جمارہا۔ اس نے آدمی نے اسے گرانا چاہا تھا مگر اس نے جھک کر اس کا وار ضائع کرتے ہوئے اپنا پاؤں اس کی ٹانگوں میں پھسا کر اسے گرایا تھا۔

"میں ڈرتی ہوں۔ خون کے بہنے سے، جان کے جانے سے، کسی کو کھونے سے۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے خیام"!

"مقصد خون مانگتا ہے سعاد! جان کی بازی ہارنے والے کامیاب ٹھہرتے ہیں۔"

"اگر بازی جیت جائیں تو؟"

"تو اگلی بازی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" ایک شخص نے اس پر جھپٹتے ہوئے اپنے دونوں بازوؤں سے اس کی گردن پر زور دیتے ہوئے اسے ریلنگ سے لگایا تھا۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سامنے کھڑے شخص کے چہرے کو نوچنے کی کوشش کی۔ اس کا ماسک ڈھلک گیا، چہرہ واضع ہوا۔ گردن کے گرد دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بے جان پڑ رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ جسم سے بہتے خون کے ہر قطرے کے ساتھ اسے اپنی جان نچڑتی محسوس ہو رہی تھی۔۔ دھیرے دھیرے رفتہ رفتہ۔۔ جسم کے ہر حصے سے کھنچتی ہوئی جان!!

اس نے تیزی سے انٹر کی دبائی تھی۔ پوری عمارت الارم سے گونج اٹھی تھی۔ باہر حفاظت کے لیے تعینات گارڈ چونک اٹھے تھے۔ اندرون عمارت قبضہ کرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ گارڈز کو وائرلیس پر ہدایات مل رہی تھیں۔ گردن کے گرد دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بس چند سانسیں باقی تھیں۔ اس نے تیزی سے میز پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا تھا۔ وہ جندل کو کال ملانا چاہتی تھی مگر یہ کرنا اسے مہنگا پڑ سکتا تھا۔ ضرار بھی نہیں۔ اسے کسی کی مدد چاہیے تھی اور عین اسی وقت اس کے دماغ میں کسی کا خیال کوندا۔ اس نے جلدی سے نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا۔ نگاہیں اسکرین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی مزاحمت دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی۔ وہ بے جان

پڑ رہا تھا۔

”ہیلو؟“ بدر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”بدر۔۔ کیا تم خیام سر کی مدد کے لیے جا سکتے ہو؟ وہ خطرے میں ہیں۔“ اس کی آواز کانپ گئی۔ بدر اس سے ایڈریس پوچھ کر فون تیزی سے بند کر گیا۔

”ایک دو۔۔ تین۔۔۔ دروازہ کھول دو!“ گارڈز کو حکم ملا۔ کئی بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ جلدی سے زینوں کی طرف بڑھے۔ سب سے آگے موجود گارڈ نے زینے پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بھاری وجود اوپر سے گرا تھا۔ دھم کی آواز کے ساتھ وہ وجود فرش سے ٹکرایا تھا۔ کئی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز سنائی دی تھی۔ سر سے خون دھار کی صورت میں بہتا ارد گرد پھیلنے لگا تھا۔ گارڈ تیزی سے اس وجود کی طرف بڑھے تھے۔ کسی نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

”یہ خیام سر ہیں!“ صدا لگائی گئی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ آنکھوں سے کئی آنسو بہتے چلے گئے۔

”اور اگر بازی جان کی ہو تو؟“

”جان دے دیں گے“!

☆☆☆

وہ لمحہ جب اس کی گردن کے گرد دباؤ بڑھ رہا تھا، اسے لگا تھا وقت وہیں تھم گیا ہے۔ وہ بہت پیچھے جا رہا تھا سالوں پہلے ساحل کنارے اس گھر کے پاس جو اس کی لگائی آگ میں بھسم ہو گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا، نم آنکھوں سے اس بھسم ہو چکے گھر کو دیکھتا۔

”تم تصور بھی کیسے کر سکتے ہو کہ تمہاری لگائی ہوئی آگ سے تم اپنے وجود کو محفوظ رکھ پاؤ گے؟ تم نے کئی زندگیاں

برباد کی ہیں خیام حنفی! تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے۔ تمہیں وہ چیخیں سنائی دیں گے جو بہت سوں کی بے چارگی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ تم اپنے ہی بہائے گئے خون میں ڈوبو گے۔ تمہیں وہ آنسو ستائیں گے جن کا سبب تم بنے تھے۔ تم سکون سے کیسے جی سکتے ہو خیام حنفی ؟!" یہ زہر خند الفاظ، یہ نفرت بھرا لہجہ کسی اور کا نہیں اس کا اپنا ہی تو تھا۔ اسی نے تو کہا تھا یہ سب۔۔ اس نے کہا تھا وہ اپنے بہائے گئے خون میں ڈوبے گا، وہ تڑپے گا۔۔ اور اس وقت۔۔ جب اسے اپنے جسم کے ہر حصے سے جان کھنچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی تو وہ سوچ رہا تھا کہ۔۔ ایسی تکلیف دہ موت تو اس نے کبھی نہیں چاہی تھی۔۔!

وہ لمحہ جب اسے نیچے پھینکا گیا تھا۔ پانچویں، چوتھی، تیسری اور دوسری منزل پر ریلنگ سے ٹکراتے ہوئے اسے اپنے جسم کی کئی ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ پورے وجود کے ساتھ فرش پر گرا تھا۔ اسے حیرت تھی اسے اب بھی اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے باپ کا چہرہ لہرایا تھا۔ مسکراتا ہوا۔۔ آنکھوں میں انوکھی چمک لیے۔۔ اس کے لیے سب سے عزیز چہرہ!

"جب والدہ مجھے مردہ سمجھ کر تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی تھیں، تب مجھے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف یہ جان کر ہوئی تھی کہ۔۔ والدہ نے ٹھیک سمجھا تھا۔ خیام مر چکا تھا۔۔ یہ قاتل جس کے ہاتھوں پر کئی بے گناہوں کا خون ہے ان کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ خیام مر چکا تھا اسی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا تھا۔ اب تو بس ایک قاتل زندہ ہے، معصوموں کا قاتل!! مجھ پر تو موت بھی رحم نہیں کھاتی۔" اس کو ئی خود پر جھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے جو آخری چہرہ اپنی نظروں کے سامنے دیکھا وہ بدر کا تھا۔ شدید تکلیف کے باوجود اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ مجھے ایسے نظر انداز نہیں کر سکتے بھائی! وہ جو دل ہے ناں سینے میں وہ دھڑکنا بند ہو جائے گا۔" اس کی آنکھیں

بند ہو گئیں۔ شور تھمتا چلا گیا۔ سناٹے میں اسے کسی کی سرگوشی سنائی دی۔

”جانتے ہو جسم کے ہر حصے سے جان نکلنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے؟ زخموں سے بہتا خون، جلن کا احساس، جان کا نکلنا، احساسِ ندامت، موت کا سامنا۔۔ یہ سب کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے؟ بہت سوں کے لیے یہ مرحلہ بہت پر سکون ہوتا ہے مگر تم ان میں کبھی شامل نہیں ہو پاؤ گے خیام! تم بے انتہا تڑپو گے، تمہیں موت اتنی آسانی سے نہیں آئے گی۔ تمہیں اپنی لگائی ہوئی آگ بجھانی ہے اور وہ صرف تمہارے اپنے خون سے بجھے گی۔ تم اس آگ کو اپنے خون سے ٹھنڈا کرو گے۔ تم جان کے بدلے جان دو گے!!“ اسے ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا۔ اپنا آپ کئی مشینوں میں جکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”وہ آگ میں نے نہیں لگائی تھی۔ وہ اس بچے نے لگائی تھی جسے میں مار چکا ہوں۔ کیا قدرت کبھی مجھے معاف نہیں کرے گی؟ کیا بے سکونی عمر بھر کے لیے میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے؟ میں ایسے تو نہیں جی سکتا۔ جان لینی ہے تو جان لیں، یوں پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال کر موت کے انتظار میں تو نہ کھڑا کریں۔ میرے لیے یہ بدترین سزاؤں میں سے ایک ہے۔ اس کی تکلیف بس موت ہی ختم کر سکتی ہے۔ لیکن جب موت بھی رحم نہ کھائے تو کیا کیا جائے؟ جنہیں میں نے مارا وہ ایک لمحے میں مر گئے مگر میں تو لمحہ لمحہ مر کر بھی نہیں مرتا۔ کیا اس سے بھی زیادہ کچھ برا ہو سکتا ہے؟ کچھ مزید تکلیف دہ، سفاک اور بے رحم؟“!

اس کی آنکھ سے پھسلتا موتی کی طرح چمکتا نمکین پانی کا شفاف قطرہ گال پر لڑھک گیا۔ اور پھر ہر سُو سناٹا چھا گیا۔ مکمل سکوت۔۔ اور خاموشی۔۔ مشین کی بیپ کی آواز سنائی دی تھی۔ دھڑکنیں دھیرے دھیرے ختم ہوتیں اب مکمل طور پر تھم چکی تھیں۔ بدر بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا تھا۔ ویران سڑک پر ایمبولینس کے سائرن کی آواز گونج اٹھی تھی۔ سڑک پر دور تک جاتی ایمبولینس اندھیرے میں کہیں گم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رات کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ گھٹاٹوپ اندھیرے کی جگہ اب ہلکی نیلی روشنی نے لے لی تھی۔ سورج کے نکلنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ وہ صبح چار بجے تھائیلینڈ پہنچ گئے تھے۔ ایئرپورٹ سے دونوں دو مختلف ٹیکسیوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر ہو لیے تھے۔ اس نے ابراہم کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ خود ان سے ملنا چاہتی تھی مگر صبح جب وہ اٹھی تو وہ گھر نہیں تھے۔ اس نے انتظار کرنے کے بجائے پہلے اپنے باقی کام نمٹانا ضروری سمجھا۔

ہینڈ بیگ اٹھا کر اس نے ایک آخری نگاہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر ڈالی۔ گہرے بھورے رنگ کا لانگ کوٹ پہنے، گلے میں ہلکے بھورے رنگ کا مفلر ڈالے، بالوں کو نیچے سے تھوڑا کرل کر کے کندھے پر بکھیر کر وہ جانے کے لیے مکمل تیار تھی۔ معمول کے مطابق میک اپ سے اپنے گال پر موجود نشان کو چھپا دیا تھا۔ اس نے جھک کر اپنے گاگلز اٹھائے پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ زینے اتر کر وہ لاؤنج سے ہوتی باہر آئی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

کچھ ہی لمحات میں اس کی گاڑی اسٹیون کے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ گاڑی رکی وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتی باہر آگئی۔ خاموشی میں اس کی ہیل کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے لاونج میں قدم رکھا۔ زینے اترتا مائک اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا۔ وہ اسے تقریباً تین سے چار ماہ بعد اپنے گھر میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔

"ازابیلا تم کب آئیں؟" بھنویں ملائے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھتا وہ اس کے روبرو کھڑا ہوا۔ ازابیلا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ ایک حد تک گرا ہوا انسان تھا، بدتمیز اور نالائق تھا مگر وہ ایک قاتل بھی ہو سکتا تھا اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا۔ مائک جیسا بزدل شخص کیسے کسی کو قتل کر سکتا تھا؟

"ایمِلی کو کیوں مروایا تم نے؟" اس نے سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مارک نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔ "کون ایمِلی؟" اس کے لاعلمی کے اظہار نے اسے طیش دلایا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور مائک کے گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔ چٹاخ کی آواز سے لاؤنج میں داخل ہوتے مارک کے اٹھتے قدم وہیں تھم گئے۔ مائک نے اپنا جھکا سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"انسانوں کی طرح بتاؤ ایمِلی کو کیوں مروایا ہے تم نے؟ کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا ہاں؟ تم ہمیشہ سے گرے ہوئے انسان تھے مگر اتنا کیوں گر گئے کہ مجھے تمہیں انسان کہتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے؟!" اس کے الفاظ کے ساتھ لہجہ بھی سخت تھا۔ آواز بلند ہوتی گئی تھی۔

"میں نے اسے نہیں مارا۔۔" وہ اپنی صفائی میں بس یہی کہہ سکا۔ نگاہیں ازابیلا کے عقب میں کھڑے مارک پر ٹکیں۔ وہ سختی سے مٹھیاں بھینچ گیا۔

"تم اب بھی جھوٹ بولو گے؟ اپنی آنکھوں سے سب دیکھ کر آ رہی ہوں مائک! اس سے پہلے کہ میں تمہارے ساتھ وہ حشر کروں کہ تم اپنی زندگی پر بیٹھ کر روؤ، مجھے بتاؤ تم نے اسے کیوں مارا؟" انگشت شہادت اٹھا کر اس نے مائک کو وارن کیا تھا۔

"ازابیلا۔۔" مارک کے پکارنے پر اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ سفید رنگ کے ٹریکنگ سوٹ میں ملبوس، ٹراوزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ آگے آیا۔ "تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہے۔ مائک کیوں کسی کو قتل کرے گا؟" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ مائک نے نفرت سے اپنے بھائی کو دیکھا تھا جو پل پل میں رنگ بدلتا تھا۔

"میں نے خود اس شخص کو وہاں دیکھا تھا۔ وہ وہی تھا مائک کا رائٹ ہینڈ!" اس نے احتجاج کیا تھا۔

"اگر تم کہہ رہی ہو تو یقیناً وہ ہو گا۔ مگر اس سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا ناں کہ قتل کا حکم مائک نے دیا تھا؟" وہ اسے

دیکھ کر رہ گئی۔ مارک نرمی سے اسے دیکھتا مسکرا دیا۔ "کافی پیو گی؟"

"ہاں اور اپنے بھائی سے کہو شکل گم کرے اپنی۔" وہ اس کے غصے سے کہنے پر ہنس دیا۔

"کمرے میں آجاؤ۔ بات کرتے ہیں۔" وہ ایک نگاہ مائک پر ڈال کر مسکراتے ہوئے زینوں کی طرف بڑھا۔ ازابیلا نے مائک کو گھوری سے نواز کر اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ وہ سر اونچا کیے دونوں کو زینے چڑھتا دیکھتا رہا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنے غصے کو بھلائے ازابیلا سے ہمدردی ہوئی تھی۔ کون تھا جو نہیں جانتا تھا مارک کی اس لڑکی سے محبت کے بارے میں؟ شاید صرف وہ لڑکی ہی! سر جھٹک کر طنزیہ ہنسی ہنستا وہ آگے بڑھ گیا۔

کچن سے جھانکتے جندل نے اپنی نگاہوں کا رخ مائک سے ہٹا کر زینوں کی طرف کیا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا یوں ازابیلا کا اس کے پیچھے جانا۔ جو بات تھی یہاں بھی تو ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

"کیا مطلب وہ زندہ بچ گیا؟ تم ایسا ہونے بھی کیسے دے سکتے ہو؟" زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا گیا تھا۔ اس نے پشیمانی سے سر جھکایا تھا۔ ارد گرد بیٹھے تمام لوگ اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اسٹیون نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچی تھیں۔ "وہ آدمی زندہ نہیں رہنا چاہیے! ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا وہ۔ کچھ بھی کرو اور اس سے چھٹکارہ حاصل کرو ابھی کے ابھی!!" اس نے انگشت شہادت اٹھا کر ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا تھا۔ وہ آدمی فوراً سے اس کے آگے سر جھکا کر پلٹ گیا۔ "تم سب تماشا کیا دیکھ رہے ہو؟ کام کرو اپنا۔" وہ اب ان سب پر دھاڑا تھا۔ اندر داخل ہوتے مائک نے دائیں ابرو اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اسٹیون کی نگاہ اس پر ٹکی۔ چیونگم چباتا بے فکری سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے روبرو کھڑا ہوتا وہ اسے اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہوا تھا۔

"چچ چچ کیا زندگی ہے آپ لوگوں کی۔۔ ابھی آپ یہاں چیخ رہے ہیں، وہاں بھائی چیخ رہے ہونگے۔ ایک دوسرے کو

نیچا دکھانے کے کھیل میں بری طرح پس رہے ہیں آپ دونوں۔" اس نے افسوس سے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اسٹیون نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔ "ویل۔۔ اب کس کو مروا رہے ہیں؟ ابراہم وارلڈ کی کمپنی کو کنٹرول کرنے کا پلان تو خراب ہو گیا۔ اب کیا کرنے والے ہیں؟"

"میرے معاملات میں ٹانگ مت اڑاؤ مائیک!" وہ غرایا۔

"اگر میں نے ٹانگ نہ اڑائی ہوتی تو نہ آپ ہوتے نہ آپ کے معاملات!" اس نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ اسٹیون نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔ "تم یہاں میرا دماغ خراب کرنے آئے ہو؟"

"نہیں۔۔ بس یہ کہنے آیا ہوں کہ بھائی کے ساتھ تو آپ بگاڑ ہی چکے ہیں، اب ابراہم وارلڈ کو اپنا دشمن مت بنائیں۔ اگر یہ دونوں مل گئے تو زمین سے آپ کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ فی الحال جلد از جلد اس معاملے کو سنبھالیں اور کسی بھی طرح یہ ظاہر ہونے سے روکیں کہ ڈی ڈبلیو کے آدمیوں کے بھیس میں کمپنی پر حملہ کرنے کے لیے آپ نے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ وہ ایک شخص۔۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا؟۔۔۔ خیام حنفی! اگر وہ زندہ بچ گیا تو آپ کی مات یقینی ہے۔" اس نے اسٹیون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا تھا۔

"میں اس سے جان چھڑوا لوں گا"!

"امید ہے آپ یہ کر لیں گے۔ کیونکہ میں ہرگز بھی آپ کے لیے ایک اور جان نہیں لوں گا!!" وہ سخت نظروں سے اسے دیکھتا پلٹ گیا۔ اسٹیون نے آنکھیں میچتے ہوئے بمشکل خود پر ضبط کیا تھا۔ اسے یہ کھیل اپنے ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ راہداری کی چھت پر کنارے میں ایک کیمرہ لگا تھا۔ اس نے فوراً سے پہلے اپنی پی کیپ کو سر کایا پھر آگے بڑھ گیا۔ پھونک پھونک کر احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس نرس کا پیچھا کرنے لگا جو دوائیوں سے بھری ٹرالی لیے آگے جا رہی تھی۔ راہداری سے گزر کر جب وہ وارڈ کے قریب پہنچنے لگے تو وہ موقع دیکھ کر جلدی جلدی قدم اٹھاتا اس سے آگے بڑھا اور دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ نرس اسی رفتار سے ٹرالی کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی جب اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے منہ پر کلوروفارم میں بھیگا رومال رکھا۔ اس کی گرفت سخت تھی، وہ اپنا آپ چھڑوانے کی کوششیں کرنے لگی مگر ناکام رہی۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا اس خالی کمرے میں لے آیا۔ نرس بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے اسے ایک کونے میں بٹھایا پھر اس کا کوٹ اتار کر خود پہنا۔ اس کا آئی ڈی کارڈ لیا۔ بیڈ سے چادر اتار کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے پھر باہر آ گیا۔ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ باہر آیا اور ٹرالی گھسیٹنے لگا۔ اس کا رخ لفٹ کی طرف تھا۔

کچھ لمحات میں وہ دوسری منزل کے اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ رہا تھا جہاں اس کا شکار موجود تھا۔ اس نے ٹرالی ایک طرف رکھ کر جلدی سے وہاں سے سرنج اٹھائی۔ کوٹ کی جیب سے وہ شیشی نکالی پھر سرنج کو اس سفید رنگ کے مائع سے بھرنے لگا۔ سرنج بھر چکی تو اس کے قدم بیڈ کی طرف اٹھے۔ بیڈ پر وہ دنیا جہاں سے بے گانہ لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں یوں موندی ہوئی تھیں جیسے معمول کے مطابق سو رہا ہو۔ ہاتھ پر برنولا لگا تھا جس سے جڑی ڈرپ کے ذریعے سفید رنگ کا مائع دھیرے دھیرے اس کے جسم میں اتر رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے ہاتھ میں موجود انجیکشن پر ڈالی۔ سفید رنگ کا یہ مائع اس کے جسم میں اترنے کے بعد تین منٹ سے بھی کم وقت میں اس کی جان لینے والا تھا۔ وہ آگے آیا۔ ذرا سا اچک کر وہ مائع ڈرپ میں اتارنے ہی لگا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی گردن کے گرد پتلی سی تار لپیٹی تھی۔ انجیکشن اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس تار کو ڈھیلا کرنے کی

کوشش کرنے لگا۔مقابل کی گرفت سخت تھی ۔ مسلسل ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس کی نگاہ ٹرالی میں رکھی قینچی پر پڑی۔ اس نے فوراً سے قینچی کو جھپٹ کر اس شخص کے ہاتھ پر وار کیا۔ وہ شخص فوراً پیچھے ہٹا۔ قینچی اس کے ہاتھ کی جلد کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ خون کی بوندیں فرش پر گریں۔اس نے پے درپے پلٹ کر اس پر اندھادھند کئی وار کیے۔وہ شخص اس کے ہر وار کو ضائع کرتا اس کے قریب آیا۔اس نے میز پر رکھا لیمپ اٹھا کر اس شخص پر پھینکا۔وہ شخص تیزی سے جھکا۔لیمپ فرش سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔وہ بنار کے تیزی سے باہر کی طرف بھاگ گیا۔اس نے اس کے پیچھے جانا چاہا مگر پھر رک گیا۔مڑ کر بیڈ پر لیٹے خیام کو دیکھا پھر گہری سانس لے کر سر جھکایا۔

”تم تو محفوظ ہو کم از کم!“ وہ بڑبڑایا۔پی کیپ سر سے اتاری۔چہرے پر چڑھا ماسک اتار کر ہاتھ میں لیا۔وہ عالیان تھا۔۔عالیان بن اعظم!اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ بیڈ کے قریب آیا۔بغور بیڈ پر لیٹے اس وجود کو دیکھنے لگا۔ہلکے بھورے بال، کشادہ پیشانی، کھڑے نقوش، سفید دمکتی ہوئی رنگت اور سب سے بڑھ کر وہ تاثرات۔۔چہرے پر چھائی وہ نرمی۔۔وہ بلاشبہ اپنے باپ جیسا تھا۔ہو بہو اسی کا عکس۔وہ محبت سے ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

”تم سب بڑے ہو گئے ہو یار۔“ وہ نم آنکھوں کو رگڑتے ہوئے بولا تھا۔”اگر تمہارا باپ یہاں ہوتا تو تمہیں اس حال میں دیکھ کر اسے یقیناً دکھ ہوتا۔وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا خیام!وہ یہاں ہوتا تو تمہاری حفاظت کو یقینی بناتا۔ مگر وہ یہاں نہیں ہے۔ تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔ گدھ تمہیں نوچنے کو تیار ہیں، بھیڑیے کو اٹھنا ہو گا!!“

دیوار کے ساتھ ہلکا سا ٹیک لگائے وہ دھیمی آواز میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔اس امید پر کہ یقیناً وہ سن رہا ہو گا۔اور اگر سن رہا ہو گا تو یقیناً وہ اس قابل ہو گا کہ ایک نہ ایک دن اسے ضرور جواب دے گا۔وہ یونہی دیوار سے ٹیک

لگائے نرمی اور محبت سے اسے دیکھ رہا تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے فوراً اپنا رخ کھڑکی کی طرف کیا۔ اندر داخل ہوتے بدر کی نگاہ فرش پر گری خون کی بوندوں اور کانچ کے ٹکڑوں سے ہوتی اس پر پڑی۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے کم فہمی سے اس کی پشت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ عالیان نے جواب دینے کے بجائے چہرہ ماسک سے ڈھک کر سر پر کَس کر پی کیپ ٹکائی۔ بدر اپنے سوال کا جواب نہ پا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ عالیان نے دھیرے سے کھڑکی کی طرف قدم بڑھائے۔ "کیا آپ خیام سر کے جاننے والے ہیں؟ جواب کیوں نہیں دے رہے؟ میں پولیس کو کال کرنے لگا ہوں!!" اور عین اسی وقت عالیان نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ تیزی سے کھڑکی کے پاس آیا۔ سرخ شرٹ والا وہ آدمی کہیں نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو مل کر دوبارہ ارد گرد دیکھا مگر وہ شخص واقعی کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ وہ گہری سانس لیتا کھڑکی بند کر کے پلٹ گیا۔ اسے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

کھڑکی کے بالکل برابر میں پائپ کے ساتھ لٹکے عالیان نے ٹھہر کر گہری سانس خارج کی پھر دونوں ہاتھوں سے پائپ پکڑ کر ذرا سا کھسکتا خیام کے کمرے کے برابر والے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس نے رک کر اندر دیکھا پھر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بنا کھڑکی سے اندر چھلانگ لگا دی۔

صرف آدھے گھنٹے بعد اسپتال کے عملے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ انہیں ریسٹ روم سے ایک لاش ملی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے خودکشی کی ہو۔ بعد ازاں سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھتے ہوئے اُنہیں معلوم ہوا تھا کہ اس شخص نے ایک نرس کو بے ہوش کر کے باندھ رکھا تھا۔ اس کے بعد خود اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

☆☆☆

وہ گھٹنوں پر سر ٹکائے گم سم سی نگاہوں سے جائے نماز کو تک رہی تھی۔ ذہن وہیں الجھا ہوا تھا۔ اگر وہ ٹھیک نہیں ہوا تو کون جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ خیام وہ پہلا اور شاید آخری شخص تھا جس نے اس سے اس کے بھائی کو لانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اسی کے بھروسے پر جندل سے اپنے متعلق سب چھپاتی آئی تھی۔ اور اس وقت وہ زندگی کے جس دوراہے پر کھڑی تھی وہاں سب بکھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ نہ اٹھا تو؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

کمرے میں چھائی خاموشی کو موبائل کی آواز نے توڑا۔ اس نے ذرا سا اچک کر میز سے موبائل اٹھایا پھر نمبر دیکھ کر کال اٹھالی۔ "کہو بدر۔" آواز دھیمی اور نم تھی مگر دوسری جانب سنی جانے والی آواز بہت بھاری اور عجیب سی تھی۔

"آپ نے کہا تھا میں خیام سر کے متعلق آپ پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟" بدر کی آواز سے جھلکتی پریشانی پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"اس وقت صرف میں ہی ہوں جس پر تم خیام کے متعلق بھروسہ کر سکتے ہو۔ کہو کیا بات ہے؟" وہ جائے نماز سے اٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"یہاں کچھ غیر معمولی سا ہے۔ میں کمرے میں آیا تو خون گرا ہوا تھا، کانچ کے ٹکڑے پڑے تھے اور ایک شخص کمرے میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ ایک انجیکشن بھی ملا ہے خیام سر کے بیڈ کے پاس۔" وہ تیزی سے میز کی طرف بڑھی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے موبائل میز پر رکھا پھر اسکرین پر نظر آتے کیمرا کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں خیام کے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھیک پینتیس منٹ پہلے کا۔ جب وہ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے خیام کو کوئی انجیکشن دینے کی کوشش کی مگر پیچھے سے کسی نے اسے پکڑ لیا۔ ویڈیو وہاں پہنچی جہاں عالیان نے اپنے چہرے سے ماسک اتارا۔ اس نے بے اختیار سکون کی سانس خارج کی تھی۔ اتنا تو

اسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص ان کے دشمنوں میں سے نہیں تھا۔ ”بوڑھا بھیڑیا!“ اسے لقب سے نوازتی وہ بدر کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میری بات غور سے سنو بدر! کسی بھی اجنبی کو خیام کے کمرے میں آنے کی اجازت مت دو۔ ڈاکٹرز ہوں یا نرسز کوئی بھی۔ جو چیک اپ کے لیے آ رہے ہیں ان کے بارے میں یقینی بناؤ کہ وہ اسپتال کے عملے میں سے ہی ہوں۔ کمرے کا دروازہ بند رکھو اور کھڑکی پر پردے ڈال دو۔ اور وہ انجیکشن۔۔ کسی سے اس کا ذکر کیے بنا اسے الماری میں رکھ دو۔“

”آپ آ رہے ہیں؟“

”خیام اٹھیں تو سب سے پہلے مجھے اطلاع دینا۔“ بدر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے حکم صادر کر کے اس نے کال کاٹ دی۔ ٹھہر کر بیڈ پر لیٹے خیام کو دیکھا پھر سر کرسی پر ٹکا دیا۔ اسے اس وقت بس انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

”اپنے بھائی اور اپنی والدہ کا خیال رکھنا۔ میں بہت جلد لوٹوں گا۔ میرے بعد اس گھر کے محافظ تم ہو گے خیام!“ نرمی سے اسے تاکید کی گئی۔

”جیسے آپ کا حکم کمانڈر!“ ننھے ہاتھ کو ماتھے تک لے جایا گیا۔

”میرا شیر۔۔“ محبت بھری سرگوشی اور وہ نرم گرم آغوش۔ صرف کچھ لمحات اور پھر کانوں کو پھاڑ دینے والے دھماکے کی آواز گونجی۔ اسے اپنا گھر آگ کی زد میں دکھائی دیا۔ اس کی سماعت سے آگ کی زد میں آتے اپنے چھوٹے بھائی کے رونے کی آوازیں ٹکرائیں۔

”والدہ وہ مر چکا ہے، واپس لوٹ آئیں۔ والدہ میرا بھائی مر چکا ہے!!“ وہ اپنی ماں کو گھر کے اندر جاتے دیکھ کر چیخ

اٹھا تھا۔ اسی وقت ایک اور دھماکہ ہوا تھا۔ اسے اپنا وجود ملبے کے نیچے دبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کی ماں اپنے مردہ بیٹے کو سینے سے لگائے لوٹ آئی تھی۔

"میں یہاں ہوں۔۔ والدہ۔۔ بابا۔۔ خیام یہاں ہے۔" اس کی آواز کسی کے بھی کانوں تک پہنچنے سے قاصر رہی۔ اس کی ماں نے اپنے زندہ بیٹے پر اپنے مردہ بیٹے کو ترجیح دی تھی۔ اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں سے نمکین پانی کا ایک قطرہ کنارے سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو گیا۔ اس کے سر پر کھڑا ڈاکٹر اس آنسو کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"ازا تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔" کسی کی پکار کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بھاگ کر آتی وہ لڑکی۔

"آپ اندر کیوں نہیں آجاتے؟ کیا آپ کو ٹھنڈ نہیں لگتی؟" معصومیت سے بھرپور وہ چہرہ۔۔ روئی کی طرح نرم پھولے ہوئے گال جہاں ایک طرف چوٹ کا نشان بھی تھا۔ "آپ کو زیادہ بولنا پسند نہیں ہے شاید۔۔ آپ یہ لے لیں۔" وہ چھوٹی سی شال اس کے آگے بڑھائی گئی۔ اس نے اس شال کو نہیں لیا۔ اس لڑکی نے آگے بڑھ کر خود ہی وہ شال اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

"تمہیں بھوک لگی ہے لڑکے؟" بھاری مردانہ آواز اور بھوک سے نڈھل ہوتا خیام حنفی۔۔۔ اسے لگا تھا وہ یہاں ٹھنڈ میں جم کر نہ بھی مرا تو بھوک سے مر جائے گا۔ "پہلے ہم ایک کھیل کھیلیں گے۔ کس کی لگائی ہوئی آگ زیادہ پھیلتی ہے۔" وہ تو بھوک سے مجبور تھا، اس نے تو چھوٹا سا کھیل کھیلا تھا۔ مگر اس کی لگائی آگ نے تو اس پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ لڑکی بھی وہیں تھی اور وہ لڑکا بھی جو اس کا مہمان تھا۔ اسے آگ کی نذر ہوتے ان معصوموں کی چیخیں ہتھوڑے کی طرح اپنے دماغ پر برستی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے خیام حنفی!!" وہ شیشہ جو اس کا عکس دکھا رہا تھا پل میں چکنا چور ہوا تھا۔ اس نے فوراً

آنکھیں کھولی تھیں۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ ماحول ٹھنڈا ہونے کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ارد گرد دیکھا تو خود کو اسپتال کے کمرے میں پایا۔ رات کے وہ تمام مناظر نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ زندہ بچ گیا تھا۔۔ ایک بار پھر زندگی کی سزا سنا دی گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی تھی۔

"آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟" ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کے جواب پر ڈاکٹر نے ایک نگاہ مشینوں پر ڈالی پھر تسلی کر کے ڈرپ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کو دبایا تھا۔ درد کی ٹیس اٹھی تھیں۔ چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے تھے۔ اس کی ڈرپ بدلتے ڈاکٹر نے بغور ان تاثرات کو دیکھا تھا۔

"کیا بہت تکلیف ہے؟" اس بار یہ آواز مانوس سی لگی تھی۔ اس نے گردن ترچھی کر کے اپنے سر پر کھڑے ڈاکٹر کو دیکھا۔ خیام کے دیکھنے پر اس نے اپنا ماسک نیچے کیا۔ ڈاکٹر کے لباس میں ملبوس وہ ضرار تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ "کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے؟" وہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ خیام نے ایک نگاہ اپنی پسلتر چڑھی ٹانگ کو دیکھا پھر کندھے ذرا سے اچکا دیے۔

"جلدی اٹھ جاؤ تو بہتر ہے۔ یہ اس بیگ کو کبڈ میں رکھ رہا ہوں۔ ضرورت کی تمام چیزیں ہیں اس میں۔ تمہارے کپڑے بھی رکھ دیے ہیں۔ لیپ ٹاپ، موبائل، کیمرا، ٹریکر اور ایئر پوڈز بھی۔ پستول بھی ہے اور یاد رہے اسے چلانا ہوتا ہے سنبھال کر نہیں رکھنا ہوتا!!" وہ اسے تاکید کرتے ہوئے طنز کے نشتر بھی اس پر پھینک رہا تھا۔ وہ اپنے ان خبیث دوستوں سے اس سے زیادہ کی امید بھی نہیں کرتا تھا۔

"اگر میں مر جاتا تو؟" بیگ کبڈ میں رکھ کر ضرار نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"دو گولیوں سے نہیں مرنے والے تھے تم۔ تمہارے لیے گولے ہونے چاہیئے گولے!" چبا چبا کر کہتا وہ اس کے

قریب آیا۔ ”اگلی بار بنا پستول کے کہیں گئے تو میرے ہاتھوں سے مروگے۔“

”اچھا ناں بس کافی ہے۔ دماغ مت پکاؤ میرا۔“ وہ تپ گیا تھا۔

”انسانوں کی طرح ہفتے کے اندر اندر اسپتال سے نکلو۔ ہمارے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔“ حکم صادر کیا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ عین اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ضرار نے فوراً ماسک اوپر کیا۔ اندر آتے ابراہم وارلڈ نے مسکرا کر خیام کو دیکھا۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ نرمی سے پوچھا گیا۔

”ٹھیک ہوں سر۔“ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ ضرار ایک نگاہ اس پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

”پولیس کو تمہیں تفتیش میں شامل کرنا ہے۔ وہ سننا چاہتے ہیں کہ کل رات کیا ہوا تھا۔ تم ان سے ملنا چاہو گے؟“

”سر۔۔ کوئی کمپنی کا پرسنل ڈیٹا چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا ہم اس کیس کو پولیس کو انوالو کیے بنا حل کر سکتے ہیں؟“ اس کے سوال پر وارلڈ نے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے تم کر لو گے؟“ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ پولیس کو میں دیکھ لوں گا۔ تم جلد از جلد ٹھیک ہو کر کمپنی واپس آؤ۔ میں کسی بھی قسم کی پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتا۔“ اسے تاکید کی گئی۔ اس نے جواباً محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وارلڈ واپس پلٹ گیا۔ وہ گردن ترچھی کر کے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ رعب دار شخصیت، نرم مزاج، سمجھدار اور سنجیدہ، کام سے لگاؤ رکھنے والا ابراہم وارلڈ۔۔ کیا واقعی یہ شخص اسکائی ٹو کے گھٹیا کھیلوں میں ملوث تھا؟

☆☆☆

”خیام سر کی طبیعت اب بہتر ہے۔ وہ اٹھ بیٹھے ہیں۔ آپ آ رہے ہیں؟“ بدر موبائل کان سے لگائے اسے اطلاع دے رہا تھا۔ دوسری طرف اس نے بے اختیار گہری سانس لے کر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ پورے وجود میں سکون سا اتر گیا تھا۔ ”آپ سن رہے ہیں؟“ وہ اس کے جواب نہ دینے پر تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں میں آ رہا ہوں۔ تم کسی کو ان سے ملنے مت دینا!“ اس نے تاکید کی۔

”مگر وارلڈ سر تو ان سے مل کر بھی جا چکے ہیں۔“ اس نے معصومیت سے اسے آگاہ کیا۔

”تم کسی کام کے نہیں ہو بدر!!“ وہ دانت پیستی کال کاٹ گئی۔ بدر نے موبائل کی روشن اسکرین دیکھتے ہوئے معصومیت سے منہ کے زاویے بگاڑے۔ اب اگر خیام سر اٹھ گئے تھے تو کیا وہ اس سے ایسا رویہ رکھنے جا رہا تھا؟ وہ منہ بناتا اندر آ گیا۔ ٹیک لگا کر بیٹھے خیام نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے اسے اندر آتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں دھیرے سے اس کے چہرے سے پھسلتیں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ بال ماتھے پر بکھرے تھے۔ چہرے پر ویرانی سی تھی۔ سفید شرٹ جس پر خون لگا تھا اور جسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ دائیں بازو پر بھی خون کے دھبے تھے۔ ہاتھوں کو دھویا گیا تھا مگر پھر بھی کچھ خون وہاں لگا رہ گیا تھا۔ اس کی نظریں واپس اٹھتیں بدر کے چہرے پر ٹکیں۔ وہ معصومیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ آنکھوں میں نرمی کا تاثر ابھرا۔ بدر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کو دیکھا جہاں لگے زخم اب بھی تازہ تھے۔ ہلکے بھورے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ خون بہت زیادہ ضائع ہونے کی وجہ سے چہرے سے نقاہت بھی جھلک رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

”کیا ہوا؟ پریشان ہو؟“ نرمی سے پوچھا گیا۔ وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔ سر نفی میں ہلا گیا۔ ”ڈر گئے تھے؟“ اس نے

ٹھہر کر خیام کو دیکھا تھا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے مزید سوال نہ کرے۔ وہ بمشکل خود پر ضبط کیے کھڑا تھا، وہ ٹوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ چہرہ اسے عزیز تھا اور اس چہرے پر یہ زخم اسے تکلیف میں مبتلا کر رہے تھے۔ جانے کیوں کب کیسے اسے سامنے بیٹھا یہ شخص عزیز ہو گیا تھا۔۔۔ ”مصعب۔۔ اپنی بیلا باجی کو کال کرو۔“ نرمی سے اسے کہا گیا۔ وہ فوراً سر اثبات میں ہلا کر موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ ازا کا نمبر ملا کر اس نے موبائل خیام کی طرف بڑھایا۔ کال فوراً اٹھالی گئی۔ اس نے موبائل تھام کر کان سے لگایا۔

”ہیلو بدر۔۔ کیسے ہو؟“ اس کی شوخ سی آواز خیام کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”خیام بات کر رہا ہوں، مادام!“ بھاری اور رعب دار آواز۔۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئی۔

”کہیے۔۔ کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی؟“ لہجے میں اب وہ شوخی نہیں رہی تھی۔

”آپ سے ملنا ہے۔ اسپتال آجائیں۔“ حکم صادر کر کے اس نے ازابیلا کی بات سنے بنا بدر کی طرف موبائل بڑھا دیا۔ بدر نے فوراً موبائل پکڑ کر کان سے لگایا۔

”آپ اسپتال میں کیا کر رہے ہیں؟“

”بیلا باجی آپ نے نیوز نہیں دیکھی کیا؟ سر کو مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ وہ دبی دبی آواز میں کہتا باہر جا رہا تھا۔ ”ٹاپ ٹرینڈنگ پر ہیں سر!! آپ جلدی سے آجائیں۔ ویسے یہ آپ کی وجہ سے ہوا ہے سر ڈیوڈ کے کیس کی تفتیش کر رہے تھے تبھی کسی نے انہیں مارنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ نہیں نہیں اب تو۔۔۔“ کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی آوازیں تھم گئیں۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں موندلیں۔ اسے نیند کا انجیکشن دیا گیا تھا جو اب اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

☆☆☆

اسے اپنے دماغ پر عجیب بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ نیند کا غلبہ ابھی بھی طاری تھا۔ ذہن خالی خالی سا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس نے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی تو درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ وہ بند آنکھوں سے کراہا تھا۔

"خیام آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں؟ خیام؟" آواز مانوس سی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ منظر دھندلا دھندلا سا تھا۔ کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے منظر صاف ہونے لگا۔ اسے اپنے سامنے دو انگلیاں نظر آئیں۔ "یہ کتنے ہیں؟"

"اندھا نہیں ہوا میں!" وہ بڑبڑایا تھا۔ اس پر جھکی سعاد سکون کا سانس لیتی سیدھی کھڑی ہوئی۔

"بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے، دھڑکنیں بھی نارمل ہیں۔ سانس لینے میں بھی مسئلہ نہیں ہے۔ اندھے بھی نہیں ہوئے، سن بھی سکتے ہیں۔ اب بول کر دکھائیں تو مجھے یقین ہو کہ آپ اپنی قوت گویائی سے محروم نہیں ہوئے۔" آواز میں خوشگواری تھی۔

"میں گونگا نہیں ہوا۔۔۔ سعاد یوسف زئی!" اس نے اسے گھوری سے نوازا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ اس کا سر پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔ گال پر چوٹ کے نشان تھے۔ ہونٹوں کے کنارے پر زخم بن گیا تھا۔ ہاتھ سلامت تھے مگر دائیں ٹانگ پاؤں سمیت پلستر میں جکڑی ہوئی تھی۔ خیام کے اٹھنے کا انتظار کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے اس کی طبیعت کے تمام احوال لے لیے تھے۔ اس کا چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہوش میں آ جانا غنیمت تھا۔ گولیوں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا بلندی سے گرنے کی وجہ سے جسم اثر انداز ہوا تھا۔ ٹانگ میں فریکچر آیا تھا۔ وہ اگلے تین سے چار ماہ تک چلنے میں مشکل محسوس کرنے والا تھا۔ وہ اس وقت اسے یہ سب نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ زندہ تھا، وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اس وقت جب وہ امید کھونے لگی تھی!

"تم رو رہی ہو؟" چہرہ بائیں طرف تکیے پر معصومیت سے گرائے، نرمی سے اس کے گالوں پر گرتے نمکین پانی کو دیکھتا وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے نفی میں سر ہلا گئی۔ بائیں ہاتھ کی پشت سے فوراً اپنے گال رگڑے۔

"میں کیوں آپ کے لیے رونے لگی؟" بولتے ہوئے دو آنسو مزید گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ شرمندگی سے نظریں چرا گئی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"میرے لیے رونے والی بس تم ہی تو ہو!" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے لبوں پر مچلتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ وہ بچوں کی طرح دانت نکال کر مسکرایا تھا۔

"زیادہ مت بولیں ورنہ چلنے کے ساتھ ساتھ بولنے کے قابل بھی نہیں رہیں گے!" اپنا رونا دھونا بھول کر وہ تیزی سے کہتی لب دانتوں میں دبا گئی۔ اپنی جلد بازی پر غصہ آیا۔

"کیا مطلب؟"

"کوئی سوال نہیں!!" اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے اس نے اپنے گال رگڑے۔ خیام نے اس کے ڈپٹنے کے انداز پر دائیں ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"میں تمہارا استاد ہوں تم میری استانی مت بنو! اور یہاں کیا کر رہی ہو؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"بدر کے علاوہ کوئی نہیں ہے آپ کے لیے یہاں پر۔ آپ کے نام نہاد دوست بھی نہیں۔" اس نے آنکھیں گھمائیں۔

"میرے نام نہاد دوستوں میں سے ایک تمہارا بھائی ہے، ایک تمہارا منگیتر اور معجزہ ہے کہ تیسرا اب تک تم سے محفوظ ہے۔ اور مزید اطلاع دیتا چلوں کہ تم سے پہلے تمہارا منگیتر میری خیریت دریافت کر کے جا چکا ہے۔" دوبدو جواب دیتا وہ اسے تپا گیا تھا۔

”اس زبردستی کی منگنی کو میں نہیں مانتی اچھا۔ اور یہ لیں۔ کام آئے گا۔“ اس نے سیاہ رنگ کا آلہ اس کی طرف بڑھایا۔ خیام نے آلہ لے کر اپنے کان میں لگایا۔ وہ خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈال کر جانے کے لیے مڑی۔

”شکریہ سعاد۔۔۔ یہ احساس دلانے کے لیے کہ میرے پیچھے میرے لیے کوئی رونے والا بھی ہے۔“ اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ سعاد نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی۔ وہ اسے سمجھ سکتی تھی۔ ایک جاسوس کی زندگی اکثر و بیشتر اسی خوف کے زیر اثر گذرتی ہے کہ جب وہ کسی اجنبی سرزمین پر اپنوں سے دور سسک سسک کر جان دے رہا ہو گا تو کیا کوئی نہیں ہو گا جو اس کے لیے دو آنسو بہائے اور دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے؟ جو ہر ماہ نہیں تو سال میں ایک بار ہی اس کی قبر پر اس سے چند باتیں کرنے آجائے؟ تنہائی کے خوف کے زیرِ اثر تمام عمر گزار دینے والے لوگ اپنی تمام عمر بھی تنہائی میں ہی گزار دیتے ہیں۔۔

”خود کو تنہا مت سمجھیں استاد جی! آپ کو کچھ ہوا تو آپ کی یہ شاگرد دنیا کو دہلا دے گی۔“ اس نے فخر سے کالر جھاڑے۔ وہ ہنس دیا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور بدر اندر داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اس کی نگاہ سعاد پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر رکا۔ سعاد نے سر تا پیر اس کا جائزہ لیا جو ابھی تک سر جھاڑ منہ پھاڑ اسی حلیے میں پھر رہا تھا۔ بیچارہ بدر!

”آپ کون ہیں محترمہ؟ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے سختی سے پوچھا تھا۔

”تم مجھے جانتے ہو۔“

”میں آپ کو نہیں جانتا۔“

”بدر۔۔ کیا تم خیام سر کی مدد کے لیے جاسکتے ہو؟ وہ خطرے میں ہیں۔۔“ وہی بھاری آواز جس سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ اس عمدہ اداکاری پر حیران رہ گیا تھا۔ ”کیا اب بھی نہیں جانتے؟“

”تو آپ ہیں وہ۔۔ نام کیا ہے آپ کا؟“ وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

"سعاد یوسف زئی!" بدر مرعوب ہوا۔ پھر اس کی نگاہ خیام پر پڑی۔ نگاہیں دھیرے سے سرکتیں اس کے کان پر ٹکیں اور پھر اسے اپنا حلق تک کڑوا ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"آپ ہیں وہ۔۔ جو ہر وقت سر سے رابطے میں رہتی ہیں۔ سر کی سیکنڈ باڈی گارڈ!!" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

"یہ مقام بس تمہارا ہے بدر!" اس نے دانت کچکچائے تھے۔ خیام انہیں لڑائی کے میدان میں کودنے کی تیاری کرتا دیکھ کر فوراً بیچ میں بول اٹھا۔ "تمہاری بیلا باجی نہیں آئیں ابھی تک؟"

"یہی بتانے آیا تھا کہ بیلا باجی اپنے کسی کزن کے ساتھ اسپتال میں تشریف آوری لا چکی ہیں۔ جلد ہی وہ یہاں ہونگی۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی انہیں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہیل کی ٹک ٹک نے ازابیلا کے آنے کی خبر دی۔ خیام نے چونک کر سعاد کو دیکھا تھا۔ وہ فوراً سے دروازے کے آگے سے ہٹ کر الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کا دروازہ کھولا اور اس کے اندر گھس کر دروازہ بند کر دیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور ازابیلا زیاد کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔ بدر جو صورتحال کو سمجھ نہیں سکا تھا آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔

ازابیلا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے بیڈ کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ زیاد میز کے پاس کھڑا ہوا۔ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس کی نگاہ میز پر رکھے چشمے پر ٹکی۔ گول شیشوں والا نازک سا چشمہ کسی لڑکی کا تھا۔ اس نے انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان اس چشمے کو اٹھایا۔ غیر محسوس طریقے سے مشکوک نگاہوں سے خیام کو دیکھا تھا۔ خیام اس کی نظروں کو نظر انداز کرتا ازابیلا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ میں ڈیوڈ کے قاتلوں کو ڈھونڈوں۔۔ اگر میں کہوں کہ میں کامیاب رہا ہوں تو؟" ازابیلا نے حیرت سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

بدر کی نظریں بار بار زیاد کے ہاتھ میں موجود چشمے سے ہوتیں الماری کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھا کہ کیا ہوگا اگر اس لڑکی کا وہاں دم گھٹ جائے؟

☆☆☆

وہ خیام کے کمرے سے نکل کر راہداری سے گزر رہی تھی۔ زیاد کسی کام کا کہہ کر پہلے ہی چلا گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی، جب سامنے سے ایک لڑکا آتا دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑے اس لڑکے کو دیکھا اور پھر وہ اسے فوراً پہچان گئی۔ وہ اس لڑکے کو بھول ہی نہیں پائی تھی۔ وہ جندل یوسف زئی تھا۔ سیاہ پینٹ شرٹ پر سفید رنگ کا کوٹ پہنے آنکھوں پر چشمہ ٹکائے وہ کافی بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ کسی فائل کے اوراق پلٹتا وہ اس کے قریب آیا تو نگاہ اس پر پڑتے ہی فوراً سے رخ موڑ کر واپس جانا چاہا مگر وہ تب تک اس کی راہ میں حائل ہو چکی تھی۔ وہ گڑبڑا کر آنکھیں میچ گیا تھا۔ وہ اس کی حرکت پر مسکرا دی۔

"کیسے ہو؟" وہ خود اپنے اچانک یوں بے تکلف ہونے پر حیران ہوئی۔

"میں ٹھیک الحمدللہ۔ تم کیسی ہو؟" وہ بھی جواباً آپ سے تم پر آیا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک۔ کافی دنوں بعد ملے ہو۔"

"ہاں وہ میں نے۔۔ پڑھائی چھوڑ دی۔ جاب کر رہا ہوں۔" اس نے اپنی داڑھی کھجائی۔ ازابیلا نے لب دانتوں میں دبائے سر تا پیر اس کا جائزہ لیا۔ وہ اس کی نظریں دیکھ کر گڑبڑایا۔ "ڈاکٹر نہیں بنا میں۔۔۔ یہ کوٹ ایک دوست کا ہے۔ اچھا لگ رہا ہوں ناں اس میں؟" اب کی بار معصومیت سے اپنا کان مروڑتے ہوئے صفائی پیش کر کے ساتھ ہی تاکیدی انداز میں پوچھا۔ وہ چہرہ موڑ کر ہنس دی۔ وہ خجلت سے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اور یہ چشمہ کیا یہ بھی دوست کا ہے؟" آہ۔۔ جندل وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس نے گڑبڑا کر اپنا چشمہ اتار کر

کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ وہ اب کی بار کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے وہ جندل کو مزید شرمندہ کر گئی تھی۔

"ایسے مت ہنسو۔۔۔ بیلا۔۔" وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ ازابیلا نے چونک کر اسے دیکھا۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں خوشگوار حیرت تھی۔ "بیلا۔۔" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔ "دوبارہ کہنا۔"

"کیا؟" وہ چونکا۔

"یہی جو ابھی کہا۔"

"ایسے مت ہنسو۔" وہ سنجیدہ ہوا۔ معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو چکی تھی۔

"اس کے بعد؟" اسے یقین ہو گیا۔ وہ جذبات میں کچھ بہت غلط کہہ بیٹھا تھا۔

"بیلا؟"

"نہیں ویسے کہو جیسے پہلے کہا تھا۔" اس کی خواہش عجیب سی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے لب وا ہوئے۔ "بیلا۔۔" وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ وہ ایک بار پھر زیر لب اپنا نام دہرا رہی تھی۔ "بیلا۔۔۔ مجھے پہلے کبھی اپنے نام کا یہ حصہ اتنا اچھا نہیں لگا۔ بیلا۔۔ مجھے اچھا لگا جندل!" لب گہری مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ اسے آج تک ازا یا پھر ازابیلا ہی کہہ کر پکارا گیا تھا۔ بدر واحد تھا جس نے اسے بیلا باجی بنایا تھا۔ اور اس وقت اسے اندازہ ہوا تھا کہ اگر بیلا کے آگے سے باجی ہٹا دیا جائے تو اس کا نام بہت خوبصورت ہے۔۔ بیلا!!

"شکریہ۔ مجھے لگا تم غصہ کرنے لگی ہو۔" اس نے سکون کی سانس لی۔ "بہر حال یہاں کیسے؟"

"ایک جاننے والے سے ملنے آئی تھی۔ اور تم۔۔ یقیناً اپنے دوست سے ملنے آئے ہو گے؟" وہ شرارت سے گویا

ہوئی۔

"ہاں بالکل۔" وہ مسکرا دیا۔ "تم یونیورسٹی جا رہی ہو؟"

"نہیں۔۔ میں نے بھی پڑھائی چھوڑ دی۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"اب کیا کرو گی؟" وہ آنکھیں سکیڑے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ازابیلا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ سماعت سے خیام کی آواز ٹکرائی۔

"آپ نے کہا تھا کہ میں ڈیوڈ کے قاتلوں کو ڈھونڈوں۔۔ اگر میں کہوں کہ میں کامیاب رہا ہوں تو؟۔۔۔ مجھے آپ سے ایک فیور چاہیے!" وہ گہری سانس لیتے ہوئے سر ذرا سا جھکا گئی۔

☆☆☆

وہ ازابیلا کو وہیں چھوڑ کر کینٹین کی طرف آیا تھا۔ لائبریری میں آج اس کا تھکا دینے والا دن گزرا تھا اور اس وقت وہ کڑک سی کافی پینا چاہتا تھا۔ اس کے ارد گرد کئی لوگ تھے۔ کچھ مریض اور کچھ مریضوں کے اہل و عیال۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ارد گرد نظریں دوڑاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کینٹین پہنچا تو وہاں کاؤنٹر پر پہلے سے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سبز گاؤن میں ملبوس بھورے رنگ کا حجاب اوڑھے وہ لڑکی یہاں موجود لوگوں میں سب سے منفرد نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔ وہ لڑکی اپنے لیے کافی لے کر پلٹ گئی۔ کچھ ہی لمحات میں اس کے آگے کافی رکھ دی گئی۔ وہ کافی لے کر پلٹا۔ اس کے آگے کچھ فاصلے پر وہی لڑکی چل رہی تھی۔ وہ گرم کافی کا گھونٹ بھرنے لگا۔

کافی کا کپ ہاتھ میں تھامے راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے سعاد کو بھوک کا احساس ہوا تھا۔ اسے خیام سے تفصیلات پوچھنے کے لیے یہیں رکنا تھا اور تب تک وہ بھوک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ اسنیکس لے لینے کا خیال

برا نہیں تھا۔ یہی سوچ کر وہ پلٹی تھی کہ سامنے نگاہ پڑی۔ کافی کے گھونٹ بھرتا اس کی طرف بڑھتا وہ لڑکا۔۔۔ وہ اسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی اور اس وقت تو وہاں بس چند لوگ تھے۔ اسے اپنے اردگرد سب ٹھہرتا محسوس ہوا تھا۔ وہ شور، لوگوں کی سرگوشیاں سب تھم چکا تھا۔ ہر سُو سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ کتنا بے فکر تھا۔ سیاہ بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھیں ایک نکتے پر نہیں ٹک رہی تھیں۔ کڑوی اور گرم کافی کو حلق میں اتارتا دھیرے سے اس کی طرف بڑھتا زیاد تاشفین۔۔

"میری دعا ہے ہم دوبارہ کبھی نہ ملیں۔"

"سینیوریتا سعاد۔۔۔ میں زیاد تاشفین۔۔۔ کیا آپ کو کسی گائیڈ کی ضرورت ہے سینیوریتا؟" وہ سناٹے میں رہ گئی تھی۔ گرم کافی کا کپ ہاتھ سے چھوٹ کر قدموں میں گرا۔ لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آنکھوں میں نمی چمکی۔ دھڑکنوں کا شور بڑھا۔ وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔۔ بس چند قدم۔۔

"تم رونا چاہتی ہو؟۔۔۔ اپنا کندھا پیش کر سکتا ہوں۔۔ ایک آخری بار اجازت دو گی؟" آنکھ سے ایک آنسو بے جان ہو کر گال پر لڑھک گیا اور فوراً ہی ماسک میں جذب ہو گیا۔ ان کے درمیان فاصلہ بس دو قدموں کا۔۔۔ اس نے سانس روک لیا تھا۔ آنکھیں بند کر لی تھی۔ لب کپکپائے تھے۔ وہ اس کے بالکل برابر سے گزرتا آگے بڑھ گیا۔ سحر ٹوٹ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول لیں۔ آنسو آنکھوں سے گرنے لگے۔

"اس کے ذکر پر آپ کی یہ حالت ہے۔ کبھی وہ سامنے آگیا تو آپ کیا کریں گی؟" وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ سامنے آیا تھا اور اس نے خود کو بے بس محسوس کیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے اٹھتے قدم روکنا چاہتی تھی، اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کا بہت انتظار کیا۔ اس پر چیخنا چلانا چاہتی تھی کہ وہ کہاں گم ہو گیا تھا مگر وہ کچھ بھی تو نہ کر سکی تھی۔ وہ دوبار چلا گیا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔ وہ اسے پھر کھو چکی تھی۔

گرم کافی سے حلق کو تر کرتے ہوئے وہ کسی احساس کے تحت رکا۔ وہ سبز گاؤن والی لڑکی جو اس کے راستے میں کھڑی تھی، اسے دیکھ کر منفرد سی انسیت کا احساس کیوں جاگا تھا؟ ماتھے پر بل ڈالے وہ پلٹا۔ وہ لڑکی اس سے کچھ قدموں کے فاصلے پر اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ بالکل ساکت و منجمد جیسے اپنی جگہ جم گئی ہو۔ اس نے ٹھہر کر ایک قدم اس لڑکی کی طرف اٹھانا چاہا مگر وہ لڑکی اسی وقت آگے بڑھ گئی۔ بنا رکے تیز رفتار سے چلتی وہ کئی لوگوں کے درمیان کہیں گم ہو گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے سبز گھاس پر گرے گرم کافی کے کپ کو دیکھتا رہا جہاں ابھی کچھ پل پہلے وہ کھڑی تھی۔ ماتھے پر نمودار بل دھیرے سے غائب ہو گئے۔

''تمہاری راہ میں کھڑی ہر حجابی لڑکی سعاد یوسف زئی نہیں ہو سکتی زیاد تاشفین!'' اس نے خود کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ وہ لڑکی سعاد نہیں ہو سکتی تھی۔ جانے کیوں لیکن وہ یہاں نہیں ہو سکتی تھی۔۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھکا کر قدم آگے بڑھا دیے۔

☆☆☆

''کمپنی پر حملہ اسٹیون نے کروایا تھا۔ ڈی ڈبلیو کے آدمیوں کے بھیس میں وہ اسٹیون کے آدمی تھے۔'' اس کی بات پر تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ جندل جو اس وقت اپنے حلیے سے کوئی ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا، زیاد جو اس کی عیادت کے لیے یہاں تشریف فرما تھا اور ضرار۔۔ وہ کمرے کی صفائی میں خاصا مشغول نظر آرہا تھا۔ کمرے سے باہر کرسی پر اپنے چہرے کے آگے اخبار پھیلا کر بیٹھی سعاد اس وقت کو کوس رہی تھی جب وہ یہاں آئی تھی۔

''آنند۔۔ وہ شخص جس نے مجھے نیچے پھینکا تھا وہ آنند تھا۔ کمپنی کا وہ ایمپلائے جو ہر ایک کے لیے قابلِ اعتبار تھا۔'' اس نے ٹھہر کر تینوں کو دیکھا۔

''تمہیں کیوں لگا کہ آنند اسٹیون کا آدمی ہے؟''

"مارک کس کو مروانا چاہتا ہے؟ اسٹیون کو۔ اور یہ وہ وقت ہے جب اسٹیون خود کو کوور کر رہا ہے۔ مارک کو اسلحے کے لیے بھاری رقم وارلڈ گلاس کمپنی نے دی ہے۔ اسٹیون یقیناً کمپنی کے پیچھے ہے۔ اسے کمپنی کا پرسنل ڈیٹا چاہیے اور جس دن اس کے ہاتھ یہ ڈیٹا لگ گیا اس دن ابراہم وارلڈ کے ہاتھ سے کمپنی چلی جائے گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"کمپنی کا اگر دیوالیہ ہو گیا تو مارک ڈی ڈبلیو کے پراجیکٹ کو جاری نہیں رکھ سکے گا۔ آہ۔۔۔ یہ باپ بیٹا تو آپس میں لڑ رہے ہیں۔" جندل نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہم انہیں لڑتا دیکھتے رہیں گے؟" ضرار نے سر اٹھا کر تینوں کو دیکھا۔

"ہم اسٹیون کو راستے سے ہٹائیں گے۔ کل کی تاریخ میں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ سب اس کی بات پر چونک کر سیدھے ہوئے۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"مارک اسٹیون کے ذریعے خود کو کوور کر رہا ہے اور اگر اسٹیون راستے سے ہٹ جائے تو؟ ہمیں یہی راستہ صاف کرنا ہے۔"

"یہ کام میں کر لوں گا۔" زیاد نے فوراً ہاتھ اٹھایا۔

"یہ کام ازابیلا کرے گی!!" اس نے تیزی سے کہا تھا۔ ان تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر خیام کو۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بالکل سپاٹ! "مارک ہمیں اسٹیون کے خلاف ثبوت دے گا اور ہم یہ ثبوت ازابیلا کو دیں گے۔ وہ یقیناً اسٹیون کو ہمارے راستے سے ہٹا سکتی ہے۔"

"تمہیں یقین ہے خیام بیلا یہ کرے گی؟" جندل نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔

”ازا!!“ زیاد نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔ جندل نے معصومیت سے کندھے اچکا دیے۔

”یقیناً وہ یہ کرے گی۔ اس کے پاس کوئی اور آپشن نہیں ہے۔“ اس نے بات ختم کر دی۔ وہ تینوں تقریباً دس منٹ تک مزید وہاں رکے رہے پھر پہلے جندل وہاں سے نکلا۔ سعاد کے چہرے کے آگے پھیلا اخبار چہرے کے مزید قریب ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ضرار بھی نکل آیا اور سب سے آخر میں زیاد۔ وہ چہرے کے آگے سے اخبار سرکا کر اس کی پشت کو گھورتی رہی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ تیسرا آدمی زیاد تاشفین ہو گا۔۔ سپیر اسینور! کچھ دیر وہیں بیٹھے رہنے کے بعد وہ اندر آ گئی۔

”مارک سے ثبوت لینے کون جا رہا ہے؟“

”تم!“ سعاد نے ٹھہر کر آنکھیں پھیلائے اسے دیکھا۔

”ہیکرز کو باہر کی دنیا میں نظر نہیں آنا چاہیے استاد جی!“ ناک سے پھسلتے چشمے کو واپس ناک پر ٹکاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”یہ بات تب یاد نہیں آئی جب مارک کے ایک پیغام پر اس سے ملنے پہنچ گئی تھیں؟“ طنزیہ لہجے میں سختی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔ اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ خیام کو اس بات سے انجان سمجھی تھی اور یہیں سمجھ میں اس سے بہت بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ وہ اس کا استاد تھا، ہمیشہ اس سے ایک قدم آگے!

”سوری سر۔۔ مجھے آپ کو بتانا چاہیے تھا۔“ اس نے پشیمانی سے کہا۔

”مارک کو پیغام بھیج چکا ہوں میں۔۔ فوراً ملو اس سے۔“ وہ غصے میں تھا۔ چہرے پر سختی تھی۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھتی رہی۔

”غصہ کیوں کر رہے ہیں؟“ معصومیت سے پوچھا گیا۔

"زیاد سے ملی ہو تم ؟!" چہرہ ترچھا کیے نگاہیں اس پر ٹکائے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتا وہ غصہ اور چہرے پر چھائی سختی۔۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ خیام ہمیشہ سے اس سب سے آگاہ تھا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں کچھ بول نہیں پائی تھی۔ "تم سے پوچھ رہا ہوں سعاد !!" وہ دھاڑا تھا۔

"یس سر۔۔" آواز لرز گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

"جب تم میرے ساتھ ہو گی اور اگر جندل تمہارے سامنے آجائے تو تمہیں اسے بھی پہچاننے سے انکار کرنا ہو گا سعاد! کسی قسم کے بھی حالات ہوں یاد رہے تمہارے کام سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں۔ تمہاری ایک غلطی سب برباد کر سکتی ہے۔ اپنے تمام رشتے یہیں رکھ کر تمہیں آگے بڑھنا ہو گا!" وہ سالوں پہلے سمجھائی گئی اس کی بات کو کیسے بھول گئی تھی۔ وہ تنہا تھی، اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔

"دوبارہ یہ کبھی نہ ہو۔ بلا اجازت تم گھر سے نہیں نکلو گی۔ ٹھیک ؟" حکم صادر کیا گیا تھا۔ اور جہاں حکم صادر کیا جائے وہاں کیا کیوں جیسے سوال بے معنی ہو جاتے ہیں۔ کم از کم خیام کے لیے یہی اصول تھا۔

"اوکے سر۔۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے آنکھیں میچیں۔ وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر اپنی گود میں رکھے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جانے کے لیے مڑی پھر کچھ یاد آنے پر رکی۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔ "غصے میں کیوں ہیں ؟" نرمی سے پوچھا گیا۔ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر حرکت کرتی انگلیاں تھم گئیں۔ اس نے گردن ترچھی کر کے دروازے میں کھڑی سعاد کو دیکھا۔

"میں خود سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں سعاد! مکمل صحتیاب ہونے تک مجھے سہارے کی ضرورت رہے گی اور ڈاکٹرز کے مطابق یہ دورانیہ کئی ماہ تک کا ہے۔ کیا ایسی صورتحال میں طبیعت میں یہ چڑچڑا پن معمولی نہیں ؟" وہ

اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ بہت غلط ہو چکا تھا۔ کچھ ایسا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے مجھے یقین ہے۔" اس نے امید دلائی تھی۔ جواباً وہ بس ہلکا سا مسکرا دیا۔

☆☆☆

"آپ سے ملاقات کا ہمیشہ خواہاں رہا ہوں، سعاد یوسف زئی!" وہ مسکراتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ روشنیوں میں جگمگاتے ریستوران کی دوسری منزل پر گلاس وال کے پاس بیٹھی وہ اسے دیکھ کر سر کو ہلکا سا خم دے گئی۔

"میری جانب سے معاملہ الٹ ہے۔" لہجے میں طنز تھا۔

"یقیناً ہونا بھی چاہیے۔ ہمارے تعلقات کچھ اچھے بھی نہیں رہے۔ میں صیاد رہا ہوں اور آپ صید!" اس کی گہری ہوتی مسکراہٹ سعاد کو اس وقت زہر لگ رہی تھی۔

"وہ تمہیں باتوں میں الجھانے لگا ہے۔" کان میں لگے آلے کی مدد سے خیام نے اسے خبردار کیا تھا۔

"صیاد تو آپ کے والد بزرگوار تھے، نہیں؟"

"وہ شکار کو جال میں پھانس کر مارنا چاہتا تھے، جبکہ میں قید کرنا چاہتا تھا۔" اس نے کمال صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ سعاد کی آنکھیں غصے سے سرخ پڑی تھیں۔

"غصہ مت کرنا۔ کام کی بات پر آؤ فوراً۔" اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی گئی۔

"مسٹر مارک باربارا! کیا آپ نے کبھی عقاب کو قید میں دیکھا ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھوں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

"آپ کی تمثیل نے مجھے متاثر کیا۔" وہ ڈھٹائی سے ہنس دیا۔

”اس سے پوچھو وہ اسٹیون کو کیوں مروانا چاہتا ہے؟“

”اسٹیون کو کیوں مروانا چاہتے ہو؟“

”حزب اللہ یہ کام کیوں کرنا چاہتی ہے؟“ سوال کے بدلے سوال کیا گیا۔

”اس کی ہر سانس کے ساتھ معصوموں کی جان لی جارہی ہے۔“

”اسٹیون میرے راستے میں حائل وہ بھاری پتھر ہے جسے ٹھوکر مار کر میں اپنا پاؤں زخمی نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے کرسی سے ٹیک لگائی۔

”ٹھیک ہے۔ یہ پتھر ہم ہٹادیں گے اور اس کے لیے تم ہمیں وہ ثبوت دو گے جو اسٹیون کے دہشتگرد ہونے کی گواہی دیں۔ لیکن ایک بات یاد رہے۔۔ اسٹیون کے بعد اگلی باری تمہاری ہو گی!!“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھوں گاڑے چبا چبا کر کہا تھا۔

”خوشی سے۔۔ میں اپنی باری کا انتظار کروں گا۔“ وہ مسکرا دیا۔ سعاد نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے وہ کاغذ اٹھا کر ایڈریس دیکھا پھر اپنا موبائل نکالا۔ وہ ایڈریس کسی کو بھیجا اور ساتھ ہی پیغام بھی۔ پھر موبائل رکھ کر سعاد کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹھیک دو منٹ بعد سعاد کو پیغام موصول ہوا۔ ثبوت وصول کیے جا چکے تھے۔

”امید ہے مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔“ وہ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر بولا تھا۔

”جسٹ ویٹ اینڈ واچ!“ سنجیدگی سے کہتی ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گئی۔ مارک سر جھٹک کر ہنس دیا۔ اسے اپنے کندھوں سے بھاری بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ریستوران کی عمارت دھیرے دھیرے خالی ہو رہی تھی۔ برقی روشنیاں بجھنے لگی تھیں۔ تاریک رات کی تاریکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

مارک کی جانب سے ثبوت جندل نے وصول کیے تھے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد اسے جندل کا پیغام موصول ہوا تھا جس کے مطابق ثبوت ازابیلا تک پہنچ چکے تھے۔ اسے بس اب صبح کا انتظار کرنا تھا۔ وہ صبح جو کئی زندگیوں میں نیا انقلاب لانے والی تھی۔ کئی زندگیاں اثرانداز ہونے والی تھیں۔۔۔اس نے آرام سے لیپ ٹاپ بند کر کے میز پر رکھا پھر ذرا سا کھسک کر تکیے پر سر رکھ دیا۔ وہ ابھی آنکھیں موندنے ہی لگا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے گردن ترچھی کر کے اندر آتے بدر کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟ اس وقت یہاں؟" اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"آپ کو رات میں میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔" نرمی سے کہتا وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے آگے آیا۔ بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ اب ٹھیک معلوم ہو رہا تھا۔ تسلی کرنے کے بعد وہ صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ خیام نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ جیکٹ اتار کر صوفے کے بازو پر ڈالتے ہوئے بدر نے رک کر خیام کو دیکھا تھا۔ رات کی تاریکی اور سناٹا، اپنے گھر کی طرف جاتا بدر، اچانک کسی اجنبی کی کال اور وہ الفاظ جنہوں نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ اور وہ لمحہ جب اس نے کمپنی میں قدم رکھا اور نگاہ اس سرخ گاڑھے خون پر پڑی جو پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اسے اپنی جان ہی تو نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ جب اس نے خیام کا سر اپنی گود میں رکھا تھا تب ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر اس کی وہ مسکرانے کی کوشش۔۔۔وہ کوئی ایک لمحہ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ سب ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ ہر لمحہ اور ہر پل۔۔

اسے اپنی آنکھ سے ایک آنسو لڑھکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں میچیں تھیں۔ اس بڑی سی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم تھے جنہیں وہ "اپنا" مانتا تھا۔ یہ چند لوگ اسے بہت عزیز تھے، وہ انہیں کبھی تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور حال ہی میں اسے احساس ہوا تھا کہ غیر محسوس طریقے سے ان چند لوگوں میں خیام کا بھی اضافہ ہو چکا

تھا۔ ایک اور آنسو اس کے گال پر لڑھک گیا۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے سامنے دیکھا تو خیام معصومیت سے پلکیں جھپکتا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے گال رگڑنے لگا۔

”مجھے لگا آپ سو گئے ہیں۔“ اس نے اپنی خفت مٹانی چاہی۔

”تم بھی رو رہے ہو؟ میرے لیے؟“ وہ جانے کیوں حساس ہو رہا تھا یا شاید بدر زیادہ محسوس کرنے لگا تھا۔

”کیا کوئی اور بھی رویا ہے؟“ وہ نم انکھوں سے مسکرایا۔ خیام چند پل پلک جھپکتا اسے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ بدر نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”آپ نے مجھے ڈرا دیا تھا۔۔“ اس کی آواز نم ہونے کے ساتھ ساتھ بھاری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ”ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے آپ بہت اچھے لگتے ہیں لیکن پھر برے بھی تو نہیں لگتے۔ میں جانتا ہوں یہ کہنے میں ذرا عجیب سا ہے لیکن آپ ایک اچھے کھڑوس باس ہیں۔ اور میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس اجنبی سی سرزمین پر جہاں اپنی زندگی کے قیمتی دس سال گزارنے کے بعد بھی میں اجنبی ہی ہوں، وہاں مجھے دس سالوں بعد کوئی اپنا ملا ہے۔ میں اس ”اپنے“ کی تشریح نہیں کر سکتا مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں سر۔۔ آپ ہمیشہ ہر مشکل میں مجھے اپنے ساتھ کھڑا پائیں گے!“ وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ دھیمی آواز جس میں نمی گھل رہی تھی۔ خیام نے پلک جھپک کر اسے دیکھا۔

”رات کے اس پہر اس کمرے میں اکیلے تم میرے ساتھ کسی لڑکی کی طرح کیوں پیش آ رہے ہو بدر؟“ اس کی آواز میں خوف تھا، احتیاط تھی۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنی عزت پیاری تھی اور باکردار رہنا عزیز تھا۔ بدر اسے عجیب سا محسوس کروا رہا تھا۔

”آپ میرے جذبات کا مذاق اڑا رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ایسے خالص لڑکیوں والے بھاری جذبات تم میں کہاں سے امڈ آئے ہیں؟“ وہ بچوں کی طرح چڑ کر کہہ رہا تھا۔ بدر بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

”سر آپ۔۔۔“ وہ کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

”ہاں میری بات سنو۔ صبح ہوتے ہی اپنا بوریا بستر باندھو اور روانہ ہو جاؤ یہاں سے۔ میں اس کمرے میں اکیلا تمہارے ساتھ بالکل محفوظ محسوس نہیں کر رہا۔“ منہ کے زاویے بگاڑ کر کہتے ہوئے اس نے کمفرٹر اپنے منہ تک کھینچ لیا۔ بدر منہ کھولے بنا پلک جھپکے اسے دیکھتا رہا۔ ”جذبات۔۔ میرے لیے۔۔ استغفر اللہ!“ وہ کروٹ بدلتے ہوئے اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ اور بدر۔۔۔ وہ ہنوز سناٹے میں تھا۔ اس کے جذبات کو بری طرح کچلا گیا تھا۔ وہ اب اپنی پوری رات یونہی گزارنے جا رہا تھا۔ اپنے جذبات کے کچلے جانے کا ماتم کرتے ہوئے۔ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟۔۔۔ آہ خیام!!

☆☆☆

”میں اس اسلحے سے ایسی فوج تشکیل دوں گا جو دنیا سے امن کا نام و نشان مٹا دے گی۔ وہ فوج جو اپنی دحشت سے پوری دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دے گی۔“

”اتنے بڑے خواب۔۔ اور تعبیر کے لیے کیا؟“

”آج شام تک کا انتظار کرو۔ جس وقت بحر الکاہل کے اوپر اڑتا جہاز پوری رفتار سے سمندر میں گرے گا تب تمہیں یقین آ جائے گا۔“ زوردار قہقہہ اور پھر خاموشی۔

”یہ گفتگو بار بارا کمپنی کے پریزیڈنٹ اسٹیون بار بارا اور دہشتگرد تنظیموں کے ایک ایجنڈے کے درمیان آج سے دو سال قبل ہوئی۔ تاریخ انتیس جولائی، جس کی شام کو بحر الکاہل کے اوپر پرواز بھرتا طیارہ ہائی جیک کیا گیا اور پھر

پوری دنیا نے دیکھا کہ وہ طیارہ دو سو اکیس افراد کو ساتھ لیے سمندر میں جا گرا۔ وہ معصوم افراد اس ایک شخص کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے جو شرافت کا لبادہ اوڑھے ہمارے درمیان بیٹھا ہے۔ میں بار بارا گروپ کے پریزیڈنٹ اسٹیون بار بارا کی بات کر رہی ہوں جو بظاہر تو ایک شریف انسان ہیں مگر حقیقت میں یہ انسانی جانوں سے کھیلنے والا وہ درندہ ہے جسے محض پیسے سے مطلب ہے۔" اس کی چہرے پر چھائی سختی اس کے الفاظ کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی شامل ہو رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے توقف سے اپنی بات جاری رکھی۔ "اسٹیون بار بارا اور اس جیسے کئی درندے جو میری اور آپ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے آئے ہیں ہمیشہ سے قانون کی پکڑ سے محفوظ رہے ہیں۔ ملک کی پولیس ہو، وکلاء ہوں یا سپریم کورٹ کے ججز۔۔ ہر شخص کو پیسے سے مطلب ہے اور جہاں انہیں اپنی مراد پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے وہاں ان کی آنکھوں میں چمک ابھرتی ہے جو انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ یہ اپنی آنکھوں کے سامنے انصاف کا قتل ہوتے دیکھتے ہیں مگر زبانیں تالو سے چپک جاتی ہیں۔ یقیناً میں یہ سب بنا ثبوت کے نہیں کہہ رہی اور نہ ہی محض اپنی طرف سے اندھیرے میں نشتر چلا رہی ہوں۔ میں اسی وقت آپ کے سامنے وہ تمام ثبوت پیش کر سکتی ہوں جو یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر اسٹیون نامی دہشتگرد جو ہزاروں معصوم لوگوں کا قاتل ہے، اس ملک کی سڑکوں پر آزاد گھومتا ہے تو اس میں ہمارے ملک کے ہر ہر فرد کا ہاتھ ہے۔

یہاں اس ظالم شخص کے بعد آپ اور میں مجرم ہیں جو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوئے ظلم کو دیکھ کر بھی خاموش ہیں۔ ہم اس اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکے کو بھول گئے جس نے اپنے خاندان کی کفالت کی خاطر اسٹیون جیسے درندوں کی باتوں میں آکر مجبوراً خودکش دھماکے میں اپنے ساتھ ساتھ اکیس افراد کی جان لے لی۔ اور اس عورت کا کیا جو ان درندوں کی درندگی سے گھائل ہو کر پوری قوت سے بہتے سمندر میں چھلانگ لگا دیتی ہے اور اس معصوم بچے کا کیا جو اپنے خاندان کی کفالت کی خاطر دن رات کام کرتا ہے مگر مشینری میں مسئلہ ہو جانے کی وجہ سے آگ کی نذر

ہو جاتا ہے۔ آپ اور میں بھول چکے ہیں کہ مذکورہ نوجوان بارباراکمپنی کا ملازم تھا، وہ عورت بارباراکمپنی میں درندگی کا شکار ہوئی اور وہ معصوم بچہ بارباراگروپ کے زیرِ نگرانی کارخانے میں جل کر بھسم ہوگیا۔ ہم خاموش رہے کیونکہ نہ وہ نوجوان ہمارا بھائی تھا، نہ وہ عورت ہماری بہن تھی اور نہ ہی اس بچے سے ہمارا کوئی خونی رشتہ تھا۔ خودغرضی اس حد تک سرایت کرگئی ہے کہ ہم بھول گئے کہ ہم سب کا ان کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ مٹی کا تعلق۔۔ ایک ہی سرزمین میں رہنے والے وہ ہمارے ہم وطن تھے۔۔ ان کے مجرم میں اور آپ ہیں جو اس بِکی ہوئی حکومت کے آگے خاموش رہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ کیمرے کے دوسری جانب کھڑے کیمرامین نے تھمب اپ کا اشارہ کرکے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"یہاں بات صرف اسٹیون کی نہیں ہے۔ یہاں ہر اس مجرم کی بات ہو رہی ہے جو ہمارے ساتھ آزاد فضا میں سانس لیتا ہے جو آزادی سے بھرپور ہوتی ہے۔ کیا وہ اس کا حق رکھتا ہے؟ کیا ہماری جانیں، ہمارا خون اتنا ارزاں ہے کہ دو پیسوں کی خاطر حکومت ہمیں بیچنے کو تیار ہے، ہمارا عدالتی نظام ہمیں اپنی ٹھوکر پر رکھے ہوئے ہے؟ اور کیا ہم اتنے بے مول ہیں کہ اس سب کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہیں گے؟ یہ سب اب نہیں ہوگا۔ میں۔۔ ازابیلا وارلڈ، نہایت ہی ادب کے ساتھ اپنی پولیس، عدالت اور حکومت سے گذارش کرتی ہوں کہ اسٹیون باربارا کو کٹہرے میں کھڑا جائے اور اس مجرم کو سزا دی جائے۔ اگر ہماری حکومت یہ نہیں کرسکتی تو یاد رہے پھر عوام اپنے ہاتھوں میں انصاف کی تلوار لے لیتی ہے۔ اور جب انصاف کی تلوار عوام کے ہاتھوں میں آجائے تو تخت الٹ دیا جاتا ہے۔۔ مجھے امید ہے میری درخواست کو اس قوم کی درخواست سمجھ کر اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ شکریہ۔۔" اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ رکارڈنگ روک دی گئی۔

"گڈ جاب ازابیلا!" اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ٹیم کو دیکھا تھا، جو خوشی و مسرت سے اسکرین کی جانب دیکھ رہے

تھے جہاں دھیرے دھیرے ان کا چینل ٹاپ ٹرینڈنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک ماہ بعد ایک صحافی کے طور پر واپس صحافت کی طرف لوٹ آجانا اسے سرشار کر رہا تھا۔ اس نے اپنی راہ میں آئی ہر رکاوٹ کو ہٹا دیا تھا، اس نے زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کا مقابلہ کیا تھا۔ اسے اب آگے بڑھنا تھا، وہ ہرگز بھی رکنا نہیں چاہتی تھی۔ یہی اس کی راہ تھی، اور وہ اس راہ کو چھوڑ کر بھٹکے ہوؤں میں سے نہیں ہونا چاہتی تھی۔

☆☆☆

•ایک دن پہلے

”آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ڈیوڈ کے قاتلوں کو ڈھونڈوں، اگر میں کہوں کہ میں نے ڈھونڈ لیا ہے تو؟“ اس نے حیرت سے خیام کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں سنجیدگی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کون؟“

”اسٹیون بار بارا!“ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ ”اسٹیون وارلڈ گلاس کمپنی کا پرسنل ڈیٹا لینا چاہتا ہے جس کے بعد کمپنی اس کے ہاتھ میں ہو گی۔ ڈیوڈ اس تمام ڈیٹا تک رسائی رکھتا تھا۔ اسٹیون نے ڈیوڈ کو استعمال کرنا چاہا اور پھر اس کے انکار پر اسے مار دیا گیا۔“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسٹیون اور ابراہم کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ وہ بچپن سے اسے جانتی تھی مگر اب اچانک اس کا یہ چہرہ سامنے آ جانا۔۔ اسے اس سب پر یقین کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"آپ کی یہ حالت۔۔ کیا یہ اسٹیون نے کی ہے؟" اس نے ٹھہر کر پوچھا تھا۔

"کل رات اس کے آدمی کمپنی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بدقسمتی کہوں یا خوشقسمتی کہ میں وہیں تھا اور نتیجتاً اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ کمپنی محفوظ ہے مگر زیادہ دیر تک نہیں۔ اسٹیون دوبارہ کوئی چال چلے گا۔"

"تو اب آپ کیا کریں گے؟ کیا بابا کو بتایا؟" اس کے سوال پر خیام نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ابراہم وارلڈ یقیناً اپنی دوستی کی خاطر اسے معاف کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور یہ میں نہیں چاہتا۔ مجھے آپ سے ایک فیور چاہیے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

"کیسا فیور؟" اس نے پہلو بدلا۔

"اسٹیون کے خلاف تمام ثبوت آپ کو رات تک مل جائیں گے۔ آپ یہ ثبوت میڈیا کے ذریعے عوام کے آگے پیش کر دیں۔ اگر میں یا آپ عدالت میں اپیل کریں تو اسٹیون کا پیسہ ہمارے قدم روک سکتا ہے مگر جہاں تک بات ہے عوام کی تو۔۔ ہر حاکم عوام کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ آپ یہ ثبوت عوام کو دیں، انصاف عوام خود لے لی گی۔" اور وہ دنگ رہ گئی تھی۔ وہ اسے صحافت میں واپس آنے کا کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے خلاف جانا تھا۔ خیام کا یہ دوٹوک انداز اور پھر اس پر آئی یہ مشکلات وہ ان سب کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خود ہی تو اسے لاوارثوں کے لیے لڑنے کا کہا تھا اور اب جب اسے میدان میں آنا تھا تو وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ اس وقت اس کے پاس ہامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

"آپ نے ازابیلا سے یہ کیوں کہا کہ ڈیوڈ کو اسٹیون نے مارا ہے؟ ہم اب تک اس کے قاتلوں تک نہیں پہنچ سکے۔" اس کی سماعت سے سعاد کی آواز ٹکرائی۔ اس نے ایک نگاہ اسکرین پر آتی ازابیلا پر ڈالی پھر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ "کیا

آپ کو لگتا ہے کہ اگر آپ ازابیلا سے ڈیوڈ کے قاتل کے متعلق جھوٹ نہ بولتے تو وہ یہ کام نہ کرتی؟ وہ صحافت کی طرف واپس نہ لوٹتی؟"

"ہاں۔ یہ وقت ایسا ہے کہ میں "اگر یہ اگر وہ" کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس وقت ہر کام کو ہو جانا چاہیے۔ چاہے پھر کوئی بھی اس کی خاطر استعمال ہو!" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آپ کو ازابیلا کو استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا خیام!" وہ افسوس سے بول رہی تھی۔

"تمہیں اس سے ہمدردی ہو رہی ہے؟"

"کیا آپ کو نہیں ہو رہی؟" سعاد نے سوال کے بدلے سوال کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا۔ سعاد نے اپنی بات جاری رکھی۔" وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کی ماں تک اسے استعمال کرتی آئی ہے۔ آپ یہ مت کریں، اس نے آپ پر یقین کیا ہے۔ جب اسے حقیقت کی خبر ہو گی تو کون جانے اس پر کیا قیامت بیتے گی۔"

"وہ باہمت ہے۔ خود کو سنبھال لے گی۔"

"ایک لڑکی چاہے جتنی بھی باہمت ہو، وہ لڑکی ہی ہوتی ہے خیام! جذباتی اور حساس۔۔" اس نے سعاد کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی مگر اس کے پاس بھی کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر ازابیلا کو استعمال کر کے وہ ایک نتیجے پر پہنچ سکتے تھے، تو وہ اس سے ہرگز بھی دریغ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ لڑکی تھی، جذباتی اور حساس۔۔ تو وہ ایک جاسوس تھا۔ سنگدل اور بے رحم! اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ لاونج میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کر رکی تھی۔ سامنے کانچ کی اس میز پر کئی شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے پار صوفے پر ابراہام وارلڈ آنکھیں موندے سر گرائے بے ڈھب انداز میں بیٹھا تھا۔ وہ چند پل یونہی

ساکت نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ ایک عرصے بعد اپنے باپ کو یوں شراب پیتا دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت عرصے سے یہ کام چھوڑ چکا تھا حتیٰ کہ اسے تو یاد بھی نہیں تھا آخری بار کب اس نے یہ کام کیا تھا مگر اب۔۔ وہ اس کی وجہ بن چکی تھی۔ نگاہیں ایل ای ڈی کی روشن اسکرین پر ٹکیں جہاں اس کی ویڈیو چل رہی تھی۔ اسے اپنا آپ مجرم سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ہینڈ بیگ صوفے پر رکھ کر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس آئی۔

"بابا۔۔" آواز کانپ گئی تھی۔ وارلڈ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ سرخ پڑتیں آنکھیں جن میں انتہا کی اداسی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

"تم نے کبھی مجھے بتایا کیوں نہیں ازابیلا کہ۔۔ تمہاری ماں تم سے ایسا ظالمانہ سلوک رکھتی تھی۔۔۔" وہ ویسے ہی سر صوفے کے بازو پر گرائے پوچھ رہا تھا۔

"آپ ان سے میرے لیے لڑ پڑتے۔ اس محبت کا کیا ہوتا جو آپ کو ان سے تھی؟" اس نے دھیرے سے اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

"مجھے تم سے زیادہ عزیز کوئی نہیں ازابیلا۔۔ کوئی نہیں!" وہ آنکھیں موند گیا۔ اس نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر شراب کی بوتلیں وہاں سے ہٹانے لگی۔ "انہیں رہنے دو یہیں۔ مجھے سکون چاہیے، میں سو نہیں سکتا۔" بوتلوں کی طرف اس کے بڑھتے ہاتھ وہیں رک گئے۔

"کیوں کر رہے ہیں یہ سب؟ آپ جانتے ہیں مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ آپ کو بھی تو نہیں پسند تو اب کیا ہو گیا ہے بابا؟"

"رہنے دو ازابیلا۔۔ صرف آج کی بات ہے۔" وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ جب آپ ہوش میں آجائیں تو بتا دیجیے گا۔ میں گھر آجاؤں گی، کیونکہ کم از کم میں اس حال میں آپ کو

نہیں دیکھ سکتی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتی جانے کے لیے مڑی تھی۔ اسے لگا تھا اس کا باپ اسے روکے گا مگر وہ تو ایک بار پھر شراب کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ وہ پتھر بنی اسے ایک کے بعد ایک بوتل خالی کرتے دیکھ رہی تھی۔ جب ہمت جواب دے گئی تو اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ بھی وہیں چھوڑ دیا تھا اور گاڑی بھی۔۔ وہ یونہی پیدل گھر سے نکل آئی تھی۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش کی نہیں تھی۔ وہ گم سم سی حالت میں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔

اپنے باپ کے خلاف جا کر، ان کے کہے کو رد کر کے صحافت کی طرف واپس جا کر اس نے ٹھیک کیا تھا؟ اس بڑی سی دنیا میں صرف اس کا باپ ہی تو تھا جو اس کا اپنا تھا۔ اور وہ اس اپنے کو بھی تکلیف میں مبتلا کر گئی تھی۔ نگاہوں کے سامنے بار بار ابراہم کا چہرہ آ رہا تھا۔۔ مدہوش اور نشے میں دھت۔۔ آنکھوں میں وہ اداسی۔۔ وہ اس سب کی عادی نہیں تھی۔ اسے کبھی اس طرح نشے میں دھت ہونا پسند نہیں تھا اور اس کے والد نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا تھا۔ اس کے ارد گرد کے لوگ بھی محتاط رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اسٹیون کے گھر بھی جب وہ ابراہم کے ساتھ جاتی تھی تو وہ لوگ بھی احتیاط برتتے تھے۔ تو اب اچانک یہ سب کیوں بدل گیا تھا۔ وہ اگر اپنے باپ کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟ جب ایک طرف کچھ ہی دن پہلے جسے وہ محبت کہتے تھے اسے کھو دیا، پھر جان سے عزیز دوست کی طرف سے پیٹھ میں خنجر گھونپا گیا اور پھر ان کی بیٹی نے بھی ان کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ واقعی وہ ہوتی تو اس صورت میں کیا کرتی؟ کیا اسے سکون ملتا؟ کیا واقعی وہ سکون کے لیے اس سب میں نہ پڑتی؟ اس نے گہری سانس لی تھی۔ مختلف سوچیں تھیں، مضبوط دائرہ تھا۔ ایک بھنور سا تھا جو اسے ارد گرد سے بے گانہ کیے ہوئے تھا، حتیٰ کہ وہ اپنی طرف دوڑ کر آتے زیاد کو بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ اسے مسلسل پکار رہا تھا مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا تھا۔ وہ ایک دم چونکی۔ ڈر کر سامنے دیکھا۔

"ازا کہاں گم ہو! کب سے بلا رہا ہوں۔" وہ پریشان ہوا تھا۔ اس نے زیاد کو دیکھ کر سکون کی سانس خارج کی۔

"معذرت میں نے سنا نہیں۔"

"ازا۔۔ تم ٹھیک ہو؟ رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو وہ بھی اکیلی؟ سب ٹھیک ہے ناں؟" اس کے تشویش سے کہنے پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا یہ ممکن ہے تم اس وقت مجھ سے کوئی سوال نہ کرو؟" زیاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے مگر پھر وہ فوراً سر اثبات میں ہلا گیا۔

"ٹھیک ہے۔۔ گھر چھوڑ دوں؟" وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔ "میرے گھر چلو پھر۔" اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر قدم بڑھا دیے۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہا تھا جو سر جھکائے ہنوز گہری سوچوں میں گم تھی۔ بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا تھا۔ "تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے زیاد؟" وہ اس سوال پر ٹھٹھکے بنا آرام سے چلتا رہا۔

"کونسی محبت کا پوچھ رہی ہو؟"

"محبت تو محبت ہوتی ہے ناں۔ یہ طرح طرح کی تو نہیں ہوتی۔" وہ الجھی۔ زیاد ہلکا سا مسکرا دیا۔

"ہوتی ہے ناں۔۔ ایک محبت وہ جو ہم خدا سے کرتے ہیں۔ پھر وہ جو ہمیں اپنے والدین سے ہوتی ہے۔ اپنے بہن بھائیوں سے اور رشتے داروں سے۔ پھر وہ جو ہمیں اپنے ارد گرد کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ یعنی جن کے ساتھ ہم پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں، کام کرتے ہیں۔ پھر وہ جو ہمیں کسی ایسے انسان سے ہوتی ہے جس میں ہم اپنا ہمسفر دیکھتے ہیں۔ ایک وہ جو ہمیں مختلف چیزوں سے ہو جاتی ہے۔ محبت وطن سے بھی ہوتی ہے، جان سے بھی اور دنیا سے بھی۔ تم کس محبت کی بات کر رہی ہو؟" مسکراتے ہوئے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ وہ اس کے سوال پر جھرجھری

لے کر رہ گئی۔ اس نے تو سادہ سا سوال کیا تھا مگر وہ اس کے سوال کو بھی الجھا چکا تھا۔ وہ تو بس محبت کی بات کر رہی تھی۔۔ بس محبت کی!

"ام۔۔ میں شاید انسانوں سے محبت کی بات کر رہی ہوں۔ یعنی کوئی ایسا شخص جس کے گرد تمہاری زندگی کا کُل محور ہو۔ بھلے وہ والدین ہوں، دوست، بھائی یا کوئی اور۔" وہ اپنی بات کہہ چکنے کے بعد کندھے اچکا گئی۔ زیاد نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں ہے۔ اس سے محبت کی نہیں تھی، بس ہو گئی تھی۔" وہ مسکرا دیا۔ ازابیلا نے ٹھہر کر مشکوک نگاہوں سے اس کی مسکراہٹ کو دیکھا۔ "کس کی بات کر رہے ہو؟"

"تم اپنے سوال پر آؤ۔ کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔" وہ کندھے اچکا گیا۔

"اگر تم کبھی اسے تکلیف میں دیکھو۔۔ خود اپنی وجہ سے ہی تو کیا کرو گے؟ یا کیا کرنا چاہو گے؟" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"کیا اس میں اس کی بھلائی ہے؟"

"نہیں۔۔۔" اور پھر وہ ٹھہر گیا۔ سوال مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اپنی وجہ سے تکلیف کا ہونا جس میں کوئی بھلائی بھی تو نہیں۔۔ ذہن کی اسکرین پر وہ چہرہ گھوم گیا جو اسے بے حد عزیز تھا۔ "میں خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دوں گا ازا۔۔ شاید قدرت کبھی وقت بدل دے۔" وہ سر جھکا گیا۔

"اور اگر وقت نہ بدلا؟"

"تو پھر بہتر کی امید رکھتا ہوں۔ اور دیکھو اب مزید کوئی سوال نہیں۔ گھر آ گیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ

گیا۔ ازابیلا نے بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ اس وقت اسے واقعی ایک اچھے دوست کی ضرورت تھی جو اسے مل گیا تھا۔

☆☆☆

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آیا اور زور سے دروازہ بند کیا۔ تیزی سے ٹائی اتار کر بیڈ پر پھینکی۔ چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ پورے وجود میں آگ لگی تھی۔ اسے استعمال کیا گیا تھا۔ حزب اللہ بہت آسانی سے اس کے ساتھ کھیل کھیل چکی تھی۔ احساس تذلیل اسے جلا کر راکھ کر دینے والا تھا۔ اس نے غصے میں آکر کوٹ اتارا اور کھینچ کر بیڈ پر دے مارا۔ پھر زور سے چلاتے ہوئے میز پر رکھی چیزیں نیچے پھینک دیں۔ چھناکے کی آواز سے کئی کانچ کی چیزیں کرچیوں میں بدل گئیں۔ اس نے سامنے رکھی کرسی کو لات ماری۔ کرسی الٹ کر دور جا گری۔ عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور مائک اندر آیا۔ اس نے ایک نگاہ کمرے کی حالت پر ڈالی پھر غصے سے لال ہوتے مارک کو دیکھا۔

”ابھی کے ابھی نکل جاؤ میرے کمرے سے۔۔۔ گیٹ آؤٹ!“ اس نے انگشت شہادت سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرے جانے سے کیا ہو گا؟ کیا آپ کا پھیلایا ہوا گند صاف ہو جائے گا؟“ اس کے طنز پر وہ آگ بگولا ہوا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے مائک! نکل جاؤ یہاں سے گیٹ آؤٹ!!“ وہ پوری قوت سے چلایا تھا۔ مائک تنفر سے ایک نگاہ اس پر ڈال کر باہر آگیا۔ کمرے سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ زینوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے ایئر پوڈز آن کیے۔

”کہیے۔۔۔ آپ کہاں غصہ نکال رہے ہیں؟“ لہجے میں طنز تھا۔ وہ ان دونوں باپ بیٹے کے درمیان پِس کر رہ چکا تھا۔

”میری مدد کرو مائیک“!

”آپ کو اب بھی راہِ فرار نظر آ رہی ہے؟ ذلت آپ کے سر پر مسلط ہو چکی ہے۔ سب کچھ تباہ و برباد کر دیا ہے اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے۔ اور ذریعہ کون بنا؟ آپ کا اپنا بیٹا مارک! آپ کو کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا اس نے۔“ وہ دبا دبا سا چلایا تھا۔

”اگر وہ ثبوت واپس لے لیے جائیں تو عدالت میں پیش کرنے کو کچھ باقی نہیں رہے گا!“ اسٹیون کی بات پر وہ چونکا۔ اس کا باپ یقیناً اپنے لیے راہِ فرار تلاش کر چکا تھا۔

”کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”مارک سے کہو کسی بھی طرح وہ ثبوت مٹا دے۔ میرے پاس صرف کچھ گھنٹے ہیں۔ اس کے بعد پولیس مجھ تک پہنچ جائے گی۔ اور کون جانے پھر میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ آواز میں خوف تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”اور آپ کا وہ نام نہاد بیٹا کیونکر آپ پر اتنا مہربان ہونے لگا ہے؟“

”اگر وہ ثبوت نہیں مٹاتا۔۔۔ تو ہم دنیا کے سامنے وہ راز لے آئیں گے جو اس کے لیے تباہ کن ثابت ہو گا۔“

”کیسا راز؟“ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”جانتے ہو میکس کو کیوں مروایا گیا تھا؟“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ۔۔۔ ازابیلا ابراہم وارلڈ کی سگی بیٹی نہیں ہے۔۔۔ اور یہ کہ وہ ایک مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ میکس یہ راز سب کو بتانے والا تھا تبھی اسے مروا دیا گیا۔“ اس کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔ ازابیلا کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ مذہب کی جنگ لڑتی وہ معصوم لڑکی۔۔ اسے ایک لمحے کے لیے اس پر بے انتہا

ترس آیا تھا۔

”یہ کوئی ایسا راز تو نہیں جو مارک کو ثبوت مٹانے پر قائل کرے؟ ہزاروں لوگ بچے ایڈاپٹ کرتے ہیں۔ اور پھر یہ کوئی جرم بھی نہیں ہے۔“ اس نے کم فہمی سے کہا۔

”تم سمجھ نہیں رہے کم عقل انسان! اس راز کے ساتھ کئی اور راز جڑے ہیں۔ اگر یہ راز کھل گیا تو وہ بھی منظر عام پر آجائیں گے اور مارک یہ کبھی نہیں چاہے گا۔ ابراہم وارلڈ اسے اسلحے کے لیے جو پیسہ دے رہا ہے وہ اسے نہیں مل پائے گا۔ اگر وہ اس راز کے لیے میکس کی جان لے سکتا ہے تو وہ یہ ثبوت کیوں نہیں مٹا سکتا؟“ اسٹیون نے تفصیلاً سب بیان کیا۔ وہ اس کھیل میں گھوم کر رہ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں کرتا ہوں کچھ۔۔ اور اگر میں نہ کر پایا تو سرنڈر کر دیجیے گا۔ اسی میں بھلائی ہے۔“ اس کا انداز تلخ ہوا تھا۔

”اگر تم نہ کر پائے تو مارک مجھے مار دے گا!“ اور ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسے اپنے باپ کے ان الفاظ پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ مارک کا اپنا کھیل بگڑ چکا تھا۔ اس نے حزب اللہ کو ثبوت دیے تھے تاکہ اسٹیون بھی اس کے راستے سے ہٹ جائے اور اس کے ہاتھ بھی صاف رہیں۔ مگر حزب اللہ نے وہ ثبوت میڈیا کو دے دیے جو اب بار بارا گروپ کی عزت بہت شوق سے اچھال رہا تھا۔ اسٹیون کو برباد کرنے کی خواہش میں مارک، بار بارا گروپ کو برباد چکا تھا۔ وہ اپنے ہی کھودے گئے گڑھے میں گر چکا تھا۔ اور اب اگر اسے اپنی عزت کے لیے اسٹیون کی جان بھی لینا پڑی تو وہ دریغ نہیں کرنے والا تھا۔

☆☆☆

وہ خالی خالی نگاہوں سے آسمان کو تک رہے تھے۔ سیاہ تاریک آسمان پر بکھرے ہوئے تارے اور ان پر کسی حاکم کی طرح کھڑا چمکتا چاند۔۔ تنہا اور اکیلا۔۔ ان کی زندگی بھی تو اس چاند سی ہو گئی تھی۔ یہ آسمان ان کے لیے سمندر تھا، گہرا اور حد نگاہ تک پھیلا سمندر جہاں وہ تنہا تھے۔ کوئی اپنا نہیں تھا جو ان کے ساتھ لہروں کے شور میں بحری جہاز کے عرشے پر چڑھ کر آسمان پر بکھرے تاروں کو گنے۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔۔ وہ یک ٹک ان تاروں کو دیکھ رہے تھے۔ بنا پلک جھپکے، سانس روکے۔ ان کی آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ سر کے سیاہ بالوں سے اب سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر جھریاں سی نمودار ہو رہی تھیں۔ وقت گزر رہا تھا وہ اب بوڑھے ہو رہے تھے۔ باجود اس کے ان کے حوصلے اب بھی بلند تھے۔ سمندر کی پُرزور لہروں کے سامنے وہ اب بھی مانندِ چٹان کھڑے ہوتے تھے البتہ وہ چند لمحات۔۔ جو انہیں تنہائی کے میسر آتے تھے ان میں وہ خود کو بے حد کمزور محسوس کرتے تھے۔ ان کا واحد سہارا۔۔ ان کا اکلوتا بیٹا انہیں تنہا کر کے دور کہیں جا بسا تھا۔ کسی اجنبی سرزمین پر۔۔ اجنبیوں کے درمیان۔۔۔ ہر سُو پھیلی خاموشی کو دروازے پر ہوتی دستک نے توڑا۔ وہ چونک کر خیالوں سے باہر آئے۔ کم فہمی سے دروازے کی طرف دیکھا جو اب کبھی کبھار ہی بجا کرتا تھا۔ جسے آنا چاہیے تھا وہ کبھی نہیں آتا تھا۔۔ گہری سانس لے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی اثناء میں دروازہ پھر بج اٹھا۔

"آرہا ہوں صبر کرو خدا کے بندے!" انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ نگاہ سامنے ٹکی تو آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک سامنے کھڑے اپنے جوان بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ کئی سالوں بعد وہ لوٹ آیا تھا۔ انہیں سانس لینے میں دقت پیش آئی تھی۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں با قاعدہ نمی تیرنے لگی تھی۔ "گلے سے نہیں لگائیں گے بابا جان؟" اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ ان کے کندھے پر سر ٹکائے انہیں خود میں بھینچے رو دیا

تھا۔ وہ دیوانہ وار اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے اسے چوم رہے تھے۔ وہ محبت سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جو تمام ناراضگیاں بھلا چکا تھا۔

"آپ کے لیے مہمان لایا ہوں بابا۔۔" انہوں نے ٹھہر کر اپنے بیٹے کو دیکھا پھر اس کے پیچھے چھپے بچوں کو۔۔ دائیں جانب سے ذرا سا سر نکال کر انہیں دیکھتا وہ بچہ۔۔ اور بائیں جانب سے سر نکال کر معصومیت سے انہیں تکتی وہ بچی۔۔ انہوں نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔

"آپ کی پوتی۔۔ سعاد اور یہ جندل۔۔ سعاد یوسف زئی اور جندل یوسف زئی!" ان کی آنکھیں ایک بار پھر اشک بار ہوئی تھیں۔

"السلام علیکم آغا جان!" دونوں نے بیک وقت کہا تھا۔ وہ پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر دونوں کو گلے سے لگا گئے تھے۔ انہیں ان کے بکھرے ہوئے تارے مل چکے تھے۔۔

"ان کو اور ان کی ماں کو اندر لے جائیں بابا۔۔" دحیہ کے کہنے پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ نگاہوں میں کئی سوال ابھرے۔ وہ ان سوالوں کو دیکھ کر نظریں چرا گیا۔ "میں بہت جلد لوٹوں گا۔۔ وعدہ رہا!" وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ کچھ دیر پہلے کی نرمی اور شفقت کی جگہ اب غصے نے لے لی۔ انہوں نے جندل اور سعاد کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ان دونوں کے اندر جاتے ہی وہ دحیہ پر برسے تھے۔ " اپنے بوڑھے باپ کو اکیلا چھوڑنا کافی نہیں تھا جو اب بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنے پر تلے ہو؟ چاہتے کیا ہو تم دحیہ ؟!" ان کی آواز بلند ہوتی گئی۔ دحیہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"اپنی کئی بہنوں کو بیوہ اور کئی بچوں کو یتیم ہونے سے بچانا چاہتا ہوں بابا۔۔ مجھے روکنے کی کوشش مت کریں۔ میری بیوی اور بچوں کی آپ سے بڑھ کر کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ان کی بہت اچھی تربیت کیجیے گا بابا۔۔" اس کی آواز

دھیمی تھی اور چہرے پر نرمی تھی۔ انہوں نے غصے سے اپنا منہ پھیر لیا۔

"ایسے مت کریں۔۔ میں جانتا ہوں آپ کے ساتھ غلط ہوا ہے مگر اب آپ کے پاس ایک اور بیٹا ہے۔ جندل آپ کا بازو بنے گا۔ سعاد آپ کی تمام امیدوں پر پورا اترے گی۔ دحیہ کو معاف کر دیں بابا۔۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ وہ نرم پڑے تھے۔ "کب لوٹو گے؟" پر امید نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ خفیف سا مسکرا دیا۔ "بہت جلد"!

"ہاں سنو۔۔ جندل تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ اپنے آغا جان کے ساتھ وہ سمندروں کی آغوش میں رہے گا۔ اور تم اسے نہیں روکو گے!" ان کے جی کڑا کر کہنے پر دحیہ ہلکا سا ہنس دیا۔ "بس سعاد کو میرے لیے رہنے دیں۔ اسے ڈانٹیے گا مت وہ جلد رو دیتی ہے۔ مجھے اس سے بے حد محبت ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو مت آنے دیجیے گا۔" وہ دحیہ کی سعاد کے لیے محبت دیکھ کر مسکرا دیے۔ ان کا بیٹا بھی باپ بن چکا تھا۔ اولاد کا درد کیا ہوتا ہے اب خوب سمجھنے لگا تھا۔

"جاؤ پھر اللہ کی امان میں۔۔ جلد لوٹنا۔۔ سعاد کے لیے!" اس نے ایک آخری محبت بھری نگاہ ان پر ڈالی پھر ان کے عقب میں چھپ کر کے کھڑے جندل پر اور آگے بڑھ گیا۔ ان کی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان کا یہ بیٹا۔۔۔ جندل اللہ کا کمانڈر۔۔ آج پندرہ سالوں بعد گھر لوٹا تھا۔ اور ایسے کہ پندرہ منٹ بھی نہیں ٹھہرا تھا۔ انہوں نے اس ملت کی خاطر بہت بڑی قربانی دی تھی۔ اپنا جوان بیٹا اس کی خاطر خود سے جدا کر دیا تھا۔۔ شاید ہی کوئی ان کی اس قربانی کو سمجھ پائے۔۔ انہوں نے گہری سانس لی ہھر جیسے ہی پلٹنے لگے تو نگاہ معصومیت سے خود کو تکتے جندل پر پڑی۔

"مجھے آپی سے بے حد محبت ہے، آپی کی آنکھوں میں آنسو مت آنے دیجیے گا۔" وہ اس کے معصومیت سے کہنے پر

نم آنکھوں سے مسکرا دیے۔ کیا ہوا اگر ایک بیٹے کو رخصت کر دیا تھا، انہیں تو اپنا دوسرا بیٹا مل چکا تھا۔ وہ بیٹا۔۔ جسے وہ سمندر کی لہروں میں پروان چڑھانے والے تھے۔ جو ان کے ساتھ سمندر کے درمیان میں بحری جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر تارے گن سکتا تھا۔۔ جس کے لیے لہروں کا شور لوری کا کام دیتا۔۔ جسے سمندر سے بے انتہا محبت ہوتی۔۔ وہ جو۔۔۔ سمندروں کا عاشق ہونے جا رہا تھا۔۔ عشق اور پھر سمندر سے۔۔ ایک طرف آگ دوسری طرف پانی۔۔!

☆☆☆

"اپنی والدہ اور بھائی کا خیال رکھو گے خیام!" سنان نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے دباتے ہوئے تاکید کی تھی۔ خیام کے چھوٹے سے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔ "مگر میرا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ کیا میں آپ کا اکلوتا بیٹا نہیں؟ آپ کا خیام؟" وہ اس کے معصومیت سے پوچھنے پر مسکرا دیا۔ اس نے بغور اپنے باپ کی دلکش مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔ مراکش کے اس ساحل کنارے۔۔ نم ریت پر پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا یہ شخص اس کا باپ تھا۔۔ سنان حنفی۔۔ اس کے عقب میں ذرا فاصلے پر اس کا چھوٹا سا آشیانہ نظر آ رہا تھا جو اس کی کُل دنیا تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے باپ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اس کے باپ کا رنگ سرخ و سپید تھا۔ وہ اگر کبھی کھل کر ہنستا تو ٹماٹر کی طرح لال پڑ جاتا۔ اس کی آنکھیں گہرے بھورے رنگ کی تھیں۔ بال اس کے متضاد ہلکے بھورے رنگ کے تھے جو ہوا کے جھونکوں سے ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہمیشہ نرمی رہتی تھی اور آواز مدھم۔۔ سنان کی آواز سے اسے بے انتہا محبت تھی۔ اسے صرف سنان سے کہانیاں سننا ہوتی تھیں۔ وہ بہت دھیما بولتا تھا۔۔ لہجہ بہت نرم۔۔ یہی چند خوبیاں اسے سب میں منفرد بناتی تھیں۔۔ دُر یکتا کی مانند!

"تمہارا بھائی بھی جلد آ جائے گا میرے شیر!" سنان نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میرا بھائی بھی جلد آجائے گا۔ مجھے اس کا اور والدہ کا خیال رکھنا ہے۔" اس نے زیر لب سنان کی دی گئی ہدایات دہرائیں پھر اپنا چھوٹا سا ہاتھ ماتھے تک لے گیا۔ "جو آپ کا حکم کمانڈر"!

"میرا شیر۔۔۔" محبت سے کہتے ہوئے سنان نے اسے گلے سے لگایا تھا۔

"میرا شیر۔۔" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔ اسے اپنے باپ کا یہ طرز تخاطب بہت پسند تھا۔ جوش میں آکر محبت سے ادا ہونے والے یہ الفاظ۔۔ "میرا شیر"!

"اور خیام اس تمام عرصے میں کیا کرنے جا رہا ہے؟" وہ اسے خود کو محویت سے تکتا دیکھ کر خفیف سا مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ خیام نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "میں آپ کی کتابیں لوں گا۔۔ اور یہاں ساحل کنارے بیٹھ جایا کروں گا۔ میں اپنے کمانڈر سنان حنفی کے آنے کا انتظار کروں گا۔ کبھی آپ مجھے کسی کہانی میں بہادری سے لڑتے سپاہی میں نظر آئیں گے اور کبھی اس عظیم سالار کی صورت میں جو دشمن پر پوری قوت سے برستا ہے۔ مجھے ہر کتاب میں آپ ملیں گے۔ جب تھک جاؤں گا تو اسی نم ریت پر لیٹ جاؤں گا اور آپ کو اسمان پر بکھرے تاروں میں ڈھونڈوں گا۔ یہاں سے بہت سے بحری جہاز گزرتے ہیں مگر دور سے۔۔ مجھے امید ہے کوئی نہ کوئی بحری جہاز میرے اشارے پر رکے گا اور سمندر سے زمین پر پہلا قدم رکھنے والے آپ ہونگے۔ آپ ہونگے ناں۔۔ بابا؟" اس نے پر امید نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ دس سال کا تھا۔ خود سے بڑی باتیں کرتا تھا جو سمندر سی گہری ہوتی تھیں۔ وہ اپنے باپ پر گیا تھا۔۔ ہو بہو سنان کا عکس!

"جیسے تم کہو۔۔" سنان نے مختصر سا جواب دیا تھا مگر ایسا کہ وہ کھل کر مسکرا دیا تھا۔ وہ اسے یقین دلا چکا تھا، اس کا مان کبھی نہیں توڑا جائے گا۔

"آپ کب لوٹیں گے بابا؟"

"بہت جلد۔۔ اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔ باہمت اور مضبوط رہنا ہے۔ تم کمزور پڑو گے تو میں گر جاؤں گا۔۔ کیا سمجھے؟" نرمی سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے پوچھا گیا۔

"مجھے آپ کے لیے مضبوط رہنا ہے کمانڈر!" باآواز بلند کہا گیا۔ سنان ہلکا سا ہنس دیا۔ وہ محویت کے عالم میں اپنے باپ کو ہنستا دیکھتا رہا۔ اس سے انجان کہ وہ آخری بار اپنے باپ کو ہنستا دیکھ رہا تھا۔ اسے آنے والے وقت سے مطلب نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ وقت بہترین تھا۔ البتہ آنے والے وقت کو اس سے مطلب تھا۔ اپنے باپ کو الوداع کرتے ہوئے خیام کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔

☆☆☆

"آپ ازا کو لینے جا رہے ہیں بابا؟" اس نے نم آنکھوں سے معاویہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ "کیا آپ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ اس کی تلاش میں نکل کر آپ کھو نہیں جائیں گے؟ میں ازا کے بعد آپ کو نہیں کھونا چاہتا۔۔ بابا۔۔" نمکین پانی کا ایک ننھا سا قطرہ اس کے گال پر لڑھک گیا تھا۔ معاویہ نے پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔۔ میں ہماری ازا کو واپس لائے بغیر نہیں لوٹوں گا۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ وہ بس چار سال کی ہی تو تھی جب ہمیشہ کے لیے ان سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ زیاد کا ہاتھ چھڑوا کر بھاگی تھی اور پھر کبھی نہیں لوٹی۔ یہ سانحہ اندلس میں پیش آیا تھا۔ ازا کے کھو جانے کے بعد وہ مراکش آ گئے تھے۔ دو سال سب نے اسے ڈھونڈا تھا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ اور اب۔۔ کچھ دن پہلے معاویہ کو خبر ملی تھی کہ اسے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ بحری قزاقوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہ تینوں اب ایک نئی راہ پر نکل رہے تھے۔ بے کراں سمندر کی طرف جہاں رات کے اندھیروں میں جانیں لے لی جاتی تھیں۔ ان کے مقابل بحری قزاق تھے، جنگلی اور وحشی۔۔ یہ راہ کٹھن تھی مگر

وہ پیچھے ہٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں ہر حال میں۔۔ ازا کو بچانا تھا۔ جندل اللہ کی جانب سے اجازت مل گئی تھی۔ یہ مشن ان تینوں کو سونپا گیا تھا۔ دحیہ، سنان اور معاویہ۔۔۔ وہ کامیاب لوٹنے والے تھے انہیں یقین تھا!!

"جلد لوٹیے گا۔۔ مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔" معاویہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر آگے بڑھ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"ایک وعدہ کرو گے زیاد۔۔۔ اگر میں نہ لوٹوں تو اپنی بہن کا بہت سارا خیال رکھنا۔ وہ بہت چھوٹی ہے، اسے تمہاری ضرورت رہے گی۔۔ زندگی کے ہر ہر موڑ پر اور ہر قدم پر۔۔ تم اس کے محافظ بنو گے۔۔ بنو گے ناں؟"

"آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بابا۔۔ کیا بھائی بہنوں کے محافظ نہیں ہوتے؟" وہ مسکرا دیا۔

کچھ لمحات میں۔۔ زیاد نے اپنے باپ کو بہت دور جاتے دیکھا تھا۔ وہ اس کی پشت کو تکتا رہا تھا یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل گیا۔ وہ چند لمحے ساکت رہا پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان جو اب دھیرے دھیرے تاریک ہونے لگا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے وہ اونچی نیچی چٹانوں کو پار کرتا بہت تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ اسے لائٹ ہاؤس جانا تھا۔ اسے وہاں روشنیاں جلانی تھیں تاکہ اس طرف آنے والا کوئی بحری جہاز رات کی تاریکی میں بپھری ہوئی لہروں کی زد میں نہ آجائے۔ اسے لائٹ ہاؤس جانا تھا تاکہ۔۔ اگر کبھی اس کا باپ لوٹے تو اپنے گھر کی راہ دیکھ سکے۔۔

☆☆☆

وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی پر بیٹھا فرصت سے سامنے کرسی سے بندھے آدمی کو گھور رہا تھا۔ زخموں سے چور وہ شخص بری طرح نڈھال ہو چکا تھا۔ صبح کی روشنی چھن سے روشن دان سے اندر آرہی تھی۔ اس نے اپنی گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر اس شخص کو دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اسٹیون کے آدمی ہو، جسے اس نے اسکائے ٹو میں مارک کی جاسوسی کے لیے بھیجا ہے۔ اب یہ بتاؤ پہلے جو تم نے بکواس کی تھی کہ تم کچھ نہیں جانتے اس کا کیا کروں؟" اس کی خونخوار نگاہوں سے وہ شخص اندر تک کانپ گیا تھا۔

"مجھے لگا وہ مجھے۔۔ چھڑا لیں گے۔" وہ ہکلایا۔ ضرار سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"تم نے دیکھا تمہیں بچانے کوئی نہیں آیا۔ اب انسانوں کی طرح بولنا شروع کرو گے یا یہیں تمہارے ٹکڑے کر دوں!" اس نے اس شخص کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا تھا۔

"میں جو جانتا تھا سب تمہیں بتا دیا ہے۔ خدا کا واسطہ ہے میری جان بخش دو۔" وہ گڑگڑایا تھا۔ ضرار نے جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ عین اسی وقت اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر اس کی اسکرین کو دیکھا جہاں مائیک لکھا جگمگا رہا تھا۔

"بات کرو اور خبردار جو کوئی ہوشیاری کی تو!" کرسی سے پستول اٹھا کر اس شخص پر تانی پھر کال اٹھا کر اسپیکر آن کیا۔

"یس باس۔۔" اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ضرار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہو تم؟ ایڈریس بھیج رہا ہوں، اپنے آدمیوں کے ساتھ رات ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچو۔" مائیک نے حکم صادر کیا تھا۔ اس شخص نے ضرار کو دیکھا پھر اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

"سب ٹھیک ہے باس؟"

"زیادہ سوال مت کرو اور جو کہا ہے وہ کرو۔ اپنے ساتھ اسلحہ بھی لے لینا۔ میں وہیں تم سے ملوں گا!" کھٹاک سے فون بند ہو گیا۔ ضرار نے بے زاری سے فون ایک طرف پھینکا۔ پھر کان میں لگے آلے کی طرف متوجہ ہوا۔

"مائیک کو ٹریس کرو۔ یہ کچھ کرنے جا رہا ہے!" اس شخص کو گھوری سے نواز کر وہ پلٹ گیا۔

"مجھے چھوڑ دو۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔ مجھے جانے دو!!" وہ شخص دیوانہ وار چلایا تھا۔ وہ اس کی چیخوں کو نظر انداز کرتا وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

"سر یہاں ایک بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔" سعاد کی پریشان کن آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے اخبار چہرے کے آگے سے کھسکا کر سامنے صوفے پر منہ پھلا کر بیٹھے بدر کو دیکھا۔

"کیسی گڑبڑ؟" اس کے سوال پر بدر نے خفا خفا سی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اس کے کان کو۔ پھر سر جھٹک کر واپس فرش کو گھورنے میں مصروف ہو گیا۔

"مائک نے ٹھیک پانچ منٹ پہلے اس شخص کو کال کر کے اپنے ساتھ آدمی لانے کا کہا تھا ٹھیک؟ اور اب اس نے ایک اور آدمی کو کال کی ہے جسے اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ ایک مختلف ایڈریس پر بلایا ہے۔ وہ آدمی کرائے کے قاتل ہیں۔ تعداد میں سات سے آٹھ ہیں۔" خیام کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"اس نے کسی اور کو کال کی؟"

"نہیں۔۔ مائک اتنا عقلمند نہیں ہے کہ خود سے فیصلے کرے۔ یقیناً وہ اسٹیون سے رابطے میں ہے۔ اگر کل یا آج وہ اس سے ملنے جاتا تو جندل ہمیں خبر دے چکا ہوتا۔ اس نے کوئی کال بھی نہیں کی۔ اس کا مطلب جانتے ہیں؟"

"شاید وہ جان چکا ہے اس کی کالز ٹریس ہو رہی ہیں۔ اس نے کسی اور طرح سے اسٹیون سے رابطہ کیا ہے!" اس کی آواز دھیمی تھی۔ صوفے پر بیٹھا بدر اس کی باتیں سننے سے قاصر تھا۔

"بالکل۔۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ جانتا ہے اس بارے میں تو اس نے اسی نمبر سے کرائے کے قاتلوں سے کیوں رابطہ کیا؟"

”مطلب وہ اس بارے میں نہیں جانتا سعاد! اس معاملے میں اسٹیون نے احتیاط برتی ہے یقیناً۔ یہ دونوں باپ بیٹا کچھ کرنے جا رہے ہیں۔“

”مثلاً کیا؟“

”ازابیلا کے پیش کردہ ثبوت اگر مٹ جائیں تو کوئی عدالت اسٹیون کو مجرم ثابت نہیں کر سکتی۔ وہ یہی ثبوت مٹائیں گے۔ ازابیلا خطرے میں ہے“!

”تو ہم کیا کریں؟“

”رات آٹھ بجے۔۔۔ ہم انتظار کریں گے۔ معاملہ جب تک مکمل سامنے نہیں آتا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ رکا۔ بغور سامنے بیٹھے بدر کو دیکھا۔ ”مصعب۔۔ اپنی بیلا باجی کے پاس جاؤ۔ کوشش کرو آج رات تک تم ان کے ساتھ کسی سائے کی طرح رہو۔“ بدر نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

”آپ یہ کام زیاد کو بھی دے سکتے ہیں، بدر کیوں؟“

”وہ کیوں بھلا؟“

”کیونکہ میں کہہ رہا ہوں۔ تم یقیناً اپنی بیلا باجی کو خطرے میں نہیں دیکھ سکتے۔“ بدر نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر سر کو ذرا سی جنبش دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھ سے جان چھڑانے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ جا رہا ہوں۔۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اور ہاں۔۔ رات کو ضرور آؤں گا!!“ منہ بنا کر کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ خیام واپس سعاد کی طرف متوجہ ہوا۔

”اگر مائک واقعی کچھ کرنے جا رہا ہے تو ہمیں زیاد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ سعاد کو جواب دے کر اس نے دائیں کان میں لگا آلہ آن کیا۔ ”رات آٹھ بجے مائک وہاں اکیلا آئے گا، تمہیں یقین ہے؟“

"ہاں تبھی اس نے اپنے ساتھ آدمی لانے کا کہا ہے۔" ضرار نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔ پھر تم اس سے ملو گے۔"

"مل کر کیا کروں؟" اس نے کم فہمی سے پوچھا تھا۔

"مار دو!" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ سعاد، جندل، زیاد اور ضرار سب چونک گئے تھے۔ اچانک سے۔۔ سب کچھ بہت بدلنے جا رہا تھا۔ انہیں اس کی امید نہیں تھی۔

☆☆☆

اس کے لیے ہر ایک ایک منٹ بھاری ہو رہا تھا۔ مائک کی وہ دھمکی بار بار اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک طرف میڈیا کی جانب سے شور مچا ہوا تھا اور اب یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر وہ ثبوت نہیں مٹائے گا تو مائک وارلڈ کے جھوٹ کو منظر عام پر لے آئے گا۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو یہ اسکائے ٹو کے لیے بہت بڑا دھچکا ثابت ہونے جا رہا تھا۔ اسے اپنے ارد گرد کے تمام راستے مسدود ہوتے نظر آ رہے تھے۔

وہ مسلسل کمرے میں ٹہلنے سے تھک گیا تو بیڈ پر بیٹھ کر سر ہاتھوں میں گرا دیا۔ ابھی اسے چند پل ہی ہوئے تھے کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے نمبر دیکھا پھر ایئر پوڈز آن کیے۔

"کہو جیم۔" آواز بھاری تھی۔

"ہمیں اسٹیون سر مل چکے ہیں۔ ٹیم ایلفا عمارت کے باہر کھڑی ہے، آپ کے حکم کا انتظار ہے۔" وہ ایکدم چونک کر تیزی سے بیڈ سے اٹھا۔

"بنا وقت ضائع کیے فوراً اسے میرے پاس لاؤ فوراً! اور خبر دار وہ فرار نہ ہونے پائے۔" حکم صادر کر کے اس نے کال کاٹ دی۔ پھر موبائل اٹھا کر جلدی سے مائک کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پر کال اٹھا لی گئی۔

”تو کیا سوچا آپ نے؟ آٹھ بجنے میں بس آدھا گھنٹہ باقی ہے۔“

”تمہارے باپ نے سرنڈر کر دیا ہے۔“ اس نے پر سکون سے انداز میں کہا تھا۔ دوسری طرف مائک کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ ”اب تم کس کی جان بچانے کی خاطر مجھے دھمکی دو گے؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”بابا ایسا نہیں کر سکتے۔ انہیں امید تھی وہ کوئی حل نکال لیں گے۔ یقیناً آپ نے انہیں پولیس کے حوالے کیا ہے۔“ وہ چلایا تھا۔ مارک کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

”جیسے تم سمجھو!!“ اسے سلگا کر وہ کال کاٹنے ہی لگا تھا کہ مائک بول اٹھا۔ ”ازابیلا۔۔ اگر آپ نے بابا کو آزاد نہیں کیا تو میں اسے مار دوں گا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ جواباً مارک سر جھٹک کر ہنس دیا۔

”تم اب یہ۔۔۔“

”میں اسے پیغام بھیج چکا ہوں۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں یہاں پہنچ جائے گی جہاں اس کی جان لینے کے لیے میرے آدمی تیار کھڑے ہیں۔“ اس نے مارک کی بات کاٹتے ہوئے تفصیل بتائی تھی۔ مارک چند پل کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”فیصلہ آپ کا ہے۔ میں اس کی جان لینے میں بالکل جھجھک کا شکار نہیں ہونے والا۔ آپ جانتے ہیں میں اس کی جان لے سکتا ہوں“!

”تم خبیث انسان اس سے دور رہو!!“ وہ چلایا تھا۔

”بابا کو میرے حوالے کر دیں!“ اور پھر کھٹاک سے فون بند ہو گیا۔ وہ موبائل بیڈ پر پھینکتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف بھاگا تھا۔ اسے کسی بھی طرح ازابیلا کو وہاں جانے سے روکنا تھا۔

☆☆☆

”صورتحال ایکدم بدل چکی ہے خیام! مائک ازابیلا کو مارنے جارہا ہے۔ اسٹیون مارک کے پاس ہے اور ضرار پہلے ہی مائک سے ملنے کے لیے نکل چکا ہے۔ وہ اکیلا ہے!!“ اس نے پریشانی سے کہا تھا۔ خیام چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

”ازابیلا۔۔ وہ کہاں ہے؟“

”وہ اسی جگہ جارہی ہے جہاں مائک کے آدمی اس کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ بدر کو اس نے کسی کام سے اسٹیون کے گھر بھیجا ہے۔“ اس نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا تھا۔ نگاہیں اسکرین پر تھیں جہاں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ازابیلا اور ضرار اپنے مقامات کے قریب سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ خیام نے جلدی سے دائیں کان میں لگا آلہ آن کیا۔

”تمہیں محتاط رہنا ہوگا ضرار! مائک اکیلا نہیں ہے۔“

”میں دیکھ لوں گا تم فکر مت کرو۔“ اس نے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

”جندل تم ازابیلا کے پاس جاؤ۔“

”میں نہیں نکل سکتا۔ مارک اسٹیون کو گھر لے آیا ہے اور دروازے بند کر دیے گئے ہیں کیونکہ پریس والے کھڑے ہیں۔ ہر طرف کڑی نگرانی ہے۔“

”اور زیاد تم؟“

”مجھے ضرار تک پہنچنے میں کم از کم تیس منٹ لگیں گے۔“ وہ اب صحیح معنوں میں پریشان ہوا تھا۔

”مجھے پچیس منٹ لگیں گے۔“ سعاد کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اور پھر لمحوں میں فیصلہ ہوا تھا۔ ”جندل تم وہیں رہو اور جہاں تک ہوسکے مارک اور اسٹیون کے قریب رہو۔ زیاد تم تیس منٹ کے اندر اندر ضرار تک پہنچو۔“

"اور تم؟" دونوں نے بیک وقت پوچھا تھا۔

"میں ازابیلا کے پاس جاؤں گا!" اس نے رک کر گردن ترچھی کر کے کھڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ آٹھ بجنے میں ابھی وقت تھا مگر ہر طرف گہرا اندھیرا چھا چکا تھا۔ سیاہ بھاری بادل پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ سست رفتار میں بوندا باندی میں بھی شروع ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب موسلا دھار بارش ہونے والی تھی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو؟ چپ کر کے وہیں بیٹھے رہو۔ ہم دیکھ لیں گے۔" جندل نے اسے ڈپٹا تھا۔

"اگر وہاں کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو آپ کی جان بھی جا سکتی ہے۔ آپ کے زخم تازہ ہیں، صرف دو دن ہوئے ہیں ابھی۔" سعاد نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔

"میں کر لوں گا۔ تم لوگ اپنے کاموں پر دھیان دو۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ "سعاد تم پچیس منٹ کے اندر اندر ضرار تک پہنچو۔"

"لیکن زیاد۔۔ آپ نے اسے بھی وہاں بھیجا ہے۔۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔

"اس وقت ضرار خطرے میں ہے!!" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا پھر سعاد سے بھی رابطہ منقطع کر دیا۔ گردن ترچھی کر کے کھڑکی کے پار چھائی تاریکی کو دیکھا۔ آرام سے اپنے ہاتھوں میں لگی سوئیاں کھینچ کر ایک طرف پھینکیں پھر نگاہیں اپنی ٹانگ پر ٹکائیں۔ سختی سے لب بھینچے پھر دونوں ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکائیں۔ ٹھہر کر گہری سانس لی اور پاؤں زمین پر جما کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اچانک سے کمزوری کے باعث دماغ چکرانے لگا مگر پھر وہ خود کو سنبھال گیا۔ کچھ ہی لمحات میں وہ کپڑے بدل کر اپنی پستول لوڈ کر رہا تھا۔ یہ کام بھی کر چکا تو دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری میں کچھ دور ایک مریض کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ برابر میں سہارے کے لیے اسٹک رکھی

تھی۔ خیام نے لب دانتوں میں دبائے اس اسٹک کو دیکھا۔

بادل ایکدم زور سے گرجے۔ بجلی کی کڑک نے ماحول کو پراسرار بنایا۔ کرسی پر بیٹھے شخص نے اخبار کھسکا کر نگاہیں ترچھی کیں تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کی اسٹک غائب تھی۔۔۔ اسپتال میں شور مچ گیا تھا۔ کمرہ نمبر ایک سو ایک کا مریض غائب تھا۔ عملہ حرکت میں آچکا تھا، ہر طرف بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اس کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز پریشانی سے سر پکڑے کھڑے تھے۔ مریض کی حالت نازک تھی، اس کا یہاں سے جانا اس کی جان کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ اور دوسری طرف وہ اپنی جان کی پروا کیے بنا اسٹک کا سہارا لے کر چلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آیا۔ جلدی سے گاڑی کا لاک کھول کر گاڑی میں بیٹھا۔ اسٹک فرنٹ سیٹ پر رکھی اور پھر گاڑی آگے بڑھادی۔ آٹھ بجنے میں بس پندرہ منٹ تھے!

☆☆☆

وہ مائک کے دیے گئے ایڈریس پر پہنچ چکا تھا۔ یہ ویران اور سنسان سا علاقہ تھا جو رات کے اس پہر تیز طوفانی بارش میں پراسرار لگ رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ بجلی کے چمکنے سے ایک لمحے کو زمین سے اسمان تک ہر شے روشن ہو جاتی تھی مگر پھر وہی اندھیرا ہر سُو اپنے قدم جمالیتا۔ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اپنے اردگرد موجود بڑی عمارتوں کو دیکھا جو ابھی زیرِ تعمیر تھیں۔ سڑکیں ابھی کچی تھیں تبھی ہر طرف کیچڑ ہو چکا تھا۔ یقیناً یہاں کوئی نئی کالونی بننے جا رہی تھی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے وہیں کھڑا رہا۔ کسی ذی نفس کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے کچھ دیر بعد آگے بڑھنے کے ارادے سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بادل ایکدم زور سے گرجے۔ بجلی کی چمک میں اس نے سامنے سے چار لوگوں کو آتے دیکھا۔ ان کے آگے چلتے لڑکے کو وہ بنا کسی تردد کے پہچان گیا۔

"مائک پہنچ چکا ہے یہاں!" اس نے اطلاع دی تھی۔

"سنبھل کر ضرار!" زیاد کی آواز سے فکر جھلک رہی تھی۔ مائک قریب پہنچ گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ بجلی کے چمکنے سے اس کی مشکل آسان ہوئی۔ وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھتا ہلکا سا ہنس دیا۔

"تم یہاں بھی پہنچ جاؤ گے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ خیر۔۔ خوش آمدید!" اس نے سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ضرار مسکرا دیا۔

"میں تمہیں پیغام دینے آیا ہوں کہ تم کتنی ہی گھٹیا چالیں چلنا شروع کر دو لیکن حزب اللہ کو اس کے مقصد سے نہیں ہٹا سکتے۔" اس کے لہجے میں اعتماد محسوس کر کے وہ ایک لمحے کے لیے مرعوب ہوا مگر پھر نفرت ہر احساس پر غالب آ گئی۔ "میں شاید تم پر رحم کھا لیتا۔ مگر میرے باپ کے ساتھ جو تم نے کیا ہے اس کے بعد اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے حقارت سے کہا تھا۔

"جس کی اپنی حالت قابلِ رحم ہو اس سے کیا رحم مانگنا؟" وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔ مائک نے ضبط سے مٹھیاں بھینچیں پھر اپنے پیچھے کھڑے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی اس کے آگے آنے لگے اور وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ضرار فورا ہوشیار ہوا اور پھر اگلے ہی لمحے ان تینوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچنا چاہی۔ اس نے فوراً سے پہلے اس کا بازو پکڑ کر اس کے دائیں طرف سے نکل کر دوسرے آدمی کو زوردار لات ماری۔ تب تک باقی دونوں آدمی سنبھل چکے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کیا۔ اس نے فوراً سے اپنا بچاو کرتے ہوئے اس شخص کے عقب سے اس کی گردن کو جھٹکا دیا تھا۔ چیخ کی آواز سے ہڈی ٹوٹی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بارش تڑا تڑ برسنے لگی۔ وہ مکمل اندھیرے میں ڈوبے بارش میں بھیگ چکے تھے۔ بجلی ایک بار پھر چمکی تھی اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پھر سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اسی لمحے میں ضرار وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ دونوں

حیران کھڑے اپنے ارد گرد دیکھنے لگے۔

"ڈھونڈو اسے۔ بچ کر جانے نہ پائے وہ!!" مائک چلایا تھا۔ ایک آدمی دائیں طرف بڑھ گیا جبکہ دوسرا بائیں طرف۔ مائک وہیں کھڑا رہا۔ بارش سے بچنے کی خاطر وہ ایک عمارت کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ اچانک بجلی چمکی اور اسے کوئی ہیولہ دکھائی دیا۔ وہ فوراً گلی کے نکڑ کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے وہ اس تک پہنچتا ہیولہ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے رک کر گہری سانس لی۔ اسی لمحے ضرار نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچی تھی۔ اس نے پوری ہمت جمع کر کے اپنی گردن اس کی گرفت سے چھڑواتے ہوئے اس کے منہ پر مکا رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے وہ اس پر وار کرتا ضرار نے جھک کر اس کے گھٹنے پر لات مار کر اسے گرایا اور اگلے ہی لمحے زوردار مکا اس کے چہرے پر رسید کیا۔ شڑاپ کی آواز سنائی دی اور وہ شخص پانی میں گرا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس پر بے شمار مکوں کی برسات کر دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھونے کے قریب ہو گیا۔ اسی وقت بادل زور سے گرجے۔ بجلی کے چمکنے سے اس نے اپنی طرف بڑھتے اس شخص کو دیکھا پھر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اندھیرے میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جب ضرار نے پیچھے سے آ کر اس کی گردن دبوچ کر اس کا سر دیوار میں دے مارا۔ خون دھار کی صورت میں اس کے سر سے بہنے لگا۔ اس نے بار ہا یہ عمل دہرایا۔ یہاں تک کہ دیوار پر خون لکیر کی صورت میں بہتا گلی میں جمع پانی میں شامل ہونے لگا۔ اس شخص کو اپنے کئی دانت ٹوٹ کر گوشت میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے۔ لال خون تھوک کے ساتھ حلق سے اترنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر اس شخص کا سر دیوار میں مارا اور پھر اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کے چہرے پر مکا رسید کیا۔ وہ شخص لڑکھڑا کر گرا اور

کچھ ہی پل میں وہ شخص بھی ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس نے رک کر گہری سانس لی پھر اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیکھا جو بارش کے پانی میں دھل رہے تھے۔ مٹی اور پانی سے بننے والی کیچڑ میں اب خون کا بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ کان تک لے جا کر کان میں لگے آلے کو آن کرنا چاہا۔ مگر آلہ گر چکا تھا۔ اس نے اپنے قدم اسی راستے کی طرف بڑھا دیے جہاں مائک اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

کچھ ہی لمحات میں وہ مائک کے سامنے موجود تھا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھولے گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا جب اس ن پیچھے سے اسے دبوچ کر اس کے چہرے پر مکا رسید کیا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سے منظر اب واضع تھا۔

مائک نے ناک سے بہتے خون کو انگلیوں کے پوروں سے صاف کرتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو مکمل بھیگا ہوا تھا۔ سیاہ لانگ کوٹ سے پانی بہہ رہا تھا۔ سیاہ بال ماتھے سے چپکے ہوئے تھے۔ ہاتھ خون آلود تھے۔ اور آنکھوں میں عجب ہی تاثر تھا۔ وہاں نفرت تھی شدید نفرت!

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

"سعاد یوسف زئی۔۔ نام تو سنا ہو گا؟ جس وقت ان پر ہاتھ اٹھایا تھا تم نے اسی وقت اپنی موت کو دعوت دی تھی۔" اس کے لہجے میں بے انتہا سختی تھی۔ مائک نے آنکھیں سکیڑے حیرت سے اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔ "تو وہ تم تھے جس نے اسے بچایا تھا۔ وہ لڑکی واقعی کمال ہے۔ خوبصورت۔!" وہ سر جھٹک کر ہنستے ہوئے خباثت سے کہہ رہا تھا۔ ضرار تیزی سے آگے بڑھا تھا اور اگلے ہی پل وہ اس کے منہ ہر پے در پے کئی مکے برسا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ منہ سے خون ابل ابل کر نکل رہا تھا۔ ایک اور مکا اس کے چہرے پر رسید کیا گیا تھا۔ اسے اپنے جبڑے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ درد کے مارے کراہتے ہوئے وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا تھا۔ ضرار نے آگے بڑھ کر زوردار لات اس کے چہرے پر ماری تھی۔ وہ پیچھے جا گرا تھا۔ نگاہوں کے سامنے تاریک آسمان تھا اور گرجتے

بادل۔۔ کڑکتی بجلی۔۔ اس وقت اسے اس آسمان پر اپنی موت دکھائی دی تھی۔ بارش کا پانی اس کے منہ میں جا رہا تھا۔ وہ بے سدھ سا چند پل وہیں پڑا رہا پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اسی وقت ضرار نے ایک اور لات اسے رسید کی۔ وہ سڑک کی دوسری طرف جا گرا۔

"رکو۔۔۔ تم اپنے دشمن سے۔۔۔ ایسے لڑتے ہو؟ میں نہتّا ہوں!!" اس نے سڑک پر خون تھوک کر اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ وہی آخری وار کیا تھا جو اس کی جان بچا سکتا تھا۔ ضرار نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی پھر گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھا، ڈیش بورڈ پر رکھی پستول اٹھائی اور مائک کے پاس آکر اس کے قدموں میں پھینکی۔

"اٹھاؤ اسے!!" مائک نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر پستول اٹھائی۔

"تم لوگ بہت غیرت مند ہوتے ہو، اسی غیرت کے مارے مرتے ہو۔"

"غیرت کے مارے مرنا غیرت کو مار دینے سے بہتر ہے!!" اس نے اپنی پستول نکالتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر تڑاتڑ برستے آسمان نے وہ منظر دیکھا تھا جب بارش میں بھیگتے وہ دونوں فاصلے پر کھڑے ایک دوسرے پر پستولیں تانے ہوئے تھے۔ وہ ایک خونی کھیل کھیلنے جا رہے تھے۔۔۔ اسے Duel کے لیے للکارا گیا تھا!!

☆☆☆

خیام کی طرف سے حکم ملتے ہی وہ فوراً گھر سے نکلی تھی۔ بہت برق رفتاری سے گاڑی چلا کر وہ ٹھیک پچیس منٹ بعد وہاں پہنچ گئی تھی جہاں ضرار مائک سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بریک پر پاؤں رکھا تھا۔ جھٹکے سے گاڑی رکی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں شیشے کے پار وہ منظر واضع ہوا جہاں وہ دونوں ایک دوسرے پر پستولیں تانے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا

رہ گیا۔ آسمان سے گرتا پانی اس پر برسنے لگا۔ وہ تیزی سے بھاگی تھی۔

”ضرار نہیں!!!“ وہ چلائی تھی۔ بیک وقت ٹریگر دبائے گئے تھے۔ دونوں پستولوں سے گولیاں نکلی تھیں۔ ایک گولی نے مائک کے کندھے کو چھوا تھا دوسری ضرار کے بازو پر لگی تھی۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ اسے اپنے اردگرد سب تھمتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ”ضرار خدارا یہ مت کرو۔“ اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ آنکھوں میں نمی چمکی۔ ایک اور بار بیک وقت دونوں جانب سے ٹریگر دبائے گئے۔ ایک گولی نے ضرار کے سینے کو چیرا تھا اور دوسری مائک کے پیٹ میں گھسی تھی۔ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ بارش کا پانی رفتہ رفتہ گہرے سرخ رنگ میں بدل رہا تھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو پھسل کر گال پر گرا تھا۔ نگاہیں پانی کی طرح بہتے خون سے ہوتیں اس سفید ہوتے چہرے پر ٹکی تھیں۔ وہ تکلیف میں تھا، بے حد تکلیف میں۔ ان دونوں نے ایک بار پھر ٹیرگر دبانا چاہے تھے کہ اسی لمحے ضرار کے وجود کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ گولی اوپر سے آئی تھی۔ غالباً کوئی سنائپر وہاں بیٹھا تھا۔ اسے اپنے اردگرد دھواں اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ پانچویں یا چھٹی پسلی کے نیچے درد کی لہر اٹھی تھی۔

”آگے مت بڑھنا!“ سعاد نے فوراً سے اپنی پستول نکال کر مائک پر تانی تھی۔ پیٹ پر ہاتھ جمائے خون روکنے کی کوشش کرتا مائک مسکرایا۔ ”اگر ایک اور گولی چلائی گئی تو مائک بار بار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا!!“ پوری قوت سے چلاتے ہوئے اسے اپنی آواز میں صاف لغزش محسوس ہوئی تھی۔ مائک سر جھٹک کر طنزیہ ہنسی ہنسا۔ اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ مائک نے اپنا دایاں بازو سیدھا کیا۔ پستول کا نشانہ ضرار کا قلب تھا۔۔ وہی جو بمشکل اپنے قدموں کو جمائے کھڑا تھا۔ خون دھیرے دھیرے پورے جسم سے نچڑ رہا تھا۔ نگاہیں سعاد پر ٹکی تھیں جن میں وہ اسے لوٹ جانے کا پیغام دے رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں۔۔۔ مت کرو۔۔“ اس نے سرگوشی کی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ اپنی پوری کوشش

کے باوجود ٹریگر پر زور نہیں ڈال پارہی تھی۔ آنکھوں میں تکلیف کا تاثر ابھر رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا جو بے جان ہونے لگے تھے۔ مائک نے نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا جو پوری کوشش کے باوجود ٹریگر نہیں دبا پارہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ نگاہوں کا رخ موڑا۔ ٹریگر پر زور دیا گیا۔ گولی اس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکلی۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ صرف چند پل۔۔ اور پھر اس نے اس پورے اونچے مرد کو زمین بوس ہوتے دیکھا تھا۔ اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں۔ اس کے جسم سے نچڑتا خون پانی میں گھل رہا تھا۔

مائک کا رخ اب اس کی طرف ہوا تھا۔ "تم کسی کی جان نہیں لے سکتیں سعاد یوسف زئی!!" اس نے مسکراتے ہوئے اپنا بازو سیدھا کیا تھا۔ اس کی پستول کے نشانے پر اب وہ تھی۔۔ وہ جس کی نگاہیں اس وجود پر ٹکی تھیں جو دھیرے دھیرے اپنے حواس کھو رہا تھا۔ اس کی بند ہوتی آنکھوں میں اس کے لیے بہت سے تاثرات تھے۔ وہ معذرت کر رہا تھا وہ اب اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔۔ وہ بے بس تھا۔۔ وہ۔۔۔ ضرار۔۔ جو ہمیشہ اس کے لیے اس سے ایک قدم آگے ہوتا تھا آج بہت پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔۔ اسے تڑاتڑ برستا آسمان اپنے سر پر گرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

"میں نے ہمیشہ اس خاندان کی عزت بچانے کی کوشش کی۔ آپ نے ہمیشہ اسے برباد کرنا چاہا اور پھر آپ کامیاب ٹھہرے۔" وہ گلاس وال پر گرتی تیز طوفانی بارش کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ بیڈ پر بیٹھے اسٹیون نے نفرت سے اس کی پشت کو گھورا تھا۔ "کیوں؟ کون اپنی عزت کو داؤ پر لگاتا ہے؟ آپ یہ کیوں کرنا چاہتے تھے؟" بادل اچانک زور سے گرجے تھے۔

"جسے تم عزت کہہ رہے ہو وہ محض سراب ہے مارک! میں نے یہ سب اپنی عزت داؤ پر لگانے کے لیے نہیں پر تمہیں اس گہری کھائی میں گرنے سے روکنے کے لیے کیا تھا۔ وہ کھائی بہت گہری ہے، وہاں صرف اندھیرا ہے۔ اب بھی وقت ہے، اس سب میں مت پڑو!" وہ اچانک کسی والد کی طرح اسے نصیحت کرنے لگا تھا۔ مارک سر جھٹک کر ہنس دیا۔ "میں برا ہوں، قاتل ہوں جانتا ہوں۔ مگر تم سب سے بدترین ہو!" اس کے لب ان الفاظ پر مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ اس نے ایک نگاہ شیشے پر گرتی بوندوں پر ڈالی پھر پلٹ کر اسٹیون کو دیکھا۔

"برائی برائی ہوتی ہے بابا! آپ خود میری انگلی پکڑ کر مجھے اس دلدل میں لائے تھے۔ اب جب میں پوری دھنس چکا ہوں تو آپ مجھے نکلنے کی نصیحت کر رہے ہیں؟"

"یہ غلط ہے۔ ہاں میں تمہیں خود اس دلدل میں لایا تھا مگر میں نے کچھ حدود مقرر کی تھیں اور تم یکے بعد دیگرے ہر حد پار کرتے گئے۔" اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔

"آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں یہ سب سراب ہے۔ یعنی دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے مگر بس آنکھوں کا دھوکہ ہے۔ تو جو چیز مجھے خوبصورت اور دلکش لگ رہی ہے اسے حاصل کرنے کی چاہت کو کیونکر مارا جائے؟" وہ رکا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ کوششیں ترک کر دیں۔ میں کبھی واپس نہیں آؤں گا! اور آپ۔۔ آپ اپنے انجام تک پہنچیں گے۔"

"تم ہر رشتے کی تمیز بھول گئے ہو!" وہ دبا دبا سا چلایا تھا۔

"جب ماں کو زہر دے رہا تھا اس وقت آپ نے میرا ہاتھ نہیں روکا تھا۔ اب جب یہی ہاتھ آپ کی گردن پر ہیں تو واویلا کیوں مچا رہے ہیں؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اسٹیون نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ "میں نے ایک انسان نہیں سانپ سے بھی زہریلے جانور کی پرورش کی ہے۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔ وہ اس کی بات پر کھکھلا کر ہنس

دیا۔ ”مجھے زہریلا کرنے والے بھی آپ ہی ہیں!“ وہ اسے آئینہ دکھا چکا تھا۔ تلخ حقیقت۔۔ اس کے ہر غلط قدم پر اگر اسے سراہنے کے بجائے وہ اسے صحیح و غلط کی تمیز سکھاتا تو آج یہ وقت نہ آتا۔ مارک اسے خاموش دیکھ کر سائیڈ ٹیبل کی طرف آیا۔ جگ اٹھا کر پانی گلاس میں الٹنے لگا۔ دھار کی صورت میں گلاس میں گرتا پانی۔۔ وہ محویت سے اسے تک رہا تھا۔ گلاس بھر گیا۔ اس نے جگ ایک طرف رکھا پھر دراز کھولی۔ اس میں سے ایک شیشی نکالی۔ اس کا ڈھکن کھولا اور بنا وقت ضائع کیے شیشی میں موجود وہ سفید مائع پانی میں ڈالا۔ شیشی ایک طرف رکھ کر اس نے ہلکا سا چمچ گھمایا پھر گلاس اٹھا کر اسٹیون کی طرف آیا۔

”آپ جانتے ہیں آپ کے لیے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ آپ اپنی ہر شے داؤ پر لگا چکے ہیں۔ زندگی کے ان آخری لمحات میں آپ کو اپنے بیٹوں کی بھلائی کے لیے سوچنا چاہیے۔ عدالتیں بار بار اگروپ کی عزت اچھالنے کے سوا کچھ نہیں کریں گی!“ وہ گلاس سے جھلکتے پانی پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔ اسٹیون نے اس کی بات کا چھپا مفہوم سمجھتے ہوئے ہونٹ بھینچے تھے۔ ”دیر مت کریں۔ میرے دروازے پر میڈیا والوں کا ہجوم کھڑا ہے۔ صرف وہ چند آنسو جو اپ کی موت پر بہائے جائیں گے، تمام معاملے کو سنبھال لیں گے۔“ وہ اپنے اس جوان بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔ پھر دھیرے سے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھوں کی لغزش کو دیکھ کو مارک نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اور پھر خود ہی وہ گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی کے صرف چند گھونٹ اپنے اندر انڈیل کر اس نے منہ پھیر لیا۔ مارک نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا پھر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ زہر نے فوراً اپنا اثر دکھایا تھا۔ وہ اپنی گردن پر سخت قسم کا دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ تکلیف کے آثار چہرے سے نمایاں تھے۔ پورا جسم گویا آگ کے انگاروں پر دہکنے لگا تھا۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ مارک نے آخری نگاہ اس پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔ جس وقت اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اسی وقت اس کے عقب میں اسٹیون

پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہو گیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ بنا کوئی تاثر دیے وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی دیوار کی اوٹ میں ہو کر کھڑا جندل فوراً کمرے میں آیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس کی نگاہ فرش پر گرے اسٹیون پر ٹکی۔ وہ تیزی سے پنجوں کے بل نیچے بیٹھا۔ اس کے منہ سے خون ابل ابل کر نکل رہا تھا۔ آنکھیں خطرناک حد تک سرخ پڑ رہی تھیں۔ اور پھر اسے خون کی قے آئی۔ لال گرم انسانی خون کے چند قطرے جندل کے چہرے پر پڑے۔ اسٹیون کی انکھیں بند ہو گئیں۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ چند پل حیرت وہ بے یقینی سے اس لاش کو تکتا رہا پھر تیزی سے وہاں سے اٹھا۔ سائیڈ ٹیبل پر آ کر جلدی سے وہ شیشی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالی اور بیڈ کراؤن کے ساتھ بلکل چھپا کر رکھے اس آلے کو اٹھایا جو ہر منظر اور ہر گفتگو رکارڈ کر چکا تھا۔ اس نے جلدی سے آلے کو موبائل کے ساتھ کنیکٹ کیا پھر موبائل کی اسکرین روشن کی۔ کانوں میں لگے ایئر پوڈز نے مارک کی آواز اس تک پہنچائی جو کہہ رہا تھا، "جب ماں کو زہر دے رہا تھا اس وقت آپ نے میرا ہاتھ نہیں روکا تھا۔ اب جب یہی ہاتھ آپ کی گردن پر ہیں تو واویلا کیوں مچا رہے ہیں؟"

وہ لب دانتوں میں دبائے ایک ایک منظر دیکھ رہا تھا۔ چند پل ہی گزرے تھے کہ اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کوئی بالکل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے موبائل بند کیا۔ نگاہیں سامنے ٹکائیں۔ وہ اپنے پیچھے کھڑے اس شخص کی نگاہیں خود پر محسوس کر سکتا تھا۔ اسے جلدی سے اپنا لائحہ عمل سوچنا تھا۔ صرف چند مزید لمحات اور پھر وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ کوئی بھاری چیز اس کے عقب میں کھڑے شخص کے سر پر لگی۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ اس شخص کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔ وہ اسی وقت وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جندل نے حیرت سے سامنے دیکھا جہاں بدر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لوہے کی بھاری سلاخ تھی۔ آنکھوں میں بے یقینی اور خوف تھا۔ وہ یک ٹک اپنے قدموں میں گری لاش کو دیکھ رہا تھا۔

وہ ازابیلا کے کام سے یہاں آیا تھا جب اس نے جندل کو چپکے سے اسٹیون کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ اس کا پیچھا کرنے پر وہ کمرے تک آیا تھا اور پھر اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسٹیون کو جان دیتے دیکھا۔ اور ٹھیک اس وقت جب اس نے اس گارڈ کو جندل کے پیچھے آتے دیکھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا اور اسی وقت اس نے وہ بھاری لوہے کی سلاخ اٹھالی جو نجانے وہاں کیوں رکھی تھی اور پوری قوت سے گارڈ کے سر پر دے ماری۔

اور اب۔۔۔ وہ شخص خون میں لت پت اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور سر ایک طرف کو ڈھلک چکا تھا۔ جندل اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جندل کو اس کی آنکھیں بند کرتے دیکھا۔ لوہے کی وہ سلاخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قدموں میں گری۔ اسے اپنے سر پر بھاری پہاڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ انجانے میں ایک شخص کا۔۔ قتل کر چکا تھا۔ وہ بدر۔۔ ایک قاتل بن چکا تھا۔ انسانی جان کا قاتل۔۔۔ بدر کا پہلا قتل جو۔۔ پوری انسانیت کا قتل تھا!!

☆☆☆

اس نے کئی جگہوں پر سگنلز توڑے تھے۔ اسے تیس منٹ کے اندر اندر ضرار کے پاس پہنچنا تھا۔ مسلسل تڑاتڑ برستی طوفانی بارش میں تیزی آرہی تھی۔ ونڈ اسکرین پر وائپر مسلسل چل رہے تھے۔ اس نے ایک موڑ کاٹا تھا اور پھر کچھ لمحات میں وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس نے پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ جھٹکے سے گاڑی روک کر وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اپنی پستول نکالی پھر ذرا سا آگے بڑھا۔ بادل اس کے اٹھتے قدم دیکھ کر پورے زور سے گرج اٹھے۔ بجلی کچھ یوں چمکی کہ ایک پل کو خوف سا محسوس ہوا۔ اسے وہاں کچھ فاصلے پر دو لوگ دکھائی دیے۔ اس کے اٹھتے قدم وہیں تھم گئے۔ اس نے آنکھیں سکیڑے انہیں پہچاننے کی کوشش کی۔ وہاں ایک لڑکا تھا جو کسی لڑکی پر پستول تانے ہوا تھا۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں بھی پستول تھی۔۔ ہاتھ جو پہلوؤں میں

گرے ہوئے تھے۔ مکمل بارش میں بھیگے وہ دونوں اسے ایک لمحے کے لیے اجنبی لگے مگر اگلے ہی لمحے وہ بری طرح چونکا۔

نگاہیں اس لڑکے کے عقب میں گرے اس وجود پر ٹکیں جو بارش کے پانی کے ساتھ ساتھ اپنے ہی خون میں بھیگ چکا تھا۔ سرخ انسانی خون پانی کے ساتھ ملتا پانی کا رنگ بدل چکا تھا۔ وہ اسے پہچان گیا۔ وہ ضرار تھا۔ بری طرح گھائل ضرار ولید! اس کی نگاہیں تیزی سے ان دونوں پر ٹکیں۔ وہ لڑکا مائک تھا اور وہ لڑکی۔۔

اسپتال میں خیام کے بیڈ کے پاس رکھی میز پر رکھا وہ گول شیشوں والا نازک سا چشمہ۔ کینٹین میں اس کے برابر میں کھڑی وہ لڑکی جس کے ناک پر گول چشمہ ٹکا ہوا تھا۔ اور پھر اس کا رک جانا۔۔ نرم سرسبز گھاس پر گری وہ کافی۔۔ سب سے بڑھ کر اس کی وہ غیر معمولی دھڑکنیں۔۔ وہ لمحوں میں اس لڑکی کو بھی پہچان گیا جو کبھی اس کے لیے اجنبی تھی ہی نہیں۔۔

"سعاد۔۔" وہ زیرلب بڑبڑایا تھا۔ اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔ نگاہیں مائک کی پستول پر پڑیں اور پھر وہ تیزی سے اس کی طرف بھاگا تھا۔ عین اسی لمحے فائر کی آواز گونجی تھی۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ پستول سے نکلی گولی اس کی طرف بڑھی تھی۔ اسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ گولی اس اپنی پسلیوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خون کو راستہ ملا اور وہ اس کے کوٹ کو داغدار کرتا سڑک پر موجود بارش کے پانی پر گرنے لگا۔ اس نے ساکت نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ہاتھ لمحے میں خون میں رنگ گئے۔ "سعاد!!" کوئی چلایا تھا۔ آواز مانوس سی تھی۔ اس نے گردن ترچھی کر کے دور کھڑے اس شخص کو دیکھا تھا۔ بارش میں بھیگتا زیاد تاشفین!!

"ہر بار قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ ہر بار تم مجھے نہیں بچا سکتے۔"

"میں تمہیں ملنے والے ہر زخم کی تکلیف جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔۔ خدارا یہ ظلم مت کرنا۔۔"

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ خون تیزی سے اس کے جسم سے نچڑ کر اردگرد پھیل رہا تھا۔ تیز طوفانی بارش میں اسے اپنا آپ پگلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کا سر کیچڑ میں لتھڑے پتھر سے ٹکرایا۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے جو آخری منظر دیکھا تھا وہ اپنے اوپر پوری قوت سے برستے آسمان کا تھا اور ہوش و حواس کھونے سے پہلے جو آخری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی وہ زیاد تاشفین کی تھی۔ "سعاد!!!" اس کی چیخ اس سنسان جگہ پر بہت دور تک سنی گئی تھی۔ بارش کا شور بھی اس کی آواز دبا نہیں پایا تھا۔

میرے چارہ گر کو نوید ہو، صف دشمناں کو خبر کرو،

وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے،

رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا۔

اس کے جسم سے نکلتا خون قطرہ قطرہ بارش کے پانی میں گر رہا تھا۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔

☆☆☆

اس کا سبز رنگ کا چھاتہ اس پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ وہ اس تیز طوفانی بارش سے بچتی گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے اس جگہ آئی تھی جہاں کا اسے ایڈریس بھیجا گیا تھا۔ وہ بدر کے ساتھ بیٹھی تھی جب اسے کسی اجنبی نمبر سے پیغام موصول ہوا تھا۔ کوئی اس سے اسٹیون کے سلسلے میں ملنا چاہتا تھا اور اس ملاقات کو مخفی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ بنا وقت ضائع کیے ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ چکی تھی۔ تڑاتڑ برستی بارش بھی اسے نہیں روک پائی تھی۔ اس نے ٹھہر کر سر اونچا کر کے اس بلند عمارت کو دیکھا۔ بارش میں بھیگتی اونچی عمارت۔۔۔

اور جب آپ دنیا دیکھنے نکلتے ہیں

تو آپ کی راہ میں کسی بلند عمارت کی چھٹی منزل پر۔۔

کسی کھڑکی کے پاس چھپ کر بیٹھا سنائپر

آپ کا نشانہ لے رہا ہوتا ہے۔۔

وہ چند پل یونہی بنا پلک جھپکے اس عمارت کو دیکھتی رہی۔ جو شخص اس سے ملنا چاہتا تھا اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔ اس نے سر جھکایا پھر نظریں سامنے ٹکائیں۔ اچانک کوئی پوری قوت سے اس سے ٹکرایا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ اس سے ٹکرانے والا شخص جلدی سے اپنی پی کیپ کو چہرے کی طرف سرکاتا اس سے معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ وہ کم فہمی سے بھنویں ملائے چپ چاپ اسے برستی بارش میں دور جاتا دیکھتی رہی۔

یونہی اچانک آپ سے ٹکرانے والا وہ شخص۔۔

جو پی کیپ نیچے سرکاتا اپنا چہرہ چھپا چکا ہے۔۔

آپ کے دشمن کا جاسوس ہوتا ہے۔۔

اس نے گہری سانس لی پھر کچھ سوچ کر قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ ابھی کچھ قدم ہی چلی تھی کہ اسے فٹ پاتھ پر کوئی فقیر بیٹھا نظر آیا۔ وہ اس چھوٹی سی دکان کے بند دروازے سے لگ کر بیٹھا تھا۔ اس نے چھاتے کو کچھ یوں دروازے سے ٹکا کر رکھا ہوا تھا کہ وہ اس پر سایہ کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ فقیر کسی قدر بارش سے محفوظ تھا مگر پھر بھی اتنی بارش میں اسے اس فقیر کے یوں یہاں بیٹھنے پر تعجب ہوا تھا۔

وہ فقیر جو سڑک کے کنارے بیٹھا ہے۔۔

وہ اپنے کان میں لگے آلے سے سنگل ملنے کا منتظر ہے۔۔

اس کی نگاہیں آپ پر ٹکی ہوتی ہیں۔۔

وہ آگے بڑھی اور اس فقیر کے پیالے میں چند نوٹ ڈالے۔ پھر نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور واپس سڑک کی طرف آگئی۔ اسی لمحے میں ایک عورت کیری کاٹ کو گھسیٹتی اس کے برابر سے گزری۔ اس کا رخ سامنے اس عمارت کی طرف تھا۔ وہ اس عورت کی پشت پر نگاہیں ٹکائے دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی تھی۔

اور وہ عورت جو کیری کاٹ گھسیٹتی آپ کے برابر چل رہی ہے۔۔

وہ آپ پر نگاہیں ٹکائے اپنا فون آن کر رہی ہے۔۔

لیکن یہ سب آپ نہیں دیکھ رہے۔۔

آپ دیکھ رہے ہیں راہیں کشادہ ہیں۔۔

منزل آسان ہے اور دنیا خوبصورت ہے۔۔

بادل اچانک زور سے گرجے۔ پانی میں پاؤں پڑتے ہی شڑاپ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اسے ایک لمحے کے لیے یہ سب بہت خوبصورت محسوس ہوا۔ شڑاپ کی یہ آواز بہت بھلی معلوم ہوئی۔ رات کی تاریکی، تیز طوفانی بارش، بھیگی سڑکیں، خاموشی اور کسی شیر کی طرح گرجتے بادل۔۔۔ یہ سب جہاں پُراسرار سا معلوم ہوتا تھا وہیں بہت خوبصورت بھی لگ رہا تھا۔ اس کے لب خود بخود خفیف سی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

اس خوبصورت دنیا کے خوبصورت خیالوں میں مگن۔۔

جب آپ منزل کی طرف قدم بڑھا رہے ہوتے ہیں۔۔

اس نے چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ اچانک کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سڑک سے ہٹاتے ہوئے جھٹکے سے دیوار سے لگایا تھا۔ خوف سے اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی تھی۔ یہ سب ایک سیکنڈ میں ہوا تھا۔

تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر راستے سے ہٹاتا وہ شخص۔۔

جو آپ کو دیوار سے لگا کر آپ کے سامنے کسی دیوار کی مانند کھڑا ہے۔۔

اس نے سانس روکے سامنے دیکھا تھا۔ اس کے آگے دیوار کی مانند کھڑا وہ شخص خیام حنفی تھا۔ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ مکمل بارش میں بھیگا، ماتھے پر پی کیپ ٹکائے جو اس کے چہرے کو بارش سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت لبوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے اگلے ہی لمحے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروایا تھا۔

وہ شخص آپ کا دشمن ہے کیونکہ دنیا آپ کی دوست ہے۔۔

سنائپر بے چینی سے پہلو بدل رہا ہے۔۔

وہ آپ کا نشانہ نہیں لے پا رہا آگے کوئی ہے۔۔

وہ جاسوس پریشانی سے ارد گرد دیکھ رہا ہے۔۔

وہ اپنا ہدف کھو چکا ہے۔۔

سڑک کنارے بیٹھے اس فقیر کے پیالے کو ٹھوکر لگتی ہے۔۔

وہ بڑبڑاتے ہوئے سڑک پر بکھرے سکے چن رہا ہے۔۔

وہ عورت فون پر کسی کو اطلاع دے رہی ہے۔۔

وہ آپ کو دیکھنے سے قاصر ہے اور وجہ۔۔

وہ شخص ہے جو آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا ہے۔۔

اس نے سانس روکے اسے دیکھا تھا۔ کل ہی تو اس نے اسے اسپتال میں دیکھا تھا۔ وہ زخمی تھا، بری طرح گھائل ہوا

تھا۔ اور اب اس وقت وہ یہاں کیوں تھا؟ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ دیوار پر ٹکایا ہوا تھا۔ شاید اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کے لیے سہارا لے رہا تھا۔

وہ شخص آئینہ ساز ہے۔۔

وہ آئینہ ساز جس کے بنائے آئینوں میں آپ دنیا دیکھ سکتے ہیں۔۔

وہ شخص آپ کا دوست ہے، دنیا آپ کی دشمن ہے۔۔

ہاں جب ساری دنیا آپ کی دشمن بن جاتی ہے تو آپ کو راہ سے ہٹانے والا وہ شخص۔۔

وہ شخص آپ کا محافظ ہوتا ہے۔۔

اس نے دھیرے سے اپنا دایاں ہاتھ ذرا سا آگے سرکایا تھا۔ اس کا چھاتہ جو صرف اس پر سایہ کیے ہوئے تھا اب اس کی زد میں خیام بھی آیا تھا۔ ٹھہر کر اسے دیکھتا خیام حنفی! اس کی نگاہوں میں نرمی تھی اور احتیاط بھی۔ اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر اسے لگ رہا تھا جیسے اس شخص کا سارا خون جمنے لگا ہو۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ بارش تڑاتڑ برستی رہی۔ بادلوں کے گرجنے میں اضافہ ہوا۔ بجلی کے چمکنے سے ایک لمحے کے لیے ہر چیز روشن ہو گئی، اس کا چہرہ واضح ہوا پھر دوبارہ سب کو تاریکی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

وہ شخص بہترین ہوتا ہے کیونکہ۔۔

وہ آئینہ ساز ہے!!

☆☆☆

•باب: سوم

•مرجُ البَحرین

•وہ اک گھڑ سوار ہے جو

کالی گھٹاؤں کو چیرتا ہوا نمودار ہوا ہے۔۔

گرد و غبار کو اڑاتا تیزی سے منزل کی طرف بڑھتا۔۔

اس کا گھوڑا بری طرح ہانپ رہا ہے۔۔

اس کی نگاہیں کسی عقاب کی مانند۔۔

اپنی منزل کی گھات میں ہیں۔۔

اس پر ایک جنون طاری ہے۔۔

اسے جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔۔

وہ ایک سپاہی ہے جسے سالارِ لشکر کے پاس پہنچنا ہے۔

اس کے ہاتھ میں ایک رقعہ ہے۔۔

کاغذ کا معمولی ٹکڑا جو اتنا اہم ہے کہ۔۔

اس پر سالارِ لشکر کی زندگی منحصر ہے۔۔

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز۔۔۔

گرد و غبار کے اٹھتے ہوئے بادل۔۔

وہ شہر کے دروازے پر پہنچ چکا۔۔

تیزی سے گھوڑے کی لگام کھینچی گئی۔۔

دروازے پر ایک ہجوم جمع ہے۔۔

دھڑکنیں سست پڑتی ہیں۔۔

ہاتھ میں تھامے کاغذ کے ٹکڑے پر گرفت مضبوط ہوتی ہے۔۔

اس نے دیکھا کہ سالارِ لشکر کو۔۔

لوگ کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔۔

بچے بلک بلک کر رو رہے ہیں۔۔

مائیں بین کر رہی ہیں اور جوان غمزدہ ہیں۔۔

وہ سپاہی۔۔۔اسے دیر ہو چکی تھی۔۔

فرمان کی تعمیل ہو چکی تھی۔۔

سالارِ لشکر کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔۔

وہ ہار چکا تھا، اُس کے لوگ ہار چکے تھے۔۔

کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔۔

ساکت نگاہوں سے جو آخری منظر اس نے دیکھا۔۔

وہ سالار لشکر کے جنازے کا تھا۔۔

جو آخری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔۔

وہ نعرہ تکبیر کی تھی۔۔۔

وہ بے جان ہو کر اپنے گھوڑے سے گر چکا تھا۔۔

وہ ایک سپاہی۔۔ جس کا سالار ہار چکا تھا۔۔۔

اس کا سالار۔۔۔

محمد بن قاسم۔۔۔وہ جا چکا تھا۔۔!

•فاتح سندھ محمد بن قاسم!

وہ سانس روکے کئی پل ان الفاظ کو دیکھتا رہا۔ یہ نام کتنا خوبصورت اور بارعب تھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا سندھ کے دروازے پر صف بستہ فوج کے ولولے کو جس کے سولہ سالہ جوان سالار نے نعرہ تکبیر بلند کیا تھا۔ وہ تخیل میں اس فوج کو سندھ کے دروازے توڑتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ سندھ۔۔۔ بابُ الاسلام۔۔ اور وہ۔۔ فاتح سندھ۔۔ محمد بن قاسم!

اس نے دھیرے سے ان بوسیدہ کاغذات کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھا۔ کاغذوں سے آتی یہ خوشبو اس کے دل کی فضا کو معطر کر دیا کرتی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس اندر اتار کر ہاتھ میں تھامے کاغذات کو لکڑی کی میز پر رکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نگاہ اس چھوٹے سے کمرے پر ڈالی جو بحری جہاز کے نچلے حصے میں تھا۔ چھوٹا سا کمرہ۔۔ جس میں کئی قدیم صندوق رکھے تھے۔ ایک لکڑی کی میز۔۔ کچھ پرانے ہتھیار اور چند نقشے۔۔ اس کا بیشتر وقت یہی گزرتا تھا۔ وہ ان نقشوں کو حفظ کر چکا تھا۔ ان صندوقوں کو کھول کر اپنے باپ کی لکھی ان تحریروں کو زبانی یاد کر چکا تھا، جو اس کے آغا جان نے چھپائی ہوئی تھیں۔

وہ طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈال کر اپنی جیکٹ میں ہاتھ اڑستا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آیا تو

سامنے ہی جہاز کے عرشے پر آغا جان کو کھڑا پایا جو دور بین لگا کر سمندر کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ لہروں کا شور اس کے دل کو تسکین بخش رہا تھا۔ اس نے محبت بھری نگاہ حد نگاہ تک پھیلے سمندر پر ڈالی جس کے قلب میں تیرتا ان کا بحری جہاز۔۔ اس آزاد سمندر کے آگے بہت چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ واپس آغا جان کی طرف کیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے برابر میں کھڑا ہوا۔

"کہتے ہیں اگر محمد بن قاسم کو مزید مہلت ملتی تو وہ پوری دنیا فتح کر ڈالتے۔" وہ فاتح سندھ سے مرعوب لگ رہا تھا۔ آغا جان نے دور بین پرے ہٹا کر کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ "سوچ رہا ہوں کہ اس "پوری دنیا" میں سمندر کی دنیا بھی شامل ہے؟ بپھرا ہوا وحشی سمندر۔۔۔ جو اگلے ہی لمحے میں پر سکون اور آزاد معلوم ہوتا ہے۔۔ کیا وہ سمندر پر بھی حکمرانی کرتے؟ کیا وہ امیرُ البحر بن سکتے؟!" اس کی پر سوچ نگاہیں سمندر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ شام کے آخری پہر میں سمندر کا پانی ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔ نقشے کے مطابق وہ اس وقت مغرب کے کسی ٹھنڈے علاقے سے گزر رہے تھے۔

"اپنے باپ جیسی باتیں کر کے میرا دل مت جلایا کرو جندل یوسف زئی!" وہ خفا ہوئے تھے۔ وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ "اس نے کہا تھا جندل آپ کا بیٹا ہے مگر۔۔۔"

"جندل دحیہ کا بیٹا ہے۔ ویسا ہی بد مزاج اور نافرمان!" اس نے اپنے آغا جان کی بات فوراً سے اچک لی تھی۔ وہ تڑخ کر رہ گئے۔ دونوں باپ بیٹا ایک جیسے تھے۔ بد مزاج، نالائق اور نافرمان!

"میری بات سنو۔۔ آئندہ مجھے کتابوں کے نزدیک نظر نہ آؤ تم!" انہوں نے اپنا لہجہ سخت کیا تھا۔

"آہ کتابیں۔۔ یہی تو بتاتی ہیں کہ سمندر کی دنیا کتنی پُر کشش ہے اور خشکی میں کیسے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر کہہ رہا تھا۔ انہیں مزید تپا رہا تھا۔

"تم لڑنا چاہتے ہو؟!" وہ پوچھ بیٹھے تھے۔

"استغفر اللہ آغا جان۔۔ میں ہرگز ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا!!" اس نے معصومیت سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

وہ چند پل اسے خفگی سے دیکھتے رہے پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ وہ اب اوپر جا رہے تھے۔۔ انہیں آسمان پر بکھرنے والے تاروں کو گننا تھا۔ جندل چند لمحے وہیں کھڑا سمندر کو تکتا رہا پھر ان کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

چند لمحات میں اندھیرا پوری طرح آسمان پر قابض ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ موتیوں کی طرح بکھرے تاروں کی چمک اس پر ہمیشہ کی طرح سحر قائم کر رہی تھی۔ لہروں کا شور اس خاموشی میں انہیں اس ساز کی طرح محسوس ہو رہا تھا جو آہستہ سے دل کے تار چھیڑ دیتا ہے۔ وہ دونوں وہیں ساکت کھڑے تاروں کو دیکھ رہے تھے جب اچانک انہوں نے بہت تیز چمکتا ہوا تارا دیکھا۔ غیر معمولی اور بہت زیادہ چمک رکھنے والا۔۔

"کیا وہ ثریا ہے؟" وہ ماتھے پر بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔

"کیا وہ تارا ہے؟" ان کے لہجے میں شبہ تھا جو درست ثابت ہوا۔ بحری جہاز جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا وہ تارا قریب آ رہا تھا۔ اور جیسے جیسے فاصلہ گَھٹ رہا تھا ویسے ہی وہ تارا بڑا ہوتا جا رہا تھا اور پھر انہوں نے دیکھا کہ وہ۔۔ کوئی تارا نہیں تھا۔ وہ روشنی کا دائرہ تھا۔ تیز روشنی جو ایک لائٹ ہاؤس کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ دونوں دنگ رہ گئے تھے۔ تاریک اندھیر رات میں سمندر پر چمکتا روشنی کا یہ دائرہ مسحور کر دینے والا تھا۔

"میں لائٹ ہاؤس سے آتی روشنی کا یہ منظر پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اور آپ؟" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بڑبڑایا تھا۔

"میں نے کئی بار یہ خوبصورت منظر دیکھا ہے مگر۔۔۔ ہر بار یہ پہلے سے زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے!" لفظ لفظ سے

محبت جھلک رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا تھا۔ یقیناً۔۔ اگر وہاں لائٹ ہاؤس کے مینار پر۔۔ کوئی موجود ہوا تو اس کے لہراتے ہاتھ کو دیکھ کر یقیناً مسکرایا ہو گا۔۔ یقیناً!

☆☆☆

وہ بنا پلک جھپکے سانس روکے اپنے قدموں میں بہتے خون کو تک رہا تھا۔ اس کا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ پر جم چکا تھا۔ وہ بدر۔۔ ایک انسانی جان کا قاتل کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ قاتل کیسے بن سکتا تھا؟ پوری انسانیت کا قاتل اور بدر؟ اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ جندل نے نرمی سے اس کے ساکت وجود کو دیکھا پھر اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔

"یہیں رہنا۔ جب تک میں نہ آؤں۔۔ بالکل خاموش!" اسے تاکید کرتا وہ آگے بڑھا۔ اس لاش کو گھسیٹتے ہوئے واشروم کی طرف لے گیا۔ واشروم کا دروازہ کھولا اور اس شخص کو اندر لے جا کر دروزے کے پیچھے بٹھا دیا۔ دروازہ بند کر کے اسے لاک کیا۔ پھر فرش کو دیکھا۔ وہاں اسٹیون اور اس شخص کا خون مل چکا تھا۔ زیادہ غور کیے بنا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ایک کا نہیں دو انسانوں کا خون ہے۔ اس نے اپنی جیکٹ سے پستول نکالی پھر کھڑکی کی طرف آیا۔ احتیاط سے کھڑکی کھولی۔ یہ کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اگر وہ یہاں سے نکلتے تو دروازے پر کھڑے گارڈز اور پریس والوں سے بچ سکتے تھے۔ اس نے تیزی سے حالات کا جائزہ لیا پھر بدر کی طرف آیا۔

"جلدی چلو اس سے پہلے کوئی آجائے۔" اس کے پریشانی سے کہنے پر بھی بدر یونہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا۔ "بدر۔۔۔ ایک لمحے کے لیے یہ بھول جاؤ۔ خیام اکیلا ہے یار وہاں، ہمیں جلدی نکلنا ہو گا۔" اس نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ جندل کا اندازہ ٹھیک رہا۔ وہ خیام کی پروا کرتا تھا، اس کے لیے وہ کچھ لمحات کے لیے واقعی یہ سب بھلا سکتا تھا۔

اور پھر کچھ لمحات میں۔۔ جندل اور بدر گھر سے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

☆☆☆

وہ ٹھہر کر اسے دیکھ رہا تھا جو بے یقینی سے آنکھیں پھیلائے اس پر نگاہیں ٹکائے کھڑی تھی۔ تڑاتڑ برستی بارش اسے چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جسم میں تکلیف سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر وہ ہر چیز کو نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ اسے اس وقت اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کی حفاظت کو یقینی بنانا تھا جو اس کی وجہ سے مشکل میں تھی۔

"گلی کے نکڑ پر کھڑی گاڑی دیکھ رہی ہیں مادام؟" آواز بہت دھیمی تھی۔ ازابیلا نے سر ذرا سا گھما کر بارش میں بھیگتی گاڑی کو دیکھا پھر نگاہیں واپس اس کے چہرے پر ٹکائیں۔ "کتنے وقت میں وہاں پہنچ سکتی ہیں؟" اس کے سوال پر اس نے فاصلے کو دیکھا پھر خیام کو۔ "دو منٹ؟"

"مجھ پر یقین ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے پوچھ رہا تھا۔ ازابیلا نے ایک نگاہ اس کے عقب میں برستی بارش پر ڈالی پھر اسے دیکھا جو کسی محافظ کی طرح اس کے آگے کھڑا تھا۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے اس انداز پر وہ ہلکا سا مسکرایا تھا مگر اگلے ہی لمحے اپنی مسکراہٹ چھپا گیا۔ "ایک منٹ پچیس سیکنڈ! بنا کسی سوال کے اس گاڑی میں بیٹھیں اور فوراً اپنے گھر جائیں۔ اپنا موبائل آف کر دیں"!

"مجھے آپ پر یقین۔۔۔"

"جانتا ہوں، لیکن مجھے آپ پر۔۔۔ یقین ہے۔۔" اس نے توڑ توڑ کر کہا تھا۔ وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔ اس شخص کے اور کتنے روپ تھے؟ کہیں اس سے بڑھ کر بے رحم کوئی نہیں تھا اور کبھی وہ اتنا نرم دل بن جاتا تھا

کہ۔۔۔سینے میں دھڑکتا دل دھڑکنا بھول جائے۔بادلوں کی گرج پر وہ چونکی۔تیزی سے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹائیں پھر سر کو ذرا سی جنبش دی۔اس نے دیوار پر رکھا اپنا ہاتھ ہٹایا اور ایک قدم پیچھے ہٹا۔ازابیلا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔دو قدم اور پھر وہ بارش میں بھیگنے لگا۔تیسرا قدم اور پھر ازابیلا فوراً دائیں طرف بھاگی تھی۔خیام اپنی پستولیں نکالتا تیزی سے پلٹا۔مائک کے آدمی تیزی سے سامنے آئے۔اس نے بنا رکے بیک وقت دونوں پستولوں سے فائرنگ کرنا شروع کر دی۔مائک کے آدمی جلدی سے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں دوڑے۔وہ فائرنگ کرتا رہا یہاں تک کہ وہ گاڑی تک پہنچ گئی۔اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی خیام دیوار کی اوٹ میں ہوا تھا۔ازابیلا نے بنا رکے گاڑی آگے بڑھا دی۔مائک کے آدمی پیچھے سے فائرنگ کرنے لگے تھے کہ خیام سامنے آگیا۔انہوں نے اپنی پستولوں کا رخ اس کی طرف کر دیا۔اس سے پہلے کہ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوتی اس نے اپنی پستولوں کے ٹریگر دبا دیے۔کئی گولیاں ہوا کی رفتار سے دیواروں میں چھید کرتی رہیں۔دو آدمی ڈھیر ہو چکے تھے۔باقی پناہ لے چکے تھے۔اس نے ٹریگر دبایا، تو معلوم ہوا کہ گولیاں ختم ہو چکی ہیں۔مائک کے آدمیوں نے موقع دیکھ کر جوابی فائرنگ کرنا شروع کر دی۔وہ جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہوا۔پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے پستولوں کو جھٹکا دیا۔میگیزین باہر نکل کر فرش پر گریں۔اس نے فوراً سے دوسری میگیزینیں نکال کر پستولوں میں ڈالیں۔اور وہیں بیٹھے بیٹھے دیوار کی اوٹ سے سر نکال کر فائر کیے۔دو مزید آدمی سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔بارش کے پانی کا رنگ بدلنے لگا۔وہ دوبارہ ایک طرف ہو گیا۔اس نے دیوار پر سر ٹکا کر گہری سانس لی۔وہ اٹھنے لگا تھا کہ عین اسی وقت کسی نے اس کی پشت سے اپنی پشت ملائی تھی۔

"انہیں میں دیکھ لوں گا۔تم ضرار کی طرف پہنچو!" آواز اجنبی سی تھی۔اس نے مڑ کر اس شخص کو دیکھنا چاہا مگر وہ شخص اسے موقع دیے بنا آس کے آگے آیا اور دیوار کی اوٹ سے ذرا سا نکل کر فائرنگ کرنے لگا۔

"آپ کون ہیں؟"

"سعاد سے پوچھ لینا۔" تیزی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ بادلوں کی گرج کے ساتھ ساتھ فائرنگ کا شور بھی بلند سے بلند تر ہوتا ہو گیا۔ اس نے رک کر خون میں بدلتے پانی کو دیکھا پھر تیزی سے پلٹ گیا۔ پوری ہمت جمع کر کے اپنی گاڑی کی طرف بھاگتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ۔۔۔ وہ لنگڑائے بنا بھاگ رہا تھا!!

☆☆☆

اسے تڑاتڑ برستا آسمان اپنے سر پر گرتا محسوس ہوا تھا۔ وہ کسی پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ جَم گیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ برستی بارش اور گرجتے بادل سب پسِ منظر میں چلا گیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تو بس وہ لڑکی تھی جو اسے بہت عزیز تھی۔ وہ وجود جو خون میں لت پت تھا، بارش میں بھیگ رہا تھا۔۔۔ وہ اس کی حفاظت کے لیے ہر حد تک جا سکتا تھا مگر اب۔۔ اب وقت گزر چکا تھا۔ وہ نہیں روک پایا۔ وہ اس گولی کو نہیں روک پایا جس نے اس کے وجود کو چیرا تھا۔ وہ ناکام رہا۔۔ اس نے کہا تھا اس کی دعا ہے وہ دوبارہ کبھی نہ ملیں۔۔۔ وہ ملے اور اس کی دعا قبول ہو گئی۔۔ وہ چلی گئی۔۔ یہ ملنا بھی کیسا ملنا تھا؟ وہ اس لڑکی کو بتانا چاہتا تھا کہ۔۔۔ جدائی کے وہ لمحات اتنے تکلیف دہ نہیں تھے جتنے یہ۔۔ بارش میں بھیگتے ہوئے اس نے شاید ہی کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس کیا تھا۔

اس کے بے جان وجود میں حرکت ہوئی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا۔ دوسرا اور پھر تیسرا۔ "سعاد"!! اس نے خود کو چلاتے سنا تھا۔ پلکوں سے ایک آنسو جھول کر گال پر لڑھک گیا۔ اگلے لمحات میں اس نے خود کو تڑاتڑ برستی بارش میں دوڑتے ہوئے پایا تھا۔ مائک جو گھٹنوں پر ہاتھ رکھے گہری سانسیں لے رہا تھا چونک کر سیدھا ہوا۔ کوئی تیزی سے ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنی پستول سیدھی کی۔ اس کی رفتار بڑھی۔ وہ صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ بس چند قدم۔۔ وہ اس فاصلے کو بھی مٹانا چاہتا تھا کہ اچانک کسی نے اپنے دونوں بازوؤں سے پیچھے سے اس کے

وجود کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ "سعاد!!!" وہ اپنے وجود کو اس گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا تھا۔ بادل ایکدم زور سے گرجے تھے۔ بجلی کی چمک سے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتے خیام کا چہرہ واضع ہوا تھا۔ وہ مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ "زیاد ہوش کرو یار کچھ۔۔ وہاں سنائپر ہے۔" وہ اس کی بات نہیں سن پا رہا تھا۔ وہ کچھ بھی سننے سے قاصر تھا۔ اسے بس سعاد کے پاس جانا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہا تھا۔

"زیاد ہوش میں آؤ!" خیام دھاڑا۔ زیاد نے جھٹکے سے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کروا کر پلٹ کر اس پر وار کیا۔ اس کی کہنی خیام کے پیٹ میں لگی۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کے کچے زخم ادھڑ گئے تھے۔ خون راستہ ملتے ہی تیزی سے بہنے لگا۔ زیاد نے ہراساں نگاہوں سے اس کی شرٹ کو دیکھا جو لال رنگ کی ہونے لگی تھی۔ خیام نے پیٹ پر ہاتھ رکھے قہر بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ "اگر ایک اور قدم آگے بڑھایا تو ہم سب مارے جائیں گے۔" وہ اپنی پستول لوڈ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس بارش میں۔۔ اندھیری رات میں۔۔ وہ باآسانی اس کے چہرے پر آئے تکلیف کے وہ تاثرات دیکھ سکتا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا تھا۔ اپنی پستول نکالتے ہوئے وہ اس کے برابر میں کھڑا ہوا۔ اور پھر دونوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا ٹریگر دبا دیے۔

مائک نے ڈر کر تیزی سے ایک طرف ہو جانا چاہا مگر اسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آئی۔ وہ دو ہیولے مسلسل فائرنگ کرتے تیزی سے اسکی طرف بڑھ رہے تھے۔ سنائپر ان کے حرکت کرنے کی وجہ سے نشانہ نہیں لے پا رہا تھا۔ "مجھے کوور کرو فوراً!" وہ دھاڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے چار سے پانچ آدمی اس کے گرد گھیرا ڈالے صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں گاڑیوں کے قریب آچکے تھے، ان کا گاڑیوں میں فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ مائک کی آنکھیں کچھ تکلیف سے اور کچھ خوف سے باہر ابلنے کو ہو رہی تھیں۔ "کچھ بھی کرو اور انہیں روکو!" وہ پریشانی سے چلایا۔

"وہ جوابی فائرنگ کرنے کا موقع نہیں دے رہے۔ ہمیں بھاگنا ہو گا!!" ایک آدمی چلایا۔ اگلے ہی لمحات میں وہ پانچ آدمی مائیک کے گرد گھیرا ڈالے بھاگ رہے تھے۔ زیاد انہیں بھاگتا دیکھ کر رک گیا البتہ خیام نے فائرنگ جاری رکھی۔ وہ مائیک کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا بالکل بھی نہیں!!

"وہ جا چکے ہیں۔۔" زیاد کے کہنے پر وہ ٹھہر گیا۔ اسے لگا وقت بھی تھم گیا ہے۔ پستول ہاتھ سے پھسل گئی۔۔ ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں گرے۔ وہ گہری سانس لیتا تھک کر گاڑی سے ٹیک لگاتا نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ زیاد آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی دائیں ٹانگ سیدھی کر کے سر گاڑی کے دروازے سے ٹکا گیا۔ اس کے زخم سے نکلتا خون قطرہ قطرہ بارش کے پانی میں گھل رہا تھا۔ ٹپ ٹپ کی وہ آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ بادل مسلسل برسنے سے تھک چکے تھے۔ بارش میں کمی آرہی تھی۔ اسے اپنے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پیٹ پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں تکلیف کا تاثر لیے وہ کچھ فاصلے پر موجود ضرار کے وجود کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ہی خون میں ڈوبا بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں۔ تکلیف کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

کچھ لمحات بعد خاموشی میں ٹائروں کے چرچرانے کی آوز سنائی دی۔ گاڑی کے رکتے ہی جندل دروازہ کھول کر تیزی سے باہر آیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ہر طرف پھیلے لال خون کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئیں۔ پھر اگلے ہی لمحے میں وہ تیزی سے ضرار کی طرف بھاگا تھا۔ گاڑی سے نکلتا بدر پانی میں ملتے خون کی اس چھوٹی سی ندی کو دیکھ کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ صرف چند مزید لمحات اور پھر ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں سنائی دیں۔ کانچ سی مقدس خاموشی کرچیوں میں بدل گئی۔ وہ دونوں گاڑیاں رکیں۔ اسٹریچر باہر لائے گئے۔ حزب اللہ کے ایک جوان کے ساتھ مل کر زیاد نے ضرار کو اسٹریچر پر لٹایا۔ اسٹیریچر گاڑی میں لے جایا گیا۔ دروازے بند ہوئے۔ اس نے نگاہیں ترچھی کر کے جندل کو دیکھا جو سعاد کو اسٹریچر پر لٹا رہا تھا۔ وہ سانس روکے کھڑا رہا۔ دروازے بند ہوئے۔

دونوں گاڑیاں دور جانے لگیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ ساکت و منجمد۔۔۔

وہ جو دھیرے دھیرے اپنے خون کو قطروں کی صورت میں بہتا محسوس کرتا آنکھیں موندے بیٹھا تھا، کسی احساس کے تحت آنکھیں کھولیں۔ نگاہیں سامنے پنجوں کے بل بیٹھے بدر پر ٹکیں۔ وہ اس تاریکی میں بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ چہرے پر کرب اور دکھ کے تاثرات تھے۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ اس کے لبوں پر دوڑتی اس ہلکی سی مسکراہٹ کو دیکھ کر بدر کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر گال پر لڑھکا تھا۔ وہ لب بھینچتے ہوئے آگے ہوا تھا۔ خیام اپنا بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلاتے ہوئے اس کا سہارا لے کر کھڑا ہوا تھا۔ دایاں ہاتھ جو خون آلود تھا، پیٹ پر رکھے بدر کا سہارا لے کر لنگڑا کر چلتا خیام حنفی۔۔۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرے میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بجھ چکی تھیں۔ رات کی تاریکی اور پراسراریت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سڑک کے عین اوپر کھڑے بادل میں ٹھہرا پانی کا وہ آخری قطرہ۔۔۔ دھیرے سے لڑھکتا ہوا ٹپ کی آواز سے سڑک پر جمع پانی میں گرا۔ اور پھر ہر سو سناٹا چھا گیا۔

☆☆☆

سنسان اور تاریک عمارت جو اچانک ہی روشنیوں سے جگمگا اٹھی تھی۔ روشن راہداری میں بہت سے بوٹوں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک پوری ٹیم تھی، حزب اللہ کے سینیئر کمانڈرز کی ٹیم جو حال ہی میں یہاں پہنچے تھے۔ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے ساتھ ساتھ احکامات جاری کیے جا رہے تھے۔

”عمارت کے دروازے بند کر دو اور دروازوں پر محافظ کھڑے کر دو۔ جیمر آن کرو۔ باہر کا کوئی شخص اندر نہ آئے اور اندر کا کوئی شخص باہر نہ جائے۔ کوئی فون کال، کوئی پیغام نہیں بھیجا جائے گا۔ باہر سے ہر طرح کا رابطہ منقطع کر دیا جائے۔ محافظ چوکنے کھڑے رہیں۔ کوئی بھی اسلحے کو خود سے جدا نہ کرے۔ خیام حنفی، مصعب الزر قاوی اور سعاد یوسف زئی کو فوراً تفتیشی کمروں میں بٹھاؤ۔ ڈاکٹرز کو رپورٹس پیش کرنے کا کہو۔ ہر شخص کو کام پر لگ جانا چاہیے۔۔ فوراً!“ سب سے آگے چلتے شخص نے احکام صادر کیے تھے اور ہر شخص حرکت میں آگیا تھا۔ دروازے بند ہو گئے۔ محافظ دروازوں پر تعینات کر دیے گئے۔ جیمر آن ہو گئے۔ باہر سے ہر طرح کا رابطہ منقطع ہو گیا۔۔ اور کچھ ہی دیر بعد۔۔ کمانڈر کے حکم کے مطابق خیام کو تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا تھا۔۔

”سعاد یوسف زئی PTSD (Post traumatic stress disorder) کا شکار ہے۔ جس رات عالیان کو شہید کیا گیا تھا، اس رات اس نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ مسلسل بیس منٹ تک! اس کے بعد عالیان کے جسم میں پیوست گولیاں بھی اس نے دیکھی تھیں۔ وہ ہمیشہ قتل سے ڈرتی رہی ہے۔ وہ پولیس فوبیا کا شکار رہی ہے۔ جندل کے مطابق وہ کئی سالوں تک راتوں کو ڈر کر اٹھ جایا کرتی تھی۔۔۔ وہ سالوں تک گہرے صدمے کا شکار رہی ہے۔ اور کل رات جب وہ ضرار کی جان بچانے کے لیے مائک کو نہیں مار پائی تو رپورٹس کے مطابق اس کی وجہ یہ سائیکالوجیکل ڈس آرڈر ہے یعنی PTSD ۔ علاج کے بغیر وہ کبھی کسی کی جان نہیں لے پائے گی بھلے اس کی وجہ سے ضرار جیسے لوگوں کی جانیں خطرے میں ہوں۔ وہ چاہ کر بھی یہ کام نہیں کر پائے گی۔ وہ اپنے ایک خوف سے لڑی ہے مگر اس کا دوسرا خوف اسے کبھی کسی کی جان نہیں لینے دے گا۔“ انہوں نے اپنی بات ختم کر کے خیام کو دیکھا جو بنا پلک جھپکے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی سعاد۔۔۔ وہ بہت بہادر تھی مگر اس کی زندگی میں کچھ ایسی چیزیں وقوع پذیر ہو گئی تھیں جنہیں نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔ وہ چاہ کر بھی ان سب سے نہیں لڑ سکتی تھی۔۔ وہ بہادر تھی

لیکن اس کے اندر آج بھی وہی بچی موجود تھی جو۔۔اس رات فائرنگ کی آواز سن کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے، اپنی سسکیاں دباتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"اس کے بارے میں جانتے تھے تم؟" اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"سعاد کے ساتھ کام کرنے کی وجہ؟"

"وہ حزب اللہ میں نہیں آنا چاہتی تھی اور میں اپنی محنت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جو میں نے اس پر کی تھی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"اس نے تمہاری آفر کیوں قبول کی؟"

"میں نے وعدہ کیا تھا کہ اسے اس کے بھائی سے ملواؤں گا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"تو کیا تم اسے ملوانے والے تھے؟" اس نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔ کمانڈر سلیمان۔۔۔اصولوں کا پابند اور حزب اللہ کو سہارا دے کر کھڑا کرنے والا شخص۔۔۔وہ ان کے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند تھا۔ اس نے رک گہری سانس لی پھر نفی میں سر ہلا دیا۔"میرے لیے الزرقاوی سر کی طرف سے جاری کیے گئے احکامات معنی رکھتے ہیں!" سلیمان نے دھیرے سے کرسی سے ٹیک لگائی۔ چہرے پر سختی تھی۔

"اسے استعمال کر رہے ہو؟"

"نہیں۔۔وہ واحد ہے جسے میں کبھی اپنے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔۔"

"اگر اسے واپس بھیج دیا جائے؟"

"میں اس کا مقروض ہوں۔۔۔یہ قرض اتارنے دیں۔" اس نے نرمی سے کہا تھا۔ سلیمان نے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھا۔"کیا وہ تمہارے لیے اتنی اہم ہے کہ تم نے اس کی خاطر تنظیم سے جھوٹ بولا؟"!

”کمانڈر۔۔۔ دحیہ یوسف زئی کی بیٹی میرے لیے اہم کیونکر نہیں ہو گی؟“ اس نے چند الفاظ میں سلیمان کے ہر سوال کا جواب دے دیا تھا۔ وہ خاموش رہے۔ خیام نے گردن ترچھی کر کے دیوار کے ساتھ لگے کالے شیشے کو دیکھا۔ ”آپ کو اس خون پر بھروسہ کرنا چاہیے جو خدا کی راہ میں بہہ چکا ہے۔ دحیہ یوسف زئی کی بیٹی کبھی حزب اللہ کی مخالفت میں کھڑی نہیں ہو گی۔۔۔ الزرقاوی سر!“ اس نے مکمل اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔ اسے یقین تھا شیشے کے پار الزرقاوی موجود تھے۔ وہ اسے نہ صرف دیکھ رہے تھے پر سن بھی رہے تھے۔ اس کی تمام حرکات و سکنات، ہر تاثر اور ہر لفظ ان کی نظر میں تھا۔

”تمہیں حزب اللہ سے کیے تمام وعدے یاد ہیں خیام؟“

”میں اپنے جسم میں موجود خون کا آخری قطرہ تک اس راہ میں بہا دوں گا!“ اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری تھی۔ سلیمان نے ٹھہر کر اس ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والے لڑکے کو دیکھا تھا۔ پھر سر کو ذرا سی جنبش دیتے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”تمہیں ایک اور موقع دیا جا رہا ہے۔ یاد رہے۔۔۔ تنظیم اپنے معمولی سے معمولی سپاہی کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں کرتی۔ کیونکہ تنظیم کے لیے اس کا کوئی سپاہی معمولی نہیں ہوتا۔۔۔ ہر سپاہی اس کے لیے خون کے ایک قطرے کی مانند ہے، اور تنظیم۔۔۔ اس خون کے بے جا ضائع جانے کا رسک نہیں لے سکتی!!“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہا گیا تھا۔ اس نے دھیرے سے سر کو جنبش دی تھی۔ اسے اس کا ہر وعدہ یاد تھا۔۔ وہ اپنے مقصد سے آگاہ تھا۔۔ اور جہاں اس کے کمزور پڑنے کا خدشہ ظاہر ہوا تھا وہیں اس نے اپنی پشت پر ان عظیم شخصیات کو کھڑا پایا تھا جنھوں نے اس کے ہتھیار کو صاف کر کے اسے تھمایا تھا اور اسے ایک نئے جذبے و ولولے کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترنے کی تاکید کی تھی۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولی تھیں۔ نگاہیں سیدھا کمرے کی سفید چھت پر ٹکیں۔ وہ چند پل پلک جھپکتی اسے دیکھتی رہی۔ اسے اپنا ذہن خالی خالی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہاں تھی؟ کیوں اور کیسے جیسے سوال دھیرے دھیرے دماغ میں اٹھ رہے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کو ہلکا سا دبایا تو نگاہ ہاتھ پر لگے برنولا پر ٹکی جس سے جڑی ڈرپ کے ذریعے سفید رنگ کا وہ مائع دھیرے دھیرے اس کے جسم میں اتر رہا تھا۔ اسی لمحے میں اسے سب یاد آیا۔ اس کے سامنے پورے قد کے ساتھ گرتا ضرار۔۔۔ اس کی پسلیوں کو چیرتی وہ گولی۔۔ اردگرد اٹھتا دھواں اور وہ تکلیف۔۔ پھر کسی کا چلانا اور اس کے سر پر تڑاتڑ برستا آسمان۔۔ اس نے تیزی سے جھرجھری لی تھی۔ چند پل یونہی لیٹے رہنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ پیٹ میں درد اٹھا مگر وہ نظر انداز کر گئی۔ نگاہ میز پر رکھے حجاب اور ماسک پر ٹکی۔ کل رات اس نے یہ والا حجاب نہیں پہن رکھا تھا۔ یقیناً یہ کوئی رکھ کر گیا تھا۔۔ جیسے کہ کون؟ جندل؟ اس نے لب دانتوں میں دبائے پھر ماسک اور حجاب دونوں اٹھا لیے۔ اگر کوئی یہ یہاں رکھ کر گیا تھا تو مطلب صاف تھا۔۔ اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

اگلے ہی لمحات میں وہ حجاب اوڑھے ماسک لگائے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ ہاتھ پر برنولا ہنوز لگا ہوا تھا۔ وہ اس عمارت سے انجان تھی۔ بس لمبی سی راہداری تھی جس کے دائیں طرف ایک موڑ تھا۔ اونچی سرمئی رنگ کی سخت دیواریں تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔ راہداری کے اختتام پر وہ دائیں طرف مڑ گئی۔ یہاں سے ایک نیا راستہ شروع ہوتا تھا۔ بائیں طرف ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا پھر آگے بڑھ گئی۔ کمرے میں اندر آکر اس نے گھوم کر کمرے کا جائزہ لیا۔ سارا کمرہ خالی تھا۔ بس بیچ میں ایک میز تھی جس کے گرد دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دائیں جانب دیوار کی جگہ پر کالے شیشے

لگے تھے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ تفتیشی کمرہ تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر شیشے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلا دیا۔

اسی اثناء میں کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے رک کر اندر داخل ہوتے لڑکے کو دیکھا۔ اونچا لمبا قد، سفید رنگت، ناک پر ٹکا چشمہ، ہاتھ میں چند فائلیں۔۔ بندہ برا نہیں تھا۔ اسے تفتیش میں مزہ آنے والا تھا یقیناً! وہ لڑکا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ فائلیں میز پر رکھ دیں۔ وہ بھی بنا وقت ضائع کیے کرسی پر بیٹھ گئی۔ دونوں اب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔۔

"کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے مجھے بتائیں کہ ضرار کیسا ہے؟" اس لڑکے نے رک کر اس کی بے چینی کو دیکھا۔

"خطرے سے باہر ہے۔" چھوٹا سا جواب تھا مگر اس کے رگ وپے میں سکون پہنچا گیا تھا۔ اس نے بے اختیار زیرِ لب خدا کا شکر ادا کیا پھر اس لڑکے کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ کو کب معلوم ہوا کہ آپ PTSD کا شکار ہیں، جس کے مطابق آپ کسی کی جان نہیں لے سکتیں؟" سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے پوچھا گیا تھا۔ سعاد کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا۔ وہ چند پل کچھ نہیں بول نہیں سکی تھی۔

"سچ کہہ رہے ہیں؟" بے یقینی سے تیوری چڑھائے پوچھا گیا۔ اس لڑکے نے فائل اس کے آگے کر دی جس میں اس کی رپورٹس تھیں۔ وہ ایک نگاہ ان پر ڈال کر لب بھینچ گئی۔ "ابھی آپ نے بتایا۔۔"

"حزب اللہ کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر کے خیام کے ساتھ کام کیوں کیا؟"

"مجھے اپنے بھائی کو ڈھونڈنا ہے۔"

"خیام ہی کیوں؟"

"انہوں نے آفر کی تھی۔" وہ بے فکری سے کندھے اچکا گئی۔

"اب حزب اللہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"مجھے میرا بھائی چاہیے۔"

"خیام آپ کی اس سلسلے میں مدد نہیں کر سکتا۔ وہ حزب اللہ کا ہر حکم ماننے کا پابند ہے"!

"وہ مجھ سے کہا گیا ہر وعدہ نبھانے کے پابند ہیں!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

"اب تک کیا کچھ جان چکی ہیں؟"

"خیام کے کام کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"اگر کوئی پکڑ لیتا؟"

"میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔ میرا حزب اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اور خیام؟"

"وہ کون؟" معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا گیا۔

"اگر میں کہوں خیام کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیں؟"

"نہیں چھوڑوں گی۔ میں آپ کی نہیں خیام سر کی ہر بات ماننے کی پابند ہوں!" اور یہیں شیشے کے پار کھڑے خیام کو حلق میں کانٹا اٹکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ کتنی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ اپنی شاگردہ کی مہارت پر عش عش کرتا یا اس جھوٹ پر جو بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

"اگر خیام کہے تو؟"

"چھوڑ دوں گی۔۔ لیکن بس تھائیلینڈ کی سرزمین پر جو کام ہم نے شروع کیا ہے اسے مکمل کرنے دیں۔ انہوں نے کہا

تھا انہیں میری ضرورت ہے۔" اس نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ لڑکا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ اس ڈس آرڈر کے ساتھ ان کی جان بھی خطرے میں ڈال سکتی ہیں۔"

"میں نے انہیں کئی خطرات سے نکالنے میں تعاون بھی کیا ہے۔ آپ اسے نظرانداز نہیں کرتے۔"

"اپنے بھائی اور ضرار کے متعلق کیا کہیں گی؟"

"میں یہاں تنہا آئی ہوں، میرا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے!" اس لڑکے نے دائیں ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے کندھے اچکا گئی۔

"زیاد سے کیا تعلق ہے؟"

"میں اس نام کے کسی لڑکے کو نہیں جانتی"!

"اگر آپ اسی رفتار سے جھوٹ بولتی رہیں تو یہاں سے کبھی نہیں نکل پائیں گی۔ اپنا اور میرا وقت برباد مت کریں۔۔!" لہجے کی سختی بڑھی تھی۔

"زیاد حزب اللہ کے اس ایجنٹ کا نام ہے، جو اس مشن پر خیام سر کے ساتھ کام کر رہا ہے۔" وہ لڑکا سر جھٹک کر رہ گیا۔

"اگر خیام نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تو؟"

"تو میں اپنے بھائی کے ساتھ پہاڑوں پر چلی جاؤں گی۔ ہم صبح کو مچھلیاں پکڑیں گے، شام میں بکریاں چرائیں گے اور رات کو سمندر کنارے آگ جلا کر بیٹھیں گے۔"

"آخری بار سنجیدہ کب ہوئی تھیں؟"

"ابھی۔۔۔ چند سیکنڈز پہلے۔۔"

"آخری بار جھوٹ کب بولا تھا؟"

"خیام سر نے مجھے سب سکھایا ہے، بس جھوٹ بولنا نہیں سکھایا!" اس نے گردن اکڑا کر کہا تھا۔ خیام کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔ اس کی شاگردہ اس کا نام روشن کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ لڑکا چند پل لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھتا رہا پھر فائلیں اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "تھائیلینڈ میں خیام کا کام مکمل ہوتے ہی آپ واپس چلی جائیں گی۔ آپ خیام کے ساتھ کیے گئے کانٹریکٹ کو ختم کر دیں گی!!" وہ لڑکا سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔ اس نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ لڑکا جانے کے لیے مڑا۔ اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ اس سے پوچھ رہی تھی، "آپ کی تعریف؟" اس لڑکے کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے یوں دیکھنے پر مسکرا دی۔ لڑکے نے پلک جھپکی۔ "خیام سر کا شاگرد رہ چکا ہوں!!" سنجیدگی سے کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے لبوں پر دوڑتی تبسم آرام سے سکڑتی گئی یہاں تک کہ بالکل غائب ہو گئی۔ وہ بے حس و حرکت بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکا۔۔۔ کتنی آسانی سے اس کے ساتھ کھیل کر جا چکا تھا۔۔ تھا تو وہ بھی پھر خیام کا شاگرد ناں۔۔ آہ خیام۔۔۔!!

☆☆☆

"مصعب الزرقاوی۔۔ خیام کے ہر راز پر پردہ ڈالنے کی وجہ؟"

"وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔" نگاہیں میز پر ٹکائے جواب دیا گیا تھا۔

"اچھا لگنا کوئی وجہ نہیں ہے۔ تم چاہتے تو اس کی اصلیت سب کو بتا سکتے تھے۔" لہجہ سخت ہوا تھا۔

"کیا آپ ان نرم سے احساسات سے واقف نہیں جو ہمارے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیتے ہیں؟" اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اور ان احساسات کی وجہ؟"!

"نہیں جانتا۔ بس وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔" اس نے نگاہیں دوبارہ میز پر ٹکا لیں۔

"کب اچھے لگتے ہیں؟"

"جب وہ مجھے نرمی سے سمجھاتے ہیں۔ جب وہ آفس میں میری موجودگی کے باوجود اپنے تمام کام خود کرتے ہیں۔۔۔ جب وہ میری وہ باتیں بھی دھیان سے سنتے ہیں جنہیں شاذونادر ہی کوئی توجہ دینے کے لائق سمجھے۔ وہ مجھے اچھے لگے تھے تب جب مجھے رونا تھا اور انہوں نے مجھے گلے لگایا تھا۔ جب وہ زخمی تھے اور شدید تکلیف کے باوجود مجھے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ جب اسپتال میں انہوں نے بہت آسانی سے مجھے بھلا دیا تھا کہ میں رو رہا تھا۔۔ اور اس وقت جب وہ کروٹ بدل کر بچوں کی طرح بڑبڑا رہے تھے۔ وہ کھڑوس باس ہیں، جنہیں دیکھ کر مجھے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے اپنے کھڑوس باس سے محبت ہے!" اس نے اپنی بات ختم کر کے اس شخص کو دیکھا جو سانس روکے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال شیشے کے پار اپنے سینئیر کمانڈرز کے درمیان کھڑے خیام کا تھا۔ کم از کم بدر کو یہ بکواسیات یہاں نہیں کرنی چاہیے تھی۔۔ بالکل بھی نہیں!!

"اب تمہیں اندازہ ہو چکا ہے کہ "تمہارے خیام سر" کسی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تنظیم اپنے مقاصد میں حق پر بھی ہو سکتی ہے اور یہ ظالموں میں سے بھی ہو سکتی ہے۔ کیا اب بھی تمہیں ان سے محبت ہے؟"!

"وہ شخص جس نے بنا کہے بہت خاموشی سے مجھے اپنے ساتھ نماز پڑھنے کی عادت ڈالی۔۔ اور وہ جس نے مجھے کسی انسان کے آگے جھکنے سے منع کیا۔۔ وہ جو باتوں سے دل جیت لیتا ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ کبھی ظالموں میں سے نہیں ہو سکتا!" خیام کے مطابق بدر ہوش میں نہیں تھا۔ وہ گہرے صدمے میں تھا۔۔

"جندل کی حفاظت کیوں کی؟ کیا اس سے بھی محبت ہے؟"

”قاتل بننے سے پہلے مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ لیکن جب وہ گارڈ اس پر اپنی پستول نکالنے والا تھا تب اس کے پکڑے جانے کا احساس۔۔ اسے کھو دینے کے ڈر نے مجھے وہ لوہے کی سلاخ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ۔۔ جب خیام سر نہیں تھے تو وہ تھا۔۔ البتہ اس کی حفاظت کے لیے کسی کو ”قتل“ کر دینا۔۔ غیر ارادی طور پر تھا۔“

”اس قتل کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟“

”میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی میں نے انسانیت کا قتل کیا ہے۔۔ یا انسانیت کی ظالموں سے حفاظت کی ہے۔ یہ واقعی ایک قتل تھا۔۔ یا جہاد؟“!

”ایسے کئی لوگوں کا خون تمہارے ”سر“ نے اور جندل نے بھی بہایا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟“ بدر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ اب فیصلہ کرنا مشکل تھا۔۔ اب بات حق اور باطل کی تھی۔ اب معاملہ ظالم اور مظلوم کا تھا۔ اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا تھا۔

”میں قاتل بن چکا ہوں۔ میرے ہاتھوں پر ایک انسان کا خون لگا ہے۔ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ خیام سر اور جندل مجاہد ہونگے مگر حقیقت یہی ہے کہ میں۔۔ ایک قاتل ہوں!!“ اس نے فیصلہ کر لیا۔۔ وہ قاتل تھا۔ وہ شخص اگر ظالموں میں سے تھا بھی تو۔۔ وہ اس کی جان لینے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا۔۔!

”خود کو پولیس کے حوالے کرو گے؟“

”میں اتنا بہادر نہیں ہوں۔“ اس نے نگاہ اٹھا کر اس شخص کو دیکھا۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ وہ واقعی اتنا بہادر نہیں تھا۔ وہ اس شخص کے ساتھ ساتھ بدر کی جان بھی لے چکا تھا۔۔ اور اب وہ۔۔ ”مصعب الزرقاوی“ کا قاتل نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر پہلے ہی دو لوگوں کا خون تھا۔ وہ مزید رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔۔ وہ اتنا بہادر

نہیں تھا۔

"خیام اور جندل کا کیا؟"

"میں نے کہا ناں۔۔ میں اتنا بہادر نہیں ہوں۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ وہ شخص چند پل خاموش رہا۔ پھر کرسی دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھا اور لب وا کیے۔ "جس دن تم خود کو ایک قاتل کے بجائے مجاہد سمجھنے لگو، اس دن یہاں آجانا۔ تم اپنے لیے یہاں کا ہر دروازہ کھلا پاؤ گے!!" وہ شخص پلٹ گیا۔ بدر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ میز پر نگاہیں ٹکائے۔۔ گم سم سا بدر۔۔۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ اسے خود سے نفرت ہو رہی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا وہ ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔ وہ کسی طرح وقت میں پیچھے چلا جائے اور اپنے اس گناہ کی تلافی کر لے۔ وہ خود کو قاتل بننے سے روک لے۔ مگر۔۔ وقت گزر چکا تھا۔ حال میں رہتے ہوئے ماضی میں جانا ناممکن ہوتا ہے۔ وقت گزر جاتا ہے، بس پچھتاوے باقی رہتے ہیں۔

"بدر معصوم نہیں رہا۔۔۔" اس کے لب دھیرے سے پھڑپھڑائے تھے۔ آنکھ سے ایک آنسو نکل کر گال سے لڑھکتا داڑھی میں جذب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میڈیا کا ہجوم اس کے گرد تنگ گھیرا ڈالے ہوا تھا۔ بہت سے سوالات تھے، اور وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ تیزی سے جلتی بجھتی فلیش لائٹس۔۔ لوگوں کی بلند ہوتیں آوازیں۔۔ تنگ گھیرا اور بڑھتا ہجوم۔۔۔ یہ منظر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ اس سب کا عادی تھا۔ مگر وہ اس طرح کے سوالات کا عادی نہیں تھا۔

"آپ اپنے باپ پر لگائے گئے الزامات کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

”کیا یہ سچ ہے اسٹیون بار بارا نے خود کشی کر لی ہے؟“

”کیا اسٹیون واقعی مجرم تھا۔ کیا وہ واقعی دہشتگرد تنظیموں سے تعلق رکھتا تھا؟“!

وہ سختی سے آنکھیں میچ گیا۔ آنسو کا چھوٹا سا قطرہ اس کے گال پر لڑھک گیا۔ سب ایک پل کے لیے خاموش ہو گئے

۔

”میرے باپ نے۔۔ اپنی زندگی میں بہت سے غلط کام کیے ہیں۔ وہ دہشتگرد بھی تھا اور سفاک قاتل بھی۔۔ اس نے کئی گناہ کیے تھے اور اب وہ ان گناہوں کے بوجھ سے تنگ آ کر اپنی جان لے چکا ہے۔ میری آپ سب سے اپیل ہے کہ میرے مرے ہوئے باپ کے متعلق اب ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے ہمیں تکلیف ہو۔ وہ اپنے تمام گناہوں کی سزا بھگت چکا ہے۔ میں مارک بار بارا۔۔۔ تمام بار بارا گروپ کی جانب سے اپنی عوام سے معافی چاہتا ہوں۔۔“ اس نے نم آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے اپنا سر جھکا دیا۔ کئی لوگ اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر خاموش ہو گئے تھے اور کئی چہ مگوئیاں کرنے لگے تھے۔ منظر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔۔

اسکرین پر نظر آتے مارک کو روتا دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔ ان سب کو گہرا دھچکا لگا تھا۔ البتہ اسے اس وقت بھی اسٹیون کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہی ڈزرو کرتا تھا، وہ اسی قابل تھا!!

اس نے نگاہوں کا رخ اسکرین سے ہٹا کر موبائل کی طرف کیا پھر آہستہ سے موبائل اٹھا لیا۔ خیام کا نمبر ملایا تو نمبر بند ملا۔ اس نے بدر کا نمبر ملایا تو یہی جواب موصول ہوا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی، اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کل وہ اسے کیوں اور کس سے بچانے آیا تھا۔ اور وہ ہی کیوں آیا تھا؟!!

کچھ یاد آنے پر اس نے اسپتال کے نمبر پر فون کیا۔ دوسری ہی بیل پر کال اٹھا لی گئی۔

”مجھے خیام حنفی سے بات کرنی ہے۔ وارلڈ گلاس کمپنی کے مینیجر۔۔ وہ تین دن پہلے نہایت زخمی حالت میں یہاں

لائے گئے تھے۔" اس نے تفصیلات بتائی تھیں۔

"جی۔۔ لیکن خیام حنفی اسپتال سے جا چکے ہیں۔ وہ کل اچانک غائب ہو گئے۔ کوئی نہیں جانتا کدھر گئے ہیں۔ اگر آپ کو وہ ملیں تو انہیں اسپتال ضرور لائیے گا ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔!" وہ مایوس ہوئی تھی۔ شکریہ کہہ کر فون بند کر کے اس نے گہری سانس لے کر سر کرسی پر ٹکایا تھا۔

"ازابیلا۔۔۔ جلدی سے آجاؤ۔ ہم لائیو جا رہے ہیں۔ اور موضوع مارک بار بار ا ہے!!" اس کی ٹیم کے ایک ورکر نے اسے آواز لگائی تھی۔ وہ گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے بہت سے کام کرنا تھے۔

☆☆☆

وہ چپ چاپ کھڑا خالی خالی نظروں سے دیوار کو تک رہا تھا۔ چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کرب کی انتہا تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس رات کو۔۔ اس منظر کو نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا جب اس نے ایک طرف اپنے بھائیوں جیسے دوست کو اور دوسری طرف اپنی جان سے عزیز بہن کو خون میں رنگے دیکھا تھا۔ وہ اس منظر کو بھی تو بھول نہیں پا رہا تھا جب خیام چکرا کر گرا تھا۔۔ اس کا بہت زیادہ خون ضائع ہوا تھا۔ وہ تینوں مختلف کمروں میں، مختلف ڈاکٹروں کے زیرِ نگرانی اپنی اپنی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ جب ایک طرف اس نے خیام کے لیے خون دیا تھا تو دوسری طرف ضرار کے لیے خون مانگا گیا تھا۔۔ ان تمام لمحات میں اسے اپنی جان حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ تینوں اسے بے حد عزیز تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔ کسی کو بھی نہیں۔۔!

دروازہ کھلا اور کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے پلٹا تھا کہ نگاہیں اس چہرے پر جا ٹکیں۔ دھڑکنیں سست پڑیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئیں۔ وہ۔۔ سعاد۔۔۔ اس کی بہن اس کے سامنے

اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔ چہرے سے نقاہت جھلک رہی تھی مگر وہ۔۔ ٹھیک تھی۔ وہ زندہ تھی۔ زندگی اور موت کی جنگ میں اس نے موت کو ہرادیا تھا۔ "آپ کا بہت شکریہ اللہ جی۔۔!" اس کے لب بے اختیار پھڑپھڑائے تھے۔ احساسِ تشکر سے دل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوا تھا۔ وہ چند پل دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور اگلے ہی لمحے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔ آنسو زاروقطار آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ کڑی دھوپ میں اسے چھاؤں میسر آئی تھی۔ غیروں کے درمیان میں اسے کوئی اپنا ملا تھا۔۔ اس کا بھائی۔۔ اس کا اپنا بھائی!! ہر وہ تکلیف جو وہ بھلا چکی تھی اپنے بھائی کو دیکھتے ہی ان تکالیف کے آثار اس کے چہرے پر نظر آنے لگے تھے۔ ہر وہ درد جسے اس نے نظر انداز کیا ہوا تھا، اپنے بھائی کے گلے سے لگ کر روتے ہوئے وہ نئے سرے سے ابھر رہا تھا۔ اور یہ تو دستورِ فطرت ہے۔۔ مضبوط سے مضبوط انسان بھی اپنے "اپنوں" کو دیکھ کر آنکھیں نم کر بیٹھتا ہے۔ ہر درد نئے سرے سے سر اٹھاتا ہے، ہر تکلیف دوہری ہوتی ہے۔ تب بس اس اپنے کا کندھا مطلوب ہوتا ہے جس پر وہ اپنے ایک عرصے سے جمع شدہ آنسو بہا سکے۔ پھر ہر تکلیف بھول جاتی ہے، ہر درد ماند پڑ جاتا ہے۔ دل پر ایک بوجھ ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے وہ "اپنا" اٹھالیتا ہے اور اسے ہر بوجھ سے آزاد کروالیتا ہے۔

وہ اس کے سینے سے لگی ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ جندل کو اس کے آنسوؤں کی نمی اپنے کندھے پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دھیرے سے اس کا سر سہلا رہا تھا۔ بالکل ایک بھائی کی طرح۔۔ بڑے بھائی کی طرح! اپنے دل کا غبار نکال لینے کے بعد وہ دھیرے سے اس سے الگ ہوئی تھی۔ جندل نے نرمی سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھیں سرخ پڑ چکی تھیں۔ ناک لال ہو رہی تھی۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔

"کیا زیادہ درد ہو رہا ہے؟" اس نے آرام سے اس کے گالوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"بہت زیادہ۔۔ لیکن یہ درد اس درد سے بہت کم ہے جو ضرار کو ملا ہے۔" ایک اور آنسو اس کے گال پر پھسل گیا۔

"جندل۔۔ آئی ایم سوری۔۔ میں اسے نہیں بچا پائی۔" ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔

"وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اس کے لیے پریشان نہ ہوں، وہ بہت بہادر ہے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ جندل نے کرسی کھینچ کر سامنے کی پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ آہستہ سے اس کے سامنے ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے فرش پر بیٹھا۔ "میں آپ کے لیے ہر بار پستول کا ٹریگر دبا سکتا ہوں۔ میں آپ کی طرف بڑھتی ہر گولی کو اپنے سینے پر روک لوں گا۔ بابا نے آپ کی حفاظت کا وعدہ لیا تھا آغا جان سے۔۔ آغا جان کے بعد یہ ذمہ داری میری ہے۔ مجھے اس ذمہ داری کو نبھانے دیں۔ مجھے آپ کی حفاظت کے لیے آپ کے آگے کھڑا ہونے دیں۔۔۔" وہ اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم مجھ سے خفا نہیں ہو؟" وہ اس کے مشکوک سے انداز میں پوچھنے پر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"اگر آپ کو میری ناراضگی سے فرق پڑتا تو مجھ سے اتنی بڑی بات نہ چھپاتیں۔" اس کا لہجہ ایکدم بدلا تھا۔ اب چہرے پر وہ نرمی بھی نہیں تھی۔ وہ بڑے بھائی سے واپس چھوٹے بھائی کے روپ میں آ رہا تھا۔ سعاد کو لگا تھا کہ اب اسے بھی چھوٹی بہن سے بڑی بہن کے روپ میں آ جانا چاہیے۔۔۔ اسے بالکل آ جانا چاہیے۔۔ ابھی کے ابھی!!

"میں آپ کا سگا بھائی ہوں!!" وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔

"میں نے کب تمہارے ساتھ سوتیلوں والا سلوک کیا ہے؟"

"کاش سوتیلا بھائی سمجھ کر سوتیلوں والا سلوک ہی کر لیتیں۔" وہ سر جھٹک کر اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔

"یہ کیا تم نے عورتوں کی طرح رونا پیٹنا ڈال رکھا ہے ہاں؟ کیا کر دیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟!" وہ تیوری

چڑھائے پوچھ رہی تھی۔

"آپ نے اپنے اتنے بڑے فیصلے سے مجھے انجان رکھا۔۔ کیا میں آپ کا بھائی نہیں؟ اکلوتا بھائی؟ آپ کو کم از کم مجھے یہ بات بتانی چاہیے تھی۔"

"تم نے بتایا تھا؟ سالوں میری ناک کے نیچے تم میرے ساتھ کھیل کھیلتے رہے۔ میرا کھیل تو دو سال بھی نہیں چلا۔ اب مزید میرا دماغ مت گھماؤ!" وہ تپ گئی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ چند پل وہ کچھ بول نہیں سکا تھا۔ سعاد نے اس کی شکل دیکھ کر بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔ اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتی آنکھیں میچتی درد سے کراہی تھی۔ جندل پریشانی سے کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ درد زیادہ ہے؟" اس کے سوال پر سعاد کے کراہنے میں اضافہ ہوا تھا۔ "میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" وہ پریشانی سے کہتا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ فوراً سیدھی ہوئی۔ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا جو دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"واپس آؤ۔ اور خبردار جو آئندہ میرے ساتھ لڑے۔ دماغ گھوم گیا تو اپنی موت کا ڈرامہ بھی رچا دوں گی۔۔ کیا سمجھے؟" وہ اس پر رعب جھاڑ رہی تھی۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھ کر رہ گیا۔۔ ہاں اس وقت۔۔ اس وقت وہ خیام کی شاگردہ لگ رہی تھی۔ یہ "کیا سمجھے؟" بولنے کا انداز خیام کا ہی تھا۔ وہ۔۔۔ خیام۔۔ اس کی بہن کو اچھی طرح بگاڑ چکا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمانڈرز کے ساتھ بیٹھا تھا جب اسے خبر ملی تھی کہ ضرار نے آنکھیں کھول لی ہیں۔ وہ اسٹک کا سہارا لیتا تیزی سے کمرے سے باہر آیا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے نگاہ دوسرے کمرے سے نکلتے جندل پر پڑی۔ جندل

بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ ہلکے بھورے رنگ کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں وہی انوکھی کشش تھی۔ دائیں ہاتھ پر برنولا لگا ہوا تھا۔ اسٹک کا سہارا لے کر کھڑا خیام حنفی۔۔ جو اب بہت بہتر نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں چند پل یونہی کھڑے رہے اور پھر اگلے ہی لمحے خیام نے معصومیت سے اپنا دایاں بازو کھولا تھا۔ وہ سالوں پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ جب اسے جنگی تربیت کے دوران چوٹ لگی تھی، جب اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ ہاں تب۔۔۔ لنگڑا کر چلتے ہوئے وہ بھی خیام کو دیکھ کر یونہی رک گیا تھا۔ اس نے بھی معصومیت سے اپنا بازو یونہی کھول دیا تھا۔

اس نے اپنے قدم بڑھائے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سالوں پہلے خیام اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے آیا تھا۔ اس کے قریب آنے پر خیام نے اپنا پھیلا ہوا بازو اس کے شانوں پر گراتے ہوئے اسٹک کو چھوڑ دیا تھا۔ جیسے سالوں پہلے اس نے خیام کے شانوں پر اپنا کھلا بازو گرایا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟" وہ اسے سہارا دے کر ضرار کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل بھی اچھا محسوس نہیں کر رہا میں۔۔۔ بابا کے خون میں ملاوٹ ہو گئی ہے!" اس کے افسوس سے کہنے پر جندل ہلکا سا ہنس دیا تھا۔ وہ خوش تھا بے حد خوش۔۔۔ کچھ لمحات پہلے اس نے ان تینوں کو زندگی اور موت کی جنگ لڑتے دیکھا تھا اور اب وہ تینوں۔۔۔ یہ جنگ جیت چکے تھے۔ اسے آج یقین ہو گیا تھا کہ ان سب کا ساتھ ایک لمبے عرصے تک لکھ دیا گیا ہے۔۔۔ اور کون جانے یہ لمبا عرصہ قدرت کے لیے کتنا ہوتا ہے؟ کیا کچھ گھنٹے؟ یا دن۔۔۔ ماہ یا سال؟

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ نگاہ سامنے بیڈ پر لیٹے ضرار پر پڑی۔ مشینوں میں گھرا۔۔ زخمی ضرار! زیاد اس کے سر پر کھڑا تھا۔ ڈاکٹرز تسلی کر کے جا چکے تھے۔ وہ دونوں بیڈ کے قریب آکر رک گئے۔

"کیسے ہو؟" سوال اس سے پوچھا گیا تھا۔۔ ضرار ولید سے۔۔ وہ جو نم آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سفید پڑ رہا

تھا۔۔ وہ شدید زخمی ہوا تھا۔۔ وہ تکلیف میں تھا مگر اس وقت ان تینوں کے لیے سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ تھا۔۔ وہ زندہ تھا!!

"ٹھیک ہوں۔۔ سعاد کیسی ہیں؟" نرمی سے پوچھا گیا تھا۔ زیاد کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ خیام نے بغور اس کے تاثرات کو دیکھا تھا۔ "الحمدللہ وہ بھی ٹھیک ہیں۔" جواب جندل نے دیا تھا۔

"اتنا ہیرو بننے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟ پہلی گولی میں ہی اس خبیث انسان کا کام تمام کیوں نہیں کیا؟" جندل نے تیوری چڑھائے اسے دیکھا تھا۔

"غیرت کا سوال تھا۔۔" وہ خفیف سا مسکرایا۔

"دو لگاؤں گا کان کے نیچے اور ساری غیرت مر جائے گی تمہاری۔۔ جنگلی انسان۔۔ جان نکال دی تھی ہماری!!" اس کے کان غصے سے لال ہونے لگے تھے۔ ضرار نے اپنے دانتوں کی نمائش کروانا ضروری سمجھا تھا۔

"تمہارا چہرہ کیوں پیلا پڑ رہا ہے؟" خیام نے زیاد کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سب اب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"دو لیٹر خون دیا ہے اس نے ضرار کو۔۔ ابھی دیکھنا یہ چکرا کر گر بھی جائے گا۔" جندل نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔

"اس کی آنکھیں بھی باہر ابلنے کو ہو رہی ہیں۔ دیکھو ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ دھیان رکھنا جندل۔۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" خیام نے اسے خبردار کیا تھا۔ زیاد نے دانت پیس کر دونوں کو دیکھا تھا۔

"تمہاری ٹانگ ٹھیک ہے؟" مسکراتے ہوئے پوچھا گیا تھا جبکہ لہجے میں طنز کا شائبہ تھا۔ خیام کے لبوں سے مسکراہٹ آرام سے غائب ہوئی۔ زیاد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "خبیث انسان!" وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا تھا۔ سارا

مزہ خراب کر دیا گیا تھا۔ خبیث لوگ۔۔!!

”زیاد۔۔“ ضرار کے بلانے پر اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس نے آہستہ سے بائیں ہاتھ کی انگشت امانت میں موجود انگوٹھی اتاری پھر ہتھیلی پر رکھ کر زیاد کی طرف بڑھائی۔ ”تمہاری امانت!“ وہ مسکرا دیا۔ زیاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ جندل کے ماتھے پر بل پڑے۔ اور خیام۔۔۔ اس کے لب خفیف سی مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔

”سعاد سے کہنا۔۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔“ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ زیاد بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔ جندل معاملے کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔

”خیام میرے دوست کیا تم مجھے سمجھا سکتے ہو یہاں کیا ہونے جا رہا ہے؟“ وہ زیاد کو ضرار کی ہتھیلی سے انگوٹی اٹھاتے ہوئے دیکھ کر پوچھ بیٹھا تھا۔

”نکاح میرے دوست۔۔ نکاح!!“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

”تمہارا؟“ جندل کے سوال پر اس نے جل کر اسے دیکھا۔

”زیاد تاشفین کا!!“ اس نے چبا کر کہا تھا۔

”تو تم کیوں مسکرا رہے ہو؟“ خیام نے گھور کر اسے دیکھا پھر اپنی کہنی زور سے اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کراہا تھا۔ ضرار انہیں دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ زیاد مبہوت سا اس انگوٹھی کو تک رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ۔۔۔ اب حالات اس کے حق میں جانے والے تھے۔ جدائی کی تاریک راتوں میں محبت کے آسمان کے عین قلب سے ملن کی روشنی پھوٹی اور اس کے دل کی تمام دنیا روشن ہو گئی۔

”ویسے کس کے ساتھ ہو رہا ہے اس ناکام شاعر کا نکاح؟“

"سعاد یوسف زئی سے!" ضرار نے سکون سے آنکھیں موندلی تھیں۔ جندل ہونقوں کی طرح ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ خیام۔۔ جو مسلسل مسکرارہا تھا اور زیاد جو اجازت طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں کم از کم آپی کے متعلق الزرقاوی سر کو بتانا چاہیے تھا!!" وہ اسے کمرے سے باہر لاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"سعاد میرے کہنے پر سب سے حتیٰ کہ اپنے بھائی کو بھی اس سب سے انجان رکھ رہی تھی، میں کیسے اس راز کو فاش کر دیتا؟!" وہ خفیف سا مسکرایا تھا۔

"تم زیاد اور آپی کے متعلق بھی جانتے تھے۔۔" وہ اب خفا ہوا تھا۔

"ہاں میں جانتا تھا۔ اگر حالات اچانک نہ بدلتے تو میں ان دونوں کو کبھی نہ ملنے دیتا اور کم از کم میرے ہوتے ہوئے دونوں کا نکاح ناممکن ہوتا!!" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"اتنے سنگدل تو نہ بنو یار۔۔" اسے برا لگا تھا۔

"تم سمجھ نہیں رہے۔ اگر دونوں ملتے تو سعاد کا راز زیادہ دیر راز نہ رہتا۔ اور اس راز کو راز رکھنے کے لیے میں ہر حد تک جا سکتا تھا۔۔ کاش حالات نہ بدلتے۔۔" اسے افسوس ہوا تھا۔ جندل سر جھٹک کر رہ گیا۔

"تم ہمیشہ سے سب جانتے تھے۔ تم نے اتنی ساری باتیں مجھ سے چھپائیں۔ میں تمہارا بھائیوں جیسا دوست ہوں یار۔۔" وہ اس سے شکوہ کر رہا تھا۔ خیام نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا تھا۔

"عورتوں کی طرح شکوے کرتے ہو تو زہر لگتے ہو مجھے۔" وہ منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔ جندل نے تپ کر اسے دیکھا تھا۔ آج ہر کوئی اسے عورتوں کے ساتھ کیوں ملا رہا تھا؟! لیکن ہر کوئی نہیں۔۔ بس خیام اور اس کی شاگردہ!! دونوں بہت بد تمیز تھے۔۔!

”خیر سے اس وقت شہد تو تم بھی نہیں لگ رہے مجھے !!“ وہ سر جھٹک کر اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ خیام جواباً خاموش رہا تھا۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ نگاہیں سامنے ٹکی تھیں۔ جندل نے کم فہمی سے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں کچھ فاصلے پر بدر کھڑا تھا۔ اسے اس کا موبائل اور دیگر سامان واپس کیا جا رہا تھا۔ اسے واپس جانے کی اجازت مل چکی تھی۔۔ وہ جا رہا تھا۔

”کیا وہ رونا چاہتا ہے؟“ وہ آنکھیں سکیڑے اس پر نگاہیں ٹکائے پوچھ رہا تھا۔

”پہلا قتل سہل تو نہیں ہوتا۔۔ اور خصوصاً جب قتل غیر ارادی ہو۔“ بدر اب اپنا والٹ اپنی جیب میں اڑس رہا تھا۔ یہ کام بھی کر چکا تو غیر ارادی طور پر پلٹا۔ نگاہیں ذرا فاصلے پر کھڑے خیام اور جندل پر ٹکیں۔ وہ ساکت ہوا تھا۔ قدم اپنی جگہ جم گئے۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اسے ہر طرف خون نظر آنے لگا تھا۔ سب سے بڑھ کر اپنے ہاتھوں پر۔۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات ابھرے تھے اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ دونوں ابھی اس کے واپس ادھر آنے کا سبب سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ وہ آگے بڑھتا دایاں بازو خیام کی گردن کے گرد پھیلاتے ہوئے اور بایاں بازو جندل کی گردن کے گرد پھیلاتے ہوئے ان کے گلے لگ گیا تھا۔ اور اگلا لمحہ ان دونوں کے لیے مزید چونکا دینے والا تھا جب وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے اس کی سسکیوں کو سن رہے تھے، اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ اس کے درد کو جھیل رہے تھے۔ اس کے رونے میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان دونوں نے۔۔۔ بڑے بھائیوں کی طرح دھیرے سے۔۔۔ اپنے ہاتھ اس کی کمر پر تسلی کے انداز میں رکھے تھے۔

خیام نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔۔ پہلا قتل سہل نہیں ہوتا۔ مرنے والا ایک بار مرتا ہے مگر قاتل ہر روز ہر لمحہ مرتا ہے۔۔۔!

☆☆☆

اس کے قدم آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف اٹھ رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں وہ چپکے سے باغ سے گزرتا گارڈز کی نظروں سے بچتا گھر کے اندرونی حصے کی طرف آیا تھا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھہر گیا۔ گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کرنی چاہی۔ وہ ایک ہیولا تھا۔۔ ہیولا جو مکمل سیاہ لباس میں موجود تھا۔ ماتھے پر ہم رنگ پی کیپ تھی۔ سفید رنگ کے رومال سے اسے نے اپنا چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پر سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے۔ وہ سانس بھی احتیاط سے لے رہا تھا۔ پکڑے جانے کا خوف اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر کر رہا تھا۔

اپنی مکمل تسلی کرنے کے بعد اس نے لاؤنج میں قدم رکھا پھر دھیرے سے دائیں طرف موجود کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ صرف چند لمحات اور پھر وہ اپنے مطلوبہ کمرے میں داخل ہو کر کمرے کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر بیڈ پر سوئے وجود کو دیکھا۔ ناکارہ اور لاچار وجود۔۔ اس وجود میں جان باقی تھی اس کا فیصلہ مشکل تھا۔ وہ اسی فیصلے کو آسان کرنے آیا تھا۔ زندگی نامی وہ پھندا جو اس ناکارہ وجود کے گلے میں ڈالا گیا تھا وہ اسے ہی نکالنے آیا تھا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ رفتار سست تھی۔ آنکھوں میں عجیب اداسی سی تھی۔ وہ بیڈ کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔ چند پل چپ چاپ پلکیں جھپکتا اس وجود کو دیکھتا رہا۔

بکھرے بال، عجیب سوجا ہوا سا چہرہ۔۔ کانچ سی خاموشی کو کرچیوں میں بدلتی سانسوں کی آواز۔۔ گھڑی کی ٹک ٹک اور تیزی سے گزرتا وقت۔۔ اس نے سر جھٹک کر گہری سانس لی۔ گویا وقت آ چکا تھا۔ اسے اپنا کام کر لینا چاہیے تھا۔ اس کا ہاتھ دھیرے سے رینگتا ہوا اپنے کوٹ کی جیب میں گیا اور وہاں سے ایک انجیکشن برآمد ہوا۔ اس نے انجیکشن کو دو انگلیوں کے درمیان میں لے کر اس کا ڈھکن اتارا پھر اس سفید مائع کو دیکھا جو بس چند لمحات میں اس وجود کو زندگی نامی طوق سے آزاد کرنے جا رہا تھا۔ وہ انجیکشن ہاتھ میں تھامے جھکا۔ اس کے سامنے وہ بازو تھا جو اب

بہت تکلیف کا سامنا کرنے کے بعد ذراسی حرکت کیا کرتا تھا۔۔انجیکشن کی سوئی دھیرے سے جِلد کو چیرتی رگوں میں اتری اور سفید مائع جسم میں داخل ہونے لگا۔بس کچھ سیکنڈز اور پھر وہ انجیکشن ہاتھ میں تھامے سیدھا ہوا۔ایک اداس سی نگاہ اس چہرے پر ڈالی پھر انجیکشن کوٹ کی جیب میں اڑستا پلٹ گیا۔

اس کی چال میں احتیاط تھی۔وہ دروازہ کھول کر باہر جا رہا تھا۔لاؤنج سے گزر کر وہ باغ میں اترا تھا۔گارڈز شراب کے نشے میں دھت پڑے ہوئے تھے۔وہ ان میں سے ایک کو ٹھوکر مارتا آگے بڑھ گیا۔وہ آدمی مدہوشی میں تھوڑا بڑبڑایا پھر ہر طرف خاموشی چھاگئی۔دروازے پر موجود روشنی سے دیوار پر اس کا سایہ بنا۔۔لمبا اور پُراسرار سا۔۔اس نے دروازہ پار کر لیا۔اسے لگا تھا۔۔اس کی زندگی کے یہ چند لمحات۔۔کسی جہنم میں گزرے تھے۔۔!

☆☆☆

کھڑکی سے چھن کر کے آتی روشنی کمرے میں موجود روشنی کے آگے ماند پڑ رہی تھی۔کمرے کا ماحول یخ ٹھنڈا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی بے فکری سے ناشتے کے ساتھ انصاف کرنے میں مصروف تھی۔دائیں ہاتھ میں ہنوز برنولا لگا ہوا تھا۔ سیاہ لمبے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا ہوا تھا۔جوڑے سے نکل کر مسلسل چہرے کے آگے آتی لٹوں کو وہ کانوں کے پیچھے اڑس چکی تھی۔چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ضد کر کے ضرورت نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ڈرپ مزید لگوا کر وہ خود کو اب بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔لیکن اس کے بہہ چکے خون کا ازالہ ابھی بھی نہیں ہوا تھا۔جس کا اس کی نظر میں حل یہی تھا کہ اس کی بھرپور خاطر مدارت کی جائے۔

اس نے جوس کا گلاس لبوں تک لے جا کر جوس کا گھونٹ بھرا۔اسی اثناء میں اس کے برابر میں رکھا موبائل تھرتھرایا۔اس نے تیوری چڑھا کر اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھا پھر موبائل اٹھا کر کندھے اور کان کے درمیان پھسایا۔

”سکون سے ناشتہ تو کرنے دیں۔“ وہ اس کے اور ناشتے کے درمیان اس بے وقت مداخلت پر خفا ہوئی تھی۔

”فوراً باہر آؤ!“ حکم صادر کیا گیا۔

”تفتیش مکمل ہو گئی ہے۔ میں نے بہت سچائی سے تمام سوالات کے جواب دیے ہیں۔ اب مجھے چین سے رہنے دیں۔ مجھ سے نہیں چلا جا رہا، بہت کمزوری ہو رہی ہے۔ آئے میرا سر۔۔۔ یہ بھی چکرا رہا ہے۔ فون رکھتی ہوں۔“ اس نے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے فون بیڈ پر پھینکنا ہی چاہا تھا کہ اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ”اگر تم نہ آئیں، تو زیاد کو بھیج دوں گا!“ وہ جانتا تھا وہ اس سے چھپتی پھر رہی ہے تبھی اسے دھمکا رہا تھا۔

”میں آ رہی ہوں۔“ وہ تیزی سے فون پھینکتی فرمانبردار شاگردہ کی طرح بیڈ سے اٹھی۔ عجلت میں اٹھنے کی وجہ سے پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ وہ لب بھینچتی انہیں نظر انداز کرتی آگے بڑھ گئی۔

کچھ لمحات میں وہ حجاب اوڑھے اچھے شاگردوں کی طرح اپنے استاد کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ جو اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ جواباً وہ معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں جب ازابیلا کے ساتھ تھا تو وہاں ایک آدمی ملا۔ اس نے مجھے مائک کے آدمیوں کو سنبھالنے کی تسلی دے کر تمہاری طرف روانہ کیا۔ میرے اس کے متعلق پوچھنے پر اس نے کہا کہ ”سعاد سے پوچھنا!“۔ محترمہ سعاد یوسف زئی۔۔ آپ میری ناک کے نیچے کیا کھیل رہی ہیں؟“ لہجے میں بلا کا طنز تھا۔

”سعاد سے پوچھنا۔۔“ وہ پر سوچ نگاہوں سے سامنے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی پھر دماغ میں ایک خیال آتے ہی چونکی۔

”بوڑھا بھیڑیا! وہ عالیان ہے۔۔ عالیان ابنِ اعظم!“ اس نے جوش سے کہا۔ خیام نے دائیں ابرو اچکائے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑائی پھر لب دانتوں میں دبائے سر ذرا سا جھکا گئی۔ ”ویل۔۔۔ مارک کی طرف سے پیغام ملنے پر جب میں وہاں گئی تھی تو مجھے روکنے والا عالیان تھا۔ اس کے بعد جب آپ اسپتال میں تھے تو آپ کو مارنے کی کوشش کی

گئی تھی۔ اس وقت آپ کو بچانے والا بھی وہی تھا۔ وہ کوئی ہمارے بہت ہی قریب ہے۔ وہ بابا کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ وہ ہم سے متعلق ہر چیز سے آگاہ ہے۔"

"یہ سب تم مجھے اب بتارہی ہو؟!" اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔

"موقع ہی نہیں ملا ناں۔۔" وہ منمنائی۔

"اب موقع دے رہا ہوں۔ ایک ہی بار میں وہ سب بتادو جو موقع نہ ملنے کی وجہ سے تم مجھے نہیں بتاپائیں۔" اپنے ہاتھ کمر پر باندھے گئے۔ طنز کے تیر چلاتا وہ اسے اس وقت بہت برا لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اپنا ناشتہ چھوڑ آئی تھی۔

"آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاتی۔" وہ اس معصومیت کو دیکھ کر رہ گیا۔

"اگلی بار وقتی آگاہ کر دینا سعاد!" پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا گیا۔ وہ مسکرادی۔ مسکراتے ہوئے سر کو خم دیا۔

"آپ سے ایک سوال۔۔"

"کہو۔"

"وہ ایک لڑکی۔۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا سعاد۔۔ اس کے اور زیاد کے متعلق آپ کیا اور کب سے جانتے ہیں؟" خیام نے ٹھہر کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"تم مجھے ہر بات سے آگاہ رکھنے کی پابند ہو، میں نہیں۔ میری استانی مت بنو!" دوٹوک انداز میں جواب دیا گیا۔

"بتائیں۔۔۔" وہی معصومیت سے پلکیں جھپکی گئیں۔ وہ اس وقت کو کوس کر رہ گیا جب اسے بلایا تھا۔

"صرف میں ہی نہیں، تمہارا بھائی بھی جانتا تھا۔ یاد ہے جب تم اس کے بیرون ملک جانے پر لڑی تھیں تو اس نے تمہیں اندلس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ زیاد وہاں جارہا تھا۔ وہ اپنے کام کے علاوہ فارغ اوقات میں تمہارے

ساتھ رہ سکتا تھا، تمہاری حفاظت کر سکتا تھا جس سے جندل کو تسلی رہتی۔ اندلس کے بعد کیا ہوا اس سے زیاد نے ہمیں انجان رکھا تھا۔ مگر میں انجان نہیں رہا تھا۔ زیاد ناکام شاعر تو تھا ہی اب ناکام عاشق بھی بن گیا تھا۔ بات تبھی ساری سمجھ میں آ گئی لیکن تمہاری طرف سے بھی معاملہ ایسا ہی ہو گا اس کی مجھے امید نہیں تھی۔" وہ رکا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا جو ہونق بنی اسے تک رہی تھی۔ ان کے دشمن تو ان کے ساتھ کھیل ہی رہے تھے وہ سب بھی آپس میں اسی کام میں مصروف تھے۔۔ آہ جندل!!

"میری طرف سے معاملہ ایسا نہیں ہے!!" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ خیام کے لبوں پر خفیف سا تبسم بکھر گیا۔ وہ ایک قدم آگے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔ "نکاح سے انکار کر دو"!

"کس کا نکاح؟" ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"میرا!!" اس کے کم فہمی سے پوچھنے پر وہ تپ گیا تھا۔

"تو آپ انکار کریں ناں۔۔"

"اُفف سعاد۔۔۔ صبح صبح میرا دماغ مت چاٹو۔ وہ سامنے کمرا تمہارا بھائی کا ہے۔ اس کے برابر میں ناکام شاعر کا اور اس کے بعد تمہارے سابقہ منگیتر کا۔ کہیں بھی تشریف لے جاؤ ورنہ اپنے کمرے میں جاؤ اور دروازے کو تالا لگا کر چابی تالاب میں پھینک دو!" وہ غصے سے کہتا پلٹ گیا تھا۔ وہ ثابت کرنے جا رہا تھا کہ سعاد کی طرف سے بھی یہی معاملہ تھا مگر وہ الٹا اس کا دماغ خراب کر گئی تھی۔۔ ہاں وہی۔۔ جواب معصومیت سے اس کی پشت دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، "یہ تو بتاتے جائیں میری پرفامنس کیسی تھی؟" اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر تھمب اپ کا اشارہ کیا۔ وہ کھل کر مسکرا دی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے اس کے جاتے ہی اپنے

کندھوں پر ہاتھ مارتے ہوئے خود کو شاباشی دی تھی۔ اور پھر کچھ لمحات بعد وہ غصے سے لال چہرہ لیے جندل کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ کھانے کی ٹرالی گھسیٹتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرالی ایک طرف کھڑی کر کے سوپ کا پیالہ اٹھایا اور پھر جیسے ہی بیڈ پر لیٹے وجود کی طرف متوجہ ہوئی تو پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا۔ سوپ فرش پر بہہ گیا۔ پیالہ چکنا چور ہو گیا۔ ایلسا۔۔۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور سر ایک طرف کو ڈھلک چکا تھا۔ اس کے حلق سے زوردار چیخ برآمد ہوئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی تیزی سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔ زینے اتر تا مارک اسے بدحواسی کے عالم میں ایلسا کے کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جس کا وجود تھر تھرا رہا تھا۔
”وہ ایلسا۔۔ مر گئی ہے۔“ اس کا دماغ بھک سے اڑا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف بھاگا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے فوراً سے ایلسا کی نبض چیک کی۔ وہ مر چکی تھی۔۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔۔ وہ کئی پل بے حس و حرکت کھڑا رہا تھا۔

”سر۔۔ رات تک یہ بالکل ٹھیک تھیں۔ میں نے خود دیکھا تھا۔“ ملازمہ کی کانپتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ پتھرائی نگاہوں سے اپنی ماں کے مردہ وجود کو دیکھتا پلٹا تھا۔ نگاہیں دروازے پر کھڑے مائک پر ٹکیں جو اپنی جگہ جم چکا تھا۔ اس کے زخم مندمل ہو چکے تھے مگر اس وقت وہ پھر زخمی ہو چکا تھا۔ اس بار زخم گہرا تھا۔۔

”آپ نے مار دیا۔۔۔ آپ نے میری ماں کو بھی مار دیا۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”میں نے نہیں مارا!“ اس کی آواز سخت ہوئی۔ مائک نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”آپ نے میرا پورا خاندان تباہ کر دیا!!“ وہ بے قابو ہو کر چلایا تھا۔

”بکواس بند کرو مائک! میں نے جو کچھ کیا اس خاندان کی عزت بچانے کے لیے کیا۔“ وہ بمشکل خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔

”کونسا خاندان ہاں؟ اس خاندان کی عزت بچانے کے لیے آپ نے اس خاندان کو چھوڑا ہی کہاں ہے؟ پہلے چچا پھر بابا اور اب ماں۔۔ آپ اور کتنا گریں گے؟ یہ ناکارہ وجود آپ کے کونسے راش فاش کر سکتا تھا جو اس سے رہی سہی زندگی بھی لے لی۔ یہ ماں تھی ہماری!! وہی ماں جس نے آپ جیسے سانپ کو جنم دیا تھا!!“ اس کے دھاڑنے پر مارک نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑا تھا۔

”اپنی بکواس بند رکھو مائک!“ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔

”ماں کے بعد اب مجھے بھی ماریں گے؟ میں حیران ہوں اب تک مجھے کیسے بخش دیا ہے آپ نے؟ مجھے بھی مار دیں اور قصہ ہی ختم کریں۔ جس دولت کی خاطر آپ میرا سب کچھ تباہ کر چکے ہیں، میرے ماں باپ کی جان لے چکے ہیں اس میں آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہوں۔ باوجود اس کے مجھے کیوں زندہ چھوڑا ہوا ہے اب تک؟ ختم کر دیں میری کہانی بھی کیونکہ آپ کے ساتھ گزارے جانے والا ہر لمحہ مجھے خود سے نفرت پر مجبور کرتا ہے!“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ مارک نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ مارک قہر بھری نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اور وہ۔۔ آنسو بہاتا دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتا چلا گیا۔

☆☆☆

”میں بکری ہوں جسے کسی کے ساتھ بھی باندھ دو گے؟ یا میں کھلونا ہوں جسے کسی کو بھی تھما دو گے؟ ایک بات آج کلیئر کر لیتے ہیں کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ جب جس کے ساتھ دل کرتا ہے مجھے روانہ کرنے کا فیصلہ سنا دیتے ہو۔ میرا دل کر رہا ہے تمہیں رکھ کر ایک تھپڑ لگاؤں!“ وہ غصے سے لال بھبھوکا چہرہ لیے تیز تیز بول رہی تھی۔ جندل نے

صدمے سے اسے دیکھا تھا۔ وہ تو اپنی بہن کو سرپرائز دینے جا رہا تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔

"آپ زیاد کو پسند نہیں کرتیں؟!" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ اپنی بہن کو کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کبھی بھی نہیں!

"زہر لگتا ہے وہ مجھے۔" اس نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ مزید حیران ہوا تھا۔ "میں انسان ہوں جندل انسان! اسے مجھ سے محبت ہوئی تو اظہار کر دیا۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ آیا تو حالات بدل گئے۔ ہاں میں نے اس کے ساتھ برا کیا تھا مگر وہ تو محبت کرتا تھا ناں؟ معاف بھی تو کر سکتا تھا؟ واپس آ سکتا تھا ناں؟ وہ ہر بات سے باخبر تھا، اسے ہر لمحے سے آگاہی حاصل تھی۔ جب میری نسبت ضرار کے ساتھ طے ہوئی تب بھی وہ نہیں آیا۔ تب نہیں آیا تو اب کیوں آیا ہے؟ میں پہلے بھی کہتی تھی اب بھی کہہ رہی ہوں کہ میں کوئی شادی نہیں کرنے جا رہی۔ اپنے دوست سے کہو مجھ سے دور رہے۔ میں نہیں جانتی اسے دیکھ کر میں کیسے خود کو روک پاؤں گی۔ اگر میرا ہاتھ اٹھ گیا تو یہ نہ اس کے لیے اچھا ہو گا نہ میرے لیے!!" اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ چہرہ ٹماٹر کی طرح لال ہو چکا تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ جندل سُن کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند پل کچھ بول نہیں سکا تھا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا، میں اب بھی کہہ رہا ہوں۔ آپ کی چاہت میرے لیے سب سے اہم ہے۔ جیسا آپ چاہیں گی، ویسا ہی ہو گا۔" اس نے نرمی سے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ سعاد نے گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں میچی تھیں۔ وہ اس کا بھائی تھا، اسے سمجھ سکتا تھا۔ "لیکن۔۔ آپ ایک بار اس سے بات کر لیں۔ جانتا ہوں آپ غصے میں ہیں، اگر اس کا حال جان لیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟ آپ کے لیے بھی اور زیاد کے لیے بھی؟" اس نے گذارش کی تھی۔

سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"اسے دیکھ کر میں خود کو نہیں روک پاؤں گی۔ میرا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور میں۔۔۔" اس کی بات درمیان میں ہی

رہ گئی تھی کہ دروازے پر دستک ہو گئی۔ دونوں نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں خیام کھڑا تھا۔ اسٹک کا سہارا لے کر ہاتھ میں کاغذ تھامے آنکھیں سکیڑے دونوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا خیام۔ "تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" اس کے سوال پر جندل اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"خیر یہ نکاح نامہ بن گیا ہے۔ آجاؤ۔ ناکام شاعر کے دستخط لینے ہیں۔" سعاد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھا تھا جو اسے مکمل نظر انداز کیے جندل کی طرف متوجہ تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں مجھے کوئی نکاح نہیں کرنا!" وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ خیام نے دائیں ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ذرا سا اعتراض اور اگلی فلائٹ سے تمہیں پاکستان بھیج دوں گا!" اسے دھمکایا گیا تھا۔ وہ دانت کچکچاتی اپنے استاد کو دیکھ کر رہ گئی۔

"آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔" منہ بسور کر کہا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ دیکھو تمہارے سامنے نکاح نامہ پھاڑ رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا اور ساتھ ہی اسٹیک چھوڑ دی، پھر دونوں ہاتھوں سے کاغذ تھام کر اس کی نگاہوں کے سامنے کیے۔ سعاد نے حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ انہیں پھاڑنے لگا تھا کہ وہ چلا اٹھی تھی۔ "نہیں کریں!!" اس نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔ جندل چہرہ موڑ کر ہنس دیا۔

"تمہیں تو نکاح نہیں کرنا تھا؟" وہ جواباً خاموش رہی تھی۔ خفا خفا سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تم آرہے ہو؟" سوالیہ نظروں سے جندل کو دیکھا گیا۔

"جاؤں آپی؟" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ سعاد کو وہ اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہوا تھا۔

"دیکھ لوں گی میں تمہیں اور تمہیں تمہارے نام نہاد دوست کو بھی!!" اس کے دانت کچکچا کر کہنے پر وہ بمشکل اپنی

ہنسی روکتا آگے بڑھ گیا۔ کمرے سے نکل کر اس نے مسکراتے ہوئے خیام کو دیکھا۔

"آپی کے ساتھ سختی مت کیا کرو۔"

"بھائی نہیں ہوں اس کا جو نخرے اٹھاؤں گا۔ استاد ہوں استاد! اسے سیدھا کرنا آتا ہے مجھے۔" سر جھٹک کر کہا گیا تھا۔

جندل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ ان استاد اور شاگردہ سے پریشان ہو چکا تھا۔ دونوں بہت عجیب تھے۔۔ بہت زیادہ۔۔ سمجھ میں نہ آنے والے۔ عجیب وغریب!!

☆☆☆

بس کچھ لمحات اور پھر اس نے خود کو ان کاغذات پر جھک کر اپنے دستخط کرتے ہوئے پایا تھا۔ وہ خود کو ہر طرح کے احساس سے خالی محسوس کر رہی تھی۔ نہ ہاتھ کانپ رہے تھے، نہ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی، نہ دھڑکنوں کی رفتار غیر معمولی تھی۔ اس کے لیے وہ کاغذ معمولی سا کاغذ تھا۔ ہاں وہ معمولی کاغذ جو اسے نئی زندگی کا پیام دے رہا تھا جہاں اس کے ساتھ ایک اور انسان، ایک اور وجود جڑنے والا تھا۔ ہاں کوئی اس کے اپنوں، دل کے بہت قریبی لوگوں میں شامل ہونے جا رہا تھا۔ وہ جیسے وہ اس ایک دستخط سے اپنے تمام حقوق سونپ گئی تھی۔ اس سب کے باوجود۔۔ جانے کیوں اسے سب معمولی سا لگ رہا تھا۔ ہر طرح کے احساسات وجذبات سے عاری۔۔ خالی اور ادھورا۔ جندل نے اسے مبارکباد تھی۔ وہ بس سر ہلا گئی تھی۔

اس نے خود کو اسی کمرے میں پایا تھا جہاں اس کی تفتیش ہوئی تھی۔ کیا کبھی کسی مشرقی لڑکی کا نکاح ایسے بھی ہوا ہوگا؟ ایک تفتیشی کمرے میں۔۔ میز پر رکھے وہ کاغذات جن پر دستخط لینے کے لیے بس اس کا بھائی کھڑا تھا۔ نہ ماں باپ تھے نہ کوئی بہن، کوئی سہیلی یا رشتے دار نہیں تھے۔ نہ اس کے سر پر لال دوپٹہ ڈالا گیا تھا نہ ہاتھوں پر مہندی کا رنگ سجایا گیا تھا۔ وہ تو معمول کے مطابق گاؤن میں ملبوس حجاب اوڑھے بیٹھی تھی۔ نکاح کے بعد اسے

مبارکباد دینے والا بس اس کا بھائی تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے نہیں لگایا تھا، کسی نے اس کے سر پر بوسہ نہیں دیا تھا۔ اس سب کے بعد بھی کیا۔۔ اس کی آنکھوں کو نم ہونا چاہیے تھا؟ دلہن تو گھر سے رخصت پر ہونے روتی ہے ناں؟ اور اس کا کیا جس کا کوئی گھر ہی نہیں تھا؟ دستخط کرتے ہوئے مشرقی دلہنوں کے ہاتھ کانپتے ہیں کیونکہ وہ اپنے گھر والوں سے جدا ہو رہی تھیں۔۔ اور اس کا کیا جس کے گھر والے ہی نہیں تھے؟ ان کی دھڑکنوں کی رفتار غیر معمولی ہوتی ہے کیونکہ وہ سرخ جوڑا، مہندی میں رنگے ہاتھ، وہ روشنیاں اور نکاح کا خوبصورت احساس۔۔ یہ سب ان کی دھڑکنوں کو منتشر کرتا ہے اور وہ۔۔ وہ تو اس سب سے یکسر مختلف تھی۔ کیا اب بھی اس کی دھڑکنوں کا معمول کے مطابق ہونا تعجب انگیز تھا؟

اور پھر اس سب کے بعد۔۔ نئ آنے والی زندگی کے احساس سے ان کے گالوں پر آتی وہ سرخی جو ہر دیکھنے والی آنکھ کو بھاتی ہے۔ حیا کا پیکر بنیں وہ ہر دل میں اتر رہی ہوتی ہیں۔ اس کی آنے والی زندگی کیسی تھی؟ جب ہر پل ہر لمحہ وہ اپنے شوہر کی حفاظت کی دعائیں کرے گی؟ جب اس کی کئی راتیں اس کی واپسی کی راہ تکتے ہوئے کٹیں گی؟ جب اسے اس کی ضرورت ہو گی مگر وہ میسر نہ ہو گا کیونکہ وہ تو محاذوں پر لڑنے گیا ہو گا؟ جب وہ۔۔ وہ راتوں کو خواب میں ڈر کر اٹھے گی اور کوئی اسے تسلی دینے والا نہیں ہو گا؟ یہ کیسا ملن تھا، جہاں بس جدائی ہی مقدر تھی۔ اس کے گالوں پر سرخی نہیں پھیل رہی تھی، وہ شرم و حیا کا پیکر نہیں بنی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ۔۔ وہ سعاد یوسف زئی۔۔ وہ ایک عام لڑکی نہیں تھی۔ اور اسی عام و خاص کے چکر میں وہ ایک عام مشرقی دلہن بھی نہیں تھی۔ اس کے شوہر کو محاذوں پر دلیری سے لڑنا تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے بہت سوں کی سکون بھری نیند کے لیے راتوں کو پہرا دینا تھا، وہ اپنی بیوی کے خواب میں ڈر کر اٹھنے پر اسے تسلی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا شوہر۔۔ وہ

عام نہیں تھا اسی لیے اسے بھی عام نہیں ہونا چاہیے۔

وہ سعادیوسف زئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ راتوں کو پہرا دے سکتی تھی، وہ اس کے ساتھ ہر محاذ پر لڑ سکتی تھی۔ شانہ بشانہ برابر برابر! وہ دونوں آرام دہ اور پر سکون سی جگہوں پر نہیں جنگ کے میدان میں ایک دوسرے کے ساتھ پر خوش ہو سکتے تھے۔ ہاں وہ ہر وہ کام کر سکتی تھی جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ۔۔

اس کا شوہر، وہ فرزندِ اسلام تھا اور اسے دخترِ اسلام کے روپ میں اس کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا تھا۔۔ برابر برابر!

☆☆☆

"ہر مذہب کہتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ ہر انسان کہتا ہے اس کا مذہب سچا ہے۔ لوگ ہزاروں دلائل دیتے ہیں، ہزاروں تاویلیں پیش کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہی سچے ہیں اور انہی کا مذہب سچا ہے۔ ہر انسان کا دل اپنے مذہب کی طرف جھکتا ہے۔ عیسائی ہندومت کو اپنا لیتے ہیں، ہندو اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں، ملحد یہودیت کی طرف جاتے ہیں۔۔۔ کیا وجہ صرف یہی ہے کہ ان کا دل فلاں فلاں مذہب کی طرف جھکتا ہے؟ اگر بات دل ہی کی ہے تو پوری دنیا ایک مذہب کی پیروکار کیوں نہیں بن جاتی؟ اور اگر نہیں تو کیا واقعی دل جس کی طرف جھکتا ہے وہی مذہب سچا ہے؟"!

اس نے ٹھہر کر اپنے لکھے الفاظ کو دیکھا اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔ راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے وہ سر کرسی پر ٹکائے نگاہیں لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر مرکوز کیے ہوئے تھی۔ بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ سرمئی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، بھورے رنگ کی شال اپنے کندھوں پر ڈالے وہ ہمیشہ کی طرح خود سے لاپروا تھی۔ میک اپ سے عاری چہرہ جس کی وجہ سے گال پر چوٹ کا نشان واضع نظر آرہا تھا۔ وہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ اسے خیام، جندل اور زیاد حتیٰ کہ بدر کی طرف سے بھی کوئی جواب موصول نہیں

ہو رہا تھا۔ کوئی اپنے گھر نہیں تھا، نہ آفس نہ اسپتال۔۔ اچانک سے جیسے انہیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ ابراہم اسٹیون کے گھر تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی طبیعت کا بہانہ کر کے ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ اسے اب اُس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔

اسکرین پر آہستہ آہستہ پیغام موصول ہو رہے تھے۔ جوزف، کم من ہو، ایڈ تھ۔۔ سب اپنے اپنے نظریات پیش کر رہے تھے مگر اسے کسی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کونسل میں اس کی تمام تر دلچسپی کا مرکز "خضر نعمانی" تھا۔ وہ شخص جو سب کو بولنے دیتا تھا کیونکہ جب وہ بولنے پر آتا تھا تو سب خاموش ہو جاتے تھے۔ تمام تاویلیں تمام صفائیاں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی تھیں۔ ہاں اس وقت بھی اسے اسی کا انتظار تھا۔

اس کی نگاہیں ہنوز اسکرین پر ٹکی تھیں لیکن ذہن اب دوسری طرف جانے لگا تھا۔ خیام سے اس کی پہلی ملاقات۔۔۔ وہ شخص بہت عجیب تھا۔ زیاد نے کہا تھا "وہ میرا سب سے بڑا دشمن ہے، اس سے دور رہو!" مگر وہ چاہ کر بھی اس سے دور نہیں رہ پائی تھی۔ ڈیوڈ کا قتل اور پھر اس کے کہنے پر ابراہم کے خلاف جا کر کیس کی تفتیش کرنا۔۔ اگر وہ واقعی برا انسان تھا تو وہ یہ سب کیوں کر رہا تھا؟!

اس کے بعد جندل، وہ پہلی بار یونیورسٹی میں ملے تھے۔ وہ پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ دھیما مزاج رکھتا تھا، چہرے پر نرمی ہوتی تھی۔ اس دن اسپتال میں سفید کوٹ پہنے اور ناک پر چشمہ ٹکائے اسے "بیلا" کہتے ہوئے وہ واقعی پیارا لگا تھا۔ اس کے متعلق کچھ بھی مشکوک نہیں تھا۔ وہ سمجھنے میں بہت آسان تھا۔ شاید تبھی وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔۔ جندل یوسف زئی۔۔!

زیاد۔۔ خیام سے اس کے جھگڑے کو ایک طرف رکھ کر اگر دیکھا جائے تو وہ اس کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اس سے متعلق ہر بات اس کے سامنے تھی۔ وہ اس کا کزن تھا، بڑے بھائیوں کی طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ایک

اچھا دوست تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے بدر۔۔ بدر۔۔ وہ بہت معصوم ہے۔ اس کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں اس کا معصومیت سے بھرپور چہرہ گھوم جاتا تھا۔ وہ اسے عزیز تھا۔۔ بہت زیادہ!

اسکرین پر وہ پیغام نمودار ہوا جس کی وہ منتظر تھی۔ وہ فوراً تمام خیالوں کو جھٹکتی سیدھی ہوئی۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری۔

"کائنات کی بات کرتے ہوئے ایک لفظ ہمارے ذہن میں آتا ہے "فطرت"۔ جب ہم کسی قانون، کسی تھیوری کی بات کرتے ہیں تو وہ ان حالات میں ہمارے لیے قابلِ قبول ہوتی ہے جب وہ فطرت کے قوانین پر پوری اترے۔ مذہب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ مذہب وہی سچا ہے جو فطرت کے مطابق ہو۔ اگر یہ بات سمجھ لی جائے تو ہر حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ میں یہاں ایک مسلمان کے طور پر اسلام کی طرفداری نہیں کروں گا بس ایک چھوٹی سی بات سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

جب ہم کائنات کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک خاص طریقے سے خاص اصولوں کے مطابق اپنا کام کر رہی ہے۔ دن کے بعد رات آتی ہے، رات کے بعد دن۔ راتیں اگر لمبی ہو رہی ہیں تو دن چھوٹے ہو رہے ہیں اور دن لمبے ہو رہے ہیں تو راتیں چھوٹی۔ یہ ممکن نہیں کہ بیک وقت دن بھی بڑا ہو اور رات بھی بڑی ہو۔ اس طرح کی کئی چھوٹی چھوٹی اور قابلِ غور مثالیں ہیں۔ یہ سب گواہی دیتی ہیں کہ ان سب کو ایک خاص نظام کے تحت چلانے والا ایک خدا ہے۔ یاد رہے ایک! نہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے نہ ہی مشرق میں غروب ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا ایک ہے۔ اگر دو ہوتے تو عین ممکن تھا کہ کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ یہ بات سمجھنے میں بہت آسان سی ہے۔

جس طرح ایک سلطنت کے دو سلطان نہیں ہو سکتے، جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں ہو سکتیں ویسے ہی ایک کائنات کے دو خدا نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک تخت پر دو بادشاہ ہوں تو قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں

نیام کو کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ ایک کائنات کے دو خدا پوری کائنات تباہ کر سکتے ہیں!!

یعنی کائنات کے اس منظم نظام سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پوری کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ اور ایک خدا کی تعلیم ہمیں اسلام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسلام کو فطری مذہب کہا جاتا ہے۔ اسلام فطرت کے قوانین پر پورا اترتا ہے۔ اسلام خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کا کہتا ہے۔ خدا کے بعد اگر دیکھیں تو کئی چھوٹی بڑی مثالیں یہ بات ثابت کرتی ہیں۔

فطرت کا قانون ہے کہ شادیاں مخالف جنسوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ ہم جنس پرستی فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ مغرب میں ہم جنس پرستی بہت عام ہو گئی ہے۔ فطرت کے قانون کے خلاف جانے کی وجہ سے ان میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مغربی معاشرہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے یہ معاشرہ قابل رحم ہو چکا ہے۔ خاندانی نظام کا وجود ہی ناپید ہو چکا ہے۔ اولاد کو نہیں معلوم ان کے والدین کون ہیں اور والدین کو اپنی اولاد کی خبر نہیں! اپنے گناہوں کے ثبوت مٹانے کے لیے بچوں کا قتل بہت عام سی بات ہو گئی ہے۔ اپنی جنس بدلنا، شراب نوشی، گندے اور اخلاق سے سے گرے ہوئے کام کرنا۔۔۔ یہ سب فطرت کے قوانین کے خلاف ہیں اور اسلام اس سب سے روکتا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم حقیقت نہیں دیکھ سکتے تو ہماری حالت قابلِ رحم ہے!

ایک معمولی سا آدمی بھی یہ سب چیزیں دیکھ سکتا ہے۔ جو لوگ فطرت کے قوانین کے خلاف جاتے ہیں فطرت خود انہیں سزا دیتی ہے۔ فطرت کے قوانین کے خلاف جانے والی قومیں شدید اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوتی ہیں۔ اور یہ اخلاقی گراوٹ ان قوموں کو پستی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہود جب اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوئے تو عیسائی ان پر مسلط کر دیے گئے۔ یہودیوں کا بے شمار خون عیسائیوں کے ہاتھوں پر ہے۔ عیسائیوں کے عروج کے دور میں یہود کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ اور پھر یہی عیسائی جب اخلاقی

گراوٹ کا شکار ہوئے تو مسلمان ان پر مسلط کر دیے گئے۔ تب یہود اور عیسائی دونوں مسلمانوں کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوئے۔ اور پھر یہی نہیں۔۔ جب مسلمان بھی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوئے تو یہی قومیں مسلمانوں پر مسلط کر دی گئیں۔ مسلمان پستی اور پستی کی طرف گرتے رہے۔ ان دونوں کے عروج کے ساتھ ہی مسلمانوں کی مثال بھیڑ بکریوں کی طرح ہو گئی۔ شدید قتل و غارت ہوئی جو آج بھی جاری ہے۔۔ عراق، شام، کشمیر، فلسطین ہر جگہ مسلمان شدید ظلم کا شکار ہیں اور وجہ سب کے سامنے ہے۔ فطرت کی سزائیں سخت ہوتی ہیں، جو قومیں وقت پر جہالت کی گہری نیند سے نہیں جاگتیں، وہ منہ کے بل گرتی ہیں۔

المختصر۔۔ مذہب وہی سچا ہے جو فطری ہو، فطرت کے قوانین کے مطابق ہو۔ اور اسلام بلاشبہ ایک فطری مذہب ہے۔ جو ایک خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کا کہتا ہے۔ جو برائی اور اچھائی میں فرق بتاتا ہے۔ ایک عام سے عام مسلمان کو بھی خبر ہے کہ ہم جنس پرستی، شراب نوشی، اپنے گناہوں کو چھپانے کے لیے بچوں کا قتل، زنا، جنس کا بدلنا اور اس طرح کے ہزاروں کام جو اخلاقی گراوٹ کے ثبوت ہوتے ہیں، نہایت ہی حد سے گرے ہوئے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ان کی سزائیں سخت سے سخت ہیں۔ اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی جس پر یقین ان کے ایمان کا حصہ ہے"!

وہ محویت کے عالم میں ان الفاظ کو تکتی رہی تھی۔ اسے کتنا آسان حل بتا دیا گیا تھا۔ ہاں اسے وہ وجہ مل گئی تھی جس کی بنا پر وہ اسلام کو پڑھ سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں کی وجہ سے آج تک اسلام سے ہچکچاتی آئی تھی مگر اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ۔۔ اسلام وہ نہیں تھا جو اسے دکھایا گیا تھا۔ اسلام وہ تھا جس پر اس نے ان سب کو عمل کرتے دیکھا تھا۔

زیاد کو۔۔ جب وہ اسے ہر مذہب کو پڑھنے کا موقع دیتا تھا۔۔ جندل کو۔۔ جس کی نگاہوں میں اس کے لیے احترام

ہی احترام ہوتا تھا۔۔خیام اور بدر کو۔۔جب اس نے ان دونوں کو بہت سکون سے آفس میں نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ ہاں۔۔اسلام یہ تھا۔پرکشش اور خوبصورت۔۔صرف یہ چند مناظر، چند ادائیں ہی اسے بہت بھائی تھیں۔جب وہ اسلام کو مکمل پڑھنے لگے گی تب کیا ہو گا؟! اس نے جھرجھری لی تھی۔اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی۔ مثبت جواب ملنے پر ملازمہ اندر آئی۔

"آپ کے مہمان آئے ہیں۔" اسے اطلاع دی گئی۔اس نے سر کو جنبش دی پھر اپنی شانے سے ڈھلک چکی شال کو واپس شانے پر ٹکاتی باہر آ گئی۔زینے اتر کر جب وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو مائیک کو اپنا منتظر پایا۔اسے دیکھ کر۔۔وہ کھڑا نہیں ہوا تھا!

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" لہجے میں سختی تھی۔

"تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"کہو۔۔سن رہی ہوں۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔مائیک نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔"تم میرے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آ رہی ہو ازابیلا"!

"قاتل ہو تم!!" اس کے لہجے میں اپنے لیے بے پناہ نفرت محسوس کر کے وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

"تو میرا راز بھی عوام کو کیوں نہیں تھما دیا؟ مجھے کیوں بچا رہی ہو؟"

"میرے پاس ٹھوس ثبوت نہیں تھے۔فکر مت کرو۔۔تمہارے باپ کے بعد تمہاری باری ہے"!

"اور میرے بعد؟" اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔"کیا بھائی کا نمبر نہیں آئے گا؟"

"وہ تم جیسا نہیں ہے۔" اس نے ماتھے پر تیوری چڑھائے کہا تھا۔

"اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

”وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔“ اسے اپنی دلیل بہت کمزور سی لگی۔ مائک سر جھٹک کر ہنس دیا۔ ”بھائی پر اندھا اعتبار مت کرو ازابیلا! تم کچھ نہیں جانتیں۔“

”تو بتاؤ مجھے وہ جو تم جانتے ہو۔“

”بھائی نے ایملی کو مارا ہے۔“ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر ہنس دی۔

”اب تم اپنا بہایا خون اپنے بھائی کے سر پر۔۔“

”میں نے اسے نہیں مارا!“ وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ گیا۔ ”تمہیں کیوں لگتا ہے میں ایملی کو ماروں گا؟ بھائی کے پاس اسے مارنے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ وہ درندہ ہے درندہ۔ میرے باپ کے بعد میری ماں کو بھی اسی نے مارا ہے۔“ وہ نفرت سے غرایا تھا۔ وہ پلک جھپکتی اسے دیکھتی رہی۔ وہ اپنی ماں کی موت کے صدمے میں تھا۔ یقیناً یہی ہوا تھا۔

”تمہاری ماں کے لیے مجھے افسوس ہے مائک! تم صدمے میں ہو میں سمجھ سکتی ہوں۔“ اسے ایک لمحے کے لیے اس سے ہمدردی ہوئی تھی۔

”میں صدمے میں نہیں ہوں ازابیلا! مجھے نادان، کم عقل اور بیوقوف سمجھنا بند کر دو۔ میں کیوں اپنی ماں کی موت کا غم کروں گا جبکہ مجھے خوش ہونا چاہیے کہ وہ اس جہنم سے نجات حاصل کر چکی ہے؟ مجھے رونا اپنی قسمت پر چاہیے۔ مائک جو زندہ ہے، جس کے لیے اس جہنم سے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔“ اس نے اپنے سر کو ہاتھوں میں گرایا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ وہ گہری سانسیں لیتا خود کو قابو میں کرنے لگا۔ ”ازابیلا۔۔ مجھے تم سے۔۔ ہمدردی ہے۔ وہ درندہ۔۔ اس سے دور رہو۔ تم واحد ہو جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔۔ وہ انسان کہلانے کے لائق نہیں ہے۔“ وہ اپنی جگہ ساکت ہوئی تھی۔ سانس روکے مائک کو دیکھے گئی۔ اس کا یہ نفرت بھرا

لہجہ۔۔ کوئی اپنے ہی بھائی سے اس قدر نفرت کیسے کر سکتا ہے؟

"میں تمہارا مقروض تھا۔ میں نے اپنا قرض اتار دیا۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسا قرض۔۔۔ مائیک؟" اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔

"اس رات۔۔۔ تمہیں مارنے کی کوشش کرنے والا میں تھا!" اس نے بہت آرام سے کہا تھا۔ ازابیلا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ "میں تمہیں نہیں مار سکا۔ کوئی ہے جو تمہاری حفاظت کر رہا ہے۔"

"میں ہی کیوں؟" اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

"کیونکہ۔۔۔ تم سے وہ شخص محبت کرتا ہے جس سے مجھے بے حد نفرت ہے!" سنجیدگی سے کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ یونہی ساکت بیٹھی رہی۔ کوئی مجسمہ ہو جیسے۔۔۔

☆☆☆

وہ آنکھیں موندے بستر پر سیدھا لیٹا تھا۔ وہ ان دو دنوں میں کافی بدل چکا تھا۔ چہرہ پیلا پڑ رہا تھا، اور جسم سے کمزوری جھلک رہی تھی۔ اسے ہر لمحہ اپنا آپ پہلے سے زیادہ کمزور ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ شدید تکلیف سے اسے اپنی رگیں کھچتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی مگر وہ ہمیشہ ضبط کر جایا کرتا تھا۔ اسے یہ کرنا تھا، بس

کچھ وقت کے لیے اسے یہ ضرور کرنا چاہیے تھا!!

کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا تھا۔ آنے والا عین اس کے بستر کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ آنے والا۔۔۔ہاں وہ وہی تھی۔ وہ جو اس کے لیے محترم تھی۔ اس کے لب خفیف سی مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ”آپ ایک اچھی ہیکر ہو سکتی ہیں مگر ایک اچھی جاسوسہ نہیں!“ بولتے ہوئے اسے شدید تکلیف کا سامنا تھا۔ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر وہ یہ سب برداشت کیوں کر رہا تھا؟! اگر احترام ہی اتنی بڑی قربانی مانگتا ہے تو پھر محبت؟ وہ تو جان لے لیتی ہو گی۔۔!

”کیسے ہو؟“

”نکاح مبارک ہو۔“ اس کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ آواز دھیمی اور لہجہ نرم تھا۔

”میں نے پوچھا کیسے ہو؟“ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔۔ دیکھیں۔“ معصومیت سے پلکیں جھپکائی گئیں۔ وہ بے اختیار نظروں کا رخ بدل گئی تھی۔

”ضرار۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔ میرے الفاظ تمہارے درد کو ختم نہیں سکتے۔ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ تم یہ ڈزرو نہیں کرتے تھے۔ اگر میں۔۔۔ اگر میں ٹریگر دبا دیتی تو تم کبھی اس حال میں نہ پہنچتے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

”جو کام آپ کے بس میں نہیں تھا، اس کے لیے خود کو ذمہ دار مت ٹھہرائیں۔ میں آپ کے لیے خوش ہوں، میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں نے امانت اس کے حق دار تک پہنچا دی۔ شکریہ نہیں کہیں گی؟“ اس کا یہ انداز جانے کیوں اسے ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا، وہ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

”ایسے مت کہو۔ تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔“ اس نے ماتھے پر بل ڈالے بے چینی سے کہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ سر تکیے پر گرا کر اس نے پہلو میں کھڑی سعاد کو دیکھا۔

”اگر آپ کبھی پاکستان جائیں تو۔۔ حرم آپی۔۔۔ زیادہ نہیں لیکن تھوڑا سا ان کا خیال رکھیے گا۔ جب تک میں ٹھیک ہو جاؤں۔“ اس نے چونک کر ضرار کو دیکھا تھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ۔۔ ضرار ولید ٹھیک نہیں تھا!!

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اس کی آنکھوں میں خوف ابھرا تھا۔

”سعاد میں۔۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر کھانسنے لگا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے تھے۔ سعاد نے تیزی سے مڑ کر میز کی طرف دیکھا۔ جلدی سے آگے بڑھ کر وہاں رکھی فائلز کو جھپٹا۔ میز پر رکھا گلاس اس کا ہاتھ لگنے سے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ وہ فائل کے اوراق تیزی سے پلٹتی ہراساں نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ اور پھر وہ بری طرح چونکی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ لیکن اس رات اس نے خود دیکھا تھا کہ اسے چار گولیاں لگی تھیں۔ وہ سنائپر۔۔ اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔

بارش کا پانی رفتہ رفتہ گہرے سرخ رنگ میں بدل رہا تھا۔ اسے اپنے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ آنکھوں کو کھول کر بارش میں سامنے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے مائک کا نشانہ لے کر ٹریگر دبانا چاہا تھا کہ فائر کی آواز گونجی۔ اسے اپنی گردن کے پچھلے حصے میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ گردن پر رکھا۔ وہ ایک پتلی سی سوئی تھی۔ اس نے ضبط کے مارے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچتے ہوئے اس سوئی کو نکالا تھا۔ خون کے ننھے قطرے اس کی گردن پر چمکنے لگے تھے۔ اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس نے اپنا بازو اٹھانا چاہا مگر اس کا پورا وجود سُن ہو چکا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے

بمشکل دیکھا تھا کہ بارش میں بھیگتی سعاد۔۔ بے یقینی وخوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مائک نے ٹریگر دبایا تھا، گولی اس کی طرف بڑھی تھی اور وہ مزید اپنے قدم زمین پر نہیں جما پایا۔ وہ پورے قد کے ساتھ گرا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے جو آخری منظر اس نے دیکھا تھا وہ اپنے اوپر گرجتے بادلوں کے برسنے کا تھا اور جس آخری احساس کو وہ محسوس کر پایا تھا وہ گردن پر خون سے بنتی اس پتلی سی لکیر کے بننے سے درد کی اٹھتی ٹیسوں کا تھا۔

اس رات جب تڑاتڑ برستی بارش نے ہر منظر کو دھندلا کر دیا تھا تب وہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس نے جو منظر دیکھا تھا حقیقیت میں سب کچھ ویسے ہی واقع ہوا تھا؟ اس نے دیکھا تھا اسے چار گولیاں لگی تھیں مگر اسے تین گولیاں لگی تھی۔۔ وہ سنائپر۔۔ اس نے ضرار کو گولی نہیں ماری تھی۔۔۔!

اس نے جلدی سے میز پر رکھی چھوٹی سی قینچی اٹھائی اور تیزی سے پلٹ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے اس قینچی سے اس کی ہتھیلی پر کٹ لگایا تھا۔ وہ درد سے کراہا تھا۔ سعاد کی نگاہیں قینچی پر چمکتے سیاہی مائل سرخ خون پر ٹکیں۔ اس نے ٹھٹھک کر اس کی ہتھیلی پر نمودار ہوتے گاڑھے خون کے قطروں کو دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوتے خیام، جندل اور زیاد ٹھہر گئے تھے۔ "تمہیں زہر دیا گیا ہے۔" وہ بے یقینی سے اس کے سیاہ پڑتے خون کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ ضرار نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں۔ جندل نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی ہتھیلی تھام کر اس پر جمع ہوتے خون کو دیکھا۔ خیام اور زیاد فوراً باہر کی طرف بھاگے تھے۔ جبکہ وہ۔۔۔ ساکت کھڑی خون کے رنگ کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہی مائل سرخ گاڑھا خون۔۔ جو اس کی سفید ہتھیلی پر چمک رہا تھا۔ اور اس قینچی پر۔۔ جس سے اس نے ضرار کی ہتھیلی پر کٹ لگایا تھا۔

اس کے دل نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ اور وہ ٹھیک نہیں تھا!

☆☆☆

"جب آپ جانتے تھے اس بارے میں تو کیوں نہیں بتایا کسی کو؟ اس کی جان کس حد تک خطرے میں ڈال چکے ہیں، کچھ اندازہ ہے آپ کو؟" وہ میز پر ہاتھ مارتا زور سے دھاڑا تھا۔ آنکھیں غصے کے مارے سرخ پڑنی لگی تھیں۔

"اس نے منع کیا تھا۔ اسے لگا تھا اگر تم لوگ اس بارے میں جان لوگے تو۔۔ تمہارا نکاح نہیں ہو گا۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"میرا نکاح اس کی جان سے زیادہ اہم تھا؟! بھاڑ میں جائے سب، کچھ بھی کریں اور اس کا علاج کریں!" آواز میں سختی تھی۔ ڈاکٹر گہری سانس لیتا کرسی پر بیٹھا تھا۔

"زہر خون میں شامل ہو چکا ہے۔ ہمیں ضرار کو اسپتال میں داخل کرنا ہو گا۔"

"تو انتظار کیوں کر رہے ہیں؟" اس بار بولنے والا خیام تھا۔

"یہاں کے کسی بھی اسپتال میں اسے داخل کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہمیں ضرار کو یہاں سے نکالنا ہو گا۔"

"ضرار کو پاکستان لے جایا جائے گا!" اندر داخل ہوتے کمانڈر سلیمان کی آواز پر وہ سب سیدھے کھڑے ہوئے۔

"یہاں سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیلی کاپٹر اترے گا۔ ضرار کے جانے کا انتظام ہو چکا ہے۔"

"کمانڈر۔۔ ہمیں اجازت دیں۔ ہم اسے خود یہاں سے لے جاتے ہیں۔" زیاد بول اٹھا تھا۔

"نہیں۔۔ تم لوگ اپنی تیاری کرو۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر سب کام پر لگ جاؤ!" تینوں نے بے بس نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ایک طرف جان سے عزیز دوست تھا اور دوسری طرف ان کا کام۔۔۔ وہ مقصد جس کے لیے تنظیم ایک عرصے سے کام کر رہی ہے۔ وہ اسے فراموش نہیں کر سکتے تھے مگر اپنے دوست کی حالت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

"ہمیں اجازت دیں۔۔ ہم ضرار سے ملنا چاہتے ہیں۔" جندل کے کہنے پر کمانڈر نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ وہ

تینوں تیزی سے باہر کی طرف بڑھے تھے۔ راہداری سے گزر کو وہ باہر آئے تو اسے ایمبولینس کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ وہ تینوں ٹھہر سے گئے تھے۔ ضرار نے انہیں دیکھ کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا تھا۔

"ایسی شکلیں مت بناؤ۔ مجھے اچھے سے خدا حافظ کرو۔" وہ اسٹریچر پر لیٹے لیٹے بول رہا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ آگے بڑھے تھے۔

"خبر دار جو اپنے ساتھ کچھ الٹا سیدھا کیا تو!" کہنے والا زیاد تھا۔

"اگر ہمیں رلانے کا سوچا بھی تو منہ توڑ دوں گا تمہارا!" جندل کی آواز نم پڑی تھی۔

"ہمیں زیادہ انتظار کروانے کا سوچنا بھی مت!!" خیام کی جانب سے اسے گھوری سے نوازا گیا تھا۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا تھا۔

"میرے لیے پریشان مت ہونا۔ مجھے اپنا ہر وعدہ یاد ہے۔ ہمیں عرش کے سائے تلے جمع ہونا ہے، ہم رب کی بارگاہ میں ساتھ پیش ہونگے۔ میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔۔ تم تینوں کو چھوڑ کر جاؤں گا کہاں؟!" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔

انہوں نے دیکھا تھا۔۔ ایمبولینس کے دروازے بند ہوئے تھے۔ سائرن بجنے لگا تھا، دروازے کھول دیے گئے تھے۔ اور چند لمحات میں ہی وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ جا چکا تھا۔۔ وہ ضرار ولید۔۔ لوٹنے کا وعدہ کر کے جا چکا تھا!!

وہ تینوں بے حس و حرکت کھڑے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے جب بہت سے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ ان کی پستولیں، موبائل فونز اور تمام آلے انہیں تھمائے گئے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد۔۔۔ نیلے آسمان نے دل موہ لینے والا منظر دیکھا تھا۔

وہ چاروں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ایک قطار میں۔۔ گردنیں سیدھی کیے۔۔ نگاہیں سامنے ٹکائے!

"جو راہ ہم نے چنی ہے اس میں خدا کے سوا کوئی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ جب میدانِ جنگ میں تم اپنی پشت پر کسی طاقت کو کھڑا نہ پاؤ تو یاد رکھنا، تمہارے ساتھ وہ ہے جو سب سے زیادہ عظیم ہے۔ جب تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں تو اپنے ان دوستوں کو یاد کرنا جنہوں نے عالم اسلام کے لیے اپنا خون دیا ہے۔ حزب اللہ کا ہر مجاہد یاد رکھے کہ اس کے آنسو اسے کمزور اور سخت دل اسے وحشی جانور بنا سکتا ہے۔ اس کے جذبات اسے انسان اور جذبات کا اظہار اسے دنیا کے لیے آشنا بناتا ہے۔ یاد رکھو کہ جس کے لیے اللہ اجنبی ہوا اس نے اپنی بربادی کا سامان کیا اور جو اللہ کی خاطر دنیا کے لیے اجنبی ہوا وہ رب کی بارگاہ میں سرخرو ہوا۔ پس سلام ہو ان اجنبیوں پر"!!

"سلام ہو ان اجنبیوں پر!" بیک وقت با آواز بلند کہا گیا تھا۔ اس نیلے آبی آسمان نے پہاڑوں کے بعد یہ منظر آج یہاں دیکھا تھا۔ وہ منظر۔۔ جو دل موہ لینے والا تھا۔۔ سانس روکنے پر مجبور کر دینے والا۔۔

☆☆☆

وہ گھر سے نکل آئی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی سڑک کنارے کھڑی کر کے وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ پر سوچ نگاہیں سڑک پر ٹکائے وہ بہت سی الجھنوں کا شکار تھی۔ مائک بہت کچھ جانتا تھا مگر اپنے بھائی کی خاطر وہ اسے کچھ نہیں بتائے گا۔ اور وہ اس سے امید بھی کیسے کر سکتی تھی؟ وہ شخص۔۔۔ مائک۔۔۔ وہی تھا جس نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کسی محافظ کی بات بھی کی تھی۔ کیا خیام؟

اسے اپنے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ مارک سے متعلق جو بکواس وہ کر کے گیا تھا وہ اسے نظر انداز نہیں کر پا رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مائک کبھی اتنے اعتماد کے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کا لفظ لفظ سچا تھا، اس کا انداز اسے یہ قبول کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ کیا وہ بھی اسٹیون کی راہ پر چل رہا تھا؟

اگر وہ بھی تو کیسے ممکن ہے کہ مائک اس سب میں نہ پڑا ہو؟ اف۔۔۔ اس نے آنکھیں میچی تھیں۔ وہ مزید یہ سب ابراہم سے نہیں چھپا سکتی تھی۔ اسے اب سب کچھ انہیں بتا دینا چاہیے تھا۔ کیونکہ صرف وہی تھے جو اسے ان تمام مشکلات سے نکال سکتے تھے۔۔ لیکن۔۔ اسٹیون کے بعد مارک واحد تھا جس سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ وہ کیسے انہیں مائک کی کہی گئی باتیں بتا دیتی جبکہ وہ ابھی دوست کی طرف سے ملنے والے زخم کو بھول نہیں پائے تھے؟

وہ اسی طرح کھڑی تھی۔ کسی کے اپنی طرف اٹھتے قدم محسوس نہیں کر پائی۔ اس شخص نے اچانک سے دائیں طرف سے آکر اس کے منہ پر کلوروفارم لگا رومال رکھا تھا۔ وہ اس اچانک حملے پر سنبھل نہ پائی۔ اس شخص کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہی۔ اس نے چلانے کی کوشش کی مگر اس کی ہر چیخ دب گئی۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اور پھر وہ ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ اس شخص نے ایک نگاہ اس کے بے ہوش وجود پر ڈالی پھر فاصلے پر کھڑی سیاہ شیشوں والی وین کو اشارہ کیا۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد۔۔۔ سیاہ شیشوں والی وہ وین سڑک پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اس کی گاڑی وہیں کھڑی تھی۔ اس کا موبائل جو اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا۔۔ اب سڑک پر گرا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔۔ کسی نے کچھ غیر معمولی محسوس نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی وہ گاڑی برق رفتاری سے ہموار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ گاڑی میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جندل کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا خیام سیٹ پر سر ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے بیک سیٹ پر بیٹھی سعاد کھڑکی کے پار نگاہیں ٹکائے بیٹھی تھی۔ وہ پوری طرح سے باہر کے مناظر کی طرف متوجہ تھی۔ بالکل ایسے جیسے اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہیں تھا۔ اور اس کے برابر میں بیٹھا زیاد گردن

ترچھی کیے نرمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاں اس کے لیے بھی اس وقت اس سے زیادہ ضروری کوئی کام نہیں تھا۔

وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر سب کچھ اتنا آناً فاناً ہو رہا تھا کہ اسے موقع ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن وقت تھا کہ جس کا ہر ہر لمحہ قیمتی تھا اور ان قیمتی لمحات میں سے کوئی لمحہ بھی اسے نظر بھر کر دیکھنے کے لیے میسر نہیں تھا۔ اس رشتے کا احساس جو حال ہی میں دونوں کے مابین بنا تھا، اسے سرشار کیے ہوئے تھا مگر دوسری طرف اس کی طرف سے اتنی بے اعتنائی اسے اداس کر رہی تھی۔ کیا وہ۔۔ اتنے عرصے بعد ملنے پر۔۔ اس کا حال بھی نہیں پوچھ سکتی تھی؟ اگر نہیں تو اپنا ہی بتا دیتی۔ اسے بہت سے شکوے تھے۔ ہاں جیسے اس وقت وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی اس کا دل کر رہا تھا وہ اسے مخاطب کرے اور اسے بتائے کہ اس کا اس طرح نظر انداز کرنا اسے بری طرح چبھ رہا ہے۔ لیکن۔۔ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ گہری سانس لیتا سر سیٹ پر ٹکا گیا۔

سعاد نے نگاہیں دھیرے سے اس کی طرف پھیری تھیں۔ ہاں وہی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے نگاہوں کا رخ پھیر گئی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جیکٹ کی جیب سے موبائل نکال کر اسے آن کیا۔ موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔ اس نے پاسورڈ لگایا، موبائل ان لاک ہوا۔ ازابیلا کی کئی کالز لگی ہوئی تھیں۔

"ازا کی کالز آئی ہوئی ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟" اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ خیام نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا۔ اس نے اس کے نمبر پر بھی کالز کی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں اب جندل کی طرف متوجہ ہوئے۔ جندل نے ٹھہر کر دونوں کو دیکھا پھر اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔ تین کالز۔۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"وقت بتاؤ۔" خیام کے پوچھنے پر جندل نے وقت دیکھا تو تینوں کالیں صبح گیارہ بج کر بیس منٹ پر ایک ایک منٹ

کے وقفے سے لگی ہوئی تھیں۔ زیاد کے پاس نو بج کر پچیس منٹ پر اور خیام کے پاس دس بجے!

"جندل، مجھے ازا کے گھر چھوڑ دو!" زیاد کے کہنے پر سعاد نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے تیزی سے اس کا موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹا تھا۔ وہ اس کی تیزی پر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"جندل، خیام اپنے موبائل پکڑائیں۔" اس نے ذرا اچک کر پیچھے مڑ کر لیپ ٹاپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کرنے لگی ہو؟" خیام کی طرف سے سوال آیا تھا۔

"ضرار کو ٹریس کرنے لگی ہوں۔ نہیں معلوم کیوں مجھے اچھی وائبز نہیں آ رہیں۔" اس نے لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر آن کیا۔ خیام نے اپنا اور جندل کا موبائل اسے پکڑایا۔ "لیڈ بھی دیں۔" اس نے چارجر کے طور پر استعمال ہونے والی لیڈ اس کی طرف بڑھائی۔ اگلے کچھ لمحات میں وہ موبائل لیپ ٹاپ کے ساتھ کنیکٹ کر چکی تھی۔ زیاد کی نگاہیں کی بورڈ پر تیزی سے چلتی اس کی انگلیوں پر تھیں۔ وہ واقعی بدل چکی تھی۔۔۔ بہت زیادہ!

"تم نے ازابیلا سے اس کا نمبر کب لیا؟" خیام مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اسپتال میں۔۔ کبھی بھی کوئی بھی کام پڑ سکتا ہے۔" وہ لب دانتوں میں دباتے ہوئے کندھے اچکا گیا۔

"جندل فوراً گاڑی روکو!" سعاد نے عجلت سے کہا۔ جندل نے فوراً گاڑی سڑک کے ایک طرف کر کے بریک پر پاؤں رکھے تھے۔ گاڑی جھٹکے سے رکی تھی۔ اس کی نگاہیں اسکرین پر نمودار ہوتے مختلف اعداد و شمار پر ٹکی تھیں۔ کچھ لمحات میں اس نے انٹر کی کِی دبائی اور کیمرا کی فوٹیج سامنے آ گئی۔ زیاد آگے ہو کر اسکرین کی طرف جھکا۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ وہاں سڑک پر وہ ایمبولینس کھڑی تھی جس میں ضرار تھا۔ اس کے ٹائر پنکچر ہو گئے تھے غالباً۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

"فوراً واپس چلو!" زیاد نے عجلت میں کہا۔ سعاد ماتھے پر بل ڈالے اس فوٹیج کو دیکھ رہی تھی۔

"تین۔۔۔دو۔۔۔" اس نے سرگوشی کی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "ایک!" ایک گولی ہوا کی رفتار سے آئی اور ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ چکنا چور کرتی ڈرائیور کے قلب میں پیوست ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی کیمرا توڑ دیا گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھرا تھا۔

"میں نے کہا تھا۔۔ مجھے اچھی وائبز نہیں آرہیں!!" اس کی سرگوشی۔۔ زیاد کا سانس روک کر اسے دیکھنا۔۔ خیام کی پریشان نگاہیں۔۔ جندل کا اضطراب۔۔۔ سڑک پر دوڑتی اس گاڑی کی رفتار بڑھتی گئی تھی۔

☆☆☆

گاڑی کے رکتے ہی وہ تیزی سے باہر نکلے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ہی ایمبولینس کھڑی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف بڑھے۔ ایمبولینس کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس کا جائزہ لیا۔ اگلی سیٹوں کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ڈرائیور جو خون میں لت پت تھا، دم دوڑ چکا تھا۔ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھا آدمی جس کا سر ڈیش بورڈ سے لگا تھا ابھی زندہ تھا۔ جندل تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ لاک تھا۔ اس نے کھڑکی کے ذریعے اسے ان لاک کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پریشان نگاہوں سے اسے نے اس شخص کو دیکھا جس کی سانسیں مدھم پڑھنے لگی تھیں۔

"یہاں کیا ہوا ہے؟" اس نے اضطراب کے عالم میں پوچھا تھا۔ اس شخص کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ پیشانی سے بہتا خون پورا چہرہ داغدار کر چکا تھا۔ اسے کھانسی آئی تھی، منہ سے خون نکلا تھا اور پھر وہ وہیں جان دے گیا۔ جندل نے غصے سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

خیام وہاں سے ہٹ کر ایمبولینس کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ یہ دروازہ بھی لاک تھا۔ اس کا دماغ بھک سے اڑا۔

"ضرار۔۔ اندر ہے۔۔" اس نے پتھرائی نظروں سے انہیں دیکھا۔ جندل تیزی سے وہاں آیا۔ دونوں نے بیک

وقت زوردار لات دروازے کو ماری۔ دروازہ چرچرایا مگر بند رہا۔ ان کی پریشانی بڑھتی رہی۔ ایسے میں زیاد جانچتی نگاہوں سے ایمبولینس کو دیکھتا پنجوں کے بل سڑک پر بیٹھا۔ جھک کر اس نے ایمبولینس کے نچلے حصے کو دیکھا۔

وہاں بم فٹ تھا۔ صرف دس سیکنڈ!

"یہاں بم ہے۔ پیچھے ہٹو سب!" وہ چلایا تھا۔ وہ سب مخالف سمتوں میں بھاگے تھے۔ ابھی انہوں نے چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ دھماکا ہوا تھا۔ کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز گونجی تھی۔ گردوغبار کا طوفان اٹھا تھا۔ ایمبولینس کے پرخچے اڑ کر اردگرد پھیل گئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے وہ اس طوفان کی زد میں آکر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

اگلے ہی پل خیام کھانستا ہوا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے گال پر چوٹ آئی تھی۔ خون کی ایک ننھی سی لکیر بن گئی تھی۔ کانوں کو رگڑتے ہوئے اس نے مڑ کر ہراساں نگاہوں سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ جندل ایک طرف پنجوں کے بل بیٹھا تھا۔ کانوں میں گونجتی بیپ کی آواز دماغ میں لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے ایک پل کے لیے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون رس رہا تھا۔ کپڑے گرد میں اٹ گئے تھے۔

اپنے کانوں کو رگڑتے ہوئے زیاد نے کسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائی تھیں۔ خیام بھی موجود تھا اور جندل بھی۔۔ بس وہی نہیں تھی۔ ہاں وہی۔۔ جو زیاد کے چلانے پر جب بھاگنے لگی تھی تو نگاہیں بے ساختہ خیام پر ٹکی تھیں۔ وہ بھاگ رہا تھا۔۔ بنا کسی سہارے کے بنا لنگڑائے وہ بھاگ رہا تھا۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے اور اسی لمحے میں وقت ختم ہو گیا اور دھماکے کی زوردار آواز گونجی تھی۔

اور اب۔۔ اب وہ کہاں تھی؟ اس کے قدم بے اختیار اٹھے تھے۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور کہیں چوٹ بھی لگی تھی مگر وہ سب نظرانداز کیے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور پھر اس نے اسے ڈھونڈ لیا۔ وہ قریب ہی تھی۔ ایک گھٹنا

زمین پر ٹکائے پنجوں کے بل بیٹھی۔۔ دونوں کانوں پر زور سے ہاتھ جمائے بہت سی آوازوں کو کانوں تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش کرتی۔۔ آنکھیں میچ کر اپنے سامنے بکھرے گوشت کے ان ٹکڑوں کو نگاہوں سے اوجھل کرنے میں مصروف۔۔ وہ مردہ قدموں سے اس کے پاس آیا تھا۔

فائرنگ کی آواز اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھتی وہ بچی جو مسلسل چیختے ہوئے رو رہی تھی۔۔ اس جسم پر موجود گولیوں کے نشان اور قیدیوں کے بھاگنے سے ان کے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کی گونجتی آوازیں، تڑاتڑ برستی بارش اور پوری کوشش کے باوجود اس کا ٹریگر نہ دبا پانا، ضرار کا پورے قد سے زمین بوس ہونا اور کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز، انسانی گوشت کے وہ خون آلود ٹکڑے۔۔۔ تمام مناظر تمام آوازیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔ آنکھوں میں چھلکتی نمی آنسوؤں کی شکل اختیار کر کے گالوں پر بہہ رہی تھی۔ پیشانی سے خون لکیر کی صورت میں بہتا آنسوؤں کے ساتھ مل رہا تھا۔ وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"میں نے نہیں مارا۔۔ نہیں مارا۔۔۔ میں نے اس کی جان نہیں لی۔" وہ سسک اٹھی تھی۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر اس کے کانوں سے ہٹاتے ہوئے اسے خود سے لگایا تھا۔ اس کے حصار میں آتے ہی اسے تمام آوازیں تھمتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اب بس دونوں کے دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس کی سسکیوں کا شور تھا۔ اس کی پیشانی سے بہتا خون زیاد کی شرٹ پر بہنے لگا تھا۔ وہ اس کے سینے سے لگی رو دی تھی۔ وہ اسے خود سے لگائے ساکت نگاہوں سے گوشت کے ان ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک ہی انسانی جسم کے کئی حصے تھے۔ خون میں لت پت۔۔۔ ایمبولینس کا نام ونشان نہیں تھا۔ اب بس جگہ جگہ اس کے پُرزے پڑے تھے۔ اس کے آنسوؤں میں اضافہ ہو رہا تھا، رونے میں شدت آ رہی تھی۔ دور سے کسی ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اپنی جگہوں پر برف کے مجسموں کی طرح جم کر کھڑے جندل اور خیام۔۔ ساکت نگاہوں سے اس اجڑ چکے مقام کو

دیکھ رہے تھے۔ ذہن میں ایک ہی سوال ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا،

”کیا قدرت کو ضرار ولید کا ایسا اختتام منظور تھا؟“!

☆☆☆

سمندر کی سطح پر تیرتا اس کا بحری جہاز اندلس کے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ عرشے پر کھڑا دوربین لگائے دور تک پھیلے سمندر کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاز پر سیاہ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا جس پر سفید رنگ کے استخوان کی کھوپڑی بنی ہوئی تھی جو ان بحری قزاقوں کی نشانی تھی۔ اس کا لباس تیز بھورے رنگ کا تھا۔ پہلو میں پستول بھی اڑسی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں سیاہ رنگ کا کنگن تھا۔ وہ اس بحری جہاز کا کپتان تھا۔ صرف اس کا نہیں، اس جیسے کئی بحری جہازوں کا کپتان تھا وہ۔

اپنی مکمل تسلی کرنے کے بعد اس نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی۔ گہرے بھورے رنگ کی آنکھیں جن میں انوکھی چمک تھی۔ سفید دودھیا رنگ کا کلین شیو چہرہ جس سے اس کی عمر تقریباً بیس سے اکیس برس معلوم ہوتی تھی۔ اس کا قد دراز تھا، سینہ چوڑا تھا۔ کشادہ پیشانی اور تیکھے نقوش۔۔ وہ مرعوب کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا، نوجوان کپتان!

اس کی نگاہیں سمندر سے ہٹ کر زینوں کی طرف گئیں جہاں سے مائیکل اوپر آ رہا تھا۔ صحت مند اور توانا، کسی پہلوان کی طرح کا وہ شخص جس نے اپنے دائیں بائیں دو پستولیں کَسی ہوئی تھیں۔ وہ آرام سے زینے چڑھ کر اس کے برابر میں کھڑا ہوا۔

”گابریال کی طرف سے پیغام موصول ہوا ہے۔“ اسے اطلاع دی گئی۔ ”وہ چاہتا ہے کہ ہم اس کے لیے جندل اللہ نامی تنظیم کے کمانڈرز کا سر تیار رکھیں جو سمندر میں قدم رکھ چکے ہیں۔“ اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوا۔

لب مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

”یعنی۔۔ایک اور شکار!میں ویسے بھی فراغت سے تنگ آ گیا تھا۔“ اس نے دونوں بازو اس آہنی ریلنگ پر ٹکاتے ہوئے کہا۔مائیکل مسکرا دیا۔”جندل اللہ کے کمانڈرز کی کیا خبر ہے؟“

”وہ تین سے چار ہیں۔ان کے ساتھ دس سے بارہ اور لوگ ہیں۔کمانڈرز میں، دحیہ یوسف زئی جس کا تعلق پاکستان سے ہے، معاویہ بن اعظم جو مراکش میں رہتا ہے اور سنان حنفی جو اندلسی ہے لیکن اب مراکش میں قیام پذیر ہے۔ یہ لوگ مراکش کے ساحل سے جہاز پر چڑھے ہیں۔ جلد ہی یہاں ہونگے۔ایک اہم بات۔۔وہ بچی۔۔وہ انہی کمانڈرز میں سے ایک کی بیٹی ہے۔“ اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”تو وہ اس بچی کے لیے آ رہے ہیں۔۔بہت خوب مائیکل!زبردست سی جنگ چھڑنے والی ہے سمندر میں۔تیار رہو! پہل ہم کریں گے۔جہاز کا رخ مراکش کی طرف کر دو۔پہلے اس اندلسی سے نپٹتے ہیں!!“ اس نے حکم صادر کیا۔ مائیکل سر کو جنبش دیتا واپس چلا گیا۔وہ اب جہاز کے نچلے حصے کی طرف متوجہ ہوا۔وہ بچی۔۔چھوٹی اور معصوم سی جسے دیکھ کر ہی ٹوٹ کر پیار آئے، گھٹنوں کے گرد بازو باندھے نم آنکھوں سے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔وہ ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔اسے اس بچی کی معصومیت بھائی تھی۔وہ دو سالوں سے اس کے ساتھ تھی،اور یہ دو سال اس نے اسی طرح گزارے تھے۔منتظر نگاہوں سے سمندر کو تکتے ہوئے۔۔وہ چھوٹی سی تھی،اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اغوا کر لی گئی تھی۔لیکن باوجود اس کے وہ اسی طرح گھنٹوں سمندر کو تکتی رہتی تھی۔یہ بے رحم موجیں اور بپھری ہوئی لہریں اسے اس کی بے بسی کا احساس دلاتی تھیں یا اس کے لیے کسی قاصد کی طرح کوئی پیغام لاتی تھیں وہ نہیں جانتا تھا۔وہ بچی۔۔۔اسے بس یہ معلوم تھا کہ وہ غلط جگہ پر غلط لوگوں کے درمیان تھی۔۔وہ جگہ جو اس کی نہیں تھی۔۔

☆☆☆

وہ کرسی پر بیٹھا گہری نظروں سے فرش کو تک رہا تھا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اضطراب کے عالم میں اپنا پاؤں زمین پر مارتا وہ بہت بے چین نظر آرہا تھا۔ اس سے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا زیاد بھی کچھ اسی کیفیت میں منتظر نگاہوں سے دروازے کو تک رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان جندل کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ اور ان سب سے فاصلے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑی سعاد گم سم سی نگاہوں سے اپنے سامنے سفید رنگ کی دیوار کو تک رہی تھی۔ آنکھوں میں چمکتی نمی ٹھہر گئی تھی۔ دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ انتظار کی ہر گھڑی ان پر بھاری تھی۔

کچھ مزید لمحات گزر گیے اور پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ سفید کوٹ پہنے ایک لڑکا باہر آیا۔ وہ تینوں تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ وہ طائرانہ نگاہ تینوں پر ڈال کر اپنے دستانے اتارنے لگا۔ ”جائے حادثہ سے دو بلڈ سیمپلس ملے ہیں۔ ایک ”اے“ اور دوسرا ”اے بی“۔ ضرار کا بلڈ گروپ ”بی“ ہے۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ۔۔۔ ایمبولینس میں نہیں تھا۔“

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ بیک وقت تینوں کے منہ سے نکلا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے تینوں وہیں کرسیوں پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھے تھے۔

”اگر وہ ایمبولینس میں نہیں تھا تو پھر؟“ ایک اور سوال حل طلب تھا۔ تینوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا۔

اسی وقت ان کے سامنے کھڑے لڑکے کا موبائل بج اٹھا۔ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس لڑکے نے موبائل پر نمبر دیکھ کر موبائل ان کی طرف بڑھا دیا۔ جندل نے آگے بڑھ کر موبائل لیا پھر کال اٹھا کر اسپیکر آن کیا۔

”کیا خبر ہے؟“

"ضرار یہاں نہیں ہے کمانڈر"!

"وہ بخیریت وعافیت یہاں پہنچ چکا ہے۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" صرف چند الفاظ تھے اور انہیں اپنی رگوں میں زندگی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ "اس کا علاج جلد ہی شروع ہو جائے گا۔ تم لوگ اپنے کام پر دھیان دو۔ وہ جلد ہی تمہارے ساتھ ہو گا۔" وہ سب مسکرا دیے تھے۔ جندل نے موبائل اس لڑکے کو تھمایا پھر تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" زیاد کے کہنے پر اس لڑکے نے سر کو خم دیا۔ وہ اور خیام آگے بڑھ گئے جبکہ جندل سعاد کی طرف متوجہ ہوا جو ہنوز بے حس و حرکت کھڑی دیوار کو تک رہی تھی۔ وہ گہری سانس لیتا آگے آیا تھا۔ اسے کلائی سے پکڑ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور نقاب میں جذب ہو گئے۔ وہ سب چلے گئے تو وہ لڑکا اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوا جہاں کال ابھی بھی چل رہی تھی۔

"کیا ہم نے ان سے حقیقت چھپا کر ٹھیک کیا سر؟" اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ضرار کی وجہ سے یہاں کام ادھورا نہیں چھوڑا جا سکتا"!

"لیکن ضرار لاپتہ ہے!!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

"اس کی تلاش شروع کی جا چکی ہے!" ساتھ ہی کال کٹ گئی۔ اس نے گہری سانس لے کر بازو پہلو میں گرا دیا۔ وہ ان چاروں کو جانتا تھا۔ حزب اللہ میں کون انہیں نہیں جانتا تھا۔ ان کی دوستی مثالی تھی اور اب۔۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ان کا دوست لاپتہ ہے مگر وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔۔ اس کے پاس اس وقت خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

اسے اپنے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پلکیں نیند کے غلبے کی وجہ سے بھاری محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تھا۔ سب دھندلا دھندلا سا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں۔ ہر جگہ اندھیرا تھا۔ اس نے واقعی آنکھیں کھولی بھی تھیں یا نہیں، اسے شبہ ہوا تھا۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو خود کو بندھا ہوا پایا۔ ماتھے پر بل ڈالے اس نے مڑنا چاہا مگر دونوں ہاتھ کرسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ اب صحیح معنوں میں ہوش میں آئی تھی۔

"کوئی ہے یہاں؟" اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات ابھرے تھے۔ اسے اپنی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس خود تک آتی محسوس ہوئی تھی۔ "کوئی مجھے سن رہا ہے؟" اس کی آواز تیز ہوئی تھی۔ اب بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ وہ جانے کب سے یہاں تھی؟ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ وہ بس اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی جب اچانک کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ کیا ہوا، کس نے کیا وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ایک بار پھر حرکت دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ہاتھ سختی سے بندھے ہونے کی وجہ سے وہ تکلیف سے دوچار تھی۔ بے بسی کے احساس سے آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

"بس اتنی سی ہمت۔۔۔ ازابیلا؟" بھاری مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ کمرے کے ایک کونے میں روشنی ہوئی۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ سیاہ جینز پر سرمئی رنگ کا گردن تک سوئیٹر پہنے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے پہچان نہیں پائی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس نے آواز میں سختی لانا چاہی۔

"غور سے دیکھو۔۔ کون ہوں میں؟" وہ دونوں ہاتھ باہم ملاتا کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے آگے ہوا۔ ازابیلا نے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ ماتھے پر بکھرے بال، تیکھے نقوش، گہری چمکدار آنکھیں، گندمی رنگت اور وہ ہلکی ہلکی داڑھی۔۔ اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ اس نے یہ چہرہ ٹی وی پر دیکھا تھا۔ ہاں جب اسے مردہ دکھایا جارہا تھا تب۔۔ وہ ڈیوڈ تھا۔۔ وہی ڈیوڈ جو مرچکا تھا!

"تم۔۔ تم زندہ ہو؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ ڈیوڈ کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"ہاں میں زندہ ہوں ازابیلا۔"

"لیکن کیوں؟ تم نے مرنے کا ڈرامہ کیوں کیا؟" وہ کم فہمی سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ مجھے ماردیتے۔ انہیں میری جان چاہیے تھی، میں نے دے دی۔ وہ اس بات سے قطعی انجان کہ میں زندہ ہوں، اب بہت سکون سے اپنا کام کررہے ہیں۔"

"کون؟" اس نے پلک جھپکی۔ ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔ "اسکائے ٹو!" اس نے رک ازابیلا کے تاثرات کو دیکھا۔ اس کا پریشان سا چہرہ بتارہا تھا کہ وہ اس سب سے قطعی انجان تھی۔ "یقیناً تم انہیں نہیں جانتی۔ لیکن مارک کو جانتی ہوناں؟ میری موت کا حکم صادر کرنے والا وہی تھا۔"

"وہ ایسا کیوں کرے گا؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"اگر میں تمہیں سب بتادوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟"

"میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔ اگر مارک نے تمہارے ساتھ کچھ برا کیا ہے تو ہم عدالت میں چلیں گے۔ میں تمہیں انصاف دلواؤں گی میرا یقین کرو!" وہ اس کی معصومیت دیکھ کر سر جھٹک کر ہنس دیا تھا۔

"کونسی دنیا میں رہ رہی ہو ازابیلا؟ یہاں انصاف بِکتا ہے۔ آج کے دور میں انصاف دولت کا غلام ہے۔ یہ غریبوں کو

اپنی ٹھوکر پر رکھتا ہے اور امیروں کے جوتے چاٹتا ہے۔“

”اسٹیون۔۔عدالت نے اس کے خلاف بھی تو ایکشن لیا ہے۔“ اسے اپنی آواز دھیمی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

”زیادہ سے زیادہ کیا؟ اسٹیون مر چکا ہے اور اب عدالت جو کر سکتی ہے وہ پینالٹی کے طور پر بار بار اگروپ سے چند پیسے بٹور لے گی۔ تمہیں اتنا معصوم نہیں ہونا چاہیے ازابیلا۔“ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے تمام دلائل، ہر بات اسے بے معنی لگی تھی۔

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”تم سے نہیں مارک سے۔“ وہ مسکرایا۔ ازابیلا نے چونک کر اسے دیکھا۔ سماعت سے مائک کی آواز ٹکرائی، ”کیونکہ تم سے وہ شخص محبت کرتا ہے جس سے مجھے بے حد نفرت ہے“۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ لب دھیرے سے وا ہوئے۔ ”میرا اس سے کیا تعلق؟“

”مارک کے خلاف تم ایک بہترین پتّا ہو ازابیلا! وہ تمہیں جیتنا چاہتا ہے، تمہاری خاطر ہر حد سے گزر جائے گا۔ جب اسے معلوم ہو گا تم یہاں میری قید میں ہو تو بِن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپے گا اور میرا ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہو گا۔“ وہ مسکرا کر کہتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ازابیلا نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ ”تم یہاں زیادہ دن نہیں رہو گی۔ آج کا دن ٹھہر جاؤ۔ صبح مارک کو پیغام مل جائے گا۔ اگر اس نے میرے تمام مطالبات مان لیے تو یقیناً تمہیں آزاد کر دوں گا۔“

”میں نے۔۔۔ تمہیں مظلوم سمجھا تھا۔“ وہ بڑبڑائی تھی۔ ڈیوڈ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا جھکا تھا۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑی تھیں۔ ”یہاں پر تم غلط تھیں۔ میں ظالموں میں سے ہی ایک ہوں!“ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ ازابیلا سختی سے ہونٹ بھینچے فرش کو تکتی رہی۔

”تم پر ترس بھی آرہا ہے مجھے۔۔ بارہ گھنٹے ہونے کو ہیں اور کسی نے تمہاری خبر نہیں لی۔ تمہارا کوئی نہیں ہے ازابیلا! تم ہمیشہ سے اکیلی ہو۔“ وہ کہہ کر جا چکا تھا۔ اندھیرے میں فرش کو تکتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں سے ایک آنسو نکل کر گال پر لڑھکتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے کیسے سوچ لیا تھا اسے آئندہ کبھی رونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی؟ وقت ہر بازی پلٹ دیتا ہے، ہر دعوے کو جھٹلا دیتا ہے۔ وہ رو رہی تھی۔ سختی سے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکیوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نکلتے آنسو تیزی سے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ درد اس بات کا نہیں تھا کہ وہ اغوا کرلی گئی تھی، تکلیف اس لیے تھی کہ وہ تنہا تھی۔ مائک نے کہا تھا کوئی اس کی حفاظت کر رہا ہے۔۔ مگر کوئی اس کے لیے میسر نہیں تھا۔ کوئی اس کا محافظ نہیں تھا!

☆☆☆

وہ پریشانی سے اپنی آفس میں ٹہل رہا تھا۔ نگاہیں بار بار موبائل کی طرف اٹھ رہی تھیں جس کی تاریک اسکرین اس کی بے چینی میں اضافہ کر رہی تھی۔ کمر پر ہاتھ باندھے اضطراب کے عالم میں ٹہلتا وہ سخت پریشانی میں گھرا ہوا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی ہوئی تھی۔ کوٹ کرسی پر لٹکایا ہوا تھا اور بازوؤں کے کف موڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر پریشانی ہی پریشانی تھی۔ وہ مسلسل ٹہلنے سے تھک گیا تو رک کر گہری سانس لی۔ اسی اثناء میں آفس کا دروازہ کھلا اور جیم اندر آیا۔

”مِس ازابیلا کی گاڑی اور موبائل ملے ہیں ہمیں۔ ملازمین کا کہنا ہے وہ صبح ہی گھر سے نکل گئی تھیں۔ ان کے نکلنے سے کچھ دیر پہلے انہوں نے مائک سے ملاقات کی تھی۔“ اس نے چونک کر جیم کو دیکھا۔

”مائک؟“

”جی۔۔ وہ پہلے بھی مِس ازابیلا کو مارنے کی کوشش کر چکا ہے۔ شاید اسی نے انہیں اغوا کیا ہو؟“

"اس کے پاس اب یہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے!" اس نے پریشانی سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا پھر موبائل اٹھایا۔ مائک کا نمبر ملا کر وہ ہونٹوں کو دانتوں سے کچلتے ہوئے اسکرین کو تکنے لگا۔ چند پل گزرے اور پھر کال کاٹ دی گئی۔ اس نے غصے سے موبائل میز پر پٹخا۔ اسی وقت اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے تیزی سے لپک کر موبائل اٹھایا مگر وہاں ابراہم وارلڈ کا نام چمکتا دیکھ کر وہ مایوس ہوا۔

"جی سر؟"

"ازابیلا کا کچھ پتہ چلا؟" اس کے لہجے میں باپ کی سی فکر تھی۔

"نہیں سر۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ جلد ڈھونڈ لیں گے۔"

"اسے ڈھونڈو مارک! میں اس کے معاملے میں تمہارے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔" اس نے سر کو جنبش دی۔ ابراہم کی طرف سے کال کاٹ دی گئی۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے جیم کی طرف متوجہ ہوا۔

"ٹیم گاما کی طرف سے کیا خبر ہے؟"

"حزب اللہ کا جاسوس پکڑا جا چکا ہے۔ مائک اس جاسوس کو جانتا ہے، ہمیں تسلی کے لیے مائک کو بلانا ہو گا۔ وہی یقین دلا سکتا ہے کہ یہ وہی جاسوس ہے یا نہیں جو الزرقاوی کا قاصد بن کر مائک سے ملا تھا"!

"مائک کو ڈھونڈو اور میرے پاس لاؤ فوراً! اس کے ساتھ ہی تمام سی سی ٹی وی کیمرا چیک کرو۔ کسی بھی قیمت پر ازابیلا کو ڈھونڈو!" اس نے حکم صادر کیا تھا۔

"اوکے سر!" جیم سر کو جنبش دیتا باہر نکل گیا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی پر لٹکتا اپنا کوٹ اٹھایا پھر باہر نکل گیا۔ سرِ دست اسے اس جاسوس سے ملنا تھا۔

☆☆☆

"ازا کو اغوا کر لیا گیا ہے!" اس نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے اطلاع دی تھی۔ خیام، سعاد اور جندل نے چونک کر اسے دیکھا تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کون؟" جندل کی طرف سے سوال آیا تھا۔

"کچھ معلوم نہیں۔ اس کی گاڑی اور موبائل وارلڈ گلاس کمپنی کے سامنے والی سڑک سے ملے ہیں۔ ہمیں اسے ڈھونڈنا ہو گا۔" اس نے پریشانی سے کہا تھا۔

"ہم کیوں؟ یہ کام اس کا باپ بھی کر سکتا ہے۔" سعاد کے تنک کر کہنے پر ان تینوں نے ٹھہر کر اسے دیکھا جو دیوار سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے سکون سے کھڑی تھی۔ چشمے کے پار آنکھوں میں بلا کی معصومیت تھی۔ خیام نے اسے گھورا تھا، جندل کی نگاہوں میں خفگی جھلکی تھی، واحد زیاد تھا جو نرمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"وہ ہماری وجہ سے مشکل میں ہے!" جندل نے اسے قائل کرنا چاہا۔

"ہم نے کیا کِیا ہے؟ وہ ہم سے پہلے بھی اسی طرح خطروں میں پڑتی رہی ہے تبھی اس کے باپ نے اسے صحافت سے پیچھے ہٹنے کو کہا تھا۔ ہمارے پاس ازابیلا کی حفاظت کے علاوہ کئی اور کام ہیں!!" وہ جھنجھلائی تھی۔ اسے ان تینوں کا ازابیلا کو اتنی اہمیت دینا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"جیسے کہ؟" خیام نے دائیں ابرو اٹھائے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"ہمارا اگلا ٹارگٹ مارک ہے۔ ہمیں اس پر دھیان دینا چاہیے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"سعاد۔۔۔ ازا مشکل میں ہے۔" وہ ٹھہر گئی تھی۔ زیاد نے شائستگی سے اسے دیکھتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے خیام کے گھورنے کا اثر نہیں لیا تھا، اسے جندل کی خفگی کی پروا نہیں تھی، مگر وہ زیاد کی ان التجا بھری نگاہوں کو نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔

"تم اس کی بہت فکر کرتے ہو کیوں؟" اس نے سوال داغا تھا۔ زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ جواب نہیں دے پایا تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے۔ میں اسے ٹریس کر رہی ہوں۔ میرا شکریہ ادا کرنا مت بھولیے گا اور یاد رہے! میرے سامنے اسے اتنی اہمیت مت دیا کریں کہ میں کسی بھی قسم کے کامپلیکس کا شکار ہونے لگوں۔" سنجیدگی سے کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ تینوں پلکیں جھپکتے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ وہ عام لڑکیوں سے الگ تھی۔۔ مگر تھی ایک لڑکی ہی! اس کا یہ رویہ فطری تھا۔ وہ سمجھ سکتے تھے۔ اگلے چند لمحات میں وہ تینوں خاموش رہے تھے۔ ان تینوں کے درمیان اس خاموشی کو خیام کے موبائل کی چنگھاڑ نے توڑا۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا پھر فوراً سے ایئر پوڈز آن کیے۔

"السلام علیکم سر"!

"وعلیکم السلام۔ وقت ضائع کیے بنا مائک کو ڈھونڈو اور اسے غائب کروادو!" اچانک سے حکم صادر ہونے پر وہ دنگ رہ گیا تھا۔

"سر۔۔ اسکائے ٹو کی پوری فوج اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرے گی"!

"ہم ہر فوج سے لڑلیں گے۔ یہ میرا حکم ہے!" ساتھ ہی کال کاٹ دی گئی۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے موبائل کی تاریک اسکرین کو دیکھنے لگا۔ یہ انداز الزرقاوی کا نہیں تھا۔ کہیں یقیناً کچھ گڑبڑ تھی □۔

"کیا ہوا؟" جندل نے اس کے آگے چٹکی بجائی۔

"مائک کو غائب کروانے کا حکم دیا ہے الزرقاوی سر نے۔۔" اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

"تو بیٹھے کیوں ہو؟" زیاد کے سوال پر اس نے گہری سانس لی۔

"شاید میں ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا موبائل اٹھا کر کوٹ کی جیب میں اڑسا پھر

الوداعی نگاہ ان پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ زیاد اس کے جاتے ہی دھم سے صوفے پر گرا تھا۔ جندل چپ چاپ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ بھی ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی نظریں اسکرین پر ٹکائے ازابیلا کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اردگرد کے تمام کیمراز کو دیکھا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ٹھہری تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کرسی سے ٹیک لگائی پھر دائیں کان میں لگے آلے کو آن کیا۔

"میں نے ڈھونڈ لیا۔" صرف چند لمحات اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا تھا۔ اس نے چہرے پر ناگواریت لیے مڑ کر آنے والے کو دیکھا۔ دروازے پر کھڑے زیاد کے چہرے پر چھائی بے چینی اسے بری طرح چبھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آگے آیا۔ اسی اثناء میں جندل بھی کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

"یہ دیکھو۔ جس گاڑی میں ازابیلا کو لے جایا گیا وہ اس عمارت کے باہر کھڑی ملی ہے۔ یہ کوئی زیرِ تعمیر عمارت ہے۔ بدقسمتی سے عمارت کے زیادہ قریب کوئی کیمرا نہیں ہے ورنہ ہم مزید قریب سے اسے دیکھ سکتے تھے۔" اس نے تفصیل بتا کر نگاہ اٹھا کر جندل کو دیکھا۔

"اندازاً کتنے لوگ ہونگے وہاں؟"

"گاڑی تو ایک ہی کھڑی ہے۔ اور گاڑی کے حساب سے کم و بیش چار سے پانچ۔۔ اگر پہلے سے کچھ لوگ اندر ہوں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"ہمیں جلد از جلد نکلنا چاہیے پھر۔" زیاد نے عجلت سے کہا تھا۔ جندل نے سر کو جنبش دی۔

"وہاں صرف جندل کو جانے دو۔" اس نے تیزی سے کہا تھا۔ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہیں نہیں لگتا کہ

ازابیلا کے "قریبی کزن" ہونے کے ناطے تمہیں اس وقت اس کے پریشان حال باپ کے ساتھ ہونا چاہیے؟ اس کی گمشدگی کی خبر کو بھلے ہی پردے میں رکھا گیا ہے مگر اس کے قریبی لوگ تو جانتے ہی ہیں ناں، سب کو اس وقت اس کے گھر ہونا چاہیے!" اس نے سکون سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے اپنی بات مکمل کی۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم بیلا کے گھر پہنچو، اگر کوئی مسئلہ ہوا تو خیام کو بلالوں گا میں۔" جندل کے کہنے پر اس نے جواباً کچھ کہنا چاہا تھا مگر سعاد کی چبھتی نگاہیں محسوس کر کے چپ کر گیا۔

"ایڈریس بھیج دیں مجھے آپی۔" سعاد نے سر کو جنبش دی۔ وہ زیاد کا شانہ تھپتھپاتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

سعاد نے اپنا موبائل اٹھالیا۔ وہ اس کے پہلو میں کھڑا چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ ناک پر چشمہ ٹکائے بے فکری سے موبائل کی اسکرین پر انگلیاں چلاتی وہ اسے ٹھہرنے پر مجبور کر گئی تھی۔ پیشانی پر سنی پلاست لگی تھی۔ چہرے پر نقاب لگا تھا۔ شاید وہ اس کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اب اسے اتارنا یاد ہی نہیں رہتا تھا۔۔۔ یا شاید وہ بس۔۔ اسے سَتا رہی تھی!

"کوئی کام ہے؟" موبائل کی روشن اسکرین پر نگاہیں ٹکائے پوچھا گیا۔ اس نے سوچوں سے نکلتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "ازا کی اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟ کیا واقعی تم اس کے کزن ہو؟" وہ چہرہ ترچھا کیے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ بَس وہ مجھے عزیز ہے۔" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ نگاہوں کا مرکز بس وہی تھی۔

"کیوں ہے؟" ایک اور سوال حاضر تھا۔

"سعاد۔۔" وہ بے بس ہوا تھا۔

"تم بالکل نہیں بدلے۔ تمہیں مجھ سے محبت بھی "بس" ہو گئی تھی۔ تمہیں ازا بھی "بس" عزیز ہے۔ تمہارے پاس کبھی کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہوتی۔ اسی لیے مجھے تم "بس" برے لگنے لگے ہو۔" وہ سنجیدگی سے کہتی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اور تم مجھے "بس" اور زیادہ اچھی لگنے لگی ہو۔" وہ خفیف سا مسکرایا تھا۔

"تم ایسی باتیں کر کے میرا غصہ کم نہیں کر سکتے۔ میں اب وہ والی سعاد نہیں رہی جس سے تم ایسی باتیں کرو گے اور وہ تمہارا منہ توڑنے کے بجائے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ میں اب تمہاری بیوی ہوں! اب اگر اتنے پیار سے کچھ ایسا ویسا کہا تو منہ توڑ دوں گی!" اسے دھمکایا گیا تھا۔ وہ گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

"اور میں وہ پرانا زیاد نہیں ہوں جو تمہیں گھبرا کر بھاگنے دوں گا۔ میں اب تمہارا شوہر ہوں! تمہاری ہر راہِ فرار میں حائل ہو جاوں گا۔" وہ شریر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ وہ ان رنگوں کو دیکھنا چاہتا تھا تبھی چند قدم مزید آگے بڑھا تھا، درمیان میں فاصلے کو گھٹایا تھا۔ بہت آرام سے دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے بائیں کان کے پاس حجاب میں لگی پِن اتاری تھی۔ وہ سُن ہو گئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ جو اسے بہت عزیز تھا، جسے وہ ان دو سالوں میں کبھی بھلا نہیں پایا تھا۔ اس چہرے پر اس وقت کئی رنگ آجا رہے تھے۔ ان رنگوں میں وہ لال رنگ اسے پسند آیا تھا جو اس کے رخساروں کی زینت بنا ہوا تھا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری تھی۔ سعاد فوراً نظریں چرا گئی تھی۔ منتشر ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنا اسے بے حد مشکل لگا تھا۔

"تم میری محبت ہو سعاد یوسف زئی!" بہت نرمی سے محبت بھرے لہجے میں کہا گیا تھا۔

"تمہیں جانا چاہیے۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"سعاد۔۔"

"زیاد! تمہیں جانا چاہیے۔ مجھے جندل کو بھی دیکھنا ہے اور خیام کو بھی۔ پلیز!" اس نے التجا کی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا تھا پھر گہری سانس لے کر سر کو جنبش دی۔

"مجھے جانا چاہیے۔" بہت دھیمی آواز میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اسے روکے گی مگر وہ اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیرنا بخوبی جانتی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اداسی سے ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔۔ اپنے اسی ازلی انداز میں۔۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھنے لگی اور وہ دروازہ پار کر گیا۔ اسے لگا وہ کسی خواب سے باہر آیا ہے۔

☆☆☆

اس کی گاڑی بہت تیز رفتاری سے اس لمبی اور ہموار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے دور جانا چاہتا تھا۔ اس کے ماں باپ کے بعد یقیناً اس سنگدل انسان کے عتاب کا نشانہ وہی بننے والا تھا اور وہ اس دردناک وقت کے آنے سے پہلے یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ مارک نے اگرچہ زیادہ تر دولت اپنے نام کروالی تھی مگر پھر بھی اس کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ دنیا کے کسی چوتھے کونے میں آرام سے اپنی ساری زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اسے تنہائی منظور تھی۔۔ کم از کم ایسے درندوں کے ساتھ سے تنہائی لاکھ درجہ بہتر تھی۔

اس کی نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں۔ لب سختی سے بھینچے وہ پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یہ لمبی سڑک معمول کے مطابق خالی تھی۔ کبھی کبھار ہی کوئی ایک دو گاڑیاں نظر آجاتی تھیں۔ حادثے کے امکانات بہت کم تھے۔ یہی سوچ کر اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔ اسی اثناء میں اس کی نظر بیک ویو مرر پر ٹکی جہاں اس کے عقب سے سیاہ رنگ

کی تیز رفتار گاڑی نمودار ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ اس گاڑی کی رفتار اس کی گاڑی کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ گاڑی چلانے والا جو کوئی تھا وہ بہت جلد اس کے قریب پہنچنے والا تھا۔ اس نے پریشانی سے رفتار مزید تیز کر دی۔ پچھلی گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں نمودار ہوئیں۔ اس نے سامنے سڑک کو دیکھا جہاں اب دائیں بائیں دو موڑ نظر آ رہے تھے۔ اس نے فوراً سے پہلے دائیں طرف موڑ کاٹا تھا۔ گاڑی اچانک سے اَن بیلنس ہوئی مگر اگلے ہی لمحے وہ اسے سنبھال گیا۔ اس کے پیچھے آتی گاڑی بائیں طرف مڑ گئی۔ اس نے سکون کی سانس خارج کر کے سیٹ پر سر ٹکایا۔ رفتار اب تھوڑی کم کر دی۔

اسے اس نئی سڑک پر بس پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہی گاڑی اس کے سامنے سے نمودار ہوئی تھی۔ یہ ون وے روڈ تھا، حادثہ یقینی تھا۔ اس نے ڈر کے مارے اپنی رفتار کم کی۔ سامنے سے آتی گاڑی کی رفتار تیز ہوئی۔ دونوں گاڑیاں بہت قریب آ گئیں۔ اگلے ہی لمحے اسے لگا تھا کہ وہ گاڑی اس کی گاڑی سے ٹکرانے والی ہے جب گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور وہ رخ بدلتی اس کے سامنے سیدھ میں کھڑی ہوگئی۔ اس نے فوراً سے بریک پر زور دیا تھا۔ گاڑی جھٹکے سے رکی تھی۔ دونوں گاڑیوں میں بس بالشت بھر کر فاصلہ باقی تھا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا وہیں بیٹھا رہا۔

سیاہ رنگ کی پجارو کا دروازہ کھلا اور سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک لڑکا باہر نکلا۔ اپنے دونوں بازوؤں کو کہنیوں تک چڑھاتے ہوئے بائیں ہاتھ میں اسٹک تھامے وہ اس کی طرف آیا۔ بہت آرام سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے گاڑی سے باہر نکالا۔

”کون ہو تم؟ چھوڑو مجھے۔“ اس کی زبان خوف سے لڑکھڑا گئی۔ اس لڑکے نے اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے نظر بھر کر دیکھا پھر بنا جواب دیے اگلے ہی لمحے ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ اسے اپنے دانت ہلتے محسوس ہوئے تھے۔ اس لڑکے نے اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بنا ہی ایک اور مکا اس کے جبڑے پر رسید کر کے

زوردار لات اس کے سینے پر ماری تھی۔ وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گرا تھا۔ ناک سے خون لکیر کی صورت میں بہنے لگا۔ سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ لڑکا آگے آیا اور جھک کر جھٹکے سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے کھینچا۔

”جب ایک غیرت مند مرد کی غیرت کو جگا کر تم نے بے غیرتی کا مظاہرہ کیا تھا، یہ مکا تمہیں اسی وقت پڑنا چاہیے تھا۔“ اس بار اس کے مکے کی زد میں اس کی ناک آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے زوردار لات اس کے سینے پر مار کر اسے سڑک پر گرایا تھا۔ مائک نے کروٹ لیتے ہوئے منہ میں آتے خون کو سڑک پر تھوکا تھا۔ ”تم ایک بے غیرت مرد ہو جو ایک لڑکی کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس پر گولی چلاتا ہے۔ ایک نامرد جو ہمیشہ پیچھے سے وار کرتا ہے!“ اسے زوردار ٹھوکر لگی تھی۔ وہ سڑک کے دوسری طرف لڑھک گیا تھا۔ پیشانی سے خون بہنے لگا تھا۔ چہرے کا نقشہ بگڑ چکا تھا۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

”میں تمہارا دشمن نہیں ہوں!“ وہ درد سے کراہتے ہوئے چلایا تھا۔ ایک بار پھر اسے ٹھوکر لگی تھی۔ اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس لڑکے نے جھک کر اس کا گریبان پکڑا پھر ایک زوردار مکا اس کے چہرے پر رسید کرتے ہوئے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا۔ اس کا سر چارکول بچھی سڑک سے ٹکرایا۔ منہ سے خون ابلنے لگا۔ وہ کروٹ بدلتا منہ میں آتا خون تھوکنے لگا۔

”تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ تمہیں اپنا دشمن بنایا جائے۔ ایک بے غیرت اور نامرد انسان ہمارا دشمن نہیں ہو سکتا!“ اس نے جاگرز میں مقید اپنا پاؤں اٹھا کر مائک کی گردن پر رکھا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ وہ بہت آرام سے اپنے جوتے کو اس کی گردن پر رگڑ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے تکلیف دے رہا تھا۔ چہرے پر بلا کی سختی تھی اور آنکھوں میں بے تحاشا قہر تھا۔ وہ اس کی جان لینے کے درپے تھا۔

”رحم۔۔کرو۔“ اسے اپنی آنکھیں ابلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔اس نے جھٹکے سے اپنا پاؤں اس کی گردن سے ہٹا کر زوردار لات اس کے پیٹ پر ماری۔وہ درد سے کراہ اٹھا تھا۔گردن بری طرح رگڑے جانے کی وجہ سے لال ہو رہی تھی۔جگہ جگہ خون کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

”تمہیں اپنے لیے موت مانگنی چاہیے کیونکہ اس کے بعد جو تمہارے ساتھ ہو گا تم اس کے تصور سے ہی کانپ اٹھو گے!“ وہ اس کے پیٹ پر دایاں پاؤں رکھ کر اس پر پورا زور دیتا سکون سے کہہ رہا تھا۔مائک کی آنکھوں میں درد کے مارے آنسو چمکنے لگے تھے۔وہ آنکھوں میں دلچسپی لیے اس کے خون میں بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔وہ یہیں اسی وقت اس نامرد کی جان لینا چاہتا تھا مگر شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا۔کچھ فاصلے سے کسی گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز آئی۔اس نے ہنوز اس کے پیٹ پر پاؤں رکھے اس پر اپنا زور دیتے ہوئے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔کچھ فاصلے پر سفید رنگ کی ایک گاڑی رکی تھی۔سیاہ لباس میں ملبوس ایک لڑکا گاڑی سے اترا تھا۔ماتھے پر سیاہ پی کیپ ٹکائی ہوئی تھی اور چہرے کو سفید رومال سے چھپایا ہوا تھا۔وہ وہیں کچھ فاصلے پر رک گیا۔اپنا دایاں ہاتھ خیام کو دیکھتے ہوئے ہلکا سا ہلایا۔

”یہاں سے آگے میرا کام ہے!“ اس نے تیز آواز میں کہا تھا۔خیام نے نگاہوں کا رخ مائک کی طرف کیا۔اس کی آنکھوں سے تکلیف کے مارے آنسو زاروقطار بہہ رہے تھے۔

”میرا نام یاد رکھنا مائک، میں خیام حنفی ہوں! ہم بہت جلد ملیں گے اور تب میں تمہیں بتاؤں گا کہ جسم کے ہر حصے سے جان کو نکلتے ہوئے محسوس کرنا کیسا ہوتا ہے؟!“ سرد سے لہجے میں کہہ کر قہر بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر وہ جھٹکے سے اس کے پیٹ سے اپنا پاؤں ہٹاتا پلٹ گیا۔وہ لڑکا اسے گاڑی کی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی گاڑی سے پیٹرول کا کین لے آیا۔جس وقت خیام اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا، وہ مائک کی گاڑی پر پیٹرول چھڑک رہا تھا۔اور

جب خیام نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تو اس نے لائٹر جلا کر پیٹرول پر پھینک دیا۔ اس نے بیک ویو مرر میں آگ کے ان شعلوں کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

مائک سے کچھ فاصلے پر کھڑا وہ لڑکا اسے دور جاتا دیکھتا رہا۔ چند ثانیے یونہی گزر گئے اور پھر وہ آگے بڑھا۔ مائک کے پاس پہنچ کر جھک کر اس کی ایک ٹانگ پکڑی پھر اسے گھسیٹتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مائک چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔۔ اور وہ اتنا ہمدرد نہیں تھا کہ اسے اپنے کاندھے پر اٹھا کر گاڑی میں ڈالتا۔۔ وہ نامردی ہی ڈزرو کرتا تھا!

☆☆☆

وہ دونوں بے زاری سے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ سارا دن یہ تھکا دینے والا کام کرنے کے بعد اب انہیں کوفت سی ہونے لگی تھی۔ اگر بات پیسوں کی نہ ہوتی تو وہ سب چھوڑ چھاڑ کر یہیں ڈھے جاتے۔ یہ کوفت زدہ کام انہیں سخت جھنجلاہٹ کا شکار کر رہا تھا۔ شام کے سائے دھیرے دھیرے پھیل رہے تھے۔ ہوا کبھی کبھار ہی پاس سے گزرتی مگر پھر بھی پچھلی بارشوں کے سبب موسم خوشگوار سا تھا۔

انہیں یونہی دروازے پر کھڑے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ انہیں دھم کی آواز سنائی دی۔ کوئی عمارت کے اندر کودا تھا۔ وہ دونوں چونکے۔ دونوں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنا وہم سمجھ کر واپس دروازہ بند کر گئے۔ دروازے کے پیچھے کھڑا جندل تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ یہ یقیناً کوئی زیرِ تعمیر شاپنگ مال تھا۔ سامنے ایک لمبی سی راہداری تھی اور پھر چاروں طرف کمرے تھے۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ اچانک اسے چند قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ دو آدمی آپس میں باتیں کرتے باہر کی طرف جا رہے تھے۔

"باس کب تک واپس آئیں گے؟"

"یہی کوئی پندرہ منٹ میں۔ اس کے بعد ہم جیمر بند کر دیں گے جس سے ہمیں باآسانی ٹریس کیا جاسکے گا۔ پھر ہم اس لڑکی کو استعمال کر کے مارک سے ہر طرح کی شرائط منوالیں گے۔" وہ دونوں اپنی دھن میں گفتگو کرتے آگے بڑھ گئے۔ ان کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اوپر نیچے کے تمام کمرے دیکھنے میں وقت لگنا تھا۔ وہ وہیں رک گیا۔ ٹھہر کر بغور ہر کمرے کو دیکھا۔ باقی تمام کمروں میں تھوڑی تھوڑی روشنی تھی۔ البتہ اس کی ناک کی سیدھ میں موجود کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھا۔ اپنی پستول نکال کر اسے لوڈ کیا۔ کسی بھی قسم کی صورتحال کے پیشِ نظر پستول پر سائیلینسر وہ پہلے ہی فٹ کر چکا تھا۔ اس نے دھیرے سے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ چر کی آواز سے کھلتا چلا گیا۔ اس نے فوراً پستول سیدھی کی۔ اندر کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکال کر ٹارچ آن کی۔ وہاں کمرے کے کونے میں وہ کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔

"بیلا۔۔" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ ازابیلا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جو تیزی سے اس کی طرف آیا اور پھر اس کے بندھے ہاتھوں کو دیکھ کر اپنا موبائل اس کی گود میں ڈالتا اس کے عقب میں جا کر اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ "جندل تم یہاں کیسے؟" اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔ وہ اس کے سوال کو نظرانداز کرتا جلدی سے اس کے ہاتھ کھول کر پاؤں کی طرف متوجہ ہوا۔ جھک کر اس رسی کو کھول کر اس نے رسی ایک طرف پھینکی پھر ٹھہر کر اسے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر لگا خون جما ہوا تھا، گال پر کسی کے تھپڑ کا نشان تھا۔ ہونٹوں کے کناروں سے خون رس رہا تھا۔۔ اس نے مزاحمت کی تھی اور اس مزاحمت کا شدید جواب دیا گیا تھا۔ وہ جلدی سے کھڑا ہوا۔

"جس نے آپ کے ساتھ یہ کیا ہے اس کی نشان دہی کر سکتی ہیں؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے سر اثبات میں ہلا گئی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتا اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ وہ بنا کسی سوال کے اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھی اور بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی جہاں بے حد سختی چھائی ہوئی تھی۔ لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ اسے اب اس سے فرق نہیں پڑتا تھا وہ یہاں کیسے آیا تھا اور کیوں آیا تھا؟ اس کے لیے بس اب یہ معنی رکھتا تھا کہ۔۔ وہ جندل۔۔ اسے۔۔ بیلا کو بچا کر لے جا رہا تھا۔۔ وہی تھا جو اس کی حفاظت کے لیے آیا تھا۔۔ جندل۔۔۔ جو اس کا محافظ بنا تھا!

وہ باہر آئے تو وہاں سامنے ہی چار مرد کھڑے تھے۔ اس نے ازابیلا کا ہاتھ دھیرے سے چھوڑا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ "ان میں سے کون؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ان سب پر ڈالی پھر ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بنا وقت ضائع کیے آگے بڑھا۔

"کون ہو تم؟" وہ چاروں اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ بنا جواب دیے آگے آیا اور زوردار مکا ایک شخص کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ شخص لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ باقی تینوں آدمی خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے آگے بڑھے تھے۔ اس نے تیزی سے ایک آدمی کے سینے پر لات مار کر دوسرے کی گردن دبوچتے ہوئے اس کا سر دیوار پر مارا تھا۔ باقی تینوں آدمی تب تک سنبھل چکے تھے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس پر وار کرنا چاہا جب اس نے پھرتی سے اس کا بازو پکڑ کر مروڑا اور ساتھ ہی جھٹکے سے اسے ایک طرف پھینکا۔ دوسرے آدمی نے پیچھے اس کی گردن دبوچنا چاہی جب اس نے اگلے ہی لمحے ایک طرف کو ہوتے ہوئے زغند بھر کر زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کی تھی۔ وہ آدمی منہ کے بل فرش پر گرا تھا۔ چوتھا تب تک اس پر پستول تان چکا تھا۔

"جندل پیچھے!!" وہ خوف سے چلائی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اسی لمحے اس آدمی نے ٹیگر دبا دیا وہ فوراً ایک طرف ہوا۔ گولی اس کے سامنے سے گزر کر دیوار میں پیوست ہو گئی۔ اس شخص نے دوبارہ گولی چلانا چاہی مگر پستول خالی تھی۔ وہ ہراساں نگاہوں سے جندل کو دیکھنے لگا جو اسے موقع دیے بنا آگے بڑھ کر اس کے جبڑے پر مکا رسید کر چکا تھا۔ اسے اپنا جبڑا ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جندل نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ کر اس کا سر دیوار میں مارا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون لکیر کی صورت میں بہنے لگا تھا۔ اس نے گریبان سے اسے پکڑ کر پیچھے ہٹایا پھر ایک اور مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ اسی لمحے میں جندل نے زوردار لات اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ پیٹھ کے بل فرش پر گرا۔ اس نے آگے بڑھ کر جاگرز میں مقید اپنا پاؤں اس کے سینے پر رکھا تھا۔

"اگلی بار کسی خاتون پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لینا کیونکہ اس کے بعد تمہیں موقع نہیں ملے گا!!" غصے سے کہتے ہوئے اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے لگا اور پھر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے چہرہ ترچھا کر کے کونے میں کھڑی ازابیلا کو دیکھا جس کی آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سُن ہو چکی تھی۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا تھا۔ وہ یونہی آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی اس کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔

وہ باہر آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر ہی جندل کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا تھا۔ کچھ لمحات بعد اس کی گاڑی سڑک پر دوڑتی اس جگہ سے دور جا رہی تھی۔

جندل نے برابر میں رکھی پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ وہ چپ چاپ بوتل تھام گئی۔ بوتل کا ڈھکن ہٹا کر اس نے بوتل لبوں سے لگائی۔ وہ ڈیش بورڈ پر رکھا رومال اٹھا کر اسے غٹاغٹ پانی پیتے دیکھتا رہا۔ اس نے بوتل لبوں سے

ہٹا کر گہری سانس لی تو جندل نے رومال اس کی طرف بڑھایا۔ وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر رومال تھام گئی۔ کچھ ہی لمحات میں وہ کہیں سے کوئی بسکٹ بھی برآمد کر چکا تھا۔

"کھالیں۔ طبیعت بحال ہو جائے گی۔" بسکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے مشورہ دیا گیا۔ وہ چپ چاپ بسکٹ تھام گئی۔ وہ توجہ سے ڈرائیونگ کرتا گاہے بگاہے اسے دیکھ رہا تھا جو خاموشی سے شیشے کے پار نظر آتی سڑک پر نگاہیں ٹکائے بیٹھی تھی۔ اسی اثناء میں اس کے کانوں میں سعاد کی آواز گونجی۔

"مارک اور ابراہم وارلڈ ازا کو لینے آرہے ہیں۔ انہوں نے غالباً اب جا کر مقام ڈھونڈ لیا ہے۔۔۔ خاصے سست ہیں!" اس نے جندل کو آگاہ کرتے ہوئے آخر میں اپنا تبصرہ پیش کیا۔ جندل نے لب دانتوں میں دبائے برابر میں بیٹھی ازابیلا کو دیکھا پھر دبی دبی آواز میں بولا۔ "انہیں کچھ دیر کے لیے روک دیں۔ پلیز!!"

"تم لوگ میری مہارت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔" وہ اس پر بگڑی تھی۔ جندل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ "ٹھیک ہے۔ یہ میرا پہلا اور آخری فیور ہے! تمہارے پاس بس دس منٹ ہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ رابطہ منقطع ہو گیا۔ ازابیلا نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ وہ خود کو اپنے ذہن میں آتے سوالوں کو زبان پر لانے کے لیے تیار کر چکی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا میں یہاں ہوں؟" آواز دھیمی اور نرم تھی۔ جندل نے کچھ کہے بنا اس کے ہاتھ میں موجود اپنے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے اس کی اسکرین روشن کی تو سامنے ہی ایک پیغام جگمگا رہا تھا جس میں اس مقام کا پتہ دیا گیا تھا۔ نمبر اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

"میں نہیں جانتا یہ میسج کس نے اور کیوں کیا؟" وہ کندھے اچکا گیا۔ اس نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔ "اور وہ لڑائی؟"

”میں فوج میں رہ چکا ہوں بیلا! اگر میری صحت میں مسئلہ نہ ہوا ہوتا تو میں اب بھی وہیں ہوتا۔“ کمال مہارت سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ وہ اس کا یقین کر گئی تھی۔ اسے کرنا پڑا تھا! مزید اس کے پاس کوئی سوال نہیں تھا۔ تبھی وہ سر جھکا کر گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں آتی نمی کو وہ بار بار پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جندل نے بریک پر پاؤں رکھے تھے۔ گاڑی جھٹکے سے رکی تھی۔ اس نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ رونا چاہتی ہو تو رو لو۔ گھر جا کر رونا مت، وہاں تمہارے آنسو تمہارے دشمنوں کی نظر میں آئیں گے۔“ اس نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا اشارہ مارک کی طرف تھا۔

”تم کیسے۔۔“

”اسے مائنک کی معذرت سمجھو۔“ ہلکا سا مسکرا کر کہتا وہ دروازہ کھولتا گاڑی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے پاس سے گزرا تھا۔ اس نے مسرت سے سر اونچا کر کے آسمان کو دیکھا تھا۔ آسمان۔۔ نیلا آبی آسمان جہاں اب سیاہ بادل جمع ہونے لگے تھے۔ یہ نیلاہٹ جلد ہی سیاہ رنگ میں بدلنے والی تھی۔ روئی کے ٹکڑوں جیسے بادلوں کے عقب سے موتی نما ستارے نمودار ہونے والے تھے۔ اور پھر وہ روشنی۔۔ مدھم اور خیرہ کن روشنی۔۔ تنہا چاند بھی سر اٹھانے لگا تھا۔ گاڑی کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا جندل، جس نے ذرا سا چہرہ ترچھا کر کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ازابیلا کو نرمی سے دیکھا تھا۔ وہ جو۔۔ دونوں پاؤں سیٹ پر رکھ کر بیٹھی اپنا سر گھٹنوں میں دیے رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں ان شیشوں کے پار دم توڑ رہی تھیں۔ وہ ان سسکیوں کو نہیں سن سکتا تھا مگر۔۔ اس کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے دل پر نمی کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

”تم کہہ رہے ہو کہ انہوں نے مارک سے اپنی شرائط منوانے کے لیے ازا کو استعمال کیا۔“ خیام کی بات پر وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔ ”مگر کون؟“

”ازا یقیناً جانتی ہو گی۔ میں صبح اس سے ملنے جاؤں گا تو پوچھ لوں گا۔“ زیاد نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ محفوظ تھی، اس خیال سے ہی وہ پرسکون ہو گیا تھا۔

”تم وارلڈ سے ملے؟“ جندل کے سوال پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ایسے لمحات میں ایک باپ کی ہوتی ہے۔ وہ بوڑھا لگ رہا تھا“!

”تم صبح کام پر جا رہے ہو؟“ خیام نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ وہاں جاؤں گا تو صورتحال معلوم ہو گی۔ اس گارڈ کی لاش واشروم میں تھی، یقیناً وہ سب کی نظروں میں آ گئی ہو گی۔ انہیں مجھ پر شک بھی ہو گیا ہو گا!“ جندل نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔ خیام نے نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

”سنبھل کر جانا پھر۔ ہم ضرار کے بعد تمہارا رسک نہیں لے سکتے۔“ اس کی بات پر وہ دونوں ہلکا سا مسکرا دیے۔ یہ احساس ہی کتنا سرشار کر دینے والا تھا کہ۔۔ وہ بحفاظت اپنے ملک پہنچ چکا تھا!!

”مائک کے ساتھ کیا کِیا تم نے؟“

”اس ٹانگ کے ساتھ میں کچھ کر سکتا ہوں؟“ اس نے معصومیت سے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں اسے گھور کر رہ گئے۔ انہیں مائک پر ترس آیا تھا۔

”بدر کے کیا احوال ہیں؟“ زیاد کے سوال پر دونوں نے کندھے اچکا دیے۔

”آج گھر جاؤں گا تو معلوم ہو گا۔ ویسے ہم کب تک اس کا انتظار کرنے والے ہیں؟“

"آج رات تک!" خیام نے بلا کی سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ دونوں ہنس دیے تھے۔ خیام کے ارادوں کو دیکھ کر ممکنہ امکانات یہی تھے کہ کل بدر ان کے ساتھ ہونے والا تھا!

"وہ بہت اچھا ہے ویسے۔۔" زیاد نے تبصرہ پیش کیا تھا۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" جندل کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"خیام سر کی تو پھر بات ہی الگ ہے۔" خیام نے فخریہ کالر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کا استاد بننے دو۔ تم دونوں کے نام بھی یاد نہیں رہیں گے اسے۔" زیاد نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ ان دونوں کے منہ کے زاویے بگڑے تھے۔

"اب تک کا سب سے کامیاب استاد میں ہوں"!

"اور اس کامیاب استاد کی کامیابی کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ تم اس میدان کے کھلاڑی نہیں ہو، ناکام شاعر!" جندل کے کہنے پر وہ منہ بسور کر رہ گیا۔

"اوئے ناکام شاعر۔۔" خیام نے میز سے کچھ اٹھاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "تمہاری شادی کا تحفہ!" اس نے ایک چابی اس کی طرف اچھالی تھی۔ زیاد نے مہارت سے چابی کو پکڑا پھر مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کے لیے اس سے بہترین تحفہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا، یقیناً نہیں!

"مجھ سے امید مت رکھنا۔ میں پہلے ہی تمہیں اپنی بہن دے چکا ہوں۔" جندل نے ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔

"صبح ملتے ہیں پھر۔۔ خدا حافظ!" وہ عجلت میں کھڑا ہو کر ہاتھ ہلاتا تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ اس کی عجلت دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گئے۔

☆☆☆

وہ مرے مرے قدم اٹھاتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ جندل کے دیے گئے رومال کو سختی سے مٹھی میں بھینچا ہوا تھا۔ دماغ مفلوج ہونے لگا تھا۔ اس کی آمد پر لاؤنج میں بیٹھا ابراہم تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

”ازابیلا۔۔بیٹے کہاں تھیں تم؟“ اس نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگاتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ اس کے سینے سے لگی خاموش کھڑی رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑا مارک پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس جاسوس سے نہیں مل سکا تھا کیونکہ اسی وقت انہیں ازابیلا کے مقام کا پتہ چل گیا تھا۔ جب وہ وہاں گئے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اور اب جب وہ وہاں سے مایوس ہو کر لوٹ آئے تھے اور اگلا لائحہ عمل سوچ رہے تھے تو وہ اس بکھری بکھری سی حالت میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”ازابیلا۔۔بیٹے جواب دو کیا ہوا ہے؟ کس نے کیا ہے یہ سب؟“ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیے پوچھ رہا تھا۔ اس نے نگاہیں ترچھی کر کے وہاں کھڑے مارک کو دیکھا۔ ابراہم نے پریشانی سے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

”وہ۔۔وہ مجھے ڈرانا چاہتے تھے۔۔“ اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے بے ربط سے الفاظ نکلے۔ ”وہ مجھے دھمکی دینا چاہتے تھے کہ۔۔میں آئندہ صحافت کا کام جاری نہ رکھوں۔“ اس نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دھیرے دھیرے اس کا دل اپنی مٹھی میں جکڑ کر خون نچوڑ رہا ہو۔

”ازابیلا۔۔۔کیا کرتی ہو تم اپنے ساتھ؟“ وہ بے بس ہوا تھا۔ ”تم ٹھیک ہو ناں؟ انہوں نے کوئی چوٹ تو نہیں پہنچائی؟“ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

”میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔۔بابا!“ اس کے کمزور سی آواز میں کہنے پر وارلڈ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے زینے چڑھ رہی تھی۔ مارک اور ابراہم اسے جاتا دیکھتے رہے تھے۔

”کیا وہ جھوٹ بول رہی ہے؟“

"میری بیٹی کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولتی۔ اس کے ساتھ جس نے بھی یہ کیا ہے انہیں ڈھونڈو اور بتاؤ کہ ابراہم وارلڈ اپنی بیٹی کی طرف اٹھنے والا ہر ہاتھ کاٹ کر دیکھتا ہے!" اس کے لہجے میں سختی تھی، آنکھوں میں قہر تھا۔ مارک نے سر کو جنبش دی۔ اسی اثناء میں اس کا فون بج اٹھا۔ وہ ابراہم سے معذرت کرتا باہر نکل آیا۔ کال اٹھا کر ایئر پوڈز آن کیے۔

"سر ہمیں ایک گاڑی ملی ہے جسے جلا دیا گیا ہے۔ آثرات سے یہ مائک کی گاڑی لگ رہی ہے۔ اب کیا حکم ہے؟"

مارک کے ماتھے پر بل پڑے۔

"یہ کمینہ اب کیا کرتا پھر رہا ہے؟!" اس نے کوفت سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔

گہری ہوتی رات کے ساتھ پوری آب و تاب سے چمکتے چاند کی روشنی اوپر دوسری منزل کے اس ٹیرس پر پڑی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں کسی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کانچ سی مقدس خاموشی کرچیوں میں بدل رہی تھی۔ روح پر لگے زخموں کی تکلیف کو آنسوؤں کے ذریعے کم کیا جا رہا تھا۔ کوئی مرہم ہو جیسے۔۔

☆☆☆

اندھیر راہداری اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ روشن ہوتی جا رہی تھی۔ بھاری بوٹوں کی آواز اس خاموشی میں پوری راہداری میں سنائی دے رہی تھی۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ دھیرے دھیرے اپنے قدم بڑھا رہا تھا۔ راہداری کے سرے پر اس کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ دروازے پر لگی چھوٹی سی اسکرین پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کمپیوٹر کی طرف سے اسے پہچان لیا گیا اور دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آ گیا، دروازہ بند ہو گیا۔ یہ سرد ٹھٹھرتا ہوا کمرہ تھا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ درمیان میں ایک میز رکھی تھی اور میز کے گرد دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی خالی تھی اور دوسری کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے، چہرے پر زخموں کے نشان

تھے۔ جلد کی اوپر کی جھلی گل رہی تھی۔ دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں بندھے تھے۔ وہ کہنیاں میز پر ٹکائے سر جھکائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا، یوں جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ جسم کے ہر حصے میں درد تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ تکلیف کے باعث اس کی کنپٹی کی رگیں کھنچی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ دانت سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنسا پھر کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”اپنے لیے بہت مشکل راستہ چن لیا ہے تم نے۔“ اس کا سرد لہجہ اس ٹھنڈے یخ کمرے میں جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گردن ترچھی کر کے اس نے دائیں طرف اس کالے شیشے کو دیکھا جس کے پار کھڑے آدمی ان کی ہر بات اور ہر اقدام جانچ رہے تھے۔

”تم سب مرو گے!!“ اس کی آواز میں نفرت پنہاں تھی۔۔۔بے پناہ نفرت۔

”فی الحال تم مر رہے ہو۔ اپنی حالت دیکھو۔“ وہ آنکھوں میں دلچسپی لیے آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔ ”تمہارا خون جمنا شروع ہو گیا ہے۔ تمہاری جِلد گلنے لگی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے چند گھنٹوں میں تمہارے اندر کے تمام اعضاء گلنے سڑنے لگیں گے۔ تم دھیرے دھیرے موت کی تکلیف محسوس کرو گے اور پھر اس وقت جب تم مرنے لگو گے تو تمہیں زہر کا تریاق دے دیا جائے گا۔ تم دوبارہ زندگی کی طرف لوٹو گے اور ایسی زندگی کی طرف جس میں تم ہر لمحہ موت کی بھیک مانگو گے!“ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ درد سے بری طرح کراہا تھا۔

”میں وہ نہیں ہوں۔ تم نے غلط آدمی کو پکڑا ہے میرا یقین کرو۔“ وہ منت سماجت پر اتر آیا تھا۔ اسے اپنی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”تم وہی ہو جسے ہم نے زہر دیا تھا۔ تم ہی حزب اللہ کے وہ جاسوس ہو جو الزرقاوی کا قاصد بن کر آیا تھا!“ پورے

اعتماد کے ساتھ کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں وہ جاسوس نہیں ہوں! وہ تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ میرا حزب اللہ سے کوئی تعلق نہیں!" وہ چلا اٹھا تھا۔ آنکھیں لال پڑنے لگی تھیں۔ سانس پھولنے لگا تھا۔ اس نے رک کر اسے دیکھا۔

"انسانوں کی طرح اعتراف کرلو ورنہ ہم خود کروالیں گے۔ تمہارے پاس صرف بارہ گھنٹے ہیں!" قہر بھری نگاہ اس پر ڈالتا وہ باہر نکل گیا۔ اس کے پیٹ میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہ درد کے مارے چلا اٹھا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھرنے لگی تھیں۔ "میرا حزب اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔۔!!" وہ پوری قوت سے چلایا تھا۔ درد اب ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ اسے اپنی موت صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ کمرے سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا راہداری میں چلنے لگا۔ اسی وقت دو آدمیوں کے ہمراہ مارک راہداری کے سرے سے نمودار ہوئے۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔

"کام ہو گیا؟" وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔

"وہ بہت جلد زبان کھولے گا!" اس نے مکمل یقین سے کہا تھا۔ مارک نے سر کو جنبش دی۔

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے، جلدی کرو۔ مجھے جلد از جلد ان جاسوسوں کے نام چاہئیں جو ہمارے اردگرد منڈلا رہے ہیں"!

"مجھ پر یقین رکھیں سر۔" اس نے سر کو جنبش دی۔ مارک ایک نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کچھ محسوس کرنے پر ٹھہر گیا۔ "سنو۔" مارک نے پلٹ کر اسے پکارا تھا۔

"یس سر۔" وہ بھی رک گیا۔

"تمہارے ہاتھ پر کیا ہوا ہے؟" مارک کے سوال پر اس نے ہاتھ پر لگے زخم کو دیکھا۔

”معمولی چوٹ ہے سر۔ اس جاسوس کو ایمبولینس سے نکالتے ہوئے لگ گئی تھی۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ مارک نے پلک چھپک کر اسے دیکھا پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ چند پل وہیں کھڑا رہا پھر سر جھکا کر اپنے ہاتھ پر لگے زخم کو دیکھا اور گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ اسے اس جاسوس کا منہ کھلوانا تھا، ہر حال میں!!

☆☆☆

اس نے لاک میں چابی گھمائی۔ کلک کی آواز سے دروازہ کھل گیا۔ وہ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے زینے چڑھنے لگا۔ اس سے ملاقات کا خیال اسے سرشار کر رہا تھا۔ دل پر جیسے ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑ رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں بس ختم ہونے کو تھیں۔۔

وہ تمام کام نمٹا کر فریش ہونے چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد باہر نکلی تو قرمزی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ کچھ نم بالوں کو پیچھے سے کیچر میں مقید کر کے باقیوں کو کمر پر کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ دیوار پر لگے اس قد آور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا عکس دیکھا۔ عموماً جو وہ خود میں دیکھتی تھی وہ اپنے چہرے پر موجود رونق ہوتی تھی اور آج وہ اپنی آنکھوں کے نیچے حلقے ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ کئی دنوں کی بے آرامی کا نتیجہ تھا۔ وہ گہری سانس لیتی جھک کر کریم ڈھونڈنے لگی تھی۔ وہ ابھی اسی کام میں مصروف تھی جب اچانک سے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ڈر کر پلٹی تھی۔ دروازے پر کھڑے زیاد کو دیکھ کر آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں۔ نم بال شانے پر آگرے تھے۔ وہ اسے

دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا پھر دروازہ بند کر کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا۔

”کیسی ہیں۔۔ سینیورا؟“ نرمی سے پوچھا گیا تھا۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ اپنے گھر جاؤ، تم سب برباد کر دو گے!“ اس نے مصنوعی غصے سے کہنا چاہا مگر وہ ناکام رہی۔ اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ وہ اتنے عرصے بعد یہ لفظ اس کے منہ سے سن رہی تھی۔۔ اس کا خواب پورا ہوا تھا۔۔ وہ سینیوریتا سے سینیورا بن چکی تھی۔۔ اسی کے ہمراہ!

”میں اس خالی مکان میں جا کر کیا کروں جبکہ میرے دل کا سکون یہاں ہے۔“ وہ بے فکری سے کندھے اچکا گیا۔

”تم میرے ساتھ ایسی باتیں نہیں کر سکتے۔“ اس نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔ آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں پگھلتی نمی دیکھ کر آگے بڑھا تھا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹی تھی۔ ”تم آ سکتے تھے۔۔۔!“ آنسو پلکوں سے جھول کر گال پر لڑھک گئے۔ دیوار کے ساتھ لگتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ آواز میں واضع لغزش تھی۔ وہ اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر وہیں رک گیا تھا۔ ”تم آ سکتے تھے۔ تم مجھے معاف کر سکتے تھے۔۔۔ تم نہیں آئے، تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔“ وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی تھی۔

”تم تک آنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے سینیورا۔۔ مجھے یہاں بھیج دیا گیا تھا۔“ اس نے عذر پیش کیا تھا۔ سعاد نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ کئی آنسو گالوں پر لڑھکتے چلے گئے تھے۔

”تم آ سکتے تھے۔۔۔ تب نہیں آئے تو اب کیوں آئے ہو؟ جب چاہا محبت کا اظہار کر دیا اور جب چاہا چھوڑ کر چلے گئے۔ انتظار کی سولی پر مجھے درد سے گزرتا دیکھتے رہے پھر لوٹ کر کیوں نہیں آئے؟!“ وہ رو دی تھی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تمام شکوے جائز تھے۔ وہ اس سے خفا ہونے کا بھی حق رکھتی تھی مگر وہ اس کے آنسوؤں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میرا کندھا۔۔ ہمہ وقت آپ کو اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہے۔۔۔ سینیورا سعاد!" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے ایک قدم آگے بڑھا تھا، وہ دو قدم آگے آئی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس کے کندھے پر سر کو پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔ وہ مضبوطی سے اس کے گرد اپنا حصار قائم کر گیا تھا۔ وہ سسک اٹھی تھی۔ آنسو زار و قطار بہنے لگے تھے۔ عرصے سے جمع غبارِ خاطر تھا جو آج آنسوؤں کی صورت نکل رہا تھا۔ کمرے میں چھائی خاموشی میں اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے آنسوؤں کی نمی اپنے کندھے پر محسوس کرتا دھیرے دھیرے اس کا سر سہلا رہا تھا۔ دھڑکنوں کی رفتار سست پڑی تھی۔ وہ اسے کبھی رلانا نہیں چاہتا تھا لیکن باوجود اس کے وہ اس وقت رو رہی تھی۔ وہ مطمئن بھی تھا کہ۔۔ وہ اس کے آنسوؤں کو پونچھنے کے لیے موجود تھا۔ وہ اسے خود سے لگا کر اس کے درد کو بانٹ سکتا تھا۔ وہی جو وہ اس وقت کر رہا تھا۔

بہت دیر بعد وہ اپنے آنسوؤں پر بند باندھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ سسکیاں دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی تھیں۔ وہ چند پل اسی طرح اس کے کندھے پر سر ٹکائے کھڑی رہی پھر دھیرے سے اس سے الگ ہوئی۔ وہ آرام سے اس کے گرد بندھے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر گیا۔ سعاد نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور اسے لگا تھا وہ اگلی سانس نہیں لے پائے گی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔۔ اسے کندھا پیش کرتے ہوئے، اس کا درد بانٹتے ہوئے وہ اپنی آنکھیں بھی نم کر بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ تکلیف یک طرفہ نہیں تھی۔ انتظار کی سولی پر درد سے دونوں گزرے تھے۔

"تم ایسے میرے لیے نہیں رو سکتے۔" وہ اس نمکین پانی کے قطرے کو انگوٹھے کے پور پر چنتی نم آواز میں خفگی سے کہہ رہی تھی۔ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بے تحاشا رونا بہت آسان تھا مگر اپنے لیے اس کی آنکھ سے نمکین پانی کا

ایک قطرہ گرتا دیکھنا بہت مشکل تھا۔

''میں صرف تمہارے سامنے ہی تو آنسو بہا سکتا ہوں۔ مجھ سے میرا یہ حق مت چھینو۔'' نم آواز میں کہتے ہوئے اس نے بہت آرام سے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر عقیدت سے اس کے بالوں پر اپنے لب رکھے تھے۔

''بہت برے ہو تم۔'' اس کا کمزور سا مکا اس کے کندھے پر پڑا تھا۔

''بہت اچھی ہو تم۔'' وہ نم آنکھوں سے خفیف سا مسکرایا تھا۔

''بہت زیادہ نفرت ہے مجھے تم سے!'' اس کے سینے سے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا گیا۔

''بہت زیادہ محبت ہے مجھے تم سے۔'' اس کے گالوں سے آنسوؤں کے نشانات مٹائے گئے۔ ''تمہاری تھوڑی سی ناراضی کے لیے نفرت بہت بڑا لفظ ہے قرارِ من!'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''تم پھر سے ایسی باتیں کر رہے ہو۔'' وہ منمنائی تھی۔

''کیا اب بھی نہیں کروں؟'' وہ اس کی پیشانی پر لگی سنی پلاسٹ کو چھوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں۔۔ تم ایسی پیاری باتیں اتنے پیار سے کرتے ہو تو۔۔۔ مجھے تم سے تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگتی ہے۔'' وہ اس کے معصومیت سے کہنے پر ہنس دیا تھا۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر ٹھہر سی گئی تھی۔ اتنے عرصے بعد اسے یوں ہنستا دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا۔۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ ہنستے ہوئے اچھا لگتا تھا۔

''کیا؟ اب میں ہنس بھی نہیں سکتا کیونکہ میری زوجہ کو مجھے ہنستا دیکھ کر مجھ سے تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگتی ہے؟'' وہ اسے خود کو محویت سے تکتا پا کر شریر ہوا تھا۔

''اڑالو مذاق۔۔'' اس نے ناک سکیڑی تھی۔ زیاد نے شرارت سے اس کی ناک دبائی تھی۔

”ایسے مت کرو۔ مجھے تم سے اور زیادہ محبت ہونے لگتی ہے۔“ وہ شریر نگاہوں سے اسے دیکھتا بمشکل اپنی ہنسی روک رہا تھا۔ سعاد نے آنکھیں سکیڑ کر خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔ اس کی لال ہوتی آنکھیں جن میں مسرت کے ساتھ ساتھ خفگی کی جھلک بھی تھی، دھلا دھلا سا چہرہ۔۔ نم بال، گہرے سیاہ اور لمبے۔۔ وہ اس کے بالوں کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اسے لمبے بال پسند تھے۔ سعاد کے بال دیکھتے ہوئے آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی بیوی دنیا کی نگاہوں میں بھلے عام سی تھی مگر اس کے لیے سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اگر دنیا اسے اس کی نگاہوں سے دیکھے تو یقیناً اس کی بات پر سر جھکا دیا جائے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس کی نگاہوں کو مسلسل خود پر محسوس کر کے اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔

اس نے بہت آرام سے اس کے بائیں رخسار پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا پھر اس کے کان کے پاس جھکا۔

”نکاح مبارک ہو، سینیورا!“ محبت بھری وہ سرگوشی اسے سرشار کر گئی تھی۔ وہ دلکشی سے مسکرائی تھی۔

”آپ کو بھی نکاح مبارک ہو۔۔ سینیور زیاد!“ اسے معتبر ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔

”تم نے کھانا کھایا ہے؟“ کچھ یاد آنے پر وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر سعاد کا سر نفی میں ہلا تھا۔ ”کیوں؟“ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

”کسی کا انتظار تھا۔۔ وہ جو میرے لیے آکر کھانا بنائے اور مجھے کھلائے۔“ وہ کندھے اچکا گئی۔ اس کے بالوں میں حرکت کرتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

”اگر میں نہ آتا تو؟“

”تو۔۔ یہ سیکریٹ ہے۔“ اس کے کان کے پاس سرگوشی کی گئی۔ اس نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ایسے مت دیکھو۔ کھانا چاہیے مجھے۔“ زیاد نے اس کے کہنے پر کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"ٹھیک دس منٹ بعد باہر آجانا۔" اس کا گال تھپتھپا کر کہتا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ محبت پاش نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو اگر حقیقت کا روپ دھار لیں تب بھی خواب ہی لگتے ہیں۔ آنکھوں پر یقین نہیں آتا، دھڑکنیں منتشر ہوتی ہیں اور ہر سانس بس اسی خوف کے زیرِ اثر لی جاتی ہے کہ اگر یہ خوبصورت خواب ٹوٹ گیا تو؟ کچھ اسی طرح کی حالت اس کی بھی تھی۔ اگر یہ خواب تھا تو وہ اسی میں جینا چاہتی تھی اور اگر یہ حقیقت تھی تو۔۔۔ وہ کبھی آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"میرا نام زیادتا شفین ہے۔"

"میں سعاد۔۔ سعاد یوسف زئی۔"

"کیا آپ کو کسی گائیڈ کی ضرورت ہے سینیوریتا؟" دھیمی آواز نرم لہجہ۔۔ کندھے پر سفری بیگ ٹکائے بغل میں تکیہ دبائے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا زیاد۔ اس کے عقب میں جھانکتا مالاگا کا ایئرپورٹ اور وہ سرمئی شام۔ اس کے دل پر ٹھنڈی پھوار پڑی تھی۔ اس سفر کا آغاز تو پھر یہیں سے ہوا تھا۔

وہ اس کے لیے کرسی کھینچ رہا تھا۔ اسے پلیٹ اٹھاتا دیکھ کر فوراً اس کے ہاتھ سے پلیٹ لی اور پھر خود ہی اس کی پلیٹ میں سالن ڈالنے لگا۔

"تم رو رہی ہو؟" وہ اس کی طرف ٹشو بڑھا رہا تھا۔

"ہر لڑکی سینیوریتا نہیں ہوتی! کچھ سینیورا بھی نکل آتی ہیں۔" وہ اس کے خفگی سے کہنے پر ہنس دیا تھا۔ وہ دونوں قرطبہ کے محراب کے پاس بیٹھے تھے۔ دونوں ہی بیک وقت اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوئے تھے۔

وہ نوالہ بنا کر اس نے منہ میں ڈال رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے برسوں سے یہ کام کرتا آیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں نمی

پگھلنے لگی تھی۔ نوالہ حلق میں اٹکنے لگا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگاتے ہوئے اس کی پشت سہلائی تھی۔

"دھیان سے چلا کرو ہر بار سیڑھیاں نہیں ہونگیں کبھی غرناطہ کی برجیں یا قرطبہ کی فصیلیں بھی ہو سکتی ہیں۔" وہ اس کے اور سیڑھیوں کے درمیان بازو حائل کیے کھڑا تھا۔ وہ قرطبہ کی طرف دوڑ رہی تھی اور وہ مسلسل اس کے پیچھے بھاگتا اسے پکار رہا تھا۔ وہ اشبیلیہ کے اس پرانے محلے میں کھمبے سے ٹیک لگائے سڑک پر بیٹھا تھا۔ شبنم میں بھیگتی رات میں اس نے شاید ہی کبھی ایسا کوئی خوبصورت منظر دیکھا تھا۔

وہ برتن اٹھا کر کچن میں رکھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ فریج سے ایک پیسٹری ڈھونڈ لایا تھا۔ پلیٹ میز پر رکھ کر وہ پلٹ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے کچن میں برتن سمیٹتا دیکھتی اس کا انتظار کرنے لگی۔

وہ گھبراہٹ کے مارے جلدی جلدی ملازم کو اپنا مدعا بیان کر رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ غرناطہ کی تنگ گلیوں میں دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اس نے خود کو موت کے دہانے پر محسوس کیا تھا اور تبھی وہ آیا تھا۔ بہت آرام سے اپنی شال اس کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اسے اپنی حفاظت میں لیا تھا۔ اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنا چاہے تھے۔

وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر پلٹا تو وہ اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ مسکراہٹ دباتا کرسی پر بیٹھا پھر پیسٹری چمچ میں بھر کر چمچ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ چپ چاپ اس کے ہاتھوں سے پیسٹری کھانے لگی۔

وہ دونوں الحمراء کے عقب میں کھڑے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان الحمراء پر نگاہیں ٹکائے۔ وہ ٹرین میں بیٹھے تھے۔ وہ رو رہی تھی، وہ اسے تنگ کر رہا تھا پھر اس نے اسی کا تکیہ کھینچ کر اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ ایئر پورٹ پر اسے الوداع کر رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی واپس اس کی طرف آئی تھی۔ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

وہ اب تمام کام نمٹا کر شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑا اس کے لیے کافی بنانے لگا۔ کبھی کبھی اسے نظر بھر کر دیکھتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ محویت سے اسے تکتی کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دے رہی تھی۔ وہ اب اس کی طرف پشت کیے کبڈ سے کپ نکالنے لگا۔

وہ اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ وہ اسے کلائی سے پکڑ کر راستے سے ہٹاتا دیوار کے ساتھ لگا چکا تھا۔ غصے میں اس کا ہاتھ اٹھا تھا، چٹاخ کی آواز گونجی تھی۔ وہ اپنا جھکا سر اٹھاتا بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی اور وہ اس کے ساتھ کھنچتا چلا گیا تھا۔ وہ اسے روتا دیکھ کر پنجوں کے بل نیچے بیٹھا تھا۔ اس سے اس کے آنسو پوچھنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا گیا۔ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ہنستے ہوئے کچھ کہا۔ وہ جواباً مسکرا دی تھی۔ وہ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کپ سے نکلتی بھاپ کو دیکھا۔

وہ بے یقینی سے ان الفاظ کو پڑھ رہی تھی جو اس نے چاکلیٹ کے ریپر پر لکھے تھے۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی مگر وہ جا چکا تھا۔ بھرے مجمعے میں نکھری نکھری سی گھاس پر کھڑے ہو کر ساکت نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر گرا تھا۔ وہ اس کا نام پکارتا اس کی طرف آ رہا تھا اور وہ پورے قد کے ساتھ گرتی چلی گئی تھی۔

وہ کپ دھونے کے بعد انہیں خشک کر کے کبڈ میں رکھ کر پلٹا۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کوئی سوال کیا جس پر اس نے جواباً نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس نے کلائی میں بندھی گھڑی کو دیکھا پھر کچھ کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا تو کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ اس کے پاس آ کر اس سے کچھ کہا۔ غالباً کسی چیز سے متعلق

کوئی تاکید کی۔ اس کے معصومیت سے سر کو جنبش دینے پر مسکرا کر اس کا گال تھپتھپاتا آگے بڑھ گیا۔

وہ نکاح نامے پر دستخط کر رہی تھی۔ وہ پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر اسے خود سے لگا رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھ سے گرتے آنسو کو اپنے انگوٹھے کو پور پر چُن رہی تھی۔ وہ اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان کے پاس جھکا تھا،

"نکاح مبارک ہو"!

وہ زینے اتر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ کرسی سے ٹیک لگاتی سکون سے آنکھیں موند گئی۔ محبت کے سفر میں اسے منزل مل چکی تھی۔۔ اسی منزل پر جہاں کھڑے ہو کر اس نے کہا تھا کہ،

"آپ کو بھی نکاح مبارک ہو۔۔ سینیور زیاد"!

☆☆☆

تاریک رات میں پوری آب و تاب سے چمکتے چاند کی روشنی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی کے آگے ماند پڑ رہی تھی۔ لمبی اور تاریک گلیاں جو بارشوں کی وجہ سے دھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے ارد گرد نگاہیں دوڑاتا دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہا تھا۔ سیاہ پی کیپ ماتھے پر ٹکائے اس سے پیشانی اور آنکھیں ڈھکے وہ اس تاریک رات میں پر اسرار شخص معلوم ہو رہا تھا۔ اپنی اسی معمولی رفتار سے وہ گلی کا موڑ مڑ گیا۔ دوسری گلی کا موڑ مڑ کر وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے اپنی رفتار سست کرنی پڑی۔ اس سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ کچھ اس انداز سے کھڑا تھا کہ اس روشن گلی میں وہ واحد تھا جو اندھیرے میں معلوم ہو رہا تھا۔ زیاد کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ اس لڑکے نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ کمال مہارت سے اپنے ہاتھ میں موجود خنجر کو گھمایا اور پھر اس کی طرف پھینکا۔ وہ بہت آرام سے ایک طرف ہو گیا۔ خنجر اس کے بالکل قریب سے گزر کر دیوار میں پیوست ہو گیا۔ اس لڑکے کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔

”کیوں بلایا ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”پلان میں تھوڑی تبدیلی کی جارہی ہے۔“ اس کی آواز بھاری تھی۔ لہجہ سپاٹ تھا۔ چہرے کو سفید رومال سے ڈھکا ہوا تھا، ماتھے پر سیاہ پی کیپ ٹکائی ہوئی تھی۔ وہ وہی لڑکا تھا جو مائک کو لے کر گیا تھا۔ ”جندل کو اسکائے ٹو میں داخل کرو۔ خیام کمپنی میں اپنا کام جاری رکھے اور تم ایلسا کے گھر والوں سے ملو۔ تنظیم جلد از جلد مارک کو ٹھکانے لگانا چاہتی ہے تاکہ جلد از جلد اس شخص تک پہنچا جاسکے جو اسکائے ٹو کی ڈوریں ہلا رہا ہے۔“

”اس کے علاوہ؟“ اس کے پوچھنے پر اس لڑکے نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک یو ایز بی نکال کر اس کی طرف اچھالی۔ اس نے یو ایز بی پکڑ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اپنی جیکٹ کی جیب میں اڑس دی۔

”مصعب الزرقاوی کے لیے بھی آرڈرز آئے ہیں۔ وہ تنظیم میں شامل نہیں ہوگا، وہ خیام کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ظاہر کرے گا بالکل ویسے ہی جیسے سعاد یوسف زئی! تمہیں اس کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔“ زیاد نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ لڑکا اب اپنی جیب سے مزید کچھ برآمد کر رہا تھا۔ کچھ ہی لمحات میں وہ ایک تصویر اس کی طرف اچھال چکا تھا۔ ”خیام سے کہو اس شخص کو ڈھونڈے۔“ زیاد نے بغور اس تصویر کو دیکھا۔ وہ کوئی مشرقی مرد تھا۔۔ گندمی رنگت، سیاہ بال، تیکھے نقوش، چہرے پر بلا کی سختی۔۔ اس کے لیے یکسر اجنبی!

”اس کے بعد؟“

”یہ تمہاری مدد کرے گا۔“ اس لڑکے نے کندھے اچکا دیے۔ اس نے سر کو جنبش دی۔ ”بس؟“

”سعاد یوسف زئی! اس کا پی ٹی ایس ڈی کا شکار ہونا تم سب کے لیے خطرہ ہے۔ اسے کسی ایسے کام میں انوالو مت کرو جس سے تمہاری جان کو خطرہ پڑ جائے۔ تنظیم کے لیے اس کا ہر فرد اہم ہے۔“ سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ سختی سے ہونٹ بھینچ گیا تھا۔ ”وہ تمہاری بیوی ہے جانتا ہوں، اس رشتے کی وجہ

سے ہر گز کمزور مت پڑنا! تم جانتے ہو حالات ایسے بھی ہو جاتے ہیں کہ ایک سپاہی خود اپنے عزیز کا گلا گھونٹنے کو تیار ہوتا ہے۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔" وہ پلک جھپکتے ہوئے سر کو جنبش دے گیا۔ وہ لڑکا ایک نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

"ضرار۔۔" اس کی آواز پر اس لڑکے کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ "ضرار کیسا ہے؟" اس کے انداز میں بے چینی تھی۔ اس لڑکے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "اس کا علاج چل رہا ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد وہ بہتر ہو جائے گا۔ کوشش کرنا کہ اب ضرار کے بعد کسی کا رسک نہ لو!" سنجیدگی سے کہہ کر وہ لڑکا آگے بڑھ گیا۔ زیاد سختی سے مٹھیاں بھینچے اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ بھاگتا ہوا واشروم میں آیا تھا۔ تیزی سے نکل کھولا اور اپنے ہاتھ دھار کی صورت میں بہتے پانی کے نیچے کر دیے۔ اس کے ہاتھوں پر بہت سا خون سا لگا تھا۔ وہ سختی سے انہیں رگڑ رہا تھا مگر خون تھا کہ مٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ناخنوں سے اس خون کو کھرچنا چاہا تو جلد پھٹ گئی۔ ہاتھ پر مزید خون نظر آنے لگا۔ اس نے یہ کاروائی جاری رکھی یہاں تک کہ اس کے ناخن خون سے بھر گئے۔ جلد کے اکھڑنے کی وجہ سے گوشت کے بہت چھوٹے سے ٹکڑے خون کے ساتھ ناخنوں میں جمع ہو گئے۔ اس نے ہراساں نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ گہرا سرخ انسانی خون اور گوشت۔۔ اس کی نگاہ پانی پر پڑی۔۔ پانی جو اب سرخ رنگ کا ہو رہا تھا۔ وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹا تھا۔ واش بیسن پر خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ اس نے چلانا چاہا مگر آواز دب کر رہ گئی۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ کر دوبارہ کھولیں تو اب کی بار شیشے پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ خون جو قطروں کی صورت میں شیشے سے لڑھکتا بیسن پر گر رہا تھا۔ ہر طرف خون تھا۔ اس کے ہاتھوں پر۔۔ اس کے وجود پر۔۔ اس کے اردگرد سرخ گاڑھا انسانی خون۔۔

اس نے گردن نفی میں ہلائی۔ اس ٹھنڈ میں بھی وہ پسینے میں شرابور تھا۔ ڈر کے مارے مکمل خود میں سمٹا وہ گردن دائیں بائیں ہلاتا خود کو کسی کی گرفت سے چھڑوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جندل نے ماتھے پر بل ڈالے اس کی حالت کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑا تھا۔

"میں نے نہیں مارا!!" وہ چلا کر کہتا اٹھ بیٹھا۔ خوف زدہ نظروں سے جندل کو دیکھا۔ پیشانی پر چمکتی پسینے کی بوندیں کنپٹی سے گرنے لگیں۔ وہ تیز تیز سانسیں لیتا اپنا بگڑا ہوا تنفس بحال کرنے لگا۔ جندل نے بغور اسے دیکھتے ہوئے ٹشو اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں پھر ٹشو تھام کر پسینے میں شرابور گردن صاف کرنے لگا۔

"خواب میں ڈر گئے تھے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"وہاں ہر طرف خون تھا۔۔ میرے ہاتھوں پر۔۔ میرے ناخنوں کے اندر۔۔ انسانی گوشت اور خون۔۔" وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جندل کو اس کی حالت پر ترس آیا تھا۔

"یہاں کیوں سو رہے ہو؟ کمرے میں کیوں نہیں گئے؟" بدر نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"تم جاؤ۔ میں سو جاؤں گا۔" اس کے کہنے پر جندل نے سر اثبات میں ہلایا پھر ایک نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بدر نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں گرایا تھا۔

"میں قاتل نہیں ہوں۔۔ میں نے کسی کو نہیں مارا۔۔ میں قاتل نہیں ہو سکتا۔۔" وہ دھیرے دھیرے بڑبڑا رہا تھا۔ آج تیسری رات تھی جب وہ اسی طرح خواب میں خون اور انسانی گوشت دیکھ رہا تھا۔ اسے اب خود سے گھن آنے لگی تھی۔۔ خود سے۔۔ بدر کے قاتل سے۔۔

وہ اپنے بستر پر لیٹا بدر کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اپنا تکیہ سینے سے لگائے بدر اندر داخل ہوا۔

"میں یہاں سو جاؤں؟ اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔" اس کے معصومیت سے پوچھنے پر وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔ بدر چپ چاپ آگے آیا۔ اس کے برابر میں تکیہ رکھا اور خاموشی سے لیٹ گیا۔ وہ بیڈ سے اٹھنے لگا تھا جب وہ بول اٹھا۔

"تم بھی ادھر ہی سو جاؤ پلیز۔ میں لاتیں نہیں مارتا۔" وہ اس کی بات پر تھوڑا جھجھک کا شکار ہوا مگر پھر سمٹ کر اسی کے برابر میں لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرے میں بدر کے خراٹے گونج رہے تھے اور وہ اپنے کانوں پر تکیے سے زور دیتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہی کوششوں کے درمیان کبھی کبھی بدر کی پڑنے والی زوردار لات سے وہ بمشکل اپنی چیخ روک پاتا تھا۔ مکمل بے چارگی کا ثبوت بنا وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے بدر کے حال پر رحم کھاتے ہوئے اسے اس کمرے میں سونے کی اجازت دی تھی۔

☆☆☆

اس نے بہت آرام سے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر اپنے سر سے پی کیپ اتارتے ہوئے پلٹا۔ مکمل سفید چادر میں لپٹی وہ صوفے کے پاس جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہ اپنی پی کیپ میز پر رکھ کر میز سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا۔ نگاہیں سفید فرش پر ٹکی تھیں۔ سماعت سے اس لڑکے کی باتیں ٹکرا رہی تھیں۔

"اس کا پی ٹی ایس ڈی کا شکار ہونا تم سب کے لیے خطرہ ہے۔ اسے کسی ایسے کام میں انولو مت کرو جس سے تمہاری جان کو خطرہ پڑ جائے۔"

"وہ تمہاری بیوی ہے جانتا ہوں، اس رشتے کی وجہ سے ہرگز کمزور مت پڑنا! تم جانتے ہو حالات ایسے بھی ہو جاتے ہیں کہ ایک سپاہی خود اپنے عزیز کا گلا گھونٹنے کو تیار ہوتا ہے۔" اس نے پلک جھپک کر گہری سانس اپنے اندر اتاری پھر چہرہ ترچھا کر کے ان اسکرینوں کو دیکھنے لگا جن کے آگے اس کا تمام دن گزرتا تھا۔ "کوشش کرنا کہ اب ضرار کے بعد کسی کا رسک نہ لو!" وہ لب دانتوں میں دبا گیا تھا۔ دل پر عجیب بوجھ سا آن گرا تھا۔ یہ خیال ہی کتنا درد بھرا

تھا کہ اگر وہ ٹھیک نہ ہوئی؟ اس کا علاج ضروری تھا اور اگر اس میں دیر کی گئی تو؟ ضرار کے بعد اگر کسی اور کی خطرناک حالت کی ذمہ دار بھی وہی ٹھہری تو؟ اسے تسلی دینا، اسے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد کرنا بہت آسان تھا مگر اس کے بوجھ کو خود اٹھانا، حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے ہر طرح کے حالات کے نتائج اخذ کرنا واقعی مشکل تھا اور تب بہت زیادہ کٹھن جب نہ حالات اس کے حق میں ہوں نہ نتائج!

اس نے نگاہوں کا رخ اس کی طرف کیا جو اب سلام پھیرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے اپنے قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے پاس پہنچ کو وہ بہت آرام سے فرش پر لیٹتے ہوئے اس کی گود میں سر رکھ گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے ناک پر ٹکا چشمہ اتار کر ایک طرف رکھا اور پھر بہت سکون سے آنکھیں موند لی تھیں۔ دعا مانگتے ہوئے اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس نے مزید زور و شور سے دعا جاری رکھی پھر کچھ دیر بعد دعا کے لیے اٹھے ہاتھ چہرے پر پھیر کر اسے دیکھا۔ زیر لب کچھ پڑھا اور جھک کر اس پر پھونک دیا۔ وہ آنکھیں کھولتا ہوا مسکرایا تھا۔

”کیا پڑھا؟“

”اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھیں، آمین۔“ وہ اپنی چادر کھولتے ہوئے مسکرا کر بتا رہی تھی۔

”اور دعا میں کیا مانگا؟“

”تمہیں۔“ مختصر سا جواب تھا جو اسے اندر تک سرشار کر گیا تھا۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے یک ٹک اسے دیکھے گیا جو چادر ایک طرف رکھ کر دوپٹہ سر پر لے رہی تھی۔ یہ کام بھی کر چکی تو بغور اسے دیکھتے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

”پریشان ہو؟“ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

”اب نہیں ہوں۔“ اس کا دایاں ہاتھ تھامتے ہوئے جواب دیا۔

”زیاد۔۔۔ تم نے اس تمام عرصے میں کیا کیا؟“ وہ اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے کھیلتے ہوئے جواب دینے لگا۔ ”جب تم زبردستی یونیورسٹی سے اپنے گھر لے گئی تھیں تو ہمارا پلان خراب ہو گیا۔ میری وجہ سے میرے ساتھوں کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی جس پر الزر قاوی سر نے تھوڑا سا ڈانٹا بھی تھا۔ اس کے تقریباً ایک ہفتے بعد میں ترکی گیا تھا اور پھر ڈیڑھ ماہ بعد واپس آیا تھا۔ تب جندل نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ میں تمہارے لیے بہت زیادہ خوش ہوا تھا۔ پھر جس دن مجھے تھائیلینڈ کے لیے نکلنا تھا اسی دن آفس میں تمہارا واویلا سنا تھا۔ اففف۔۔۔ کتنا لڑی تھیں تم جندل سے۔ اس وقت دل چاہا تھا باہر والی آفس سے نکل کر یہ نظارا خود دیکھوں مگر خواہش بس خواہش ہی رہی۔“ وہ ہلکا سا ہنس دیا تھا۔ ”اس کے بعد سے یہی ہوں۔ ڈیڑھ سال بعد جندل اور خیام آئے اور پھر ضرار۔۔۔ اس سے تمہاری منگنی کی خبر سنی تھی۔ میں نہیں جانتا میں نے کیسے خود کو رونے سے روکا تھا۔ مجھے لگا تھا میں نے تمہیں کھو دیا۔ ہاں تب میں نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ تم سے شکوہ تھا کہ میرا انتظار بھی نہیں کیا اور پھر تم مل گئیں۔ میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔“ محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”تمہیں مجھ پر کبھی غصہ نہیں آیا؟ مجھ سے کبھی نفرت نہیں ہوئی؟ تب بھی نہیں جب میری وجہ سے ضرار موت کے دہانے پر کھڑا تھا؟ تب بھی نہیں جب میری وجہ سے تمہارے ساتھیوں کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی؟ اور تب جب میں نے تمہیں پولیس کے حوالے کیا تھا؟“ اس کے سوال پر وہ دھیرے سے نفی میں سر ہلا گیا۔

”تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی سب کرتا۔ ضرار کے معاملے میں تم کبھی قصوروار نہیں تھیں۔ تم سے ہر حادثے کے بعد مجھے بس محبت ہوئی ہے۔۔۔ سینیورا!“ ہاتھ بڑھا کر دھیرے سے اس کی ناک دبائی تھی۔ اس کے لبوں پر دوڑتی

مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"تم ہمیشہ ایسے ہی بے باکی سے محبت کا اظہار کرتے تھے؟" اس کے شرارت سے پوچھنے پر وہ نفی میں سر ہلا گیا۔

"نہیں اب کرنے لگا ہوں۔۔ اور تم مجھے نہیں روک سکتیں!" مسکراتے ہوئے کہا گیا۔

"لیکن تم ایسے نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہو پھر مجھے تم سے تھوڑی محبت ہونے لگتی ہے۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا تھا۔

"میں اپنی زوجہ سے پیار سے پیار بھری باتیں نہیں کر سکتا، میں ان سے اظہارِ محبت نہیں کر سکتا، میں ایسے نہیں ہنس سکتا کہ پیارا لگنے لگوں کیونکہ اس سب کے بعد میری زوجہ کو مجھ سے تھوڑی محبت ہونے لگتی ہے۔ اور کچھ شامل کرنا ہے قرارِ من؟" اس کے شرارت سے پوچھنے پر وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے سوچنے لگی۔

"تم مجھے اتنے پیارے الفاظ سے مخاطب نہیں کر سکتے۔ سینیورا کہہ لیا کرو یا نام لے لیا کرو۔" ایک اور پابندی عائد کی گئی ساتھ ہی آسان حل پیش کیا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتیں محترمہ۔" وہ خفا ہوا تھا۔ اس کے بالوں میں چلتا اس کا ہاتھ ایک لمحے کو رکا پھر واپس حرکت کرنے لگا۔ "اچھا ٹھیک ہے بس قرارِ من نہیں!" تھوڑی سی گنجائش باقی رکھی گئی۔

"جانِ من؟" معصومیت سے پوچھا گیا۔ وہ فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ گئی تھی۔ رخسار لال ہو کر تپنے لگے تھے۔ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے پر آتے رنگوں کو دیکھتا ہنس دیا تھا۔

"تم ایسے نہیں کہہ سکتے۔۔!" اس نے دبی دبی آواز میں کہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتا اپنے سینے پر رکھ گیا تھا۔

"نہیں کہتا، اور حکم؟" وہ گہری سانس لیتی سر نفی میں ہلا گئی۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتا اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی

مسلسل خود پر جمی نگاہوں پر متذبذب ہوتی کوئی نئی بات سوچنے لگی۔ وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"زیاد۔۔۔ تم نکاح کے وقت کیا سوچ رہے تھے؟" اس کے سوال پر زیاد کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ۔۔ میری بیوی عام بیویوں جیسی نہیں ہو گی اور اسی لیے میں بھی عام شوہروں جیسا شوہر نہیں بنوں گا۔ جب وہ بہت سارا کام کر کے تھک جائے گی تو میں اس کے لیے کافی بنادوں گا۔ میں اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام بھی کروالوں گا۔ میں اس کی صحت کا خیال تھوڑا زیادہ رکھوں گا کیونکہ اس کا سارا دن اسکرین کے سامنے گزرتا ہے۔ میں اس کے لیے کھانا بھی بنادوں گا کیونکہ۔۔ میری بیوی مسٹر اینڈریو کے نام سے کسی کو بے وقوف بنانے میں مصروف ہو گی۔" وہ جو مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی، اس آخری جملے پر ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم جانتے تھے؟" آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"نہیں۔ خیام نے کہا تھا اینڈریو کے روپ میں اس کا کوئی شاگرد ہے۔ جب تمہارا راز کھلا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شاگرد نہیں شاگردہ ہے۔" وہ مسکرادیا۔ وہ خجلت سے لب دانتوں میں دبا گئی۔

"تم مجھ سے رابطے میں تھیں۔۔ میں تمہیں پہچان نہیں پایا۔" اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ "تم میرے قریب تھیں، میں بہت آسانی سے ہمارے درمیان فاصلے بڑھا گیا۔ تم وہیں اسی کمرے میں موجود تھیں، میں تمہیں دیکھ نہیں پایا۔ جس وقت جہاز پرواز بھر رہا تھا تو میں اپنی غیر معمولی دھڑکنوں کا پیغام نہیں سمجھ پایا جو تمہاری آمد کی خبر دے رہی تھیں۔۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ تھیں مگر میں انجان رہا۔ تم سعاد۔۔ تم کیا ہو یار؟ تم خود سے نفرت کا پوچھتی ہو یہ بتاؤ تمہیں کبھی مجھ پر غصہ نہیں آیا؟ مجھ سے نفرت نہیں

ہوئی؟ محبت کا دعوہ کیا تھا میں نے اور یہ کیسی محبت تھی جو تمہاری موجودگی محسوس نہ کر سکی؟ میں تمہارے قریب ہوتے ہوئے بھی تمہیں دور تلاش کرتا رہا؟ میں کبھی کچھ سمجھ ہی نہیں پایا۔۔" اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ وہ محویت سے اسے تکتی ہلکا سا مسکرادی تھی۔

"تم واقعی چاہتے ہو میں تمہارا منہ توڑ کر اپنے غصے کا یقین دلاؤں تمہیں۔" وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"اپنی محبت پر شک کرنے کے بجائے اپنی زوجہ کی قابلیت پر رشک کرو۔ تم مجھے پہچان نہیں پائے تو سوچو۔۔ میں کس کس کی نگاہوں میں دھول جھونک سکتی ہوں!" اس کے فخر سے کہنے پر وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"نفرت نہیں تو کیا کبھی محبت بھی نہیں ہوئی؟" وہ اس اچانک سوال پر گڑبڑا گئی تھی۔ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے پر آتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔

"ایسے سوال مت کرو!" وہ نظریں چرا گئی تھی۔

"اچھا تھوڑی محبت تو ہونے لگی ہے ناں؟" وہ شریر ہوا تھا۔

"کیا ضروری ہے محبت کا ہونا؟ کیا بس اچھا لگنا کافی نہیں؟" اس نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اپنی بات جاری رکھی۔

"میں نہیں جانتی یہ محبت کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں لیکن۔۔ اچھا لگتا ہے مجھے تمہارے ساتھ۔۔ اچھے لگتے ہو تم مجھے۔" اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"محبت کسے کہتی ہو سعاد؟"

"وہ جو تمہیں مجھ سے ہے۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر ہلکا سا ہنس دیا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھنے لگی۔ نگاہیں اس کے چہرے سے ہوتیں اس کے کانوں پر ٹکی تھیں۔۔ کان جو لال ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھی۔

"غیور مشرقی لڑکے کے کان اب بھی غیرت سے لال ہوتے ہیں؟" اس کے شرارت سے پوچھنے پر زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔اور کیا اس وقت اس مشرقی لڑکے کے رخسار بھی غیرت سے لال ہو رہے ہیں؟" مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔ سعاد نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے۔ وہ یونہی شرارت سے اسے دیکھتا رہا تو وہ ہلکی سی چیخ مارتی اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ گئی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنستا چلا گیا تھا۔

"تم ایسے نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہنسو بھی مت۔ میرے گالوں کو بھی مت دیکھو۔" وہ آنکھیں میچتے ہوئے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ رخساروں پر آتا سرخ رنگ مزید گہرا ہونے لگا تھا۔

"ہاتھ تو ہٹاو۔" وہ اس کے ہنس کر کہنے پر تیزی سے نفی میں سر ہلا گئی۔

"نہیں۔۔تم تنگ کر رہے ہو۔" وہ اس کے عجلت میں کہنے پر ایک بار پھر ہنس دیا تھا۔ وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی جو اپنی ہنسی روکنے کی کوششوں میں ناکام ہو رہا تھا۔

"اچھا سنو۔۔" ہنسی کے درمیان میں کہا گیا۔ "ایک تھا غیور مشرقی لڑکا، اور ایک تھی باحیا مشرقی لڑکی۔۔غیور مشرقی لڑکے کے کان غیرت سے لال پڑ جاتے تھے اور باحیا مشرقی لڑکی کے رخسار حیا سے تپنے لگتے تھے۔" وہ اپنی بات مکمل کر کھکھلا کر ہنسا تھا۔ وہ کانوں کی لو تک سرخ پڑ گئی تھی۔

"میں رو دوں گی اب ایسے تنگ کیا تو۔ میں سچ میں رو دوں گی۔" اسے دھمکی دی گئی تھی۔

"رونا کیوں؟ حیا سے کون روتا ہے بھلا؟" وہ ہنوز اسے تنگ کر رہا تھا۔

"زیاد!! میں آئندہ تمہیں گھر نہیں آنے دوں گی پھر۔" ایک اور دھمکی موصول کی گئی۔

"میں ویسے ہی آؤں گا جیسے آج آیا تھا۔ تم مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتیں۔" وہ اپنی ہنسی پر قابو پانے میں کامیاب

ہو گیا تھا۔ سعاد سے اب مزید کوئی جواب نہیں بن پایا تھا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑے تھے۔ زیاد نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کے رخسار پر چٹکی کاٹی تھی۔ وہ ہوش میں آتی واپس اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ گئی تھی۔

"ارے ارے۔۔اب تو کچھ نہیں کہہ رہا یار۔" اس کی ہنسی ایک بار پھر بے قابو ہوئی تھی۔

"نہیں۔۔اب جو بھی کہو میں ہاتھ نہیں ہٹاؤں گی۔۔" وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔

"اب نہیں کروں گا پکا۔۔۔"

"چپ بالکل چپ۔۔میں رونے بیٹھ گئی تو پھر مناتے رہنا۔" ان کی آوازیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ زیاد کی ہنسی، سعاد کی خفا خفا نگاہیں سب اس تاریک رات کی تاریکی میں چھپ رہا تھا۔ اور پھر یہاں تک کہ ہر آواز خاموشی کی طرف سے سلب کر لی گئی۔ ہر سرگوشی دم توڑ گئی۔ ہر سُو اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھا جب اس پر بالٹی بھر پانی پھینکا گیا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے سر جھٹک کر گہری سانسیں لیتے ہوئے سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ منظر دھندلا سا تھا۔ کوئی اس کے سامنے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ منظر صاف ہونے لگا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس کوئی لڑکا تھا جس نے سیاہ پی کیپ سر پر جما رکھی تھی اور سفید رومال سے چہرے کو ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گہری سانس لیتا سر جھٹک گیا۔ وہ سختی سے کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ زخموں پر پانی گرنے کی وجہ سے پورا وجود جلنے لگا تھا۔ بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی، لبوں کے کنارے کی جلد پھٹی ہوئی تھی۔ پیشانی پر گہرا زخم آیا تھا۔ ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ تکلیف ہی تکلیف تھی۔

"کیسے ہو؟" پرسکون سی آواز تھی۔

"کون ہو تم؟" اس نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کے بالکل قریب لگے اس تیز بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی جس سے اس کی اپنی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ دوبارہ سر گرا گیا۔

"وہ جس کے پیچھے ایک دنیا ہے۔" لہجہ میں مزاح کا شائبہ تک نہ تھا۔ انداز پر اسرار سا تھا جیسے جو کہا وہی حقیقت ہے، وہی سچ ہے۔

"کون؟" اس نے جسم میں اٹھتے درد کو بمشکل برداشت کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اس قید میں تمہارا ساتھی۔۔ جانتے ہو تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟" دلچسپی سے کہتا وہ آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں گھٹنوں پر رکھتے ہوئے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "مائک بار بار ا! بار بار ا گروپ کے آدھے شیئرز کا مالک جو غائب ہو چکا ہے۔ جیسے اسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔ اس کا نام مٹایا جا چکا ہے۔ کوئی اخبار اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ رہا، کسی نیوز چینل پر اس کا نام نہیں ہے۔ تم نے ایک اصطلاح استعمال کی تھی، یاد ہے؟

Damnatio memorie!

اسی کے مطابق تمہارا نام و نشان مٹا دیا گیا ہے۔ عنقریب تم لوگوں کی یادداشت سے بھی محو ہونے والے ہو۔" اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری تھی۔ اس کی آنکھیں۔۔ گہرے بھورے رنگ کی چمکتی ہوئی۔۔ عقاب کے جیسی دھاک بٹھانے والی۔۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ "تم۔۔ تم مرے نہیں؟" وہ لڑکا اس کے سوال پر سر جھٹک کر ہنستا پیچھے ہوا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"تم غلط سمجھے میں وہ نہیں ہوں۔ اگر وہ ہوتا تو تم زندہ نہ ہوتے"!

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

"اسکائے ٹو کی ڈوریاں کس کے ہاتھ میں ہیں؟" دو ٹوک انداز میں پوچھا گیا۔

”نہیں جانتا۔“ اس نے اعتماد سے جواب دیا۔”بھائی کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم“!

”مارک اسے کیوں چھپا رہا ہے؟“

”اب تک سب اسے چھپاتے آئے ہیں۔ ہم سب مہرے تھے، بادشاہ کے سپاہی تھے۔ میں، بابا، بھائی اور ہم سے نیچے تمام لوگ“!

”ابراہم وارلڈ؟“

”وہ بوڑھا۔“ وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔”اس سے اس کی کمپنی لے لو تو وہ ختم ہو جائے گا۔“

”اس کی بیوی کو کس کے کہنے پر مارا تم نے؟“

”بھائی کے کہنے پر!“ اس نے گہری سانس لی تھی۔

”کیوں؟“

”نہیں جانتا۔“ اس کے جواب پر وہ لڑکا کھڑا ہو گیا۔”میں کچھ گھنٹوں میں دوبارہ آؤں گا اور تب تم مجھے سب بتاؤ گے۔ اس مغالطے میں مت رہنا کہ کوئی تمہیں بچانے آئے گا۔ تم اپنی تمام زندگی اب یہیں سڑو گے!“ سختی سے کہتا قہر بھری نگاہ اس پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ مائک ٹھہر کر اسے جاتا دیکھتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر ساتھ ہی پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ وہ گہری سانس لیتا اپنا سر گرا گیا تھا۔

☆☆☆

”اسلام کو ایسے دل کی ضرورت ہے جو خدا کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوتا۔ ایسی گردن کی ضرورت ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا نہیں جانتی۔ ایسی تلوار کی ضرورت ہے جو خم کھانا نہیں جانتی۔ اسلام کو ایسے سپاہی کی ضرورت ہے جو خدا کی راہ میں فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر لڑ سکتا ہے۔ اسلام کو نیک دل، نیک خُو اور نیک

طینت انسانوں کی ضرورت ہے جو اپنوں سے غداری نہیں کرتے۔ ان علماء کی ضرورت ہے جو تیروں کی بارش اور تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھتے ہیں۔ خدا کے دین کو ان سنگِ مرمر کے مکانوں میں رہنے والوں اور بیش قیمت قبائیں زیب تن کرنے والے امراء کی ضرورت نہیں، ان صابر و شاکر سپاہیوں کی ضرورت ہے جو پیٹھ پر پتھر باندھ کر لڑ سکتے ہیں۔۔۔"!

(نسیم حجازی)

اس نے کتاب بند کر کے گہری سانس لی۔ فضا میں رچی نم مٹی کی خوشبو کو اپنے اندر اتارنا چاہا۔ وہ آلتی پالتی مار کر سمندر کے کنارے پر بیٹھا تھا۔ گود میں کتاب رکھی تھی اور نگاہیں بے کراں سمندر پر ٹکی تھیں۔ اسے سمندر سے کچھ خاص عقیدت نہیں تھی، اسے بس سمندر میں تیرنے والے وہ بحری جہاز پسند تھے جن میں قاصد آیا کرتے تھے۔ قاصد جو فتح کا پیغام لاتے تھے۔ اسے سمندر میں لڑنے والے وہ سپاہی پسند تھے جن کی تلواروں کی گونج سے لہروں کا شور ماند پڑ جاتا تھا۔

دور سے آتی بپھری ہوئی لہر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ جانتا تھا یہ بھی انہی لہروں میں سے ایک ہے جو ساحل پر سر پٹخ کر واپس چلی جاتی ہیں۔ ایک آخری نگاہ سمندر پر ڈالتا وہ کتاب سینے سے لگاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں سے کوئی دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر اس کا گھر تھا۔ ہاں وہ گھر اسے اتنا عزیز نہیں تھا جتنا اندلس والا گھر تھا۔ قرطبہ کی گلیاں اسے یاد آتی تھیں مگر اپنے باپ کی واپسی سے پہلے اس کا وہاں جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے باپ کو گئے دو ماہ ہونے کو تھے۔ وہ اپنے باپ کو بتانا چاہتا تھا کہ۔۔ انہوں نے جس بھائی کا ذکر کیا تھا وہ آچکا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی جو ابھی بس ایک ہفتے کا تھا۔ وہ جس میں اس کی جان بستی تھی۔ وہ جس کا نام اس نے "مصعب" رکھا تھا۔

مصعب کا خیال آتے ہی اس کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا تقریباً دوڑنے لگا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ اپنے

گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ آگ کے شعلوں کی نظر ہوتا یہ گھر اس کا آشیانہ نہیں تھا۔ سینے سے لگی کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر قدموں میں جا گری تھی۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ اس نے چلانا چاہا مگر آواز دب گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھا تھا۔

"والدہ۔۔ والدہ خیام آ گیا ہے۔" دیوانہ وار چلاتا وہ آگ کے شعلوں سے لڑتا گھر کے اندر آیا تھا۔ اس کی ماں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"والدہ نکلیں یہاں سے!!" وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر گڑ گڑایا تھا۔ اس کی ماں ساکت نگاہوں سے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کمرہ جو مکمل آگ کی نذر ہو چکا تھا۔ وہی کمرہ جہاں اس کا چھوٹا بھائی موجود تھا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھا۔ "وہ مر گیا ہے۔۔ والدہ مصعب مر گیا ہے خدارا چلیں یہاں سے۔" وہ رو رہا تھا۔ اپنی ماں کو جھنجھوڑ رہا تھا مگر وہ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ آگ دھیرے دھیرے تمام گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کے رونے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آنسو گرم سیال کی طرح گالوں پر بہہ رہے تھے۔ آگ کی تپش سے اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"والدہ چلیں۔۔ وہ مر گیا ہے۔۔ چلیں خدارا۔۔" وہ سسک اٹھا تھا۔ اس کی ماں نے سہم کر اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اپنا ہاتھ چھڑواتی اس کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ "والدہ رک جائیں۔ وہ مر گیا ہے، میرا بھائی مر چکا ہے خدارا واپس آئیں!!" وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ اسی اثناء میں وہ بے رحم آگ اس کی طرف لپکی تھی۔ "والدہ!!" اس کی آواز دبتی چلی گئی تھی۔ اپنا وجود چھت کے ملبے تلے محسوس ہوا تھا۔ اس کا آشیانہ ٹوٹ چکا تھا۔ اسے اپنا آپ بکھرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آگ کی تپش اور ملبے کا بوجھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ سر سے نکلتا خون اس کی پیشانی سے گرتا گالوں پر آنسوؤں کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا۔۔ اس کی ماں۔۔ اس کے مردہ بھائی کو سینے

سے لگائے دور جا رہی تھی۔ وہ رو ہی تھی۔۔ وہ رونا بھول گیا تھا۔ کیا کوئی ماں۔۔ اپنے زندہ بیٹے پر اپنے مردہ بیٹے کو ترجیح دے سکتی ہے؟!

آنکھ سے کئی آنسو گالوں پر بہتے چلے گئے تھے۔ زخموں پر نمکین پانی کر گرنے سے جلن کا احساس ہوا۔ وہ سسک اٹھا تھا۔ لب دھیرے سے پھڑ پھڑائے تھے۔ "بابا۔۔ والدہ۔۔ میں زندہ ہوں۔۔ آپ کا خیام۔۔ خیام حنفی زندہ ہے"!

ایک آگ وہ تھی جس نے اس کے آشیانے کو زیروزبر کر دیا تھا۔۔ وہ اس آگ سے بچ گیا تھا۔۔ اور ایک آگ وہ تھی جو وہ لگانے والا تھا۔۔ وہ آگ جس میں وہ جلنا اس کا مقدر تھا۔ خیام حنفی زندہ تھا کیونکہ۔۔ اس کے لیے زندگی کی سزا تجویز کی گئی تھی۔

☆☆☆

آگ کی تپش سے اسے اپنا جسم جھلستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو سفید کپڑے میں لپیٹے سینے سے لگائے اس آگ سے دور بھاگ رہی تھی۔ پاؤں پتھروں پر چلنے کی وجہ سے زخمی ہو چکے تھے۔ ایک دو جگہ پر ٹھوکر کھانے کی وجہ سے جسم پر خراشیں آئی تھیں۔ اپنی چادر سے بے پرواہ وہ بس بھاگ رہی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کو یہاں سے دور لے کر جانا تھا۔ اس آگ سے بہت دور۔۔

اس نے یونہی بھاگتے ہوئے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہ آگ کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس کا آشیانہ جل چکا تھا۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ اسے خیام کا خیال آیا تھا۔ روتا بلکتا خیام۔۔ اس کا اپنا بیٹا جسے وہ آگ میں جھونک آئی تھی۔ اسے لگا وہ اگلی سانس نہیں لے پائے گی۔ اس مردہ لاش کے گرد اس کی گرفت سخت ہوئی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھرنے لگیں۔ سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا تو جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے سامنے۔۔ بہت قریب۔۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے وہ وحشی درندے کھڑے تھے۔ اس کے گھر کو

آگ میں جھونکنے والے بحری قزاق! وہ نوجوان کپتان جس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکان تھی۔ اس نے پیچھے پلٹنا چاہا لیکن کسی نے اسے ٹھوکر ماری۔ وہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی۔ سفید کپڑے میں لپٹے بچے کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو زارو قطار بہنے لگے۔ اس نوجوان کپتان نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنا دو دھاری خنجر نکالا تھا۔ اسے اپنی موت دکھائی دی تھی۔

”میں جلد لوٹوں گا۔ اپنا اور خیام کا خیال رکھنا۔ اور میرے آنے والے بیٹے کا بھی۔“کسی کی دھیمی سی سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ نگاہوں کے سامنے وہ جوان چہرہ گھوم گیا تھا جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جو اس پر جان چھڑکتا تھا۔ نوجوان کپتان ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

”آپ والدہ سے بے حد محبت کرتے ہیں ناں؟“ معصوم سا لہجہ تھا۔ اسے لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

”ہاں بہت زیادہ۔۔ کیونکہ وہ تمہاری ماں ہے۔“ محبت سے کہا گیا تھا۔

کیا میں بھی بڑا ہو کر اپنے بچوں کی ماں سے بہت زیادہ محبت کروں گا؟“ وہ دونوں اس کے سوال پر کھکھلا کر ہنسے تھے۔ وہ سختی سے آنکھیں میچ گئی تھی۔ نوجوان کپتان اس کے سر پر کھڑا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے بالوں سے پکڑتے ہوئے اس کا سر اونچا کیا تھا۔

”اگر میں نہ لوٹا تو میرا وہاں انتظار کرنا جہاں ملنے والے کبھی نہیں بچھڑتے۔“خنجر کی تیز دھار اسے اپنی گردن پر چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اگلے ہی لمحے وہ بہت صفائی سے اس کی گردن پر خنجر پھیر چکا تھا۔ بالکل جیسے کسی جانور کو ذبح کیا ہو۔ خون دھار کی صورت میں ابل ابل کر بہنے لگا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ وہ آنکھوں میں انوکھی چمک لیے اپنے ہی خون میں ڈوبتی اس لاش کو دیکھنے لگا۔ نگاہ اس کے پہلو میں گرے بچے پر

پڑی۔۔ چھوٹا اور معصوم۔۔ آنکھیں موندے۔۔۔ اس جہان سے بے پروا۔۔

اس کا اگلا قدم رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ اس کا سخت جوتا اس بچے کے چہرے کو مسخ کر رہا تھا۔ وہ کمزور سی جلد پھٹ گئی۔ اس کا جوتا بچے کے خون سے سرخ پڑنے لگا۔ وہ نہیں رکا یہاں تک کہ ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آئی۔ اگر وہ مزید زور دیتا تو شاید اس معصوم کی آنکھیں بھی نکال دیتا۔ اس نے جوتا ہٹا لیا۔ ایک گہری نگاہ اس مسخ شدہ چہرے پر ڈالی پھر اسے اپنے جوتے سے ٹھوکر مارتا آگے بڑھ گیا۔ اس کی تقلید میں اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔

اس بات سے قطعی انجان کہ۔۔۔ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا خیام حنفی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف اس کے مصعب کی مسخ شدہ لاش تھی اور دوسری طرف اس کی ماں کا بے جان وجود۔ وہ کسی طرح خود کو اس آگ سے محفوظ کرنے میں کامیاب رہا تھا مگر یہاں۔۔ یہاں تو موت مزید دردناک تھی۔ اس نے چلانا چاہا مگر آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ آنکھیں کسی صحرا کی طرح خشک ہو گئیں۔ اس کے بازو پہلو میں آگرے اور اگلے ہی لمحے وہ لڑکھڑا کر گرا۔ بند ہوتی آنکھوں سے جو آخری چہرہ اس نے دیکھا وہ مصعب کا خون میں ڈوبا مسخ شدہ چہرہ تھا۔ اور جو آخری خواہش اس کے دل میں جاگی تھی وہ اپنی موت کی تھی۔۔۔!

☆☆☆

"میں آفس میں اپنا کام جاری رکھوں گا اور تم ایلسا کے گھر والوں کو ڈھونڈو گے۔ سوال یہ ہے کہ جندل کو کیسے اسکائے ٹو میں داخل کیا جائے؟" خیام نے اپنی زکام زدہ سی ناک رگڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھا جندل لیپ ٹاپ میں یو ایز بی لگا چکا تھا۔ ان کے سامنے صوفے پر زیاد بیٹھا تھا اور اس کے برابر میں سعاد۔ دونوں کے سامنے چائے کے کپ رکھے تھے جن سے گرم بھاپ اڑ رہی تھی۔

”مارک اسکائی ٹو میں ہے۔ یعنی بار بارا کمپنی اسکائی ٹو کے انڈر ہے اور یہ لسٹ اسی کے ملازمین کی ہے۔“ جندل نے لیپ ٹاپ کی اسکرین ان کے سامنے کی۔ وہ تینوں جھک کر اسکرین کو دیکھنے لگے۔

”سعاد۔۔ ان میں سے دیکھو جو کام کا لگے اس کا ڈیٹا نکالو۔“ خیام کی بات پر وہ سر کو جنبش دیتی کھڑی ہوئی۔ جھک کر لیپ ٹاپ سے یو ایس بی نکالی پھر اپنی میز کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں اب خیام کی طرف متوجہ ہوئے جو اپنی لال ہوتی ناک کو ٹشو سے رگڑ رہا تھا۔ مسلسل چھینکوں کی وجہ سے آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ زیاد کے سوال پر وہ سر نفی میں ہلا گیا۔

”زکام ہو گیا ہے اور شاید بخار بھی۔ آج آفس نہیں جا پاؤں گا۔ اس حالت میں آفس جانا مشکوک لگے گا۔“ اس کی بات پر اس نے سر کو جنبش دی۔

”تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔ اس شخص کو ڈھونڈو یہ ہمارے ساتھ کام کرے گا۔“ زیاد نے وہ تصویر اس کی طرف بڑھائی۔ خیام نے بغور اس تصویر کو دیکھا۔ وہ آدمی اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ اس نے چپ چاپ تصویر ایک طرف رکھ دی۔ جندل اس عرصے میں خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ ہی دیر میں سعاد کچھ کاغذ لیے صوفے پر بیٹھ رہی تھی۔

”اس آدمی کو بار بارا گروپ کے تمام ڈیٹا تک رسائی حاصل ہے۔ اس کے بعد یہ۔۔ یہ بار بارا گروپ کے تمام معاملات دیکھتا ہے۔ کمپنی کا سی ای او اور سب سے بڑھ کر یہ شخص۔۔“ اس نے تیسرا کاغذ میز پر رکھا۔ ”یہ شخص کمپنی کا پرسنل ہیکر ہے!“ وہ تینوں اس شخص کی تصویر کو دیکھنے لگے۔ سرمئی رنگ کے ڈائے شدہ گھنگھریالو بال، شیو زدہ چہرہ اور بائیں کان میں بالی۔۔ وہ شخص اپنے حلیے سے واقعی ایک ہیکر لگتا تھا۔

”اگر اسے راستے سے ہٹا دیا جائے، ساتھ ہی کمپنی پر سائبر اٹیک ہو تو بار بارا گروپ کے پاس ایک نئے ہیکر کو ہائر

کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ اور ایسے میں اگر جندل وہ ہیکر بنے تو وہ کمپنی میں داخل ہو سکتا ہے!" اس نے پلان ترتیب دے کر سوالیہ نگاہوں سے تینوں کو دیکھا جو سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"کتنے پرسنٹ چانسز ہیں کہ کمپنی میں داخل ہونے کے بعد اسکائے ٹو میں بھی اس کا داخلہ ممکن ہو گا؟" زیاد نے سوال اٹھایا تھا۔

"تقریباً پچاس فیصد! کیونکہ ہر کمپنی کو ہر وقت سائبر اٹیکس کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر ایسے میں اٹیک ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً جندل کو ہائر کریں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو۔۔ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا واقعی اسکائے ٹو مارک کے انڈر ہے یا پھر وہ بھی اس کا ایک عام سارکن ہے؟"

"کمپنی پر سائبر اٹیک آسان ہو گا؟" جندل کے سوال پر اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تھوڑی سی محنت اور میں کر لوں گی۔ مجھے ہمیشہ سے اس کی خواہش رہی ہے۔" اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔

"حملہ بار بار اکمپنی پر نہیں وارلڈ گلاس کمپنی پر ہو گا۔ ایک تیر سے دو شکار!" خیام نے گویا فیصلہ سنایا تھا۔ تینوں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگے۔ "اسٹیون بھی وارلڈ گلاس کمپنی کا پرسنل ڈیٹا چرانے کی کوشش کر چکا ہے۔ اگر ہم اس ڈیٹا تک رسائی حاصل کر لیں تو نہ صرف وارلڈ کے متعلق جان سکتے ہیں بلکہ اسکائے ٹو میں بھی داخل ہوا جا سکتا ہے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"تو کام شروع کریں؟" سعاد کے سوال پر وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔ وہ جوش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلان کیا ہے؟" اس نے ناک پر ٹشو رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"co_operative Cyber attack!"

وہ مسکرائی۔ پھر جھک کر میز سے زیاد کا کپ اٹھا کر خیام کے آگے رکھا۔ "چائے پی لیں۔ بہتر محسوس کریں گے۔"

وہ میز پر پھیلے کاغذ اور اپنا چائے کا کپ اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ خیام نے ایک نگاہ کپ سے نکلتی بھاپ پر ڈالی پھر کپ اٹھا لیا۔

"کتنا وقت لگے گا اس میں؟" زیاد نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ مجھے کم از کم اڑتالیس گھنٹے تو لگیں گے۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔

"جندل تم مارک کے گھر جاؤ۔ وہاں سے جتنی معلومات اکٹھی کر سکتے ہو کرو، پھر کل جاب چھوڑ دینا۔" اس کے کہنے پر جندل نے سر کو جنبش دی۔

"تم میرے ساتھ لائبریری آجاؤ۔" اس نے چائے کے گھونٹ بھرتے خیام کو دیکھ کر کہا۔ "ازا آرہی ہے ملنے۔ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا تو وہیں سے کام شروع کر دیں گے۔"

"اور تم نے جو اس کے دماغ میں میرے خلاف زہر اگل رکھا ہے؟" اس نے تڑخ کر پوچھا تھا۔

"تمہیں منظرِ عام پر آنے کی دعوت کس نے دی ہے؟" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے سوال کے بدلے سوال کیا۔ خیام چائے کا کپ خالی کر کے سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جندل اور زیاد نے بھی اس کی تقلید کی۔

"کوشش کرو جلد از جلد یہ کام کر لو۔" وہ گردن ترچھی کر کے سعاد کو کہہ رہا تھا جو اسکرین پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ غالباً کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے جواباً خاموش رہنے پر وہ جندل کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔ زیاد دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا۔ سعاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"اپنا خیال رکھنا۔"

"ازا سے ملنے جا رہے ہو؟" وہ اس کے سوال پر اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔

"لائبریری جا رہا ہوں۔ پھر وہیں سے اسٹیشن چلا جاؤں گا۔"

"کب لوٹو گے؟" سست پڑتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

"ایک دو دن میں۔۔ ان شاء اللہ۔" اس کے رخسار کو سہلاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ جواباً ہلکا سا مسکرا دی۔

"رابطے میں نہ رہوں شاید۔ پریشان مت ہونا۔"

"یہ تم مجھے کہہ رہے ہو؟ تم دنیا کے تیسرے کونے میں بھی چلے جاؤ تو وہاں بھی تم سے رابطہ کرنے میں کامیاب ٹھہروں گی۔ مجھے ہلکا مت لو!" اس نے فخر سے گردن اکڑا کر کہا تھا۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"تم میرا غرور ہو یار۔۔!" اس نے محبت سے کہا تھا۔ سعاد کی آنکھیں فخر سے چمکی تھیں۔

"اب جاؤ۔۔ فی امان اللہ۔"

"اللہ حافظ۔" اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا پھر اس کا گال تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ یک ٹک اسے جاتا دیکھتی رہی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ وہ چلا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چائے کا کپ اٹھایا۔ پھر چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اسکرین پر آتے اعداد و شمار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

انتظار کی ہر گھڑی اسے مزید بے چین کر رہی تھی۔ مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں۔ ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں اور ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا بے حد مضطرب نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک لمبی میز تھی جس کے دائیں بائیں کچھ فاصلے سے کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اس بڑے سے ہال میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ مارک کے علاوہ تمام چہرے اندھیرے میں تھے۔ اس کے چہرے پر پڑتی روشنی اسے سب میں نمایاں کر رہی تھی۔ وہ سب کمر سیدھی کیے بیٹھے تھے۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ میز سے کچھ فاصلے پر

دو آدمی کھڑے تھے۔ سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس چہروں پر ماسک چڑھائے۔ مارک کی نگاہیں بار بار ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موجود مضبوط رسی پر پڑ رہی تھی۔ اس کے لیے موت کا پھندہ تیار تھا۔ اس نے لب دانتوں سے کاٹتے ہوئے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا تھا۔

کچھ لمحات مزید انتظار میں گزر گئے اور پھر کسی کی اسٹک کی آواز سنائی دی۔ بھاری بوٹوں کی چاپ۔۔ کوئی ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ سب نے اپنے سر جھکا لیے تھے۔ وہ شخص پورے اعتماد سے چلتا سربراہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بھی مکمل اندھیرے میں تھا۔ بس ایک ہیولا سا تھا جو اسے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

"مارک بار بارا۔۔ اب تک اپنی غلطیوں کے بارے میں کیا کہو گے؟" بھاری آواز تھی۔ لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینے کی ننھی بوند اس کی ہتھیلی پر گری۔

"میں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرتا ہوں۔" اس کی آواز کانپ گئی۔

"تم اسٹیون کو حزب اللہ سے مروا نہیں سکے، تم نے بار بارا گروپ کو عدالت میں جھونک دیا۔ تم مائک کو قابو میں نہیں کر سکے حتیٰ کہ تم اب تک یہ نہیں جان پائے کہ تمہارے ارد گرد تمہارے ساتھ سائے کی طرح موجود افراد میں سے کون حزب اللہ کا جاسوس ہے؟!" آواز بلند ہوتی گئی۔ اس نے سختی سے اپنی آنکھیں میچی تھیں۔ اس کے پاس اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔!

"مجھے آخری موقع دیا جائے۔" اس کی کمزور سی آواز ہال میں گونجی تھی۔

"مارک بار بارا کے حق میں کون کون ہے؟!" ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالی گئی۔ سب خاموش رہے۔ صرف ایک دو نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنی روح فنا ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

سربراہی کرسی پر بیٹھے شخص کی طرف سے ان دو لڑکوں کو اشارہ ملا۔ وہ دونوں بنا چاپ پیدا کیے آگے آئے تھے۔

مارک نے اپنے عقب میں ان کی موجودگی محسوس کی تھی۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کے کوٹ پر لگا بیج اتارا تھا۔ بیج جس پر اسکائے ٹو کا نشان موجود تھا۔ دوسرے لڑکے نے اپنے ہاتھ میں موجود رسی کو جھٹکا دیا اور اگلے ہی لمحے وہ رسی اس کی گردن کے گرد پھسا کر اس پر دباؤ ڈالا تھا۔ گرفت سخت تھی، اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ آنکھیں ابلنے کو تھیں۔

"زیاد۔۔ زیاد تاشفین۔۔ جاسوس۔۔" بے ربط سے الفاظ اس کے منہ سے نکلے تھے۔ اس لڑکے کو رکنے کا اشارہ ملا۔ اس نے جھٹکے سے وہ رسی اس کی گردن سے کھینچ لی۔ وہ اپنی گردن رگڑتا کھانسنے لگا تھا۔ آنکھوں میں تکلیف کی شدت سی نمی چمکی تھی۔

"زیاد تاشفین حزب اللہ کا جاسوس ہے۔ میرے ایک حکم پر اس سے سب اگلوایا جا سکتا ہے۔" اس نے خوفزدہ نگاہوں سے اس ہیولے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے تم نے اس جاسوس سے اگلوالیا جسے تم نے زہر دیا تھا؟" لہجے میں طنز کا شائبہ تھا۔ وہ آنکھیں میچتا ہوا گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"مارک بار بارا کو ایک موقع دیں۔ یہ قابل اور باصلاحیت ہے۔ بار بارا گروپ میں صرف اسی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کمپنی اسی کے کندھوں پر کھڑی ہے۔" بھاری اور رعب دار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس نے سکون کی سانس لی تھی۔ اسے یقین تھا جس نے اس کی سفارش کی تھی، اس کی بات کبھی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔

"تم اس کی گارنٹی دینے کو تیار ہو؟"

"اگر اس سے ایک اور غلطی ہوئی تو اس کا گلا میں خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹوں گا!" اس ہیولے کے سامنے احترام سے سر جھکا دیا گیا۔ مارک گہری سانس لیتا کرسی سے ٹیک لگا گیا۔

”ایک آخری موقع مارک! حزب اللہ کا کھیل جلد از جلد ختم کرو۔“ اسے حکم دیا گیا تھا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں بہت جلد ان سے نمٹ لوں گا!“ اس کی بات مکمل ہوئی اور وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ اسٹک کے فرش سے ٹکرانے کی ہلکی سی آوز پیدا ہوئی۔ وہ شخص دور جانے لگا اور پھر ہال سے نکل کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ مارک نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ گلے میں پڑے اسٹال کو سیٹ کرتی زینے اتر رہی تھی جب اپنے کمرے سے نکلتے ابراہم کی نگاہ اس پر ٹکی۔ وہ کل رات کی نسبت اس وقت ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔ چہرے پر رونق تھی۔ ہاں اب وہ ان کی ازابیلا لگ رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے زینوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ آخری زینے پر رک گئی۔

”صبح بخیر بابا۔“ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ اسے لگا تھا ان کی زندگی میں بہار لوٹ آئی ہو۔

صبح بخیر بیٹے۔۔ کہیں جا رہی ہو؟“

”جی آفس جا رہی ہوں۔“ اس نے بے فکری سے جواب دیا۔ وارلڈ جواباً خاموش ہو گیا۔ چند پل پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ سنجیدگی سے کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے اس کے پیچھے آئی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ بہت آرام سے کہا گیا تھا۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیوں؟“ بہت کمزور سی آواز میں پوچھا گیا تھا۔

”میں مزید تمہیں خطرے میں نہیں دیکھ سکتا۔ بہتر ہے تمہیں کسی ایسے لڑکے کے حوالے کر دیا جائے جو تمہاری حفاظت کر سکے!“ وہ محافظ کی بات کر رہا تھا۔ وہ یک ٹک انہیں دیکھے گئی۔

”کس کی بات کر رہے ہیں۔۔ بابا؟“ اسے اپنی ہتھیلیاں نم پڑتی محسوس ہوئی تھیں۔

”مارک کی۔ وہی تمہاری حفاظت کر سکتا ہے، تم اسی کے ساتھ محفوظ ہو سکتی ہو!“ فیصلہ کن انداز میں کہا گیا تھا۔ اسے لگا تھا کسی نے اس کے سر پر پہاڑ توڑ دیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسی مارک کی بات کر رہا تھا جس کی وجہ سے وہ دو بار موت کے منہ میں پہنچی تھی۔ وہ اسی کو اس کا محافظ بنانا چاہتا تھا، اسے قدرت کے اس مذاق پر ہنسی آئی تھی۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے ازابیلا؟“ اس نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ چند پل لب دانتوں میں دبائے اضطراب سے انہیں دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”بابا۔۔ میں نہیں جانتی کیا سچ ہے کیا جھوٹ مگر کل صبح مائک مجھ سے ملنے آیا تھا۔۔ اس نے کہا تھا کہ مارک بھی اسٹیون کی طرح دہشتگردی میں ملوث ہے۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ۔۔“

”اسے غلط فہمی ہوئی ہے ازابیلا!“ اس نے اس کی بات کاٹی تھی۔ وہ لب بھینچ گئی۔ وہ اپنے باپ سے کسی ایسے ہی ردعمل کی توقع کرتی تھی۔ اسے مارک پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ ”مارک کو جوان ہوتے دیکھا ہے میں نے، بہت گہرائی میں جانتا ہوں مَیں اسے۔ تمہیں اندیشوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔“ وہ بے بسی سے اپنا سر جھکا گئی۔ گود میں رکھے ہاتھوں کو وہ رگڑ رگڑ کر لال کر چکی تھی۔ اسے کسی بھی طرح اپنے باپ کو انکار کرنا تھا مگر کیسے؟ وارلڈ بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا اور پھر کچھ دیر بعد وہ اس سے پوچھ رہا تھا، ”تمہیں کوئی پسند ہے ازابیلا؟“ اس نے چونک کر سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ہاں یہی وہ طریقہ تھا جو کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ شاید یہاں اس کی بات مان لی جاتی۔

”جی بابا۔“ اس کی آواز بہت دھیمی پڑی تھی۔

”کون؟“ اگلا سوال مزید مشکل تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ ذہن میں کوئی نام نہیں آیا۔ وہ اس شش

و پنج میں مبتلا تھی کہ نگاہ میز پر رکھے اپنے موبائل کی روشن اسکرین پر ٹکی۔ وہاں جندل کی کال آرہی تھی۔ اس نے فوراً سر اٹھایا۔ ”جندل۔۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ وارلڈ کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

”جندل یوسف زئی۔۔ میرا کلاس فیلو تھا۔ مجھے اچھا لگتا ہے اور۔۔ تبھی میں مارک سے شادی نہیں کر سکتی!“ اس نے گویا فیصلہ سنایا تھا۔ اسے اپنی عجلت پر خود حیرانی ہوئی تھی۔ جندل کی کال بند ہو چکی تھی۔ اس نے پر امید نگاہوں سے وارلڈ کو دیکھا جو گہری سوچ میں پڑ چکا تھا۔

”مسلمان ہے؟“

”جی بابا۔۔ لیکن مذہب آپ کے لیے کبھی معنی نہیں رکھتا۔“

”لیکن اس کے لیے رکھتا ہے۔ وہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔ ایک مسلمان ایک ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جس کا کوئی مذہب نہ ہو!!“ جلدی میں اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوا تھا وہ کیا کہہ گیا تھا۔ ازابیلا نے پلک جھپک کر اسے دیکھا تھا۔

”اور اگر میرا کوئی مذہب ہو تو؟“ وارلڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم اس سے شادی کے لیے اسلام قبول کرو گی؟“ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

”تم سمجھ نہیں رہیں ازابیلا! وہ مسلمان ہے اور اگر تم صرف اس سے شادی کے لیے اسلام قبول کرو گی تو بھول جاؤ وہ کبھی تمہیں اپنائے گا۔ ان مسلمانوں کے لیے یہ سب بہت بڑی چیزیں ہوتی ہیں۔ مذہب کے نام پر مر مٹنے کو تیار ہوتے ہیں۔“ وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

”وہ نہیں تو کوئی نہیں!“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا پھر ہینڈ بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وارلڈ نے بے بس نگاہوں سے

اسے دیکھا جو الوداعی نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ لاؤنج سے نکلنے تک اسے اپنی پشت پر وارلڈ کی نگاہیں محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اپنے انداز اور اپنی باتوں پر آج خود حیران رہ گئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی تھی وہ کتنی آسانی سے جھوٹ بولنے لگی تھی، بالکل ویسے ہی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے کبھی وہ سچ بولا کرتی تھی۔ اپنی اس اچانک تبدیلی کی وجہ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھا جب اس پر ٹھنڈا یخ پانی پھینکا گیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کے سامنے کرسی پر وہی کل والا لڑکا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ ماتھے پر سیاہ پی کیپ ٹکی تھی اور چہرے کو ہنوز سفید رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔

”تو تم نے بولنے کا فیصلہ کیا؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھا گیا۔ وہ گہری سانس لے کر اپنا سر گرا گیا۔

”میں نہیں جانتا اسکائی ٹو کس کے انڈر ہے۔ بھائی کے سوا کسی کو نہیں معلوم!“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں اپنی بات دہرائی تھی۔

”تم کس سے حکم لیتے تھے؟“

”میرا کبھی اسکائی ٹو سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ بابا اس کے رکن تھے مگر پھر وہ بھی الگ ہو گئے اور تبھی اسکائی ٹو نے انہیں مروا دیا۔“

”اسٹیون نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟“

”کیونکہ اسکائی ٹو انہیں وہ نہیں دے رہا تھا جو انہیں مطلوب تھا۔ بار بار اگروپ کا تمام کنٹرول بھائی کے ہاتھ میں جا رہا تھا اور وہ ایسا نہیں ہونے دے سکتے تھے۔“

”مارک کیوں؟“ ایک اور سوال۔ مائیک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

”اسکائے ٹو میں سیٹس ہوتی ہیں۔ دس سیٹس جن میں سے ساتویں پر بابا تھے اور چھٹی پر بھائی! جو اوپر ہو گا کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہو گا۔“ وہ لڑکا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم کہنا چاہ رہے ہو کہ اسکائے ٹو باقاعدہ ایک پوری تنظیم ہے اور مارک اس کا ایک عام سا رکن ہے؟ یعنی اس سے اوپر بھی لوگ بیٹھے ہیں؟“ اس کے سوال پر مائیک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”وہ سب اپنے وقت کے بڑے بڑے وحشی جانور ہیں۔ ایسے درندے جن کے ہاتھوں پر لاکھوں انسانوں کا خون ہے۔ لیکن وہ کون ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ سب چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے تک کو نہیں پہچان سکتا۔“ اس نے تفصیل بتائی۔ وہ لڑکا پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”اسٹیون ساتویں نمبر ہے۔ آٹھویں، نویں اور دسویں نمبر کا کیا؟“ اس کے سوال پر مائیک نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

”انہیں حزب اللہ مار چکی ہے۔ جلد ہی ان کی جگہ دوسرے لوگ آجائیں گے اور بابا کی جگہ بھی۔ یہ تنظیم قائم رہے گی جب تک حزب اللہ اس کی شاہ رگ نہ کاٹ لے۔“ وہ لڑکا کچھ سوچتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا گیا۔

”تمہاری ماں۔۔ وہ کیا جانتی تھی؟“ اس کے سوال پر مائیک نے کرب سے آنکھیں میچی تھیں۔

”وہ جان چکی تھی کہ پانچویں نمبر پر کون ہے۔“

”جو تم نہیں جانتے؟“ اس کے پوچھنے پر وہ نفی میں سر ہلا گیا۔ ”تمہاری ماں کو مارک نے مروا دیا۔ کیا اس نے کسی کو یہ راز بتانے کی کوشش نہیں کی؟“

”کی تھی۔۔ تبھی تو مروا دیا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہوا تھا۔

”کوئی اور جو اس راز سے واقف ہو؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ وہ لڑکا چند پل آنکھیں سکیڑے اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”تعاون کے لیے تمہارا شکریہ کیونکہ میں واقعی مار کٹائی سے پرہیز کرتا ہوں۔ ویسے بھی تمہارے یہ زخم جلد نہیں بھرنے والے۔“ اس کا اشارہ خیام کے دیے گئے زخموں کی طرف تھا۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جانے کے لیے مڑ گیا۔

”میں کب تک یہاں رہوں گا؟“ آواز سے بے بسی جھلک رہی تھی۔

”اپنی موت تک!“ سرد سے لہجے میں جواب دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ کرسی سے بندھا مائک اپنا سر گرا گیا۔ وہ بہت کوشش کے باوجود اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ وہ کس جگہ پر تھا اور کس کے ساتھ تھا؟!

☆☆☆

وہ پتلی سی سوئی دھیرے سے اس کی جلد سے گزرتی رگوں میں ٹھہری، اور سرنج میں بھرا مائع دھیرے دھیرے اس کی رگوں میں اترنے لگا۔ وہ سختی سے آنکھیں میچ گیا تھا۔ انجیکشن نکال لیا گیا۔ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر میز پر رکھ دیا۔

”اب سے تم ہر لمحہ اپنی موت کی بھیک مانگو گے۔“ وہ انجیکشن ایک طرف رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”میرا حزب اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لوگ تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں، میں نہ ان کے متعلق کچھ جانتا ہوں نہ تمہارے۔“ وہ تھکی تھکی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر طنزیہ ہنسی ہنسا□۔

”ہر جاسوس یہی کہتا ہے۔ تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ انسانوں کی طرح بولنا شروع کرو گے یا ہم جانوروں کی

طرح پیش آئیں؟" اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے سختی سے پوچھا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا!!" وہ گڑگڑایا۔ اس نے سختی سے لب بھینچے پھر ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈال کر پلٹ گیا۔

"تم اس وقت کو روؤ گے جب تم نے درد سے بلبلاتے ہوئے زندگی کی بھیک مانگی تھی!!" نفرت بھرے لہجے میں کہہ کر وہ باہر آ گیا۔ پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا راہداری میں آیا۔ انگشت شہادت اور انگوٹھے سے ناک کی ہڈی کو دباتے ہوئے وہ راہداری سے گزر کر ریسٹ روم میں آیا تھا۔ اس نے احتیاط بھری نگاہوں سے اردگرد دیکھا پھر جلدی سے دروازہ لاک کیا۔ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا پھر پاس رکھے کانچ کے چھوٹے سے شوپیس کو اٹھایا اور اسے زور سے فرش پر مارا۔ شوپیس کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے جھک کر کانچ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا پھر بیسن کے پاس آیا۔ اپنے دایاں ہاتھ سامنے کیا اور تیزی سے ہتھیلی پر لگے زخم کے اوپر کانچ پھیر دیا۔ لب سختی سے بھینچ لیے۔ تیز سرخ گاڑھا خون قطرہ قطرہ بیسن میں بہنے لگا۔ اس نے خون کو دیکھ کر سکون کی سانس خارج کی پھر کانچ کا ٹکڑا ایک طرف پھینک دیا۔ اپنی ٹائی کی ناٹ کی ڈھیلی کی اور نل کھول کر اپنی ہتھیلی پانی کے نیچے کر دی۔ خون تیزی سے پانی کے ساتھ ملنے لگا۔ وہ چند پل یونہی ساکت کھڑا اپنی ہتھیلی سے بہتے خون کو دیکھنے لگا پھر نکل بند کر دیا۔ ایک نگاہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ جیسے ہی باہر آیا تو سامنے سے آتا لڑکا اسے دیکھ کر چونکا۔

"آپ ٹھیک ہیں سر؟" وہ اس کی ہتھیلی سے قطرہ قطرہ بہتے خون کو دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں اندر شوپیس ٹوٹ گیا ہے۔۔ کسی کو بھیج دو۔" سرسری سے انداز میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ لڑکا ماتھے پر بل ڈالے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ نگاہ سفید فرش پر پڑی جہاں قطار کی صورت میں جگہ جگہ سرخ خون کے قطرے گرے ہوئے تھے۔

وہ گھر کے اندر داخل ہوا اور پھر باغیچے سے گزرتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ اس نے ابھی چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ سامنے سے ملازمہ آتی دکھائی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں بھاری بھر کم سوٹ کیس اٹھایا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ سوٹ کیس ایک طرف پھینکتی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"کہاں تھے تم؟ نہ کوئی خبر نہ کچھ اچانک سے غائب ہو گئے؟ کچھ اندازہ ہے یہاں کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟" وہ کمر پر ہاتھ باندھے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ بالکل انجان بنا۔

"اسٹیون نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کے بعد ہی ایلسا بھی مر گئی۔ اور کل سے مائک بھی غائب ہے۔ مارک نے تمام ملازموں کو چھٹی دے دی ہے۔" جندل کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"ایلسا مر گئی؟" وہ حیران ہوا تھا۔ ملازمہ نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسے مارا گیا ہے۔ مائک کو شک ہے کہ اسے مارک نے مارا ہے اور مارک کو شک ہے کہ یہ کام مائک کا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے مجھے پورا یقین ہے یہ کام مارک کا ہے۔ ورنہ مائک کو تو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔" وہ رازدارانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"اچھا۔۔ اسٹیون نے خودکشی کیسے کی؟" وہ سوچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس لڑکی سے باتوں

میں سب اگلوا سکتا تھا۔

”معلوم نہیں۔ بس ملازم اس کے کمرے میں گیا تو وہ فرش پر مرا ہوا تھا۔ افف میں تو وہ اتنا سارا خون دیکھ کر ہی چکرا گئی تھی۔ دو لاشیں آگے پیچھے اٹھی ہیں اس گھر سے۔“ اس نے جھرجھری لی تھی۔ وہ دو لاشوں کی بات کر رہی تھی۔ اسٹیون اور ایلسا۔۔ مطلب صاف تھا۔ جس نے بھی ایلسا کو مارا تھا وہ اس گارڈ کی لاش بھی ٹھکانے لگا چکا تھا جسے جندل نے واشروم میں چھپایا تھا۔۔ لیکن کون؟

”کیا تمام ملازم جا رہے ہیں؟“

”ہاں۔ بس گارڈز یہیں ہیں۔ سنا ہے مارک گھر بھی خالی کر رہا ہے۔ اب اس اکیلے گھر میں وہ اور کرے گا بھی کیا؟“ اس نے کندھے اچکا دیے۔ جندل نے سمجھ کر سر ہلایا پھر جانے کے لیے مڑا۔ ملازمہ اس کی بے رخی پر منہ کھولے اسے دیکھنے لگی جو واپسی کے راستے پر قدم بڑھا چکا تھا۔

”ہے تم۔۔ تم اب کہاں جاب کرو گے؟ کیا کہتے ہو دونوں مل کر کوئی ریستوران کھول لیں؟“ اس نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔ وہ اس کی باتیں ان سنی کرتا گھر کا دروازہ پار کر گیا۔ ہر بار کی طرح۔۔ اس گھر سے نکلتے ہوئے وہ کئی مزید الجھی ہوئی پہیلیاں ساتھ لیے نکل رہا تھا۔ کون تھا جو منظرِ عام پر نہیں آ رہا تھا؟

☆☆☆

”مائک کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی سر! کہیں کوئی سراغ نہیں ہے۔“ جیم کی پریشان کن آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچی تھیں۔

”اس کمینے کے پاس چھپنے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایئرپورٹس دیکھو، وہ کسی بھی صورت میں ملک سے باہر نہیں جانا چاہیے!!“ لہجے میں سختی تھی۔ بس ایک بار یہ کمینہ اس کے ہاتھ لگ جائے، وہ اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹے گا۔

"اور مس ازابیلا کو جنہوں نے اغوا کیا تھا ہم انہیں بھی تلاش نہیں کر پائے۔" آواز قدرے دھیمی تھی۔ اس کا چہرہ غصے کے مارے لال ہوا تھا۔

"تم کسی کام کے نہیں ہو! ایک سے بڑھ کر ایک کمینہ پال رکھا ہے میں نے۔" غصے میں بے قابو ہوتا وہ اسے سخت سنا کر کال کاٹ چکا تھا۔ گہری سانس لے کر اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ یہ سب اسے پاگل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسکائے ٹو کی طرف سے الگ دباؤ تھا اور پھر یہ مسئلے الگ۔ اسے سب کچھ دھیرے دھیرے اپنے ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔

خود کو قدرے ٹھنڈا کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ پاس رکھا موبائل اٹھایا اور ازابیلا کا نمبر ملایا۔ تیسری ہی بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"کہو مارک؟" اس کی مصروف سی آواز مارک کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ یقیناً اس وقت آفس میں تھی۔

"ازابیلا۔۔ میری بات دھیان سے سنو۔ کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے تمہیں کس نے اغوا کیا تھا؟ کوئی ایسا جس پر تمہیں شک ہو؟" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ اپنی آفس میں فائل پر جھکی ازابیلا ایک لمحے کے لیے تھم گئی تھی۔ کیا وہ اسے سب بتا دے؟ اس کے بعد کیا ہونے والا تھا؟ لمحوں میں اسے فیصلہ لینا تھا اور اس نے لے لیا۔

"نہیں۔۔ یقیناً وہ جو بھی ہیں ان کا تعلق اسٹیون سے ہے کیونکہ حال ہی میں مَیں اسی کے کیس پر کام کر رہی تھی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ بہت صفائی سے جھوٹ بولا تھا۔ مارک کو اس کا یقین کرنا پڑا تھا۔

"کوئی ایسی بات جو انہوں نے تم سے کی ہو؟ جو ان تک پہنچنے میں مدد دے؟" وہ الفاظ بدل کر سوال دہرا رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر کرسی سے ٹیک لگائی۔

"کیا کرو گے تم؟ اگر کچھ کیا جا سکتا تو مجھے صحافت سے روکا نہ جاتا۔ وہ جو بھی تھے مجھے روکنا چاہتے تھے اور میں نہیں

رکوں گی۔ اب کیا چاہتے ہو؟" وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔ لہجے میں ذراسی سختی تھی۔ وہ لب بھینچ گیا۔

"تمہاری حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔" آواز بہت دھیمی تھی۔

"میں خود اپنی حفاظت کر لوں گی۔ تمہارا شکریہ! آئندہ آفس ٹائمنگ میں مجھے کال مت کرنا۔" سنجیدگی سے کہہ کر اس نے کال بند کر دی۔ مارک موبائل کی تاریک اسکرین کو دیکھ کر رہ گیا۔ اور وہ۔۔ اسے اب اپنے بدلے بدلے رویے سے الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ کیا کر رہی تھی کیوں کر رہی تھی، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اضطراب کی کیفیت میں دانتوں سے نچلے ہونٹ کو کاٹتے ہوئے سامنے بیٹھے خیام کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ باہم ملائے کہنیاں میز پر ٹکائے وہ بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جو جانے کہاں کھو گئے تھے۔ وہ بدر، جو بلا سوچے سمجھے کچھ بھی بول دیتا تھا آج بہت سوچنے کے بعد بھی اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں چُن پا رہا تھا۔ کافی کے گھونٹ بھرتے خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر کرسی سے ٹیک لگائی۔

"میں سن رہا ہوں مصعب!" اس نے زکام زدہ سی ناک سکیڑتے ہوئے کہا تھا۔ بدر نے سر جھکا کر سوچنے کے لیے مزید کچھ وقت لیا پھر جھکا ہوا سر اٹھا کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "میں نہیں رہ سکتا۔۔ میں ایسے نہیں جی سکتا کہ جب ہر لمحہ مجھے اپنے ہاتھوں پر ایک بے گناہ کا خون نظر آتا ہے۔ میں اس سب سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔۔ میں خود کو قاتل سمجھتا رہا تو بدر کے بعد بہت جلد مصعب بھی مارا جائے گا۔" بولتے ہوئے اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"طریقہ تم جانتے ہو۔ خود کو قاتل کے بجائے مجاہد سمجھو جس نے جانے کتنے بے گناہوں کی جان بچائی ہے۔" اس نے بات مکمل کر کے کافی کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

"آپ جانتے ہیں یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میں کیسے جان سکتا ہوں کہ آپ لوگ راہِ راست پر ہیں؟" اس کا سوال۔۔ وہ سرمئی شام، کافی کے کپ سے اڑتی بھاپ، وقت پیچھے چلا گیا تھا۔ قرطبہ کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا دحیہ جو اپنے اندیشے ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھے معاویہ اور سنان جو اس کے ہر اندیشے کو دور کر رہے تھے۔ وقت ایسے خود کو دہراتا ہے، اب بدر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے خیام۔۔ دروازے سے داخل ہوتے جندل نے ٹھہر کر دونوں کو دیکھا پھر بدر کے برابر میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"اسلام کے نام پر اٹھنے والی تقریباً تمام تنظیمیں ہی راہِ راست پر ہیں۔ مختلف تنظیمیں، بشرطیکہ وہ واقعی اسلام کی خاطر اٹھی ہوں۔ ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے بس طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ تبلیغی جماعت جو اسلام کا پرچم بلند دیکھنا چاہتی ہے اس کا طریقہ کچھ اور ہے۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی، سپا* ہ صحابہ، لشکر جھن* گوی اور بہت سی تنظیمیں۔۔ یہ سب اسلام کا پرچم بلند دیکھنا چاہتی ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے کام کر رہی ہیں۔ حزب اللہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اس میں مبلغ بھی ہیں، علماء بھی، انجینئرز اور ڈاکٹرز بھی، اساتذہ اور سپاہی بھی۔۔ ایک باقاعدہ نظام کے تحت کام کرنے والی یہ تنظیم وسیع دائرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے طریقے سے کام کر رہا ہے۔ ہم بھی کر رہے ہیں۔ ہم نے جہاد کا راستہ چنا ہے، وہ راستہ جس میں اگر ذرا بھی قدم ڈگمگائے تو ایمان پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ آخری سانسوں کے دوران نیت میں ذرا سی کھوٹ اور تمام عمر رائگاں جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ راستہ کٹھن ہے مگر۔۔ جیسے ہر انسان کی اپنی الگ فیلڈ ہوتی ہے اسی طرح ہماری بھی یہی فیلڈ ہے۔۔ ہم اسی میں مہارت رکھتے ہیں، تبھی ہم چُن لیے گئے۔" اس نے بات مکمل کر کے ٹھہر کر بدر کو دیکھا جو بنا پلک جھپکے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تنظیم حکومت کی طرف سے منظور نہیں کی گئی۔ حکومت کی نگاہ میں یہ مجرم ہیں یا دہشتگرد! جس جہاد کی بات آپ کر رہے ہیں کیا آپ وہ اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف کریں گے؟" اس کا سوال خاصا چبھتا ہوا

تھا۔ خیام نے کافی کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ اس سوال کا جواب جندل دینے والا تھا۔

”طا* لبان کا نام سنا ہو گا؟ وہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف لڑے تھے کیونکہ ان کے حکمران اسلام دشمن عناصر کی کٹھ پتلیاں بن چکے تھے۔ اور پھر خدا نے انہیں اتنی ہمت و استقامت دی کہ وہ نہ صرف اپنے ہی لوگوں سے لڑے بلکہ تمام دنیا سے لڑ کر بالآخر اپنی ریاست بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے حکمرانوں کے حالات سب کے سامنے ہیں۔ جمہوریت کے نام پر جو پتّا کھیلا جا رہا ہے اس میں اقتدار چند خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جو ایک سے بڑھ کر ایک عیاش ہیں۔ ہر حکمران کو صرف اقتدار سے مطلب ہے۔ اسلام کے نام پر آزادی حاصل کرنے والے ملک میں آج تک اسلامی نظام قائم نہیں کیا جا سکا۔ اگر ایسے حکمران اور ایسی حکومت کی نگاہ میں ہم مجرم ہیں تو مجرم ہی سہی! یہ وہ حکمران ہیں جن کے ہاتھوں پر ہزاروں علماء اور ہزاروں مجاہدینِ اسلام کا خون ہے۔ انہوں نے صرف اپنی غرض کی خاطر، اپنے مالکوں کی خوشنودی کی خاطر اپنی پناہ میں آئے مسلمانوں کو اسلام دشمن طاقتوں کے حوالے کر کے اعزاز حاصل کیے ہیں۔ یہ ایک اسلامی ریاست کی حکومت کا طریقہ نہیں ہوتا، ایسے حکمران خلیفہ اسلام نہیں ہوتے۔ خلیفہ اسلام وہ تھے جنہوں نے اپنا پورا ملک داؤ پر لگا دیا صرف اس ایک مسلمان بھائی کی خاطر جس نے ان کے پاس پناہ لی تھی۔ دنیا اسے دہشتگرد مانتی تھی مگر انہوں نے کہا تھا کہ اپنے اس بہتان کو ہماری عدالتوں میں ثابت کرو، ہم خود اسے سزا دیں گے!!

اسلامی ریاست یہ ہوتی ہے بدر! ہمارا ملک کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اسے تباہ کر دیا گیا ہے۔ خدا ان لوگوں کو استقامت دے جو اسکی سلامتی کی خاطر اٹھتے ہیں ورنہ یہ معجزہ ہی ہے کہ یہ ملک اب تک قائم ہے۔ اگر اس میں اسلام کو قائم رکھنا ہے تو لازمی امر ہے کہ اس کرپٹ اور کٹھ پتلی حکومت کے خلاف اٹھا جائے۔ کیونکہ اب ہمارے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا!“ اس نے بات مکمل کر کے بدر کو دیکھا۔ وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔ کہیں کسی اعتراض کی گنجائش ہی

نہیں تھی۔

”میں۔۔میں شاید اس سب کو اتنی جلدی سمجھ نہیں سکتا۔ حزب اللہ کے ساتھ کام کرنا، ایک مجاہد کی طرح خدا کی راہ میں لڑنا یقیناً میرے لیے سعادت ہو گی لیکن۔۔ یہ سب آسان نہیں ہے۔ مجھے کچھ وقت چاہیے اور تب تک۔۔“

اس نے ٹھہر کر خیام کو دیکھا جو اپنی ناک کو ٹشو سے رگڑ رہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے وہ آگے کیا کہنے جا رہا تھا۔ ”میں خیام سر کے ساتھ کام کرنا چاہوں گا۔ بالکل جیسے سعاد کر رہی ہیں۔“

”تم انہیں آپی کہو گے!“ جندل نے اسے گھورا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ ہمیں تمہارا انتظار رہے گا اور۔۔ خوش آمدید!“ خیام ہلکا سا مسکرا دیا۔ بدر اسے دیکھ کر رہ گیا۔ لال ہوتی ناک، آنکھوں میں چمکتی نمی اور نرمی سے مسکراہٹ میں ڈھلے لب۔۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دوسری جانب اس کے جذبات کو بری طرح روندا جاتا تھا، تبھی خاموش ہو گیا۔

”تو۔۔میں آج سے کام شروع کروں؟“ اس کے سوال پر دونوں نے رک کر اسے دیکھا پھر آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا۔

کچھ ہی دیر بعد بدر میدان میں کھڑا تھا اور سعاد سینے پر بازو باندھے، آنکھیں سکیڑے بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”ہیکنگ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔ خیام نے اس کا استاد بننے کے بعد اسے خاصا ٹف ٹائم دیا تھا، وہ اب اس کا بدلہ بدر کی استانی بن کر لینے والی تھی۔ کیونکہ دو لوگوں کی جنگ میں نقصان ہمیشہ کسی تیسرے کا ہوتا ہے!!

”بنیاد سے واقف ہوں۔ آپ کو مجھ پر زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس نے کسی شریف شاگرد کی

طرح جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ وہ رکھا ہے لیپ ٹاپ، یہ رہی میز اور کرسی۔۔ ہم کام شروع کرتے ہیں پھر۔" وہ اپنی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بدر سر کو جنبش دیتا اس سے فاصلے پر دائیں طرف دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھا لیپ ٹاپ اٹھا کر کھولا۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا پھر متلاشی نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ میز پر سامنے ٹیپ رکھی تھی۔ اس نے ٹیپ اٹھا کر اسے دانتوں سے کاٹا پھر لیپ ٹاپ کے کیمرا پر چپکا دی۔ کسی کی خود پر نظریں محسوس کر کے گردن ترچھی کر کے سامنے دیکھا جہاں سعاد فرصت سے اسے گھور رہی تھی۔

"اگر لیپ ٹاپ کا نیٹ آن ہو تو کوئی بھی کیمرا کے ذریعے ہمیں دیکھ سکتا ہے۔" اس نے اپنے عمل کی وضاحت پیش کی۔

"معلوم ہے سب۔" وہ سر جھٹک کر اپنے کام کی طرف مشغول ہو گئی۔ بدر اس سے کام کی تفصیلات پوچھتا اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ان دونوں سے فاصلے پر کھڑے جندل نے پرسوچ نگاہوں سے برابر میں کھڑے خیام کو دیکھا۔ "تم نے کبھی اس کا فائدہ اٹھایا ہے؟ کبھی کیمرا کے ذریعے کسی کو دیکھنے کی کوشش کی؟"

"نہیں۔۔ اتنا فارغ نہیں ہوں۔" وہ نفی میں سر ہلاتا آگے بڑھ گیا۔ اب کم از کم وہ اسے افق کا نہیں بتا سکتا تھا جسے وہ اکثر فارغ وقت میں ایسے ہی ٹریس کیا کرتا تھا۔۔۔ تب تب جب اسے وہ بہت زیادہ یاد آتی تھی۔۔ وہ جو اسے بہت زیادہ عزیز تھی۔ جس سے محبت اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی مانند تھی۔

سعاد نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا تھا۔ نگاہیں اس کے ہاتھ میں موجود اسٹک سے ہوتیں اس کے چہرے پر ٹکیں۔ جس لمحے میں وہ دروازے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، ایک آنسو اس کی پلکوں سے جھول کر گال پر گرا تھا۔

اس نے زکام زدہ سی ناک پر مٹھی رکھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو کو چھپایا اور پھر دروازہ پار کر گیا۔ ایک لمحے میں ہوا یہ سانحہ اسے ششدر کر گیا تھا۔۔ وہ رو رہا تھا۔ اس آنسو میں اور ان آنسوؤں میں جو زکام کی وجہ سے آنکھوں میں تھے، بہت فرق تھا۔ یہ سوال اس کے لیے کافی الجھا ہوا تھا کہ۔۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ جس نے خیام کو رلا دیا تھا؟!!

☆☆☆

"عجیب گدھے ہو یار تم۔ ہاتھ ہٹاؤ ورنہ ایک لگاؤں کا کان کے نیچے۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ اس کے شانے پر بازو پھیلا کر چلتے خیام نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کیا تھا۔ وہ لائبریری میں موجود تھے۔ دائیں بائیں رکھی کتابوں کے درمیان میں چلتے وہ دور سے دیکھنے پر گہرے دوست معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے آگے چلتا زیاد ان سے یکسر انجان بنا ہاتھ میں تھامی کتابوں کی لسٹ دیکھنے میں مشغول تھا۔ "اب تم گئے بس!" جندل نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے زور سے اپنی کہنی اس کے پیٹ میں ماری۔ خیام نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچی تھی۔ جندل نے دایاں ہاتھ کام میں لاتے ہوئے اس کے ناک کو اپنے مکے کا نشانہ بنایا تھا۔
اپنے پیچھے کچھ ہلچل محسوس کر کے زیاد کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ اس نے پیشانی پر بل ڈالے مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ خیام نے اپنا بازو جندل کے شانے پر پھیلایا ہوا تھا اور کچھ ایسے ہی انداز سے جندل کھڑا تھا۔ دونوں اس کے پلٹ کر دیکھنے پر مسکرا دیے۔ وہ مشکوک نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا رخ موڑ گیا۔ اس کے مڑتے ہی جندل نے خیام کا بازو پکڑ کر مروڑا تھا۔ اس نے جلدی سے خود کو سنبھال کر اپنا سر اس کے سر میں دے مارا تھا۔ جندل کراہ کر پیچھے ہٹا تھا۔ خیام کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ "کیسا دیا پھر؟"
"اب نہیں بچو گے تم خبیث انسان۔۔" وہ اس کی گردن دبوچتا اسے کتابوں کے ریک سے لگا گیا۔ اس کی پشت

کتابوں سے ٹکرائی۔ جندل کی گرفت مضبوط ہوئی۔ خیام نے اپنی زکام زدہ سی ناک سکیڑی۔ زیاد نے کمر پر ہاتھ باندھ کر مڑ کر دونوں کو گھورا۔

"تم دونوں انسان نہیں بن سکتے؟"!

"اس نے شروعات کی تھی۔" جندل نے صفائی پیش کی۔ خیام نے موقع دیکھ کر اس کا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹا کر اس کا بازو مروڑتے ہوئے پیچھے سے آ کر اس کی گردن کے گرد بازو لپیٹا تھا۔ "پہلے مارا اس گدھے نے تھا۔" معصومیت سے کہا گیا۔ جندل کی گردن پر دباؤ دیا گیا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"یہ لائبریری ہے۔ اسے میدانِ جنگ مت بناؤ۔ مطلب کون مانے گا کہ یہ دونوں خاصے سمجھدار اور سنجیدہ حزب اللہ کے کمانڈرز میں سے ایک ہیں۔ بچوں سے بھی گئی گزری حرکتیں ہیں۔ گردن چھوڑو اس کی۔" وہ انہیں طنز کا نشانہ بناتے ہوئے جھنجھلایا تھا۔ خیام نے سر جھکا کر جندل کو دیکھا جس کے چہرے پر گردن پر دباؤ بڑھنے کی وجہ سے خون سمٹ آیا تھا۔ اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی۔ وہ اپنی گردن رگڑتا اسے گھورتے ہوئے سیدھا ہوا۔

"کیا؟ مجھے مت گھورو، شروع اس نے کیا تھا۔" معصومیت سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے اس نے زیاد کو کہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگا تھا جب لائبریری میں داخل ہوتی ازابیلا پر نگاہ ٹکی۔ جندل اور خیام بھی اسے دیکھ چکے تھے۔ خیام نے جلدی سے جندل کے سر پر ٹکی پی کیپ جھپٹی اور اپنے سر پر رکھتا پلٹ گیا۔ زیاد آگے بڑھ گیا اور جندل ریک سے ایک کتاب اٹھا کر وہیں کتابوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

وہ زیاد کی تلاش میں نگاہیں ارد گرد دوڑا رہی تھی۔ وہ یہاں نہیں تھا پھر یقیناً لائبریری کی دوسری طرف تھا۔ اس نے اپنے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ٹھٹھک کر رکی۔ ماتھے پر بل ڈال کر کتابوں کے پاس کھڑے اس لڑکے کو دیکھا جو اس کے دیکھتے ہی فوراً کتاب اپنے چہرے کے آگے کر چکا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ اسے پہچان گئی اور

پھر خود بخود اس نے اپنے قدم اس کی طرف اٹھتے محسوس کیے تھے۔ وہ اس کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔ جھک کر اس کے ہاتھ میں موجود کتاب کا نام دیکھا۔ جندل لب دانتوں میں دبا گیا تھا۔

”قدیم تاریخ دان ہیروڈوٹس کی کتاب "Histories" جو لکھتا ہے کہ، ”امن میں بیٹے اپنے باپ کو دفن کرتے ہیں اور جنگ میں باپ اپنے بیٹوں کو۔“ یونانی اور رومی جنگوں کی تاریخ لکھنے والا تاریخ دان جس کا تعلق ترکی کے شہر بودرم سے تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ قدرت اپنا انتقام لیتی ہے انسان کے وحشیانہ اور ظالمانہ اقدام کے مطابق!“ وہ اپنی بات مکمل کر کے ہلکا سا مسکرا دی۔ جندل نے آہستہ سے کتاب اپنے چہرے سے سرکائی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ہلکا سا ہنس دی۔ ”آج کس دوست سے ملنے آئے ہو؟“

”نہیں۔۔ کتاب لینے آیا تھا۔“ اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ کچھ فاصلے پر کھڑے خیام نے اپنے سر پر ٹکی پی کیپ مزید نیچے سرکائی تھی۔

”تاریخ نے ہمیشہ مجھے فیسینیٹ کیا ہے۔ قدیم یونانی دور، سلطنت روم، قیصر و کسریٰ، بازنطینی سلطنت۔۔ ان سب کے عروج و زوال کی کہانیاں دم بخود کر دیتی ہیں۔ حقیقت کے قریب تر، تلخیوں کو خود میں سموئے بے حد پرکشش تاریخ۔۔“ وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بول رہی تھی۔ وہ پلک جھپکتا اسے سن رہا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ فاصلے پر کھڑا خیام بھی اور زیادہ بھی جو اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا۔ ”ہیروڈوٹس جسے ”فادر آف ہسٹری“ کہا جاتا ہے جس نے رومی سلطنت کی تاریخ کو قلمبند کیا ہے۔ اس نے جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کیسے قدیم اور مضبوط سلطنت روم ایک ہی دن میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ تین بادشاہوں کا سال پھر پانچ اور چھ بادشاہوں کا ایک ہی سال میں سلطنت روم کا سلطان بننا بعد ازاں سلطنت روم کے تقریباً تیسرے حصے کا آگ کی نذر ہو جانا۔۔ یہ سب کتنا تلخ اور خوبصورت سا لگتا ہے۔ ایک سلطنت کا زوال اور دوسری کا عروج۔۔ مختلف قوموں کے

ادوار، اقتدار کی جنگیں، اندرونی سازشیں اور پھر مضبوط سے مضبوط سلطنت کا بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا۔۔

رومی سیاست دان Tacitus جسے عصرِ حاضر کے مورخین رومی دور کا بہترین تاریخ دان مانتے ہیں۔ جو لکھتا ہے کہ، ”انسان زخم کا بدلہ دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے بنسبت کسی فائدے کا بدلہ دینے کے۔ کیونکہ احسان ایک بوجھ ہے اور انتقام سکون ہے۔“ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے ہم عصر انسانوں کو بھوک سے مارتے ہیں، وہ انہیں ذبح کرتے ہیں اور اپنی لالچ میں وہ ہر حد سے گزرتے ہیں۔ اور اس سب کو وہ ایک مضبوط سلطنت کی تعمیر کا نام دیتے ہیں۔ پھر جب ان کی آنکھوں پر بندھی پٹی اترتی ہے تو ان کے سامنے ایک ریگستان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور اسے یہ امن کہتے ہیں۔

مورخین نے ان ادوار کو بھی قلمبند کیا ہے جب قیصر و کسریٰ کے تخت و تاراج مسلمانوں کی اٹھتی ہوئی طاقت نے روند ڈالے تھے۔ ایک نئی سلطنت کا عروج اور کئی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں۔ مسلمانوں نے لمبے عرصے تک دنیا پر اپنی دھاک بٹھائے رکھی۔ عباسی، اموی، عثمانی، فاطمی، خوارزمی اور بہت سی خلافتیں جو دوسری سلطنتوں کے زوال کے ساتھ اٹھتی رہیں۔ مگر کہتے ہیں ناں Pride comes before fall.. ;

اسپین میں مسلمانوں نے زبردست شکست کا سامنا کیا۔ خلافتِ عثمانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور یہ اٹھتی ہوئی طاقت منہ کے بل گری۔ وجوہات جو بھی ہوں مگر ہر سورج کو غروب ہونا پڑتا ہے۔ ہر دن کے بعد رات آتی ہے۔۔ تاریک اور اندھیر۔۔

اسلام کے سنہری دور کو قلمبند کرنے والا ابوریحان البیرونی تھا۔ جس نے ”آثار الباقیہ اور تاریخ الاسلام“ جیسے شاہکار تخلیق کیے۔ جس نے مذاہب کی تاریخ لکھی اور اسے دنیا کے سامنے لایا۔ اس نے کہا تھا کہ، ”خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کا کام دیتی ہیں۔۔“ کتابیں۔۔ یہ کتابیں اپنے اندر ایک دنیا سموئے ہوئی ہیں۔ یہ آئینہ

ہیں جو انسان کو اس کے ماضی کی جھلک دکھاتی ہیں۔۔ خوبصورت اور تلخ ماضی"!

وہ خاموش ہو گئی۔ ٹھہر کر اسے دیکھا جو مبہوت سا اسے تک رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "مجھے فکشن پر مبنی فیری ٹیلز نہیں پسند جن کے اختتام میں سب خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ سلطنت کے لوگ خوشحال ہو جاتے ہیں، بادشاہ لمبے عرصے تک حکومت کرتا ہے اور شہزادے کو اس کی شہزادی مل جاتی ہے۔ مجھے تاریخ پسند ہے جندل! جس میں عظیم سے عظیم سلطنت بھی ٹکڑوں میں بدل جاتی ہے، بادشاہوں کی گردنوں میں پھندے ڈالے جاتے ہیں اور شہزادے چالاک وزیروں کی کٹھ پتلیاں بن کر رہتے ہیں۔ مجھے وہ تحریکیں فیسینیٹ کرتی ہیں جو زمین کے ایسے ٹکڑے پر سورج کی پہلی کرن کی مانند ہوتی ہیں جہاں ہر طرف کٹی پھٹی لاشیں بکھری ہوتی ہیں۔ حقیقت کے قریب تر یہ تاریخ۔۔ ہمارا اپنا ہی ماضی ہے جس سے جُڑ کر رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔" اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں منفرد سی چمک تھی اور چہرے پر معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ نازک اور حساس سی لڑکی اتنی گہری باتیں کرتی تھی اسے آج اندازہ ہوا تھا۔

"تاریخ الہند۔۔ البیرونی کی کتاب کا نام تاریخ الہند ہے۔" اس نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر سمجھ کر سر ہلا دیا۔

"تو سمندروں کا یہ عاشق تاریخ سے بھی محبت رکھتا ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کے سنگ وہ بس مسکرانا چاہتی تھی۔ ہر طرح کی فکر سے آزاد وہ اس سے تاریخ پر بات کرنا چاہتی تھی۔ اسے اچھا لگا تھا کسی ایسے شخص سے مل کر جو اسے سمجھ سکتا تھا۔ جس سے وہ، وہ سب کہہ سکتی تھی جو دوسروں کے سامنے کہتے ہوئے وہ جھجک کا شکار ہوتی تھی۔ اچھا لگا تھا اسے جندل کا یوں اسے توجہ دینا۔۔

"ماضی تو پھر پُر کشش ہے بیلا! اس سے محبت نہ بھی کرو تو محبت ہو جاتی ہے۔۔" نرمی سے کہتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتی رہی۔ عجیب منفرد سا احساس تھا جس میں وہ گرفتار ہو رہی تھی۔ کتابوں کی

خوشبو، لائبریری میں چھائی مقدس خاموشی اور سامنے کھڑا یہ لڑکا جو محبت کی بات کر رہا تھا۔۔ اسے اپنے گردو پیش میں سب تھمتا محسوس ہوا تھا۔

"محبت۔۔ یہ کتنا خوبصورت احساس ہے۔" اس نے بے اختیاری میں کہا تھا۔ جندل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ ان سے فاصلے پر کھڑا خیام بری طرح چونکا تھا۔ سماعت سے ایسے ہی کوئی الفاظ ٹکرائے تھے۔ "محبت کا احساس کتنا خوبصورت ہے ناں۔۔" اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ وہ معصوم سی سرگوشی اور یہ آواز۔۔ نرمی سے اسے دیکھ کر مسکراتی وہ بچی اور وہ مسکراہٹ جو اس وقت ازابیلا کے لبوں پر رینگ رہی تھی۔ ماضی کے کئی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائے تھے۔ ایک انکشاف ہوا تھا اور وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔

وہ چاہ کر بھی آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا، وہیں اپنی جگہ پر جم سا گیا تھا۔ کتاب والا ہاتھ پہلو میں جا گرا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں۔ وہ جندل کی کسی بات پر ہنس رہی تھی، وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔۔

لائبریری میں چھائی کانچ سی خاموشی، سورج کے ساتھ ڈھلتی شام۔۔ اور وہ تیز روشنی جو اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ چہرے پر آتے بالوں کو کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ وہ ٹھہر گیا تھا۔ گال پر موجود وہ نشان آج چھپایا نہیں گیا تھا۔۔ اسے لگا تھا وہ اگلی سانس نہیں لے پائے گا۔

"آپ بہت اچھے ہیں امیر البحر۔۔۔ میں آپ کا بہت سارا خیال رکھوں گی۔" وہ کھکھلا کر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ اس کے پہلو میں بیٹھا جندل اسے ہنستا دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

اس کی خوفزدہ سی نگاہیں ان سے فاصلے پر ریک کے پاس کھڑے زیاد پر ٹکیں۔ وہ اس رات بھی وہیں کھڑا تھا۔۔ دیوار سے ٹیک لگائے محبت سے دونوں کو دیکھتا۔۔۔ "تم میری بہن کو پسند آ گئے ہو۔" اس کے لہجے میں بے حد محبت تھی۔ وہ اب بھی ان دونوں کو ویسے ہی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔۔ اور وہ۔۔ وہ بھی اس

رات وہیں تھا۔ کھڑکی کے پار ٹھنڈے یخ موسم میں اپنی ہڈیوں تک کو جمتے ہوئے محسوس کرتا وہ ان کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔۔۔ہاں جیسے اس وقت۔۔ منتشر ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ وہ ان دونوں کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ منظر گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ماضی اور حال کے درمیان گزرے کئی سال جیسے لمحوں میں بدل گئے تھے۔

"کچھ ہم دونوں کے نقوش بھی حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے سے ہیں۔" زیاد کی بات پر اس نے دھیان کیوں نہیں دیا تھا؟ وہ کیسے نہیں جان پایا کہ وہ لڑکی۔۔ اس کی بہن تھی۔ زیاد تاشفین کی بہن ازا تاشفین! وہی لڑکی جو اس کے لاشعور میں بسی ہوئی تھی۔ ازا تاشفین وہ وہی تھی جس سے اسے انجانی سی محبت تھی۔۔وہ۔۔ ازا۔۔ وہی بچی تھی جسے اس رات اس نے جندل کے ساتھ دیکھا تھا۔ جس سے اسے جانے کب محبت ہوئی تھی اور جسے ڈھونڈنے وہ یہاں آیا تھا!!

اس رات بھی وہ ان دو کے درمیان تیسرا تھا۔ اس وقت بھی وہ ان دو کے درمیان تیسرا تھا۔ وہ خیام حنفی۔۔ تکون کا وہ تیسرا سرا جو ہمیشہ سے تنہا تھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر گال پر گرا۔ اسے سب ختم ہوتا محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

"آپ انہیں حقیقت کیوں نہیں بتا دیتے؟ کیا انہیں یوں ہر چیز سے بے خبر رکھنا ان کے ساتھ ظلم نہیں؟" وہ بہت مدھم سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"حقیقت بہت تلخ ہے۔ مجھے ڈر ہے وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے۔"

"یہ نفرت صرف خیام کے حصے میں آئے گی۔ اسے اس بوجھ کو اٹھانے دیں کیونکہ یہ بوجھ تب مزید بڑھ جائے گا

جب وہ خود حقیقت جانیں گے۔" اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اداسی کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

"اسے وہ سب بے حد عزیز ہیں۔ وہ بے گناہ ہو کر بھی سزا کاٹ رہا ہے، اس کے ساتھ ظلم ہو گا۔"

"اور باقی؟ سعاد کا کیا جو اپنے بھائی سے ملنے کے لیے تڑپتی ہے؟ زیاد جو اپنی بہن کا منتظر ہے۔ جندل جو تنظیم کی خاطر اپنے خونی رشتے سے محبت کو دفن کر رہا ہے؟ بدر کا کیا جو اپنے بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی پشت پر کوئی ہاتھ نہیں دیکھتا؟ کیا آپ صرف خیام کی وجہ سے سب کو تکلیف دے رہے ہیں؟"

"بات خیام کی نہیں اس محبت کی ہے جو حقیقت سے آشنا ہوتے ہی نفرت میں بدل جائے گی۔ تم جندل کو اس کا گلا گھونٹنے سے کیسے روکو گے؟ تمہیں یقین ہے زیاد اسے معاف کر دے گا اور اس کی بہن خیام کو اپنا مجرم جان کر اس سے بے انتہا نفرت نہیں کرے گی؟ ان کے درمیان محبت ختم ہو جائے گی پھر بس نفرت باقی رہے گی۔"

"ان کی محبت اتنی کمزور تو نہیں ہے۔ آپ کو ان پر یقین ہونا چاہیے۔"

"کس پر ترس کھا رہے ہو؟" مختصر سا سوال کیا گیا۔

"بدر پر۔۔ میں نے دیکھا تھا اسے اپنے بھائیوں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے۔ میں نے محسوس کیا تھا اس تحفظ کو جو اسے میسر ہوا تھا جب اس کے بھائیوں نے اس کی پشت پر اپنے ہاتھ رکھے تھے۔ وہ تو بے قصور ہے۔ اس کی بہن، اس کے بھائی سب اس کے سامنے ہیں مگر وہ انہیں گلے نہیں لگا سکتا کیونکہ وہ ہر چیز سے بے خبر ہے۔ مجھے بدر پر ترس آ رہا ہے۔"

"تب کیسا محسوس کرو گے جب اس کے بھائی آپس میں لڑ پڑیں گے؟ جب وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جائیں گے؟ بدر تو یہ بھی نہیں چاہے گا۔"

"کیا کوئی بین بین کا راستہ نہیں ہے؟" وہ بے بس ہوا تھا۔

"سب کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دو۔ جب تدبیر سمجھ نہ آئے تو تقدیر پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔" اسے نصیحت کی گئی تھی۔

"مجھے امید ہے، وہ اپنے درمیان کبھی نفرت کو حائل ہونے نہیں دیں گے۔"

"تمہارا بھرم قائم رہے۔" نرمی سے کہا گیا تھا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"جب تک ضرار نہیں ہے، اس کی جگہ تم سنبھالو۔ آنکھیں کھلی رکھنا اور ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا!" حکم صادر کیا گیا۔ اندھیرے میں کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی لوٹ رہا تھا۔ اس نے چند پل انتظار کیا اور پھر وہ بھی باہر نکل آیا۔ تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ ماتھے پر ٹکی سیاہ پی کیپ نظر آئی اور وہ سفید رومال جس سے اس نے اپنا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب اداسی سی تھی۔ ویسی ہی اداسی جو کسی بہت اپنے کو تکلیف میں دیکھ کر ہوتی ہے۔ وہ نگاہیں اپنے راستے پر مرکوز کیے آگے بڑھ گیا۔ پیچھے خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

کوئی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھا۔ اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے کندھے اچکا گئی۔ "کیسے ہو؟"

"تمہارے لیے فکر مند تھا میں اور تم ہو کہ گھر آنے سے بھی منع کر دیا۔ اور سارا دن کے انتظار کے بعد اب آئی ہو۔ تم ایک بالکل اچھی کزن نہیں ہو۔" وہ خفا ہوا تھا۔ بازو سینے پر باندھ کر کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کی زوجہ آپ کو سُن سکتی ہیں!" کسی نے تڑخ کر کہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں دیکھو۔ بالکل ٹھیک!" وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھرتا آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔

"میں سن رہا ہوں ازا۔۔" وہ چند پل لب دانتوں سے کاٹتی مضطرب سی اسے دیکھتی رہی پھر لب وا کیے۔ "ڈیوڈ زندہ ہے۔" زیاد کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ "مجھے اسی نے اغوا کیا تھا کیونکہ وہ مارک سے اپنی کوئی شرائط منوانا چاہتا تھا۔ وہ مظلوم نہیں ہے زیاد! وہ مارک کے آدمیوں میں سے ہی ہے، جس کے جھگڑنے پر مارک نے اسے مارنے کا حکم دیا تھا۔"

"مگر ہم نے خود اس کی لاش دیکھی تھی ازا"!

"میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔ وہ ڈیوڈ ہی تھا۔ اپنی جگہ کسی اور کو مرنے کے لیے بھیج دینا بہت آسان ہے! وہ زندہ ہے اور۔۔ اور وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ ہم مارک کے کیس پر کام کرسکتے ہیں اگر ڈیوڈ ہمارے ساتھ تعاون کرے تو۔۔" اس نے ٹھہر کر زیاد کو دیکھا جو سوچ میں پڑ چکا تھا۔

"لیکن خیام نے کہا تھا کہ اسٹیون ڈیوڈ کا قاتل ہے۔"

"شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاید وہ بھی حقیقت تک نہ پہنچ سکا ہو۔" اس نے اندازہ لگایا۔

"اور عین ممکن ہے وہ تمہیں استعمال کر کے اسٹیون کی حقیقت سامنے لانا چاہتا ہو۔ ورنہ کیونکر اس نے بنا ثبوت کے یہ دعوہ کیا کہ اس نے ڈیوڈ کے قاتل کو پکڑ لیا ہے؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم میرے خلاف مزید زہر اگلنا بند کردو!!" خیام نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بے فکری سے اپنے کان کو کھجایا۔

"تم نے ابراہم انکل کو کیا بتایا ہے؟"

”یہ کہ صحافت میں میرے مخالفین نے یہ کام کیا ہے۔ میں انہیں مارک کے متعلق نہیں بتا سکتی کیونکہ وہ یقین نہیں کریں گے۔ میں تمہارے سوا کسی پر یقین نہیں کر سکتی۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ٹھہر کر اسے دیکھا۔”میں تم پر یقین کر سکتی ہوں ناں زیاد؟“ اس نے پُریقین نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گیا۔

”میں تمہارا بھرم رکھوں گا ازا!“ نرمی سے کہا گیا تھا۔

”میرا ابھی رکھنا، خدارا!!“ کوئی بے چین ہوا تھا۔

”اگر ہم شروع سے دیکھیں تو پہلے جو لوگ مجھے دھمکا رہے تھے وہ ایملی کے بوائے فرینڈ کے کیس سے متعلق تھے جو رفتہ رفتہ خاموش ہو گئے۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ایملی اور اس کے بوائے فرینڈ کو مائک نے مروایا ہے مگر مائک کے مطابق یہ کام مارک کا ہے۔ اس دوران ہمیں اسٹیون کے خلاف چند ثبوت ملے جو منظرِ عام پر آئے اور پھر اسٹیون نے خودکشی کر لی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی بھی مر گئی اور اب سنا ہے کہ مائک بھی لاپتہ ہے۔ ڈیوڈ، جو وارلڈ گلاس کمپنی کا ایمپلائے تھا اس کا قتل ہوا لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وہ نہیں مرا۔ وہ زندہ ہے اور مارک کا دشمن بن چکا ہے جبکہ پہلے دونوں نے ساتھ کام کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ۔۔ ان تمام کیسز کا آپس میں کیا تعلق ہے اور سب سے بڑھ کر۔۔ یہاں درمیان میں کچھ ایسا ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے!“ اس نے چہرے پر آتے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”جیسے کہ؟“

”اسٹیون کا تعلق دہشتگرد تنظیموں سے تھا۔ یقیناً یہاں درمیان میں اسی سے متعلق کچھ ہو رہا ہے۔ شاید کوئی تنظیم۔۔ کوئی باقاعدہ نظام جو بربریت کے اصولوں پر چلتا ہے۔“

"ہم اپنی بات کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں؟" زیاد کی بات پر اس نے سر کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"دو کام ہیں۔ ہم ڈیوڈ کو ڈھونڈیں گے اور اس نمبر کو ٹریس کریں گے جس سے جندل کو پیغام ملا تھا!" زیاد نے بات سمجھ کر سر اثبات میں ہلایا پھر کچھ یاد آنے پر لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا۔

"مائک اگر سب جانتا ہے تو ہم اس سے کیوں نہیں اگلوا لیتے؟"

"وہ گدھا ہے بہت بڑا گدھا! اپنے بھائی سے نفرت میں ہر حد سے گزر جائے گا مگر اس کے راز فاش نہیں کرے گا۔ ویسے بھی ابھی وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے۔" اس نے سر جھٹک کر کہا تھا۔

"تو۔۔ تمہیں میری کیا مدد چاہیے؟" اس کے سوال پر ازابیلا نے معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا پھر آگے ہوئی۔

"میں نے بھنڈ مار دیا ہے۔" اس نے بچوں کی طرح منہ بنا کر کہا تھا۔ زیاد نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ مزید آگے کھسکی۔ اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب لائی۔ "میں نے بابا سے کہا ہے مجھے جندل پسند ہے۔۔ میرا کلاس فیلو!" اسے جھٹکا لگا تھا۔ کتاب پر جھکے جندل کے ہاتھ سے کتاب چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔ خیام اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ کافی کا گھونٹ بھرتی سعاد کا منہ گرم گرم کافی سے جل گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ ازابیلا کے اٹھے کندھے ڈھیلے پڑے۔ "وہ میری شادی کروا رہے ہیں مارک سے۔ مجھے اور کچھ سمجھ نہیں آیا اور اسی وقت جندل کی کال بھی آ گئی تو میں نے اسی کا نام لے لیا۔ اس بے چارے کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گی یہ بات۔" وہ سخت پریشان تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

"تو اب کیا کرنے جا رہی ہو؟"

"بابا کہتے ہیں وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ کیا واقعی نہیں کرے گا؟" اس نے بہت معصومیت سے پوچھا تھا۔

زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جندل نے خیام کی مشکوک نگاہوں سے بچنے کے لیے کتاب اپنے چہرے کے آگے کر دی۔ سعاد کو کافی بہت زیادہ کڑوی محسوس ہوئی تھی۔

"تم اسے لے کر واقعی سنجیدہ ہو ازا؟"

"میرے پاس اور کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے۔ مجھے مارک سے شادی نہیں کرنی!!" وہ بے بس ہوئی تھی۔ "جندل کا نام تو ایسے ہی درمیان میں آ گیا ہے لیکن اب میں سوچ رہی ہوں کہ مارک کے مقابلے میں وہ ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا ناں؟" اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ جندل کو اس ٹھنڈے یخ ماحول میں بھی گرمی محسوس ہوئی تھی۔ خیام کو اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا اور سعاد برے برے منہ بناتی کافی کا کپ پٹخ رہی تھی۔

"وہ مسلمان ہے ازا۔۔" عذر پیش کیا گیا تھا۔

"اگر میں بھی ہو جاؤں تو؟"

"وہ ہی کیوں؟ کیا تمہیں وہ واقعی اچھا لگنے لگا ہے؟ جانتی ہی کتنا ہو تم اسے؟" وہ نا چاہتے ہوئے بھی جھنجھلایا تھا۔

"تم جانتے ہو اسے؟" اس نے چونک کر زیاد کو دیکھا۔ وہ فوراً نفی میں سر ہلا گیا۔

"وہ اچھا ہے، کم از کم مارک سے اچھا ہے۔ تم بابا سے بات کرو پلیز میری اس مارک گدھے سے جان چھڑوا دو۔" اس نے التجا کی تھی۔

"میں اسے ہرگز اپنی بھابھی نہیں بناؤں گی، بالکل بھی نہیں!" کسی نے تڑخ کر کہا تھا۔

”میں بات کرتا ہوں انکل سے۔ تم ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ مذہب کوئی کھیل نہیں ہے۔ تمہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہو گا۔“ وہ اسے تسلی دینے کے ساتھ ہی نصیحت بھی کر رہا تھا۔ وہ سمجھ کر سر اثبات میں ہلا گئی۔

”تم بہت اچھے ہو زیاد۔۔“ وہ مسکرا دیا۔

”کبھی زیاد کی بیوی سے بھی ملو، وہ اس سے بھی زیادہ اچھی ہے۔“ کوئی خاموش نہیں رہ سکا تھا۔ وہ چہرہ ترچھا کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپا گیا تھا۔

☆☆☆

اس کی چیخیں کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر بے اثر ہو رہی تھیں۔ وہ بری طرح درد سے بلبلا رہا تھا۔ پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ لبوں کے کنارے کی جلد پھٹی ہوئی تھی، منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ جسم پر بھاری اور مصبوط ڈنڈے پڑنے کی وجہ سے اسے اپنا ہر جوڑ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے سخت اور مضبوط رسیوں کے ذریعے چھت باندھا ہوا تھا ایسے کہ اسکے پاؤں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں کے نیچے تیز آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے جس کی وجہ سے اسے اپنے پاؤں کی جلد پھگلتی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک اور ڈنڈا اس کے پیٹ پر پڑا تھا۔ وہ بری طرح چیخا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس لڑکے کو روکا۔ لڑکا پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آگے آیا۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر اونچا کیا۔

”حزب اللہ کا جاسوس کون ہے یہاں ؟!“ ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔

”میں نہیں جانتا۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھ پر رحم کرو۔“ وہ گڑگڑایا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اسکے بالوں کو چھوڑا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ لڑکا اشارہ ملتے ہی آگے آیا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا اور اسے اپنی آنتیں باہر نکلتی محسوس ہوئی

تھیں۔ منہ سے خون پانی کی طرح نکلا تھا۔ خون کے چھینٹے اس لڑکے کے چہرے پر پڑے۔ وہ آنکھیں میچتا اس خون کو صاف کر کے واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس بار اس ڈنڈے کی زد میں اس کی پسلیاں آئی تھیں۔ اسے خون کی قے آئی تھی۔ منہ سے نکلتا وہ سرخ گاڑھا خون پاؤں کے نیچے بھڑکتی آگ پر گرا تھا۔ شعلے مزید بلند ہوئے تھے۔ اسے اپنا جسم جھلستا محسوس ہوا۔

اسی اثناء میں کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ مارک دو آدمیوں کے ہمراہ اندر آیا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتا اس سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

”کچھ بکا اس نے؟“

”ہم کوشش کر رہے ہیں سر، مگر یہ بہت ڈھیٹ ہے۔“ اس نے عذر پیش کیا۔ مارک نے سخت نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ ندامت سے سر جھکا گیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا جس کا سر ایک طرف کو ڈھلک چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم میں جان باقی نہیں رہی تھی۔ گالوں پر تیزی سے آنسو گر رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔ حزب اللہ کے جاسوس کا نام بتاؤ اور آزاد ہو جاؤ۔“ اس کے بلند آواز میں کہنے پر اس وجود میں تھوڑی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ لب دھیرے سے پھڑپھڑائے۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔ مجھ پر رحم کرو۔“ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ مارک نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر جھٹکا اور واپس مڑ گیا۔

”اس سے جان چھڑاؤ۔ یہ حزب اللہ کا جاسوس نہیں ہے۔ وہ لوگ مر جاتے ہیں مگر اپنے دشمن سے رحم کی بھیک نہیں مانگتے!“ بات مکمل کرتے ہی وہ دروازہ پار کر گیا۔ اس نے چونک کر اس شخص کو دیکھا۔ یہ بات اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی؟

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسلحہ سے لیس افراد کو اندر بلایا تھا۔ قطار میں وہ تین لوگ اپنی اپنی پستولیں سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ ”بے ضرر کر دو!“ حکم صادر کیا گیا۔ ٹریگر پر زور پڑا اور فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ آن کی آن میں کئی گولیاں اس کے جسم سے آر پار ہوتی گئیں۔ اس مردہ وجود کو باقاعدہ مردہ لاش میں تبدیل کر دیا گیا۔ فائرنگ جاری رہی۔ وہ سرد سی نگاہ اس پر ڈال کر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ فائرنگ تھم گئی۔ حکم کی تعمیل ہوئی، اس مردہ لاش کو بھون دیا گیا تھا۔

☆☆☆

”مسٹر اینڈریو۔۔ ایڈیتھ بات کر رہی ہوں۔“ وہ جو اس بے وقت کال پر بے زار ہوئی تھی یک لخت سیدھی ہو کر بیٹھی۔

”جی آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں مادام! اپنا کام کروا کر غائب ہو جانے والے کلائنٹس مجھے کبھی پسند نہیں آئے۔“ اس نے اندر داخل ہوتے خیام کو دیکھ کر دبی دبی آواز میں کہا تھا۔ اپنے کام میں مصروف بدر کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ آخری کام کریں اور ساتھ ہی مجھے اکاؤنٹ نمبر دیں، میں پیمنٹ ٹرانسفر کر دوں گی۔“ بہت شرافت سے کہا گیا تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی جسے خیام کی مشکوک نگاہوں کی وجہ سے وہ فوراً چھپا گئی۔

”جی میں سُن رہا ہوں۔“

”نمبر بھیج رہی ہوں۔ یہ ٹریس کریں اور وہ جو بھی ہے اس سے متعلق ساری معلومات دیں۔“ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔

”بہت بہتر!“ رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے خیام کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ سامنے اسکرین پر مرکوز کی۔

”کون تھا؟“ زکام زدہ سی ناک سکیڑتے ہوئے پوچھا گیا۔

”کلائنٹ۔“ مختصر سا جواب دیا گیا۔

”تھا یا تھی؟“ اس نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔

”آپ مردوں کی بھی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ کیا فرق پڑتا ہے وہ خاتون ہے یا کوئی صاحب۔ میرے لیے سب کلائنٹ ہیں خیام!“ اس نے خاصی سمجھداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ خیام نے بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کون تھا۔۔۔ سعاد؟“ توڑ توڑ کر پوچھا گیا۔ بدر کے لیے دونوں استاد شاگردہ کی یہ نوک جھونک دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب منتظر نگاہوں سے سعاد کو دیکھ رہا تھا جو دانتوں سے نچلے ہونٹ کو کاٹ رہی تھی۔

”استاد جی۔۔ آپ بہت اچھے ہیں۔۔ سچ میں۔۔“ بہت معصومیت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا گیا۔ وہ جواباً کھل کر مسکرایا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نم آنکھوں سے اسے دیکھتا آگے آیا۔ بہت آرام سے اس کے پاس جھکا۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں اور اگلے ہی لمحے اس کا موبائل اچک لیا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔ وہ اس کی چیخ کا کوئی اثر لیے بنا اس کی کال ہسٹری دیکھنے لگا۔

”کیا کہہ رہی تھی ازا؟“ موبائل کی اسکرین پر نگاہیں ٹکائے وہ دائیں ابرو اٹھائے پوچھ رہا تھا۔

”نمبر ٹریس کروانا ہے۔“ اس نے منہ کے زاویے بگاڑے۔

”اور تم نے کہا کہ پہلے وہ پچھلی پیمنٹ کرے۔ درست؟“ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ”تم اس سے کوئی پیمنٹ نہیں لے رہیں۔ اگر کچھ الٹا سیدھا کیا تو تمہارا شوہر بھی تمہیں نہیں بچا پائے گا۔“ وہ اسے دھمکی دے رہا تھا۔ وہ تپ گئی تھی۔

”میرے شوہر کو بیچ میں مت لائیں!“ تڑخ کر کہا گیا۔ خیام نے اس کا موبائل وہیں سے اس کی طرف اچھالا۔ وہ

مہارت سے موبائل پکڑ گئی۔

"تمہارا شوہر ہمیشہ سے بیچ میں تھا۔ سالا گدھا!" چبا چبا کر کہتا وہ پلٹ گیا۔

"آپ میرے سامنے میرے شوہر کو گدھا نہیں کہہ سکتے خیام!" اس نے تیز آواز میں کہا تھا۔ وہ اس کی بات ان سنی کرتا دروازہ پار کر گیا۔ سعاد کا دل کیا تھا وہ پاس رکھا کپ اٹھا کر اس کے سر میں دے مارے۔۔ مگر ہائے یہ ادب!

"آپ دونوں۔۔ ایسے لڑتے ہیں؟" بدر نے آنکھوں میں انوکھی چمک لیے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ سعاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔ وہ گڑبڑا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔

"جب میں اور میرے استاد جی بات کر رہے ہوں تو اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ تمہیں اپنے کان بند کر لینے چاہئیں۔" اسے تاکید کی گئی تھی۔ وہ سر کو جنبش دیتا لب دانتوں میں دبا گیا۔ سعاد نے اپنے موبائل کی روشن اسکرین پر نگاہ دوڑائی جہاں ازابیلا نمبر بھیج چکی تھی۔

"یہ نمبر بھیج رہی ہوں، اسے ٹریس کرو۔" اس نے حکم جاری کیا اور ساتھ ہی بدر کو پیغام موصول ہوا۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے اس نمبر کو دیکھا پھر گردن ترچھی کر کے سعاد کو جو واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"آپی یہ تو۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا پھر اس نمبر پر کال کی۔ سعاد کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر اپنے موبائل کو دیکھا پھر مڑ کر بدر کو جو اسے دیکھ کر کندھے اچکا گیا۔

"یہ میرا بھائی بہت سیدھا ہے۔ اٹھا کر میرا ہی نمبر دے دیا گدھے نے۔" اس نے کرسی کا رخ بدر کی طرف کرتے ہوئے گہری سانس لی۔ "اب ایک جعلی ڈاکومنٹ بناؤ۔ یہ کام تو نپٹائیں۔" بدر نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔

"لکھو کہ یہ لڑکی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ نہیں اس کا ایک بڑا بھائی بھی ہے۔ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ ایڈریس دو

اندلس کا۔۔ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ اندلس میں خوشی خوشی رہتی ہے۔" اس نے بات مکمل کر کے بدر کو دیکھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ "دو بچے بھی لکھ دو۔" بہت سکون سے کہا گیا۔ بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کو یقین ہے وہ لڑکی ہے؟" بہت معصومیت سے سوال کیا گیا۔

"خاتون لکھ دو۔ اب معاملہ بس تصویر کا رہتا ہے۔۔ کسی ایسی خاتون کی تصویر پکڑ لو جو بہت خوبصورت ہوں اور وفات پا چکی ہوں۔ ڈاکومنٹ تیار کر کے ازا کو بھیج دینا اور اس تمام عرصے میں اپنی چونچ بند رکھنا مجھے توجہ کی ضرورت ہے اور تنہائی کی بھی جو تمہاری وجہ سے مجھے میسر نہیں!" دو ٹوک انداز میں کہہ کر وہ رخ موڑ گئی۔ وہ پلک جھپکتا اسے دیکھتا رہا۔ وہ خیام کو منہ پر جواب دے دیتی تھی لیکن اس کا کیا جو یہ کام بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی استانی۔۔ منہ بند کروانا اچھے سے جانتی تھی۔

☆☆☆

اپنے کمرے میں آ کر وہ پی کیپ اور جیکٹ ایک طرف اچھالتا دھم سے بیڈ پر گرا تھا۔ اسے اپنا جسم ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اندر جیسے آگ لگی تھی۔ وہی آگ جو سب جلا کر راکھ کر دینے پر تلی تھی۔ نگاہوں کے سامنے بار بار وہی چہرہ آ رہا تھا۔ کھکھلا کر ہنستی اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستی ازا تاشفین!

وہ اس سے پہلی بار اس رات ملا تھا۔ جب اس نے اپنی شال اسے اوڑھائی تھی۔ جب وہ ٹھنڈ سے جم کر مرنے والا تھا اور وہ اسے ٹھنڈ سے محفوظ رکھنے کے جتن کر رہی تھی۔ وہ اسے سالوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک قرض تھا جو وہ چکانا چاہتا تھا لیکن۔۔ اب جب وہ ملی تو ایسے کہ اس کے دل و دماغ پر کسی کی مہر لگ چکی تھی۔ اور یہ بات تو اسی رات طے ہو گئی تھی پھر جانے کیوں وہ اس تمام عرصے میں امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔ وہ ان دونوں کے درمیان ہو کر بھی نہیں

تھا۔ اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔

نمکین پانی کا چھوٹا سا قطرہ آنکھ سے لڑھک کر کنپٹی سے بہتا سفید چادر میں جذب ہو گیا۔ محبت شاید اس کے مقدر میں تھی ہی نہیں۔ اس نے جسے ٹوٹ کر چاہا تھا ہمیشہ اسے کھو دیا تھا۔ سنان۔۔ مصعب، افق اور اب ازا۔۔ اور کون جانے وہ ازا اور جندل کے درمیان آکر جندل کو بھی کھو دے۔ اس کا اپنی قسمت پر ہنسنے کو دل چاہا تھا۔ وہ جنہیں اپنا سمجھتا تھا وہ کبھی اس کے تھے ہی نہیں۔ نہ مصعب اس کا تھا نہ افق اور نہ ہی ازا۔۔ اور یہاں آکر جندل کیوں سب کی مخالفت کر جاتا تھا۔ وہ کیوں اس کا اپنا تھا؟ وہ کیوں اس سے محبت کرتا تھا؟!

اسے اپنے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ جسم جیسے آگ پر تپ رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور رہی سہی کسر زکام نے پوری کر دی تھی۔ اسے کمرے سے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ زیاد یہاں نہیں تھا، جندل گھر جا چکا تھا، سعاد نیچے نہیں آتی تھی۔ یقیناً آنے والا بدر تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ دروازے میں کھڑے بدر نے ٹھہر کر اسے دیکھا جو بے ڈھب سے انداز میں بیڈ پر سویا ہوا تھا۔

وہ چند ثانیے مضطرب سا وہیں کھڑا رہا پھر اندر آ گیا۔ کمرہ یخ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس نے اے سی بند کیا پھر بیڈ کی طرف آیا۔ بہت آرام سے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارے۔ کھڑے ہو کر اس پر کمفرٹر ڈالا پھر کچھ سوچ کر اپنے دائیں ہاتھ کی پشت اس کی پیشانی پر رکھی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہی اس نے یوں اپنا ہاتھ کھینچا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ وہ بری طرح بخار میں تپ رہا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ اس کے سرہانے بیٹھا اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ آنکھیں موند کر لیٹے خیام کو اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔۔ اس کا اس طرح خیال رکھنا اسے کمزور کر دے گا جو وہ یقیناً

نہیں چاہتا تھا مگر۔۔ اچھا لگا تھا اسے یوں اپنے لیے بدر کا فکر مند ہونا۔ سوچوں میں گھرا وہ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا اسے خبر نہیں ہوئی۔ اس بات سے قطعی انجان کہ۔۔ اس کی پیشانی پر سفید کپڑا رکھتے ہوئے بدر کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ آنکھوں کے آگے چھاتی آنسوؤں کی دبیز تہہ ہر منظر دھندلا کر رہی تھی۔ وہ بہت پیچھے جا چکا تھا۔۔ ایک لمبا سفر طے کیا گیا تھا۔

"بھائی میں مر رہا ہوں۔ یہ دیکھیں ہاتھ لگائیں ذرا، میرے جسم میں آگ لگی ہوئی ہے۔ بس اب میں نہیں بچوں گا۔"

وہ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔

"بھائی دیکھیں اسے۔ یہ صبح سے یہی بکواس کیے جا رہا ہے۔ ہم نے تو نہیں کہا تھا ناں اسے کہ آدھی رات کو بارش میں نہائے۔" اس کے سرہانے کھڑی افق نے خفا خفا سی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ ابھی بھی مجھے ڈانٹ رہی ہے۔ بس میں مرنے لگا ہوں۔ اب نہیں بچوں گا۔" اس کے کراہنے میں اضافہ ہوا تھا۔ افق کا چہرہ غصے سے لال پڑنے لگا تھا۔ اسی اثناء میں اسے اپنی پیشانی پر کسی کے لمس کا احساس ہوا تھا۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اب پٹیاں پانی میں بھگو رہا تھا۔

"جان امانت ہوتی ہے مصعب! امانت میں خیانت نہیں کرتے۔" بہت نرمی سے اسے نصیحت کی گئی تھی۔

"آپ بہت اچھے ہیں یار۔۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اس کے سرہانے بیٹھا اس کا بھائی۔۔ بڑا بھائی۔۔ خیام حنفی کھل کر مسکرایا تھا۔

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو زار و قطار اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ اس نے اپنا دایاں بازو اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے اپنی سسکیوں کو دبایا تھا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ واضح تھی۔ دل تھا جیسے ابھی درد سے پھٹ جائے گا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ اس کا شدت سے دل کیا تھا وہ ایک بار۔۔۔ بس ایک بار اس کا قرض چکا دے۔

اسی کا جو اس کے سامنے بے خبر سویا ہوا تھا۔ وہ ایک بار جھک کر اس کی پیشانی کا بوسہ لینا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ۔۔ وہ اس کو ملے ہر درد کا مداوا کرنے کو تیار ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ۔۔ آگہی کی سزا کاٹنے والا صرف وہی نہیں تھا۔ اس آگ میں دونوں برابر کے جل رہے تھے۔ قریب ہو کر بھی دور ہونا، یہ اس کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے آستین سے اپنی آنکھوں کو رگڑا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے پاس رکھا موبائل اٹھایا۔ جلدی سے کسی کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا۔ پہلی ہی بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"کہو بدر؟"

"بھا۔۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ ایک آنسو چپکے سے گال پر لڑھک گیا۔ "خیام سر کو تیز بخار ہو رہا ہے۔ نیچے آجائیں۔" اس کی نم آواز، گالوں پر گرتے آنسو، بے خبر سویا ہوا خیام۔۔۔ اسے لگا تھا کہ اب وہ مزید خود کو نہیں سنبھال پائے گا۔ اب وہ پورے قد کے ساتھ گرے گا اور شکست کھائے گا۔

☆☆☆

زیاد سے ملنے کے بعد اس نے گھر کی طرف رخ کیا تھا۔ رات کی تاریکی میں روشن سڑک سے گزرتی گاڑیاں سگنل بند ہونے پر ٹھہر گئیں۔ اشارہ دیکھ کر اس نے بھی بریک پر پاؤں رکھ دیے۔ گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے بیک ویو مرر میں پیچھے کھڑی گاڑیوں کو دیکھا پھر ارد گرد دیکھنے لگی۔ اس کے بالکل برابر میں سفید رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے سر پر سیاہ پی کیپ ٹکائی ہوئی تھی اور چہرہ سیاہ ہی ماسک سے ڈھکا تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی پھر اشارہ کھلنے پر گاڑی آگے بڑھادی۔

اسے ابھی مزید پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس نے خود کو عجیب سے احساس میں گھرا پایا تھا۔ وہ گاڑی مسلسل اس

کے تعاقب میں تھی یا وہ بس شک کر رہی تھی، اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس نے ایک دو بار غیر ارادی طور پر مختلف موڑ کاٹے مگر ہر بار وہ گاڑی اس کے ساتھ رہی۔ اسے اب صحیح معنوں میں پریشانی ہونے لگی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل اٹھا کر زیاد کا نمبر ملایا۔ دوسری بیل پر کال اٹھالی گئی۔

"کہو ازا۔" وہ ٹرین کی کھڑکی سے باہر نظر آتے منظر پر نگاہیں ٹکائے کہہ رہا تھا۔

"کوئی میرے تعاقب میں ہے۔" اس نے پریشان کن آواز میں کہا تھا۔ زیاد کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"کہاں ہو تم؟"

"گھر سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر۔" اس نے بیک ویو مرر سے اس گاڑی کو اپنے قریب آتے دیکھ کر کہا۔

"مطلب میرے اپارٹمنٹ کے قریب ہو۔ ازا فوراً اپارٹمنٹ پہنچو۔ پاسورڈ تمہیں معلوم ہے۔ یقینی بناؤ تعاقب کار تمہارے زیادہ قریب نہ آسکیں!" اس نے ہدایات جاری کی تھیں۔ ازابیلا نے سمجھ کر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں شہر سے باہر ہوں۔ ایک دو دنوں میں آؤں گا۔ آج رات اپارٹمنٹ میں رہو، صبح گھر چلی جانا۔ سمجھ رہی ہو ناں؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ ایک نگاہ اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی گاڑی پر ڈالی پھر اپنی رفتار مزید تیز کر کے نگاہیں سڑک پر مرکوز کر دیں۔

دوسری طرف ٹرین میں بیٹھے زیاد نے موبائل جیب میں اڑس کر گہری سانس لی تھی۔ سر سیٹ پر ٹکائے وہ آنکھیں موندنے ہی لگا تھا کہ کوئی اس کے سامنے آ کر بیٹھا۔ سیاہ لباس میں موجود سیاہ پی کیپ ماتھے پر ٹکائے، چہرے کو ماسک سے ڈھکے وہ شخص اس کی نگاہوں میں چبھا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اس شخص نے اپنی پی کیپ مزید نیچے

سر کائی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر اپنی توجہ کھڑکی سے باہر مرکوز کرلی۔ تعاقب کار صرف ازا کے ہی نہیں اس کے پیچھے بھی تھے۔ کہیں نہ کہیں کچھ ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

”بحیرہ روم کی ان مطلق العنان موجوں سے پوچھو کہ انہیں اب تک کتنے مجاہدینِ اسلام کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہو چکا ہے؟ کیا آج بھی یہ بپھرا ہوا سمندر کسی امیر البحر کے سامنے سر جھکاتا ہے؟ امیر البحر، کوئی ایسا مردِ مجاہد جو اس بے کراں سمندر کا فاتح ہو؟

جب جب میں یہ سوچتا ہوں تو جواب نفی میں ملتا ہے۔ شاید وجہ یہ ہے کہ اب کوئی ابنِ تاشفین یا ابنِ قاسم نہیں بنتا۔ اب نہ وہ جذبہ ہے نہ ایمان جو پہاڑوں تک کو تھر تھرانے پر مجبور دے۔ اب کوئی ابنِ ولید رضی اللہ عنہ جیسا مردِ مجاہد نہیں ہے جو خدا کی راہ میں شہادت کا طلبگار ہو۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ کیا اب نہیں تو کبھی نہیں؟ کیا جہالت کی گہری نیند میں سوئی یہ قوم تب اٹھے گی جب پانی سر سے گزر چکا ہو گا؟“!

اس نے رک کر لب دانتوں میں دبائے ان الفاظ کو دیکھا۔ دل میں بے اختیار اپنے باپ سے ملنے کی خواہش جاگی تھی۔ وہ ان سے ملنا چاہتا تھا اور وعدہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ امیر البحر بنے گا۔ وہ سمندروں کا عاشق ان سمندروں کو فتح کرے گا۔ وہ ابنِ تاشفین جیسا بہادر اور ابنِ قاسم جیسا سمجھدار بنے گا۔۔!

وہ انہی سوچوں میں گھرا ہوا تھا جب اچانک جہاز کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کی کرسی الٹ گئی۔ اس کا سر میز کے کنارے پر لگا۔ پیشانی سے خون کی ننھی بوندیں گریں۔ اس نے پریشان کن نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ یک لخت شور بلند ہوا تھا۔ بہت سی چیخیں اس کی سماعت سے ٹکرائی تھیں۔ جہاز میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ وہ فرش سے اٹھ کر تیزی سے اوپر کی طرف بھاگا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ اوپر آیا تو سامنے قیامت برپا دیکھ کر اسے سانس لینے

میں دشواری ہوئی تھی۔

جہاز کے عرشے کو آگ اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ محافظ اپنی پستولیں سنبھالتے اپنی جگہ پر کھڑے ہو رہے تھے۔ باقی لوگ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے کونوں میں دبکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے دادا کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ تیزی سے زینوں کی طرف بھاگا۔ زینے پھلانگ کر وہ اوپر آیا تو نگاہ سیدھ میں سمندر پر ٹکی۔ ان کے سامنے جنگی بحری جہاز تھا۔ جہاز پر بحری قزاقوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے کپتان نے اشارہ دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے آگ کا گولا اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔

"جندل نیچے آؤ!!!" کوئی چلایا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو بہت بھاری محسوس کیا تھا۔ وہ قدم نہیں بڑھا پایا۔ آگ کا وہ گولا عین اس کے اوپر سے گزرتا جہاز کے پچھلے حصے سے ٹکرایا۔ شعلے بھڑک اٹھے۔ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ بیشتر لوگ آگ کی لپیٹ میں آئے۔ انسانی خون کی چھوٹی سی ندی قائم ہونے لگی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ اس نوجوان کپتان نے دلچسپی سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ اسے اپنی رگ و پے میں سکون اترتا محسوس ہوا تھا۔ وہ اس جہاز کو آگ میں بھسم کرنے والا تھا۔ آگ۔۔ اس کا پسندیدہ کھیل! اس کی نگاہیں نیچے ٹکیں۔ خوفزدہ سی نگاہوں سے آگ کی لپیٹ میں آتے جہاز کو دیکھتی وہ بچی، اس کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار لڑھک رہے تھے۔ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتی ان انسانی چیخوں کو اپنی سماعت تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر ہاتھ بلند کیا۔ اگلے ہی لمحے اشارہ دیا گیا۔

"جندل وہاں سے ہٹو!!" جہاز کے کپتان نے حکم دیا تھا۔ اس کے آغا جان نے التجا کی تھی۔ وہ چاہ کر بھی پیچھے نہیں ہٹ پایا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ان دو بھائیوں کو اپنے جسموں کو آگ سے چھڑانے کی کوشش کرتے

ہوئے دیکھا تھا۔ انکے کپڑے جل چکے تھے اور وہ مسلسل چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ نمکین پانی کے دو قطرے پلکوں سے جھول کر بے جان ہو کر گرے تھے۔

"جوابی حملہ کریں آغان جان!!" وہ چلایا تھا۔ اس نے خود میں انجانی سی قوت محسوس کی تھی۔ نفرت بھری نگاہوں سے اس نوجوان کپتان کو دیکھا تھا جو اس کی چیخ پر محظوظ ہوا تھا۔ اس کے آغا جان نے ٹھہر کر اسے دیکھا اور پھر محافظوں کو اشارہ دیا۔ اگلے ہی لمحے جہاز کا رخ بدلنے لگا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچتا اس نوجوان کپتان کو گھور رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کی دبیز تہہ بچھ گئی تھی۔

"وہ رخ بدل رہے ہیں۔ یقیناً جوابی حملہ کریں گے۔ ہمیں انہیں روکنا ہو گا۔" مائیکل نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

"انہیں کوشش کرنے دو۔ جو لوگ مزاحمت نہیں کرتے، ان کی موت بدترین ہوتی ہے۔ یہ جوان بہادر ہیں، یہ بدترین موت کے مستحق نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اپنا دو دھاری خنجر نکالا تھا۔ دلچسپی سے اس بچے کو کو دیکھا جس کی نگاہوں میں اس کے لیے بے پناہ نفرت تھی۔ بے انتہا نفرت!

جہاز کا رخ بدل دیا گیا۔ ایک اور اشارہ ملا اور پھر بے درپے دھماکے ہوئے۔ کانوں کو پھاڑ دینے والی آوازیں گونجیں۔ سمندر کی لہریں بپھر اٹھیں۔ آگ کے گولے عین جہاز کے قلب میں لگے۔ ٹھیک درمیان میں آگ بھڑک اٹھی۔ اب دونوں جہازوں میں یکساں منظر تھا۔ دونوں طرف آگ تھی اور چاروں طرف پانی تھا۔ حد نگاہ تک پھیلا پانی، پانی کے اوپر آگ!

وہ زور زور سے اپنے کانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگی تھی۔ یہ چیخیں، پانی کی طرح بہتا انسانی گرم خون، آگ کی نذر ہوتے انسان اور وہ لوگ جن کے آدھے جسم جلے ہوئے تھے اور وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ وہ اس منظر سے اوجھل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے کئی لوگوں کو پانی میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔ اسی اثناء میں کوئی دھڑام سے اس

کے قدموں میں گرا تھا۔ اس کا چہرہ جلا ہوا تھا۔ جسم خون آلود تھا۔ سرخ گاڑھا خون اس کے قدموں میں بہنے لگا۔ اس نے زوردار چیخ ماری تھی۔ اگلے ہی لمحے اسے ٹھوکر لگی تھی۔ وہ اس لاش کے اوپر گری تھی۔ اسے اپنا آپ خون میں لت پت محسوس ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانا چاہے مگر سب بے سود تھا۔ اس کا دل رکنے لگا تھا، سانس لینا محال ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو زاروقطار بہنے لگے تھے اور اگلے ہی لمحے وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ اس خون آشام شام میں اس نے زندگی سے موت کی طرف بڑھنا شروع کیا تھا۔

"دونوں جہاز ڈوب رہے ہیں۔ ہمیں جلدی کرنا ہوگی!" مائیکل نے گھبرا کر کہا تھا۔ اس نے اپنا خنجر ہوا میں اچھالا۔ خنجر واپس اس کی طرف گرا، اس نے مہارت سے اسے پکڑتے ہوئے اپنے ہاتھ میں گھمایا اور پھر ٹھیک اس بچے کا نشانہ لے کر خنجر اس کی طرف پھینکا۔ جندل نے پیچھے ہٹنا چاہا کہ اسے ٹھوکر لگی۔ وہ خنجر نشانہ چونکنے کی وجہ سے اس کے بازو کو سیدھ میں چیرتے ہوئے نیچے گرا۔ اس نے ہراساں نگاہوں سے اپنے بازو سے ابل ابل کر بہتے خون کو دیکھا۔ اس دو دھاری خنجر کے دیے گئے گہرے زخم کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ زخم کسی شیر کے پنجے سے ملا ہو۔ اگلے ہی لمحے وہ نیچے کی طرف بھاگا تھا۔ اسے اپنے آغا جان کے پاس جانا تھا۔ قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ اپنے اردگرد پانی کی طرح بہتا خون اسے بری طرح خوفزدہ کر رہا تھا۔ اس کے لیے مزید یہ سب دیکھنا کٹھن ہو رہا تھا۔ دونوں جہاز ڈوبنے لگے تھے۔ سمندر کا شفاف پانی کسی ماں کی طرح آگ کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ نوجوان کپتان نے اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں تو خود کو تنہا پایا۔ اس نے اس بچی کو ڈھونڈنا چاہا مگر ناکام رہا۔ مائیکل آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور اب بس وہی تھا جو زندہ سلامت تھا۔ وہ فوراً نیچے کی طرف بڑھا۔ اب سمندر ہی اسے پناہ دے سکتا تھا۔ وہ سمندر کی آغوش میں سمانے جا رہا تھا۔ تبھی اس نے دیکھا تھا کہ ایک شخص۔۔ سیاہ چغہ پہنے، سر پر ہُڈ گرائے، اپنا چہرہ ڈھکے لاشوں کے درمیان سے اس معصوم بچی کو نکال رہا تھا۔ اس نے اس شخص کی

طرف بڑھنا چاہا مگر کسی لاش سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ اس شخص نے مڑ کر قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت تھی، بے انتہا نفرت۔ اگلے ہی لمحے اس نے اس شخص کو اس بچی سمیت سمندر میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔ وہ بے سدھ سا وہیں گر گیا تھا۔

وہ بھاگ رہا تھا۔ اس کے قدموں تلے کئی لاشیں کچلی جا رہی تھیں۔ جسم پر جا بجا خون لگا تھا۔ بازو درد کی وجہ سے سُن ہونے لگا تھا۔ آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ وہ کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھا مگر یہاں ہر طرف کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔ اکثر و بیشتر تو زندہ جلے ہوئے لوگ تھے جن کے چہروں اور جسموں کی کھالیں ادھڑ چکی تھیں۔ اس نے جانے کتنوں کے مسخ شدہ چہروں کو لتاڑا تھا، جانے کتنے گوشت کے ٹکڑے اس کے قدموں تلے کچلے گئے تھے۔ وہ اس خونی منظر سے بھاگنا چاہتا تھا اور تبھی۔۔ اس نے خود کو سمندر میں گرتے محسوس کیا۔ اس کا جہاز۔۔۔ ڈوب چکا تھا۔

وہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے آتے پانی نے ہر منظر دھندلا کر دیا۔ تمام آوازیں بند ہو گئیں۔ بازو سے بہتا خون سمندر کے شفاف پانی کو خراب کرنے لگا۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی، وہ سانس نہیں لے پایا۔ سمندر کسی دوست کی طرح اسے خود میں سمیٹ رہا تھا۔ وہ بہت نیچے جا رہا تھا۔۔ مسلسل نیچے کی طرف۔۔ کسی بے جان شے کی مانند۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اپنی موت صاف دکھائی دی۔ سمندر نے آگ کو خود میں سمیٹ لیا تھا اب اس آگ سے کھیلنے والے انسانوں کی باری تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے مگر وجود بے جان سا ہونے لگا۔ بال ماتھے سے چپک گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ اتھاہ گہرائیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی جہان کی طرف جہاں جانے والے کبھی نہیں لوٹتے۔۔

اس نے محسوس کیا کہ جب سمندر اس کے بکھرے سے وجود کو خود میں سمیٹ رہا تھا تو ایک شخص سمندر سے لڑتا

ہوا آیا اور اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

"سمندر اپنے امیر البحر کا قاتل نہیں ہو سکتا!" وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

☆☆☆

اس نے لاک میں چابی گھمائی۔ کلک کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ اس نے پہلا قدم اندر رکھا۔ سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھٹھک کر رکا۔ وہاں خالی میز کے پاس رکھی کرسی پر کوئی نقاب پوش بیٹھا تھا۔ مکمل سیاہ لباس میں موجود، ہم رنگ ہی پی کیپ سر پر ٹکائے اور چہرے کو سیاہ رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم اندر کیسے آئے؟ کیفے تو بند تھا۔" اس کی آواز میں واضع لغزش تھی۔ زیاد نے پر سکون سی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" لہجہ ہڈیوں کو جما دینے کی حد تک سرد تھا۔ چند ثانیے بعد وہ شخص اضطراب کے عالم میں انگلیاں چٹخاتا اس کے سامنے بیٹھا اسے تک رہا تھا۔ "تمہاری بیٹی ایلسا، اس کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟"

"جیسے ایک باپ کے اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتے ہیں۔" اس نے زخمی سے لہجے میں کہا تھا۔

"اگر ایسی بات تھی تو کبھی اس کی خبر کیوں نہیں لی؟" اس نے دائیں ابرو اٹھائے سوال کیا تھا۔

"انہوں نے کہا تھا اگر میں اس سے ملنے آیا تو وہ اسے مار دیں گے۔" اس کی آنکھیں اب آنسوؤں سے بھرنے لگی تھی۔ زیاد کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری رہا۔

"کون؟"

"اس کا شوہر اور مارک۔" اس نے سر جھکا کر اپنے آنسوؤں کو اندر اتارا تھا۔

"ایلسا ایسا کیا جانتی تھی کہ وہ لوگ اس کی جان کے درپے ہو گئے؟" زیاد کے سوال پر اس بوڑھے شخص نے خوفزدہ

سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔

"تمہاری بیٹی مرچکی ہے، وہ تمہیں بھی جلد ماردیں گے۔ کیااب بھی خاموش رہو گے؟" لہجہ تلخ تھا۔

"وہ جانتی تھی کہ اسکائے ٹو کی پانچویں سیٹ پر کون بیٹھا ہے۔" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا۔

"کون؟"

"اسے بتانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اسے معذور کرچکے تھے۔" اس کی آنکھوں سے اب آنسو بہنے لگے تھے۔

"تمہارے علاوہ اور کوئی جسے بتانے کی اس نے کوشش کی ہو؟" زیاد نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"اس کا بھائی۔۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی۔ اور شاید وہ کامیاب بھی ہوگئی تھی۔" وہ چونک کر سدیھا ہوا۔

"وہ مجھے کہاں ملے گا؟" بوڑھے نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"اس کا بھائی ایک سائیکو پیتھ ہے"!

☆☆☆

اس نے رات زیاد کے اپارٹمنٹ میں ہی گزاری تھی۔ صبح تقریباً وہ آٹھ بجے وہاں سے نکلی تھی۔ سڑک پر گاڑی ڈالتے ہی اس نے اسی گاڑی کو اپنے تعاقب میں دیکھا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچ گئی تھی۔ البتہ اب رات کی نسبت ڈر کم تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار معمولی ہی رکھی۔ چند لمحات ہی گزرے تھے کہ اس نے سڑک کنارے کسی لڑکی کو کھڑے دیکھا تھا جو ہاتھ کے اشارے سے اسے روک رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے گاڑی کنارے پر کھڑی کردی۔ وہ لڑکی اس کے پاس آئی، اس نے شیشہ نیچے کیا۔

"میری بس مِس ہوگئی ہے۔ آپ مجھے لفٹ دے سکتی ہیں؟" خاصی شستہ انگریزی میں ناک سے پھسلتے چشمے کو واپس ناک پر ٹکاتے ہوئے پوچھا گیا۔

"شیور، آجائیں۔" اس کے مسکرا کر کہنے پر وہ لڑکی سر کو جنبش دیتی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔ سڑک پر نگاہیں مرکوز کیے توجہ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے ٹھہر کر اس لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس نے ٹخنوں تک کا سیاہ رنگ کا لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ گردن کے گرد سرخ رنگ کا مفلر لپیٹا ہوا تھا اور سر پر سیاہ حجاب تھا۔ چہرے پر ماسک لگا تھا اور ناک پر چشمہ ٹکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔ اس لڑکی میں کچھ منفرد سا تھا جو اسے اچھا لگا تھا۔

"آپ ازابیلا وارلڈ ہیں ناں؟" چہرہ ترچھا کر کے شائستگی سے اس سے پوچھا گیا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اور آپ کی تعریف؟"

"سعاد!" اس نے خاصی سچائی سے کام لیا تھا۔ وہ بس ہلکا سا مسکرا دی۔ سعاد نے بغور اسے دیکھا تھا۔ اس کے گہرے بھورے رنگ کے شانوں تک آتے بال ڈائے شدہ تھے۔ چہرہ میک اپ کی وجہ سے چمک رہا تھا، کچھ نکھرا نکھرا سا بھی لگ رہا تھا۔ کتھئی اور سبز رنگ کا اسٹول اس نے مفلر کی طرح گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ سیاہ جینز پر گھٹنوں سے نیچے تک خاکی لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اسے تجسس ہوا تھا کہ آخر ایسا کیا تھا اس لڑکی میں جو اس کا بھائی، اس کا شوہر اور استاد دیکھ رہے تھے؟ جو وہ نہیں دیکھ پا رہی تھی؟ وہ ایک معمولی سی لڑکی تھی۔۔ عام سی۔۔ عام سی لڑکی جو زیاد کو اچھی لگتی تھی۔ اس نے نا چاہتے ہوئے بھی بچوں کی طرح منہ بسورا تھا۔

"آپ اسٹوڈنٹ ہیں؟" گاڑی میں چھائی خاموشی کو ازابیلا نے توڑا۔

"نہیں۔۔ ہاؤس وائف ہوں۔" اسے اپنا حلق تک کڑوا ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"آپ لگتی نہیں ہیں۔" اس نے تعریف کی تھی یا طنز وہ سمجھ نہیں پائی۔

"اسے میں اپنی تعریف سمجھوں گی۔" اس نے کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً وہ لب دانتوں میں دباتے ہوئے

اپنی مسکراہٹ دبا گئی۔

"بس یہیں روک دیں۔" اس کے کہنے پر ازابیلا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسی کے گھر کے سامنے گاڑی رکوا رہی تھی۔ اس نے سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا تبھی گاڑی روک دی۔ وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔ مڑ کر اسے شکریہ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ لڑکی جو اسے تھوڑی منفرد لگی تھی اب بہت زیادہ منفرد محسوس ہوئی تھی۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اب دور جا رہی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی پھر اچانک کسی خیال کے آنے پر چونک گئی۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہاں اس کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے حیرت سے واپس اس لڑکی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جو اب کہیں گم ہو چکی تھی۔

وہ لڑکی، بہت آرام سے اسے باحفاظت اس کے گھر پہنچا گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی گاڑی وارلڈ گلاس کمپنی کے دروازے پر رکی۔ بدر نے ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر جلدی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ سیاہ رنگ کی اسٹک سڑک پر ٹکی۔ ہلکی سی ٹک کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے وہ باہر نکل آیا۔ بدر گاڑی کا دروازہ بند کر کے اب اس کے آگے چلنے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس کا اگلا قدم کمپنی کے اندر تھا۔ وہاں کھڑے لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ جو سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس سپاٹ چہرہ لیے، سنجیدہ نگاہوں سے دھاک بٹھاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"مجھے لگا تھا اب یہ نہیں آئیں گے۔ موت کے منہ سے واپس آئے ہیں، میں نے دیکھا تھا ان کا وہ خون میں لت پت وجود۔ آہ۔۔ یہ سچ میں بہادر ہیں۔" آواز کسی لڑکی کی تھی۔

"وارلڈ کو یہ پہلے ہی پسند تھا، اب تو نمبر اور بڑھ گئے ہیں اس کے۔ ہم سب دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالے جائیں

گے۔" کسی لڑکے نے جل بھن کر کہتے ہوئے ناک سکیڑی تھی۔

"یہ بالکل ان فکشنل کہانیوں کا ولن لگ رہا ہے جو سر اٹھا کر چلتے ہیں اور جن کے ہاتھ میں موجود اسٹک پر عقاب بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ بندہ کتنا ڈیشنگ ہے۔" ایک لڑکی کی آواز ذرا سی بلند ہوئی تھی۔ سب کی نگاہیں اس لڑکی سے ہوتیں اس بندے پر ٹکیں جو انہیں یکسر نظر انداز کرتا آگے بڑھ چکا تھا۔ اس سے ایک قدم کے فاصلے پر چلتا بدر اسے آج کا شیڈول بتا رہا تھا جسے اس نے سننے کی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ یہی سب اس کے کان میں سعاد دہرا رہی تھی۔

کچھ ہی لمحات میں وہ راہداری سے گزرتا اپنے آفس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راہداری کے سرے سے نمودار ہوتے وارلڈ نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں خوشگوار حیرت ابھری۔

"خیام حنفی! ویلکم بیک مین۔" لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی تھی۔

"اچانک غائب ہو گئے تھے تم۔ مجھے لگا بھاگ گئے ہو۔" اسے جانے کیوں اس کے لہجے میں طنز محسوس ہوا تھا۔

"میری اہلیہ کی طبیعت بگڑ گئی تھی تبھی آوٹ آف کنٹری جانا پڑا۔ اب آ گیا ہوں۔" بہت صفائی کے ساتھ جھوٹ بولا گیا تھا۔ بدر کے حلق میں کچھ چبھنے لگا تھا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب آ گئے ہو تو سارا کام سنبھالو۔ مجھے کمپنی کے معاملے میں تمہارے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں۔" مسکرا کر کہا گیا تھا۔ اس کے عقب سے نمودار ہوتا مارک اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رہا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے سرکتیں اس کے ہاتھ میں موجود اسٹک پر ٹکی تھیں۔ ذہن کی اسکرین پر وہ منظر نمودرار ہوا جب اس نے اسٹک ہاتھ میں لیے اس ہیولے کو ہال میں آتے دیکھا تھا۔ اس کی بھاری آواز اور اسٹک کی ہلکی سی ٹک ٹک۔۔ اس نے حیرت و اچھنبے سے خیام کو دیکھا تھا۔ وارلڈ اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا تھا۔ مارک بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ خیام خاموش کھڑا رہا۔ بدر نے گردن ترچھی کر کے اسے جاتے دیکھا۔

”آپ ابراہم وارلڈ کو اپنے شک کے دائرے میں کیوں نہیں لاتے سر؟“ اس کے سوال پر خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے مصعب! یہ چیز اسے مشکوک بناتی ہے مگر ہم کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔“ ایک طائرانہ نگاہ راہداری پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ بدر وہیں کھڑا رہا۔ گردن ترچھی کر کے اس راستے کو دیکھا جہاں سے وارلڈ گیا تھا پھر ٹھہر کر اس خوشبو کو اندر اتارا جو اسے محسوس ہوئی تھی۔ یہ خیام کے کلون کی خوشبو نہیں تھی، یقیناً یہ خوشبو وارلڈ کی تھی۔۔ منٹ کی ٹھنڈی اور ہلکی سی خوشبو۔۔

☆☆☆

”دائیں طرف چوتھی میز آپ کے لیے بکڈ ہے۔ چیک پر سائن کریں اور بنا رقم درج کیے وہیں رکھ جائیں۔ رقم موصول کر لی جائے گی۔“ اینڈریو کی طرف سے ملنے والے پیغام کو دیکھ کر اس نے گہری سانس لے کر گرد و پیش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ اس کے دیے گئے ایڈریس پر پہنچ چکی تھی اور اب اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے رقم اس کے حوالے کرنا تھی۔ وہ دائیں طرف چوتھی میز پر آئی اور اپنا ہینڈ بیگ وہاں رکھ دیا۔ ابھی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ ویٹر نے اس کے سامنے کافی کا کپ رکھا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ویٹر کو دیکھا۔

”جنہوں نے آپ کے لیے میز بک کروائی ہے، آرڈر بھی انہوں نے ہی دیا ہے۔“ ویٹر نے اس کی نگاہوں میں موجود سوال کو پڑھ کر جواب دیا۔

”کیا میں جان سکتی ہوں کہ کون؟“ اس نے احتیاط بھری نگاہ اپنے ارد گرد ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”وہ جا چکے ہیں۔“ ویٹر نے مسکرا کر جواب دیا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے کافی کے کپ سے اڑتی بھاپ کو دیکھا پھر اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مجھے تسلی کیسے ہو گی کہ رقم آپ نے ہی موصول کی ہے؟“ اس نے پیغام بھیجا تھا۔ اس سے دو میزوں کے فاصلے پر بیٹھی سعاد نے ناگواریت سے موبائل پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا تھا۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اور ازا کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

”آپ چیک سائن کریں، آگے میرا مسئلہ ہے۔“ دوٹوک انداز میں کہا گیا۔ اس نے پرسوچ نگاہوں سے اس پیغام کو دیکھا۔ رقم موصول کرنے والا یقیناً عجلت میں تھا۔ لیکن کون؟ اس نے ایک بار پھر گردن دائیں بائیں گھمائی تھی۔ اس کے دائیں طرف دو میزیں خالی تھیں اور پھر تیسری میز پر کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ چہرے کے آگے اخبار تھا۔ جبکہ بائیں طرف اکا دُکا لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ بھی کہیں بھی مشکوک نہیں تھا۔

اس نے ہینڈ بیگ سے چیک نکالا اور بنا وقت ضائع کیے اپنے سائن کر دیے۔ چیک میز پر رکھا، قلم بیگ میں ڈالا۔ چیک کے اوپر کافی کا کپ رکھا اور ہینڈ بیگ اٹھا کر چپ چاپ باہر نکل گئی۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتی سعاد کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے ازا کا تعاقب کیا۔ وہ دروازے کے پار گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ کچھ ہی لمحات میں اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کی تقلید میں سفید رنگ کی ایک گاڑی بھی آگے بڑھ گئی۔

”بدر سن رہے ہو؟“ اس نے سرگوشی کی تھی۔

”فرمائیے۔“ اس کی مصروف سی آواز سعاد کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”آئی فون لینے چلیں؟“ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔ دوسری طرف ڈرائیونگ کرتے بدر کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ اس نے چور نگاہوں سے بیک ویو مرر سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے خیام کو دیکھا۔

”آئی فون؟!“ اس نے سرگوشی کی تھی۔

"ایک تمہارا، ایک میرا۔" اس کی دھڑکنیں تیز ہوئی تھیں۔

"پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

"اپنی استانی کو ہلکا مت لو۔" مکمل تسلی کرنے کے بعد اس نے ازابیلا کی میز سے چیک اٹھاتے ہوئے فخر سے کہا تھا۔

"آپ بھی اپنے استاد کو ہلکا مت لیں۔ انہیں بھنک بھی پڑ گئی تو آپ کی تو خیر ہے میں مارا جاؤں گا۔"

"استاد جی کی پرواہ مت کرو۔ تم بس ذرا فرصت میں آؤ، آئی فون لینے چلتے ہیں۔" اس نے چیک اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالا پھر ناک سے پھسلتا چشمہ واپس ناک پر ٹکاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

"یو آر گریٹ استانی جی"!!

☆☆☆

"اس نے پہلا قتل اپنے دوست کا کیا تھا۔ پولیس جب اس کے دوست کے اپارٹمنٹ میں پہنچی تو وہاں فرش پر اس کے دوست کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ یہ اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ہاتھ خون آلود تھے، چہرے پر خون کے چھینٹے تھے۔ کپڑے سرخ رنگ میں رنگے تھے۔ پولیس کے سوال پر اس نے بنا کسی تردد کے اعتراف کیا کہ قاتل وہی ہے۔ لیکن پولیس کو کہیں بھی کوئی ایسا ہتھیار نہیں ملا جس سے قتل ہوا ہو۔ اس نے اپنے دوست کو دانتوں سے کاٹا تھا۔۔ ٹھیک اس کی شاہ رگ پر۔۔ پوری قوت سے یہاں تک کہ اس نے جان دے دی۔ تب ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک سائیکوپیتھ ہے۔" اس کے ساتھ چلتے ڈاکٹر نے جھرجھری لی تھی۔ "میں نے کبھی اتنا برا قتل نہیں دیکھا تھا۔ حد سے گرا ہوا اور وحشیانہ!" اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ سینئر ڈاکٹر کی ہمراہی میں وہ سفید کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ناک پر چشمہ ٹکائے ہاتھ میں نوٹ بک لیے ڈاکٹروں کی ٹیم کا ہی فرد لگ رہا تھا جو یہاں کے دورے پر آئے تھے۔

"اسے جیل نہیں بھیجا گیا؟" اس نے ناک سے پھسلتا چشمہ واپس ناک پر ٹکاتے ہوئے سوال داغا۔

"تین ماہ کے عرصے میں اس نے وہاں دو قتل کیے۔ ایک کی شاہ رگ اسی طرح دانتوں سے کاٹی اور دوسرا۔۔ اس کا سر دیوار میں مار مار کر اسے ختم کر دیا۔ گارڈز جب تک پہنچے تب تک وہ اس کے خون میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی اسے مینٹل اسائلم لایا گیا۔" ڈاکٹر کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ وہ بھی ٹھہر گیا۔

"مجھے رپورٹ بنانے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ سے بیس منٹ لگیں گے۔ اس عرصے میں اپنا کام مکمل کر لو۔ اور یاد رہے، اس کے قریب مت جانا!" اسے تاکید کی گئی تھی۔ اس نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ ڈاکٹر اپنی ٹیم کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے نگاہوں کا رخ کمرے کے دروازے کی طرف کیا۔ کمرہ نمبر ایک سو تین۔۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔

سفید دیواریں اور ہم رنگ ہی فرش، بڑا اور بالکل خالی یہ کمرہ بے حد سرد تھا۔ ماحول یخ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ کمرے کے بالکل کونے میں ایک بیڈ رکھا تھا جس پر سفید چادر بچھی تھی۔ سفید چادر جس پر جگہ جگہ سرخ انسانی خون لگا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں اس خون سے سرکتیں بیڈ سے بندھے اس شخص پر ٹکیں جو وحشیانہ طریقے سے اپنا سر بیڈ پر مار رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ہتھکڑی میں بندھا تھا۔ پیشانی سے خون لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ رخسار اور ہاتھ سرخ رنگ میں رنگے تھے۔

"تم ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔" اس ٹھنڈے یخ کمرے میں اس کی آواز بھی جمنے لگی تھی۔ وہ شخص ٹھہر گیا۔ خالی خالی نظروں سے بیڈ کو گھورنے لگا۔ زیاد نے اپنے قدم آگے بڑھائے۔ "جس طرح تمہاری بہن کو فالج کا مریض بنا دیا گیا اسی طرح تمہیں سائیکوپیتھ ثابت کیا گیا۔ مجھے حیرت ہے انہوں نے تم دونوں کو مارا کیوں نہیں؟!" وہ اب عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سرخ انسانی خون کی عجیب سی مہک متلی کا سا احساس اجاگر کر رہی تھی۔

”ہر جرم کی سزا موت نہیں ہوتی۔“ اس نے نخوت سے کہا اور اپنا وہی عمل دہرانے لگا۔ سفید چادر پر خون کے چھینٹے گرنے لگے۔ اس کا سر بیڈ سے ٹکرانے سے کمرے میں ارتعاش سا پیدا ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا پنجوں کے بل اس کے برابر میں بیٹھا۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔

”تمہارا مجرم کون ہے؟!“ وہ رک گیا تھا۔ زیاد اس کے بہت قریب تھا۔ اتنا کہ اس کے وجود سے اٹھتی خون کی مہک اسے خود میں سماتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ”کون ہے تمہارا اور تمہاری بہن کا مجرم؟!“ اس نے سوال دہرایا تھا۔ نگاہیں اس کے خون سے بھرے چہرے سے گرتیں اس کے ہاتھوں پر ٹکیں جہاں اس کے ناخنوں میں بھی خون جما ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ نگاہ اس کے سنجیدہ چہرے سے سرکتی اس کی گردن پر ٹھہری۔ وہ شاید اس کی شاہ رگ کا مقام معین کر رہا تھا۔ کئی پل گزر گئے۔ زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ اس نے بغور اس کے گلے میں ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی کو دیکھا۔ عجیب سا احساس اس کے اندر اجاگر ہوا اور اگلے ہی لمحے اس نے پوری قوت سے اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیے تھے۔

زیاد نے اس کی گردن دبوچ کر اسے پیچھے ہٹانا چاہا تھا مگر نگاہ دیوار پر لگے کیمرا پر ٹکی۔ وہ یہاں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا تھا تبھی بس معمولی سی مزاحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ وہ اس پر مزید حاوی ہو گیا۔ اس کی گردن پر خون کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس شخص کا منہ خون سے بھرنے لگا۔ زیاد نے اس کی گردن دبوچ لی مگر سب بے سود رہا۔ کیمرا اسے یہ منظر دیکھتے گارڈ نے وائرلیس پر ہدایات دیں۔ کچھ پل مزید گزر گئے اور پھر گارڈز اندر داخل ہوئے۔ دو گارڈز نے پوری قوت سے اس شخص کو پکڑ کر پیچھے دھکیلا تھا۔ زیاد گہری سانسیں لیتا ٹانگیں سیدھی کرتا بیڈ سے ٹیک لگا گیا۔ گردن سے بہتا خون سفید کوٹ کو داغدار کر گیا تھا۔ وہ شخص آنکھوں میں وحشت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا، پورا چہرہ خون میں رنگا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اندر داخل ہوتے ڈاکٹر نے تیزی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"شاید اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ قتل کا سب سے وحشیانہ طریقہ کیونکر ہے؟ تکلیف دہ اور وحشت ناک!" اس نے اپنی گردن پر آئے گہرے زخم کو دباتے ہوئے خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ڈاکٹر نے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا تھا۔ اپنی گردن پر ہاتھ رکھے اس نے ٹھہر کر اس شخص کو دیکھا جو اب اپنے لبوں پر زبان پھیر رہا تھا غالباً خون کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس کی حالت پر رحم آیا تھا۔ ڈاکٹر کے ہمراہ کمرے سے نکلتے ہوئے وہ کچھ یاد آنے پر ٹھٹھک کر رکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ واپس اس بیڈ کی طرف آیا۔ وہاں سفید چادر پر خون سے کچھ لکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسے خون چاہیے تھا، اسے اپنا پیغام مکمل کرنا تھا۔

اس نے بغور ان الفاظ کو دیکھا۔ وہ تھائی زبان نہیں تھی، ہسپانوی تھی۔ اسے سمجھنے میں کچھ وقت لگا اور پھر وہ اسے پڑھنے میں کامیاب رہا۔ وہاں مجرم کا نام لکھا تھا،

"دلال!" اس کا ہاتھ اپنی کوٹ کی جیب میں گیا۔ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ اس نے ٹھہر کر اس شخص کو دیکھا جو اب اپنے ناخنوں سے خون کو کھرچنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اس نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا پھر شیشے کے بھاری دروازے کو دھکیل کر باہر آ گیا۔ زینے اترتے ہوئے اس نے کڑوی اور گرم کافی سے اپنا حلق تر کیا پھر جیکٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالی۔ اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ وہ اس کی گاڑی کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ لانگ کوٹ کی جیب میں اڑسے ہوئے تھے اور نگاہیں سامنے نظر آتی سیاہ ہموار سڑک پر مرکوز تھیں۔ اس کے ٹھٹکنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ آنکھوں میں انوکھی چمک لیے اسے دیکھا۔

”بوڑھا بھیڑیا! جب زیاد نے ازا کے تعاقب کاروں کا ذکر کیا تھا، مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا۔“ ماسک کے پیچھے شاید وہ مسکرائی تھی۔ عالیان نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اپنی پی کیپ کو نیچے سرکاتا اس کے برابر میں گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ بولنے سے پہلے گرم کافی کو حلق میں اتارا۔

”جب ایک اجنبی لڑکی اس کی گاڑی میں بیٹھی تھی، اور بیک ویو مرر سے مجھے گھورا تھا، مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا۔“ اس نے بے فکری سے کہا تھا۔

”عمر دیکھیں اپنی۔ کسی لڑکی کا تعاقب کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔“ اس نے خاصا مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ عالیان سر جھٹک کر ہنس دیا۔

”سعادیوسف زئی کا بوڑھے بھیڑیے کا تعاقب کرنا بھی اسے زیب نہیں دیتا۔“

”آپ میری باتیں میرے ہی پیچھے دہرانے والے ہیں؟“ اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ عالیان لاجواب ہوا تھا۔ آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔ ”صاف اور سیدھی بات کرتی ہوں۔ حالانکہ مجھے وہ اچھی نہیں لگتی لیکن پھر بھی ازا کو نقصان پہنچانے کی کوشش مت کیجیے گا، آپ اپنے لیے مسائل پیدا کریں گے۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں کیوں لگا میں اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہوں؟"

"خیام کی جان بچانے والا کبھی اس لڑکی کو نقصان نہیں پہنچائے گا جس کی وہ پروا کرتا ہے۔" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"تو پھر اس شک کی وجہ؟"

"استاد جی کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ کوئی اور آپشن نہیں ہے۔" اس نے گہری سانس لی تھی۔ عالیان مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا جو نیلے شفاف آسمان تلے گاڑی سے ٹیک لگا کر سر اونچا کیے کھڑی تھی۔ وہ اس کے اس انداز پر کہیں کھو سا گیا تھا۔ ماضی کے کئی مناظر ذہن کی اسکرین پر لہرائے تھے۔ یہ انداز دحیہ کا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ہوتا تو یونہی سر اونچا کر کے آسمان کو تکا کرتا تھا۔ بالکل ایسے ہی۔۔ کسی چیز سے کمر ٹکا کر، سر اونچا کیے، نگاہوں میں نرمی کا تاثر لیے۔۔ ہر انداز اسی کا تھا۔

"کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے اطلاع دی تھی۔ وہ چونک کر سوچوں سے باہر آیا۔ سر جھٹک کر گرم کافی کا گھونٹ بھرا پھر گہری سانس لی۔

"میں ہمیشہ سے سوچتا تھا کہ میرا بیٹا میرے لیے کیسی بہو کا انتخاب کرے گا۔ کوئی کمزور اور حساس سی لڑکی یا پھر دبنگ اور خود مختیار۔ آج تمہیں دیکھ رہا ہوں تو اندازہ ہو رہا ہے کہ۔۔ اس نے یک قلم مختلف چناؤ کیا ہے۔ پر اعتماد اور بہت بہادر لڑکی کا!" سعاد کو چند پل لگے تھے اس کی بات سمجھنے میں۔ اس نے حیرت سے عالیان کو دیکھا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ وہ محبت بھری نگاہوں سے نرمی سے مسکراتا اسے دیکھ رہا تھا۔ "زیاد کا انتخاب بلاشبہ بہترین ہے!" وہ گنگ رہ گئی تھی۔

"آپ۔۔ آپ زیاد کے۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عالیان نے اپنے لبوں پر انگشتِ شہادت رکھ کر اسے

خاموش کروایا تھا۔

"لیکن زیاد نے کہا تھا اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔" اس نے بے یقینی کی کیفیت میں کہا تھا۔

"اس نے تو تم سے یہ بھی کہا ہو گا کہ جب تمہاری وجہ سے اس کے ساتھیوں کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی تو واپس جانے پر الزرقاوی نے اسے بس تھوڑا سا ڈانٹا تھا، تو کیا تم نے یقین کر لیا؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار لب دانتوں میں دبا گئی۔ وہ اس کا یقین کیے بیٹھی تھی اور وہ یہاں بھی اسے ڈبل کراس کر چکا تھا۔

"میں کیسے مان لوں؟" اس نے مزید کریدنا چاہا تھا۔

"جیسے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا ویسے ہی۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"آپ سچ میں اس کے والد ہیں؟" اسے اپنی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ عالیان نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بس ہلکا سا مسکرایا تھا۔۔ ذرا سا۔۔ جیسے زیاد مسکراتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ ایک سی تھی۔ اس کی آنکھیں وہ گہرے بھورے رنگ کی تھی جیسے زیاد کی۔ اور بال بالکل سیاہ تھے۔ کشادہ پیشانی اور کھڑی ناک۔۔ سفید اور گندمی سی رنگت۔۔ سر پر ٹکی پی کیپ اور جیکٹ کی جیب میں اڑسے ہوئے ہاتھ۔۔ عمر کا فرق نہ ہوتا تو وہ مغالطے میں پڑ جاتی کہ یہی زیاد تھا۔ ہر انداز ویسا ہی تھا۔ مزید شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"یہ راز رہے گا۔" عالیان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"اچھی بیویاں اپنے شوہروں سے کوئی بات نہیں چھپاتیں!" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ عالیان نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔

"یہ اچھی بیوی اپنے شوہر کو اس رقم کے بارے میں جو ازاسے وصول کی ہے، اطلاع دینے والی ہے یا میں دوں؟" ٹھیک تاک کر سوال کیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔ کیا تھا یہ شخص جو ہر معاملے سے باخبر تھا۔

"اگر میں واقعی آپ کی بہو ہوں تو آپ یوں مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے!" وہ بگڑی تھی۔

"اس کے لیے تمہیں اچھی بیوی کے ساتھ ساتھ اچھی بہو ہونے کا ثبوت بھی دینا ہو گا!" وہ اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کرتا خود دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کیا آپ کا بیٹا کافی نہیں تھا جو آپ بھی مجھے ڈبل کراس کر رہے ہیں؟" اس نے منہ بسور کر پوچھا تھا۔

"باپ، باپ ہوتا ہے سعاد بچے۔" انداز شفقت لیے ہوئے تھا۔

"بچے؟ اب مجھے بچے کہیں گے؟" وہ تلملائی تھی۔ عالیان نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر ہلکا سا ہنس دیا۔ دروازہ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ کچھ یاد آنے پر اس نے شیشہ نیچے کیا اور گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"اس کا بہت خیال رکھنا سعاد! اس کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہنا۔ اسے محبت سے زیادہ وفا کی ضرورت ہے۔" اسے تاکید کی گئی۔ وہ سانس روکے اسے دیکھنے لگی۔ وہ گاڑی آگے بڑھا چکا تھا اور وہ وہیں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ جا چکا تھا اور دوبارہ ملنا مشکل تھا۔ جب تک وہ خود اس سے ملاقات کا خواہاں نہ ہو۔۔ جیسے آج ہوا تھا۔ وہ بوڑھا بھیڑیا۔۔۔ واقعی زیاد کا باپ تھا۔

☆☆☆

بے کراں سمندر کی سطح پر تیرتا جہاز مراکش سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اطلاع کے مطابق وہ بحری قزاق یہیں کہیں قریب میں تھے۔ جہاز کے عرشے پر ریلنگ پر ہاتھ ٹکا کر کھڑا اسنان سمندر میں عجیب سی اداسی محسوس کر رہا تھا۔ مراکش تک گھٹتا فاصلہ اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ خود اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھا۔ عجب سا احساس تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ سب کچھ جیسے دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہو۔ اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دحیہ اس کے برابر میں آ کھڑا ہوا۔ نگاہیں حد نگاہ تک پھیلے سمندر پر ٹکائیں۔

"اسے کتابیں پسند ہیں۔ وہ گھنٹوں کتابیں لے کر بیٹھا رہتا ہے۔ اس دوران نہ کسی کی سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ اسے تلخ سی کہانیاں پسند ہیں۔ اس کی پسندیدہ کتاب "فتوحاتِ شام" ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے اسے بے انتہا محبت ہے اور ایسی ہی کوئی محبت اسے سید سلیمان علی ندوی اور دوسرے مورخین سے ہے۔ اس نے کہا تھا وہ میرے انتظار میں بہت سی کتابیں پڑھے گا۔ وہ مجھے وہیں ساحل کنارے ملے گا۔ جانے کیوں اب خوف سا پیدا ہو رہا ہے کہ اگر وہ وہاں نہ ہوا تو؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ آنکھوں میں اداسی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں سوچ رہے ہو؟" دحیہ نے نرمی سے اسے دیکھا۔

"نہیں معلوم۔ بس مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ میں اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے سر جھکا کر نیچے دیکھا جہاں عالیان کو کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔ وہ اب حواس باختہ ہو کر زینے چڑھ رہا تھا۔

"دحیہ سنان، معاویہ نے پیغام بھیجا ہے۔" اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ دونوں نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا۔ "انہوں نے تمہارے گھر پر حملہ کیا ہے۔ سب کو مار دیا۔ خیام ایک ماہ سے لاپتہ ہے۔ کل انہوں نے دحیہ کے والد کے جہاز پر حملہ کیا ہے۔ سب مر گئے ہیں۔" ان دونوں کو لگا تھا جیسے پورا سمندر ان کے اوپر بہا دیا گیا ہو۔ بے یقینی سے آنکھیں پھیلائے انہوں نے عالیان کو دیکھا تھا۔

"جندل، وہ ان کے ساتھ تھا؟" اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں۔ لیکن وہ محفوظ ہے۔ اب کیا کہتے ہو؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔ سنان چند پل خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ اس کی بیوی اور نوزائیدہ بیٹا مارے جا چکے تھے اور خیام، وہ جانے کہاں تھا اور کس حال میں تھا؟

ایک آنسو اس کے گال پر لڑھک گیا۔ لبوں کو سختی سے بھینچتا وہ آگے بڑھ گیا۔ عالیان نے ترس بھری نگاہوں سے

اسے دیکھا پھر دحیہ کو جو اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سالوں بعد ہوئی وہ پندرہ منٹ کی ملاقات، اس کی اپنے والد سے آخری ملاقات تھی۔

☆☆☆

"بیلا باجی۔" بدر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پنجوں کے بل اچک کر ہاتھ ہلایا تھا۔ اس نے موبائل سے سر اٹھا کر خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا پھر موبائل کوٹ کی جیب میں اڑستی اس کے پاس آئی۔

"کیسے ہو بدر؟" نرمی سے پوچھا گیا۔

"بالکل ٹھیک۔ کافی پینے چلیں؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ازابیلا نے پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"گاڑی میں بیٹھو۔ میں باس کو انفارم کر آؤں۔" اس نے اپنی گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی۔

"اسے رکھیں۔ خیام سر کی گاڑی میں چلتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ پھر واپس پلٹ گئی۔ بدر وہیں کھڑا رہا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے گھوم کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ بینکاک کے سب سے بڑے نیوز چینل میں کام کرتی تھی اس کا اندازہ اسے یہاں کی عمارت اور اس ہنگامی صورتحال کو دیکھ کر ہی ہو رہا تھا۔ اپنے کام میں مگن دنیا و مافیہا سے بے خبر لوگ اسے ہمیشہ سے برے لگتے تھے۔ کچھ ہی لمحات میں ازابیلا واپس آتی دکھائی دی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس سے دو قدم آگے چلنے لگا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتی چند پل اسے دیکھتی رہی پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بدر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"کہاں جانا پسند کریں گی؟" وہ گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"کہیں بھی لے جاؤ۔" وہ اپنی گردن سے آئی ڈی کارڈ نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ رہی تھی۔ گود میں رکھا لیپ ٹاپ پچھلی سیٹ پر رکھ کر ہینڈ بیگ نیچے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ سیٹ سے ٹیک لگالی تھی۔ بدر نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ سیاہ رنگ کی جینز پر قرمزی کوٹ پہنے، گلے میں بھورے رنگ کا اسٹول ڈالے وہ بہت پر سکون سی لگ رہی تھی۔ کانوں میں بھورے رنگ کے چھوٹے سے آویزے موجود تھے۔ بالوں کو اونچی پونی میں باندھ رکھا تھا۔ وہ اپنی توجہ واپس سڑک کی طرف کرتا لب دانتوں میں دبا گیا۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔" اس نے چونک کر بدر کو دیکھا۔

"تم مجھے عجیب سی وائبز دے رہے ہو بدر!" اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"پریشان نہ ہوں، سب نارمل ہے۔ پہلے ہم شاپنگ پر چلیں گے پھر کافی پینے، اوکے؟" ازابیلا نے پلک جھپک کر اسے دیکھا پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس نے گاڑی شاپنگ مال کے باہر روکی تھی۔ وہ اگلے دو گھنٹے اسے ادھر سے ادھر گھماتا رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے کئی نئے سوٹ لیے تھے جو ازابیلا نے پسند کیے تھے۔ اسے نفیس سا پینڈینٹ گفٹ کرنے کے بعد وہ سب سے آخر میں اب جیولر کے پاس پریشان حال کھڑا تھا۔

"انہیں یہ پسند آئے گی؟" اس نے ایک انگوٹھی ہاتھ میں لیے پوچھا تھا۔

"تم سے نہیں ہو پائے گا بدر!" اس نے انگوٹھی بدر کے ہاتھ سے لے کر واپس اپنی جگہ پر رکھی پھر اسے ساتھ لیے آگے بڑھ گئی۔ ٹھیک بیس منٹ بعد وہ بہت جوش سے وہ سارے بیگز گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکان دوڑ رہی تھی۔ وہ اس معصومیت سے بھرپور مسکان کو دیکھ کر رہ گئی۔

"پوچھ سکتی ہوں تم اتنے خوش کیوں ہو آج؟ کوئی خاص وجہ؟" بدر گاڑی کی ڈگی بند کرتا پیچھے ہٹا پھر مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں نے پہلی بار ان کے لیے کچھ لیا ہے۔ میں واقعی آج بہت خوش ہوں۔" لہجے سے محبت جھلک رہی تھی۔

"کس کے لیے؟"

"ہیں کوئی۔۔" وہ ٹال گیا۔ ازابیلا نے سمجھ کر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

اگلے کچھ لمحات میں وہ کیفے میں موجود تھے۔ بدر کافی لینے چلا گیا تھا جبکہ وہ ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اپنا موبائل دیکھنے لگی تھی۔

"آپ بھی اس ٹیم کی ممبر ہیں؟" بدر نے اس کے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ نگاہ اس کے موبائل کی روشن اسکرین پر ٹکی جہاں کم من ہونے کوئی سوال پوچھا ہوا تھا۔ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے حیرت سے بدر کو دیکھا۔

"تم بھی؟" وہ اثبات میں سر ہلاتا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جوزف یاد ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔

"وہ تم ہو؟!" وہ مسکراتے ہوئے کندھے اچکا گیا۔

"میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا وہ تم ہو گے۔" وہ حیران تھی۔ بدر نے کافی کا گھونٹ بھر کر اسے دیکھا۔ پھر رازدارنہ انداز میں اس کے قریب ہوا۔ "خضر نعمانی کا بہت بڑا فین ہوں میں۔ کیا کمال کا بندہ ہے وہ، ایسے تاک کر جواب دیتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔

"مجھے اس سے ملنا ہے۔" ازابیلا نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔ بدر کے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔ "آپ کے پاس لیپ ٹاپ ہے بیلا باجی؟"

"ہاں گاڑی میں رکھا ہے۔" اس کے جواب پر وہ جلدی سے گاڑی کی چابی اٹھاتا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو

ہاتھ میں لیپ ٹاپ تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کیا پھر اپنا اور ازابیلا کا موبائل اس کے ساتھ کنیکٹ کیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ جوش سے چلا اٹھا تھا،

"میں نے ڈھونڈ لیا بیلا باجی"!!

☆☆☆

"کہاں ہو تم؟ ایک تو تم دونوں سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ مصعب گاڑی لے کر بھاگ گیا ہے اور محترمہ سعاد صبح سے آوارہ گردی میں مصروف ہیں۔ کوئی دین ایمان ہے تم لوگوں کا؟" وہ اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر دھم سے گرتے ہوئے اس پر بگڑا تھا۔

"آپ کے حکم کی تعمیل کر کے آ رہی ہوں۔ راستے میں ہوں، ڈانٹا مت کریں مجھے ورنہ زیاد کو بتا دوں گی۔" اسے دھمکی دی گئی تھی۔

"وہ اتنا عقلمند ہے کہ استاد اور شاگردہ کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔ اگر بے وقوف ثابت ہوا تو اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھے گا۔" اس نے تڑخ کر کہا تھا۔

"آپ میرے شوہر کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کر سکتے!" جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے ان کے نکاح کو اور ان میاں بیوی کے منہ سے میرا شوہر اور میری بیوی سن سن کر اس کے کانوں میں باقاعدہ زخم ہو گئے تھے۔ وہ اسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ازابیلا کو کھڑا پایا۔ اس کے عقب سے بدر نے اپنا سر نکالا۔

"بیلا باجی سگنل یہیں سے آ رہے ہیں۔" اس نے ازابیلا کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"اندر آ جاؤ۔" وہ سنجیدہ نگاہ دونوں پر ڈال کر اندر آ گیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے اندر آئے۔

"خضر نعمانی آپ ہیں؟" لاؤنج کی طرف اٹھتے اس کے قدم تھم گئے۔ اس نے مڑ کر کم فہمی سے اسے دیکھا۔ "وہ آپ ہیں ناں۔ خضر نعمانی جس کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔ جو جب بولتا ہے تو سب کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیتا ہے؟" وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مادام!" اس نے صاف انکار کیا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ بدر نے حیرت سے ہاتھوں میں موجود لیپ ٹاپ کو دیکھا جہاں سے سگنل یک لخت غائب ہو گئے۔

"بیلا باجی سگنل غائب ہو گئے ہیں۔" بدر کی سرگوشی پر اس نے بے اختیار آنکھیں میچی تھیں۔ اس کی اس حرکت پر خیام کو اپنی دھڑکنیں سست پڑتی محسوس ہوئی تھیں۔

"آپ ایک بار پھر بنا کسی ٹھوس ثبوت کے آئی ہیں، مادام!" اس کی آواز میں تلخی تھی۔ لہجے میں سختی تھی۔ لیکن آنکھیں، وہ اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ دل تھا کہ دھڑکنا بھول رہا تھا اور نگاہیں تھیں جن میں چاہ کر بھی وہ اس کے لیے سختی نہیں لا پا رہا تھا۔ وہ لب دانتوں میں دبا گئی۔

"آئی ایم سوری۔۔ ہمیں غلط فہمی۔۔"

"یار تم لوگ میرے ساتھ سوتیلوں والا سلوک کیوں کرتے ہو؟ کیا میں کوئی۔۔۔" اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی جب جندل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا جہاں وہ اپنی دھن میں منہ بسور کر کہتا زینے اتر رہا تھا۔ خیام کی نگاہ بھی اس پر پڑ چکی تھی۔ خیام کی گھوری کو دیکھ کر اس کی زبان کو فوراً بریک لگے تھے۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ متذبذب نگاہوں سے ازابیلا کو دیکھتے ہوئے اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بے اختیار اس کا پاؤں پھسلا اور اگلے ہی لمحے وہ زینوں سے نیچے آ رہا تھا۔ بدر کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ ازابیلا کے لب مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ خیام کا چہرہ ضبط کے مارے لال پڑنے لگا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔" وہ جلدی سے اپنے کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سر آخری زینے کی نکلی ہوئی نوک سے ٹکرایا تھا تبھی پیشانی پر خون کی ننھی بوندیں چمکنے لگی تھی۔ اسے شاید پاؤں پر بھی چوٹ آئی تھی مگر وہ سب نظر انداز کرتا خود کو سنبھال چکا تھا۔ "کیسی ہو۔۔ بیلا؟" وہ اپنی خفت مٹانے کی کوششوں میں تھا۔ خیام کی گھوری اور بدر کی کھی کھی کو یکسر نظر انداز کیا تھا۔

"ٹھیک۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" وہ بہت کوشش کرنے کے باوجود اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا سکی تھی۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"تم خیام کو جانتے ہو؟" اس کے سوال پر اس نے مدد طلب نگاہوں سے خیام کو دیکھا جو اسے نظروں ہی نظروں میں کچا چبانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"اوپر کچن میں سینک کا پائپ ٹوٹ گیا تھا۔ یہ وہی بنانے آیا تھا۔" جواب خیام نے دیا تھا۔ جندل نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔ "اب تم جاسکتے ہو۔" وہ اب جندل کی طرف متوجہ ہوا۔ جندل نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ "خدا حافظ۔" اس نے ہاتھ ہلا دیا۔ جندل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں بھی چلتی ہوں۔ یوں اچانک آجانے پر معذرت۔" وہ خفیف سا مسکراتے ہوئے معذرت خواہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پایا تھا۔ لوگوں کو لفظوں کی مار مارنے والا خیام حنفی اس لڑکی کے آگے چاروں شانے چت ہوا تھا۔ وہ پلٹ گئی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی طلسم ٹوٹا ہو۔

"جندل۔۔" وہ پلٹنے لگا تھا جب وہ اسے پکارتے ہوئے اس کے قریب آئی تھی۔ "دیکھ کر چلا کرو۔ اتنی معصوم حرکتیں کرو گے تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔" اس نے خاصی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ جندل نے سانس روکے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھتی آگے بڑھ گئی۔ جندل نے پلک جھپکی۔ وہ دروازہ پار کر گئی۔

"اس نے کیا کہا؟" وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں تھا۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس نے آگے بڑھ کر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرتے بدر کی گردن دبوچی تھی۔

"میری اجازت کے بنا تم اسے یہاں کیوں لائے؟ کیا وہ خبیث زیاد کافی نہیں تھا جو اب تم بھی اسے مجھ سے بدگمان کرنے پر تلے ہو؟ میری ناک کے نیچے کونسا کھیل کھیل رہے ہو تم، ہاں؟" سختی سے پوچھا گیا۔ اس کی گردن کے گرد گرفت سخت ہوئی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا سگنل آپ کے گھر سے ملیں گے۔ ہم تو خضر نعمانی کو ٹریس کر رہے تھے۔" اس نے گھبرا کر جلدی جلدی کہا تھا۔

"اب یقین ہو گیا کہ میں کوئی خضر نعمانی نہیں ہوں؟" گرفت سختی پکڑنے لگی۔

"مگر سگنل یہیں سے آ رہے تھے، واقعی میں۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ خیام نے جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی تھی۔ وہ گردن پر ہاتھ رکھتا کھانسنے لگا تھا۔

"یہ کھیل تمہارا تو نہیں؟" اس نے مشکوک نگاہوں سے جندل کو دیکھا۔ جندل کو فوراً سے اپنے پاؤں کا درد آیا۔

"آہ میرا پاؤں۔۔ یہ بہت درد کر رہا ہے شاید فریکچر آ گیا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے فرش پر بیٹھا تھا۔ خیام نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا پھر آگے بڑھ کر اس کے پاؤں کو ٹھوکر ماری تھی۔ وہ درد سے بلبلایا تھا۔ "اوئے گدھے۔۔ اللہ جی۔۔ بہت درد ہو رہا ہے۔"

"عورتوں کی طرح رونا پیٹنا مت ڈالا کرو!" غصے سے اسے گھورا گیا۔

"یہ واقعی تکلیف دہ ہے۔ آئے۔۔ میرا پاؤں۔"

"تم اٹھتے ہو یا۔۔" اس نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تھا کہ جندل چلا اٹھا تھا۔ "آپی آپی یہ

دیکھیں۔ یہ میرے ساتھ کیا کر رہا ہے۔" خیام نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے سعاد داخل ہو رہی تھی۔ جندل کے چلانے پر تیزی سے اس کی طرف آئی۔

"کیا ہوا ہے؟ یہ خون کیسے؟" اس نے پریشانی سے اس کے ماتھے سے خون صاف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ازابیلا کو۔۔۔ دیکھنے میں محو تھا کہ پاؤں پھسلا اور۔۔۔ زینوں سے گر گیا۔" خیام نے توڑ توڑ کر جواب دیا تھا۔ سعاد سب بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"میری بات سنو تم خبردار جو اس لڑکی کی باتوں کو سنجیدہ لیا۔ میں اسے کبھی اپنی بھابھی نہیں بناؤں گی۔" وہ اس پر بگڑی تھی۔

"میرا پاؤں۔۔ آئی ہائی۔۔" وہ ایک بار پھر کراہنے لگا تھا۔ اس بار دل میں درد ہوا تھا۔ درد سے کراہتے ہوئے وہ خفا خفا نگاہوں سے اپنے لیے پریشان ہوتی سعاد کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بہن اچھی تھی، بس اسے ازا اچھی نہیں لگتی تھی۔ خیام تیوری چڑھائے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے غصہ تھا۔ جندل کے سامنے آنے پر نہیں، ان دونوں کی ملاقات پر۔ کیا ضروری تھا وہ آج یہاں ملتے؟

کیا ضروری تھا۔۔۔ تکون کے تیسرے تنہا سرے پر وہی کھڑا ہو؟

☆☆☆

عمارت سے نکل کر وہ سڑک کی طرف آیا۔ ٹیکسی کا انتظار کرتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے ہاتھ میں وائرلیس تھا۔ اس نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر ایک طرف چل دیا۔ ہجوم سے ذرا ہٹ کر اس نے وائرلیس کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ یقیناً جو بھی اس کی طرف سے سگنل ملنے کا منتظر تھا اسے سگنل مل چکے تھے۔

''ہیلو۔'' بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے وائرلیس اپنے منہ کے قریب کیا۔

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے سوال کیا تھا۔

''ٹھیک شام سات بجے اسٹیشن پر آؤ۔ تم کو جو معلومات چاہتے ہو وہ مل جائیں گی۔'' اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور ساتھ ہی رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے وائرلیس کوٹ کی جیب میں ڈال کر اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔ جلدی سے کوئی نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگایا۔

''کیا کوئی اتنا لمبا عرصہ کسی کو سزا دینے کے لیے کسی معجزے کا انتظار کر سکتا ہے؟''

''یہ ٹریپ ہے۔ ذرا بچ کر!'' دوسری طرف سے اس کے سوال کا مفہوم سمجھ کر فوراً جواب دے دیا گیا۔

''کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔''

''تم جانتے ہو کیا کرنا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، جوابی وار مت کرنا!'' اسے تاکید کی گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے ایک نگاہ ارد گرد ڈالی پھر اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ اڑستا آگے بڑھ گیا۔ اسے اب اسٹیشن جانا تھا لیکن اس سے پہلے اسے اپنے تعاقب کاروں سے پیچھا چھڑوانا تھا۔ وہ یونہی سست رفتار سے چلتا سڑک کے ایک طرف سگنل کھلنے کے انتظار میں کھڑے لوگوں کے قریب آیا تھا۔ متلاشی نگاہوں سے اس نے آس پاس دیکھا اور پھر اسے اس کا مطلوبہ شخص مل گیا۔ بالکل اسی کی طرح کے حلیے میں موجود وہ لڑکا موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ قدم بڑھاتا اس ہجوم میں داخل ہوا۔ سر پر ٹکی پی کیپ کو ٹیڑھا کیا۔ جیکٹ کی جیب سے چشمہ نکال کر ناک پر ٹکایا۔ کانوں میں ایئر پوڈز ٹھونسے، جیکٹ اتار کر بازو پر ڈالی اور منہ میں چیونگم ڈال کر چہرے پر ماسک لگا لیا۔ اسے یہ سب کرنے میں صرف چند سیکنڈز لگے تھے۔ اس کے تعاقب کار متلاشی نگاہوں سے ارد گرد دیکھ رہے تھے جبکہ وہ مزے سے چیونگم چباتے ہوئے اس لڑکے کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔ سگنل کھل گیا۔ لوگ

آگے بڑھ گئے۔ اس نے بھی قدم بڑھا دیے۔ سڑک پار کر کے زیاد دائیں طرف مڑ گیا جبکہ وہ لڑکا بائیں طرف۔ اس نے مڑ کر اس لڑکے کو دیکھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق تعاقب کار اس کے پیچھے لگ چکے تھے۔

☆☆☆

انسانی جمِ غفیر کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے سر پر ٹکی پی کیپ مزید نیچے سر کائی تھی۔ چہرہ سیاہ ماسک میں چھپا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا وہ اپنے ہدف کے تعاقب میں تھا۔ اسٹیشن پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ شام کے سائے پر سُو پھیل چکے تھے۔ کچھ آبی اور سرمئی سا آسمان بادلوں سے صاف تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا موسم کو خوشگوار بنا رہی تھی۔

ببل چباتے ہوئے بے فکری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں اس کے ہدف نے اندر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ وہ اس کے پیچھے اندر چلا آیا تھا۔ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ بائیں ہاتھ میں وہ انجیکشن تھا جو اس کے ہدف کو ہمیشہ کی نیند سلانے والا تھا۔ اسے بس اس کے قریب ہونا تھا۔

وہ یونہی قدم بڑھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب کوئی اس سے ٹکرایا۔ ہدف نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ اس سے ٹکرانے والا اس سے معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے جلدی سے سامنے دیکھا، اس کا ہدف غائب ہو چکا تھا۔ اگلے کچھ لمحات میں وہ ادھر ادھر دوڑتا اسے تلاش کر رہا تھا مگر اس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ باہر آیا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے بگڑے تنفس کو بحال کرتے ہوئے اردگرد نگاہیں دوڑائیں۔ طرح طرح کے لوگ تھے، خود میں مگن اطراف سے بے پروا۔ وہ کوفت میں مبتلا ہوا تھا۔

اس کے بالکل سامنے اس سات منزلہ عمارت کی چھت پر کھڑا زیاد تعجب سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا، سات بج رہے تھے۔ اسے پیغام موصول ہوا تھا کہ اسٹیشن کے باہر اسی عمارت

کے سامنے اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اور وہاں۔۔ کوئی اور نہیں پر جندل کھڑا تھا۔ وہ اسے اس کی آنکھوں سے پہچان سکتا تھا۔ وہ وہاں کیوں تھا؟

اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا پھر اس کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا۔ نگاہیں اسی پر ٹکی تھیں جو کال اٹھا کر موبائل کان سے لگا رہا تھا۔

"ہاں کہو؟"

"کہاں ہو تم؟"

"لائبریری جا رہا ہوں۔ کوئی کام ہے؟" وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اس وقت غلط وقت پر غلط جگہ پر موجود تھا، اس کے جھوٹ نے اسے شک میں مبتلا کیا تھا۔ اس نے جواب دیے بنا کال کاٹ دی۔ چہرہ ایکدم سپاٹ ہو گیا تھا۔

جندل نے کم فہمی سے موبائل کی تاریک اسکرین کو دیکھا پھر کندھے اچکاتے ہوئے موبائل جیب میں ڈال دیا۔

ایک شخص بھاری سوٹ کیس لیے اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے سرسری نگاہ اس کی پشت پر ڈالی پھر سڑک کے دائیں طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ چونکا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں نگاہیں واپس سامنے دوڑائیں جہاں سڑک پر کسی کے جوتوں کے نشان تھے۔ جوتوں پر یقیناً کیچڑ لگی تھی۔ اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ جب وہ ہدف کے تعاقب میں تھا تب وہ ایسی گلی سے بھی گزرے تھے جب اس کا پاؤں کیچڑ میں پڑا تھا۔ وہ اپنا حلیہ بدل چکا تھا۔ اس کے برابر سے گزرنے والا شخص اس کا ہدف ہی تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے قدم اس کے تعاقب میں بڑھائے تھے۔

سامنے عمارت کی چھت پر اب کوئی نہیں تھا۔ زیاد دل میں بہت سے شبہات لیے واپس جا چکا تھا۔

☆☆☆

تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ بالآخر اس کے قریب آیا تھا اور تیزی سے اسے گردن سے دبوچتے ہوئے ایک مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ جندل نے اس کا گریبان پکڑ کر پے در پے کئی مکے اس کے گال پر رسید کرنے کے بعد اس کے سینے پر لات ماری تھی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ سر چکرانے لگا تھا۔ منہ سے خون بہنے لگا۔ ہونٹوں کے کناروں پر زخم آئے۔ گال کی جلد پھٹ گئی۔ اس اچانک حملے نے اسے کچھ بھی دیکھنے سننے سے محروم کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے چکراتے سر کو سنبھال کر آنکھیں پوری کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ایک اور مکا اس کے چہرے پر پڑا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتا سڑک پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

جندل نے گہری سانس لیتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے۔ اسی اثناء میں کوئی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"یہاں سے آگے میرا کام ہے۔" سیاہ لباس میں ملبوس، سفید رومال سے چہرہ ڈھکے سر پر سیاہ پی کیپ ٹکائے وہ لڑکا مسکرا کر کہتا ہاتھ ہلا گیا۔ جندل نے بے زاری سے اسے دیکھا۔

"یہ میرا شکار ہے۔ اگر تمہیں اس سے کوئی کام تھا تو اس کا شکار خود کرتے!" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"دراصل مجھے مار کٹائی نہیں پسند۔ تمہارا شکریہ۔ اب تم جا سکتے ہو۔ کوئی معلومات ملی تو تمہیں آگاہ کر دوں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔ جندل نے دانت پیستے ہوئے اسے گھوری سے نوازا پھر پلٹ گیا۔ وہ لڑکا پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ جب وہ گلی کا موڑ مڑ گیا تو اس نے جھک کر اس کی بائیں ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹ کر اپنی گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ یہ دونوں دوست، جندل اور خیام کسی کو اس قابل ہی کہاں چھوڑتے تھے کہ وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر اس کی گاڑی میں بیٹھ سکے!!

ٹھیک بیس منٹ بعد وہ لڑکا مائک کے برابر میں کرسی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ مائک کے زخم اب تقریباً مندمل ہو چکے تھے مگر جسم میں درد کی ٹیسیں اب بھی اٹھتی تھیں۔ مائک نے ترس کھاتی نظروں سے اس نئے شکار کو دیکھا

پھر کرسی پر سر رکھ کر آنکھیں موند گیا۔ اس نے پانی کی بالٹی اٹھائی اور اس شخص پر الٹ دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھول کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی تو اسی لمحے زوردار لات چہرے پر پڑی۔ وہ تکلیف سے کراہا تھا۔

"اب ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ کمی لگ رہی تھی۔" جھک کر کہتا وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔

"شروع کرتے ہیں۔ اس سائیکوپیتھ کے ذریعے ہمیں ٹریپ کرنے کی کوشش کیوں کی؟" وہ سیدھا مدعے پر آیا۔ اسے یقین تھا وہ طوطے کی طرح بولنا شروع ہو جائے گا۔ مارنے والا خاصا تجربے کار تھا آفٹر آل۔

"میرے پاس ثبوت ہے۔ دلال کے خلاف ثبوت۔" وہ اس کی امید پر پورا اترا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ مائک نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"دلال کون ہے؟" اس نے مائک سے سوال کیا تھا۔

"بحری قزاق جو سالوں پہلے یہاں کے ساحل پر اترا تھا۔ وہ ہمارے بیچ ہی ہے مگر کوئی بھی نہیں جانتا وہ کون ہے؟" مائک کی بات پر اس نے سمجھ کر سر ہلایا پھر واپس اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور تم کیونکر اس شخص کے خلاف جا کر وہ ویڈیو ہمیں دینا چاہتے ہو، جان عزیز نہیں ہے؟" سوال خاصا چبھتا ہوا تھا۔ اس شخص نے بولنے سے پہلے منہ میں جمع ہوتی تھوک اور خون کو فرش پر تھوکا تھا۔

"میں نے اس وقت کے لیے بہت انتظار کیا ہے۔ اگر میں وہ ویڈیو تمہیں دینے کی دھمکی دلال کو دیتا تو یقیناً وہ مجھے دولت سے مالامال کر کے میرا منہ بند کروانے کی کوشش کرتا۔" اس کا اندازہ ایک بار پھر ٹھیک نکلا۔ سب کی طرح یہ بھی دولت کے پیچھے تھا۔

"خیر اگر وہ دو گولیاں تمہارے سینے میں ٹھوک دیتا تو جہنم میں تمہاری ہر خواہش پوری ہوتی۔ وہ ویڈیو کہاں ہے؟"

اس نے آہستہ آہستہ پاؤں کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا تھا۔ جاگرز کا رخ اس شخص کے چہرے کی طرف تھا۔

"میں نے اسے چھپایا ہوا ہے۔" اس نے چکراتے سر کو کرسی پر ٹکایا تھا۔

"تم بار بار ا کمپنی کے پرسنل ہیکر ہو۔ اسکائی ٹو تک رسائی تو ہو گی ہی؟"

"میں صرف کمپنی کا سسٹم سنبھالتا ہوں۔ اسکائی ٹو ہماری پہنچ سے بہت دور ہے۔ وہاں صرف مارک کے بھروسے مند آدمی ہی پہنچ سکتے ہیں۔" اس کے جواب سے وہ مایوس ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا پھر گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ ویڈیو جہاں چھپائی ہے اس جگہ کا ایڈریس دو۔ اور اگر کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش کی تو یاد رہے مجھے مار کٹائی نہیں پسند لیکن اگر مجھے غصہ آ گیا تو جان لینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا"!

☆☆☆

پہلے اس کی انگلیوں نے ذراسی حرکت کی تھی۔ پھر اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی تھی۔ اور کچھ لمحات میں اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ خالی خالی نگاہوں سے اس نے سفید چھت کو دیکھا تھا۔ اس کے لیے یکسر انجان۔ وہ چند پل چھت کو تکتا رہا پھر خالی ذہن کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ سر کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ اس کے منہ سے سسکی نکلی۔ اس نے نگاہیں دوڑا کر اس جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں دیوار کے ساتھ لگے بیڈ پر وہ بیٹھا تھا۔ سامنے ہی ایک میز اور صوفہ رکھا تھا۔ میز پر کھانے پینے کی کچھ اشیاء رکھی تھیں۔ ایک طرف چھوٹا سا پانی کا کولر رکھا تھا۔ دیوار پر کیلنڈر نسب تھا۔ وہ اپنی آنکھیں رگڑ تا بیڈ سے اترا۔ ٹھنڈے یخ فرش پر قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ موسم سرد تھا۔ صوفے کے پاس آ کر وہ چند پل کھڑا رہا پھر صوفے پر چڑھ گیا۔ اچک کر کیلنڈر کو دیکھا۔ تاریخ تھی، دس سمبر!

سمندر کنارے کتاب پڑھتے ہوئے اس نے جو تاریخ لکھی تھی وہ تھی دس نومبر۔ وہ پورے ایک ماہ بعد ہوش میں آیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئے تھے۔ اس کے گھر میں لگی آگ، اس کی ماں کی لاش اور مصعب کا مسخ شدہ چہرہ۔۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹا اور نتیجتاً صوفے سے گر گیا۔ اس کا سر میز کے کونے پر لگا۔ درد کے احساس سے اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے ارد گرد دیکھا تھا۔

اسے یہاں کون لایا تھا اور کیوں؟ کیا اب وہ بھی اسی طرح بے دردی سے مارا جائے گا؟!

یہ سوال ذہن میں آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ متلاشی نگاہوں سے اس نے ارد گرد دیکھا۔ دائیں طرف آہنی دروازہ تھا۔ اس نے تیزی سے آگے آکر دروازہ کھولا اور بنا کچھ سوچے باہر نکل گیا۔ باہر کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا تھا۔ وہ کسی کالونی میں تھا۔ ویران سی لمبی سڑکیں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ بہت سے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ خوف اس پر حاوی ہوتا رہا۔ اس کے قدموں کی رفتار بڑھنے لگی اور اگلے لمحات میں وہ پوری رفتار سے سڑکوں پر دوڑ رہا تھا۔
اپنی زندگی کی خاطر ایک مردہ وجود مراکش کی سڑکوں پر دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

☆☆☆

کوئی اس کے سرہانے کھڑا بہت دھیمی سی آواز میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ آواز اس کے لیے یکسر اجنبی تھی۔ اس نے بہت آرام سے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ کسی کو خود پر جھکا پایا تھا۔ سیاہ نم بال اس کے چہرے پر پڑے تھے۔ بالوں سے اٹھتی ہلکی سی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ پیشانی پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تھا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔

"بخار اب اتر گیا ہے۔ بھائی، یہ جاگ گئے ہیں۔" وہ خوشی سے کہتی پیچھے ہٹی تھی۔ اس کے ہٹتے ہی کمرے کا منظر اسکے سامنے تھا۔ معمولی سا کمرہ جس کے چھوٹے سے بیڈ پر وہ لیٹا تھا۔ سامنے ہی کھڑکی تھی اور اس کے برابر میں دروازہ۔ ایک طرف میز رکھی تھی اور اس کے ساتھ ہی کرسی۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا وہ کہاں ہے؟

"تمہارے اٹھنے کا بہت انتظار کیا ہے میری بہن نے۔" کسی کی نرم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ گیارہ سالہ لڑکا تھا۔ لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ اس کے برابر میں اس کا بازو پکڑ کر وہی لڑکی کھڑی تھی جو کچھ دیر پہلے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تقریباً اس کی ہم عمر تھی یا شاید کچھ چھوٹی۔ چہرے پر بلا کی معصومیت لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ دائیں گال پر چوٹ کا نشان تھا، چوٹ حال ہی میں لگی تھی شاید، زخم گہرا معلوم ہوتا تھا۔ وہ چند پل کے لیے سب بھول گیا تھا۔ "تمہیں شاید اندازہ نہ ہوا ہو، مگر تم دو ہفتوں بعد ہوش میں آئے ہو۔ بابا تمہیں بہت نازک حالت میں لائے تھے۔ تمہیں بھی اور۔۔ میری ازا کو بھی۔" اس نے اپنی بہن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا تھا۔ اسے وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار لگا تھا۔

"دو ہفتے بعد۔۔" اس نے زیرِ لب دہرایا تھا۔ ذہن کی اسکرین پر یک لخت وہ تمام مناظر ابھرے تھے۔ وہ کٹی پھٹی لاشیں اور سمندر میں لگی آگ۔ اسے اپنے آغا جان کا خیال آیا تھا۔

"سب مر چکے ہیں۔" اس لڑکے نے اس کی نگاہوں میں ابھرتا سوال پڑھ لیا تھا۔ وہ گنگ رہ گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں۔ وہ اپنے آغا جان کو کھو چکا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس کے کمانڈر، اس کے ساتھی، اب وہ سمندر کے قلب میں تیرتے جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر کس کے ساتھ ستارے گنا کرے گا۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

"آپ روئیں نہیں۔ بہادر لوگ روتے نہیں ہیں۔" اس نے نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا تھا جو اس کے دیکھنے پر

مسکرادی تھی۔

"میرا نام زیاد تاشفین ہے اور یہ میری بہن، ازاتا شفین!" اس نے تعارف کروایا تھا۔

"میں۔۔ جندل یوسف زئی۔" وہ ہلکا سا مسکرادیا۔ نم انکھوں سے۔ دل پر بھاری بوجھ لیے۔

"میرے بابا کسی کام سے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ امی تمہارے لیے کھانا بنا رہی ہیں۔ انہیں میں نے تمہارے جاگنے کی خبر دے دی ہے۔ تمہارے زخم تقریباً بھر چکے ہیں سوائے بازو پر لگے زخم کے۔ مجھے ڈر ہے جلد علاج نہ ہونے کی وجہ سے اس کا نشان رہ جائے گا۔" وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ کر تمام احوال بتا رہا تھا۔ ازا متذبذب سی نگاہوں سے اسے دیکھتی بیڈ پر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ زیاد اس کی حرکت پر مسکرادیا۔

"آپ امیر البحر ہیں؟ بابا کہہ کر گئے ہیں کہ امیر البحر کا بہت سارا خیال رکھا جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کی معصومیت سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز اسے بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"ہاں میں امیر البحر ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"میں آپ کا بہت سارا خیال رکھوں گی، امیر البحر!" اس نے احترام سے سر کو خم دیا تھا۔ زیاد اس کی حرکت پر ہنس دیا تھا۔

"تم میری بہن کو پسند آ گئے ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ جندل نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ زندگی سے بھرپور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کی نگاہیں اس کے عقب میں کھڑکی کی طرف اٹھیں۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے کوئی وہاں آ کر بیٹھا ہو۔ وہ کئی پل وہیں دیکھتا رہا۔ اسی اثناء میں باہر سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ کوئی دھیرے دھیرے سسک رہا تھا۔ وہ دونوں بھی اب کھڑکی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"ازا، باہر دیکھو کون ہے؟ میں جندل کے لیے کھانا لاتا ہوں۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ آگے بڑھ کر

اس کی چھوٹی سی شال اٹھا کر اس کے کندھوں پر ڈالی پھر اس کے بالوں میں ہاتھ چلا کر اس کے بال بکھیر کر وہ آگے بڑھ گیا۔

"بھائی!!" اس نے تلملا کر آواز لگائی تھی۔ زیاد کمرے سے نکل چکا تھا۔ وہ منہ بسور کر دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ باہر قدم رکھتے ہی اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ وہ کوئی لڑکا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر گھٹنوں میں سر دیے وہ سسک رہا تھا۔ اس ٹھنڈ میں بھی اس کے جسم پر بس ہلکے سے کپڑے تھے۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے برابر میں کھڑی ہوئی۔

"آپ رو رہے ہیں؟" اس کی آواز پر اس نے سہم کر سر اٹھایا تھا۔ خوفزدہ سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ "ڈریں مت۔ بھائی کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اندر لے آؤں۔ یہاں بہت ٹھنڈ ہے، آپ جم جائیں گے۔" وہ مزید خود میں سمٹ گیا تھا۔ نگاہیں ہنوز اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ رات کی تاریکی میں اس مدھم سی روشنی میں اس کے گال پر موجود چوٹ کا نشان چمکا تھا۔ اس کی خاموشی کو ازا نے انکار سمجھا تھا۔ تبھی اپنے گرد لپیٹی شال اتار کر آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس کے پاس سے گزرا تھا۔ بالوں میں برائے نام اٹکا گلابی رنگ کا کلپ بالوں سے پھسل کر قدموں میں گرا۔ وہ اس بات سے انجان شال اس کے گرد لپیٹ کر پیچھے ہٹی۔

"اب آپ نہیں جمیں گے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہ انوکھی سی چمک اور لبوں پر مسکان۔ وہ جو بھی تھی اس کی ہر ادا زندگی سے بھرپور تھی۔ جیسے کبھی وہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے شدت سے چاہا تھا کہ کاش وہ سب نہ ہوا ہوتا۔ وہ بھی پھر اسی طرح ہنستا مسکراتا رہتا۔

"اگر آپ اندر نہیں آنا چاہتے تو نہ آئیں۔ لیکن اگر آنا چاہیں تو یہ دروازہ کھلا ہے۔ اندر مہمان موجود ہے اور وہ دو ہفتوں بعد جا گئے ہیں۔ میں ان کے پاس جا رہی ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھیں اور جم مت جایئے گا۔ اسے صبح سے

اوڑھ لیں۔" وہ شال کی طرف اشارہ کر کے ہدایات جاری کر رہی تھی۔ وہ ہنوز خاموش رہا۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی پھر واپس پلٹ گئی۔ وہ اسے جاتا دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ دروازہ پار کر گئی۔ اس نے سر دیوار سے ٹکا دیا۔ اسی وقت اس کی نگاہ قدموں میں گرے کلپ پر پڑی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کلپ اٹھایا۔ چھوٹا سا گلابی رنگ کا پیارا سا کلپ۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر وہ کلپ مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ اس کلپ کو لینے ضرور واپس آئے گی۔

☆☆☆

اسے اپنی رگوں میں دوڑتا خون جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈ بڑھ رہی تھی، رات مزید تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خود میں سمٹتا ٹھنڈ سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹھنڈ ہڈیوں کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک کی شدت سے وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے پاؤں تھک چکے تھے۔ ٹانگوں میں شدید درد تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سر دیوار سے لگایا تھا۔ منہ سے سسکی نکلی تھی۔ آنکھوں سے گرم آنسو نکل کر گالوں پر بہہ گئے تھے۔ وہ رونا چاہتا تھا۔۔ بہت سارا رونا۔۔ اسے کسی کندھے کی ضرورت تھی مگر یہاں جیسے اس کے سب اپنے اس سے روٹھ چکے تھے۔ بے بسی ہی بے بسی تھی۔

"ازا چار سال کی تھی جب اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔" اس کی سماعت سے کسی کی آواز ٹکرائی۔ اس نے ذرا سا اچک کر کھڑکی کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ بیڈ پر ایک لڑکا لیٹا تھا۔ اس کے برابر میں وہی لڑکی بیٹھی تھی جس کا نام شاید ازا تھا۔ کرسی پر بیٹھا لڑکا محبت بھری نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا۔ کتنا مکمل منظر تھا وہ۔ اس کی آنکھوں سے اپنی بہن کے لیے جھلکتی محبت۔ ہاں کبھی ایسی ہی محبت سے وہ اپنے مصعب کو دیکھا کرتا تھا۔ اسے نا چاہتے ہوئے بھی ان سے حسد محسوس ہوئی تھی۔ "ان دو سالوں میں مَیں کبھی اتنی شدید تکلیف سے دوچار نہیں ہوا جو مجھے اس لمحے

محسوس ہوئی تھی جب میرے قریب آنے پر یہ سہم کر بابا کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ ازاہم سب کو بھول چکی تھی۔ تم دو ہفتوں بعد اٹھے ہو۔ ان دو ہفتوں میں میری بہن کا اپنے گھر واپسی کا سفر بہت کٹھن رہا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ازا نے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا۔

"کیا آپ کی کوئی بہن ہے امیر البحر؟" اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا گیا تھا۔ زیاد کی نگاہوں کا رخ بھی اس کی طرف ہوا تھا۔

"ہاں میری ایک بڑی بہن ہیں۔ بہت غصہ کرتی ہیں۔ مجھے ڈانٹتی بھی ہیں اور رعب بھی جماتی ہیں۔" اس نے منہ بسور کر ناک سکیڑی تھی۔ زیاد اس کے انداز پر ہنس دیا تھا۔

"میرے بھائی مجھے نہیں ڈانٹتے۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ مجھ سے انہیں سب سے زیادہ محبت ہے۔" وہ چہکی تھی۔ جندل اس کے چہرے پر خوشی دیکھ کر خفیف سا مسکرایا تھا۔ زیاد نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں پر اپنے لب رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو زارو قطار بہنے لگے تھے۔ وہ مزید انہیں نہیں دیکھ پایا تھا۔ بند مٹھی میں موجود کلپ پر گرفت سخت ہوئی تھی۔ وہ اپنے گرد شال کو لپیٹتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تھکے تھکے سے انداز میں اس نے قدم بڑھائے تھے۔ وہ محبت بھری سرگوشیاں، کسی کی چہکتی آواز، وہ ان سب سے دور جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے رات کی تاریکی میں وہ سب گم ہو رہا تھا۔ آوازیں تھم گئی تھیں۔ سر جھکا کر چلتے ہوئے اس کی نگاہ خود سے کچھ فاصلے پر ان سیاہ بوٹوں پر ٹکی۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ نگاہ ان بوٹوں سے اٹھتی اس شخص کے چہرے پر ٹکی۔ سفید دودھار نگت، چمکتی پیشانی اور ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں۔ وہ متذبذب سا اسے دیکھنے لگا۔

"تمہیں بھوک لگی ہے لڑکے؟" مسکراتے ہوئے پوچھا گیا۔ وہ چند پل خاموش رہا لیکن پھر سر اثبات میں ہلا گیا۔ اس وقت۔۔ وہ فراموش کر چکا تھا کہ یہ وہی شخص تھا جس نے اس کی ماں کی گردن پر خنجر پھیرا تھا۔ یہ وہی جوتے

تھے جو اس کے بھائی کے خون میں ڈوبے تھے۔ اگر وہ اُن دردناک لمحات میں اس درندے کی شکل دیکھ لیتا تو شاید اس کا چہرہ نوچ ڈالتا۔

”ہم ایک چھوٹا سا کھیل کھیلیں گے۔ اگر تم جیت گئے تو میرے پاس موجود سارا کھانا تمہارا۔ کیا کہتے ہو؟“ اس نے بنا سوچے فوراً سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس شخص کی آنکھیں چمکی تھیں۔ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے دو لائٹر نکالے۔ دونوں کو جلایا۔ ایک لائٹر اس کے قریب کیا۔ آگ کے شعلے کی روشنی سے اس کے چہرے کا رنگ زرد معلوم ہونے لگا۔

”جس کی لگائی گئی آگ زیادہ دور تک گئی، وہ سکندر!“ اس نے قبول کر لیا۔ لائٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس شخص نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر لائٹر اچھال دیا۔ لائٹر سڑک پر گرا اور بجھ گیا۔ اس نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ وہ چند پل لب بھینچے کھڑا رہا۔ پھر جانے اس کے دماغ میں کیا آیا تھا کہ وہ پلٹا تھا اور اگلے ہی لمحے لائٹر پوری قوت سے اس طرف اچھال دیا جہاں وہ گھر تھا۔ لائٹر دور جا گرا۔ سڑک پر گرے پیٹرول نے اپنا کام دکھایا اور آن کی آن میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اس نے خوفزدہ سی نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا جس کے لب بے ساختہ مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ آنکھوں سے اچانک وحشت سی ٹپکنے لگی تھی۔ وہ اگلے ہی لمحے تیزی سے وہاں سے بھاگا تھا۔ شعلے بلند ہو رہے تھے۔ صرف کچھ لمحات میں ہی تین گھر آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ کئی انسانی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ رات کی تاریکی آگ کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔ مقدس خاموشی انسانی چیخوں کے نیچے دب گئی تھی۔

اس کی نگاہ سامنے اٹھی تھی۔ آگ کی لپیٹ میں اب وہ گھر آ رہا تھا جہاں وہ تین افراد موجود تھے۔ اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔ قدم بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ اس نے چلانا چاہا مگر آواز دب کر رہ گئی۔ اس نے سر نفی میں ہلایا اور کئی آنسو گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔ اسے اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا۔ اسے

اپنے پیچھے قہقہے لگاتے اس درندے اور خود میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحات پہلے اسے جن معصوموں سے حسد کا احساس ہوا تھا وہ اب انہیں آگ میں جھونک چکا تھا۔ وہ خوش نہیں تھا تو اس نے انہیں بھی خوش رہنے نہیں دیا تھا۔ یہ کیسا کھیل تھا جس میں وہ کئی انسانی جانوں کا قاتل بن چکا تھا۔ بند مٹھی میں موجود گلابی رنگ کے کلپ پر اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔

وہ پہلی رات تھی، جب اس نے بیک وقت کئی جانیں لی تھیں۔ جب اس نے آگ کا کھیل کھیلا تھا۔

جب وہ۔۔ خیام حنفی۔۔ اپنے ہاتھ خون میں رنگ چکا تھا۔۔ گرم سرخ انسانی خون سے!!

☆☆☆

تاریک راہداری میں چلتے ہوئے وہ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اپنی منزل کے قریب ہو رہا تھا۔ اس کی رفتار تیز تھی۔ وہ کسی کی نظروں میں آئے بنا جلد از جلد اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ بایاں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کمرے کے باہر آیا۔ ٹھہر کر اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔ وہاں کسی زخم کا نشان موجود نہیں تھا وجہ وہ ماس تھا جو اس کی ہتھیلی پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ ماس جو ایک ایسے شخص کی ہتھیلی کے ماس سے مشابہت رکھتا تھا جسے اس کمرے کا سیکیورٹی سسٹم جانتا تھا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اسکرین پر رکھ دیا۔ شناخت ہو گئی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آ گیا۔

یہ درمیانے سائز کا کمرہ تھا جس میں سامنے دیوار پر بہت سی اسکرینیں نسب تھیں۔ اسکرینوں کے سامنے میز رکھی

تھی اور میز پر کئی ایل سی ڈیز رکھی تھیں۔ وہ جلدی سے میز کے پاس آیا۔ کرسی کھینچ کر کرسی پر بیٹھا پھر کی بورڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ اگلے کچھ لمحات میں اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ وہ جلد از جلد تمام خفیہ معلومات تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پاسورڈ توڑنے کے بعد اس نے جلدی سے اپنے کوٹ کی جیب سے یو ایس بی نکال کر ایل سی ڈی سے کنیکٹ کی۔ تمام ڈیٹا اس چھوٹی سی یو ایس بی میں منتقل ہونے لگا۔ وہ لب دانتوں سے کچلتا اسکرین پر نگاہیں جمائے انتظار کرنے لگا۔

اسی اثناء میں اسے باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے تیزی سے متلاشی نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ چند لمحات کے لیے چھپ سکے۔ اگلے ہی لمحے میں دروازہ کھل گیا۔ ایک شخص اندر آیا۔ بھرپور جمائی لیتے ہوئے وہ میز کے پاس آیا۔ اسکرینوں پر ایک نگاہ ڈال کر تسلی کی پھر میز پر رکھا چابیوں کا گچھا اٹھایا۔ چابیوں کو ہوا میں اچھال کر مہارت سے پکڑتے ہوئے وہ بے فکری سے سیٹی بجاتا باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ چند پل خاموشی چھائی رہی اور اگلے ہی لمحے وہ جست لگا کر چھت سے نیچے آ گیا۔ یو ایس بی دوبارہ کنیکٹ کی۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ڈیٹا ٹرانسفر ہو گیا۔ اس نے یو ایس بی نکال کر جیب میں ڈالی پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ اپنے آفس میں بیٹھا اس ڈیٹا کو کھنگال رہا تھا۔ اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ٹکی تھیں۔ وہاں کوئی ویڈیو چل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ لب کھلے رہ گئے تھے۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ چہرہ لال پڑنے لگا تھا۔ وہ مزید وہ سب نہیں دیکھ پایا اور فوراً سے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ گہری سانس لے کر اس نے سر کرسی پر ٹکا دیا۔ ضبط کے مارے آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

☆☆☆

”مجھے سن رہے ہو؟“ سیڑھیوں پر بیٹھ کر موبائل کان سے لگائے وہ ہاتھ سے دیوار پر لکیریں کھینچ رہا تھا جب اس بات پر ٹھہر گیا۔

”ہاں تم وہی ہو جو دوسروں کے شکار پر نظر رکھتا ہے۔“ وہ ابھی تک تپا بیٹھا تھا۔

”چونچ مت لڑاؤ زیادہ۔ ایڈریس بھیج رہا ہوں وہاں سے کوئی ویڈیو اٹھانی ہے۔“ اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے موبائل کان سے ہٹایا۔ روشن اسکرین پر اس کا پیغام جگمگا رہا تھا۔ وہ ایڈریس بھیج چکا تھا۔ جندل نے گہری سانس لی پھر سیڑھیوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے کچھ لمحات میں وہ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ دروازہ کھولنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی پستول نکال کر لوڈ کی پھر احتیاط سے آگے بڑھا۔ چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ ایک طرف دو کمرے تھے اور ساتھ ہی کچن۔ درمیان میں میز رکھی تھی اور میز کے گرد کرسیاں۔ اس نے طائرانہ نگاہ لاؤنج پر ڈالی پھر کچھ غیر معمولی محسوس نہ ہونے پر کمرے کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کی نگاہ سامنے پڑی اور آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ دیوار کے ساتھ لگی ریلنگ پر ایک لاش بہت بری حالت میں لٹکی ہوئی تھی۔ وہ کوئی پینتیس سال کا مرد تھا جس کے سینے پر جابجا ضربیں لگی تھیں۔ چہرے کا نقشہ بگڑا ہوا تھا۔ شاید کئی دانت بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ انگلیوں سے ناخن ادھیڑے گئے تھے۔ اس کے جسم سے نچڑتا خون قطرہ قطرہ سفید فرش پر بہہ رہا تھا۔ کمرے میں خون کی عجیب سی مہک سمائی ہوئی تھی۔

وہ لاش کا جائزہ لے کر میز کی طرف بڑھا۔ وہاں رکھا موبائل اٹھایا۔ موبائل آن کرتے ہی وہاں ایک ویڈیو سامنے آگئی۔ اس نے ویڈیو چلائی تو ویڈیو میں وہی شخص تھا جو اس وقت یہاں لٹکا تھا۔ اسی شخص کو ریلنگ سے لٹکایا جا رہا تھا۔ پھر بھاری زنجیر سے اس کے سینے پر جابجا ضربیں لگائی گئی تھیں۔ کچھ ایسے وار بھی کیے گئے تھے جس سے اس کے

دانت ٹوٹ چکے تھے۔ قاتل سامنے نہیں آیا تھا۔ البتہ وہ جو بھی تھا اس کی مطلوبہ ویڈیو چرا چکا تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ نگاہ سامنے اٹھائی۔ شیشے پر خون سے کچھ لکھا تھا۔ اس نے اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ کوئی اور زبان تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکال کر اس کی تصویر لی پھر وہ ویڈیو اپنے موبائل میں ٹرانسفر کی۔ وہ جیسے ہی یہ کام کر کے فارغ ہوا تو باہر پولیس کے سائرن کی آوز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے موبائل جیکٹ کی جیب میں ڈالا پھر اپنی پستول سنبھالتے ہوئے کمرے کی کھڑکی کی طرف آیا۔ پولیس کی کئی گاڑیاں نیچے رکیں اور آن کی آن میں کئی پولیس آفیسر اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔ سڑک خالی ہوتے ہی اس نے بنا وقت ضائع کیے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ دروازہ کھلا اور پولیس اندر آ گئی۔ اپارٹمنٹ سے باہر وہ سڑک پر کھڑا اپنا سر جھٹک کر اب ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔

☆☆☆

”خیام۔۔زیاد کا نام کیا ہے؟“ اس کے سوال پر صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھے خیام نے دائیں ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ میز سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر سنجیدگی تھی۔

”اتنے اعلیٰ قسم کے سوال کہاں سے لاتی ہو؟“ وہ بھی سنجیدہ تھا۔

”میں پورے نام کا پوچھ رہی ہوں۔“ اس نے وضاحت دی تھی۔

”شوہر تمہارا ہے، نام مجھ سے پوچھ رہی ہو؟“ وہ طنز کیے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔

”آپ بنا طنز کیے مجھے جواب دیں گے استاد جی؟“ وہ جھنجھلائی تھی۔

”زیاد تاشفین بن معاویہ تاشفین“!

”اس کے بابا کا پورا نام کیا ہے؟“ وہ چونکی تھی۔

"معاویہ تاشفین بن اعظم۔ البتہ تنظیم میں وہ معاویہ بن اعظم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ تاشفین کا استعمال وہ نہیں کرتے تھے، زیاد کرتا ہے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"بائے اپنی چانس، کیا اس کے والد زندہ ہیں؟" اس کے سوال پر وہ چونکا تھا۔ آنکھیں سکیڑے اسے دیکھا جس نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔

"تم کیا جانتی ہو سعاد؟"

"وہ زندہ ہیں۔ زیاد کے والد۔ بوڑھا بھیڑیا جس نے اپنا نام عالیان بن اعظم بتایا تھا۔ وہ زندہ ہے۔" خیام نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "میں ان سے ملی ہوں۔ وہ ازا کا تعاقب نہیں کر رہے وہ اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا یہ راز رہے گا۔ آخر ایک باپ اپنے بیٹے سے کیوں یہ بات چھپا رہا ہے کہ وہ زندہ ہے؟"!

"عالیان، عالیان یہ نام سنا سنا لگ رہا ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

"عالیان میرے ماموں کا نام ہے خیام! ماموں بھی جندل اللہ میں تھے اور زیاد کے والد بھی۔ اب تک میں یہی سمجھتی آئی تھی کہ بابا اور ماموں کی طرح جندل اللہ کے تمام کمانڈرز شہید کیے گئے تھے۔ مگر ان میں سے کچھ زندہ ہیں اور چھپ رہے ہیں۔ لیکن کیوں؟" اس کے پاس کئی سوال تھے جن کے جواب مشکل تھے۔ خیام نے پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کچھ یاد آنے پر چونکا۔ اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔

"کیا یہ عالیان ہے؟" سعاد نے آگے ہو کر تصویر کو دیکھا پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ازا اس وقت کہاں ہو گی؟"

"بدر نے بتایا تھا وہ آج رات کسی آرٹ گیلری جائے گی۔"

"ہمیں عالیان وہیں ملے گا سعاد! یقیناً وہ بہت کچھ جانتا ہے۔" اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل

گیا۔ سعاد چند پل وہیں کھڑی رہی پھر آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ذہن بہت الجھا ہوا تھا مگر اس وقت اسے اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کرنا تھی۔

☆☆☆

یہ بینکاک کی سب سے بڑی آرٹ گیلری تھی۔ لمبا اور بڑا سا ہال جہاں دیواروں پر مختلف تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار موجود تھا۔ طرح طرح کے لوگ تھے اور سب کی توجہ کا مرکز ماہر مصوروں کی تخلیق کی گئی وہ بے جان تصویریں تھیں جو اتنی خوبصورتی سے کینوس پر اتاری گئی تھیں کہ حقیقت کا سا گماں ہوتا تھا۔ وہ یہاں ابراہم کے ساتھ آئی تھی۔ ابراہم اپنے کسی دوست کے ساتھ کھڑے تھے جبکہ وہ ان سے فاصلے پر بغور اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

حد نگاہ تک پھیلا پانی تھا جس کی لہریں بپھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے جن سے تڑاتڑ برستا پانی سمندر میں شامل ہو رہا تھا۔ بہت سی لہریں اٹھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ سمندر کے عین قلب میں ایک بحری جہاز سمندر میں آئے طوفان سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بحری جہاز جس پر سفید رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جہاز سے کچھ فاصلے پر روشنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں کوئی لائٹ ہاؤس تھا، یقیناً یہ روشنی وہیں سے آ رہی تھی۔ روشنی کا روپ یہ جو کسی بڑے اور روشن تارے کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔

اچانک سے اس کے سر میں درد کی ٹیس اٹھی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر کئی مناظر لہرائے تھے۔ طوفانی رات میں سمندر کی سطح پر تنکے کی طرح تیرتا بحری جہاز، شراب کی بو، نشے میں دھت سپاہیوں کے قہقہے۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج سے سہم کر ایک کونے میں دبکی وہ بچی اور اسے دلچسپی سے تکتا وہ نوجوان کپتان۔ اس نے جھرجھری لی تھی۔ صرف کچھ سیکنڈز میں اس نے یہ کیا دیکھا تھا؟ اس نے بے اختیار اپنا سر تھاما تھا۔ آنکھیں میچتے ہوئے اس

نے آگے بڑھ کر تصویر کے کونے پر لکھے نام کو دیکھا۔

"عالیان ابنِ اعظم!" وہ اس نام کو دیکھ کر چونکی تھی۔ اسی نام کے ساتھ اسی طرح کی ایک تصویر خیام نے وارلڈ کو تحفے میں دی تھی۔ نام اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔ طبیعت ایک دم بوجھل سی ہوگئی تھی۔ چہرہ مضمحل سا تھا۔ اسی اثناء میں کوئی اس کے برابر میں آکر کھڑا ہوا تھا۔

"پراسرار اور رگوں میں دوڑتے خون کو جما دینے والا منظر ہے ناں؟" آواز بہت دھیمی سی تھی۔ اس نے چہرہ ترچھا کر کے اس شخص کو دیکھا۔ وہ مکمل سیاہ لباس میں موجود تھا، ہاتھ جیکٹ کی جیب اڑسے تھے۔ سر پر سیاہ پی کیپ ٹکی تھی اور ہم رنگ ہی ماسک سے چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔

"یہ بس۔۔ خوفناک ہے۔" اس نے تبصرہ پیش کیا تھا۔

"پانی کی دنیا خوفناک نہیں ہے ازا۔۔" وہ چونک گئی۔ وہ شخص اس کا نام بھی جانتا تھا اور بہت بے تکلفی سے اسے ازا بھی کہہ رہا تھا۔ "یہ انسان ہے جو خوفناک ہے، انسان کے کام ہیں جو خوف میں مبتلا کرتے ہیں۔" وہ جواباً خاموش رہی۔ چند پل دونوں کے درمیان خاموشی نے ڈیرہ ڈالے رکھا۔ "یہ روشنی کا چھوٹا سا ستارہ لائٹ ہاؤس میں جگمگا رہا ہے۔ تم بھی ایک لائٹ ہاؤس کی طرح ہو ازا۔ جب تک تاریکی ہے، کئی مسافر سمندر کی بے رحم موجود کی نذر ہو جائیں گے۔ جب یہ ستارہ چمکے گا تو رہبر کہلائے گا۔۔۔!" ایک نرم سی نگاہ اس پر ڈال کر وہ پلٹ گیا۔ وہ سانس روکے اسے جاتا دیکھنے لگی۔ وہ پہلے ہی بہت الجھی ہوئی تھی، وہ شخص مزید گرہیں باندھ کر چلا گیا تھا۔

اس نے آرٹ گیلری سے باہر قدم رکھا تو کسی احساس کے تحت اگلا قدم وہیں روک لیا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا خیام سیدھا ہوا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا عین اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ "وہ آپ کا بیٹا ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے اسے یتیم کر دیا، کیوں؟" اس کا پہلا سوال اپنے دوست کے متعلق تھا۔

”کندن بننے کے لیے جلنا پڑتا ہے!“ لہجہ سپاٹ تھا۔

”مگر وہ آپ کا خون ہے!! ہم سب یتیم تھے، کم از کم اسے ہی باپ کا سایہ میسر کر دیتے۔ آپ نے اپنے ہی بیٹے کو جدائی کی آگ میں جھونک دیا۔ اپنی ہی بیٹی کو لاوارث رہنے دیا۔ آپ کے بیٹے کو یقین ہے اس کا باپ مر چکا ہے۔ اور بیٹی، وہ آپ کی وجہ سے غیروں کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ اندھیرے میں زندگی گزار رہی ہے اگر اسی تاریکی میں اس نے جان دے دی تو خدا کو کیا جواب دیں گے؟“ وہ پھٹ پڑا تھا۔ آواز کانپ گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ عالیان نے سانس روک لیا تھا۔ ”آپ بالکل ایک اچھے باپ نہیں ہیں، بالکل بھی نہیں۔ آپ پر کیا گزری میں نہیں جانتا مگر میں ان راتوں کو فراموش نہیں کر سکتا جب میرا بھائیوں جیسا دوست اپنے باپ کی یاد میں گھنٹوں گھٹنوں میں سر دیے روتا تھا۔ اس کی سسکیاں، اس کی پکاریں میں کبھی بھول نہیں پایا۔ وہ آج تک اس احساسِ جرم میں مبتلا ہے کہ وہ آپ سے کیا گیا وعدہ نہیں نبھا پایا۔ وہ اپنی بہن کی حفاظت نہیں کر پایا۔ اس سے ہر بات راز رکھ کر آپ نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ باپ بیٹوں کے لیے رہبر ہوتے ہیں، آپ نے اسے راستے میں تنہا کر دیا۔“ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکال کر ماسک میں جذب ہو گیا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچی تھیں۔ وہ جواباً بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہ یہ درست وقت تھا نہ درست جگہ۔ اس نے بہت آرام سے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ خیام وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ انسانی جمِ غفیر میں وہ کہیں گم ہو گیا۔

ایک باپ۔۔ اپنے دل پر بہت سا بوجھ لیے روپوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

رات دس بجے جب وہ آرٹ گیلری سے واپس آیا تو اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔ پیغام پڑھتے ہی اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے اور اگلے ہی لمحے وہ زینے چڑھ رہا تھا۔ اسٹک کی ٹک ٹک کو

نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف سعاد نے بھرپور جمائی لی تھی۔ مسلسل پچھلے دو دنوں سے بنا آرام کیے وہ اس کام میں لگی تھی تبھی اب نیند سے برا حال تھا۔ ایسا ہی کوئی حال اس کے برابر میں دوسری میز پر بیٹھے بدر کا تھا۔ اس کی استانی کی نظر میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی تبھی وہ سب کچھ پرفیکٹ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اپنے کام میں مگن وہ دونوں دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سن پائے۔

"ازا سے جو چیک موصول کیا ہے، وہ کہاں ہے؟" دوٹوک انداز میں پوچھا گیا۔ اس کی نیند بھک سے اڑی۔ ان دونوں نے چور نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مڑ کر دروازے کے پاس کھڑے خیام کو۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے استاد جی۔" اس نے معاملہ سنبھالنا چاہا۔ اس نے عالیان کا راز فاش کیا تھا، وہ بہت آرام سے حساب برابر کر چکا تھا۔ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

"چیک۔۔۔ کہاں ہے۔۔ سعاد؟!" اس نے توڑ توڑ کر پوچھا تھا۔ سعاد نے خفا نگاہوں سے اسے دیکھا پھر میز کی دراز کی طرف اشارہ کر دیا۔ خیام نے آگے بڑھ کر دراز کھولی اور چیک اٹھا لیا۔

"استاد جی، ہمیں آئی فون لینے ہیں۔ وعدہ آئی فون کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور ویسے بھی اس کے پاس اتنی دولت ہے، مجھے بلینک چیک دیتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔" اس نے تاویلیں پیش کی تھیں۔ خیام نے چیک کو اپنے دونوں ہاتھوں کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان لیا تھا۔

"بھول جاؤ اسے"!

"خیام پلیز۔۔ نہیں۔۔" اس نے اس کی التجاؤں کا اثر لیے بنا چیک پھاڑ دیا۔ سعاد کے منہ سے چیخ نکلی تھی مگر اس کی چیخ اس چیخ کے مقابلے میں بہت کم تھی جو بدر کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔ دونوں نے صدمے کی حالت میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے چیک کے ٹکڑوں کو دیکھا جو خیام نے ہوا میں اچھال دیے۔

"اپنے کام پر دھیان دو تم دونوں!" ایک سخت نگاہ دونوں پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔ سعاد نے صدمے سے منہ کھولے اسے جاتا دیکھا۔ بدر نے کسی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب جندل کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علی۔۔" اس کا سلام بیچ میں ہی رہ گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سعاد کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو جمع ہونے لگے تھے۔ اگلے ہی لمحے میں وہ رو رہی تھی۔ وہ ایکدم بوکھلایا تھا۔

"اپی کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے؟" وہ پریشانی سے کہتا اس کے سامنے گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھا تھا۔

"انہوں نے میرا چیک پھاڑ دیا۔ وہ میرا حق تھا جندل۔۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بدر حیرت سے بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں چمکتے موٹے موٹے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی۔۔ یہ لڑکی واقعی خیام کی شاگردہ تھی۔

"کس نے؟"

"استاد جی نے۔ مجھے آئی فون چاہیے تھا جندل!" وہ مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جندل اس کی بات کچھ کچھ سمجھ چکا تھا۔

"ایسے روئیں تو نہیں۔ آپ جانتی ہیں میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔" وہ اس کا سر سہلا رہا تھا۔ وہ اور زور و شور سے رونے لگی تھی۔ کیا ہوا اگر خیام نے چیک پھاڑ دیا تھا؟ اگر جندل کے ذریعے اس پر دباؤ ڈالا جاتا تو یقیناً ایسا ہی چیک خیام کی جیب سے برآمد ہو جاتا۔ وہ اب سسکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی۔ جندل متذبذب سا اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ان سے فاصلے پر بدر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی

پگھلنے لگی تھی۔ یہ دونوں بہن بھائی اس وقت اسے بہت کچھ یاد دلا رہے تھے۔ کچھ بہت اپنوں کی یاد۔ اپنوں کی محبت کی، جس سے وہ ہمیشہ محروم رہا تھا۔

☆☆☆

"ایک ہی مذہب کے پیروکار جو اپنے مذہب کی تعلیمات پر دل سے ایمان لاتے ہیں، وہ فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ فرقہ واریت میں بٹے یہ لوگ کیسے یہ دعوہ کرسکتے ہیں کہ ان کا مذہب سچا ہے؟ اسلام کی ہی مثال لے لیں۔ ہر شخص نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی ہوئی ہے اور دوسروں کی مسجد میں جانے کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اس کے سوا دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والا ہر شخص کافر ہے، اسلام دشمن ہے۔ ایسا مذہب کیونکر سچا ہو سکتا ہے جو اپنے ہی پیروکاروں کے درمیان اتحاد قائم نہیں کرپایا؟!" اس کا سوال کافی چبھتا ہوا تھا جس میں صرف اسلام کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

وہ اپنے بالوں کو اونچی پونی میں باندھتے ہوئے منتظر نگاہوں سے لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین کو دیکھنے لگی۔ اسے کسی کے جواب کا انتظار تھا۔ وہی جو لاجواب کر دیتا تھا۔ غیر ارادی طور پر اسے اب بدر عرف جوزف کے جواب کا بھی انتظار تھا۔ وہ لڑکا، جو اپنی پہلی ملاقات میں ہی اسے بہت معصوم اور سادہ سا لگا تھا۔ تاریک اور منافق دنیا میں صاف دل والا لڑکا، اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا وہ اتنی گہری باتیں کرسکتا ہے۔ اس کی کہانی تھوڑی تلخ تھی، اسے کے تجربات تلخ تھے مگر یہ تلخی کبھی اس کے مزاج پر اثرانداز نہیں ہوئی تھی۔ اور یہی چیز اسے سب سے منفرد بناتی تھی۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کئی مناظر لہرائے تھے جن میں وہ منظر بھی تھا جب جندل بدر کا کان پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی تھی۔ صرف بدر ہی نہیں، وہ لڑکا بھی تو معصوم سا تھا جو سیڑھیوں سے گر جایا کرتا تھا۔ جو کتاب کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا تھا اور جو سفید کوٹ پہن کر

ناک پر چشمہ ٹکا کر پوچھا کرتا تھا، "اچھا لگ رہا ہوں ناں؟"

اس کی زندگی میں اسے ایسے لوگ ملنے لگے تھے جو بہت تھوڑے سے وقت میں اسے اچھے لگنے لگے تھے۔ جن کی معصومیت سے اسے محبت ہونے لگی تھی، جن کی اچھائی اسے برائی کے ان گڑھوں میں رہبر ستارے کی مانند محسوس ہو رہی تھی، رہبر ستارے کی مانند!

"فرقہ واریت یعنی ایک ہی مذہب کے لوگوں کے بیچ چند مسائل میں تنازعات کی بنا پر علیحدہ گروہ بنالینا۔ جیسے سیاست میں ایک پارٹی کے لوگ آپس میں کسی مسئلے پر جھگڑ پڑتے ہیں اور وہ ایک پارٹی ٹوٹ کر دو پارٹیوں کو جنم دیتی ہے۔ بنیادی پلان، سوچ اور تمام منصوبے ایک ہی ہوتے ہیں بس چند بہت چھوٹے سے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں جو نااتفاقی کا سبب بنتے ہیں۔ اسی طرح مذہب میں ہوتا ہے۔ اسلام کی مثال لیں۔ عام لوگوں کی سوچ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے جو میلاد کرتا ہے وہ بریلوی اور سنی، جو نہیں کرتا وہ دیوبندی۔ جو داڑھی نہیں کاٹتا وہ اہل سنّت۔ ہاں بنیادی طور پر باقاعدہ ان کے عقائد میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر وہ عقائد ایسے ہیں کہ ان سے ان کا ایمان خطرے میں نہیں پڑتا۔ قادیانیوں نے جب ختم نبوت کا انکار کیا تو انہیں اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ ان کے خلاف مہم پر فرقوں میں بٹے مسلمان آپس کی دشمنیاں بھول کر متحد ہو گئے اور پاکستان میں باقاعدہ ان کے خلاف قانون پاس کروایا۔

الغرض یہ کہ اختلاف ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ہر انسان کی سوچ مختلف ہے، ہر چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مذہب یونیورسل ہے۔ یعنی جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ اس میں بدلاؤ کی گنجائش نہیں۔ جنہوں نے مذہب میں تحریف کی کوشش کی وہ ذلیل و خوار ہوئے ہیں۔ بنیادی عقائد کو آپ نہیں چھیڑ سکتے۔ لیکن اگر لوگ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اختلاف ظاہر کر کے اپنی الگ مسجد بنالیتے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے وہ منکر ہو گئے ہیں۔ ہمارے

معاشرے میں اس بات پر فساد کھڑا ہو جائے گا کہ ارکانِ اسلام میں پہلے روزہ ہے یا حج۔ ان کی ادائیگی سے متعلق کسی کو کوئی پروا نہیں لیکن اگر کسی نے روزہ بعد میں حج پہلے فرض قرار دیا تو عقیدہ خراب ہو گیا۔ وہابی ہے، بریلوی ہے، دیوبندی ہے، کے نعرے لگنا شروع ہو جائیں گے۔

یہ ہیں بہت چھوٹے سے مسائل اور بالکل انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کی وجہ سے آپس میں فسادات کھڑے کرنا بھی کوئی حل نہیں۔ میں دیوبندی ہوں مجھے تب تک کسی سنی سے کوئی مسئلہ نہیں جب تک وہ اسلام کے بنیادی عقائد میں تحریف نہ کرے۔ اگر وہ کرتا ہے تو قادیانیوں کی مثال میں پہلے ہی پیش کر چکا ہوں۔ فرقہ واریت بلاشبہ امتِ مسلمہ میں نااتفاقی کے بیج بو رہی ہے، مگر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسلام پر مر مٹنے والے ہی لوگ اسلام کی ناموس کی خاطر اپنے اپنے فرقوں سے قطع نظر ہو کر ایک ہی محاذ پر متحد ہوئے ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا قطعی مناسب نہیں کہ جو دین اپنے ہی پیروکاروں کو ایک جھنڈے تلے جمع نہ کر سکا وہ کیونکر سچا ہو سکتا ہے؟!

مزید یہ کہ بات صرف اسلام کی نہیں ہے۔ فرقے ہر مذہب میں ہیں۔ عیسائیت میں دیکھیں۔ کیا مشرقی کلیسا اور مغربی کلیسا کے تنازعات نے مختلف فرقوں کو جنم نہیں دیا تھا؟ ہندوؤں کو دیکھیں، انہوں نے تو باقاعدہ انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ نچلے طبقے والے لوگ شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ مقدس کتابوں کو پڑھنا دور کی بات سن تک نہیں سکتے۔ یہودیت کو دیکھیں تو یہ مذہب ستر فرقوں میں بٹا تھا۔ تو تنقید کا نشانہ صرف اسلام کیوں؟ ہر مذہب میں فرقے ہیں تو کیا اب مذہب سے انکار کریں گے؟ خدا کے احکام صاف اور واضح ہیں۔ یہ انسان ہے جو ان میں تحریف کرتا ہے اور ان پر سوال اٹھاتا ہے۔ حالانکہ وہ یہ حق نہیں رکھتا۔۔۔“!

وہ کئی پل بنا پلک جھپکے اسکرین کو دیکھتی رہی۔ اسے ایکدم گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ وہ کس کے انتظار میں تھی؟ ہر سوال کا جواب سامنے تھا تو وہ کیوں کترا رہی تھی؟ وہ کیوں ابھی تک پستی کی طرف جا رہی

تھی۔۔ مسلسل۔۔وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھی تھی جب ایک نرم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"تم بھی ایک لائٹ ہاؤس کی طرح ہو ازا۔ جب تک تاریکی ہے، کئی مسافر سمندر کی بے رحم موجود کی نذر ہو جائیں گے۔ جب یہ ستارہ چمکے گا تو رہبر کہلائے گا۔۔۔"!

اس نے سانس لینا چاہا، وہ سانس نہیں لے پائی۔

☆☆☆

زیاد کمرے میں داخل ہوا تو پہلی نگاہ ہی اس پر جا ٹکی۔ اس نے مبہم سا مسکراتے ہوئے دروازہ بند کیا پھر اس کے قریب آیا۔ وہ میز پر سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ شاید کام کرتے کرتے آنکھ لگ گئی تھی۔ تمام اسکرینیں روشن تھیں۔ یقیناً یہی ہوا تھا۔ اردگرد چاکلیٹ اور چیونگم کے ریپر پڑے تھے۔ سر کے نیچے معصومیت سے دایاں بازو پھیلایا ہوا تھا۔ بال پھسل کر چہرے پر آن گرے تھے۔ اس نے بہت آرام سے اس کے چہرے سے بال ہٹائے تھے۔ ناک پر ٹکا چشمہ واضع ہوا۔ اس نے بہت احتیاط سے چشمے کو اتار کو ایک طرف رکھ دیا۔ محبت بھری نگاہ اس پر ڈالی پھر کبڈ کی طرف بڑھا۔ کبڈ کھول کر متلاشی نگاہوں سے اندر جھانکا تو سامنے ہی اس کی مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس نے شال اٹھا کر کبڈ بند کیا۔ اسی پل وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ یہ شال وہی تھی جو اس نے اسے غرناطہ میں دی تھی۔ ایک طرف اس سے محبت نہ کرنے کا دعوہ تھا دوسری طرف اس کی دی گئی چیزوں کی اتنی اہمیت تھی۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ آگے بڑھ کر شال کھول کر اس پر پھیلا دی۔

چند پل وہ وہیں کھڑا پھر صوفے کی طرف آیا۔ میز سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور جوتے اتار کر صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ لیپ ٹاپ آن کیا، پھر کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر ایک طرف رکھی۔ سر پر ٹکی پی کیپ اتار کر اپنے برابر میں رکھی پھر بالوں میں ہاتھ چلا کر انہیں ماتھے پر بکھیرا تھا۔ وہ جندل کی وجہ سے پریشان تھا۔ وہ وہاں کیا کر رہا تھا اور

تب ہی کیوں جب وہ اس شخص سے ملنے جا رہا تھا جو اسے دلال کے متعلق معلومات دینے والا تھا۔ طرح طرح کے خیالات تھے جو اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اسے اس پر یقین تھا، اعتماد تھا مگر پھر جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا وہ کیا تھا اور جندل نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟

اس نے انگشت شہادت اور انگوٹھے سے اپنی ناک کی ہڈی کو مسلا تھا۔ سر کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ وہ آنکھیں میچ کر کھولتا لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ گوگل کھولا اور پھر لب دانتوں میں دبائے کچھ سرچ کرنے لگا۔ اندھیرے میں لیپ ٹاپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ پی ٹی ایس ڈی کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور جیسے جیسے وہ پڑھ رہا تھا ویسے ہی دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ دل پر جیسے بھاری بوجھ آن گرا تھا۔ اسے ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی احساس نے اسے چونکایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سعاد کی طرف دیکھا۔ سر دھیرے دھیرے نفی میں ہلاتے ہوئے وہ نیند میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا پھر اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ کمرے کی لائٹ جلائی اور اس پر جھکا۔

”سعاد۔۔ سعاد اٹھو۔“ وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ اب صحیح معنوں میں پریشان ہوا تھا۔ ”سعاد۔۔ آنکھیں کھولو یار۔“ اس کی آواز تیز ہوئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ تنفس بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”وہ۔۔ میں۔۔“ اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے بے ربط سے الفاظ نکلے تھے۔

”کچھ نہیں ہوا۔ خواب میں ڈر گئی ہو تم۔“ وہ ٹشو باکس سے ٹشو نکالتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ پیٹ میں متلی سی ہونے لگی تھی۔ زیاد نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گلاس تھامتی اسے قے آئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی تیزی سے واشروم کی طرف بھاگی تھی۔ وہ گلاس ہاتھ

میں لیے پریشان سا وہیں کھڑا رہا۔

بیسن کے پاس کھڑے ہو کر اس نے نل کھول دیا۔ پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر مارے۔ ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ نقاہت کا عجیب سا احساس تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی خود کو گہرے پانی میں جاتے دیکھا تھا۔ پانی جو نیلے رنگ سے دھیرے دھیرے سیاہ رنگ میں بدلنے لگا تھا۔ اس نے اپنے جسم میں پانی داخل محسوس کیا تھا۔ اسے اپنی موت یقینی نظر آئی تھی۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیاں جو ہمیشہ اسے خوف میں مبتلا کرتی تھیں۔

اس نے نل سے دھار کی صورت میں بہتے پانی کو دیکھا اور پھر تیزی سے نل بند کر دیا۔ گہری سانس لے کر خود کو آئینے میں ایک نظر دیکھا پھر چہرہ خشک کر کے باہر آگئی۔ نڈھال سی نگاہوں سے سامنے کھڑے زیاد کو دیکھا۔ چہرہ ایک دم مضمحل سا لگنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہو؟“ پریشانی سے پوچھا گیا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ سر صوفے کے بازو پر ٹکا دیا۔ وہ آرام سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ”میں ہمیشہ پانی دیکھتی ہوں۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیاں جن کے زور کے آگے خود کو بہت بے بس محسوس کرتی ہوں۔ مجھے سمندر کبھی پسند نہیں آئے۔ سمندر ظالم ہوتے ہیں۔ خوبصورت اور ظالم جو ہر چیز کو خود میں بھینچ لیتے ہیں، بکھرتے ہوؤں کو سمیٹ لیتے ہیں۔ آغا جان کو سمندر سے بہت محبت تھی۔ یہ محبت زہریلی تھی، انہیں ختم کر گئی۔ مجھے سمندروں سے ڈر لگتا ہے زیاد۔۔“ اس کی آواز میں خوف تھا۔ آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکتا اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم اپنے ہر خوف سے لڑ لو گی۔“ وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ کئی پل یونہی خاموشی سے گزر گئے پھر اس نے آرام سے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ زیاد نے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے حصار میں لیا تھا۔

"تم کب آئے؟"

"بس تھوڑی دیر پہلے، جب تم سو رہی تھیں۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔

"کام ہو گیا؟"

"تقریباً۔ ہم انہیں جلد ڈھونڈ لیں گے۔" اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ سعاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے ہوتیں اس کی گردن پر ٹکیں جہاں سنی پلاست لگی تھی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"گردن پر کیا ہوا ہے؟"

"معمولی چوٹ ہے۔" اس نے ٹالنا چاہا تھا۔

"دیکھنے دو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر سنی پلاست اتاری تھی۔ زخم پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ زخم گہرا اور تازہ تھا، ابھی بھی خون لگا ہوا تھا۔ کسی نے پوری قوت سے اپنے دانت گاڑھے تھے، تبھی گہرے نشان بنے ہوئے تھے۔

"یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟" وہ پریشان ہوئی تھی۔

"ایک سائیکو پیتھ سے ملا تھا، اس نے تحفہ دیا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ سعاد نے خفا خفا سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تمہیں اس کا منہ توڑ دینا چاہیے تھا۔" ہلکے سے غصے سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زیاد نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"کہاں؟"

"فرسٹ ایڈ باکس لینے۔ خون صاف کروں۔" اس کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ اپنی عجلت پر وہ شرمندہ

ہوا۔ وہ مسکراہٹ دباتی میز کی طرف بڑھ گئی۔ وہ لب کچلتا اسے دیکھنے لگا۔ وہ باکس لے کر اس کے برابر میں بیٹھی۔ وہ اچھے بچوں کی طرح آلتی پالتی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تمہیں پتہ ہے میں تمہارے پیچھے روئی ہوں۔" اس کی گردن پر لگا خون صاف کرتے ہوئے اسے بہت اہم معمولات فراہم کی گئی تھیں۔

"کیوں بھلا؟"

"کیا یہ میرا حق نہیں کہ میں اپنے کلائنٹس سے اپنی محنت کی رقم وصول کروں؟" وہ مصروف سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔ بشرطیکہ تم نے کام ٹھیک کیا ہو۔" اس نے سوچ کر جواب دیا۔

"میں نے کام ٹھیک کیا تھا بس رپورٹ میں تھوڑی سی تبدیلی کی تھی۔ اور خیام نے میرا چیک پھاڑ دیا۔ مجھے اور بدر کو آئی فون لینا تھا۔" وہ خون صاف کر چکی تو سنی پلاست اٹھانے لگی۔

"کیسی تبدیلی؟"

"یہی کہ خاتون اندلس میں رہتی ہیں اور ان کا ایک بڑا بھائی ہے جو ڈاکٹر ہے۔ ٹیکنیکلی یہ جھوٹ نہیں ہے۔ چھوٹے بھائی بھی بہنوں کے لیے بڑے ہی ہوتے ہیں اور جندل کا کیا ہے وہ جاسوس ہے اور زندگی میں جانے کتنی بار ڈاکٹر کے روپ میں سب کو دھوکا دیا ہو گا۔" اس نے باکس بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اب مکمل اس کی طرف متوجہ تھی۔

"اور؟" مختصر سا سوال تھا۔

"اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ اندلس میں رہتی ہیں۔ بات غلط ہے مگر یہ خواہش ہے نا میری۔" معصومیت

سے اسے دیکھا گیا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اور؟"

"اور بس یہی کہ میں نے تصویر کسی اور خاتون کی لگائی تھی۔ اور بس یہی تو لکھا تھا کہ خاتون کے دو بچے ہیں۔" اس کے اٹھے کندھے ڈھیلے پڑے تھے۔ خفگی سے ناک سکیڑی گئی تھی۔ زیاد کی آنکھوں میں شرارت چمکی تھی۔

"بس دو؟" وہ جیسے مایوس ہوا تھا۔ وہ اس کے سوال پر سر اثبات میں ہلا گئی۔

"ہاں دو۔ کم ہیں کیا؟" اس بار اس کا سر اثبات میں ہلا تھا۔

"ذاتی تجربہ بتاؤں تو ایک بھائی کے ساتھ بھائی اور بہن کے ساتھ بہن لازماً ہونی چاہیے۔ مجھے بہنیں بہت اچھی لگتی ہیں، اور بھائی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں جو اب واقعی گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"یہ بھی ہے۔ اگر میرا بڑا بھائی ہوتا تو اس کی سائیڈ لے کر جندل کو سیدھا کر کے رکھتی۔ اور بہن، ہاں کبھی کبھی اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مگر اچھا ہے، میری کوئی بہن ہوتی تو شاید میری اتنی زیادہ اہمیت نہ ہوتی۔" وہ کھل کر مسکرائی۔

"تمہیں کیوں لگتا ہے کوئی تمہاری جگہ لے سکتا ہے؟" اس کے چہرے پر آتے بالوں کو اس کے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے پوچھا گیا۔

"شاید جو لوگ ہمیشہ سے اکیلے رہے ہوں پھر اچانک سے ان کے پاس بہت سی محبت آ جائے تو یہ خوف فطری ہے۔" وہ کندھے اچکا گئی۔

"تبھی تو کہہ رہا ہوں، چار بہن بھائی ہونگے تو اکیلے پن سے بچے رہیں گے۔" وہ شرارت سے کہتا لب دانتوں میں

دبا گیا۔

"لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ میں روئی ہوں۔ کیونکہ خیام نے میرا چیک پھاڑ دیا ہے جو میں نے ازا سے لیا تھا۔" وہ واپس اپنے موضوع کی طرف آئی تھی۔

"اگر تمہارا کوئی بڑا بھائی ہوتا تو خیام کی یہ جرات نہ ہوتی۔" اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ سعاد نے ابرو تان کر اسے دیکھا۔

"زیاد، تمہیں میں کتنی معصوم لگتی ہوں؟" اچانک سوال ہوا تھا۔

"تم بس۔۔ معصوم ہو۔" اس نے سوچنے کے لیے بہت تھوڑا سا وقت لیا۔

"میں نہیں ہوں۔ تمہاری باتیں بالکل میری سمجھ میں آ رہی ہیں، اور میں انہیں نظر انداز کر رہی ہوں کیونکہ فی الحال تمہیں توجہ دینی ہو گی اس بات پر کہ میں روئی ہوں!!" اس نے ہی ایک سانس میں تیزی سے کہا تھا۔ وہ چند پل ٹھہر کر اسے دیکھتا رہا پھر بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"میں کیسے فراموش کر گیا کہ میرے مقابل سعاد یوسف زئی ہیں۔" وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں میرے حق کے لیے لڑنا ہو گا!!" وہ منمنائی تھی۔

"مثلاً کس لیے؟"

"یہی کہ وہ چیک جو پھاڑا ہے وہ مجھے صحیح سلامت دوبارہ دلوایا جائے۔ مجھے آئی فون لینا تھا اور بہت سارے گاؤن، حجاب اور ہینڈ بیگز بھی۔ جاگرز، سینڈلز اور ہاں اسنیکس، چاکلیٹس اور ایسی کئی چیزیں۔" اس نے لمبی لسٹ پیش کی تھی۔

"لیکن یہ تمہارا اور تمہارے استاد کا معاملہ ہے۔ میں کیسے کچھ بول سکتا ہوں؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"اچھا پھر اچھے شوہروں کی طرح بیوی کی خواہشات کا احترام تو کر ہی سکتے ہوناں؟" اس نے ناک سکیڑی تھی۔

"واللہ! مہینے کا آخر چل رہا ہے۔" اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔ وہ اس کے انداز پر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"لگ رہے ہو ناں اب مشرقی شوہر۔ عام سی بیوی کے عام سے شوہر!" وہ اس کی بات پر مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"خاص سی سعاد کا خاص سازیاد۔۔!" اس نے اس کے کان کے پاس جھکتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔ وہ ٹھہر سی گئی تھی۔ اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ وہ ہر بار اپنی محبت کا اظہار بہت مختلف سے انداز میں کرتا تھا، اور اس کا ہر انداز لاجواب کر دینے والا تھا۔ جیسے اس وقت وہ چاہ کر بھی کوئی جواب تلاش نہیں کر پائی تھی۔ بس یونہی اس کے روبرو بیٹھے آنکھوں میں انوکھی چمک لیے تشکر بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جو مقابل کو سرشار کر گئی تھیں۔

☆☆☆

آج انہیں اپنے پلان پر عمل کرنا تھا۔ خیام آفس آگیا تھا جبکہ جندل اور زیاد حملے کی کامیابی کے منتظر تھے۔ بدر اور سعاد مکمل تیاری کے ساتھ اسکرینوں پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ خیام کی طرف سے اشارہ ملا تھا اور وہ دونوں اپنے سامنے رکھے کی بورڈز پر جھکے تھے۔

سیاہ بالوں والی وہ لڑکی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جب اسے کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا لیپ ٹاپ گاڑی کے بانٹ پر رکھا اور ناک پر چشمہ ٹکالیا۔ سبز پی کیپ والا وہ لڑکا کیفے ٹیریا میں بیٹھا تھا جب اس کی اسکرین پر کوئی پیغام چمکا۔ اگلے ہی پل وہ حملے میں شامل ہو چکا تھا۔ اس نے نیند سے اٹھ کر انگڑائی لی اور نگاہ سامنے اسکرین پر ملے پیغام پر ٹکی۔ اس کی نیند بھک سے اڑی اور وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر اپنی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ

پر چلانے لگی۔ آن کی آن میں سعاد یوسف زئی اپنے جیسے پندرہ شاطر دماغوں کو اس حملے میں شامل کر چکی تھی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد کسی نے بدحواسی میں اس کے آفس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ مثبت جواب ملنے پر ایک لڑکا بگڑے تنفس کو بحال کرنے کی کوشش کرتا اندر آیا تھا۔

"کمپنی پر۔۔سائبر اٹیک ہوا ہے۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ خیام کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"ٹیم کہاں ہے؟" وہ جلدی سے کرسی سے کھڑا ہوا تھا۔

"ہم انہیں روک نہیں پا رہے۔" لہجے میں خوف تھا۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا تھا۔ راہداری سے گزرتا وہ لفٹ کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے لفٹ میں داخل ہوتے ہی وہ لڑکا بھی اس کے ساتھ آیا۔ آہنی دروازہ بند ہوا۔ لفٹ پانچویں منزل پر رکی۔ دروازہ کھلا اور وہ دونوں باہر آ گئے۔ راہداری سے گزر کر وہ سیکورٹی روم کے دروازے پر رکے۔ دروازہ پر لگی اسکرین نے دونوں کی شناخت کی اور دروازہ کھل گیا۔ اس کا اگلا قدم اس بڑے سے ہال کی طرف اٹھا تھا۔ ٹھیک بیچ میں دیوار کے پاس بڑی سی اسکرین لگی تھی۔ ارد گرد بہت سی کرسیوں پر کئی ہیکرز بیٹھے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کی بورڈ پر چلتی ان کی انگلیوں کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ ٹھنڈے یخ ماحول میں بھی انہیں پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے نگاہوں کا رخ اسکرین کی طرف کیا۔ وہاں کوئی نقشہ کھلا تھا جس پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔

"ہم انہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کوآپریٹیو سائبر اٹیک ہے۔ اس ایک حملے کے پیچھے کئی شاطر دماغ ہیں، انہیں روکنا مشکل ہے!" کسی کی گھبرائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پر سوچ نگاہوں سے اسکرین کو دیکھنے لگا۔

”بس کچھ منٹ اور خیام، صرف چند منٹ!“ وہ بہت پر جوش تھی۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی، آنکھیں ذہانت سے چمک رہی تھیں۔ ہر چیز ٹھیک جارہی تھی۔ وہ ان کے لیے اس حملے سے بچنے کے تمام راستے مسدود کر چکی تھی۔ اسے خود پر، اپنی ذہانت پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔

”کچھ بھی کرو، کسی بھی طرح انہیں کمپنی کے ڈیٹا تک رسائی حاصل کرنے سے روکو!!“ اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ وہاں بیٹھے لوگوں کی ہتھیلیاں بھیگنے لگی تھیں۔

”وہ سسٹم میں داخل ہو چکے ہیں۔“ کسی نے ڈرتے ڈرتے بتایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

”انہیں ہر حال میں روکو!!“ وہ چلایا تھا۔ چہرہ غصے سے لال پڑنے لگا تھا۔

”شاباشے۔ ایسے ہی چلاتے رہیں، بس ایک منٹ استاد جی!“ وہ اس کے کان میں چہکی تھی۔

”انعام کے طور پر ہمارا آئی فون ڈن کریں، سر!“ بدر کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اسے کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔ اس نے موبائل کی روشن اسکرین پر جگمگاتا پیغام پڑھا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے اور اگلے ہی لمحے وہ حکم صادر کر دہا تھا، ”سرور بند کر دو۔ ابھی کے ابھی سرور بند کر دو!!“ اس کی بلند آواز نے سعاد کو ٹھہرنے پر مجبور کیا تھا۔

”خیام، نہیں۔ صرف چالیس سیکنڈ رہتے ہیں۔ یہ پلان میں شامل نہیں تھا۔۔“ وہ کم فہمی سے کہہ رہی تھی۔

”سر، یہ بہت نقصان دہ ثابت ہو گا۔“ کسی نے اعتراض کیا تھا۔

”کم از کم کمپنی کا ڈیٹا محفوظ رہے گا۔ میں نے جو کہا ہے وہ کرو!!“ وہ طیش میں آیا تھا۔ آن کی آن میں تمام سسٹم بند کر دیا گیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی روشنیاں بجھتی رہیں۔ یہاں تک کہ سب رک گیا۔ اس کے سامنے دیوار پر نسب اسکرین تاریک ہو گئی۔ ان سب نے گہرے سانس لیتے ہوئے سر کرسیوں پر ٹکا دے۔ پیشانی سے پسینے کی بوندیں گر رہی

تھیں۔

”اگر ہم یہ نہ کرتے تو کون جانتا تھا کہ کمپنی کس کے ہاتھ میں جانے والی تھی۔“ کسی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔ خیام ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

”ہی از اے جینیئس مین!“ کسی نے تبصرہ پیش کیا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ تمام آوازیں تھم گئیں۔

☆☆☆

اس نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائے اسکرین کو دیکھا۔ اس کی محنت رائگاں جا چکی تھی۔ وہ کمپنی کے ڈیٹا تک رسائی حاصل کرنے کے بہت قریب تھی اور یہیں اسے واپس صفر کی طرف بھیج دیا گیا۔ اس نے سختی سے لب دانتوں میں دبائے تھے۔ ماتھے پر تیوری چڑھی تھی۔ اس کے عقب میں صوفے پر بیٹھے زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا جو اب اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بدر بے بسی سے مٹھیاں بھینچتا کمرے سے نکل چکا تھا۔

”اگر انہیں یہ سب کرنا تھا تو مجھے بتانا چاہیے تھا!!“ اس کی آواز ذرا سی بلند ہوئی تھی۔ زیاد نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔ ”میں۔۔ میں نے اس پر بہت محنت کی تھی۔“ اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ ایک طرف بے بسی کا احساس تھا اور دوسری طرف خیام پر بے تحاشا غصہ جسے ضبط کرنے کی کوشش میں وہ ہلکان ہو رہی تھی۔

”اس نے یقیناً کچھ سوچ کر کیا ہو گا یہ۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

”انہیں مجھے بتانا چاہیے تھا!!“ آواز مزید بلند ہوئی تھی۔ وہ اب کرسی سے اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ زیاد کی نگاہ اس کے ہاتھوں پر پڑی۔ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔ وہ اپنا موبائل صوفے پر رکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آتا ہوں۔۔“ اس پر ایک نگاہ ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ سعاد اس کے جاتے ہی دھم سے صوفے پر بیٹھی

تھی۔ حجاب کی پنیں نکال کر اسے صوفے پر پٹخ کر سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔ آنکھوں میں چمکتی نمی باہر نکلنے کو بے تاب ہوئی تھی۔ صرف چند لمحات کی بات تھی اور وہ کامیاب ٹھہرتی۔ صرف چند لمحے۔۔چند سیکنڈز۔۔اس نے گہری سانس لے کر سر صوفے کے بازو پر ٹکایا تھا۔ دو آنسو گالوں پر بہتے چلے گئے۔ اسی اثناء میں زیاد کا موبائل تھرتھرایا تھا۔ اس نے سرسری سی نگاہ موبائل کی روشن اسکرین پر ڈالی۔ اسکرین پر جگمگاتے پیغام پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھا کر اس پیغام کو بار بار پڑھا۔ وہ خیام کا پیغام تھا جو اس سے اچانک سروے بند کروانے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ یعنی خیام نے یہ سب زیاد کے کہنے پر کیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے اس کے پیچھے نیچے جا رہی تھی۔ زینے اتر کر وہ نیچے آئی تو کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بھول چکی تھی بدر بھی نیچے ہی تھا۔ اپنے حجاب سے بے پروا وہ کچن میں آئی تھی۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کافی بنا رہا تھا۔ اس کی موجودگی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ وہ لب بھینچتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ بدر عجلت میں اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ وہ بھی جانے کیوں ٹھہر سی گئی تھی۔ حجاب سے بے پروا، شانوں پر بکھرے سیاہ بال، دودھیا سی رنگت، گہرے بھورے رنگ کی آنکھیں، تیکھے نقوش اور آنکھوں میں چمکتی نمی۔۔وہ اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ کبھی حرکت نہیں کر پائے گا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں، پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس کی وجہ سے جان سے جاتے جاتے بچی تھی۔ وہی لڑکی، جس کے لیے وہ پہلی بار خیام کے سامنے رویا تھا۔ سعاد یوسف زئی، جس کہ وجہ سے اس نے عرصے بعد خود پر قابو کھویا تھا اور آنسو بہائے تھے۔ اس کے لیے سانس لینا محال ہوا تھا۔

ایسی ہی حالت سعاد کی تھی۔ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ اس کے سامنے یوں بے حس و حرکت کیوں کھڑی تھی؟ اس کی دھڑکنیں منتشر کیوں ہوئی تھیں۔ قدم کیوں اٹھنے سے انکاری تھے؟ اس کی آنکھوں کیوں جلنے لگی

تھیں اور سانسیں کیوں تھمنے لگی تھیں؟

اس نے دیکھا تھا کہ۔۔ نمکین پانی کا شفاف قطرہ بدر کی پلکوں سے جھول کر بے جان سا ہو کر گال پر لڑھک گیا۔ عین اسی لمحے دو آنسو اس کے گالوں پر بھی بہہ گئے۔ چند لمحوں کا کھیل تھا، زیاد کافی کا کپ ہاتھ میں لیے پلٹا تھا اور پلٹتے ہی ساکت ہوا تھا۔ وہ دونوں نم آنکھیں لیے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اسے سمجھنے میں کچھ پل لگے اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے سعاد کو کلائی سے پکڑ کر اپنے پیچھے کیا تھا۔ وہ اس کے آگے دیوار کی مانند کھڑا ہو گیا تھا۔ طلسم ٹوٹا تھا۔ بدر نظریں جھکا گیا تھا۔ وہ آنکھیں میچتے ہوئے اس کے بازو پر اپنی گرفت سخت کر گئی تھی۔ اس کے اس اچانک رد عمل سے اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ اس کے حجاب کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ اسے لاپرواہی نہیں دکھانی چاہیے تھی۔

”کوئی کام ہے بدر؟“ اس کی آواز میں سختی تھی۔

”سوری۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔“ اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے جواب دیا پھر واپس پلٹ گیا۔ وہ زیاد کے عقب سے نکل کر اسے جاتا دیکھنے لگی۔ زیاد نے مڑ کر اسے دیکھا جو اس کے دیکھتے ہی نظریں چرا گئی تھی۔

”پوچھ سکتا ہوں یہ کیا تھا؟“ نہ صرف لہجہ سخت تھا پر نگاہوں میں بھی سختی تھی۔

”زیاد میں۔۔“ وہ جواب نہیں دے سکی۔ اپنی کیفیات خود سمجھنے سے قاصر تھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی۔

ذہن کی اسکرین پر چند مناظر لہرائے تھے۔ گھر میں لگی آگ، روتے بلکتے معصوم بچے کی آوازیں، کھڑکی پر کھڑی سعاد اور رات کی تاریکی میں پناہ لیتا وہ شخص جس کی گود میں اس کا بھائی بلک رہا تھا۔ بدر کی آنکھ سے گرتا آنسو اور وہ

آنسو جو اس کے باپ کی آنکھ سے گرا تھا تب جب وہ ان کے سینے سے لگی انہیں الوداع کہہ رہی تھی۔ اسے اپنے اردگرد سب دھواں ہوتا محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

”اچانک پلان کیوں بدلا؟ سب ٹھیک تو جا رہا تھا۔“ جندل منہ بسور کر کہتا دھم سے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا خیام منتظر نگاہوں سے زیاد کو دیکھ رہا تھا جو سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر میں سعاد کھڑی تھی اور سامنے کچھ فاصلے پر بدر۔ وہ دونوں بالکل چپ تھے۔ خیام کی توقع کے عین برعکس وہ اس پر چیخنے چلانے کے بجائے دم سادھے کھڑی تھی۔ گم گم سی نگاہیں فرش پر ٹکی تھیں۔

”یہ پیغام ہیڈ کوارٹر سے نہیں آیا مگر میں تصدیق کر چکا ہوں۔ پیغام کے مطابق سسٹم میں ایسا وائرس موجود ہے جو سسٹم میں داخل ہونے والے کا تمام ڈیٹا ہیک کروا سکتا ہے۔ اس وائرس سے بچنے کی تدابیر اختیار کیے بنا ہم سسٹم میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔“ اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

”تمہیں ایسا کچھ نظر آیا سعاد؟“ خیام نے نگاہوں کا رخ سعاد کی طرف کیا۔ سب کی توجہ کا مرکز وہ تھی۔ اس نے شاید سنا نہیں تھا تبھی بس خاموشی سے فرش کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ ناک پر ٹکے چشمے نے ایک حد تک آنکھوں میں چھلکتی نمی کو چھپا لیا تھا۔ ”سعاد؟“ خیام نے اسے دوبارہ پکارا تھا۔ ایک آنسو اس کے گال پر لڑھک گیا تھا۔ بے بسی سے لب دانتوں میں دبا کر اسے دیکھتے بدر کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ جندل کے ماتھے پر بل نمودار

ہوئے تھے۔ زیاد نے گہری سانس لی تھی۔

"جندل، سعاد کو اندر لے جاؤ۔" اس کے کہنے پر جندل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خاموشی سے آگے بڑھ کر اسے کلائی سے پکڑ کر اپنے ساتھ لیے آگے بڑھ گیا زیاد اب بدر کی طرف متوجہ ہوا جو کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ "تم جا سکتے ہو، مصعب!" لہجہ کاٹ دار تھا۔ وہ بنا کسی سے نظریں ملائے پلٹ گیا۔ خیام نے کم فہمی سے اس کی پشت کو دیکھا۔

"کچھ ہوا ہے کیا؟ تم لوگ لڑے ہو؟" وہ اس کے سوال پر نفی میں سر ہلا گیا۔ "سعاد کو ڈانٹا ہے؟" اس کا سر ایک بار پھر نفی میں ہلا تھا۔ "تو وہ رو کیوں رہی ہے؟"

"نہیں جانتا یار۔۔" وہ جھنجھلا کر کہتا آگے ہوا۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"غصے میں ہو؟"

"تم اپنے سوالات کا سلسلہ بند کر کے میری بات سنو گے؟" وہ اس پر بگڑا تھا۔

"تم غصے میں ہو۔ وجہ جان سکتا ہوں؟" اس کی بات کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا جب وہ روتی ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں نمی نہیں دیکھ سکتا۔" وہ بے بس ہوا تھا۔

"ہاں تو یہ بات اسے جا کر کہو۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ یہ میاں بیوی اس کی سمجھ سے باہر تھے۔

"میں ڈر رہا ہوں آنے والے وقت سے۔" اس کی آواز میں خوف تھا۔ خیام نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا ہے زیاد؟" اس نے جواب نہیں دیا۔ بس جیکٹ کی جیب سے یو ایس بی نکال کر میز پر رکھے لیپ ٹاپ میں ڈالی اور لیپ ٹاپ کی اسکرین اس کے سامنے کر دی۔ خیام ماتھے پر بل ڈالے اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ہی اس کی ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں، آنکھیں سرخ ہو کر جلنے لگی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی

ننھی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ ایک منٹ سے زیادہ وہ ویڈیوز نہیں دیکھ پایا۔ اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

”سسٹم میں کوئی وائرس نہیں ہے۔ وہاں یہ سب موجود ہے۔ مجھے پیغام موصول ہوا تھا کہ، ”کسی بھی طرح سعاد یوسف زئی کو سسٹم میں داخل ہونے سے روکو!“۔ وارلڈ گلاس کمپنی، ایک پورا پلیٹ فارم ہے جہاں درندے بستے ہیں۔ یہ کمپنی صرف ایک نقاب ہے جس کی آڑ میں وہ تاریک راتوں میں خون کی ہولی کھیلتے ہیں۔ جو ڈیٹا اسٹیون چرانا چاہا تھا وہ یہی تھا۔ ان کے گندے کاموں کے ثبوت!“ اس کا ماتھا شکن آلود تھا۔ چہرے پر پریشانی تھی۔ خیام نے آنکھیں رگڑ کر اسے دیکھا۔

”اگر سعاد نے یہ دیکھ لیا تو؟“ اس نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

”میں نے خود کو بمشکل سنبھالا ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ میں اسے بکھرنے سے کیسے بچا پاؤں گا۔ نہ صرف وہ۔۔ پر جندل بھی!!“ اس کی آواز کئی پل خیام کو اپنی سماعت سے ٹکراتی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

”خیام۔۔ کیا بدر میرا بھائی ہو سکتا ہے؟“ اس کے سوال پر اسے اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا۔ جاگرز کے تسمے باندھتے ہوئے وہ ٹھہر سا گیا تھا۔ ساکت سی نظروں سے موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھا جہاں اس کی کال چل رہی تھی۔ اسے لگا تھا اس نے اس پر غصہ کرنے کے لیے کال کی تھی۔ وہ اس پر چیخے گی، چلائے گی اور اگر پرانی سعاد کی طرح تھپڑ جڑنے کی دھمکی بھی دے دے تو وہ حیران نہیں ہو گا۔ مگر وہ بھیگی آواز میں اس سے اپنے بھائی کا پوچھ رہی تھی۔ وہ کئی پل کچھ بول نہیں پایا تھا۔

”اس کے دادا کا نام کعب الزرقاوی ہے۔ شاید وہ الزرقاوی سرہی ہوں۔ انہوں نے بدر کو اپنا نام دیا ہو۔ ہو سکتا ہے

ناں ایسے؟" وہ رو رہی تھی۔ گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے اور سسکیاں دبانے کے لیے لب دانتوں تلے کچلے گئے تھے۔ "وہ ہنستا ہے تو آنکھوں کے کنارے سلوٹیں سی پڑتی ہیں۔ بالکل بابا کی طرح اور۔۔ اور میری طرح۔ آپ نے اسے مسکراتے دیکھا ہے؟ خوشی میں اس کی آنکھوں کی چمک مانوس مانوس سی نہیں لگتی؟" وہ بول رہی تھی اور وہ سانس روکے اسے سن رکا تھا۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔ اس نے سختی سے لب بھینچے تھے۔ "آج وہ رو رہا تھا۔۔ نہیں جانتی کیوں مگر خیام۔۔ اس کی آنکھوں میں وہ مانوس سا تاثر میرے لیے سانس لینا محال کر رہا ہے۔ وہ انسو، وہ تاثر، وہ لمحات بالکل ویسے ہی تھے، جب بابا کو آخری بار میں نے الوداع کیا تھا۔ خیام بدر میرا بھائی ہے۔" اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ خیام کو اپنی آنکھیں جلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد وہ اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہہ رہا تھا، "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی سعاد۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ دل اتنی شدت سے جس بات پر گواہی دے آپ اسے غلط فہمی نہیں کہہ سکتے۔ وہ میرا بھائی ہے خیام۔۔ بدر میرا بھائی ہے۔۔!" وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"سعاد تم۔۔۔ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"رگوں میں دوڑتے خون کی کشش سے واقف ہیں خیام؟ میری بات کا یقین نہیں تو اس خون کی تصدیق کر لیں۔ میرا دل کہتا ہے وہ میرا بھائی ہے۔" اس نے حل پیش کیا تھا۔ خیام کو لگا تھا وہ اگلا سانس نہیں لے پائے گا۔ چہرہ بالکل سفید پڑ گیا جیسے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔

"یہ بے وقوفی ہو گی سعاد۔۔ تم بدر کو بھی شک میں ڈال دو گی۔" وہ ہلکا سا ہنسا تھا۔ اس کے ہنستے ہی آنکھوں سے ایک آنسو گال پر لڑھک گیا۔ اس نے بند مٹھی لبوں پر رکھ کر اپنی سسکی دبائی تھی۔

"آپ نے کہا تھا آپ میرے بھائی کو ڈھونڈنے میں میری مدد کریں گے۔" وہ اسے اس کا وعدہ یاد دلا رہی تھی۔

"مجھے اپنا کیا گیا وعدہ یاد ہے سعاد لیکن اگر یہ حقیقت نہ ہوئی تو مصعب۔۔۔" وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ سماعت سے ٹکراتیں سعاد کی دبی دبی سسکیاں اور اس کی بھیگی آواز اسے ضمیر کے بہت بھاری بوجھ تلے دبا رہی تھیں۔ اس نے کال کاٹ دی۔ رابطہ منقطع ہو گیا۔ آنکھوں سے دو آنسو گالوں پر پھسل گئے۔ اس کا وجود دھیرے دھیرے کانپنے لگا تھا۔

تو کیا اب وقت آ گیا تھا۔۔ کہ اس سے محبت کرنے والوں کی محبت نفرت میں بدلنے جا رہی تھی؟ کیا اب وہ اپنے کیے کی سزا بھگتنے والا تھا؟

☆☆☆

کافی کا کپ اس کے ہاتھ چھوٹ کر گرا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھی۔ بے یقینی و حیرت سے اس نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے پار دیکھا تھا۔ موبائل کان سے لگائے دھیرے دھیرے سسکتی سعاد کے الفاہ وہ بخوبی سن سکتا تھا۔ اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔ آنکھوں سے آنسو زارو قطار بہہ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ لال پڑنے لگا تھا۔ قدموں میں پانی کی طرح بہتی گرم کافی سے انجان وہ بس ساکت نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ دل اتنی شدت سے جس بات پر گواہی دے آپ اسے غلط فہمی نہیں کہہ سکتے۔ وہ میرا بھائی ہے خیام۔۔ بدر میرا بھائی ہے۔۔!" وہ سانس روکے اس کی تڑپ دیکھ رہا تھا۔ قدم بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ آنکھوں میں نمی سی ٹھہرنے لگی تھی۔ اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ دھڑکنیں سست پڑنے لگی تھیں۔ وہ کئی پل بے حس و حرکت کھڑا رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھی سعاد موبائل ایک طرف رکھ کر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ یہ دوسری

بار تھا جب وہ اسے یوں بے حجاب دیکھ رہا تھا۔ اس نے پلٹنا چاہا تھا مگر قدم جم گئے تھے۔ وہ اس کی بہن ہونے کا دعوہ کر رہی تھی، وہ کیسے پلٹتا۔ اس لڑکی کے آنسو اسے کمزور کر رہے تھے۔ نمکین پانی کا ننھا سا قطرہ اس کے گال پر گرا تھا۔ اس نے بے اختیار قدم آگے بڑھانا چاہے تھے۔

"بدر؟" آواز زیاد کی تھی۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا جو آخری زینے پر کھڑا سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے برابر سے گزر کر زینے اترنے لگا۔ زیاد نے کم فہمی سے اس کی پشت کو دیکھا۔ وہ جا چکا تھا۔ اسے وہ تھوڑا عجیب سا لگا تھا۔ یہ وہ بدر تو نہیں تھا جس سے متعلق سعاد اور خیام اسے کئی بار بتا چکے تھے۔ یہ بدر تو پر اسرار سا اور اپنے ہی خول میں رہنے والا تھا۔

اس نے اپنی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔ قدم آگے بڑھائے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"سعاد کیا ہوا ہے؟" پریشانی سے کہتا وہ آگے آیا تھا۔ اس نے اپنے آنسوؤں پر بند باندھنا چاہے تھے مگر ناکام ٹھہری۔ وہ اس کے برابر میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے گود میں رکھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تھے۔

"لڑکی کچھ بتاؤ گی مجھے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں رو رہی ہو اتنا؟" وہ اس کے چہرے پر آئے بال کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"تم بھی یقین نہیں کرو گے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا۔" وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"رونا بند کرو۔ کیا بچپنا ہے یہ؟ کوئی بات ہوئی ہے تو یہیں بیٹھا ہوں ناں، تمہارا نہیں تو کس کا یقین کروں گا؟" وہ اپنا رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے رونا آتا ہے جندل کی سختی دیکھ کر۔ وہ کیسا بھائی ہے؟ اسے وہ سب محسوس کیوں نہیں ہوتا جو میں کرتی ہوں؟

وہ کیوں خود کو اپنے خول میں رکھتا ہے؟ آخر کوئی بھائی کیسے اپنے بھائی کو فراموش کر سکتا ہے؟ اس کی رگوں میں دوڑتا خون اسے بے چین کیوں نہیں کرتا؟" آنسو ہنوز گالوں پر بہہ رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ "وہ ہمیشہ سے ایسے تھا۔ اسے نہ اپنی بہن کی پروا تھی، نہ اپنے بھائی کی۔ اسے صرف اور صرف اپنے کام سے مطلب ہے۔ اگر اس کے دل میں ہمارے لیے ذرا بھی محبت ہوتی تو آج وہ میرے ساتھ کھڑا ہوتا۔ پھر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر خیام کو میری بات کا یقین نہیں آتا!!" اس کی آواز ذرا سی بلند ہوئی تھی۔ زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے سعاد۔ ایک بھائی کبھی اپنی بہن کو فراموش نہیں کر سکتا!!" وہ اعتماد سے کہہ رہا تھا۔ اسے اپنی بات کی صداقت کا یقین تھا۔ کیونکہ وہ بھی۔۔۔ ایک بھائی تھا۔

"وہ ایسا ہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے لاپرواہ ہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کی بہن، اس کا بھائی کس حال میں ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی محبت، اپنے راز، اپنی سوچ کو خود تک محدود رکھتا ہے۔ وہ بہت ظالم ہے زیاد۔۔" وہ سسک اٹھی تھی۔ زیاد چندپل بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے دھیرے سے اسے خود سے لگایا تھا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رو دی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی سسکیاں سنتا رہا تھا۔

کچھ لمحات بعد وہ نرمی سے اس کے گالوں پر گرتے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کے پوروں پر چنتے ہوئے کہہ رہا تھا، "اگر وہ خود کو اپنی ذات تک محدود رکھتا ہے تو اسے اس سمندر کی طرح سمجھو جس میں اگر طوفان آ گیا تو سب بہا لے جائے گا۔"

☆☆☆

حد نگاہ تک پھیلا سمندر۔۔ سمندر کی مطلق العنان موجیں۔۔ آج وہ تھک ہار کر سمندر کے پاس آیا تھا۔ عاشق کی طرح جس کی تھکن بس اپنے محبوب کی آغوش میں اترتی ہے۔ وہ بھی اپنی تھکن اتارنے آیا تھا۔ نم ریت پر بیٹھا پاؤں پانی میں ڈالے۔۔ دور سے کوئی لہر اس کی طرف آتی تو وہ گھٹنوں تک بھیگ جاتا۔ سرمئی شام کے سائے ہر سُو پھیل چکے تھے۔ سورج ڈھلنے سے پہلے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ہلکی ہوا کے جھونکے پانی کے ساتھ اٹھکیلیاں کھیل رہے تھے۔ اس کے لیے یہ منظر خیرہ کن تھا۔ پانی اور مٹی کی یہ نم سی خوشبو اسے اندر تک سرشار کر رہی تھی۔ رگ وپے میں جیسے سکون سا اتر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد ڈھیلے سے انداز میں باندھے تھے۔ آنکھیں چمکی تھیں۔

”سنو ہم راز! آج مجھے اپنا آپ ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے کندھے اب تھکنے لگے ہیں۔ یہ بوجھ بہت زیادہ ہے جو میں اٹھائے ہوئے ہوں۔ شاید میں خود پر ظلم کر رہا ہوں۔ شاید میں عادی ہو چکا ہوں۔ میں ظالم اور سنگدل بن چکا ہوں یا پھر حد سے زیادہ معصوم ہوں۔ میں خود کو اپنی ذات کے خول تک محدود رکھتا ہوں یا پھر شاید مجھے اپنے احساسات، اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرنا آتا۔ کتابیں بھی مجھے وہ الفاظ نہیں دے پاتیں جو میرے جذبات کے ترجمان بنیں۔ شاید یہ سب بس محسوس کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر یہ احساسات، یہ جذبات الفاظ کے محتاج نہیں۔۔“

سمندر کے اوپر، پانی کی اٹھتی لہروں کے ساتھ ایک عقاب۔۔ اپنے پر پھیلائے اڑان بھرتا اس کے پاس سے گزرا تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا وہ سمندر کو ہم راز بنائے اور اس کے زئی کی آمد نہ ہو۔ اس نے ایک اونچی اڑان بھری تھی۔ لہروں کے ساتھ اٹھتا وہ بہت اوپر گیا تھا۔ وہ سر اونچا کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ واپس آ رہا تھا۔ تیزی سے۔۔۔ اسی کی جانب۔ وہ اس کے پاس آیا۔ جندل نے اپنا بازو سیدھا

کیا۔ وہ اس کے بازو پر بیٹھ گیا۔ اپنے پر سمیٹ لیے۔ اس کے تیز پنجے جندل کے بازو میں چبھے۔ خون کی ننھی بوندیں سمندر کے شفاف پانی پر گریں مگر وہ اس سے بے پروا کھل کر مسکراتے ہوئے اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

”زئی۔۔ مجھے واقعی تمہاری ضرورت تھی۔“ وہ اس کی سرگوشی پر مچلا تھا۔ اسے درد کا ہلکا سا احساس ہوا۔ وہ اسے نظر انداز کرتا سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں بہت سخت بن چکا ہوں۔ اور کیا یہ فطری نہیں؟ میں نے یہیں، ایسے ہی پانی کے قلب میں اپنے جہاز کو ڈوبتے دیکھا تھا۔ ایسی ہی ایک شام میں سمندر میں آگ لگی تھی۔ ایک قیامت برپا ہوئی تھی۔ وہ کٹی پھٹی لاشیں، وہ بھسم ہوئے جسم، وہ خون آلود شام میں بھول نہیں پاتا۔ میں نے آغا جان کو آگ کی نذر ہوتے دیکھا تھا۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جاتے ہوئے مجھے اپنی موت یقینی لگی تھی۔ میں چھوٹا تھا زئی۔۔ شاید آٹھ سال کا۔ کیا اب بھی میرے سخت دل پر تعجب کیا جا سکتا ہے؟“ وہ دھیمی سی آواز میں سرگوشی کر رہا تھا۔ سمندر کے ساتھ ساتھ اب زئی کو بھی اپنے راز میں شریک کیا تھا۔ ”اس کے بعد وہ آگ۔۔ اس رات بھی میں موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ میں نے بہت سوں کی زندگیاں اجڑتے ہوئے دیکھی تھیں۔ جب میں گھر پہنچا تھا تو ایک اور قیامت میری منتظر تھی۔ ماں، بابا۔۔ میں نے انہیں بھی کھو دیا۔ کچھ عرصے بعد۔۔ جان سے زیادہ عزیز ماموں کو بھی۔ میں تنہا ہو گیا تھا۔ میں نے خون کی ہولی دیکھی تھی۔ اب کسی کا سسکنا، کسی کا تکلیف میں ہونا مجھے نرم نہیں کر پاتا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان گنت جانیں لی ہیں۔

زندگی نے مجھے سکھایا ہے کہ۔۔ یہ موت نہیں ہے جس سے ڈرنا چاہیے۔ یہ زندگی ہے جو سانس تک روک لیتی ہے۔ موت تو برحق ہے، بس ایک لمحے کی کہانی ہے۔ مگر زندگی ہر لمحے مرنے کا نام ہے۔ شاید تمہیں میں اتنی مایوسی کی باتیں کرتا اچھا نہیں لگ رہا مگر آج دل بہت اداس ہے۔ کچھ دیر میں مغرب کا وقت ہو جائے گا۔ میرے دل کا

سکون تو پھر اسی رب کی بارگاہ میں ہے۔ میں پھر سے ویسا ہی ہو جاؤں گا۔ سخت سا ظالم سا جندل یوسف زئی! میں واقعی ظالم بن چکا ہوں۔ شاید یہ کسی کے لیے تکلیف کا باعث بنے لیکن۔۔۔ اگر میرے دل کے سمندر میں طوفان آ گیا تو اسے کوئی روک نہیں پائے گا۔ میں نے اس آگ کو خود میں سمیٹ لیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے میں سخت بن چکا ہوں۔۔" اس کی بات ختم ہو گئی۔ اس نے مسکرا کر زئی کو دیکھا۔ بہت آرام سے اس کی پشت پر تھپکی دی۔ اس کے زئی نے اپنے پر پھیلائے اور اگلے ہی لمحے وہ اونچی پرواز بھر رہا تھا۔ ایک لمبا چکر سمندر کے گرد کاٹ کر وہ اس کے قریب سے گزر کر اب اوپر جا رہا تھا۔ جندل سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

منظر لمحوں میں بدلا تھا۔ حال سے ماضی تک کا سفر طے ہوا تھا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے جندل یوسف زئی سمندر کنارے کھڑا تھا۔ وہ اس آگ سے بھی بچ گیا تھا۔ وہ سروائیور تھا۔ سروائیور اور گواہ، اس رات گھروں میں بھڑکتی آتش کا گواہ!

اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا تھا۔ وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ جلے ہوئے گھر، ملبوں کے نیچے دبی لاشیں دیکھنا، گرم انسانی خون کی مہک سونگھنا۔۔ یہ سب آسان نہیں ہوتا۔ ایک کے بعد ایک جان کا جانا اور پے در پے ایسے لوگوں کو کھونا جو چند لمحوں میں عزیز ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکی۔۔ ازاوہ اسے نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔ زیاد بری طرح زخمی تھا۔ وہ ان دونوں کا مقروض تھا اور اب یہ قرض اتارنا چاہتا تھا مگر۔۔ اس وقت کچھ ایسا نہیں تھا جو وہ ان کے لیے کر پاتا۔ بے بسی ہی بے بسی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرم سیال کی طرح گالوں پر بہنے لگے۔ اسے غم سے اپنا دل پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ سمندر کو دیکھتے ہوئے وہ چلایا تھا،

"ظالموں پر قہر بن کر ٹوٹنے والا امیر یوسف آج کہاں ہے؟" اس کی تیز آواز نے سمندر کی لہروں کو بے چین کیا تھا۔

اس کا وجود کانپ اٹھا تھا۔ آنکھوں میں چمکتے آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی تھی۔

”میں اپنی تھمتی سانسوں کے تھمنے تک آپ کا منتظر رہوں گا امیر المسلمین! آگ کی لپیٹ میں آتا بحیرہ روم ایک بار پھر آپ کی قباپوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں اور بحیرہ روم۔۔۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں امیر المسلمین۔۔۔! آپ کیوں چلے گئے؟ لوٹ آئیں ناں۔۔۔!“ وہ رو دیا تھا۔ نم ریت پر گھٹنوں کے بل گر گر کر وہ بلک بلک کر رو دیا تھا۔ اس کے آنسو تیزی سے سمندر کے پانی میں گر رہے تھے۔ دور سے ایک لہر آئی تھی، شاید اسے دلاسہ دینے آئی تھی۔ نمی کا احساس ہوتے ہی اسے کے رونے کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ اسے لگا تھا۔۔ وہ اس آگ سے بچ گیا تھا مگر یہاں جان دے دے گا۔

اس سے فاصلے پر۔۔ کچھ دور کھڑے کسی شخص نے بغور اسے دیکھا تھا۔ اس کے کہے الفاظ کو ازبر کیا تھا۔ لہر دور جا رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں میں کمی نہیں آئی تھی۔ یہاں اپنے گھر سے دور اس کے پاس کوئی نہیں تھا جو اس کے آنسو پونچھتا، اسے خود میں بھینچتا اور پھر مسکرا کر اسے تسلی دیتے ہوئے اس کے بال ماتھے پر بکھیر دیتا۔ اس نے شدت سے دعا کی تھی کہ سمندر میں اترا جندل اللہ کا بحری جہاز اس طرف آئے اور ساحل پر دحیہ کے قدم پڑتے ہی وہ بھاگ کر ان سے لپٹ جائے۔ اس کی دعا قبول نہیں ہوئی۔ وہ یونہی روتا بلکتا رہا تھا۔ کوئی اس کے لیے میسر نہیں تھا۔ کیونکہ کندن بننے کے لیے جلنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

اندھیر اور تاریک کمرے میں اسکرین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ کمرے میں چھائی کانچ سی خاموشی اس کے لیے باعثِ سکون تھی۔ اس نے جلدی سے اسکرین پر نمودار ہوتے کوڈز کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے

خوشی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق کوئی ورلڈ گلاس کمپنی کے سسٹم میں داخل ہوا تھا۔ صیاد صید کے لیے آیا تھا مگر اس سے پہلے ہی کئی صیاد اس کی تاک میں بیٹھے تھے۔

اس نے عجلت میں کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ایک پیغام لکھا۔ ایک آخری نگاہ اس پیغام پر ڈالی پھر پیغام بھیج دیا۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں انوکھی چمک لیے اس نے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔ اسے امید تھی اس کے پیغام کو قابلِ غور ضرور سمجھا جائے گا۔ نگاہیں ہنوز اسی پیغام پر ٹکی تھیں جو موصول کیا جاچکا تھا۔

”وہ چِپ جس میں ورلڈ گلاس کمپنی کے خفیہ راز موجود ہیں، آج بھی میرے پاس ہے۔“

☆☆☆

”ڈیوڈ کو ڈھونڈ لیا گیا ہے سر۔“ اس نے راہداری میں مارک کے ساتھ چلتے ہوئے اسے اطلاع دی تھی۔ ”مس ازابیلا کو اغوا کرنے والا وہی تھا۔ مجھے امید ہے مائک کے لاپتہ ہونے کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔“ مارک کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ وہ بھی اس کے ساتھ رک گیا۔

”ہم ڈیوڈ پر حملہ نہیں کر سکتے۔ وہ بہت کچھ جانتا ہے، اسے اس طرح ڈیل نہیں کیا جاسکتا۔“ مارک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

”میں جانتا ہوں سر۔ اسی لیے ہم ڈیوڈ کے بھائی کو ڈھونڈ چکے ہیں۔ وہ کالج کا اسٹوڈنٹ ہے۔ عمر انیس سال۔ اسے وہی سبق دیتے ہیں جو مس ازابیلا کو اغوا کر کے وہ ہمیں دینا چاہتا تھا۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ مارک کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔

”یہی وجہ ہے تم مجھے پسند ہو۔ جلد از جلد یہ معاملہ نپٹاؤ۔ میں ڈیوڈ کے مسئلے کو مزید طول نہیں دینا چاہتا۔“ ہدایات جاری کر کے وہ اس کا شانہ تھپتھپاتا آگے بڑھ گیا۔ وہ نچلا لب دانتوں سے کاٹتے ہوئے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ

راہداری پار کر گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے اپنے موبائل کو دیکھا پھر کسی کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا۔

"اسے اٹھالو۔" اس نے حکم صادر کیا تھا۔ کالج کے باہر اس کے حکم کے انتظار میں کھڑے وہ آدمی اندر کی طرف بڑھے تھے۔ وہ مکمل سیاہ لباس میں موجود تھے اور سینوں اور پشت پر ڈی ڈبلیو کا بیج لگا تھا۔ صرف چند پل اور پھر ڈیوڈ کا بھائی ان کے قبضے میں تھا۔ اسے بے ہوش کر کے وہ گاڑی تک لائے تھے۔ اسے ڈگی میں پھینک کر خود وہ دو گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ آگے پیچھے دونوں گاڑیاں اپنی منزل کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ جو اپنے آفس کی طرف بڑھ رہا تھا موبائل پر موصول ہونے والے پیغام پر رک گیا۔ موبائل آن کرتے ہوئے اس نے پیغام دیکھا تو اسی انیس سالہ لڑکے کی تصویر تھی جو کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی نیچے پیغام جگمگا رہا تھا، "ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔" اس نے موبائل کوٹ کی جیب میں ڈالا پھر گہری سانس لیتے ہوئے پلٹ گیا۔ اسے اب پہلے اس لڑکے کا معاملہ نپٹانا تھا۔

☆☆☆

وہ صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گود میں رکھے ہاتھ رگڑ رگڑ کر لال کیے جا چکے تھے۔ آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سرخ پڑ چکی تھیں۔ اس کے سامنے میز سے ٹیک لگا کر زیاد کھڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر خیام کسی مجرم کی طرح اضطراب کی کیفیت میں اس کی بکھری بکھری حالت دیکھ رہا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود اسے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن میں وہ اسے یقین دلاتا کہ بدر، اس کا بھائی نہیں تھا۔

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو کہ بدر واقعی سعاد کا بھائی نہیں ہے؟" پہل زیاد نے کی تھی۔ سعاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ کر اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔

"وہ دس سال کی عمر سے یہاں ہے۔ اگر وہ واقعی سعاد کا بھائی ہے تو الزرقاوی سر اسے یہاں تنہا کیوں چھوڑ

کر جاتے؟" اس نے جواز پیش کیا تھا۔

"ان کے پاس ہر کام کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ مجھے میرے بھائی سے دور کرنے کے لیے بھی کوئی حیلہ ہو گا ان کے پاس۔" اس کا انداز تلخ تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"سعاد، فرض کرو اگر وہ تمہارا بھائی نہ ہو۔ تم اسے بھی شک میں ڈال دو گی اور پھر اس سب کا کیا نتیجہ نکلے گا ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ ٹھیک ہے تم کہہ رہی ہو تو ہم ڈی این اے ٹیسٹ کروا لیتے ہیں۔ بلکہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی ہم الزر قاوی سر سے پوچھ لیں گے۔ مگر ایک بار، ایک بار یہاں کام مکمل ہو جائے۔" وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے ساری زندگی مجھے میرے بھائی سے دور رکھنے والے آپ کے الزر قاوی سر، آپ کو بتا دیں گے کہ بدر میرا بھائی ہے یا نہیں؟"

"سعاد، میں کہہ رہا ہوں ناں۔ مجھ پر یقین کرو۔ میں اپنا وعدہ ضرور نبھاؤں گا۔" اس نے یقین دلایا تھا۔ وہ چند پل رک کر اسے دیکھتی رہی پھر کچھ سوچ کر سر کو جنبش دی۔

"اگر وہ میرا بھائی ہوا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے گرتے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اور اسے لگا تھا جیسے اس پر ایک بھاری بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ وہ حقیقت جانتا تھا اور اس حقیقت کے نتائج یہی نکلتے تھے کہ، وہ اسے کبھی معاف نہیں کرنے والی تھی۔

"تم اپنے بھائی سے جلد ملو گی۔ یہ وعدہ ہے میرا۔" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ وہ گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے خیام؟" وہ اس کے روبرو کھڑی ہوئی تھی۔ خیام نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے؟ کم از کم اس معاملے میں بالکل نہیں۔ آپ جانتے ہیں ناں میں آپ کے

ساتھ صرف اپنے بھائی کی وجہ سے ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔ اسے لگا تھا اس کا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔

"نہیں۔" یک لفظی جواب تھا لیکن مکمل اعتماد سے دیا گیا تھا۔ وہ اس کا یقین کر گئی۔

"ہو گیا مسئلہ حل؟" زیاد کے سوال پر دونوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ جواباً اس نے محض کندھے اچکا دیے۔ "اصل میں ایک اور نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ میں اس پر بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ جندل ابھی تو غائب ہے، جب آئے گا تو اس سے بھی بات کر لیں گے۔"

"کہو، کیا ہوا؟" وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ایلسا نے اپنے بھائی کو اس شخص کا نام بتایا تھا جو پانچویں سیٹ پر بیٹھا ہے۔ لیکن وہ بس ایک ٹریپ تھا۔ وہ ہیکر، اسے مجھے کوئی معلومات دینی تھی لیکن وہ مجھے نہیں ملا کیونکہ جندل اس کے تعاقب میں تھا۔ البتہ، ایک شخص ہے۔ دلال! اس سائیکو پیتھ نے اس کا نام لیا تھا۔" اس نے تمام تفصیلات دونوں کے گوش گزار کیں۔

"دلال، پہلی بار سن رہا ہوں۔" خیام نے کم فہمی سے کہا تھا۔ پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سعاد کے دماغ میں کچھ کلک ہوا تھا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"کیا اس نے دلال ہی کہا تھا؟ اسی طرح؟"

"ہاں۔ ہسپانوی زبان میں لکھا تھا۔" وہ جلدی سے آگے بڑھی۔ میز سے کاغذ قلم اٹھا کر اسے پکڑائے۔

"لکھ کر بتاؤ۔" زیاد نے کاغذ قلم تھام لیے۔ سعاد نے کرسی سنبھال لی۔ خیام بھی میز کی طرف آیا۔

"یہ دیکھو ایسے۔" سعاد نے بغور ان الفاظ کو دیکھا۔ پھر سر کو جنبش دیتی اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور اگلے ہی لمحے دیوار پر نصب بڑی سی اسکرین پر چند تصاویر نمایاں ہوئی تھیں۔

”یہ مائیکل کی تصویر ہے۔ اس کی گردن کے پاس یہ ٹیٹو دیکھیں۔ یہ ہسپانوی زبان میں دلال لکھا ہے۔“ اس نے مائیکل کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے برابر میں یہ اسٹیون کی تصویر ہے۔ اس کے کان کے پیچھے یہ نشان بنا ہے جبکہ مارک کے بازو پر ذرا اوپر کی طرف۔“ وہ دونوں اب غور سے ایک کے بعد ایک تصویر دیکھ رہے تھے۔ ”اور پھر یہ دیکھیں۔ یہ کوئی ستائیس سالہ لڑکا ہے جس کا قتل آج سے اٹھارہ سال پہلے ہوا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب وارلڈ گلاس کمپنی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ کمپنی کے بارے میں پڑھتے ہوئے اس کا سرسری ذکر آیا تھا لیکن کیس دلچسپ تھا تبھی میں نے اس پر ریسرچ کی۔ یہ لڑکا اپنے بیڈروم میں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش کھڑکی کے پاس لٹکی ہوئی تھی۔ اس پر شدید تشدد کیا گیا تھا یہاں تک کہ اس کا چہرہ شناخت کے قابل نہیں تھا۔ اس کے سامنے بائبل رکھی تھی، بائبل کھلی ہوئی تھی جس کے صفحات پر اس کے منہ سے نکلتا خون بہہ رہا تھا۔ بستر پر خون سے یہی نشان بنا تھا یعنی دلال لکھا ہوا تھا۔ اور بائبل کے ان صفحات پر لکھا تھا،

آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت!“ اس نے رک کر دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں اسکرین پر نظر آتی تصویر دیکھ رہے تھے جہاں بائبل کے خون آلود صفحات نظر آرہے تھے۔

”یعنی یہ انتقامی کاروائی تھی۔ اس میں دلچسپ کیا ہے؟“ زیاد کے سوال پر اس نے سر کو جنبش دی۔

”یہ لڑکا، اپنے باپ کے بعد اس کے وراثت میں چھوڑے گئے دو بحری جہازوں کا کپتان تھا۔ یہ پندرہ سال کی عمر سے وہ جہاز چلا رہا تھا۔ مارک اور اسٹیون، ان کا تعلق بھی سمندر سے ہے۔ بار بار بحری قزاقوں کو کہا گیا تھا۔ اور آپ کو یاد ہے، یہاں مجرم جو بھی ہے اس کا تعلق اس حادثے سے بھی ہے جو جندل اللہ کے ساتھ سمندر میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وارلڈ گلاس کمپنی کی بنیاد تب رکھی گئی جب بحری قزاق اچانک سے زور پکڑنے لگے۔ یعنی دو ہزار دس میں جب بحری قزاق سمندروں میں خطرناک قوت بن کر ابھرے تھے۔“ اس نے

اپنی بات مکمل کر کے باری باری دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں گہری سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اس کی بات میں وزن تھا۔

”یعنی، دلال ایک بحری قزاق ہے اور یہ نشان اس کی تنظیم کا ہے۔“

”یعنی وہ بحری قزاق جو شرافت کا لبادہ اوڑھ کر عام لوگوں کے درمیان گھسے بیٹھے ہیں۔“ سعاد نے سر اثبات میں ہلایا۔ ”وارلڈ کے پاس یہ نشان ہے؟“ خیام کے سوال پر اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

”ہو گا بھی تو میں نے نہیں دیکھا۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”میں جندل کو دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ سوچتے ہیں اس کے متعلق۔“ وہ ایک نگاہ ان دونوں پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ سعاد نے گہری سانس لے کر کرسی سے ٹیک لگائی۔

”کافی پیو گی؟“

”تم بناؤ گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ سر کو جنبش دیتا پلٹ گیا۔ ”سنو زیاد، جاتے ہوئے بدر کو بھیج دینا۔ یہ ڈیٹا والا کام تو ختم کریں ہم۔“ اس نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

”بھیج دوں گا۔“ وہ دروازہ پار کر گیا۔ سعاد نے گہری سانس لی پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

”تم نے کیا سوچا ازابیلا؟“ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر صوفے پر بیٹھا سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے حلق میں کچھ چبھتا محسوس ہوا تھا۔

”میں آپ کو اپنا جواب دے چکی ہوں بابا۔ میں مارک سے شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

”تو اس لڑکے سے کرو گی؟ کیا تم واقعی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو؟“ اس کے لہجے میں تھوڑی سختی در آئی

تھی۔ اس نے بے بسی سے وارلڈ کو دیکھا تھا۔

"بابا، مجھے تھوڑا وقت دیں۔ آپ اس طرح مجھے پریشرائز نہیں کرسکتے۔ اگر جندل سے شادی نہیں کی میں نے تب بھی میں مارک کے لیے انکار ہی کروں گی۔۔!" وارلڈ نے سخت نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ لاؤنج میں قدم رکھتا مارک ٹھٹھک کر رکا تھا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

"جندل یوسف زئی؟ وہ ملازم؟ تم اسے مجھ پر ترجیح دے رہی ہو ازابیلا؟" وہ حیران ہوا تھا۔ ازابیلا نے دانت کچکچائے تھے۔ آنکھیں میچتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا رخ مارک کی طرف کیا جو تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ کیا برائی ہے اس میں؟" اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ وارلڈ نے گہری سانس لے کر صوفے سے ٹیک لگائی تھی۔

"وہ ایک ملازم ہے ازابیلا! اس میں اور تم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ دقیانوسی سوچ رکھنے والا عام مسلمان ہے اور تم۔۔"

"تم نے اس کی سوچ تک بھی رسائی حاصل کرلی؟" اس کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے پوچھا گیا۔

"تم زیادتی کر رہی ہو۔" اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تمہیں اپنا الگ راستہ چننے کا مشورہ دوں گی۔ میرے انتظار میں مت رہنا، تم میں ایسا کچھ نہیں ہے جو مجھے تمہاری طرف مائل کرسکے۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔

"ازابیلا!!" وارلڈ کی سخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کا چہرہ ضبط کے مارے لال پڑنے لگا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرکے واپس مارک کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تمہارا اپنا بھائی تم سے نفرت کرتا ہے۔ تم اسے اپنی ماں کے قاتل لگتے ہو، ایملی کا خون تمہارے ہاتھوں پر لگا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں موت کے منہ سے واپس آئی ہوں۔

تمہارا بھائی تمہاری نفرت میں میری جان لینے والا تھا کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری محبت جو ہزاروں لوگوں کو مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دے!!" وہ سختی سے مٹھیاں بھینچے بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں مارک کے لیے بے پناہ نفرت تھی۔ وارلڈ اپنی جگہ سُن بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور مارک، اس کا چہرہ غصے سے لال پڑنے لگا تھا۔ جسم کا سارا خون جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

"تم مجھے ایسے ٹھکرا نہیں سکتیں ازابیلا"!

"اب تم میرے باپ کی موجودگی میں مجھے دھمکی بھی دو گے؟ اپنی بے مول محبت کی خاطر اتنا گرو گے؟" وہ دائیں ابرو اٹھائے طنزیہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ مارک کو اپنے اردگرد دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

"تم غلط کر رہی ہو"!

"درست تو تم نے بھی نہیں کیا۔ اب مزید میری زندگی میں مشکلات مت پیدا کرنا کہ مجھے تم سے نفرت ہونے لگے۔" اس نے جھک کر میز سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا تھا۔ ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر اس کے قریب سے گزر کر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

"میں اسے اس قابل نہیں رہنے دوں گا کہ تم اسے پا سکو۔" اس کی سرد سی آواز اسے ٹھہرنے پر مجبور کر گئی تھی۔ مارک نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "اگر میں قاتل ہوں تو ایک اور قتل کا اضافہ کرنے میں ذرا جھجھک کا شکار نہیں ہونگا۔"

"مارک!!" وارلڈ کی دھاڑ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اسے نظرانداز کرتا ازابیلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

"مائک نے درست کہا تھا، تم درندے بن چکے ہو۔" نفرت بھرے لہجے میں کہتی قہرآلود نگاہ اس پر ڈال کر وہ لاؤنج

سے نکل آئی۔ جانے کیوں اسے اس تمام عرصے میں وارلڈ کی خاموشی اچھی نہیں لگی تھی۔ یہ شخص اس کا باپ تو نہیں تھا کیونکہ جس باپ کے سائے میں وہ پروان چڑھی تھی وہ کبھی یہ نوبت نہ آنے دیتا اور پھر آج یوں خاموش نہ رہتا۔ وہ کہیں کچھ بھول رہی تھی، کہیں کچھ خلا سا تھا۔ اسے اپنے دل پر بوجھ سا گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل نکالا۔ چند پل لب دانتوں میں دبائے موبائل کی روشن اسکرین پر نگاہیں ٹکائے رکھیں پھر ایک پیغام لکھنے لگی۔

"جندل، کیا ہم مل سکتے ہیں؟" اس نے پیغام بھیج کر موبائل رکھا پھر گہری سانس لی۔ اسے اب فیصلہ لے لینا چاہیے تھا۔ اب بس آر یا پار۔

☆☆☆

"میں اسے پکڑ چکا تھا مگر وہ لڑکا جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔ میرا شکار لے گیا وہ پھر کچھ دیر بعد ایک ایڈریس بھیجا جہاں دلال نامی آدمی کے خلاف کوئی ویڈیو موجود تھی۔ وہاں گیا تو اس شخص کو مار دیا گیا تھا اور ویڈیو اٹھالی گئی تھی۔ البتہ، سنگھار میز کے شیشے پر خون سے کچھ لکھا تھا۔ یہ دیکھو۔" اس نے موبائل کی اسکرین دونوں کے سامنے کی۔ تصویر میں خون سے ہسپانوی زبان میں دلال لکھا تھا۔ وہ دونوں لب دانتوں میں دبا گئے۔

"دلال لکھا ہے۔ اور کچھ قابلِ توجہ جو تم نے دیکھا ہو؟" خیام کے سوال پر جندل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چائے کا کپ اٹھالیا۔ اسے ویسے بھی اس لڑکے پر غصہ آرہا تھا جو جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔

"یہ بات تھی تو تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ کچھ اندازہ ہے تم نے مجھے کتنا شکی کر دیا تھا؟" زیاد اس پر بگڑا تھا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے جندل نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔ خیام مزے سے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گیا۔ اسے اب دیکھنے کو کچھ بہت کچھ ملنے والا تھا۔ جندل چائے کا کپ پٹختا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں ذرا شرم نہیں آئی مجھ پر شک کرتے ہوئے؟" اس نے آگے بڑھ کر اس کے جبڑے پر مکا رسید کیا تھا۔ زیاد کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ جو کام اس نے کیا تھا، اس پر وہ ایسے ہی رد عمل کی امید کرتا تھا۔

"غلطی تمہاری ہے۔ تمہیں جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا!!" وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ جندل نے دانت پیس کر اسے دیکھا پھر ایک اور مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ زیاد نے گھور کر اسے دیکھا اور جواباً اس کی گردن دبوچی تھی۔

"تمہارے ساتھ ویسے بھی بہت سے حساب باقی ہیں۔ آج سارے حساب چکاتا ہوں۔" اس کی گردن پر اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ جندل نے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے اس کے سینے پر لات رسید کی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ جندل نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بنا اگلا مکا اس کے پیٹ پر مارنا چاہا۔ زیاد نے اس کا وار ضائع کرتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر مروڑتے ہوئے اس کے پیٹ پر لات رسید کی تھی۔

صرف چند پل مزید اور لاؤنج ان کے لیے میدانِ جنگ بن چکا تھا۔ صوفوں پر رکھے کشن زمین بوس ہو چکے تھے۔ میز پر رکھی چیزیں ان سے ٹکرا کر اب ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ جندل کے گال پر زخم آیا تھا جبکہ زیاد کی پیشانی پر خون کے قطرے چمک رہے تھے۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھے خیام کے اطمینان میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔

"تم اس خبیث کو روک نہیں سکتے؟" زیاد نے مکا کھانے کے بعد اپنے جبڑے کو سہلاتے ہوئے خیام کو گھورا تھا۔

"تم اس کی طرفداری نہیں کرو گے۔ مت بھولو تمہاری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے۔" اس کی دلیل کافی بھاری تھی۔ خیام نے زیاد کو دیکھ کر کندھے اچکا دیے۔ اسی اثناء میں سعاد لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ لاؤنج کا منظر دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رکی تھی۔

"یا خدا تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ عجلت میں جندل کے قریب آئی تھی۔ ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھا کر گردن اور

گال پر آئے زخم کو دیکھا تھا۔

"آپ کے شوہر نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔" اس کے طنزیہ کہنے پر سعاد نے مڑ کر زیاد کو گھورا تھا۔

"کچھ تو لحاظ کیا کرو۔ چھوٹا ہے وہ۔" اسے شرم دلانا چاہی تھی۔

"شروعات اس نے کی تھی۔" زیاد نے منہ بسور کر کہا تھا۔

"استاد جی، آپ ہی انہیں روک لیتے۔" وہ اب خیام کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جندل کہتا ہے میری رگوں میں اس کا خون دوڑ رہا ہے اور میں خون کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا!" دوٹوک انداز میں کہا گیا۔ وہ اس معصومیت کو دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا کرتے ہو تم زیاد؟ بے چارے کی گردن پر گہرا زخم لگا ہے۔" وہ ٹشو سے جندل کی گردن پر لگے خون کو صاف کرتے ہوئے اسے سنا رہی تھی۔

"میری بھی پیشانی پر زخم آیا ہے لیکن تمہیں بس اپنے بھائی کی پروا ہے۔" وہ خفا ہوا تھا۔

"ہاں کیونکہ وہ چھوٹا ہے۔ اور نہیں تو یہی دیکھ لیتے کہ تمہاری بیوی کا چھوٹا بھائی ہے یہ!!" اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔

"تم میری بیوی ہو کر اس کی حمایت نہیں کر سکتیں!!" وہ تلملایا تھا۔

"وہ میری بہن ہیں۔ تم اپنی چونچ بند رکھو ناکام شاعر!" جندل نے دوبدو جواب دیا تھا۔

"تم کچھ کہنے آئی تھیں سعاد؟" دونوں نے چونک کر خیام کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔

"ہاں۔ اوپر چلیں مجھے کچھ دکھانا ہے آپ کو۔" اس نے ٹشو ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے جواب دیا تھا۔ خیام اٹھ کھڑا ہوا۔ سعاد زیاد کو گھوری سے نواز کر آگے بڑھ گئی۔ خیام نے بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

"وہ تم دونوں کی بیوی اور بہن بعد میں پہلے میری شاگردہ ہے!!" جاتے جاتے وہ انہیں حقیقت بتانا نہیں بھولا تھا۔ وہ دونوں دانت پیس کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

"آپ نے جب سرور بند کروایا تھا تب ڈیٹا مکمل ٹرانسفر ہونے میں صرف چند سیکنڈز باقی تھے۔ مکمل تو نہیں البتہ کچھ ڈیٹا تک رسائی حاصل کرنے میں ہم کامیاب ہوئے ہیں۔ بدر اور میں نے وہ ڈیٹا کھنگال لیا ہے اور جو کچھ اہم لگا وہ الگ کر دیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے یہ ویڈیوز دیکھیں۔ انہیں بہت زیادہ سیکیورٹی میں رکھا گیا ہے۔" وہ اسے تفصیل بتا کر کی بورڈ پر جھکی۔ اسی اثناء میں اس کے برابر میں کھڑے خیام کا فون بج اٹھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھا۔

"میں آتا ہوں، ایک منٹ۔" موبائل کان سے لگاتا وہ باہر نکل گیا۔ سعاد نے گہری سانس لی۔ بدر نے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا۔

"جب تک وہ آئیں اب۔۔" اسے انتظار سے کوفت ہوئی تھی تبھی وہ ویڈیوز چلالیں۔ بدر بھی اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دونوں اب مصروف سے انداز میں اسکرین پر جھکے تھے۔

وہ موبائل کان سے لگائے کمرے سے باہر کھڑا تھا۔ کال کمپنی کے ایمپلائے کی تھی۔ اسے ابھی بمشکل دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ چھناکے سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا اور اگلے ہی لمحے موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ وہ اسے کچھ دکھانا چاہتی تھی، وہ ان ویڈیوز تک پہنچ چکی تھی!! اس کی نگاہیں زینوں کی طرف اٹھی تھیں۔ زینے چڑھتا زیاد اسے یوں بت بنے کھڑا دیکھ کر آخری زینے پر رک گیا۔ خیام کی وہ خوفزدہ سی نگاہیں اسے ٹھٹھکنے پر مجبور

کر گئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔

کمرے میں آتے ہی اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ سامنے فرش پر جگہ جگہ کانچ کے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میز کے پاس وہ کھڑی تھی۔ قدموں میں خون گر رہا تھا۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ زخمی کر چکی تھی۔ آنکھوں میں حیرت و بے یقینی تھی۔ اس کا دل رکنے لگا تھا۔ سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نمی پگھلنے لگی تھی۔ زیاد کی نگاہیں اس کے عقب میں اسکرین پر چلتی ویڈیوز پر ٹکیں۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ وہ ویڈیوز بند کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اسکرین تک پہنچنے سے پہلے ہی سعاد کا سر چکرایا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

بے دھیانی میں کمرے میں داخل ہوتا جندل یہ منظر دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا تھا۔ ہوش و حواس سے بے گانہ سعاد اور فرش پر گرتا خون، زیاد کا سفید پڑتا چہرہ جیسے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس کی نگاہیں ان کے عقب میں اسکرین پر ٹکیں۔ اسے لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ خیام نے جلدی سے آکر سارا سسٹم بند کر دیا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے تھے۔

ان سے فاصلے پر کھڑا ابدر سانس روکے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ منظر جو اس نے دو منٹ سے بھی کم عرصے میں دیکھے تھے، اس کی ٹانگوں سے جان نکالنے کے لیے کافی تھے۔ آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔ اس نے مضبوطی سے کرسی کو پکڑا تھا۔ اسے سانس لینا محال لگا تھا۔ وہ سانس نہیں لے پایا تھا۔

☆☆☆

اندھیر راہداری کے سرے سے ایک ہیولا نمودار ہوا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ راہداری میں چھائی مقدس خاموشی پر گراں گزر رہی تھی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا دروازہ کھول کر اندر

آ گیا۔ سامنے ہی ڈیوڈ کا بھائی کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر دو لڑکے ہتھیاروں سے لیس کھڑے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک شخص کیمرا کے ساتھ کھڑا ویڈیو بنانے کے لیے مکمل تیار تھا۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اسے دستانے پیش کیے۔ اس نے دستانے ہاتھوں پر چڑھائے پھر اس لڑکے کے پیچھے کھڑا ہوا۔ اس کے اشارے پر اس لڑکے پر پانی پھینکا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

خوفزدہ سی نظروں سے اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ ان آدمیوں کے ہاتھوں میں پستولیں دیکھ کر اس کا وجود خوف سے کانپنے لگا تھا۔ آواز بیٹھ گئی تھی، الفاظ مر گئے تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھرنے لگی تھیں۔

"شروع کرو۔" اس نے اشارہ دیا۔ ویڈیو ریکارڈ ہونا شروع ہو گئی۔ ایک آدمی آگے آیا اور ہاتھ میں پکڑی پستول کی نال اس لڑکے کے سر پر رکھی۔

"اس لڑکے کو جانتے ہو ڈیوڈ؟ یہ تمہارا بھائی ہے، تمہارا سگا بھائی جسے زمانے کے عتاب سے بچانے کی خاطر تم نے اس کی شناخت چھین کر اسے سب سے چھپا دیا تھا لیکن ہم نے اسے ڈھونڈ لیا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس لڑکے کے شانوں پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ویڈیو میں صرف اس کے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ "تمہاری طرف ہمارا بہت سا حساب ہے اور اب یہ حساب چکتا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تمہاری غداری کی سزا تمہارا بھائی کاٹے گا۔ تمہارا قرض یہ اپنے خون سے چکائے گا۔" وہ لڑکا تیزی سے نفی میں سر ہلانے لگا تھا۔ آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہنے لگے تھے۔

"بھائی مجھے بچالیں، بھائی یہ مجھے مار دیں گے۔" وہ تڑپ رہا تھا، بلک رہا تھا۔ اس نے اشارہ دیا تھا اور اگلے ہی لمحے ٹریگر پر زور دیا گیا۔ پستول سے نکلتی گولی سیدھا اس کے سر میں لگی۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ خون کی ایک لکیر اس کی پیشانی سے نیچے جانے لگی۔ وہ اپنے دستانے اتار کر ایک طرف پھینکتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے وہ

بے جان وجود دھم سے نیچے گرا تھا۔ خون تیزی سے فرش پر پھیلنے لگا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ راہداری میں چلتے ہوئے اس نے اپنی گردن دائیں بائیں ہلائی پھر اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

☆☆☆

"ماموں، مجھے بابا سے ملنا ہے۔" اس نے نم آنکھوں سے سر اٹھا کر عالیان کو دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر چلتے عالیان کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ اس نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر پنجوں کے بل نیچے بیٹھا۔ آرام سے اس کے ٹھنڈے پڑتے گالوں کو رگڑا۔

"رو کیوں رہے ہو یار؟ بہادر بنو، بہادر لوگ زمانے کی بے رحمی پر رونے کے بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔" وہ اس کے گال سہلاتے ہوئے نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ایک آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر گال پر لڑھک گیا۔ عالیان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"زیادہ درد ہو رہا ہے؟" اس نے تیزی سے سر اثبات میں ہلایا۔ "رونا چاہتے ہو؟" عالیان کے سوال پر اس کا سر ایک بار پھر اثبات میں ہلا تھا۔ "بہت سارا؟" اب کی بار وہ رو دیا تھا۔ عالیان نے آگے بڑھ کر اسے خود میں بھینچا تھا۔ وہ اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سے اس کی پشت سہلا رہا تھا۔ اسے کھل کر رونے کا موقع فراہم کیا تھا۔ دل میں جمع غبار تھا جو آنسوؤں کی صورت نکل رہا تھا۔

کافی دیر وہ یونہی روتا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو تھمنے لگے تھے۔ سسکیاں دھیمی ہوتی گئیں۔ عالیان کو شبہ ہوا کہ وہ سو گیا ہے۔ اس نے آرام سے اسے خود سے الگ کیا۔ مسکرا کر اسے دیکھا جو سونے کی تیاریوں میں تھا۔

"نالائق لڑکے، گھر جا کر سونا۔ اور سنو میری بات، گھر جا کر رونا مت۔" اس کے بالوں کو اس کے ماتھے پر بکھیرتے ہوئے ہدایات جاری کی گئیں۔ "اپنے باپ کے سامنے بھی نہیں۔ اور ماں کے سامنے تو بالکل نہیں۔ سعاد کے

سامنے تم رونا ویسے بھی نہیں چاہو گے، وہ تمہیں کندھا پیش کرنے کے بجائے مزید رلائے گی۔ اسی لیے بس اب آنسو نہ دیکھوں تمہاری آنکھوں میں۔ گھر جا کر آرام سے سکون سے سو جانا۔ کسی کو کچھ مت بتانا باقی میں دیکھ لوں گا۔ ٹھیک ہے؟" اس نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"بابا کب آئیں گے؟"

"بہت جلد ان شاء اللہ۔ تم دعا کرنا ان کے لیے، اور میرے لیے بھی۔ ہم ایک شخص کو زندہ ڈھونڈنے میں کامیاب ٹھہرے ہیں جو دشمن جہاز میں تھا۔ مائیکل نام ہے غالباً، وہ جیسے ہی ہوش میں آئے گا ہم اس سے بہت کچھ معلوم کر لیں گے جندل۔ ہم آغا جان کا انتقام لیں گے۔" وہ جواباً سر کو جنبش دیتا مسکرا دیا۔ عالیان اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا ہاتھ اس کے آگے بڑھایا۔ جندل نے پر سوچ نگاہوں سے اس کے ہاتھ کو دیکھا پھر سر نفی میں ہلایا۔

"تھک گیا ہوں میں۔ کندھے پر بٹھائیں مجھے۔" اس نے منہ بسور کر کہا تھا۔ عالیان نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا پھر اس کی لال ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر جھک کر اسے اٹھا لیا۔ وہ مزے اسے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کر گیا۔

"بات سنو تم، ابھی رو رہے تھے تبھی تمہارے لاڈ اٹھا رہا ہوں۔ چراغ اٹھا کر بھی ڈھونڈو تو ایسا ماموں کہیں نہیں ملے گا۔ جو نہ صرف ماموں ہے پر کہیں کا لگتا لگاتا چاچو بھی ہے۔" وہ ناک سکیڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مجھے آپ جیسا ماموں چاہیے بھی نہیں۔ میرے لیے بس آپ کافی ہیں۔" وہ مسکرا دیا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ اس کے کندھے پر سر رکھے سو چکا تھا۔ اسے پشت سے اتار کر بیڈ پر لٹاتے ہوئے اس نے نگاہیں ترچھی کر کے بیڈ کے سرہانے پر کھڑی سعاد کو دیکھا۔

"آغا جان کی موت کی خبر لایا ہے یہ اور اتنے مزے سے سو رہا ہے؟" وہ روتے ہوئے بھی غصے میں تھی۔ عالیان

اسے دیکھ کر رہ گیا۔

یہ وہی رات تھی جب جندل کی آنکھ سانس نہ آنے کی وجہ سے کھلی تھی۔ اس نے اپنے گھر کو آگ کی نذر پایا تھا۔ سعاد اس کا ہاتھ پکڑے اسے دوسرے کمرے میں لائی تھی۔ لوہے کی بھاری چیز اٹھا کر کھڑکی پر ماری جس سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ نیچے لوگ ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اس نے جندل کو پہلے زغند بھرنے کا کہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی تھی اور پھر خود کو آگ سے نکل کر ایک نرم ملائم گدے پر پایا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے سعاد کو دیکھا تھا جو پتھریلی نگاہوں سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے چھلانگ نہیں لگائی تھی۔

"آپی!!" وہ چلایا تھا۔ سعاد نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور پھر ایک نگاہ آگ کی نذر ہوتے اپنے آشیانے پر ڈالی۔ اس کا بھائی لے جایا جا چکا تھا، جندل نیچے اس کا منتظر تھا۔ جس باپ کے انتظار میں وہ آج رات جاگتی رہی تھی اس باپ کی آغوش کی گرمی محسوس کرنے سے پہلے ہی موت ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ اس کی ماں بھی اس کے باپ کے ساتھ آگ کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے کئی آنسو بہہ نکلے۔ اگلے ہی پل اس نے خود کو گرتے محسوس کیا تھا۔ اس رات کے سروائیور وہ اور جندل تھے۔ دحیہ کی لاش نہیں ملی تھی البتہ اس کی چند چیزیں اور خون کا سیمپل ملا تھا جس سے انہیں یقین تھا کہ وہ بھی وہیں تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کبھی نہ کبھی واپس لوٹ آتا، جبکہ وہ نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

اسے لگا تھا اس کا دل درد سے پھٹ جائے گا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے آشیانے کو جلتے دیکھا تھا۔ اس کی اولاد کو، اس کے خاندان کو ختم کر دیا گیا تھا۔ بے بسی ہی بے بسی تھی۔ شراب کے نشے میں دھت بحری قزاقوں کے

قہقہے اس کے کانوں میں گرم سیسے کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ کوئی اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے؟ انسان اتنا کیسے گر سکتا ہے؟ وہ معاویہ، عالیان اور سنان کو بمشکل راضی کر کے یہاں جندل سے ملنے آیا تھا مگر اس سے پہلے ہی اسے قید کر لیا گیا تھا۔ ان کا دشمن ان سے ہمیشہ ایک قدم آگے تھا۔ وہ رات اس نے یک ٹک اپنے بھسم ہو چکے گھر کو دیکھتے ہوئے کاٹی تھی۔ اگلے دن صبح ہی وہ اس کے سر پر کھڑے تھے۔

"تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟" کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اسے اٹھا کر کمرے کے وسط میں باندھ دیا گیا۔ طرح طرح کے تشدد کیے گئے۔ بھاری مضبوط ڈنڈا جب اس کے پیٹ پر پڑتا تھا تو اسے اپنی آنتیں باہر نکلتیں محسوس ہوتی تھیں۔ درد سے پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ جسم خون آلود ہو گیا تھا۔ ناک اور منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ وہ اس کا ضبط آزماتے رہے تھے۔ اگلے دو دنوں تک اسے ظلم و جبر کے وہ چہرے دکھائے گئے تھے جنہیں دیکھ کر روح کانپ اٹھے، وہ ساتھ ساتھ ہر لمحے کو رکارڈ بھی کرتے رہے تھے۔ شاید دنیا کو اپنے کارنامے دکھانے تھے یا آنے والے نئے درندوں اور وحشیوں کو ظلم و جبر کے پرانے آزمودہ طریقوں سے آگاہ کرنا مقصود تھا۔

دو دن بعد اس شام جب وہ زخموں سے چور ہو گیا۔ نڈھال ہو گیا، جسم میں جان نہ رہی۔ تو بہت آرام سے اسے زندگی سے رہائی دے دی گئی۔ اسے موت کی طرف دھکیل دیا گیا۔ خنجر سے اس کی شاہ رگ کاٹتے ہوئے اس ظالم کے ہاتھ لمحہ بھر کو نہیں کانپے تھے۔

کون کہتا ہے مجاہدوں کی موت دردناک نہیں ہوتی؟ یہ حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے مجاہد ہی تو ہوتے ہیں جن کے جگر چبائے جاتے ہیں۔ یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے مرد ہی ہوتے ہیں جن کی لاشوں کو کئی کئی دنوں تک سولی پر لٹکایا جاتا ہے۔ اسلام کے بہادر فرزند ہی تو ہوتے ہیں جن کے سروں کو نیزوں پر لایا جاتا ہے۔ ان کی موت ایسی ہی

ہوتی ہے، بم دھماکوں میں گوشت کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں کہ لاش کو جوڑنا ناممکن ہو جائے۔ یہی تو ہوتے ہیں جو جسم پر ہزاروں گھاؤ لیے رب کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں۔ تصور تو کرو یہ کٹے پھٹے جسموں والے جب اپنا ایک ایک زخم رب کو دکھائیں گے اور کہیں گے بس تیری ہی رضا مقصود تھی اللہ! تب یہ رب کی بارگاہ میں سرخرو ہونگے۔ ہاں تب ان کے ساتھ کی گئی زیادتیاں، ان کے ساتھ ہوا ظلم انہیں جنت میں لے جائے گا۔ وہ لمحات تو پھر قابلِ رشک ہیں جب خدا مسکرا کر ان کے جسم پر لگے ہر زخم کو دیکھے اور کہے، یہ میرا بندہ ہے۔ آج اس کے لیے عافیت ہے۔

☆☆☆

اس نے اپنے ہاتھ کی پشت اس کی پیشانی پر رکھی۔ حرارت کا احساس ہوا تو لب دانتوں میں دباتے ہوئے اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے سر بیڈ کراؤن پر ٹکایا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ جو ہر چیز سے بے خبر آنکھیں موندے سوئی ہوئی تھی۔ دو گھنٹے بخار میں تپنے کے بعد اب کچھ آرام آیا تھا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ بہت تکلیف میں رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے ہنستی مسکراتی اچھی لگتی تھی۔ اس کے تمام دکھوں کو سمیٹنا اس کی اولین ترجیح تھی مگر، شاید کچھ بوجھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں چاہ کر بھی بانٹا نہیں جا سکتا۔ وہ بھی کچھ ایسے بوجھ اٹھائے ہوئے تھی جنہیں وہ چاہ کر بھی اتار نہیں سکتا تھا۔

آرام سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا جب اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے پلکیں جدا کی تھیں۔ وہ فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے چند پل کمرے کی چھت کو گھورتی رہی۔ وہ بے چین ہوا۔ اس نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ وہ نگاہوں میں اس کے لیے بہت

سی فکر سموئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ اس نے بے اختیار سکون کا سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں میچی تھیں۔

''ڈرا دیا تھا یار تم نے۔'' وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ اس نے خفیف سا مسکراتے ہوئے اپنے پٹی میں بندھے ہاتھ سے اس کا گود میں رکھا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ بغور اسے دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی مگر آنکھوں میں عجیب سا خالی پن تھا۔ آنسوؤں کی دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی جسے وہ چھپانے کی کوششوں میں تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت سارا، میں بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط ہوئی تھی۔ ''میں سو جاؤں؟ کیا تم میرے لیے خیام کو مجھ تک پہنچنے سے روک سکتے ہو؟'' اس نے شرارت سے پوچھا تھا۔ وہ بے اختیار ہلکا سا ہنس دیا تھا۔

''بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ میں تمہارے جاگنے تک تمہارے لیے پہرہ دے سکتا ہوں۔'' اس نے نرمی سے اس کا گال سہلایا تھا۔ پھر وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتی اسے روک گئی۔ وہ واپس وہیں بیٹھ گیا۔

''کہیں مت جاؤ، پلیز۔'' اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ڈر چکی تھی۔ اپنوں کو کھونے سے ڈری ہوئی تھی۔

''نہیں جاتا، سو جاؤ۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''تمہارا ہاتھ پکڑ کر؟'' وہ اجازت مانگ رہی تھی۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔

''تمہارا ہی ہوں، سینیورا!'' وہ کھل کر مسکرائی۔ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ کھسک کر اس کے قریب ہوئی، اپنا سر اس کی گود میں رکھا پھر اس کا ہاتھ اپنے دونوں میں ہاتھوں میں لیتی آنکھیں موند گئی۔ وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اسے اپنے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک آنسو اس کی بند

آنکھوں سے بہتا گال سے لڑھک کر اس کے ہاتھ پر گر رہا تھا۔ اس نے آرام سے اس کے گال پر گرتے آنسو کو چنا تھا۔

اس کے بالکل قریب اس کے ہاتھ تھام کر خاموش آنسو بہاتی وہ بہت جلد نیند کی وادیوں میں چلی گئی تھی۔ اس کی گہری نیند کے متعلق تسلی کر کے اس نے آرام سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑوایا۔ اس کا سر تکیے پر رکھا، کمفرٹر درست کیا اور لائٹ بند کر کے باہر آ گیا۔ دل پر سکون سا ہو گیا تھا جیسے ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑ گئی ہو۔

وہ زینوں کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ نگاہ کمرے کے کھلے دروازے پر ٹکی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ وہ اندر آ گیا۔ بدر سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے آنے پر فوراً کھڑا ہوا۔

"تم یہاں؟ گھر نہیں گئے؟" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ بھی واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔ کشن گود میں رکھ لیا۔

"نہیں۔ آپی کا کچھ ادھورا کام مکمل کر رہا تھا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟" اس کے لہجے میں احتیاط تھی۔ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا گیا۔

"تمہاری آپی کا گھر ہے۔ بے فکر رہو لڑکے۔" بدر اسے دیکھ کر رہ گیا۔ حلق جانے کیوں خشک پڑنے لگا تھا۔

"کیسی ہیں وہ؟" اس نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

"الحمدللہ، ٹھیک ہے۔ بخار بھی کم ہو گیا ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ زیاد نے میز سے پانی کی بوتل اٹھائی۔

"بھائی۔۔" اس کی پکار پر بوتل کا ڈھکن کھولتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے ٹھہر کر بدر کو دیکھا۔ "اس ویڈیو میں وہ کون تھا؟"

"سعاد کے بابا۔" اسے لگا تھا کسی نے اس کا دل مٹھی میں پکڑ کر نچوڑ لیا ہو۔ وہ سر کو جنبش دیتا پیچھے ہوا تھا۔ اچانک

سے گھٹن ہونے لگی تھی۔

"خیام سر ہے اور جندل بس جندل۔ مجھے بھائی کیوں کہا؟" بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ لب بے اختیار دانتوں تلے دبائے۔

"سعاد کہتی ہیں مجھے آپی کہا کرو۔ آپی کے شوہر ہونے کے ناطے آپ بھائی ہوئے ناں۔" اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

"نام لے لیا کرو بدر۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آئندہ مجھے بھائی مت کہنا۔" بدر کی دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ وہ سنجیدہ نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ لفظ اسے اس کی بہن کی یاد دلاتا تھا۔ اسے بھائی کہنے کا حق بس وہی رکھتی تھی۔

☆☆☆

بدر نے اپنا کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھا۔ اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور کوٹ کی جیب سے یو ایس بی نکال کر اس کے ساتھ کنیکٹ کی۔ نگاہیں اسکرین پر ٹکیں۔ روفی کمرے میں آیا، اس کے قدموں میں بیٹھ کر منتظر نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ انجان رہا۔ یک ٹک اسکرین کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی دبیز تہہ بچھتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ ویڈیوز سالوں پہلے بنائی گئی تھیں۔ یہ ایک بوسیدہ کمرہ تھا جس کے وسط میں دحیہ کو باندھا ہوا تھا۔ اس کے پیٹ پر ایک شخص ڈنڈے مار رہا تھا۔ چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ حالت بہت خراب تھی۔ وہ خون کی قے کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے بھاری قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ پھر ایک شخص آگے آیا تھا۔ اپنی پستول اس پر تانی اور یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ اس میں ابھی بھی جان باقی رہی تو ایک اور آدمی پیچھے سے آیا۔ وہ یقیناً ان کا کمانڈر تھا جس کے

بس ہاتھ نظر آرہے تھے۔ اس نے بنا کسی تردد کے بہت آرام سے اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا تھا۔ بدر نے سختی سے آنکھیں میچی تھیں۔ آنسو زارو قطار آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ سعاد کے دعوے کے مطابق یہ شخص اس کا باپ تھا۔ اس کے سامنے بے دردی سے مارا جانا والا یہ مجاہد، اس کا سگا باپ تھا۔ اسے اپنے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔

اگلی ویڈیو میں کئی قیدی تھے۔ قدموں میں بیڑیاں تھیں اور وہ بھاگ رہے تھے۔ ان میں سب سے واضع چہرہ عالیان یوسف زئی کا تھا۔ آن کی آن میں ان پر کئی پستولیں تانی گئیں اور فائر کر دیے گئے۔ اپنی جان کے لیے بھاگتے وہ لوگ اسی جگہ ساکت ہوگئے۔ قدم زمین پر جم گئے۔ خون فوارے کی صورت پھوٹ گیا۔ ان بے جان جسموں کو چھلنی کر دیا گیا۔ اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ اس نے عالیان کو پورے قد کے ساتھ گرتے دیکھا تھا۔ وہ چہرہ جھکائے بلک بلک کر رو دیا تھا۔ آنسو آنکھوں سے گرتے داڑھی میں جذب ہونے لگے تھے۔ ناک لال پڑنے لگی تھی۔ ویڈیو زہنوز چل رہی تھیں۔ اس کے قدموں میں بیٹھا روفی اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ اس کے رونے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگا تھا اس کا دل درد سے پھٹ جائے گا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا اس درد کو جس کا سامنا جب سعاد نے کیا تو ہوش وحواس کھو بیٹھی اور جندل، وہ پتھریلا چہرہ لیے وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

”تم نے کہا وہ ٹھیک ہے تو پھر مسئلہ کہاں ہے؟ ملنے دو مجھے اس سے۔“ وہ جھنجھلایا تھا۔ دروازے پر کمر ٹکا کر کھڑے زیاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

”وہ سو رہی ہے۔ آواز ہلکی رکھو اپنی۔“ خیام نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

”مجھے بہت ضروری کام ہے۔ ویڈیوز کے علاوہ اس نے جو ڈیٹا حاصل کیا ہے ہمیں اسے دیکھنا ہے۔ اسے جگادو وہ بعد میں نیند پوری کرلے گی۔“ وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”اپنی شکل گم کرو۔ میں تمہیں اپنی بیوی کی نیند خراب کرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں اس کا تھوڑا سا احساس کرنا چاہیے۔ وہ بخار میں تپتی رہی ہے۔“ اس نے اٹل فیصلہ سنایا تھا۔

”لیکن اب وہ ٹھیک ہے۔“

”نیچے کا راستہ وہ رہا۔“ اس نے ہاتھ سے زینوں کی طرف اشارہ کیا۔ خیام نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔

”دیکھ لوں گا تمہیں بھی۔“ اسے گھوری سے نوازتا وہ آگے بڑھا پھر کچھ یاد آنے پر رک گیا۔ پلٹ کر کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ ”اٹھ جاؤ سعاد، صبح ہو گئی ہے!!“ وہ زور سے چلایا تھا۔ زیاد نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ وہ ”ہلکا مت لینا مجھے“ والی نظروں سے اسے دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر نہیں تھی۔ اس نے متلاشی نگاہیں پورے کمرے میں دوڑائیں۔ اسی اثناء میں وہ ڈریسنگ روم سے نکلی تھی۔ سیاہ رنگ کے گاؤن پر گلابی حجاب اوڑھے، کندھے پر پرس لٹکائے کہیں جانے کے لیے مکمل تیار۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”جندل کے پاس جانا ہے۔“ اطلاع دیتے ہوئے وہ سنگھار میز کے قد آور شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کیوں؟“ وہ اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ سعاد نے رک کر اسے دیکھا پھر پلٹی۔

”شاید اسے میری ضرورت ہو۔ ہاں وہ بھائی ہے لیکن میں بڑی بہن ہوں۔ رشتوں کے معاملے میں وہ مجھ سے چھوٹا ہے اور اسی لیے حساس ہے۔ مجھے ایک بڑی بہن کی طرح اس کے پاس جانا چاہیے اور اس کا درد بانٹنا چاہیے۔“ وہ سمجھداری سے کہہ رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ ”لیکن اگر وہ ہمیشہ کی طرح یہ طوفان بھی اپنے اندر دبا گیا تو میں

اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ خفگی سے کہتی واپس شیشے کی طرف پلٹی۔

"اسے یہ مت کرنے دینا۔ یہ ظلم ہو گا۔" اس نے ہدایت دی تھی۔ وہ سر کو جنبش دے کر نقاب کے لیے پن اٹھانے لگی۔ زیاد نے آگے بڑھ کر پن اس کے ہاتھ سے لی۔ وہ کم فہمی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے آرام سے نقاب سے اس کا چہرہ ڈھک کر پن لگا دی۔ سکون سے اپنی کاروائی کر کے وہ پیچھے ہٹا۔

"اچھی لگتی ہو ایسے۔ میری خواہش پوری کرنے کے لیے بہت شکریہ سینیورا۔" وہ محبت سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے یہ تمہارے لیے نہیں اللہ کے لیے کیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"شاید تبھی تمہارا خیال آ جائے تو سجدے سے اٹھا نہیں جاتا۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گئی تھی۔ صد شکر کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس نے مبہم سا مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما پھر اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ وہ بے اختیار اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی۔ اچھا لگتا تھا اسے یوں اسکا محفوظ محسوس کروانا، اپنے حصار میں رکھنا اور یوں اس کا چاہنا۔ اور پھر چاہے جانے کا احساس کس کو نہیں بھاتا؟

اگلے کچھ لمحات میں وہ اس کے ہمراہ جندل کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ جندل چابی وہیں بھول گیا تھا تبھی انہیں دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نے لاونج میں قدم رکھا تو سفید رنگ کا خرگوش اس کی طرف لپکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔ وہ اس کے پاس ٹھہر کر بغور اسے دیکھنے لگا۔ سعاد نے پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر اس کا سر سہلایا تھا۔ وہ خوشی سے اچھلتا کودتا اندر بھاگ گیا۔ وہ مسکرائی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ قدم آگے بڑھائے۔ جندل کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں کسی کو نہیں پایا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

"وہ گھر نہیں ہے؟" وہ پریشان ہوئی تھی۔

"رکو میں معلوم کرتا ہوں۔" وہ اپنا موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملاتا باہر نکل گیا۔ وہ چند پل اضطراب کی کیفیت میں

اس کمرے کو دیکھتی رہی۔ اس کا بھائی ایک ماہ سے یہاں رہ رہا تھا۔ یہ کمرہ بالکل بھی اسکی پسند کے مطابق نہیں تھا مگر وہ رہ رہا تھا۔ شاید ان پر اسرار لوگوں کی زندگیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ اپنی پسند ناپسند کو مار دیتے ہیں۔ ہر حال میں جی لیتے ہیں، ہر روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس نے سوچوں کو جھٹک کر گہری سانس لی پھر دروازہ بند کر کے باہر آگئی۔ نگاہ اس کے برابر میں دوسرے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر ٹکی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے۔ قدم بے اختیار اس کمرے کی طرف بڑھے تھے۔

یہ کمرہ جندل کے کمرے کی نسبت بکھرا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں پہلے اسے باہر ملنے والا خرگوش بیڈ کے پاس گاجر سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ بیڈ پر بدر آڑا ترچھا ہو کر لیٹا تھا۔ دایاں بازو آنکھوں پر ٹکایا ہوا تھا۔ اس کی ناک لال ہو رہی تھی اور لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ جاگ رہا تھا، اس کی موجودگی محسوس کر چکا تھا اور باجود اس کے اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ آرام سے آگے آئی تھی۔ چند پل بغور اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ دایاں ہاتھ آرام سے آگے بڑھا۔ ہاتھ کی لرزش واضع ہوئی۔ اس کی انگلیوں کے پوروں نے بدر کے نم بالوں کو چھوا تھا۔ عجیب سا احساس تھا جو اسے جسم میں سر سراتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ آنکھوں میں جمع ہوتے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتی باہر آگئی۔

"خیام کو بھی نہیں معلوم۔ شاید شام تک آجائے۔ اب؟" وہ موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"بس چلیں۔" اس کے جواب پر اس نے سر کو جنبش دی پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بھی اسکی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔

گاڑی سڑک پر ڈال کر اس نے ایک لمحے کے لیے نگاہ سڑک سے ہٹا کر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ گہری اور پر سوچ نگاہوں سے کھڑکی کے پار دیکھنے میں مصروف تھی۔

"آپ کے پاس وقت ہے، سینیورا؟" وہ نگاہوں کا رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں اپنے ٹف سے ٹف شیڈول میں بھی سینیور زیاد کے لیے وقت نکال سکتی ہوں۔" وہ کہہ کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔

وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔

"آئی ایم آنرڈ!" وہ مسکرا کر واپس کھڑکی کے پار نظر آتے مناظر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔

☆☆☆

اس نے بھورے رنگ کی شال اپنے گرد لپیٹی پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سرمئی شام اب گہری ہونے لگی تھی۔ یہ شام اس پر بہت بھاری گزری تھی۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے یونہی اسی حالت میں بینچ پر بیٹھا تھا۔ پتھریلی نظروں سے ایک ہی نکتے کو تکتا، گم سم اور ایک طوفان کو دل میں دبائے۔ اس کا چہرہ ضبط کے مارے لال پڑ رہا تھا اور مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی خود پر قابو نہیں کر پا رہا تھا اور نتیجتاً وہ سختی سے لب بھینچتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک گہری نگاہ اردگرد ڈالی پھر قدم آگے بڑھا دیے۔

اگلے کچھ لمحات میں وہ اس بند فیکٹری کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا تھا۔ بنا چاپ پیدا کیے وہ اندر آیا۔ راہداری کا موڑ مڑ کر وہ اس کمرے میں آیا جہاں مائک اور وہ ہیکر کرسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

دروازہ بند ہو گیا۔ وہ ہیکر گہری نیند میں تھا جبکہ مائک اسے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ اس نے آرام سے اپنی شال اتار کر ایک

طرف پھینکی۔ مائنک کی آنکھوں میں خوف ابھرا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سختی اسے کسی آگ کی طرح لگ رہی تھی جس سے آج فرار ناممکن تھی۔ وہ دھیرے سے اس کے پیچھے آیا اور اس کے کرسی سے بندھے ہاتھ کھولنے لگا۔ اس کے ہاتھ کھول کر اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا۔

"دلال کون ہے؟!" اس نے بھاری آواز میں پوچھا تھا۔ اس کی قہر برساتی آنکھوں کو دیکھ کر وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔ جندل نے اگلے ہی لمحے زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کا گریبان پکڑ کر پے در پے کئی مکے اس کے جبڑے پر رسید کیے تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ گال کی جلد پھٹنے کی وجہ سے وہاں سے خون رسنے لگا تھا۔ جندل نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بنا زوردار لات اس کے سینے پر ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا سخت جوتے میں مقید پاؤں اس کی گردن پر رکھا تھا۔

"دلال کون ہے؟" سوال دہرایا گیا تھا۔

"مم۔۔میں نہیں جانتا۔ مجھے نہیں معلوم۔" وہ دھیرے دھیرے اس کی گردن پر اپنا جوتا رگڑ رہا تھا۔ اس کی گردن پر خون کی ننھی بوندیں نمودار ہوئی تھیں۔ درد کے مارے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ عجیب سے شور کی وجہ سے وہ ہیکر بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"وہ بحری قزاق کہاں ہے جس نے نہ صرف میرے گھر کو آگ کی نذر کیا پر بے دردی سے میرے باپ کو بھی مار ڈالا؟!!" وہ چلایا تھا۔ جھٹکے سے اپنا پاؤں اس کی گردن سے ہٹاتے ہوئے اسے زوردار ٹھوکر ماری تھی۔ اس کا سر کرسی کے پاؤں سے ٹکرایا تھا۔ پیشانی سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے جھک کر وہ موٹا ڈنڈا اٹھایا اور اس کے پاس آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بند کمرا مائنک کی چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس کے پیٹ پر پڑتی ضربیں اسے خون کی قے کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اسے اپنی آنتیں نکلتی محسوس ہوئی تھیں۔ آنسو زار و قطار بہنے لگے تھے۔ اس پر عجیب ہی جنون

سوار تھا، وہ بنار کے اس پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔۔" وہ چلایا تھا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا پھر ڈنڈا ایک طرف پھینکا۔ اگلے ہی لمحے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا پھر اس کے بالوں سے اسے پکڑ کر اس کا سر دیوار میں دے مارا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ اس کے بار ہا یہ عمل دہرانے سے اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ اس کا سر دیوار میں مار کر اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے کرتا اس کے جبڑے پر مکا رسید کر چکا تھا۔ اس کے منہ سے خون نکلا تھا۔ گرم سرخ انسانی خون، جندل کی سفید قمیض اس کے خون میں رنگ گئی۔ ہاتھوں کی جلد پھٹ گئی۔ مائک لڑکھڑا کر گرا۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری گئی، اسے اپنی موت یقینی نظر آئی۔

"رحم کرو، مجھے نہیں معلوم۔" وہ اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھا پے در پے اس کے چہرے پر مکے برسا رہا تھا۔ اسے اپنے دانت ٹوٹتے محسوس ہوئے۔ درد سے جسم ٹوٹنے لگا۔ چہرہ خون سے بھر گیا۔ منہ سے تھوک سمیت خون نکل کر گردن پر بہنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔

"دلال کہاں ہے؟" اس کی گردن کے گرد گرفت سخت تھی۔ خون آلود ہاتھوں سے وہ اس کی گردن پر زور دے رہا تھا۔ مائک نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو نوچا تھا۔ اس کی گرفت سختی پکڑتی گئی۔ اسے اپنی آنکھیں نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کی مزاحمت ختم ہونے لگی۔ ہاتھ بے جان ہو کر گر گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ جندل نے جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی۔ نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کپڑے مکمل اس کے خون میں رنگ چکے تھے۔ گردن پر اس کی مزاحمت کے نشانوں سے خون بہہ رہا تھا مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس نے ایک سخت نگاہ خوف سے گنگ بیٹھے ہیکر پر ڈالی پھر میز سے پستول اٹھائی۔ بازو سیدھا کر کے اس کا نشانہ لیا اور پے در پے کئی فائر کیے۔ اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے بھی کپکپاہٹ کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ پستول کی

میگزین خالی کرنے کے بعد اس نے پستول ایک طرف پھینکی اور جھک کر اپنی شال اٹھائی۔

اگلے کچھ لمحات میں وہ شال کو اپنے شانوں پر ڈالتے ہوئے فیکٹری سے نکل رہا تھا۔ عقاب سی آنکھیں جو ذہانت کی آئینہ دار ہوا کرتی تھیں اس وقت ان میں صرف نفرت تھی، صرف نفرت۔

☆☆☆

”مجھے لگا تھا میں سانس نہیں لے پاؤں گی۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ میں بہت سارا رونا چاہتی تھی۔ پھر مجھے لگا مجھے نہیں رونا چاہیے۔ مجھے سانس لینا چاہیے تاکہ میں ان سانسوں کو روک سکوں جو ہر لمحے میں جانے کتنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ مجھے ان کو رلانا ہے۔ حد سے بڑھا ہوا ظلم مظلوم کو مظلوم نہیں رہنے دیتا، یہ اسے ظالم یا اس سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔ رونے والے جب رلانے پر آتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو کی جگہ خون بہتا ہے۔ میں انتقام لینا چاہتی ہوں۔“ مدھم سی آواز میں کہہ کر اس نے وقفہ لیا تھا۔ رات کی ہلکی ہلکی تاریکی میں اس سنسان اور ویران سڑک پر ان دونوں کو اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ گاڑی کے بانٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے تھے۔ اردگرد اونچے اور بڑے گھر تھے جو مکمل روشن تھے لیکن آسمان پر چھایا اندھیرا پھر بھی غالب تھا۔ وہ خاکی لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چہرہ ذرا سا ترچھا کر کے سعاد کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ عجیب سی اداسی کا ڈیرہ تھا۔ وہ بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اس نے نچلے لب کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے اپنا رخ اس کی طرف کیا تھا۔ نظریں جھکاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے تھے۔ اس نے ٹھہر کر اس کے ہاتھوں کو دیکھا پھر نرمی سی انہیں تھام لیا۔

”تم جانتے ہو میں ٹریگر نہیں دبا سکتی۔ کیا تم میرے لیے انتقام لو گے؟ انہوں نے مجھے بہت تکلیف دی ہے۔ مجھ سے میرے اپنوں کو چھینا ہے، مجھے بہت رلایا ہے۔ انہیں دکھانا کہ اپنا کیا سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ انہیں ویسی ہی تکلیف

دینا جیسی انہوں نے مجھے دی۔ تم یہ کرو گے ناں؟ تم میرا انتقام لو گے ناں؟" وہ پر امید نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی پشت کو اپنے انگوٹھوں سے سہلاتے ہوئے وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔

"تم یہ کر بھی سکتیں تب بھی میں تمہیں یہ نہ کرنے دیتا۔ جان لینا بہت تکلیف دہ ہے، میں تمہیں اس تکلیف سے گزرنے نہ دیتا۔ تمہارے لیے میں بہت سے خون اپنے سر لے سکتا ہوں سینیورا۔" اس نے یقین دلایا تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑواتی واپس گاڑی کے بانٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے سوچا ہے میں اب خوش رہنے کی کوشش کروں گی۔ اب میں بالکل نہیں روؤں گی سچ میں۔" زیاد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ نگاہ اس کے چہرے سے ہوتی اس کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ پر ٹکی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھ سمیت کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے کھکھلا کر ہنسی تھی۔ وہ چہرہ موڑ کر اپنی مسکراہٹ چھپا گیا۔

"ایسی حرکتیں کرتے ہو تو مجھے اچھے لگنے لگتے ہو۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

"میں تمہیں ویسے بھی اچھا لگتا ہوں سینیورا۔" اس نے یقین سے کہا تھا۔

"کیا ثبوت ہے؟" اس نے آنکھیں چھوٹی کی تھیں۔

"وہ شال جو میں نے تمہیں اندلس میں دی تھی، وہ تم نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ وہ پی کیپ بھی وہیں رکھی ہے اور رومال بھی۔ اسے میں کیا سمجھوں؟" وہ آنکھوں میں انوکھی چمک لیے اس پر نگاہیں ٹکائے پوچھ رہا تھا۔

"یہی کہ میں ہدیے بہت سنبھال کر رکھتی ہوں۔" سر تان کر کہا گیا۔ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"تم نے مجھے مایوس کیا۔ میں ایسی حرکتیں جاری رکھتا ہوں پھر۔" وہ واپس سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ پر گرفت

مضبوط ہوئی۔ وہ لب دانتوں میں دبا گئی۔ ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ ان کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آیا تھا۔ کسی نے اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب محبت کرنے والے ساتھ ہوں تو شاید کوئی اور خواہش باقی ہی نہیں رہتی۔ الفاظ ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

خاموشی کے اس لمبے دورانیے کو زیاد کے موبائل کی رنگ ٹون نے توڑا۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر اسکرین نظروں کے سامنے کی۔ روشن اسکرین پر ازا کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے پر سوچ نگاہوں سے نام کو دیکھا۔ وہ بھی نام دیکھ چکی تھی اور اب اسے نظر انداز کرنے کی کوششوں میں تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر کال کاٹ دی۔ ان دو سالوں میں اس کی کال اکثر و بیشتر دوسری یا تیسری بیل پر اٹھالی جاتی تھی۔ آج پہلی بار اس نے ازا کی کال کاٹی تھی، اسے امید تھی وہ سمجھ جائے گی۔

اس نے موبائل بند کر کے واپس جیب میں رکھ دیا۔ اس کے برابر میں کھڑی سعاد کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ بہت چھوٹی سی حرکت تھی اور اسے سرشار کر گئی تھی۔ شاید وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت جانتا تھا تبھی انہیں نظر انداز نہیں کرتا تھا۔

”تمہیں کال اٹھانی چاہیے تھی۔ شاید اسے ضروری کام ہو۔“ تھی تو وہ بھی پھر ایک مشرقی بیوی ہی۔

”یہ وقت بس تمہارے لیے، تمہارے ساتھ۔ تم میری ٹاپ پرائیورٹی ہو۔ میں تمہیں ہر لمحہ یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے بہت خاص ہو۔“ وہ خفیف سا مسکرایا۔ وہ بے اختیار ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کی طرف رخ موڑے کھڑا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اس کے عقب میں تھی۔ سر پر پی ٹیک تھی اور چہرے کو ماسک سے ڈھکا تھا۔ وجہ وہ تعاقب کار تھے۔

”اتنی محبت مت کیا کرو۔ اتنی محبت دیتے ہو تو ڈر لگتا ہے۔“

”تزول جبال الراسیات وقلبھم

عن الحب لایخلو ولایتزلزل

مضبوط سے مضبوط پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں، لیکن اہلِ وفا کے دل نہ تو محبت سے خالی ہوتے ہیں، نہ ان میں تزلزل پیدا ہوتا ہے۔

تم سے مجھے بس۔۔۔ محبت ہے۔ بار بار ہو جاتی ہے، پہلے سے بھی زیادہ۔“ وہ نظریں جھکا گئی۔ گال لال پڑنے لگے تھے۔ نقاب کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکا۔ گال تپنے لگے، اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ رخسار پر رکھا تھا۔ دوسرا ہاتھ ہنوز اس کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

”غیور مشرقی لڑکے یہ مت کرو۔“ وہ اس کے آنکھیں میچ کر کہنے پر کھلکھلا کر ہنسا تھا۔ وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے لبوں پر بند مٹھی رکھ کر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی۔

”کیا ہوا؟ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“ اس نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”چپ چپ بالکل چپ۔ سامنے دیکھو تم۔“ حکم صادر کیا گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔ وہ بائیں ہاتھ سے اپنا رخسار رگڑنے لگی۔ زیاد چند پل اس کی حرکتیں دیکھتا رہا پھر اس کی طرف رخ موڑ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے رخساروں پر رکھے تھے۔

”اب ٹھیک ہے؟“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ اس نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”مذاق مت اڑاو۔“ آواز دھیمی ہوگئی۔

”میری یہ مجال۔ تمہیں غصہ آگیا تو کھینچ کر تھپڑ دے مارو گی۔“ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔

”آئی ایم سوری۔ وہ بس اچانک سے تھا۔ مجھے غصہ تھا تم پر۔“ اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"اگلی بار بھی غصہ آئے تو یہی کرنا۔" شرارت سے کہا گیا۔

"زیاد۔۔" وہ منمنائی تھی۔ وہ مسکرایا تھا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں خفگی لیے معصومیت سے اسے دیکھتی وہ اس ناکام شاعر کو شعر یاد دلا گئی تھی۔

"ایک چہرہ ہے جسے دیکھ کے لمحہ بھر کو

دل ٹھہر جاتا ہے میں آپ دھڑک جاتا ہوں۔"

"واللہ۔۔۔" وہ شعر سن کر دھیمی آواز میں کہتی چہرہ موڑ گئی تھی۔ زیاد نے ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ اس کے رخساروں ہٹائے۔ وہ موقع دیکھ کر جلدی سے اپنے ہاتھ سینے پر باندھنے لگی تھی مگر اس سے پہلے ہی وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال چکا تھا۔

"میرے پاس ابھی بھی کچھ وقت ہے۔" مسکراتے ہوئے اسے اطلاع دی گئی۔ اس نے خفا خفا سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"زیاد۔۔" نرمی سی اسے پکارا گیا۔

"کہو سکون میرے۔" وہ شریر ہوا تھا۔

"ہم اندلس چلتے ہیں۔" اس کے طرز تخاطب کو خوبصورتی سے نظر انداز کیا گیا تھا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔ "ہم وہاں کوئی چھوٹا سا ریستوران کھول لیں گے۔ میں شیف بن جاؤں گی تم ویٹر کی خدمات سر انجام دینا۔ چھوٹا سا گھر لے لیں گے ورنہ وہیں ریستوران میں کوئی کمرہ بنوا لیں گے۔" وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔ اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔

"دو وقت کا کھانا کھا لیں گے۔ ہفتے میں ایک بار آؤٹنگ کے نام پر سڑکوں پر آوارہ گردی کریں گے۔" اس نے

آگے کا پلان ترتیب دیا۔

”ہاں۔ کم از کم ہم وہ وقت ساتھ گزاریں گے۔ یہاں میں گننے پر آؤں تو تم ٹک کر ایک گھنٹہ بھی مجھے نہیں دے سکتے۔ مجھے تم سے اتنی ساری باتیں کرنی ہیں مگر نہ تمہارے پاس وقت ہے نہ میرے پاس۔“ وہ سر جھکائے اداسی سے کہہ رہی تھی۔ نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

”لیس السفر

جدائی نہ تو سفر سے ہے

ولا فراق الحب

اور نہ ہی محبوب کے الگ ہونے سے

حتی الموت لیس فراقا

یہاں تک کہ موت بھی جدائی کا ذریعہ نہیں بن سکتی

سنجتمع فی الآخرۃ

عنقریب ہم سب آخرت میں جمع ہونگے

الفراق ھو

جدائی تو یہ ہے

ان یکون احدنا فی الجنہ

ہم میں سے ایک جنت میں جائے

والاخر فی النار

اور دوسرا آگ میں

جدائی یہ نہیں کہ ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہم ساتھ نہیں ہیں۔ جدائی موت کے بعد کی ہے۔ ہجر کی گھڑیاں وہ ہیں جب ہم دو آخرت میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں۔ میں یہ نہیں چاہتا، وہاں مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔" وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے سر کو جنبش دی۔ وہ سمجھ گئی۔

"سعاد۔۔" اسی کے انداز میں اسے پکارا گیا تھا۔

"کہیں۔۔۔ سکون میرے۔۔" اس نے آخری الفاظ بہت دھیمی آواز میں کہے تھے۔ وہ بمشکل سن پایا تھا۔ ٹھہر کر تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر نظریں پھیر گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکایا تھا۔

"ہم یہاں کام مکمل کر کے اندلس چلیں گے، چھٹیوں پر۔"

"اور وہ چھٹیاں کیسی ہونگی؟ کام والی؟" وہ مسکرائی۔

"ہاں ناں۔ عام چھٹیاں تھوڑی مل سکتیں ہیں ہمیں۔"

"ہم ساتھ کام کریں گے۔"

"ساتھ وقت گزاریں گے۔ پھر تمہیں میرے ساتھ جو اتنی ساری باتیں کرنی ہیں، سب کرنا۔ میں گھنٹوں تمہیں سنوں گا۔"

"مجھے نیند آ جائے گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر سونا۔" مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے نظریں اس سے ہٹا کر سامنے دیکھنے لگی۔

"ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔" اس نے اطلاع دی تھی۔

"رات گہری ہو رہی ہے۔"

"گھر چلیں؟ جندل شاید واپس آ گیا ہو؟" اس کے کہنے پر زیاد نے اس کے کندھے سے سر اٹھایا۔

"آؤ۔" اس نے جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے کہا۔ وہ گاڑی کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے گاڑی ان لاک کی۔ وہ دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ گہرا اور تاریک آسمان، ٹھنڈی ہوائیں اور مقدس خاموشی۔ اس نے نگاہوں کا رخ واپس اس کی طرف کیا۔ اس نے ایک عرصے بعد، تاریک رات کے کچھ لمحات بہت سکون سے گزارے تھے۔ بنا کسی کی یاد کے، بنا کسی تڑپ کے۔

☆☆☆

گاڑی سڑک کے کنارے پر روکے وہ یک ٹک موبائل کی تاریک اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی بار اس نے اس کی کال کاٹی تھی۔ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی وہ مصروف تھا۔ وہ بے حد مصروفیت کے باوجود اس کی کال اٹھایا کرتا تھا۔ پھر آج ایسا کیا ہوا تھا؟ وہ پہلے ہی بہت پریشان تھی اور پھر زیاد کا اسے یوں نظر انداز کرنا اسے مزید تکلیف دے گیا تھا۔ وہ واحد تھا جسے وہ اپنا دوست کہتی تھی۔ جو اس کی سنا کرتا تھا، جو اس کی مانتا تھا۔

اس نے بے اختیار لب دانتوں میں دبائے۔ گہری سانس لی پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے گھر کی طرف جانے والے راستے کے بجائے مخالف راستے پر گاڑی ڈال دی تھی۔ شدید ذہنی دباؤ تھا جس میں وہ گھری ہوئی تھی۔ ابراہم کا اچانک سے تبدیل ہونے والا رویہ جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کہاں کون سا خلا رہ گیا تھا؟ وہ کب یوں بدلنا شروع ہوئے تھے، کب ان کے رویے میں فرق آنے لگا تھا وہ چاہ کر بھی اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔

بے دھیانی میں معمولی رفتار میں گاڑی چلاتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے پڑی۔ گلی کے وسط میں اسٹریٹ لائٹ کے پاس ایک گاڑی کھڑی تھی۔ یہ گاڑی خیام کی تھی، بدر اسے اسی گاڑی میں شاپنگ کے لیے لے کر گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ اس نے بریک پر پاؤں رکھے۔ گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل

آئی۔ اب منظر کچھ صاف تھا۔ گاڑی کے بانٹ سے ٹیک لگا کر دو لوگ کھڑے تھے۔ ایک لڑکا اور لڑکی۔ لڑکے کی اس کی طرف پشت تھی، وہ لڑکی کے آگے کھڑا تھا تبھی وہ ان دونوں کے چہرے دیکھنے سے قاصر تھی۔ اس کی پشت سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ یہ خیام نہیں تھا۔ اسے شاید مغالطہ ہوا تھا۔ وہ واپس پلٹنے ہی لگی تھی کہ وہ لڑکا اپنا رخ موڑتا لڑکی کے برابر میں گاڑی کے بانٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ساکت ہوئی تھی۔ وہ زیاد تھا، زیاد تاشفین۔ کسی بات پر ہنستا وہ بہت خوش تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور لبوں پر دوڑتی وہ مسکراہٹ کسی بھی قسم کے دکھاوے سے عاری تھی۔ اس نے اس کے برابر میں کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی لڑکی تھی جس نے اس سے لفٹ مانگی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا البتہ آنکھیں، اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی آنکھوں سے جھلکتی خوشی واضع تھی۔ اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔ وہ لڑکی کون تھی اسے اس سے مطلب نہیں تھا۔ زیاد اس کے ساتھ کیوں تھا اسے اس سے مطلب تھا۔ اور خصوصاً تب کیوں جب وہ اس کی کال کاٹ چکا تھا؟

اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ شاید وہ اس کی دوست تھی۔ اسے اس سے بہتر کوئی دوست مل چکا تھا جو اس کے لیے اس سے زیادہ اہم تھا۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ وہ کھکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گہری سانس لے کر سر سیٹ کی پشت پر ٹکایا۔ آنکھیں سختی سے میچیں۔ وہ ہمیشہ سے دوستوں کے معاملے میں بہت زیادہ حساس تھی کیونکہ وہ ہمیشہ گنے چنے ہی ہوتے تھے۔ زندگی کی اس منزل پر جب صرف وہی اس کا دوست تھا آج اسے یوں کسی اور کے ساتھ دیکھ کر اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ بالکل بھی نہیں!

اس نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ وہ اس لڑکی کے کندھے پر سر ٹکائے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں

پھیر لیں۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موڑ کاٹ کر واپسی کے راستے پر ڈال دی۔ وہ اب بس سیدھا گھر جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

ان دونوں نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا تو اندھیرے میں کسی کو دیوار سے ٹیک لگا کر سینے پر ہاتھ باندھے اپنا منتظر پایا۔ وہ دونوں رک گئے۔ خیام نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر لائٹ آن کی۔ سعار گڑبڑا کر زیاد کا بازو پکڑتی اس کے پیچھے ہوئی تھی۔ خیام نے سخت نظروں سے اسے گھورا تھا۔

"بہت جلدی آ گئے تم دونوں؟" لہجہ کاٹ دار تھا۔

"تم میری بیوی کی ساس لگ رہے ہو، سچ میں۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔ سعاد کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔ خیام نے دانت کچکچائے تھے۔

"تم نے کہا تھا سعاد سو رہی ہے!!" اس نے تڑخ کر کہا تھا۔

"ہاں پھر جب سعاد جاگ گئی تو ہم جندل کے گھر گئے۔ وہ وہاں نہیں تھا تو ہم۔۔۔"

"تو تم دونوں نے سوچا کیوں نہ تھوڑی آؤٹنگ کر لی جائے، درست؟" اس نے جلے بھنے انداز میں پوچھا تھا۔

"ایکدم درست!" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو جبکہ تمہارا تعاقب کیا جا رہا ہے؟" اس کا دل کر رہا تھا آگے بڑھ کر ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کر دے۔ ایک دو دانت تو اس ناکام شاعر کے توڑ ہی ڈالے۔

"انہیں میں نے سنبھال لیا تھا۔ تم فکر مت کرو۔" اسے تسلی دی گئی۔

"لیکن پھر بھی تم کیسے اسے لے کر جا سکتے ہو؟!" اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ دونوں باہر گئے

تھے مسئلہ یہ تھا کہ اس کی شاگردہ کی جانب سے اسے نظر انداز کیا گیا تھا۔ وہ کہتا تھا مجھے کام ہے وہ اپنی نیند قربان کر دیتی تھی اور آج اس ناکام شاعر کی وجہ سے وہ اس کی بات سنے بنا چلی گئی تھی۔ اس کا غصہ حق پر تھا۔

”بیوی ہے میری۔ تمہیں مسئلہ کیا ہے؟ کیوں ساس بن رہے ہو؟“ وہ تپ چکا تھا۔ سعاد ہونقوں کی طرح انہیں آپس میں لڑتا دیکھ رہی تھی۔

”بیوی ہے تو کیا مطلب؟ شاگردہ ہے وہ میری! تم سے پہلے میری بات سننی چاہیے اسے۔“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

”استاد جی۔۔“ اس کی آواز پر اس نے رک کر اسے دیکھا جو زیاد کے پیچھے سے سر نکالے معصومیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”صرف ایک گھنٹہ ہی تو ہے۔ جانے دیں اب۔ آپ کی شادی ہو گی تو پھر پوچھوں گی میں۔“ وہ اس کے معصومیت سے کہنے پر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”لیکن مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تمہارا اس ناکام شاعر کی وجہ سے مجھے نظر انداز کرنا!!“ وہ دل کی بات لبوں پر لے آیا۔

”اللہ اللہ۔ کیا کروں؟ شوہر ہے یہ میرا۔“ اس نے احتجاج کیا تھا۔ خیام نے خفا خفا سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ڈرامے بند کرو تم اپنے۔ میری بیوی کو یوں کٹہرے میں مت کھڑا کیا کرو۔“ وہ اس پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ اپنے دانت تڑوانا چاہتا تھا۔

”جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تمہاری شادی کو۔ مت بھولو میں چاہتا تو تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ سعاد یہاں ہے!“ اسے دھمکی دی گئی تھی۔

”دو محبت کرنے والوں کو جدا کرنے کا گناہ تمہارے سر آتا!“ وہ بھی پھر ناکام شاعر تھا۔

”کم از کم استاد کو نظر انداز کرنے کے گناہ سے کم ہے یہ!!“ سینہ تان کر کہا گیا۔ سعاد کا دل کیا تھا اپنا سر پیٹ ڈالے۔

"آپ دونوں لگے رہیں میں جارہی ہوں۔" وہ دونوں کو گھوری سے نوازتی زینوں کی طرف بڑھی تھی۔

"دیکھ رہا ہوں میں زمانے کو بدلتے ہوئے!!" اس نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔ وہ اس کی آواز نظر انداز کرتی اوپر آگئی تھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ نگاہ جیسے ہی سامنے پڑی تو اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ دبائی تھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے صوفے پر بیٹھے جندل کو دیکھا جو جانے کس کے خون میں نہا کر آیا تھا۔

"جندل کیا ہوا ہے؟ کیا ہے یہ؟" حیرت سے اسے دیکھتی وہ اس کے قریب آئی تھی۔ جندل چپ چاپ اسے دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ بنا کچھ کہے وہ آگے آیا پھر اپنے بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے اس کے گلے لگا تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کا وجود دھیرے دھیرے کانپ کانپ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوئی تھی۔ آنکھیں تعجب سے پھیلی تھیں۔ اس کے وجود سے اٹھتی خون کی مہک اس کے لیے سانس لینا دشوار کر رہی تھی۔ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر اس کی گرفت سخت تھی۔

"مت کریں۔۔پلیز۔" وہ اسے پیچھے ہٹنے سے منع کر رہا تھا۔ اس نے پہلو میں گرے بازو اس کی پشت پر رکھ کر سانس لینے کی کوشش کی تھی۔ آرام سے اس کی پشت کو سہلایا تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کی دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ دماغ چکرانے لگا تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا محال لگ رہا تھا۔ وہ ڈرتی تھی، خون سے اور قاتلوں سے۔ وہ اس کے سامنے کبھی اس حالت میں نہیں آیا تھا۔ اور آج۔۔ جبکہ وہ سرخ انسانی خون میں رنگا اسے خود سے لگائے کھڑا تھا تو اسے لگ رہا تھا وہ یہیں اسی وقت ڈھیر ہو جائے گی۔

"جندل۔۔پلیز۔" وہ سسک اٹھی تھی۔ وہ آرام سے پیچھے ہٹا تھا۔ بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کے برابر سے گزر کر تیز تیز سانس لیتی صوفے پر بیٹھی تھی۔ نڈھال نگاہوں سے اسے دیکھا جو اس کے برابر میں صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

"کیا کر کے آرہے ہو؟" لہجے میں خوف تھا۔ جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"میں نے اسے مار دیا۔ اس کی جان لے لی میں نے اپنے ہاتھوں سے، یہ دیکھیں۔" اس نے اپنے خون میں لت پت ہاتھ اس کے آگے کیے تھے۔ سعاد نے خوفزدہ سی نظروں سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ مرنے والے کو بہت بے دردی سے مار کر آیا تھا۔ اس کے ناخنوں میں خون جمع ہو گیا تھا۔ سرخ انسانی خون میں رنگے اس کے ہاتھ اسے بے اختیار پیچھے ہٹنے پر مجبور کر گئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو چھپانے کے لیے انہیں پیچھے کر لیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال پا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لگے خون کے چھینٹے اور اس کے وجود سے اٹھتی وہ خون کی مہک اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اسے متلی سی ہونے لگی تھی۔

"کسے۔۔۔ مار کر آئے ہو؟" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔

"انہوں نے ایسے ہی مارا تھا، مجھے ایسے ہی یتیم کیا تھا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اسے پل پل تڑپایا، دھیرے دھیرے اس کی جان لی۔ میں ان جیسا بن گیا۔ آج اپنا انتقام لے کر آیا ہوں، آج پہلا۔۔۔ "قتل" کر کے آیا ہوں۔" اس کے الفاظ اسے کانپنے پر مجبور کر گئے تھے۔ اسے سانس لینا محال لگا تھا۔ نگاہ اس کی شال پر لگے خون پر ٹکی۔ پھر اوپر کو اٹھتی اس کی گردن پر جہاں کسی کی مزاحمت کے نشان تھے۔ وہ مزید برداشت نہیں کر پائی۔ اسے قے آئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی واشروم کی طرف بھاگی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے آنکھوں کو رگڑتے ہوئے فیکٹری میں قدم رکھا تو سامنے فرش پر گرے خون کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ ذہن میں مائک کا خیال آیا اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر آیا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ سامنے ہی دیوار پر کئی گولیاں پیوست تھیں۔ کسی نے پوری میگزین دیوار پر خالی کی تھی۔ اس کی نگاہیں نیچے سرکیں تو کرسی سے بندھا ہیکر کانپ

اٹھا۔ کرسی کے نیچے بے رنگ مائع بہہ رہا تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ چکی تھی۔ منہ پر کسی نے کس کر کپڑا باندھا ہوا تھا۔ قریب تھا کہ وہ خوف سے بے ہوش ہونے والا تھا۔

اس نے نظروں کا رخ ہیکر سے پھیر کر فرش پر گرے مائنک کی طرف کیا۔ خون میں لت پت وہ وجود بالکل بے جان پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے منہ میں جمع خون تھوک کے ساتھ فرش پر بہہ رہا تھا۔ سر سے نکلتا خون ارد گرد پھیل چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ اسے حیرت ہوتی اگر وہ زندہ ہوتا۔ اس نے جلدی سے اس کی نبض پکڑ کر دیکھی۔ وہ زندہ تھا، اسے حیران کر گیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ اتار کر اس کے زخموں پر رکھ کر دباؤ دیا۔ خون روکنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی موبائل نکال کر کان سے لگایا۔

"مائنک کی حالت بہت خراب ہے۔ جلدی سے کوئی ڈاکٹر بھیج دیں۔" اس کی آواز بہت مانوس سی تھی۔ نرم اور بھیگی۔ چہرہ سفید رومال سے ڈھکا ہوا تھا البتہ آنکھیں واضع تھیں۔ لال ہوتی آنکھیں جو بہت سی فکر نگاہوں میں سموئے مائنک کے بے ہوش وجود پر ٹکی تھیں۔

☆☆☆

"یہ جندل غائب کہاں ہو گیا ہے آخر؟" کافی کا گھونٹ بھرتے خیام نے تفکر سے پوچھا تھا۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھے زیاد نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔ "یہ گدھا کبھی انسان کا بچہ نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ سے ایسے تھا، سخت دل اور لاپروا!" وہ تپ گیا تھا۔

"دس سال کی عمر سے ساتھ رہے ہیں ہم۔ یاد ہے بڑی سے بڑی چوٹ بھی لگ جاتی تھی تو روتا نہیں تھا۔ مجھے تو یاد بھی نہیں یہ آخری بار کب رویا تھا؟" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

"تم کب روئے تھے؟" خیام کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔

"جب نکاح کے بعد سعاد سے ملا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔ خیام نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے سر کو جنبش دی پھر سامنے دیکھا۔ کوئی زینوں سے اتر کر لاؤنج کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ آنے والا اندھیرے سے نکل کر روشنی کی طرف آیا تو اس پر نظر پڑتے ہی خیام کے ہاتھ سے کافی کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔

"جندل۔۔" وہ صوفے سے اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ زیاد نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا ہے یہ سب؟" وہ اس کا حلیہ دیکھ کر پریشان ہوا تھا۔ جندل اس کے سوال نظر انداز کر تا زیاد کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انہیں دیکھ لو جا کر۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔ زیاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"ہوا کیا ہے یار؟ کیا کر کے آئے ہو؟!" وہ پریشان ہوا تھا۔

"مائک کو۔۔مار دیا میں نے۔ وہ اسی قابل تھا۔۔ قتل کر دیا اس کا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔ خیام اپنی جگہ ساکت ہوا تھا۔ زیاد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "میں نے اسے مار دیا۔ اپنے لیے مار دیا۔ انتقام لے کر آرہا ہوں۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے خیام۔" وہ تکلیف میں تھا، بے حد تکلیف میں۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ بکھری بکھری سی حالت میں اسکے سامنے کھڑا یہ لڑکا اس کا جان سے عزیز دوست تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اسے خود سے لگایا تھا۔ اس نے پروا نہیں کی تھی وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس کے وجود سے اٹھتی خون کی مہک سانس روکنے پر مجبور کرنے والی تھی۔ اسے پروا تھی بس اپنے دوست کی۔ اس دوست کی جو اس کا کندھا میسر ہونے پر ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ زیاد لب دانتوں میں دبائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہمیشہ سے ایسے تھے۔

وہ دن جب خیام نے اپنی جان بچانے کی خاطر پہلی انسانی جان لی تھی اس دن اس کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ تب وہ بھی یونہی کسی اور کے خون میں رنگا ہوا آیا تھا۔ تب جندل نے بھی یونہی آگے بڑھ کر اسے اپنا کندھا پیش کیا تھا۔ ماضی اور حال کے ان دو مناظر میں اس نے کوئی فرق نہیں پایا تھا۔ وہ دونوں ہمیشہ سے یک دل یک جان تھے۔۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست!

اس کے موبائل کے تھرتھراہٹ نے اسے سوچوں سے باہر نکالا۔ اس نے نمبر دیکھ کر موبائل کان سے لگایا۔

"کہو۔"

"وہ زندہ ہے۔ شکر کرو وہ زندہ ہے!!" اس نے آنکھیں میچتے ہوئے گہری سانس لی تھی۔ موبائل واپس میز پر رکھا پھر نرم سی نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ خیام دھیرے دھیرے اس کا سر سہلاتے ہوئے اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔ آنکھوں میں کرب تھا، تکلیف تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"وہ زندہ ہے جندل۔ قدرت بھی نہیں چاہتی کہ تم اپنے انتقام کی خاطر قاتل بنو۔" اس نے جندل کی پشت تھپکی تھی۔ جندل نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "خود کو قصوروار مت ٹھہراؤ۔ مائک کی ہڈیاں توڑ کر اگر تمہیں سکون ملتا ہے تو کوئی منع نہیں کر رہا تمہیں۔ بس زیادہ ظالم مت بنا کرو، ٹھیک ہے؟" وہ کسی بڑے بھائی کی طرح اسے سمجھا رہا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ انہیں سمجھایا کرتا تھا۔ جندل نے سر کو جنبش دی۔ وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ جندل اسے زینوں کی طرف جاتا دیکھتا رہا۔ خیام آرام سے اس کے آگے آیا۔ اپنے دونوں آستینوں سے اس کے چہرے پر لگے خون کو رگڑنے کی کوشش کی۔

"اگلی بار جب اس کی جان لینے جاؤ تو بتانا، ساتھ چلیں گے۔ کم از کم پھر زیاد کو کال موصول نہیں ہو گی کہ مائک مرتا مرتا بچ گیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ نم آنکھوں سے ہلکا سا ہنس دیا تھا۔

”میں ڈر گیا تھا۔“ وہ بھیگی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”تاریک راتوں میں روشن چراغ اندھیروں سے ڈرا نہیں کرتے، جندل“!

☆☆☆

وہ آرام سے اس کے برابر میں زینے پر بیٹھا تھا۔ چہرہ ترچھا کر کے بغور اسے دیکھا جو ابھی نہا کر آیا تھا۔ نم بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں اداسی تھی۔ شال شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر سامنے دیکھنے لگا□۔ سامنے دھلا ہوا فرش تھا اور کچھ فاصلے پر لمبے اونچے درخت اور خوبصورت پودے۔ سر پر تاریک آسمان تھا اور اس پر روشن چمکتے ستارے۔ مقدس خاموشی تھی جو اپنے بکھرے وجود کو سمٹنے کے بعد ایک بار پھر بکھرنے کی منتظر تھی۔

”مجھے بے بسی کا احساس ہوا تھا۔“ اس کی آواز بھاری ہوئی تھی۔ ”رونا آیا تھا بہت سارا۔ میں سالوں بعد اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا اور اس حالت میں کہ ان کا وجود خون میں لت پت تھا اور ظالم دشمن ان پر قہقہے لگا رہا تھا۔ انہیں میرے سامنے بے دردی سے مار دیا گیا اور میں کچھ نہیں کر سکا۔“ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ اس بار یہ آنسو وہ گالوں پر گرنے نہیں دے گا۔ اس بار یہ نمی دل پر گرنے والی تھی۔ وہ چہرہ ذرا سا ترچھا کر کے اسے نرمی سے دیکھ رہا تھا۔ ”آپی نے کئی بار ماموں کی موت کا ذکر کیا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا وہ موت اتنی تکلیف دہ ہو گی۔ ہاں میں ان کے جنازے پر موجود تھا مگر انہیں اپنی آنکھوں سے مرتے نہیں دیکھا تھا۔ آغا جان نے بتایا تھا کہ بابا کہتے تھے، جندل آپ کا ہے بابا بس سعاد کو میرے لیے رہنے دیں۔ شاید اسی لیے آپی بالکل بابا جیسی ہیں۔ اور میں ماموں جیسا اور آغا جان جیسا۔ مجھے سب سے زیادہ محبت ان دونوں سے تھی۔ میں نے دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ہے خیام! کیا کوئی درد اس درد کا مداوا کر سکتا ہے کہ موت ان کے دروازے پر کھڑی تھی اور میں تقدیر کے فیصلے کا

منتظر تھا؟" نمکین پانی کا موتی جیسا چمکتا قطرہ پلکوں سے جھول کر گال پر لڑھک گیا۔ وہ اپنے آنسو نہیں روک پا رہا تھا۔ تکلیف کی انتہا تھی۔

"آپی کو لگتا ہے میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ انہیں لگنا بھی چاہیے کیونکہ میں ایسا ہی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے بڑے بڑے طوفانوں میں تدبیر کو رائگاں جاتے اور تقدیر کو غالب آتے۔ وہ میری بہن ہیں، میرا اکلوتا خونی رشتہ! ان سے میری محبت تو الفاظ میں نہیں ڈھالی جا سکتی ناں۔ وہ کہتی ہیں میرا ایک بھائی زندہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہے۔ لیکن کیا کروں جب وہ ارد گرد کہیں نہیں دکھتا۔ شاید اس کے لیے ہم سے دور رہنا ہی بہتر ہے، شاید وہ ایسے ہی خوش ہو۔ اس کی خوشی، اس کا سکون عزیز نہ ہوتا تو خیام، کون بھائی چاہے گا وہ اپنے بہن بھائیوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سبب بنے؟ کیا واقعی میں ظالم ہوں؟" ایک اور آنسو اس کے گال پر لڑھک گیا تھا۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتا اس سے سوال کر رہا تھا اور خیام بس چپ چاپ نرمی سے اسے دیکھتا اسے سن رہا تھا۔ اس وقت اسے کوئی سننے والا چاہیے تھا۔ اس وقت وہ بس درد بانٹنا چاہتا تھا۔

"یہ سب آسان نہیں ہوتا یار۔ مجھے دکھ ہوا تھا جب آپی نے اتنا بڑا فیصلہ لیا اور مجھے بے خبر رکھا۔ مجھے تب بھی دکھ ہوا تھا جب میرے بار بار پوچھنے پر انہوں نے مجھے زیاد کے متعلق نہیں بتایا۔ اور پھر اب وہ اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق سب سے زیادہ اعتماد تم پر کرتی ہیں۔ انہیں یقین ہے تم انہیں اپنے بھائی سے ملواؤ گے۔ اور میرا کیا؟ کیا میں اپنے بھائی سے ملنا نہیں چاہتا؟ تمہیں تو اندازہ ہے ناں خیام کہ چھوٹے بھائی کتنے عزیز ہوتے ہیں؟" اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے سر جھکایا۔ کئی آنسوؤں کو اندر اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے سر اٹھایا تو آنسو گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔ اس نے تیزی سے ان کے نشانات مٹا کر انہیں چھپانا چاہا مگر تب تک دو اور آنسو گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ مکمل بے بس ہوا تھا۔

”سعاد کو لگتا ہے، بدر تمہارا بھائی ہے۔“ وہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر نرم پڑا تھا۔ لمحوں میں فیصلہ کیا گیا تھا، وہ انہیں مزید اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان دونوں کو یوں تڑپتا اور بلکتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے انکشاف پر جندل نے تعجب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اسے لگتا ہے کعب الزرقاوی، الزرقاوی سر ہی ہیں جنہوں نے بدر کو اپنا نام دے کر اس کی اصل شناخت چھپائی ہے۔ اسے یقین ہے بدر اس کا بھائی ہے۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ جندل چند پل کچھ بول نہیں پایا تھا۔ نگاہوں کے سامنے وہ چہرہ گھوم گیا تھا جس کی اسے عادت ہوگئی تھی۔ اسے لالا کہہ کر چڑانے والا، اس کا گھر میں رہنا محال کرنے والا وہ لڑکا جو اس دن ان دونوں کے گلے لگ کر بلک بلک کر رویا تھا، اس کا بھائی تھا؟

”کیا تمہیں بھی یہی لگتا ہے؟“ وہ براہِ راست اس سے پوچھ رہا تھا۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”تمہیں نہیں لگتا؟“ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ جندل سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”میں جلد اس کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے وہ تنگ کرتا ہے تو غصہ بھی آتا ہے لیکن اس کا خیال بھی رکھتا ہوں۔ اسے تکلیف میں بھی نہیں دیکھا جاتا اس پر ترس آتا ہے۔ اس دن وہ خواب میں ڈرا تھا تو میں بنا کسی تردد کے اسے اپنے ساتھ سونے کی اجازت دے گیا تھا۔ مجھے اس کا رونا اچھا نہیں لگتا کیونکہ وہ روتے ہوئے بہت معصوم لگتا ہے اور مجھے لگتا تھا میں اسے دیکھ کر نرم پڑ جاؤں گا۔ کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا یہ سب چھوٹے چھوٹے احساسات دراصل رگوں میں دوڑتے ایک ہی خون کی کشش کے باعث تھے۔“ وہ حیران تھا، بے حد حیران۔

”ایک بار یہاں کام مکمل کر لیں، پھر الزرقاوی سر سے ملتے ہیں۔ مجھے امید ہے جو اس کے رنگ ڈھنگ ہیں وہ یقیناً تمہارا اور سعاد کا بھائی ہے۔“ وہ اس کے مسکرا کر کہنے پر ہلکا سا ہنس دیا تھا۔

”کیسے مطلب؟“

”ایک نمبر کا ضدی ہے۔ ڈرامے باز ہے، جلدی رونے بیٹھ جاتا ہے۔ نرم دل ہے اور معصوم بھی۔ خصوصاً یہ دونوں عادات اضافی ہیں۔ سعاد کے مطابق جب وہ ہنستا ہے تو آنکھوں کے کناروں پر سلوٹیں سی پڑتی ہیں بالکل اسی جیسی۔ عین ممکن ہے وہ تمہارا بھائی ہو۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔ جندل کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”اگر وہ سچ میں میرا بھائی ہوا تو۔۔۔“

”تو پھر یہ چھٹانک بھر کے یوسف زئی میدان مارنے کے لیے تیار رہیں۔“ اس نے منہ بنا کر آواز بھاری کر کے کہا۔

”میں زئی سے ملا ہوں کل۔“ اس نے اطلاع دی تھی۔ خیام نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ کسی نے ان دونوں کے آگے کافی کے کپ بڑھائے تھے۔ دونوں نے کپ تھام لیے۔ زیاد بھی اپنا کپ لے کر جندل کے بائیں طرف زینے پر بیٹھ گیا۔

”کیسی طبیعت ہے آپی کی؟“ وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میری بات سنو تم۔“ وہ گرم کافی کا گھونٹ حلق میں اتار کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”وہ میری اکلوتی بیوی اور تمہاری اکلوتی بہن ہے۔ تھوڑا خیال رکھا کرو اس کا۔ تم جانتے ہو اس کی طبیعت کو۔“ اس نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔ جندل نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔ خیام نے دانت کچکچا کر زیاد کو دیکھا۔

”تم کیوں بھول جاتے ہو وہ میری اکلوتی شاگردہ بھی ہے؟“ اس نے تنک کر پوچھا تھا۔

”یاد ہے مجھے۔ جیسے تمہیں اپنی شاگردہ کی فکر ہے ویسے ہی اسے اپنے استاد کی۔ مجال ہے اس کی کوئی بات تمہارے ذکر کے بنا مکمل ہو۔“ اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ جندل نے کافی کا کپ لبوں سے لگا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔ خیام نے فخریہ کالر جھاڑے تھے۔

”یہ تو پھر میری محنت کا صلہ ہے۔ داد وصول کرنے کا حق رکھتا ہوں میں“!

"خدا کی پناہ ایسے استاد سے اور اس کی محنت سے"!

"تم کیوں جل رہے ہو ناکام شاعر؟" اس نے دانت پیس کر زیاد کو دیکھا۔

"سمجھا کرو، ایک ہی بیوی ہے وہ بھی اپنے استاد کی فرمانبردار ہے۔ اس کے لیے تو رسوائی ہی رسوائی ہے۔" جندل نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے افسوس سے کہا۔

"محبت کی راہ میں ہمیں ہر طرح کی رسوائی منظور ہے۔" اس نے چہک کر کہا تھا۔

"اس کے اندر کا مردہ شاعر جاگ رہا ہے۔" جندل نے اطلاع دی۔

"فکر مت کرو رہے گا پھر بھی وہ مردہ ہی۔" خیام نے تسلی دی تھی۔ زیاد نے تپ کر دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں مزے سے اسے لتاڑنے میں مصروف تھے۔ وہ غصے سے ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

گہری ہوتی رات میں تاریک اور اندھیر آسمان کے سائے تلے زینوں پر بیٹھے وہ تینوں کسی بات پر کھکھلا ہنسے تھے۔ ان کی ہنسی کئی پل گردونواح میں گونجتی رہی تھی۔

☆☆☆

اندھیر اور تاریک کوٹھڑی تھی جس کے کونے میں وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ گھٹنوں کے گرد بندھے بازوؤں کو ڈھیلا کر رکھا تھا۔ سر گھٹنوں پر ٹکا تھا۔ پشت پر اوپر کی طرف دیوار میں روشن دان تھا، جو بند تھا۔ ہر طرف تاریکی اور اندھیرا تھا۔ کہیں کوئی چیز سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ چند پل خاموشی سے گزر گئے پھر بند دروازے کے پار چابیوں کے گچھے کی آواز سنائی دی۔ تین سے چار چابیاں تھیں جو آپس میں ٹکرائی تھیں۔ ایک چابی تالے میں لگی اور تالا کھل گیا۔ سیاہ دستانوں میں چھپے ہاتھوں نے دروازے کو دھکیلا۔ ذرا سی چرچراہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ کھلے دروازے سے آتی کچھ روشنی اس کے وجود پر

پڑی۔ اس مردہ سے وجود میں کچھ حرکت ہوئی۔

''سر اٹھاؤ۔'' آواز بھاری اور رعب دار تھی۔ چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔ چہرے کے علاوہ پورا وجود اندھیرے میں تھا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے شخص نے دھیرے سے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اکڑی ہوئی گردن کو دائیں بائیں ہلایا پھر ٹھنڈی سانس بھر کر سر دیوار پر ٹکا دیا۔ سفید روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ جھریوں زدہ چہرہ، آنکھوں کے گرد حلقے، سر کے بالوں میں اترتی چاندنی، بڑھی ہوئی داڑھی، لاغر اور کمزور سایہ وجود اپنی اصل پہچان کھو چکا تھا۔

''کیسے ہو؟'' آواز میں طنز کا شائبہ تھا۔

''میری بیٹی کیسی ہے؟'' ہمیشہ کی طرح اس کا پہلا سوال یہی تھا۔ اس کے سامنے کھڑے شخص نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

''وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے!'' اسے یاد دلایا گیا تھا۔

''جنم دینا کافی نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے پروان چڑھایا ہے، وہ میری بیٹی ہے۔'' وہ بضد تھا۔ نقاہت کی انتہا تھی کہ دو جملے بول کر ہی اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

''وہ بھی ایسی ہی ہے۔ ضدی اور مغرور! لیکن تم فکر مت کرو بہت جلد میں ایسا کھیل کھیلنے والا ہوں کہ تمہاری نام نہاد بیٹی بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپے گی۔ اپنے صیاد کے جال میں وہ بری طرح پھڑ پھڑائے گی مگر آزادی کی کوئی راہ نہیں ہو گی۔'' وہ مسکرایا تھا۔ آنکھیں چمکی تھیں۔

''اس سے دور رہنا دلال! حزب اللہ اس سے کی گئی زیادتیوں کے لیے تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔'' اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

''میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔ کل رات میں ایک اور خونی کھیل کھیلنے جا رہا ہوں۔ الگ الگ طریقوں سے شکار

کروں گا اور جیت یقیناً میری ہو گی۔" انداز مغرورانہ تھا۔

"خدا تم پر اپنا قہر نازل کرے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔ دلال نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر پلٹ گیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ چابی تالے میں لگی، تالا بند ہو گیا۔ بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ جا چکا تھا۔ پیچھے اس اندھیر کمرے میں وہ شخص ایک طرف ڈھے چکا تھا۔ وجود میں جیسے جان باقی نہیں رہی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں کے سامنے وہ معصوم چہرہ لہرایا جو اسے ہر روز جینے کی امید دیتا تھا۔ اس کی بیٹی کا کھلکھلاتا چہرہ، ازابیلا کا پُر رونق چہرہ۔

☆☆☆

بدر گہری نیند میں تھا جب اس کا موبائل چنگھاڑ اٹھا تھا۔ اس نے نیند میں ہی موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔ مانوس بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے اس کی نیند بھک سے اڑی۔ اگلے کچھ لمحات میں وہ اپنی جیکٹ لے کر گھر سے نکل رہا تھا۔

زیاد کی آنکھ موبائل کی بیپ پر کھلی تھی۔ اس نے اکڑی ہوئی گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے موبائل کی روشن اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا۔ پیغام پڑھ کر ایک نگاہ ارد گرد ڈالی۔ وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ دائیں طرف لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ رات دیر تک لائبریری کا کام کرتے کرتے کب اس کی آنکھ لگی اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ سامنے کرسی پر بیٹھی سعاد بھی میز پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کی طرف بھی صورتحال کچھ خاصی مختلف نہیں تھی۔ وہ آنکھیں رگڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ کبڈ سے شال نکال کر سعاد پر ڈالی۔ موبائل پر الارم لگایا اور موبائل اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ پھر کمرے سے نکل گیا۔

خیام نے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں قدم رکھا تو نگاہ صوفے پر سوتے جندل پر ٹکی۔ اس نے پاس رکھی اس کی جیکٹ اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خیام چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ اس نے آنکھیں رگڑتے

ہوئے وقت دیکھا پھر گہری سانس لیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ ہی لمحات میں بدر بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو وہاں کا منظر سانس روکنے پر مجبور کر دینے والا تھا۔ شبنم میں بھیگے آسمان پر ہوا جامنی رنگ فجر کا وقت ہونے کا پیغام دے رہا تھا اور وہ تینوں اسی پیغام پر لبیک کہہ چکے تھے۔ جندل سب سے آگے امامت کے لیے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے خیام اور اس کے برابر میں زیاد۔ وہ بھاگتا ہوا اندر آیا اور خیام کے دائیں طرف کھڑا ہو گیا۔

تکبیر پڑھی گئی۔ ہر سُو چھائی مقدس خاموشی میں جندل کی نرم سی آواز نے خلل ڈالا۔ شبنم میں بھیگا آسمان اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر سرشار ہوا۔ فضا معطر ہوئی۔ وہ چاروں بیک وقت رکوع میں گئے۔ اور پھر اس منظر پر وقت ٹھہر گیا تھا جب وہ چاروں ایک ساتھ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوئے تھے۔ سروں کے ساتھ اس عظیم رب کی بارگاہ میں دل بھی جھکے تھے۔ اس بارگاہ میں جہاں ہر درد کی دوا موجود تھی، جہاں ہر زخم پر مرہم رکھا جاتا تھا، بھلے وہ روح کے ہوں یا جسم کے۔

☆☆☆

رات کی تاریکی خود میں سمٹتی روشن صبح میں گم ہو گئی۔ کچن سے آتی خوشبو اس کی بھوک مزید بڑھا رہی تھی۔ وہ میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھا بے صبری سے کچن میں کھڑے خیام کو دیکھ رہا تھا۔ بند مٹھی پر چہرہ گرائے بلا کی معصومیت چہرے پر سجائے وہ کل رات کی نسبت کافی ہشاش بشاش تھا۔

”لے بھی آؤ یار۔ بھوک لگی ہے مجھے۔“ اس نے غالباً چوتھی بار آواز لگائی تھی۔ کبڈ سے برتن نکالتا خیام تپ گیا تھا۔

”واللہ! ایک اور آواز لگائی تم نے تو ناشتہ جلا دوں گا میں۔“ دھمکی سخت تھی۔ وہ ناک سکیڑتا میز کے شیشے پر لکیریں

کھینچنے لگا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے فرسٹ ایڈ باکس میز پر رکھا۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ چہرہ بند مٹھی سے اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں سعاد کرسی کھینچ کر اس کے برابر میں بیٹھ رہی تھی۔

"السلام علیکم۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"وعلیکم السلام۔" دھیمی آواز میں سلام کا جواب دے کر وہ فرسٹ ایڈ باکس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اپنی مطلوبہ کریم نکالی۔ آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑا اور دائیں ہاتھ سے ہاتھ کی پشت پر لگے زخموں پر کریم لگانے لگی جو پے در پے مکے مارنے کی وجہ سے آئے تھے۔ وہ اپنے کام میں بالکل مگن تھی۔ وہ نچلا لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھوں کے بعد وہ اس کی گردن پر لگے زخم کی طرف متوجہ ہوئی۔ زخم صاف کر کے آئنٹمنٹ لگائی۔ پھر چیزیں سمیٹنے لگی۔

"آئی ایم سوری آپی۔" اس نے نرمی سے کہا تھا۔ سعاد نے رک کر اسے دیکھا۔ وہ معصومیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھامے تھے۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالی تھیں۔

"میں آئی تھی جندل۔ بڑی بہن کا فرض نبھانے آئی تھی، تم میرا انتظار تو کرتے۔ ہر بار کی طرح خود سے فیصلہ لے لیا حالانکہ یہ صرف تمہارا حق نہیں تھا۔ مرنے والا میرا بھی باپ تھا اور گرنے والا میرا بھی ماموں تھا۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تم تنہا سب فیصلے لے کر خود کو تکلیف دو۔ آئندہ ایسے مت کرنا، میری خاطر۔ ایک ہی تو بھائی ہے میرا۔" اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے اس نے آخر میں لاڈ سے کہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

"آپ کے دوسرے بھائی کو بھی بہت جلد ڈھونڈ لیں گے۔" اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے یقین دلایا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی تھی۔ جندل نے بغور اسے دیکھا تھا۔ فیروزی حجاب کے حالے میں نکھرا نکھرا سا چہرہ، لبوں پر دوڑتی مسکان اور آنکھوں میں وہ نرم سا تاثر، وہ اسے بدلی بدلی سی لگی تھی۔ یا شاید وہ آج غور

کر رہا تھا۔

”آپی۔“ نرمی سے اسے پکارا گیا۔ سعاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”آپ خوش ہیں، زیاد کے ساتھ؟“ اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے وہ پوچھ رہا تھا۔

”تمہیں نہیں لگتا؟“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے، میں بس تسلی کرنا چاہتا تھا۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”میں خوش نہ ہوتی تو تمہارا دوست سلامت نہ پھر رہا ہوتا جندل!“ اسے یقین آ گیا تھا۔ وہ خوش تھی بالکل خوش تھی۔ کیونکہ سامنے سے آتا زیاد بالکل سلامت تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”جندل پوچھ رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ خوش ہوں یا نہیں؟“ جواب سعاد نے دیا تھا۔

”مجھے سلامت دیکھ کر بھی تمہیں یقین نہیں ہے؟“ وہ حیران ہوا تھا۔ اس کی بات پر ان دونوں نے لب دانتوں میں دبائے ایک دوسرے کو دیکھا پھر کھکھلا کر ہنس پڑے تھے۔ ”کیا؟ میں نے کچھ غلط کہا؟“ اس کے پوچھنے پر سعاد نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”میں نے بھی بالکل یہی جواب دیا تھا۔“ سعاد کے ہنس کر کہنے پر وہ مسکرا دیا۔ اسی اثناء میں کچن کے دروازے پر کھڑا خیام کھنکھارا تھا۔ سعاد جلدی سے نقاب لگاتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”بیٹھی رہو۔ ناشتہ کر لو۔“ وہ میز پر برتن رکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”آپ نہیں کریں گے؟“ اس کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں بس آفس جاؤں گا، دیر ہو گئی ہے۔ تم آج کا شیڈول بتا دینا اور بدر کو میں دوپہر تک بھیج دوں گا۔“ وہ ہدایات

جاری کرتا کرسی کی پشت پر لٹکا اپنا کوٹ اٹھا رہا تھا۔

"آج ابراہم سے میٹنگ ہے آپ کی۔ فائلز اور ڈاکومنٹس تیار کر لیے ہیں اور میں نے بھیج بھی دیے ہیں۔ دیکھ لیجیے گا یاد سے۔" وہ واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ خیام نے سر کو جنبش دی۔

"اللہ حافظ۔" وہ ایک الوداعی نگاہ سب پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سعاد نے نقاب ٹھوڑی پر ٹکایا پھر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ وہ دونوں بھی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی پھر مسکراہٹ دباتی اپنے کپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اچھا لگا تھا اسے ان دونوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنا۔ تحفظ کا احساس تھا جس نے اسے ہشاش بشاش کر دیا تھا۔

☆☆☆

زیاد کو اپنے سامنے بیٹھتا دیکھ کر اس نے غیر محسوس انداز میں گردن کے گرد لپیٹے اسکارف کو ڈھیلا کیا تھا۔ رات کا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ محبت بھرا تاثر اور اس کی ہنسی وہ چاہ کر بھی نہیں بھول پا رہی تھی۔ اسے سوچوں میں گم دیکھ کر زیاد نے میز کا کونا بجایا تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟" نگاہوں میں وہی وہ نرم سا تاثر تھا جو اسے دیکھتے وقت ہوتا تھا، جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

"رات کال کی تھی میں نے۔ تم نے اٹھائی نہیں۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں، کچھ ضروری کام تھا۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ وہ بغور اسے دیکھنے لگی۔ کبھی اس کی کال نظرانداز نہ کرنے والا زیاد اگر کسی کے لیے اسے نظرانداز کر رہا تھا تو وہ واقعی اس کے لیے اہم تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟" اس کے یوں اچانک پوچھنے پر زیاد کو حلق میں کانٹا چبھتا محسوس ہوا تھا۔

"خیریت؟ آج کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ایسے ہی۔ جواب نہیں دو گے؟"

"ایسے ہی۔ کبھی کوئی اچھی لڑکی ملی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔ پکا!" اس نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا تھا۔ بارہا شکر کیا تھا کہ کان میں لگا آلہ وہ احتیاطی طور پر یہاں آنے سے پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ ازابیلا نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کافی کا کپ لبوں سے لگایا تھا۔

"تم نے کال کیوں کی تھی؟"

"ہاں۔ میری لڑائی ہو گئی ہے۔ میں نے مارک سے پنگا لے لیا ہے، اسے بتایا ہے کہ میں اس جیسے قاتل سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ بابا بھی وہیں تھے اور مجھے کافی حیرت ہوئی انہوں نے میری حمایت میں ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ اب بھی یہی چاہتے ہیں میں اسی گدھے سے شادی کروں۔" اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

"لیکن ابراہم انکل تو تمہیں اتنا سپورٹ کرتے تھے۔ اچانک کیا ہو گیا؟"

"معلوم نہیں۔ یہ مارک ان کی سگی اولاد ہے ناں، زہر لگنے لگا ہے اب مجھے اور زیادہ۔" اس نے کڑوی اور گرم کافی سے حلق تر کیا۔

"تو اب کیا کرو گی؟"

"کیا کرونگی؟ اس نکمے، نالائق اور نامعقول جندل کو میسج کیا تھا میں نے کہ مجھ سے ملے۔ جانے کون سے تم سب کے کاروبار چل رہے ہیں کہ کوئی میری کال نہیں اٹھاتا اور کوئی میرا پیغام نہیں دیکھتا۔ میں کتنی مشکل سے خود پر ضبط کیے بیٹھی ہوں کچھ اندازہ نہیں ہے تمہیں۔ آفس بھی نہیں گئی میں حالانکہ آج ہمیں نیا کیس کور کرنا تھا۔" وہ واقعی تپی بیٹھی تھی۔ کافی کے گھونٹ پر گھونٹ بھرتی وہ لائبریری کا لحاظ کیے بنا تیز آواز میں بول رہی تھی۔ زیاد نے

گڑبڑا کر ارد گرد دیکھا۔ ”کیا میں اتنی بری ہوں؟ میرے پاس دولت ہے، اچھی خاصی خوبصورت بھی ہوں پھر وہ ذلیل مارک ہی کیوں؟“ اس نے غصے سے کافی کا کپ پٹخا تھا۔ زیاد نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔

”میرا دل کر رہا ہے میں سب تہس نہس کر دوں۔ عجیب کوئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔ اور پھر وہ کہہ رہا ہے وہ جندل کو نہیں چھوڑے گا۔ خبیث قسم کا انسان ہے، جندل کو کچھ کر دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ گھر چھوڑ دوں، بابا سے ناراض ہو جاؤں پھر منہ اٹھا کر کہاں جاؤں؟ اس بھری دنیا میں ہے کون میرا؟“ اس کی آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔

وہ اس کے لمحوں میں بدلتے موڈ کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ”مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ اب میں ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگ جاؤں گی۔“ اس نے سر ہاتھوں میں گرایا تھا۔

”ازاازا۔ اتنا کیوں سر پر سوار کر رہی ہو سب۔ کوئی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا میرا یقین کرو۔“ اس نے اسے تسلی دینا چاہی تھی۔

”ہاں تو کوئی اور آپشن بھی تو نہیں ہے۔“ وہ بس اب رونے کو تھی۔ زیاد کی نگاہ اس کے عقب میں کتابوں کے درمیان کھڑے جندل پر پڑی جو پی کیپ سرکاتا اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوششوں میں تھا۔

”تو جلدی کیا ہے۔ ستائیس کی تو ہوا بھی، آرام سے کرنا تیس پینتیس سال کی عمر میں شادی۔“ حل پیش کر دیا گیا۔ وہ دانت کچکچا کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہارے ابراہم انکل کا کیا کروں؟ انہیں ایک عدد داماد چاہیے جو قابلِ اعتماد ہو جس کو اپنی تمام جائیداد سونپ کر وہ سکون سے بڑھاپا گزاریں۔“ وہ تڑخی تھی۔

”تو تم کیوں نہیں سنبھال سکتیں؟“

”دو ماہ گئی تھی کمپنی۔ تیسرے ماہ کی پہلی تاریخ کو خود ہی ہاتھ سے پکڑ کر کمپنی سے نکال دیا تھا کہ معلوم نہیں کتنا

نقصان کر دیا تھا میں نے۔ اب یہ میری فیلڈ تو نہیں ہے۔ میں معاملات بگاڑ سکتی ہوں لیکن سلجھا نہیں سکتی۔" اس نے دونوں ہاتھ اوپر کیے تھے۔

"تو، اب کیا کرنا چاہتی ہو؟" اس نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے جندل سے شادی کرنی ہے۔" اس نے فیصلہ سنایا تھا۔ زیاد کو اپنا حلق تک کڑوا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ نگاہ اس کے عقب میں کھڑے جندل کے لال ہوتے کانوں پر ٹکی۔ وہ معصومیت سے کتاب اپنے چہرے کے آگے کر گیا۔

"آؤ، مسجد چلتے ہیں۔ پہلے تمہیں کلمہ پڑھواتے ہیں پھر ساتھ ہی لڑکے کو ڈھونڈ کر تمہارا نکاح بھی پڑھوا دیتے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟" اس کے چہرے پر ایکدم رونق آئی تھی۔ وہ خوشی سے کچھ کہنے لگی تھی مگر زیاد کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر چپ کر گئی۔ وہ طنز کر رہا تھا، اسے اندازہ ہو گیا۔

"اس میں برائی ہی کیا ہے؟" منہ بسور کر پوچھا گیا۔

"کوئی بھی نہیں۔ تبھی تو کہہ رہا ہوں چلتے ہیں مسجد۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ وہ منہ بسورتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم مجھے بالکل نہیں سمجھ سکتے۔" وہ جانے کے لیے مڑی تھی۔

"اب کہاں جا رہی ہو؟"

"ایک دو کتابیں لینی ہیں، آ رہی ہوں۔" مصروف سے انداز میں کہتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی جندل نے کتاب نیچے کی۔ زیاد نے مشکوک نگاہوں سے اسے گھورا۔

"تمہارے کان کیوں لال ہو رہے ہیں؟"

"پٹھان ہوں۔ یہ بتاؤ آپی مان جائیں گی؟" وہ پرجوش تھا۔ زیاد نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"ہڈیاں توڑ دے گی وہ تمہاری۔"

”لیکن بیلا اچھی ہے۔ اور دیکھو وہ اتنی پریشان ہے۔ اس کی مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ اور تمہارا دوست ہونے کے ناطے میرا بھی۔“ جندل نے اسے قائل کرنا چاہا تھا۔

”ایک بار یہ بات اپنی بہن کے سامنے کرنا۔“

”تم تو ان جیسے مت بنو۔ سالا ہوں تمہارا۔“ اس نے منہ بسورا تھا۔

”وہ رہا باہر کا راستہ۔ نکلنے کی کرو۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جندل نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ زیاد اسے نظر انداز کرتا ارد گرد دیکھنے لگا۔ لائبریری کی ترتیب تھوڑی بدلنی چاہیے۔ دائیں طرف کتابیں کم معلوم ہو رہی ہیں۔ وہ بغور ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ جندل ناک سکیڑ تا پلٹ گیا۔ پی کیپ کا کونا پکڑ کر نیچے سرکاتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ ایک طرف اسے بیلا پر ترس آ رہا تھا اور دوسری طرف خود پر۔

”جندل دیکھ کر!!“ وہ چلائی تھی مگر تب تک اس کا سر اس بھاری ستون سے ٹکرا چکا تھا۔ اسے اپنا دماغ گھومتا محسوس ہوا تھا۔ فاصلے پر کھڑی ازابیلا تعجب سے اسے دیکھتی کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ وہ پیچ و تاب کھاتا پیچھے ہٹا تھا۔ زیاد نے کسی بھاری کتاب کی تلاش میں نگاہیں دوڑائی تھیں۔

”دیکھ کر کیوں نہیں چلتے تم؟“ وہ ہنستے ہوئے اس کے قریب آئی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے خجالت سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا تھا۔

”چچ چچ۔ سیڑھیاں تو سمجھ میں آتی ہیں مگر یہاں کیا ہوا تھا؟ یہ دیکھو یہاں سے سوجنے لگا ہے۔“ وہ اس کی پیشانی پر انگشت شہادت رکھ کر مقام کی نشاندہی کر رہی تھی۔ وہ بے اختیار لب دانتوں میں دبا گیا۔ اس سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

”کیا ہوا؟ ٹھیک ہو؟“ وہ اسے خاموش دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اس نے جلدی سے سر اثبات میں ہلایا۔ ”آج کونسی

کتاب پڑھ رہے ہو؟" وہ سوال پوچھ کر جواب کا انتظار کیے بنا خود ہی جھک کر اس کے ہاتھ میں موجود کتاب کا نام دیکھنے لگی۔

"Count of Monte Cristo!"

اس کی آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔

"آخر میں Count Morcerf مر جائے گا۔" اس نے جھک کر کہا تھا۔

"ازا!" وہ کچھ کہنے لگا تھا جب پیچھے سے زیاد کی آواز آئی تھی۔

"میں آتی ہوں ایک منٹ۔" وہ عجلت میں کہہ کر زیاد کی طرف بڑھی تھی۔ جندل نے چہرہ موڑ کر اسے جاتے دیکھا تھا۔ گردن تک چڑھے ہوئے خاکی رنگ کے سوئیٹر پر بھورے رنگ کا کوٹ پہنے، بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑے وہ لبوں پر ہلکی سی مسکان لیے دور جا رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ آوازیں تھمنے لگی تھیں، ارد گرد کے مناظر دھندلے ہونے لگے تھے۔ وہ ایک ایک قدم ٹھہر ٹھہر کر اٹھا رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ نگاہ اس کے بالوں میں اٹکے چھوٹے سے کلپ پر ٹکی۔ سر کی حرکت کی وجہ سے برائے نام اٹکا وہ کلپ بالوں سے جھول کر فرش پر گرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر سا گیا تھا۔

"لیکن میرا کلپ یہیں لگا تھا بھائی۔ وہ میرا پسندیدہ تھا۔" نرم اور معصوم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

اس نے بے یقینی سے راہداری کا موڑ مڑتی ازابیلا کو دیکھا تھا۔

"میں آپ کا بہت سارا خیال رکھوں گی، امیر البحر۔" اسے لگا تھا بحیرہ روم کا پانی اس پر آن گرا تھا اور وہ اتھاہ گہرائیوں میں جا رہا تھا جہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ گرد و پیش میں تمام آوازیں تھم گئیں۔ ساکت سی نگاہیں فرش پر گرے کلپ پر ٹکیں۔ وہ آگے آیا۔ پنجوں کے بل جھکا اور اس کلپ کو انگشت شہادت اور

انگوٹھے کے درمیان اٹھالیا۔

”تم میری بہن کو پسند آ گئے ہو۔“ زیاد تاشفین اور اس کی بہن ازاتا شفین۔ اس نے سانس روکے زیاد سے بات کرتی ازا کو دیکھا تھا۔ وہ ازاتا شفین تھی، زیاد کی بہن۔ وہی لڑکی جسے وہ اس رات ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ ہاں وہ وہی تھی۔ زیاد کے کچھ کہنے پر ماتھے پر بل ڈالے اپنے بالوں میں کلپ تلاش کرتی وہ ازا ہی تھی۔ اس کے بال۔۔ وہ اس رات گہرے سیاہ تھے جبکہ اس وقت ڈائے شدہ تھے۔ اس کی آنکھیں، گہرے بھورے رنگ کی نرم سا تاثر لیے۔۔ وہ ان آنکھوں کو پہلی نظر میں ہی پہچان کیوں نہیں پایا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے لیے بے شمار دعائیں کی تھیں۔ وہ ایک قرض چکانا تھا، اس رات کے تمام احسان لوٹانا چاہتا تھا۔ جس طرح اس نے اس کی حفاظت کی تھی وہ بھی اسے اپنے حصار میں محفوظ محسوس کروانا چاہتا تھا اور آج، اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی تمام دعائیں قبول ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی اس کے سامنے تھی۔ ازاتا شفین، جندل یوسف زئی کی نگاہوں کے حصار میں کھڑی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ سانس روکے، بنا پلک جھپکے۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

وہ اپنا کلپ ڈھونڈنے اس طرف آ رہی تھی۔ وہ اپنی مٹھی بند کرتا جلدی سے ایک طرف ہوا تھا۔ اس نے فرش پر نگاہیں دوڑائیں پھر مایوس سے واپس چلی گئی۔ کتابوں کے درمیان وہ راہداری کا موڑ مڑتی اس کی نگاہوں سے او جھل ہو گئی۔ اس نے پلک جھپکی، سینے میں قید سانس خارج کی۔ اسے لگا جیسے کوئی طلسم ٹوٹا تھا۔ کسی ساحر نے اس سے سے نگاہیں پھیری تھیں اور نتیجتاً سحر ٹوٹا تھا۔ اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی پر رکھے کلپ کو دیکھا۔ فیروزی رنگ کا خوبصورت اور نفیس سا کلپ۔ وہ مضبوطی سے اسے مٹھی میں بھینچ گیا۔ اسے یقین تھا، جس دن وہ اس کے تمام قرض چکانے پر آئے گا اس دن یہ کلپ بھی اسے واپس دے دے گا۔ تب تک، اس کے پاس یہ نشانی ہو گی کہ۔۔ ایک لڑکی ازاتا شفین اس کی دعاؤں کا صلہ تھی اور جس سے محبت کی گواہی اس کے دھڑکتے دل نے دی تھی۔

☆☆☆

گاڑی اپنی معمول کی رفتار کے ساتھ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سیٹ پر سر ٹکا کر آنکھیں موند کر بیٹھا خیام خیالوں کے بھنور میں پھنس چکا تھا۔ ڈرائیونگ کرتا بدر گاہے بگاہے نگاہ سڑک سے ہٹا کر اس پر ڈالتا اور ہر بار اسے اسی حالت میں پاتا۔ تیزی سے طے ہوتا سفر ہر لمحے انہیں منزل کے قریب کر رہا تھا۔ وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر جا رہے تھے اور واپسی شام تک ہی ممکن تھی۔ اسے اس وقت کاغذوں میں سر دے کر اپنی میٹنگ کے اہم نقاط یاد کرنا چاہیے تھے مگر وہ بالکل بے فکر تھا کیونکہ اس نے وہاں وہی کچھ کہنا تھا جو سعاد اسے بتانے والی تھی۔ میٹنگ کس سسلسلے میں تھی، کس کے ساتھ تھی اسے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ یہ کام سعاد کا تھا، اسی پر جچتا تھا۔

"سر، آپ تینوں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں؟" وہ اس کے جندل اور زیاد کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"ہم چاروں۔ میں، جندل، زیاد اور ضرار۔" اس نے بند آنکھوں سے جواب دیا تھا۔ بدر نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"آپ میں ہمیشہ سے ایسی ہی گہری دوستی تھی؟" وہ متجسس تھا۔

"نہیں۔ میرا دوست صرف جندل تھا۔ جندل کو زیادہ دوست بنانے کا شوق تھا تبھی وہ زیاد کا بھی دوست تھا اور ضرار کا بھی۔ میں اور زیاد بہت لڑتے تھے جبکہ ضرار ہمیشہ سے شریف تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ چاروں میں کب گہری دوستی ہوئی اندازہ ہی نہیں ہوا۔" اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ نگاہ سامنے ہموار سڑک پر ٹکی۔

"اور سعاد آپی؟"

"وہ پہلے میرے لیے بس جندل کی بہن تھی۔ ضرار کے ساتھ اس کا بچپن ساتھ گزرا تھا تبھی دونوں میں دوستی تھی۔ بعد میں وہ میری شاگردہ بنی، پھر زیاد کی بیوی بنی۔ اور وہ ہم چار میں پانچویں ہو گئی۔" وہ کھل کر مسکرایا تھا۔ بدر نے

موڑ کاٹتے ہوئے بغور اسے مسکراتے دیکھا۔

”آپ کو وہ اچھی لگتی ہیں؟“

”کیا وہ اچھی نہیں ہے؟“ دائیں ابرو اٹھائے سوال کے بدلے سوال کیا گیا۔

”غصے کی تیز ہیں۔“ اس نے ناک سکیڑی تھی۔

”لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ حساس، نرم مزاج اور نازک سی لڑکیاں سروائیور نہیں ہوتیں جبکہ سعاد سروائیور ہے۔ کیا سمجھے؟“ نرمی سے اسے سمجھا کر سوال کیا گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دے گیا۔ خیام نے کچھ یاد آنے پر ڈیش بورڈ پر رکھے کاغذات اٹھائے۔ اس نے کاغذات کا جائزہ لیا تو ایک انگوٹھی ان سے نکل کر اس کی گود میں گری۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ آرام سے انگوٹھی کو انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان اٹھایا۔ وہ سادی سی انگوٹھی تھی جس کے درمیان میں نیلے رنگ کا چمکتا ہوا بڑا سا موتی جڑا تھا۔ بدر نے اس کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کو دیکھا تو وہ منظر نگاہوں کے سامنے لہرا گیا جب ازابیلا نے اپنا آئی ڈی کارڈ اتار کر ڈیش بورڈ پر رکھا تھا ساتھ ہی اپنی انگوٹھی بھی اتاری تھی۔ وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔

”ازا۔۔“ وہ واپس سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔ یہ لڑکی ہمیشہ سے اپنی چیزوں کے بارے میں اتنی ہی لاپروا تھی۔۔ ہمیشہ سے۔ اور شاید صرف چیزوں کے بارے میں ہی نہیں، انسانی دھڑکتے دلوں کے بارے میں بھی۔ وہ لب دانتوں میں دبائے سختی سے آنکھیں میچ گیا تھا۔

☆☆☆

مائک نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں تو اسے اپنا منتظر پایا۔ وہ بیڈ پر لیٹا تھا۔ سر پٹی میں جکڑا تھا، ہاتھ پر ڈرپ لگی تھی۔ چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ زندہ تھا۔

اپنے زندہ ہونے کا یقین کر کے اس نے گہری سانس لی۔

"مجھے لگا تم تو گئے۔" وہ لڑکا کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چہرہ ہمیشہ کی طرح سفید رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔

"میری قسمت میں ذلالت والی زندگی ہی ہے شاید۔" وہ تپا ہوا تھا۔ اسے اس بے چارے پر ترس آیا تھا۔

"فکر مت کرو۔ جندل کو تم پر بس غصہ تھا، وہ نکل گیا اور تم بچ گئے۔ بس تھوڑے سے زخم ہیں جلد بھر جائیں گے۔" اس کی آنکھیں شرارت سے چمکی تھیں۔ مائک اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گیا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا اس نام نہاد باورچی پر۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ پھر دانت پیس کر اسے دیکھا۔ "میرا گناہ کیا ہے؟ یہی کہ میں اپنے باپ اور بھائی کے جرائم پر پردہ ڈالتا آیا اور انہیں بچانے کی چند ایک کوششیں کیں۔ اسے غصہ تھا تو بھائی پر نکالتا، میرا چہرہ بگاڑنے کیوں ٹپک پڑتا ہے؟" وہ اس پر بگڑا تھا۔

"تمہارا گناہ یہ ہے کہ تم، ایک نہایت ہی بزدل اور بے غیرت مرد ہو!" تاک کر جواب دیا گیا تھا۔ چبا چبا کر کہا گیا تھا۔ مائک اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اپنی بزدلی اور بے غیرتی کا وہ خود بھی معترف تھا۔

"بہرحال میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔ حزب للہ مارک کو راستے سے ہٹانے کے بعد تمہیں باربارا گروپ کا چیئرمین بنانا چاہتی ہے۔ مارک کے بعد تم سب سے زیادہ بھاری امیدوار ہو گے کرسی کے لیے اور حزب اللہ کے لیے فائدہ مند بھی۔" اس نے تفصیل بتائی تھی۔

"تم تو مجھے مرتے دم تک یہاں رکھنے والے تھے؟" اس نے تنک کر پوچھا تھا۔

"یہاں رہو یا وہاں، میری نظریں ہمیشہ تم پر ہونگیں۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ مائک نے گہری سانس لی۔

"بھائی کو ان کے کیے کا انعام مل جائے گا۔ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر باربارا گروپ کا چیئرمین بن جاؤں گا۔ تقریباً شیئرز میرے نام، بہت ساری طاقت اور ذلت سے چھٹکارا۔ اچھا ہے مجھے منظور ہے۔" اس نے ہامی بھر لی۔

”بہت اچھے۔ شاید اسی طرح تم بزدلی سے چھٹکارا حاصل کرسکو۔“ وہ طنز کے نشتر پھینکتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں اب میرے ساتھ کچھ تو نرمی کا سلوک کرنا چاہیے۔“ اس نے منہ بسورا تھا۔

”جندل نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں تمہارے ساتھ حد سے بھی زیادہ نرمی والا سلوک کرتا ہوں؟“ مسکرا کر پوچھتا وہ ہلکا سا ہنس کر پلٹ گیا۔ مائک پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یہ ذلالت تو شاید چیئرمین بننے کے بعد بھی اس کے نصیب میں تھی۔

☆☆☆

”سر یہ دیکھیں۔ ڈیوڈ نے جس شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے، ہم اسے ٹریس کرنے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔“ ایک لڑکے کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ اردگرد اپنی اپنی اسکرینوں میں سر دے کر بیٹھے لوگوں نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے اس لڑکے کی طرف آیا۔ لڑکے نے اسکرین اس کے سامنے کی۔ ایڈریس دیکھ کر اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔

”ہمیں مارک سر کو بتانا چاہیے وہ یقیناً اسے سراہیں گے۔“ اس لڑکے نے خوشی سے کہا تھا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور دو آدمیوں کے ساتھ مارک اندر داخل ہوا۔ وہ لڑکا جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہم نے اسے ڈھونڈ لیا سر!“ وہ چہکا تھا۔ مارک کے ماتھے پر بل پڑے۔ اگلے ہی لمحے وہ بات سمجھ گیا اور جلدی سے ان کے پاس آیا۔ ایک نگاہ ایڈریس پر ڈالی پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”اپنے ساتھ کچھ آدمی لو اور جلد از جلد انہیں پکڑو۔ خبردار کوئی بھی ہاتھ سے نہ نکل پائے!“ مارک نے حکم صادر کیا تھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ مٹھیاں سختی سے بھینچ لی تھیں۔ ہتھیلیاں نم پڑنے لگی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ مارک اس کے جاتے ہی اس لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔

”ڈیوڈ کے پیچھے ایک آدمی لگاؤ۔ آج کی رات اس سے بھی جان چھڑاؤ۔ اور پانچ چھے آدمیوں کو تیار کرو۔ آج زیاد تاشفین کا کھیل بھی ختم کرتے ہیں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔ وہ لڑکا سر اثبات میں ہلاتا اپنے کام میں لگ گیا۔ مارک گہری نگاہوں سے اسکرین کو دیکھتا اگلا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔

☆☆☆

”ڈیوڈ کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا ہے۔ وہ اس چِپ کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔“ سعاد کی بات پر وہ چاروں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”اس نے ایڈریس بھی بھیجا ہے۔ اسی لائبریری کا جہاں زیاد کام کرتا ہے۔ اب کیا کرنا ہے؟“ اس نے سوال کیا تھا۔

”جندل، تم فارغ ہو؟“ اس کی آواز کان میں لگے آلے کی وجہ سے باآسانی جندل نے سنی تھی۔

”ہاں۔ میں چلا جاتا ہوں اس سے ملنے۔“ اس نے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

”احتیاطی تدابیر اپنا لینا۔ ہم لوگ بس واپس آرہے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی تھی۔

”میں بھی آجاؤں گا۔ یہاں بس تھوڑا کام رہتا ہے، رات تک فارغ ہو جاؤں گا۔“ لائبریری میں کتابیں سمیٹتے زیاد نے کہا تھا۔ چند لمحوں میں پلان ترتیب دے دیا گیا تھا۔ کتابیں سمیٹتا زیاد جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگا۔ سعاد اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ڈرائیونگ کرتے بدر نے خیام کو دیکھا جسے اسی وقت کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔

”ایک قیدی رہا ہو رہا ہے۔ آج رات، بندرگاہ پر پہنچو۔ معاویہ ابن اعظم!“ وہ کوئی اطلاع نہیں تھی۔ وہ حکم تھا۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے اس پیغام کو دیکھنے لگا۔ پیغام کس قیدی کے متعلق تھا اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ لیکن بھیجنے والا معاویہ تھا لہٰذا اس کی صداقت پر اسے یقین تھا۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے پر سوچ نگاہوں سے سڑک کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر بدر کی طرف متوجہ ہوا۔

”گاڑی روکو بدر۔“ بدر نے تعجب سے اسے دیکھا پھر گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔ ”تم فوراً سعاد کے پاس پہنچو مجھے کچھ کام ہے یہاں۔“ اس نے اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن جا کہاں رہے ہیں اور اچانک سے کون سا کام پڑ گیا؟“ وہ پریشان ہوا تھا۔

”مجھے آنے میں دیر ہو جائے اور رابطہ نہ کر پاؤں تو سعاد سے کہنا عالیان کو ڈھونڈے۔“ وہ اسے ہدایت کرتا گاڑی سے نکل گیا۔ بدر نے پریشان نگاہوں سے بیک ویو مرر میں اسے ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا۔ ٹیکسی بالکل مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”اس نے کہا تھا وہ اگلے دن ہی لوٹ آئے گا۔“ سنان کی دھیمی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”شاید اسے قید کر لیا گیا ہو۔“ معاویہ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

”اگر اسے قید کر لیا گیا ہے تو ہم ایسے یہاں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتے۔“ عالیان نے تفکر سے کہا تھا۔

”ہمیں کچھ بھی کرنے سے پہلے معلوم کرنا ہو گا وہ کہاں ہے اور کس حال میں؟“ سنان اضطراب کی کیفیت میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ صوفے سے ہٹ کر وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ پردہ ہٹا کر نیچے گلی میں جھانکا۔

”آخر وہ کون لوگ ہیں جو ہر چیز تباہ کرتے ہوئے یہاں آ رہے ہیں؟ پہلے تمہارا گھر، پھر میرا اور اب دحیہ کا۔ چاہتے کیا ہیں وہ؟“ معاویہ نے پیشانی رگڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

”خیام لاپتہ ہے۔ زیاد زخمی ہے اور ازا کا کچھ معلوم نہیں۔ سعاد اور جندل بچ گئے ہیں مگر اس بچے کا کیا جس نے حال ہی میں اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی؟ وہ ظالم درندے ہیں جن کے دل پتھر کے ہیں۔“ عالیان کے لہجے میں نفرت

تھی۔ گلی میں دیکھتے سنان کی نگاہ پولیس موبائلز پر ٹکیں جو گنتی میں تین تھیں اور گھر کا محاصرہ کر رہی تھیں۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"پولیس آئی ہے۔" دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ یقیناً یہ خریدے جا چکے ہیں۔ ہمیں نکلنا ہو گا۔" عجلت میں کہتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ اٹھائی۔ وہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تیزی سے لاونج سے نکل کر وہ زینے چڑھ کر گھر کی چھت پر آئے۔ سنان نے مڑ کر زینوں پر کھلتا دروازہ بند کیا۔ اسی اثناء میں پولیس گھر کے دروازے کو توڑ کر اندر داخل ہو چکی تھی۔ معاویہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر نیچے کا جائزہ لیا۔ یہاں سے نیچے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نیچے بھی پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ اس نے متذبذب نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

"برابر والی چھت پر کود جاؤ، فوراً۔" سنان نے انہیں حکم دے کر اپنی پستول نکال کر لوڈ کی۔

"اور تم؟"

"میں انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم لوگ جلدی کرو۔" معاویہ اور عالیان نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا پھر نفی میں سر ہلایا۔

"تم پکڑے جاؤ گے۔ ہم ساتھ لڑیں گے، ساتھ مریں گے!" عالیان نے فیصلہ سنایا۔

"کچھ تو ہوش کے ناخن لو۔ دحیہ کو ڈھونڈو پھر مدد کے لیے آؤ۔ یہاں سے بچ کر نکلو گے تو کچھ کر پاؤ گے ناں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا یہ وعدہ ہے میرا۔ تم لوگ جلدی کرو بس۔" پولیس اہلکار زینے چڑھ رہے تھے۔ معاویہ نے اضطراب کی کیفیت میں اسے دیکھا۔ تیزی سے زینے چڑھتے اہلکاروں کے بوٹوں کی آواز اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ جلدی سے عالیان کے ہمراہ برابر والی چھت کی طرف بڑھا تھا۔ سنان نے چہرہ

موڑ کر اسے دیکھا۔

"سنو معاویہ! اگر میں قید ہو جاؤں تو رہائی کے وقت سب سے پہلے ملاقات کے لیے آنے والا میرا بیٹا ہو۔ میرا خیام ہو!" معاویہ نے مڑ کر اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"میرا وعدہ رہا۔" ایک آخری نگاہ اس پر ڈال کر وہ چھت پر کود گیا۔ اس کے پیچھے ہی عالیان نے بھی چھلانگ لگا دی۔ پولیس اہلکاروں نے دروازہ توڑ دیا۔ کئی پستولیں اس پر تان لی گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ پستول نیچے رکھ دی۔ ایک اہلکار نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑی لگائی۔ باقی عالیان اور معاویہ کی تلاش میں نکلے۔ جب اسے نیچے لے جایا جا رہا تھا تو اس نے پلٹ کر اس راستے کو دیکھا تھا جہاں سے وہ دونوں گئے تھے۔ ان دونوں کے لیے اتنا وقت کافی تھا، وہ دونوں یقیناً فرار ہو چکے تھے۔

اسی رات جب عالیان اور معاویہ نے دحیہ کی تلاش میں دو مختلف راستے اختیار کیے تو عالیان کو راستے میں ہی پولیس پکڑنے میں کامیاب ٹھہری البتہ معاویہ ہمیشہ کے لیے فرار ہو گیا تھا۔ وہ مجاہد جو ایک عرصے تک دشمنوں سے لڑتے آئے تھے اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں گہرے زخم کھا کر پورے قد سے گرے تھے۔ عالیان کو ایک ماہ بعد جعلی پولیس مقابلے میں مار دیا گیا۔ سنان کے لیے فیصلہ سنایا گیا کہ،

"سنان حنفی کو تا حکمِ ثانی قید میں رکھا جائے گا۔"

تا حکمِ ثانی! یعنی تا حیات۔ حکومتیں بدلیں گی، اقتدار کی کرسی پر نئے حکمران آئیں گے اگر کسی نے اس قیدی کو قابلِ توجہ سمجھا تو عدالت میں کیس چلے گا ورنہ عمر اسی قید میں کٹے گی۔ اور یہ تو پھر غلام قوموں کا دستور ہے، یہ اپنوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا فن جانتی ہے۔ جو لوگ ایک قوم کے انقلاب کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، اکثر و بیشتر اپنی ہی قوم کے ہاتھوں سولی پر چڑھائے جاتے ہیں۔ جند اللہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک حادثہ، پولیس کی

مداخلت اور اپنوں کی غداری نے اس تنظیم کی ایسی کمر توڑی کہ روشن اور بلند مقاصد کی بنیاد پر بننے والی تنظیم ریت کے ذروں کی طرح بکھر گئی۔ اب انتظار تھا کہ کب ان ذروں کو سمیٹ کر ساحل سے دور ایک مضبوط عمارت تعمیر کی جائے گی جسے سمندر کی کوئی لہر بہا کر نہ لے جاسکے۔ وہ پہاڑوں کی طرح سخت اور بلند ہو۔ فلک بوس ہو۔

☆☆☆

لائبریری آسمان پر تاریکی پھیلتے ہی سنسان پڑ گئی تھی۔ لمبی اور تاریک راہداریاں جن کے دائیں بائیں کتابوں کا ہجوم تھا سناٹے میں کھڑی تھیں۔ کانچ سی مقدس خاموشی ہر سُو چھائی ہوئی تھی۔ اس کے قدم دھیرے سے لائبریری کے فرش پر پڑے۔ احتیاط بھری نگاہوں سے اردگرد دیکھتا وہ بنا کسی چاپ کے ایک تاریک راہداری کی طرف آیا۔ یہاں دیوار کے دوسری طرف کھڑکی تھی جس کے پار اسٹریٹ لائٹ کی روشنی سی گلی روشن تھی۔ روشنی کی کچھ شعائیں کھڑکی سے ٹکرا رہی تھیں جس کی وجہ سے ایک حد تک راہداری کا آخری سرا بھی روشن ہو گیا تھا۔ اس نے اضطراب کی کیفیت میں پی کیپ درست کرتے ہوئے کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔

چند لمحات انتظار میں گزر گئے۔ وہ تذبذب سے دانتوں سے ہونٹ کچلتا کھڑکی کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ ایک طائرانہ نگاہ کھڑکی کے پار نظر آتے منظر پر ڈالی۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانہ دیکھ کر تسلی سے وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اگر وہ سامنے اس اونچی عمارت کی تیسری منزل پر بیٹھے سنائپر کو دیکھ لیتا تو یقیناً یہ غلطی نہیں کرتا۔ کتابیں دم سادھے اسے تک رہی تھیں۔ اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اس اثناء میں اسے اپنے پیچھے کوئی سایہ سا محسوس ہوا۔ وہ چونک کر پلٹا۔

"میں ہوں۔" جندل نے آرام سے کہا۔ سفید قمیض شلوار میں ملبوس، سیاہ رنگ کی شال کندھوں پر ڈالے وہ اب

اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈیوڈ نے سکون کی سانس خارج کی تھی۔ ”سن رہا ہوں۔“ وہ اب مکمل اس کی طرف متوجہ تھا۔

”وہ چِپ جس میں مَیں نے اسٹیون کے کہنے پر وارلڈ گلاس کمپنی کا خفیہ ڈیٹا سیو کیا تھا وہ اب بھی میرے پاس ہے۔“ اس نے وہی بات دہرائی تھی۔

”اور تم وہ ہمیں کیوں دو گے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔

”میں انتقام چاہتا ہوں، اپنے بھائی کا انتقام! انہوں نے بے دردی سے میری آنکھوں کے سامنے میرے بھائی کو مار دیا اور میں کچھ نہیں کر سکا۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

”آخری اطلاعات کے مطابق تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا؟“

”وہ سب صرف اپنے گھر والوں کو ان ظالموں کے عتاب سے بچانے کی خاطر کیا تھا میں نے۔“ جندل نے رک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت اس کی بات کی تصدیق کر رہی تھی۔

”دلال کو جانتے ہو؟“ اس کے سوال پر ڈیوڈ ساکت ہوا تھا۔ چہرہ ایکدم سپاٹ ہو گیا تھا۔ پتھریلی نگاہوں سے اس نے جندل کو دیکھا۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ جندل نے بغور اس کے ایک ایک تاثر کو دیکھا۔

”تم۔۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ اس کی آواز کانپ گئی۔

”دلال کون ہے؟!“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا تھا۔ ڈیوڈ کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ غیر محسوس طریقے سے اس نے پی کیپ نیچے سرکائی تھی۔ جندل نے اس کی حرکت کو بغور دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن دبوچتے ہوئے اس کی پی کیپ جھٹکے سے اتاری۔ اس کے بال ماتھے پر بکھر گئے۔ کان کے پیچھے وہ نشان واضح ہوا۔ وہی نشان جو دلال کا تھا۔ اس کی گردن پر جندل کی گرفت سخت ہوئی تھی۔

"تم جانتے ہو اسے، تم اسی کے آدمی ہو۔ بتاؤ دلال کون ہے؟" اس کی آواز تیز ہوئی تھی۔ مقدس خاموشی کانچ کی کرچیوں کی طرح بکھر گئی۔ اس نے جھٹکے سے اس کی گردن آزاد کر کے ایک مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑکی سے لگایا اور پے در پے کئی مکے اس کے جبڑے پر رسید کیے۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ ناک سے سرخ خون کے قطرے گرے۔ کھڑکی پر سرخ رنگ کا مائع گرا۔ وہ اس کی خاموشی پر مزید مشتعل ہوا۔ آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔

کھڑکی کے پار اس کی تاک میں بیٹھے سنائپر نے کان میں لگا آلہ آن کیا۔ اطلاع دی گئی کہ وہاں ڈیوڈ کے ساتھ ساتھ جندل بھی موجود تھا۔ اگلا حکم موصول کیا گیا اور اگلے ہی لمحے وہ نشانہ لے رہا تھا۔

"دلال کون ہے؟!" وہ غرایا تھا۔ ڈیوڈ نے نڈھال ہوتے ہوئے منہ میں جمع ہوتا خون فرش پر تھوکا تھا۔ جندل نے زوردار لات اس کے سینے پر ماری تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ جالگا تھا۔ ٹانگیں سیدھی کر کے بیٹھتے ہوئے اس نے گہری سانس لی تھی۔ سر چکرانے لگا تھا۔ چہرہ خون آلود ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ زوردار لات اس کے پیٹ پر رسید کی تھی۔ پھر اس کا گریبان پکڑ کر اسے کھڑا کرتے ہوئے اس کا سر دیوار میں مارا تھا۔ خون پتلی سی لکیر کی صورت میں اس کی پیشانی سے بہتا ٹھوڑی سے گرنے لگا تھا۔ اندر داخل ہوتی ازابیلا کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گری تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی بے ساختہ نکلتی چیخ کو دبایا تھا۔

اسے پیغام موصول ہوا تھا، مارک اس سے ملنا چاہتا تھا یہاں لائبریری میں۔ وہ اسے منع کر دیتی مگر پھر آخری بار اس سے بات کرنے کا سوچ کر یہاں آگئی اور یہاں اس نے مارک کو نہیں جندل کو پایا تھا۔ قریب تھا کہ ڈیوڈ ہوش و حواس کھو بیٹھتا جبکہ وہ اس کے خون میں نہایا ہوا تھا۔ گردن پر اور چہرے پر جا بجا خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں خوف اور بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ منہ سے سسکی نکلی تھی۔

جندل نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کا تنفس پھولا ہوا تھا۔ تیز تیز سانس لینے کی آوازیں لائبریری کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ اپنے خون آلود ہاتھ پر ڈالی پھر آنکھیں میچ کر گہری سانس لی۔ ازابیلا کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔ ڈیوڈ بے سدھ سا کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔

"بیلا میری بات سنو یہ۔۔" وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ سر نفی میں ہلاتی پیچھے ہٹنے لگی۔ خوفزدہ نگاہیں اس کے خون سے بھرے ہاتھوں پر ٹکی تھیں۔ اس نے بے بسی سے لب دانتوں میں دبائے۔ وہ رو رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو گال پر لڑھکنے لگے تھے۔ اسی اثناء میں کھڑکی کے پار بیٹھے سنائپر نے ٹریگر پر زور دیا۔ ہوا کی رفتار سے ایک گولی کھڑکی کے شیشے کو چیرتی ہوئی ڈیوڈ کے دماغ میں پیوست ہو گئی۔ کھڑکی کا شیشہ چھانکے سے چکنا چور ہو گیا۔ ڈیوڈ کو جھٹکا لگا اور اگلے ہی لمحے وہ بے جان ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ گرم سرخ خون سر کے راستے سے نکلتا فرش پر بہنے لگا۔ جندل تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"جندل رکو!!" وہ خوف سے چلائی تھی۔ ٹریگر پر زور دیا گیا۔ اس بار آنے والے گولی جندل کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا۔ ہاتھ مکمل خون میں ڈوب گیا۔ اس کی نگاہ سفید فرش پر ٹکی۔ خون اس کے قدموں میں پانی کی طرح بہنے لگا۔ درد کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ اسے اپنی گردن میں کچھ چبھتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ گردن پر رکھتے ہوئے وہ پتلی اور باریک سی سوئی گردن سے کھینچی تھی۔ سوئی ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گری۔ گردن پر خون کی بوندیں چمکیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہونا چاہا مگر تب تک ایک گولی اس کے کندھے کو چیرتی ہوئی نکلی تھی۔ اس کے پورے وجود نے جھٹکا کھایا تھا۔ ٹانگوں میں جان نہیں رہی تھی۔ سختی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔

اس نے دیکھا تھا کہ عین اس کی نگاہوں کے سامنے وہ پورا اونچا مرد چاروں شانے چت ہوا تھا۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ بال ماتھے پر بکھر گئے تھے۔ شال اور کپڑے سرخ میں خون میں رنگ چکے تھے۔ اس کے گرد خون کا ایک دائرہ سا بننے لگا تھا۔ وہ تیزی سے آگے آئی تھی۔ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔

"آنکھیں مت۔۔۔ بند کرنا پلیز۔" وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے رو رہی تھی۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ کی لاش گھوم گئی تھی۔ اپنے ماموں کا پورے قد کے ساتھ ڈھیر ہونا کسی فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے چل رہا تھا۔ اپنے رخساروں پر گرتے اس کے آنسوؤں سے انجان وہ اپنی ماں کو زندہ آگ کی نذر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھ سے نمکین پانی کا ایک قطرہ نکل کر کنپٹی سے بہتا بالوں میں جذب ہو گیا۔

"یہ مت کرنا۔ جندل پلیز۔۔" وہ رو دی تھی۔ وہ دھیرے سے آنکھیں موند گیا تھا۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے جو آخری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی وہ سعاد کی تھی،

"مجھے تم پر فخر ہے، اخی"!

☆☆☆

زیاد کا ارادہ جندل کے پاس جانے کا تھا مگر اپنے پیچھے تعاقب کاروں کو دیکھ کر اس نے راستہ بدل لیا تھا۔ مختلف موڑ مڑتا وہ کسی انجان راستے پر نکل آیا تھا۔ تعاقب کار پیچھے رہ چکے تھے۔ اس نے سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھنڈی سانس خارج کی تھی۔ اندھیرے میں سڑک پر روشنی کا روپیہ پھینکتیں گاڑی کی ہیڈ لائٹس ایک لمحے کے لیے پوری سڑک کو روشن کر دیتی تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ آگے بڑھ جاتا اور پیچھے اندھیرا ہو جاتا۔ یہی آنکھ مچولی جاری تھی کہ اسے سامنے سڑک پر روشنی نظر آئی تھی۔ وہ دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ اس کے لیے خطرے کا الارم بج چکا تھا۔ قریب آنے پر اس کے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے جلدی سے بریک پر پاؤں رکھے۔ گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے اپنی پستول اٹھا کر لوڈ کی پھر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اسی اثناء میں ان دو گاڑیوں کے دروازے بھی کھلے اور مارک اپنے آدمیوں کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

"یہ سڑک تمہاری قبر تک جاتی ہے، زیاد تاشفین!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ زیاد نے طائرانہ نگاہ اس کے دائیں بائیں کھڑے آدمیوں پر ڈالی۔ وہ گنتی کے پانچ تھے۔

"البتہ تمہاری قبر یہیں اسی مقام پر بنے گی۔" اس نے کندھے اچکا دیے تھے۔ مارک نے سختی سے مٹھیاں بھینچیں پھر سر جھکا کر طنزیہ ہنس دیا۔

"تمہاری کزن جس لڑکے کو پسند کرتی تھی اسے مارنے کے بعد میں آج رات شراب میں مست ہونا چاہتا تھا مگر سوچا ایک ہی بار تم سے بھی نپٹ لوں۔ یہ کزن کزن والا کھیل اب ختم کرتے ہیں۔ کیا کہتے ہو؟" زیاد نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا تھا۔ وہ جندل کی بات کر رہا تھا یقیناً وہ اسی کی بات کر رہا تھا۔ اسے پریشانی ہوئی تھی۔ مارک نے اپنے آدمیوں کو اشارہ دیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی پستولیں نکالی تھیں۔ وہ فوراً پیچھے ہٹا تھا۔ انہوں نے فائر کھول دیے، وہ جلدی سے گاڑی کے کھلے دروازے کی اوٹ میں ہوا۔

موقع ملتے ہی اس نے جوابی فائرنگ کی تھی۔مارک اور اس کے آدمی اپنی گاڑیوں کی اوٹ میں ہوئے تھے۔اس کی جوابی فائرنگ کے دوران دو آدمی مارے گئے تھے۔باقیوں کا پلڑا ابھاری رہا تھا۔سنسان سڑک پر فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔اندھیر سڑک پر جلتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کسی کا کوئی نشانہ خطا نہیں جارہا تھا۔پستول کی میگزین میں گولیاں ختم ہو چکی تھی۔اس نے جلدی سے گاڑی سے دوسری میگزین نکال کر پستول میں ڈالی۔اسی اثناء میں اس کی طرف سے خاموشی محسوس کر کے وہ آدمی اس کی گاڑی کے قریب آ گئے۔اس سے پہلے کہ وہ سامنے آتے اس نے جلدی سے اٹھ کر ان دونوں پر فائر کر دیے۔دھڑام کی آواز سے وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔مارک سختی سے لب بھینچ کر رہ گیا۔

اسے چند منٹ مزید لگے تھے اور وہ پانچویں شخص کا بھی کام تمام کر چکا تھا۔مارک کی پستول خالی ہو چکی تھی۔مسلسل بیس منٹ تک فائرنگ کرنے کی وجہ سے وہ تین سے چار میگزینیں خالی کر چکا تھا۔زیاد حالات کو سمجھ کر باہر نکل آیا۔اپنی گردن دائیں بائیں ہلائی پھر دونوں گاڑیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

"وقت ضائع کیے بنا آجاؤ۔" وہ حکم دے رہا تھا۔مارک نے جھٹکے سے اپنی پستول پھینکی پھر اس کے روبرو آن کھڑا ہوا۔پہلا وار زیاد نے کیا تھا جسے وہ فوراً پیچھے ہٹ کر ضائع کر گیا۔اس نے مڑ کر اسے مکا رسید کرنا چاہا مگر زیاد پھرتی سے ایک طرف ہوتا اس کی ٹانگ پر لات مار کر اسے لڑکھڑانے پر مجبور کر چکا تھا۔اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے عجلت میں کوٹ کی جیب میں چھپا خنجر نکالا جو اندھیرے کی وجہ سے زیاد نہیں دیکھ پایا۔اس نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچنا چاہی تو مارک اسے جھٹکے سے سڑک پر پٹختا اس کے بازو پر خنجر چلا چکا تھا۔خون کے چند قطرے سڑک پر گرے تھے۔اس نے زیاد پر وار کرنا چاہا مگر وہ کروٹ بدل کر اس کے وار کو ضائع کر چکا تھا۔جلدی سے کھڑے ہو کر اس نے مارک کا بازو پکڑ کر مروڑتے ہوئے اس کے ہاتھ سے خنجر گرایا تھا۔اگلے ہی لمحے زوردار لات اس کے

سینے پر رسید کی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا تھا۔ زیاد نے پے در پے کئی بار اسے ٹھوکر ماری تھی۔ اس کا چہرہ سڑک پر رگڑا گیا۔ جلد پھٹ گئی، خون رسنے لگا۔ اس کا سر گاڑی سے ٹکرایا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ باقی کام تمام کرنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ مارک نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"تم اپنے نہتے دشمن پر حملہ آور نہیں ہو سکتے۔" وہ رک گیا۔ پلک جھپک کر اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"ہو تو تم دونوں ایک ہی گندے خون کے۔ غیرت کا طعنہ دے کر بے غیرتی دکھانا تمہارے خون میں ہے۔"

نفرت سے کہتا وہ مڑ گیا۔ جھک کر سڑک پر گری اپنی پستول اٹھائی پھر مارک کی۔ اپنی گاڑی کے پاس آکر وہاں سے میگزین نکال کر مارک کی پستول میں ڈالی۔ وہ ہمت جمع کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ منہ میں جمع ہوتے خون کو فرش پر تھوکا۔

زیاد نے پستول اس کی طرف اچھال دی۔

اگلے لمحات میں وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ مارک پستول لوڈ کر رہا تھا اور وہ خود کو آنے والے ہر طرح کے لمحات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ایک اور خونی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر خون میں لت پت ضرار کا چہرہ گھوم گیا۔ بارش میں بھیگتی سعاد اور تیزی سے بہتا خون۔ اس نے سر جھٹکا تھا۔ مارک تیار ہو چکا تھا۔ دونوں نے نشانے لیے تھے۔

"انہوں نے مجھے بہت تکلیف دی ہے۔ مجھ سے میرے اپنوں کو چھینا ہے، مجھے بہت رلایا ہے۔" آخری لمحات میں اس نے نشانہ بدلا تھا۔ بیک وقت ٹریگر دبائے گئے تھے۔ اس کی گولی مارک کے کندھے کو چھو کر گزری تھی، مارک کی گولی نے اس کے بازو کو چیرا تھا۔ دونوں طرف ایک ہی آگ تھی، دونوں طرف غصہ تھا، نفرت تھی۔ دونوں ہی تکلیف دینا چاہتے تھے، پل پل تڑپانا چاہتے تھے۔

"انہیں دکھانا کہ اپنا کیا لوٹ کر آتا ہے۔ انہیں ویسی ہی تکلیف دینا جیسی انہوں نے مجھے دی۔" اسے اپنی پانچویں یا

چھٹی پسلی کے نیچے تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ مارک کو اپنا سینہ جلتا محسوس ہوا تھا۔ خون قطرہ قطرہ سڑک پر گرنے لگا تھا۔

"تم یہ کرو گے ناں زیاد؟ میرے لیے ٹریگر دباؤ گے ناں؟" اس بار اس کی پستول سے نکلی گولی مارک کے قلب میں لگی تھی۔ مارک کی پستول سے نکلی گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس نے بایاں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر سختی سے لب بھینچتے ہوئے مارک کو دیکھا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ سڑک پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے پستول پھینکی تھی۔ درد کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ خون تیزی سے بہنے لگا تھا۔ اس کے سفید جاگرز سرخ خون میں نہا چکے تھے۔ پی کیپ سر سے پھسل کر نیچے گری۔ بال پیشانی پر بکھر گئے۔ آنکھوں میں تکلیف کا تاثر ابھرا۔ اس نے قدم بڑھائے۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس نے سہارے کے لیے کچھ تلاش کرنا چاہا مگر کچھ میسر نہ ہوا۔ ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس کا سر چکرایا تھا۔ اگلا قدم اٹھاتے ہی وہ لڑکھڑا کر گرا تھا۔ سر سڑک سے ٹکرایا۔ اس نے خود کو بے بس محسوس کیا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے آسمان تھا۔ کھلا اور تاریک آسمان۔ آج آسمان پر گنتی کے بس چند تارے تھے۔ کل رات آسمان پر بہت سارے تارے تھے جنہیں سعاد کے ساتھ مل کر اس نے گننے کی کوشش کی تھی۔ سعاد، ہاں سعاد۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ اس کا کھلکھلاتا چہرہ ذہن کی اسکرین پر ابھرا تو اسے اپنی آنکھوں میں نمی ٹھہرتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اسے چھٹیوں میں اندلس جانے کا کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے رخساروں پر ہاتھ رکھے اسے خفا خفا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اسے ہچکی آئی تھی۔ ناک سے خون نکلا تھا۔ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ خاموشی میں

کسی کے بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی دوڑتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ ان قدموں کی چاپ سن سکتا تھا۔ کوئی حواس باختہ ہو کر بھاگ رہا تھا۔ ایک دو، وہ ان قدموں کو گن رہا تھا۔ اس نے کسی کو اپنے سر پر رکتے محسوس کیا۔ کوئی گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔

"زیاد۔۔۔بیٹے۔ آنکھیں مت بند کرنا زیاد۔ ہمت کرو دیکھو میں آیا ہوں، تمہارا باپ۔" وہ ان الفاظ کو صحیح سے سن نہیں پایا۔ وہ اس چہرے کو بھی دیکھ نہیں پایا۔ آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ نکل کر کنپٹی سے گرتا بالوں میں جذب ہو گیا۔ معاویہ نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کے زخموں کو دبا کر خون روکنے کی کوشش کی تھی۔ "زیاد۔ یہ دکھ مت دینا یار۔ اس بار نہیں، بس اس بار نہیں!!" اس کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔ اس کے لب دھیرے سے پھڑپھڑائے تھے، "بابا۔۔"

معاویہ کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سالوں بعد وہ اپنے بیٹے سے اس حال میں ملے گا جب اس کا وجود خون میں لت پت ہو گا اور وہ خفگی سے آنکھیں بند کر لے گا۔ کئی آنسو اس کے گالوں پر گرتے چلے گئے۔ جھک کر اپنے بیٹے کے بالوں پر لب رکھتے ہوئے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اس کی سسکیاں خاموش اور ویران سڑک پر کافی دیر تک گونجتی رہی تھیں۔

☆☆☆

انہوں نے غیر محسوس طریقے سے گھر کا محاصرہ کیا تھا۔ وہ گنتی کے آٹھ آدمی تھے۔ وہ چار آدمیوں کو گھر کے باہر مختلف پوزیشنوں پر کھڑا کر کے چار کے ساتھ اندر آیا تھا۔ دروازہ کھولنے میں انہیں کچھ خاص دقت پیش نہیں آئی تھی۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے ان چاروں کو نیچے کی تلاشی لینے کا حکم دیا جبکہ خود زینوں کی طرف بڑھا۔ زینے چڑھ کر اس نے ایک نگاہ ارد گرد ڈالی پھر تیزی سے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے جھٹکے

سے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ سعاد جو بدر کو اسکرین کی طرف متوجہ کر کے کچھ دکھا رہی تھی یک لخت چونک کر پلٹی تھی۔ اس نے جلدی سے اندر آکر دروازہ لاک کیا پھر ان دونوں کی طرف مڑا۔ سعاد اور بدر نے حیرت سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھا۔ مکمل سیاہ لباس میں ملبوس، چہرہ ماسک میں چھپائے اور سینے پر ڈی ڈبلیو کا بیج لگائے وہ شخص اندر کب آیا انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا۔ سعاد کی نگاہیں بے اختیار اس کے ہاتھ میں موجود پستول پر ٹکی تھیں۔

"پریشان مت ہو۔ میں سب بتاتا ہوں، پہلے ہمیں ان آٹھ آدمیوں سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے۔ چار نیچے گھر میں ہیں اور چار باہر۔" اس کی بات پر ان دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا۔ گویا وہ اس پر یقین کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے، بعد میں تسلی سے سب بتاؤں گا۔" اس کے اٹھے کندھے ڈھیلے پڑے تھے۔ سعاد نے مشکوک نگاہوں سے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"جو گھر میں ہیں وہ اب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے۔ ان کا بندوبست ابھی کر دیتی ہوں میں، البتہ باہر والوں کو بدر کے ساتھ سنبھال لیں آپ جو بھی ہیں۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ اس نے بدر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سعاد جلدی سے اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس طرح کے کسی بھی حالات کے لیے اس نے تمام بندوبست کر رکھے تھے۔ صرف ایک بٹن دبانے کی دیر تھی اور گھر کے بیرونی دروازے اور چور راستے بند ہو چکے تھے۔ کسی کے لیے بھی اب یہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

البتہ سوال اب یہ تھا کہ آخر وہ لوگ خیام کے گھر پہنچے کیسے تھے؟ اس نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔ کچھ ہی لمحات میں کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر آئے۔

"کیا ہوا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”ہو گیا کام۔ اب یہ بتائیں وہ آپ کو ٹریس کرنے میں کامیاب کیسے ہوئے؟“ وہ بھنویں ملائے خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سعاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ ذہن میں کچھ کلک ہوا۔

”ڈیوڈ کے پیغام کے ذریعے۔ ڈیوڈ نے جس سے بھی رابطہ کیا وہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، جیسے یہاں۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”اگلی بار خیال رکھیے گا سعاد! آپ کی ایک خطا سب خطرے میں ڈال سکتی ہے۔“ وہ اسے نرمی سے نصیحت کر رہا تھا۔ سعاد نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں تعجب کا تاثر ابھرا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں چرا گیا تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ وہ پلٹنے لگا تھا جب سعاد کی نگاہ اس کی ہتھیلی پر ٹکی۔ اس کی ہتھیلی پر وہ نشان، اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ اس کے راستے میں آئی تھی۔

”ضرار بن ولید!“ اس نے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کا نام لیا تھا۔ بدر نے حیرت سے دونوں کو دیکھا تھا۔ جبکہ وہ، وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ وہ کیسے بھول گیا تھا جس لڑکی کے ساتھ اس کا بچپن گزرا تھا، جس کا وہ بے حد احترام کیا کرتا تھا، ایک ہی نگاہ میں اسے پہچان سکتی تھی۔۔!

☆☆☆

وہ ٹیکسی سے اترا تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسے چھو کر گزرا۔ اس کا لانگ کوٹ ہوا کے زور سے پھڑ پھڑایا۔ اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ سیاہ تاریک آسمان جس کی تاریکی نے ستاروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی پھر قدم آگے بڑھائے۔ اطلاع کے مطابق بحری جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا تھا۔ جہاز سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے ڈرم تھے جنہیں مشینوں کے ذریعے منتقل کیا جا رہا

تھا۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جس قیدی کے متعلق بھی وہ پیغام تھا وہ اسی راستے سے گزر کر آگے جائے گا۔ وہ چہرہ ترچھا کر کے منتظر نگاہوں سے سامنے دیکھنے لگا۔ دور سمندر میں کھڑا بحری جہاز برقی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا میں سمندر کی نمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے رک کر سینے میں قید سانس خارج کی تھی۔

سمندر اسے کبھی دلچسپ نہیں لگے تھے، اسے سمندروں سے خوف آتا تھا۔ وہ بس، جندل کو پسند تھے۔ گہرے اور پراسرار، خطرناک اور لمحوں میں سانس روک دینے والے، جان نکال دینے والے سمندر۔ اس نے سر دیوار پر ٹکا دیا۔ سیاہ کوٹ پینٹ پر خاکی رنگ کا لانگ کوٹ پہنے وہ ٹھنڈ سے بچنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن باجود اس کے سرد ہوا اسے ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے دور سے ایک قیدی کو آتے دیکھا تھا۔

وہ ایک ہیولا سا تھا جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں مگر انہیں اتارنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ انہی ہتھکڑیوں کے سبب اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ اسی قیدی سے ملنے آیا تھا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ قیدی بہت سست رفتار سے چل رہا تھا۔ شاید وہ تھکا ہوا تھا، تھکن بھی برسوں کی تھی۔ وہ قریب آ رہا تھا یہاں تک کہ وہ روشنی کی زد میں آ گیا۔ اس کا چہرہ واضع ہوا۔ بال مکمل سفید تھے اور چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ گال کی جلد پھٹی ہوئی تھی، زخم تازہ معلوم ہوتے تھے۔ ہونٹ بالکل سوکھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑے بہت ہلکے اور بہت پرانے تھے۔ ہاتھوں میں موجود ہتھکڑیوں کی حرکت سے خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔
ہتھکڑیاں ایک عرصے سے لگی ہوئی تھیں تبھی اس کی ہتھیلیوں پر گہرے زخم بن چکے تھے جن سے قطرہ قطرہ خون گر رہا تھا۔ کمزور اور لاغر سا وہ وجود اس پر نگاہیں ٹکائے آگے بڑھ رہا تھا۔

خیام ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ چہرہ کچھ مانوس سا تھا۔ ہاں گزرے وقت نے اپنے نشان اس پر چھوڑ دیے تھے مگر اب بھی وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ وہ آنکھیں، نرم سا تاثر لیے وہ گہری آنکھیں اسے آئینے میں اپنی آنکھوں کا عکس لگی تھیں۔ وہ ہلکے بھورے بال ہوا کے زور سے پیشانی پر بکھرے تھے۔ وہ چونک گیا تھا۔ تعجب سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ کندھے جھک گئے تھے، گردن تنی ہوئی نہیں تھی، چہرے پر جھریاں تھیں مگر وہ شخص، ماضی کا سنان حنفی تھا۔ اس کی یادداشت اچھی تھی یا اس کا باپ بدلا نہیں تھا۔ زمانے کے ظلم و ستم میں بھی وہ ڈٹ کر کھڑا رہا تھا۔ اسے سانس لینا دشوار لگا تھا۔ وہ شخص، وہ قیدی اس کا باپ تھا۔ خیام حنفی کا باپ سنان حنفی!

”سنو معاویہ! اگر میں قید ہو جاؤں تو رہائی کے وقت سب سے پہلے ملاقات کے لیے آنے والا میرا بیٹا ہو۔ میرا خیام ہو!“ سنان اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ وہ گنتی کے پندرہ قدموں کے فاصلے پر بھی بخوبی اپنے بیٹے کو دیکھ سکتا تھا۔ معاویہ نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا، اس کا خیام اس کے سامنے تھا۔ اسی کی جوانی کا عکس، ہو بہو اس جیسا۔ وہ بڑا ہو گیا تھا۔ قد میں اس سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ آنکھیں ذہانت سے چمک رہی تھیں۔ ہر انداز میں رعب تھا، شخصیت مضبوط تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ پلکوں سے پانی کا شفاف قطرہ جھول کر گال پر لڑھکا تھا۔

وہ اس مسکراہٹ کو کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ آئینے میں کھڑے ہو کر اپنے باپ کی طرح مسکرانے کی کوشش کرتا تھا، وہ اپنی کوششوں کو کیسے بھول سکتا تھا؟ یہ وہی انداز تھا، یہ وہی مسکراہٹ تھی، یہ شخص اس کا باپ تھا۔ یہ شخص سنان حنفی تھا۔ گواہی اس کے دل نے دی تھی، آنکھوں سے گرتے آنسوؤں نے مرحبا کہا تھا۔ اسٹک ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔ قدم بے اختیار اٹھے تھے۔

”بابا۔۔“ لب پھڑپھڑائے تھے۔ سنان نے یہ سرگوشی بخوبی سنی تھی۔ آنکھوں سے کئی آنسو بہتے چلے گئے۔ اس نے بانہیں پھیلانا چاہیں، اپنے بیٹے کو مرحبا کہنا چاہا مگر اسے وقت نہیں مل پایا۔ فائر کی آواز گونجی اور اس کے پورے

وجود نے جھٹکا کھایا۔ خیام کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ نگاہیں ساکت ہوئیں۔ سنان کا وجود سُن ہو کر رہ گیا۔ خون کے چند قطرے اس کے پیٹ کے راستے سے نکلتے سڑک پر گرے۔ ایک اور فائر ہوا۔ گولی اس بار اس کے قلب میں پیوست ہوئی۔ اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا تھا۔ آنکھوں میں جمع ہوتے آنسو ٹھہر گئے تھے۔ لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔ اس نے اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے باپ کو گرتے دیکھا۔ اس کا سر سڑک سے ٹکرایا۔ گرم انسانی خون تیزی سے اس کے گرد پھیلنے لگا۔ اس نے سانس لینا چاہی، وہ سانس نہیں لے پایا۔

مرجُ البحرین، ہاں اسے کہتے ہیں مرج البحرین! وہ راستہ جو دو سمندروں کو جدا کرے۔

ماضی اور حال کے دو کرداروں کے بیچ موت کا حائل ہو جانا، دو دلوں کے بیچ بدگمانیوں کا آجانا، لمبی جدائیوں کے بعد چند پل کی ملاقات اور ایک بار پھر جدائی کا طے پانا اور زمانے کے بچھڑے ہوؤں کا یوں ملنا کہ درمیان میں کوئی تعلق باقی نہ رہا ہو۔ اسے کہتے ہیں مرج البحرین!!

ایک سمندر سنان تھا دوسرا خیام، وہ جو ساکت نگاہوں سے اپنے باپ کو آخری سانسیں لیتا دیکھ رہا تھا۔ جندل اور ازا، وہ جو اس کا سر اپنی گود میں رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ زیاد اور معاویہ، وہ جو اس کے بالوں پر اپنے لب رکھتا ہچکیوں سے رو دیا تھا۔ ضرار اور سعاد، جو سانس روکے اپنے مقابل کھڑے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کی نگاہوں میں اس کے لیے پہلے سے کئی گنا زیادہ احترام تھا۔ مرج البحرین قائم ہوا تھا، دو سمندر کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔

☆☆☆

•باب : چہارم

•لاغالب الا اللہ

•اے امیر کارواں!

کیا تم نے نہیں دیکھا؟

ماؤں کا بلکنا اور یتیموں کا رونا۔۔

دور کسی سرزمین پر خون کی ندی بہہ رہی ہے،

وہ کھٹی پھٹی لاشیں اور جلتے ہوئے خواب،

ایک وطن اجڑا ہے، اک قوم مری ہے۔

غلامی کی زنجیریں اور آزادی کے نقارے،

ٹکراتی ہوئی تلواریں اور دوڑتے ہوئے گھوڑے۔۔

کیا تم نہیں دیکھ رہے اپنے لشکر کا مرِ مٹنا؟

سنو، یہ وطن تمہارا ہے۔

یہ لوگ تمہارے اپنے ہیں، یہ خون تمہاری ماؤں کا ہے۔

کیا تم نہیں جانتے تم خدا کے نائب ہو؟

اپنے لشکر کے امیر اور کارواں کے سالار؟

تم پیٹھ دکھا کر بھاگے ہو، تم پر افسوس ہے۔

تمہاری تلوار زنگ آلود ہے، یہ تمہیں چیر کر نکلے۔۔

آسمان تمہیں دھتکارے، زمین تمہیں قبول نہ کرے۔

اٹھو، کہ یہ وقت ماتم کا نہیں ہے۔۔

اٹھو کہ تمہیں اپنے لشکر کو سمیٹنا ہے،

جاگو کہ رات کی تاریکی چھٹ چکی ہے،

ہوش کرو کہ تم امیر کارواں ہو!

سنو اس سیف اللہ کی پکاریں،

وہ کانوں میں گونجتے ھل مِن مُبارز کے نعرے،

تم کیسے امیر ہو، تم کیسے سالار ہو؟

زمین خون مانگتی ہے، آزادی جان لیتی ہے،

تم کیوں خائف ہو، یہ لوگ تمہارے ہیں۔

گھوڑوں کی پیٹھوں پر ننگی تلواریں لہراتے مجاہد،

تمہارے حکم کے منتظر ہیں، یا امیر!

یہ لوگ مر مٹنے آئے ہیں، انہیں کٹ جانے دیجیے۔

سیف اللہ کے نقشِ قدم پر چلیں، آگے بڑھیں،

کہ قومیں وہیں زندہ رہتی ہیں،

مزاحمت جن کے خون میں بسی ہو۔

غازیانِ اسلام، سیف اللہ جیسا امیر چاہتے ہیں،

اٹھیں، کہیں روزِ محشر آپ کا گریبان ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔

اس سالار کو یاد کریں، شہادت جسے مطلوب تھی،

وہ کیسا مرد تھا کہ جس کے نعروں سے دشمن لرزتا تھا،

وہ سیف اللہ تھا، خدا کی تلوار تھا۔

تلوار بھی ایسی جو خون میں رنگی تھی۔۔

جاگیں اے امیر، کہ موت تقدیر میں ہوئی تو،

آپ سے ملاقات حوضِ کوثر پر ہو گی۔

سیف اللہ کے ہمراہ، مجاہدوں کے حصار میں۔۔!

•سیف اللہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

کھڑکی سے چھن کر کے آتی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اس نے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے جھک کر ان نرم پھولے ہوئے گالوں کو چھوا۔ انگشت شہادت دودھیا گالوں سے ہوتی اس کی گردن پر آئی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ اسے گدگدی کرتا کھکھلا کر ہنسا تھا۔ اسی لمحے کوئی اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

"یہ کتنا پیارا ہے۔ گول مٹول بھالو جیسا۔" اس نے چہک کر کہا تھا۔ نگاہیں بستر پر لیٹے بچے پر ٹکی تھیں جو آنکھیں کھولے غور سے اس چہرے کو دیکھ رہا تھا جو اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔

"ہاں یہ پیارا ہے۔" اس کی تائید کی گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس بچے پر جھکا۔ جھک کر نرمی سے اس کے گال کھینچے تھے۔ بچے نے کلکاری بھری تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" اس کے سوال نے پیچھے کھڑے شخص کو چونکایا تھا۔

"نام، معلوم نہیں۔ کبھی سوچا نہیں۔" اس شخص کے جواب پر اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ اس ایک سال کے بچے کا کوئی نام نہیں تھا، وہ حیران ہوا تھا۔ "تم دے دو اسے کوئی نام۔" وہ ٹھہر سا گیا تھا۔ مسکراہٹ دھیرے سے سمٹ گئی تھی۔ محبت بھری نظروں سے اس بچے کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار جھک کر اس کا ننھا سا ہاتھ تھاما تھا۔

"مصعب، اس بچے کا نام مصعب ہو گا۔" ایک آنسو پلکوں سے جھول کر گال پر لڑھک گیا۔

"مصعب الزر قاوی، تمہیں یہ نام بہت کچھ یاد دلائے گا خیام۔" نرمی سے کہا گیا تھا۔ وہ لب سختی سے دانتوں میں دبا گیا۔

"کیا میں اسے اپنا بھائی بنا سکتا ہوں؟ مصعب حنفی نہ سہی مصعب الزر قاوی ہی۔" اس نے آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس تمام عرصے میں اس نے مڑ کر پیچھے کھڑے شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کے عقب میں کون کھڑا تھا، اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز تو سامنے لیٹا "مصعب الزر قاوی" تھا۔

"یہ تمہارا بھائی ہے۔ اسے تمہارے حوالے کرنے آیا ہوں۔" کئی آنسو اس کے گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔ اسے اس کا بھائی مل چکا تھا۔ ہاں رگوں میں دوڑتے خون میں فرق آ گیا تھا مگر جہاں دل مل جائیں وہاں خون اپنی وقعت کھو دیتا ہے۔ جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے وہ سسک اٹھا تھا۔ تبھی پیچھے کھڑے شخص نے آگے بڑھ کر اپنی بانہوں میں لیٹی بچی کو مصعب کے برابر میں لٹایا تھا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

"اس کا نام افق ہے۔ اسے بھی ایک بڑے بھائی کی ضرورت ہے۔" آواز رندھی ہوئی تھی۔ لہجے میں کرب تھا۔ وہ ٹھہر کر اس بچی کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت چھوٹی سی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید چند ہفتوں کی یا ایک ماہ کی۔ مصعب کی طرح

وہ صحت مند اور گول مٹول نہیں تھی بلکہ بہت کمزور سی تھی۔

”اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”کل رات دونوں مارے جا چکے ہیں۔ افق بھی یتیم ہے۔“ اس کا دل ایکدم زور سے دھڑکا تھا۔ ”میری پوتی کا خیال رکھنا خیام! بالکل جیسے ایک بھائی اپنی بہن کا رکھتا ہے۔“ بھیگی آواز میں اسے ہدایت کی گئی۔ وہ شخص پلٹ گیا۔ وہی شخص جسے وہ ”الزر قاوی سر“ کہا کرتا تھا۔ وہ چند پل بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر نگاہوں کا رخ افق کی جانب کیا۔ وہ الزر قاوی سر کی پوتی تھی، ان کا خون تھی۔ یہ شخص حال ہی میں اپنے جوان بیٹے کو دفنا کر آیا تھا۔ اور اس بیٹے کی نشانی کو اس کے پاس چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ نچلا لب دانتوں سے کاٹتا آگے آیا۔ متذبذب سی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے گال کو چھوا۔ اسے لگا اس نے روئی کو چھو لیا ہے۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اسے اس کا غم بانٹنے کے لیے دو ساتھی مل چکے تھے۔ دیر سے ہی سہی مگر وہ مل چکے تھے۔

وہ ساتھی، جن سے محبت کب اس کی رگوں میں خون کی طرح سرایت کر گئی وہ انجان رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے خود کو کھلے اور وسیع میدان میں پایا تھا۔ گرد و پیش میں ہزاروں لوگ تھے جو خود میں مگن تھے۔ کسی کے پاس فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس کے پاس ٹھہر سکے۔ کچھ جہاز سے اترنے والے مسافروں میں اپنے گھر والوں کو تلاش کر رہے تھے اور کچھ اگلی فلائیٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ عجیب سا حال تھا۔ کوئی بھاگ رہا تھا، کوئی بیٹھ رہا تھا، کوئی خوشی سے ہنس رہا تھا اور کوئی اپنوں کی جدائی پر رو رہا تھا۔

وہ ان سب کے درمیان میں کھڑا تھا۔ سیاہ جینز پر سفید اپر پہنے نم آنکھوں سے اردگرد کے نظارے دیکھتا مصعب الزر قاوی، جس کی عمر لگ بھگ دس سال معلوم ہوتی تھی۔ اس کی دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں اور سانس لینا محال

ہو رہا تھا۔ ارد گرد کی تمام آوازیں تھمتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کسی کی بھاری آواز بار بار اس کی سماعت سے ٹکرا کر ہتھوڑے کی طرح دماغ پر برس رہی تھی۔

”تم مصعب الزر قاوی، دحیہ یوسف زئی کے بیٹے ہو۔ سعاد یوسف زئی تمہاری بہن ہے، جندل یوسف زئی اور خیام حنفی تمہارے بھائی ہیں۔ انہیں کبھی بھولنا مت اور خبردار انہیں یاد کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ تم انہیں پہچاننے سے انکار کرو گے، تم انہیں دیکھ کر اپنے اٹھتے قدموں کو تھمنے نہیں دو گے۔ تم تنہا رہو گے مصعب! بھیڑیے تنہا ہی ہوتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ اس نے لب بھینچتے ہوئے اپنی سسکی دبائی پھر بے اختیار پلٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑے شخص کو دیکھا تھا۔

”دادا، مجھے الوداع تو کریں۔“ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔ آواز بھیگ گئی تھی۔ اس شخص کے پتھریلے تاثرات میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا۔ وہ یونہی پتھر کا بنا کھڑا رہا۔ اس نے قدم بڑھانا چاہے مگر وہ آگے نہیں بڑھ پایا۔ منہ سے سسکی نکلی تھی۔ ”ایک بار گلے لگا لیں۔“ آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر گال پر پھسل گیا۔ اس شخص نے ایک اجنبی سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”تمہیں رونا نہیں رلانا ہے، مصعب الزر قاوی!!“ چہرہ سپاٹ تھا۔ لہجہ بھاری تھی۔ وہ کہہ کر پلٹ چکا تھا۔ اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ مصعب کو اپنا دل رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر جا رہا تھا، اس بھری دنیا میں ایک اجنبی ملک میں بالکل تنہا۔ اسے اپنی لڑائی خود لڑنے کے لیے درندوں کے آگے ڈال دیا گیا تھا۔ ایسے درندے جو اگر صرف اس کا نام جان لیتے تو خون پینے کو تیار ہو جاتے اور تب تک نہ رکتے جب تک جسم سے خون کا آخری قطرہ نہ نچوڑ لیتے۔ اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے لب دانتوں سے کچلتے ہوئے سر جھکایا تھا۔ گالوں پر گرتے

آنسوؤں پر بند باندھا گیا تھا۔ وہ اگر میدان میں آچکا تھا تو اسے اپنی جان کی خاطر لڑنا بھی تھا۔ اسے لڑنا تھا کیونکہ، گدھ ہمیشہ بھیڑیوں کی تاک میں رہتے ہیں۔

☆☆☆

لائبریری کے باہر ایمبولینس کے سائرن کا شور اٹھا تھا۔ ازابیلا تیزی سے باہر آئی تھی۔ وہ لوگ اسٹریچر نکال رہے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے انہیں جلدی کرنے کا کہہ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحات میں وہ ان کے ہمراہ راہداری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لائبریری روشن ہو چکی تھی، سفید چمکتے فرش پر بہتا خون اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں کتابوں کے درمیان میں چلتی اس طرف آئی تھی جہاں جندل خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہی وہ لوگ بھی آ گئے تھے۔ جلدی سے انہوں نے آگے بڑھ کر جندل کی نبض دیکھی تھی۔ ازابیلا فکر مندی سے انہیں دیکھ کر کھڑکی کے پاس ڈیوڈ کی بے جان لاش کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں کہ وہاں اب کوئی لاش نہیں تھی۔ جب وہ باہر گئی تھی تب لاش یہیں موجود تھی، باہر جا کر دوبارہ اندر آنے میں اسے کم و بیش دو منٹ لگے تھے۔ ان دو منٹوں میں لاش غائب کر دی گئی تھی۔

جندل کو اسٹریچر پر ڈالا جا چکا تھا۔ وہ جلدی سے دائیں طرف مڑی تھی۔ ایک کے بعد ایک راہداری دیکھی تھی اس نے مگر کہیں کسی کے آثار نہیں تھے۔ وہ پریشانی سے ماتھے پر بل ڈالے باہر آئی تھی۔ جندل کو ایمبولینس میں لے جایا جا رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگی تھی جب ایک شخص نے اشارے سے اسے روک دیا۔

"مجھے ساتھ جانا ہے۔" اس نے دوبارہ آگے بڑھنا چاہا مگر وہ شخص اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اسے پیچھے رہنے کا کہا اور خود ایمبولینس کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے لمحات میں ایمبولینس کے سائرن بجنے لگے اور وہ دور جاتی دکھائی دی۔ ازابیلا جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف آئی۔ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور بنا

وقت ضائع کیے گاڑی ایمبولینس کے تعاقب میں ڈال دی۔ اس کی گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہونے پر لائبریری کی دیوار کی اوٹ سے وہ لڑکا نکلا تھا۔ سیاہ پی کیپ ماتھے پر ٹکائے چہرے کو سفید رومال سے ڈھکے وہ ڈیوڈ کی لاش کو گھسیٹتا اپنی گاڑی تک لایا۔ ڈگی کھول کر لاش اس میں اڑسی پھر ڈگی بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔ اگلے ہی لمحات میں اس کی گاڑی بھی ایمبولینس کے تعاقب میں تھی۔

وہ تقریباً دس منٹ تیز رفتار سے چلتے رہے تھے۔ انہوں نے اسپتال کے راستے کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا جو ازابیلا کو پریشان کر گیا تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور اسی اثناء میں سیاہ رنگ کی ایک گاڑی پوری رفتار سے اسے کراس کرتی آگے بڑھ گئی۔ کچھ آگے جا کر اس کی رفتار کم ہو گئی۔ ازابیلا کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ وہ اس گاڑی کے قریب پہنچ گئی۔ اسی وقت اس لڑکے نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس لڑکے کی گاڑی آگے بڑھ گئی جبکہ وہ اب یوٹرن لے رہی تھی۔ لڑکا بہت تیز رفتار میں ڈرائیونگ کرتا ایمبولینس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ ایک سنسنان سڑک پر آئے۔ سڑک کنارے ایک بڑا اٹرالہ کھڑا تھا۔ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایمبولینس تیزی سے اس کے اندر جا چکی گئی۔ دروازے بند ہو گئے۔ اس نے فکرمندی سے اپنی پیشانی رگڑی۔ گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔ وہ انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ ٹھیک تیس منٹ بعد دروازے کھلے، ایمبولینس باہر آئی اور آگے بڑھ گئی۔ اس کے تعاقب میں جاتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ ان تیس منٹ میں کچھ برا کیا جا چکا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچ گیا تھا۔ ایمبولینس اب اسپتال کے راستے پر تھی۔ اس نے تسلی کر کے موڑ کاٹا اور گاڑی واپسی کے راستے پر دوڑنے لگی۔

☆☆☆

ایمبولینس کا مسلسل بجتا سائرن اور راہداری میں دوڑتے کئی لوگ، اسپتال میں کہرام مچ چکا تھا۔ ڈاکٹرز کی فوج آپریشن تھیٹر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ خون میں لت پت زندگی اور موت کی جنگ لڑتا مارک، اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کسی کو امید نہیں تھی وہ بچ جائے گا۔ ہر طرف اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز کے چہرے پر یکے بعد دیگرے کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ وہ خون روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کے وجود سے نکلتا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں۔ وہ اب مایوس ہونے لگے تھے۔ خون کو روکنا ناممکن لگا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے تھک کر اپنے سفید دستانے جو خون میں رنگے ہوئے تھے، اتار دیے۔ ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دروازہ کھلا اور کچھ گارڈز اندر آئے۔ اسے اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ اسٹریچر کے ٹائر چرچرائے۔ اس کے پیچھے ڈاکٹرز بھی راہداری میں تیز رفتار سے چلنے لگے۔

"بار بار اگروپ کی طرف سے زور دیا جا رہا ہے، مارک کو وہ دوسرے اسپتال میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جو انہی کے زیرِ نگرانی ہے۔" کسی نے بھاگتے ہوئے کہا تھا۔ اسٹریچر باہر لایا گیا۔ ایمبولینس کا دروازہ کھلا۔ دو ڈاکٹر مارک کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گئے۔ دروازے بند ہوئے۔ سائرن بجاتی ایمبولینس دور جانے لگی۔ وہ اسپتال کے دروازے کے ساتھ والی دیوار سے ٹیک لگا کر دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ رات کے اس پہر روشنیوں میں نہائی عمارت کے دروازے کے پاس کھڑا وہ انہی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ چہرے پر موجود سفید رومال واضح نظر آ رہا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے وہ گنتی کر رہا تھا۔ مدھم سی آواز میں کسی سرگوشی کی مانند۔

تین دو ایک، گنتی پوری ہونے پر اس نے کلائی میں بندھی گھڑی کو دیکھا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری۔ وقت ہو چکا تھا۔ سڑک پر دوڑتی ایمبولینس کے نیچے لگا بم زوردار آواز سے پھٹا تھا۔ لمحوں میں ایمبولینس کے پرخچے اڑ گئے

تھے۔ دھماکے کی زوردار آواز نے تاریکی میں ہر ذی نفس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے تھے۔ انسانی گوشت کے ٹکڑے آگ کی نذر ہو رہے تھے۔ گرم سرخ خون آگ کو مزید بھڑکا رہا تھا۔ سڑک پر بہتا سرخ خون بارش کے پانی کی طرح لگ رہا تھا جو سڑک کے کنارے پر جمع ہو گیا ہو۔

مارک مر چکا تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈاکٹرز اور ایک ڈرائیور بھی مارا جا چکا تھا۔ بار بار اگروپ کے چار افراد دھماکے میں جان بحق ہو چکے تھے۔ کان میں لگے آلے کے ذریعے کسی کو اطلاع دیتا وہ سفید رومال والا لڑکا مسکرایا تھا۔ مسکراتی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ آنکھوں کے کنارے سلوٹیں سی پڑی تھیں۔ انتقام لیا جا چکا تھا، ہزاروں معصوموں کا انتقام۔

☆☆☆

وہ حواس باختہ ہو کر ریسپشن کی طرف آئی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے تھے۔ آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کچھ پوچھا تھا۔ اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ جواب ملتے ہی وہ آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلتی راہداری کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے پیچھے آتے بدر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ دماغ سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ لفٹ میسر نہ ہونے پر وہ تیزی سے زینوں کی طرف آئی تھی۔ چشمے کے پار آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ وہ زینے پھلانگ کر دوسری منزل پر آئی تھی۔ مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ پہلا قدم کمرے میں رکھتے ہی نگاہ سامنے پڑی تو اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ مشینوں میں جکڑا دنیا و مافیہا سے بے خبر لیٹا جندل جس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگایا ہوا تھا۔ ہاتھ پر برنولا لگا تھا، ڈرپ میں موجود سفید مائع دھیرے دھیرے اس کے جسم میں اتر رہا تھا۔ وہ بے اختیار آگے آئی تھی۔ نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ کئی آنسو گال پر لڑھک گئے۔ جھک کر اس کے ماتھے پر لب رکھتے ہوئے اس کے منہ سے سسکی نکلی

تھی۔ بدر نے غمزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے بھائی کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ ہی تو اٹھی تھی۔

”آپی، آپ بھائی کو دیکھ آئیں۔ میں جندل کے پاس ہوں۔“ اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے بدر کو دیکھا۔ بدر کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکی دباتی باہر کی طرف بڑھی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر آئی تو دل درد سے پھٹتا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں سے آنسو زاروقطار بہنے لگے تھے۔ ہمت جمع کر کے وہ برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ نگاہ سامنے اٹھی تو اسے اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر اس کی خون آلود جیکٹ، پی کیپ اور دوسری چیزوں کے ساتھ خون میں بھرے جاگرز رکھے تھے۔ جبکہ وہ دوسری طرف مشینوں میں جکڑا آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ اس کے سرہانے کھڑا معاویہ اسے دیکھ کر پیچھے ہٹا تھا۔

وہ آگے آئی تھی۔ آرام سے نقاب کو ٹھوڑی پر ٹکایا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس کی پیشانی پر گرے بالوں کو ہٹایا تھا۔ ٹپ ٹپ۔۔ کئی آنسو گالوں سے بہہ کر ٹھوڑی سے گرتے چلے گئے۔ معاویہ نے گہری سانس لے کر آنکھوں میں ٹھہرتی نمی کو اندر اتارا تھا۔ وہ دحیہ کا عکس دیکھ رہا تھا، اپنے بیٹے کی محبت کو دیکھ رہا تھا۔ بیٹا جو زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا اور اس کے سرہانے کھڑی لڑکی جس سے اس نے عمر بھر ساتھ رہنے کے وعدے کیے ہوئے تھے۔ وہ چند پل اس بہادر لڑکی کو دیکھتا رہا پھر بے اختیار پیچھے ہٹا۔ وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ زیاد کا ہاتھ تھام کر کھڑی سعاد نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

”آج مت جائیں۔ آج آپ کے بیٹے کو آپ کی ضرورت ہے، آج اسے تنہا مت کریں خدارا۔“ بولتے ہوئے آنسو زاروقطار گالوں پر بہنے لگے۔ معاویہ کو اپنے قدم جمتے محسوس ہوئے تھے۔ اس نے رک کر آنسو بہاتی سعاد کو دیکھا تھا۔ ”دیکھیں ناں وہ کس حال میں ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو معاف کر پائیں گے خود کو؟ نہیں معلوم آپ اسے

کیوں اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں مگر اب اس کے ہر طرف تاریکی ہے۔ اسے آپ کی ضرورت ہے، آج ایک باپ کی طرح اسے سنبھال لیں۔ میرا شوہر، آپ کا بیٹا موت کے دروازے پر کھڑا ہے بابا۔ اس کا ہاتھ تھام لیں، نہ میں اس درد کو سہنے کو تیار ہوں نہ آپ۔" اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ وجود دھیرے دھیرے کانپنے لگا تھا۔

معاویہ نے آنکھوں میں ٹھہرتی نمی کے زور کے آگے خود کو بے بس محسوس کیا تھا۔ نمکین پانی کا شفاف قطرہ اس کے گال پر لڑھک گیا تھا۔

"مجھے ضروری کام سے جانا ہے، بیٹے۔" وہ معذرت کر رہا تھا۔ وہ سانس روکے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"مگر یہ بیٹا ہے آپ کا!! اس سے زیادہ ضروری کیا ہے؟ خون ہے آپ کا، اسے کیسے چھوڑ کر جا سکتے ہیں آپ؟" وہ تقریباً چیخ ہی تو اٹھی تھی۔

"کہیں اور میری زیادہ ضرورت ہے۔ تم ہو ناں اس کے پاس۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرایا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"پھر اسے بس میرا شوہر رہنے دیں۔ بھول جائیں یہ آپ کا بیٹا بھی ہے۔ کسی تکلیف سے گزرنا ہے تو میں گزروں گی، اس کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے تو میں رکھوں گی، اس کے لیے رونا ہے تو میں روؤں گی۔ آپ کی کہیں اور زیادہ ضرورت ہے۔ جائیے، آج یہاں اپنے بیٹے کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔" معاویہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے تلخ الفاظ اسے اپنی روح چھلنی کرتے محسوس ہو رہے تھے مگر وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ، حق پر ہی تو تھی وہ۔

"مجھے تم پر یقین ہے، تم زیاد کا بہت خیال رکھو گی۔" وہ آنکھوں میں چھلکتی نمی کو پیچھے دھکیل کر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے اسے پلٹتے دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا وہ رک جائے گا، وہ نہیں رکا تھا۔

"جانے سے پہلے اسے یہ احساس تو دلاتے جائیں کہ اس کا باپ اس سے ملنے آیا تھا۔ اتنے ظالم نہ بنیں، اتنا ظلم نہ کریں اس پر۔" وہ آگے قدم نہیں بڑھا پایا تھا۔ "بابا، آپ دحیہ کی بیٹی کی درخواست رد نہیں کر سکتے۔ آپ یہ نہیں کریں گے۔" وہ تڑپ اٹھی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ دھیرے سے آگے آیا تھا، جھک کر اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے تھے۔ آنکھ سے ایک آنسو بہہ کر ناک کی ہڈی سے پھسل کر زیاد کے گال پر گرا تھا۔ اس نے سر اٹھایا تھا۔ پلٹ کر نم آنکھوں سے سعاد کو دیکھا پھر پتھریلا چہرہ لیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ جیسے اب اگر مزید ٹھہرا تو جانا مشکل ہو جائے گا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

وہ گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ آرام سے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ضبط کا بندھن ٹوٹا تھا۔ منہ سے سسکی نکلی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے ہاتھ پر سر ٹکائے بلک بلک کر رو دی تھی۔ آنکھوں سے گرتے آنسو زارو قطار بہنے لگے تھے۔ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں سست ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔

☆☆☆

وہ ساکت و منجمد دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بنا پلک جھپکے ایک ہی نکتے پر نگاہیں ٹکائے وہ جیسے پتھر کا ہو چکا تھا، ایک مجسمہ ہو جیسے۔ آنکھیں صحرا کی طرح خشک ہو چکی تھیں۔ دل معمول کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ وہ سانس لے رہا تھا وہ زندہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے اتنا ہی ڈھیٹ تھا۔ اتنا ہی سخت اور ایسے ہی پتھر کا۔ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی

صلاحیت مفلوج ہو چکی تھی۔ چاہ کر بھی وہ کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا، ذہن ایکدم بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اب بھی اس کے پاس سے گزر رہے تھے مگر اب اسے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ رگوں میں دوڑتا خون جم چکا تھا شاید۔ کئی پل خاموشی سے گزر گئے۔ کوئی آرام سے اس کے برابر میں آ کر بیٹھا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ وجود ویسے ہی پتھر کا رہا۔

"آج میں نے سنان کو دوبارہ کھو دیا۔ مجھے یہاں ہونا چاہیے تھا، مجھے اس کے لیے آنا چاہیے تھا۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے خاصے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی ٹھہر رہی تھی۔ دل درد سے پھٹنے لگا تھا۔ "مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا، میں نے کر دیا۔ مجھے اس کا قرض بھی تو چکانا تھا، مجھے اس کے آگے کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ اس کی طرف بڑھتی ہر گولی کو اپنے سینے پر روکنا چاہیے تھا۔ عالیان کے بعد سنان کا خون بھی میرے سر آ گیا۔" ایک آنسو معاویہ کے گال پر لڑھکتا چلا گیا۔ خیام نے سانس روکتے ہوئے پلک جھپکی تھی۔

"وہ مسکرائے تھے، مجھے دیکھ کر ہلکا سا۔ میں آگے بھی بڑھا تھا لیکن، شاید قدرت کا فیصلہ میری حمایت میں نہیں تھا۔ ایک طرح سے اچھا بھی ہے، اپنے بیٹے کے ہاتھوں پر اتنے معصوموں کا خون دیکھ کر وہ بہت زخمی ہو جاتے۔ ان کا مان ٹوٹ جاتا، اپنی تربیت کو کوستے۔ اچھا ہے وہ مجھ سے نہیں ملے۔ اگلے جہان میں وہ بہت خوش ہونگے، ان کا بھرم رہ گیا ہے۔ ان کا مان قائم ہے۔ میں آج بھی ان کا خیام ہوں، ان کا بیٹا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گھٹنوں کے گرد بازو باندھتے ہوئے ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھی تھی۔ معاویہ نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"خود کو قصوروار مت ٹھہرایا کرو خیام! اپنے زہریلے الفاظ کا زہر اپنے اندر مت اتارا کرو۔"

"آپ بھی یہی نہیں کر رہے؟ جیسے عالیان اور سنان کا خون آپ کے سر ہے ویسے ہی اس رات جاں بحق ہوئے ان تمام معصوموں کے خون کا سوال مجھ سے ہو گا۔ جیسے آپ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں ہیں، میں تو پھر

سانس لینے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ اچھا ہے زیاد آپ سے نہیں ملا، اچھا ہے بابا مجھ سے نہیں ملے۔ نفرتوں کی ایسی دیوار کھڑی ہو جاتی جسے پار کرنا وبالِ جان بن جاتا۔" اس کے لہجے سے جھلکتی تلخی معاویہ کو اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا، الفاظ کے ساتھ بہت ظالم تھا۔

"اسے تم پر فخر تھا، اسے تم سے بے پناہ محبت تھی۔"

"انہیں اپنے بیٹے سے محبت تھی، اسی پر فخر تھا۔ ان کا بیٹا اسی رات مر گیا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹا تھا، اس کی جان لی تھی پھر وہیں اسی زمین میں اسے دفن کر دیا تھا۔ یہ قاتل ان کا بیٹا نہیں ہے۔" اس کے تلخ جواب پر معاویہ کی آنکھوں میں کرب کا تاثر ابھرا۔

"الفاظ کے ساتھ اتنے ظالم مت بنو۔"

"تو کیا کروں؟ ساری زندگی یتیم رہا ہوں اور آج پھر یتیم ہو گیا ہوں۔ بتائیں کیا کروں؟ چاہ کر بھی رو نہیں پا رہا میں، چاہ کر بھی اپنے باپ کو نہیں دیکھ پا رہا میں بتائیں ناں کیا کروں؟ میں گلا نہیں کر سکتا کیونکہ خدا کو یہ نہیں پسند۔ میرا دکھ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اپنے نبی کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دوں۔ کیا کروں پھر؟ اگر یہی سب ہونا تھا، اگر یہی سب مقصود تھا تو اتنے عرصے انہیں تکلیف میں کیوں رکھا؟ مجھے کیوں یہ آسرا دیا کہ میرا باپ زندہ ہے، قید میں ہے۔ کبھی نہ کبھی تو رہا ہو گا۔ آج رہائی ملی تو جان سے گئے۔ مجھے ایک بار پھر مار دیا۔" وہ تڑپ اٹھا تھا۔ معاویہ نے لب بھینچتے ہوئے اس کا شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ضبط سے لال ہوتا چہرہ موڑ گیا تھا۔

"قبر کو انتظار نہیں کرواتے خیام، قدرت تمہیں اپنے باپ کی قبر پر مٹی ڈالنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے گمنامی کی موت منظور نہیں تھی تقدیر کو۔" اس نے بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا تھا۔ خیام نے اس عرصے میں پہلی بار نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی شرٹ پر خون لگا تھا۔ ہاتھ بھی کسی کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔

گردن پر سرخ خون کے چھینٹے پڑے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"زیاد اور جندل زخمی ہیں۔" معاویہ نے سرسری سا جواب دیا تھا۔ اور وہ اس شخص کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا بیٹا زخمی تھا مگر وہ یہاں اسے تسلی دینے آیا تھا۔ خود زخمی تھا اور اس کے زخموں پر مرہم رکھنے آیا تھا۔ اپنی ذات بکھر چکی تھی مگر اسے سمیٹنے آیا تھا۔

"آپ کو زیاد کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے حصے کی محبت مجھے مت دیں، میں ہمیشہ دوسروں کی محبتوں پر قابض ہو جایا کرتا ہوں آج یہ مت ہونے دیں۔" اس نے التجا کی تھی۔

"مرنے والا میرا دوست سے بڑھ کر بھائی تھا!" وہ بہت مشکل سے ضبط کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مردوں سے زیادہ زندوں کو آپ کی ضرورت ہے۔" وہ اپنے الفاظ سے ایک بار پھر اسے توڑ چکا تھا۔

"اٹھو خیام! قبروں کو انتظار نہیں کروایا کرتے۔"

"میرے باپ کو اپنے وطن بھیج دیں۔ ان کی قبر اندلس میں تعمیر کروائیں، کمانڈرز سے کہیں اسے میری گزارش سمجھ لیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جو اپنے وطن سے نکالے گئے تھے، انہیں اسی مٹی میں دفن کریں جس سے محبت نے انہیں کسی اور زمین کو اپنا وطن بنانے ہی نہیں دیا۔ سنان حنفی کو۔۔اندلس بھیج دیں۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو لڑھکا کر گال سے پھسلتا داڑھی میں جذب ہوا تھا۔ معاویہ کرب بھری نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ چکا تھا۔ خیام پتھریلی نگاہوں سے اس کی پشت دیکھتا رہا۔ اور جو پتھر کے ہو چکے ہوں ان سے کسی جنبش کی امید لگایا نہیں کرتے۔

☆☆☆

”آپی۔۔آپی سنیں۔“ غنودگی کی حالت میں اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جسم نے ساتھ نہیں دیا۔ذہن مفلوج سا ہو گیا تھا۔”آپی۔۔جندل اٹھ گیا ہے۔“ وہ کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی تھی۔آنکھیں پھیلائے سامنے دیکھا۔بدر عقب میں چہرہ جھکائے کھڑا تھا۔”جندل بلا رہا ہے آپ کو۔“ بدر کے کہنے پر اس کے دل سے ایک بھاری بوجھ ہٹ سا گیا تھا۔وہ آنکھیں میچتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔درد بھری نگاہ زیاد پر ڈالی تھی جو ابھی بھی اسی حالت میں تھا۔صبح فجر میں جب زیاد کی حالت اچانک بگڑی تھی تو اس کا ہاتھ تھام کر روتے ہوئے وہ جانے کب سو گئی تھی۔آرام سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ نقاب لگا کر پلٹ گئی تھی۔

بدر کے ہمراہ وہ کمرے سے نکل کر برابر والے کمرے کی طرف بڑھی تو نگاہ بے ساختہ سامنے اٹھی۔وہ ازابیلا تھی، چہرے پر اڑی ہوائیاں، کانپتے ہاتھ آنکھوں میں ٹھہرتی نمی۔۔وہ بھاگتے ہوئے اس طرف آ رہی تھی۔سعاد اپنی جگہ ٹھہر سی گئی تھی۔بدر نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔وہ عین سعاد کے برابر سے گزرتی زیاد کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔اس نے سانس روکے پلٹ کر اسے کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔

”شاید بیلا باجی کو ریسپشن سے خبر ملی ہے۔“ بدر نے حالات سنبھالنے کی کوشش کی۔وہ ایک بھیگی نگاہ اس پر ڈال کر جندل کے کمرے میں آئی۔بدر باہر کھڑا رہا۔وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی بیڈ کے پاس آئی۔جندل اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیا۔

”السلام علیکم۔کیسی ہیں؟“ اس کا انداز ہلکا پھلکا سا تھا۔جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔لہجہ ہشاش بشاش تھا۔وہ بنا جواب دیے آگے آئی۔جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر گال پر گرا۔جندل نے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا۔

”مت روئیں۔مجھے اچھا نہیں لگتا جب آپ روتی ہیں۔“ وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔وہ زکام زدہ سی سانس خارج

کرتی سر کو جنبش دے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں ہاتھ تھامے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے بڑی بہن ماں کی طرح ہوتی ہے۔ اور جو بچپن میں یتیم ہو جاتے ہیں ان کے لیے بڑی بہنیں ماں ہی بن جاتی ہیں۔ تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ بہت تنگ کیا ہے تم دونوں نے مجھے۔" وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے شکوہ بھی کر رہی تھی۔ جندل نے آرام سے اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا تھا۔

"اور بھائی اپنی بہنوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ آنسو پونچھ لیں۔" اس نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے اپنے گال رگڑے تھے۔ "اب بتائیں کیا ہوا ہے؟"

"تمہیں ڈرگز دیے گئے تھے۔ میں حیران ہوں انہوں نے ایسے کیوں کیا۔ ضرار کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر اسے زہر دیا گیا تھا۔ تمہیں ڈرگز دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔" اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ "ڈیوڈ مر چکا ہے۔ سنائپر کو مارک نے بھیجا تھا اس کا اعتراف ازا نے کیا ہے۔ اس نے تمہیں بھی ازا کی وجہ سے مروانے کی کوشش کی ہے۔" اس نے زکام زدہ سی ناک سکیڑتے ہوئے کہا تھا۔ جندل ازا کے ذکر پر اس کی حرکت کو دیکھ کر مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

"اور زیاد؟"

"اس نے ڈیول میں مارک کو بہت زخمی کر دیا تھا۔ اس کے بچنے کے چانسز بہت کم تھے۔ اسے دوسرے اسپتال شفٹ کیا جا رہا تھا کہ راستے میں ایمبولینس میں دھماکہ ہو گیا۔ مارک مر چکا ہے۔" اس نے اطلاع دی تھی۔ جندل نے سکون کی سانس خارج کی تھی۔

"خیام کہاں ہے؟" اس کے سوال پر سعاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس تمام عرصے میں غائب رہا تھا، اسے بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے مڑ کر بدر کو دیکھا جو اندر آ رہا تھا۔

"خیام کہاں ہے بدر؟"

"انہیں اچانک کوئی کام پڑ گیا تھا۔ وہ ٹیکسی لے کر چلے گئے تھے۔ کہا تھا کہ اگر میں نہ لوٹوں تو سعاد سے کہنا عالیان سے رابطہ کرے۔" اس نے سنجیدگی سے اطلاع تھی۔ سعاد نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں گھر جا رہی ہوں۔ تم جندل کا خیال رکھنا اور زیادہ ہوش میں آئے تو فوراً اطلاع دینا۔" اس نے بدر کو ہدایات جاری کیں پھر جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ کچھ یاد آنے پر رک گئی۔ مڑ کر جندل کو دیکھا۔ "اور تم خبردار جو ازا سے ملے۔ میں اس کے بال کھینچنے سے اور تمہارا منہ توڑنے سے بالکل دریغ نہیں کروں گی۔ اس کی وجہ سے میرا بھائی جان سے جاتے جاتے بچا ہے۔" اس کے لہجے میں ازا کے لیے نفرت نہیں تھی بس ذرا سا غصہ تھا جسے جندل نے نظر انداز کرنا بہتر سمجھا تھا۔ اس نے فرمانبرداری سے سر کو اثبات میں ہلایا تھا۔ سعاد اسے گھوری سے نواز کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی جندل بدر کی طرف متوجہ ہوا۔

"بیلا ٹھیک ہے؟ کہاں ہے وہ؟" لہجے میں دنیا جہاں کی فکر تھی۔ بدر نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔

"اپنا منہ بند رکھو اور چپ چاپ پڑے رہو۔ میں نے آپی کی ہدایات سن لی ہیں اور جان کی بازی لگا دوں گا مگر بیلا باجی کو تم سے ملنے نہیں دوں گا!!" اس نے سخت فیصلہ سنایا تھا۔ جندل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپی کا چمچہ۔" وہ منہ بسور کر بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆

وہ سر بلند کیے دور جاتے ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ٹھہرتی نمی موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ اسے اندلس بھیج دیا گیا تھا۔ اس کی آخری آرام گاہ اندلس کی سرزمین تھی۔ دحیہ اور عالیان پاکستان میں تھے، سنان اندلس میں اور وہ یہاں۔ اگر کبھی زندگی نے موقع دیا تو وہ اپنے دوستوں سے ملنے ضرور جائے گا۔ وہ چار تھے اور

ان چاروں میں بس اب وہ باقی تھا۔ ماضی کا وہ کردار جو موت سے بچتا آیا تھا۔

نم آنکھوں سے دور جاتے ہیلی کاپٹر کو دیکھتے ہوئے اس نے دعا کی تھی کہ اس کے تین دوست جو عرش بریں کے سائے تلے اس کا انتظار کر رہے ہیں، ان کا انتظار زیادہ لمبا نہ ہو۔ اب زندگی بے معنی سی لگنے لگی تھی۔ ایک عہد تھا جو نبھانا تھا، چند دوست تھے جن سے ملاقات طے تھی۔ جہانوں کا فاصلہ تھا اور وہ یہ فاصلہ لمحوں میں طے کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ جو کبھی اس کے لیے یکسر اجنبی تھے یوں اسے عزیز ہو جائیں گے کہ ان سے ملاقات کے لیے وہ زندگی کو داؤ پر لگانا چاہے گا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

زندگی بھی کتنی عجیب ہے، اچانک سے ملنے والے لوگ بہت عزیز ہو جاتے ہیں اور پھر جب وہ جدا ہوں تو جان نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن پھر جن کے بچھڑنے پر زندگی بے انتہا مشکل لگتی ہے ان کی غیر موجودگی کی بھی عادت ہو جاتی ہے۔ انسان کو زندہ رہنا پڑتا ہے، اپنوں کے ساتھ یا اپنوں کے بغیر۔ سانس تو لینی ہے، جینا بھی ہے۔ موت یوں ہر کسی کو اتنی آسانی سے نہیں آجایا کرتی۔ زندگی اس طرح اتنی آسانی سے نہیں کٹ جاتی۔ اسے کاٹنا پڑتا ہے، جان لگانی پڑتی ہے، زخم کھانے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات یہ موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ بن جاتی ہے۔

اس نے نگاہیں ترچھی کر کے برابر میں کھڑے خیام کو دیکھا جو سر اونچا کیے آسمان پر جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ رویا نہیں تھا، اسے رونا چاہیے تھا۔ ہلکے بھورے رنگ کے بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھیں صحرا کی طرح خشک تھیں۔ چہرے پر نرمی تھی، گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ معاویہ نے گہری سانس لے کر سر جھکایا تھا۔

دونوں کے درمیان خاموشی کو اس کے موبائل کی رنگ ٹون نے توڑا تھا۔ اس نے موبائل پر جگمگاتے اجنبی نمبر کو دیکھا پھر موبائل کان سے لگایا۔

”یہ مت سمجھیے گا مجھے آپ سے ہمدردی ہونے لگی ہے۔ مجھے بس خیام سے بات کرنی ہے۔“ تڑخ کر کہا گیا تھا۔ وہ

غصے میں تھی۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا مسکرا دیا۔ ہاں ایسے لوگ بھی نعمت ہوتے ہیں جو کڑے سے کڑے وقت میں بھی چند لمحوں کے لیے لبوں پر مسکان لے آتے ہیں۔ وہ بھی اس کے لیے نعمت سے کم نہیں تھی۔ معاویہ نے موبائل خیام کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چند پل ٹھہر کر اسے دیکھتا رہا پھر موبائل تھام لیا۔

"کہو، سن رہا ہوں۔" وہ موبائل کان سے لگائے دور جا رہا تھا۔

"کہاں ہیں آپ؟ خدا کی قسم میں آپ کا سر پھاڑ دوں گی۔ انسانوں کی طرح گھر آئیں۔ آپ کو اندازہ ہے یہاں کیا ہو گیا ہے؟" وہ اس کی آواز سنتے ہی چلا اٹھی تھی۔ خیام نے بے اختیار موبائل کان سے ہٹا کر اسکرین کو گھورا تھا۔

"یہ بات تم آرام سے بھی کہہ سکتی ہو۔" معاویہ نے چہرہ گھما کر اسے دیکھا جو دھیمی آواز میں بولتا موبائل کان سے لگائے اس کھلے میدان کی حدود سے نکل رہا تھا۔

"یہاں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ آئیں اور خود سنبھالیں اپنے دوستوں کو۔" اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ خیام نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے زیاد کی؟" اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا۔

"ٹھیک نہیں ہے وہ، آپ آجائیں پلیز۔" وہ شاید رو رہی تھی۔ اس کی نم آواز سے اسے یہی لگا تھا۔ "زیاد کے بابا بھی آئے تھے۔ میں نے انہیں روکا تھا خیام، وہ نہیں رکے۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کے لیے اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کی سسکی خیام کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے پلٹ کر ایک افسردہ نگاہ دور کھڑے معاویہ پر ڈالی۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گا، اب ایسے روؤ تو مت۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

"نہیں رو رہی میں اس بدتمیز کے لیے۔ ایسے کون کرتا ہے؟ آپ جانتے ہیں وہ ڈیول میں زخمی ہوا ہے۔" اس کی

ہچکی بندھ گئی تھی۔ پی کیپ سر پر ٹکا کر اس نے ماسک لگایا تھا۔

"ڈیول کس کے ساتھ؟"

"مارک کے ساتھ۔ وہ بری طرح زخمی تھا، اسے اسپتال لے کر جا رہے تھے جب راستے میں ایمبولینس میں دھماکہ ہو گیا۔ وہ مر گیا ہے۔" سعاد کے جواب پر گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے اس کے ماتھے پر بل آئے تھے۔ "اور ہاں ڈیوڈ بھی مر چکا ہے۔ اس کی لاش بھی غائب ہے۔"

"اور جندل؟"

"واللہ! میں کچھ سخت نہیں کہنا چاہتی مگر یہ سب اس ازا کہ وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے خوامخواہ میرے بھائی کو اس میں گھسیٹا ہے جیسے میرا شوہر کافی نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے مارک جندل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اسے ڈرگز دیے گئے تھے۔" وہ اب رونا بھول کر غصے سے کہہ رہی تھی۔

"کس طرح کے ڈرگز؟"

"معلوم نہیں خود ہی آ کر دیکھ لیں۔ مجھ سے کچھ سنبھالا نہیں جا رہا یہاں۔ زیاد نے الگ پریشان کیا ہوا ہے، وہ اب نہ اٹھا تو یقین جانیں میں اگر رونے بیٹھ گئی تو سب بھول بھال کر بس یہی کروں گی پھر!!" وہ اس کے لہجے میں چڑچڑاپن محسوس کر کے گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تم سوئی ہو سعاد؟"

"خاک نیند آنی تھی اسے اس حالت میں دیکھ کر۔" وہ سر جھٹک کر بڑبڑائی تھی۔ خیام نے سر کو جنبش دی۔ اس کے چڑچڑے پن کی وجہ وہ سمجھ گیا تھا۔ نیند کی کمی اسے ایسا ہی کر دیتی تھی، پھر وہ ہر وقت لڑنے کو تیار ہوتی تھی۔

"اسپتال پہنچو۔ آ رہا ہوں میں بھی۔"

”پہلے گھر آئیں، یہاں نئی مصیبت کھڑی ہے۔“

”کیا؟“

”سوال مت کریں، انسانوں کی طرح گھر آئیں۔“ ایک بار پھر تڑخ کر جواب دیا گیا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ غصے میں وہ کسی کی نہیں سنتی تھی، بس سناتی تھی۔ تبھی اس وقت اس نے خاموش رہنا بہتر جانا تھا۔ موبائل سیٹ پر پھینک کر اس نے نگاہیں سامنے سڑک پر مرکوز کرلیں۔ وہ زندگی کے ایسے موڑ پر کھڑا تھا جہاں ہر بڑے سے بڑے دھچکے پر بھی صرف چند لمحوں کا ٹھہرنا اس کے لیے وبالِ جان بن جاتا تھا۔ وہ ایسے مسافر تھے جنہیں رکنا نہیں تھا، جو قبروں پر مٹی ڈال کر سوگ منانے کے بجائے آگے بڑھنا جانتے تھے۔ جنہیں اپنے دکھوں کو پسِ پشت ڈال کر دوسروں کے دکھوں کو سمیٹنا آتا تھا۔

☆☆☆

”اور تم کہنا چاہ رہی ہو کہ میں مان لوں کہ تمہیں پکڑنے کے لیے مارک نے صرف چار آدمی بھیجے اور چاروں کے چاروں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے، اور میری سمجھدار شاگردہ نے انہیں گھر میں محصور کرلیا، ٹھیک؟“ اس نے دائیں ابرو اٹھائے پوچھا تھا۔ لہجے میں طنز تھا۔ وہ معصومیت سے سر اثبات میں ہلا گئی۔ ”کسے بے وقوف بنا رہی ہو؟“ اسے گھوری سے نواز کر وہ میز کی طرف بڑھا۔

”لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا یقین کریں۔“ وہ منمنائی تھی۔ وہ اس کی بات نظر انداز کرتا کرسی پر بیٹھ کر اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ اگلے لمحات میں وہ سی سی ٹی فوٹیج دیکھ رہا تھا۔ ویڈیو میں بالکل وہی سب ہو رہا تھا جو سعاد نے بتایا تھا۔ چار آدمی اندر داخل ہوئے اور محصور ہو گئے۔ اسے ہضم کرنے میں دقت ہوئی تھی۔ نگاہ اسکرین کے کنارے پر لکھے وقت پر ٹکی تو اس نے سخت نظروں سے سعاد کو گھورا تھا جو لب دانتوں میں دباتی سر جھکا گئی تھی۔

”ویڈیو ایڈٹ کی گئی ہے۔ ان کے اندر آنے کے بعد پورے دس منٹ میں کیا ہوا، وہ ڈلیٹ کر دیا ہے تم نے۔ کیوں؟“ اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔

”خیام دیکھیں۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں کہتی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی۔ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں آپ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ جھوٹ تو بالکل نہیں بولتی، یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔ اب اگر میں آپ کو کچھ نہیں بتا رہی تو مطلب ایسی کوئی بات ہے ناں جس کے پیچھے ایسی وجہ ہے کہ مجھے آپ کو وہ نہیں بتانی چاہیے۔ کیا سمجھے؟“ وہ بات مکمل کرکے اسی کے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

”استاد سے استادی کر رہی ہو؟“ چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ خیام نے اسے سب کچھ سکھایا تھا۔ اور اگر کچھ نہیں سکھایا تھا تو وہ ”استاد سے استادی کرنا“ تھا۔ وہ جھوٹ بول سکتی تھی۔ وہ کمال مہارت سے جھوٹ بولتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے اپنے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولتی آئی تھی بنا کسی خوف کے۔ باوجود اس کے خیام کے آگے اس کا ہر جھوٹ پکڑا جاتا تھا۔ وہ ایک اچھی اداکارہ تھی۔ اپنی اداکاری سے اس نے اپنے عزیز واقارب کو ایک عرصے بے وقوف بنایا تھا مگر، خیام کے آگے وہ یہاں بھی مار کھا جاتی تھی۔ اور پھر وہ اس کے ہر جھوٹ کے پکڑے جانے پر یا اس کے ہر پلان کے خراب ہونے پر بس ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتا تھا، ”میں نے تمہیں استاد سے استادی کرنا نہیں سکھایا، سعاد یوسف زئی!“ جیسے وہ ابھی کہہ رہا تھا، ”میں نے تمہیں استاد سے استادی کرنا نہیں سکھایا، سعاد یوسف زئی!“ بس فرق یہ تھا وہ اس بار مسکرایا نہیں تھا، بجائے مسکرانے کے اسے گھوری سے نوازا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

”ضرار آیا تھا۔“ اس کی بات پر خیام نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ دھیمی آواز میں اسے سب بتانے لگی۔

وہ حیران کھڑا تھا۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے اپنے سامنے کھڑی سعاد کو دیکھتا۔ سعاد نے کچھ سوچ کر ہاتھ آگے

بڑھایا تھا مگر وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ نگاہیں جھکا لیں۔

"ہاں میں ضرار ہوں، ضرار بن ولید۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔ بہت ہی آرام سے اپنے چہرے پر چڑھا ماسک اتارنے لگا جسے ابھی کچھ لمحات پہلے سعاد نے اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ ماسک اس کے چہرے سے اترا تو اس کا اصل چہرہ سامنے آیا تھا۔ میک اپ کی دبیز تہوں میں چھپا اس کا چہرہ واضح ہوا تھا۔ وہ سانس روکے اسے دیکھنے لگی۔ گہری آنکھوں میں نرمی تھی، پیشانی پر سیاہ بال گرے تھے۔ لب دانتوں میں دبائے ہوئے تھے، داڑھی تھوڑی چھوٹی کر لی گئی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھا، ایکدم صحتیاب ہو چکا تھا۔ یا پھر، شاید وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوا تھا۔

"کیا ڈرامہ رچایا ہے تم نے؟"

"سمجھنے میں بہت آسان۔ مجھے زہر دیا گیا، جب مجھے ایمبولینس میں لے جایا جا رہا تھا تو مجھ پر حملہ ہوا۔ اور اس وقت ان کا واسطہ ایک ایسے بندے سے پڑا جو ان کا اپنا تھا لیکن بس وہ ضرار بن چکا تھا۔ اسے وہی زہر دیا گیا تھا جو وہ میری رگوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور میں انہی کے ایک آدمی کے روپ میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک قابلِ اعتماد شخص جو بار بار اگروپ کے کئی رازوں سے واقف ہے۔" اس نے سر کو خم دیا تھا۔ سعاد نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا تھا۔

"ذرا شرم نہیں آئی اپنے دوستوں کو رلاتے ہوئے؟ کم از کم انہیں تو بتا دیتے۔" سعاد نے اسے شرم دلانا چاہی تھی۔ وہ معصومیت سے ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

"آپ بھی روئی تھیں؟" مسکراہٹ دبائے پوچھا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"زخم کیسا ہے ہاتھ کا؟" وہ بات بدل کر اپنے دیے گئے زخم کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

"آپ کا دیا گیا زخم بھر گیا تھا، لیکن تسلی کے لیے خون کا رنگ دیکھنا تھا تو اسے دوبارہ تازہ کرنا پڑا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے بے فکری سے کہتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔ پھر اس کے عقب میں چپ چاپ ہونقوں کی طرح

انہیں تکتے بدر کو دیکھا جو اپنے کان لپیٹ کر کھڑا تھا۔ ”آپ کا معصوم شاگرد!“ اس کے مسکرا کر کہنے پر سعاد نے پلٹ کر بدر کو دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

”میری طرح!“ سر فخر سے بلند کر کے کہا گیا۔ وہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ موڑ گیا۔ عقب میں کھڑا بدر ایک نگاہ ان دونوں پر ڈال کر خاموشی سے وہاں سے کھسک چکا تھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟ واپس جاؤ گے یا عوام کا انتظار کرو گے؟ انہیں بتانا ہے یا نہیں؟“ اس کے سوال پر وہ گہری سانس لیتا نفی میں سر ہلا گیا۔

”فی الحال اس بات کو راز رہنے دیں۔ آپ مجھ سے نہیں ملیں، میں آپ سے نہیں ملا۔ البتہ پہلے کی طرح رابطے میں رہوں گا اور ہر صورتحال سے آگاہ کرتا رہوں گا۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”پہلے کی طرح؟“ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”ویڈیوز میں نے بھیجی تھیں۔ وارلڈ گلاس کمپنی پر سائبر اٹیک میں نے رکوایا تھا، مائک کو میرے کہنے پر اغوا کیا گیا، بار بارا کمپنی کے ملازمین کی لسٹ بھیجنے والا میں تھا۔ اور بھی کچھ بتاؤں یا کافی ہے؟“ وہ آخر میں شرارت سے مسکرایا تھا۔ سعاد نے ناک سکیڑی تھی۔

”کافی ہے۔ اب نکلنے کی کرو تم۔ ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا اور پھر آگے کی صورتحال کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

”ہاں آپ بدل گئی ہیں۔ میں سوچتا تھا جب آپ کو حقیقت پتہ چلے گی تو کھینچ کر ایک تھپڑ رسید کریں گی۔“ وہ دھیمی آواز میں کہتا سر جھکا کر ہلکا سا ہنس دیا تھا۔ ”شاید یہ زیاد کی صحبت کا اثر ہے۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس نے فوراً زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ سعاد خاموش رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہوا تھا۔ ”آئی ایم سوری۔ یونہی بول دیا میں نے۔“ وہ خجلت کا شکار ہوا تھا۔

”مشرقی لڑکیوں کی خاموشی کو ہاں سمجھا جاتا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں واقعی بدل گئی ہوں اور یہ یقیناً زیاد کی

صحبت کا اثر ہے۔ اب نکلنے کی کرو اس سے پہلے کہ میرا دماغ گھوم جائے اور یقین کرو میں تھپڑ اب بھی ویسے ہی کھینچ کر لگاتی ہوں۔" وہ اپنی ٹون میں واپس آئی تھی۔ ضرار اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اسے چند لمحوں میں اپنی سوچ بدلنا پڑی تھی، وہ نہیں بدلی تھی بالکل بھی نہیں۔ وہ اب بھی ویسی ہی تھی، غصے کی تیز!

سعاد نے بات مکمل کر کے خیام کو دیکھا جو برے برے منہ بناتا کرسی سے ٹیک لگا رہا تھا۔

"خبیث انسان، ایک بار ہاتھ لگے یہ گدھا۔ عقل ٹھکانے نہ لگائی تو میرا نام بھی خیام نہیں!" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ سعاد خاموش رہی تھی۔ وہ اسے سمجھ سکتی تھی، اور اس معاملے میں وہ اس کے ساتھ تھی۔ "مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا جب اس گدھے کے جاتے ہی مائک کو اغوا کرنے کا آرڈر آیا تھا کیونکہ مائک واحد تھا جس نے اسے دیکھا ہوا تھا۔ اگر مارک مائک کو بلوا لیتا تو یقیناً یہ خبیث پکڑا جاتا۔ جنگلی گدھا، دل کر رہا ہے جا کر منہ توڑ آؤں اس کا۔" وہ غصے میں تھا۔ شدید غصے میں۔ سعاد گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا غصہ اتنی آرام سے ٹھنڈا نہیں ہونے والا تھا اسی لیے انتظار کے بجائے اس نے نماز پڑھنا مناسب سمجھا تھا۔

☆☆☆

"زیاد ہوش میں آ گیا ہے۔" شام پانچ بجے انہیں پیغام موصول ہوا تھا۔ پیغام پڑھتے ہی اس نے بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اگلے ہی لمحات میں وہ خیام کے ہمراہ اسپتال کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے اسے اپنی دھڑکنیں منتشر ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ انہوں نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا تھا، دونوں زینے پھلانگ کر اوپر پہنچے تھے۔ ابھی وہ کمرے کی طرف بڑھنے ہی لگے تھے جب دروازے پر کھڑا ابدران کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"وہ۔۔ اندر نہیں جائیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ "اصل میں بیلا باجی

اندر رہیں۔ آپ کا جانا مناسب نہیں، انہیں شک ہو جائے گا۔" اس نے سعاد کو دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ خیام نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے پیشانی رگڑی تھی۔ سعاد کا چہرہ ضبط کے مارے لال ہونے لگا تھا جیسے جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ رہا ہو۔ آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔

"میں جندل سے مل کر آتا ہوں۔" خیام عجلت میں کہتا دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بدر نے متذبذب نگاہوں سے سعاد کو دیکھا پھر خیام کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ سعاد نے نم آنکھوں سے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا تھا۔ آنکھ سے ایک آنسو نکل کر نقاب میں جذب ہوا تھا۔ وہ سختی سے ہونٹ بھینچتی پلٹ گئی تھی۔ زینے اتر کر وہ راہداری سے گزر کر باہر آئی تھی۔ دائیں بائیں اونچے لمبے درختوں کے درمیان بنا کشادہ راستہ جو اسپتال کے دروازے تک جاتا تھا، وہ چپ چاپ اس لمبے راستے پر چلنے لگی۔ ٹھنڈ کا احساس ہوا تو ہاتھ لانگ کوٹ کی جیب میں اڑس لیے۔

وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ وہ اٹھ چکا تھا، اسے ہوش آ گیا تھا اور وہ اس سے مل نہیں سکتی تھی۔ دل تڑپ رہا تھا مگر وہ جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اسے انتظار کرنا تھا، انتظار جو طوالت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ ٹھنڈ بڑھنے لگی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ وہ تھک کر ایک بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ سر بینچ کے بازو پر ٹکا دیا تھا۔ نگاہیں آسمان پر ٹکی تھیں۔ انتظار کی ان گھڑیوں میں آسمان کو تکتے ہوئے اس نے خود تاریکی کو شام کے سرمئی سایوں پر غالب آتے دیکھا تھا۔ کیسے بادلوں کے پیچھے سے چاند نظر آیا تھا اور ساتھ ستارے لایا تھا۔ بدر اسکی تلاش میں کئی بار ادھر آیا تھا مگر اسے چپ چاپ آسمان کو تکتا دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ انسانی جمِ غفیر رفتہ رفتہ گم ہو رہا تھا۔ آوازیں تھم رہی تھیں۔ اکا دکا لوگ اب وہاں کھڑے تھے۔ کئی پل گزر گئے پھر کوئی خاموشی سے اس کے برابر میں بیٹھا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ چپ چاپ آسمان کو تکتی رہی۔

”کتنے ستارے ہیں؟“ آواز معاویہ کی تھی۔ وہ لوٹ آیا تھا۔

”نہیں معلوم۔“ اس نے زکام زدہ سی سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

”وقت ضائع کیا تم نے۔ ستارے گن لیتیں۔“ وہ افسوس کے ساتھ مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا۔ سعاد نے سر اٹھا کر خفا خفا نظروں سے اسے دیکھا پھر سیدھی ہو کر بیٹھی۔

”بالکل آپ پر گیا ہے وہ۔ انتظار کی سولی پر لٹکایا ہوا ہے۔“ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ معاویہ اس کے لہجے سے جھلکتی ناراضگی اور محبت محسوس کر کے مسکرا دیا تھا۔ ”کون کرتا ہے ایسے؟ اتنا انتظار کون کرواتا ہے بھلا؟“ اس کی آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر گال پر گرا تھا۔ وہ انگشت شہادت کے پور سے آنکھوں کے کناروں پر ٹھہرتی نمی کے قطرے چننے لگی تھی۔

”جن سے محبت ہوتی ہے ان کے انتظار میں ایک ایک گھڑی صدیوں کی طرح بھاری لگتی ہے۔“

”نہیں ہے مجھے اس سے محبت۔“ وہ تیزی سے کہتی اس پر بگڑی تھی۔ معاویہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا مسکرانا سعاد کو مزید تپا گیا تھا۔ ”اور آپ کیوں آئے ہیں؟ چلے گئے تھے ناں اسے چھوڑ کر، اب کیا لینے آئے ہیں یہاں؟“

”اسے دیکھنے آیا تھا۔“ ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا گیا۔

”تو جائیں دیکھ لیں۔ کھڑکی سے جھانک لیجیے گا یا پھر کسی ڈاکٹر کے روپ میں چلے جایئے گا۔ آپ کے لیے اپنی پہچان چھپانا کون سا مسئلہ ہے؟“ وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کا غصہ دیکھ کر مسلسل مسکرا رہا تھا۔

”میں نے اسے دیکھ لیا۔ نہ صرف دیکھا پر اس سے مل بھی چکا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے کہا گیا۔ سعاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کب کیسے؟ مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ ایک ساتھ کئی سوال اٹھے تھے۔

”ابھی۔ تمہیں دیکھا تو لگا اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ بھی ایسے ہی غصہ کرتا ہے، اس کا غصہ بھی اتنا ہی پیارا ہوتا ہے۔“ اس کی بات پر سعاد گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ”کبھی دیکھا ہے اسے غصے میں؟“ معاویہ کے سوال پر وہ سر نفی میں ہلا گئی۔

”کبھی دیکھنا غور سے۔ وہ غصے میں خاموش ہو جائے گا، ایک کونے میں الگ ہو کر بیٹھ جائے گا۔ بات نہیں کرے گا، ناراضگی دکھائے گا۔ بچپن میں غصے میں روتا بھی تھا۔“ وہ خاموشی سے معاویہ کو دیکھنے لگی جس کا چہرہ اپنے بیٹے کے متعلق بات کرتے ہوئے چمک اٹھتا تھا۔ ”تمہیں اچھا نہیں لگتا ناں سعاد، ازا کا زیاد سے قریب ہونا۔ کبھی غور سے دیکھنا انہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ ساتھ خوش ہوتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہو، جیسے خون کا رشتہ۔ گہری کشش ہو جو انہیں جوڑے رکھتی ہو۔ وہ ازا کو اپنی بہن کی طرح چاہتا ہے۔ تمہیں اسے سمجھنا چاہیے۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”اسے بھی مجھے سمجھنا چاہیے۔ میں پچھلے پانچ گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”بس چند گھنٹے۔ وہ تمہارا ہے، تم تک ہی لوٹ کر آئے گا۔ اس کا ہر راستہ تم تک جاتا ہے۔ اگر ایسے میں وہ صرف کچھ وقت انہیں دیتا ہے جو اسے عزیز ہیں، جن کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے تو یہ کوئی بری بات تو نہیں۔“ وہ اس کی بات سمجھ گئی۔ وہ ازا کی طرف سے اس کا دل صاف کر رہا تھا۔

”ازا کی طرفداری کر رہے ہیں؟“ نہایت سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ معاویہ نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر بے اختیار ہنس دیا تھا۔

”میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اس بچی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو بہت معصوم ہے۔“ اسے یقین دلایا گیا کہ وہ واقعی

ازا کی طرفداری کر رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"ہاں، وہ واقعی معصوم ہے۔" لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ معاویہ مسکرا دیا تھا۔ چند پل اس کے ساتھ بیٹھنے کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ملتے جائیں اپنے بیٹے سے۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ معاویہ نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"پھر کبھی۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"مجھ سے کیوں ملنے آتے ہیں پھر؟" وہ خفا ہوئی تھی۔

"تم اپنے باپ جیسی ہو۔ عادات میں بھی اور دکھنے میں بھی۔ دحیہ کی یاد تم تک کھینچ لاتی ہے مجھے۔ اور پھر اپنی بیٹی سے ملنے آنا کوئی غلط بات تو نہیں۔" دھیمی آواز میں کہتا وہ کندھے اچکا گیا۔ سعاد اسے دیکھ کر رہ گئی۔ عرصے بعد کسی کے منہ سے اپنے لیے لفظ بیٹی سن کر اسے اچھا لگا تھا۔

"اور آپ کی یہ بیٹی جب اپنے شوہر سے جھوٹ بولے گی تو اس کا گناہ آپ کے سر جائے گا۔" وہ اس معصوم دھمکی پر ہنس دیا تھا۔ الوداعی نگاہ اس پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔ سعاد کی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا یہاں تک کہ وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ گہری سانس لے کر بینچ کے بازو پر سر ٹکاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔ اس کے پاس کئی رشتے تھے، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت رشتہ۔ باپ نہیں تھا مگر پچھلی دو ملاقاتوں میں معاویہ نے اسے باپ جیسی شفقت دی تھی۔ بھائی بھی تھا جو اسے عزیز رکھتا تھا اور شوہر بھی جو اس پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ تکلیف میں ہوتی تو وہ سب پریشان ہوتے تھے، اس کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے۔ وہ، سعاد یوسف زئی، رشتوں کے معاملے میں واقعی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔

☆☆☆

چرچ میں چھائی مقدس خاموشی کے احترام میں وہ سب گردنیں سیدھی کیے چپ چاپ نگاہیں سامنے ٹکائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں مارک کا تابوت رکھا تھا اور پادری کتاب ہاتھ میں لیے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔ دائیں بائیں قطاروں میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے، چپ چاپ دم سادھے۔ اسی اثناء میں لکڑی کا دروازہ کھلا۔ مائک کے سیاہ بوٹوں میں مقید پاؤں فرش پر ٹکے۔ وہ اندر آ گیا، دروازہ بند ہو گیا۔ وہ اعتماد سے چلتا دائیں طرف دوسری قطار میں بیٹھ گیا۔ نگاہیں سامنے ٹکا دیں۔

اسے کئی پل یونہی گزر گئے۔ مارک کی آخری رسومات پوری کر دی گئیں۔ تابوت لے جایا گیا۔ لوگ اٹھنے لگے۔ چرچ خالی ہونے لگا اور پھر یہاں تک کہ صرف وہ اور ابراہم وارلڈ وہاں رہ گئے۔ مقدس خاموشی اور پراسرار تاریکی۔ تاریکی جس سے برقی جگنو جنگ میں مصروف تھے اور خاموشی جسے ابراہم نے توڑا تھا۔

”تمہیں نہیں لوٹنا چاہیے تھا۔“ آواز بھاری تھی۔ چہرہ سپاٹ تھا۔

”بھائی کے بعد میری یہاں ضرورت ہے۔“ وہ طنزیہ مسکرایا تھا۔ ابراہم سر جھٹک کر ہلکا سا ہنس دیا۔

”اسکائے ٹو بار بار اگروپ کے چیئرمین کی کرسی خالی نہیں رہنے دیتا۔ تم نے خوامخواہ تکلیف کی۔“ اس نے چہرہ ترچھا کر کے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ مائک کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔ اس نے چونک کر دائیں طرف دوسری قطار میں بیٹھے ابراہم کو دیکھا تھا۔

”پانچویں سیٹ پر آپ ہیں؟“ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”کوئی اور ہو سکتا ہے؟“ دوٹوک انداز میں پوچھا گیا۔ لہجے میں پراسراریت تھی۔ مائک نے بے اختیار سر نفی میں ہلایا تھا۔

”ناممکن! میرے لیے یہ قبول کرنا ممکن ہے کہ بھائی کا اسکائے ٹو سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ قبول کرنا ناممکن ہے

کہ، ابراہم وارلڈ اسکائے ٹو کے دلدل میں پھنس چکا ہے۔" اس کا انداز بھی دوٹوک تھا۔ ابراہم نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر ہلکا سا مسکرا دیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"پھر تو تمہیں مجھے ماننا چاہیے کہ میں اس حد تک اداکاری میں ماہر ہوں۔"

"یہ اداکاری نہیں ہے ابراہم! تم کبھی اسکائے ٹو میں نہیں ہو سکتے، کبھی نہیں۔ یقیناً تم نہیں ہو، کوئی تمہیں استعمال کر رہا ہے یا پھر۔۔۔" ابراہم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

"یا پھر؟" دائیں ابرو اٹھائے پوچھا گیا۔ مائک نے رک کر اسے دیکھا پھر چہرہ موڑ لیا۔ نگاہیں سامنے ٹکائیں، سینے پر صلیب کا نشان کھینچا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں قطاروں کے درمیانی راستے پر کھڑے ہو کر اس نے نظریں ترچھی کر کے ابراہم کو دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔

"میں معلوم کر لوں گا۔ مجھے یقین ہے میں کر لوں گا!" اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ وارلڈ کے لبوں پر مچلتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ مائک لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر آ گیا۔ زینے اتر کر وہ اپنی سیاہ چمچماتی گاڑی کی طرف آیا۔ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے چہرہ ترچھا کر کے برابر میں بیٹھے لڑکے کو دیکھا جو ہاتھ میں ٹیبلٹ لیے چرچ کی ویڈیو دیکھنے میں مصروف تھا جہاں ابراہم وارلڈ ہنوز پتھر کا بنا بیٹھا تھا۔

"ابراہم اسکائے ٹو میں کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس نے چہرہ گھما کر مائک سے پوچھا تھا۔ چہرے کو ہمیشہ کی طرح سفید رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔

"میں اسے جانتا ہوں، وہ شخص ایسا نہیں ہے۔ اس نے سالوں محنت کی ہے اور وارلڈ گلاس کمپنی کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی محنت یوں اسکائے ٹو کی جھولی میں نہیں ڈالے گا۔ وہ شخص، وہ بہت سمجھدار اور قابلِ

تحسین شخصیت کا مالک ہے، وہ ان قاتلوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔" اس کے لہجے سے جھلکتے یقین کو محسوس کر کے وہ خاموش ہو گیا۔ مائک اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی پھر ٹیبلیٹ کی اسکرین کی طرف متوجہ ہوا جہاں ابراہم ہنوز ویسے ہی بیٹھا تھا، پتھر کا مجسمہ ہو جیسے۔

☆☆☆

"تمہیں اندازہ نہیں ہے تم نے مجھے کتنا پریشان کر دیا تھا۔ تم میرے اکلوتے دوست ہو یار۔" وہ اسکے سامنے کرسی پر بیٹھی نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زیاد اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"تم مجھے پچھلے پانچ گھنٹوں سے یہی بتا رہی ہو ازا۔" آواز دھیمی تھی۔ آنکھوں میں نرمی تھی اور لہجے میں محبت کا ہلکا سا عنصر شامل تھا۔ اس کا یہی انداز اسے کمزور کر دیتا تھا۔ اسے وہ بلاوجہ اچھا نہیں لگتا تھا، وہ تھا ہی ایسا۔ زیاد بس زیاد تھا۔

"تم نے بھی تو ڈرا دیا تھا۔ اور اب کہہ رہے ہو کہ معمولی سا حادثہ تھا۔ اتنا بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے تمہارا۔" وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے بدر کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ اس نے ایک نگاہ کرسی پر بیٹھی ازابیلا پر ڈالی پھر بیڈ پر لیٹے زیاد پر۔

اسے بتایا گیا تھا زیاد کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اسے جندل کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ فوج میں رہ چکا ہے اور ڈیوڈ اس کا پرانا دشمن تھا۔ اسے مارنے کی کوشش کرنے والا مارک تھا جو جندل کو اس کی محبت کی وجہ سے مارنا چاہتا تھا۔ اور سامنے بیٹھی یہ لڑکی ان کے ہر جھوٹ کا یقین کر گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے یہی کرتی آئی تھی۔ اسے زیاد پر بھروسہ تھا، اکلوتا دوست تھا اس پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا کبھی بھی نہیں۔ جندل پر جانے کب سے وہ یوں اعتماد کرنے لگی کہ اس کے جھوٹ پر کبھی شک نہیں ہوا۔ وہ سب اسکے گرد جھوٹ کی ایسی اونچی دیواریں قائم

کر چکے تھے جو اگر یہ لڑکی دیکھ لیتی تو شاید اسے ٹوٹنے سے کوئی نہیں روک پاتا۔ ان دیواروں کو پار کرنا مشکل ہو جاتا۔ دیواریں، جن کے پار سب کھڑے تھے۔ زیاد، جندل، خیام حتیٰ کہ اس کا اپنا باپ!

"وہاں کیوں کھڑے ہو بدر؟" وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ بدر نے چونک کر اسے دیکھا پھر گہری سانس لیتا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیڈ کے پاس آیا۔ زیاد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" وہ مغموم سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا انداز اسے بے اختیار سعاد کی یاد دلا گیا تھا۔ شاید یہ سعاد کی بات کا اثر تھا یا پھر واقعی وہ کہیں کہیں اس کی جھلک دیتا تھا۔

"الحمدللہ۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟" بدر نے رک کر اسے دیکھا۔ یا وہ آئینے کی طرح شفاف تھا کہ کوئی بھی اس میں جھانک لیتا تھا یا پھر بس وہ چاروں ہی ایسے تھے کہ ان سے کچھ چھپانا مشکل تھا۔

"کچھ نہیں۔ بس کل سے یہاں ہوں تو تھکاوٹ ہو گئی ہے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ دیکھو۔ میں تمہیں بتاتی تھی ناں کہ بدر بہت معصوم ہے۔ کیوٹ لگ رہا ہے ناں؟" ازا کے چہک کر کہنے پر زیاد کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ بدر کا چہرہ ایکدم سرخ ہوا تھا۔ اس نے گڑبڑا کر دونوں کو دیکھا تھا۔ دونوں اسکے لال چہرے کو دیکھ کر ہنس دیے تھے۔

"بیلا باجی، میں گھر جا رہا ہوں۔ آپ کو بھی گھر چھوڑ دوں؟" اس نے جلدی میں پوچھا تھا۔ ازا نے سر کو جنبش دی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ اپنا کوٹ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اپنا خیال رکھنا۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤ، تمہیں پہلی بار بیمار دیکھ رہی ہوں بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔" وہ لاڈ سے کہہ رہی تھی۔ زیاد نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ وہ الوداعی نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ بدر چند پل وہیں کھڑا رہا۔ وہ کمرے کا دروازہ پار کر گئی تو زیاد اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"کچھ کہنا ہے؟"

"سعاد آپی غصے میں ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" مسکرا کر کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ زیاد کی نگاہوں کے سامنے بے اختیار اس کا غصے سے لال ہوتا چہرہ آیا تو وہ سامنے دیکھتے ہوئے کھکھلا کر ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

”پریشان ہو؟“ سیب کھاتے جندل نے گم سم کھڑے خیام کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ میز سے ٹیک لگائے بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے یہاں آکر کچھ بھی سنبھالنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ڈیوڈ کی لاش غائب تھی، اور باقی سب کچھ بدر سنبھال چکا تھا۔ جندل کی بات پر گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”مت بھولو تمہاری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے۔“ فخریہ کالر جھاڑ کر کہا گیا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ ”چلو اب بتادو کیا ہوا ہے؟“

”سوچ رہا ہوں ضرار کو زہر دینا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن تمہیں ڈرگز کیوں دیے گئے؟“ اس کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”کوئی تجربہ کر رہے ہونگے۔“ بے فکری سے کندھے اچکاتے ہوئے اس نے سیب کی قاش خیام کی طرف بڑھائی۔ وہ چپ چاپ قاش تھام گیا۔ ”ڈرگز کس طرح کے ہیں؟“

"عام سے ہیں۔ کوئی خاص توجہ طلب چیز بھی نظر نہیں آئی۔" وہ سیب کی قاش کو دانتوں سے کاٹ کر کہہ رہا تھا۔

"پھر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں، بس ذرا کمزوری ہے۔ لیکن زیاد سے ہزار درجے بہتر حالت میں ہوں۔" اس نے پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو عورتوں کی طرح ادھر کیوں چھپ کر بیٹھے ہو؟" لہجے میں طنز تھا۔

"یہ مجھے عورتوں والا طعنہ مت دیا کرو تم خبیث انسان! منہ توڑ دوں گا تمہارا۔" وہ اس پر بگڑا تھا۔

"تم واقعی ایکدم ٹھیک ہو۔ چلو آؤ اس ناکام شاعر کے پاس چلیں۔" خیام ہاتھ جھاڑتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوا۔

جندل نے ٹانگیں بیڈ سے لٹکا کر سہارے کے لیے بازو پھیلایا۔ خیام نے رک کر اسے دیکھا پھر اپنی اسٹک اس کے برابر میں رکھی اور اکڑی ہوئی گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جندل نے حیرت سے اسٹک کو دیکھا پھر اسے جو اپنی ٹانگوں پر صحیح سلامت چل رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے بیڈ سے اترا۔ پیٹ میں درد کی ٹیس اٹھی۔ وہ اسٹک ایک طرف پھینک کر پیٹ پر ہاتھ رکھتا باہر کی طرف بھاگا تھا۔ کمرے سے باہر آ کر اس نے خیام کو برابر والے کمرے میں جاتا دیکھا۔ وہ فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پیچھے سے خیام کی گردن دبوچی تھی۔

"کب سے رچایا ہوا ہے تم نے یہ ڈرامہ جنگلی گدھے؟" وہ خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ سکون سے بیٹھے زیاد نے ان دونوں کی اچانک آمد اور پھر آتے ہی گدھوں کی طرح شروع ہونے پر کوفت سے انہیں دیکھا تھا۔

"عقل تمہاری اپنی گھٹنوں سے بھی نیچے ہے۔ چھوڑو میری گردن۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بے زاری سے کہہ کر آگے آیا تھا۔

"ناکام شاعر دیکھ رہے ہو اس گدھے کو۔ یہ حضرت ہمیشہ سے ٹھیک تھے بس لنگڑانے کے ڈرامے کرتے تھے۔" وہ

تڑخ کر کہہ رہا تھا۔ خیام چپ چاپ میز پر رکھی زیاد کی رپورٹس دیکھنے لگا تھا۔

"تمہیں آج خبر ہوئی ہے؟" زیاد کے سوال پر اس نے آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے دیکھا پھر خیام کو۔

"تم دونوں ملے ہوئے تھے۔ آج میں تمہیں۔۔" غصے سے کہتا وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کرسی سے پاؤں ٹکرایا تھا۔

ساتھ ہی پیٹ میں درد کی ٹیس اٹھی تو وہ گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھا تھا۔

"آنکھیں کرائے پر دی ہیں کیا؟" زیاد نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"شکل مت دکھانا تم دونوں اپنی۔ ذرا جو شرم آئی ہو مجھے بے وقوف بناتے ہوئے۔ اور نہیں تو میرے جذبات کا ہی خیال کرتے۔ کیسے دوست ملے ہیں مجھے۔" وہ ہنوز ان دونوں کو کوس رہا تھا۔

"اسے گھر لے جاؤ یار۔ عورتوں کی طرح رونا پیٹنا ڈال رکھا ہے۔" زیاد نے منہ بسور کر کہا تھا۔ خیام کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ جندل نے غصے سے دانت پیسے تھے۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب شکل نہیں دکھاؤں گا تمہیں اپنی۔" دانت پیس کر کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خیام ہنستے ہوئے آگے آیا۔ سہارے کے لیے اپنا کندھا پیش کیا۔ وہ اسے گھور کر اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلا گیا۔ زیاد نے الوداعی انداز میں اپنا ہاتھ ہلا دیا۔

"تم میرے دوست تھے۔ تم اس ناکام شاعر کے ساتھ مل کر میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" جندل معصومیت سے شکوہ کر رہا تھا۔

"سمجھا کرو۔ کبھی کبھار اس بے چارے کا بھی دل رکھ لینا چاہیے۔" خیام اسے تسلی دے رہا تھا۔

"تم مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے؟" لہجہ مشکوک تھا۔

”نہیں۔ تمہیں یقین دلانے کے لیے تمہیں کہیں لے چلتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔“ اب اسے پچکارا گیا تھا۔ زیاد نے لب دانتوں میں دبا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

☆☆☆

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کھینچی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بناتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ سر تھک کر ہاتھوں میں گرا دیا۔ اس سے کہاں غلطی ہوئی تھی؟ وہ کہاں دھوکہ کھا رہی تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ کر سامنے میز پر رکھی ڈائری کے کورے ورق کو دیکھا۔ اس نے سب سے زیادہ اعتبار زیاد پر کیا تھا۔ مگر یہ اعتبار آج بکھر چکا تھا۔

اس سے یہ کہنے والا زیاد کہ وہ خیام سے بے انتہا نفرت کرتا ہے، اس رات اسی کی گاڑی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے کہا تھا اسے کوئی اچھی لڑکی ملی تو سب سے پہلے اسے بتائے گا مگر وہ یہاں بھی اسے بہت پیچھے دھکیل چکا تھا۔ اور اب، وہ اس سے جھوٹ بول رہا تھا کہ اس کا ایکسیڈینٹ ہوا تھا۔ جب ایک طرف مارک کو گولیاں لگی تھیں تو اسی رات زیاد کا ایکسیڈنٹ یقیناً اتفاق نہیں تھا۔ کہیں کچھ خلا سا تھا جو اس کے تمام سوالات کے درمیان ایک ربط قائم کر رہا تھا۔ اس نے وارلڈ کی بات پر یقین نہیں کیا تھا جب وہ مارک کی طرف سے صفائیاں پیش کر رہے تھے۔ وہ کیونکر زیاد کا یقین کر گئی جس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی اس سے جھوٹ نہ بولنے کی۔

اور جندل، وہ بھی اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ آخر ڈیوڈ ہی کیوں اس کا دشمن تھا؟! وہ ڈیوڈ جو مارک کے ساتھ کام کرتا تھا اور پھر مارک نے ڈیوڈ کو مارنے کے بعد جندل کو مارنے کا حکم دیا اور اگر دیا بھی تو وہ ایمبولینس میں اسے لے کر راستہ بدلنے کے بعد درمیان میں آدھے گھنٹے کے لیے اسے کہاں لے گئے تھے؟ ہر طرف الجھنیں تھیں، پہیلیاں تھیں، وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکنے لگا تھا۔ اسے لگا تھا وہ رو دے گی۔ تھک کر ہار کر اب وہ بہت سارا رو دے گی۔ وہ بکھر جائے گی۔ اس نے نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں میں دبایا۔ اسی اثناء میں اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔ اس نے زکام زدہ سی سانس خارج کر کے اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا۔

پیغام اس ڈاکٹر کا تھا جسے اس نے زیاد کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کا کہا تھا۔ وہ کام کر چکا تھا۔

زیاد کو گولیاں لگی تھیں۔ تین گولیاں! اس کا ایکسیڈینٹ نہیں ہوا تھا۔ مارک کو بھی تین گولیاں لگی تھیں۔ موبائل بے اختیار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گرا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئیں۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ دونوں آپس میں لڑے تھے۔ ڈیول لڑا گیا تھا، یقیناً یہی ہوا تھا۔ زیاد وہ نہیں تھا جو وہ نظر آتا تھا۔ یقیناً وہ اس سے بہت کچھ چھپا رہا تھا۔ وہ اس کے گرد جھوٹ کی لمبی دیواریں قائم کر چکا تھا جن کے پار وہ کچھ نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ اور اب، وہ دیواریں گرنے لگی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ، اس بھری دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس پر وہ مکمل اعتماد کر سکتی تھی۔ جو واقعی اس کا بھرم رکھتا، اس کا مان ٹوٹنے نہ دیتا۔

اس کے پیٹ میں متلی سی ہونے لگی تھی۔ اسے قے آئی تھی، وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی طرف بھاگی تھی۔ اس کے جاتے ہی کمرہ خالی ہو گیا۔ کوئی بالکونی سے کمرے میں کودا۔ بنا آہٹ پیدا کیے وہ میز کی طرف آیا۔ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے کو ڈھکے سفید رومال پر پڑی۔ اس نے دستانے میں قید ہاتھ بڑھا کر اس کا موبائل آن کیا۔ پاسورڈ کھولنے میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ آنکھیں چھوٹی کر کے اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا۔ چند پل وہ کچھ سوچتا رہا پھر ڈائری کے ساتھ رکھا قلم اٹھا کر ڈائری پر جھکا۔

اگلے لمحات میں جب ازابیلا واش روم سے نکل رہی تھی تو وہ بالکونی سے نیچے چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ ٹشو سے اپنا چہرہ تھتھپاتی میز کی طرف آئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل اٹھانا چاہا کہ نگاہ ڈائری کے کھلے صفحے پر ٹکی۔

"اگر آپ خاموش نہیں ہونگی، تو خاموش کروادی جائیں گی۔" سیاہ روشنائی سے تحریر کردہ الفاظ اسے سانس روکنے پر مجبور کر گئے تھے۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے تحریر کے برابر میں قلم کی ٹوٹی نوک کو دیکھا تھا۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹی تھی۔ قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے کرسی کو تھام کر سہارا لیا تھا۔ یہ الفاظ وہ کبھی نہیں بھولی تھی، یہ انداز اسے ہمیشہ خوفزدہ کر دیا کرتا تھا۔ اسے جب لگا تھا کہ اسے پیچھے دھکیلنے والے خود پیچھے ہٹ چکے ہیں تو وہ اچانک اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو چکے تھے۔ اس بار یہ دیوار مزید مضبوط تھی۔ جو شخص اس کے کمرے تک پہنچ سکتا تھا وہ اس سے کچھ بھی توقع کر سکتی تھی۔ ازابیلا وارلڈ، اپنے ہی گھر میں محفوظ نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ سر بیڈ کراؤن پر ٹکائے چہرہ ترچھا کر کے کھڑکی کے پار گہری ہوتی رات پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ ہر سُو خاموشی تھی، اتنی کہ وہ اپنی سانسوں کی آواز بخوبی سن رہا تھا۔ کمرے کی فضا پر سکون تھی مگر جہاں دل بے چین ہو وہاں یہ سکون بھی کارآمد نہیں تھا۔ سماعت سے بار بار وہ الفاظ ٹکرا رہے تھے جو اس نے ہوش و حواس کھونے سے پہلے سنے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود اس چہرے کی تصویر مکمل اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں بن رہی تھی جو اس کے اور تاریک آسمان کے درمیان حائل ہوا تھا۔ کون تھا جو اسے یہاں لایا تھا؟ کون تھا جس کی گود میں اس نے سکون سے آنکھیں بند کی تھیں؟ وہ لمس اتنا مانوس سا کیوں تھا؟ کئی سوال تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لی تھیں۔ چند پل ہی گزرے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ کوئی ہلکی سی آہٹ سے اندر آیا اور اس کے پہلو میں کھڑا ہوا۔ بغور اسے دیکھا جو آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ شاید سو رہا تھا یا شاید جاگ رہا تھا، فیصلہ مشکل تھا۔ سیاہ بال پیشانی پر گرے ہوئے تھے۔ چہرے سے نقاہت جھلک رہی تھی مگر پہلے سے بہتر لگ رہا تھا۔ وہ ہنوز آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

اسی اثناء میں وہ نرم سا لمس اپنی پیشانی پر محسوس ہوا۔ وہ اس کی پیشانی پر گرے بال ہٹا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو اس کے اچانک آنکھیں کھولنے پر ہاتھ کھینچ گئی۔ وہ چہرہ ترچھا کر کے نرمی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے یوں دیکھنے پر گڑبڑائی، نظریں جھکائیں پھر نچلے ہونٹ کا کونہ دانتوں میں دبا کر اسے دیکھا۔

"کیسے ہو؟" آواز نا چاہتے ہوئے بھی بھیگ گئی۔

"دل پریشان تھا پھر تم آ گئیں۔ اب ٹھیک ہوں۔" خاصا شاعرانہ جواب تھا۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا تھا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ چھپانے کے لیے ہاتھ پیچھے باندھ لیے۔ وہ آنکھیں چھوٹی کیے مبہم سا مسکراتا اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے غصہ آ رہا تھا۔ وہ صبح سے تمہارے پاس تھی۔ ایک لمحے کو نہیں اٹھی، مجھے تمہیں دیکھنا تھا۔" وہ آنکھوں میں جمع ہوتے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ہمت جمع کر کے بولی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے مزید رونا آیا تھا۔ "تم نے بھی اسے جانے کا نہیں کہا۔ ٹھیک ہے، تم اس کے کزن ہو لیکن بیوی ہوں میں تمہاری۔ بس ایک نظر تمہیں دیکھنا تھا۔ جانتے ہو چوبیس گھنٹوں میں کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں؟" اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ رہی تھی، نظریں جھکا کر کھڑی تھی۔ شاید آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے تاثرات نہیں بدلے تھے۔ وہ یونہی اسے نرمی اور محبت سے دیکھتا رہا تھا۔

"ایسے مت کیا کرو۔ میرا ضبط مت آزمایا کرو۔" ایک آنسو دھیرے سے آنکھ سے نکل کر گال پر لڑھک گیا۔ اس نے جلدی سے اسے پونچھنا چاہا مگر تب تک دو مزید آنسو رخساروں پر بہہ گئے۔

"رہنے دو۔ تم سے نہیں ہو گا۔" وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے ہی لگی تھی کہ اس سے پہلے ہی وہ آرام سے اس کی کلائی

پکڑتا اسے اپنے پہلو میں بٹھا کر آگے ہوا تھا اور اس کے گرد بانہوں سے حصار قائم کرتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھا تھا۔ سب اتنی اچانک ہوا تھا کہ وہ خود سمجھ نہیں پائی تھی۔ ہوش تب آیا تھا جب اس نے دھیرے سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا تھا، ”آیم ایم سوری، سکون میرے۔“ وہ رو دی تھی، اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر۔ وہ خاموشی سے اس کا سر سہلاتا اس کی سسکیاں سنتا رہا تھا۔

خود سے کیے تمام وعدے بھلا دیے تھے۔ اس نے کہا تھا وہ نہیں روئے گی، مگر وہ اس کا ضبط آزما گیا تھا۔ وہ جو اس سے تھوڑی سی دوریوں پر شکایت کر رہی تھی، اب اسے زندگیوں کی دوری پر جاتا دیکھ کر جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنوں کو کھونے سے ڈرتی تھی، اس نے چند لمحات کے لیے اس سے اس کی اپنی سانسیں چھین لی تھیں۔ وہ کیسے نہ روتی؟ اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اسے موت کے منہ سے واپس آتے دیکھ کر بھی خود پر ضبط کر جاتی۔ وہ ایسی ہی تھی، اپنوں کے لیے حساس اور بہت نازک۔ رشتے شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انسان کو بہت کمزور اور نازک بنا دیتے ہیں۔

اس کے آنسو تھمنے لگے اور سسکیاں دبنے لگیں تو اس نے دھیرے سے اپنا سر اس کے کندھے سے ہٹایا۔ وہ آرام سے اس کے گرد قائم حصار ڈھیلا کر گیا۔ نرمی سے اپنے انگوٹھے کے پوروں پر اس کے آنسوؤں کو چنا تھا۔

”جانتی ہو چوبیس گھنٹوں میں کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ ایسے ہوتے ہیں جن میں تمہارا خیال آتا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھا گیا تھا۔

”زیاد۔۔“ اس کا نام پکارتی وہ روہانسی ہوئی تھی۔ ”اپنی جان داؤ پر لگاتے ہوئے تمہیں میرا بالکل خیال نہیں آیا؟ آئندہ ایسے مت کرنا۔ میں مر جاؤں گی۔“ اس کی دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔

”شش۔۔“ دایاں ہاتھ اس کے رخسار پر رکھتے ہوئے وہ اسے خاموش کروا گیا تھا۔ ”تمہارا ہی تو خیال آیا تھا۔“

”ایسے کرتے ہیں خیال؟ جان نکال کر؟“ وہ شکوہ کر رہی تھی۔

”آئی ایم سوری، سکون میرے۔“ وہ ایک بار پھر معافی مانگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے رخساروں سے آنسوؤں کے نشانات مٹا کر تسلی کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹا تھا۔

”کل رات آسمان پر بہت کم تارے تھے سعاد۔ میں نے گنا تھا انہیں، میری نظروں کے سامنے بس پانچ تارے تھے، صرف پانچ۔ ایک میرا، ایک تمہارا، ایک بابا کا، ایک ماں کا اور۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”اور پانچواں بہت تنہا تھا۔ معلوم نہیں کس کا تھا۔“ اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”تمہارا تارہ میرے تارے کے بہت قریب تھا، بہت زیادہ بالکل تمہاری طرح۔“ وہ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چشمہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ نمی بہت واضع تھی۔ ہر وقت اس کی آنکھوں میں ٹھہری رہتی تھی، اسے اب اس کی عادت سی ہونے لگی تھی۔

”اور کل رات میں نے تمہیں بہت دور جاتے محسوس کیا تھا۔ مجھے لگا میں نے تمہیں کھو دیا۔“ وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ جس پر برنولا لگا تھا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیا سوچ کر جھکی تھی۔ دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنی پیشانی ٹکائی تھی۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھنے لگا۔ ”مجھے تنہا مت کرنا زیاد، میرا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔“ ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر ناک کی ہڈی سے بہتا زیاد کے ہاتھ پر گرا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ کھینچ پایا نہ اسے آنسو بہانے سے روک پایا۔

”اتنا مت رو، سعاد۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ زکام زدہ سی سانس لیتی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”وعدہ کرو آئندہ ایسے نہیں کرو گے۔ ایک بار تو میرے بارے میں سوچتے۔ تمہاری عادی ہو گئی ہوں، عادتیں جان

لیوا ہوتی ہیں۔ تم ان لمحات کی تکلیف محسوس کر سکتے ہو، جب ایک طرف میرا شوہر جس کی محبت میرے لیے سانس کی مانند ہے وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا اور دوسری طرف بھائی جو میرا واحد خونی رشتہ ہے۔ میں اتنی مضبوط نہیں ہوں یار، اتنی ہمت نہیں ہے کہ ایک ہی لمحے میں تم دونوں کو کھو دوں۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ تمہاری بیوی ابھی اتنی بہادر نہیں ہوئی زیاد۔" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں میں نمی ٹھہرتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خود بھی روتی تھی اور اسے بھی رلا دیا کرتی تھی۔ وہ اب بھی یہی کر رہی تھی۔ اس نے آرام سے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے سینے پر رکھا تھا۔

"مت کیا کرو ایسے۔ اپنا عادی بنا کر مجھے یوں تنہا کر کے مت جایا کرو۔" وہ سسک اٹھی تھی۔ زیاد نے اس کے گرد حصار مضبوط کر کے اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر آنکھوں موندلی تھیں۔ بائیں آنکھ سے ایک آنسو نکل کر گال سے لڑھکتا داڑھی کے بالوں میں جذب ہو گیا۔

"تمہیں تنہا کر کے جاؤں گا کہاں؟ تم میری واحد پناہ گاہ ہو۔" اس نے بھیگی آواز میں سرگوشی کی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس اس کے سینے پر سر رکھے آنکھوں موندلی تھیں۔ وہ اپنے پیٹ میں اٹھتی درد کی ٹیسوں کو نظر انداز کرتا یونہی بیٹھا رہا تھا۔ اس کی موجودگی سے رگ و پے میں سکون اتر گیا تھا۔ وہ غلط نہیں کہتا تھا اسے، "سکون میرے"!

☆☆☆

اس کے قدم ان تاریک گلیوں میں بہت احتیاط سے اٹھ رہے تھے۔ سنسان اور ویران گلیاں رات کے اس پہر اندھیرے کی وجہ سے کچھ پر اسرار بھی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گلی کا موڑ مڑ رہا تھا۔ اسی اثناء میں اسے عجیب سا احساس ہوا تھا جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ اس کے قدموں کی رفتار مزید بڑھ

گئی۔ ساتھ ہی وہ احساس بھی بڑھتا رہا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اب گلی سے نکل کر لمبی ہموار شاہراہ پر آیا تھا۔ سڑک پر گزرتی اکا دکا گاڑیاں ایک لمحے کے لیے ساری سڑک کو روشن کرتیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ یونہی تیز رفتار سے چلتا رہا۔

اپنی طرف اٹھتے قدم اب بہت قریب محسوس ہونے لگے۔ اس نے جیکٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر سر پر ٹکی پی کیپ مزید نیچے سرکائی اور پھر ناک سے پھسلتے ماسک کو ذرا اوپر کیا اور دونوں ہاتھ واپس جیکٹ کی جیب میں ڈالے۔ جیب میں موجود خنجر کی موجودگی محسوس کی اور پھر رفتار سست کر دی۔ ایک دو تین، وہ اپنی طرف اٹھتے قدموں کو گننے لگا۔ سات اور آٹھ، خنجر نکال کر اس نے پلٹ کر تیزی سے وار کیا تھا مگر دوسری طرف سے اس کے بازو کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا گیا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی ایک زوردار لات اس کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر خاک آلود زمین سے ٹکرایا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے دیکھا جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔ مکمل سیاہ لباس میں موجود چہروں پر ماسک چڑھائے سروں پر پی کیپ ٹکائے، وہ انہیں اس حلیے میں بھی پہچان سکتا تھا اور وہ پہچان چکا تھا۔ سامنے کھڑا لڑکا جندل یوسف زئی تھا اور اس کے برابر میں خیام حنفی۔

اس نے اٹھنا چاہا مگر خیام نے آگے بڑھ کر اسے ٹھوکر ماری تھی۔ وہ سڑک پر دور جا گرا تھا۔ جلدی سے سنبھلنے کی کوشش کی مگر تب تک جندل اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ گریبان سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور ساتھ ہی ایک مکا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی مگر پے در پے کئی مکے رسید کر کے اس کی مزاحمت کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس کے ناک سے خون کی چند بوندیں گریں۔ چہرے پر ٹکا ماسک ڈھلک گیا۔ گال پر ہلکا سا زخم آیا۔ ان دونوں نے ٹھہر کر اس کھڑی ناک والے لڑکے کو دیکھا جو ضرار سے کافی مشابہت رکھتا تھا۔ تھوڑی کسر باقی

تھی۔ خیام نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچتے ہوئے اسے دیوار سے لگایا تھا۔

"کیا ہم پر اتنا بھی یقین نہیں تھا جو ہم سے حقیقت چھپائے رکھی؟!" چبا چبا کر پوچھا گیا تھا۔ اس کی گردن کے گرد گرفت سخت ہوئی تھی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر سانس رکنے لگا۔ خیام کی گرفت سختی پکڑتی رہی یہاں تک کہ اسے لگا اب بس آخری سانسیں بھی ختم ہونے کو ہیں۔ جندل کو مداخلت کرنا پڑی تھی۔ اس نے خیام کو پیچھے دھکیلا تھا۔ خیام نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا جو اب لمبے لمبے سانس لیتا اپنا تنفس بحال کرنے کی کوششوں میں تھا۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ تینوں سڑک کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ ضرار اپنی لال ہو چکی گردن کو رگڑتا خفا خفا نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا جو فرصت سے اسے گھورنے میں مصروف تھے۔

"کیا مصیبت پڑ گئی ہے تم دونوں کو؟" آخر تنگ آ کر وہ بول ہی اٹھا تھا۔

"یہی سوال ہمارا ہے۔ کون سی قیامت آ جاتی اگر تم ہمیں حقیقت سے آگاہ کر دیتے۔" جندل کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"سعاد کو تو ٹھک سے سب بتا دیا۔ ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟ واللہ میرا دل کر رہا ہے تمہاری جان لے لوں میں۔" خیام نے غصے سے دانت پیسے تھے۔

"سعاد سے بھی کچھ چھپایا نہیں جاتا۔ خدا جانے کہاں پھنس گیا ہوں میں۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ ساتھ ہی ٹشو گردن پر رکھ کر جندل کے مکوں کی وجہ سے بہتے خون کو روکنے کی کوشش بھی جاری تھی۔

"اسپتال کے راستے پر کیا کر رہے تھے؟" خیام نے اس کی بڑبڑاہٹ نظر انداز کرتے ہوئے سوال داغا تھا۔

"سنا تھا زیاد بہت زخمی ہے۔ اسی کو دیکھنے آیا تھا۔ مگر وہ سعاد کے ساتھ تھا تو میں واپس جا رہا تھا جب تم دونوں گدھے

ٹپک پڑے۔"

"بہت اچھے۔ شکر کرو تمہیں اسی کے برابر میں نہیں پہنچادیا ہم نے۔" جندل کے کہنے پر اس نے دانت پیسے تھے۔

"اس سب کی وجہ کیا تھی؟" خیام نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میری رپورٹس میں جب زہر کے آثار نظر آئے تو مجھے الزر قاوی سر کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایک چھوٹا سا ڈرامہ رچانے کا کہا۔ سعاد اور زیاد کا نکاح پلان کا چھوٹا سا حصہ تھا۔ تم تینوں کو وہاں مصروف رکھ کر ہم نے وہ وقت لیا تھا جو ہمیں چاہیے تھا۔ جب ایمبولینس پر حملہ ہوا تو حزب اللہ کے ایک قیدی کو وہی زہر دے کر میرے یعنی ان کے کمانڈر کے حوالے کر دیا۔ اس قیدی کو بعد میں مارک نے مروا دیا اور اسی طرح میں بار بار اگمپنی میں داخل ہو چکا تھا۔ البتہ اس دوران کچھ عجیب باتیں ہوئی۔" اس کے الجھے ہوئے انداز میں کہنے پر دونوں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگے۔ "الزر قاوی سر میرے ساتھ رابطے میں رہے مسلسل۔ مائک کو غائب کروانا، ویڈیوز تم تک پہنچانا، سائبر اٹیک رکوانا، سعاد کے لیے تمہارے گھر آنا اور بہت سے کام جن کے احکامات وہ وقتاً فوقتاً جاری کرتے رہے ہیں۔ لیکن، وہ انداز الزر قاوی سر کا نہیں ہے۔ میں سالوں ان کے ساتھ رہا ہوں، انہیں جانتا ہوں مگر وہ انداز ان کا نہیں ہے۔"

اس کے فکر مندی اور الجھن سے کہنے پر جہاں جندل چونکا تھا وہیں خیام بھی ٹھٹکا تھا۔ انہیں مائک کے متعلق موصول ہونے والی کال یاد آئی تھی جس نے دونوں کو شک میں مبتلا کیا تھا۔ ایسا ہی شک ضرار کو بھی تھا۔ تو کیا واقعی درمیان میں کچھ ایسا جھول تھا جو قابلِ توجہ تھا؟

"کیا کوئی الزر قاوی سر کا نام استعمال کر رہا ہے؟" جندل کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ان کا نام استعمال کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ شاید کچھ اور بات ہے۔"

"تم کبھی ان سے ملے؟" خیام نے سوال کیا تھا۔

"نہیں، مجھ سے بس وہ لڑکا ملتا رہا ہے۔ نام پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی بس اس کے سفید رومال سے اسے پہچان لیتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔ خیام کو وہ لڑکا یاد آیا تھا جو مائک کی گاڑی پر پیٹرول چھڑک رہا تھا۔ یقیناً ضرار اسی کی بات کر رہا تھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا پیغام ملا ہے۔ وارلڈ ہی اسکائے ٹو کی پانچویں سیٹ پر بیٹھا ہے۔" اس نے بات مکمل کر کے دونوں کو دیکھا جن کے چہروں پر کوئی نیا تاثر نہیں آیا تھا۔

"مجھے بالکل تعجب نہیں ہوا۔ یہی شخص تھا جس نے خود کو کور کرنے کے لیے پہلے میکس پھر اسٹیون اور اس کے بعد مارک کو آگے کیا۔" جندل نے سر جھٹک کر کہا تھا۔

"لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ کام بہت صفائی سے کیا جندل! اس کی ہی کمپنی میں اس کا دایاں ہاتھ بن کر کام کرتے ہوئے بھی مجھے کبھی شک نہیں گزرا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی نہیں خبر ہوئی کہ وارلڈ گلاس کمپنی ان لوگوں کے لیے ایک پلیٹ فارم کی طرح ہے۔ یہ شخص اس معاملے میں واقعی قابلِ تعریف ہے۔" خیام نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ جندل نے جواباً کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔ اسے ابراہم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ سوچ کر وہ ضرار کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"تم یہیں کام جاری رکھو گے؟" اس کے سوال پر ضرار نے سر کو جنبش دی۔

"میرا کام اب بہت آسان ہو گیا ہے۔ مارک مر چکا ہے، اب بار بارا گروپ کے چیئرمین کی کرسی کے لیے الیکشن ہوں گے۔ اگلے چیئرمین کے آنے تک سب کچھ سنبھالنے میں آسانی رہے گی۔" اس کی بات پر دونوں نے سر کو جنبش دی۔

"اگلا چیئرمین کون ہو گا؟" خیام نے سوال کیا تھا۔

”خدا جانے۔۔“ ضرار نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ جندل خاموش رہا تھا۔ اگلے کئی پل وہ تینوں یونہی فٹ پاتھ پر بیٹھے رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں اندھیرے میں ڈوبے تین دوست جن کی آوازیں دھیمی ہوتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلا دن باربارا گروپ کے لیے خاصا مشکل تھا۔ الیکشن میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے لیے مائک کی اچانک آمد پریشان کن تھی۔ وہ ہرگز بھی مائک کو سب پر کنٹرول لینے نہیں دے سکتے تھے مگر اس وقت واحد وہی تھا جو مارک کے بعد سب سے زیادہ پرزور امیدوار تھا۔ وہ سب اسی سلسلے میں سر جوڑے بیٹھے تھے، اس سے انجان کہ مائک ہر چیز پر کنٹرول لینے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

اس کی سیاہ چمچماتی گاڑی کمپنی کے باہر رکی تھی۔ گارڈ نے جلدی سے گاڑی سے اتر کر دروازہ کھولا تھا۔ وہ گاڑی سے نکلا تھا اور پھر اس کے اگلے قدم کمپنی میں پڑے تھے۔ سرمئی رنگ کے کوٹ پینٹ میں ملبوس، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پوری شان کے ساتھ چلتا ارد گرد کھڑے لوگوں کو حیران کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے چلتے دو گارڈز اس کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کسی سے بھی بات کیے بنا سی ای او کی آفس میں آیا تھا۔ میز کے پار کرسی خالی ہونی چاہیے تھی مگر وہ یہ دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا تھا کہ اس سے پہلے ہی وہ لڑکا وہاں موجود تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

”سوچا تمہیں تمہارا حق ملنے پر مبارکباد دینے آ جاؤں۔“ کرسی پر جھولتے ہوئے کہا گیا تھا۔ وہ گہری سانس لیتا دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر ٹکائیں۔ آنکھیں اس لڑکے کی گہری آنکھوں میں گاڑیں۔

”اگر تم ایسے میری آفس میں آؤ گے تو سب کو شک میں مبتلا کرو گے۔“ خاصا مخلصانہ مشورہ دیا گیا۔

"تم اتنے عقلمند ہو یا بننے کی کوشش کر رہے ہو؟" دائیں ابرو اٹھائے سوال کیا گیا۔

"تمہیں اب مجھ پر طنز کرنے سے باز رہنا چاہیے۔" ایک اور مخلصانہ مشورہ۔

"بولنے میں تکلیف تو نہیں ہو رہی مائک؟ جندل یوسف زئی کا ہاتھ زیادہ بھاری ہے یا خیام حنفی کا؟" لہجہ خاصا چبھتا ہوا تھا۔ مائک دانت کچکچاتے ہوئے پیچھے ہٹا تھا۔

"دونوں پتھر ہیں۔" وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا تھا۔ وہ لڑکا مزے سے کرسی سے ٹیک لگا گیا۔ "کیا کہنے آئے ہو؟"

"خیام آرہا ہے، اسے یقین دلاؤ کہ مارک کی موجودگی میں کمپنی نے جو بھی ڈیلز وارلڈ گلاس کمپنی سے کی ہیں انہیں ختم نہیں کیا جائے گا۔ اسے بتاؤ کل تم وارلڈ سے خود اس سلسلے میں ملو گے۔ وارلڈ کے پاس اب اپنے لیے کوئی ڈھال نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں اب کی بار وہ تمہیں اپنی ڈھال بنائے۔"

"اس کی بات پر اتنا یقین ہے تو اسے مار کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، مجھے اسکائے ٹو کی شاہ رگ تک پہنچنا ہے۔ جب اس کا وقت آئے گا تو اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹوں گا۔" مائک نے چونک کر اس کی آنکھوں میں امڈتی نفرت کی آگ کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نرم سا تاثر ہی رہتا تھا مگر ایک پل کے لیے اتنی نفرت دیکھ کر وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

"کمپنی کے باقی معمالات خود سنبھالو۔ خبردار جو میری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی، میں وہ ہاتھ کاٹ کر رکھ دیتا ہوں!" لہجے میں سختی در آئی تھی۔ اسے خبردار کر کے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی پھر جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ لمحات پہلے جس آفس میں مائک پوری شان کے ساتھ داخل ہوا تھا اب اسی آفس سے اعتماد سے سر اٹھا کر وہ نکل رہا تھا، بنا کسی خوف کے، بنا کسی پروا کے۔ اپنے کام میں مگن لوگوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا جو یقیناً ان سب

کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ جب وہ مین ہال میں آیا تو سامنے ہی کمپنی کے دروازے سے خیام اندر آ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سپاٹ چہرہ لیے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ دونوں قریب آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک پل کے لیے دونوں برابر کھڑے ہوئے، ایک پل کے لیے خیام کی آنکھوں میں اس سفید رومال والے لڑکے کا عکس ابھرا۔ وہ لڑکا آگے بڑھ گیا، اس نے بھی قدموں کو تھمنے نہیں دیا۔ لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے چہرہ ترچھا کر کے اس لڑکے کو دیکھا جو اب دروازہ پار کر چکا تھا۔ وہ بے اختیار کان میں لگے آلے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"مصعب، کہاں ہو؟"

"کام کر رہا ہوں۔" مصروف سے انداز میں جواب ملا۔

"یہاں آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"خیریت؟"

"وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گیا ہے۔ مجھے ایک عدد باڈی گارڈ چاہیے تاکہ اگلی بار اس کی یہ جرات نہ ہو۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا لیکن دوسری طرف بدر اس کے انداز پر کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔ اس کے کھڑوس باس کو اس کی قدر ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟"

وہ رات گھر چلی گئی تھی اور اب صبح زیاد کے بلانے پر اسپتال آ گئی تھی۔ اس سے پہلے ہی خیام اور جندل اس سے مل

کر جا چکے تھے۔ ضروری سامان بھی اسے دیا جا چکا تھا جس میں کان میں لگا آلہ، موبائل اور پستول شامل تھی۔

مصروف سے انداز میں موبائل کی روشن اسکرین پر نظریں ٹکائے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی سماعت سے زیاد کی آواز ٹکرائی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا پھر اندر آ گئی۔ دروازہ بند کیا اور کرسی کھینچ کر بیڈ کے پاس لانے لگی۔ "بتاؤ ذرا یہ کون ہے؟"

"معلوم نہیں۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ کرسی بیڈ کے قریب رکھ کر وہ بیٹھنے ہی لگی تھی جب وہ جلدی سے اس کی کلائی پکڑ چکا تھا۔

"اس دن تو فوراً کہہ دیا تھا یہ خلیل جبران ہے؟ آج غالب کو نہیں پہچان سکیں۔" وہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر اس کے برابر میں بیٹھی تھی۔

"میں ویسے ہی پریشان ہوں۔ ایسی شاعری سنا کر اب رلا مت دینا۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

"تم انشاء کو سننا چاہتی ہو، یقیناً!" اس کے ناک پر ٹکا چشمہ اتارتے ہوئے پورے یقین سے کہا گیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں چمکتی شرارت کو دیکھ کر بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی تھی۔

"ہم گھوم چکے بستی بن میں،

اک آس کی پھانس لیے من میں،

کوئی ساجن ہو کوئی پیارا ہو،

کوئی دیپک ہو کوئی تارہ ہو۔

جب جیون رات اندھیری ہو،

اک بار کہو تم میری ہو۔" اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے اس نے ٹھہر ٹھہر کر غزل کے اشعار پڑھے تو اسے بے ساختہ اپنے گال تپتے محسوس ہوئے تھے۔

"تم۔۔چلتے پھرتے ہو دیوان ہو یار۔" وہ لال پڑتے گالوں سے ذرا سا سر جھکا کر ہنسی تھی۔وہ مسحور سا اسے دیکھنے لگا۔

"ہم ہیں بے فیض ادیبوں کے ادھورے مصرے،

تو ہے میر کے دیوان پہ چھایا ہوا شخص!" ایک اور شعر اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

"واللہ۔۔" وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر چہرہ موڑ گئی تھی۔زیاد نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔"میں ویسے دیوانِ غالب کی بات کر رہی تھی۔"

"میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی،

اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی۔

میر کی استادی کا غالب نے خود اعتراف کیا ہے۔

ریختے کے اک تمہی استاد نہیں ہو غالب،

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا۔" اسے جیسے میر کی گستاخی پسند نہیں آئی تھی۔وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھنے لگی۔

"اور غالب نے اپنے لیے کچھ نہیں کہا؟"

"کہا ہے ناں،

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے

کہتے ہیں غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔"

"بس اب، کافی ہے۔ یہ بتاؤ تمہاری رپورٹس میں Systolic heart کا ذکر بھی آیا ہے۔ کب سے بیمار ہو تم؟" وہ سنجیدگی سے اس سے پوچھنے لگی۔ اسے مزید شرارت سوجھی تھی۔

"جب سے آپ سے محبت ہوئی ہے۔" مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا گیا۔ وہ لال پڑتے چہرے سے اسے گھور کر رہ گئی۔

"تفصیل بتاؤ اس کی۔ میں نے نام بھی پہلی بار سنا ہے۔"

"اس میں میری کچھ دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن مِس ہو جاتی ہے۔ اندلس سے آنے کے بعد اس کی زد میں آیا ہوں۔ کیونکہ میری کچھ دھڑکنیں وہیں رہ گئی تھیں۔۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ غیر محسوس طریقے سے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط ہوئی تھی۔

"کرنل مرزا اسلم بیگ کی سوانح حیات، کرنل اشفاق حسین کی کتاب "اقتدار کی مجبوریاں" صفحہ نمبر 42۔ معذرت کے ساتھ لیکن میں اشعار کے بعد باقاعدہ دوسروں کے الفاظ چوری ہوتے دیکھ کر اپنے کان مزید بند نہیں رکھ سکتا تھا۔" آواز جندل کی تھی۔ وہ دونوں ایکدم چونکے تھے۔ سعاد نے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے دونوں کے دماغ بھک سے اڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھ کانوں تک گئے اور پھر زیاد کی بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔ اپنے کان سے آلہ نکال کر یوں پھینکا تھا جیسے کوئی اچھوت ہو۔ اپنے کان سے آلہ نکال کر میز پر رکھتی سعاد اس کی اڑی رنگت اور پھر بے ساختہ کی گئی حرکت دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"خدا کی پناہ! کوئی پرائیوسی بھی ہوتی ہے۔" وہ تپ گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر ہنس دی تھی۔ وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہے یہ اب خیام کے ساتھ مل کر کیا کرے گا میرے ساتھ"!

"تو، میں نے کہا تھا اتنے شاعرانہ جواب دو مجھے۔" وہ اس کی حالت دیکھ کر بمشکل اپنی ہنسی پر قابو کیے بیٹھی تھی۔

"واللہ، اب کیا بندہ اپنی بیوی سے محبت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا؟" اس نے ناک سکیڑی تھی۔

"موقع اور محل دیکھ کر سینیور زیاد!" وہ اسے چڑا رہی تھی۔ رخسار ہنوز گلابی ہو کر تپ رہے تھے۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے سینیورا!" وہ روہانسا ہوا تھا۔

"اچھا بس ٹھیک ہے اب۔ یہ لو، ویڈیوز منگوائی تھیں تم نے وہی دینے آئی تھی۔ ویسے کیوں دیکھنی ہیں؟" وہ اپنا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"دیکھوں گا، شاید کوئی قابلِ غور بات نکل آئے۔" اس نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔ اسکرین روشن ہوئی تو والپیپر پر سعاد کی تصویر نظر آئی۔ تصویر کسی دوسرے سے کھچوائی گئی تھی، الحمراء میں۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے سر اٹھا کر سورج کو دیکھنے کی کوشش کرتی سعاد اور اس کے ساتھ فرش پر نظر آتا سایہ، اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی وہ سایہ اس کا اپنا تھا۔ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"ادھر آنا ذرا۔" وہ ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھنے لگی۔ وہ موبائل کا کیمرا آن کرتا آگے ہوا۔ آرام سے دایاں بازو اس کے شانے پر پھیلا کر اس کے قریب ہوتے ہوئے اسکرین سامنے کی۔

"سمائل۔" اس نے مسکراتے ہوئے کیمرا میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ادھر نہیں دیکھ پائی۔ بس چپ چاپ سانس روکے اسے دیکھنے لگی جس کے لبوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی اور آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ اس کے قریب بیٹھا اسے اپنے حصار میں لیے وہ بہت خوش تھا۔ مسکراتی آنکھیں اور مسکراہٹ کے گہرے ہونے کی وجہ سے لبوں کے کنارے بنتا وہ چاند سا نشان اسے ٹھہرنے پر مجبور کر گیا تھا۔ زیاد نے اسکرین پر کلک کیا اور تصویر کھنچ گئی۔

"پرفیکٹ!" وہ نچلے لب کا کونہ دبائے تصویر کو دیکھ رہا تھا جس میں سعاد گلابی رخسار لیے نرمی سے اسے دیکھ رہی تھی

جبکہ وہ مسکراتے ہوئے کیمرا کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے تصویر نہیں دیکھی، وہ موبائل ایک طرف رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا جو ہنوز دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے پر گرے بالوں کو ہٹایا پھر دھیرے سے لبوں کے کنارے پر بنتے نشان کو چھوا۔ وہ اس کی بے ساختگی دیکھ کر مسکراہٹ دبا گیا۔ وہ اس کے متوجہ ہونے پر گڑبڑا کر اس کے حصار سے نکلی تھی۔ جلدی سے اپنا چشمہ اٹھاتی بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے بہت کام ہیں۔ آپ آرام کیجیے گا اور ازا کے لیے دروازہ بالکل مت کھولیے گا۔" نظریں چراتے ہوئے ہدایات جاری کیں۔ وہ اس کے ایکدم تم سے آپ پہ آنے پر بمشکل اپنی ہنسی روک پایا تھا۔

"میری طرف دیکھ کر کہیے گا ذرا۔" اس کے شرارت سے کہنے پر وہ نچلا لب دانتوں میں دبا گئی۔ خجلت سے اسے دیکھا۔ "اپنا خیال رکھیے گا۔ خدا حافظ۔" عجلت میں کہتی وہ پلٹ گئی۔

"ملاقات کا شرف بخشتی رہیے گا، جاتے ہوئے دروازہ بند کر جایئے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے آواز لگائی تھی۔ وہ آنکھیں میچ کر اپنے دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھتی باہر نکل گئی تھی۔ وہ دروازہ بند ہوتے ہی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے جوس کا گھونٹ بھر کر گلاس ایک طرف رکھا پھر موبائل پر چلتی ویڈیو کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ویڈیوز سعاد نے حاصل کی تھیں ان میں صرف عالیان اور دحیہ کی ویڈیوز نہیں تھیں۔ مراکش میں زیاد کے جلتے گھر کی ویڈیو بھی وہیں موجود تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی تھیں اور ہر ویڈیو میں پہلے سے بڑھ کر درندگی کا مظاہرہ کیا ہوا تھا۔ وہ لب سختی سے بھینچے ان دو آدمیوں کو دیکھ رہا تھا جو تاریک رات میں اس کے گھر پر پیٹرول چھڑک رہے تھے۔

اس کے گھر کے بعد کئی دوسرے گھروں پر اور پھر سڑک پر۔ اپنے حلیے سے وہ بحری قزاق معلوم ہوتے تھے۔ ایسے ہی بحری قزاقوں کا ذکر سعاد نے کیا تھا۔ بحری قزاق جو جند اللہ سے لڑے تھے۔ اسی لڑائی کے دوران اس کا، سعاد اور جندل کا اور خیام کا گھر اجڑا تھا۔ گتھیاں اب سلجھ رہی تھیں۔ وہ عرصے سے جن لوگوں کی تلاش میں تھا، جنہیں وہ تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا وہ اس کی نظروں کے سامنے اس کے گھر پر پیٹرول چھڑک کر فارغ ہو چکے تھے۔ منظر بدلا اور اب کی بار سڑک پر کھڑا وہ شخص نظر آیا جو اپنے حلیے سے بحری جہاز کا کپتان لگ رہا تھا۔ وہ نوجوان لڑکا تھا، عمر کم و بیش بیس سے اکیس سال۔ اس کا چہرہ واضح نہیں تھا البتہ دائیں طرف جیکٹ میں اڑسا دو دھاری خنجر بالکل واضح تھا۔ اس خنجر سے ملنے والا نشان جندل کے بازو پر تھا۔ اسے اس بار کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

وہ اب اس بچے کی طرف متوجہ ہوا تھا جسے نوجوان کپتان لائٹر پکڑا رہا تھا۔ بچے کا چہرہ بھی واضح نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں اس کے نقوش دیکھ پانا مشکل تھا۔ اس بچے نے لائٹر جلایا۔ اس شخص کی تقلید میں لائٹر سامنے پھینکنے کے بجائے وہ پلٹا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ لائٹر اس کے گھر کی طرف اچھال چکا تھا۔ آن کی آن میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ شعلے بلند ہوئے تھے۔ کئی گھر آگ کی لپیٹ میں آئے تھے۔ نوجوان کپتان کے قہقہے اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

بھڑکتے شرلوں کی روشنی میں اس بچے کا چہرہ واضح ہوا۔ خوفزدہ چہرہ اور پتھریلی نگاہیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ زیادہ یہ چہرہ دیکھ کر ٹھٹھکا تھا۔ اس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے، رنگت بالکل دودھیا تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ عربی خون لگا تھا مگر اگلے ہی لمحے میں وہ مغرب کے لوگوں کی جھلک دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ وہ اس بچے کو کیسے بھول سکتا تھا؟ یہ بچہ، خیام حنفی تھا۔ ایک عربی سلطان ہو جیسے یا پھر مغربی شہنشاہ! اس قوم سے تعلق رکھنے والا جس کی رگوں میں عربی اور مغربی اقوام کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ خیام حنفی ہی تھا،

اس کے گھر کو آگ میں جھونکنے والا۔ اس رات وہاں خیام بھی تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ میں موجود کلپ کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا تھا۔ زیاد کو لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ ازا اس رات اپنے کلپ کو ڈھونڈنے ہی تو نکلی تھی۔ یہی گلابی رنگ کا نفیس اور پیارا کلپ جو خیام کی ہتھیلی پر آگ کے شعلوں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ ضبط کے مارے چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ ویڈیو ختم ہو گئی۔ وہ بنا پلک جھپکے سانس روکے موبائل کی تاریک اسکرین کو تکتا رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ سختی سے ہونٹ بھینچتا ہاتھ پر لگا برنولا کھینچ کر نکال رہا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے تھے، جیکٹ پہن کر پستول اور موبائل جیکٹ کی جیب میں اڑسے تھے۔ سر پر پی کیپ ٹکائی اور قدم دروازے کی طرف بڑھائے تھے۔ پیٹ میں درد کی ٹیس اٹھی تھی، بے اختیار اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔ لب بھینچ کر درد ضبط کرتے ہوئے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ٹھیک بیس منٹ بعد وہ خیام کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ کمرے میں آیا تھا۔ پی کیپ سر سے اتار کر ایک طرف پھینک کر وہ میز کی طرف آیا۔ میز پر رکھی چیزیں الٹ پلٹ کیں پھر عجلت میں تمام درازیں کھول کر دیکھیں۔ وہ کسی کی تلاش میں تھا جو یہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسی کمرے میں، خیام کے کمرے میں! وہ غصے سے لال چہرہ لیے سائیڈ ٹیبل کی طرف آیا تھا۔ جلدی سے دراز کھولی پھر وہاں رکھی چیزیں الٹ پلٹ کیں۔ اسے جس کی تلاش تھی وہ مل گیا۔ وہ گلابی رنگ کا کلپ وہی موجود تھا۔ اس نے ٹھہر کر وہ کلپ اٹھایا تھا۔ ہتھیلی پر اس کلپ کو رکھ کر بغور اسے دیکھا۔ اس رات یہی کلپ ازا کے بالوں میں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ لب سختی سے دانتوں تلے کچلے گئے۔ خون کی ننھی سی بوند اس کے نچلے لب پر چمکی۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی، اسے سانس لینا محال لگا۔

خالی خالی نگاہوں سے اس نے دراز میں جھانکا۔ اگلے لمحے میں وہ بری طرح ٹھٹھکا تھا۔ وہاں کوئی انگوٹھی رکھی تھی۔

اس نے جھک کر اس انگوٹھی کو اٹھایا، انگوٹھی میں جڑے نیلے رنگ کے موتی کو دیکھ کر اسے پہچاننے میں دقت نہ ہوئی کہ یہ انگوٹھی ازا کی تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ انگوٹھیوں میں سے ایک تھی، لیکن اب یہ خیام کے پاس تھی۔ اس کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں، اس کی گھڑی کے ساتھ رکھی تھی۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہاتھ میں موجود کلپ اور انگوٹھی کو دیکھا تھا۔ نگاہوں کے سامنے دو چہرے لہرا گئے تھے۔ ایک چہرہ ازا کا تھا، اس کی معصوم بہن کا۔۔ اور دوسرا، وہ بھی ازا کا تھا، جو اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی۔

ابراہم وارلڈ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ وہ ازا کا کزن نہیں ہے۔ ازا ابراہم کی سگی بیٹی نہیں تھی۔ اس کے اور ازا کے نقوش بہت ملتے تھے کیونکہ۔۔۔ وہ ازا کا بھائی تھا۔ ازا تاشفین کا بھائی زیاد تاشفین! یہیں اس سے غلطی ہوئی تھی۔ یہیں ابراہم نے اسے پکڑا تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ وہ ازا کا بھائی ہے!!

اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔ کلپ اور انگوٹھی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ پلکوں سے نمکین پانی کا چھوٹا سا قطرہ جھول کر گال پر لڑھک گیا۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔

قیامت تو یہ تھی کہ، خیام اس بات سے آگاہ تھا۔ وہ سب جانتا تھا، وہ۔۔ خیام حنفی، ہمیشہ سے سب جانتا تھا۔

☆☆☆

"ان چاروں آدمیوں کو بیسمنٹ میں رکھا ہوا ہے میں نے۔ ہاں ٹھیک ہے، بدر سے کہنا تمہیں لے آئے گا، گاڑی اسی کے پاس ہے۔" وہ موبائل کان سے لگائے لاؤنج میں داخل ہوا تو نگاہ بے اختیار سامنے کمرے سے نکلتے زیاد پر ٹکی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ اس کے چہرے کے پتھریلے تاثرات، تنے ہوئے جبڑے اور سختی سے بھینچی ہوئی مٹھیاں اسے ٹھٹھکنے پر مجبور کر گئی تھیں۔ وہ موبائل بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ماتھے پر بل ڈالے وہ

کچھ کہنے ہی لگا تھا جب نگاہ اس کے ہاتھ میں موجود کلپ پر ٹکی۔ اس نے بے اختیار سانس روک لیا تھا۔ وہ نظریں نہیں اٹھا پایا تھا۔ بنا پلک جھپکے سانس روکے اس کلپ کو دیکھے گیا۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ وہ حقیقت جان چکا تھا، وہ ساری زندگی جس لمحے سے بھاگتا رہا تھا وہ آن پہنچا تھا۔

زیاد دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تھا۔ ضبط کے مارے آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ سرخ پڑتی آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔ وہ اپنے گھر کو جلتے دیکھ رہا تھا۔ اپنی بہن کی چیخوں کو سن رہا تھا، اپنی ماں کی لاش ڈھونڈ رہا تھا۔ اور اس کا مجرم سامنے کھڑا تھا۔ خیام حنفی، جس نے اس کے گھر کو آگ میں جھونکا تھا۔ جو اس کے ساتھ کئی معصوم لوگوں کا مجرم تھا۔ ایک سفاک قاتل!

"میرے بھائی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ مجھے ڈانٹتے بھی نہیں ہیں۔" وہ محبت سے اسے تکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب آنے پر ڈر کر معاویہ کے پیچھے چھپی تھی۔ اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ پھسل کر ناک کی ہڈی پر گرا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے سختی سے خیام کی گردن دبوچی تھی۔ خیام، جس نے گردن کے گرد گرفت سخت ہونے پر جب نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تو آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"وہ تم تھے۔ اس رات میرے گھر کے باہر تم تھے۔ آگ کا کھیل تم نے کھیلا تھا۔" اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو خیام کے لیے بے حد نفرت ابھری تھی۔ وہ سختی سے دانت ایک دوسرے پر جمائے کھڑا تھا۔ مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ گردن کے گرد بڑھتا زور اسے سانس روکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ "وہ تم تھے خیام حنفی!! تم جانتے تھے ازا میری بہن ہے، وہی ازا جس کے مجرم ہو تم!!" وہ چلا ہی تو اٹھا تھا۔ آنکھوں سے دو آنسو گال پر لڑھک گئے تھے۔ خیام نے کچھ بولنے کی کوشش کی تھی وہ بول نہیں پایا۔ پلکوں سے ایک آنسو جھول کر گال پر لڑھک گیا۔ اس کا چہرہ لال ہونے لگا تھا، جیسے خون چھلکنے لگا ہو۔

”قاتل ہو تم، سفاک قاتل! مجرم ہو تم۔ تم میں اور ان درندوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ اس کی آواز کمزور پڑی تھی۔ خیام کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ سانس رک رہا تھا، پیشانی کی رگیں تن گئی تھیں۔ اگر ایسے ہی اس کی موت لکھی تھی تو وہ ایسے ہی مرنا چاہتا تھا۔ اپنے ہی دوست کے ہاتھوں بے غیرتی کی موت، شاید اسی طرح وہ اپنے کیے کا کفارہ ادا کر سکے۔ شاید یونہی، ایک بڑے بوجھ سے آزادی حاصل ہو۔ اس کی آنکھوں سے کئی آنسو بہتے چلے گئے۔ زیاد کی گرفت مزید سخت ہوتی گئی۔ اسی لمحے میں سعاد اندر آئی تھی۔ نگاہ زیاد کے پتھیر لے چہرے سے ہوتی خیام پر ٹکی جس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔

”زیاد!!“ وہ بے اختیار چیخی تھی۔ تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔ ”چھوڑو انہیں۔ زیاد پاگل ہو گئے ہو؟“ وہ چلائی تھی۔ اسے پیچھے دھکیلنا چاہا تھا مگر وہ جم کر کھڑا تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ نہ کچھ سن رہا تھا، نہ دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف خیام کی بگڑتی حالت دیکھ کر اسے کچھ سجھائی نہیں دیا تھا۔ ”زیاد، زیاد مر جائے گا وہ۔ چھوڑو اسے۔“ اس کا بایاں بازو پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے وہ التجا کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں کسی نے پیچھے سے زیاد کو پکڑا تھا۔ اس کے پلٹتے ہی ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید ہوا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ سعاد نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے پیچھے کھڑے جندل کو دیکھا تھا جو زیاد کو سنبھلنے کا موقع دیے بنا اس کے پیٹ پر لات رسید کر چکا تھا۔ کچے زخم کھل گئے تھے، درد کی ٹیس اٹھی تھی۔ خون کی چند بوندیں گری تھیں۔ سفید شرٹ پر لال دھبے پڑے تھے۔ اس نے لب دانتوں سے کچلتے ہوئے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔

خیام نے افسردہ نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ اس کا تنفس بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ گردن کے گرد اس کی سخت گرفت کی وجہ سے نشان پڑ چکے تھے۔ جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ جندل نے سخت نگاہوں سے زیاد کو گھورا تھا جو فرش پر گرتی خون کی بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"جندل مت کرنا۔ جندل رکو۔" سعاد اسے روکتی رہ گئی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ایک اور مکا زیاد کے جبڑے پر رسید کر چکا تھا۔ اس بار اس کے گال کی جلد پھٹی تھی۔ خون کی ننھی بوندیں نمودار ہوئی تھیں۔

"اب اپنے ہی دوست کی جان لو گے تم؟!" وہ غصے سے چلایا تھا۔

"ہاں لوں گا۔ دوست نہیں قاتل ہے یہ قاتل!" وہ دھاڑا تھا۔

"اپنا منہ بند رکھو زیاد ورنہ اسے توڑنے میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا!" زیاد نے جواباً خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا مگر جندل کے گال پر پڑنے سے پہلے ہی خیام اسے روک چکا تھا۔

"تمہیں مجھ پر غصہ ہے تو مجھ پر ہی نکالو۔" اس نے سرد آواز میں کہا تھا۔ زیاد نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا تھا۔

"میرا دل کر رہا ہے خیام میں تمہاری جان لے لوں۔ نفرت ہو رہی ہے مجھے تم سے، شدید نفرت!" اس کا نفرت آمیز لہجہ خیام کو پتھر کا کر گیا تھا۔ اس کے الفاظ کئی پل اس کی سماعتوں سے ٹکراتے رہے تھے۔ نفرت، ہاں وہ نفرت کے ہی قابل تھا۔ اسے وہی مل رہا تھا، جو اسے ملنا چاہیے تھا۔ شدید نفرت!

"اپنے الفاظ پر غور کرو!" جندل کے کہنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"جانتے ہو تمہارا یہ دوست، یہ وہی ہے جس نے اس رات میرے گھر میں آگ لگائی تھی۔ اسی کی وجہ سے میں اور میری بہن یتیم ہو گئے تھے۔ یہی ہے میری بہن کا مجرم جو آج اس کی وجہ سے اپنی اصل شناخت کھو چکی ہے!!" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ گالوں پر آنسو گرنے لگے تھے۔ خیام کو سانس لینا محال لگا تھا۔ سعاد نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دونوں کو دیکھا تھا۔ جندل کا چہرہ ہنوز بے تاثر رہا تھا۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا اس نے کیا کیا ہے۔ لیکن تمہیں کوئی حق نہیں ہے تم اس سے نفرت کرنے لگو!" خیام نے بے یقینی سے جندل کو دیکھا تھا۔ اسے تو زیاد کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو اس کے ساتھ شانے سے شانہ

ٹکائے، کندھے سے کندھا ملائے مکمل اعتماد سے کھڑا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔۔ وہ حیران ہوا تھا، بے حد حیران۔

"یہ نفرت کے ہی قابل ہے!" وہ دھاڑا تھا۔ نم آنکھوں میں شعلے کی طرح بھڑکتا غصہ سعاد کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر گیا تھا۔ "یہ شخص انہی درندوں کی صف میں کھڑا ہے۔ خیام حنفی نفرت۔۔" اس کی بات مکمل نہیں ہوئی۔ جندل نے ایک اور مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ سنبھل کر سر اٹھانے ہی لگا تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنا عمل دہرا چکا تھا۔ وہ لڑکھڑایا تھا۔ ایک پل کے لیے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سعاد تیزی سے ان دونوں کے درمیان میں آئی تھی۔

"جندل رکو، خدارا رک جاؤ۔ اس کی حالت دیکھو۔" اس نے منت کی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔ زیاد صوفے کا سہارا لیتا پیٹ پر ہاتھ رکھ کر جھکا تھا۔ منہ سے نکلتا خون سفید فرش پر گرا تھا۔ خیام اسے سنبھالنے کے لیے آگے آیا تھا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹک چکا تھا۔ سعاد نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"زیاد۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا تھا۔ اس کا تیزی سے بہتا خون دیکھ کر اس کی آنکھوں سے کئی آنسو لڑھک گئے۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایک خفا نگاہ جندل پر ڈالی تھی۔ جندل لب بھینچ کر رہ گیا۔ وہ سعاد کا ہاتھ جھٹک کر پلٹا تھا۔ ایک سرد نگاہ خیام پر ڈالی۔

"تم پلٹے کیوں تھے؟ تم ہی کیوں خیام؟"

"میں خوش نہیں تھا۔۔" ایک آنسو اس کے گال پر لڑھکا تھا۔ آوز کانپ گئی تھی۔ "میں تمہیں بھی خوش نہیں دیکھ سکا تھا۔" زیاد نے سر جھکا کر آنسوؤں کو اندر اتارا تھا۔ خیام ایک قدم آگے بڑھا تھا۔ "میں قاتل نہیں ہوں زیاد۔۔ میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا۔ یہ قسمت تھی۔" وہ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ صفائی پیش کر رہا

تھا۔ بات دوستی کی تھی، وہ اس دوستی کو نفرت میں بدلتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”مدد خدا کرتا ہے مگر انسان شکر اس کا ادا کرتا ہے جو اس مدد کا ذریعہ بنتا ہے۔ آزمائش خدا کی طرف سے تھی تم ذریعہ بن گئے۔ موت قسمت میں تھی تم قاتل بن گئے۔“ دونوں کی دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ سانس لینا محال لگ رہا تھا۔

”میں نہیں بننا چاہتا تھا۔۔۔“

”میں تمہیں معاف نہیں کروں گا، ازا کے لیے تو بالکل نہیں۔ آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا خیام! میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ زیاد کی سرد آواز اور لہجے میں سختی محسوس کر کے اسے لگا تھا کسی نے اس کا دل پکڑ کر مٹھی میں نچوڑ لیا ہو۔ وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ سعاد نے رک کر خیام کو دیکھا تھا جو پتھریلی نظروں سے فرش پر گرے زیاد کے خون کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لاؤنج پار کر گیا۔ سعاد اس کے پیچھے گئی تھی۔ جندل صوفے پر ڈھے سا گیا تھا۔ خیام پنجوں کے بل فرش پر بیٹھا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر خون میں لت پت کلپ کو اٹھایا اور سختی سے مٹھی میں بھینچ گیا۔ اسے اندازہ تھا، زیاد کی یہ نفرت جلد ختم ہونے والی نہیں تھی۔ وہ اسے وقتی غصہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ نفرت ہی تھی کہ اس نے کہا تھا وہ اس کی جان لے لے گا۔ اسے موقع ملا تو وہ اپنا ادھورا کام ضرور پورا کرے گا۔

☆☆☆

فیکٹری میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ فرش پر کسی کے جوتوں کے نشان تھے، آنے والا جو بھی تھا خاصا لاپروا تھا۔ اس کے کیچڑ بھرے جوتوں کے نشان دائیں طرف کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ پی کیپ سرکاتا آگے بڑھا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا تو وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ سیاہ ٹراؤزر پر سیاہ ہی اپر پہنے سر پر پی کیپ ٹکائے، بالوں کی اونچی پونی بنائے وہ اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ وہ بنا چاپ پیدا کیے آگے آیا

تھا۔ ایک سرد نگاہ بیڈ پر لیٹے مارک پر ڈالی تھی جس کا سامنے کھڑا ڈاکٹر معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اب اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا جو میز پر انجیکشن رکھ رہی تھی۔ چہرے پر سفید رنگ کا ماسک لگا تھا۔

"بچ جائے گا یہ؟" اس کے سوال پر اس لڑکی نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے پر لگا ماسک اتارا تھا۔ گہری، ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں اور نکھرے نکھرے چہرے والی وہ لڑکی ازا تھی، ازا تاشفین!

"مشکل ہے۔ یہ صرف کچھ وقت کے لیے اٹھ جائے بہت بڑی بات ہو گی۔" وہ حقارت سے کہہ رہی تھی۔ اس نے ایک نگاہ مارک پر ڈالی پھر ازا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے بیڈ سے ہٹ کر دور کھڑا ہوا۔ وہ اس کی تقلید میں وہیں آ گئی۔

"جوتے دکھاؤ اپنے۔" اس کے کہنے پر ازا کے ماتھے پر بل پڑے۔ دایاں پاؤں ذرا سا اوپر کیا۔ اس نے جھک کر اس کے جوتے دیکھے۔

"کیچڑ لگی ہوئی ہے ازا! احتیاط کیا کرو۔" تیوری چڑھا کر کہا گیا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر کندھے اچکاتی دونوں ہاتھ اپر کی جیبوں میں ڈال چکی تھی۔

"بائے داوے، کیوں بلایا ہے؟ اور یہ کوئی طریقہ ہوتا ہے بلانے کا؟ جان نکال دی تھی تم نے میری۔" وہ اس سفید رومال والے لڑکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خفگی سے کہہ رہی تھی۔ اس نے بس کندھے اچکانے پر اکتفا کیا تھا۔

"مارک کا معائنہ کروانا تھا اور دوسری بات، بار بار اگروپ کے چیئرمین کے لیے الیکشن ہو رہے ہیں۔ مائک کو سیٹ دلوانی ہے اور اسکائی ٹو یہ ہونے نہیں دے گا۔ تمہیں اپنا زور لگانا ہو گا۔"

"سمجھ گئی۔ سمجھو کام ہو گیا۔" اس نے سر کو خم دے کر کہا تھا۔

”اور سنو ازا، زیاد جانتا ہے تم اس کی بہن ہو۔“ ازا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھیں تعجب سے پھیلی تھیں۔ سانس روک لیا تھا۔ دھڑکنیں منتشر ہوئی تھیں۔ ”اسے ہرگز یہ اندازہ مت ہونے دینا کہ تم اس سے باخبر ہو۔ سمجھ گئیں؟“ دائیں ابرو اٹھائے پوچھا گیا۔ وہ گم سم سی اسے دیکھتی سر اثبات میں ہلا گئی۔

”اگر آپ خاموش نہیں رہیں تو خاموش کروادی جائیں گی۔ ہاں اب میں سمجھ سکتی ہوں، پچھلی بار تم نے یہ تب کہا تھا جب ایملی کے بوائے فرینڈ کے قتل کے پیچھے مارک کا ہاتھ نکلا تھا۔ اس بار جب میرا راز فاش ہوا ہے۔“ وہ بات کی تہہ تک پہنچی تھی۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اسے کیسے خبر ہوئی؟“ اسے اپنے حلق میں کچھ چبھتا محسوس ہوا تھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بس احتیاط برتنا، اسے شک کا موقع مت دینا۔“ اس کی بات پر وہ سر کو جنبش دے گئی۔ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد اس نے گردن ترچھی کر کے بیڈ کے پاس کھڑے ڈاکٹر کو دیکھا جو ان کی طرف آرہا تھا۔

”مارک نہیں بچ پائے گا۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔“ سنجیدگی سے اطلاع دی گئی۔

”ہم اسے کچھ دیر کے لیے ہوش میں لاسکتے ہیں؟“ ازا نے عجلت میں پوچھا تھا۔

”یہ اسے مزید موت کے قریب لے جائے گا۔“

”یعنی یہ ممکن ہے۔ بہت اچھے، اسے ہوش میں لائیں۔“ ازا نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

”لیکن وہ۔۔“

”جو کہا جارہا ہے وہی کرو بس!“ اس لڑکے کے سخت لہجے پر ڈاکٹر نے رک کر اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دے کر مڑ گیا۔ وہ دونوں آپس میں نظروں کا تبادلہ کر کے مارک کی طرف متوجہ ہوگئے۔

☆☆☆

سعاد اسے صوفے پر بٹھا کر خود فرسٹ ایڈ باکس لے آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے گہری سانسیں لیتا اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوششوں میں تھا۔ اپنے زخموں سے بے پرواہ وہ بس ازا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ بار بار اس کا معصوم چہرہ نگاہوں کے سامنے آتا تو اسے خیام سے مزید نفرت ہونے لگتی تھی۔ زندگی نے عجب دوراہے پر اسے لا کھڑا کیا تھا۔ سعاد فرسٹ ایڈ باکس اس کے برابر میں رکھ کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ آرام سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تھے۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

”خون بہہ رہا ہے۔ اسے دیکھنے دو پلیز۔“ وہ التجا کر رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رک گیا۔ زیاد کی شرٹ پر خون کا سرخ دھبہ اسے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ آرام سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال کر پیچھے ہو کر صوفے کے بازو پر سر گرا چکا تھا۔

”تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ سعاد اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیوں نہ کروں، حالت دیکھی ہے اپنی؟“ وہ چاہ کر بھی اپنا لہجہ سخت نہیں کر پائی تھی۔

”اس کا ذمہ دار بھی تمہارا بھائی ہے۔“ وہ اسے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔

”تم میرے بھائی سے نہیں اپنے دوست سے لڑے ہو۔ خبر دار جو مجھے بیچ میں گھسیٹنے کی کوشش کی۔“ اس کے ماتھے پر بل آئے تھے۔ وہ اپنا لہجہ سخت کر چکی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر انگشت شہادت اور انگوٹھے سے اپنے ناک کی ہڈی مسلنے لگا۔ وہ چپ چاپ فرسٹ ایڈ باکس کھول کر سامان نکالنے لگی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کے منتظر نگاہوں سے دیکھنے پر سیدھا ہو کر بھی بیٹھ گیا۔ وہ بہت آرام سے اچک کر اس کے گال پر لگے زخم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”خون پرانے زخموں سے بہہ رہا ہے۔“ زیاد کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں اور وہ زخم ڈاکٹر کو دکھانے والے ہیں۔ اور اگر ڈاکٹر کے پاس جانے کی توفیق نہ ہو تو خود ہی دیکھ

لینا۔ میں بس اپنے بھائی کے دیے گئے زخموں پر مرہم رکھنے کی پابند ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے غلطی کا اعتراف کیا تھا۔ اپنی لڑائی میں وہ اسے واقعی نہیں گھسیٹ سکتا تھا۔

"مت کیا کرو ایسے۔" وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی، وہ مکمل اس کے رخسار پر آئے زخم کی طرف متوجہ تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ رہا تھا۔ چہرہ قریب ہونے کی وجہ سے یہ نمی مزید واضع تھی۔ وہ بے اختیار نظریں جھکا گیا تھا۔ وہ گال پر لگا زخم صاف کر کے پیچھے ہوئی۔

"ڈاکٹر کے پاس چلیں؟" وہ سر نفی میں ہلا گیا۔ "خون بہہ رہا ہے۔" وہ پریشان ہوئی تھی۔

"رک جائے گا۔" گہری سانس لے کر کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سنجیدگی سے سامنے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "آؤ گھر چلیں۔" نگاہوں کا رخ اس کی طرف کیا تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"گھر؟"

"میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔" اس کے لہجے میں خود بخود سختی آگئی تھی۔ وہ اپنے سامنے پھیلے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سختی سے لب بھینچتے ہوئے اپنا ہاتھ واپس کھینچ گیا۔

"زیاد، تم جانتے ہو میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔ میرا سارا کام۔۔"

"وہاں کر لینا۔ اس کی وجہ سے میں یتیم ہو گیا، میں نے اپنی بہن کو کھو دیا اب اپنی بیوی کو کیسے اس کے گھر رہنے دوں؟" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ چکا تھا۔ سعاد نے خفا خفا سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت کچھ سمجھنا نہیں چاہتا تھا، وہ بس خود کو سمجھانا چاہتا تھا۔

"زیاد، مت کرو ایسے۔ وہ تمہارا دوست۔۔۔"

"مت کہو ایسے۔ وہ میرا دوست نہیں ہے۔" اور اب وہ تھک گئی تھی۔ وہ بہادر تھا، مضبوط تھا اس کے ہر دکھ کو سمیٹ لیتا تھا۔ وہ کمزور تھی، حساس تھی اس کے دکھوں کا بوجھ چاہ کر بھی بانٹ نہیں پا رہی تھی۔ بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرتا تاثر دیکھ کر زیاد ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ انکار کر رہی تھی، وہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ وہ چند پل بے یقینی کی کیفیت میں کھڑا رہا پھر لب بھینچے تھے۔ پیشانی رگڑتے ہوئے چہرہ موڑ کر گہری سانس لی تھی۔ اس کا لال ہوتا چہرہ اور آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ کر سعاد کی آنکھ سے ایک آنسو گرا تھا۔ زیاد نے نظروں کا رخ اس کی طرف کیا پھر سر کو جنبش دی۔

"اپنا خیال رکھنا، سعاد یوسف زئی!" زیاد کے الفاظ سن کر اسے لگا تھا کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ کر نچوڑ کیا ہو۔ وہ ایک آخری نگاہ اس پر ڈال کر اس کے برابر سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی۔

"مت جاؤ۔ اپنے ساتھ ظلم مت کرو۔ ہم ساتھ یہ دکھ سہہ لیں گے، تمہیں غصہ ہے تو نکال لو۔ رونا ہے تو میں کندھا پیش کر دوں گی، ایسے مت جاؤ۔" وہ آنسو بہا رہی تھی۔ وہ رک گیا تھا مگر پلٹا نہیں تھا۔ پلٹتا تو پتھر کا ہو جاتا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی تھی مگر وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ پار کر گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"زیاد۔۔ زیاد رکو۔" وہ آستین سے اپنی نم آنکھوں کو رگڑتا تیزی سے زینے اتر رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے زینے اترنے لگی تھی۔ اس کے انتظار میں کھڑے جندل اور خیام سعاد کی آواز پر چونکے تھے۔ "زیاد۔۔ رکو۔" وہ اسے پکار رہی تھی، اور پہلی بار وہ اس کی پکار نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ اس کی ایک پکار پر پلٹ جایا کرتا تھا، اس کے پاس آ جایا کرتا تھا آج وہ دور جا رہا تھا۔ وہ آخری زینے پر رک گئی۔ خیام سعاد کو دیکھ کر رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جندل نے افسوس سے اسے دیکھا پھر زیاد کو جو دروازہ پار کر چکا تھا۔ کچھ ہی لمحات میں کسی گاڑی کے جانے کی آواز آئی۔ اس کی

آنکھوں سے کئی آنسو بہہ نکلے تھے۔

"اس گدھے کے لیے مت روئیں۔ دماغ ٹھکانے لگے گا تو آجائے گا واپس۔" جندل نے منہ بسور کر کہا تھا۔ سعاد نے خفا نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"وہ زخمی تھا جندل۔ کچھ تو خیال کرتے، اس کا نہیں تو اپنی بہن کا خیال کرتے۔ حالت دیکھی تھی تم نے اس کی، وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ کتنی آسانی سے کہہ رہے ہو تم کہ میں اس کے لیے نہ روؤں۔ تمہیں لگتا ہے وہ آسانی سے لوٹ آئے گا؟ اس قابل رہا ہے وہ؟" وہ دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جندل نے لب دانتوں میں دبائے اسے دیکھا تھا۔ "اور آپ خیام، نہیں معلوم کہ جھگڑا کس لیے ہوا ہے۔ مگر ایک بار اسے دوست سمجھ کر اسے خود حقیقت بتاتے تو آج وہ اس طرح بکھرا ہوا وجود لے کر یہاں سے نہ جاتا۔ آپ نے اس کو توڑ دیا ہے۔ اس کے دوستوں پر اس کے مان کو توڑا ہے!" بولتے ہوئے اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ خیام کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"پاگل ہوگئے ہیں آپ تینوں۔ اپنے ساتھ مجھے بھی کر دیں گے۔" سخت نگاہ ان دونوں پر ڈال کر وہ زینے چڑھنے لگی تھی۔ وہ دونوں چپ چاپ اسے جاتا دیکھتے رہے تھے۔ ایک یہ لڑکی تھی جو ہر چیز سے انجان تھی مگر باجود اس کے ان تینوں کے درمیان پِس رہی تھی۔ ایک وہ لڑکی تھی جو تینوں کے لیے سانس کی مانند تھی اور انجانے میں ان کے درمیان ایک سخت دیوار کا سبب بن گئی تھی۔ جانے اس سب میں اصل قصوروار کون تھا، اصل گناہ کس کا تھا جس کی سزا سب کاٹ رہے تھے؟

☆☆☆

"تمہیں اسے نہیں مارنا چاہیے تھا۔" وہ افسوس کر رہا تھا۔ نگاہ سر ہاتھوں میں گرا کر بیٹھے جندل پر تھی۔ "وہ تکلیف میں تھا۔ تمہیں اسے سمجھنا چاہیے تھا۔" اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ جندل نے سر اٹھا کر

خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو کیا کرتا؟ مرنے دیتا تمہیں؟ مجھے مت بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ واللہ میرا دل کر رہا ہے میں اٹھ کر تمہارا بھی سر پھاڑ دوں۔" اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ خیام نے بے بسی سے سر جھٹکا تھا۔ "سمجھ کیا رکھا ہے تم دونوں نے خود کو؟ ہاں ٹھیک ہے سمجھ گیا میں وہ آگ تم نے لگائی تھی تو پھر کیا؟ ہو گیا ناں جو ہونا تھا، اب اس بات پر ایک دوسرے کی جانیں لیتے پھرو گے؟" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔

"اس رات تم بھی وہاں تھے جندل!" وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔

"ہاں تھا میں۔ لیکن اب یہاں ہوں، زندہ سلامت ہوں۔ اور کیا چاہیے؟ اپنے دشمنوں کا گریبان پکڑنے کے بجائے اپنے دوستوں کا گریبان پکڑوں؟ اب کیا اس حد تک گر جاؤں؟"

"اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ اپنی بہن۔۔۔"

"ہاں تو جائے اپنی بہن کے پاس۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر نکالے اسے اس جہنم سے جب وہ جانتا ہے کہ ازا اس کی بہن ہے۔ جا کر ابراہم وارلڈ کا گریبان پکڑے اور اس سے حساب لے، گردن دبوچنی ہے تو دلال کی دبوچے۔ تم پر ہاتھ کیوں اٹھایا ہے اس نے؟!" اس کی آنکھوں سے جھلکتا غصہ خیام کو حیران کر گیا تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ ازا زیاد کی بہن تھی۔ باوجود اس سب کے جو ان سب کے ساتھ ہوا وہ اس پر غصہ کیوں نہیں کر رہا تھا؟ اسے زیاد ہی کیوں غلط لگ رہا تھا؟

"تمہیں غصہ کس بات پر جندل؟"

"تم پر ہے۔ چپ چاپ اس کی بکواس سنتے رہے آگے بڑھ کر اس کا منہ کیوں نہیں توڑا؟ کہتے ناں اسے کہ اگر تم اس کی بہن کے مجرم ہو تو فرشتہ بن کر تو وہ بھی نہیں آیا۔ ابھی اگر ازا کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کچھ

بھی نہیں ہو گی جس کا اظہار وہ تم سے کر کے گیا ہے۔ عجیب جنگلی گدھے ہو تم دونوں۔ ایک کی آنکھوں پر غصے کی پٹی بندھی ہے تو دوسرے کا بس چلے جرائم پیشہ افراد کے جرائم بھی اپنے کھاتے میں لکھوا لے۔ تم جیسے گدھے سے کم از کم مجھے یہ امید نہیں تھی۔" وہ غصے بھری نگاہ اس پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خیام نے گہری سانس لی تھی۔

"اب کہاں چلے؟" بے بسی سے پوچھا گیا۔

"اس خبیث کو یہ بتانے کہ اگر انسان نہیں بنا تو یہیں سے واپس بھجوا دوں گا اسے۔" وہ آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ خیام نے جلدی سے اٹھ کر اس کا راستہ روکا تھا۔

"تم اس کے پاس نہیں جاؤ گے"!

"تم روکو گے؟" وہ دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ خیام نے نظریں ترچھی کر کے جندل کے بائیں طرف کمرے کے کھلے دروازے کو دیکھا پھر ذرا سا ترچھا ہوا۔ اگلے ہی لمحے جندل کو کچھ سمجھنے کا موقع دیے بنا زوردار لات اس کے سینے پر ماری تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا تھا۔ خیام نے جلدی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ لاک ہو گیا۔

"خیام دروازہ کھولو میں جان لے لوں گا تمہاری!!" وہ چلایا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر پلٹ گیا۔ ایک نگاہ فرش پر گرے خون پر ڈالی پھر شرٹ کے کف مروڑنے لگا۔ اسے پہلے لاونج کو اس کی اصل شکل میں واپس لانا تھا۔ جندل زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا، اسے دھمکیاں بھی دے رہا تھا مگر وہ ان سنی کرتا اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

مارک نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں تو ان دونوں کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے درد سے ٹوٹتے جسم کو بندھا ہوا پایا تھا۔ وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں پر ہتھکڑی لگی تھی۔ وہ دونوں بیڈ کے بائیں طرف کھڑے تھے۔

دونوں اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ سفید رومال والا لڑکا اور سفید ماسک والی لڑکی! خود کو انجان جگہ پر انجان لوگوں کے درمیان پاکر اس کی آنکھوں کے آگے وہ منظر گھوم گیا جب اسے ایمبولینس میں ڈالا گیا تھا۔ بار بار گروپ کی طرف سے اسے دوسرے اسپتال منتقل کرنے پر زور دینا بس ایک سازش تھی، سازش کامیاب ہو چکی تھی۔ ایمبولینس بدل دی گئی اور بار بار اگروپ کے ڈاکٹرز کو دوسری ایمبولینس میں بھیج کر اسے اڑا دیا گیا جبکہ مارک کو یہاں لایا گیا تھا۔ وہ دونوں جو بھی تھے، خاصے شاطر تھے۔

"تمہارے پاس صرف چند منٹ ہیں۔ بولو گے یا خاموش رہنا پسند کرو گے؟" لڑکے کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں مرتے وقت غداری نہیں کروں گا۔" دوٹوک انداز میں جواب دیا گیا۔

"بہت بہتر۔" لڑکی نے سر کو جنبش دی پھر ہاتھ میں انجیکشن لے کر قریب آئی۔ جھٹکے سے انجیکشن اس کی گردن پر مارا تھا۔ بے رحمی سے وہ مائع اس کی رگوں میں اتارا گیا تھا۔ اسے اپنا پورا جسم درد سے ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔

"یہ تمہارے چند لمحات کو موت سے بدتر بنا دے گا! اب سوچ لو، تریاق کے لیے بولو گے یا وفاداری دکھاتے ہوئے اپنی بات پر قائم رہو گے؟" اس نے انجیکشن فرش پر پھینکا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" اس نے درد ضبط کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اسکائے ٹو کی ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟" لڑکے نے سوال کیا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"دلال کون ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

”ابراہم وارلڈ اصل مجرم ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے لب بھینچتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ان دونوں کے ماتھوں پر بل نمودار ہوئے تھے۔

”تمہارے اوپر سیٹ پر کون بیٹھا ہے؟“

”دلال! لیکن وہ کون ہے میں نہیں جانتا۔ ابراہم وارلڈ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ درد تھا کہ بڑھتا جارہا تھا۔ رگیں کھینچتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ سانس پھول رہا تھا، دھڑکنیں منتشر ہورہی تھیں۔

”ڈی ڈبلیو کے اسلحے کے لیے رقم ابراہم نے نہیں دی؟“

”وہ نہیں جانتا یہ رقم اسلحے کے لیے ہے۔ ابراہم وارلڈ ایک عام انسان ہے، بس عام انسان!“ اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ اس کی ناک سے خون نکلنے لگا تھا۔ منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔

”لیکن تم خود دلال کی تنظیم میں سے ہو؟“ ازا الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

”تنظیم کا کوئی شخص نہیں جانتا کہ دلال کون ہے؟!“ اس نے آنکھیں میچتے ہوئے جواب دیا۔ پیٹ میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی گویا رگیں پھٹنے لگی ہوں۔ ان دونوں نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا جسے اگلے ہی لمحے خون کی قے آئی تھی۔ اس کا جگر پھٹ چکا تھا۔ خون ابل ابل کر منہ سے بہہ رہا تھا۔ اس کا وجود سرخ خون میں بھیگنے لگا۔ سانسیں جاتی رہیں، دھڑکنیں تھمنے لگیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئیں۔ منہ سے بہتا خون فرش پر گرنے لگا۔ سانس رک گئی، دل بند ہوگیا۔ ازا نے سر جھکا کر اپنے سفید جاگرز پر گرتی خون کی بوندوں کو دیکھا پھر پاؤں پیچھے ہٹا لیے۔

”مائک کا بھی یہی کہنا ہے۔“ اس لڑکے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔ نگاہیں مارک کے مردہ وجود پر تھیں جو اپنے ہی خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر اسے انجکشن دے کر ہوش میں نہ لایا جاتا تو شاید وہ کچھ دن مزید زندہ رہ لیتا۔

"مارک کو جس طرح ابراہم سپورٹ کرتا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانچویں سیٹ پر وہی ہے۔ اور پھر اس نے خود بھی تو اقرار کیا ہے۔" ازا کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"عین ممکن ہے مائک ٹھیک ہو۔ کوئی ابراہم کو استعمال کر رہا ہو۔ یعنی ایک اور ڈھال"!

☆☆☆

اس نے خود کو تاریک سڑک پر پایا تھا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گرد و پیش سے بے نیاز وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں اس کے سفید جاگرز پر سرخ خون کی بوندیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ شرٹ پر خون کے دھبے لگے تھے۔ زخموں سے بہتا خون خود ہی رک گیا تھا، انہیں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اس کی نگاہوں سے سامنے بار بار ازا کا چہرہ آ رہا تھا۔

ازا کا، اپنی ماں کا اور باپ کا۔ آگ کی نذر ہوتا اس کا گھر اور وہ دلدوز چیخیں، وہ کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ وہ اس رات یتیم ہو گیا تھا، اس نے اپنے تمام رشتوں کو کھو دیا تھا۔ آج اسی رات کے سبب ایک دوست کو کھو کر آ رہا تھا۔

دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں، آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے چلتا رہا تھا۔ اسی اثناء میں اچانک سے اسے احساس ہوا تھا کہ پانی کی کوئی ننھی بوند اس کے چہرے پر گری ہو۔ اس نے رک کر ماتھے پر بل ڈالے سر اٹھایا۔ سر اونچا کر کے آسمان کو دیکھا تو پانی کی کئی مزید بوندیں اس کے چہرے پر گریں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش کی بوندوں میں تیزی آتی گئی اور چند پل میں وہ سڑک کے کنارے پر کھڑا مکمل بھیگ چکا تھا۔

بہت سے لوگ تھے جو چھتریاں لے کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے مگر وہ ویسے ہی بارش کی تیز بوچھاڑ سے بے نیاز دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا رہا تھا۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ گالوں پر گرم پانی کا احساس ہوا تھا۔ وہ رو رہا تھا، ہاں بارش نے اسے رلا دیا تھا۔ اسے مراکش کی بارش یاد آئی تھی، اسے وہ رات یاد آئی

تھی جب سمندر میں طوفانی بارش ہوئی تھی اور اس نے ازا کے ساتھ مل کر لائٹ ہاؤس کو روشن کیا تھا۔ دو بحری جہازوں کو اس کی بدولت اپنی منزل پر پہنچنے میں آسانی ہوئی تھی۔ اسے وہ بارش یاد آئی تھی جس میں وہ ازا کے ساتھ بھیگا تھا، ساحل کنارے اس کے ساتھ ریت سے چھوٹے گھر بنائے تھے۔

بارش کی بوندوں کے ساتھ نمکین پانی کے قطرے گرم سیال کی طرح گالوں پر بہنے لگے۔ اس نے انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ بارش یہ کام بخوبی کر رہی تھی۔ یونہی سڑکوں پر چلتے ہوئے وہ کسی تاریک سڑک کی طرف جا کر گم ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، اگر دیکھتا تو پتھر کا ہو جاتا کیونکہ جس جگہ اس نے کھڑے ہو کر سر اونچا کر کے آسمان کو دیکھا تھا، جہاں اس کے چہرے پر پانی کی بوندیں گری تھیں، وہاں اب اس کا باپ، معاویہ بن اعظم کھڑا تھا۔

☆☆☆

سعاد نے آرام سے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس نے ٹھہر کر کپ کو دیکھا پھر کپ تھام لیا۔ وہ لاؤنج کے دروازے سے ٹیک لگائے تاریک آسمان پر نگاہیں ٹکائے کھڑا تھا۔ وہ بھی اس سے فاصلے پر بائیں طرف دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ نگاہیں تاریک آسمان پر ٹکا دیں۔ بارش کے بعد دھلا دھلا آسمان۔ بارش تقریباً دو گھنٹے مسلسل اور پورے زور سے ہوتی رہی تھی، تبھی موسم اچانک سے سرد ہو گیا تھا۔ ہوا کے ہلکے جھونکوں میں نمی کا عنصر شامل تھا۔

”تم بہن بھائی مجھے سمجھ نہیں آ رہے۔ اس نے زیاد کو مارنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی، تم شوہر کو چھوڑ کر یہاں بیٹھی ہو۔ کیوں کر رہے ہو ایسے؟“ وہ کافی کے کپ پر انگشت شہادت پھیرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے نظریں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

"مجرم تم نہیں ہو خیام! وہ غصے میں ہے، کچھ بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسے تنہا رہنے دو، سنبھل جائے گا۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا تھا۔

"کیا وجہ بس یہی ہے؟ بس یہی؟" وہ اپنے سوال پر زور دے رہا تھا۔ وہ سر نفی میں ہلا گئی۔

"جندل کو اپنا دوست عزیز ہے اور مجھے بس میرا استاد۔ تمہارا پتہ ہے مسئلہ کیا ہے، تم گلٹ سے نہیں نکل پا رہے۔ وہ ویڈیوز میں نے بھی دیکھی ہیں، تم نہ ہوتے تو وہاں کوئی اور ہوتا۔ مجرم تم نہیں ہو اور جب تک تم اس بات پر یقین نہیں کرو گے سب تمہیں مجرم سمجھیں گے۔ جاؤ، زیاد کا گریبان پکڑو، اسی طرح چلاؤ، غصے کا اظہار کرو اور کہو میں مجرم نہیں ہوں۔ تم خاموش کیوں ہو جاتے ہو؟ اپنی صفائی مت دو، اپنی معصومیت کا "یقین" دلاؤ۔ میں نے دیکھا تھا تم رو رہے تھے، "خیام حنفی" رو رہا تھا۔ تمہارے پاس بھی وہی دل ہے، نرم سا گوشہ جو محبت چاہتا ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے تم اپنے دوستوں کے معاملے میں اپنے ساتھ زیادتی کر جاتے ہو۔ تم خود کو نگلیکٹ کر دیتے ہو۔" وہ بات مکمل کر کے ہلکا سا مسکرائی تھی۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی، وہ سر ذرا سا اونچا کر کے آسمان کو تک رہی تھی۔

"تمہارا بھائی بھی وہیں تھا اس رات۔" بھاری آواز میں کہا گیا تھا۔

"وہ زندہ سلامت ہے۔ میرے سامنے ہے، مجھے اور کیا چاہیے؟" چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"اور اگر زیاد کی جگہ تم ہوتیں؟ اگر وہ گھر تمہارا ہوتا، مرنے والے تمہارے والدین اور لاپتہ ہونے والی تمہاری بہن ہوتی؟" وہ آنکھوں میں دلچسپی لیے اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس کا امتحان لے رہا تھا۔

"میں، تمہاری جان لے لیتی خیام!" اس نے بنا کسی تگو دو کے کہا تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر ہلکا سا

ہنس دیا۔

"بس یہی فرق ہے۔ یہ سب تمہارے ساتھ نہیں زیاد کے ساتھ ہوا ہے۔" وہ گہری سانس لیتا کافی کے کپ کی طرف متوجہ ہوا۔ گرم کافی کو حلق میں اتارتے ہی اس کی کڑواہٹ کا اندازہ ہوا تو اس نے ماتھے پر بل ڈالے سعاد کو دیکھا تھا جو معصومیت سے کندھے اچکا گئی۔

"اس پر غصہ نہیں آرہا؟" اس کے سوال پر وہ نفی میں سر ہلا گیا تھا۔

"اس رات میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ زیاد کی بہن ازا آئی تھی میرے پاس۔ پتا ہے سعاد، اس وقت ان حالات میں بھی میں ایک لمحے کے لیے سب بھول گیا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی، بہت معصوم۔ اس کی آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں۔ اس کا چہکنا، اس کا بولنا، ہنسنا۔۔ میں ان چند لمحات کا اسیر ہو گیا تھا۔" اس نے وقفہ لیا تھا۔ سعاد بغور اس چمک کو دیکھ رہی تھی جو زیاد کی بہن کے متعلق بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آئی تھی۔ "میں نے زیاد کو بھی دیکھا تھا جندل کو بھی۔ سب خوش تھے سوائے میرے۔ نہیں جانتا کیوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ایک لمحے کا غصہ میری ذات پر وہ بدنما داغ چھوڑ گیا جسے میں چاہ کر بھی نہیں دھو پارہا۔ زیاد ٹھیک کہہ رہا تھا، موت تقدیر میں ہوتی ہے لیکن موت کا ذریعہ بننے والا قاتل کہلاتا ہے۔ میں بھی قاتل کہلایا گیا۔ صرف اس کا ہی نہیں کئی اور گھر بھی آگ کی نذر ہو گئے۔ کئی آشیانے بکھر گئے۔ اس کی بہن اسے دوبارہ کبھی نہیں ملی۔ باپ روپوش ہو گیا جسے وہ آج تک مردہ سمجھتا آرہا ہے۔ ماں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ یہ سب اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ تنہا ہو گیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ اس نے کافی کا کپ لبوں سے لگایا تھا۔ سعاد نے سر جھٹک کر اسے دیکھا۔

"تم بھی تو تنہا تھے۔" اس کی بات پر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔ زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا جو جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں تنہا نہیں تھا سعاد، مجھے دو ایسے لوگ مل گئے تھے جنہوں نے ایک حد تک مجھے میرا ماضی بھلا دیا تھا۔ جندل کے پاس تم تھیں، اس کے پاس بھی کوئی ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ جیتا تھا۔ زیاد کے پاس کوئی نہیں تھا۔ شاید تمہیں کبھی محسوس نہ ہوا ہو لیکن تم اس میں وہ ڈرا سہا بچہ ضرور دیکھو گی جس سے اس کا بچپن چھین لیا گیا تھا۔ میں نے، جندل نے اپنا بچپن جیا ہے سعاد! جندل نے تمہارے ساتھ اور میں نے ان دو لوگوں کے ساتھ جو مجھے اپنی زندگی کا حصہ لگنے لگے تھے۔ جب تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی، جب ٹریننگ کے لیے ہم پہاڑوں پر گئے تھے تب بھی وہ ویسا ہی تھا۔ ڈرا سہا سا زیاد! وہ دوست نہیں بناتا تھا، خاموش رہتا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے۔ یقین مانو تم اس زیاد کو دیکھ لو تو شاید اس کا ادھورا کام مکمل کر دو۔“ سعاد سانس روکے اسے سن رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں امڈتی نمی محسوس کر کے نظریں چرا گیا تھا۔

”تم مجھے ڈرا رہے ہو۔“ اس کی آواز میں خوف تھا۔ خیام نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں اب میں سمجھ رہی ہوں اس کے بابا نے یہ کیوں کہا تھا کہ میرے بیٹے کو محبت سے زیادہ وفا کی ضرورت ہے۔ خیام اگر اسے۔۔۔ معلوم ہو گیا کہ اس کا باپ زندہ ہے اور یہ بھی کہ ہم اس سے باخبر تھے۔“ اس کی بات سمجھ کر خیام نے سر کو ذرا سی جنبش دی تھی۔

”پریشان مت ہو، تم سے خفا نہیں ہو گا۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

”بات خفا ہونے کی نہیں ہے۔ بات اعتماد کی ہے، وہ ٹوٹ جائے گا۔“ اس نے نچلا لب دانتوں میں دبایا تھا۔

”اسے سنبھال لینا۔“ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یعنی عین ممکن تھا آج اگر خیام کٹہرے میں کھڑا تھا تو کل وہ کھڑی ہو گی۔ اس کے غصے کا سوچ کر ہی اس نے جھرجھری لی تھی۔ خیام نے بے ساختہ امڈتی مسکراہٹ کو چہرہ موڑ کر چھپایا تھا۔ منہ بسور کر اسے دیکھتی سعاد کو کچھ یاد آیا تھا۔

"ازا؟ اس کی بہن کا نام ازا تھا؟" اس کے پوچھنے پر وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔ چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا پھر کافی کا کپ خالی کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ وہ چپ چاپ کپ تھام گئی۔

"ازا بیلا، وہ اس کی بہن ہے۔ ازا تاشفین!" اس نے گویا دھماکہ کیا تھا۔ وہ تعجب سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھنے لگی۔ یادوں کے ریچوں میں کئی مناظر لہرائے تھے۔ ہر وہ منظر جس میں ازا اسے بہت بری لگی تھی۔ ازا کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے پلک جھپکی تھی۔

"سچ کہہ رہے ہو؟ تمہیں کب معلوم ہوا؟"

"کچھ ہی دن پہلے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"تبھی وہ مجھے بری لگتی ہے۔ ہم میں ہمیشہ سے نند بھابھی والا رشتہ قائم تھا۔" اس نے بہت سوچ کر کہا تھا۔ وہ مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھنے لگا پھر بے اختیار ذرا سا سر جھکا کر ہنس دیا۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسکرا دی۔ "واللہ خیام! میں اسے بہت ٹف ٹائم دوں گی۔"

"اور تمہارا شوہر تمہیں یہ کرنے دے گا؟"

"تمہیں لگتا ہے وہ مجھے روک سکتا ہے؟!" آنکھیں چھوٹی کر کے سوال کیا گیا۔ وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گیا۔ سعاد کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ اس نے فخریہ کالر جھاڑے تھے۔ خیام مسکراتے ہوئے چہرہ موڑ گیا تھا۔ سعاد نے بغور اسے دیکھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے ہوتیں اس کے ہاتھوں تک گئی تھیں جہاں آج اسٹک نہیں تھی۔

"اس دن تم بنا اسٹک کے بھاگے تھے۔ کیا یہ سب ہمیشہ سے بس ڈرامہ تھا؟" وہ بھنویں ملائے دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"اس کی ضرورت مجھے صرف دو سے تین دن تک پڑی تھی۔ ہمیں اتنا سخت ٹرین کیا جاتا ہے کہ ہڈیاں اس قدر

مضبوط ہوتی ہیں کہ ذراسی اونچائی سے گرنے پر فریکچر نہیں آجاتے سعاد! البتہ ایک عام خیام کے لیے یہ لازمی تھا۔" وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے سمجھ کر سر کو ذراسی جنبش دی۔

"ویسے میں تم سے کچھ کہنے آئی تھی۔ اگلا ہفتہ بہت مصروف ہوگا الیکشن کی وجہ سے۔ لیکن اس کے بعد میں ایک سے دو دنوں کی چھٹیوں پر جانا چاہتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ خیام نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"کام مکمل کر کے چلی جانا۔"

"پوچھو گے نہیں کہاں؟"

"زیاد کے پاس۔" وہ مسکراتے ہوئے کندھے اچکا گیا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ "تمہیں جانا چاہیے۔ اسے تمہاری ضرورت ہوگی۔ تم اس کے کہنے کے باوجود اس کے ساتھ نہیں گئیں مجھے یہ جان کر بھی اچھا نہیں لگا تھا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ ہی تو کہتے ہیں استاد جی، کام کے معاملات میں رشتے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ جاتی تو کام کیسے دیکھتی؟" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔

"میری ہونہار شاگردہ!" اس نے تعریف کی تھی۔ جواباً سعاد نے سر کو خم دیا تھا۔ کچھ پل مزید رکنے کے بعد وہ جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ کپ کچن میں رکھ کر آنے کے بعد وہ واپس آئی تو وہ وہیں کھڑا تھا۔ کچھ سوچ کر پلٹا تھا۔

"ایک بات بتاؤ، کیا میں صرف استاد ہونے کے ناطے تمہارے لیے اتنا اہم ہوں؟"

"ایک اچھا استاد ہونے کے ناطے!" سر کو خم دیا گیا۔ مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی پھر زینوں کی طرف بڑھی۔ وہ آنکھیں چھوٹی کیے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کی شاگردہ اس کا بہت سارا بوجھ کم کر گئی تھی۔

☆☆☆

مائک بے زاری سے فائل کے کاغذات پلٹ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے کام چور تھا، اسے کمپنی اور اس کے معاملات میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اب حزب اللہ اس سے یہ سارے کام کروا رہی تھی۔ اسے سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا، ہر وہ کام جس سے وہ اب تک بھاگتا آیا تھا۔ الیکشن سے پہلے پہلے اسے کمپنی میں اسکائے ٹو کو کمزور کرنا تھا، ان کے تمام ملازمین کی جان پڑتال کرنی تھی اور آج سارا دن اس نے یہی کیا تھا۔ تھکن سے چور ہوتا وجود اسے اب مزید کام کرنے سے روک رہا تھا۔ آنکھیں نیند سے بھاری ہو رہی تھیں۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔

کمپنی کے تقریباً ملازمین جا چکے تھے بس گنے چنے لوگ باقی تھے۔ جن میں ضرار ولید جس نے اب مینیجر کی کرسی سنبھال لی تھی اور وہ سفید رومال والا لڑکا جو ہر کام کی نگرانی کر رہا تھا، پیش پیش تھے۔ اس نے فائل بند کی اور پھر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بھرپور جمائی لی۔ ابھی چند پل ہی ہوئے تھے کہ دھاڑ کی آواز میں دروازہ کھلا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ تین اسلحے سے لیس افراد چہروں پر ماسک چڑھائے ڈی ڈبلیو کا بیج سینے پر لگائے اسے اپنی پستولوں کے نشانے پر لیے آگے بڑھے۔ وہ گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کون ہو تم؟ تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟“ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تھا۔ ایک آدمی نے مڑ کر دروازہ بند کیا تھا۔

”کوئی سوال نہیں، تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“ کڑکتی ہوئی آواز میں حکم جاری کیا گیا۔ اس نے متذبذب نگاہوں سے ان تینوں کو دیکھا۔ اس کے کان میں لگے چھوٹے سے آلے سے سبز رنگ کی شعاعیں نکلی تھیں۔ سگنل ملے تھے۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے معصومیت سے کہا تھا۔ ان تینوں کے ماتھے پر بل پڑے۔ اگلے ہی لمحے میں دروازے پر

کسی نے زوردار لات ماری تھی۔ دروازہ زوردار آواز سے کھل کر دیوار سے لگا تھا۔ وہ دونوں اندر آئے تھے۔ اندر آتے ہی ضرار نے ایک آدمی پر جھپٹتے ہوئے اس کی پستول چھینی اور پستول کا پچھلا حصہ اس کے سر پر دے مارا۔ دوسرا آدمی اس کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اس سے پہلے ہی وہ ٹریگر دبا چکا تھا۔ پستول سے نکلی گولی اس کے سر کے آر پار ہوئی تھی۔ وہ دھڑام سے زمین بوس ہوا تھا۔ تیسرا آدمی سفید رومال والے لڑکے کو اپنے نشانے پر لے کر کھڑا تھا۔ ضرار رک گیا۔ مائک غیر محسوس طریقے سے اس کے پیچھے ہوا تھا۔

"آگے مت آنا، گولی چلادوں گا۔" اس لڑکے کے اپنی طرف اٹھتے قدم دیکھ کر اس نے دھمکی تھی۔ اس کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکا بنا کسی خوف کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آگے آیا تھا۔

"لیکن وہ سچ میں گولی چلا دے گا۔" ضرار نے گڑبڑا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کی پستول خالی ہے۔" اس لڑکے کے بے فکری سے کہنے پر وہ آدمی چونکا۔ چونک کر اپنی پستول کو دیکھنا چاہا۔ وہ لڑکا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آگے آیا اور اگلے ہی لمحے زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ مکا خاصا زبردست تھا۔ سرخ گاڑھا خون اس کے منہ سے نکل کر کھڑکی کے شیشے پر لگا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس نے زوردار لات اس کے سینے پر رسید کیا تھی۔ کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ وہ آدمی تیسری منزل سے نیچے آیا تھا۔ نیچے کھڑی گاڑی پر اس کا بھاری بھرکم وجود گرا۔ گاڑی کی بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔ سائرن کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔ آگے کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ خون ابل ابل کر اس کے منہ سے بہتا سڑک پر بہنے لگا۔ سر خون میں لت پت ہو گیا۔ لوگ جمع ہونے لگے۔ کسی نے پرخوف نظروں سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کھڑکی کے پاس کھڑا لڑکا فوراً پیچھے ہٹا تھا۔

"لیکن تم نے کہا تھا تمہیں لڑنا نہیں آتا۔" ضرار نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ مائک کی آنکھیں خوف

سے پھیلی تھیں۔

"میں نہیں جانتا تھا، میرا کام اتنا زوردار ہے کیونکہ میں نے کبھی کسی کو مارا ہی نہیں تھا۔" ٹھہر ٹھہر کر کہتے ہوئے اس نے دودھیا ہتھیلی آنکھوں کے سامنے کی تھی جس پر خون کے چھینٹے لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک اور جان لے چکا تھا۔ بہت آسانی سے، بنا کسی تردد کے۔ ایک اور انسانی جان!

☆☆☆

"یہ ظلم ہے، زیادتی ہے، گناہ ہے۔ خدا کی قسم میں اس مائک کا منہ توڑ دوں گا، اسے سمندر میں پھینک دوں گا۔ میرے لیے مرنے کا مقام ہے کہ کل جس کی ہڈیاں توڑ کر آیا تھا آج اسی کی ہڈیوں کی حفاظت کے لیے اس کے آگے پیچھے پھروں۔ میں بتا رہا ہوں مجھ سے ایسی کسی چیز کی امید مت رکھنا تم لوگ! مانا بے روزگار ہوں مگر اتنے برے حالات نہیں آئے میرے۔" وہ تڑخ کر کہتا کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ کھولنے لگا تھا، کہاں وہ مائک اور کہاں جندل یوسف زئی!

"تم سے پوچھا نہیں جا رہا، تمہیں آگاہ کر رہا ہوں کہ کل سے تم مائک کے باڈی گارڈ کی خدمات انجام دو گے۔" ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھے خیام نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"ضرار ہے، زیاد ہے اور وہ نالائق ناہنجار، دوسروں کے شکار پر نظر رکھنے والی مخلوق بھی۔ میں ہی کیوں اس نامرد کا باڈی گارڈ بنوں؟!" وہ مٹھیاں بھینچے لال بھبھوکا چہرہ لیے بمشکل اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا۔

"ضرار دوسرے معاملات دیکھ رہا ہے، زیاد سے کہہ کر میں اپنا منہ نہیں تڑوانا چاہتا اور رہی بات اس دوسری مخلوق کی تو اسی نے یہ احکامات جاری کیے ہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں اطلاع دی تھی۔ جندل نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"اگر اتنی ہی اس کی فکر ہے تو بدر سے۔۔۔"

"خبر دار! مصعب کا نام بھی مت لیناوہ صرف میرا باڈی گارڈ ہے!!" اس نے تیزی سے جندل کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ لہجے میں ایکدم سختی در آئی تھی جسے جندل نے محسوس نہیں کیا تھا لیکن اندر داخل ہوتا بدر ٹھٹھک کر رکا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟ تم اسے الیکشن تک کے لیے مائک کے پاس بھیج دو۔ الیکشن کے بعد بلا لینا۔" اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے تھے۔ خیام نے سخت نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اپنا موبائل اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"مصعب کہیں نہیں جائے گا! اسے وہاں بھیجنا اس کی جان خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ وہ میرے ساتھ کم از کم محفوظ ہوتا ہے مجھے اور کسی کی پرواہ نہیں۔ تم انسان کے بچے بنو اور کل پہلی فرصت میں مائک کے پاس پہنچو۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے حاکمانہ انداز میں کہا گیا۔ جندل نے تعجب سے اسے دیکھا جو ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ چکا تھا۔

"تمہیں پرواہ ہے تو بس اس خبیث زیاد کی اور اس چھٹانک بھر کے بدر کی! میں جاؤں بھاڑ میں۔" وہ پیچھے سے چلایا تھا۔ کمرے کی طرف جاتے خیام نے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے چھوٹی انگلی سے کان کھجایا تھا۔ جندل نے اس کے جاتے ہی تلملا کر صوفے کو ٹھوکر ماری تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ درد سے بلبلاتا لنگڑا کر صوفے پر گرا تھا۔ دروازے پر کھڑے بدر کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"خیام سر کو میں اچھا لگنے لگا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے دھیمی آوز میں کہا تھا۔ جندل نے چونک کر اسے دیکھا پھر پاس پڑا کشن کھینچ کر اسے مارا تھا۔ وہ تیزی سے نیچے ہوا تھا۔ کشن پیچھے فرش پر گرا۔ جندل نے دانت کچکچائے۔ بدر معصومیت سے کندھے اچکاتا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

"کمپنی کا سابقہ مینیجر جو مارک کا دایاں ہاتھ تھا۔ وہ دو بار جیل میں جا چکا ہے۔ اسکائے ٹو کسی ایسے شخص کو بار بارا گروپ کا چیئر مین نہیں بنائے گا جو خود کو ہی بچا نہ سکے۔" اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں ٹکائے پر سوچ انداز میں کہا تھا۔ چہرے پر آتے بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا تو کان میں لگا سیاہ رنگ کا آلہ نظر آیا جس سے وہ دوسری طرف رابطے میں تھی۔ "ٹھیک ہے آگے بڑھو۔" اس نے حکم جاری کیا۔

وہ چار لوگ تھے۔ چاروں ایک ساتھ ریستوران میں داخل ہوئے تھے۔ اپنے ظاہری حلیے سے چاروں ہی اونچے خاندانوں سے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے دائیں طرف دوسری میز کو اپنے لیے پسند کیا تھا۔ وہ آرڈر دے رہے تھے جبکہ ان سے فاصلے پر دوسری میز پر سیاہ ماسک والا لڑکا ان پر نظریں ٹکائے کچھ کہہ رہا تھا جو کان میں لگے آلے کے سبب باآسانی ازابیلا سن رہی تھی۔

"ڈی ڈبلیو کے نگران، جن میں سے ایک پر ہراسمنٹ کا کیس ہے اور دوسرا ڈرگز کے کیس میں عدالت میں گھسیٹا گیا ہے۔ نشئی اور عیاش انسان! بالکل بھی نہیں۔ ان دونوں کو کبھی الیکشن میں آنے نہیں دیا جائے گا البتہ باقی دو کے چانسز ہیں۔" اس نے خود کلامی کرتے ہوئے پاس رکھے کاغذ پر ان دونوں کے نام لکھے پھر واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ دائیں بائیں دو لوگوں کے ہمراہ اپنی گاڑی کی طرف آیا تھا۔ اس کے آتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اس نے مڑ کر دونوں کو کوئی پیغام دیا پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس سے فاصلے پر سفید رنگ کی گاڑی میں بیٹھا وہ لڑکا اس کی گاڑی کے آگے بڑھتے ہی اس کا تعاقب شروع کر چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا جو ازابیلا بخوبی سن رہی تھی۔

”ایک اچھا سیاستدان جو عوام کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ یہ شخص اگر چیئرمین بن گیا تو یہ بینکاک کے میئر کے لیے ہونے والے الیکشنز میں بھی آئے گا۔ یہی آدمی ہے مائک کی ٹکر کا! اسی کو راستے سے ہٹانا ہے۔“ اس نے فیصلہ لیا تھا۔ ساتھ ہی پاس رکھا اپنا موبائل اٹھا کر کسی کو پیغام بھیجا تھا۔ صرف چند پل مزید اور دیکھتے ہی دیکھتے چار سے پانچ لوگ اس شخص کے تعاقب میں لگ چکے تھے۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔ اس کا کام کسی حد تک مکمل ہونے والا تھا۔

☆☆☆

جندل نے کوٹ پہنا پھر ٹائی لے کر سنگھار میز کی طرف آیا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے بدر نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر تھمب اپ کا اشارہ کیا۔ وہ برے برے منہ بنا تا ٹائی باندھنے لگا۔ وہ دونوں سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس کام پر جانے کے لیے مکمل تیار تھے۔ دو باڈی گارڈ جن میں سے ایک کچھ زیادہ ہی خوش تھا جبکہ دوسرے کا دل اس بچے کی طرح رو رہا تھا جسے زبردستی اسکول بھیجا جا رہا ہو۔

ان دونوں نے ایک ساتھ بار بارا کمپنی میں قدم رکھا تھا۔ جندل، جو مائک سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ اور بدر، جو خیام کے ہمراہ قدم اٹھا رہا تھا، شانہ بشانہ برابر برابر۔ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سعاد خیام کو ڈیل کے متعلق ہدایات دے رہی تھی۔ مائک اسے اپنی پالیسی سمجھا رہا تھا۔ ضرار نے کاغذات تیار کیے تھے اور ان سب کی سوچ کے مطابق سی ای او کی آفس میں شاہانہ انداز میں کرسی پر بیٹھا سفید رومال والا لڑکا ٹیبلٹ پر میٹنگ کا ایک ایک منظر دیکھ رہا تھا۔ کاغذات تیار ہوئے، بدر نے قلم خیام کے آگے رکھا۔ جندل نے دانت پیستے ہوئے قلم مائک کے آگے رکھا۔ دونوں نے دستخط کیے۔ کام مکمل ہوا۔ خیام نے اسے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ کھیل بس شروع ہو چکا تھا۔

اگلے ایک ہفتے وہ سب بہت مصروف رہے تھے۔ خیام معمول کے مطابق آفس جا رہا تھا، سعاد معمول کے مطابق اپنا کام کر رہی تھی۔ جندل مائک کے ساتھ تھا۔ بار بار اگروپ میں الیکشن قریب تھے تبھی وہ چاروں بہت مصروف تھے۔ ضرار بھی اس سب میں پیش پیش تھا۔ بدر کو بھی ایک پل کی فرصت نہیں تھی۔ وہ کسی بھی طرح الیکشنس میں مائک کو جتوانا چاہتے تھے اور اس کے لیے سب نے دن رات ایک کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف اسکائے ٹو کی طرف سے بھی پورا زور تھا کہ کسی طرح مائک کے مخالف کھڑے شخص کو جتوایا جائے جس کی وجہ سے مقابلہ مزید سخت ہو گیا تھا۔ دن رات کا کام تھا، چند لمحات کی بھی فرصت نہیں تھی۔ بہت مصروفیات کے باوجود انہیں اپنے درمیان ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔

خیام گھر آتا تھا تو اپنے لیے کافی بناتا زیاد ایک کپ اس کے آگے رکھ کر جانے کے لیے موجود نہیں ہوتا تھا۔ جندل کئی بار لائبریری گیا تھا مگر وہ کئی دنوں سے لائبریری نہیں آیا تھا۔ ازابیلا نے کئی بار اس سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر ہر کوشش ناکام گئی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ منظر سے ہٹ سا گیا تھا۔ اور سعاد، وہ اب کام کرتے کرتے تھک کر سو نہیں جاتی تھی کیونکہ اب اسے جگانے والا کوئی نہیں تھا۔ بدر اسے کافی بنا دیتا تھا مگر یہ کافی اس کے لیے حلق سے اتارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی اسے اپنا اتنا عادی کر چکا تھا کہ اس کے میسر نہ ہونے پر اس کی عادت اسے بیمار کرنے لگی تھی۔ موسم اچانک سرد ہوا تھا، مسلسل بارشیں ہو رہی تھیں۔ اسے بخار ہو گیا تھا۔ وہ رات کھانستی رہی تھی، نزلے نے الگ حالت خراب کر دی تھی مگر وہ تھا ہی نہیں کہ اس کا خیال رکھتا۔ عجیب ادھورا پن سا ہو گیا تھا اس کی زندگی میں۔

دوسری طرف اپنے اپارٹمنٹ میں کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے چاند کو تکتے زیاد نے بے اختیار آنکھیں میچی تھیں۔ ہفتہ بھر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو جانا بہت آسان تھا مگر خود کو ان کے متعلق سوچنے سے روکنا بہت مشکل

تھا۔ خیام سے نفرت کا اظہار کر کے بھی اس سے نفرت نہ کر پانا، جندل کو خفگی دکھا کر بھی اس سے خفا نہ ہو پانا اور سعاد کو تنہا کر کے بھی اس سے الگ نہ ہو پانا۔۔ ایک طرف وہ تینوں تھے اور دوسری طرف اس کی بہن۔۔ ازا تاشفین! وہ جب اسکے متعلق سوچتا تھا تو وہ تینوں بھول جاتے تھے۔ وہ گمراہی کے گڑھوں میں گری ہوئی تھی، تاریکی میں روشنی کی طلبگار تھی، جھوٹ کی مضبوط دیواروں کے درمیان محصور تھی۔ وہ اسے کیسے فراموش کرتا؟ کیسے اسے جا کر بتاتا کہ وہ اسکا بھائی تھا۔ اس کا سگا بھائی!!

وہ بھائی جو اسکے لیے تڑپا تو بہت تھا مگر اس کے لیے کچھ کر نہیں پایا تھا۔ وہ بھائی جو اتنا کم ہمت تھا کہ اسے اس کی اصل شناخت سے آگاہ کرنے سے بھی ڈر رہا تھا۔ وہ بھائی جو، اس سے بہت محبت کرتا تھا اور جو اسے بالکل نہیں ڈانٹتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن الیکشن تھے۔ وہ سب بے صبری سے نتیجے کے منتظر تھے۔ سعاد، خیام، جندل اور ضرار چاروں لاؤنج میں نسب بڑی سی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہونی لگی تھی۔ مائک کے حق میں ووٹ کم تھے۔ وہ نہیں جیت سکتا تھا، انہیں اس کا جیتنا مشکل لگا تھا۔

ازابیلا نے ایک نگاہ لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر ڈالی پھر پیغام بھیج دیا۔ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا اور الیکشن کی صورتحال دیکھنے لگی جو اس کی توقع کے عین مطابق مائک کے حق میں نہیں تھی۔ اس کا بھیجا گیا پیغام فیکٹری کے اندھیر کمرے میں بیٹھے سفید رومال والے لڑکے کو ملا جو اب اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ آن کی آن میں صورتحال بدلی تھی۔ وہ شخص جو مائک کے مقابلے میں کھڑا تھا اسے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ اس کا سیکریٹری بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی کرسی سے دستبردار ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ دو شاطر دماغ کھیل الٹنے میں کامیاب ٹھہرے تھے۔

حالات خود بخود مائک کے حق میں ہو گئے۔ وہ الیکشن جیت گیا۔ اسے بار بار اگروپ کا چیئر مین بنا دیا گیا۔ وہ چاروں نتائج دیکھ کر کچھ الجھن کا شکار ہوئے تھے۔ چاروں کو بیک وقت اس لڑکے کی طرف سے پیغام موصول ہوا تھا۔

"اسکائے ٹو کا دھیان اپنی طرف کر کے ہمیں کوور کرنے کے لیے از حد شکریہ، دوستوں"!

"مجھے مت بتانا یہ لڑکا ہمیں استعمال کر رہا ہے۔" خیام نے بگڑ کر کہا تھا۔

"یہ کل کا بچہ ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے اور ہم اسے کھیلنے دے رہے ہیں؟ مطلب واقعی میں؟" جندل نے ناک سکیڑی تھی۔

"کیا فرق پڑتا ہے ہمیں بے وقوف بنا کر ہی سہی مائک الیکشن تو جیت گیا ناں۔" ضرار کی بات میں دم تھا۔ وہ دونوں بچوں کی طرح منہ بسورنے لگے۔

"میں سونے جا رہی ہوں۔ اتنے دن اپنی نیند حرام کی صرف اس جنگلی لڑکے کو کوور کرنے کے لیے؟ واللہ! میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" وہ گود میں رکھا کشن پٹختی آگے بڑھ گئی تھی۔ ضرار نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا پھر ان دونوں کو جو منہ بسورے بیٹھے تھے۔ جندل کا سر خیام کے کندھے پر تھا جبکہ خیام کا سر صوفے کے بازو پر۔ اسے بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

"مگر اس نے ہمیں "دوستوں" کہا ہے، پھر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

"ہماری انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ کیا ہم سینیئر نہیں ہیں؟ کیا الزرقاوی سر نے خود ہمیں یہاں سب سنبھالنے کے لیے نہیں بھیجا؟" جندل نے بگڑ کر پوچھا تھا۔

"ہو سکتا ہے الزرقاوی سر نے اسے کوور کرنے کے لیے ہی ہمیں بھیجا ہو۔" ضرار نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگے۔

”تم ہمارے دوست ہو یا اس کے؟“ خیام نے تڑخ کر پوچھا تھا۔ ضرار گڑبڑایا۔

”اس خبیث زیاد سے اللہ پوچھے کہاں جا کر چھپ گیا ہے۔ دوستوں میں جب پھوٹ پڑ جائے تو یہ چھٹانک بھر کے لوگ یونہی ناکوں تلے چنے چبوا جاتے ہیں۔“

”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ خیام نے اطلاع دی تھی۔

”یہاں میری زندگی خراب ہو رہی ہے۔“ جندل بڑبڑایا تھا۔ ضرار نے گہری سانس لیتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگائی تھی۔ ان کے یہ ڈرامے دیکھتے ہوئے اس کی رات بہت اچھی گزرنے والی تھی ہاں شرط یہ تھی کہ وہ اس دوران اپنا منہ بند رکھے گا۔

☆☆☆

”کہیں جا رہی ہیں؟“ بدر کے سوال پر اس نے سر کو جنبش دی پھر اپنا بیگ گھسیٹتی لاونج میں لائی۔ وہ صوفے سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ ”کہاں؟“

”اپنے شوہر کے پاس۔ میری بس ہو گئی ہے بھئی، خیام سے کہنا سعاد آپی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ویسے ان سے اجازت لے لی تھی میں نے۔“ وہ زکام زدہ سی ناک سکیڑ کر اپنا بیگ گھسیٹتے ہوئے زینوں کی طرف بڑھی۔

بدر خیام کی گاڑی کی چابی اٹھاتا آگے آیا۔

”آئیں میں چھوڑ دوں۔“ وہ اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ ”بیگ اتنا بھاری ہے، کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہیں؟“ وہ اس کے آگے آگے زینے اتر رہا تھا۔

”آجاؤں گی ایک دو دنوں میں۔ اور اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بس بہت سارے ٹشو، میری دوائیاں، اور ہاں بھوک لگنے کی صورت میں تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان۔ ان کیس اگر وہ حضرت بھوک ہڑتال کر کے بیٹھے ہوں اور

فریج کے ساتھ ساتھ کچن بھی خالی ہو۔" وہ کندھے اچکا کر کہتی زینے اتر رہی تھی۔ بدر اس کے جواب پر مسکرا دیا تھا۔

اگلے لمحات میں وہ اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی تھی۔ پاسورڈ جاننا مشکل کام نہیں تھا سو پانچ منٹ کے اندر اندر وہ اپارٹمنٹ کے اندر تھی۔ بیگ ایک طرف رکھ کر اس نے لانگ کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا۔ جوتے اتارے، گاؤن ایک طرف پھینکا۔ بالوں کو جوڑے میں باندھا اور دوپٹے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈال لیا۔ عادت کے مطابق وہ پہلے کچن میں آئی تھی۔ ٹشو سے ناک رگڑ کر پہلے چائے کے لیے دودھ چولہے پر رکھا تھا۔ پھر فریج کا جائزہ لیا۔ توقع کے عین مطابق وہ بالکل خالی تھا۔ حضرت واقعی بھوک ہڑتال پر تھے۔ وہ کھانستے ہوئے واپس چولہے پر پکتے دودھ کی طرف متوجہ ہوئی۔ آنچ ہلکی کی پھر اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگی۔ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا مگر صاف ستھرا سا اپارٹمنٹ! حضرت صفائی پسند تھے، اسے افسوس ہوا تھا۔ پہلا کمرہ خالی تھا اور دوسرا یقیناً اس کا بیڈ روم تھا۔ وہ کمرے میں آگئی۔

ایک طرف جہازی سائز بیڈ تھا، سامنے سنگھار میز اور دوسری طرف کبڈ تھے۔ ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ تھا۔ بیڈ پر اس کی جیکٹ رکھی تھی اور بیڈ کے پاس جوتے رکھے تھے۔ وہ یقیناً باتھ روم میں تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے پھر باہر آگئی۔ کچھ ہی دیر میں چائے تیار ہو گئی۔ اس نے چائے کے ساتھ ایک ہی بار میں بخار، نزلہ اور کھانسی کی گولیاں پھانکیں اور صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہیں آیا۔ اسے انتظار سے کوفت ہوئی۔ چائے کا کپ خالی ہوا تو وہ کچن میں کپ رکھنے کے بعد کمرے کی طرف آگئی۔ جیسے ہی وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی تو اسے ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔ وہ بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا تھا۔ دایاں بازو آنکھوں پر رکھے وہ شاید سو چکا تھا۔ تب جب وہ باہر اس کا انتظار کر رہی تھی، وہ اس کی آمد سے بے خبر تھا یا پھر جان کر انجان بن کر سو چکا تھا۔

وہ لب دانتوں میں دبائے خفگی سے اسے دیکھتی آگے آئی تھی۔ نم بالوں پر ابھی بھی پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اس پر کمفرٹر ڈالا تھا۔ چند پل وہیں کھڑے رہنے کے بعد وہ بیڈ کے دوسری طرف آئی تھی۔ ٹانگیں سیدھی کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی اور چہرہ ترچھا کر کے بغور اسے دیکھنے لگی۔

وہ ایک ہفتہ جانے کہاں رہا تھا؟ اس کا موبائل بند تھا وہ اسے ٹریس نہیں کر پائی تھی۔ ایک ہفتے بعد آج اس کا موبائل آن ہوا تھا اور نتیجتاً وہ اس تک پہنچ گئی تھی۔ اسے لگا تھا شاید اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ مگر وہ۔۔۔ وہ اب بھی خفا تھا۔ اس کا یوں سو جانا اس کی خفگی کا ثبوت تھا۔ پر سوچ نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے وہ خود بھی نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

زیاد کی آنکھ موبائل کی تھرتھراہٹ سے کھلی تھی۔ دایاں بازو آنکھوں سے ہٹا کر اس نے ماتھے پر بل ڈالے سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو پڑھ کر اس کی نیند بھک سے اڑی۔

”اگر تم آج نہ آئے تو شاید میری طرح تا عمر خود کو کوستے رہو گے۔“ اس نے جلدی سے اٹھنا چاہا تھا مگر پھر کسی احساس کے تحت ٹھٹھک کر رکا۔ تعجب سے اپنے بائیں طرف دیکھا جہاں سعاد بیڈ کراؤن پر سر ٹکائے سو چکی تھی۔ وہ کب آئی تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ کیسے آئی تھی، اس کا اسے کچھ کچھ اندازہ تھا۔ وہ چند پل ٹھہر کر اسے دیکھتا رہا پھر آرام سے اٹھ بیٹھا۔ اس کی ناک زکام کی وجہ سے لال ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ کی وجہ سے وہ خود میں سمٹی ہوئی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا جوڑا کافی حد تک کھل چکا تھا۔ اس نے آرام سے آگے بڑھ کر اس کا رخسار سہلایا تھا۔ وہ ہلکا سا کسمسائی تھی۔

”سعاد، صحیح سے لیٹ جاؤ۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس نے نیند میں ہی ناک سکیڑی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"سعاد۔۔ایسے گردن میں درد ہو جائے گا۔" اب کی بار اس کا رخسار تھپتھپایا۔ سعاد نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر منہ بسور کر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"سکون سے سونے بھی نہیں دیتے۔" وہ نیند میں اونچی آواز میں بڑبڑائی تھی۔ وہ بے اختیار لب دانتوں میں دبا گیا۔ آرام سے اس پر کمفرٹر ڈالا پھر بیڈ سے اتر گیا۔ اپنی جیکٹ اور پی کیپ اٹھانے کے بعد لائٹ بجھا کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ اگلے ہی لمحات میں وہ ہاتھ میں چھاتہ لیے اپارٹمنٹ سے نکل رہا تھا۔

"ساتویں منزل سے چھلانگ لگاتے ہوئے کیا آپ کو ایک بار بھی اپنی بیمار ماں کا خیال نہیں آیا؟" وہ نرمی سے بیڈ پر لیٹے لڑکے سے پوچھ رہی تھی جو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

"ان کی بیماری کی وجہ سے ہی تو یہ نوبت آئی۔ میں تنگ آ گیا تھا روز روز نوکری کے لیے دھکے کھا کھا کر۔" اس کے جواب پر ازابیلا کو بے اختیار اس پر ترس آیا تھا۔ اسی اثناء میں اس کا موبائل تھرتھرایا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اپنی ٹیم پر ڈالی پھر متذبذب نگاہوں سے موبائل کی اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا۔

"آپ جہاں بھی ہیں، جو بھی کر رہی ہیں سب چھوڑ کر یہاں آ جائیں۔ میں اپنا قرض اتارنا چاہتا ہوں، مادام!" پیغام پڑھ کر وہ چند پل سناٹے میں کھڑی رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے گلے سے آئی ڈی کارڈ نکال کر پاس کھڑی لڑکی کو پکڑا کر تیزی سے کمرے سے نکل رہی تھی۔ منتشر ہوتی دھڑکنیں اور پھولتا ہوا سانس۔۔ وہ راہداری میں بھاگ رہی تھی۔ پیغام خیام کا تھا۔ اس کا قرض، وہ نہیں جانتی تھی وہ کس قرض کی بات کر رہا تھا۔ اسے بس یہ اندازہ تھا کہ۔۔ اسے سب چھوڑ کر اس کے پاس پہنچنا تھا۔

☆☆☆

بارش کی تیز بوچھاڑ اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ پوری قوت سے برستے بادل سیاہ ہموار سڑک کو بھگو رہے تھے۔ وہ کسی بوسیدہ ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ چاروں طرف کچھ پرانی چیزیں پڑی تھیں جنہیں کباڑ کہنا بہتر تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی اور میز کے پار کرسی پر خیام بیٹھا تھا۔ وہ کسی کا منتظر تھا۔ اس کے سامنے میز پر "ازاتا شفین" کا کلپ، اس کی شال اور "ازابیلا وارلڈ" کی انگوٹھی رکھی تھی۔ وہ دم سادھے بنا پلک جھپکے تیزی سے برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی اُس رات کے اُس منظر میں کھو رہا تھا جب وہ اسی طرح تڑاتڑ برستی بارش میں ازابیلا کے آگے دیوار کی مانند کھڑا ہوا تھا۔ جب اس کے سوال پر وہ آنکھیں میچتی نفی میں سر ہلا گئی تھی۔ جب اس نے اپنا چھاتہ آگے کیا تھا۔۔ جب وہ۔۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے خیام حنفی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار سر جھٹکا تھا۔ یہ لڑکی دن بہ دن اس کا جینا محال کر رہی تھی۔

اس کا انتظار ختم ہوا۔ سامنے سے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ وہ ویسے ہی بیٹھا رہا۔ آنے والا اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر پر ٹکی پی کیپ اتار کر میز پر رکھی اور نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیسے ہو، خیام؟" آواز سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ بارش سے ہٹا کر معاویہ کی طرف کیا جو اسی بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا جیسے خون نچڑ گیا ہو۔ بالوں پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ اسے پہلی نظر میں ہی بیمار لگا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔ معاویہ نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر سر جھکایا۔ چند پل خاموشی میں گزر گئے۔ معاویہ نے سر نہیں اٹھایا۔ خیام بری طرح چونکا تھا۔ وہ واقعی ٹھیک نہیں تھا۔

"شاید جس وقت سے میں بھاگتا رہا ہوں، وہ آن پہنچا ہے۔" اس نے سر اٹھایا تو گالوں پر دو آنسو لڑھکتے چلے گئے۔ خیام نے حیرت سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھا۔ "میرا وقت ختم ہو چکا ہے خیام! میں خود کو بہت بیمار محسوس کر رہا

ہوں۔" اس کا سفید پڑتا چہرہ، کمزور سا وجود، بھیگی آنکھیں اور کانپتے ہونٹ۔۔ وہ سانس روکے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے ساری زندگی بہت بڑے جرم کے بوجھ تلے گزاری ہے۔ مجھے اس بوجھ کو اتارنا تھا مگر بدقسمتی سے اس بوجھ میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے سانس لینا محال لگ رہا ہے خیام!" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔

"آپ۔۔ آپ ایسے نہیں کر سکتے۔ آپ یوں بیچ راستے میں مجھے تنہا نہیں کر سکتے۔" اس نے سر بے اختیار نفی میں ہلایا تھا۔

"میں نے شہادت کی موت مانگی تھی خیام! مگر شاید وہ میرے نصیب میں نہیں تھی۔ سیف اللہ جیسے مردِ مجاہد کو شہادت نصیب نہ ہوئی تو میرا تو شکوہ ہی نہیں بنتا۔ ہاں مجھے افسوس رہے گا کہ میں۔۔۔ میں اپنے دوستوں کی طرح خدا کی راہ میں ڈٹ کر کھڑا نہ ہو سکا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میں نے اپنی اولاد کو اندھیرے کی طرف دھکیل دیا۔ ہم جیسوں کا اختتام ایسا ہی ہوتا ہے خیام۔۔ ہم ایسے ہی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔" اس کی آنکھیں لال پڑ رہی تھیں۔ خیام بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گیا۔

"آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔"

"خدا کی راہ میں زندگی وقف کر دینے کا وعدہ کیا تھا میں نے اور اس وعدے کو نبھا نہیں پایا۔ اپنی جان کی خاطر بھاگا، تنظیم کی نظروں سے روپوش ہو گیا اور ساری زندگی اسی دوڑ میں گزار دی۔ اب دیکھو موت تو سامنے کھڑی ہے، عین نگاہوں کے سامنے۔" اس کے گال پر ایک آنسو لڑھکتا ہوا داڑھی کے بالوں میں جذب ہو گیا۔ خیام کچھ بول نہ سکا تھا۔ معاویہ کی نگاہ اس کے سامنے میز پر رکھی شال پر ٹکی تو آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئیں۔ اس نے سانس روکے کانپتے ہاتھوں سے اس شال کو اٹھایا تھا۔

"آپ جانتے تھے ازابیلا آپ کی بیٹی ہے۔" خیام کی آنکھ سے نمکین پانی کا ایک قطرہ لڑھک کر گال پر پھسلا تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہیں اس سے محبت ہے۔“ اس نے شال کو اپنے چہرے کے قریب کر کے اس میں بسی خوشبو کو سونگھا تھا۔ خیام یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ یہ شخص، اتنا ظالم کیوں تھا۔ وہ اس میں اپنا عکس کیوں دیکھتا تھا؟ وہ خیام حنفی۔۔ معاویہ بن اعظم میں اپنا مستقبل کیوں دیکھ رہا تھا؟

”اسے بچا لینا خیام۔۔ وہ بہت معصوم ہے، اسے ان ظالموں کے ہاتھوں سے بچا لینا۔“ گرم سیال کی طرح بہتے آنسو شال پر گرنے لگے۔ اسے اپنی سانسیں تھمتی محسوس ہوئی تھیں۔

”میں اس پر کوئی حق نہیں رکھتا۔“ اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

”تو کیا اسے تنہا کر دو گے؟“ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا گیا۔ خیام کو لگا تھا کسی نے اس کا دل پکڑ کر مٹھی میں نچوڑ لیا ہو۔

”آپ ٹھیک نہیں ہیں۔“ اس نے پلک جھپکی تھی۔

”بدر کے گھر سے وہ چِپ میں نے اٹھائی تھی۔ اس میں کوئی خاص معلومات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ تمہاری طرف میرا کوئی قرض نہیں رہتا۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ خیام نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ معاویہ کو اپنے ناک میں خارش محسوس ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی ناک سے خون کی بوندیں گری تھیں۔ خیام تیزی سے کھڑا ہوا تھا۔ معاویہ شال سینے سے لگائے پیچھے ہٹا تھا۔

”زیاد کو تمہیں معاف کر دینا چاہیے۔ میں اس کا سامنا کرنے سے ڈرتا ہوں، اگر وہ تمہیں معاف نہیں کر رہا تو مجھے کیسے کرے گا؟“ بولتے ہوئے اسے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے منہ سے نکلتا خون خاک آلود فرش پر بہہ رہا تھا۔ خون، جس کا رنگ سیاہ پڑ رہا تھا۔ خیام نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔

”یہ مت کریں۔ خدارا اتنے ظالم مت بنیں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے، آپ کا خون ہے۔ تھوڑا انتظار کریں وہ آ رہا ہے۔

آپ کا بیٹا اور ازا۔۔ ہاں وہ بھی۔ آپ سن رہے ہیں ناں؟" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ معاویہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس نے میز کا سہارا لے کر کھڑا ہونا چاہا تھا مگر اگلے ہی لمحے وہ لڑکھڑا کر گرا تھا۔ اس نے دیکھا تھا اس پورے اونچے لمبے مرد کو زمین بوس ہوتے۔۔ اس خون میں لت پت وجود کی سانسوں کو اکھڑتے۔۔ اس کے بہتے آنسو اور کپکپاتے ہونٹ۔۔ شاید وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ ہاں شاید کلمہ۔ وہ آگے نہیں بڑھ پایا، وہ اسے روک نہیں پایا۔ اس کا وجود بے جان ہو گیا تھا۔ بالکل ساکت۔۔ وہ شال ہنوز سینے سے لگی تھی۔ شال پر سرخ گاڑھا خون گرا تھا۔ خیام کو اس آہنی چھت تلے بھی آسمان اپنے سر پر تڑاتڑ برستا محسوس ہوا تھا۔

بارش کے پانی میں شڑاپ کی آواز آئی۔ کسی کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں بیک وقت ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ حواس باختہ، اڑی رنگت اور پتھریلی نظریں۔۔ ایک دوسرے کی آمد سے بے خبر وہ ایک ساتھ اندر آئے تھے۔ خیام نے سانس روکے چہرہ ترچھا کر کے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ ایک آنسو چپکے سے اس کے گال پر لڑھکتا چلا گیا۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس وجود کو دیکھ رہے تھے جو خیام کے قدموں کے پاس خون میں لت پت تھا۔ جان دے چکا تھا، سانس روک چکا تھا۔

☆☆☆

وہ کاونٹر پر اپنی کافی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ شیشے کے پار آسمان تڑاتڑ برس رہا تھا۔ وہ گردن ترچھی کر کے بارش کی بوچھاڑ کو تکنے میں مصروف تھا جب اس کی کافی کاونٹر پر رکھ دی گئی۔ اس نے شکریہ کہا اور پھر کافی اٹھا کر باہر آ گیا۔ ایک ہاتھ میں چھاتہ پکڑے دوسرے سے کافی کے گھونٹ بھرتا وہ سڑک کنارے چلنے لگا۔ بدر نے اسے روفی کو لانے کا کہا تھا اسی لیے اس کا رخ خیام کے گھر کی بجائے اپنے گھر کی طرف تھا۔ موسم کے تیور دیکھ کر اس نے ٹیکسی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بھیگتی سڑکوں پر گزرتی گاڑیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ وہ گرم کافی سے حلق تر کرتا ارد گرد نگاہیں دوڑاتا بے فکری سے چل رہا تھا۔ وہ مصروف سے انداز میں سڑک کا موڑ مڑا تھا جب اچانک ایک تیز رفتار گاڑی سامنے سے آئی تھی۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ گاڑی خطرناک حد تک تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔

اس نے عجلت میں ایک طرف ہونا چاہا مگر اسے موقع نہیں دیا گیا۔ اس گاڑی نے اسے زبردست ٹھوکر ماری تھی۔ وہ اچھل کر پہلے گاڑی کی چھت پر گرا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کا سر بھیگی سڑک سے ٹکرایا تھا۔ اس کا چھاتہ دور جا گرا، گرم کافی سڑک پر بہنے لگی۔ بارش کی بوچھاڑ نے پل میں اس کے وجود کو بھگو دیا۔ خون ایک لکیر کی صورت میں اس کے سر سے بہنے لگا۔ دھیرے دھیرے گرتا خون بارش کے پانی میں گھلنے لگا۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا۔ دماغ سُن ہونے لگا تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی، کہیں کوئی صورت نہیں تھی۔ بس تڑاتڑ برستا آسمان تھا اور بارش کا بڑھتا شور تھا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کچھ فاصلے پر جا کر رکی گاڑی کا دروازہ کھلا۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ شخص گاڑی سے اترا پھر ہاتھ میں چھاتہ لیے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا۔ بغور اس کے خون آلود چہرے کو دیکھا پھر آرام سے پنجوں کے بل

اس کے برابر میں بیٹھا۔ بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو سے جیکٹ کے آستین کو ذرا سا سرکایا، جیسے کچھ تلاش کرنا چاہا۔ اسے وہ مل گیا، وہ نشان جو کسی شیر کے پنجے جیسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشان جو اس کے دو دھاری خنجر نے اس بچے کو دیا تھا جو بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا نفرت بھری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ بچہ اب بڑا ہو گیا تھا، وہ بچہ اس کے سامنے تھا۔ خون میں لت پت، زندگی اور موت کے درمیان جنگ میں پِستا وجود لیے۔۔ وہ اس نشان کو تاعمر چھپاتا آیا تھا کیونکہ یہ نشان آشکار ہونے پر اسے موت کے دروازے تک لے جا سکتا تھا۔ آنکھیں موندے خون میں لت لت جندل یوسف زئی کو اندازہ نہیں تھا، وہ وقت آ چکا تھا۔

اس نے آرام سے اپنے چہرے پر لگا ماسک اتارا تھا۔ اس کا چہرہ واضع ہوا تھا۔ آنکھوں میں بارش کی بوچھاڑ کا عکس ابھرا تھا۔ چوڑی پیشانی اور سپاٹ چہرے والا وہ ابراہم وارلڈ تھا۔۔ ابراہم وارلڈ یا پھر دلال۔۔ وہ نوجوان کپتان جو اپنے وقت کا سب سے بہترین بحری قزاق تھا۔

☆☆☆

سفید فرش پر جگہ جگہ بکھری کانچ کی کرچیوں کی طرح اس کا مان ٹوٹا تھا۔ فرش پر گری خون کی ننھی بوندوں کو دیکھ کر اس کی رگوں میں گردش کرتا خون ٹھہرنے لگا تھا۔ مدھم سی دبی دبی سسکیاں اس کے دل پر ضربیں لگا رہی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا اپنی بیٹی کی یہ اجڑی اور بکھری سی حالت دیکھ رہا تھا۔ شراب کا نشہ اتنا تھا کہ وہ خود اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ لیکن باوجود اس کے وہ اپنی بیٹی کی اس حالت کو نظرانداز نہیں کر پایا تھا۔ گھٹنوں میں سر دیے بلک بلک کر روتی ازابیلا بھی اس کی موجودگی محسوس کر چکی تھی۔ وہ آنسو بہاتی بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ سختی سے آنکھیں میچ گیا تھا۔

”مجھے نہیں رہنا۔ م۔۔ ماں کے ساتھ نہیں رہنا۔۔ وہ بہت بری ہیں بابا۔“ وہ مسلسل سر نفی میں ہلاتے ہوئے رو رہی

تھی۔ اس کی آنکھ کے قریب کی جگہ سوجی ہوئی تھی۔ ہونٹوں کے کنارے پھٹے ہوئے تھے۔ گال پر کسی کے تمانچے کا نشان تھا۔ سرخ ہوتی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اپنی بیٹی کا یہ حال دیکھ کر وہ ساکت ہی تو گیا تھا۔ ”انہوں نے مارا ہے مجھے۔۔ کوئی اپنی بیٹی کو ایسے مارتا ہے بابا؟ مجھے ان کے ساتھ نہیں رہنا۔۔۔ وہ بہت بری ہیں۔“ آنسو گرم سیال کی طرح رخساروں پر گر رہے تھے۔ وہ کئی پل سانس روکے بنا پلک جھپکے اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو دیکھتا رہا تھا۔

”وہ۔۔ تمہاری ماں نہیں ہے بیٹے۔ اس نے ثابت کر دیا وہ تمہاری ماں نہیں ہے۔“ ازابیلا بری طرح چونکی تھی۔ نگاہ اٹھا کر ابراہم کی آنکھوں میں دیکھا تو اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی اور سچائی ظاہر کرتی آنکھوں نے اس کے آنسوؤں کو خشک کر دیا تھا۔ وہ اگر نشے میں نہ ہوتا تو کبھی حقیقت نہ بتاتا۔ مگر اس وقت وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ ”تمہارے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ تمہیں بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں تمہیں موت کے منہ میں جاتے نہیں دیکھ پایا تھا، تمہیں اس آگ سے میں نے بچایا تھا ازا۔“ وہ گم سم سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئی تھی۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔

”ان بحری قزاقوں سے تمہاری حفاظت کرنے کے لیے میں اپنا وطن، اندلس چھوڑ کر یہاں آگیا۔ یہاں مجبوراً اس عورت سے شادی کرنا پڑی۔ یہ عورت تمہاری ماں نہیں ہے ازا۔۔ تم ازا ہو۔ میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔ اگر باپ ہوتا تو شاید کبھی بھی تمہیں اس عورت کے حوالے نہ کرتا۔“ نمکین پانی کا ننھا سا قطرہ پلکوں سے جھول کر ازا کے رخسار پر گرا تھا۔ ”میں نے تمہیں اپنی بیٹی کی طرح چاہا ہے مگر پھر بھی میں تمہارا باپ نہیں بن پایا۔ باپ ایسے نہیں ہوتے، وہ بیٹیوں کے معاملے میں اتنے لاپروا نہیں ہوتے۔“ وہ سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ازا سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ سترہ سال۔۔ اس کی زندگی کے یہ سترہ سال صرف سراب تھے۔ وہ اس شخص کی بیٹی

نہیں تھی جس نے اسے باپ جیسی شفقت دی تھی۔ وہ عورت اس کی ماں نہیں تھی، جس نے اس پر درندگی دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ وہ کئی پل کچھ بول نہیں سکی تھی۔ اور جب بولنے کی سکت جمع ہوئی تو اس کے لبوں پر بس یہی سوال آیا تھا،

"میرے ماں باپ کون ہیں؟" کئی آنسو اس کے رخساروں پر گرتے چلے گئے۔

"تمہارے باپ کا نام معاویہ تاشفین ہے۔ میں نے مزید اس کے متعلق معلومات اکھٹی کرنا چاہی تھی مگر کچھ میسر نہ ہوا۔ وہ مر چکا ہے۔" ایک اور پہاڑ اس کے سر پر گرا تھا۔ اس نے بمشکل صوفے کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا تھا۔ نشے میں دھت ابراہم کے لیے مزید اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ایک غمگین نگاہ ازا پر ڈال کر جانے کے لیے پلٹ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہ حقیقت کتنی تلخ تھی کہ سترہ سالوں میں وہ جس شخص کو اپنا باپ کہتی آئی وہ بس اس کا محافظ تھا۔ وہ محافظ جس نے اسے موت کے منہ سے نکالا تھا۔ یہ احساس کتنا جان لیوا تھا کہ سترہ سال کی عمر میں جب اسے حقیقت سے آگاہ کیا گیا تو اس کی واپسی کی راہیں اجڑ چکی تھیں۔ پھر یہ سچ کہ وہ اب تک جھوٹ اور دھوکے کی مضبوط دیواروں میں محصور رہی تھی، کتنا ظالم تھا۔

☆☆☆

اس رات ابراہم نشے میں تھا۔ اگلی صبح وہ سب بھول چکا تھا اسے نہیں یاد تھا وہ ازا کو کس اندھیر گھاٹی کی طرف دھکیل چکا تھا۔ اس کے لیے وہ وہی ہر حقیقت سے بے خبر معصوم ازابیلا تھی۔ اس سے اس کی معصومیت چھین لی گئی تھی۔ اسے اپنے ارد گرد ہر شے سے نفرت ہونے لگی تھی۔ قانتہ اس دن کے بعد سے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھا پائی کیونکہ اس کے اور ازا کے درمیان کوئی ایسا رشتہ باقی نہیں رہا تھا جو اسے یہ حق دیتا۔ وہ خود کو اس سے جتنا دور کر سکتی تھی اس نے کیا۔ البتہ ابراہم اس کے لیے ہمیشہ بس اس کا باپ ہی رہا۔ وہ شخص جو اس کا محافظ تھا، اس کا باپ تھا، اب ازا

کے لیے اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی۔ اس کا ہر حکم ماننا اس پر فرض تھا۔ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی ایسے ہی گزارنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا، وہ اسے کبھی یہ خبر نہیں ہونے دے گی کہ انجانے میں ہی سہی وہ اسے حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ دو سال قبل اسے ایک کال موصول ہوئی۔

"مس ازابیلا وارلڈ۔۔ یا مس ازا تاشفین ؟!" آواز بھاری تھی۔ لہجے میں رعب تھا۔ وہ جو مصروف سے انداز میں موبائل کان سے لگائے آگے بڑھ رہی تھی، بے اختیار اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"کون ہیں آپ؟" اس نے لہجہ سخت کرنا چاہا تھا۔

"وہ بحری قزاق آج بھی اس بچی کی تلاش میں ہے ازا، جو اس کی نگاہوں کو بھا گئی تھی۔ آپ کو لگتا ہے وہ آپ کو تلاش کیے بنا رک جائے گا؟" اس بار آواز میں قدرے نرمی محسوس ہوئی تھی۔ وہ چند پل کچھ بول نہیں سکی تھی۔ انجان نمبر تھا، مقابل اجنبی تھا مگر ہر چیز سے باخبر تھا۔ اس کے ماضی سے۔۔ حتیٰ کہ اس کی ذات سے، اس کی اصل پہچان سے۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"اگر آپ کو اپنی جان عزیز ہے ازا، اور آپ اپنا اختتام آگ کے شعلوں کی زد میں نہیں دیکھنا چاہتیں تو خاموش رہیں۔ آپ کچھ نہیں جانتیں، جو دکھ رہا ہے وہی سچ ہے۔ مان لیں اور جان لیں!" یہ کوئی مشورہ نہیں تھا، یہ حکم تھا۔ حکم جو سنایا گیا تھا، زیاد کی آمد سے ٹھیک ایک دن قبل۔

"میں زیاد تاشفین ہوں۔ آپ کا کزن، ماموں زاد۔ آپ یقیناً مجھے نہیں جانتی ہو نگی مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا مجھے۔" وہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھائے لبوں پر مسکان لیے کہہ رہا تھا اور وہ سُن کھڑی اسے سن رہی تھی۔ وہ اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہاتھ نہیں تھام پائی تھی۔ وہ "زیاد تاشفین" پر اٹک گئی تھی۔

اس اجنبی لڑکے نے اسے خاموش رہنے کا کہا تھا۔ وہ خاموش نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی وہ اس لڑکے سے پوچھے کیا اس کے والد کا نام معاویہ تاشفین ہے؟ کیا یہ تاشفین اس کا بھائی ہے؟ یا کوئی جاننے والا؟ مگر وہ نہیں پوچھ پائی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی اور زیاد کا مصافحے کے لیے بڑھا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اگر وہ یہ نہ کرتی تو پہچان لی جاتی۔ وہ بحری قزاق اسے ڈھونڈ لیتا۔ وہ لڑکا یہی پیغام دینا چاہتا تھا، وہ اس اجنبی لڑکے کا اعتبار کر گئی۔ اپنی جان کی خاطر جان لگانی پڑتی ہے، جھوٹ بولنے پڑتے ہیں کیونکہ۔۔ وہ ایک سروائیور تھی۔

ابراہم نے زیاد کی بات کا یقین کر لیا۔ قانتہ اپنے "بھتیجے" پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ دن بہ دن زیاد کے قریب ہوتی گئی۔ وہ اچھا تھا، مزاج دھیما تھا۔ طبیعت میں نرمی تھی، سمجھدار تھا اور۔۔۔ اور بس وہ اچھا تھا۔ وہ اس کی دن بہ دن عادی ہوتی گئی۔ اسے ایک اچھا دوست مل گیا تھا۔ دوست۔۔ جو شاید اس کا بھائی تھا۔ یا شاید واقعتاً کزن تھا۔ ان کے چہرے بہت حد تک ایک دوسرے کی مشابہت رکھتے تھے۔ ان کی عادات ایک سی تھیں، ان کی طبیعت اور مزاج ایک سا تھا۔ وہ کیسے اسے اپنا بھائی نہ مانتی؟ دنیا میں ہزاروں تاشفین ہوتے ہیں مگر زیاد تاشفین بس وہی تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا جب وہ دھیرے دھیرے اسلام کی طرف مائل ہونے لگی تھی۔ یہ احساس کتنا عجیب تھا ناں کہ اس کے کانوں میں پڑنے والی پہلی آواز اذان کی تھی۔ اس کا تعلق مسلمان گھرانے سے تھا۔ اور وقت نے اسے اسلام سے اتنا دور لا کھڑا کیا تھا کہ اب اگر اس کی طرف دل جھکنے بھی لگا تھا تو قدم بڑھانے میں بہت وقت درکار تھا۔

دو سال بعد تک وہ اس فون کال کو بھلا چکی تھی۔ اور یہیں اس نے غلطی کی تھی۔ ان دنوں وہ آج سے بیس سال پہلے بحیرہ روم کے پانی میں دو بحری جہازوں کی مابین ہوئی جنگ کے کیس کو دیکھ رہی تھی۔ اس حادثے کے متعلق کسی اخبار میں یا میڈیا پر کہیں کوئی خبر نہیں تھی۔ اسے ایک میل موصول ہوئی تھی جس میں اس حادثے کا ذکر، حادثے کے اسباب پر کچھ شک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس نے دن رات اسی کیس کے لیے وقف کیے ہوئے تھے جب

ایک رات اچانک اس نے ایک اور کال موصول کی تھی۔

"آپ صحافت کو چھوڑنے والی ہیں۔" چھوٹتے ہی کہا گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"میں ایسا کیوں کروں گی؟" اس نے تیوری چڑھائے پوچھا تھا۔

"آپ سے یہ کروایا جائے گا۔ کیا مقابلہ کرلیں گی؟" لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"میرے ساتھ کام کریں ازا! ہمیں ان بحری قزاقوں کو ڈھونڈنا ہے۔ جو میل آپ نے موصول کی ہے، وہ اسی کیس کے متلعق ہے۔ کل صبح کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہے گا۔ آپ کے ارد گرد جھوٹ کی بہت سی دیواریں کھڑی ہونے والی ہیں اور خود کو ان میں محصور ہونے سے روکنے کے لیے آپ کو سچ تلاش کرنا ہوگا۔" آواز میں بے حد سنجیدگی تھی۔ وہ چند پل خاموش رہی تھی۔

"میں آپ کا یقین کیسے کروں؟"!

"انتظار کریں۔ اگر یقین آجائے تو اسی نمبر پر کال کیجیے گا۔" اور اس کے ساتھ ہی کال کٹ گئی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

اگلے دن ابراہم کی طرف سے صحافت چھوڑنے کے متعلق جاری ہونے والے حکم نامے نے اسے سناٹے میں کر دیا تھا۔ اس لڑکے نے کہا تھا اس سے یہ کروایا جائے گا، اور یہ ہو چکا تھا۔ چند دنوں بعد میکس کا قتل ہو گیا۔ اور یہاں پہلی بار اسے قلم کی نوک ملی تھی۔ دوسری بار یونیورسٹی میں اور پھر جیسے یہ سلسلہ شروع ہوتا گیا۔ اس دوران اس کی ملاقات خیام سے ہوئی، جندل سے اور بدر سے۔ جندل اور بدر پر شک اسے اس شام اس جگہ سے جہاں وہ کھڑے تھے، قلم کی نوک ملنے کے بعد ہوا۔ جبکہ خیام پر اس وقت جب زیاد نے مائک کے حادثے کے بعد اس سے اپنی

دشمنی کا اظہار کیا۔ یہ بات طے تھی کہ زیاد کوئی عام شخص نہیں تھا۔ وہ یقیناً یہاں کسی مقصد سے آیا تھا، شاید کوئی جاسوس بن کر۔ ممکن تھا کہ وہ بھی اسی بحری قزاق کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور پھر اگر وہ خیام سے دشمنی کا اظہار کر رہا تھا تو یقیناً یہ جھوٹ تھا۔ اس نے کہا تھا سخت دشمن، یعنی وہ دونوں بہت گہرے دوست تھے!

میکس کا قتل زیاد نے کیا تھا، قلم کی نوک کے ذریعے پیغام دینے والا وہ سفید رومال والا لڑکا تھا۔ ایملی کے بوائے فرینڈ کا قاتل مارک تھا۔ ہر وہ کام جس کے لیے وہ خیام پر شک کرتی آئی وہ کسی دوسرے کے کھاتے میں جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے اندازہ ہوا کہ۔۔ خیام تو بس ابراہم کی کمپنی کا مینیجر تھا، معصوم مینیجر!

بعد ازاں جب ایملی کو اغوا کیا گیا اور اس کے بوائے فرینڈ کو مارا گیا تھا تب اس نے یہ فیصلہ لیا تھا کہ وہ اس اجنبی لڑکے کا یقین کرے گی۔ ان کی پہلی ملاقات فیکٹری میں ہوئی تھی۔

"خیام، جندل، زیاد اور بدر۔۔ یہ چاروں تمہارے ساتھی ہیں؟" وہ سینے پر ہاتھ باندھے سامنے کھڑے لڑکے سے پوچھ رہی تھی۔ سیاہ جینز پر سیاہ اپر پہنے، سر پر ہم رنگ پی کیپ ٹکائے اور چہرے کو سفید رومال سے ڈھکے وہ لڑکا قد کاٹھ سے اسی کے ہم عمر یا شاید کچھ چھوٹا معلوم ہوا تھا۔

"جان کر کیا کریں گی؟"

"تم پر یقین!" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہا گیا۔ وہ لڑکا چند پل خاموش رہا پھر سر کو اثبات میں ہلایا۔

"یہ راز رہے گا۔" اس نے تاکید کی۔

"تم ان کے ساتھ کام کر کے اس بحری قزاق کو پکڑ سکتے ہو، پھر میں ہی کیوں؟" اس نے اگلا سوال کیا تھا۔

"ہمارے شک کی زد میں جو چار افراد ہیں، آپ کا تعلق ان چاروں افراد سے ہے۔ مزید یہ کہ آپ ابراہم وارلڈ کی بیٹی ہیں، ایک صحافی ہیں۔۔۔ جو آپ کر سکتی ہیں وہ کام ان میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔" اس نے بات مکمل کر کے

کندھے اچکائے۔ ازا نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔

”اور اس سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟“ وہ لڑکا اس کی بات پر ہلکا سا، بالکل ذرا سا مسکرایا تھا۔ اپر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

”کیا زیاد آپ کا بھائی نہیں ؟!“ ازا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ لڑکا مسکراتے ہوئے واپس ایک قدم پیچھے ہٹا۔

”آپ اپنے بھائی سے مل سکتی ہیں، آپ اپنے اصل کی طرف لوٹیں گی ازا!“ سنجیدگی سے کہا گیا تھا۔ سودا گھاٹے کا نہیں تھا۔ وہ مان گئی تھی۔

اس نے پہلا کام جو کیا تھا وہ جیم، ڈیوڈ اور ان جیسے کئی دوسرے لوگوں کو خریدنے کا تھا۔ اسٹیون کو اسکائے ٹو اور اسکائے ٹو کو اسٹیون سے بدزن کرنے میں ڈیوڈ نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ مائک اور مارک کے جھگڑے، اسٹیون اور مارک کے درمیان معاملات میں بگاڑ پیدا کرنے میں جیم کا ہاتھ تھا۔ بظاہر یہ سب کام خود بخود ہوتے گئے تھے مگر ان کے پیچھے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ان تین لوگوں کو اختتام تک پھر حزب اللہ کے باقی مجاہدین نے پہنچایا تھا۔

اس دوران بہت سے انکشاف ہوئے تھے۔ ڈیوڈ کو قتل کرنے کے لیے مارک نے جب اپنے آدمی بھیجے تو اسے بچانے والی وہی تھی، خیام کو اس کے کیس کی تفتیش پر ابھارنے والی وہی تھی۔ بعد میں اسے سامنے لا کر مارک کی حقیقت دکھانے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ اور سب سے بڑی بات۔۔۔ اس نے حزب اللہ تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ دو لوگ جن کے نام حزب اللہ نے دیے تھے ان میں ایک بدر تھا جو حزب اللہ میں شمولیت اختیار کر چکا تھا اور دوسرا نام ازا کا تھا۔۔ حزب اللہ بہت جلد اسے بھی رضامند کرنے والی تھی۔ وہ وہیں تھی اس رات جب بدر، خیام اور سعاد زیرِ تفتیش تھے۔ وہ وہیں تھی جب سعاد اور زیاد کا نکاح ہوا تھا۔۔ اس نے دیکھا تھا بدر کو جندل اور خیام کے گلے لگ کر روتے ہوئے۔۔ اس نے ان دوستوں کو اپنے ایک دوست کو الوداع کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اسے حقیقت

دکھائی جارہی تھی، وہ حقیقت جس کی تلاش نے اسے یہاں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ حقیقت جو اگر تلخ تھی تو بہت خوبصورت بھی۔۔ مگر اسے آشکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنی جان کی خاطر اسے خاموش رہنا تھا۔ اسے یہ کرنا تھا۔۔!

☆☆☆

بارش کے پانی میں شڑاپ کی آواز آئی۔ کسی کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں بیک وقت ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ حواس باختہ، اڑی رنگت اور پتھیرلی نظریں۔۔ ایک دوسرے کی آمد سے بے خبر وہ ایک ساتھ اندر آئے تھے۔ خیام نے سانس روکے چہرہ ترچھا کر کے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ ایک آنسو چپکے سے اس کے گال پر لڑھکتا چلا گیا۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس وجود کو دیکھ رہے تھے جو خیام کے قدموں کے پاس خون میں لت پت تھا۔ جان دے چکا تھا، سانس روک چکا تھا۔ زیاد نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا جو اپنی جگہ پتھر کا ہو چکا تھا۔

"یہ کون ہے خیام؟" دل میں کئی خدشات لیے اس نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا تھا۔ خیام جواب نہیں دے پایا تھا۔ آنکھ سے ایک آنسو نکل کر گال پر لڑھک گیا تھا۔ "میں پوچھ رہا ہوں یہ کون ہے؟!!" وہ دھاڑا تھا۔ کئی خدشات کی بنا پر آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ ازا سانس روکے یک ٹک اس وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کان بھی خیام کا جواب سننا چاہتے تھے۔ وہ اپنے خدشات کو غلط ثابت کرنا چاہتی تھی۔

"معاویہ۔۔۔ معاویہ تاشفین!" وہ بے اختیار پیچھے ہٹا تھا۔ زیاد نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے پھسلتیں اس وجود پر ٹکی تو اسے لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ بے اختیار وہ پنجوں کے بل نیچے بیٹھا تھا۔ پتھریلی نگاہیں اس خون میں بھرے چہرے پر ڈالی تھیں جسے وہ پہلی نظر میں پہچان نہیں پایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا یہ شخص اس کا باپ تھا۔ خیام کہہ رہا تھا یہ شخص معاویہ تھا۔ وہ کیسے یقین کرتا؟ اس کا باپ تو مر چکا تھا، سالوں پہلے اس نے خود معاویہ کی قبر پر مٹی ڈالی تھی۔ اس کا باپ کیسے لوٹ سکتا تھا اور اس حالت میں۔۔ اس نے سر بے اختیار نفی

میں ہلایا تھا۔ آنکھوں سے کئی آنسو لڑھکتے چلے گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس چہرے کو چھونا چاہا مگر اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس کا باپ مر چکا تھا، وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا یہ شخص اس کا باپ ہے۔ یہ تکلیف دہ ہے، وہ سانس نہیں لے پائے گا، اس کا دل پھٹ جائے گا، وہ یقین نہیں کر سکتا۔ یہ شخص۔۔۔ہاں یہ شخص اس کا باپ ہے۔ یہ آنکھیں اس کی ہی آنکھوں کا عکس ہیں۔ اس چہرے پر زمانے کی تھکن ہے، گزرے ہوئے وقت نے اس پر اپنے نشان چھوڑے ہیں مگر۔۔ یہ وہی چہرہ ہے۔ اس کے باپ کا، معاویہ تاشفین کا!

”بابا۔۔“ آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ وہ سرگوشی اسے بار بار اپنی سماعت سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔ بارش کا شور بڑھتا گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھ اپنے باپ کی آنکھوں پر رکھے۔ ہاتھ دھیرے سے اس چہرے سے پھسلتا گیا۔ آنکھیں بند کر دی گئیں، پردہ قائم ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کی خون آلود پیشانی پر لب رکھتا سسک اٹھا تھا۔ اسے لگ رہا تھا غیر معمولی انداز میں دھڑکتا اس کا دل آج درد سے پھٹ جائے گا۔ اس نے کبھی خواہش نہیں کی تھی وہ اپنے باپ سے دوبارہ ملے۔ پھر قدرت کو یہ ملاقات ایسی صورت میں منظور کیوں تھی؟ جھلک دکھادی تھی تو ایک بار ان کے گلے لگنے کی اجازت تو ہوتی۔ صرف چند پل۔۔ صرف چند لمحات۔۔۔ وہ اس ان چاہی ملاقات میں ساری زندگی جی لیتا، تاعمر اپنے ہونٹ سی لیتا مگر، ملاقات ہو گئی تھی۔ ایسے کہ وہ اپنے باپ کے مردہ وجود کو دیکھ رہا تھا جو ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ایسے کہ۔۔۔ اس کی آنکھ سے بہتے آنسو ناک کی ہڈی سے پھسلتے معاویہ کے گال پر لڑھک رہے تھے مگر اس میں اتنی بھی جان نہیں تھی کہ وہ ان آنسوؤں کو پونچھ سکتا۔

وہ دھیرے سے اٹھا تھا۔ اپنا سر اٹھایا تھا۔ وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ازا کو نہیں دیکھ پایا، ازا جو اپنی جگہ پتھر کی ہو چکی تھی۔ اس نے گردن ترچھی کر کے خیام کو دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں موجزن سوال، اشک، غصہ اور نفرت دیکھ کر خیام کا دل کیا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ ان باپ بیٹے کی ایسی ملاقات نہیں کروانا چاہتا تھا، کبھی بھی

نہیں۔ وہ اپنے دوست کو مزید تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا، بالکل نہیں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تھا۔ زیاد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے قدم خیام کی طرف بڑھائے تھے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن دبوچی تھی۔

"ہر بار تم ہی کیوں خیام حنفی؟! میرا گھر جلے، میرا خاندان اجڑے، میرا باپ مرے۔۔ تم ہر بار کیوں موجود ہوتے ہو خیام؟ تم ہی کیوں؟" اس کی گردن کے گرد گرفت سخت کرتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا گیا تھا۔ اس کے لہجے کے سرد پن نے خیام کے آنسوؤں کو خشک کیا تھا۔

"وہ چاہتے تھے تم انہیں معاف کر دو۔" اس نے اٹکتی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تھا۔ بے اختیار اس کی گردن کے گرد گرفت مزید سختی ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا میرے سامنے مت آنا!" ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں ابھرتی نفرت کو دیکھ کر خیام کو آہنی چھت اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔ گردن کے گرد زیاد کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ چہرے سے خون چھلکنے لگا۔ تنفس بگڑنے لگا، دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ زیاد کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت اور غصہ اسے موت سے پہلے مار رہا تھا۔ پیشانی کی رگیں ابھرنے لگی تھیں۔ سانسیں تھمنے لگی تھیں۔ اسی لمحے میں ازا پورے زور سے زیاد کو دھکیلتے ہوئے ان دونوں کے درمیان میں آئی تھی۔ زیاد لڑکھڑایا تھا۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ ازا کی پتھریلی نظروں نے اسے سانس روکنے پر مجبور کیا تھا۔ زیاد آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ ازا کا ہاتھ اٹھا تھا اور تڑاخ کی آواز سے خیام کے رخسار پر پڑا تھا۔ زیاد رک گیا۔ ایک آنسو ازا کی پلکوں سے جھول کر گال پر گرا۔ خیام اپنا بائیں طرف کو جھکا سر اٹھا نہیں پایا۔

"وہ تمہاری جان لے گا تو تم جان دے دو گے ہاں؟" وہ اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی آواز بلند نہیں کر پائی تھی، اپنا لہجہ سخت نہیں کر پائی تھی۔ خیام نے نم آنکھیں اس کی آنکھوں میں

گاڑی تھیں۔ اس کی نگاہوں سے جھلکتا وہ نرم تاثر ازا کو مزید طیش دلا گیا تھا۔ ”آئندہ تم نے یوں خودکشی کی کوشش کی تو یقین کرو خیام! اس بار تھپڑ مارا ہے اگلی بار جان لے لوں گی۔“ وہ اپنا لہجہ سخت کرنے میں کامیاب ٹھہری تھی۔ قہر آلود نگاہ اس پر ڈال کر جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا تھا۔ وہ پلٹ گئی تھی۔ خیام سانس روکے اس کی پشت دیکھ رہا تھا۔ زیادہ ضبط کے مارے مٹھیاں بھینچتے کرسی کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا تھا۔ ازا چپ چاپ معاویہ کے پاس پنجوں کے بل بیٹھی تھی۔

”آپ جو بھی ہیں۔۔۔ میں صرف خیام کے کہنے پر آپ کو اپنا باپ نہیں مان سکتی!“ اس کی آواز کانپ گئی۔ منہ سے سسکی نکلی۔ سر جھکا کر اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنا چاہا مگر ناکام ٹھہری۔ کئی آنسو زارو قطار رخساروں پر بہنے لگے۔ خیام لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کیے آگے آیا تھا۔ جھک کر معاویہ کے سینے سے لگی شال اٹھائی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے شال کو پکڑ کر اسے جھاڑا اور اگلے ہی لمحے وہ شال ازا کو اوڑھائی تھی۔ جیسے اس رات ازا نے اسے اوڑھائی تھی۔

”آپ رو رہے ہیں؟۔۔۔ ڈریں مت۔ بھائی کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اندر لے آؤں۔ یہاں بہت ٹھنڈ ہے، آپ جم جائیں گے۔۔۔ اب آپ نہیں جمیں گے۔۔۔ اگر آپ اندر نہیں آنا چاہتے تو نہ آئیں۔ لیکن اگر آنا چاہیں تو یہ دروازہ کھلا ہے۔ آپ اپنا خیال رکھیں اور جم مت جایئے گا۔ اسے صحیح سے اوڑھ لیں۔۔“ وہ اس کی کہی ہر بات دہرا رہا تھا۔ دھڑکنیں یوں سست پڑی تھی گویا دل ابھی دھڑکنا بند ہو جائے گا۔ وہ سر اٹھا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے اس رات سے آزاد کر دو ازا۔۔ میرے لیے دن بہ دن سانس لینا محال ہو رہا ہے۔ میں نے اپنا قرض لوٹانے کی کوشش کی۔۔ کہہ دو میں نے اپنا قرض لوٹا دیا۔“ وہ آنکھوں سے گرتے موتیوں کی مانند چمکتے آنسوؤں کو نہیں روک پا رہا تھا۔ ازا سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک بارش وہ تھی جو باہر برس رہی تھی، جس کا شور کچھ

مزید سننے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ ایک بارش وہ تھی جو دلوں پر قطرہ قطرہ برس رہی تھی، جو اتنی مدھم تھی کہ سانسوں کی آواز تک سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

”کیا تم نے دیکھا ہے کبھی۔۔۔ کسی ملکہ نے اپنا غلام آزاد کیا ہو؟ وہ غلام جو۔۔ ملکہ سے وفادار ہو؟“ وہ لفظوں کا ہیر پھیر کر گئی۔ خیام کو سانس روکنے پر مجبور کر گئی۔ آنسوؤں کی دبیز تہہ اس کے آگے حائل ہونے لگی۔ ازا کا چہرہ دھندلا ہونے لگا۔ اس نے آستین سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ وہ اپنے رخساروں سے آنسوؤں کے نشانات مٹا رہی تھی۔ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھا گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹھتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ خیام اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا، وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ نگاہیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اندازہ تھا اگر یہ خطا ہوئی تو یہ لڑکا اس رات کے بعد اس شام میں بھی قید ہو جائے گا۔ اسے شاید اس پر ترس آ گیا تھا۔ اپنے شانوں پر ڈلی خون آلود شال کو مٹھیوں میں بھینچ کر اپنے گرد لپیٹتی وہ آگے بڑھی تھی۔ ایک۔۔۔ دو۔۔ تین۔۔ وہ اس کے اٹھتے قدم گن رہا تھا۔ آنکھوں میں جمع ہوتے آنسو بہنے کو بے تاب ہوئے۔ سات۔۔ آٹھ۔۔ دسویں قدم پر وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ موتیوں کی طرح چمکتے نمکین پانی کے شفاف قطرے اس کے رخساروں پر لڑھکتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

”Damnatio memoriae.

قدیم ادوار میں جب ایک بادشاہ کا تخت الٹ دیا جاتا تو موت کے بعد اسے جو سزا دی جاتی تھی وہ تھی ڈمناشیو میمورائے! یعنی وہ لوگ جن پر اس بادشاہ نے سالہا سال حکومت کی، ان کے ذہنوں سے اس کی تصویر مٹا دی جاتی تھی۔ ہر وہ چیز جو اس بادشاہ سے منسلک ہوتی نیست و نابود کر دی جاتی تھی۔ ہٹلر کے ساتھ یہی ہوا تھا، قدیم سلطنت

روما کے چند بادشاہ بھی اسی سزا کے حق دار ٹھہرے تھے۔ موجودہ دور میں عراق کا صدر، صدام حسین بھی اسی سانحے سے گزرا ہے۔ وہ نوٹ جلا دیے جاتے ہیں جن میں ان کی تصاویر ہوں، وہ سکے آگ میں جھونکے جاتے ہیں جو ان کی یاد دلائیں۔ وہ عمارتیں ڈھا دی جاتی ہیں جو بادشاہ کی یادگار ہوں۔ غرض۔۔ اس انسان سے متعلق ہر ایک چیز۔۔ ہر بات یادوں کے دریچے سے مٹا دی جاتی ہے۔

جندل اللہ کو یہی سزا دی گئی تھی۔ ان کے نوجوان اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اخبارات، میڈیا نے انہیں اس قابل نہیں سمجھا کہ ان کے متعلق کچھ کہا جائے۔ ہر وہ تحریک جو انہوں نے شروع کی، اسے جڑ سے اکھاڑا گیا۔ ان کے گھر جلا دیے گئے۔۔ سب ختم کر دیا گیا۔ جندل اللہ کا آخری مجاہد معاویہ تاشفین، جو سالوں موت سے بھاگتا رہا۔۔ بالآخر وہ بھی مارا جا چکا ہے۔ اب کوئی نہیں جو ان کا نام لیوا ہو۔"

اس نوجوان لڑکے نے اپنی بات مکمل کر کے ستائش طلب نظروں سے میز کے پار بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ ان سب کے چہرے سپاٹ تھے، ایکدم سپاٹ۔ سیاہ رنگ کی دیواروں والے بڑے سے ہال میں لمبی میز کے ارد گرد بیٹھے وہ سب تقریباً دس سے بارہ آدمی تھے اور سب سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس تھے۔ اگر ان میں کوئی مشترکہ چیز تلاش کی جاتی تو وہ مانوس سا نشان سب کے پاس مختلف جگہوں پر نظر آتا جو اس تنظیم سے منسلک تھا۔۔ دلال کی تنظیم سے!

"ہر اندھیر گھاٹی میں کوئی نہ کوئی سروائیور ہوتا ہے۔ اندھیرے میں ڈوبا۔۔ خود میں سمٹا۔۔ اپنی سسکیاں دباتا۔۔ ہر گناہ اپنا ثبوت چھوڑ جاتا ہے، ہر ظالم کے ہاتھوں ایک مظلوم بچ جاتا ہے جو وقت گزرنے پر بساط الٹ دیتا ہے۔ وہ سروائیور۔۔ اپنے وقت کا بڑا کھلاڑی بن کر ابھرتا ہے۔ ایسے لوگوں سے ڈرنا چاہیے، یہ جانتے ہیں کہ انتقام بنا کوئی نشان چھوڑے کیسے لیا جاتا ہے؟! جندل اللہ نے اپنے پیچھے جو سروائیور چھوڑے ہیں وہ حزب اللہ بن کر ابھرے ہیں۔ تمہیں ان سے ڈرنا چاہیے۔۔ تمہیں "دلال" کے بعد "الزرقاوی" سے ڈرنا چاہیے۔ وہ سروائیور جو تمہاری

صفوں میں گھسا بیٹھا ہے مگر تم اسے تلاش نہیں کر پائے۔ وہ سروائیور جو تمہیں روند رہا ہے اور پیچھے انتقام کے لیے کسی سروائیور کو نہیں چھوڑ رہا!" آواز بھاری اور رعب دار تھی۔ سب کی نظریں سربراہی کرسی پر بیٹھے دلال پر ٹکی تھیں۔ اس کا سپاٹ چہرہ، سرخ آنکھیں جن کے ایک اشارے پر سب تہس نہس کر دیا جاتا تھا اور سرد آواز ان سب کو پہلو بدلنے پر مجبور کر گئے تھے۔

"اپنی کامیابی کا ذکر کرنے سے پہلے اپنی ناکامی کا ذکر کیا کرو! کیا تم الزر قاوی کو ڈھونڈ سکے ہو؟!!" اس کا سخت لہجہ اس نوجوان لڑکے کو سر جھکانے پر مجبور کر گیا تھا۔

"ہم کوشش کر رہے ہیں۔۔ سر!" اس کی آواز پہلے کی نسبت کمزور پڑ گئی تھی۔

"تم سالوں سے کوشش کر رہے ہو مگر اس شخص کو نہیں ڈھونڈ پائے جو تمہاری چالیں تم پر الٹ رہا ہے۔ وہ تمہیں جڑوں سے اکھاڑ رہا ہے اور تم۔۔۔ تم کوشش کر رہے ہو؟!" اس کی آوز تیز نہیں ہوئی تھی۔ وہ دھاڑا نہیں تھا اور نہ ہی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔ اس نے اسی سنجیدگی سے دھیمی آوز میں سپاٹ چہرے کے ساتھ سخت لہجے میں کہا تھا اور وہ سب کے سب سر جھکانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"وہ لڑکا جندل یوسف زئی! اس کے ہوش میں آتے ہی ہم انہیں اپنی طاقت دکھائیں گے۔ یہ ہمیشہ کی طرح اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔" ایک شخص نے ہمت جمع کر کے کہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے اس کے دماغ پر قابو پانا آسان ہو گا؟! مجھے امیدیں مت دلاؤ، مجھے نتیجہ دکھاؤ نتیجہ!! اس قابل نہیں ہو تو کرسی خالی کر دو۔"

"سر ہم۔۔ ہم زیاد تاشفین کو بھی تلاش کر رہے ہیں۔ ہم بہت جلد ان تک پہنچ جائیں گے۔"

"ابدال کو بلاؤ! جو تم نہیں کر سکتے، وہ اسے کرنے دو۔" حکم صادر کیا گیا تھا۔

”اگر وہ یہاں آیا تو سمندر میں بحری قزاق کمزور۔۔۔“

”سمندر میں بحری قزاق ابدال کے نہیں دلال کے نام پر لڑتے ہیں! اپنا دماغ درست کرو اور میرے حکم پر سوال اٹھانے کی جرات کرنے کی کوششیں ترک کردو۔“ کاٹ دار لہجے میں کہا گیا تھا۔ وہ شخص آنکھیں میچتا نظریں جھکا گیا۔ اسی اثناء میں ایک شخص دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ اس نوجوان لڑکے کے کان کے پاس جھکا۔ ایک خبر اس کے گوش گزار کی۔ لڑکے نے چونک کر دلال کو دیکھا۔ اس شخص کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سر کو جنبش دے کر باہر کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

”جندل یوسف زئی۔۔۔ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم ماری جا چکی ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں تھوک نگلتے ہوئے خبر سنائی تھی۔ دلال نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔

”کون؟“

”الزر قاوی!“ وہ بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی وہ سب بھی کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

”ازاتا شفین کو پکڑ لو! خبردار اگر اس بار ناکام ہوئے۔ وہ واحد ہتھیار ہے جس سے الزر قاوی کو قابو کیا جا سکتا ہے۔“ ایک قہر آلود نگاہ ان سب پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کا ہر اٹھتا قدم بہت سے لوگوں کو ان کی موت کے نزدیک کر رہا تھا۔ جس لمحے میں اس نے ہال سے باہر قدم رکھا تھا، اس لمحے میں بندرگاہ پر بحری قزاقوں کا جہاز لنگر انداز ہوا تھا۔

نئی تہذیبیں، نئے ادوار ہمیشہ ”بر“ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سمندر قدیم تہذیبوں پر ہی برقرار ہے ۔ اس کی اپنی دنیا ہے اور اس دنیا کے قاتل بھی اپنے ہے۔ وہ ہمیشہ سے وحشی درندے تھے۔ وقت کے بدلنے سے ان کی درندگی میں اضافہ ضرور ہوتا ہے، لیکن ان کا ناپید ہونا خام خیال ہے۔

☆☆☆

خیام کو جندل کی حالت سے آگاہ کرنے کے لیے وہ اسے پیغام بھیج چکا تھا جو ابھی تک اس نے نہیں دیکھا تھا۔ انتظار سے تھک کر گہری سانس لے کر وہ سینے پر ہاتھ باندھے میز سے ٹیک لگائے فرصت سے بیڈ پر لیٹے جندل کو دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہوش میں نہیں آیا تھا۔ وجہ دماغ پر لگی گہری چوٹ تھی۔ اسے جو ڈرگز دیے گئے تھے ان کا اثر اب ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے کہا تھا شاید وہ اس پر کوئی تجربہ کر رہے تھے، اور یہی کیا گیا تھا۔ وہ گہری سانس لیتا سر دیوار پر ٹکا گیا۔ جندل کو اب تک ہوش میں آ جانا چاہیے۔ اسے اب مزید انتظار نہیں کروانا چاہیے۔

"شکر خدا کا تم عین وقت پر پہنچ گئے۔ اگر وہ مزید اسے کسی طرح کے ڈرگز دیتے تو اس کے دماغ کو قابو کرنا کوئی مشکل کام نہ ہوتا ان کے لیے۔" ڈاکٹر نے اس کے روبرو کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا ایسا کوئی کیس کبھی سامنے آیا ہے؟" وہ تیوری چڑھائے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل، انہیں مکمل طور پر مدہوش کر کے جب اپنے لوگوں میں بھیجا جائے تو وہ وہی کرتے ہیں جس کے لیے انہیں تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی اپنے ہی ساتھیوں کی جان لینے کو تیار ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر کی بات پر اس نے چہرہ ترچھا کر کے جندل کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں موندے یوں لیٹا تھا جیسے خفا ہو۔ کوئی گہرا راز ہو جسے چھپایا جا رہا ہو۔۔ کوئی غم ہو جسے دبایا گیا ہو۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" اس نے نظریں جندل کے چہرے سے ہٹا کر ڈاکٹر کے چہرے پر ٹکائیں۔ ڈاکٹر نے سر کو جنبش دی۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا باہر آ گیا۔ جب وہ فیکٹری سے نکل رہا تھا تو اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے نمبر دیکھا پھر موبائل کان سے لگایا۔

”کہو۔“

”ابراہم نے ازا کو پکڑنے کے احکام جاری کیے ہیں۔“ دوسری طرف سنجیدگی سے کہا گیا تھا۔اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔ جلدی سے کال کاٹ کر اس نے ازا کا نمبر ملایا۔ نمبر بند ملا۔ اسے اب صحیح معنوں میں پریشانی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے خیام کے نمبر پر ایک پیغام بھیجا اور تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ اگلے لمحات میں وہ اپنی پستول لوڈ کرتا گاڑی کی طرف بھاگ رہا تھا۔

☆☆☆

سعاد کی جب آنکھ کھلی تو زیاد کو غیر حاضر پایا۔ وہ سارا دن اس کا انتظار کرتی رہی مگر وہ غائب رہا تھا۔ رات کو انتظار سے تھک کر وہ کچن میں آئی تھی۔ اپنے کھانے کا بندوبست کر کے جب وہ کام مکمل کر کے پلٹی تھی تو زیاد کو دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ ٹھہر سی گئی تھی۔ وہ جوتے اتار کر سلیپر پہن رہا تھا۔ چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے خالی تھا۔ سعاد کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

”کہاں رہ گئے تھے تم؟ پریشان ہو گئی تھی میں۔ مجھے لگا تم ابھی تک ناراض ہو۔“ وہ معصومیت سے کہتی اس کے قریب آئی تھی۔ زیاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سرد سا تاثر سعاد کو ٹھٹھکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے زیاد؟“ لہجے میں فکر در آئی تھی۔ وہ ہنوز خاموش رہا تھا۔ ”کیا ہوا ہے یار، بولو گے کچھ؟!“ اس کی آواز ذرا سی بلند ہوئی تھی۔ زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر آواز رندھ گئی تھی۔ چہرہ ترچھا کر کے آنسوؤں کو اندر اتارنا چاہا تو وہ نکلنے کو مزید بے تاب ہوئے۔ اس نے بے بسی سے سامنے کھڑی سعاد کو دیکھا جو نگاہوں میں کئی سوال اور بہت سی فکر سموئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بابا۔۔۔ بابا چلے گئے۔ میں ایک بار پھر یتیم ہو گیا۔“ دو آنسو اس کے رخساروں پر بہتے چلے گئے۔ سعاد کی آنکھیں

بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ اب کی بار اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دھیرے سے آگے آیا تھا، اس کے گرد بازوؤں سے حصار قائم کرتے ہوئے اس کے کندھے پر سر رکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سُن کھڑی تھی۔ اپنے کندھے پر اس کے آنسوؤں کی نمی کا احساس ہوا تھا۔ وہ سسک اٹھا تھا، تکلیف بڑھی تھی تو رو دیا تھا۔

"مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے سعاد۔۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے پلک جھپکی تھی۔ نمکین پانی کا ننھا قطرہ رخسار پر لڑھک گیا تھا۔ تو کیا اس رات اسپتال میں وہ معاویہ سے اس کی آخری ملاقات تھی؟ کیا اسے بیٹی کہنے والا شخص، اسے چند لمحوں میں باپ جیسی محبت محسوس کروا کر اسے ان لمحوں کا اسیر کرنے والا شخص اپنی جان کی بازی ہار چکا تھا؟ کیا۔۔ معاویہ تاشفین، اپنے دوستوں سے جا ملا تھا؟ اس نے آنکھیں میچتے ہوئے دھیرے سے زیاد کی پشت پر ہاتھ رکھے تھے۔ "مجھے لگ رہا ہے میں زندگی ہار بیٹھا ہوں۔" اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ وہ اسے تسلی نہیں دے پائی تھی۔ سانس روکے اس کی پشت سہلاتے ہوئے وہ اسے رونے دینا چاہتی تھی۔ وہ یہی تو کہتا تھا، میں صرف تمہارے سامنے رو سکتا ہوں۔ وہ اس سے یہ حق نہیں چھین سکتی تھی، اس کا دکھ بانٹ سکتی تھی۔ کئی پل یونہی گزر گئے تھے۔ اس کے رونے میں کمی آئی تو سعاد نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے فاصلہ قائم کیا۔ وہ سر اٹھائے اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے یقین ہے تمہارے بابا کبھی تمہیں ہارتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔" نرمی سے کہہ کر وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ذرا سا اچک کر اس کے نم بالوں پر اپنے لب رکھ گئی تھی۔

"میں برسوں خود کو یتیم سمجھتا رہا جبکہ وہ زندہ تھے۔ میں۔۔۔ میں ان کا بیٹا تھا، کوئی اپنے بیٹے کے ساتھ ایسے کیسے کر سکتا ہے؟ وہ ایک بار بتاتے تو سہی۔۔۔ ایک بار مجھے مان تو دیتے۔" اور اگر وہ اپنی بات پر سعاد کی حالت دیکھ لیتا تو اس کا رہا سہا مان بھی جاتا۔ وہ کسی مجرم کی طرح نظریں چراتے ہوئے لب سختی سے دانتوں میں دبا گئی تھی۔ "میں

نے ایسی ملاقات نہیں چاہی تھی۔ ان کا خون میں لت پت وجود میری نگاہوں کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا۔ میں۔۔ میں خود کو نہیں سنبھال پا رہا۔" نم آواز میں کہتے ہوئے وہ سر جھکا گیا تھا۔ آنکھیں سختی سے میچیں تو ایک آنسو رخسار پر لڑھک گیا۔ سعاد نے آرام سے اس کا سر اٹھایا تھا۔

"تم بہت بہادر ہو زیاد۔ ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی، ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں دیکھو تم کتنے خوش نصیب ہو، تم نے خود انہیں الوداع کہا ہے۔ یہ آخری ملاقات تمہارے نصیب میں تھی۔" وہ اس کی سرخ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے سمجھا رہی تھی۔

"نہیں آتے ناں۔ سالوں انہیں مردہ سمجھا، خود کو یتیم سمجھا۔ اب بھی نہیں آتے، مجھے اپنا آپ بکھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سالوں پہلے بھی تو اس تکلیف سے گزرا تھا ناں۔۔ انہیں ایک بار کھو دیا تھا، اب دوبارہ کیوں؟" اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"ہو سکتا ہے ناں وہ تمہیں کچھ یاد دلانے آئے ہوں۔ عین ممکن ہے انہیں کوئی قرض اتارنا ہو۔" وہ پرامید نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے ان سے کیا ہر عہد یاد ہے، وہ آتے تو سہی میں جان لگا دیتا ان کے لیے۔"

"ایسے شکوہ مت کرو۔ وہ تمہاری یہ حالت دیکھ لیں تو کیا خود کو قصوروار نہیں ٹھہرائیں گے؟" اس کی بات پر زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ آرام سے اس کے رخساروں سے آنسوؤں کے نشانات مٹانے لگی تھی۔

"میں۔۔۔ میں اسے ایک برا خواب سمجھ کر بھول جانا چاہوں گا۔" وہ آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بھول جانا۔ وقت خود بھلا دے گا زیاد۔ ہر تکلیف کم ہو جاتی ہے، ہر درد مٹ جاتا ہے۔" اس بار اس کی آنکھ سے

لڑھکتے آنسو کو اس نے اس کے رخسار پر گرنے سے پہلے ہی اپنی انگشت شہادت کے پور پر چن لیا تھا۔ ''اب مت رونا۔ تمہیں ان کے لیے دعا کرنی ہے اور ان کا باقی رہ جانے والا کام مکمل کرنا ہے۔ کیا سمجھے؟'' وہ سمجھداری سے کہہ رہی تھی۔ وہ چند پل چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر زکام زدہ سی سانس لے کر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

''خیام بھی وہیں تھا۔'' اس کی بات پر سعاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''وہ بابا سے ملا تھا۔۔ وہ جانتا تھا بابا زندہ ہیں۔''

''تم نے اسے کچھ نہیں کہا ناں؟'' اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ زیاد نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی، وہ اپنے غصے کو روک نہیں پایا تھا۔

''کیا کرتے ہو زیاد؟ تم آخر خیام کو۔۔۔۔''

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' زیاد نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ خیام کے متعلق کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔

''تم چینج کرلو۔ میں۔۔ چائے بناتی ہوں۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ رہی تھی۔ زیاد نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ چہرہ ترچھا کیے اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

ازا موبائل کی اسکرین پر نظریں ٹکائے پارکنگ ایریا میں آئی تھی۔ بارش درمیان میں کچھ گھنٹوں کے لیے رکی تھی مگر شام سے دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ موبائل برابر میں سیٹ پر ہینڈ بیگ کے ساتھ پھینکا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ جس وقت اس کی گاڑی پارکنگ ایریا سے نکل رہی تھی اس وقت سیاہ رنگ کی جیپ بھی اس کے تعاقب میں لگ چکی تھی۔ اس نے بیک ویو مرر میں اس جیپ کو دیکھا اور رفتار بڑھا دی۔ وہ صبح خیام کے پیغام پر سب چھوڑ کر چلی گئی تھی، اور واپس وہیں آئی تھی۔ اس نے معمول کے

مطابق اپنے کام نمٹائے تھے۔ آفس جا کر آج کا شو بھی کیا تھا۔ کل کے شو کے لیے مواد بھی اکٹھا کیا تھا۔ اور اب جب وہ رات کے دس بجے گھر واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھی تھی تو اپنا وجود بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

کیا اس کی جان اتنی قیمتی تھی کہ وہ اس جان کی خاطر اپنے باپ کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے پاس صرف چند لمحات گزارنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا؟ حتیٰ کہ۔۔ وہ اپنے باپ کو باپ ماننے سے انکار کر کے آئی تھی۔ تھی تو وہ بھی پھر معاویہ کی بیٹی۔۔ اسی کی طرح سخت، اسی کی طرح ظالم!

اس نے آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلا اور بیک ویو مرر میں اپنے تعاقب میں دوڑتی جیپ کو دیکھا جس کی رفتار دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ اس نے لب دانتوں میں دبائے اور گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے تیزی سے موڑ کاٹا تھا۔ گاڑی خاک اڑاتی آگے بڑھی تھی۔ جیپ کی رفتار بھی بڑھی تھی۔ تیزی سے آگے پیچھے بھاگتی گاڑیاں سڑک پر ہنگامہ برپا کر رہی تھیں۔ رات کے اس پہر تاریکی میں سنسان سڑکوں پر وہ خوف کو پیچھے دھکیلتی گاڑی کی رفتار بڑھا رہی تھی۔ عین اسی وقت جب اس نے دوسرا موڑ کاٹا تھا تو سامنے سے اسی کی گاڑی جیسے دوسری گاڑی آتی دکھائی دی تھی۔ وہ گاڑی بالکل اس کے پاس سے گزری، گاڑی کا شیشہ نیچے ہوا۔ سفید رومال والے لڑکے نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ اس لڑکے نے گاڑی مخالف راستے پر ڈالی، جیپ اس کے پیچھے چلی گئی۔ چند لمحوں کا کھیل تھا اور وہ خود کو محفوظ محسوس کرتی گاڑی کی رفتار ہلکی کرتی سیٹ پر سر ٹکا گئی تھی۔

بارش کی بوچھاڑ میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے گھر کی طرف جانے والے راستے کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ لڑکا جلد واپس آنے والا تھا، اسے یقین تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہی گاڑی اس کے عقب سے نمودار ہوئی تھی۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس نے گاڑی سڑک کنارے کھڑی کر دی۔ وہ لڑکا بھی اپنی گاڑی ایک طرف روک چکا تھا۔ وہ گاڑی سے نہیں نکلی۔ وہ لڑکا اس کی طرف آیا۔ دائیں ہاتھ میں چھاتہ لیے ذرا

سا جھکتے ہوئے بائیں ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ اس کے چھاتے کے سائے تلے گاڑی سے اتری تھی۔ اس لڑکے نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تھا۔ چہرہ ترچھا کر کے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑی تھیں۔ نگاہیں ملتے ہی وہ بری طرح چونکی تھی۔ یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جنہیں دیکھنے کی وہ عادی تھی۔ یہ وہ لڑکا نہیں تھا یہ تو۔۔۔

”آپ کا کچھ وقت لے سکتا ہوں۔۔۔مادام؟“ آواز بھاری تھی۔ دھیرے سے اس نے اپنے چہرے پر موجود رومال ہٹایا تھا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ازا کو آسمان پوری قوت سے اپنے سر پر برستا محسوس ہوا تھا۔ بارش کی تیز بوچھاڑ کا شور بڑھ گیا تھا۔ پانی کی دیواریں ان کے گرد قائم ہوئیں۔ اس نے سانس روک لیا تھا۔

”تم۔۔۔“ وہ کچھ کہہ نہیں پائی۔ الفاظ دم توڑ گئے۔ خیام آنکھوں میں دلچسپی لیے ذرا سا اس کی طرف جھکا۔

”سنا تھا مادام اپنے آشناؤں کو ”تم“ کہہ کر مخاطب کرنے کا شرف بخشتی ہیں۔“ اس کے معنی خیزی سے کہنے پر ازا کا چہرہ ایک لمحے میں سرخ پڑ گیا تھا۔ تیوری چڑھا کر اس نے سامنے کھڑے خیام کو دیکھا تھا پھر اس کے ہاتھ سے چھاتہ چھپٹا تھا۔ ایک لمحہ لگا تھا اور چھاتہ ہٹتے ہی وہ کھلے آسمان تلے بارش میں بھیگ گیا تھا۔ بارش کی بوندیں آنکھوں پر پڑیں تو اس کے لیے ازا کا چہرہ دیکھنا محال ہو گیا۔ دائیں ہاتھ سے پیشانی پر ہاتھ سے چھپر بنائے اس نے ازا کو دیکھا جو اسے گھورنے میں مصروف تھی۔

”یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیوں آئے ہو میرے پیچھے؟“ وہ غصہ کر رہی تھی۔

”آپ کے بابا کی کمپنی کا مینیجر ہوں، مستقبل کی باس ہیں آپ میری۔ آپ کو خطرے میں دیکھ کر کیسے نہ آتا؟“ بارش کے شور کی وجہ سے اسے اپنی آواز تھوڑی بلند کرنا پڑی تھی۔

”ایک بار مجھے تمہاری باس بننے دو، یقین جانو سب سے پہلے تم سے استعفیٰ لکھواوں گی۔“ وہ اس کی بات پر بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا پایا تھا۔

”خدا سے دعا ہے آپ کا یہ شوق جلد پورا ہو۔ اب چلیں؟ آپ کو آپ کے کزن کے گھر چھوڑ دوں۔ یہ لوگ آپ کو آپ کے گھر نہیں جانے دیں گے۔“ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ازا نے دانت کچکچائے تھے۔

”دیکھو سامنے رہی سوسائٹی۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ منہ بسور کر کہتی اس کی بات سنے بنا آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ بارش میں بھیگتا اس کی تقلید میں قدم بڑھانے لگا تھا۔ ہلکے بھورے بال بھیگ کر پیشانی پر گر گئے تھے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے چہرہ سفید پڑنے لگا تھا۔ وہ اس کی پروا کیے بنا قدم اٹھاتی رہی تھی۔ گویا اسے اپنے پیچھے آنے دینا چاہتی تھی، اس نے اپنا کچھ وقت اسے دینے کے لیے ہامی بھر لی تھی۔

”خفا کیوں ہیں مادام؟“ بارش کی بوچھاڑ کی وجہ سے اسے اپنی آواز تھوڑی بلند کرنا پڑی تھی۔ دونوں گاڑیاں پسِ منظر میں جا رہی تھیں۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

”آپ کے اور میرے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جس کی بنا پر میں آپ سے خفا ہوؤں۔“ وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔ اس کے لب خود بخود مسکراہٹ میں ڈھل گئے تھے۔

”پھر یہ دوڑ کیوں لگوا رہی ہیں؟ بس کچھ وقت ہی تو مانگا ہے۔“ اس کی رفتار قدرے سست تھی مگر باوجود اس کے وہ اس سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ اسے معتبر بنا رہا تھا۔

”آپ کسی کو بھی میرا باپ بنا کر میرے سامنے کھڑا کر دیں گے اور پھر مجھ سے بہتر کی توقع کرتے ہیں؟“ بولتے ہوئے جانے کیوں اس کی آواز کمزور پڑ گئی تھی۔

”ازا۔۔ کیا تم سب بھول چکی ہو؟ کیا واقعی تمہیں کچھ یاد نہیں؟!“ اس کی آواز بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ میں اسے رک کر اسے سننا پڑا تھا۔

”کیا میرے ماضی میں کچھ ایسا تھا خیام جسے یاد رکھا جانا چاہیے تھا؟“ وہ رک گئی تھی لیکن پلٹی نہیں تھی۔ وہ بھی اس

سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ مکمل بارش کی زد میں آیا وہ بے بسی سے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ ازا کو اس کی موجودگی پر شک ہوا تھا۔ اس نے پلٹنا چاہا تھا جب وہ بول اٹھا تھا۔

"مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" وہ تیزی سے پلٹی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ میں موجود چھاتے کی زد میں آیا تھا۔ ٹھنڈ سے سفید پڑتا چہرہ لیے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ وہ بے اختیار اسے دیکھے گئی۔

"کیا تم سچ میں سب بھول چکی ہو؟ یا بس سب کچھ نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟ ازا۔۔ کیا واقعی تمہیں کچھ یاد نہیں؟" وہ اپنا سوال دہرا رہا تھا۔ وہ چند پل جواب نہیں دے سکی تھی۔ چوری پکڑے جانے کا خطرہ تھا، آنکھوں سے جھانکتی سچائی کے پڑھے جانے کا خطرہ تھا۔

"تم صرف بابا کی کمپنی کے مینیجر ہو اور۔۔۔"

"مجھ پر یقین ہے؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا گیا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ ہاتھ شل پڑنے لگے۔ نچلا لب دانتوں تلے کچلا گیا۔ خیام نے ہاتھ بڑھا کر چھاتہ تھام لیا۔ "کیا آج بھی جواب نفی میں دو گی؟" سوال دہرایا گیا۔ وہ آنکھیں میچتے ہوئے بے اختیار سر اثبات میں ہلا گئی۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ اس کی حرکت پر آنکھوں میں ستائش ابھری تھی۔

"مجھے تم پر یقین نہیں ہے۔ تم ایسے ہی میری اب تک کی زندگی کو سراب نہیں کہہ سکتے۔" اس نے ہاتھوں کی کپکپاہٹ چھپانے کے لیے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے تھے۔

"تو اب تک برداشت کیوں کر رہی ہو؟ کھینچ کر تھپڑ کیوں نہیں مارا؟" وہ آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم واقعی یہ چاہتے ہو؟"

"تم واقعی یہ کر دو گی؟" لفظوں کی مات ہوئی۔ وہ لب دانتوں میں دباتی نظروں کا رخ بدل گئی۔

”سوچ سمجھ کر بولا کرو خیام! ہر بار تمہاری الٹی سیدھی باتوں کا یقین نہیں کروں گی۔ ٹھوس ثبوت کے ساتھ بات کیا کرو، ورنہ تمہاری باتیں اثر کھو دیں گی۔“ اسی کے الفاظ اسی کو لوٹائے گئے۔ خیام کی آنکھوں میں کرب ابھرا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ دل میں خواہش جاگی تھی یہ وقت یہیں تھم جائے۔ بارش کی بوچھاڑ جاری رہی۔ وہ یونہی اس کے لیے چھاتہ تھامے اسے تکتا رہے۔ مگر خواہشیں کب پوری ہوتی ہیں۔ اس نے کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا پھر خیام کو۔ وہ اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ سر جھٹک کر گہری سانس لی۔

”آؤ، چھوڑ دوں۔“ اس نے قدم بڑھا دیے۔ وہ اس کے پیچھے اس پر چھاتہ تانے قدم اٹھانے لگا۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ وہ زیاد کے اپارٹمنٹ کے قریب ہو رہے تھے۔ خیام چاہ کر بھی راستے کو طول نہیں دے پایا تھا۔

”ابراہم وارلڈ تمہارا دشمن ہے!“ اس کے کہنے پر ازا سختی سے مٹھیاں بھینچ گئی تھی۔

”خیام تم سوچ سمجھ کر بولو ورنہ میرا ہاتھ۔۔۔“

”تم جانتی ہو، تم اسی لیے گھر نہیں جا رہیں۔ تمہیں اس سے زیادہ زیاد پر یقین ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے ازا؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ وہ سرخ آنکھیں لیے پلٹی تھی۔ لب سختی سے بھینچے اسے دیکھا تھا۔ ”مجھ پر یقین نہیں ہے مگر میرے کہنے پر ہر بار اپنا راستہ بدل لیتی ہو۔ ابراہم پر یقین ہے مگر اس کے کہنے کے باوجود مارک کو مجرم قرار دیتی ہو۔ اتنی مشکوک حرکتیں کیوں کر رہی ہو؟“ وہ سنجیدہ تھا، بالکل سنجیدہ۔ اس نے راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے گھنٹی پر ہاتھ رکھنا چاہا تھا مگر وہ تیزی سے اس کی کلائی پکڑ چکا تھا۔ ”جواب دے دو، پھر چلی جانا۔“ وہ لب دانتوں میں دبا گئی۔

”مسٹر خیام حنفی! اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کی بات پر یقین کر لوں گی تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ میں۔۔“

”تم کس کے انتظار میں تھیں ازا؟ میرے ایک اشارے پر یوٹرن کیوں لیا؟“ ایک اور سوال۔ وہ بے بسی سے اسے

دیکھ کر رہ گئی۔ اپنی کلائی پر اس کی سخت گرفت محسوس کر کے کلائی چھڑوانا چاہی مگر ناکام رہی۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

"میں بابا کو بتاؤں گی تم۔۔"

"میں اپنے ہر سوال کا جواب لے کر رہوں گا!" آرام سے اس کی کلائی پر گرفت ہلکی کر دی۔ اس نے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑوائی۔ سانس روکے اسے دیکھا اور تیزی سے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھا گیا۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ، آنکھوں میں ابھرتا چوری پکڑے جانے کا خوف، سرخ پڑتا چہرہ اور دانتوں تلے کچلا گیا لب۔۔ وہ گہری سانس لے کر نگاہوں کا رخ موڑ گیا۔ دروازہ کھل گیا۔ خیام نے نگاہ اٹھائی تو سانس روکنا پڑا تھا۔ سامنے کھڑے زیاد نے پہلے بارش میں بھیگے خیام کو دیکھا پھر ازا کو۔ چہرہ ایکدم سپاٹ ہو گیا تھا۔ ازا نے پلٹ کر ایک نگاہ خیام پر ڈالی۔ نگاہیں ملیں اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ زیاد نے بے تاثر نگاہوں سے خیام کو دیکھا۔ پھر دروازہ بند کر دیا۔ اس نے پلک جھپکی تھی۔ ہاتھ پہلو میں جا گرا۔ وہ ایک بار پھر بارش کی زد میں آ گیا تھا۔ اس بار۔۔ یہ بارش دل پر بھی ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

بارش کو رکے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ پٹرول سے بھرا ایک ٹینکر گلی کے سرے سے نمودار ہوا۔ رات کی تاریکی میں ٹینکر کی ہیڈ لائٹس نے گلی کو روشن کیا۔ خاموشی میں انجن کے چلنے کی آواز نے لغزش پیدا کی۔ ٹینکر اس چھوٹے سے گھر کے دروازے پر رکا۔ دو آدمی باہر نکل آئے۔ مکمل سیاہ لباس میں موجود، سینوں پر ڈی ڈبلیو کا بیج لگائے وہ وائرلیس پر پیغام ملنے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش میں دھلا آسمان تاروں سے صاف تھا۔ گلی کے کناروں پر پانی جمع ہو چکا تھا۔ سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ہوا میں بھی ہلکی سی نمی تھی۔ ہر سو گہری خاموشی کا راج تھا۔

چندپل خاموشی سے گزر گئے۔ وائرلیس پر پیغام موصول ہوا۔ ان دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا۔ ایک آدمی ٹینکر کی طرف آیا۔ پیچھے کی طرف لگے پہیے کو گھمایا۔ ٹینکر میں موجود پیٹرول قطرہ قطرہ گرنے لگا۔ وہ دونوں چندپل یہ تماشا دیکھتے رہے۔ تسلی کر کے دونوں پلٹے اور اپنے قدم بڑھا دیے۔ پٹرول قطرہ قطرہ بہتا رہا۔ ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دیتی رہی۔ کچھ لمحے گزرے۔ وہ دونوں گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے۔ ایک شخص نے اپنی جیب سے لائٹر نکالا۔ آگ کا ننھا سا شعلہ بھڑکا۔ اس کا ماسک سے ڈھکا چہرہ روشن ہوا۔ اگلے ہی لمحے اس نے پوری قوت سے لائٹر اچھال دیا۔ لائٹر ٹینکر سے ٹکرایا۔ ایک لمحے میں آگ بلند ہوئی۔ شعلے بھڑک گئے تھے۔ پوری گلی روشن ہو گئی تھی۔ آگ کے بلند شعلے آسمان کو چھوتے محسوس ہوئے تھے۔ چیخیں بلند ہوئیں، آہ و بکا شروع ہوئی۔ لوگ بھاگنے لگے۔ وہ چھوٹا سا گھر۔۔۔ دھیرے دھیرے آگ کی نذر ہوتا گیا۔ اور اگر ذرا غور سے سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا جاتا تو ایک چھوٹا سا خرگوش۔۔ سفید رنگ کا۔۔ معصوم خرگوش۔۔ گم سم سا اپنے گھر کو لپیٹ میں لیتی آگ کو تک رہا تھا۔ آنے والے وقت سے بے خبر۔۔ گم سم اور سہما ہوا خرگوش۔

☆☆☆

”جندل کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے ہوش میں نہیں آیا ہے۔ ہمیں ڈر ہے اس کے دماغ پر آئی چوٹ کسی گہرے صدمے کا سبب بن سکتی ہے۔“ پیغام پڑھتے ہی اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے پیغام کو دیکھا۔ دل سے بے اختیار صدا نکلی تھی۔ اس نے فریاد کی تھی، الٰہی بھائیوں جیسے دوست کے غم سے دوچار مت کرنا۔ دل اس قدر تیزی سے دھڑکا کہ اسے سانس روکنا پڑا تھا۔ لب دانتوں سے کچلتے ہوئے اس نے آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلا تھا۔

اگلے لمحات میں وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا فیکٹری کی طرف رواں دواں تھا۔ آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ دھڑکنیں

منتشر ہو رہی تھیں۔ وہ اسے عزیز تھا، بے حد عزیز۔ ہر کڑے سے کڑے وقت میں جندل اس کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا، شانہ بشانہ برابر برابر۔ وہ اس کا دایاں بازو تھا، جان بستی تھی اس میں۔ اسے کھونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے نمکین پانی کا ایک قطرہ اپنے رخسار پر لڑھکتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے جیکٹ کے بازو سے اپنی آنکھوں کو رگڑا تھا۔ توجہ سڑک پر مرکوز کی تھی۔ کچھ پل خاموشی سے گزر گئے۔ گاڑی سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ اسی اثناء میں اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے نمبر دیکھا پھر کال اٹھالی۔

”کہو مصعب۔“ آواز بھاری ہو گئی تھی۔

”میں نے جندل سے کہا تھا روفی کو لے آئے مگر وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے غائب ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں چلا جاؤں روفی کو لینے؟ مجھے یاد آرہا ہے وہ۔“ وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ بدر نے کال کاٹ دی۔ اس نے گہری سانس لے کر سر سیٹ پر ٹکا دیا۔ ذہن میں اچانک کوئی خیال آیا۔ اس نے جھٹکے سے گاڑی روکی تھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے دیکھا تھا۔ ابراہم نے جندل کو مارنے کی کوشش کے ناکام جانے کے بعد اسے اغوا کرنا چاہا تھا، وہ اس میں بھی ناکام ٹھہرا تھا۔ اس نے ازا کو استعمال کرنا چاہا مگر یہاں بھی مات ملی۔ اگر وہی دلال تھا تو غالب امکان تھا وہ اپنی پرانی چال چلے گا۔ وہ ان کے گھروں تک پہنچے گا، وہ آگ کا کھیل کھیلے گا جیسے اس نے پہلے کیا تھا۔ اس بار اس کھیل کی زد میں بدر اور جندل، سعاد اور زیاد کا گھر آئے گا۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی سے موبائل اٹھا کر بدر کا نمبر ملا۔ بیل جاتی رہی، بدر نے کال نہیں اٹھائی۔ اس نے جلدی سے یوٹرن لیا تھا۔ اس کی گاڑی اب پوری رفتار سے واپسی کے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ اسے جندل اور بدر کے گھر جانا تھا۔۔ جہاں بدر جا چکا تھا۔۔

بہت تیز رفتار میں ڈرائیونگ کر کے وہ اگلے دس منٹ میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ اسے اپنی گاڑی گلی کے باہر روکنا پڑی تھی۔ لوگوں کا جمِ غفیر گلی کے باہر موجود تھا۔ آہ وبکا تھی، فریادیں تھیں۔ دائیں بائیں مکانوں سے سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ آگ کے شعلے اب کافی حد تک ٹھنڈے پڑ چکے تھے مگر ایک دو گھر ابھی تک اس بھڑکتی آگ کی زد میں تھے۔ فائر بریگیڈ یئر کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہر ممکن کوشش جاری تھی۔ وہ تیزی سے گاڑی سے نکلا تھا۔ اگلے لمحات میں اس نے خود کو بھاگتے ہوئے پایا تھا۔ ہجوم کو چیرتا۔۔ خون کی چھوٹی سی ندی کو پار کرتا۔۔ منتشر ہوتی دھڑکنیں اور بگڑتے ہوئے تنفس کے ساتھ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے کئی لوگوں سے ٹکرایا۔ کئی زخمیوں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ خون کے چھینٹے اس کے چہرے اور ہاتھوں پر پڑے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز آگے بڑھتا گیا۔ اس کی تلاش ختم ہوئی۔ اس نے دیکھا تھا۔۔ اس کا بھائی۔۔ مصعب الزرقاوی ہجوم سے تنہا کھڑا، پھٹی پھٹی نگاہوں سے آگ کی نذر ہوتے اپنے آشیانے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

بدر کے قدم اٹھے تھے۔ وہ آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلتا آگے بڑھا تھا۔ آگ کا شعلہ بھڑکا تھا۔ کسی نے پیچھے سے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا۔

”روفی!!“ وہ چلا اٹھا تھا۔ اپنا آپ خیام کی گرفت سے چھڑوانا چاہا تھا۔ آگ کے شعلوں کی روشنی میں اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو چمک اٹھے تھے۔ چلانے کی وجہ سے گردن کی رگیں ابھرنے لگی تھیں۔ چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ وہ خیام کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ایک بار پھر چلایا تھا۔ ”روفی!!“ اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ خیام نے تیزی سے اس کے آگے آکر اسے خود میں بھینچا تھا۔

”بھائی روفی۔۔۔ بھائی وہ مر جائے گا۔۔ اسے بچالیں بھائی۔۔“ وہ تڑپ اٹھا تھا۔ خیام کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ اس

کی آنکھوں سے آنسو زاروقطار بہنے لگے۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں نے اس کے لیے سانس لینا محال کیا تھا۔

"بھائی روفی مر جائے گا۔۔ اسے نکالیں۔۔ وہ مر جائے گا۔۔ وہ معصوم مر جائے گا بھائی۔۔" وہ رو دیا تھا۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا تھا۔ خیام کو اپنا چہرہ بھیگتا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں سے آنسو گرم سیال کی طرح بہنے لگے تھے۔ بدر کا بلکنا، تڑپنا اسے تکلیف میں مبتلا کر گیا تھا۔ کاش کاش۔۔ وہ یہ سب ہونے سے روک پاتا۔ کاش۔۔ وہ اپنے بھائی کو اس تکلیف سے نہ گزرنے دیتا۔ آگ کا یہ کھیل، مزید کتنی زندگیاں تباہ کرنے والا تھا؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ آگ۔۔ خالقِ کائنات کی سزا ہے۔ زمین پر خدا بن کر بیٹھنے والے آخر کب تک اپنی خدائی کا ڈھونگ رچائیں گے؟ کیا وہ بھول گئے ہیں خدا کی لاٹھی حرکت میں آئے تو ہر تخت الٹ دیا جاتا ہے۔ ہر بادشاہ ذلیل ہوتا ہے، ہر ظالم منہ کے بل گرتا ہے۔ مگر اس لاٹھی کے حرکت میں آنے تک۔۔۔ ظالموں کی رسی ڈھیلی رہتی ہے۔ مظلوم قدموں تلے روند دیے جاتے ہیں، بری طرح کچلے جاتے ہیں۔

☆☆☆

سعاد نے کافی کے کپ ان دونوں کے سامنے میز پر رکھے۔ ٹھہر کر ایک نگاہ دونوں پر ڈالی جو گفت وشنید میں مصروف تھے، پھر پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کوئی تمہارا تعاقب کر رہا تھا، خیام عین موقع پر ظاہر ہوا اور تمہیں یہاں چھوڑ گیا۔ اپنے گھر کیوں نہیں گئیں؟" اس کے لہجے میں خیام کے ذکر پر طنز کا شائبہ ان دونوں نے محسوس کیا تھا۔

"بابا آج کل مصروف ہیں۔ میں ان سے اس سلسلے میں بات نہیں کر پا رہی۔۔"

"اور میں اتنا بے وقوف ہوں کہ اس بات پر یقین کر لوں گا؟" اس کے عجلت میں کہنے پر ازابے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں جل بھن کر بیٹھے ہو؟“ وہ تپ گئی تھی۔

”تم خیام کے کہنے پر وہاں کیوں آئیں؟! تم جانتی ہو وہ مجھے نہیں پسند!“ اس نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ پہلی بار ازا کو اس کی بات سے سچائی جھلکتی محسوس ہوئی تھی۔ شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑی سعاد نے دانت پیستے ہوئے اسے گھورا تھا۔ ان دونوں کا تھائی میں بات کرنا اسے حد سے زیادہ برا لگ رہا تھا۔ ان کی کوئی بات وہ سمجھ تو نہیں پا رہی تھی البتہ خیام کے نام پر زیاد کے چہرے کے بگڑتے تاثرات سے اسے کچھ کچھ اندازہ تھا وہ کیا بات کر رہے تھے۔ اور یہی چیز اسے طیش دلا رہی تھی۔

”اچھا، پھر تم وہاں کیا کر رہے تھے؟ اور وہ اس شخص کو تمہارا باپ کیوں کہہ رہا تھا؟“ وہ بھی اب میدان میں آئی تھی۔

”بہت سی باتیں ہیں جن سے تم آگاہ نہیں ہو۔ میری بات سنو ازا! اس خیام کو اتنی توجہ مت دیا کرو۔ مجھے بہت برا لگتا ہے وہ۔“ اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ سعاد کا دل کیا تھا وہ پاس رکھا سیب اٹھا کر اس کے سر میں دے مارے۔ ازا اسے گھوری سے نواز کر کافی کا کپ لبوں سے لگا گئی۔ وہ پیچ و تاب کھا کر سر جھٹک کر رہ گیا۔ عجیب صورتحال تھی۔ دونوں سچ سے واقف تھے مگر ایک دوسرے کو انجان رکھنا چاہتے تھے۔

”کافی اچھی بنائی ہے۔“ گرم کافی حلق میں اتار کر اس نے ستائشی نظروں سے سعاد کو دیکھا۔ یہ پہلی بار تھا اس نے سعاد پر توجہ دی تھی۔ سعاد نے چونک کر کم فہمی سے اسے دیکھا۔ زیاد کی نگاہ سعاد پر ٹکی۔ وہ بے اختیار لب دانتوں میں دبا گیا۔

”ازا کہہ رہی ہے کافی اچھی نہیں بناتیں تم۔“ اس نے ترجمہ کیا تھا۔ ازا اس کے ترجمے پر مسکراہٹ دبا کر سر جھکا گئی۔ سعاد نے ایک نگاہ ازا پر ڈالی پھر سر کو جنبش دی۔ لب سختی سے بھینچے اس نے بمشکل خود کو کچھ سخت کہنے

سے روکا تھا۔

"تم ہمیں لڑوادو گے۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا ہے اسے میرا یہاں آنا بالکل اچھا نہیں لگا!" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ازا۔۔۔ سعاد بیوی ہے میری۔" اس نے اطلاع دی تھی۔ ازا کی نگاہیں بے اختیار سعاد پر ٹکی تھیں جو اب سیب کو دانتوں سے کاٹنے میں مصروف تھی۔ وہ یقیناً غصے میں تھی۔ زکام کی وجہ سے ناک کے ساتھ ساتھ رخسار بھی لال پڑ رہے تھے۔ وہ بے اختیار ہلکا سا ہنسی تھی۔ زیاد نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"اچھا لگا تمہاری بیوی سے مل کر۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ زیاد نے بے اختیار سکون کی سانس خارج کی تھی۔ صد شکر اس نے معاملے کو زیادہ کریدا نہیں تھا۔

"کیا وہ غصے کی تیز ہے؟" وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ازا کا کہنا ہے تمہارا سرخ پڑتا چہرہ کسی لال مرچ کی مانند لگ رہا ہے۔" وہ ترجمان بنا تھا۔ ازا اپنی ہنسی روکنے کے لیے کپ لبوں سے لگا گئی۔ سعاد نے سیب میں دانت گاڑے تھے۔

"مت کرو یار۔ تم نکلواؤ گے مجھے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ازا بہت صاف گو ہے۔ اسے لگ رہا ہے تم اس کی باتوں کا برا منا رہی ہو۔ ایسا نہیں ہے ناں سینیورا؟" تائیدی نظروں سے اسے دیکھا گیا۔ یہیں سعاد کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں اپنا سامان سمیٹ کر واپس گھر چلی جاؤں تو انسانوں کی طرح کہہ دو۔ مجھے غصہ دلانے کی کوشش مت کرو کیونکہ ایک بات تمہیں بتادوں! یہاں صرف دو کمرے ہیں۔ میرے غصے کی صورت میں عین ممکن ہے تمہیں آج رات لاؤنج میں گزارنی پڑے۔" دھمکی خاصی بھاری تھی۔ ازا کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔

زیاد مسکراہٹ دباتا چہرہ موڑ گیا۔ سعاد نے چونک کر ازا کو دیکھا۔ اسے پہلی بار کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

”دیکھ لو، لاؤنج میں قلفی جمنے والی ہے تمہاری۔“ ہنستے ہوئے کہا گیا۔

”تم غصے میں واقعی لال مرچ جیسی لگ رہی ہو۔ ازا تمہیں آئینہ دیکھنے کا مشورہ دے رہی ہے۔“ وہ ڈھیٹ تھا، مہا ڈھیٹ تھا۔

”میں اس ازا کے ساتھ ساتھ تمہارا بھی سر پھاڑ دوں گی!!“ وہ غرائی تھی۔

”اب معاملات تم سنبھالو اور اپنے لیے کسی ڈھال کا بندوبست کر لینا۔“ مسکراتی نگاہ ان دونوں پر ڈال کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ زیاد کافی کے کپ اٹھا کر کچن میں آیا تھا۔ کپ سینک میں رکھ کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے اس کے برابر میں شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا۔

”کافی بہت اچھی بناتی ہو تم۔“ اس کی تعریف کی گئی۔ اپنی ڈھال کا بندوبست کیا گیا۔

”میری بلا سے۔۔ آئندہ اپنی بہن سے کہنا بنا دے گی۔“ وہ تپ گئی تھی۔

”بہنوں سے کون کام کرواتا ہے بھلا؟“ وہ شریر ہوا تھا۔ سعاد نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”میں۔۔ میں۔۔ تمہاری بیوی بھی کسی کی بہن ہے!!“ وہ حیران تھی، بے حد حیران۔ وہ اس کے تاثرات پر بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا پایا تھا۔

”میری تو بیوی ہے ناں۔۔“ لاڈ سے کہا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ سر جھٹک کر ہاتھ میں موجود سیب شیلف پر رکھا پھر اس کے روبرو کھڑی ہوئی۔ سنجیدگی سے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔

”زیاد۔ ازا کو بتا دو تم اس کے بھائی ہو۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ ”میں جانتی ہوں کیسا محسوس ہوتا ہے جب کسی سے آپ کا خون کا رشتہ ہو، وہ انسان نگاہوں کے سامنے ہو مگر آپ چاہ کر بھی اسے

گلے نہ لگا پائیں۔ آپ چاہ کر بھی۔۔۔ اس سے اس رشتے کے مطابق نہ مل پائیں۔ وہ بہن ہو تو آپ اس کے ساتھ کسی بھائی کی طرح نہ کھڑے ہو پائیں اور بھائی ہو تو۔۔ تو کبھی اس کے تحفظ کو محسوس نہ کر پائیں۔" چشمے کے پار اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ "خود کو مزید تکلیف مت دو۔ اسے بتا دو۔۔۔ میں نہیں چاہتی تم اپنی بہن کو دوبارہ کھو دو۔" اس نے التجا کی تھی۔ وہ سر کو جنبش دیتا نظریں جھکا گیا تھا۔

"کیا بتاؤں اسے؟ کہ میں، اس کا بھائی اپنا عہد نہیں نبھا پایا؟ میں آج تک اسے صرف اپنے مقصد کی خاطر استعمال کرتا آیا؟ سعاد۔۔ اگر وہ مجھ سے خفا ہو گئی؟ اگر اسے مجھ سے نفرت ہونے لگی؟ میں نے اسے بس استعمال کیا، یہ جان کر وہ ٹوٹ نہیں جائے گی؟" اس کی آواز کمزور پڑ گئی تھی۔

"اسے بس یہ بتاؤ۔۔ تم اس کے بھائی ہو۔ تم سمجھ جاؤ گے بہنیں اپنے بھائیوں کے معاملے میں بہت کمزور ہوتی ہیں۔" ایک آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر گرا تھا۔

"کتنی کمزور ہوتی ہیں؟"

"کہ انہیں بنا کسی شکوے کے معاف کرنے کو تیار ہوتی ہیں۔۔ اتنی کہ۔۔۔ انہیں اپنے سامنے دیکھ کر خود پر گزرا مشکل وقت بھول جاتی ہیں۔ انہیں بس اپنے بھائی چاہیے ہوتے ہیں۔۔ محافظ بھائی!" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ زیاد ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ وہ بھی تو ایک بہن تھی، تبھی با آسانی بہنوں کے جذبات کی ترجمان بن گئی تھی۔ وہ زکام زدہ سی سانس لیتا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

سرمئی رنگ کی چین میں اٹکا چھوٹا سا لاکٹ۔۔ بدر اور روفی کا "ر"۔۔ سیاہی میں لپٹا روفی کا لاکٹ۔۔ وہ چپ چاپ بنا پلک جھپکے اس لاکٹ کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے کرسی پر آگے ہو کر بیٹھا وہ پچھلے کئی لمحات سے

یونہی خاموش تھا۔ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ خیام بیڈ پر لیٹے جندل کے پاس کھڑا تھا۔ گاہے بگاہے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیتا جس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

یہ لاکٹ اس نے روفی کو اس کی سالگرہ پر دیا تھا۔ روفی کی سالگرہ۔۔ یعنی وہ دن جب وہ بدر سے ملا تھا۔ چھوٹا سفید رنگ کا معصوم خرگوش جسے اس نے تھائلینڈ آنے کے بعد دن رات محنت کر کے اپنی پہلی کمائی سے خریدا تھا۔ اس نے کرائے کے پیسے روفی پر خرچ کر دیے گئے تھے۔ وہ اس سرد رات کو کبھی نہیں بھولا تھا جب اس ظالم شخص نے اسے روفی سمیت گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ بھوکا تھا۔۔ بالکل روفی کی طرح۔ اپنوں سے دور تھا روفی کی طرح۔۔ رونا چاہتا تھا اور وہ رویا تھا۔۔ روفی سے لپٹ کر۔۔ اپنی بے بسی پر وہ اس رات جی بھر کر رویا تھا۔ وہ خرگوش نہیں تھا ناں۔۔ وہ اس کا دوست تھا، اس کی جان تھا۔ وہ کیسے مر سکتا تھا؟ وہ۔۔ آگ کی نذر کیسے ہو سکتا تھا؟!

آنسو کا ایک قطرہ آنکھ سے پھسل کر ناک کی ہڈی سے لڑھکتا اس کے گال پر گرتا چلا گیا۔ اس نے زکام زدہ سی سانس خارج کر کے سر جھٹکا تھا۔ خیام ایک نگاہ اس پر ڈال کر گہری سانس لیتا کرسی کھینچ کر اس کے روبرو بیٹھا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے وہ لاکٹ لیا تھا۔ روفی تو جانور تھا، وہ لوگ انسانوں کو بچانے آئے تھے۔ کئی لوگوں کو عین وقت پر حفاظت سے ان کے گھروں سے نکال لیا تھا۔ روفی کی طرف کسی کا دھیان کیوں جاتا؟ کسی جانور کی زندگی انسانی زندگی سے زیادہ تو قیمتی نہیں ہے ناں؟ روفی کی تلاش میں۔۔ اسے جو واحد چیز ملی وہ یہ لاکٹ تھا۔ بس لاکٹ۔

"روفی میرا واحد دوست تھا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "آپ کے لیے بھی شاید وہ بس ایک جانور ہو مگر میرے لیے وہ۔۔ وہ سب کچھ تھا۔ ایک خرگوش کی موت پر رونا شاید کم عقلی اور بے وقوفی سمجھی جاتی ہو مگر۔۔ اپنے دوست کی موت پر آنسوؤں کو کیسے روکا جائے؟!" دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکتے چلے گئے۔ خیام اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم روفی کے مرنے پر اتنا رو رہے ہو، میری موت پر کیا کرو گے ؟!" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ بدر کی آنکھوں میں کچھ ٹوٹا تھا۔ غمگین نگاہوں سے اس نے خیام کو دیکھا تھا۔

"میرے ساتھ ایسی باتیں مت کیا کریں۔ میں رو دیتا ہوں۔" وہ اطلاع دے رہا تھا۔ خیام کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی جسے وہ چہرہ جھکا کر چھپا گیا۔ بدر نے خفا نگاہ اس پر ڈال کر اپنی آنکھوں کو رگڑا تھا۔ خیام بغور اسے دیکھنے لگا۔ سفید رنگت رونے کی وجہ سے سرخ پڑنے لگی تھی۔ کان لال ہو رہے تھے۔ جیسے سعاد کے ہوتے تھے اور جیسے جندل کے۔ آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی مگر اب وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک چکا تھا۔

"ہم تمہارے روفی کی قبر بنوائیں؟" وہ سنجیدہ تھا، بالکل سنجیدہ۔

"روفی سے پہلے اس کے قاتلوں کی قبریں بناؤں گا میں!" اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ وہ سنبھل چکا تھا، خود کو سنبھال چکا تھا۔ خیام نے سکون کی سانس خارج کرتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔

"تمہارا کوئی بھائی ہے بدر؟" اس کا سوال خاصا غیر متوقع تھا۔ بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے اس کے بھائی کا پوچھ رہا تھا۔ اسے مشکل میں ڈال چکا تھا۔ وہ خاموش رہا تو خیام چونک اٹھا تھا۔ "مصعب؟ تمہارا کوئی بھائی ہے؟" اس نے دل میں کئی شبہات لیے سوال کیا تھا۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ بدر نے بے بس نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ شاید انکار کر دیتا مگر اس وقت۔۔ وہ انکار نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے ایک دوست کی ضرورت تھی ناں۔۔ روفی تو مر گیا تھا۔ وہ کمزور پڑ گیا تھا، شاید اب تنہا سب جھیلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا۔ دونوں ہاتھ سختی سے باہم ملائے انگوٹھے سے اپنے ہاتھ کی پشت کو رگڑا۔ نظریں جھکائیں تو گال پر آنسو لڑھکتا محسوس ہوا۔ خیام کو لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ اسے اپنا دل رکتا ہی تو محسوس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا

تھا۔ بدر کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

"تمہارا کوئی بھائی ہے مصعب؟ تم انکار کیوں نہیں کر رہے؟" اسے اپنی آنکھیں جلتی محسوس ہوئی تھیں۔ سرخ آنکھوں سے بدر کو دیکھا تھا جو بے بس ہوا تھا۔ "جواب دو مصعب الزرقاوی!!" وہ چلایا تھا۔ دل تڑپ اٹھا تھا۔ آواز کانپ گئی تھی۔ بدر کی حالت کسی معصوم بچے کی سی تھی۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اپنی سسکیاں دبا رہا تھا۔ خیام کے چلانے پر سہم کر اسے دیکھا تھا۔

"خ۔۔ خیام۔۔ حنفی۔" کئی آنسو اس کے گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔ خیام ٹھہر سا گیا تھا۔ اس کے گریبان پر گرفت کمزور پڑی تھی۔ بے یقینی و حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔ الفاظ دم توڑ گئے۔ آنکھیں خشک ہو گئیں۔ دل اس قدر تیزی سے دھڑکا کہ اس کے لیے سانس لینا محال ہوا۔

"تم جانتے تھے۔ تمہیں یاد تھا۔" وہ جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑتا ایک قدم پیچھے ہٹا تھا۔ بدر نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

"کیسے بھولتا؟ کوئی اپنے بھائی کو کیسے بھول سکتا ہے؟" اس کی آوز کمزور پڑ گئی تھی۔ "آپ تب بھی یاد تھے جب دادا مجھے یہاں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ جب میں راتوں کو ڈرتا تھا، جب۔۔ جب وہ مجھے مارتے تھے۔ جب پہلی بار کام پر گیا اور خود کو زخمی کر بیٹھا۔ جب کرائے کے پیسے پورے کرنے کے لیے پڑھائی چھوڑنا پڑی۔۔ آپ ہمیشہ یاد آئے بھائی۔" اس نے رک کر زکام زدہ سی سانس خارج کی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو رخساروں پر لڑھکتے گئے۔ خیام سانس روکے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کمزور تھا میں، تنہا تھا۔ سر پر ماں باپ نہیں تھے۔ وہ مارتے تھے مجھے۔۔ آپ تو جانتے ہیں ناں کہ کمزور بچے تعلیمی اداروں میں کس کس طرح کے ستم کا شکار ہوتے ہیں؟ کون سی ہڈی کے چٹخنے سے موت کا سا درد محسوس ہوتا ہے جانتا ہوں میں۔ چھٹی منزل سے دھکا ملنے پر خود کو بے بس

محسوس کرنا، ڈنڈوں اور جوتوں سے پٹنایوں کہ جسم کا کوئی حصہ بغیر زخم کے نہ رہے۔۔ میں نے سب کچھ سہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ۔۔۔ تنہا ہونا کیسا ہوتا ہے؟ ہر وہ لمحہ۔۔ جب منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا، جب جسم درد سے ٹوٹنے لگا، جب زخموں پر رکھنے کے لیے مرہم میسر نہ ہوا مجھے آپ یاد آئے۔ بڑے بھائی تھے ناں؟ کوئی اپنے بھائی کے ساتھ ایسے کرتا ہے؟ یوں ایک حکم پر تنہا کر جاتا ہے؟ کبھی تو لوٹتے۔ آ کر گلے لگاتے، احساس دلاتے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میں بہت اکیلا تھا۔۔ میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔“

وہ سسک اٹھا تھا۔ سر جھکا کر آنسوؤں کو اندر اتارنا چاہا مگر وہ زاروقطار گالوں پر بہتے گئے۔ خیام اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا اسے تکتا رہا تھا۔ وہ ایسا کیوں تھا؟ وہ جانے انجانے میں ان لوگوں کو جن سے اسے شدید محبت تھی، تکلیف کیوں پہنچاتا تھا؟ وہ سب اس کی وجہ سے درد میں کیوں مبتلا ہوتے تھے؟ وہ کیوں سب کو رلاتا تھا؟ اسے کیوں اتنی سختی سے تراشا گیا تھا؟

”وہ ایک حکم میرے لیے بہت معنی رکھتا تھا مصعب۔۔“ وہ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

”یہی تو۔ آپ جانتے ہیں آپ میں اور جندل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سعاد آپی جندل سے ناراض تھیں کہ وہ الزر قاوی سر کے حکم پر اپنے بھائی کو فراموش کرنے کو تیار تھا۔ آپ نے بھی تو یہی کیا۔ آپ بھی۔۔ دادا کے ایک حکم پر اپنی بہن اور اپنے بھائی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ کو اندازہ ہے آپ کے جانے کے بعد ہم پر کیا بیتی؟ وہ رات یاد ہے بھائی جب افق کسی چیز کی پروا کیے بنا آپ کی طرف دوڑی تھی؟ وہ گاڑی کے نیچے کچلی جانے والی تھی؟ آپ کیسے اسے تنہا کر سکتے تھے؟ وہ آپ کے جانے کے بعد ایک عرصہ بیمار رہی۔ مجھے لگا آپ لوٹ آئیں گے مگر آپ نہیں آئے۔ آپ تو چلے گئے تھے۔۔ پہاڑوں پر۔۔ جندل کے ساتھ۔ آپ کو ایک تنظیم بنانی تھی ناں۔۔ جب پہاڑ آپ کے نعرہ تکبیر سے گونجتے تھے تب آپ کے بہن بھائیوں کی سسکیاں اس گونج میں دب جاتی تھیں، آپ کیسے

ہمیں سن پاتے؟" اس کا چہرہ اس قدر لال ہو گیا تھا جیسے خون چھلکنے لگا ہو۔ خیام سانس روکے اسے سن رہا تھا۔ بدر کا چہرہ دھندلا ہونے لگا تھا۔ آنسوؤں کی دبیز تہہ نے ہر منظر دھندلا کر دیا تھا۔ بدر۔ اپنی جیکٹ کے آستین سے اپنی آنکھوں کو رگڑ رہا تھا۔ وہ مزید دھندلکے میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔

"آپ جانتے ہیں افق کو آپ یاد نہیں ہیں۔ کوئی اس کا نہیں نہ وہ کسی کی ہے۔ وہ بس میری ہے، صرف میری! اس رات ہماری سالگرہ پر وہ تحائف آپ نے بجھوائے تھے میں جانتا ہوں۔ آپ اسے یاد کرتے ہونگے مگر وہ آپ کو فراموش کر چکی ہے۔ میں نے بھی کوشش کی تھی بھائی!! میں نہیں کر پایا۔ میں نے ان دس سالوں میں آپ کا شدت سے انتظار کیا۔ آپ لوٹ آئے اور ایسے کہ۔۔ کہ حقیقت جانتے ہوئے بھی مجھے اجازت نہیں تھی میں سچ سامنے لاؤں۔ یہ حالات اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں؟ یہ لبوں سے الفاظ کیوں چھینتے ہیں، یہ جذبات کے قاتل کیوں کہلاتے ہیں، یہ محبت کے معاملے میں اتنے سفاک کیوں ہوتے ہیں؟! میں روتا تھا یار۔ یاد آتے تھے آپ مجھے۔ عادت تھی آپ کی۔ ایک بھائی ہے میرا جو میرے لیے دنیا سے لڑ سکتا ہے! جب جب اسکول میں بگڑے لڑکوں کے ہتھے چڑھا آپ کی شدت سے یاد آئی۔ آپ حیران ہوئے تھے ناں میرے ہاتھ اتنے سخت کیوں ہیں؟ بھائی میں عادی ہوں۔ میں خود اپنا آسرا بنا ہوں، میں نے خود کو خود جوڑا ہے۔ آپ سے بہت سے شکوے ہیں۔ میرا مان رکھتے ناں۔۔ بھائی کہہ کر گلے لگاتے ناں۔۔ بڑے بھائی کی طرح میری طرف اٹھنے والے ہاتھوں کو روکتے ناں۔" وہ سسک اٹھا تھا۔ لب سختی سے دانتوں میں دبا کر اپنی سسکی کو لبوں پر روکا تھا۔ خیام کی آنکھ سے ایک آنسو چپ چاپ گال پر لڑھک گیا تھا۔

"میں ہی کیوں؟ جندل کیوں نہیں؟" اس نے کافی دیر بعد گم سم سے انداز میں سوال کیا تھا۔

"کیونکہ محبت تو آپ نے دی تھی ناں۔ بھائی تو آپ بنے تھے۔ اسے تو بے خبر رکھا گیا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی زندہ

ہے۔ وہ آپ تھے جسے میری ذمہ داری سونپی گئی تھی۔" وہ حق جمار ہا تھا۔ آواز ذرا سی بلند ہو گئی تھی۔ خیام نے سر جھٹک کر گہری سانس لی تھی۔ وہ آج تک اس خوف میں مبتلا رہا کہ اگر جندل کو حقیقت معلوم ہوئی تو شاید اس کا چھوٹا بھائی "اس کا" نہ رہے۔ مگر وہ اس کا ہی بھائی تھا۔ رگوں میں دوڑتے خون کی کشش ہوتی ہے مگر دل میں بسی محبت زیادہ اثر رکھتی ہے۔

"اب کیا ایسے کھڑے رہیں گے؟ کیا اتنا بھی حق نہیں میرا کہ مجھے گلے لگائیں آپ؟ اتنے ظالم کیوں ہو گئے ہیں آپ؟" وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے شکوہ کر رہا تھا۔ خیام نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ بدر کی آنکھوں سے جھلکتی خفگی، چہرے پر معصومیت اور نم آنکھیں۔۔ وہ بے اختیار ہلکا سا ہنسا تھا۔ ایسے کہ ہنستے ہی آنکھوں سے دو آنسو بہہ گئے تھے۔

"آجاؤ یار۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بدر کے گلے لگا تھا۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ بدر نے سسکیاں دباتے ہوئے اس کے کندھے پر سر ٹکایا تھا، پی کیپ کی وجہ سے چہرہ چھپ گیا تھا۔ خیام نے گہری سانس بھرتے ہوئے آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو بہنے سے روکا تھا۔ "خون تو ایک ہے۔ عورتوں کی طرح شکوہ کرنا تو تم دونوں کی جینز میں موجود ہے۔" وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بدر خفگی سے ناک سکیڑتا پیچھے ہٹا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم مجھے بس اپنا بڑا بھائی واپس چاہیے۔" اس نے بچوں کی طرح منہ بسور کر کہا تھا۔ جیسے کوئی پسندیدہ کھلونا مانگ رہا ہو۔ خیام نے مسکرا کر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ماتھے کو ڈھکتی پی کیپ کو سرکا کر عقیدت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اور بدر کو لگا تھا۔۔ صحرا میں کسی بھٹکے مسافر کو زمانوں کے سفر کے بعد چھاؤں میسر ہوئی تھی۔ اس نے ایک سایہ دار شجر پا لیا تھا۔

"سنو اگلی بار کوئی تم پر ہاتھ اٹھائے تو پہلے اس ہاتھ کو روکنا پھر مجھے آگاہ کرنا۔ کون سی ہڈی توڑنے سے اس کا ہاتھ

ضائع ہو سکتا ہے میں تمہیں تفصیل میں سبق پڑھاؤں گا۔ کیا سمجھے؟" نگاہوں میں نرم سا تاثر لیے اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔ بدر کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"مجھے حزب اللہ میں آنا ہے بھائی۔۔ میں خود پر اٹھنے والا ہر ہاتھ خود توڑنا چاہتا ہوں۔" اس نے خواہش ظاہر کی تھی۔ خیام نے چونک کر خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھیں چمکی تھیں۔ بدر نے سر پر ٹکی پی کیپ ماتھے پر سرکائی تھی۔ سر کو خم دیا تھا۔ اسے اپنا استاد مانا تھا۔ اور خیام۔۔۔ اسے محسوس ہوا تھا وہ ایک لمبے عرصے بعد اپنے دل پر پانی کی ٹھنڈی پھوار پڑتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ نرمی سے، سست رفتار میں گرتے ٹھنڈے پانی کے چمکتے قطرے۔۔

اور اس دوران۔۔ وہ دونوں ہی جندل کے ساکت وجود میں پیدا ہوتی حرکت نہیں دیکھ پائے تھے۔ جندل۔۔ جس کے وجود نے بعد میں حرکت کی تھی مگر دماغ پہلے جاگ اٹھا تھا۔ وہ جو۔۔ جان چکا تھا کہ بدر تنہا نہیں تھا۔ وہ۔۔ جس کے دماغ پر خیام کے الفاظ ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے،

"میں ہی کیوں؟ جندل کیوں نہیں؟"

☆☆☆

”یہ وقت ہے ازا! کسی ایک صف میں کھڑے ہونے کا۔ اب آر یا پار۔“ پیغام پڑھ کر وہ چند پل سُن بیٹھی رہی تھی۔ تو کیا وقت آ گیا تھا؟ حقیقت کے ظاہر ہونے کا، میدان میں اترنے کا؟ اس کے لیے یہ مشکل تھا بے حد مشکل۔ جس طرح مائک نے وارلڈ کو دلال ماننے سے انکار کیا تھا، جس طرح مارک نے گواہی دی تھی، وہ بھی تو یہی مانتی تھی۔ وہ جس شخص کے سائے میں پروان چڑھی تھی وہ ہرگز کوئی قاتل نہیں ہو سکتا تھا۔ ابراہم وارلڈ قاتل نہیں ہو سکتا تھا!!

اگلے ہی لمحے وہ لانگ کوٹ اور موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔ اس کا ارادہ اس لڑکے سے ملنے کا تھا۔ وہ اس سے وقت مانگنا چاہتی تھی۔ وہ وارلڈ کے خلاف نہیں کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ کیسے کھڑی ہو جاتی؟! سیاہ رنگ کا لانگ کوٹ شانوں پر ڈالتے ہوئے اس نے جیسے ہی لاؤنج پار کرنا چاہا نگاہ سامنے کمرے کے دروازے کی طرف ٹکی۔ کمرہ۔۔ زیاد کا کمرہ۔ وہ بے اختیار ٹھٹھک کر رکی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو کیسے نظرانداز کر سکتی تھی؟ کسی ایک صف کو چننا۔۔ ظاہر تھا اسے باپ اور بھائی کی صف میں کھڑا ہونا تھا۔ وہ ان دونوں کو کیسے نظرانداز کر سکتی تھی؟ ایک طرف وہ لوگ تھے جن سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ ایک طرف وہ شخص جو اس کا ہیرو تھا، اس کا آئیڈیل!

اس کے قدم بے اختیار کمرے کے دروازے کی طرف اٹھے تھے۔ کئی پل وہ دروازے پر کھڑی رہی تھی۔ وہ دستک دینے کی ہمت نہ کر سکی۔ وہ سر جھکا کر پلٹنے لگی تھی کہ دروازہ کھلا تھا۔ اسے دروازے پر دیکھ کر سعاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

”کہیں جا رہی ہو ازا؟“ وہ انگریزی میں مخاطب تھی۔ وہ اپنا موبائل لانگ کوٹ کی جیب میں ڈالتی سر کو جنبش دے گئی۔ ”کہاں؟ اور اس وقت؟ زیاد کو جگاؤں؟“ اس نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھ ڈالے۔

”نہیں۔۔ اسے مت جگائیں۔ میں جلد آ جاؤں گی۔“ اس نے عجلت میں کہا تھا۔ سعاد نے سمجھ کر سر کو جنبش دی

تھی۔ وہ متذبذب سی نظروں سے فرش کو گھورنے لگی۔ سعاد نے بغور اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب کو دیکھا۔ وہ لب دانتوں سے کاٹ رہی تھی، گویا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ازا؟ کچھ کہنا ہے؟" وہ بغور اس کے تاثرات جانچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"صرف ایک سوال۔۔ مشکل فیصلے کیسے لیے جاتے ہیں؟" وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"بنا سوچے جلد از جلد! جتنا سوچو گی فیصلہ اتنا مشکل ہوتا جائے گا۔" وہ بہت آسانی سے اس کی مشکل آسان کر گئی۔ ازا ہلکا سا مسکرائی پھر سر کو جنبش دی۔

"بہت شکریہ۔ آپ سو جائیے گا۔ مجھے پاسورڈ معلوم ہے۔"

"زیاد کو معلوم ہوا تو ناراض ہو گا۔" اس نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

"میں منا لوں گی۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ سعاد نے جواباً سر کو جنبش دی۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ وہ وہیں دروازے پر کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ آج کل ہر کسی کی حرکتیں مشکوک تھیں۔ اسے استاد جی کو آگاہ کرنا چاہیے تھا، وہ بالکل یہ کرنے جا رہی تھی۔

اپارٹمنٹ سے نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے پاس سے گزرا تھا جو اسے ٹھٹھرنے پر مجبور کر گیا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے مفلر کو گردن کے گرد لپیٹتی جھرجھری لے کر رہ گئی۔ موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملایا اور قدم بڑھاتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ کال پہلی ہی بیل پر اٹھالی گئی تھی۔

"میری گاڑی کہاں ہے؟" اسے اپنی آواز جمتی محسوس ہوئی تھی۔

"آپ کو ٹریس نہ کیا جا سکے تبھی اس کا بندوبست کر دیا ہے میں نے۔" مصروف سے انداز میں اطلاع دی گئی تھی۔

"مجھے لینے آؤ خیام! یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔" اس نے مفلر سے کانوں کو لپیٹتے ہوئے کہا تھا۔ دوسری طرف خیام کے

ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

"کہاں ہیں آپ؟" وہ بدر کو جندل کے پاس رکنے کا اشارہ کر کے خود گاڑی کی چابیاں چھپٹ کر باہر کی طرف لپکا تھا۔

"پیچ سڑک پر، زیاد کے اپارٹمنٹ سے ذرا فاصلے پر۔" اس نے گھوم کر ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اطلاع دی۔

"جان سکتا ہوں وہاں کیا کر رہی ہیں؟!" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"ٹھیک دس منٹ میں پہنچو!" اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے حکم صادر کیا گیا اور ساتھ ہی کال کاٹ دی گئی۔

موبائل کوٹ کی جیب میں اڑس کر اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے اور قدم بڑھا دیے۔ اگلے لمحات میں وہ سست رفتار سے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ تاریکی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈ بھی بڑھ رہی تھی۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں سڑکوں کے کناروں پر جمع پانی چمک رہا تھا۔

چند پل میں ایک گاڑی اسے تیز رفتار سے اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ پہنچ چکا تھا۔ گاڑی تیزی سے اس کے پاس آئی۔ جھٹکے سے رکی۔ دروازہ کھلا اور وہ آناً فاناً باہر نکلا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ وہ نو منٹ پینتیس سیکنڈ میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پرفیکٹ!" مسکرا کر کہتی وہ دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی سر جھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دروازہ بند کر کے اس نے جلدی سے ہیٹر آن کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ازا نے کوٹ کی جیب موبائل نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھا۔ خیام نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

"کہاں لے کر جا رہے ہو؟" گردن ترچھی کر کے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑیں۔

"کہاں جانا ہے؟" توجہ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا گیا۔

"ابراہم وارلڈ کے گھر!" اس نے بریک پر زور دیا تھا۔ گاڑی جھٹکے سے رکی تھی۔ وہ پورا ازا کی طرف مڑا تھا۔

"وہ آپ کا دشمن ہے۔ اس نے اپنے آدمی بھیجے آپ کو پکڑنے کے لیے اور آپ اسی کے گھر جانا چاہ رہی ہیں؟" وہ اسے گھور رہا تھا۔ ازا نے دائیں ابرو اٹھائے سے دیکھا۔

"تم پھر سے بنا ثبوت کے بات کر رہے ہو"!

"کم آن ازا!! میں تمہیں خودکشی نہیں کرنے دوں گا۔" وہ جھنجھلایا تھا۔ جھنجھلاہٹ میں فوراً سے آپ سے تم پر آیا تھا۔

"یہ بات تم کہتے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔" اس پر طنز کیا گیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"کیوں جانا چاہتی ہیں؟" نرمی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جنگ کے لیے دشمن کو للکارنا پڑتا ہے۔ ابراہم کو یہ بتانا ہے کہ۔۔ ازابیلا حقیقت جان چکی ہے۔ اب وہ ازا تاشفین کو دیکھے گا جو اسے تباہ و برباد کرنا چاہتی ہے۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ خیام نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تم نے یقین کر لیا؟"

"تم پر نہیں مائک پر۔ اس نے میل کی ہے جس میں ابراہم خود اعتراف کر رہا ہے کہ اسکائے ٹو کی پانچویں سیٹ پر وہ بیٹھا ہے۔ مائک نے یہ بھی بتایا کہ۔۔ زیاد، تم اور جندل حزب اللہ سے تعلق رکھتے ہو۔ اور میں جان چکی ہوں کہ۔۔ وہ شخص میرا باپ تھا۔ میرا اور زیاد کا۔۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ خیام نے پلک جھپک کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں یہ سب مائک نے بتایا ہے؟"

"نہیں۔ بابا کے متعلق۔۔ اور اس رات کے متعلق جب میری زندگی یکسر بدل گئی، زیاد نے بتایا ہے۔" اس نے گود

میں رکھے اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے جواب دیا تھا۔ شاید ابھی تک وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے کی عادی نہیں ہوئی تھی۔ خیام کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔

”اس نے اور کچھ بھی بتایا؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔ خوف۔۔ حقیقت کے کھل جانے کا، سچ کے سامنے آنے کا۔

”نہیں۔۔ کچھ اور بھی ہے کیا بتانے کے لیے؟“ وہ نظریں ترچھی کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بے اختیار سر نفی میں ہلا گیا۔ سر جھٹک کر ٹھنڈی سانس لی پھر سیٹ پر سر ٹکایا۔

”یہ کھلا تضاد ہے ویسے۔ تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے مگر اس نامرد کی ایک میل پر مکمل اعتماد ہے۔“ اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ ازا نے رک کر اسے دیکھا۔

”تم میرے سامنے ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے!“ اس نے لہجہ سخت کیا تھا۔

”بہت بہتر! تم نے یہ چھوٹ بھی بس اس خبیث کو دی ہوئی ہو گی۔“ نہایت سنجیدگی سے کہا گیا۔ ازا نے دانت پیس کر اسے دیکھا جو گاڑی واپس سڑک پر ڈال چکا تھا۔

”تم کبھی بھی وارلڈ کے ساتھ مخلص نہیں تھے۔“ وہ گویا افسوس کر رہی تھی۔

”کیونکہ مجھے تم سے بنا کر رکھنی تھی۔ مستقبل کی باس ہو۔ اپنا فائدہ تو سوچوں گا ناں۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکا دیے۔ وہ جواباً خاموش رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ منزل کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ رات کی تاریکی کو چیرتی سڑکوں پر رواں دواں گاڑی میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ کچھ لمحات میں وہ گھر کے باہر کھڑے تھے۔ وہ دروازہ کھولنے لگی تھی جب خیام نے اسے پکارا تھا۔

”بیس منٹ! صرف بیس منٹ ازا۔ اگر تم بیس منٹ میں نہ آئیں تو میں آ جاؤں گا۔ وہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے

ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میں اس گھر سے یونہی سر اٹھا کر نکلوں گی!" اس نے مکمل اعتماد سے کہا، پھر گاڑی سے نکل گئی۔ وہ گردن ترچھی کیے اسے دور جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

سیاہ ہیل کی ٹک ٹک۔۔ اعتماد سے سر اٹھا کر چلتی ازاتا شفین۔۔ لمبی اور روشن راہداری۔۔ ہال کے دروازے پر کھڑے گارڈز نے اس کے لیے دروازے کھول دیے۔ اس نے اگلا قدم اندر رکھا تھا۔ اس کمرے میں جہاں شیشے کی میز کے پار صوفے پر ابراہم وارلڈ بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے شراب کا گلاس لبوں سے لگائے، بالکل پر سکون۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ لانگ کوٹ اتار کر برابر میں رکھ دیا۔ گردن کے گرد لپٹے مفلر کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی تو وہ بھی کوٹ کے ساتھ رکھ دیا۔ صوفے سے ٹیک لگا کر سنجیدگی سے ابراہم کو دیکھا جو گلاس میز پر رکھ رہا تھا۔

"میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔" لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ سنہری روشنیوں میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"میں جانتی تھی آپ میرا انتظار کر رہے ہونگے۔" اس نے اعتماد سے کہا تھا۔ ابراہم وارلڈ نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی پھر صوفے سے ٹیک لگالی۔

"تو تم حقیقت جان چکی ہو ازا۔۔" وہ رکا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا پھر گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا نام مکمل کیا۔ "ازاتا شفین!" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی۔ چند پل خاموشی کے نذر ہوئے اور پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی، "میرا باپ کہاں ہے دلال؟!" ابراہم چند پل اسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر ہلکا سا

ہنس دیا۔

”میں جانتا ہوں تم صدمے میں ہو۔ تمہارا باپ۔۔ معاویہ تاشفین مارا جا چکا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

”مگر میں معاویہ تاشفین کی بات نہیں کر رہی۔ میں اپنے باپ کا پوچھ رہی ہوں، اس محافظ کا جس نے مجھے اس رات آگ سے بچایا تھا!“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

”وہ میں تھا ازا۔“ نرمی سے اسے دیکھا گیا۔

”وہ تم نہیں تھے! وہ شخص درندہ ہوتا، سفاک قاتل ہوتا تو ازا تاشفین اسی رات گھٹ گھٹ کر مر چکی ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تم نہیں تھے۔ وہ دلال نہیں تھا، وہ ابراہم وارلڈ تھا!!“ اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ ابراہم نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

”تم کچھ کہنے آئی ہو، ازا؟“ وہ اسے اصل موضوع پر لا رہا تھا۔ ازا نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

”میں اعلانِ جنگ کرنے آئی ہوں۔ آج سے آپ مجھے اپنے دشمنوں کی صف میں کھڑا پائیں گے۔“ اس کی آواز میں رعب تھا، لہجہ سخت تھا۔ آنکھیں ابراہم کی آنکھوں میں گاڑی ہوئی تھیں، نظروں میں سختی تھی۔

”تم شطرنج میں ہار جاتی ہو ازا!“ وہ اسے پیچھے ہٹنے کا کہہ رہا تھا۔

”شطرنج آپ کا کھیل ہے۔ ضروری نہیں آپ کے دشمن بھی اسی میدان میں اترنا پسند کریں۔“

”مجھے تم ہمیشہ سے اچھی لگتی تھیں۔ معصوم۔۔ خاموش اور گم سم سی بچی جو گھنٹوں سمندر کو تکا کرتی تھی۔ آج میں تمہاری آنکھوں میں سمندر دیکھ رہا ہوں۔۔ بپھرا ہوا سمندر، جس کی لہریں کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ لگ رہی ہیں۔“ وہ بغور اس کی آنکھوں کو میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”مجھے سمندر کبھی پسند نہیں آئے۔ ظالم اور وحشی سمندر!“ وہ اس تمام عرصے میں پہلی بار مسکرائی تھی۔ ابراہم نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے لبوں پر رینگتی مسکراہٹ اسے اچھی لگی تھی۔

ان سے دور گاڑی میں بیٹھے خیام نے وقت دیکھا۔ ازا کو گئے ٹھیک بیس منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے جلدی سے پچھلی سیٹ پر رکھا اپنا سفید رومال اٹھایا تھا۔ رومال سے چہرہ ڈھک کر اس نے اپنی پستول لوڈ کی اور اگلے ہی لمحے میں وہ گاڑی سے نکل آیا۔

ابراہم گلاس میں شراب ڈال رہا تھا۔ ازا کی نگاہیں گلاس میں دھار کی صورت میں گرتی شراب پر تھیں۔ خیام نے دروازے پر کھڑے گارڈ پر پیچھے سے وار کیا تھا۔ اسے ڈھیر کر کے وہ اندر کی طرف بڑھا تھا۔ سی سی ٹی وی کیمرہ سے بچ کر وہ اونچے درختوں سے گزرتا احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ ابراہم نے شراب کا گلاس ازا کی طرف بڑھایا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ مسکراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا گیا۔ سامنے سے آتے دو گارڈز کے ساتھ اس کی ٹکر ہوئی تھی۔ اگلے لمحات میں وہ ان کی ہڈیاں توڑنے میں مصروف تھا۔ اس کے زوردار مکے سے گارڈ کو اپنا جبڑا ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی لات سے اسے اپنے پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کے اگلے وار پر وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا تھا۔ دوسرے آدمی کو بھی اس نے بمشکل دو منٹ دیے تھے۔ پوری طرح تسلی کر کے وہ تیزی سے راہداری کی طرف بڑھا تھا۔ ابراہم نے برابر میں رکھی فائل اٹھائی۔ مسکراتی نگاہوں سے ازا کو دیکھا پھر فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ ازا نے فائل اس کے ہاتھ سے لی۔ کاغذات پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔

ہال کے دروازے پر پہنچتے ہی اس کی نگاہ وہاں کھڑے گارڈ پر ٹکی۔ گارڈ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے تیزی سے آگے آتے ہوئے اس کے سینے پر لات رسید کی تھی۔ اس کا گریبان پکڑ کر پے در پے کئی مکے اس کے

چہرے پر مارے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کا گریبان جھٹکے سے چھوڑ کر اسے وہیں درد سے تڑپنے کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے جیسے ہی دروازہ کھولنا چاہا تو دروازے کو لاک پایا۔ اسے اب صحیح معنوں میں گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ ابراہم اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ کاغذات پر نگاہیں دوڑاتی اسے سن رہی تھی۔ سخت نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ کہہ بھی رہی تھی جس پر وہ بس مسکرایا تھا۔ خیام نے پیچھے ہٹ کر زوردار لات دروازے پر رسید کی۔ دروازے نے شور پیدا کیا مگر کھلا نہیں۔ راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ خیام کو کیمرہ میں دیکھا جا چکا تھا۔ ازا جھک کر ان کاغذات پر دستخط کر رہی تھی۔ ابراہم پرسکون نگاہوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا جس کے ساتھ خیام زور آزمائی میں مصروف تھا۔ اس کی اگلی لات پر دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا۔ اس نے فوراً اندر آتے ہی اپنی پستول ابراہم وارلڈ پر تانی تھی۔ اسی کے ساتھ ہی دس پندرہ پستولیں خیام پر سیدھی ہوئی تھیں۔ ازا نے سر اٹھایا، قلم ایک طرف رکھ دیا۔ فائل بند کی۔ ابراہم نے ہاتھ بڑھا کر فائل کو اٹھا لیا۔ خیام کم فہمی سے انہیں دیکھنے لگا۔

”ایسے وفادار لوگ بہت کم ملتے ہیں ازا! انہیں آئندہ یوں مشکل میں مت ڈالنا کیونکہ اگلی بار میں اسے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔“ وہ مخاطب ازا سے تھا مگر سنایا خیام کو تھا۔

”ان گنت قتل کیے ہیں میں نے اور اس سے باخبر ہوں کہ مرنے سے پہلے مارا کیسے جاتا ہے۔“ خیام کی بھاری آواز نے ایک لمحے کے لیے ہال میں سناٹا پیدا کیا تھا۔ ابراہم نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ازا اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک آخری نگاہ ابراہم پر ڈالی پھر پلٹ گئی۔ خیام ابراہم کو گھوری سے نوزتا اس کی تقلید میں آگے بڑھا۔ گارڈز نے راستہ صاف کر دیا۔ وہ اپنے قول کے مطابق اسی طرح اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر وہاں سے نکلی تھی۔ اس سے ایک قدم پیچھے چلتا خیام احتیاط بھری نگاہوں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ راہداری سے نکل کر جب وہ سڑک

پر آئے تو ازا کی رفتار سست پڑ گئی۔ خیام گاڑی اندر نہیں لایا تھا، وہ شاید زندگی میں پہلی بار اپنے گھر کا یہ راستہ پیدل طے کر رہی تھی۔ اپنا گھر۔۔۔ یہ لفظ اب اس حویلی کے لیے کتنا اجنبی ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

خیام کا اگلا قدم اس کے برابر اٹھا تھا، وہ دونوں اب شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ اس نے سر جھکا کر آنسوؤں کو اندر اتارا تھا۔ وہ چہرہ ترچھا کر کے بغور اسے دیکھنے لگا۔

مدھم سی روشنی میں دمکتا اس کا چہرہ ٹھنڈ کی وجہ سے سرخ پڑ رہا تھا۔ ازا۔۔۔ اپنا کوٹ وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اس کی گردن کے گرد لپٹا مفلر بھی وہیں رہ گیا تھا۔ بے اختیار اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ ازا بھی رک گئی۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ خیام نے پر سوچ نگاہوں سے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا پھر اپنا سیاہ کوٹ اتارا۔ اگلے ہی لمحے میں وہ آگے بڑھا تھا، سیاہ کوٹ کو اس کے شانوں پر ڈالا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی جو ایک قدم پیچھے ہٹ کر درمیان میں فاصلہ قائم کر چکا تھا۔ اس نے پلک جھپکی۔ وہ اب متلاشی نگاہوں سے ارد گرد دیکھنے لگے۔ اس طرف کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے پر لپٹا سفید رومال اتارا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی غلطی کیے بنا وہ سفید رومال اس کی گردن کے گرد لپیٹا تھا۔

"اب تم جم نہیں جاو گی۔" وہ مسکرایا تھا۔ ہلکا سا۔۔۔ دل سے۔ ایسے کہ اس کی آنکھوں نے بھی مسکرانے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

"آگے کیمرہ بھی ہونگے اور گارڈ بھی۔" اس نے اطلاع دی تھی۔ وہ مزے سے کندھے اچکا کر ہاتھ میں موجود سیاہ ماسک سے اپنا چہرہ ڈھک چکا تھا۔ ازا نے گہری سانس اندر اتاری تھی۔ سفید رومال سے اٹھتی اس کے کلون کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے بے اختیار سانس روکا تھا۔ خیام نے بغور اس کی یہ حرکت دیکھی تھی۔

"تم۔۔۔ اپنی چیزوں کے متعلق ہمیشہ سے لاپرواہ تھیں۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا کر سر جھٹک رہا تھا۔

اسے جانے کیوں یہ لڑکا پراسرار سا لگا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اس کے لیے عام سا لڑکا تھا۔۔ اس کے باپ کی کمپنی کا عام سا مینیجر۔ مگر دن بہ دن وہ خاص بنتا جا رہا تھا۔ جو اس کے لیے جان لینے پر تیار ہو جاتا تھا، جو اس کی پروا کرتا تھا۔۔ جس کے لیے وہ خاص تھی۔

"خیام۔۔" وہ اسے پکار بیٹھی تھی۔ "مجھے اپنے ماضی میں سے کچھ یاد نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہاں سوچیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"کیا پوچھنا ہے ازا؟" وہ مکمل اس کی طرف متوجہ تھا۔

"ماضی میں۔۔ تمہارے ساتھ میرا کیا تعلق تھا؟ تم کون تھے؟" وہ نرمی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ وہ اس لڑکی کو کیسے بتا دیتا وہ کون تھا؟ اگر بتا دیتا تو قیامت نہ آجاتی؟ وہ جو اس وقت۔۔ اس کے ساتھ کھڑی ہے کیا تب بھی کھڑی ہوتی؟ کیا وہ یہی رومال اور کوٹ اس کے منہ پر نہ دے مارتی؟ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنوں کو کھونے کے ڈر سے گزرا ہے اور اسی ڈر نے اسے جھوٹ بولنا سکھایا تھا۔ اس نے اب بھی یہی فیصلہ لیا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں کون تھا؟" وہ اداسی سے مسکرایا تھا۔

"تم۔۔" وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ "تم کوئی بہت خاص ہو گے۔ کیونکہ تم بہت اچھے ہو۔ تھوڑے سے کھڑوس ہو مگر اچھے ہو۔" وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ وہ منتشر ہوتی دھڑکنوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ یہ لڑکی اتنی جلدی متاثر کیوں ہو جاتی تھی؟ آج سے سالوں پہلے بھی اس نے ایسے ہی کیا تھا اور اس کے دل میں خلا سا پیدا کر گئی تھی۔ اب بھی یہی کر رہی تھی۔۔۔ اب جانے کیا ہونے والا تھا؟

"کس اینگل سے تمہیں میں اچھا لگتا ہوں؟" اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے پوچھا گیا۔ وہ اپنی تعریف سننا چاہتا تھا،

وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

”جب تم پہلی بار میرے آنے پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جب تم نے ڈیوڈ کے کیس کی تفتیش کے لیے ہامی بھری تھی۔ جب اس رات تم مجھے بچانے آئے تھے، جب تم اسپتال میں تھے۔ اور۔۔۔ ابھی جب تم اپنا کوٹ مجھے دے رہے تھے۔“ وہ خاصی صاف گو تھی۔ اپنے احساسات چھپا کر نہیں رکھتی تھی۔

”اور برا کب لگا ہوں؟“

”جب زیاد تمہیں مارنے کی کوشش کر رہا تھا اور تم مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔“ اس کے لہجے سے خفگی جھلکی تھی۔

خیام نے لب دانتوں میں دبائے۔ ”اچھا بتاؤ ناں۔۔ تمہارا اور میرا کیا تعلق تھا؟“ وہ کوشش کے باوجود اسے اپنی باتوں میں نہیں گھما پایا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے اپنا سوال نہیں بھولنے والی تھی۔

”میں۔۔ میں اس غلام جیسا تھا جو ملکہ کے ساتھ بہت وفادار ہو، جو قدم قدم پر ملکہ کے ساتھ ہو مگر ملکہ جس کی پہنچ سے بہت دور ہو۔“ اس نے ٹھہر کر ازا کو دیکھا۔ وہ کم فہمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی بات میں چھپا مطلب نہیں سمجھ پائی۔ یا شاید سمجھ کر انجان بنی رہی۔ اس نے بے اختیار نظروں کا رخ پھیرتے ہوئے سینے میں قید سانس خارج کی۔ ”رات بہت ہو گئی ہے۔ آؤ چلیں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ ماتھے پر ہلکے سے بل ڈالے اس کی پشت کو گھورتی رہی۔ خیام نے اس کی غیر موجودگی محسوس کر کے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر تیزی سے اس کے پیچھے قدم بڑھا چکی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کسی انجانے احساس کے تحت کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر کمرے میں نظریں دوڑائیں۔

اندھیرے میں ڈوبے کمرے میں ٹھنڈ کے احساس نے اسے نیند سے جگایا تھا۔ اس کا کمبل غائب تھا۔ اس نے ماتھے

پر بل ڈالے آنکھیں ملتے ہوئے برابر میں دیکھا۔ سعاد پورا کمبل کھینچ کر اس میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ نیند میں اسے کچھ بے چین لگی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

”سعاد۔۔ ٹھیک ہو تم؟“ پریشانی سے کہتے ہوئے اسے اس کا رخسار گرم محسوس ہوا تھا۔ اس نے چونک کر اس کی پیشانی پر اپنے ہاتھ کی پشت رکھی۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے سائیڈ لیمپ جلایا۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے گولی نکالی پھر گلاس میں جگ سے پانی الٹا۔ پانی کا گلاس لے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”سعاد۔۔ اٹھو دوائی لے لو۔“ وہ اس کی آواز پر ہلکا سا کسمسائی۔ آنکھیں رگڑتے ہوئے وہ نیند میں ہلکا سا بڑبڑائی پھر اٹھ بیٹھی۔ گولی اس کے ہاتھ سے لی، پانی کے گلاس سے ساتھ گولی پھانکی۔ گلاس اسے پکڑایا اور واپس لیٹ گئی۔ زیاد نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا پھر اس پر کمبل درست کر کے بیڈ سے اتر گیا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا خالی ہو چکا جگ اٹھایا اور کمرے سے نکل آیا۔

کچن میں آ کر وہ جگ میں پانی بھرنے لگا۔ اسے ابھی کچھ پل ہی ہوئے تھے کہ اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے پلٹ کر دیکھا تو ازا کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تعجب کا تاثر ابھرا۔

”تم کہیں گئیں تھیں ازا اور اس وقت؟“ وہ کم فہمی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں کچھ کام تھا۔ تم سوئے ہوئے نہیں تھے؟“ اس نے شانوں پر ٹکا کوٹ اور گردن میں لپٹا رومال اتار کر صوفے پر رکھتے ہوئے جواب دے کر سوال کیا تھا۔

”ہاں۔۔ ابھی پانی لینے کے لیے اٹھا تھا۔“ اس نے بغور اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سر کو جنبش دے کر کچن میں آئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے روبرو کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جگ شیلف پر رکھ کر مکمل اس کی طرف

متوجہ ہوا تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ کہنے جا رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں زیاد۔۔" اس نے نرمی سے زیاد کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم نے کبھی مجھ سے جھوٹ بولا ہے؟" اس کے سوال پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ازا کی نگاہوں میں ہنوز وہی نرم سا تاثر قائم رہا۔ وہ جواب نہیں دے پایا۔ وہ منتظر رہی۔ کئی پل گزر گئے۔ وہ آنکھیں میچتے ہوئے سر نفی میں ہلا گیا۔ وہ بے اختیار مسکرادی تھی۔

"جھوٹ ایسے بولیں کہ یقین تو آئے۔۔۔ بھائی!" اس نے عام سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ زیاد نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ کیا اس نے غلط سنا تھا؟ شاید اس نے سعاد کی باتوں کو سر پر سوار کر لیا تھا۔ کیا واقعی وہ اسے بھائی کہہ رہی تھی؟! اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ سانس روکے یک ٹک ازا کو دیکھے گیا۔

"کیوں نہیں بتایا؟ جانتے تھے تو آکر حق کیوں نہیں جمایا؟" وہ مسکرا رہی تھی۔ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔ ان میں نمی ٹھہر رہی تھی۔ زیاد کا چہرہ دھندلا ہو رہا تھا۔ شیلف پر گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ بظاہر وہ بہت مضبوط لگ رہی تھی مگر اندر سے اسے اپنا آپ ٹوٹا محسوس ہوا تھا۔

"ازا۔۔" وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔

"ازا تا شفین کہیں۔۔۔" اس کی آواز کمزور پڑ گئی تھی۔ اس نے سر جھکا کر آنکھو میں جمع ہوتے آنسوؤں کو اندر اتارنا چاہا تھا۔ زیاد کو دل کی دھڑکنیں منتشر ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر زیاد کو دیکھا تو رخساروں پر آنسو گرتے چلے گئے۔ "آپ نے کہا تھا۔۔۔ کبھی خود کو کمزور محسوس کروں تو آپ کی طرف ایک بار ضرور دیکھوں۔ میں آپ کو ہمیشہ اپنے لیے میسر پاؤں گی۔" اس کی بات دہراتے ہوئے آنسو زارو قطار اس کے

رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ وہ سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”آج بہت کمزور محسوس کر رہی ہوں خود کو۔۔ آج سنبھال لیں۔“

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا تھا۔ وہ آگے آئی تھی۔ آرام سے اس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ کئی پل بے حس و حرکت کھڑا اپنی شرٹ پر گرتی نمی کو محسوس کرتا رہا تھا۔ اس کے رونے میں شدت آئی تھی تو دھیرے سے اسکے گرد حصار قائم کیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے تھے۔ اس نے آنکھیں میچتے ہوئے ازا کے بالوں پر بوسہ دیا تھا۔ وہ سسک اٹھی تھی۔ وہ اس کے سر پر ٹھوڑی ٹکاتا آنکھیں میچ گیا تھا۔ دھڑکنیں اس قدر سست پڑ گئی تھیں گویا ابھی دل رک جائے گا۔ جس لمحے کے آنے سے وہ ڈر رہا تھا، جس حقیقت کے آشکار ہونے پر ازا کے ردعمل کا سے خوف تھا وہ لمحہ آ کر اتنی آسانی سے چلا جائے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ شاید سعاد نے ٹھیک کہا تھا، بہنوں کو بس اپنے بھائیوں سے مطلب ہوتا ہے۔ وہ سب بھلا کر ان کی پناہ میں آ جاتی ہیں۔ وہ بھی لوٹ آئی تھی۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔

اگلے لمحات میں دونوں صوفے پر بیٹھے تھے۔ وہ اسے گزرے ماہ و سال کی کہانی بتا رہا تھا۔ ازا اس کے کندھے پر سر ٹکائے خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔ بحری قزاق، اس کا اغوا ہونا، گھر لوٹنا اور پھر وارلڈ کے ہتھے چڑھنا۔۔ اسے سب ایک خواب کی مانند محسوس ہوا تھا۔ معاویہ کا زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جانا۔۔ زیاد کا حزب اللہ میں شمولیت اختیار کرنا۔۔ وہ اسے ہر ہر لمحے سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کی کئی الجھنیں سلجھتی گئی تھیں۔ چپ چاپ اسے سنتے ہوئے اسے جو دلی سکون میسر ہوا تھا، وہ آج سے پہلے اس سے ناآشنا تھی۔ جب کہانی مکمل ہوئی تو وہ خاموش ہو گیا۔ سامنے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا میں ازا ہوں؟!“ اس نے تاک کر سوال کیا تھا۔ وہ لب دانتوں میں دبا گیا۔

"بس پتہ چل گیا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اور خیام سے کیا کہہ رہے تھے؟ بابا کی موت پر اس پر کیوں غصہ تھے؟" وہ سوچ سوچ کر سوال کر رہی تھی۔ وہ اس کے مشکل سوالوں کے جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

"آج کچھ مت پوچھو۔ مجھے بس اپنی بہن کے متعلق جاننے دو۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ازا نے سر ذرا سا اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ نگاہیں ملیں تو زیاد کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ بمشکل آنکھیں کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے چونک کر دیوار پر نسب گھڑی میں وقت دیکھا تو یہ جان کر اسے حیرت کوئی تھی انہیں دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ ازا واپس اس کے کندھے پر سر ٹکاتی آنکھیں موند گئی تھی۔

"میں سونا چاہتی ہوں۔۔۔ بہت سارا۔۔ سکون سے۔۔ شاید پہلی اور۔۔۔" وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکی۔ نیند غالب آ گئی۔ وہ ہلکی آواز میں کچھ بڑبڑاتی گہری نیند میں جا چکی تھی۔ زیاد نے چپ چاپ اس کے سر پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

"تمہاری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ اگلے منٹ میں مجھے کام پر نظر آؤ تم!" آنکھ کھلتے ہی اسے پیغام موصول ہو چکا تھا۔ رات بخار میں کافی حد تک کمی آ گئی تھی مگر جسم میں ابھی بھی اسے حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ خیام کا حکم تھا تبھی اگلے لمحات میں وہ بھاگتی دوڑتی اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ اگلے پندرہ منٹ میں وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ زیاد کمرے میں نہیں تھا، شاید لائبریری چلا گیا تھا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب اس نے قدم کمرے سے باہر رکھا اور نگاہ سامنے صوفے پر ٹکی۔ وہ صوفے کے بازو پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھی ازا اس کے کندھے پر سر ٹکائے گہری نیند میں تھی۔ اسے بے اختیار رونا آیا تھا۔ یہ حضرت اس سے پٹنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ

بالکل یہی چاہتا تھا!

اس نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا پھر گاؤن کے بازو چڑھاتی کچن میں داخل ہوئی۔ تیز آواز کے ساتھ برتنوں میں کھٹ پٹ کی۔ وہ کچی نیند میں تھا، شور کی وجہ سے اٹھ بیٹھا۔ تیوری چڑھائے کچن کی طرف دیکھا جہاں سعاد اب کیبنٹ کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھی۔

"ازا سورہی ہے۔۔ شور مت کرو۔" وہ احتیاط سے دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ وہ مزید تپ گئی تھی۔ جھٹکے سے کیبنٹ بند کر کے کچن سے نکل کر اس کے پاس آئی تھی سخت نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

"بات کرنی ہے۔" دانت پر دانت جمائے کہا گیا۔

"بعد میں کر لینا۔ میں اٹھا تو ازا جاگ جائے گی۔" وہ بالکل سنجیدہ تھا، ایکدم سنجیدہ۔

"تم مر جاؤ گے میرے ہاتھوں۔" وہ غرائی تھی۔ زیاد نے اس کی غراہٹ پر سخت نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔ نظریں ترچھی کر کے ازا کو دیکھا پھر آرام سے اس کا سر صوفے کے بازو پر ٹکایا۔ آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے کہنی سے پکڑا پھر اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کیوں غصہ کر رہی ہو صبح صبح؟" وہ دروازہ بند کر کے اس کے روبرو کھڑا پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے بے یقینی سے اسے دیکھا جس کے آج مزاج ہی نہیں مل رہے تھے۔ زیاد کا دھیان جواب نہ پا کر اس کے گاؤن کی طرف گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس سے پوچھ رہا تھا، "کہیں جا رہی ہو؟"

"تمہیں کوئی فرق پڑتا ہے؟" اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"خیام نے بلایا ہے؟" وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ایکدم سے اجنبیت کے تاثرات نمایاں ہوئے تھے۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"زیاد کیا ہو گیا ہے یار تمہیں؟ تم اسے سمجھنے کی کوشش۔۔۔"

"تم مجھے سمجھنے کی کوشش بھی تو کرو سعاد! تم نے دیکھا ہے ازا کو؟ وہ حقیقت جانتی ہے مگر جن تاریک گڑھوں میں وہ گر چکی ہے وہاں سے نکلنا اس کے لیے بہت مشکل ہے۔ تمہیں خبر نہیں ہے سعاد کہ کیا محسوس ہوتا ہے یہ سوچ کر ہی کہ۔۔۔ اگر زمین پلٹ گئی اور آسمان گھوم گیا تو ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔ اور جدائی بھی کیسی۔۔ ہمیشہ کی۔ میں اپنی بہن کو خسارے میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر خدا نے جواب مانگ لیا تو کیا کہوں گا؟ کیوں نہیں بچایا اسے؟ میرا فرض ہے یہ، میری ذمہ داری ہے ازا اور میں یہ نہیں سمجھ پا رہا میں اس ذمہ داری کو کیسے نبھاؤں؟"

اس کی دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ دل پر بھاری بوجھ آن گرا تھا۔ سعاد خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے الفاظ کھو چکے تھے۔ وہ بھی تو ٹھیک کہہ رہا تھا، اب مزید وہ کیا کہتی؟

"تمہیں میں برا لگوں گا۔ جندل اور ضرار بھی شاید مجھ سے خفا ہوں۔ مگر دل پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ جو وار دل پر کیے جاتے ہیں، وہ تا دیر تکلیف میں مبتلا رکھتے ہیں اور یہ تکلیف کچھ فراموش نہیں کرنے دیتی۔ میں کچھ نہیں بھلا سکتا۔۔ وہ رات۔۔۔ اس کا ایک ایک لمحہ مجھے ازبر ہے۔ میں کچھ نہیں بھولا۔ نہ وہ چیخیں، نہ فریادیں۔۔ رونا، بلکنا۔۔ موت کا سامنا۔۔ میں کچھ نہیں بھولا سعاد!" اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"تمہیں سب سے زیادہ نفرت کس سے ہے؟" وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

"مجھ سے کبھی کچھ مت چھپانا سعاد! مجھے اندھیرے میں رہنا پسند نہیں۔ جو غلطی خیام نے کی ہے وہ تم مت کرنا۔"

وہ اس کا سوال سمجھ چکا تھا تبھی اسے خبردار کر رہا تھا۔ وہ تقریباً لرز ہی تو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جہاں ہمیشہ نرم سا تاثر رہتا تھا، آج اتنی سختی دیکھ کر وہ خوف میں مبتلا ہوئی تھی۔ ایک احساس تھا، ندامت تھی۔ معاویہ کے خبردار کرنے کے باوجود اس نے اس سے سچ چھپا کر ٹھیک نہیں کیا تھا۔ اسے کم از کم زیاد سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا جو

اس پر سب سے زیادہ یقین کرتا تھا۔

"تم معاف نہیں کر سکتے؟ وہ تمہارا دوست ہے۔ گہرا دوست، جان دیتے تھے یار تم لوگ ایک دوسرے پر۔" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا، اسے معاف نہیں کر سکتا تھا؟

"دل پر لگے گھاؤ آسانی سے نہیں بھرتے۔ مجھے اعتراف کرنے دو میں اس معاملے میں بہت کمزور ہوں۔ میں۔۔ اسے معاف نہیں کر سکتا!" وہ آج ظالم بنا ہوا تھا۔ ظالم اور سخت۔۔ اس نے پلک جھپک کر سر جھکایا تھا۔

"مجھے بھی روکو گے؟" فرش کو گھورتے ہوئے سوال داغا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی غلطی نہیں کی تھی اس نے۔

"تم رک جاؤ گی؟" وہ ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

"میرا مان مت توڑو زیاد!" اس نے بکھرے سے انداز میں کہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ لب دانتوں میں دبا لیے۔ چند پل خاموشی کی نذر ہوئے۔ وہ آگے آیا۔ ہاتھ بڑھا کر دائیں طرف اس کے حجاب پر لگی پن نکالی۔ نقاب سے چہرہ ڈھک کر وہ پن آرام سے نقاب پر لگا دی۔

"رابطے میں رہنا۔ مجھے ضرار نے کمپنی میں بلایا ہے۔ وہاں جاؤں گا، اپارٹمنٹ بدلنا ہے تو ازا کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔" وہ اسے اپنے ارادوں سے باخبر کر رہا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دی تھی۔ آنکھوں کے کنارے سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔ زیاد نے انگوٹھے سے آرام سے ان سلوٹوں کو سہلایا تھا۔

"میں چھوڑ آؤں یا کوئی لینے آ رہا ہے؟" وہ نرمی سے اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے پوچھ رہا تھا۔

"بدر کو بھیجا ہے خیام نے۔ آنے والا ہے۔"

"اور بخار کیسا ہے؟" اس کی پیشانی پر ہاتھ کی پشت رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بہتر ہے اب۔"

"جندل کی کوئی خبر؟"

"وہ مائک کے ساتھ ہوتا ہے۔ پرسوں رات گھر ہی تھا۔" اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے تھے۔ زیاد نے سر کو جنبش دی۔ گویا اس کے جانے کے احکامات جاری کیے ہوں۔ کیا وہ بس یونہی چلی جائے؟ وہ اسے الوداع نہیں کرے گا؟ گھر وہ آئے گا نہیں، اتنا اس کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ کال کر کے خیریت ہی پوچھ لے۔۔۔ تو کیا اب وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ اسے الوداع ہی کر دے، جیسے اسے کرنا چاہیے؟ وہ لب دانتوں سے کاٹتی متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔ وہ بغور اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے تاثرات سے محظوظ ہوتا خاموش کھڑا رہا۔ وہ انگلیاں چٹخاتی اضطراب کی کیفیت میں نظروں کا رخ پھیر گئی۔

"کچھ کہنا ہے؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ سر نفی میں ہلا گئی۔ دونوں ہاتھ کمر پر باندھ لیے۔ وہ سر کو جنبش دے کر خاموش ہو گیا۔ اسی اثناء میں گھنٹی بج اٹھی۔ بدر پہنچ چکا تھا۔ زیاد نے اس کے بیگ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

"وہ میں نے باہر رکھ دیا ہے۔" اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ کر وہ اطلاع دے رہی تھی۔

"آجاؤ پھر۔ بدر کو زیادہ انتظار مت کرواؤ۔" وہ پلٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اور وہ بس اس کی پشت گھور کر رہ گئی۔ اس سے کسی بھی قسم کی توقع کرنا فضول تھا۔ ایکدم فضول!

"تم ایک بالکل اچھے شوہر نہیں ہو۔" وہ تڑخ کر کہتی اس کے پاس سے گزر کر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ زیاد نے تیزی سے اسے کلائی سے پکڑ کر روکا تھا۔

"کچھ کہا تم نے؟"

"بدر انتظار کر رہا ہے۔" خفگی سے کہا گیا۔

”لیکن تم نے شوہر کے متعلق کچھ کہا تھا۔“ مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا گیا۔

”پہلی بار میں سن لیتے۔ اب میں بار بار ایک ہی بات دہراتی اچھی لگوں گی؟“ وہ تپ گئی تھی۔

”نہیں۔ اچھی تو واقعی نہیں لگو گی۔ اگلی بار کان کھلے رکھوں گا اپنے۔“ مسکراہٹ دبا کر کہتا وہ اس کی کلائی چھوڑ چکا تھا اور وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اسے ایسے بھیج سکتا تھا مگر اس کے لیے یوں جانا مشکل تھا، بہت مشکل! اس پر نظریں ٹکائے وہ آرام سے آگے آئی۔ اس کی کے گرد بازو حمائل کرتی اس کے سینے سے لگی تھی۔

”ایڈیٹ ہو تم!“ آنکھیں میچتے ہوئے مدھم آواز میں کہا گیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے گرد بانہوں سے حصار قائم کر گیا تھا۔

”حال تمہارے یہ ہیں اور دعوے کتنے بڑے بڑے کرتی ہو، اسٹوپڈ!“ اس کا سر سہلاتے ہوئے وہ شرارت سے گویا ہوا تھا۔ وہ مسکراہٹ دبا گئی تھی۔

☆☆☆

طویل رات کے چھٹتے ہی انتظار کی گھڑیاں گنتا دن اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ رات کا اندھیرا اپنے ساتھ کئی راز لیے روانہ ہو چکا تھا۔ کمپنی میں ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ ہر کوئی اپنے کام میں لگ چکا تھا۔ لفٹ سے نکل کر راہداری کو پار کرتا وہ ابراہم کی آفس کے باہر کھڑا ہوا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ مثبت جواب ملا تو اندر آ گیا۔ کرسی پر پورے اعتماد سے بیٹھا ابراہم وارلڈ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

”خیام حنفی۔۔ اپنے کام سے لگاؤ رکھنے والا، بااعتماد اور قابلِ تحسین شخصیت رکھنے والا مرد!“ ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی تعریف کی گئی۔ ”تم نے بہت کم وقت میں جس طرح کمپنی کو سنبھالا ہے، میں اس کے لیے تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ تم ایک محنتی لڑکے ہو، میں تمہیں مستقبل میں بہت آگے دیکھ رہا ہوں۔“ اور وہ

محنتی لڑکا سنجیدگی سے ابراہم پر نظریں ٹکائے اس کے مدعے پر آنے کا منتظر تھا۔ ”مجھے امید ہے تم میرے بعد بھی کمپنی کو یونہی سنبھالے رکھو گے۔“ وہ مدعے پر آگیا تھا۔ خیام نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ کہیں جا رہے ہیں ؟!“ ماتھے پر بل ڈالے سوال کیا گیا۔

”میں ریزائن دے چکا ہوں۔ کمپنی اب کسی اور کے نام کر دی گئی ہے۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے اطلاع دے رہا تھا۔ خیام نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”آج سے تم اس کرسی پر کسی اور کو دیکھو گے۔“ میز سے گزر کر وہ اس کے پاس آیا تھا۔ مسکرا کر اسے دیکھا پھر اس کا شانہ تھتھپتا کر آگے بڑھ گیا۔ دروازہ کھلا اور وہ آفس سے نکل گیا۔

”یہ ابراہم کیا کہہ کر گیا ہے؟ نیا سی ای او کون ہے؟“ اس کی سماعت سے سعاد کی آواز ٹکرائی تھی۔ اس نے پر سوچ نگاہوں سے سی ای او کی خالی کرسی کو دیکھا۔ یہ شخص اب کونسا نیا کھیل کھیلنے جا رہا تھا؟

”مجھے کھیل بگڑتا ہوا کیوں نظر آرہا ہے؟“ اس نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

وہ ایک طائرانہ نگاہ پورے آفس پر ڈال کر باہر نکل آیا۔ راہداری کو پار کر کے جب اس نے ہال میں قدم رکھا تو ابراہم وارلڈ کو بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہاں موجود ورکرز اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے میں مگن تھے۔ اسی اثناء میں۔۔ ہلکی سی سرگوشیوں میں۔۔ ہیل کی ٹک ٹک کی آواز سنائی دی تھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب خیام کی نگاہیں داخلی دروازے کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ بھورے رنگ کی ہیلز تھیں جن کو دیکھتے ہی ان کے قیمتی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس کی نگاہیں اوپر کو اٹھیں تو پھر اسی چہرے پر ٹھہر گئیں۔ خاکی رنگ کے پینٹ کوٹ میں ملبوس اعتماد سے چلتی وہ ازاتا شفین تھی۔ گہرے بھورے رنگ کے بالوں کو جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ کانوں میں چھوٹے سے آویزے چمک رہے تھے۔ چہرہ دمک رہا تھا، میک اپ سے گال کے قریب نشان چھپایا ہوا تھا۔ وہ بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اس کے انداز میں رعب تھا۔۔ آج سے پہلے وہ اسے صحافی کے روپ میں نظر آئی

تھی جو کیمرا کی روشنیوں میں آگے بڑھ بڑھ کر چیختی چلاتی لوگوں سے سوال کرتی تھی۔ آج اس کا یہ روپ بہت مختلف تھا۔۔ کوئی باس ہو جیسے۔۔ اور اس کے برابر میں۔۔ بالکل برابر میں سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس جندل کھڑا تھا۔ سنجیدگی سے نگاہیں سامنے ٹکائے اس کے شانہ بشانہ اعتماد سے چلتا۔۔ وہ ایک باس لگ رہی تھی اور جندل اس کا باڈی گارڈ!

اور اسی نکتے پر وہ چونکا تھا۔ ابراہم وارلڈ ازا کے بالکل برابر سے گزرا تھا۔ دونوں کی نگاہیں سامنے ٹکی رہی تھیں، ایک دوسرے کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا تھا۔ ہاں۔۔ ابراہم نے کمپنی ازا کے نام کر دی تھی۔ وہی تھی جسے وہ ابراہم کے بعد سی ای او کی کرسی پر دیکھنے والا تھا۔ اس کی مستقبل کی باس حال میں باس بن چکی تھی۔۔ وہ جو سب سے پہلا کام اس سے استعفیٰ لکھوانے کا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ازا تاشفین۔۔۔ وارلڈ گلاس کمپنی کی سی ای او!

وہ دونوں ابھی فاصلے پر تھے جب اس کے کان میں بدر کی گھبرائی گھبرائی سی آواز گونجی۔

”خیام سر، جندل یہاں نہیں ہے۔ وہ غائب ہے۔“ وہ خالی بستر اور دائیں طرف گری ڈرپ ساتھ میں چند سوئیوں پر نگاہیں ٹکائے پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”وہ یہاں ہے، مصعب۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ جندل۔۔ اس کے گال پر چوٹ کا نشان تھا۔ لبوں کے کناروں پر زخم تھے۔ دایاں ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ کافی حد تک ٹھیک معلوم ہو رہا تھا۔

ابراہم وارلڈ نے کمپنی سے باہر قدم رکھا، ازا آگے بڑھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب کمپنی کی چھت پر دو ہیلی کاپٹر نظر آئے تھے۔ رسیاں پھینکی گئیں اور آن کی آن میں سیاہ لباسوں میں ملبوس ڈی ڈبلیو کا بیج سینوں پر لگائے وہ بیس سے پچیس آدمی کمپنی کی چھت پر اترے تھے۔ اسلحے سے لیس، حملے کے لیے تیار! کمپنی کے باہر گاڑی سے نکلتی سعاد نے ہیلی کاپٹر کے شور پر ٹھٹھک کر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ رسیوں سے لٹک کر چھت پر اترتے آدمیوں کو دیکھ کر اس کی

آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ چونک کر اس نے کمپنی کے دروازے سے باہر آتے وارلڈ کو دیکھا۔

"کمپنی پر حملہ ہونے والا ہے خیام! وہ بیس سے پچیس آدمی ہیں۔ دلال کی فوج ہے!" اس کی گھبرائی آواز پر خیام نے چونک کر ازا اور جندل کو دیکھا۔ نگاہیں آگے بڑھتیں ان کے برابر سے گزر کر جاتے وارلڈ پر ٹکی۔ اگلے ہی لمحے میں اس نے بلند آواز میں حکم صادر کیا تھا،

"جلد از جلد کمپنی خالی کر دو!! اپنی جان بچانی ہے تو نکلو یہاں سے!!" اس کی بلند آواز پر کئی گردنیں مڑی تھیں۔ لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگے تھے۔ جندل اور ازا ٹھہر گئے۔ سعاد تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔ انسانی جمِ غفیر سے بچ کر نکلتا ابراہم وارلڈ اپنے عقب میں افراتفری محسوس کر کے مسکرا دیا تھا۔ اور عین اس وقت چھت کے دروازے پر فٹ کیا گیا بم دھماکے سے پھٹا تھا۔ دھوئیں کے ساتھ ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ دلال کی فوج۔۔ اپنا اسلحہ سنبھالتی سیڑھیوں کے راستے نیچے آنے لگی۔

☆☆☆

اندھیر راہداری، لمبی اور تاریک۔ سیاہ بوٹوں کی آواز۔۔ دھیرے دھیرے اٹھتے بھاری قدم جو راہداری کے وسط میں کمرے کے دروازے کے باہر رکے۔ دیوار پر لگی اسکرین پر ہاتھ رکھا گیا۔ نشان دہی ہوئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ کمرے کا ماحول یخ ٹھنڈا تھا۔ کمرہ اگر تاریک نہیں تھا تو مکمل روشن بھی نہیں تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی، میز کے پار کرسی پر جندل بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ باہم ملائے کہنیاں میز پر رکھے سر جھکائے کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا وہ کسی کی آمد سے باخبر تھا بھی تو سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ لڑکا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کرسی کے پاس آیا۔ ہاتھ میں موجود لیپ ٹاپ میز پر رکھا اور پھر خود کرسی کھینچ کر اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ ناک پر چشمہ ٹکا تھا۔ گہرے سیاہ بال حال ہی میں سیٹ کیے گئے تھے۔ سیاہ کوٹ پینٹ پر سفید

رنگ کا لمبا لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ شاید ابھی باہر سے آیا تھا اور آتے ہی سیدھا یہاں پہنچا تھا۔ تبھی اسے کوٹ اتارنے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ اس نے سنجیدہ نگاہ جندل پر ڈال کر لیپ ٹاپ آن کیا۔ کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں، کوئی ویڈیو کھولی اور پھر اسکرین جندل کے سامنے کر دی۔

”اس رات کے متعلق کچھ یاد ہے، جندل ؟!“ اس کی آواز سرد تھی۔ سنجیدہ اور سپاٹ۔ جندل نے سر اٹھا کر نگاہیں اسکرین پر مرکوز کیں۔ وہ ایمبولینس تھی پوری رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ تاریک رات میں ایمبولینس کا مسلسل بجتا سائرن۔۔ خالی سڑکیں۔۔ اور پھر اس ایمبولینس کا اس بڑے سے ٹرالے کے اندر چلے جانا۔ ویڈیو ختم ہو گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اس ایمبولینس میں تم تھے۔ جب تم زخمی تھے تو یہ وہ ایمبولینس ہے جس نے تمہیں لائبریری سے اسپتال پہنچایا تھا۔“ اس لڑکے نے تفصیل بتائی تھی۔ جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”جس نے بھی اس ایمبولینس کا تعاقب کیا، یہ ویڈیو بنائی اسے یقیناً یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس رات میں بے ہوش تھا۔ مجھے ڈرگز دیے گئے تھے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس لڑکے نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

”پھر بھی دماغ پر زور دو۔ کیا تم نے کچھ سنا؟ کچھ محسوس کیا؟“ وہ لڑکا اپنی بات پر اڑا رہا۔ جندل نے سوچنے کے لیے بس چند لمحات لیے۔ ذہن خالی خالی رہا۔ اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ اس لڑکے نے گہری سانس لی پھر لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف کیا۔ ایک اور ویڈیو چلائی اور جندل کو اس پر نگاہ ڈالنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دونوں ہاتھ باہم ملائے نگاہیں ترچھی کر کے لیپ کی ٹاپ کی اسکرین پر دیکھا۔ تڑاتڑ برستی بارش میں بائیں ہاتھ میں چھاتہ اور دائیں ہاتھ میں کافی کا کپ لے کر فٹ پاتھ پر چلتا جندل اور پوری رفتار سے آتی گاڑی۔ صرف چند لمحات کا کھیل تھا اور وہ گاڑی جندل کو سنبھلنے کا موقع دیے بنا پوری قوت سے اس سے ٹکرائی تھی۔ وہ اچھل کر پہلے گاڑی کی چھت پر گرا اور اگلے

ہی لمحے اس کا سر خاک آلود بھیگی سڑک پر ٹکرایا۔ چھاتہ دور جا گرا، کافی بہنے لگی۔ اس کے سر سے خون کی ایک لکیر نکلی۔ کچھ پل بعد ایک آدمی اس کے پاس آیا۔ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔ انگشت شہادت اور انگوٹھے سے جیکٹ کے بازو کو سرکایا۔ بغور اس کے نشان کو دیکھا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ یہاں وہ سی سی ٹی وی فوٹیج ختم ہو گئی۔

"کوئی اندازہ ہے یہ آدمی کون تھا؟" سانس روکے بنا پلک جھپکے لیپ ٹاپ کی تاریک اسکرین پر تکتے جندل نے اس لڑکے کے سوال پر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ پایا۔ نگاہوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب سمندر میں آگ لگی تھی۔ دو بحری جہاز آتش کی نذر ہوئے تھے۔ کٹی پھٹی لاشیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ چیخ و پکار کی وجہ سے سمندر کی لہروں کا شور دب گیا تھا۔ وہ نفرت بھری نگاہوں سے اس نوجوان کپتان کو گھور رہا تھا جب وہ دو دھاری خنجر اس کی طرف پھینکا گیا تھا۔ اس نے اپنے آغا جان کی چیخ سنی تھی۔ وہ خنجر کے نشانے سے ہٹا تھا۔ خنجر اس کے بازو کو چیرتا ہوا گرا تھا۔ اس نے پلک جھپکی۔ ساکت نظروں سے اپنے بازو کو دیکھا۔ وہ لڑکا جانچتی نظروں سے اس کے چہرے پر چھائے تاثرات کو دیکھنے لگا۔ جندل نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بازو سے شرٹ کو سرکایا تھا۔ اس دو دھاری خنجر سے ملا نشان واضع ہوا تھا۔ کسی شیر کا پنجہ!

"یہ نشان۔۔۔ مجھے دلال کے خنجر سے ملا تھا۔ وہ اس نشان کو دیکھ رہا تھا۔" اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ اس لڑکے نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا۔

"تمہیں وارلڈ کے آدمیوں سے چھڑوایا تھا ہم نے۔ تمہیں یقین ہے وہ دلال ہے؟" اس کے سوال پر جندل نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ہاتھ بڑھا کر لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن کی اور اس شخص کی تصویر کو زوم کیا۔ اس لڑکے نے آگے ہو کر نگاہیں اس تصویر پر ٹکائیں۔ وہ اس خنجر کو دیکھنے میں کامیاب رہا جو جندل اسے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ لب سکیڑتا کرسی سے ٹیک لگا گیا۔

”مطلب ابراہم وارلڈ ہی دلال ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ جندل نے لب دانتوں میں دبائے نگاہیں میز پر گاڑیں۔ وہ لڑکا آنکھیں چھوٹی کیے جندل کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کمزور لگ رہا تھا، چہرے سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ وہ بہت بڑے حادثے سے گزرا تھا، اس کا یوں اٹھ جانا بھی غنیمت تھا۔ مگر اس کے چہرے پر یہ تاثرات اس حادثے کی وجہ سے نہیں تھے۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا، اس پر کوئی انکشاف ہوا تھا۔

”تم ٹھیک ہو جندل؟“ اس سے رہا نہیں گیا تھا۔

”سمندر سے کسے محبت ہے؟“ اس کا سوال خاصا غیر متوقع تھا۔

”ہمارے درمیان تو صرف تمہیں!“ اس نے مکمل یقین سے جواب دیا تھا۔ جندل کا سر بے اختیار نفی میں ہلا تھا۔

”دلال کو! وہ بحری قزاق ہے۔ وہ نوجوان کپتان جس کی زندگی کا ایک حصہ سمندر میں گزرا ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ وہ لڑکا چند پل کم فہمی سے اسے دیکھتا رہا جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو اور اگلے ہی لمحے وہ بری طرح چونکا تھا۔

”تم کہنا چاہتے ہو کہ۔۔ دلال تمہیں ڈھونڈ رہا ہے؟ ایک نوجوان کپتان اس بچے کو ڈھونڈ رہا ہے جسے اپنے دادا کے بعد اس کے بحری جہاز کا کپتان بننا تھا۔ یعنی۔۔ یہ لڑائی سرے سے سمندر کی ہے۔ وہ تم سے لڑنا چاہتا ہے کیونکہ سمندروں میں اس کے لیے خطرہ تم ہو۔ سمندر سے باہر کی دنیا میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ بات کی تہہ تک پہنچا تھا۔ جندل نے سر دھیرے سے اثبات میں ہلا دیا۔ وہ لڑکا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تو یہ سب۔۔ یہ اتنا ظلم، یہ درندگی، یہ جنگیں، قتل و قتال۔۔ سب سمندر کی وجہ سے تھے؟“ وہ اب بھی حیران تھا، بے حد حیران۔

”کیونکہ دلال ایک بحری قزاق ہے!“ اس کی آواز پر کئی پل کمرے میں سناٹا چھایا رہا تھا۔ وہ لڑکا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”دلال الزر قاوی سر کو ڈھونڈ رہا ہے کیونکہ جس بچے کو اس نے اس شام آگ کی نذر ہوتے بحری جہاز

کے عرشے پر دیکھا تھا اسے الزرقاوی نے پناہ دی تھی۔ یہ سمندر تھا جس کی سلطنت کے لیے دلال نے جندل اللہ کے مجاہدین کا قتلِ عام کیا تھا۔ غور کرو، آغا جان بحری جہاز کے کپتان تھے۔ خیام کا گھر مراکش میں تھا مگر سمندر کے پاس۔ زیاد کا گھر لائٹ ہاؤس کے ساتھ تھا۔ خود زیاد اس لائٹ ہاؤس کو روشن کرنے جاتا تھا۔ معاویہ، دحیہ، سنان اور عالیان۔۔ کہیں نہ کہیں ان سب کا تعلق سمندر سے تھا اور تبھی دلال ان سب کا قاتل بنا تھا۔ اسے سمندر سے غرض ہے۔ دلال۔۔۔ سمندروں کا عاشق ہے۔" اس کی آواز کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ لڑکا سانس روکے اسے سن رہا تھا۔ وہ اپنے دشمن کے مقصد تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کا دشمن جس مقصد کے لیے جنگ کرتا تھا۔۔ وہ محبت نامی ایک جذبہ تھا۔ سمندروں سے محبت۔۔ محبت جو ہوس میں بدلی تھی۔ زیادہ کی چاہ۔۔ مکمل پا لینے کی خواہش۔ سمندروں کی سلطنت پر قبضہ کرنے کا جنون!

"اور اسی لیے اسے تمہاری تلاش ہے۔ کیونکہ۔۔ سمندروں سے محبت "تمہارے" خون میں ہے۔" وہ اس لڑکے کی بات پر سر کو جنبش دے گیا۔ وہ لڑکا گہری سانس لیتا پیچھے ہوا تھا۔

"یہ سب میرے لیے واقعتاً حیران کن ہے۔ شاید آج میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں کہ کیسے سمندر کی محبت موت تک لے جاتی ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیاں کیوں خوفناک ہوتی ہیں۔" اس نے جھرجھری لی تھی۔ جندل ہلکا سا مسکراتے ہوئے آگے ہوا تھا۔ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑی تھیں۔

"کبھی خود کو ان اتھاہ گہرائیوں میں گرتا ہوا پاؤ گے تو جانو گے کہ یہ محبت ظالم کیوں ہوتی ہے؟!" اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔ وہ لڑکا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"خیر۔۔ تمہارے لیے ایک کام ہے۔"

"کیا؟ ابھی تو اٹھا ہوں، کچھ کہہ نہیں رہا مگر درد ہو رہا ہے مجھے شدید قسم کا۔" وہ اس پر بگڑا تھا۔

”کیا کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹرز کو بلایا ہے، تمہارا فائنل چیک اپ کر کے دو تین انجیکشن ٹھوک دیں گے۔ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔“ وہ اس لڑکے کو بس دیکھ کر رہ گیا۔ ”ابراہم وارلڈ نے کمپنی ازا کے نام کر دی ہے۔ ازا صبح کمپنی جائے گی، اور چونکہ اسے حفاظت کی ضرورت ہے تو تم اس کے باڈی گارڈ بنو گے۔“ حکم صادر کر دیا گیا تھا۔

”ازا سب جان چکی ہے کیا؟“ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

”ہاں۔ جب تم خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے تو یہاں ایک کے بعد ایک انکشاف ہوا ہے۔ اسی لیے وقت ضائع کیے بنا تیار ہو جاؤ۔ ابراہم نے کمپنی بنا کسی مقصد کے ازا کو نہیں دی۔ ننانوے فیصد امید ہے کل کمپنی پر حملہ ہو گا۔ تیار رہنا۔“ اس لڑکے نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ ننانوے فیصد امید کس نے دلائی؟“

”ہمارے اپنے بھی کچھ خفیہ ذرائع ہیں۔“ وہ بے فکری سے کندھے اچکا کر لیپ ٹاپ اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جندل نے سر کو جنبش دی پھر گردن ترچھی کر کے بائیں طرف دیوار کو دیکھا۔ دیوار جس کے پار یقیناً کئی نظریں اس پر تھی۔ وہ چندپل اس دیوار کو تکتا رہا پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دھیرے دھیرے چلتا اس دیوار کے پاس آیا تھا۔ بہت قریب۔۔ یہاں تک کہ اگر ایک قدم مزید اٹھاتا تو شیشے سے ٹکراتا۔

شیشے کے پار۔۔ ازا سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے۔۔ سست پڑتی دھڑکنوں کے ساتھ۔ اس کے برابر میں جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سفید رومال والا لڑکا کھڑا تھا۔ آنکھیں چھوٹی کیے۔۔ بغور اسے دیکھتا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس لڑکے نے پیچھے سے سے آواز لگائی گئی تھی۔

”میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شیشے کے پار۔۔ الزرقاوی سر کھڑے ہیں۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ سفید رومال والے لڑکے نے بے اختیار اپنے ہاتھ جیبوں سے نکالے تھے۔ بنا پلک جھپکے جندل کو دیکھا تھا جو ایک سنجیدہ

نگاہ شیشے پر ڈال کر پلٹ چکا تھا۔ ہزار احتیاط سہی۔۔ مگر وہ انہیں مات نہیں دے سکتا تھا۔ یہ لوگ اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ محسوس کر لیا کرتے تھے، تاک کر اندازے لگاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے۔۔۔ جن کا کوئی نشانہ نہیں چونکتا تھا۔

☆☆☆

"اگر وارلڈ نے کمپنی مجھے دے بھی دی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ڈی ڈبلیو کا پراجیکٹ تو ویسے بھی بار بار ا کمپنی کے زیرِ نگرانی تھا۔ کمپنی میں ایسا کچھ نہیں ہے جو وارلڈ کے خلاف ثبوت پیش کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہاں کا مینیجر خیام، سب سے پہلے ابراہم کی حقیقت جان چکا ہوتا۔" ازا کی بات پر اس نے گہری سانس لے کر کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔

"لیکن اگر وارلڈ کمپنی تمہارے نام کر چکا ہے تو یقیناً وہ کمپنی کے ذریعے کچھ کرے گا۔" اس نے پر سوچ نگاہوں سے ازا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ کمپنی میں آگ لگوا دے، دھماکہ کروا دے، اپنی فوج اتار دے۔ اس صورت میں ہم کیا کریں گے؟ آخر جانتے بوجھتے ہم کیوں کنویں میں گریں؟" وہ الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

"ازا۔۔ اگر وہ کچھ ایسا کرنے کا پلان کر رہا ہے تو ہم اسے استعمال کریں گے۔ تم اپنے لوگوں سے کہو، اگر ایسی کوئی بھی اطلاع ملے تو فوراً آگاہ کریں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں ہر معاملے سے مجھے باخبر رکھنا ہے۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔ اس لڑکے نے سر کو جنبش دی پھر دونوں ہاتھ باہم ملائے کہنیاں میز پر رکھ کر آگے ہوا۔

"خیام کا معاملہ سنبھال لیا تھا؟ اسے شک تو نہیں ہوا؟" اس کے سوال پر ازا نے لب دانتوں میں دبائے تھے۔

”مجھے لگتا ہے اسے شک ہو گیا ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اس لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ۔۔ کل رات جب تم نے اسے بھیجا تھا تو وہ سفید رومال سے چہرہ ڈھک کر آیا تھا۔ اور اس نے مجھ سے سوال بھی کیا تھا کہ۔۔ میں اسے دیکھ کر فوراً گاڑی سے کیوں اتری؟ یقیناً میں کسی کے انتظار میں تھی۔ اب مجھے کیا معلوم وہ تم نہیں تھے، خیام تھا۔“ وہ برے برے منہ بناتی کرسی پر سر ٹکا گئی۔ اونچی پونی میں بندھے بال کندھے پر ڈھلک آئے۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”اور کچھ؟“ وہ کرسی سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اس سے پوچھ رہا تھا۔ گردن گرائے چھت کو تکتی وہ یقیناً اسے مزید کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔

”کل رات۔۔ وہ ابراہم کے گھر کی سیکیورٹی چیک کرنے کے لیے اندر آیا تھا۔ کہاں کتنے گارڈز ہیں؟ کونسا راستہ کہاں ملتا ہے؟ اندر کیسے داخل ہونا ہے؟ بیس منٹ گزرنے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا مگر مجھ تک دس منٹ بعد پہنچا۔ وہ اپنا کام کرنے آیا تھا۔“ وہ یونہی گردن گرائے تلخی سے ہلکا سا ہنسی۔ آنکھوں میں جانے کیوں نمی چمکی تھی۔

”اس نے مجھے اپنا کوٹ دیا، مجھے ٹھنڈ سے بچانے کے لیے اپنا رومال میری گردن کے گرد لپیٹا۔ سننے میں دیکھنے میں یہ کتنا اچھا ہے۔۔۔ وہ میری فکر کرتا ہے، مجھے ٹھنڈ سے بچانا چاہ رہا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ۔۔۔ وہ ”یہ“ ڈھونڈ رہا تھا۔“ اس نے آرام سے اپنے کان میں لگا چھوٹا سا آلہ نکالا تھا۔ سفید رنگ کا۔۔ اور بالکل چھوٹا۔ اس نے بغور ازا کے ہاتھ میں موجود آلے کو دیکھا۔ یہ آلہ اس نے ہی ازا کو دیا تھا۔

”وہ نہیں ڈھونڈ پایا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ۔۔ ایسا ہی ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے استعمال کیا ہے۔ اس نے مجھے صحافت کی طرف لوٹایا، اس نے مجھے بتایا کہ وہ میری حفاظت کر سکتا ہے اور یہ کہ۔۔ میں اس کے لیے خاص ہوں۔ مگر وہ بہت مطلبی ہے۔ ہر معاملے میں اپنی غرض ڈھونڈ لیتا ہے۔ اسے شک ہے میں اسے دھوکا دے رہی ہوں، اسے لگتا ہے

میں تمہارے ساتھ رابطے میں ہوں۔ میں اسے یقین نہیں دلا پائی کہ۔۔ میں وہی معصوم ازاہوں جس سے وہ پہلی بار ملا تھا۔ جسے اس نے کہا تھا کہ۔۔ ناممکن کو ممکن بنتے دیر نہیں لگتی اگر ارادے ٹھوس ہوں!" اس کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی دبیز تہہ ٹھہرنے لگی تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے گردن اٹھا کر سامنے دیکھا۔

"اسے اگر تم پر یقین نہیں ہے تو وہ اس پر بھی یقین نہیں کرے گا کہ تم ہمیشہ سے ہر چیز سے واقف تھیں۔" اسے یقین دلایا گیا تھا۔ ازا جواباً خاموش رہی تھی۔ وہ بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتا انہیں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جن میں عجیب سی اداسی تھی۔ وہ اس اداسی کو الفاظ دینا چاہتا تھا مگر کوئی لفظ اس کے آگے ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔ "تمہیں وہ اچھا لگتا ہے؟" اس کا سوال خاصا غیر متوقع تھا۔ ازا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم نے یہ سوال کیوں کیا؟" اس کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔

"مجھے بس خیال آیا۔" اس نے بات گھمائی تھی۔ ازا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"وہ اچھا ہے مگر حقیقت جان کر مجھے وہ کبھی اچھا نہیں لگا۔ اس سے بعید نہیں ہے، وہ اپنے کام کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

"اور جندل۔۔ سنا تھا تم اس سے شادی کرنے جا رہی ہو؟"

"مجھ سے الٹے سیدھے سوال مت کرو۔ میں تمہیں۔۔" اس کے موبائل پر کوئی پیغام آیا تھا۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ماتھے پر بل ڈالے اس پیغام کو دیکھا۔ "ابراہم نے صبح پچیس آدمیوں کو کمپنی پر حملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔" اس نے اطلاع دی تھی۔

"تب پھر ہمارا اندازہ درست تھا۔ پھر ہم بھی اس کھیل میں شامل ہونے کی تیاری کرتے ہیں۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا کرنے جا رہے ہو؟“

”یہ حملہ ہم عوام کو لائیو دکھائیں گے۔ دیکھتے ہیں کیا طوفان کھڑا ہوتا ہے؟!“ پی کیپ ذرا سی نیچے سرکا کر وہ پلٹ گیا۔ ازا نے پرسوچ نگاہوں سے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ یہ لڑکا۔۔ وہ نہیں جانتی تھی یہ کون تھا مگر اس وقت بس یہی تھا جس پر اسے اعتماد تھا۔ وہ اس قابل تھا کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں۔۔ اسے محسوس ہوتا تھا ان دونوں کی ایک کہانی ایک سی ہے۔ کہیں کسی موڑ پر۔۔ ان کی کہانی میں کئی مشترکہ چیزیں ہیں۔

☆☆☆

چیختے چلاتے لوگ صرف چند لمحات میں کمپنی خالی کر چکے تھے۔ جنہیں نکلنے کا موقع نہیں ملا وہ کمروں میں بند ہو گئے۔ گنتی کے دو تین فرد ہی تھے جنہیں نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ سعاد تیزی سے اندر آئی تھی۔ خیام کی نگاہ اس پر ٹکی اور پھر ازا پر۔

"سعاد، ازا کو آفس میں لے جاؤ۔ جندل تم میرے ساتھ آؤ۔ انہیں نیچے پہنچنے سے روکنا ہے ہر حال میں!!" وہ تیزی سے حکم صادر کر تا پلٹ گیا۔ جندل اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ سعاد عجلت میں ازا کی طرف آئی۔ اس کی کلائی پکڑی اور پھر اس کی آفس کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دوڑتے بھاگتے قدموں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ خیام اپنی آفس میں آیا۔ جلدی سے میز کی دراز کھول کر پستول نکالی۔ ساتھ ہی دو میگزینیں نکال کر جندل کی طرف اچھالیں جو مہارت سے انہیں پکڑ چکا تھا۔ وہ باقی میگزینیں اپنی جیبوں میں اڑستا اس کے ساتھ باہر کو لپکا۔ وہ دونوں

تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تھے۔ بھاری بوٹوں کی آواز قریب آتی گئی۔ فاصلہ مٹتا گیا۔ ان کا سامنا چوتھی منزل پر ہوا۔

دونوں طرف سے بیک وقت فائرنگ ہوئی تھی۔ دیواروں کی اوٹ میں ہو کر انہوں نے زینوں پر ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اندھادھند دیواروں سے ٹکراتی گولیاں، فائرنگ کا شور، ٹوٹتے شیشے۔۔۔ سب کچھ خوفزدہ کرنے والا تھا۔ یہ کمپنی پہلی بار اس قسم کی صورتحال سے گزر رہی تھی۔

سعاد ازا کو آفس میں لائی۔ اسے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے پلٹی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے راہداری میں آئی تھی۔ نگاہ سامنے سے آتے تین نقاب پوشوں پر ٹکی۔ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ ان تینوں میں سے ایک تیزی سے اس کی طرف جھپٹا تھا۔ وہ فوراً سے ایک طرف ہوتی اس کی گدی پر مکا رسید کر چکی تھی۔ دوسرے نے اس کے پاؤں میں اپنا پاؤں پھسا کر اسے گرانا چاہا مگر وہ تیزی سے اس کا وار ضائع کرتی اس کے پیٹ میں مکا رسید کر گئی تھی۔ تیسرے نے اس کا حجاب کھینچنا چاہا تھا جب وہ اس کا بازو پکڑ کر مروڑ چکی تھی۔ چیخ کی آواز سے بازو کی ہڈی چٹخی تھی۔ وہ درد سے چلایا تھا۔ وہ اسے لات رسید کرتی دور دھکیل چکی تھی۔

اسی اثناء میں باقی دونوں آدمی سنبھل چکے تھے اور اب اس پر وار کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس بار پہلا وار اس نے کیا تھا جس کے جواب میں ایک آدمی نے زوردار تمانچہ اس کے رخسار پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی تھی۔ خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا جو اس پر جھپٹنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے دائیں طرف ہوتی اس کی ٹانگ پر لات مارتی اسے منہ کے بل گرا چکی تھی۔ اب باقی دونوں آدمی اس کی طرف بڑھے تھے۔

وہ ان کے ساتھ مصروف تھی جب دروازے سے زیاد اور ضرار داخل ہوئے تھے۔ وہ دونوں تیزی سے اندر آئے تھے۔ ضرار نے ایک آدمی کو قابو کیا تھا۔ زیاد نے سعاد پر وار کرتے آدمی کی گردن کو دبوچتے ہوئے اس کا سر دیوار

میں دے مارا تھا۔ زیاد عجلت میں اس کی طرف پلٹا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ تیزی سے اسے کہنی سے پکڑ کر آگے بڑھا۔ چہرے پر انتہا کی سنجیدگی تھی۔ آخری آدمی کو گراتے ضرار نے ماتھے پر بل ڈالے زیاد کی پشت کو دیکھا تھا۔

"اوئے اوئے رکو کہاں لے کر جا رہے ہو؟" وہ اس اچانک افتاد پر ہڑبڑا کر پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی تیز رفتار کے سبب وہ تقریباً اس کے پیچھے گھسٹتی جا رہی تھی۔ وہ اسے اس آفس میں لایا تھا جہاں ازا موجود تھی۔ دروزہ کھول کر اسے اندر لا کر جھٹکے سے اس کی کہنی چھوڑی اور پلٹ کر باہر نکل گیا۔

"رکو رکو زیاد!!" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ دروازہ اس کے منہ پر بند کر چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے دروازہ لاک ہونے کی آواز آئی۔ "زیاد میں تمہاری جان لے لوں گی دروازہ کھولو!!" وہ چلائی تھی۔ وہ اپنی پستول نکالتا اس کی چیخوں کو نظر انداز کرتا ضرار کے ہمراہ زینوں کی طرف بڑھ چکا تھا۔

دونوں طرف سے مسلسل ہوتی فائرنگ نے ماحول میں تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ سفید زینوں سے خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔ یقیناً دوسری طرف دو تین آدمی ڈھیر ہوئے تھے۔ خیام نے اپنا ہاتھ روکتے ہوئے برابر میں کھڑے جندل کو دیکھا۔

"ایسے کام نہیں چلے گا۔ مجھے کوور کرو۔" فائرنگ کرتے جندل نے سر کو جنبش دی۔ خیام تیزی سے زینوں کی طرف بڑھا۔ کئی پستولوں نے اسے اپنے نشانے پر لیا مگر کسی کو ٹریگر دبانے کی مہلت نہ ملی۔ دونوں ہاتھوں میں پستولیں لے کر فائرنگ کرتا جندل ان سے یہ موقع چھین چکا تھا۔ وہ زینوں کے سرے پر آیا تھا۔ نقاب پوش پیچھے ہٹ کر دیواروں کی اوٹ میں ہو گئے تھے۔ عین اسی وقت جندل، ضرار اور زیاد بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ چاروں نے جلدی سے اپنی جگہیں سنبھالی تھیں۔ پستولوں سے نکلتی گولیاں عمارت کے شیشوں کو چکنا چور کر رہی تھیں۔

دیواروں میں سوراخ ہو رہے تھے۔ چار سے پانچ لاشیں گر چکی تھیں۔ سفید فرش پر خون بہہ رہا تھا۔ اسی وقت کسی نے اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹا سا بم کی طرح کا آلہ ان کی طرف پھینکا۔ فرش سے ٹکراتے ہی سرمئی رنگ کی گیس اس سے نکلنے لگی۔ آن کی آن میں وہ سب اس کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود کوئی بھی ارد گرد کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گیس ان کے نتھنوں سے ٹکراتی سانس کے ذریعے اندر جانے لگی۔ ان کے لیے سانس لینا محال ہوا تھا۔

☆☆☆

بائیں ہاتھ میں چھاتہ لیے وہ راہداری میں آیا تھا۔ وقت ضائع کیے بنا اس نے فائر الارم پر ہاتھ رکھا تھا۔ پوری عمارت الارم سے گونج اٹھی تھی۔ سفید رومال والا وہ لڑکا راہداری کی طرف بڑھا تھا۔ آن کی آن میں آگ لگ جانے کی صورت میں آگ بجھانے کی لیے چھتوں میں فٹ شاورز سے پانی گرا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا پوری عمارت میں بارش ہو رہی ہو۔ زینوں پر پانی گرنے لگا۔ اس کا چھاتہ بھیگ چکا تھا۔ وہ بھیگتے فرش پر قدم رکھتا آگے بڑھا۔ اس نے جیکٹ سے پستول نکال کر لوڈ کی اور زینے چڑھتا گیا۔ جب وہ چوتھی منزل پر پہنچا تو وہاں نرالا ہی منظر تھا۔ پانی کی وجہ سے گیس پر کسی حد تک قابو پالیا گیا تھا۔ دونوں طرف سے اب ہاتھا پائی چل رہی تھی۔ خیام ایک آدمی کی گردن کی ہڈی توڑنے میں مصروف تھا۔ ضرار نے دوسرے کا سر دیوار میں مارا تھا۔ جندل نے تیسرے کے سینے پر لات رسید کی تھی۔ اسی اثناء میں ایک آدمی جندل پر پیچھے سے وار کرنے لگا تھا۔ اس نے بنا وقت ضائع کیے پیچھے سے آکر پستول کا پچھلا حصہ اس کی گدی پر مارا تھا۔ وہ دھڑام سے گرا تھا۔ ایک آدمی جلدی سے اس کی طرف بڑھا، وہ تیزی سے ایک طرف ہوا۔ وہ آدمی اپنی تیز رفتار کی وجہ سے زینوں سے لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی نگاہ سامنے اٹھی جہاں خیام چار بندوں میں گھرا ہوا تھا۔ چوتھا آدمی بس اس کے سر پر وار کرنے والا تھا۔

”خیام بچ کے!“ وہ چلایا۔ خیام کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ اس آدمی نے عجلت دکھائی مگر فوراً ہی فائر کی آواز گونجی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ خیام نے مڑ کر اس طرف دیکھا جہاں سے گولی آئی تھی۔ زیاد اس آدمی کو مار کر ایک سرد نگاہ خیام پر ڈال کر پلٹنے ہی لگا تھا کہ کسی نے اس پر خنجر سے وار کیا تھا۔ وہ فوراً ایک طرف ہوا۔ خنجر اس کے بازو کو چیرتا ہوا گیا۔ وہ اگلے ہی لمحے سنبھل چکا تھا۔ سفید رومال والا لڑکا انہیں وہیں چھوڑ کر پانچویں منزل پر جاتے زینوں کی طرف بڑھا۔ وہ گنتی کے پچیس لوگ تھے مگر یہاں صرف پندرہ لڑ رہے تھے۔ تین کا نیچے کام تمام ہو چکا تھا۔ باقی اوپر تھے۔ اسے ان سے نمٹنا تھا۔ وہ زینے چڑھ کر جب پانچویں منزل پر آیا تو دو آدمیوں کو راہداری میں پایا۔ اس کے آتے ہی وہ دونوں اس پر پستول تان چکے تھے۔

”آگے مت آنا، ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ ایک آدمی نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

”بہت بہتر۔ میں ویسے بھی مار دھاڑ کو پسند نہیں کرتا۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکا دیے۔

”پستول پھینکو اور ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“ دوسرا آدمی غرایا۔ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی پھر پستول نیچے رکھنے کے لیے جھکا۔ وہ آدمی ہنوز اسے نشانے پر لیے کھڑا رہا۔ اس نے پستول فرش پر رکھی اور اگلے ہی لمحے تیزی سے ایک مکا جھک کر اسے دیکھتے شخص کی ناک پر جڑ دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ ناک پر رکھ کر چلایا تھا۔ دوسرے آدمی نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہوا۔ متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ نگاہ کانچ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر پڑی جو فرش پر گرا تھا۔ اسی اثناء میں اس آدمی نے دوسرا فائر کر دیا۔ وہ گولی سے بچنے کے لیے جھکا اور جلدی سے کانچ کا وہ ٹکڑا اٹھا کر فرش پر قلابازی کھاتے ہوئے اس آدمی کے پیٹ میں گھونپ دیا تھا۔ دوسرا اپنے ناک سے بہتے خون کو روکنے میں مصروف تھا کہ اس نے جلدی سے وہیں فرش پر لیٹے لیٹے اس کی ٹانگ کھینچی تھی۔ وہ دھڑام سے فرش پر گرا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے سینے پر چڑھ کر اس پر پے

در پے مکے برسا رہا تھا۔ اس شخص کا پورا چہرہ خون سے بھر چکا تھا۔ درد سے اس کی چیخیں نکلنے کو تھیں مگر اس کا ہر مکا اس کی چیخ کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ جب وہ نڈھال ہو گیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر فرش پر گرے کانچ کے ٹکڑے کو اٹھایا اور بنا کسی تردد کے وہ ٹکڑا اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ خون کو راستہ ملا تو وہ پانی کی طرح بھیگے فرش پر بہنے لگا۔ وہ ایک سرد نگاہ اس مردہ وجود پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر اپنی پستول اٹھائی پھر رک کر فرش پر بہتے خون کو دیکھا۔

"تم نے مجھے یہ جاننے کا موقع دیا کہ میرا مکا کتنا زوردار ہے، یہ تم لوگوں کی سب سے بڑی غلطی تھی۔" اس نے ایک قہر آلود نگاہ ان لاشوں پر ڈالی پھر ان کے برابر میں اس چھوٹے سے بم کی طرف متوجہ ہوا۔ جھک کر وہ بم اٹھایا اور پھر جلدی سے اوپر کی طرف بھاگا۔ زینے پھلانگتا وہ چھت پر آیا تو دروازے کو بند پایا۔ اس نے زوردار لات دروازے پر رسید کی۔ دروازہ چرچرایا مگر کھلا نہیں۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ اس نے ایک اور کوشش کی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے زینے پھلانگتے قدموں کی آواز سنی۔ اس نے جھک کر زینوں میں دیکھا تو وہ تینوں اوپر آ رہے تھے۔ زیاد ان سے پیچھے تھا۔ وہ واپس دروازے کی طرف پلٹا۔ ایک اور لات دروازے کو رسید کی، وہ اس بار بھی ناکام رہا۔ اس نے رک کر زینوں کی طرف دیکھا، وہ تینوں اوپر پہنچ چکے تھے۔ جندل نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا۔ ضرار، جندل اور خیام آگے آئے۔ تینوں نے ایک ساتھ لاتیں دروازے پر رسید کی تھیں۔ دروازہ تیزی سے کھل کر دھڑام کی آواز سے پیچھے دیوار سے ٹکرایا تھا۔ وہ تینوں جلدی سے آگے بڑھے۔ چھت پر موجود پانچوں آدمیوں نے انہیں اپنی پستولوں کے نشانے پر لیا۔

وہ بم ہاتھ میں لیے آگے آیا۔ جھک کر بم کو قدموں میں رکھا اور ہلکی سی ٹھوکر مار کر اسے ان پانچوں کی طرف دھکیل دیا۔ ضرار نے چونک کر اسے دیکھا۔ بم دیکھ کر ان پانچوں نے بھاگنے کے لیے جگہ تلاش کرنا چاہی۔ اسی اثناء میں ضرار چلایا تھا، "جھکو!!!" اس کی چیخ دھماکے کی آواز میں دبتی چلی گئی۔ دروازے پر پہنچتے زیاد کو دھکا ملا۔ کانوں

کو پھاڑ دینے والی آواز گونجی۔ انسانی جسموں کے چھیتڑے اڑ گئے۔ ہر سو خاموشی چھا گئی۔ سناٹا۔۔ گہرا سناٹا۔

فرش پر گرے زیاد نے اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ کانوں میں گونجتی بیپ کی آواز سے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ ریلنگ کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔ اسے چھت پر ہر طرف خون نظر آیا۔ ایک طرف ان پانچوں کی کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔ اس کی متلاشی نگاہوں نے اردگرد ان چاروں کو تلاش کرنا چاہا۔ وہ اسے مل گئے۔

جندل جو فرش پر چت لیٹا گہری سانسیں لے رہا تھا، اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ خیام جو دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو رہا تھا، اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ ضرار جو دیوار سے ٹیک لگائے ٹانگیں سیدھی کیے بیٹھا تھا۔ اسے اپنے جسم کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا، اس کی ٹانگ پر چوٹ آئی تھی۔ اور وہ سفید رومال والا لڑکا۔۔۔ وہ اپنے چھاتے سمیت چھت کے بالکل ایک طرف کونے میں کھڑا تھا۔ چپ چاپ۔۔۔ معصومیت سے ان تینوں کو تکتا۔

”خبیث انسان، اگر بم پھٹنے والا تھا تو تمہیں ہم تینوں کو خبردار کرنا چاہیے تھا۔“ خیام غرایا تھا۔

”میں کچھ سن نہیں پا رہا۔ کان بند ہو گئے ہیں۔“ جندل نے وہیں لیٹے لیٹے آواز لگائی تھی۔

”میں حرکت نہیں کر پا رہا۔ میری جان نکل گئی ہے۔“ ضرار کی کمزور سی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”ایک بار جسم میں جان واپس آئے تو تینوں مل کر اس گدھے کی چٹنی بنائیں گے۔ نامعقول کہیں کا!“ خیام اپنے بازو سے بہتے خون کو دیکھ کر اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔

”مجھے شروع سے ہی یہ دوسروں کے شکار پر نظر رکھنے والی مخلوق اپنی دشمن لگتی تھی۔“ جندل نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر کمر میں اٹھتے درد کی وجہ سے وہ واپس وہیں لیٹ گیا۔

”میں صرف چٹنی سے کام نہیں چلانے دوں گا۔ اس ناہنجار کا اچار بننا چاہیے، ہاں!۔۔۔ ہائے میری ٹانگ۔“ ضرار

کرا ہا تھا۔ دروازے پر کھڑا زیاد بے اختیار ہنس دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جو خوف اس نے محسوس کیا تھا، وہ ان تینوں کو سلامت دیکھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سکون کی سانس خارج کی تھی۔

☆☆☆

زیاد زینے اتر کر راہداری میں آیا۔ پہلے الارم بند کیا، چھتوں سے گرتا پانی ایکدم رک گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا راہداری میں آیا۔ بازو سے بہتے خون کو نظر انداز کرتا وہ آفس کے دروازے کے باہر رکا۔ ہاتھ بڑھا کر دروازہ ان لاک کر کے جیسے ہی کھولا تو کوئی بجلی کی تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اس کی گردن دبوچتے ہوئے اسے دیوار سے لگایا تھا۔ اس نے سنبھل کر سعاد کو دیکھا جو اس کی گردن پر گرفت مضبوط کرتی کسی بھوکی شیرنی کی طرح خونخوار نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"مجھے یہاں بند کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے تھے تم؟" غصے سے پوچھا گیا۔ ازا ہونق بنی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری حفاظت کو یقینی بنانا تھا۔" وہ ڈھیٹوں کی طرح مسکرایا تھا۔ وہ غصے سے اسے گھورتی دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو دبوچ گئی تھی۔

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں زیاد تاشفین! اگلی بار یہ جرات بھی مت کرنا۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ غرائی تھی۔ وہ چپ چاپ مسکراہٹ دبا گیا۔

"تم کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔" وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔

"مگر اس کے ساتھ وہ حشر کر سکتی ہوں کہ وہ نہ زندوں میں رہے نہ مردوں میں!" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔ زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"بازو چھوڑو۔۔۔ درد ہو رہا ہے۔" اس نے چونک کر اس کے بازو کو دیکھا۔ گاڑھے سرخ بہتے خون کو دیکھ کر گرفت

ڈھیلی پڑی۔ نگاہوں کے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلائی جو اس کے خون میں تر ہو چکی تھی۔ خفا نگاہوں سے اسے دیکھا جو بس ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں بھائی؟" ازا فکرمندی سے کہتی آگے آئی تھی۔ زیاد نے سر کو جنبش دی۔ سعاد ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر باہر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسے فرسٹ ایڈ باکس تلاش کرنا تھا۔ ازا نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما تھا۔ اسے صوفے پر بٹھا کر وہ خود اس کے برابر میں بیٹھی تھی۔

"زخم گہرا تو نہیں؟" اس کی آواز سے جھلکتی فکر محسوس کر کے وہ بس مسکرا دیا تھا۔

"نہیں۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا گیا۔ وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"ابراہم نے۔۔ کمپنی میرے نام کر دی ہے۔" اس کی اطلاع پر زیاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

"وہ ایسا کیوں کرے گا؟ کمپنی کے علاوہ اس کے پاس ہے کیا؟"

"یہاں غلطی پر تھے ہم۔ اس کے پاس کمپنی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے یہاں تک کہ اسے کمپنی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس کے جواب پر زیاد نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔ سعاد فرسٹ ایڈ باکس لیے اندر آئی۔ چل چاپ باکس ازا کی طرف بڑھا دیا۔ زیاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم اپنے بھائی کو سنبھالو۔ مجھے استاد جی سے بات کرنی ہے۔" وہ مخاطب ازا سے تھی مگر مقصد زیاد کو سلگانا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ٹھہری تھی۔ ازا نے باکس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ زیاد نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا۔ "مجھے ایسے مت گھورو۔ میرا دل کر رہا ہے میں تمہیں۔۔۔" وہ غصے سے کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ غالباً ازا کی وجہ سے اسے خاموش ہونا پڑا تھا۔ زیاد نے دانت کچکچائے تھے۔ وہ اسے سخت گھوری سے نوازتی باہر نکل گئی تھی۔ ازا نے اس کے جانے پر نگاہوں کا رخ زیاد کی طرف کیا۔

"آپ دونوں ہمیشہ ایسے لڑتے ہیں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"مجھ سے کچھ مت پوچھو ازا! میرا دل کر رہا ہے میں اسے واپس کمرے میں بند کر دوں!!" اس نے غصے سے سر جھٹکتے ہوئے اپنے خوفناک ارادے ظاہر کیے تھے۔ ازا اپنی مسکراہٹ دباتی اس کے زخم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جبکہ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ تینوں ذرا ذرا سے فاصلے پر دیواروں سے ٹیک لگائے ٹانگیں سیدھی کیے بیٹھے تھے۔ لڑائی کے دوران جندل کی گردن پر کچھ زخم آئے تھے۔ خیام کے رخسار پر جبکہ ضرار کا ہاتھ زخمی ہوا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے بکھرے بکھرے سے حلیوں میں وہ تینوں تھک کر آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ اردگرد لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ خون ہی خون تھا، جسم درد سے ٹوٹ رہے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود بھی ایک سکون تھا جو رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ یہ جنگ بظاہر کتنی ظالم لگتی ہے مگر جب یہ جنگ "جہاد" کا نام مستعار لے لے تو پھر کتنی خوبصورت اور دلکش لگتی ہے۔ خدا کی راہ میں خون بہانا۔۔ زخمی ہونا، تھکنا۔۔ یہ سب بہت پرکشش ہے۔ فتح کی خبر کا اندازہ کبھی بھی فاتح کے ہاتھ لگے مالِ غنیمت، سرحدوں اور زمینوں کی کثرت سے نہیں لگایا جاتا لیکن یہ تو مجاہدین کے تھکے تھکے چہرے، بکھرے حلیے۔۔ خون میں نہائے جسم جو زخموں سے چور ہوں۔۔ درد سے ٹوٹتے جوڑ اور ان کے چہروں پر وہ ہلکی سی مسکان ہوتی ہے جو فتح کی خوشخبری دیتی ہے۔

"میں سمجھ نہیں پا رہا۔ آخر ابراہام نے کمپنی ازا کو کیوں دی؟" ضرار نے سوال اٹھایا تھا۔

"کیونکہ اس کا یہ ٹھکانہ آشکار ہو چکا تھا۔ وہ اسے تباہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ وہ اپنا ٹھکانہ بدل رہا ہے ضرار! وہ اب کہیں اور پناہ لے گا اور ہماری لیے اسے ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔" جندل کی بات میں وزن تھا۔

”مائک نے کہا تھا ابراہم کے پاس کمپنی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی تو بس ایک عام سی چھت تھی اس کے لیے۔ ایک مہرہ، ایک جال۔ اس کے پاس اس سے بڑے مہرے موجود ہیں۔ وہ اس سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہے جتنا ہم تصور کرتے آئے ہیں۔“ خیام پرسوچ نگاہیں فرش پر بہتے خون پر ٹکائے بول رہا تھا۔ ان دونوں نے اپنے سروں کو جنبش دے کر اس کی بات کی تائید کی تھی۔ اسی اثناء میں انہیں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کی نگاہیں زینوں کی طرف ٹکیں جہاں سے وہ لڑکا آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں تھام رکھی تھیں۔ زینے چڑھ کر وہ ان کے پاس آیا اور ایک ایک بوتل سب کو پکڑا دی۔

”مجھے کیوں لگ رہا ہے تم پہلے سے سب جانتے تھے؟“ خیام نے بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا تھا۔ اس لڑکے نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ جندل اور ضرار پانی کی بوتلیں لبوں سے لگا چکے تھے۔

”کیونکہ میں واقعی سب جانتا تھا۔“ سرسری سے انداز میں جواب دے کر اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر بغور جندل کی گردن پر آئے زخم کو دیکھا۔ ”تم ابھی بستر سے اٹھے ہو۔ اس زخم کا جلد علاج کروالو، تمہارا خون پہلے ہی بہت بہہ چکا ہے۔“ اس نے ہمدردانہ انداز میں کہا تھا۔ جندل نے سر کو جنبش دے کر پانی کی بوتل ایک طرف رکھی۔

”گارڈز کو تم نے ہٹایا تھا؟“ خیام کے سوال پر اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ابراہم نے۔ وہ تمہیں یہیں ختم کرنا چاہتا تھا۔“ اس کی بات پر خیام نے سر جھٹکا تھا۔

”ارادے تو تمہارے بھی یہی تھے۔“ جندل نے منہ بنا کر کہا تھا۔ وہ لڑکا دائیں ابرو اچکائے اسے دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں سعاد وہاں پہنچ چکی تھی۔ ہاتھ میں لیپ ٹاپ لیے، حواس باختہ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی یہاں آئی تھی۔

”تم لوگوں کو یہ دیکھنا چاہیے۔“ اس نے عجلت میں کہہ کر لیپ ٹاپ خیام کی طرف بڑھایا۔ وہ تینوں بھی کھسک کر

اس کے قریب ہوئے۔ نگاہیں اسکرین پر جمادیں۔ وہ ایک ویڈیو تھی جس میں کمپنی پر ہوئے حملے کے مناظر دکھائے جارہے تھے۔ ہر منظر صاف تھا۔ حملہ آوروں کے سینوں پر لگے ڈی ڈبلیو کے بیج صاف واضع تھے۔ افراتفری، فائرنگ کی آوازیں، ٹوٹتے شیشے، بہتا خون۔۔ غرض ہر منظر دکھایا جارہا تھا۔ بس کوئی نہیں تھا تو وہ لوگ تھے۔ انہیں بالکل یوں غائب کیا گیا تھا جیسے وہ کبھی اس منظر کا حصہ تھے ہی نہیں۔

"یہ ویڈیو۔۔" جندل کچھ کہتے کہتے رکا چونک کر اس لڑکے کو دیکھا جو جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے فکری سے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ "تم نے وارلڈ کو حملہ کرنے دیا تاکہ تم ڈی ڈبلیو کو سامنے لاسکو۔" اس کی آواز میں حیرت تھی۔

"صرف یہی نہیں بلکہ تم وارلڈ کی طاقت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے۔ اگر اس ویڈیو کے لائیو دکھانے کے باوجود پولیس نے یہاں کا رخ نہیں کیا اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔ ابراہم وارلڈ کی پہنچ بہت دور تک ہے۔" ضرار نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔ اس لڑکے نے گہری سانس لے کر سر کو جنبش دی۔

"تم لوگوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ مقابلہ کتنا سخت ہونے والا ہے۔ ابراہم وارلڈ صرف ابراہم بھی تو نہیں ہے، وہ دلال بھی ہے۔ بحری قزاق جس کے جھنڈے تلے لڑتے ہیں۔ تم سے نپٹنے کے لیے وہ سمندری فوج کو ساحل پر بھی بلاسکتا ہے۔"

"اس کی فوجیں خدا کی فوج کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں۔" سعاد نے اعتماد سے کہا تھا۔ وہ سب اس کے پُریقین انداز میں کہنے پر مسکرادیے تھے۔ اسی اثناء میں جندل کو بدر کا خیال آیا تھا۔

"بدر کہاں ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے خیام کو دیکھا۔ خیام نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا پھر جیب سے موبائل نکال کر بدر کا نمبر ملایا۔ دوسری بیل پر ہی کال اٹھالی گئی تھی۔

”کہاں ہو مصعب؟“ اس کے سامنے کھڑے لڑکے نے بغور اسے دیکھا تھا۔

”یہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ خدا جانے کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔ آپ کمپنی میں ہی ہیں ناں؟“ اس کی آواز سے جھنجھلاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

”ہاں سب یہیں ہیں۔ وقت سے آجاؤ۔“ اسے تاکید کی گئی۔ پھر فون بند کر دیا۔ موبائل واپس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا جہاں وہ لڑکا اب واپس زینوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

”میں نہیں جانتا ڈی ڈبلیو کے آدمی وہاں کیسے پہنچے؟ میں ابھی تک جان نہیں پایا کہ بار بار اکمپنی کیسے ڈی ڈبلیو کو ڈیل کر رہی تھی؟ کہیں کوئی کاغذات نہیں، کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔“ وہ موبائل کان سے لگائے پریشانی سے پیشانی رگڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ قدم دھیرے دھیرے زینوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”مجھے ایسے کیوں لگ رہا پے جیسے ڈی ڈبلیو کا پراجیکٹ ہمیشہ سے وارلڈ کے ہاتھ میں تھا!“ جندل نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ وارلڈ نے اسلحے کے لیے رقم ضرور دی تھی مگر پراجیکٹ پر مکمل کام اس کا نہیں ہے۔ پہلے بابا اور پھر مارک نے اسے سنبھالا تھا۔“ وہ اب زینے چڑھ رہا تھا۔

”خیر۔۔ جو بھی ہے۔ تم انسان کے بچے بنو، مجھے تپ چڑھ گئی ناں تو ہڈیاں توڑ دوں گا تمہاری۔“ وہ آخر میں دھمکی دینا نہیں بھولا تھا۔ مائک نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

”مجھ پر شک مت کیا کرو۔ دل سے تمہارے ساتھ ہوں، دل سے!!“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”بہت زبان چل رہی ہے۔ زخم مندمل ہو گئے ہیں کیا تمہارے؟!“ طنزیہ انداز میں کہتا وہ اسے سلگا گیا تھا۔ اسے

مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی تبھی کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ مائک نے دانت کچکچا کر موبائل کو دیکھا پھر تیزی سے زینے چڑھنے لگا۔ آخری اطلاعات کے مطابق کوئی اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ اور اس کا ملاقاتی کمپنی کی چھت پر کیا کر رہا تھا، اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔

اگلے لمحات میں وہ چھت پر پہنچ چکا تھا۔ وہ شخص فاصلے پر اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ مائک دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے برابر میں کھڑا ہوا۔ اتنا اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ملاقاتی کوئی اور نہیں ابراہم وارلڈ تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں ارد گرد کے منظر پر ٹکائی تھیں۔ وہ بلندی پر کھڑے تھے، بہت زیادہ بلندی پر۔ یہاں سے وہ بینکاک کا نظارہ کر سکتے تھے۔ اونچی عمارات ان کے سامنے تھیں۔ مصروف شاہراہیں اور پیادہ لوگ۔۔ سب کچھ نگاہوں کے عین سامنے تھا۔

”تمہیں لگا تم بار بار اگروپ کے چیئرمین بن جاؤ گے تو ساری چیزیں خود بخود تمہارے انڈر آجائیں گی۔“ ابراہم کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ مائک نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے۔

”ساری نہ سہی۔۔ تھوڑی بہت۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”تم یہاں غلط تھے۔ بار بار اگروپ کے پاس جو تھا میرا دیا ہوا تھا۔ وہ جب تک میرے تابع رہے ان کے پاس دولت بھی رہی اور طاقت بھی۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے مائک! تم بس ایک عام سے گروپ کے چیئرمین ہو۔ بہت جلد تمہارے ارد گرد کی دنیا بدلے گی۔ کمپنی ایک کے بعد ایک نقصان اٹھائے گی۔ تم دیوالیے کی طرف جاؤ گے۔ تب تمہیں معلوم ہو گا کہ۔۔ دولت اور طاقت کیوں ضروری ہے؟!“ اس کے الفاظ میں سچائی تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، اسے کرنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اس کا چہرہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ مائک کو ایک لمحے کے لیے اس سے خوف محسوس ہوا تھا۔ اسے خوف محسوس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے سامنے کھڑا شخص قاتل تھا، سفاک قاتل!

”اور ازا؟ کیا سالوں جس لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھا اس کے ساتھ بھی یہی کریں گے؟!“ اس کا انداز خاصا چبھتا ہوا تھا۔ لہجے میں طنز کا شائبہ تھا۔ وارلڈ سر جھٹک کر ہلکا سا مسکرایا تھا۔

”نہیں، ازا مختلف ہے۔ میں اس سے لڑنا چاہوں گا۔ کمپنی کے ذریعے وہ میری ٹکر پر آسکتی ہے۔ مجھے اچھا لگے گا جب میں اسے اپنے مدمقابل دیکھوں گا۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ آنکھیں چمکی تھیں۔ مائک کو وہ اس لمحے تھوڑا مختلف لگا تھا۔

”تم نے وارلڈ کے ساتھ کیا کیا ہے دلال؟!“ اس نے ابراہم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔ یہ پہلی بار تھا ابراہم نے چہرہ ترچھا کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑی تھیں۔

”میں ہی۔۔ ابراہم وارلڈ ہوں!“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔ مائک کا سر بے اختیار نفی میں ہلا تھا۔

”میں بے وقوف ہوں مگر اتنا نہیں ہے کہ بچپن سے جس شخص کو دیکھتا آیا ہوں اسے سمجھنے میں غلطی کر دوں۔ مجھے یقین ہے تم ابراہم وارلڈ نہیں ہو۔ تم ابراہم ہو ہی نہیں سکتے!! تم دلال ہو دلال!!“ اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ ابراہم سر جھٹک کر ہلکا سا ہنس دیا۔

”تم بے وقوف ہو۔۔ بہت بڑے بے وقوف۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اور مائک۔۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس ثبوت کو ڈھونڈنا چاہتا تھا جو ثابت کرے کہ اس کے سامنے کھڑا یہ شخص ابراہم وارلڈ نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا یہ سچ ہے۔۔ اور سچ ہمیشہ ظاہر ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ اسے یہ راستہ ڈھونڈنا تھا۔ اسے یقین تھا جو دکھ رہا ہے وہ سراب ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ۔۔ دور کہیں زنداں میں سر دیوار پر ٹکائے یخ ٹھنڈے فرش پر بیٹھا ایک قیدی۔۔ یک ٹک چھت کو تک رہا تھا۔ اس نے آج پھر خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب۔۔ جو وہ کئی سالوں سے دیکھتا آرہا تھا۔

سمندر ہے، سمندر میں طوفان ہے۔ آسمان سے بجلی گر رہی ہے۔ لہریں بپھری ہوئی ہیں۔ بحری جہاز لہروں پر تیرتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ جہاز کو جھٹکے لگ رہے ہیں، سمندر انسانی جان کے لیے پیاسا ہے۔ اندھیر تاریک رات ہے۔ بجلی کی چمک ایک لمحے کے لیے سمندر کی دنیا کو روشن کر دیتی ہے۔ وہ۔۔ جہاز کے عرشے پر ایک معصوم بچی کو اپنی شال میں لپیٹے کھڑا ہے۔ اسے بہر صورت اس بچی کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے۔۔

اس قیدی کے لیے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ یہ خواب ہے۔۔ یا اس کے ماضی کی ایک جھلک۔

☆☆☆

"خیام۔۔۔ خیام جی۔۔ آپ کو میری بات سننا ہو گی۔" وہ اپنی نشست پر آگے کھسکتی بچوں کی طرح منمنائی تھی۔ جبکہ گرم کافی کے گھونٹ بھرتے خیام کا منہ "خیام جی" سنتے ہی کافی سے جل گیا تھا۔ اس نے کھانستے ہوئے کافی کا کپ میز پر رکھا تھا۔

"کیا ہے؟ کیوں مجھے مروانے پر تلی ہو؟ تمہیں جیسے اپنے شوہر کا پتا نہیں ہے، شکل تک تو دیکھنا نہیں چاہتا وہ میری۔" وہ جھنجھلایا تھا۔ سعاد نے لب دانتوں میں دبائے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ اور وہ اس کے انداز پر سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ کپ میز پر پٹخ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ اگلے لمحات میں وہ زیاد کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز کے پار بالکل مقابل! زیاد سنجیدگی سے اس پر نگاہ ٹکائے بیٹھا تھا جسے اپنا مدعا پیش کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ خیام کے برابر میں سعاد کھڑی تھی۔ خونخوار نظروں سے زیاد کو گھورنے کا مشغلہ جاری تھا۔ کمرے کے ایک طرف ازا، ضرار، جندل اور بدر کمپنی کا معاملہ سنبھالنے کے لیے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ زیاد نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی پھر منتظر نگاہوں سے خیام کو دیکھا جو دوسری بار اپنا گلا کھنکھار رہا تھا۔ سعاد نے دانت کچکچائے تھے۔

"تمہیں میری شاگردہ کی بہادری پر شک نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے بالآخر بولنے کی ہمت کر ہی لی۔ سعاد نے زیاد

کو گھورتے ہوئے "سمجھ گئے ناں" والے انداز میں سر کو جنبش دی۔ "لڑائی کے دوران اسے کمرے میں بند کر دینا خاصی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ تم سے پہلے بھی وہ اس طرح کے موقعوں پر لڑ چکی ہے۔ بلاشبہ اس نے ہر میدان میں جھنڈے گاڑے ہیں۔ تمہاری یہ حرکت میری تربیت پر تمانچہ ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ سعاد نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ زیاد کا چہرہ سپاٹ رہا۔ جیسے کہہ رہا ہو، "جاری رکھو۔"

"مجھے اندازہ ہے تم اس کی پروا کرتے ہو۔ مگر کام کے معاملے میں اس کے شوہر مت بنا کرو۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہے، وہ اپنے لیے خود لڑ سکتی ہے۔" اس نے بات مکمل کی۔ منتظر نگاہوں سے زیاد کو دیکھا جو اب دونوں ہاتھ باہم ملائے کہنیاں میز پر ٹکائے آگے ہوا تھا۔

"وہ خود لڑ سکتی ہے میں جانتا ہوں۔ مگر ازا کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا!" اس نے جیسے اپنے عمل کی وجہ بتائی۔ سعاد نے حیرت سے اسے دیکھا جو خیام کے سامنے اپنا بیان بدل چکا تھا۔

"اوہ۔۔ سعاد کو پھر یقیناً غلط فہمی ہوئی ہوگی کہ تم نے اس کی حفاظت کے لیے اسے کمرے میں بند کیا تھا۔" خیام نے مسکرا کر سعاد کو دیکھا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ عین موقعے پر بیان بدل رہا ہے استاد جی۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا ازا سے پوچھ لیں۔" وہ تقریباً چلا ہی تو اٹھی تھی۔ اپنا نام سننے پر ازا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ باقی سب بھی سعاد کے احتجاج پر ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"ازا، کیا زیاد نے یہ کہا تھا کہ اس نے سعاد کی حفاظت کے لیے اسے کمرے میں بند کیا تھا؟" خیام براہِ راست ازا سے مخاطب ہوا۔ اس نے گڑبڑا کر پہلے سعاد کو دیکھا پھر زیاد کو۔ اور پھر تیزی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ سعاد نے بے یقینی

سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھا۔ زیاد مسکراہٹ دباتا سر جھکا گیا۔

"یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں استاد جی۔۔ آپ تو میرا یقین کریں۔ زیاد نے سچ میں یہی کہا تھا۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔ خیام نے بے اختیار گہری سانس لی تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان برا پھنسا تھا۔

"تمہیں کچھ اور نہیں کہنا تو میں جاؤں؟ مجھے اپنے بہت سے کام ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے سوالیہ نظروں سے خیام کو دیکھا۔ خیام کا سر اثبات میں ملنے ہی لگا تھا کہ سعاد بول اٹھی تھی، "تمہیں میں دیکھ لوں گی۔ اچھا نہیں کر رہے تم!!" وہ دھمکی دینے کے انداز میں کہتی سینے پر بازو باندھ چکی تھی۔

"تم یہاں تصحیح کرلو۔" وہ اٹھتے ہوئے خیام سے مخاطب ہوا تھا۔ "اس کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ میں اپنی بہن کے بعد تم جیسے لوگوں کے ہاتھوں اپنی بیوی کو تاریک گڑھے میں نہیں دھکیل سکتا!" سخت لہجے میں طنزیہ انداز میں کہا گیا تھا۔ خیام سختی سے لب بھینچ گیا تھا۔ ماحول میں تناؤ محسوس کرکے وہ وہ چاروں گہری سانس لے کر واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ان کے جھگڑے کبھی ختم نہیں ہو سکتے تھے، کبھی نہیں!

"زبان دیکھیں اس کی۔ کاٹنے والی ہو رہی ہے۔" سعاد نے دانت کچکچائے تھے۔ زیاد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑی اور اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

"اوئے۔۔ میں تمہاری جان لے لوں گی زیاد!!" وہ اس کے ساتھ تقریباً کھنچتی ہوئی جا رہی تھی۔ غصے سے چہرہ ایکدم سرخ ہوا تھا۔ وہ اسے باہر لایا تھا۔ مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ سعاد نے جھٹکے سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کروائی تھی۔ خونخوار نظروں سے اسے گھورا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں تو خیام کے گھر جانا تھا؟" وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے گڑبڑا کر اسے دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا وہ ان حالات میں اس طرف دھیان نہیں دے گا۔۔ مگر یہ اس کی

بھول تھی۔ وہ لب دانتوں میں دبا گئی۔ ”مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا جب ہر وقت شیرنی کی طرح بپھری ہوئی سعاد یوسف زئی میرے ساتھ اتنے پیار سے پیش آئی تھی۔“ اس نے دانت کچکچائے تھے۔

”میں بس۔۔۔ یہاں آکر کچھ سسٹم دیکھنا چاہتی تھی۔۔ تمہیں بتاتی تو تم وارلڈ کی وجہ سے کبھی یہاں آنے نہیں دیتے۔“ وہ منمنائی تھی۔ آواز ایکدم دھیمی ہو گئی تھی۔ وہ بے اختیار نرم پڑا تھا۔

”میرے متعلق غلط اندازے مت لگایا کرو۔ تم مجھے جانتی ہی کتنا ہو؟!“ خفگی سے کہتا وہ دو قدم آیا۔ درمیان میں فاصلہ گھٹایا۔ سعاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ زیاد نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت ہلکی سی موڑ کر اس کی پیشانی پر رکھی۔ سعاد نے سختی سے آنکھیں میچیں۔ اگلے ہی لمحے وہ پورے زور سے اپنی انگشت شہادت کو انگوٹھے کے زور سے اس کی پیشانی پر مار چکا تھا۔ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتی چیخی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ دباتا پلٹ گیا تھا۔

”اگلے دس دنوں تک شکل مت دکھانا اپنی مجھے زیاد تاشفین!!“ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھے دبا دبا سا چلائی تھی۔ وہ کھل کر مسکراتا راہداری کا موڑ مڑ چکا تھا۔

☆☆☆

کیمرا کی جلتی بجھتی روشنیاں، تیز چبھتے ہوئے لہجوں میں اٹھتے ہوئے سوال، پرسکون اور بھاری آواز میں ملتے جواب۔۔ وہ سامنے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اسٹیج کے نیچے ذرا ہٹ کر دو سے تین آدمی کھڑے تھے۔ ہال میں قطار میں لگی کرسیوں پر صحافی بیٹھے تھے۔ کئی کیمرا تھے اور ہر ایک اس کی تصاویر اتارنے میں مصروف تھا۔ وہ پہلے اس سے کوئی سوال کرتے اور پھر اس کا جواب لکھنے میں مشغول ہو جاتے۔ ہال صحافیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایسے میں۔۔ وہ۔۔ ابراہم وارلڈ پرسکون سا ہر ایک کے سوال کا جواب دیتا شدت سے کسی کا منتظر تھا۔ وہ بہت انتظار کر چکا تھا، وہ مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ اسے کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ لڑکی اندر

آئی تھی۔ سیاہ ہیلز کی ٹک ٹک سنائی دی تھی۔ خاکی رنگ کا لانگ کوٹ پہنے، گلے میں پرنٹڈ گلابی رنگ کا اسٹول ڈالے، بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑے وہ پورے اعتماد سے چلتی آگے آئی تھی۔ اس کے پیچھے اس کی ٹیم کا ایک فرد تھا۔ وہ یہاں بطورِ صحافی آئی تھی مگر ایک لمحے کے لیے ہر ایک کا دھیان اپنی طرف کھینچ چکی تھی۔ کیمروں کا رخ ابراہم سے ہٹ کر ازا کی طرف ہوا۔ صحافی اس کی طرف متوجہ ہوا جو ابراہم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

”کیا یہ سچ ہے ابراہم وارلڈ نے آپ کا اور اپنا تعلق ختم کر دیا ہے؟ آپ اس سے متعلق کچھ کہنا چاہیں گی؟“

”ازابیلا۔۔ آخر ایسا کیا ہوا جس نے ابراہم وارلڈ کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا؟“

”آپ ابراہم وارلڈ کی دولت کی واحد وارث تھیں۔ کیا آپ آسانی سے اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں گی؟“

بے انت سوال تھے۔ وہ کسی کو جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ ابراہم وارلڈ مکمل اس کی طرف متوجہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

” کمپنی پر حملہ آپ نے کروایا ہے؟!“ اس کا ایک سوال وہاں موجود تمام لوگوں کے سوالات پر بھاری تھا۔ ایک لمحے کو ہال میں سکوت چھا گیا۔ سب کی نظریں ابراہم کی طرف اٹھیں۔ چہ مگوئیاں ہوئیں۔ ”کیا ازاتا شفین کو مروانے کا حکم تم نے دیا تھا دلال؟!“ اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ ابراہم نے بغور آنکھیں چھوٹی کیے اس کی آنکھوں میں چمکتی ہلکی سی نمی کو دیکھا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب سعاد اور بدر یہاں کے سسٹم میں داخل ہوئے تھے۔ پورا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ ابراہم کے عقب میں نسب بڑی سی اسکرین روشن ہوئی تھی۔ اگر وہ تمام چینلز بند کروا سکتا تھا جہاں انہوں نے یہ ویڈیو لائیو دکھائی تھی تو ان کے پاس بھی اتنی ہی طاقت تھی کہ وہ دنیا کے سامنے وہ ثبوت لے آتے۔ اسکرین پر

وارلڈ گلاس کمپنی کی چھت پر اترتے لوگ نظر آئے۔ ان کے سینوں پر لگے بیج بالکل واضح دکھائے گئے۔ ابراہم نے مڑ کر اپنے عقب میں چلتی فلم کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی نگاہیں ازا پر ٹکی رہیں، جس کی نگاہوں میں اس کے لیے بس نفرت تھی۔ شدید نفرت!

وہاں کھڑے صحافی ویڈیو کور کارڈ کرنے لگے۔ کئی سوال اٹھے۔ ابراہم ہر ایک کے سوالوں کی زد میں آیا۔ اس نے نظریں جھکا کر گہری سانس لی تھی۔ آنکھوں میں پگھلتی نمی کو اندر اتارا تھا۔

"تم ستارے گن سکتی ہو ازابیلا؟ ستارے گنو گی تو رات کی تاریکی سے ڈر نہیں لگے لگا۔" ایک شفیق اور مہربان باپ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس نے برابر میں رکھی کرسی پر گرفت مضبوط کی تھی۔

"ابراہم وارلڈ حقیقتاً ایک بحری قزاق ہے جو سالوں سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا۔ یہ شخص درندہ ہے، ایک سفاک قاتل جس کے ہاتھوں پر ہزاروں انسانوں کا خون ہے۔ یہ شخص میرا باپ نہیں ہے۔ میرے والدین کا قاتل ہے یہ!" اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ سب دم سادھے اسے سن رہے تھے۔ اور وہ۔۔ وہ خود اپنی آواز نہیں سن پا رہی تھی۔

"سمندر سے مت ڈرا کرو۔ اس کی گہرائی میں جاؤ، تم ہر وہ وجہ بھولنے لگو گی جو تمہیں سمندر سے خوفزدہ کرتی ہے۔ اور یہی سمندر کی خوبی ہے۔ تمہیں اپنے خوف پر قابو پانا سیکھنا ہو گا ازابیلا۔" کسی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے محافظ کو دیکھا تھا۔

"مجھے یقین ہے اس ہال میں جو کچھ کہا جائے گا وہ باہر کی دنیا تک کبھی نہیں پہنچے گا کیونکہ یہ شخص اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اپنے خلاف بولنے والوں کا منہ بند کروا سکے۔ یہ شخص بہروپیہ ہے۔ کل اگر آپ کو یہ سیاست کے میدان میں کھڑا ملے تو حیران مت ہوئیے گا بلکہ میں اب بھی وثوق سے کہہ سکتی ہوں اس شخص کے لیے سیاست بھی ایک

کھیل ہے۔ ملک کا وزیر اعظم ہو، صدر، عدالت میں بیٹھا قاضی یا میدانِ جنگ میں لڑتا فوجی۔ ہر شخص اس کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ ورنہ ممکن ہی نہیں دنیا اتنے بڑے قاتل کو آزاد رہنے دے۔" اس کی آواز، اس کا لہجہ، انداز سب کو مات دے رہا تھا۔ کسی کی جرات نہیں تھی اس کی بات کاٹے۔ کوئی درمیان میں سوال کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ ابراہم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے للکار رہی تھی اور وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لبوں پر ہلکی سی مسکان لیے اسے سن رہا تھا۔ آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ ستائش تھی۔

"سب سے پہلے تمہارا نام دیکھتے ہیں۔ ازا۔۔۔ ازا بیلا۔ ازا بیلا وارلڈ کیسا رہے گا؟ ویسے اگر تم میرا نام نہیں لینا چاہتی تو بس ازا بیلا بھی خاصا رعب دار ہے۔" کرسی پر اس کی گرفت سخت ہوتی گئی جسے ابراہم نے بخوبی محسوس کیا تھا۔

"میں۔۔۔ ازا تاشفین آج تمہیں مردوں کی طرح میدان جنگ میں آنے کے لیے للکار رہی ہوں۔ تمہاری فوج بہت بڑی ہے دلال! مگر یاد رہے میں اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہوں کہ قدرت فتح و شکست، ناکامی و کامیابی پر قادر ہے۔ تم سالوں پہلے بھی میری جان نہیں لے سکے تھے، تم اب بھی کامیاب نہیں ہو گے۔"

"میں تمہاری جان نہیں لینا چاہتا ازا! میں یہ کبھی نہیں چاہتا تھا۔" اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ ازا نے سانس روکے اسے دیکھا تھا۔

"تم کتنی معصوم ہو ازا بیلا۔ مجھے تم بہت عزیز ہو۔ میں تمہیں بہت آگے دیکھنا چاہتا ہوں، بہت زیادہ آگے۔" اس نے پلک جھپکی تھی۔

"مجھے مزید کچھ نہیں کہنا۔ امید ہے اب تم مردوں کی طرح وار کرو گے دلال!" ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر وہ پلٹ گئی۔ اس کے پلٹتے ہی صحافیوں کا ہجوم اس کی طرف بڑھا۔ دھکم پیل شروع ہوئی۔ اس وقت اس کے ساتھ کھڑا اس کا گارڈ ہر ایک کو دھکیلتا اس کے لیے راستہ بنا رہا تھا۔ وہ جس طرح اعتماد سے سر اٹھا کر اندر آئی تھی، ویسے ہی

نکل رہی تھی۔ اور یہ پہلی بار تھا ابراہم کا دھیان اس کے گارڈ کی طرف گیا تھا۔ اس کے لبوں پر رینگتی مسکراہٹ غائب ہوتی گئی۔ اس نے وہاں جندل کو دیکھا تھا۔۔ جندل جو ازا کے لیے راستہ بنا رہا تھا۔

ایک وہ لڑکا تھا۔۔ جسے اس نے بحری جہاز کے عرشے پر خود کو نفرت سے گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک وہ لڑکی تھی جو بحری جہاز کے کونے میں دبکی گھٹنوں سمندر کو تکا کرتی تھی۔ اس شام اس نے ان دونوں کو سمندر کی نذر ہوتے دیکھا تھا۔ سمندر ان دو "سمندروں" کو خود میں سمو نہیں پایا تھا تبھی وہ دونوں سالوں بعد اس کے مقابلے کے لیے کھڑے تھے۔ البتہ سالوں بعد ایک مشترکہ چیز اب بھی تھی۔۔

وہ تب بھی ازا تاشفین کو نہیں جندل ہوسف زئی کو مارنا چاہتا تھا۔ اسے اب بھی جندل یوسف زئی سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔ وہ سمندروں کا عاشق تھا۔۔ اور دو عاشق۔۔۔ رقیب ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے سخت دشمن!

☆☆☆

شفق کے کنارے ڈوبتے سورج کی سرخی سے دہک رہے تھے۔ گہرا سرخ رنگ جس میں رات کی سیاہی گھلنے لگی تھی۔ ہلکے سرد ہوا کے جھونکے ٹھٹھرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ آبادی سے دور یہ اونچی عمارت شہر کے الگ ہی کونے میں معلوم ہوتی تھی۔ یہ سنسنان علاقہ تھا جہاں کسی ذی نفس کا گزر شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ عمارت چاروں طرف سے گھنے جنگل میں گھری تھی۔ درمیان میں درختوں کو کاٹ کر راستہ بنایا گیا تھا۔ اونچے گھنے درخت پوری عمارت پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ وہ تنہا اس عمارت کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دروازہ۔۔۔ وہ دروازہ جس کی دہلیز پر قدم رکھنے کا مطلب موت کے دہانے پر کھڑا ہونا تھا۔ وہ فیصلہ کر کے آیا تھا، اسے یہ دروازہ پار کرنا تھا۔ اس نے سوچنے کے لیے مزید وقت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ذرا آگے ہو کر دروازے پر نسب چھوٹی سی اسکرین پر اپنا چہرہ دکھایا۔ شناخت ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ اس کے قدم اٹھے اور اگلے لمحات میں وہ عمارت کے اندر کھڑا تھا۔

وہ قدم رکھ چکا تھا۔ یہاں سے اس کی نئی زندگی شروع ہونی تھی۔ وہ اب آزاد نہیں ہوگا، وہ اب بے فکر نہیں ہوگا اس کی راتیں اب سلاخوں کے پیچھے ٹھنڈے یخ فرش پر کروٹیں بدلتے گزریں گی یا پھر میدانِ کارزار میں دشمن سے جنگ کرتے ہوئے۔ اس کی شامیں اب پہلے کی طرح زندگی سے بھرپور نہیں ہونگی۔ اب ہر لمحہ اسے موت کا خنجر اپنی شاہ رگ پر محسوس ہوگا۔ اب اس کے دوست کم دشمن زیادہ بنیں گے۔ اس نے جو دروازہ پار کیا تھا، وہ خوف کا دروازہ تھا۔ یعنی اب۔۔ ذات باری تعالیٰ کے سوا کوئی اس کے لیے خوف کا باعث نہیں ہوگا۔ نہ موت۔۔ نہ زندگی!

یہ میدان کچھ زیادہ لمبا نہیں تھا۔ یہاں سے راستہ اندر راہداری کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہی راہداری تھی جس کے سرے پر اس دن وہ جندل اور خیام کے گلے لگ کر رویا تھا۔ اس بار اسے یہاں نہیں جانا تھا۔ اس کے قدم مخالف سمت میں اٹھے تھے۔ وہ دائیں طرف آیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ دیوار کے پاس آیا۔ پرسوچ نظروں سے دیوار کو دیکھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر سر جھکا کر نیچے دیکھا۔ وہ کسی ڈھکن کے اوپر کھڑا تھا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا، پنجوں کے بل بیٹھ کر وہ ڈھکن اٹھایا۔ یہاں سے اسے نیچے سیڑھیاں جاتی نظر آئیں۔ اس نے رک کر ارد گرد نگاہ ڈالی پھر بنا وقت ضائع کیے نیچے اتر گیا۔ اس کے پیچھے وہ ڈھکن دوبارہ بند ہو گیا۔ وہ دھیرے دھیرے زینے اترنے لگا۔ ہر سُو موت کی سی خاموشی تھی۔ توقع کے برعکس اسے راستہ دکھانے تک کے لیے یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ زینے اتر کر نیچے آیا تو اپنے سامنے اونچی دیواروں کے درمیان سفید فرش والی راہداری پائی۔ اس نے قدم آگے بڑھادیے۔

غیر محسوس طریقے سے وہ بنا چاپ پیدا کیے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سفید جاگرز راہداری کے آخری سرے پر رکے۔ سر اٹھا کر اس نے سامنے دیکھا۔ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑا تھا۔ خاک آلود زمین دور تک پھیلی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک لڑکا اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ سیاہ پینٹ پر سیاہ جیکٹ پہنے اور ہم رنگ ہی جاگرز میں

پاؤں مقید تھے۔ بدر نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ دیوار کے ساتھ بندھی مضبوط سفید رنگ کی تار میں اس کا پاؤں الجھا اور اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل فرش پر گرا۔ اسے اپنے منہ میں مٹی کا ذائقہ محسوس ہوا۔ ناک کی ہڈی ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ اس کی طرف پشت کر کے کھڑا لڑکا پلٹا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا۔ پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھا۔

”تم اپنے پہلے امتحان میں ہی بری طرح ناکام ہوئے ہو۔“ آواز مانوس سی تھی۔ بدر نے حیرت سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ زیاد ایک نگاہ اس پر ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا ہڑبڑا کر کھڑا ہوا۔ جیکٹ کے آستین سے چہرہ رگڑا۔ سیاہ بالوں کا رنگ خاکی ہو چکا تھا۔ جیکٹ اور پینٹ دونوں ہی خاک آلود ہو چکی تھیں۔ اس نے زیاد کو دیکھ کر منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

”آپ کو کم از کم مجھے آگاہ کرنا چاہیے تھا تاکہ میں ہوشیار رہتا۔“ اس نے منہ بسور کر کہا تھا۔

”اب کر رہا ہوں۔“ سنجیدگی سے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے کہا گیا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے کم فہمی سے زیاد کو دیکھا۔ عین اس وقت کوئی بھاری چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی۔ اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں کے آگے ایک لمحے کے لیے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اس چیز کو دیکھنا چاہا جو اس کے سر سے ٹکراتی دائیں طرف گئی تھی۔ وہ بھاری لوہے کی بال تھی جو اب مضبوط سلاخ سے جھولتی واپس اسی کی طرف آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک طرف ہوتا وہ دوبارہ اس کے سر سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور دوبارہ منہ کے بل زمین پر گرا۔ پیشانی پر بال کے لگنے سے خون کی ننھی بوندیں چمکیں۔ رخسار پر ہلکا سا زخم آیا۔ ہاتھ بری طرح چھل گئے۔ وہ زمین پر چت لیٹا کراہ اٹھا تھا۔

"دوسرے میں بھی ناکام ونامراد ٹھہرے۔" سنجیدگی سے کہا گیا۔ بدر کا دماغ یہیں سے ٹھنکا۔

"کیا مطلب اور بھی۔۔۔" وہ ہڑبڑا کر کہتا اٹھنے لگا تھا جب اس کا پاؤں زمین میں دبے چھوٹی چھوٹی کیلوں پر پڑا تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکلی تھیں۔ ہر سُو چھائے سناٹے پر گہری دراڑیں پڑی تھیں۔ زیاد نے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اپنے کان کو رگڑا تھا، گویا اسے بدر کی چیخیں ناگوار گزری تھیں۔

"تم اپنے آخری امتحان میں نامراد ٹھہرے۔" اور بدر اپنا چیخنا بھول کر دھم سے واپس وہیں گر گیا۔ وہ کیل جانے کیسے تھے اس کے جاگرز پھٹ چکے تھے۔ اس کا پاؤں زخمی ہو چکا تھا۔ درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔ وہ گہری سانسیں لیتا اپنا تنفس بحال کرنے لگا۔

"کھڑے ہو جاؤ بدر!" زیاد نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ بادل نخواستہ ہونٹ بھینچ کر درد برداشت کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ خفا نگاہوں سے زیاد کو دیکھا جس کا چہرہ ایکدم سپاٹ تھا۔

"تم نے جس راہ کا چناؤ کیا ہے وہاں ہر پل تمہیں ہوشیار رہنا ہو گا۔ ہر پل ہر لمحہ! کوئی تمہیں خبردار نہیں کرے گا، کوئی تمہارے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ تم مر رہے ہو گے لوگ تمہیں مرتا چھوڑ جائیں گے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے تو خود اٹھو گے۔ تمہارے زخموں پر کوئی مرہم نہیں رکھے گا۔ تمہیں اپنی جان بچانی ہے، تمہیں اپنے زخموں کو خود سینا ہو گا۔ تمہیں تکلیف ہو گی، درد ہو گا، تکلیف بھی ہو گی مگر تم سیکھ جاؤ گے بدر! اپنے آنسوؤں کو کیسے پیتے ہیں اور چیخوں کو کیسے روکتے ہیں تم سیکھ جاؤ گے۔" اس نے گہری سانس لی تھی۔ بدر نے سر جھکا کر آنکھوں میں اڈتی نمی کو اندر اتارا تھا۔ زیاد نے بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ جب ایسے۔۔۔ سر جھکا کر آنسوؤں کو اندر اتار رہا تھا تو سعاد کی شبیہ دے رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ اس کے ساتھ کیسے سختی سے پیش آنے والا تھا جبکہ۔۔۔ یہ لڑکا ہر پہلو سے سعاد جیسا لگتا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے تھے۔ وہ دو لمبے اونچے مرد شانہ بشانہ چل رہے تھے۔۔ برابر برابر۔ دونوں کے ہاتھوں میں گرم کافی کے کپ تھے۔ حلق کو گرم کافی سے تر کرتے وہ دونوں ہی گہری سوچوں میں گم تھے۔ سوچ کا دھارا تھا جو مختلف سمتوں میں بہہ رہا تھا اور وہ دونوں اس میں گرتے جا رہے تھے۔ شفق کی رعنائیاں اور شوخیاں رات کی تاریکی میں دب رہی تھیں۔ عنقریب سیاہی پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔

سیاہی۔۔ اندھیرا۔۔ تاریک اور پراسرار گہرا اندھیرا۔

"میں غالباً سولہ یا سترہ سال کا تھا جب میری ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی تھی۔" جندل نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔ خیام نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھنے لگا۔ قدم ہنوز اٹھتے رہے۔ "وہ لڑکا عمر میں مجھ سے تقریباً دو سے ڈھائی سال بڑا تھا۔ اسے دیکھ کر۔۔ کسی عرب سلطان کا گمان ہوتا تھا۔ مگر میں کبھی نتیجے پر پہنچ نہیں سکا کہ وہ حقیقت میں کون تھا۔ کیونکہ دوسری طرف وہ کوئی مغربی شہنشاہ لگتا تھا۔ وہ رات کی تاریکی کی طرح ہر شے خود میں سمیٹ لیتا تھا۔ وہ گہرا تھا کسی سمندر کی طرح۔۔ مگر میں اسے سمندر نہیں کہہ سکتا۔ بہت جلد میں نے اسے اپنے دل کے قریب محسوس کیا تھا۔" اس کی آواز میں نرمی تھی۔ ان دونوں کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ خیام کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ جندل کے تاثرات ہنوز نرم سے رہے تھے۔

"جب میں پہاڑوں پر اس کے ساتھ چڑھتا، جب کھلے میدانوں میں ہم دونوں دوڑتے۔۔ جب ہمارے نعرہ تکبیر سے سنگلاخ چٹانیں تک گونج اٹھتیں تو۔۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکا میرا ہی حصہ بن گیا ہے۔ تم مجھے عزیز ہوتے گئے یار۔ میرے دوست، بھائی، ہمراز۔۔ مجھے سمجھنے والے سب تم تھے۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر ہم دونوں ہمیشہ ہر میدان میں شانہ بشانہ لڑے ہیں۔ دشمن نے کبھی ہمیں گھیرا ہے تو اس حال میں کہ ہمارے کندھے سے کندھا

جڑا تھا اور پشت سے پشت ملی تھی۔ ہم دونوں کے پاس ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ خیام نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔ "تم اپنے راز خود تک رکھتے مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر یہ تو بتا دیتے کہ بدر "ہمارا" بھائی ہے۔" اس نے شکوہ کناں نظروں سے خیام کو دیکھا تھا۔ خیام نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ حیرت و بے یقینی سے سانس روکے بنا پلک جھپکے اسے دیکھا تھا۔ دل ایکدم زور سے دھڑکا تھا۔

"اتنا تو یقین کرتے ناں مجھ پر۔ کیوں ہمیں اندھیرے میں رکھا خیام؟!" اس کی خفا نگاہیں خیام کو اپنا دل چیرتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے سختی سے مٹھیاں بھینچی تھیں۔ وہ ان سوالوں سے ہمیشہ راہِ فرار اختیار کرتا آیا تھا مگر آج۔۔ یہ سوال جندل پوچھ رہا تھا۔ اس کے لیے راہِ فرار ممکن نہیں تھی۔

"مجھے لگا تم۔۔ تم اسے مجھ سے چھین لو گے۔ میرے پاس اس کے سوا جینے کا کوئی سہارا نہیں تھا جندل! میں نے۔۔ میں نے اس دن بھی کوشش کی تھی جب وہ پانچ سال کا ہوا تھا۔ میں اسے تمہارے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر۔۔ مگر میں نہیں کر پایا۔ میں ایک بار پھر مصعب کو نہیں کھو سکتا تھا یار۔ کل رات جب مجھے اپنا بچھڑا بھائی ملا تب۔۔ تب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے دل میں ہم دونوں کی محبت کی کونپل پنپ رہی تھی۔ وہاں کوئی تفریق نہیں تھی۔۔ اور حقیقت میں یہ تفریق ہی تھی جو مجھے خوفزدہ کیے رکھتی تھی۔ میں ہر بار۔۔ ہر بار تکون کا تیسرا اتنہا سرا نہیں بن سکتا جندل!" اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں سالوں ساتھ رہنے کے باوجود خود کو کبھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اور یہی چیز انہیں مشکل بناتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے تھے کہ سمجھے جا سکیں۔

"ہماری رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے خیام مگر۔۔ وہ محبت جس کی کونپل تمہاری گود میں اس کے دل میں پھوٹی تھی وہ اس خون کے رشتے پر فوقیت لے گئی ہے۔ اور تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کبھی اس بات

کی اجازت نہیں دوں گا کہ خیام حنفی ایک بار پھر اپنے بھائی مصعب کو کھو دے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ خیام اسے دیکھ کر رہ گیا۔ چند پل دونوں خاموش رہے۔ اس خاموشی کو جندل کی شوخ آواز نے توڑا۔ "اور ویسے بھی۔۔۔ اب ہم تینوں کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے۔" وہ کہہ کر بے اختیار ہنسا تھا۔ اسے ہنستا دیکھ کر خیام بھی ہنس دیا تھا۔ اور یہی وہ پل تھا جب وسیع آسمان اپنی تمام تر وسعتوں سمیت اندھیرے کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

"تو۔۔ اب کیا ارادہ ہے؟ سعاد آپی کو بتاؤں؟" وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"شاید اسے جان لینا چاہیے۔ اب جبکہ بدر حزب اللہ میں شمولیت اختیار کر چکا ہے تو میرا نہیں خیال الزر قاوی سر کو اس پر اعتراض ہو گا۔ لیکن شاید پھر بھی ہمیں ان کی اجازت کا انتظار کرنا پڑے۔" خیام نے کافی کا کپ خالی کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ جندل نے سر کو ہلکی سی جنبش دی پھر کافی کا کپ لبوں سے لگا گیا۔ "ویسے۔۔ یہ زیاد۔۔ تمہیں یقین ہے یہ ہمارا غصہ مصعب پر نہیں نکالے گا؟"

"اگر وہ ایسا کرے گا تو پکا میرے ہاتھوں سے ضائع ہو گا۔" جندل نے بھرپور عزم کے ساتھ جواب دیا۔ خیام ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھا تھا۔ مہرے اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ شطرنج کی بساط کے ساتھ میز پر گلاس اور شراب کی بوتل رکھی تھی۔ صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا ابراہم منتظر نگاہوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ گھٹنوں پر رکھا دایاں ہاتھ دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی ہوئی تھی۔ کوٹ ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ روشنیوں میں نہایا کمرہ رات کی تاریکی کو مات دے رہا تھا۔ اسے چند پل ہی

مزید انتظار کرنا پڑا تھا۔ چند ثانیے بعد ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ گارڈز کے پہرے میں وہ لڑکا اندر آیا۔ ابراہم نے گردن ذرا سی دائیں طرف گرا کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ سفید قمیض شلوار میں ملبوس خاکی رنگ کی شال لپیٹے یہ لمبا اونچا مرد جندل یوسف زئی تھا۔ سیاہ بال سیٹ کر کے کھڑے کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں انتہا کی سنجیدگی تھی۔ وہ اعتماد سے چلتا آیا تھا۔ آرام سے اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔ اس کا یہ رعب دار انداز دیکھ کر ابراہم ہلکا سا مسکرایا تھا۔ آنکھوں کے اشارے سے گارڈز کو جانے کا کہا تھا۔ گارڈز باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ ابراہم نے شراب گلاس میں ڈالی پھر گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ شراب کا گھونٹ بھرا اور پھر صوفے سے ٹیک لگائی۔

"جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، سمندر میں۔ اس وقت میں تمہاری نگاہوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے تمہاری نگاہوں میں انتقام کی آگ دیکھی تھی، میں آج بھی وہی آگ دیکھ رہا ہوں۔" اس کی بھاری آواز جندل کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں نے اپنی زندگی جس مقصد کے لیے وقف کی ہے اس میں انتقام کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں نے اپنا انتقام خدا کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ جانے اور تم!" اس کے جواب پر ابراہم نے ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم میں مَیں نے وہ سب دیکھا تھا جو بحری کپتان میں ہونا لازم ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو لڑکے؟ تمہاری جگہ سمندر ہے۔" اس کی بات پر جندل سر جھٹک کر ہلکا سا ہنسا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر وہ آگے ہوا، اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑی تھیں۔

”تم جیسے بحری قزاق جب سمندر کو گندا کرنے کے بعد اپنے ناپاک ارادوں کے ساتھ ”بر“ کی طرف متوجہ ہوں تو ہمیں میدان میں اترنا ہی پڑتا ہے۔ آخر سمندر بھی تو اپنا انتقام لے گا ناں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وارلڈ اس کی بات پر ہلکا سا ہنس دیا تھا۔

”سمندر سے محبت تمہیں مروائے گی۔“ یاد دہانی کروائی گئی۔

”لیکن تمہیں سمندر مروائے گا“!

”دیکھتے ہیں نوجوان۔ تم بھی یہیں ہو اور میں بھی۔“ مسکراتے ہوئے کہہ کر وہ شراب کا گلاس لبوں سے لگا گیا۔ جندل نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر صوفے سے ٹیک لگالی۔ ”میں چاہوں تو ابھی تمہیں مروا سکتا ہوں کیونکہ تم سے میری دشمنی ازلی ہے۔ لیکن چونکہ میں نے تمہیں یہاں اپنی شرط رکھنے کے لیے بلایا ہے تو میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔“ وہ تمہید باندھ رہا تھا۔ جندل کو بے زاری ہوئی تھی۔

”جبکہ تم یہود اس کام میں ماہر ہو۔۔ وعدہ خلافی!“ تاک کر طنز کا نشتر پھینکا گیا تھا۔ ابراہم نے تنک کر اسے دیکھا تھا۔ بہت مشکل سے وہ خود کو کچھ سخت کہنے سے روک پایا تھا۔

”الزرقاوی میرے حوالے کر دو۔ میں تم سب کو یہاں سے سلامت جانے دوں گا۔ اب تک تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ تم نے یہاں آکر کتنی بڑی غلطی ہے۔ یہاں ہر طرف میرا جال بچھا ہے، تمہارا نکلنا ناممکن ہے۔“

”الزرقاوی ہی کیوں؟“

”اس نے اب تک جتنا مجھے نقصان پہنچایا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے۔“ اس کے جواب پر جندل نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔

”پھر تو تم نے مجھے یہاں بلا کر اپنا اور میرا وقت برباد کیا۔“ اس کی بات پر ابراہم نے دانت کچکچائے تھے۔

”سنو لڑکے! میں تمہیں جانے دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔۔ الزرقاوی کے خون کے بدلے تم حزب اللہ کے ہر جوان کا خون بچا سکتے ہو۔ ورنہ میں ایسی قتل و غارت مچاؤں گا کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔“ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ اس کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ جو کہہ رہا تھا وہ کر دکھاتا۔ اس کے لہجے میں اعتماد کی جھلک یقینی سی تھی۔

”جو کرنا ہے کر لو دلال! تم الزرقاوی کی خاک تک کو نہیں پا سکو گے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”تم غلطی کر رہے ہو۔“ اسے تنبیہہ کی گئی۔

”بعض اوقات غلطیاں بھی قابلِ تحسین ہوتی ہیں۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”شطرنج کھیلتے ہو لڑکے؟“ مسکراتے ہوئے سوال داغا گیا۔

”نہیں، میں عین موقع پر بساط الٹ دیتا ہوں۔“ اسی وقت اس نے بساط الٹ دی تھی۔ مہرے ابراہم کے قدموں میں جا گرے۔ وہ گردن جھکا کر طنزیہ ہنسی ہنسا۔ جندل سنجیدگی سے اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بنا وقت ضائع کیے باہر نکل گیا۔ ابراہم نے مسکراتی نگاہ اس کی پشت پر ڈالی پھر شراب کے خالی گلاس میں شراب الٹنے لگا۔ اس کی آج رات یہیں اور اسی حالت □□ میں گزرنے والی تھی۔

☆☆☆

وہ ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی گہری نگاہوں سے تاریک آسمان کو تک رہی تھی۔ سیاہ چادر پر جگہ جگہ بکھرے تارے اور چاند کی مدھم روشنی آنکھوں کے لیے خیرہ کن تھی۔ وہ سر اٹھائے چپ چاپ آسمان کو تک رہی تھی۔

سرمئی اونچی لمبی دیواریں تھیں جو دم سادھے اس اونچی عمارت کا بوجھ اٹھائے ہوئی تھیں۔ یہ عمارت جنگل کے بیچ میں تھی اور خاصی ویران جگہ پر۔۔ تبھی رات کے اس پہر حد سے زیادہ خاموشی تھی۔

اس کے عقب میں زیاد، جندل، خیام اور ضرار کا مشترکہ آفس تھا۔ آفس میں بدر، سعاد اور ضرار بیٹھے تھے۔ زیاد کسی کام سے اوپر تھا۔ خیام بھی یہیں کہیں تھا جبکہ جندل کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وہ چند لمحے بدر، سعاد اور ضرار کے ساتھ بیٹھی رہی مگر پھر اٹھ کر یہاں آگئی۔ سعاد اور ضرار کے پاس لڑنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔ بدر کی شوخ طبیعت کو کوئی نہ کوئی شرارت سوجھ ہی جاتی تھی۔ البتہ ان تینوں کے درمیان میں وہ، بہت غیر آرام دہ محسوس کر رہی تھی۔ اسے زیاد سے بات کرنی تھی۔ وہ اسے بلانا چاہتی تھی ورنہ خود وہیں جانا چاہتی تھی جہاں وہ تھا۔ اسے یہ سب اجنبی لگتے تھے۔ بدر، خیام، ضرار، جندل اور سعاد۔۔ وہ زیاد کی عادی تھی۔ اگر جان کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ کبھی یہاں نہ رکتی۔ یہ سب بس آپس میں ہی اچھے لگتے تھے۔ وہ چاہ کر بھی ان میں گھل مل نہیں سکتی تھی۔ یہ سب اس کے لیے ہمیشہ اجنبی ہی رہنے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ آواز خیام کی تھی۔ عین اس کے عقب سے آئی تھی۔ وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے مڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھیں۔

”وقت کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ زندگی بھر جنہیں اپنا سمجھتے ہیں وہ کس قدر اجنبی سے لگنے لگتے ہیں۔۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”اور اجنبی کس قدر اپنے اپنے سے لگنے لگتے ہیں۔۔“ وہ اس کی بات پر بری طرح چونکی تھی۔ پلٹ کر اسے دیکھنا چاہا مگر وہ ایک قدم آگے بڑھا کر اس کے بالکل عقب میں کھڑا ہوتا اس کی یہ کوشش ناکام بنا گیا۔ وہ دم سادھے سامنے دیکھنے لگی۔ ”اگر تم یہاں کمفرٹیبل نہیں ہو تو زیاد سے کہوں آجائے؟“

"نہیں۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ اسے پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی وہ کام کر رہا ہو گا۔" اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ خیام نے سر کو جنبش دی۔ چند ثانیے دونوں خاموش رہے پھر ازا نے کچھ سوچ کر سوال داغا۔

"تمہارا اور زیاد کا جھگڑا ہوا ہے؟" اس کے سوال پر خیام نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔ وجہ مت پوچھنا۔" اس نے زکام زدہ سی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ازا نے جواباً منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

"اتنے کھڑوس اور بدتمیز کیوں ہو تم؟!" وہ تنک کر پوچھ رہی تھی۔

"کتنا؟" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

"بہت زیادہ۔" وہ سر جھٹک کر کہہ رہی تھی۔ وہ چہرہ موڑ کر ہلکا سا ہنسا تھا۔ ازا کو اس کی ہنسی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر خفگی سے سامنے دیکھنے لگی۔

"لیکن تم نے کہا تھا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔ اس لحاظ سے تمہیں میرے کھڑوس ہونے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہ تھا۔

"تم مجھے ہمیشہ اچھے نہیں لگتے!" اس نے منہ بسور کر اپنی بات پر زور دیا تھا۔

"ہاں۔۔ کیونکہ بصورت دیگر یہ ملکہ کی شان کے خلاف ہے!" اس نے اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔ ازا نے چہرہ ہلکا سا ترچھا کر کے اسے گھورا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا کھل کر مسکرایا تھا۔ اسی لمحے میں جندل وہاں آیا تھا۔ راہداری میں قدم رکھے تھے۔ نگاہ سامنے اٹھی تو اس کے اٹھتے قدم بے اختیار تھم گئے۔ وہ دونوں ساتھ کھڑے

تھے۔ ازا چہرہ ترچھا کیے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑا اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔ جندل نے بے اختیار اپنی نظریں چرائی تھیں۔ تیزی سے دھڑکتے دل میں کئی شبہات نے جنم لیا تھا۔ وہ کئی پل وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ضرار کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”جندل آجاؤ۔ اب ہم مزید کتنا انتظار کریں؟“ اس نے منہ بسور کر کہا تھا۔ وہ تینوں چونکے تھے۔ خیام کی نگاہ بے اختیار جندل کی طرف اٹھی۔ نگاہیں ملیں اور جندل کو لگا کہ۔۔ اس کے دل میں جو شبہات جنم لے رہے تھے وہ درست تھے۔ کبھی اپنی آنکھوں کو پڑھنے کی اجازت نہ دینے والا خیام، اپنی نگاہوں کے ذریعے سچائی ظاہر کر چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ چہرے پر کرب کے تاثرات آئے۔ نچلا لب دانتوں تلے کچلا گیا۔ مٹھیاں سختی سے بھینچیں۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ ازا اچٹتی نگاہ ان دونوں پر ڈال کر اندر جا چکی تھی۔ وہ سر جھٹکتا گہری سانس لیتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ خیام کے بالکل قریب سے گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کا شیرازہ بکھرتا محسوس ہوا تھا۔ زندگی نے اسے عجب دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اسے مشکل امتحان میں ڈالا جا چکا تھا۔

☆☆☆

”دلال کے جرم ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن ہم ابھی تک سمجھ نہیں پا رہے وہ آخر ڈی ڈبلیو کی سربراہی کیسے سرانجام دے رہا ہے اور کہاں؟“ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھے ضرار نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔ وہ سب وہیں موجود تھے۔ جندل، بدر، سعاد، خیام، ازا اور ضرار۔ زیاد بھی وہیں آ چکا تھا۔ درمیان میں میز پر چائے کے کپ رکھے تھے۔

”ڈی ڈبلیو کا مسئلہ دلال کی موت کے ساتھ ہی حل ہو جائے گا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ دلال کے خلاف ثبوت ملنے سے پہلے ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔“ جندل نے گہری سانس لے کر کہا تھا۔

”مجھے ایسے کیوں لگ رہا ہے ہم کہیں کچھ بھول رہے ہیں۔“ خیام کچھ سوچتے ہوئے آگے ہوا۔ سب کی نگاہیں اس پر ٹکیں۔ ”اس نے سالوں پہلے سمندر میں جو قتل وغارت مچائی اس کا نہ کوئی رکارڈ ہے نہ ثبوت۔ یوں لگتا ہے دنیا اس قاتل کو آزاد کا پروانہ دے چکی ہے بھلے وہ کتنا ہی بڑا درندہ کیوں نہ ہو۔ لیکن پھر یہ بات بھی ہے کہ ہم سب یہ جان گئے کہ دلال بحری قزاق ہے۔ حالانکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں، کیسے؟“ اس کی بات میں وزن تھا۔ سب گہری سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اسی لمحے میں سعاد کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

”وہ ویڈیوز۔ دلال نے اپنے ہر قتل کے سین کو رکارڈ کیا ہوا ہے۔ ان ویڈیوز میں وہ خود نہیں تھا مگر پھر بھی عین ممکن ہے کہ ایسی دوسری ویڈیوز ہوں جن میں وہ خود بھی موجود ہو!“ اس نے بات مکمل کر کے نگاہیں گھما کر سب کو دیکھا۔

”اگر اسے قتل مزہ دیتا ہے تو ایک حد تک آپ ٹھیک ہو سکتی ہیں۔“ ضرار نے اس کی تائید کی تھی۔

”یعنی تم لوگ کہہ رہے ہو کہ اب ہمیں ان ویڈیوز کو تلاش کرنا ہے؟“ زیاد کے سوال پر ان دونوں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”مگر وہ ویڈیوز کمپنی میں موجود نہیں۔ اس کے علاوہ ابراہام انہیں کہاں رکھ سکتا ہے ازا؟“ خیام کے سوال پر سب کی نگاہوں کا رخ ازا کی طرف ہوا۔

”اپنے گھر؟“!

”پھر اس کے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔“ خیام کی بات پر جندل نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"وہاں بھاری سیکیورٹی ہے۔ تم اکیلے کیسے جاؤ گے؟"

"تم صرف اس صورت میں وہاں جاسکتے ہو جب تمہیں وہاں کے سیکیورٹی سسٹم کا صحیح اندازہ ہو۔" ضرار کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

"اور مجھے اندازہ ہے۔ کیوں ازا؟" اس نے تائیدی نظروں سے ازا کو دیکھا۔ وہ سر اثبات میں ہلاتی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا اندازہ درست تھا، وہ اس رات اسی کام کے لیے اندر آیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر۔ تم یہ کام کرو۔ میں اور ازا صبح کمپنی جائیں گے۔ ضرار مائک کے ساتھ بار بارا گروپ کے معاملات دیکھ لے گا۔" جندل نے پلان ترتیب دیا۔

"اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے۔ یہ تصویر دیکھو۔" ضرار نے اپنا موبائل میز پر رکھا۔ سب نے جھک کر اس تصویر کو دیکھا۔ یہ تصویر بندرگاہ پر لی گئی تھی جہاں بحری قزاقوں کا جہاز ٹھہرا ہوا تھا۔ تقریباً پندرہ آدمیوں میں گھرے اس کپتان کا چہرہ بالکل واضع دکھائی دے رہا تھا جس نے ہاتھ میں دو پستولیں پکڑ رکھی تھیں۔ "اسے یقیناً دلال نے بلایا ہے۔ ہمیں اس سے بھی نپٹنا ہو گا۔"

"اسے میں دیکھ لوں گی۔" سعاد نے پر جوش انداز میں کہا۔ زیاد نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ "بس مجھے ضرار کی مدد چاہیے ہو گی۔" اس نے اجازت طلب نظروں سے ضرار کو دیکھا۔

"ایسے مت دیکھیں۔ میں کون ہوتا ہوں آپ کو منع کرنے والا۔" وہ اس کی نظروں سے گڑبڑایا تھا۔ وہ سب اس کے انداز پر مسکرا دیے تھے۔

"کیا کرنے لگی ہو تم؟" خیام نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”بس دیکھتے جائیں۔“ اس نے بے فکری سے کندھے اچکائے۔ خیام نے سر کو جنبش دی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ضرار بھی کھڑا ہو گیا۔

”میں گھر جا رہا ہوں۔ تم لوگ جب آؤ تو اپنے سونے کا بندوبست خود کر لینا۔ دو کمرے نیچے خالی ہیں۔ دو اوپر۔“ خیام نے اچٹتی نگاہ سب پر ڈالی پھر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ ضرار اور جندل نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس تمام عرصے میں خاموش بیٹھے بدر کی چھٹی حس بھی جاگ اٹھی تھی۔

”اوپر میں اور ازا سوئیں گے۔ تم تینوں نیچے ایڈجسٹ کر لو۔“ سعاد نے گویا ان کے ارادے سمجھ کر اعلان جاری کیا تھا۔

”میں تنہا سونے کا عادی ہوں۔“ ضرار گڑبڑا کر خیام کے پیچھے بھاگا تھا۔

”میں لاتیں نہیں مارتا، سچ میں!!“ بدر بوکھلایا۔ جندل نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔

”خبردار جو تم نے میرے ساتھ سونے کی کوشش بھی کی تو! اپنے خیام سر کے پاس جاؤ۔“ وہ دوبارہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

”جندل، وہ کہہ تو رہا ہے کہ تنگ نہیں کرتا۔“ سعاد کو بدر سے ہمدردی ہوئی۔

”اتنی لاتیں مارتا ہے یہ۔ اس معاملے میں مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں، ہاں!“ اس نے صاف انکار کیا تھا۔ ازا ان کی نوک جھونک سے محظوظ ہوتی صوفے سے ٹیک لگا گئی۔

”تم جاؤ بھلے جندل۔ بدر یہیں رہے گا۔“ اس تمام عرصے میں خاموش بیٹھا زیاد بول اٹھا۔ بدر کا سر بے اختیار نفی میں ہلا تھا۔ جندل نے دونوں ابرو اٹھائے اسے چڑایا پھر اٹھ کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔

"میں یہاں اکیلا کیسے سو سکتا ہوں؟" بدر منمنایا تھا۔

"میں یہیں رہوں گا، بے فکر رہو۔" بدر کو تسلی دے کر وہ ازا اور سعاد کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم دونوں جندل کے ساتھ چلی جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔" ان دونوں کو ہدایت کرتا وہ انہیں غیر معمولی سنجیدہ لگا تھا۔ ازا سر کو جنبش دے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جبکہ سعاد وہیں بیٹھی بغور اسے دیکھنے لگی۔

"تم ٹھیک ہو زیاد؟" وہ فکر سے پوچھ رہی تھی۔ بدر اس لمحے میں ازا کے ساتھ چپ چاپ وہاں سے کھسک چکا تھا۔

"ہاں، بس سر میں درد ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"دوائی لے لینا اور تم بھی جلدی سو جاؤ۔ نیند کی کمی کی وجہ سے بھی ہو رہا ہو گا۔" وہ اسے تاکید کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈالی پھر باہر نکل گئی۔ وہ گہری سانس لیتا صوفے سے ٹیک لگا گیا۔

☆☆☆

”اس دنیا میں دین ہو یا مذہب۔۔ دونوں مٹتے جا رہے ہیں۔ اب دنیا میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو نہ دین کو مانتے ہیں نہ مذہب کو۔ وہ سرے سے خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“ سوال کس کا تھا اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے نگاہیں خضر نعمانی کے جواب پر ٹکائی تھیں۔

"اس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم نے مذہب کو یا دین کو بہت محدود کر دیا ہے۔ یعنی۔۔ عیسائی نے عیسائیت کو بس چرچ تک محدود کر دیا ہے۔ یہود نے یہودیت کو بس سینا گوگ تک، ہندو نے ہندومت کو بس مندر تک اور مسلمان نے اسلام کو بس مسجد تک! مذہب بس راہبوں، مولویوں اور پنڈتوں تک محدود ہو گیا ہے۔

حقیقت میں مذہب ہمیں صحیح اور غلط میں تمیز سکھاتا ہے۔ مذہب قانون کی بنیاد رکھتا ہے۔ مذہب انسان کی زندگی میں توازن برقرار رکھتا ہے۔ لیکن آج کے انسان نے مذہب کو بس خدا کی عبادت تک محدود کر دیا ہے۔ مذہب کو یکسر غلط معنی میں لیا جا رہا ہے۔ مذہب تو سلیقہ سکھاتا ہے۔ ایک انسان ہر برے سے برا اور گھٹیا سے گھٹیا کام کر کے چرچ میں آ کر یسوع مسیح کے آگے سینے پر صلیب کا نشان بنائے اور بس؟! ظاہر ہے مذہب یہ نہیں ہے۔ ہماری ہی نااہلی ہے کہ مذہب انسانوں کی زندگیوں سے نکلتا جا رہا ہے۔

اس صورتحال میں مذہب کو دیکھیں تو مذہب بھی ایسا ہونا چاہیے جس کے بتائے گئے قوانین کو آپ زندگی کے ہر موڑ پر ہر مسئلے پر لاگو کر سکیں۔ یعنی مذہب ایک مکمل ضابطہ حیات ہو۔ اور ایسا مذہب صرف اسلام ہے جو مذہب نہیں دین ہے! آپ امیر ہیں غریب، بادشاہ ہیں یا فقیر، بڑے ہیں یا بچے، مرد ہیں یا عورت، شوہر ہیں یا بیوی، والدین ہیں یا اولاد، استاد ہیں یا شاگرد۔۔ اسلام نے ہر ایک کی حدود کو متعین کیا ہوا ہے۔ اسلام سمٹ کر نماز روزے تک محدود نہیں ہے۔۔ اسلام بہت وسیع ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک مکمل دین ہے! اسلام آپ کو دنیا چھوڑنے کا نہیں کہتا، اسلام دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا سکھاتا ہے۔ دنیا سے کٹ جانا ہرگز اسلام کی تعلیمات میں شامل نہیں۔

دنیا سے کٹ جانا رہبانیت ہے، یہ راہب تھے جو دنیا چھوڑ کر جنگلوں میں عبادت کے لیے گئے تھے۔ دنیا کے پیچھے دوڑنا یہودیت ہے، یہ یہود تھے جنہوں نے دین کو چھوڑ کر نفس پرستی کی تھی۔ اسلام میں نہ رہبانیت ہے نہ یہودیت! اسلام میں حنیفیت ہے، ایک اللہ پر ایمان اور اسی کی اطاعت۔۔!

اسلام میں میانہ روی ہے۔ اسلام دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا سکھاتا ہے۔ اسلام مکمل ہے، مسلمانوں میں رہبانیت اور یہودیت سرایت کر گئی ہے۔۔!

اسلام اس معاملے میں بری الذمہ ہے۔۔!" وہ یک ٹک اسکرین تو تکتی رہی تھی۔ وہ جو دن بہ دن مزید کشمکش کا شکار ہوتی جا رہی تھی، اسے اب اپنے سامنے ایک کھلا راستہ نظر آ رہا تھا۔۔ بس ایک فیصلہ لینے کی دیر تھی۔ بس ایک فیصلہ!

☆☆☆

وہ گارڈز کی نظروں سے بچ کر چھت پر چڑھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اپنے راستے پر ڈالتا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کا اٹھتا ہر قدم احتیاط کا تاثر دے رہا تھا۔ کچھ قدم مزید اٹھانے کے بعد وہ وارلڈ کے کمرے کی بالکونی میں کود گیا۔ کمرے کا دروازہ کھولنے میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے گھٹاٹوپ اندھیرے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ سائیڈ لیمپ تک بند تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی بیڈ پر ڈالی تو بیڈ کو خالی پایا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ازا سے گھر کے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی معلومات لے لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک حد تک اگر احتیاط برت رہا تھا تو دوسری طرف وہ ایک حد تک اس کام کو آسان بھی خیال کر رہا تھا۔ ازا کی معلومات ہی تھیں جن کے مطابق ابراہم کبھی اپنے ضروری کاغذات اپنے کمرے میں نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لائبریری میں آیا تھا۔

مکمل سیاہ لباس میں موجود، ہم رنگ ہی پی کیپ سر پر ٹکائے اور سیاہ ہی رومال سے چہرہ ڈھکے وہ میز کی طرف آیا۔ جلدی سے اس کی درازیں دیکھیں۔ کاغذات الٹ پلٹ کیے پھر وہ کتابوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اگلے پندرہ منٹ میں وہ لائبریری کا کونا کونا چھان چکا تھا مگر کہیں کوئی کام کی چیز اسے نہیں ملی تھی۔ وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ اسے احساس ہوا کوئی کمرے کی طرف آرہا ہے۔ آنے والا دروازے کے بالکل قریب تھا۔ اگر وہ واپس جانے کا ارادہ کرتا تو فوراً ہی پکڑے جانے کا اندیشہ تھا لہٰذا اس نے یہاں سے نکلنے کے بجائے دروازے کی اوٹ میں ہونے کا فیصلہ لیا تھا۔ دروازہ کھلا، ابراہم اندر آگیا۔ خیام نے اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور اپنے خنجر کی نوک اس کی شاہ رگ پر رکھی۔

"کوئی ہوشیاری نہیں۔" سختی سے کہا گیا۔ ابراہم کے لب مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

"بہت انتظار کروایا تم نے۔۔" وہ خوشگوار حیرت سے کہہ رہا تھا۔ خیام کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"کیا مطلب؟"

"تم وہ ویڈیوز ڈھونڈنے آئے ہو جو میرے قاتل ہونے کا ثبوت دیں۔ کیوں یہی بات ہے ناں؟" اس کے انداز میں پراسراریت تھی۔ اسی لمحے میں اس کی سماعت سے بھاری بوٹوں کی آواز ٹکرائی۔ گارڈز کو خبر ہو چکی تھی، وہ دوڑتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ خنجر پر خیام کی گرفت مضبوط ہوئی۔ خنجر کی نوک ابراہم کی گردن پر چبھی۔ سرخ گاڑھے خون کی چند بوندیں چمکیں۔

"ویڈیوز کہاں ہیں دلال؟" اس نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

"راز کو ہمیشہ اہلِ راز کے پاس ہونا چاہیے۔" مسکرا کر کہتا وہ خیام کو سلگا گیا تھا۔ اسی وقت دروازہ زور سے بجایا گیا۔ جواب کا انتظار کیے بنا دروازہ توڑنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔

”میں وہ ڈھونڈ کر رہوں گا دلال! ڈرو اس وقت سے جب تمہارے ظلم تم پر لوٹ آئیں گے۔“ سختی سے کہتے ہوئے اس نے خنجر پر اپنی گرفت مزید سخت کی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھول دیا گیا۔ اسلحے سے لیس گارڈز تیزی سے اندر آئے۔ متلاشی نگاہیں خالی کمرے میں دوڑائیں۔ انہیں ایک کونے میں ابراہم نظر آیا۔ خیام اسے بے ہوش کر کے جا چکا تھا۔ وہ سب تیزی سے کمرے کی کھڑکی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان سے ہمیشہ دو قدم آگے رہنے والا خیام حنفی۔۔اب چھتیں پھلانگتا گھر کی حدود سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

وہ کچن میں کھڑی اپنے لیے کافی بنا رہی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے اور نیند تھی کہ کہیں روٹھ کر جا چکی تھی۔ اس نے بھی سونے کی کوشش کرنے کے بجائے کام کرنا زیادہ بہتر سمجھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب تھکن کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ چولہے پر دودھ ابالنے کے لیے رکھ کر وہ شیلف سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ گہری نظروں سے چولہے پر پکتے دودھ کو دیکھتی وہ خالی خالی ذہن لیے کھڑی تھی جب کسی آہٹ پر اسے چونکنا پڑا۔ نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو ازا اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے سے شرٹ ٹراوزر میں ملبوس وہ موبائل ہاتھ میں لیے اس کی طرف آئی۔

”کیا ہوا؟ تم سوئی نہیں؟“ وہ ماتھے پر بل ڈالے پوچھ رہی تھی۔ ازا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ موبائل ایک طرف رکھ کر وہ زغند بھر کر شیلف پر چڑھ بیٹھی۔

”کیا بنا رہی ہیں؟“ مسکراتے ہوئے پوچھا گیا۔

"کافی۔ پیو گی؟" اس کے سوال پر وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلا گئی۔ سعاد سر کو جنبش دے کر فریج کی طرف بڑھ گئی۔ ازا نے لب دانتوں میں دبائے اس کی پشت کو دیکھا۔ اس کی کمر پر بکھرے لمبے سیاہ بال اسے اچھے لگے تھے۔ اپنے بال وہ کٹواتی رہتی تھی، ڈائے بھی کروائے ہوئے تھے لیکن اب سعاد کے بال دیکھ کر اسے اندازہ ہوا تھا سیاہ لمبے بال کتنے اچھے لگتے ہیں۔

"آپ کے بال اچھے ہیں۔" وہ تعریف کیے بنا نہ رہ سکی۔ فریج بند کر کے پلٹتی سعاد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تمہارے بھائی کو بھی اچھے لگتے ہیں۔" وہ کیبنٹ سے کپ نکالتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"ویسے سچ کہوں، مجھے کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوا زیاد ان سب چیزوں پر بھی غور کرتا ہے۔ مطلب ان دو سالوں میں مَیں نے اسے اپنے کام سے کام رکھنے والا اور لڑکیوں کے متعلق بالکل لاپروہ لڑکے کے طور پر پایا ہے۔ میں اگر کبھی اس سے زبردستی اپنی تعریف کروانا بھی چاہوں تب بھی وہ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتا۔" اس نے ناک سکیڑی تھی۔ دودھ کپ میں ڈالتی سعاد اس کی بات پر لب دانتوں میں دبا گئی۔

"ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا آپ کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں۔ ہماری شادی کو ایک ماہ ہونے والا ہے اور مجھے نہیں معلوم اسے کونسا رنگ پسند ہے؟ اسے میں کیسے اچھی لگتی ہوں؟ کھانے میں وہ کیا پسند کرتا ہے اور وغیرہ وغیرہ۔ اپنے بالوں کو کٹوانے کا خیال میں اس کے سامنے ظاہر نہ کرتی تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ اسے لمبے بال پسند ہیں۔" اپنی بات مکمل کر کے اس نے کافی کا کپ ازا کو پکڑایا۔ وہ مسکراتے ہوئے کپ تھام گئی۔ سعاد اس کے روبرو دوسری شیلف پر بیٹھ گئی۔

"ویسے جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے لگا آپ تھوڑی کھڑوس اور غصے والی ہیں۔ اب مجھے اپنا خیال بدلنا پڑ رہا ہے۔" کافی کا کپ لبوں سے لگائے گرم کافی سے حلق تر کرتی سعاد نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔

"ازا۔۔ سچ بتا رہی ہوں تمہارے معاملے میں مَیں ایسی ہی ہوں۔" اس نے خاصی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ازا نے چونک کر اسے دیکھا۔ "جب میں یہاں آئی تو خیام، زیاد، جندل حتیٰ کہ بدر کو بھی تمہارا گرویدہ پایا۔ ایک میرا بھائی تھا، ایک میرا شوہر تھا اور ایک استاد جی۔۔ مَیں واحد لڑکی ہوں جس کا ان سب کی زندگی میں عمل دخل رہا ہے۔ میرا تم سے چِڑنا بنتا ہے۔۔ اور ویسے پہلے مجھے لگتا تھا اس سب میں تمہارا قصور نہیں ہے مگر اب میں کسی قسم کی شرمندگی و ندامت کا شکار نہیں ہوتی کیونکہ تم میری نند ہو اور میں بالکل اچھی بھابھی نہیں بن سکتی۔" اس کی بات غور سے سنتی ازا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ سعاد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے چہرہ موڑ لیا تھا۔

"آپ کی کوئی سہیلی ہے؟" اس کا سوال غیر متوقع تھا۔

"ہاں۔ حرم اور امامہ۔ لیکن دونوں مصروف ہیں اور پاکستان میں ہیں۔ حرم، ضرار کی بہن ہے اور امامہ حزب اللہ میں ہی ہے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"چلیں پھر جب تک یہاں ہیں مجھے سہیلی بنالیں۔ میں دوست کم بناتی ہوں، مگر یقین کریں دوستی آخری وقت تک نبھاتی ہوں۔" اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"تمہاری دوست بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھی، ازا!" سعاد نے اسے کچھ یاد دلانا چاہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ کر سر جھٹک گئی۔

"ٹھیک ہے۔۔ رہیں پھر بھابھی ہی!" اس نے منہ بسورا۔

"ہاں ہاں لڑا کا بھابھی۔ جھگڑے کریں گے، ایک دوسرے کو چیزیں اٹھا اٹھا کر ماریں گے، زبان چلائیں گے۔ رونق لگی رہے گی۔" اس نے مستقبل کا خوبصورت نقشہ کھینچا۔ ازا نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔

"آپ ابھی سوئیں گی؟ مطلب آپ یہاں ہیں تو یقیناً آپ کو نیند نہیں آرہی ہو گی!" اس کے سوال پر سعاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "پھر کیا میں آپ سے جندل، خیام اور بھائی کا ماضی پوچھ سکتی ہوں؟!" سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا جو پر امید نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی پھر کافی کا کپ خالی کر کے برابر میں رکھا۔ نگاہ اٹھا کر ازا کو دیکھا۔۔ اور پھر جیسے جیسے رات کی تاریکی بڑھتی گئی وہ دونوں ویسے ہی ماضی کی منزلیں طے کرتی گئی تھیں۔

☆☆☆

یہ وقت صبح فجر کے قریب قریب کا تھا۔ افق پر ابھی اندھیرے کا ہی بسیرا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں خاموش تاریک سڑکوں پر پہرہ دے رہی تھیں۔ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ ماحول کو پر اسرار کر رہی تھی۔ عمارت کے اندر ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسی خاموشی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ زنجیر کے گرنے کی آواز آئی۔ کوئی زینے اتر رہا تھا۔ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ اڑسے زیاد دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کھلے میدان میں آیا تھا۔ دور تک پھیلا میدان۔۔ اس کی نگاہ اس میدان میں پوری رفتار سے دوڑتے بدر پر ٹکی تھی۔ وہ بھاگ رہا تھا، پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ تنفس پھولا ہوا تھا، پسینے میں شرابور وہ کافی دیر سے بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ کسی ایسی جگہ پر اپنے قدم ٹکنے نہیں دے رہا تھا جہاں نوکیلے کیلوں کے دبے ہونے کا خدشہ تھا۔ اس کے سر کے پاس سے گزرتی بال سے وہ ہر بار اپنا سر بچا رہا تھا۔ جگہ جگہ بچھی پتلی سی تاریں جو غور کرنے پر مشکل سے نظر آتی تھیں، وہ ان سے بھی اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب ٹھہرا تھا۔ زیاد اس کے جوش کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

اسے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ یہ ایک ہفتہ ان سب کے لیے ہی خاصا مصروف تھا۔ دوسری طرف بدر اس ایک ہفتے میں پہلے سے کافی بہتر ہو چکا تھا۔ اس نے جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ اسکرین روشن کی، کسی کا نمبر ملایا پھر ایئرپوڈز آن کر کے موبائل واپس جیب میں ڈال دیا۔ دونوں ہاتھ بھی واپس جیب میں اڑس دیے۔

"کون؟" سعاد کی نیند میں ڈوبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اسے اندازہ ہوا تھا وہ ان دنوں میں اسی آواز کو سننے سے قاصر رہا تھا۔ یہ آواز جس کے سنتے ہی اسے اپنی رگ و پے میں سکون اترتا محسوس ہوتا تھا۔

"جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا

میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے گنگنایا تھا۔

"یاد ہے یاد ہے۔ صبح صبح میری نیند میں خلل ڈالنے کی جرات بس سینیور زیاد ہی کر سکتے ہیں۔" وہ ناک سکیڑ کر کہتی کمبل میں دبک گئی تھی۔ زیاد کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

ابھی تک سو رہی ہو؟" اس کی نگاہیں بدر پر ٹکی تھیں۔ دل اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ابھی فجر میں وقت ہے ناں۔" اس نے بھرپور جمائی لی تھی۔

"فجر کا وقت ہو چکا ہے سینیورا۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"اچھا۔ اٹھ گئی ہوں اور حکم؟" وہ اپنی آنکھیں رگڑتی اٹھ بیٹھی تھی۔

"مجھے یہاں ہفتہ ہونے والا ہے غالباً۔ تم سے ملنا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دوسری طرف اس کی بات سن کر سعاد کی ساری نیند پل بھر میں اڑی تھی۔

"کیوں کیوں؟" وہ ہلکا سا ہنسی تھی۔

"بیوی سے ملاقات کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے؟" وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"بیوی جب سعاد یوسف زئی ہو، جو بہت مصروف رہتی ہو تو بالکل کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے۔ اب ایسے ہی منہ اٹھا کر تو نہیں آسکتی ناں میں!!" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یاد کر رہا ہوں تمہیں۔ زیادہ نہیں بس شام کی چائے تمہارے ساتھ پینی ہے۔" اس نے خواہش ظاہر کی تھی۔

"چائے تم بناؤ گے۔" وہ شرط رکھ کر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ وہ اس کی ہنسی سن کر مسرور ہوا تھا۔

"منظور ہے۔" اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

دور میدان میں دوڑتے بدر کی ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے ٹھوکر کھائی تھی۔ وہ منہ کے بل گرا تھا۔ درد کی شدید لہر پاؤں میں اٹھی تھی۔ زیاد نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"خود کو ڈھیلا مت چھوڑو بدر! اٹھو کہ منہ کے بل گرنے والوں کے لیے تاریخ میں کوئی جگہ نہیں۔ دوڑو کہ رکنے والوں کو قافلے ہمیشہ پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہوش کرو کہ مدہوش لوگوں کے قدم ہر مقام پر لڑکھڑا جاتے ہیں۔" اس کی بلند آواز بدر کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر ہونٹ بھینچ کر درد برداشت کیا تھا۔ ہمت جمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اٹھ نہیں پایا، لڑکھڑا کر دوبارہ منہ کے بل گرا۔ اس بار اسے پہلے سے زیادہ تکلیف سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

"اٹھو بدر! میدانِ کارزار میں جو شہسوار گر جائیں وہ اپنے ہی گھوڑوں تلے روندے جاتے ہیں۔" وہ اسے حکم دے رہا تھا۔ بدر نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔۔ وہ کامیاب رہا تھا۔ پیشانی سے خون کی چند بوندیں سفید جاگرز پر گریں۔ اس نے گہری سانس لی اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ ٹوٹتے ہوئے جسم، بگڑتے ہوئے تنفس اور درد کرتی ٹانگوں سے بھاگتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ۔۔ یہ سب آسان نہیں تھا۔ اس میدان میں جان دینے سے پہلے جان لگانی پڑتی ہے۔ شدید درد اور تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے، اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔۔ یہ سب آسان نہیں ہوتا۔ خود کو موت سے پہلے مارنا آسان نہیں ہوتا۔

☆☆☆

وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے پینسل سے کاغذ پر لکیریں کھینچتی گہری سوچ میں گم تھی۔ اندر آتے جندل نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔ ایک کپ کو دانتوں سے پکڑا ہوا تھا، دوسرا دائیں ہاتھ میں تھا اور بائیں میں فائل تھام رکھی تھی۔ پاؤں سے دروازہ بند کر کے وہ میز کے پاس آیا۔ کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا پھر اپنا کپ دانتوں سے چھڑوا کر ہاتھ میں پکڑتا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ازا نے گہری سانس لے کر کپ اٹھا کر کرسی سے ٹیک لگالی۔

"کیا سوچ رہی ہو بیلا؟" اس نے گرم کافی سے حلق تر کر کے پوچھا تھا۔

"تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے مجھے آفس میں میڈم ازابیلا کہا کرو!" وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔

"میڈم لفظ تمہاری عمر کے حساب سے بہت بڑا بڑا لگتا ہے۔" اس نے دانتوں کی نمائش کروائی تھی۔ ازا اسے گھور کر رہ گئی۔ جندل نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کافی کا کپ لبوں سے لگالیا۔ ازا لب دانتوں میں دبائے بغور اسے دیکھنے

لگی۔ اور یہ لڑکا۔۔ جندل یوسف زئی۔۔ ماضی میں اس کا اس سے کیا رشتہ تھا؟ اس کے ذہن میں سوال اٹھا تھا جسے وہ بنا دیر کیے لبوں پر لے آئی۔

"جندل۔۔ ماضی میں تمہارا میرے ساتھ کیا رشتہ تھا؟" وہ کپ ایک طرف رکھ کر بند مٹھی گال پر ٹکائے اس سے پوچھ رہی تھی۔ جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں شرارت چمکی۔ وہ کپ ایک طرف رکھ کر آگے ہوا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔

"میں ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ تمہارے بابا مجھے اپنے گھر لائے تھے۔ میں کئی دنوں بعد ہوش میں آیا تھا اور ہوش میں آتے ہی جو پہلا چہرہ میں نے دیکھا تھا وہ تمہارا تھا۔ ایک پیاری معصوم لڑکی جس نے مجھ سے پوچھا تھا آپ امیر البحر ہیں؟!۔۔ میں آپ کا بہت سارا خیال رکھوں گی امیر البحر۔۔" وہ اس کی بات دہرا کر مسکرایا تھا۔ ازا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ جندل نے نرمی سے اسے دیکھا تھا۔ "زیاد نے کہا تھا تم میری بہن کو پسند آ گئے ہو جندل!" ازا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ جندل نے بغور اس کے چہرے پر آتے رنگوں کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔ اور چہرے سے مسکراہٹ ایکدم غائب ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے میز پر رکھے ہاتھ اپنی گود میں رکھے تھے۔ اگر جو جندل کو پتا چل جاتا وہ کچھ عرصے سے اس سے شادی کے متعلق بھی سوچ رہی تھی تو اس کا رہا سہا تاثر بھی اس کی نظروں میں خراب ہو جاتا۔۔ اسے یقین تھا ایسا ہی ہو جانا تھا۔

"میں۔۔ ماضی میں بس تمہارا مہمان تھا ازا۔۔ ایک اجنبی مہمان جو چند پل تمہارے پاس ٹھہرا اور پھر اپنے سفر پر نکل گیا۔ میرے راستے ہمیشہ سے تمہارے راستوں سے جدا تھے۔" وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ازا سانس روکے اسے دیکھے گئی۔ وہ بولتے ہوئے جس کرب سے گزر رہا تھا اس کا اندازہ صرف اسے ہی تھا۔ اس کے گلے میں

گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ زکام زدہ سی سانس خارج کر کے اس نے نظریں جھکائی تھیں۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ وہ جانتا تھا وہ اپنے چند الفاظ کی مدد سے ازا کی تمام خوش فہمیوں کو ختم کر چکا تھا۔ وہ۔۔ مبہم الفاظ میں اسے انکار کر چکا تھا۔ وہ نظریں نہیں اٹھا پایا۔ دل کی حالت غیر ہوئی۔ دوسری طرف ازا سانس روکے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے اس کے ارادوں سے واقف تھا، تبھی صفائی سے انکار کر چکا تھا۔

"تم اجنبی تھے ناں۔۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مسکرا نہیں پائی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا تھا۔ جندل اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔۔ میڈم ازابیلا!" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ ازا اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر رہ گئی۔ وہ بنا نظریں ملائے پلٹ گیا۔ دروازے کی طرف بڑھا تو اپنے گال پر نمی کا احساس ہوا۔ منظر دھندلا ہونے لگا۔ اس نے کوٹ کے آستین سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ دروازے کی طرف نگاہ اٹھی تو اسے ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔

دروازے پر کھڑا اخیام سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانے کب سے وہاں کھڑا تھا۔۔ اس کے تاثرات۔۔ سختی سے بھینچی ہوئی مٹھیاں اور دانتوں تلے کچلا گیا لب۔۔ وہ سب سن چکا تھا۔ آنکھوں میں کرب ہی کرب تھا۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ جندل نظریں چراتا تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔۔ چپ چاپ۔۔

وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ دونوں بھول گئے تھے بعض دفعہ جدا راستے ایک ہی منزل کی طرف لے آتے ہیں۔ وقت جس پر رحم کھا لے، منزل اسی کی ہوتی ہے۔

☆☆☆

”میں پلان دہرا رہا ہوں۔ ابدال کے آدمی زیاد کو پکڑنے کے لیے اس کے اپارٹمنٹ میں آئیں گے کیونکہ وہ اسے ٹریس کرنے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ وہ وہاں آئیں گے تو ضرار کو پائیں گے۔ ضرار تھوڑی سی مزاحمت کرے گا پھر خود کو ان کے حوالے کر دے گا۔ وہ ضرار کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ جیسا کہ دلال کی عادت ہے وہ پیچھے گھروں کو آگ میں جھونک دیتا ہے تو وہ زیاد کے اپارٹمنٹ کے ساتھ بھی یہی کرے گا۔ اس کے بعد ضرار سے تفتیش ہو گی۔ تفتیش ہفتے تک جائے گی اور پھر وہ ضرار کے ساتھ یہاں آئیں گے۔۔ پھر سب ختم! ابدال سمیت اس کی آدھی فوج ہڑپ ہو جائے گی۔“ اپنی کرسی پر بیٹھتی سعاد نے پورا پلان سکون سے سنا پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مجھے کتنی مار کھانا ہو گی؟“ زیاد کے اپارٹمنٹ میں صوفے پر لیٹے ضرار نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

”جب تک انہیں تمہاری بات کی سچائی پر یقین نہیں آجاتا!“ اس کی بات پر ضرار اور سعاد نے گہری سانس لی تھی۔ ان کا یہ پورا پلان ترتیب دینے والا یہی ظالم سفید رومال والا لڑکا تھا۔ حد تو یہ کہ اس نے اپنی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ یہ لڑکا دن بہ دن ان کے لیے ایک پہیلی بنتا جا رہا تھا۔

”ضرار سیدھے ہو جاؤ۔ زیاد کے موبائل سے انہیں سگنل موصول ہو چکے ہیں۔“ کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلاتی سعاد گویا ہوئی۔

”کیا فرق پڑتا ہے؟ میں سیدھا ہو جاؤں یا ٹیڑھا؟ پٹنا ہی تو ہے۔“ اس نے بے فکری سے کہا۔

”پھر میری مانو الٹے لٹک جاؤ۔“ اس نے تڑخ کر کہا۔

”تم دونوں اپنا منہ بند رکھو۔ مجھے کام کے دوران بولنا بالکل پسند نہیں!“ وہ لڑکا غرایا تھا۔ وہ دونوں منہ بسور کر رہ گئے۔

اس بڑے سے ہال میں بڑی بڑی اسکرینوں کے پیچھے بیٹھے آدمی مکمل طور پر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ابدال، جسے سمندر سے یہاں آئے کچھ دن ہی ہوئے تھے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے ہال میں چکر لگا رہا تھا۔ اس کا قد خاصا لمبا تھا، سینہ چوڑا اور پیشانی کشادہ۔ وہ بھاری اور مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ اس کے ذمے سمندر میں کئی بحری جہاز تھے۔ وہ اسے سمندروں کا شکاری بھی کہا کرتے تھے۔ دلال نے اسے سمندر چھوڑ کا اگر یہاں آنے کو کہا تھا تو مطلب اس بار اس کی ٹکر جن لوگوں سے ہوئی تھی ان سے مقابلہ آسان نہیں تھا۔

وہ یونہی چکر لگا رہا تھا جب ایک آدمی جلدی سے کھڑا ہوا۔

”زیاد کو ٹریس کر لیا گیا ہے۔ سگنل اس کے اپارٹمنٹ سے ملے ہیں۔“ اس لڑکے کی بات سن کر وہ جلدی سے ہاتھ میں موجود وائرلیس کی طرف متوجہ ہوا۔

”دس آدمیوں کو فوراً زیاد کے اپارٹمنٹ میں بھیجو۔ مجھے وہ زندہ چاہیے، ہر حال میں!“ اس نے حکم صادر کیا تھا۔ اگلے لمحات میں دو بڑی بڑی سیاہ جیپیں سیاہ لباس میں ملبوس آدمیوں کو لے کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔

”سوچنے کی بات ہے سفید رومال والے لڑکے! تمہیں کیسے یقین ہے کہ ابدال تمہاری باتوں میں آجائے گا؟“ سعاد نے پر سوچ انداز میں پوچھا۔

”نام اچھا ہے۔۔ ہاں سفید رومال والے لڑکے، جواب دو۔“ ضرار زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکا۔

”ہر بحری قزاق دلال نہیں ہوتا جو بَر اور بحر دونوں میں لڑنا جانتا ہوں۔ ابدال سمندر کا شکاری ہے، اس زمین پر اس سے بڑھ کر بے وقوف کوئی ثابت نہیں ہو گا۔“ اس لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"اچھا۔ کیا دلال نے یہ بات نہیں سوچی ہو گی؟" ضرار نے چونک کر پوچھا۔

"ظاہر ہے اس نے سوچا ہو گا اس کے متعلق۔ وہ ابدال کو سامنے لا کر ہمارا دھیان بٹا رہا ہے۔" جواب سعاد نے دیا تھا۔

"آخر یہ دلال انسانوں کی طرح میدان میں آ کر لڑ کیوں نہیں رہا؟ یہ چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیل رہا ہے؟" اس نے بے زاری سے پوچھا تھا۔

"مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں دلال ہوں؟" سعاد نے تڑخ کر جواب دیا۔

"تم دونوں مرو گے میرے ہاتھوں!" وہ لڑکا ان کے مسلسل بولنے پر تلملایا تھا۔ وہ دونوں ایکدم چپ ہو گئے۔

مشکل سے دس منٹ گزرے ہونگے کہ صوفے پر لیٹے ضرار کو اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے عجلت میں دائیں کان میں موجود آلہ نکال کر صوفے میں دبایا پھر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ ٹوٹ گیا۔ آن کی آن میں دس آدمی اندر داخل ہوئے اور دس کی دس پستولیں ضرار پر تان لی گئیں۔

"ہاتھ اوپر، ہتھیار پھینک دو۔" ایک آدمی نے سختی سے کہا۔

"کوئی ہتھیار نہیں ہے میرے پاس۔ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا!!" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑایا تھا۔

"دیکھتے ہیں تمہیں بھی۔" ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کا خول چڑھایا تھا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو رسی سے باندھا گیا۔ اگلے لمحات میں وہ ان دس آدمیوں کے ہمراہ باہر نکل رہا تھا۔

"کیا یہ اتنا آسان تھا؟" سعاد بے چین ہوئی۔

”تم دلال کی پہیلیوں کی عادی ہو گئی ہو، تمہیں باقی سب آسان لگے گا۔“ اس لڑکے نے گہری سانس لے کر کہا۔ سعاد نے سر کو جنبش دے کر اس کی بات کی تصدیق کی تھی۔ وہ واقعی دلال کی پہیلیوں کے عادی ہو گئے تھے جو دماغ گھما دیتی تھیں۔ وہ دونوں چند پل انتظار کرتے رہے پھر ضرار کی طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ یعنی آلے کو ختم کر دیا گیا تھا۔

اس دن زیاد کے اپارٹمنٹ سے اٹھتے آگ کے شعلے بہت بلندی تک گئے تھے۔ پیٹرول اس کثیر مقدار میں گرایا گیا تھا کہ مشکل سے دو منٹ میں پورا اپارٹمنٹ اور ارد گرد کے کئی گھر آگ کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ انسانی جم غفیر سڑک پر جمع تھا۔ لوگوں کی آہ و بکا، چیخ و پکار بڑھتی گئی تھی۔ کئی لوگ جان سے گئے تھے۔ خدا جانے اور کتنے معصوموں کی جان جانے والی تھی؟ قیامت تو یہ تھی وہ اس سلسلے میں بالکل بے بس تھے۔ جب حکومت اپنے ہی لوگوں کو خود دلال کے لیے قربان کرنے پر تلی تھی، تو وہ خاموش رہنے کے سوا کیا کرتے؟ انہیں بس دلال سے لڑنا تھا۔۔ اس کے ختم ہوتے ہی قتل و قتال کا یہ طویل سلسلہ بھی رک جانا تھا۔

☆☆☆

اس نے ایک زوردار مکا جندل کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ جندل لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ وہ اسی لمحے میں دوسرا مکا اس کے جبڑے پر رسید کر چکا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ اسے گریبان سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ لگا چکا تھا۔ جندل کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

”سمجھتے کیا ہو تم خود کو ہاں؟ انسان ہو تو انسان بن کر رہو، فرشتہ بننے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں!!“ وہ غصے سے لال انگارہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑے غرایا تھا۔

"انسان بننے کی کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔" اس نے دوبدو جواب دیا تھا۔ خیام کا دل کیا تھا وہ اس کا منہ توڑ دے۔

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو جندل! میں جانتا ہوں تمہیں ازا سے محبت ہے۔ اس کے باوجود اس بکواس کا مقصد جان سکتا ہوں جو تم اس سے کر کے آئے ہو؟!" خیام نے اس کے گریبان پر گرفت سخت کرتے ہوئے اسے تقریباً جھنجھوڑ ہی تو دیا تھا۔ جندل نے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں سے اپنا گریبان آزاد کیا تھا۔ خیام نے غصے میں اسے مکا مارنا چاہا تھا مگر وہ اس سے پہلے ہی اسکی گردن دبوچ چکا تھا۔

"تمہیں یہ غلط فہمی کیونکر ہے خیام حنفی کہ جندل یوسف زئی تمہاری آنکھیں نہیں پڑھ سکتا؟! ازا کے ذکر پر جو انوکھی چمک ان میں ابھرتی ہے، اس کے ساتھ میرے ذکر پر غصے سے تمہارا چہرہ تمتما اٹھتا ہے، تمہیں لگتا ہے میں اندھا ہوں جو یہ سب نہیں دیکھتا؟! اگر میں انسانوں والی حرکت نہیں کر کے آیا تو تم نے کونسی انسانیت کا مظاہرہ کیا ہے ہاں؟ اتنی ہمت ہے تم میں کہ اس سے محبت کا اظہار کر سکو؟!" وہ اس کی گردن پر گرفت سخت کرتا غصے سے غرایا تھا۔ خیام نے جھٹکے سے اپنی گردن اس کی گرفت سے آزاد کروائی تھی۔

"ہاں ہے مجھے اس سے محبت! اب سے نہیں سالوں سے۔ اسی رات جب وہ تمہارے پہلو میں بیٹھی تھی۔ سالوں پہلے بھی اسے تم اچھے لگے تھے اور سالوں بعد بھی اس نے تمہارے دروازے پر سر کو خم دیا ہے۔ ایک آسان سی بات تمہیں سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ صرف تمہیں دیکھتی ہے؟! اسے صرف جندل یوسف زئی نظر آتا ہے!!" اس کی پیشانی کی رگیں ابھرنے لگی تھیں۔ چہرہ غصے سے لال پڑ رہا تھا۔ مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں۔ ایسا ہی کوئی حال اس کے مقابل کھڑے جندل کا تھا۔

"مگر میری نظر میں اس کے بعد بھی دنیا ہے خیام! تم اسے خوش رکھ سکتے ہو، میں اس سے اس کی خوشیاں چھین تو سکتا ہوں مگر دے نہیں سکتا!!" اس نے گویا ہار مانی تھی۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا جندل!! وہ کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے جس کا تم سودا کرو گے۔“ وہ دبا دبا سا چلایا تھا۔

”سودا نہیں درخواست ہے یہ! میں اسے خوش نہیں رکھ سکتا۔ تم بھول رہے ہو خیام یہ میری دنیا نہیں ہے۔ میں یہاں ایک بحری قزاق سے لڑنا آیا ہوں، اور یاد رہے مجھے آئندہ ان سے لڑنے کے لیے سمندر میں اترنا ہے۔ چند پل، ماہ، سال یا برسوں کون جانے واپسی کب ممکن ہو۔ میں اسے تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا!“ وہ اپنے عمل کی وضاحت پیش کر رہا تھا۔ خیام نے رک کر اسے دیکھا پھر گہری سانس لی تھی۔

”تم یہ سب میری وجہ سے کر رہے ہو!“ اس نے پورے یقین سے کہا تھا۔

”یہ سچ ہے مجھے اس وقت دکھ ہوا تھا جب سعاد آپی نے مجھ سے زیادہ تم پر بھروسہ کیا تھا۔ مجھے اس وقت بھی تکلیف ہوئی تھی جب الزرقاوی سر نے بدر کو میرے بجائے تمہارے حوالے کیا تھا۔ میرے لیے سانس لینا محال ہوا تھا جب مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ جس سے میں محبت کرتا ہوں عرصہ ہوا خیام حنفی اسے اپنے دل میں جگہ دے چکا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے خیام کہ میں نے ہر بار ان لوگوں کو تمہاری خاطر تمہارے لیے پیش کر دیا جو مجھے جان سے عزیز تھے۔ یہاں معاملہ دل کا تھا، میں جان دے سکتا تھا۔ تم بھول پر تھے کہ قربانیاں تم نے دی تھیں۔ یہ میں تھا جس نے زندگی میں ہر قدم پر ہر لمحے میں اپنے دوست کی خاطر قربانیاں دی تھیں یہاں تک اپنے عزیز رشتوں کو بھی اس کے حوالے کر دیا۔ میں اب بھی یہی کروں گا۔۔ میں جانتا ہوں ازا میری نہ ہوئی تو میرا دل خالی رہے گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں نہ ملی تو آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹ کر پوری قوت سے گرے گا۔ تم جان دے دو گے خیام حنفی اور جندل یوسف زئی یہ کبھی نہیں چاہے گا!“ اس نے آخری الفاظ پر زور دیا تھا۔ خیام سُن کھڑا اسے سن رہا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی، حیرت، دکھ اور درد کے عناصر کناروں پر ٹھہرتی نمی میں غوطہ زن تھے۔ اسے اپنی

دھڑکنیں منتشر ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ جندل کا کہا حرف بہ حرف سچ تھا۔ اسے اس سچائی پر تکلیف ہوئی تھی۔ یہی تکلیف تھی جس نے نمکین پانی کے قطرے کو رخسار پر گرنے پر مجبور کیا تھا۔

"تم۔۔ تم چاہتے کیا ہو آخر جندل؟!" اس کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔

"تم سے حوضِ کوثر پر ملاقات چاہتا ہوں۔۔ تمہاری دوستی میرے لیے دل کی دھڑکنوں اور آتی جاتی سانسوں کی طرح ہے۔ تم نہ ہوتے تو شاید مَیں مَیں نہ ہوتا۔ تمہیں یہ جان لینا چاہیے کہ جندل یوسف زئی اگر کسی پر جان دیتا ہے تو وہ صرف خیام حنفی ہے! تمہارے لیے میں ہر بار، بار بار اپنا دل توڑ سکتا ہوں۔ مگر تمہیں میں یہ کبھی نہیں کرنے دوں گا۔ تم اتنے مضبوط نہیں ہو کہ یہ تکلیف بھی سہہ سکو۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں، جلن کا احساس شدت پکڑ رہا تھا۔ مٹھیاں اس قدر سختی سے بھینچی ہوئی تھیں کہ بازو کی رگیں ابھر رہی تھی۔ خیام یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"تم اس رات کا ازالہ کر رہے ہو۔" اس نے شکستہ آواز میں کہا تھا۔

"اگر تم یہی سننا چاہتے ہو تو ہاں۔۔ میں نہیں چاہتا تم ایک اور گھر کو آگ کی نذر کرو۔ اگر سب خوش ہیں تو خیام حنفی بھی خوش رہنے کا حق رکھتا ہے!!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ خیام نے اس کے سپاٹ چہرے پر نگاہیں دوڑائیں۔ آنسوؤں کی دبیز تہہ نے اس کے چہرے کو دھندلا کر دیا۔ وہ اسے نہیں دیکھ پایا۔ یہاں تک کہ اپنے رخساروں پر نمی کا احساس ہوا۔

"مجھے اتنی اہمیت مت دیا کرو جندل! تمہاری محبت زیاد کی نفرت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔" دو آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک گئے۔

"ازا کو اپنا لو خیام! اس سے پہلے کہ اس کا نام نہاد بھائی تمہاری نفرت میں کسی چوزے کو تمہارے مقابلے پر لے آئے۔" وہ اسے مخلصانہ مشورہ نہیں حکم دے رہا تھا۔ سنجیدگی سے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑی تھیں۔

"یقین کرو میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اگر اسے تمہاری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی تو جان لے لوں گا تمہاری!!" ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر وہ اس کے برابر سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ خیام سانس روکے چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ اسے اپنے کندھوں پر بھاری بوجھ محسوس ہوا تھا اور دوسری طرف دل کو ڈھارس ملی تھی۔ زندگی کا دستور ہے، قدرت کا قانون ہے، حاصل اور لاحاصل ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دو دوسرا لو۔ وہ اگر ایک طرف پرسکون ہوا تھا کہ اس بار تکون کا تیسرا تنہا سراوہ نہیں تھا۔۔ تو دوسری طرف جندل اسے اضطراب میں مبتلا کر چکا تھا۔ کیا ضروری ہے۔۔۔ ہر بار تکون کی کہانی مکمل ہو؟ کیا لازمی ہے دو ساتھ ہوں اور تیسرا تنہا؟!

☆☆☆

اس نے راہداری میں قدم رکھا۔ اونچی لمبی سرمئی دیواریں اس کی آہٹ پر دم سادھ گئیں۔ اس نے چہرہ ترچھا کر کے اس کھلے میدان کو دیکھا۔ بدر کو اصولاً یہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس وقت یہاں نہیں تھا۔ وہ یونہی سست رفتار سے چل کر ایک کمرے کے دروازے کے پاس آئی۔ ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا پھر اندر آ گئی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں ایک ہفتہ پہلے وہ سب جمع ہوئے تھے۔ اپنی میز پر بکھرے کاغذات سمیٹتا زیاد اس کی طرف پشت کر کے کھڑا تھا۔

"السلام علیکم۔" مسکراتے ہوئے سلام کر کے اس نے ہینڈ بیگ میز پر رکھا۔ زیاد نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو۔" وہ کاغذات ایک فائل میں جمع کر کے دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔ وہ نقاب ٹھوڑی پر ٹکاتی صوفے پر بیٹھ گئی۔ فائل ٹھکانے لگانے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیسی ہو؟" میز سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا گیا۔

"ٹھیک۔ تم نے چائے پر بلایا ہے۔ چائے پینے میں کم و بیش پندرہ منٹ لگیں گے۔ اور تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب!" اس نے شرارت سے کہتے ہوئے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ زیاد اس کی بات پر مسکراہٹ دبا گیا۔

"میں چائے لاتا ہوں۔" مسکراتی نگاہ اس پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔ وہ سکون سے صوفے سے ٹیک لگا گئی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ چائے پہلے ہی تیار تھی، وہ دو منٹ بعد ہی چائے کے ساتھ واپس آیا تھا۔ ٹرے میز پر رکھی۔ اس کا کپ اسے تھمایا پھر کرسی کھینچ کر اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ نگاہیں اس پر گاڑیں جو چائے کو پھونکوں کے ذریعے ٹھنڈا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ گہرے سبز رنگ کے گاؤن میں ملبوس، خاکی رنگ کے حجاب کے ہالے میں قید دمکتا ہوا چہرہ۔۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا وہ اس گیٹ اپ میں اسے بہت اچھی لگتی تھی۔۔ ہمیشہ!

"بس دیکھتے رہو گے؟" اسے مسلسل خود کو تکتا پا کر سعاد نے مسکرا کر کہا پھر چائے کا گھونٹ بھرا۔

"ہاں۔۔ تمہیں مسئلہ نہ ہو تو میں پندرہ منٹ ایسے ہی گزار سکتا ہوں۔" اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ سعاد نے گڑبڑا کر اسے دیکھا تھا۔

"نہیں نہیں بالکل نہیں۔ میرے گال لال ہو جاتے ہیں یار۔" اس نے اعتراض کیا تھا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے آپ کے رخسار ابھی سے سرخی مائل ہو رہے ہیں۔" اس نے مسکراٹ دباتے ہوئے اسے خبردار کیا تھا۔ سعاد نے حیرت سے اسے دیکھا، اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے اپنے رخساروں پر ہاتھ رکھ گئی

تھی۔ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔ ہنستے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ وہ گہری سانس لیتی پیچھے ہٹی تھی۔ خفگی سے اسے دیکھا تھا جو مزے سے چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"تو۔۔ تمہیں کچھ یاد ہے سعاد؟" وہ کپ واپس میز پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ سعاد نے بھنویں ملائے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"کیا؟ یاد تو سب کچھ ہے مگر تم یاد دلاؤ گے تو اور یاد آجائے گا۔" اس کے جواب پر وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

"آج ہماری شادی کو پورا ایک ماہ ہو گیا ہے سینیورا! پچھلے ماہ اسی تاریخ پر آپ زیرِ تفتیش تھیں۔" اس نے گویا اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ سعاد برے برے منہ بناتی سینے پر ہاتھ باندھ گئی۔

"مجھے وہ دن مت یاد دلاؤ، بہت منحوس دن تھا۔" اس نے منہ بسور کر کہا تھا۔ زیاد نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

"تم۔۔ تم ہماری شادی کے دن کو منحوس دن کہہ رہی ہو؟" وہ تقریباً صدمے سے چلا ہی تو اٹھا تھا۔

"ہاں تو۔۔ اس دن میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔" وہ اسے مزید تپا رہی تھی۔ وہ چند پل کچھ بول نہیں سکا تھا۔

"بہت بہتر! مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا تم سے شادی کرنے کا۔" وہ بھی تپ چکا تھا۔ تنک کر کہتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا گیا۔ اسی کی طرح سینے پر ہاتھ باندھ کر چہرہ موڑ لیا۔

"میں بھی مر نہیں رہی تھی تمہارے لیے!" اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔

”لیکن میں مر رہا تھا۔ میری ہی غلطی تھی جو سعاد یوسف زئی جیسی ناقدر لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا۔“ اس نے منہ بسور کر کہتے ہوئے غصے سے ناک سکیڑی تھی۔ سعاد کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”مجھے ناقدر مت کہو۔ تمہاری محبت کی قدر ہے مجھے !!“ اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

”ہاں وہ تو نظر آرہا ہے مجھے۔“ وہ اب خفا ہو چکا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے اب ایسے برے برے منہ تو مت بناؤ۔ بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔ پندرہ میں سے دس منٹ تم لڑ کر گزار چکے ہو۔“ آگے بڑھ کر اسے منانے کی کوشش میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ سارا ملبہ اس پر ڈال گئی تھی۔

”میں لڑ رہا ہوں ؟“

”کوئی شک ؟“ مسکرا کر پوچھا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اس کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی تھی، ہمیشہ اسے زیر کر دیتی تھی۔ ”ویسے۔۔ آپس کی بات بتاؤں۔۔ میں نے تمہارے ساتھ لڑائی کو بہت یاد کیا، سچ میں۔۔“ اس نے بچوں کی طرح آنکھیں میچتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

”چلو۔۔۔ کسی بہانے سینیورا نے ہمیں یاد کر کے ہمیں شرف تو بخشا۔“ مسکراتے ہوئے کہا گیا۔ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کی۔

”باقی دو منٹ !“ وہ شرارت سے گویا ہوئی۔ زیاد زیرِ لب مسکرایا۔

”مجھے اندازہ ہو رہا ہے سعاد کہ میری عمر اب زیادہ ہو گئی ہے۔ یہی کوئی بتیس تینتیس برس کا ہو چکا ہوں۔ تمہیں نہیں لگتا ہمیں اب اپنے بچوں کے متعلق سوچنا چاہیے ؟“ وہ آنکھوں میں شرارت لیے اس کے ایکدم سے لال پڑتے چہرے کو نگاہوں کے حصار میں لیے زیر لب مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد اسے گھور کر رہ گئی۔ وہ اس کے

گھورنے پر کندھے اچکا گیا۔ ”میں واقعی سنجیدگی سے اپنے بچوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“ وہ اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔

”تم آج کل اکیلے رہ رہے ہو تبھی یہ فضول سوچیں تمہارے دماغ میں آرہی ہیں۔“ اس نے گڑبڑا کر نگاہوں کا رخ موڑتے ہوئے اسے ٹالنا چاہا تھا۔

”مجھے بھی یہی لگا تھا۔ اور انہی فضول سوچوں کے ساتھ ایک اور سوچ میرے ذہن میں آئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہہ کر ذرا توقف کیا پھر گویا ہوا۔ ”میں جانتا ہوں خیام تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا تبھی پوچھ رہا ہوں، خیام پہلی بار بابا سے کب ملا تھا؟“ اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔

”پہلی بار تو آرٹ گیلری میں ملے تھے دونوں۔ جب میں نے اسے بتایا تھا کہ معاویہ انکل ازا کے تعاقب میں ہیں اور مجھے یہ۔۔۔“ وہ جلدی میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ اپنی عجلت پر بری طرح چونکی تھی۔ وہ اس سے وہ بلوا چکا تھا جو اسے نہیں بولنا چاہیے تھا۔ وہ بہت آرام سے اسے باتوں میں لگا کر اپنی بات نکلوا چکا تھا۔ اس نے ایسا موضوع چھیڑا تھا جس سے بچنے کے لیے وہ اسے اس کے اس سوال کا جواب بہت آسانی سے دے گئی جو کسی اور موقعے پر وہ ہر حال میں ٹال جاتی، ہوشیار ہو جاتی چونک اٹھتی۔ اور اس وقت اسے اندازہ ہوا تھا کہ۔۔۔ زیاد نے اسے کیوں بلایا تھا۔ وہ سانس روکے تیزی سے دھڑکتے دل کو سنبھالتی اسے دیکھنے لگی جو ہنوز نرمی سے اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے ہوا تھا۔

”اور تمہیں یہ تب معلوم ہوا جب تم ان سے ملی تھیں۔“ وہ اس کی بات مکمل کر چکا تھا۔ سعاد بنا پلک جھپک اسے دیکھے گئی۔ زیاد نے سر جھکا کر گہری سانس لی۔ آرام سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروانا چاہا۔ وہ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتی سر نفی میں ہلا گئی۔

"آئی ایم سوری زیاد۔۔" اسے اپنی آواز بھیگتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"مجھے تم پر مان تھا یار۔ اس مان کو توڑنے دیتیں۔" اس کا لہجہ۔۔۔ پر شکوہ آنکھیں اور الفاظ۔۔ اسے اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا۔ وہ اسی لمحے سے ڈرتی تھی جب اس کا مان ٹوٹ جائے گا۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ۔۔ وہ واقف تھی اس کا باپ زندہ تھا۔

"زیاد انہوں نے منع کیا تھا، میں سچ میں۔۔۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگی تھی۔

"ایک بات مانو گی میری سعاد؟" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ زیاد نے آرام سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ وہ بے بس ہو گئی۔ اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی تیزی سے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دو قدم آگے آیا تھا۔ درمیان میں موجود فاصلے کو گھٹایا تھا۔ آرام سے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو سہلایا تھا۔

"مجھ سے کچھ وقت کے لیے رابطہ مت کرنا!" وہ حکم صادر کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"آئی ایم سوری۔۔" اس کی آنکھ سے گرتا آنسو زیاد کے ہاتھ کی پشت پر گرا تھا۔

"تم لوگ مجھے وہاں سے چوٹ پہنچاتے ہو جہاں سے میں توقع بھی نہیں کرتا۔ جس سلسلے میں تم لوگوں پر یقین کرتا ہوں، تم لوگ وہیں سے وار کرتے ہو یار۔" وہ بے بس ہوا تھا۔ سعاد نفی میں سر ہلاتے ہوئے سسک اٹھی تھی۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ میں۔۔ میں واقعی یہ نہیں چاہتی تھی۔۔" وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"تمہارے دو منٹ پورے ہوئے سعاد۔۔ اللہ حافظ!" وہ اس کے آنسوؤں کو پونچھنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد اس کا گال سہلا کر آگے بڑھ گیا۔ سعاد نے نم آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ دروازہ پار کرتے ہوئے زیاد کو

اپنے دل پر بھاری بوجھ گرتا محسوس ہوا تھا۔ وہ رو رہی تھی، وہ اسے روتا چھوڑ آیا تھا۔ نگاہوں کے سامنے بار بار معاویہ کا چہرہ گھوم جاتا تو دل میں تکلیف بڑھ جاتی۔ اس نے رک کر سانس لینا چاہی تھی تو ناک سے کوئی چیز رینگتی محسوس ہوئی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے انگشت شہادت ناک پر رکھی۔ انگشت شہادت کے پور پر نمی کا احساس ہوا، سرخ گاڑھے خون کی بوندیں چمک اٹھیں۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کے ساتھ یہ ہو رہا تھا۔ اچانک سے ناک سے خون بہنا شروع ہو جاتا تھا۔ اس نے سختی سے لب بھینچے تھے۔ راہداری میں قدم رکھتے بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ زیاد کی نگاہیں اس پر ٹکیں۔

”اندر اپنی بہن کو دیکھو ذرا۔“ عجلت میں تاکید کر کے وہ فوراً پلٹ گیا تھا۔ بدر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس جگہ پر آیا جہاں وہ کھڑا تھا۔ نگاہیں سفید فرش پر گری خون کی بوند پر ٹکی۔ گہرا سرخ تازہ خون۔۔ اس نے بھنویں ملائے کم فہمی سے زیاد کی پشت کو گھورا۔

تو کیا اس کے استاد جی ٹھیک نہیں تھے؟!

☆☆☆

”کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟“ ڈاکٹر نے چشمے کے پار سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”کونسا سلسلہ؟“ اس نے کم فہمی سے پوچھا۔

”ناک سے خون کب سے آ رہا ہے؟“ ڈاکٹر نے رپورٹس پر جھکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”پچھلے کئی دنوں سے۔ اور آج صبح سے دو تین بار ہوا ہے یہ۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”اور کوئی مسئلہ؟ بخار؟ جسم میں درد؟“

”بخار تو نہیں ہاں جسم میں درد رہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بدر کو ٹرین کر رہا ہوں؟“ اس نے کم فہمی سے کہا۔ ڈاکٹر نے سر کو جنبش دی پھر رپورٹس ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔ سنجیدگی سے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔

”تمہیں بلڈ کینسر ہے۔“ بہت آرام سے اس کے سر پر پہاڑ توڑا گیا تھا۔ اس نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

”آپ اگر مذاق کر رہے۔۔“

”میں مذاق نہیں کر رہا زیاد! میں اسی وقت کا منتظر تھا۔“ ڈاکٹر کے پر اسرار لہجے نے اسے پہلو بدلنے پر مجبور کیا تھا۔

”تم جانتے ہو معاویہ کی موت کیسے ہوئی؟“ ڈاکٹر کے سوال پر اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”انہیں زہر دیا گیا تھا۔“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”اگر اسے زہر نہ بھی دیا جاتا تو وہ کچھ دنوں میں مر جاتا۔ بس شہادت کی موت اس کے نصیب میں تھی۔ ورنہ وہ بھی بلڈ کینسر کا شکار تھا۔“ اس پر حیرت انگیز انکشاف ہوا تھا۔

”لیکن بابا روپوش تھے۔ آپ کو کیسے معلوم؟“ اس نے سوال اٹھایا۔

”اس کا پوسٹ مارٹم میں نے ہی کیا تھا زیاد!“ ڈاکٹر نے اسے یاد دلایا تھا۔ وہ سمجھ کر سر ہلا گیا۔

”تو آپ کہہ رہے ہیں یہ بیماری ہماری خاندانی ہے؟“ اس نے سست پڑتی دھڑکنوں سے پوچھا تھا۔ ڈاکٹر نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک حد تک۔۔ تبھی میں تمہارا منتظر تھا اور تم آ گئے۔ اب سنو، ابھی یہ اتنا خطرناک نہیں ہوا کہ تمہاری جان کو خطرہ ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے میں یہ تمہاری جان لے بھی سکتا ہے۔ کیونکہ بلڈ کینسر بہت تیزی سے پھیلتا ہے۔ اسی لیے فوراً علاج کرواؤ۔ "

"ہاں مگر میں یہاں کیسے؟"

"الزر قاوی سر سے بات کرتا ہوں۔ تم واپس جا رہے ہو!" انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یہاں کام چھوڑ کر میں واپس نہیں جاؤں گا"!

"زندہ رہو گے تو کام کرو گے ناں!" ڈاکٹر کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ وہ ایک سخت نگاہ اس پر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"کیا ازا بھی اس کا شکار ہو سکتی ہے؟" دروازہ کھولتے ان کے ہاتھ تھم گئے۔ پلٹ کر اسے دیکھا جو پر امید نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"کہہ سکتے ہو۔" اسے امید نہیں دلائی گئی۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ وہ اپنی جگہ سُن بیٹھا بند دروازے کو تکتا رہا۔ کیا یہ سب ایسے ختم ہونے والا تھا؟ جس مشن پر اس نے دو سال کام کیا تھا وہ اسے اپنی جان کی خاطر یوں بیچ میں چھوڑ کر جانے والا تھا؟

اس کی نگاہوں کے سامنے سعاد کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ اسے یہ کیسے بتائے گا کہ وہ بلڈ کینسر کا شکار ہے؟ وہ ایک لمحے میں زندہ ہے تو اگلے لمحے میں مر بھی سکتا ہے۔ اور ازا؟ وہ یہ سب جان کر کس تکلیف سے گزرے گی؟ اور وہ خود؟ کیا

اسپتال کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا اس کی قسمت میں تھا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے معاویہ کا چہرہ گھوم گیا جو خون سے بھرا تھا۔ آخری وقت میں اسے خون کی قے آئی تھی۔۔ کیا وہ۔۔ زیاد تاشفین بھی ایسے مرنے جا رہا تھا؟

☆☆☆

اس کی چیخیں اس بند کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسے رسی سے باندھ کر کمرے کے وسط میں لٹکایا گیا تھا۔ پشت پر اور پیٹ پر بھاری ڈنڈے مارے جا رہے تھے۔ جسم پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ سرمئی شرٹ خون آلود ہو چکی تھی۔ چہرے کے نقوش بگڑ چکے تھے۔ ہونٹوں کے کنارے پھٹے ہوئے اور گالوں کی جلد اکھڑی ہوئی تھی۔ بائیں آنکھ بری طرح سوج چکی تھی۔ جسم کے ہر ہر حصے سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی چیخیں اس پر زور آزمائی کرتے آدمیوں کے لیے سکونِ قلب کا باعث تھیں۔

"میں ایک بار پھر پوچھ رہا ہوں لڑکے!! حزب اللہ کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟" ایک آدمی کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں ایک بار پھر بتا رہا ہوں میں نہیں بتاؤں گا!" وہ چلایا تھا۔ گردن کی رگیں ابھرنے لگی تھیں۔ بولتے ہوئے اسے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہ اس شخص پر ڈال کر منہ میں جمع ہوتے خون کو فرش پر تھوکا تھا۔

"بہت ضدی ہو۔ اگر اسی طرح تکلیف سے مرنا نہیں چاہتے تو بتا دو، ورنہ یاد رکھو تم نہ زندوں میں رہو گے نہ مردوں میں!!" اس شخص نے اس خبردار کیا تھا۔

”تم میری کھال بھی کھینچ لو تب بھی نہیں بتاوں گا!“ اس نے صاف انکار کیا تھا۔ اس شخص نے گہری سانس لی پھر پاس کھڑے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر موٹا ڈنڈا اس کے پیٹ پر مارا۔ اسے اپنی پسلیاں چٹختی محسوس ہوئی تھیں۔ منہ سے دردناک چیخ نکلی تھی۔ اگلے لمحات میں اسے پے در پے ڈنڈے رسید کیے جا رہے تھے۔ کمرے میں ایک بار پھر اس کی چیخیں گونجنی لگی تھیں۔ ایک ڈنڈا اس کے سینے پر پڑا تھا۔ اسے خون کی قے آئی تھی، جس جگہ اوپر کر کے اسے باندھا گیا تھا وہاں سفید فرش پر پانی کی طرح خون گرا تھا۔ اسے اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

”خیام کو ابراہم کے گھر سے کچھ نہیں ملا۔ آخر اس نے وہ ویڈیوز کہاں دفن کی ہیں؟!“ وہ جھنجھلائی تھی۔ اس نے رک کر اسے دیکھا پھر کرسی سے ٹیک لگائی۔

”ازا۔۔ تمہیں نہیں لگتا وہ ویڈیوز جہاں بھی ہیں تم ان سے واقف ہو؟“ اس نے پر اسرار لہجے میں کہا تھا۔ ازا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ کھڑکی سے چھن کر کے آتی روشن اس کے سفید رومال پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے اس سے آنکھیں ملانا محال تھا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ وہ کم فہمی سے اسے دیکھنے لگی۔

”دلال کے تمہارے ساتھ عجیب رشتہ ہے ازا! تم اس رشتے کو فراموش نہیں کر سکتیں۔ اس درندے کے دل پر پہلی ضرب تم نے لگائی تھی۔ وہ تمہیں عزیز رکھتا ہے، اس نے ایک عرصہ تمہارے باپ کی طرح تمہیں پالا۔ تمہارے اس کے خلاف اعلان جنگ پر اس نے خود تمہیں وہ قلعہ مہیا کیا جہاں سے تم اس کے خلاف لڑ سکو۔ یعنی وہ

تمہیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس سب پر غور کرو تو ازا۔۔ تم ہی ہو وہ جسے اس کا ہمراز ہونا چاہیے۔ یعنی دلال کے بعد کوئی جانتا ہے کہ وہ ویڈیوز کہاں ہیں تو وہ تم ہو!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ ازا ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ وہ اسے عجیب سے احساسات سے دوچار کر گیا تھا۔ ایک شخص جو اس کا سخت دشمن ہے، وہی اس کا محافظ ہے اور وہ اس کی ہمراز ہے۔ کیا قدرت اس سے بڑا مذاق اس کے ساتھ کر سکتی تھی؟!

"تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" وہ مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ازا۔۔ تم اور میں، ہم دونوں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں اپنا آشیانہ اجڑنے کے بعد انہی کے ہاتھوں میں پروان چڑھے ہیں۔ اور یہی وہ مشترکہ بات ہے ہم میں جو ہمیں "Game changers" بناتی ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کہہ رہا تھا۔ ازا نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

"کون ہو تم؟!" وہ عرصے سے ذہن میں اٹھا سوال لبوں پر لے آئی تھی۔

"دوستوں کے لیے مہربان، دشمنوں کے لیے عتاب!" وہ غالباً مسکرایا تھا۔ ازا سر جھٹک کر رہ گئی۔ وہ آخر اسے کیوں اپنی پہچان بتائے گا۔

"میں یاد کرنے کی کوشش کروں گی۔ اگر دلال نے واقعی مجھے اپنا ہمراز بنایا ہے تو یقین کرو، اس راز کے بوجھ سے دن بہ دن میرے لیے سانس لینا محال ہو جائے گا۔ میں جلد از جلد اس سے چھٹکارہ پانا حاصل کروں گی۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔ اس نے سر کو خم دیا تھا۔ کھڑکی سے آتی روشنی جسے وہ اس وقت سے خود پر روکے بیٹھا تھا اس کے سر جھکانے پر ازا کی آنکھوں میں پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہی تھی۔ دایاں ہاتھ چہرے کے آگے کر کے اس روشنی کو اپنے ہاتھ پر روکا تھا۔

”ضرار پلان کے دوسرے مرحلے پر عمل کب شروع کرے گا؟“

”جب اسے یقین ہو جائے گا اب اس کی بات کا یقین کیا جائے گا۔“ مسکراتے ہوئے جواب دیا گیا۔

”مگر وہ اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔“ اس کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے تھے۔

"No risk, No gain!"

وہ کندھے اچکا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ گہری سانس لے کر ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں زیاد کے پاس جا رہی ہوں۔ آج کل بدر بھی یہیں ہے ناں؟“ اس کے سوال پر وہ سر اثبات میں ہلا گیا۔

”ہاں۔۔ ہڈیاں تڑوانے آیا ہے اپنی۔“ وہ کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔ ازا ہلکا سا مسکرا دی پھر الوداعی نگاہ اس پر ڈال کر وہ کمرے سے نکل آئی۔ عموماً اس کی ملاقات اس لڑکے سے فیکٹری میں ہوا کرتی تھی مگر آج اس نے ازا کو یہیں بلوالیا تھا۔ وہ گلے میں پڑا مفلر ٹھیک کرتی راہداری میں قدم رکھنے لگی۔ ہیل کی ٹک ٹک اس سے پہلے اس کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ لانگ کوٹ ہوا کے جھونکے سے ہلکا سا لہرایا تھا۔ کمر پر گرے بال ہلکا سا کسمسائے۔ وہ اس کمرے کے باہر رک گئی جہاں ان سب کی مشترکہ آفس تھی۔ وہ دروازہ دھکیلنے ہی لگی تھی کہ دوسری طرف یہ کام اس سے پہلے خیام نے کیا تھا۔ اور نتیجہ ازا کی چیخ کی صورت میں نکلا تھا۔ شیشے کا بھاری دروازہ کھلتے ہی اس کے وجود سے ٹکرایا تھا۔ وہ ایکدم لڑکھڑائی تھی۔ دھکیلے جانے کے باعث وہ پیچھے گرنے لگی تھی۔ خیام بدحواس ہوتا آگے آیا تھا۔ وہ تب تک دیوار کا سہارا لے کر اپنے قدم زمین پر جمانے میں کامیاب ٹھہری۔ ہینڈ بیگ پھینک کر دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھتی وہ سختی سے آنکھیں میچ گئی۔ خیام کی نگاہ اس کی لمبی گداز انگلیوں سے ٹپکتے خون کی بوندوں پر ٹکی۔ اس کی رنگت فق ہوئی تھی۔

"ازا خون بہہ رہا ہے۔" وہ جلدی سے آگے آیا۔ اس کے ہاتھ پیشانی سے ہٹا کر بغور اس کی پیشانی کا جائزہ لیا۔ دائیں ابرو سے ذرا اوپر اسے چوٹ آئی تھی۔ خون کی ننھی بوندیں وہاں سے گری تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب میں رکھا رومال نکال کر اس کی پیشانی پر رکھا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" مغذرت طلب نظروں سے اسے دیکھا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اتنے غصے میں دروازہ کون کھولتا ہے خیام؟" وہ بے بسی سے پوچھ رہی تھی۔

"غصہ جب تمہارے بھائی پر ہو تو کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ آہستہ سے اس کا زخم دبا رہا تھا۔ ازا نے رومال اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تم بھائی سے کیوں لڑتے ہو؟"

"کیونکہ تمہارا بھائی جل ککڑا بنا پھرتا ہے۔ بات بات پر منہ سُجا کر گھوم رہا ہوتا ہے۔" وہ تپ گیا تھا۔ ازا نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا جس کا چہرہ ایکدم غصے سے لال پڑنے لگا تھا۔ اسے لگا تھا یہ صفت بس بدر اور جندل میں تھی لیکن خیام بھی ایسے ہی تھا۔

"کتنا لڑتے ہو تم لوگ! اور رکو ذرا یہ تمہارے گال پر کیا ہوا ہے؟" اس کی نگاہ خیام کے گال پر ٹکی جہاں چوٹ کا نشان تھا۔ زخم تازہ تھا یعنی ابھی ہی کی کارستانی تھی۔

"کچھ نہیں۔ تم اپنی فکر کرو۔" خیام نے اسے ٹالنا چاہا۔ ازا نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مجھے مت بتانا تم نے زیاد پر ہاتھ اٹھایا ہے!" وہ اسے سخت نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"نہیں لڑا اس سے میں۔" خیام نے منہ بسورا تھا۔

"تو پھر؟" وہ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ باندھے پوچھ رہی تھی۔ خیام نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے دیکھا۔ اسے کیسے بتاتا یہ زخم دیا جندل نے تھا مگر جانے انجانے میں وجہ وہ بن گئی تھی۔ وہ دونوں شاید زندگی میں پہلی بار کسی اور کی وجہ سے آپس میں لڑے تھے ورنہ ہمیشہ ان کے بیچ لڑائی کا سبب وہ دونوں خود ہی ہوتے تھے۔

"تم سے پوچھ رہی ہو میں۔" اسے خاموش دیکھ کر ازا نے اس کے آگے ہاتھ ہلایا تھا۔ "مجھے حیرت ہوتی ہے تم لوگوں پر تم لوگ ساتھ کام کیسے کر لیتے ہو؟ جب دیکھو کوئی نہ کوئی لڑ رہا ہے۔ کبھی زیاد خیام کو مار رہا ہے، کبھی جندل اور سعاد کی جنگ جاری ہے، کبھی ضرار اور سعاد لڑ رہے ہیں اور تو اور وہ چھٹانک بھر کا بدر۔۔ اسے بھی اپنے جیسا بنا لیا ہے تم لوگوں نے۔ کل وہ حضرت جندل کے ساتھ منہ ماری میں مصروف تھے۔ اور پھر یہ تم لوگوں کے ہاتھ کیوں اٹھتے ہیں ہاں؟ کوئی کسی کا گریبان پکڑ کر کھڑا ہے، کوئی مکے آزما رہا ہے تو کسی کی لاتیں برس رہی ہیں۔ کچھ تو حیا کرو تم لوگ۔۔ تیس سے اوپر کی عمریں ہیں تم لوگوں کی حالت تین سال کے بچوں والی ہے۔ نالائق، نانہجار۔۔ ایک سے بڑھ کر ایک نامعقول اور گدھا!" وہ اسے سنانا شروع ہوئی تو کھڑے کھڑے ہی جھاڑ پلا دی تھی۔ خیام حیرت و بے یقینی سے سُن کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ سعاد کے بعد یہ پہلی لڑکی تھی جو کھڑے کھڑے اسے سنا چکی تھی۔ بنا رکے، بنا جھجھکے!!

"اب بولو گے کہ کس سے مار کھائی ہے؟" وہ اس کی خاموشی پر جھنجھلا کر ہاتھ پر ہاتھ مارتی پوچھ رہی تھی۔ خیام ہنوز بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ازا نے اسے دیکھ کر غصے سے دانت کچکچائے تھے۔ "میرا دل کر رہا ہے خیام میں تمہیں رکھ کر لگاؤں ایک کان کے نیچے۔ یا پھر میں نا تمہارا۔۔" وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے قریب لائی تھی۔ اپنے ہر عمل سے وہ اسے جھٹکے پر جھٹکے دے رہی تھی۔ اس کے وجود میں کوئی حرکت اور لبوں میں کوئی جنبش نہ

دیکھ کر وہ گہری سانس لیتی ہاتھ جھاڑ کر پیچھے ہٹی۔ ”بس اتنے شریف بن کر رہو تو کسی سے مار کھانے کی نوبت نہ آئے “!

”بیلا باجی، آپ ایسے ہاتھ ہلا ہلا کر لڑاکا بیویوں کی طرح سوال کریں گی تو میرے بے چارے سر کہاں سے جواب دے پائیں گے ؟ شکل تو دیکھیں ان کی ایسے لگ رہا ہے ابھی رو دیں گے۔ کتنا ڈانٹا ہے آپ نے انہیں۔“ بدر جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ معصومیت سے اپنی بات مکمل کر تا وہ پلکیں جھپکتا خیام کو دیکھنے لگا جو اب دانت پر دانت جمائے اسے گھورنے لگا تھا۔

”تمہارا بے چارہ سر مار کھا کر آرہا ہے۔“ ازا نے اسے اطلاع دی۔ بدر نے حیرت سے خیام کو دیکھا جو اپنے دائیں ہاتھ سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بیلا باجی۔ یہ مار کھانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہاں مارتے ہوئے دو چار مکے انہیں بھی پڑ گئے ہوں تو وہ الگ بات ہے۔“ بدر نے اسے تسلی دی تھی۔ ازا سر جھٹک کر رہ گئی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہارے استاد کو معلوم ہے ؟“ خیام نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”استاد جی کو ہی ڈھونڈ رہا تھا۔۔ ارے یہ آ گئے۔“ بدر نے کمرے سے نکلتے زیاد کو دیکھا۔ ان تینوں کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

”تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو ؟“ سخت لہجے میں پوچھا گیا۔ خیام کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔

”میں آپ سے ملنے آئی تھی۔“ ازا نے اطلاع دی تھی۔

”مجھے بھی آپ سے کام تھا استاد جی۔“ بدر بھی جھٹ سے بولا۔ زیاد نے ایک اچٹتی نگاہ ان دونوں پر ڈالی پھر خیام کی طرف متوجہ ہوا۔

”اور تم؟!“ لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”سر کو ہم نے روکا تھا۔ سوچا تھوڑی محفل لگالیں۔ بیلا باجی سے پوچھیں سر کتنی اچھی کمپنی دیتے ہیں۔ کیوں بیلا باجی؟“ خیام کے جواب سے پہلے ہی بدر نے تیزی سے کہا پھر تائیدی نظروں سے ازا کو دیکھا جو سر اثبات میں ہلا گئی۔

”اس کے منہ میں الفاظ مت ڈالو بدر!“ زیاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔ بدر بے اختیار لب دانتوں میں دبا گیا۔ ازا ہاتھ میں موجود خون آلود رومال کو بھینچ گئی۔ خیام دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”آپ معاف کیوں نہیں کر دیتے انہیں؟“ وہ خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

”قتل کی معافی نہیں ہوتی بدر!“ اس نے دوٹوک انداز میں کہا پھر بدر کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لب بھینچتا آفس کی طرف بڑھ گیا۔ ازا بھی اس کا اشارہ سمجھ کر چپ چاپ بدر کے پیچھے چلی گئی۔ زیاد اب خیام کی طرف متوجہ ہوا۔

”مجھے بار بار تمہیں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہ پڑے خیام حنفی کہ میری بہن سے دور رہو!!“ انگشت شہادت اٹھا کر اسے خبردار کیا گیا۔ خیام چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ زیاد سخت نگاہ اس پر ڈال کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔۔ چپ چاپ۔۔ اور اگر انسان دوسروں کو کچھ کہنے کا موقع دینے لگے تو کتنے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔۔

☆☆☆

”ہاں کہو، سن رہا ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ باہم ملائے کہنیاں میز پر ٹکائے مکمل اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"زیاد تم۔۔" وہ بے خیالی میں کچھ کہتے کہتے رکی۔ اپنی غلطی پر زبان دانتوں تلے دبائی اور عادت کے مطابق آنکھیں سختی سے میچیں۔ زیاد مسکرا دیا تھا۔۔ ذرا سا۔۔ بالکل ہلکا سا۔

"ازا۔۔ میں تمہارا بھائی ہوں مگر سب سے بڑھ کر دوست ہوں۔ تم مجھے زیاد کہہ لیا کرو، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ آرام سے اس کی مشکل آسان کر چکا تھا۔

"تم بہت اچھے بھائی ہو۔" وہ کھل کر مسکرائی۔ زیاد نے سر کو خم دیا۔

"مجھے خیام کے متعلق پوچھنا تھا۔ تم اس سے کیوں خفا ہو؟ کیا ہوا ہے تم دونوں کے درمیان میں؟ تم دونوں تو اچھے دوست تھے۔" وہ اب مدعے پر آئی تھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا جو اپنے سوال کا جواب جاننے کے لیے پرجوش تھی۔

"اگر وہ کہتا ہے میں اس کا دوست ہوں تو وہ غلط کہتا ہے۔ ہم دونوں کبھی دوست نہیں ہو سکتے!!" وہ جواب کو ٹال مٹول گیا۔ ازا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اچھا بھئی نہیں بتاؤ۔ نہیں پوچھ رہی میں۔۔" وہ سر جھٹک کر کرسی سے ٹیک لگا گئی۔ چند پل خفگی سے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا توقف سے بولی۔ "یہ بتاؤ، بابا کی شہادت کیسے ہوئی؟" زیاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ شاید پہلی بار اس سے اپنے باپ کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

"انہیں بلڈ کینسر تھا۔ لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ان کے جسم میں زہر کے اثرات بھی ملے ہیں۔ یعنی انہیں زہر دے کر شہید کیا گیا تھا۔" اس نے مبہم سے انداز میں تفصیل بتائی۔ ازا نے اس کی بات سمجھ کر بس سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ "خیریت؟ تم نے اچانک کیوں پوچھا؟" زیاد نے اسے کریدنا چاہا۔

”اصل میں اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، سعاد بھی جاگ رہی تھی تو ہم دونوں یہی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کیسے ان کے گھر کو آگ لگی، اور کیسے ہمارے گھر اجڑا۔ خیام کے ساتھ کیا ہوا اور بدر کیسے بچھڑا۔“ وہ سوچ سوچ کر بتا رہی تھی۔ زیاد نے غیر محسوس طریقے سے پہلو بدلا تھا۔ وہ کچھ یاد آنے پر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر توقف سے بولی۔ ”اس نے مجھے تمہاری اور اس کی لو اسٹوری بھی سنائی۔“ وہ کھکھلا کر ہنسی۔

”لو اسٹوری؟“ زیاد نے دائیں ابرو اٹھائے پوچھا۔

”ہاں کہ کیسے تم دونوں پہلے یونیورسٹی میں ملے پھر اس کا پیچھا کرتے ہوئے تم اندلس آئے۔ جان بوجھ کر اس کے گائیڈ بنے۔ تم نے کیسے اسے ایک لفنگے آدمی سے بچایا۔ اس کا دل جیتنے کے لیے ہوٹلز کے بل پے کیے۔ پھر تم یہاں آ گئے۔ پھر کہانی میں ٹوئیسٹ آیا اور تم دونوں کی ”تاریخی“ شادی ہوئی۔“ وہ ”تاریخی“ پر زور دے کر گردن گرا کر ہنسی تھی۔ زیاد نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا تھا۔

”میں پیچھا کرتے ہوئے اندلس آیا۔۔ اس کا دل جیتنے کے لیے ہوٹلز کے بل پے
کیے۔۔ زبردست۔۔ انٹرسٹنگ۔۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بڑبڑایا پھر ازا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اس نے تمہیں بتایا کہ یہ محبت یک طرفہ تھی یا دو طرفہ؟“ اسے شرارت سوجھی تھی۔

”دو طرفہ۔۔ تم اس کا دل جیتنے میں کامیاب رہے تھے ناں۔“ اس نے تائید چاہی تھی۔ زیاد مسکراہٹ دباتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گیا۔ پھر کچھ یاد آنے پر سنجیدہ ہوا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”ازا۔۔ میں کئی دنوں سے یہ بات تم سے کرنا چاہ رہا تھا۔ یاد رہے میں صرف دوست نہیں بھائی بن کر بھی یہ بات کر رہا ہوں۔ میرا مان رکھنا!“ وہ تمہید باندھ رہا تھا۔ ازا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں تم کافی

عرصے سے مذہبی کشمکش میں مبتلا ہو۔ جب سے یہ سب شروع ہوا ہے تمہارا اس طرف اتنا دھیان نہیں ہے مگر پھر بھی تم نے جستجو مکمل ترک نہیں کی۔۔ ازا۔۔ میں چاہتا ہوں تم اسلام قبول کر لو۔" وہ بہت نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گئی تھی۔ "میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ برا ہوا ہے۔ تم سے تمہارا دین چھین لیا گیا ہے۔۔ اب وقت ہے اسے واپس تھام لو۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں دائمی جدائی ہماری قسمت میں نہ لکھ دی جائے۔ ہم دونوں کے راستے بعد از موت جدا نہ ہو جائیں۔ بابا۔۔ ماں اور میں۔۔ ہم سب تمہارا انتظار کریں گے۔ ہمیں مایوس مت کرنا۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی۔ جدائی سے دونوں خائف تھے مگر۔۔ کچھ فیصلے آسان نہیں ہوتے۔

"مجھے اندازہ ہے بھائی۔۔ مگر اب میں بس اس لیے اسلام قبول نہیں کر سکتی کہ یہ آپ کا مذہب ہے۔ مجھے میری تلاش کا سفر مکمل کرنے دیں۔ مجھے امید ہے جب میں آپ کی طرف لوٹوں گی تو آپ کو اپنا منتظر پاؤں گی۔" اسے اپنے رخسار پر نمی کا احساس ہوا تھا۔

"دیکھنا ازا۔۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔" وہ ڈرا ہوا تھا، اس کا ڈر جائز تھا۔ ہر لمحہ وہ یہی دعا کرتا تھا کہ موت اس سے تب تک دور رہے جب تک موت پر قادر خدا پر ایمان نہ لے آئے۔ وہ۔۔ اپنی بہن کو خسارے میں جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"کبھی ہزاروں دلائل بھی مطمئن نہیں کر پاتے۔۔ کبھی ایک لفظ حیات بدل لیتا ہے۔ مجھے امید ہے میرا سفر تلاش جلد اختتام پذیر ہو گا۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی تھی۔ زیاد نے بے اختیار آمین کہا تھا۔ وہ کم از کم اپنی موت سے پہلے ازا کی طرف سے یہ خوشخبری سننا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا موت اسے مزید کتنی مہلت دینے والی تھی۔ وہ اب بس۔۔ ازا کو لوٹتے دیکھنا چاہتا تھا۔۔ اپنے اصل کی طرف!

☆☆☆

وہ رات کئی لوگوں پر بھاری گزری تھی۔ خیام، جسے اپنا رواں رواں سُن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ دل و دماغ میں عجیب سی جنگ چڑھ گئی تھی۔ سوچوں کا بھنور تھا جس میں وہ محصور ہوتا جا رہا تھا۔ اور جندل۔۔ جسے اپنا دل خالی ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے جو فیصلہ بس چند لمحات میں لیا تھا وہ اس کی زندگی کا ہر پل اس پر بھاری کرنے جا رہا تھا۔ زیاد جو اگر ایک طرف اپنوں سے روٹھا ہوا تھا تو دوسری طرف زندگی اس سے روٹھنے لگی تھی۔ شاید آج سے پہلے اس نے یہ محسوس نہیں کیا تھا مگر اب معلوم ہونے پر اس نے اس رات کے کئی لمحات بیسن پر جھک کر خون تھوکتے ہوئے گزارے تھے۔ ازا۔۔ وہ دھتکاری گئی تھی۔ اسے اپنا آپ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید آج سے پہلے اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا مگر اب اسے یہ بات قبول کرنا پڑی تھی کہ وہ جندل کو استعمال نہیں کر رہی تھی، اس کا نام یونہی لبوں پر نہیں آیا تھا۔۔ یہ دل میں اٹھتی خواہش تھی جس نے الفاظ کا روپ دھارا تھا۔۔ وہ خواہش جو بری طرح کچلی جا چکی تھی۔ اور سعاد۔۔ وہ گم سم اپنے خالی ہاتھوں کو تک رہی تھی۔ صرف چند غلط فہمیاں، جانے انجانے میں لیے گئے چھوٹے سے فیصلے مضبوط سے مضبوط رشتوں میں بھی بے اعتمادی کا بیج بو دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ زیاد کا یہ مان کیسے دوبارہ قائم کرے گی۔ وہ اسے معاف کر دے گا مگر شاید آئندہ کبھی اس پر اندھا اعتبار نہیں کرے گا۔۔ اور یہی چیز تھی جو اسے اندر ہی اندر تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی۔

خیام دل اور دماغ کی جنگ میں تھکنے لگا تھا جب بدر اس کے پاس آ کر بیٹھا تھا۔ سعاد کے اٹھے کندھے ڈھیلے پڑے تھے اور تبھی جندل نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ زیاد یک ٹک بیسن میں گرتے خون کو دیکھ رہا تھا۔ ازا گھٹنوں کے گرد بازو باندھ کر سر گھٹنوں پر ٹکا کر رو دی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی۔۔ وہ سالوں پہلے بھی ہوں ہی تنہا تھے۔۔ وہ آج بھی تنہا تھے۔ اپنے خول میں سمٹ کر رہنے والے۔۔ گہرے راز رکھنے والے۔۔ تو طے ہوا کہ کچھ

لوگ تنہائی کو بہترین ہمراز گردانتے ہیں۔ اور یہی ان دونوں کا یقین تھا۔ انہیں ہر بار کسی کندھے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود کو خود سمیٹ لیتے تھے۔

☆☆☆

"میں مزید یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ یہاں گزرتا ہر لمحہ مجھ پر بھاری ہے، یہاں لی گئی ہر سانس مجھے گراں گزرتی ہے۔ میں نے پہاڑوں میں اڑان بھرنا سیکھی ہے، میں نے سمندر کی تلاطم خیز موجوں میں سکون ڈھونڈا ہے، میں کھلے آسمان تلے آزادی سے سویا ہوں میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں؟ یہاں ہر طرف قید کی سلاخیں ہیں، ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں بسنے والے ہر انسان نامی پرندے کے پر کاٹ کر اس کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا ہو۔ انسان سے اس کی اڑان چھین لی گئی ہو۔

میں۔۔ میں نے پہاڑوں میں، سمندروں میں، جنگلوں میں عاجزی دیکھی ہے، مشقت اور مشکلات دیکھی ہیں۔ میں نے وہاں کی سادگی اور مشکلات میں سکون محسوس کیا ہے۔ یہاں غرور تکبر، عیش و آرام۔۔ نفس پرستی اور بے سکونی ہے۔ میں نے وہاں پہاڑوں میں قرون اولیٰ کے مجاہدین کی جھلک دیکھی ہے، یہاں میں نے مکہ کے منافقین دیکھے ہیں۔ میں نہیں رہ سکتا یہاں، میں نہیں جی سکتا یہاں۔۔۔!" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سعاد بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے بغور اسے سن رہی تھی۔

"لیکن مجھے پہاڑوں سے یہاں بھیجا گیا ہے، مجھے سمندروں کی گہرائی سے نکال کر یہاں کے دلدل میں بھیجا گیا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو فریضہ مجھے سونپا گیا ہے اس میں کی گئی ایک غلطی بھی وہاں پہاڑوں پر موجود قرون اولیٰ کے مجاہدین کی جھلک مٹا دے گی۔ اور ہمیں یہی تو سکھایا گیا ہے، سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جاتے ہوئے خود کو سمندر کے حوالے کر دینا۔ سمندر خود ہی تمہیں باہر نکال پھینکے گا۔۔۔!

میں جیوں گا، اپنا فریضہ نبھاؤں گا تاکہ دنیا ایک بار پھر سن سکے گھوڑوں کی ہنہناہٹ، اسلام کے شیروں کی گرج۔ تاکہ دنیا دیکھ سکے تلواروں کا ٹکرانا اور تیز ہوا کے جھونکوں سے دنیا پر لہراتا وہ پرچم کہ جو گواہی دے ایک اللہ اور اس کی وحدانیت کی۔۔۔۔"!!

میری زندگی کا مقصد، تیرے دین کی سرفرازی۔۔

میں اسی لیے مجاہد، میں اسی لیے نمازی۔۔

"کیا ہوا ہے جندل، پریشان ہو؟" وہ نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ایک مشکل فیصلہ سنا کر آیا ہوں آپی۔۔مجھے اپنا دل خالی محسوس ہو رہا ہے۔" وہ نظریں فرش پر ٹکائے بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔ گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"کیا تم مطمئن نہیں ہو؟"

"دماغ سکون میں ہے مگر دل کا کیا کروں؟ یہ مجبوریاں اور عذر نہیں سنتا، یہ بس "چاہتا" ہے۔ اور جو چاہتا ہے اسے "مانگتا" ہے۔ نہ ملنے پر بچوں کی طرح روٹھ جاتا ہے۔ اسے کیسے سنبھالا جائے؟ دل پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔" اس نے دھیرے سے صوفے سے ٹیک لگا لی۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ خود ہی سنبھل جائے گا۔۔ مگر خبردار، اس کی باتوں میں مت آنا! یہ تم سے تمہارا ذہنی سکون بھی چھین لے گا۔" وہ بہت آسان الفاظ میں اس کی مشکل آسان کر گئی۔ جندل نے مبہم سا مسکرا کر اسے دیکھا پھر سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”ویسے اگر تم چاہو ہو تمہارے دل کو سنبھالنے کے لیے تمہاری شادی کروادیتے ہیں، کیا کہتے ہو؟“ اس نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کے لیے شائستگی سے پوچھا تھا۔

”شکر ہے آپ کو خیال تو آیا۔“ اس نے باقاعدہ تشکر بھری سانس لی۔ سعاد نے مسکراہٹ دبائی۔

”بتاؤ کیسی بیوی چاہیے؟“ وہ اپنا رخ اس کی طرف کر کے مکمل اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ام۔۔اس کے بال گہرے بھورے رنگ کے ہوں اور کندھوں تک آتے ہوں۔ رخسار پر چوٹ کا نشان ہو جسے وہ میک اپ سے چھپاتی ہو۔۔قد درمیانہ، مزاج شائستہ، آنکھیں گہری اور۔۔۔ سمندر سے محبت کرتی ہو۔“ سوچ سوچ کر بولتے ہوئے اس نے باقاعدہ سعاد کے سامنے ایک تصویر بنادی۔ سعاد چند پل خلا میں گھورتی رہی پھر نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

”ایک لڑکی ہے میری نظر میں مگر مسئلہ ہے اسے سمندر نہیں پسند۔۔تو تمہارا اور اس کا جوڑ بالکل نہیں بنتا۔ اسے پسِ پشت ڈال کر ہم تمہارے لیے کوئی جل پری تلاش کرتے ہیں۔“ اس نے شرارت سے کہا تھا۔ جندل اس کی بات کا مطلب سمجھ کر لب دانتوں میں دبا گیا۔ اسے کیسے بتاتا کہ آخر میں یہ شرط اسی تصویر کو جھٹلانے کے لیے رکھی گئی تھی۔

”بہت شکریہ! آپ کا یہ احسان تاعمر نہیں بھولوں گا۔“ اس نے سر کو خم دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔۔بہن سے بڑھ کر دوست ہوں تمہاری، اتنا تو کر ہی سکتی ہوں تمہارے لیے۔“ اس نے فخریہ کالر جھاڑے تھے۔ جندل نے دائیں ابرو اٹھائے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سعاد نے اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر آنکھیں چھوٹی کر کے اسے گھورا۔ ”جانتی ہوں تم کیا کہنے لگے ہو لیکن تم غلط ہو۔ میں نے کافی سوچا اور میں اس نتیجے

پر پہنچی ہوں کہ میں ساری زندگی جس طرح تمہارے ساتھ پیش آئی ہوں، جو کردار میں نے تمہاری زندگی میں نبھایا ہے وہ دراصل ایک اچھی دوست کا ہے۔ کیا کہتے ہو؟" تائیدی نگاہوں سے اسے دیکھا گیا۔

"شدید مخالفت کرتا ہوں۔ کھڑے کھڑے جھاڑ پلا دیتی ہیں، کہیں بھی سنا دیتی ہیں، جانے کتنی بار تھپڑ کھا چکا ہوں آپ سے۔۔ یہ بس ایک بڑی بہن ہی کر سکتی ہے!" اس نے جلے کٹے انداز میں کہا تھا۔

"تم بس جلتے رہنا۔ تم سے اچھا بدر ہے۔۔ حالانکہ اس کی بہن نہیں ہوں مگر پھر بھی اس دن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپ ایک اچھی بہن ہیں۔"

"ہاں، آپ بھی تو کس کی باتوں میں آئی ہیں۔" وہ سر جھٹک کر بڑبڑایا۔ سعاد نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا پھر اس کے کندھے پر مکا رسید کیا تھا۔

"نامعقول انسان"!

"بے وقوف خاتون"!

"گستاخ عوام!" اور یہاں سے ان کی تادیر جاری رہنے والی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ کیونکہ بقول سعاد کے وہ دونوں بہن بھائی کم دوست زیادہ تھے۔

☆☆☆

"ویسے ظلم کیا ہے آپ نے میرے ساتھ۔ بھگا بھگا کر مار دیتے ہیں استاد جی۔ ٹانگیں ٹوٹنے کو ہو رہی ہیں اب۔۔" وہ اپنی ٹانگ کو ہلکا ہلکا دباتا شکوہ کر رہا تھا۔ خیام نے نگاہیں ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ گال پر چوٹ کے نشان تھے، ایک زخم پیشانی پر بھی تھا۔ ہاتھ چھلے ہوئے تھے۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ وہ واقعی بہت محنت کر رہا تھا۔ "اب

ایسے ماما بھری نگاہوں سے نہ دیکھیں۔" اسے مسلسل خود کو تکتا پا کر بدر نے اسے ٹوکا تھا۔ خیام نے چونک کر نگاہوں کا رخ بدلا۔

"اس نے ابھی ہاتھ ہلکا رکھا ہوا ہے۔ اگر تم پہاڑوں پر جاتے تو معلوم ہوتا سختی کیا ہوتی ہے؟!" خیام کی بات پر وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"مجھے اندازہ ہے بھائی کہ سختی کیا ہوتی ہے؟!" اس نے تاریک آسمان کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"افق کیسی ہے؟" اس نے موضوع بدلا تھا۔

"معلوم نہیں۔ رابطہ نہیں ہوا کئی دنوں سے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔ خیام نے سر کو جنبش دی۔

"اپنے اور اس کے مستقبل کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟" سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"خیال نیک ہیں بس حالات ساتھ نہیں دے رہے۔ جیکب صاحب واپس بلائیں تو کچھ سوچا جائے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ خیام ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔

"اسے حقیقت بتاؤ گے تو تمہیں قبول کر لے گی؟"

"آپ اسے جانتے نہیں ہیں بھائی۔" بدر نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "وہ میرے ہر غلط کام میں بھی میرا ساتھ دیتی ہے۔ یہاں تو پھر حق و باطل کی جنگ ہے، وہ ماتھے پر بل ڈالے بنا میرے شانہ بشانہ کھڑی ہو جائے گی۔" اس کے لہجے میں مان تھا، محبت تھی۔ خیام نے مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے سر کو جنبش دی تھی۔ برسوں کا عرصہ گزرا تھا، وہ واقعی اپنی بہن کو نہیں جانتا تھا۔ وہ بڑی ہو چکی تھی، وہ نہیں جانتا تھا وہ کس طرح کی

شخصیت کے قالب میں ڈھلی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ بھرے کئی رنگ آئے تھے۔ بدر نے بغور ان رنگوں کو دیکھا پھر ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کے لیے پوچھ بیٹھا۔

”عمر کیا ہے آپ کی؟“ اس کے سوال پر خیام نے کم فہمی سے اسے دیکھا جیسے سوال کے پیچھے مقصد جاننے کی کوشش کی ہو۔

”یہی کوئی بتیس سال۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ بدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ کی عمر کے لوگ چار بچوں کے باپ ہوتے ہیں اور آپ ہیں کہ بچے تو چھوڑیں بچوں کی اماں کے بھی دور دور تک آثار نہیں ہیں۔ کچھ تو شرم کریں یار۔“ وہ افسوس سے کہتا اسے شرم دلا رہا تھا۔ خیام نے دائیں ابرو اٹھائے ”اچھا!!“ والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اور تم؟ تمہاری عمر میں مَیں خرا*سان میں اہم ترین مشن کو کمانڈ کر رہا تھا۔ کچھ تو شرم کرو، تم یہاں بیٹھ کر مجھے بچوں کے مشورے دے رہے ہو!“ اس نے بھی حساب چکتا کیا تھا۔

”دیر آید درست آید!“ خیام کا جوابی وار فاؤل گیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ ”ویسے ایمان سے بتائیں واقعی کبھی شادی کا نہیں سوچا؟ یا پھر کوئی اور مسئلہ ہے؟“ وہ رازدارانہ انداز میں کہتا کھسک کر اس کے قریب ہوا۔ خیام اس کے تیور دیکھ کر بے اختیار خود میں سمٹا تھا۔

”ایسے مت دیکھو مجھے اور ذرا فاصلے پر بیٹھو۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ بدر نے بدمزگی سے اسے دیکھا پھر واپس فاصلہ قائم کر کے بیٹھا۔

”بتائیں ناں اب، کیوں نہیں کی شادی؟“

"کبھی وقت نہیں ملا۔" بدر کو اس سے ایسے ہی جواب کی امید تھی۔

"اب ہے ناں، سوچ لیں۔ ویسے بھی استاد جی بیلا باجی کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے آسمان پر نگاہیں ٹکائے چاند کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔ خیام نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں حیرت ابھری۔ وہ کئی پل کچھ بول نہیں سکا۔ بدر نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر فخریہ کالر جھاڑے۔ "آپ کو لگا مجھے نہیں معلوم ہو گا؟ مائی ڈیئر کھڑوس باس! اگر ذرا غور فرمائیں تو آپ کی اور میری رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے!" اس نے شرارت سے خیام کی طرف جھک کر کہا تھا۔ خیام بے ساختہ جھرجھری لیتا پیچھے ہٹا تھا۔ غلطی سے اس نے جندل کا خون لیا تھا اور اب اس غلطی کی سزا وہ ساری زندگی بھگتنے جا رہا تھا۔

"اگلی بار مر جاؤں گا مگر کسی کا خون نہیں لوں گا!" اس نے پختہ ارادہ کیا تھا۔

"نہ کریں، بیلا باجی بیوہ ہو جائیں گی۔" اس نے معصومیت سے کہا تھا۔ خیام نے دانت کچکچائے۔ بدر اس کے صبر کا امتحان لے رہا تھا، وہ اس امتحان میں بری طرح ناکام ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ پورا اس کی طرف گھوم چکا تھا۔

"زیاد نے تم سے کہا ہے کہ وہ ازا کی شادی کرنا چاہتا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں کہا تو نہیں ہے۔ بس مجھے لگا وہ یہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ۔۔ مجھے لگتا ہے استاد جی بیمار ہیں، مزید سعاد آپی سے پوچھ لیں۔ کل ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا تو ان سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ۔۔ استاد جی بیلا باجی کے متعلق فکرمند ہیں۔ عین ممکن ہے یہ شادی کا مسئلہ نہ ہو، بیلا باجی کے مذہب کے متعلق ہو مگر شاید اس کا حل اس صورت میں نکالا جائے۔" اس نے مکمل تفصیل اس کے گوش گزار کی۔ خیام اس کی پہلی بات میں ہی اٹک گیا تھا۔ وہ مزید سب کچھ خالی خالی دماغ سے سنتا رہا تھا۔

”زیاد۔۔ بیمار ہے؟“ اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ بدر نے سر اثبات میں ہلایا پھر رازدارانہ انداز میں اس کے قریب ہوا۔ ”کل میں نے ان کے ناک سے خون بہتا دیکھا تھا۔۔ صرف چند قطرے نہیں۔۔ باقاعدہ خون! گہرا سرخ انسانی خون!“ اس نے خیام کے کان کے پاس سرگوشی کی تھی۔ اس کا ماتھا یہیں سے ٹھنکا تھا۔ چونک کر بدر کو دیکھا تھا جو لب دانتوں میں دبائے فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

”تمھیں کیا لگتا ہے مصعب؟“ اس نے الجھے الجھے سے انداز میں پوچھا تھا۔

”آپ کو یاد ہے۔۔ معاویہ انکل کو بلڈ کینسر تھا؟ معلومات نکلوانے پر مجھے معلوم ہوا ہے کہ استاد جی کے دادا کی موت بھی بلڈ کینسر سے ہوئی۔ یعنی یہ ان کی خاندانی بیماری ہے!“ وہ جس نتیجے پر پہنچا تھا وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ ایک لمحے کے لیے خیام کو اپنے اردگرد سب کچھ تھمتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے سانس روکے بدر کو دیکھا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے میں وہ تیزی سے زیاد کی آفس کی طرف بھاگا تھا۔ راہداری میں اٹھتے قدم اسے من من بھر کے محسوس ہو رہے تھے۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور دماغ سُن ہونے لگا تھا۔ وہ تیزی سے آفس کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ زیاد کی کرسی اور میز دونوں خالی تھے۔ وہ یہاں سے نکل چکا تھا۔ اور اس کے اس طرح چلے جانے نے ہی خیام کو یہ قبول کرنے پر مجبور کیا تھا کہ بدر کا ہر اندیشہ درست تھا۔۔ زیاد تاشفین کو بلڈ کینسر تھا!

☆☆☆

اس نے خود کو گہرے اتھاہ سمندر میں پایا تھا۔ وہ پوری اونچائی سے سمندر میں گری تھی۔ شڑاپ کی آواز آئی تھی اور ایک جہان سے دوسرے جہان کا سفر طے ہوا تھا۔ ایکدم ہر طرف سکوت چھا گیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے مگر خود کو گہرے پانی میں بے بس پایا۔ اس نے سانس لینا چاہی تو منہ کے ذریعے پانی پھیپھڑوں میں جانے لگا۔ اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

دھیرے دھیرے گہرے پانی میں گرتا وجود بے جان پڑنے لگا تھا۔ وہ گہری اتھاہ گہرائیوں میں جارہی تھی۔ روشنی ختم ہوتی جارہی تھی، دھیرے دھیرے ہر سُو اندھیرا چھارہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وجود بے جان پڑ گیا۔ وہ گہرے پانیوں میں داخل ہوتے ہی موت کے حوالے کردی گئی۔

وہ ایکدم ڈر کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے خود کو اندھیر کمرے میں پایا۔ سرد موسم میں بھی وہ پسینے میں شرابور ہوچکی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے لیمپ آن کیا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے پانی گلاس میں الٹا پھر گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پانی چڑھا کر اس نے گلاس ایک طرف رکھا پھر سر ہاتھوں میں گرادیا۔ گہرے سانس لیتی وہ اپنا تنفس بحال کرنے لگی تھی۔ سمندر سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ ہر بار سمندر کی اتھا گہرائیوں میں اپنے وجود کو بے جان پڑتے محسوس کرتی تھی۔ پانی۔۔ حد نگاہ تک پھیلا پانی۔۔ سمندر کی دنیا اسے خوفزدہ کرتی تھی۔

اس نے سر ہاتھوں سے اٹھایا۔ نگاہیں ترچھی کرکے برابر میں خالی جگہ کو دیکھا۔ وہ اب اس جگہ پر زیاد کو دیکھنے کی عادی ہوگئی تھی۔ اسے اس وقت اس کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل اٹھایا پھر اسے کال کرنے لگی۔ پھر وقت دیکھنے کے بعد کال کرنے کا ارادہ ترک کرکے اس کے لیے پیغام لکھا۔

”وہ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں یاد کیا، تمہیں محسوس ہوا؟!“ پیغام لکھ کر اسے نے بار بار اسے پڑھا اور بالآخر مکمل تسلی کرکے پیغام بھیج دیا۔ کچھ دیر جواب کا انتظار کیا، جواب نہ ملنے پر وہ بیڈ سے اتری۔ کھلے بالوں کو جوڑے میں باندھا پھر واشروم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ فریش ہوکر واپس آئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے بال سنوارے۔

اگلے لمحات میں وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ کرسی کھینچ کر اسکرینوں کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ ایک نگاہ موبائل پر ڈالنا نہیں بھولی تھی جس کی اسکرین ہنوز تاریک تھی۔

☆☆☆

ایک اور بھاری رات گزری تھی۔ اگلی صبح ان دونوں کو زیاد کی طرف سے غیر معمولی پیغام موصول ہوا تھا۔

"مجھے پہاڑ یاد آرہے ہیں۔ تم لوگ اس سلسلے میں میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟" پیغام پڑھ کر جہاں خیام اپنی جگہ سُن ہو چکا تھا وہیں جندل نے برے برے منہ بنائے تھے۔

"یہ صبح صبح کونسا مذاق کرنا چاہ رہا ہے میرے ساتھ؟" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ خیام ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر تیزی سے باہر کی طرف لپکا تھا۔ جندل بھی اپنا کوٹ اٹھا کر اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

اگلے چند لمحات میں وہ تینوں اس کھلے میدان میں بدر کے منتظر تھے۔ جب بدر نے میدان میں قدم رکھا تو ان تینوں کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا۔ اس کی چھٹی حس نے کسی گڑبڑ کا الارم دیا۔ اس نے نم پڑتی ہتھیلیاں بھینچتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔ وہ تینوں سنجیدگی سے اس کے اٹھتے قدموں کو دیکھ رہا تھا۔ خیام باقاعدہ انہیں گن رہا تھا۔

"تین۔۔۔ دو۔۔ ایک!" اس کے ساتھ ہی بدر کا پاؤں اس اچانک نمودار ہونے والی رسی میں اٹکا۔ وہ منہ کے بل خاک آلود زمین پر گرا۔ سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اس کے ستارے گردش کرنا شروع ہو چکے تھے۔

اگلے لمحات میں وہ شل ہوتی ٹانگوں کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ پوری قوت کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ جندل اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دس منٹ میں اس میدان کے پانچ چکر لگانا تھے۔ کھلا وسیع میدان جس کا ایک چکر وہ آج سے پہلے کبھی چار منٹ سے کم وقت میں مکمل نہیں کر پایا تھا۔ چکراتا سر، آنکھوں کے آگے چھاتا اندھیرا۔۔ شل ہوتی ٹانگیں، تیزی سے بہتا پسینہ۔۔ وہ ہر چیز سے لاپرواہو کر بھاگ رہا تھا۔ یہاں اس نے پانچ چکر مکمل کیے، وہاں جندل نے وقت دیکھا۔ دس منٹ، تیس سیکنڈ! اس نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا۔ بدر نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زیاد نے اسے دوبارہ بھاگنے کا اشارہ دے دیا۔ بدر کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

خیام اس کے سامنے اینٹ لے کر کھڑا تھا۔ بدر کم فہمی سے اینٹ کو تک رہا تھا۔ اس کے برابر میں کھڑا زیاد آگے آیا۔ اگلے ہی لمحے میں اس نے گھومتے ہوئے اپنی ٹانگ ہوا میں لہرائی۔ بدر نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اینٹ کے دو ٹکڑے زمین پر گرتے دیکھے۔ زیاد اپنے ہاتھ جھاڑتا پیچھے ہٹ گیا۔ خیام نے ایک اور اینٹ اٹھالی۔ لبوں پر شرارت بھری مسکراہٹ رینگ گئی۔ بدر نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ بے اختیار قدم پیچھے ہٹے۔ زیاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔ بدر کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ اس نے زیاد کے سے انداز میں گھوم کر اپنی ٹانگ ہوا میں لہرائی۔ اینٹ تو نہیں البتہ اسے اپنے پاؤں کی ہڈی ضرور چٹختی محسوس ہوئی تھی۔ خیام، جندل اور زیاد کے فلک شگاف قہقہے اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ وہ اپنا پاؤں پکڑتا نیچے بیٹھتا چلا گیا تھا۔

”ورزش جسم کو مضبوط بناتی ہے بدر! تمہیں پچھلے ایک ہفتے سے اگر میں صرف ورزش ہی کروا رہا ہوں تو اس کی وجہ یہی ہے۔ اگر پہلے ہی دن تمہارے ہاتھ میں پستول پکڑوا دوں تو اگلے دو دنوں میں تم اسپتال میں ہو گے!“ زیاد نے ہنستے ہوئے اس کے کان میں کہا تھا۔ وہ لب سختی سے بھینچے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے زیاد کی شکایت خیام سے کی تھی۔

اگلے لمحات میں وہ اپنے ٹوٹے پاؤں پر کھڑا تھا۔ درد تھا کہ بڑھتا جارہا تھا۔ جندل نے اس کے ہاتھ میں پستول دی تھی۔ خیام نے ٹارگٹ بتایا تھا۔ اس نے پستول پر گرفت مضبوط کی۔ دونوں بازو سیدھے کیے۔ مکمل دھیان ٹارگٹ کی طرف لگا کر نشانہ لینے کی کوشش کی۔ اگلے چند لمحات میں اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، وہ نشانہ نہیں لے پا رہا تھا۔ اس کے بازو شل پڑنے لگے تھے۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

"پستول پر گرفت زیادہ سخت مت کرو۔ تم نشانہ لینے سے پہلے ہی تھکنے لگو گے۔ میں ایک بار پھر ورزش پر زور دوں گا۔ اس کے بنا تمہارے ہاتھوں کی کپکپاہٹ نہیں جائے گی۔ ایک عام انسان کبھی بھی اپنے بازوؤں کو یوں سیدھا کرنے کے بعد انہیں کانپنے سے روک نہیں پاتا!" زیاد نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پستول لی اور اگلے ہی لمحے میں نشانہ لے کر ٹریگر دبدیا۔ گولی بالکل نشانے پر لگی۔ بدر نے ٹھنڈی سانس خارج کی تھی۔

"اے مردِ مجاہد! یاد رکھو کہ تمہارے پیچھے کوئی ملک نہیں ہے۔ تم نے جس راہ کا انتخاب کیا ہے اس میں تم تنہا ہوگے، تمہارے اپنے لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہونگے۔ کوئی طاقت تمہاری پشت پر نہیں سوائے اللہ کے!! پس جب تم ہار جاو، تھک جاؤ تو اسی کو یاد کرو۔ یاد رکھو تم اجنبی ہو۔ اور سلام ہو ایسے اجنبیوں پر جو اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے آئے ہیں!!" زیاد کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اسے لگا تھا کسی نے اس کے اندر جان ڈال دی ہو۔ اس بار پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے اسے اپنی ٹانگیں شل ہوتی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ خیام، جندل دونوں اپنی کلائیوں پر بندھی گھڑیوں کی سوئیاں دیکھ رہے تھے۔ اور یہاں منظر گڈ مڈ ہونے لگے تھے۔

وہ تین دوست تھے، اونچے نیچے پہاڑی سلسلے تھے۔ پوری آب و تاب سے چمکتا سورج تھا، پتھریلے راستے تھے اور وہ پوری جان لگا کر بھاگ رہے تھے۔ الزرقاوی کی کرخت آواز ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ نعرہ تکبیر کی آوازیں جوش بڑھا رہی تھیں۔ وہ تینوں بلندیوں کو طے کرتے گئے تھے۔

"تم قاسم ہو، تم خالد ہو! تم عبد اللہ بن مبارک جیسے شیر اور طارق کی طرح فولاد سے سخت ہو۔ تم میں یوسف جیسی نرمی ہے، تم عمر جیسے عادل ہو۔ اے میدانِ کارزار کے مجاہدین! تمہاری خون آلود تلواریں، تمہیں چہرے پر تھکن کے آثار، تمہاری بکھری ہوئی زرہ اور تمہارے جسموں پر آئے زخم خدا کو پسند ہیں۔ تم وہ ہو جو چُن لیے گئے ہیں۔ تمہیں دشمن سے دبنا نہیں لڑنا ہے۔ یاد رہے خدا کی راہ میں گرنے والا خون کا ایک قطرہ تمہیں ابدی حیات بخشتا ہے۔ تم سرخرو ہوگے، تمہارے حوصلے بلند ہونگے۔ خبر دار! کبھی پیٹھ دکھا کر مت بھاگنا۔ ہر تیر کو سینے پر روکنا، ہر زخم سینے پر کھانا۔ اسلام کا پرچم جھکنے مت دینا، نعرہ تکبیر کی آواز دبنے مت دینا!!" ایک صور تھا جو پھونکا گیا تھا۔ حزب اللہ کی صفِ اول کے مجاہدین نے وہ زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا تھا کہ پہاڑ گونج اٹھے تھے۔

"ھل من مبارز!!" ایک چنگھاڑ تھی۔

"لا غالب الا اللہ!" امید تھی، ایمان تھا۔

"نصر من اللہ و فتح قریب!" اور انہیں لگا تھا کہ پہاڑوں نے بھی سر تسلیم خم کیے ہوں۔ فتح کی خوشخبری تو صدیوں پہلے سنادی گئی تھی۔ اٹل فیصلہ تھا، انکار کی جرات نہیں تھی۔ وہ تینوں پہاڑ کی بلندی پر پہنچے تھے۔ تینوں نے ایک ساتھ اپنی رائفلیں بلند کی تھیں۔ اللہ اکبر کے نعرہ مستانہ نے پہاڑوں کو مسرور کیا تھا۔

بدر۔۔۔ میدان پار کر چکا تھا۔ ان دنوں نے وقت دیکھا، نو منٹ تیس سیکنڈ!

☆☆☆

وہ ایک ہاتھ میں نوڈلز سے بھری پلیٹ پکڑے دوسرے میں چائے کا کپ پکڑے کمرے کے دروازے کے پاس آئی۔ پاؤں سے دروازہ کھولا پھر کمرے میں آئی۔ دروازے کو پاؤں سے ہی بند کیا پھر میز کی طرف آئی۔ چائے کا کپ اور نوڈلز کی پلیٹ کو میز پر رکھا۔ وہ کرسی کھینچ کر کرسی پر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ نگاہ لیپ ٹاپ کی اسکرین سے ہو کر اپنے موبائل پر ٹکی۔ اسی لمحے میں وہ ٹھٹک کر رکی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں نگاہیں واپس لیپ ٹاپ کی تاریک اسکرین پر ٹکیں جہاں اس کے عقب میں دروازے پر کھڑے زیاد کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی۔ وہ وہیں کھڑا تھا، سینے پر ہاتھ باندھے مبہم سا مسکرا کر اسے دیکھتا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ اس کے الفاظ کی تلخی یاد آئی تو آنکھوں میں نمی چمکی۔ بھاری دل لیے اس نے قدم بڑھائے تھے۔ اس سے نظریں ملائے بنا وہ اس کے قریب آئی تھی۔ آرام سے اس کے گرد بازو حمائل کرتی اس کے سینے سے لگی تھی۔

"Don't you dare to do this again, or I will make you regret it!"

وہ آنکھیں موندے کہہ رہی تھی۔ زیاد نے دھیرے سے پہلو میں گرے بازو اٹھا کر اس کے گرد حصار قائم کیا تھا۔ اس نے ارادہ کیا تھا وہ اسے خفگی دکھائے گا، اس سے ناراض رہے گا۔ مگر وہ اس سے ناراض نہیں رک سکا۔ اپنی بیماری کا سن کر خود چل کر اس تک آیا اور پھر جب وہ اس کے آتے ہی یوں اس کے سینے سے لگی تھی تو اس کی رہی سہی ناراضگی بھی جاتی رہی تھی۔ وہ اس سے خفا نہیں رہ سکتا تھا۔۔ اب تو بالکل نہیں!

خاموشی میں دھڑکتے دلوں کا شور محسوس کر کے اس کی کچھ دھڑکنوں کے بعد ایک کے بجائے دو دھڑکنیں مِس ہوئی تھیں۔ اسے اپنے سینے پر نمی کا احساس ہوا تھا۔ وہ خاموش آنسو بہانے میں مصروف تھی۔ زیاد کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس کے گرد بندھے بازو ڈھیلے کرتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا تھا۔ مسکرا کر اسے دیکھا جو اپنے آنسو چھپانے کی کوشش میں تھی۔ اس لمحے میں وہ خود جس کرب سے گزرا تھا اس کا اندازہ بس اسے تھا۔

"If you youself come to me and comfort me like this, I will do this again and again and never regret it!"

سعاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی شرارت اور لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ اسے ٹھہرنے پر مجبور کر گئی تھی۔ زیاد نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ناک پر ٹکا چشمہ اتار کر میز پر رکھا تھا۔

"بہت برے ہو تم۔ ایسے کون کرتا ہے ہاں؟ تمہیں اندازہ ہے یہ سن کر میری کیا حالت ہوئی تھی جب تم نے مجھے رابطہ کرنے سے منع کیا تھا؟!" وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی شکوہ کر رہی تھی۔

"مجھے تجربہ ہے سینیورا! سانس رکتی محسوس ہوتی ہے۔" وہ اس کے نرم سے جواب پر اسے دیکھ کر رہ گئی۔ زیاد چند پل اسے دیکھتا رہا۔ نم آنکھیں، سرخ ہوتی ناک اور دہکتے رخسار۔۔ سیاہ لمبے بال جو آبشار کی طرح کمر پر گرے ہوئے تھے۔ اور اس کی پر شکوہ نگاہیں۔۔ وہ دھیرے سے ایک قدم آگے بڑھا۔ درمیان میں موجود فاصلہ ختم کیا اور دھیرے سے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔ وہ پر سکون ہوتی آنکھیں موند گئی تھی۔ وہ اسے تحفظ اور محبت کا احساس دلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"اظہارِ محبت کے لیے شکریہ سینیورا!" وہ زیرِ لب مسکرایا تھا۔ سعاد نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ "آپ نے جو ہماری لو اسٹوری میری بہن کو بتائی ہے وہ واقعتاً تاریخی لو اسٹوری ہے۔" وہ اس کی پیشانی کو انگوٹھے سے سہلاتا ہوا شرارت سے کہہ رہا تھا۔ سعاد اس کی بات کا مطلب سمجھ کر جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں نے ہرگز یہ نہیں کہا مجھے تم سے محبت ہے!" سر اکڑا کر کہا گیا۔

"اچھا۔۔ پھر تو تمہیں میری غیر موجودگی سے یا میری ناراضگی سے کوئی فرق نہیں پڑا ہو گا۔" وہ جیسے مایوس ہوا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”کیسی؟“ وہ انجان بنا۔

”مجھے تمہاری ناراضگی سے یا غیر موجودگی سے بہت فرق پڑتا ہے، کیونکہ تم میرے شوہر ہو!“ اس نے ناک سکیڑی تھی۔

”کیا فائدہ جب محبت ہی یک طرفہ ہو۔“ وہ گہری سانس لے کر افسوس سے کہہ رہا تھا۔

”زیاد۔۔میں رو دوں گی اب۔“ وہ دھمکی دے رہی تھی۔ زیاد فوراً الرٹ ہوا تھا۔

”اچھا سوری۔۔۔میری محبت اور تمہاری وفا سے ہم اپنا رشتہ ہمیشہ قائم رکھیں گے۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ سعاد نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے تک لایا۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔مجھے غصے میں بھی وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔“تم“ میرا مان ہو، اور میں تمہیں ٹوٹنے نہیں دوں گا۔“ وہ ندامت سے معافی مانگ رہا تھا۔

”آئندہ مت کرنا ایسے۔“ معصومیت سے کہا گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گیا۔

”مجھے آپ سے بہت محبت ہے سینیورا۔“ وہ اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا آگے زندگی کونسے موڑ پر لا کر کھڑا کرنے والی تھی۔ کتنے لمحات باقی تھے موت کے دروازے تک پہنچنے میں۔۔وہ یہ چند پل، چند لمحات اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ اسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی پہلی اور آخری محبت ثابت ہونے جا رہی تھی۔ اس پر یونہی نظریں ٹکائے اسے اپنے دل پر قطرہ قطرہ نمی گرتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ

احساس ہی کتنا جان لیوا تھا کہ۔۔۔ ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ توڑنے میں وہ پہل کرنے جا رہا تھا۔ یہ دغا اس کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔

"میں آپ کی محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں سینیور!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ زیاد نے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ سیاہ لمبے بالوں کو جوڑے میں باندھا گیا تھا جو اب ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ چہرہ ہشاش بشاش سا تھا۔ آنکھوں میں وہی انوکھی چمک تھی جو زیاد کو دیکھ کر آیا کرتی تھی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ اس کی چند دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن مِس ہوئی تھی۔

"رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔" اس نے دل سے دعا کی تھی۔ سعاد نے بے اختیار آمین کہا تھا۔ رخسار دہک اٹھے تھے۔ اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر اسے شرارت سوجھی تھی۔

"سینیورا تم نے غور کیا ہے اس دعا کے معنی پر؟" وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ پر جوش انداز میں اس کی طرف رخ کرتا ایک ٹانگ موڑ کر دوسری لٹکا کر بیٹھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔ اب غور کرو یہاں "ازواجنا" ہے۔ یعنی بیوی نہیں بیویاں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے تمہارا شوہر چلتے پھرتے یہ دعا پڑھتا ہے۔ اس کا صلہ اسے ملنا چاہیے ناں۔۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے تائیدی نگاہوں سے سعاد کو دیکھا جو اس کی بات سمجھ کر دانت پیس کر رہ گئی۔ اور وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بنا ایک بار پھر بول اٹھا تھا۔

"عربی میں ایک کہاوت ہے کہ جس شخص کی ایک بیوی ہوتی ہے وہ مسکین ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک قصہ ہے کہ۔۔ ایک عالمہ درس میں بڑے زور و شور سے شوہر کی دوسری شادیوں کی حمایت میں بول رہی تھیں۔ ایک خاتون درس کے بعد جھجھکتے ہوئے ان کے پاس آئی اور پوچھا، "آپ سچ میں شوہر کی دوسری شادی کے حق میں ہیں؟" عالمہ نے جب مثبت جواب دیا تو وہ خاتون بولیں، "شکر ہے ورنہ میں آپ سے بات کرتے ہوئے بہت ڈر رہی تھی۔ میں آپ کے شوہر کی دوسری بیوی ہوں۔" یہ سننا تھا اور وہ عالمہ غش کھا کر مسند سے گر گئیں۔" وہ بات مکمل کر کے ہنس دیا۔ سعاد کا چہرہ مارے خفت کے لال پڑ چکا تھا۔

"تم اپنی دوسری شادی کے متعلق بات کرنا چاہ رہے ہو زیاد؟" نہایت ضبط سے کام لیتے ہوئے مٹھیاں بھینچتے ہوئے چبا چبا کر پوچھا گیا۔ وہ معصومیت سے سر اثبات میں ہلا گیا۔

"ہاں۔۔ دیکھو دوسری بیوی آئے گی تو تمہارا خیال رکھے گی۔ تم اپنی ہیکنگ سنبھالنا وہ تمہارا گھر سنبھالے گی۔ مناسب؟" شرارت سے مسکراتے ہوئے تائیدی نگاہوں سے اسے دیکھا گیا۔

"میرے گھر کے ساتھ ساتھ میرا شوہر بھی سنبھالے گی۔" اس نے سختی سے صوفے کے بازو کو دبوچا تھا۔ زیاد اس کی حرکت اور چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ کر بمشکل اپنا قہقہہ روک پایا تھا۔

"ہاں ناں۔۔ وہ میرے سارے کام کر دیا کرے گی۔ میرے لیے کھانا بنائے گی، میرے گھر آنے پر ہشاش بشاش سی اپنی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہے گی، رات کو میرے آرام کا خصوصی خیال رکھے گی۔ تم تو مصروف ہوتی ہو ناں تو یہ سب کام وہ کر لے گی۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں خلا میں گھورتا اسے اپنی دوسری بیوی کا ایک ایک کام گنوا رہا تھا۔ سعاد اس کی حسرت بھری نظروں پر لب بھینچ گئی۔

"تم اس کے ساتھ خوش رہو گے ؟" وہ دانت کچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"بالکل۔ مشرقی لڑکا ہوں، بیوی اگر ایسی ہو گی تو کیوں نہیں خوش رہوں گا؟ بھلا بتاؤ، کیا تم کبھی میرے لیے تیار ہوئیں؟ کبھی شام کو میرے آنے کا انتظار کیا؟ کبھی مجھ سے بیویوں کی طرح نخرے اٹھوائے؟ کوئی فرمائش کی؟ نہیں ناں۔۔ تم میں مشرقی لڑکیوں والی کوئی عادت نہیں ہے۔ تم خاص ہو۔۔ وہ عام ہو گی مگر دل کو بھائے گی۔" وہ بند مٹھی گال پر جمائے، کہنی صوفے کے بازو پر ٹکائے لبوں پر ہلکی سی مسکان لیے کہہ رہا تھا، نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جو اب ٹماٹر کی طرح لال پڑ رہا تھا۔ اسے لگا تھا وہ بس ابھی رو دے گی۔ دوسری طرف سعاد کے ضبط کی انتہا ختم ہوئی تھی۔

"تو جاؤ پھر کر لو دوسری شادی۔ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بھاڑ میں چلے جانا۔ میں ایسی ہی ہوں!!" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی پھٹ پڑی تھی۔ زیاد نے انگشت شہادت اور انگوٹھے کو اپنے لبوں پر رکھ کر اپنی ہنسی روکی تھی۔

"دل سے اجازت دو ناں۔ ایسے غصے سے اجازت دو گی تو میرا دل نہیں مانے گا۔" وہ اسے مزید اکسا رہا تھا۔

"دل کی بات مت کرو تم! تم سب مرد ایک سے ہوتے ہو۔ پہلے محبت کے دعوے کرتے ہو مگر ایک شادی کو ایک ماہ مشکل سے دیتے ہو اور دوسری شادی کی رٹ لگا دیتے ہو۔" دو آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

"بہت تجربہ ہے سینیورا آپ کو۔۔ ہم مردوں کی نفسیات سے اتنی واقفیت رکھتی ہیں ماشاءاللہ"!

"تم اٹھو۔ جاؤ اپنی دوسری بیوی کے پاس۔" اس نے دونوں ہاتھوں کے کمزور سے مکے بنا کر اس کے سینے پر مارے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ تھام گیا تھا۔

"آرام سے، دوسری آئے گی تو اس کے پاس بھی چلا جاؤں گا۔ ابھی تو بس تم ہی ہو اور تمہیں ہی اسے لانے کے لیے منانا ہو گا۔" سعاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا پھر اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروانا چاہے۔ اس کی گرفت مضبوط تھی نتیجتاً زیاد کے ہاتھ اس کی کلائیوں تک آ گئے۔ وہ نم آنکھوں سے بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"خود ہی لے آؤ اپنی من پسند بیوی!" نم آواز اور ساتھ ہی ٹپ ٹپ۔۔

"وہ تو میں لے آیا ہوں۔ میں دوسری کی بات کر رہا ہوں سینیورا!" وہ اس کے آنسوؤں کا اثر لیے بنا شرارت سے کہہ رہا تھا۔

"میں تمہیں جان سے مار دوں گی زیاد!! تمہیں بھی اور تمہاری اس بیوی کو بھی!" وہ دبا دبا چلائی تھی۔ ہاں اب اس کی ضبط کی انتہا ختم ہوئی تھی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر بے اختیار گردن گرا کر ہنسا تھا۔ گردن گرا کر۔۔ کھل کر وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ وہ خفا نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جس کی ہنسی تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ یک ٹک اسے ہنستا دیکھتی کہ اسے زیاد کی ہنسی عزیز تھی مگر اس وقت وہ اسے ہنستا ہوا بے حد برا لگا تھا۔

"یار۔۔ پہلے یہ حق جما لیتیں۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہا تھا۔ اور اس کے گرتے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ پھر سے ہنس دیا تھا۔

"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔" آواز بے حد دھیمی تھی۔ وہ بالآخر اپنی ہنسی پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔ آرام سے اس کے ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کیے پھر مسکراتے ہوئے اس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کے پوروں پر چنا۔

"نہیں کر رہا میں دوسری شادی۔ مجھے سینیورا سعاد ہی اپنی بیوی کے روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ میری لاڈلی اور من پسند بیوی!" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ سعاد نے خفا نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم واقعی ایسی بیوی چاہتے ہو جو تمہارے لیے تیار ہو، بناؤ سنگھار کرے؟ جو تمہاری آمد کی منتظر رہے، فرمائشیں کرے اور نخرے اٹھائے بھی اور اٹھوائے بھی؟" معصومیت سے سوال کیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہرتی نمی خشک ہو چکی تھی۔ زیاد نے رک کر اسے دیکھا تھا۔

"مذاق کر رہا تھا یار۔ سنجیدہ مت لو اسے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا رخسار سہلا رہا تھا۔

"لیکن۔۔ شاید سب کو ایسی ہی بیویاں چاہیے ہوتی ہیں۔ عام سی۔۔ شاید اب میں عام اور خاص کا مطلب سمجھ گئی۔ مشرقی بیویاں ایک سی ہوتی ہیں، بس ان کا انداز انہیں خاص بناتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور خود بھی خوش رہتی ہیں۔ عام اور خاص سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ وہ یہ کوششیں ترک کر دیں۔" وہ اس کی بات کو سنجیدہ لے چکی تھی اور اب مردوں کی نفسیات کے مطابق یہ معمہ حل کرنے میں مصروف تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ادھر دیکھو۔" زیاد کے کہنے پر اس نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "تمہیں واقعی لگتا ہے میں تم سے خوش نہیں ہوں؟" نرمی سے سوال کیا گیا۔ وہ اس کی نگاہوں میں اپنے لیے محبت و احترام دیکھ کر فوراً سے نفی میں سر ہلا گئی۔ اس کا معمہ حل ہو گیا۔ وہ جیسی بھی تھی، اسے اچھی لگتی تھی۔

"تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو یار۔" وہ بازو صوفے کے سرے پر پھیلا کر اس پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اسے عربی میں کرنا ذرا۔" اسے شرارت سوجھی۔

"نورِ عین!" اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی اور سعاد کو سانس تک روکنا پڑا تھا۔ وہ الفاظ سے کھیل جاتا تھا۔۔ اس کے الفاظ اسے سحر میں جکڑ لیتے تھے۔ اس کے لیے زیاد تاشفین ساحر تھا۔۔ لفظوں کا جادوگر! وہ یونہی صوفے کے بازو پر سر ٹکائے اس کے چہرے کو نگاہوں کے حصار میں لیے آنکھیں موند گیا تھا۔ سعاد کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"سو رہے ہو؟" وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اس کے انداز پر حیران ہوئی۔ کھسک کر اس کے قریب ہوتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنے ہاتھ کی پشت رکھی۔ وہ ٹھیک تھا، اسے تسلی ہوئی تھی۔ جس لمحے میں وہ اپنا ہاتھ اس کی پشت سے ہٹا رہی تھی زیاد نے یونہی آنکھیں موندے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ سعاد نے دیکھا تھا۔۔ بند آنکھوں سے نمکین پانی کا ایک قطرہ ٹوٹ کر گال پر گرا اور پھر گال سے لڑھکتا ہوا اس کی داڑھی میں جذب ہو گیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت اس کے چہرے کو دیکھے گئی۔

"زیاد۔۔۔" اس کے لہجے میں فکر تھی، خوف تھا۔۔ زیاد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سو چکا تھا۔ جبکہ سعاد نے۔۔۔ بے خوابی کا شکار ہو کر اگلے کئی گھنٹے یونہی اس کے ساتھ بیٹھے گزار دیے تھے۔ وہ اس آنسو کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جو اس کی آنکھ سے گرا تھا۔ وہ آنسو معمولی نہیں تھا۔۔ یہ مضبوط، لمبا اونچا مرد بلاوجہ نہیں رویا تھا۔

ازا کرسی سے ٹیک لگائے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ پر نگاہیں ٹکائے بیٹھی تھی۔ یہ پینٹنگ اس نے آرٹ گیلری سے خریدی تھی۔ یہ معاویہ کی پینٹنگ تھی جس میں ایک بحری جہاز کو ڈوبتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ بحری جہاز کو ایک طرف پانی اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف تڑاتڑ برستا آسمان اس جہاز کو سمندر کی طرف دھکیل رہا تھا۔ باوجود ان دو عظیم طاقتوں کی کوشش کے وہ جہاز بپھری ہوئی لہروں کے اوپر اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھا۔ تیز چمکتی بجلی میں اس جہاز کو پوری کوشش کرتے دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ یک ٹک اس جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر کئی مناظر لہرائے تھے۔ ایک چھوٹی معصوم بچی سیاہ رنگ کی شال میں لپٹی جہاز کے عرشے پر کھڑی تھی۔ تیز چمکتی بجلی اور بادلوں کی گرج اسے سہمنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ خود میں سمٹی جہاز کے عرش پر کھڑی طوفانی لہروں سے لڑتے جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے برابر میں کوئی کھڑا تھا جس کا ہاتھ اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ کانوں میں بیپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما۔ آنکھیں سختی سے میچیں۔ بیپ کی آواز بڑھتی گئی۔ درد شدت اختیار کرتا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میز پر سر رکھتی وہ نڈھال ہو گئی تھی۔

”مجھے نہیں یاد۔۔ مجھے کچھ نہیں یاد۔۔“ وہ سسک اٹھی تھی۔ اسی اثناء میں خیام آفس میں داخل ہوا تھا۔ اسے میز پر سر رکھے سسکتے دیکھ کر وہ چونکا۔ ماتھے پر بل ڈالے وہ تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔

"ازا۔۔مادام کیا ہوا ہے؟ ٹھیک ہیں؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ ازا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر رخساروں پر گر گئے۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر سامنے رکھا پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ وہ چپ چاپ گلاس تھام گئی۔

"ٹھیک ہو؟ کیا ہوا ہے؟" وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ازا نے پانی پی کر گلاس میز پر رکھا پھر کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"میں تھک گئی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں یاد اور جب بھی کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں تو ناکام ٹھہرتی ہوں۔ میرے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں، کانوں میں عجیب سی آواز سنائی دیتی ہے۔۔ خیام مجھے عجیب سے قہقہے سنائی دیتے ہیں جیسے کوئی میری اس حالت سے محظوظ ہو رہا ہو، کوئی مجھ پر ہنس رہا ہو۔۔" وہ بے بسی سے کہتی چلی گئی۔

"ریلیکس ازا۔۔ پرسکون رہو۔ اپنے دماغ پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم چھوٹی تھیں، تمہیں کچھ یاد آئے گا بھی نہیں۔" خیام نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تو پھر وہ سب کیا ہے جو میں دیکھتی ہوں؟ میں ایک بحری جہاز کو دیکھتی ہوں جو ڈوب رہا ہے۔ تیز طوفانی بارش میں وہ جہاز بمشکل اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ میں کسی کی چیخیں سنتی ہوں۔ کوئی مجھے بلا رہا ہوتا ہے اور جانتے ہو وہ آواز بہت مانوس سی لگتی ہے۔۔ وہ مجھے ازابیلا نہیں ازا کہہ رہا تھا۔۔" وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا ازا۔۔ میرا یقین کرو۔" وہ اس کی بات پر چند پل اسے دیکھتی رہی پھر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ خیام نے ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی سے ٹیک لگا لی۔ ازا چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کی نظریں مسلسل

خود پر محسوس کر کے ہزار بار دیکھے آفس کا نئے سرے سے جائزہ لینے لگا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے بھورے رنگ کے بال سلیقے سے سیٹ کیے ہوئے تھے۔ کلائی پر گھڑی باندھ رکھی تھی۔ چہرہ نکھرا نکھرا سا تھا۔ اس کی داڑھی کا رنگ بھی ہلکا بھورا تھا۔ اس کی رنگت دودھیا تھی۔ اس کے نقوش۔۔ اس کے نقوش اسے مانوس مانوس سے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا پھر کچھ سرچ کر کے اسکرین پر نگاہیں ٹکائیں۔ خیام نے کم فہمی سے اسے دیکھا جو ایک نگاہ اس پر ڈال کر ایک نگاہ اسکرین پر ڈال رہی تھی۔

"خیام تم۔۔ تم اندلسی ہو؟" وہ چونک کر پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کے ایکدم درست اندازے پر گڑبڑا گیا۔

"نہیں تو۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"جھوٹ مت بولو تم اندلسی ہو! میں ہمیشہ سوچتی تھی تم ایک طرف عربی بھی لگتے ہو اور دوسری طرف مغربی بھی۔ دراصل تم اندلسی ہو کہ یہ اندلس تھا جہاں عربی اور مغربی حسن کا ملاپ ہوا تھا۔ خیام حنفی تم۔۔ اندلس کے باشندے ہو!" اس نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔ خیام نے غیر محسوس انداز میں پہلو بدلا تھا۔ جبکہ کافی کا کپ ہاتھ میں لیے آفس کا دروازہ کھولتا جندل اس کی بات پر ٹھٹھک کر رکا تھا۔ "تم۔۔ تم خیام۔۔ تم مور ہو۔" وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔ جندل چونک گیا تھا۔

"ہم مورسکوز تھے ازا! ہم وہ تھے جنہیں ان کے وطن سے نکال دیا گیا تھا۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔ لہجے میں دکھ امڈ آیا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔۔ میں نے اندلس کی تاریخ پڑھی ہے۔ اندلس کے مسلمانوں نے زیادہ تر مراکش کا رخ کیا تھا۔ تم بھی وہیں کے رہنے والے ہو؟" وہ بند مٹھی ٹھوڑی پر تکائے پوچھ رہی تھی۔ خیام نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ جندل کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ اسے الزرقاوی سر کی بات یاد آئی تھی۔

"مورسکوز کے لیے لفظ "مورسکو" گالی بن چکا تھا یا طعنہ۔ لیکن وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ ان کے آباؤاجداد نے غلامی کی جن زنجیروں کو زیور سمجھ کر پہنا تھا آج ان کی نسلوں کے لیے وہ گلے کا طوق بن چکی ہیں۔ کلیسا اندلس کو مسلمانوں کے وجود سے "پاک" کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھا۔ ظلم و بربریت کی حد یہ کہ صدیوں بعد آج سے صرف چند سال پہلے مراکش میں مورسکوز کے ایک گھر میں آگ لگا دی گئی۔ گھر کے مالک کی لاش مسخ کر دی گئی، اس کی بیوی کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کا ایک نومولود بچہ ان ظالموں کے قدموں تلے بری طرح سے کچلا گیا۔۔۔ اور ایک۔۔۔۔

ایک کو تمہیں ڈھونڈنا ہے۔۔"!

"تو خیام۔۔ کیا تمہارے پاس وہ چابی ہے؟" وہ اپنی نشست سے آگے کھسک کر تجسس سے پوچھ رہی تھی۔ خیام نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کون سی چابی؟ "ارے۔۔ اندلس کے باشندے جو مراکش میں ہجرت کر کے آئے تھے انہوں نے اپنے گھروں میں اپنے اندلس کے گھروں کی چابیاں لٹکائی ہوئی ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے اندلس واپس ضرور جائیں گے۔ کیا تمہارے پاس وہ چابی ہے؟" اس کی پرجوش نظریں مسلسل خیام کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ خیام نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ازا نے افسوس سے اسے دیکھا پھر پیچھے ہٹ گئی۔ آفس کے دروازے پر کھڑا جندل اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ

دھیرے سے اپنی جیکٹ کی جیب میں گیا تھا۔ جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں وہ سنہری چابی تھی جو اسے الزرقاوی سر نے دی تھی۔ یہ چابی۔۔ یہ خیام کی تھی۔

اس نے حیرت و بے یقینی سے بند دروازے کو دیکھا تھا جس کے پار ازاا اس سے اندلس کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ کہانی کے اس موڑ پر آ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جس بچے کی تلاش میں نکلا تھا۔۔ وہ بچہ خیام حنفی تھا! وہی تھا جس کا بھائی ان ظالموں کے قدموں تلے کچلا گیا تھا۔ وہی تھا جس کے گھر کو آگ میں جھونکا گیا تھا۔ وہی تھا عربی اور مغربی حسن کا پیکر جو اپنے وطن سے نکالا گیا تھا۔۔

جندل یوسف زئی کو۔۔ اپنے وطن سے دور۔۔ ایک اجنبی سرزمین پر۔۔ خیام حنفی کی تلاش میں بھیجا گیا تھا۔۔

وہ خیام حنفی۔۔ جو اس اجنبی سرزمین پر۔۔ زیاد تاشفین اور ازا تاشفین کو ڈھونڈنے آیا تھا۔۔

اور زیاد؟ اس کی تلاش ابھی جاری تھی۔۔ دوسرے حل ہو چکے تھے۔۔ تیسرا ابھی باقی تھا۔۔

☆☆☆

وہ آج اس کے مقابلے پر کھڑا تھا۔ ذراسی غلطی اور اس کے مقابل کھڑا اس کا استاد اسے کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ گہری سانس لیتا وہ میدان میں اترا تھا۔ پہلا وار زیاد نے کیا تھا۔ وہ ایک طرف کو جھک کر اس کا وار ضائع کر چکا تھا۔ زیاد

نے اسے مکا مارنا چاہا تھا جب وہ تیزی سے ایک طرف ہو کر اسی کے جبڑے پر مکا رسید کر گیا۔ اگلے ہی لمحے میں زیاد نے زوردار لات اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ وہ پلٹا اور اس بار اس کے نشانے پر بدر کی پسلیاں آئیں۔ درد کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ اگلے پندرہ منٹ تک اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا رہا۔ پسینے میں شرابور پھولتا تنفس، رخسار پر زخم، چھلے ہوئے ہاتھ۔۔۔ وہ اب ایک حد تک اس سب کا عادی ہو چکا تھا۔

جب اسے معاملات بگڑتے محسوس ہوئے تو اس نے جھک کر وہاں رکھا ڈنڈا اٹھا لیا تھا۔ وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا اور اسی بچاؤ کے چکر میں وہ پوری قوت سے یہ ڈنڈا زیاد کے پیٹ پر مار چکا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی جب زیاد نے کوئی اثر لیے بنا اس پر جوابی وار کیا تھا۔ زیاد کا وار ضائع کرتے ہوئے اس نے جب دوبارہ ڈنڈا اسے مارنا چاہا تو وہ تیزی سے اس کا بازو مروڑ کر ڈنڈا اس کے ہاتھ سے لے کر اسی کے پیٹ پر رسید کر چکا تھا۔ بدر پیٹ پر ہاتھ رکھتا درد سے کراہا تھا۔ اسی لمحے زیاد نے اسے کی ٹانگ پر ڈنڈا مار کر اسے گرایا تھا۔ اس کا سر خاک آلود زمین سے ٹکرایا تھا۔ خون کی ننھی بوندیں مٹی پر گری تھیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میدان کی طرف آتے خیام اور سعاد ٹھٹھک کر رکے تھے۔

زیاد نے ڈنڈا ایک طرف پھینک کر اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے زوردار ٹھوکر اسے ماری تھی۔ وہ لڑھک کر دور گرا تھا۔ پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ وہ درد سے بلبلایا تھا۔ سعاد کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔

بدر نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھ سے بہتا خون مٹی پر گرا۔ وہ سختی سے ہونٹ بھینچتا اٹھنے لگا تھا جب زیاد نے ایک بار پھر اسے ٹھوکر رسید کی۔ وہ واپس خاک آلود زمین سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ تنفس بری طرح بگڑا۔

”وہ تکلیف میں ہے۔“ سعاد نے شکوہ کناں نظروں سے خیام کو دیکھا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچ گیا تھا۔

”تمہیں تکلیف ہو رہی ہے اس کا اندازہ دشمن کو تب ہونے دو جب تم اس پر قابو پالو۔ تمہارا کراہنا، لڑکھڑانا تمہاری کمزوری ثابت کرتا ہے بدر!“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ بدر ہونٹ بھینچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پیٹ پر ہاتھ رکھے تھکی نظروں سے زیاد کو دیکھا تھا۔ گہری سانس لے کر وہ اس پر وار کرنے ہی لگا تھا کہ زیاد اسے موقع دیے بنا اسے واپس گرا چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں زوردار لات اس کے پیٹ پر رسید کی تھی۔ وہ دونوں ٹانگوں کو سمیٹ کر کروٹ پر لیٹا درد سے چیخ ہی تو اٹھا تھا۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ فاصلے پر کھڑا خیام یہ منظر دیکھ کر لب دانتوں میں دبا گیا۔

”اٹھو بدر!“ سختی سے کہا گیا۔ بدر نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔ آنکھوں سے دو آنسو گرے۔ زیاد ان آنسوؤں کو دیکھ کر ایک اور ٹھوکر اسے رسید کر چکا تھا۔ وہ درد سے بلبلایا تھا۔ اپنی چیخوں کو چاہ کر بھی نہیں روک پایا تھا۔ اسے اپنی پسلیاں ٹوٹتی محسوس ہوئی تھیں۔ پیٹ پر ہاتھ رکھے وہ آنکھیں میچتا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ زیاد نے اس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ سعاد تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ زیاد نے ایک اور ٹھوکر اسے ماری تھی۔ بدر کو اپنی رگیں پھٹتی محسوس ہوئی تھیں۔ گھٹنوں کو پیٹ سے ملائے وہ درد سے بری طرح کراہا تھا۔ زیاد مزید آگے بڑھا تھا۔ اگلے ہی لمحے سعاد تیزی سے ان دونوں کے درمیان آئی تھی۔

”وہ مر جائے گا۔“ اس کی آواز کانپ گئی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ بنا اس کی بات پر توجہ دیے کہنی سے پکڑ کر اسے راستے سے ہٹا دیا۔ ”خدارا رک جاؤ زیاد! حالت دیکھو اس کی وہ مر رہا ہے۔“ وہ چلائی تھی۔ اس کی بے رحم ٹھوکر نے بدر کو بلکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پیٹ پر ہاتھ رکھے سختی سے آنکھیں میچتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ سعاد نے سانس روکے اسے دیکھا۔ زیاد وہیں کھڑا رہا۔ بدر ہمت جمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ زخمی نظروں سے سعاد کو دیکھا پھر زیاد کو۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے آگے آیا۔ زیاد کو موقع دیے بنا وہ ایک مکا اس کے جبڑے پر رسید کر چکا

تھا۔ اس کا مکا۔۔زیاد کو اپنا جبڑا ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے پے در پے کئی مکے زیاد کے جبڑے پر رسید کیے تھے۔ اس کے منہ سے نکلتا خون کچھ خاک پر گرا اور کچھ کے چھینٹے برابر میں کھڑی سعاد کے کوٹ پر گرے۔ بدر نے ہاتھ روک لیے۔

"آج کے لیے اتنا کافی ہے استاد جی۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ زیاد نے سر کو جنبش دی تھی۔ وہ ایک اچٹتی نگاہ سعاد پر ڈال کر پلٹا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ خیام کے پاس آیا۔

"ٹھیک ہو؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

"درد سے مر رہا ہوں میں۔" وہ تلملایا تھا۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر فاصلے پر کھڑے زیاد کو جو منہ میں جمع ہوتا خون فرش پر تھوک رہا تھا۔

"تم سے زیادہ تکلیف میں وہ ہے مصعب!" خیام کی بات پر بدر نے چونک کر زیاد کو دیکھا۔

"کیا میرے مکے اتنے زوردار ہیں؟" وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"بات تمہارے مکوں کی نہیں ہے نامعقول انسان! بات یہ ہے کہ وہ بیمار ہے۔ غور سے دیکھو زیاد کو۔ وہ تم سے زیادہ پسینے میں شرابور ہے۔ اس کا تنفس ابھی تک بگڑا ہوا ہے۔ وہ کانپ رہا ہے مصعب! اس کا جسم درد سے ٹوٹ رہا ہے۔" خیام کے انکشاف پر بدر نے آنکھیں چھوٹی کر کے غور سے زیاد کو دیکھا۔ اس کے منہ سے خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ سعاد مسلسل خون نکلنے پر پریشان ہوئی تھی۔ اس کی حالت وہی تھی جو خیام نے بیان کی تھی۔

"بات کریں پھر الزرقاوی سر سے! بھیجیں انہیں علاج کے لیے۔ اس طرح تو یہ مر جائیں گے۔" بدر نے جھرجھری لی تھی۔ خیام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس چپ چاپ زیاد کو دیکھتا رہا۔ نڈھال سا چہرہ۔۔۔ بکھرا سا وجود۔۔ وہ دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔۔ خیام حنفی، آہستہ آہستہ اپنے دوست کو کھو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ نڈھال سا سر گرائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ پورے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی ایک دو ہڈیاں بھی ٹوٹ چکی ہوں تو اسے ہرگز حیرت نہیں ہو گی۔ یہ درد ایسا ہی تھا جیسے باقاعدہ ہڈیاں توڑی گئی ہوں۔ پھٹے ہوئے ہونٹ، چھلے ہوئے گال، سوجی آنکھ۔ بکھرا بکھرا سا حلیہ۔۔ وہ چند دنوں میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ شرٹ پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ ٹانگ بھی زخمی تھی، اپنے قدموں پر کھڑا ہونا اس کے لیے محال تھا۔

اسے چند پل ہی گزرے کہ ابدال کمرے میں آیا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے کرسی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا۔ تمسخرانہ نگاہیں اس پر ٹکائیں۔ "تو کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟" اس کے سوال پر ضرار نے ٹھنڈی سانس لی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا مگر میرا ایک سوال ہے۔" اس کی نگاہیں بھی کسی شیر کی نگاہیں تھیں۔ لہجہ ویسا ہی مضبوط اور سخت تھا۔ ابدال نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا پھر دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکا۔

"تمہیں زندگی مل جائے گی، کیا یہی تمہارے لیے کافی نہیں؟!" طنزیہ انداز میں کہتا وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔ ضرار نے دانت کچکچائے تھے۔ غصے بھری نگاہ اس پر ڈالی پھر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنے ہتھکڑی میں بندھے ہاتھ

اس کی گردن سے گزار کر ہتھکڑی کی چھوٹی سی زنجیر سے اس کی گردن کے گرد گرفت سخت کی۔ ابدال جھٹکے سے میز پر گرا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپا تھا۔

”تمہاری زندگی یا میرا سوال؟“ مسکراتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی گئی۔ اس کی گردن کے گرد گرفت سخت ہوتی گئی۔ خون کی ننھی بوندھیں اس کی گردن پر چمکیں۔

”کیسا۔۔۔ سوال؟“ اس کے منہ سے دبی دبی آواز نکلی تھی۔

”دلال کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔۔ دلال کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ اس نے شدید تکلیف میں بمشکل اپنی بات مکمل کی۔ ضرار نے جھٹکے سے اس کی گردن کو چھوڑا۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھتا تیزی سے پیچھے ہٹا۔ خونخوار نظروں سے اسے دیکھا جو اپنے لبوں کے کناروں سے نکلتا خون صاف کر رہا تھا۔ اس کی تمسخرانہ نگاہوں نے ابدال کو دانت کچکچانے پر مجبور کیا تھا۔

”کب چلنا ہے؟“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ابدال نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

اگلے لمحات میں چار سے پانچ جیپیں جنگل کے اونچے نیچے راستوں سے گزرتیں اس عمارت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ گھنے اونچے درختوں میں گھرا یہ راستہ بہت پراسرار سا تھا۔ سیاہ لباسوں میں ملبوس یہ تیس سے بتیس آدمی اپنی پستولیں سنبھالے ابدال کی سربراہی میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ تیسری جیپ میں ان سات آدمیوں کے درمیان پھنس کر بیٹھا ضرار بری طرح تپا ہوا تھا۔ وہ دو موٹے آدمی اسے اپنے بیچ میں بٹھائے اس کی

تقریباً چٹنی بنانے پر تلے تھے۔ گاڑیاں پوری رفتار سے درختوں کو پار کرتیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان درختوں میں چھپے آلات کی مدد سے سعاد اور وہ سفید رومال والا لڑکا اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے بغور ان جیپوں کو دیکھ رہے تھے جو بس عمارت کے قریب تھیں۔

"تیار ہو سعاد؟" اس کی بھاری آواز کمرے میں گونجی تھی۔ وہ لڑکا مکمل اندھیر کمرے میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر سفید رومال اور پی کیپ رکھی ہوئی تھی۔ پیچھے سے بس سیاہ جیکٹ اور سر کے سیاہ بال نظر آرہے تھے۔ اسکرین پر نگاہیں ٹکائے اس نے اپنا سفید رومال اٹھایا تھا۔

"ہاں، وہ بس قریب ہیں۔ تم بھی نکلنے کی کرو۔" سعاد نے کی بورڈ پر جھکتے ہوئے کہا۔ اس لڑکے نے رومال باندھ کر سر کو جنبش دی پھر اپنی پی کیپ سر پر ٹکا کر باہر نکل گیا۔

وہ عمارت سے ذرا فاصلے پر رکے تھے۔ اسلحے سے لیس تیس بتیس آدمیوں کے ہمراہ ضرار بندھے ہوئے ہاتھوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ طائرانہ نگاہیں اردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ عمارت کے قریب پہنچ کر ابدال نے اسے پاسورڈ لگانے کا اشارہ کیا۔ وہ پلٹا۔ معصومیت سے ابدال کو دیکھا پھر اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ ابدال نے دانت کچکچاتے ہوئے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ جیب سے چابی نکال کر آگے آیا۔ وہ ابھی ضرار کے بندھے ہاتھوں پر جھکا ہی تھا کہ ایک خنجر اس کی طرف آیا تھا اور اس کے سینے کے آر پار ہوا تھا۔ سب ہوشیار ہو کر پیچھے دیکھنے لگے جہاں سے خنجر آیا تھا۔ اسی اثناء میں ضرار نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دائیں طرف دوڑ لگا دی تھی۔

"پکڑو اسے، وہ بھاگنے نہ پائے!" ابدال چلایا تھا۔ سعاد نے کی بورڈ کی کِی دبائی تھی۔ آن کی آن میں عمارت کے چاروں اطراف میں بڑی بڑی سلاخیں نمودار ہوئی تھیں۔ وہ تیس بتیس آدمی وہیں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

ضرار پوری رفتار سے بھاگتا ہوا درختوں کے پاس آیا تھا۔ دو آدمی اس کے تعاقب میں تھے۔ پسینے سے شرابور وہ درخت کے پاس رکا۔ وہ دونوں آدمی بگڑتے تنفس کے باعث وہیں رک گئے۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر فاصلے پر کھڑے ضرار کو دیکھا۔ اسی لمحے میں بیک وقت دو خنجر آئے اور ان کے سینوں کے آر پار ہو گئے۔ خون کی ایک لکیر ان کی سیاہ جیکٹوں پر نمودار ہوئی اور اگلے پل میں وہ دونوں وہیں ڈھیر ہو چکے تھے۔ ضرار نے سر اٹھا کر درخت کو دیکھا تھا۔ سفید رومال والا لڑکا ایک ٹہنی پر چڑھ کر بیٹھا تھا۔ ضرار کے دیکھنے پر اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا۔

ضرار نے بغور اس کے ہاتھ میں موجود خنجر کو دیکھا پھر ان دو افراد کو جسے اس نے بیک وقت مارا تھا۔۔ ایک بات تو طے تھی کہ۔۔ یہ سفید رومال والا لڑکا خنجر چلانے میں ماہر تھا۔۔ اور صرف یہی نہیں، اس کا نشانہ بھی پکا تھا!

☆☆☆

اندھیر تاریک کوٹھڑی میں کوئی زنجیر گرنے کی آواز سنائی دی۔ چند پل گزرے پھر اس تاریک کوٹھڑی میں ہلکی سی روشنی ہوئی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی دھیرے دھیرے زینے اتر رہا تھا۔ زینے اتر کر وہ اس دروازے کی طرف آیا۔ چابیوں کی آواز سنائی دی۔ تالا کھولا گیا اور پھر دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا۔ اس کے بھاری بوٹوں میں مقید پاؤں ٹھنڈے یخ فرش پر پڑے۔ وہ اندر آیا۔ آرام سے دائیں طرف دیوار کے پاس کھڑے ہو کر روشن دان کھولا۔ ہلکی سی روشنی اندر آئی۔ کمرے کے بالکل کونے میں دبک کر بیٹھے بوڑھے شخص کی آنکھوں میں یہ تیز روشنی بری طرح چبھی۔ ابراہم وارلڈ دست رفتار سے قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا۔ پنجوں کے بل اس کے سامنے فرش پر بیٹھا۔ جھک کر اس کے جھریوں زدہ چہرے کو دیکھا۔

"کیسے ہو؟" اس کی بھاری آواز اس کمرے میں کئی پل گونجتی رہی۔

”میری بیٹی۔۔ کہاں ہے؟“ اسے بولنے میں تکلیف کا سامنا تھا۔

”میں نے کمپنی اس کے نام کر دی ہے۔ وہ بہت خوش ہے، بالکل کسی معصوم بچی کی طرح!“ وہ ہلکا سا ہنسا۔ اس کی ہنسی سن کر وہ بوڑھا کمزور وجود تڑپ ہی تو اٹھا تھا۔

”کیا کرنے والے ہو تم میری بیٹی کے ساتھ؟“ وہ شدید تکلیف کے باوجود حلق کے بل چلایا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔۔ جب تک وہ زندہ ہے میں محفوظ ہوں۔“ اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کمزور لاغر وجود نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں تمہارا یہ چہرہ نوچنا چاہتا ہوں۔۔ میں۔۔ میں دنیا کو دکھاؤں گا۔۔ کون ہو تم؟!!“ اس کی بات پر ابراہم سر جھٹک کر ہنس دیا۔

”تم اپنا چہرہ کیسے نوچو گے؟“ اس کا سوال عجیب سا تھا اور انداز بھی۔ اس بوڑھے شخص نے پہلو بدلا تھا۔

”میں اس پر تیزاب پھینک دوں گا“!

”بہت اچھے۔۔ اپنے چہرے کے ساتھ یہ ظلم بھی کر لینا خوشی سے۔“ وہ مسکرایا۔ ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میری بات۔۔ یاد رکھنا دلال۔۔ خدا کسی کو اس کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا! نہ ہی وہ کسی ظالم کو ہمیشہ کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔۔ تم منہ کے بل گرو گے دلال!“ اس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ابراہم نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر لبوں کو گول کر کے سیٹی بجاتا باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی سیٹی دیواروں سے ٹکراتی خالی کمروں میں گونجنے لگی۔ کسی کے زینے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ پھر چند لمحے بعد زنجیر

کے اوپر اٹھنے کی اور اس کے بعد خاموشی چھاگئی۔ کونے میں دبک کر بیٹھا وہ بوڑھا شخص اپنا رخ بدل رہا تھا۔ یہ روشنی بری طرح اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ دلال اسے کئی ہفتے اندھیرے میں رکھنے کے بعد روشنی میں لے آتا تھا، تب جب وہ بالکل اندھا ہونے کے قریب ہوتا تھا۔۔ جب اسے روشنی تکلیف دیتی تھی۔

☆☆☆

”دعائیں دو مجھے۔ڈی ڈبلیو کا ہیڈ کوارٹر مل چکا ہے۔“ ازا کی پرجوش آواز اندھیر کمرے میں گونجی۔ کافی کا کپ لبوں سے لگائے میز سے ٹیک لگا کر کھڑا وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ نگاہیں روشن اسکرینوں پر ٹکی تھیں۔

”مجھے تمہاری پہنچ کا اندازہ نہ ہوتا تو کبھی تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش نہ کرتا۔“ اس کی آواز میں نرمی تھی۔

”تعریف کے لیے شکریہ۔مائک کا شکریہ ادا کر دینا۔۔ اس کام میں اس نے میری بہت مدد کی ہے۔“

”میں ضرور یہ کرتا ازا اگر مجھے اندازہ نہ ہوتا کہ ہاتھوں کی زبان کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ شکریے کے طور پر میں اسے اک دو مکے رسید کروں تو بالکل، مجھے کوئی اعتراض نہیں!“ وہ ہلکا سا ہنسا تھا۔ ازا کو حیرت ہوئی تھی، وہ آج اتنے خوشگوار موڈ میں کیوں تھا بھلا؟

”خیر۔۔اب کیا کرنے جا رہے ہو؟“ اس نے گہری سانس لے کر پوچھا تھا۔

”ہیڈ کوارٹر کو اڑائیں گے۔مجھے بچپن سے اڑتی ہوئی چیزیں پسند ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”تم اڑاؤ گے، بذات خود؟“

"میرے اپنے بھی کچھ رابطے ہیں ازا! میں اسے دیکھ لوں گا۔ تم اب اگلے کام پر دھیان دو۔" اس نے کافی کا کپ میز پر رکھا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کونسا کام؟"

"دلال نے ویڈیوز کہاں رکھی ہیں؟ سوچو اور ڈھونڈو!" سنجیدگی سے حکم صادر کر کے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ کان سے ایئر پوڈز نکال کر میز پر رکھے پھر کی بورڈ پر جھک گیا۔ کمرے میں ایکدم خاموشی چھا گئی۔ کچھ پل خاموشی کی جذر ہوئے پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگالی۔ لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر اس کا لکھا پیغام جگمگا رہا تھا۔

"آپ کا منتظر ہوں، کعب الزر قاوی"!

☆☆☆

وہ بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا گہری نیند میں تھا جب اسے لوہے کی کوئی ٹھنڈی یخ راڈ اپنے تلوؤں پر محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنے پاؤں کمبل میں کرنا چاہے مگر کمبل بے ترتیبی سے پہننے کی وجہ سے اس کے پاؤں کمبل میں نہ آسکے۔ اسی لمحے میں اسے وہ راڈ دوبارہ اپنے تلوؤں پر محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا کوئی اس کے پاؤں کو دروازہ سمجھ کر دستک دے رہا تھا۔ وہ نیند میں ہی تپ گیا تھا۔

"کون خبیث ہے یہ جس سے میری نیند بھی برداشت نہیں ہوتی؟" آنکھیں بند کیے ہی وہ چلایا تھا۔ جواباً ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔ وہ پرسکون سا کروٹ بدل کر تکیے کو اپنے بازوؤں میں دبوچ گیا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب وہ

لوہے کی ٹھنڈی یخ راڈ اس کے پیٹ پر پڑی تھی۔ وہ چیخ مار تا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے دیکھا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کے سامنے۔۔ کعب الزر قاوی عرف جیکب صاحب کھڑے تھے۔ سفید قمیض شلوار میں، شانوں پر خاکی شال ڈالے بائیں ہاتھ میں اپنی محبوب اسٹک لیے۔۔ اپنی رعب دار شخصیت سے دھاک بٹھاتے۔۔ کعب الزر قاوی!

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم میری اسٹک کو بھول جاؤ گے!" وہ افسوس کر رہے تھے۔ لہجے میں گہرا طنز تھا۔ بدر نے خوفزدہ نظروں سے اسٹک کو دیکھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا؟ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس اسٹک کو ان کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اسی اسٹک سے پٹا تھا، ہزاروں بار مار کھائی تھی۔ دس سال گزر چکے تھے مگر ان کی اسٹک آج بھی ایسی ہی تھی۔۔ سیاہ رنگ کی۔۔ ایکدم چمکتی چمچماتی!

"آپ۔۔ آپ کب آئے؟" وہ ہوش میں آتا کمبل ایک طرف پھینک کر بیڈ سے اترا۔ کعب نے دائیں ابرو اٹھائے سر تا پیر اسے دیکھا۔ ڈھیلے سے سرمئی رنگ کے ٹراوزر میں، سفید شرٹ پہنے وہ رف سے حلیے میں ان کے سامنے دونوں ہاتھ باندھے خود میں سمٹ کر کھڑا تھا۔ سیاہ بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بلا کی شرافت تھی۔

"ابھی آیا ہوں۔ اور دیکھ رہا ہوں خاصا قد کاٹھ نکال لیا ہے تم نے۔ صحت مند بھی لگ رہے ہو اور غالباً کسی بہترین استاد کی شاگردی میں ہو۔" ان کے لہجے میں ستائش تھی۔ اپنی عقاب سی نگاہوں میں وہ ایک پل میں اس کے زخموں کا بھی جائزہ لے چکے تھے۔ بدر کا سر "شرافت" سے مزید جھک گیا تھا۔

"آپ نے قد کاٹھ نکالنے کے لیے ہی تو بھیجا تھا۔" وہ کہنا چاہتا تھا مگر حلق سے آواز تک نہیں نکلی۔ کعب نے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی جو شباب کی منازل کو چھو رہا تھا۔ چہرے پر داڑھی سجی تھی۔ وہ جندل جیسا نہیں تھا کیونکہ جندل عالیان پر گیا تھا۔ وہ دحیہ جیسا تھا، سعاد میں ملتا تھا۔

”اپنا حلیہ درست کر لو۔ میں ہر گز بھی اپنی پوتی کو تم سے اس حلیے میں ملنے کی اجازت نہیں دوں گا!“ سنجیدگی سے حکم صادر کر کے وہ پلٹ گئے۔ جبکہ بدر کا ذہن لفظ ”اپنی پوتی“ پر اٹک گیا تھا۔ کیا افق بھی آئی تھی؟!

اگلے لمحات میں وہ تیزی سے اپنے کپڑے اٹھاتا واش روم میں گھس گیا تھا۔ پانچ منٹ میں وہ نہا کر نکلا تھا۔ سفید قمیض شلوار میں ملبوس وہ بالوں کو تولیے سے رگڑتا باہر آیا۔ بے ڈھب طریقے سے تولیا صوفے پر پھینکا پھر خود سنگھار میز کے قد آور شیشے کے سامنے کھڑا ہوا۔ بھرپور نگاہ خود پر ڈالی۔ وہ ایک عرصے بعد شلوار قمیض پہن رہا تھا، اسے اپنا آپ اچھا لگا تھا۔ جلدی سے بال سیٹ کرنے کے بعد اس نے کلائی پر باندھنے کے لیے گھڑی اٹھائی جو وہ خیام کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا۔ گھڑی کلائی پر باندھ کر اس نے پرفیوم اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے سانس روک لیا۔ ڈرتے ڈرتے شیشے میں دیکھا جہاں خیام کا عکس اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

”تم کہیں جا رہے ہو؟“ وہ سر تا پیر اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”افق آئی ہے بھائی!!“ وہ خوشی سے اچھلا تھا۔ خیام نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا ہو۔

”خواب دیکھا ہے کیا تم نے؟“ وہ دائیں ابرو اٹھائے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔ دادا بھی آئے ہیں قسم لے لیں۔“ وہ جلدی سے خود پر پرفیوم چھڑک کر اس کی طرف آیا۔ خیام نے پلک جھپک کر اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے میں وہ دونوں تیزی سے باہر کی طرف بھاگے تھے۔

☆☆☆

”تو مطلب آپ کہہ رہے ہیں کہ بدر ویسا نہیں رہا جیسا وہ پہلے تھا؟“ افق نے فکر مندی سے اسے دیکھا تھا۔ جندل نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر نفی میں ہلایا تھا۔

”نہیں۔۔ اسے تو تم یاد بھی نہیں ہو۔ ایک نمبر کا خبیث اور بے غیرت انسان بن چکا ہے۔ تم اسے دیکھو تو پہچاننے سے انکار کر دو۔“ وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ افق کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔

”ہے کہاں وہ؟“

”یہیں کہیں منہ مار رہا ہو گا۔“ جندل نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔ افق نے بے اختیار گہری سانس لے کر اپنے تیزی سے دھڑکتے دل کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ وہ الزر قاوی کے ساتھ بدر سے ملنے کے لیے جا رہی تھی جب جندل نے اسے پکڑ لیا تھا۔ بقول اس کے وہ یہاں نہیں تھا اور اس کے آنے تک جندل اسے اچھی کمپنی دے سکتا تھا۔ جبکہ ان پندرہ منٹوں میں اس نے جو کچھ اسے بدر کے متعلق بتایا تھا وہ سن کر اس کے رخسار دہکنے لگے تھے اور کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہو اتھا۔ وہ اسی اضطراب کی کیفیت میں جندل کے ہمراہ کھڑی تھی جب اسے راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے پلٹی تھی۔ اس نے دیکھا تھا وہ دو لوگ تھے جو دور سے بھاگتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔ اس نے انہیں پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ آگے دوڑنے والا لڑکا اس کے لیے قطعاً اجنبی تھا اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر دوڑتے لڑکے کو وہ پہلی نظر میں پہچان گئی تھی۔ خیام چند قدموں کے فاصلے پر رک چکا تھا۔ بدر اسی رفتار سے بھاگتا اس کے قریب آیا تھا۔ مسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”کیسی ہو؟“ اس نے پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا تھا۔

"السلام علیکم!" افق نے سخت نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" اس نے سر کو خم دیتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر سلام کا جواب دیا۔ جندل نے ان دونوں کو دیکھ کر بھرپور جمائی لی تھی۔ وہ ملاقات کے ان ابتدائی مراحل سے بےزار ہونے لگا تھا۔ افق کو اب اس کا سر پھاڑنا چاہیے، یقیناً اسے یہی کرنا چاہیے۔

"تم بہت بڑی ہوگئی ہو۔" اسے سمجھ نہیں آیا تھا جندل اور خیام کی موجودگی میں وہ اور کیا کہے۔ اس کے لاکھ آنکھوں سے اشاروں کے باوجود وہ دونوں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

"تم بھی۔" افق نے تذبذب سے کہا۔ جندل نے اپنا گلا کھنکھارا۔ بدر نے سخت نگاہوں سے جندل کو گھورا پھر پلٹ کر خیام کو دیکھا جو ہنوز افق کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے کھڑا تھا۔ اس نے گہری سانس لی پھر ان دونوں کے درمیان سے ہٹ گیا۔

"افق یہ خیام سر ہیں۔۔ میرے باس!" اس نے مسکراتے ہوئے اس کا تعارف کروایا۔ افق نے سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ بدر نے گڑبڑا کر اسے دیکھا پھر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر اس کے سر کو جھٹکا دیا تھا۔ "سلام کرو سلام!!" اس نے دبی دبی آواز میں کہا تھا۔ جندل کی بےاختیار ہنسی چھوٹی تھی۔ افق نے دبی دبی آواز میں اسے سلام کیا۔ خیام نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا۔

"میرا تعارف بھی کرواؤ بدر!" جندل نے پیچھے رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

"یہ جندل ہے۔۔ لالا پٹھان!" اس نے دانت کچکچائے۔ افق نے مسکراتے ہوئے سر کو خم دیا۔

"اچھا لگا آپ سے مل کر۔" وہ جبراً مسکرائی۔

"ہمیں بھی۔" جندل نے خوشدلی سے کہا۔

"اب آپ کی اجازت ہو تو میں افق کو لے جاؤں؟ آپ دادا سے مل لیں۔۔" بدر نے اجازت چاہی۔

"ہاں جاؤ جاؤ شاباش۔۔" جندل نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ بدر اسے گھوری سے نواز کر افق کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ جندل اور خیام دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے انہیں جاتا دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ دونوں راہداری کا موڑ مڑ گئے۔ ان کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی دونوں نے گہری سانس لے کر دیوار پر سر ٹکایا تھا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا۔۔۔ افق اتنی بڑی ہو گئی ہے۔" خیام نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"میں تمہیں سمجھ سکتا ہوں خیام! مگر تمہارے اس طرح مسلسل گھورنے پر وہ پریشان ہو گئی ہو گی۔" جندل نے اس کی توجہ اس کے گذشتہ عمل پر دلانا چاہی۔

"دس سال تک اسے چھوٹی بہن کی طرح چاہا ہے، اسے اپنی گود میں پالا ہے۔ بہت یاد کیا ہے اسے۔۔ یہ بہنیں اتنی عزیز کیوں ہو جاتی ہیں جندل کہ اپنے ہی وجود کا حصہ لگنے لگیں؟" وہ گہری نظروں سے فرش کو تکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں۔ میری ایک ہی بہن ہے اور مجھ سے بڑی ہے۔ میں ان کے ہاتھوں رج کے ذلیل ہوا ہوں، ان کے تھپڑ کھائے ہیں، ان کی ڈانٹ سنی ہے۔۔ اسی لیے مجھے ہرگز اندازہ نہیں ہے بہن بھائی کی محبت کیسی ہوتی ہے کیونکہ بقول آپی کے وہ میرے ساتھ دوست کا سا رویہ رکھتی ہیں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا تھا۔

"بہت زیادہ ناشکرے ہو تم"!

”ایسے ہی اچھا ہوں۔ مجھے بالکل تجربہ نہیں کرنا کہ چھوٹی بہنوں کا ساتھ کیسا ہوتا ہے؟“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکا دیے۔ خیام اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ رشتوں اور محبت کے معاملے میں اتنا لاپروا کیوں تھا؟ یا وہ ظاہر ایسے کرتا تھا؟ جو بھی تھا۔۔ اسے بس افق سے ملنا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ۔۔ اس نے اپنی چھپکلی کو بہت یاد کیا۔ بہت زیادہ!

☆☆☆

وہ چاروں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے الزر قاوی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ چاروں نے قطار میں کھڑے ہو کر با آواز بلند انہیں سلام کیا تھا۔ سلام کا جواب دے کر الزر قاوی نے گہری نگاہ ان چاروں پر ڈالی تھی۔ وہ ایک عرصے بعد ان چاروں کو دیکھ رہے تھے۔ آخری بار ان کی ملاقات پاکستان میں ہوئی تھی جب یہاں کا مشن ان کے حوالے کیا تھا۔

”کیسے ہو جوانوں؟“ دونوں ہاتھ کمر پر باندھے سنجیدگی سے مگر نرمی سے پوچھا گیا۔

”الحمدللہ سر۔“ بیک آواز میں جواب دیا گیا۔

”ایمان کی کیسی حالت ہے؟“ یہ سوال انہیں کانپنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ سر جھک جاتے تھے۔ دل یوں دھڑکتے تھے گویا آخری بار دھڑک رہے ہوں۔ آنکھوں میں نمی جمع ہوتی تھی تو ہر منظر دھندلا جاتا تھا۔ کوئی جواب نہ دے پایا تو خیام نے سر اٹھایا۔

”حضرت سلیمان ثوری کا قول ہے: اگر ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھ لیں تو کہیں گے کہ یہ تو مجنون ہیں، عاشق ہیں اور اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہمیں دیکھ لیں تو کہیں گے کہ یہ منافق ہیں کافر ہیں۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ الزرقاوی نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر کو جنبش دی۔

”نماز کی پابندی کی؟ رب کو یاد رکھا اور قرآن سے رائے لی؟“ اگلا امتحان ان کا منتظر تھا۔

”کوئی نماز نہیں چھوڑی۔ رب کی تابعداری کی اور قرآن کا فیصلہ سر آنکھوں پر رکھا۔“ جواب زیاد نے دیا تھا۔

”دل کے معاملے میں خیانت تو نہیں کی؟“

”دل اللہ کا گھر ہے۔ وہی اس گھر کا مالک ہے، اس کے کچھ بندے ہیں جو اس کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ انہیں نکالا نہیں جا سکتا، اللہ کے محبوب ہیں۔“ جندل کے جواب نے انہیں لاجواب کیا تھا۔

”اللہ کے سوا کسی کے آگے سر تو نہیں جھکایا؟“

”یہ سر جھکتا تو پھر اٹھنے کے قابل نہ رہتا، سر!“ ضرار نے اعتماد سے کہا تھا۔ انہیں مکمل تسلی ہو چکی تھی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

”اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان پر رکھیں۔ تمہیں اپنی راہ پر گامزن رکھیں، تمہارا ایمان قائم رہے، تمہارا شمار اس کے محبوب بندوں میں ہو۔“ مسکراتے ہوئے دعا دی گئی۔

”آمین ثم آمین!“ چاروں نے ہم آواز ہو کر کہا۔

”میں یہاں چند کام دیکھنے آیا ہوں۔ سب سے پہلے زیاد۔۔ تمہیں تمہاری شادی کی بہت مبارک ہو۔ امید ہے سعاد تم سے خوش ہو گی۔“ وہ مکمل زیاد کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ زیاد نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی تھی۔

"شکریہ سر۔۔"

"خیام اور جندل۔۔ تم دونوں کو مبارک ہو، بچھڑا بھائی مل گیا ہے۔" وہ اب ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان دونوں نے سر کو خم دیا۔ کعب کی نگاہوں کا رخ ضرار کی طرف ہوا جو متذبذب سا کھڑا تھا۔ "اور تم۔۔ ابنِ ولید! سب سے پہلے تمہیں بتادوں حزب اللہ ہمیشہ تمہاری احسان مند رہے گی۔ تم بلند حوصلوں والے اعلیٰ کردار کے مجاہد ہو!" ان کے الفاظ ایسے تھے کہ ضرار نے بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

"اور اس کے بعد۔۔ ماموں بننے پر بہت مبارک باد وصول کرو۔" ضرار کو ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے میں وقت لگا تھا۔ ان تینوں نے چونک کر ضرار کو دیکھا تھا جو خود حیران پریشان سا کھڑا تھا۔ اور اگلے لمحات میں اس کی نگاہوں کے سامنے حرم کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا اس کی بہن ماں کے مرتبے پر فائز ہونے والی تھی۔

"بہت شکریہ سر۔۔" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ ان سب کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ ضرار ایسا ہی تھا۔۔ بہت حساس اور نرم دل!

"اس کے بعد تم لوگ مجھے کیس کی تفصیل بتاؤ گے۔" انہوں نے حکم صادر کیا اور پھر خود کرسی پر براجمان ہو گئے۔ ان چاروں نے بھی اپنی اپنی کرسیاں سنبھال لیں۔

☆☆☆

وہ دونوں سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ افق بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے کہنی گھٹنے پر ٹکائے بغور فرش کو دیکھ رہی تھی۔ بدر ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ اسے خیام، بدر، سعاد سب کے متعلق بتا چکا تھا۔ اس کے کسی سوال کا انتظار نہیں کیا تھا۔ ان دس سالوں میں اس کے پاس افق کو بتانے کے لیے اتنی باتیں جمع

نہیں ہوئی تھیں جتنی اس ایک ماہ میں ہو گئی تھیں اور وجہ ظاہر ہے ان سب کی مختلف شخصیتیں اور مختلف روپ تھے۔

"تمہیں اعتراض تو نہیں ہے ناں افق؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے نفی میں سر ہلا گئی۔

"میں دادا کے بعد سب سے زیادہ تم پر یقین کرتی ہوں۔ اگر تم انہی کی بنائی تنظیم میں شمولیت اختیار کر چکے ہو تو میں کیوں اعتراض کروں گی؟" اس نے سمجھداری سے کہا تھا۔ بدر ہلکا سا مسکرا دیا۔

"ویسے تمہارے بھائی اچھے ہیں۔۔ سچ میں۔" اس نے کچھ دیر پہلے جو منظر دیکھا تھا، وہ ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ لبوں پر شریر سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"ہاں۔۔ جندل تو منہ نہیں لگاتا۔ حالانکہ وہ جان چکا ہے میں اس کا بھائی ہوں پھر بھی ایک مرتبہ بھی سیدھے منہ بات نہیں کی اور نہ ہی اٹھ کر گلے لگایا اور خیام بھائی بھی موڈی ہیں۔ دل کرے گا تو سر پر چڑھا لیں گے، مزاج بگڑ گئے تو گٹر میں پہنچا دیں گے۔" اس نے سر جھٹک کر کہا تھا۔ افق بے اختیار ہنسی تھی۔

"اور تمہاری بہن؟"

"آپی بہت اچھی ہیں یار۔۔" اس کی آنکھوں میں سعاد کے ذکر پر ہی انوکھی چمک آ جاتی تھی۔ لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہو جاتی تھی۔ لہجے سے محبت جھلکنے لگی تھی۔ "لیکن انہیں ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ دادا کی اجازت کے بغیر نہ خیام بھائی یہ کام کر سکتے ہیں نہ جندل!" اس نے افسوس سے لب بھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"اوہ۔۔ چلو کوئی بات نہیں اب تو دادا آ گئے ہیں۔ ویسے کہاں ہیں وہ؟ مجھے ملنا ہے۔"

گھر ہو نگی۔ تم ان سے ملو گی تو فین ہو جاؤ گی ان کی۔ وہ ایک بہت اچھی ہیکر بھی ہیں۔ اور تمہیں بیلا باجی سے بھی ملواؤں گا۔ وہ بہت معصوم سی اور کیوٹ سی ہیں۔" وہ پر جوش سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"دیکھ لو تم۔۔ میں کہتی تھی ناں تم سوتیلے ہو۔" افق نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"سوتیلا ہوں تبھی تو یہ سلوک کرتے ہیں جیکب صاحب۔۔ آتے ساتھ اپنے ڈنڈے سے پیٹ ڈالا۔ گلے لگانا دور کی بات یہ تک نہیں پوچھا کیسے ہو بدر؟" خفگی سے کہتے ہوئے اس نے ناک سکیڑی تھی۔

"تم جانتے ہو دادا کو بدر۔۔ وہ ایسے ہی ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھ سے بلا ضرورت بات نہیں کی، حالانکہ سگی اور اکلوتی پوتی ہوں۔۔ ان کے اکلوتے بیٹے کی واحد نشانی!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ بدر گہری سانس لیتا ستون پر سر ٹکا گیا۔

"شاید وقت کا تقاضا تھا کہ وہ ایسے بن گئے۔" افق نے اس کی بات پر سر کو جنبش دی۔ اس کی نگاہ بدر کے عقب میں راہداری کے سرے سے نمودار ہوتی لڑکی پر ٹکی۔

"وہ ہیں سعاد آپی؟" اس نے ماتھے پر بل ڈالے پوچھا تھا۔ بدر نے تیزی سے مڑ کر اسے دیکھا پھر سر اثبات میں ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے قریب پہنچنے پر سعاد کی رفتار سست پڑی۔ اس نے چونک کر افق کو دیکھا۔ اسے یہ چہرہ جانا پہچانا لگا، ایسا ہی کوئی احساس افق کو ہوا۔

"ہم لائبریری میں ملے تھے۔۔ تم۔۔ افق بنت فہد!" سعاد کو یاد آ گیا۔ افق نے سر اثبات میں ہلایا۔

"یہ میری کزن ہے آپی۔۔ الزرقاوی سر کی پوتی۔" بدر نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"کیسی ہو افق؟"

”الحمدللہ۔۔ آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تم دونوں سے تفصیل میں بات کرتی ہوں پہلے ایک کام ہے وہ نپٹالوں۔“اس نے عجلت میں کہا۔ ان دونوں نے سر کو جنبش دی۔ سعاد ایک اچٹتی نگاہ دونوں پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ بدر نے بغور اس کے اٹھتے قدموں کو دیکھا۔ وہ اس کمرے کی طرف جارہے تھے جہاں الزرقاوی سر کے ساتھ ان چاروں کی میٹنگ چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ سعاد کے ہی منتظر تھے۔ اس نے سر جھٹکا پھر افق کی طرف متوجہ ہوا۔

”آؤ یار۔۔ تمہاری مہمان نوازی کرتا ہوں میں۔ کیا کھاؤ گی؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ بنا کسی پر نگاہ ڈالے اس نے پہلے پلٹ کر دروازہ بند کیا پھر ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی۔ خیام کی میز کے پار سربراہی کرسی پر الزرقاوی سر بیٹھے تھے۔ وہ چاروں میز کے گرد کرسیاں رکھے ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں اب اس پر ٹکی تھیں۔ زیاد پہلو بدل رہا تھا، خیام کے چہرے پر اضطراب تھا، جندل زیر لب دعائیں پڑھ رہا تھا جبکہ ضرار پر سکون سا تھا۔ وہ تینوں ڈرے ہوئے تھے وہ الزرقاوی سر کا لحاظ نہیں کرے گی جبکہ ضرار پر سکون تھا کہ اسے اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں لگا تھا۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ ان سب پر ڈالی پھر اپنے لیے کرسی کھینچ کر لائی۔ دائیں ہاتھ سے کرسی کھینچ کر اس نے کرسی خیام کے برابر میں رکھی۔ پھر چپ چاپ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”خیام نے کہا تھا، اس مشن میں مَیں ان کے ساتھ رہوں گی اور آپ مجھے نہیں روکیں گے!“اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ خیام کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی جسے وہ فوراً دبا گیا۔ زیاد ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ جندل نے

بے اختیار شکر ادا کیا جبکہ ضرار اب بے چین ہوا تھا۔ وہ واقعی بہت بدل گئی تھی۔ کم از کم اس معاملے میں اسے زیاد کا رنگ خود پر نہیں چڑھانا چاہیے تھا۔ بالکل نہیں!

"بالکل۔ تو بتاؤ سعاد، دلال کے خلاف ثبوت کیسے ڈھونڈیں؟" الزر قاوی نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"خیام سے پوچھ لیں۔ ہم پہلے ہی اس کے متعلق بات کر چکے ہیں۔" اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔ خیام اس بار اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا سکا تھا۔

"ویل سر۔۔ ابراہم نے ان ویڈیوز کے متعلق کہا تھا کہ راز اہلِ راز کے درمیان ہی ہیں۔ تو سعاد کا ماننا ہے کہ "اہلِ راز" سے مراد کتابیں ہیں اور کتابیں لائبریری میں پائی جاتی ہیں۔ ہمیں ایک حد تک یہ لگتا ہے کہ وہ ویڈیوز ہمیں لائبریری میں ملیں گی۔" خیام نے تفصیل بتائی۔

"بہت اچھے۔ لیکن اس سے پہلے تم لوگ ایک اور کام کرو گے۔" وہ سب مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"زیاد کے متعلق خبر۔۔"

"سر میں بدر کو ٹرین کر رہا ہوں۔ وہ ان شاء اللہ بہت کم وقت لے گا۔" زیاد نے جلدی سے ان کی بات کاٹی تھی۔ سعاد، جندل اور ضرار نے کم فہمی سے اسے دیکھا جبکہ خیام لب دانتوں میں دباتا سر جھکا گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ الزر قاوی کو اس کے کینسر کے متعلق بات کرنے سے روک رہا تھا کیونکہ اس نے سعاد کو ابھی تک بے خبر رکھا ہوا تھا۔

"ہاں ان شاء اللہ۔ ایک بات میں تم سب کو بتانا چاہتا ہوں۔" الزر قاوی نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سر کو جنبش دے کر کہا۔ "تم چاروں کے علاوہ ایک پانچواں بھی ہے جو اس مشن کو لیڈ کر رہا ہے اسے زیاد سے پہلے یہاں بھیجا گیا

تھا! وہ تم چاروں کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے۔۔ اس نے معلوم کر لیا ہے کہ ڈی ڈبلیو کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟!"

الزر قاوی کی بات پر وہ سب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"کہاں سر؟" ضرار نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ خود تم سے رابطہ کرے گا اور بتا دے گا۔ ان کے ہیڈ کوارٹر کو تباہ کرنے کے لیے اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی شاید۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے سر لیکن آخر وہ ہے کون اور ہم سے کیوں چھپ رہا ہے؟" جندل نے الجھن سے پوچھا۔

"بہت جلد معلوم کر لو گے۔ فی الحال اس کی طرف سے پیغام کا انتظار کرو۔" سنجیدگی سے کہتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی وہ سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ سعاد وہیں بیٹھی رہی۔ الزر قاوی کے جانے کے بعد زیاد سعاد کی طرف مڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم اہلِ راز کتابیں ہیں؟" مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔

"تم نے ہی تو بتایا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔ زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔ چند پل وہ وہیں کھڑا رہا پھر باہر نکل گیا۔ سعاد جوش سے خیام کی طرف مڑی۔

"پرفارمینس کیسی رہی؟"

"شاندار، میری ہونہار شاگردہ!" اس نے ستائش سے کہا تھا۔ وہ کھل کر مسکرادی تھی۔ جندل اور ضرار نے بے زاری سے ان استاد اور شاگردہ کے ڈرامے دیکھے پھر آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

ازا بدر کے بلانے پر یہاں آئی تھی۔ وہ موبائل کی اسکرین پر نگاہیں جمائے آگے بڑھ رہی تھی جب اسی وقت زیاد کمرے سے نکلا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ رک گیا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کی طرف آرہی تھی۔ چہرے پر سنجیدگی تھی، مگر نرمی بھی تھی۔ کانوں میں چھوٹے سے آویزے موجود تھے۔ بال ہمیشہ کی طرح شانوں پر گرے تھے۔ سفید کوٹ مسلسل لہرا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر غمگین سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خود پر مسلسل کسی کی نظریں محسوس کر کے ازا نے سر اٹھایا۔ وہ اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی کھل کر مسکرائی۔

"السلام علیکم۔ کیسے ہو؟" خوشدلی سے پوچھا گیا۔

"وعلیکم السلام۔ الحمدللہ، اپنی بہن کو یاد کر رہا تھا۔" مسکراتے ہوئے جواب دیا گیا۔

"سوری بھائی۔۔ آفس میں اتنا کام ہوتا ہے فرصت ہی نہیں ملتی یہاں آنے کی۔" اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے موبائل کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اب اسے کیا بتاتی کہ وہ ڈی ڈبلیو کا ہیڈ کوارٹر ڈھونڈنے میں مصروف تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ جندل تمہارے ساتھ ہوتا ہے ناں؟"

"ہاں جندل اور خیام دونوں۔" اس نے تسلی دی۔ اسی اثناء میں سعاد بھی باہر آگئی تھی۔ ان دونوں کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ بھی وہیں ٹھہر گئی۔

"آپ بھی یہاں ہیں بھابھی؟" ازا نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم بھی یہاں ہو ازا؟" اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ زیاد بے اختیار ہنس دیا۔ ازا جھینپ کر مسکراہٹ دبا گئی۔

"اچھا مجھے بدر نے بلایا تھا۔ کہاں ہے وہ؟"

"افق کے ساتھ ہو گا۔ تم ٹھہرو اپنے بھائی کے پاس، میں بلاتی ہوں اسے۔" سعاد نرمی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

"ازا۔۔ میں جارہا ہوں۔" اس نے اطلاع دی تھی۔ ازا نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم یہیں سعاد کے ساتھ رہنا۔۔ اگر دوبارہ ملاقات مقدر میں ہوئی تو ضرور ملیں گے۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو ازا کو چونکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

"کیوں جا رہے ہیں آپ؟" وہ کم فہمی سے پوچھ رہی تھی۔

"کیونکہ تمہارے بھائی کو اپنا علاج کروانا ہے۔" عقب سے خیام کی آواز سنائی دی۔ زیاد نے خفا نگاہ اس پر ڈالی۔ ازا نے حیرت سے زیاد کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے بھائی کو؟"

"زیاد کو۔۔ بلڈ کینسر ہے۔" اس نے مختصراً زیاد کی حالت بتائی۔ ازا ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ تو کیا۔۔ سالوں بعد ملنے والا اس کا بھائی۔۔ موت کے منہ میں کھڑا تھا؟

"تم اپنا منہ بند رکھ سکتے تھے!" زیاد نے غصے سے اسے گھورا تھا۔ وہ اب پہلے کی طرح اس سے منہ نہیں موڑ لیتا تھا نہ اپنے زہریلے الفاظ سے خیام کو خود سے نفرت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ شاید یہ اس بیماری کا اثر تھا یا آنے والے وقت کا خوف کہ اب وہ اسے مخاطب بھی کر لیا کرتا تھا، اس کی بات کا جواب بھی دے دیتا تھا اور اس کے آنے پر اپنا راستہ بھی نہیں بدلا کرتا تھا۔ ہاں لیکن اس سب کے باوجود۔۔ وہ اسے آج تک معاف نہیں کر پایا تھا۔

"تمہیں اپنی بہن کی دعاؤں کی ضرورت ہو گی، زیاد۔" خیام نے ہمدردی سے کہا تھا۔ سُن ہوتے دماغ سے ان کی باتیں سنتی ازا کو اپنی آنکھوں میں نمی پھگلتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے اندازہ تھا وہ کس تکلیف سے گزر رہا تھا۔ اسے یہ

بھی معلوم تھا کہ بلڈ کینسر میں موت کتنا قریب کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اس لمحے میں زندہ وجاوید اس کے سامنے کھڑا ہے اور اگلے ہی لمحے میں وہ لڑکھڑا کر گرتا نظر آئے تو وہ حیران نہیں ہو سکتی تھی۔ غرض یہ کہ۔۔ وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

"ازا۔۔ رونامت۔۔" زیاد نے اس کے تیور دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے رخساروں پر نمی گرتی محسوس ہوئی۔ زیاد نے گہری سانس لی پھر آگے بڑھ کر اسے خود سے لگایا تھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھتی سسک اٹھی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے یار تمہیں؟ ایسے رونے بیٹھو گی تو میں کیسے جانے کی ہمت کر پاؤں گا؟" وہ اس کا سر سہلاتا نرمی سے کہہ رہا تھا۔ خیام چپ چاپ نگاہیں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں آپ کو۔۔ کھونا نہیں۔۔ چاہتی بھائی!" ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا ہوئے۔

"یہیں ہوں بہن! میں تمہیں تنہا نہیں کروں گا۔ تمہاری حفاظت کا وعدہ کیا ہے، تاحیات نبھانا ہے۔۔ اور پھر میں جاؤں گا بھی کہاں؟ مجھے اپنی بہن کو دخترِ اسلام بنتے بھی دیکھنا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں کہتا اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ اپنے گال رگڑتی پیچھے ہٹی تھی۔ نم آنکھیں اس کی خشک آنکھوں میں گاڑی تھیں۔

"وعدہ کریں۔۔ میرے لیے واپس آئیں گے!" وہ اس سے وعدہ لے رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گیا۔

"وعدہ!" وہ اپنے آنسو اندر اتارتی سر جھکا گئی۔

"بھابھی کو بتایا؟"

"نہیں۔۔ خدارا اسے خبر مت ہونے دینا۔" اس نے گذارش کی تھی۔ ازا سمجھ کر سر اثبات میں ہلا گئی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اس کے عقب میں کھڑے خیام کو۔ خیام۔۔ جو یقیناً کچھ کہنے آیا تھا تبھی ارد گرد دیکھتا مصروف دکھنے کی کوشش کرتا ان کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"تمہیں کچھ کہنا ہے؟" وہ براہِ راست خیام کی طرف متوجہ ہوا۔ ازا بھی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں میں۔۔ کہنے آیا تھا کہ۔۔" بولتے ہوئے اس سے غلطی ہوئی تھی کہ اس نے نگاہیں ازا کی طرف کر لی تھیں۔ ان نم آنکھوں میں جھانکتے ہی اس کے الفاظ لبوں پر دم توڑ گئے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ زیاد نے بغور اس کی اس حرکت کو دیکھا۔ غیر محسوس طریقے سے اس نے ازا کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پیچھے کیا تھا۔ خیام کسی طلسم کے ٹوٹنے پر ہوش میں آیا تھا۔

"میں۔۔ الزرقاوی سر کہہ رہے ہیں تم جلدی نکلنے کی تیاری کرو۔ یہاں ہم دیکھ لیں گے۔" اس نے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔ زیاد نے سر کو جنبش دی۔ وہ گہری سانس لیتا پلٹ گیا۔ زیاد نے بغور اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ وہ بھلے ہی اس کے معاملے میں خود کو نرم کر لے۔۔ مگر اپنی بہن کے معاملے میں کبھی اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا، یہ طے تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں سینے پر ہاتھ باندھے فرصت سے اسے گھورنے میں مصروف تھے۔ دانتوں سے ہونٹ کاٹتا زیاد ارد گرد نگاہیں دوڑاتا اپنے بچاؤ کے لیے کسی مورچے کی تلاش میں تھا۔ وہ اب بھی خاموش تھا، ان کے سوال کے جواب میں کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ انہیں طیش دلا رہا تھا، ان کے صبر کو آزما رہا تھا۔ وہ دونوں آخر تنگ آ کر تلملائے تھے۔

"بولو گے بھی کچھ یا منہ میں نسوار رکھی ہوئی ہے؟" ہمیشہ کی طرح پہلے جندل کا صبر ختم ہوا تھا۔

"نہیں بولنا تو بتا دو، ہم نے اچھے اچھوں کے منہ کھلوائے ہیں۔" ضرار نے اپنے بازو چڑھاتے ہوئے کہا۔ زیاد بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

"ہاں۔۔ مجھے بلڈ کینسر ہے۔" اس کی دبی دبی سی آواز نکلی۔ وہ دونوں ایک لمحے کو اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ وہ خیام کے منہ سے یہ سن کر اس کی بات کا یقین نہیں کر پائے تھے مگر اب تو وہ خود اعتراف کر رہا تھا۔ اب شک کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

"تم۔۔ تم نے یہ بات چھپائی کیوں؟"

"کہاں چھپائی ہے یار؟ بتانے کا موقع ملا؟ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوتا گیا، اگر الزر قاوی سر یہ بات نہ چھیڑتے تو شاید اب بھی تمہیں معلوم نہ ہوتا۔ میں خاموشی سے جانا چاہتا تھا۔" وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

"میری بات سنو تم، ہمارے ساتھ سوتیلوں والا سلوک مت کیا کرو۔ اس خیام کو اور بدر کو ان کے فرشتوں نے خبر دی ہے کیا؟ حتیٰ کہ ازا کو بھی معلوم ہے۔" جندل تپ گیا تھا۔

"میں نہیں جانتا ان دونوں کو کیسے خبر ہوئی۔ اور وہ تمہارا نام نہاد دوست خیام! اس نے ہی ازا کو بتایا ہے۔ میرا دل کر رہا ہے میں جا کر منہ توڑ دوں اس کا۔"

"مرنے والے ہو مگر پھر بھی سکون نہیں ہے۔ شرم کرو، حیا کرو!" ضرار نے منہ کے زاویے بگاڑے تھے۔

"اب تو خیام کو معاف کر دو تم!" جندل نے زغند بھر کر میز پر چڑھتے ہوئے کہا تھا۔

”میں چاہ کر بھی یہ نہیں کر پا رہا۔ اس کی شکل دیکھتا ہوں تو وہ رات یاد آجاتی ہے جب اس نے میرے گھر کو آگ کی نذر کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں مرتے ہوئے بھی اپنی بہن کو اپنے اصل کی طرف لوٹتے نہیں دیکھ پا رہا۔ وہ مجرم ہے میرا، میری بہن کا!!“ وہ ایکدم طیش میں آیا تھا۔ خیام کے سامنے وہ بھلے ہی نرم ہوا تھا مگر غصہ اب بھی وہی تھا۔ اس کی ان باتوں کے ضرار اور جندل تو عادی ہو چکے تھے مگر بدر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتی ازا کو ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔ اس نے حیرت و بے یقینی سے زیاد کو دیکھا تھا، جیسے جو کچھ اس نے سنا اس پر یقین کرنے میں دقت ہوئی ہو۔

”وہ بچہ تھا یار۔۔ اس کی غلطی صرف یہ تھی کہ وہ پلٹا تھا! یقین مانو وہ یہ کام نہ بھی کرتا تو کوئی اور کر لیتا۔“ جندل نے اس کی طرفداری کی تھی۔

”یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ ہی کیوں جندل؟!! اس ساری دنیا میں میرے گھر کو جلانے والا، میری بہن کی زندگی برباد کرنے والا خیام حنفی ہی کیوں؟ وہ جان چکا تھا کہ بابا زندہ ہے۔ ایک بار مجھے بتاتا تو سہی، میں اسے معاف کر دیتا۔ اس نے غلطیوں پر غلطیاں کی ہیں۔۔ لیکن یہ غلطیاں بھی نہیں ہیں، یہ گناہ ہے! تم مجھے کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے۔ تم نہیں جانتے کیسا محسوس ہوتا ہے جب انسان مکمل بے بس ہو جائے۔۔ اتنا بے بس کہ۔۔ ہر وقت یہ ڈر لگا ہوا ہوتا ہے کہ کہیں میں دوسرے جہان میں اپنی بہن کا انتظار کرتا ہی نہ رہ جاؤں۔ مگر میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ کچھ بھی تو نہیں! کیونکہ وہ شخص جسے میں اپنا دوست کہتا تھا وہ میری زندگی میں ایسا موڑ لے آیا کہ پھر حالات بگڑتے گئے۔ ازا دلال کے ہتھے چڑھی، قانتہ جیسی مرتد عورت نے اس کی پرورش کی۔ اس درندے کو اس نے اپنا باپ جانا۔۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا میری بہن بھی کہیں میری پیٹھ میں چھرا گھونپنے تو نہیں جا رہی؟!“ وہ جذبات میں آکر ارد گرد سے بے گانہ بھاری اور نم آواز میں بولتا چلا گیا۔ جہاں جندل اور ضرار کو اس کی باتوں سے تکلیف پہنچی

وہیں ازا کو اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کے لیے بدر کا سہارا لینا پڑا تھا۔ ایک آنسو پلکوں سے جھول کر رخسار پر گرا تھا۔ بدر نے ترحم بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"تمھیں کم از کم اپنی بہن پر شک نہیں کرنا چاہیے۔" ضرار خفا ہوا تھا۔

"شک نہیں کر رہا حقیقت بتا رہا ہوں۔ بھائیوں جیسا دوست اگر میرا مجرم نکل سکتا ہے تو بہن سے کیا توقع کروں؟ وہ بہن جس کی پرورش ایک مرتد عورت نے کی، جس نے اپنی زندگی کے اہم ترین برس دلال جیسے سفاک قاتل کے ساتھ گزارے؟" اس کا شکستہ سا لہجہ ان سب کو بری طرح چبھا تھا۔ ازا نم آنکھوں سے گم سم سی اسے تک رہی تھی۔

"جہاں تک میں جانتا ہوں معاویہ انکل زندہ ہیں، اس کا آپی کو بھی علم تھا؟ اگر تم انہیں معاف کر سکتے ہو تو خیام کو کیوں نہیں؟ آپی پر یقین کر رہے ہو تو ازا کو کیوں شک کی گہرائیوں میں دھکیل رہے ہو؟" جندل کے سوال پر وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"سعاد کو بیچ میں مت لاؤ! وہ تب تب میرے ساتھ کھڑی ہوئی ہے جب تم میں سے کوئی نہیں تھا۔" اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئے۔ "اور رہی بات ازا کی تو۔۔"

"زیاد بھائی!! خدارا بس کر دیں یار۔" بدر کی تیز آواز پر وہ تینوں چونک کر پلٹے تھے۔ سب کی نگاہیں بدر کا بازو دبوچ کر کھڑی ازا پر ٹکی تھیں۔ وہ نم آنکھوں سے زیاد کو تک رہی تھی۔ اور زیاد۔۔ وہ اپنی جگہ پر پتھر کا ہو گیا تھا۔ "جانتا ہوں بہت بری طرح سے گھائل ہوئے ہیں آپ! مگر بیلا باجی کی صداقت کی گواہی میں دے رہا ہوں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ نہ ہوتیں تو وہ تمام دولت اور عیش و آرام چھوڑ کر اپنی راہوں کے پھول ہٹا کر کانٹوں پر چلنے کا فیصلہ نہ

کرتیں۔ آپ کو کم از کم۔۔" اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ازا ہتھیلی سے اپنے رخسار رگڑتی تیزی سے پلٹ چکی تھی۔ ان تینوں نے خفا نگاہوں سے زیاد کو دیکھا تھا جو سب برباد کرنے پر تلا تھا۔ ناچاہتے ہوئے، غیر ارادی طور پر وہ سب کو تکلیف میں مبتلا کر جاتا تھا۔۔ اس طرح کہ وہ سب اس کی تکلیف بھول جاتے تھے۔

راہداری میں قدم رکھتے ہوئے اسے اپنے رخساروں پر تیزی سے آنسو گرتے محسوس ہوئے تھے۔ زیاد کے الفاظ بار بار اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ جہاں ایک طرف وہ خیام کی حقیقت جان کر سناٹے میں رہ گئی تھی وہیں زیاد کی باتوں نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ اس نے کیسے یقین کر لیا تھا۔۔ ۔ سالوں بعد جب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹنا چاہے گی تو۔۔ اسے بہت آرام سے قبول کر لیا جائے گا؟ اور کانٹوں پر چلنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر جائے۔ کانٹے تو پھولوں میں ہوتے ہیں۔۔ یعنی وہ لمحات جب اپنے بھی اجنبی سے لگنے لگیں۔ جب آپ کا ۔ ۔۔ آپ کے سوا کوئی نہ رہے۔۔

☆☆☆

"تمہیں شکایت ہے ناں سعاد کہ تم سے تمہارے بھائی کو جدا کیوں کیا گیا؟" نرم مگر بھاری آواز تھی۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ وہ سانس روکے الزرقاوی کو دیکھ رہی تھی۔ تو کیا۔۔ وقت آن پہنچا تھا؟

اس کے قدم دھیرے دھیرے اٹھ رہے تھے۔ وہ راہداری کو پار کر رہی تھی۔ اونچی لمبی سرمئی دیواریں جو دم سادھے اس کے اٹھتے قدم گن رہی تھیں۔ اس کی ہتھیلیاں نم پڑ رہی تھیں۔ دھڑکنیں منتشر تھیں۔ آنکھوں میں قطرہ قطرہ نمی پھگلنے لگی تھی۔

"تم جانتی ہو تمہارا بھائی تمہارے ساتھ رہ کر کبھی بھی محفوظ نہیں تھا۔ وہ مصعب الزر قاوی تھا، تمہارا گھر اس عقاب کی پرورش کے لیے بہت چھوٹا تھا۔ اس کے پنجے اس چھوٹے سے گھر میں تیز نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ آزاد رہ کر ہی بلند اور اونچی پروان بھرنا سیکھ سکتا تھا۔۔ اس نے سیکھ لیا سعاد! تمہارا بھائی، تم اسے دیکھو تو جانو کہ اس کی زندگی کے یہ ماہ وسال کتنی بلند اڑانیں بھرتے گزرے ہیں۔ وہ۔۔ ضائع نہیں ہوا!" ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

سعاد نے آرام سے پلک جھپکی۔ اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری۔

"کون؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ وہ خود بمشکل اپنی آواز سن پائی۔

"بندہِ خدا! جاؤ۔۔ اپنے بھائی کو دیکھ لو۔" وہ دیوار گرادی گئی جس کے پار اس کا بھائی کھڑا تھا۔ وہ شخص لوٹ آیا تھا جس نے اس سے اس کا بھائی چھینا تھا۔ ملاقات کا انتظام ہو چکا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ دھکیلا تھا۔ وہ اندر آئی، تو پیچھے دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ کمرہ تاریک تھا۔۔ بالکل تاریک۔ بس دائیں طرف دیوار پر بہت سی اسکرینیں نسب تھیں۔ کسی کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ اسکرینوں کی روشنی نے میز اور کرسی کو روشنی کیا ہوا تھا۔ میز جہاں کئی بڑی اسکرینیں رکھیں تھی۔۔ اور کرسی جہاں اس کا بھائی بیٹھا تھا۔ اس نے لب سختی سے دانتوں میں دبائے۔ اپنے قدم آہستہ سے اس کی طرف بڑھائے۔ اس کے قدموں کی چاپ خاموش کمرے میں صاف سنائی دی۔ کی بورڈ پر حرکت کرتی انگلیاں تھم سی گئیں۔ وہ اس کے عقب میں ٹھہر گئی۔ وہ چند پل بیٹھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

سعاد نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا۔ پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ وہ جو رخ موڑے کھڑا تھا، دھیرے سے اپنا رخ اس کی طرف کیا۔ جھکا سر اٹھا کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ سعاد کو لگا تھا اس کا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔

آنکھوں سے کئی آنسو گرتے چلے گئے۔ اس نے سہارے کے لیے کرسی کو مضبوطی سے دبوچا۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے اس کے چہرے کو دیکھا۔

زخمی چہرہ۔۔ گال پر نیا زخم۔۔ ہونٹوں کے کنارے پھٹے ہوئے۔۔ سر پر کس کر پی کیپ رکھی ہوئی تھی۔ گردن پر خراشیں تھیں۔ سیاہ بالوں والا، بھری رنگت اور کشادہ پیشانی والا یہ لڑکا بدر تھا۔ بدر۔۔ جو ہنستا تو آنکھوں کے کناروں پر سلوٹیں سی نمودار ہوتی تھیں۔ اس کا شک درست تھا۔ رگوں میں دوڑتے خون نے درست گواہی تھی۔۔ وہی اس کا بھائی تھا۔۔ مصعب الزرقاوی ہی بدر یوسف زئی تھا!!

”میں۔۔ میں خیام بھائی کا موبائل ہیک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔۔ دیکھیں۔۔ میں بہت جلد سیکھ گیا۔۔ آپی!“ اس کی آواز کانپ گئی۔ آنکھوں میں پانی امڈنے لگا۔ سعاد تڑپ کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے گلے سے لگ کر وہ پھٹ پڑی تھی۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا تھا۔

اس نے سنا تھا بڑی بہنیں ماں جیسی ہوتی ہیں اور اگر ماں نہ ہو تو وہ ماں ہی بن جاتی ہیں۔ وہ کیسے یقین کرتا جبکہ اس نے نہ ماں کی ممتا کو محسوس کیا تھا نہ بہن کی محبت دیکھی تھی؟ وہ نہیں جانتا تھا بہن بھائی کا رشتہ کیسے ہوتا ہے؟ ہاں تب جب۔۔ اس نے سعاد کو اپنے لیے بلک بلک کر روتے دیکھا تھا۔۔ جب کچن میں سانس روکے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے دونوں کی آنکھوں نے دغا دی تھی۔۔ ہاں تب اسے اندازہ ہوا تھا بہنیں کیسی ہوتی ہیں؟

بہن کی محبت کتنی شدید ہوتی ہے؟ اس نے یہ بات تب جانی تھی جب سعاد کو ”اپنی خاطر“ خون کے اس میدان میں دیکھا تھا۔ خیام نے اسے کیسے منایا، وہ نہیں جانتا تھا۔ ہاں جب اسے معلوم ہوا کہ سعاد اپنے بھائی کو ڈھونڈنے کے لیے اس کے ساتھ کام کر رہی تھی تب اسے اندازہ ہوا تھا بہنوں کی محبت کتنی شدید ہوتی ہے؟ تب اس نے جانا تھا۔۔ خولہ کی ضرار کے لیے تڑپ کیسی تھی؟

”مجھے آپ سے بہت محبت ہے آپی۔۔“ وہ اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔اس سے الگ ہوتی سعاد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگائے تھے۔ہاتھ جو کھردرے سے ہو گئے تھے۔دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔۔یہ زخم زیاد کے دیے ہوئے تھے، جو ابھی بھرے نہیں تھے۔

”تم جانتے تھے ناں؟“ اس کی نم آنکھیں بدر کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔بدر نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔”صرف تم ہی نہیں۔۔جندل۔۔خیام تم سب جانتے تھے؟“ دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک گئے۔

”مجھے معاف کر دیں۔میں ماں جیسی بہن کی محبت سمجھ نہیں پایا۔“ وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔دونوں طرف آنسو تیزی سے گر رہے تھے۔سعاد اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”بدر۔۔تم۔۔تم میری جان ہو یار۔“ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیے کہہ رہی تھی۔”میں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے بہت تڑپی ہوں۔تمہیں شاید یہ دیوانگی لگے مگر ہاں۔۔میں اپنے بھائی کے لیے بہت تڑپی ہوں۔“ اس کی آواز کانپ گئی۔بدر نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں؟ میں آپ کو کبھی دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔۔“ وہ اس کے رخساروں پر گرتے آنسوؤں کو چن رہا تھا۔

”میں تمہارے لیے تمہارے بنا گزرا ہر برا دن خواب سمجھ کر بھلا سکتی ہوں۔۔“ اس نے اعتماد سے دعوہ کیا تھا۔بدر ہلکا سا مسکرا دیا۔”ایک بات بتاؤ۔تم مصعب الزرقاوی ہو یا بدر یوسف زئی؟“ وہ آنکھیں چھوٹی کیے پوچھ رہی تھی۔

”آپ کے لیے بدر یوسف زئی اور خیام بھائی کے لیے مصعب الزرقاوی“!

"خیام بھائی؟!" اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ بدر نے سر کو جنبش دی۔ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے۔

"بیٹھ جائیں۔" اس نے دھیرے سے اسکے شانوں پر زور دیا وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے آگے سے ہٹ کر پہلو میں کھڑا ہوا۔ "یہ دیکھیں۔۔ یہ ڈی ڈبلیو کا ہیڈ کوارٹر ہے، آپ کے ایک بٹن دبانے کی دیر ہے اور اسکے پرخچے اڑ جائیں گے۔ یہ ہمارے مشن کی سب سے بڑی کامیابی ہو گی۔" وہ بغور اس کے چہرے کو دیکھتا نرمی سے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے ٹھہر کر اس بٹن کو دیکھا پھر اسکرین کو۔ "میرے لیے یہ کر لیں گی؟" دھیمی آواز میں پوچھا گیا۔ اس نے چونک کر بدر کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔

"تم جانتے ہو میں۔۔" وہ کچھ کہنے لگی تھی جب بدر نے آرام سے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کی انگشت شہادت پکڑ کر اس نے بٹن دبا دیا۔ اسکرین پر دھماکہ ہوتا دکھائی دیا اور پھر سب تاریک ہو گیا۔ بدر نے تیزی سے اسکرین بند کر دی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔۔ آپ کے پی ڈی ایس ڈی کا شکار ہونے کی ایک وجہ میں بھی ہوں۔" وہ دکھ سے کہہ رہا تھا۔ سعاد مسکرا دی۔ بدر اسے مسکراتا دیکھ کر مسکرا دیا۔ دونوں کی آنکھوں کے کنارے پر سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔

"آپ یہاں میرا انتظار کریں گی آپی؟ میں بھائیوں کے پاس جا رہا ہوں۔ واپس آؤں گا تو بہت ساری باتیں کریں گے۔ ٹھیک؟" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ بدر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ الوداعی نگاہ اس پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔ جبکہ وہ سکون کی سانس خارج کرتی کرسی سے ٹیک لگا گئی۔۔ بغور اپنے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھا جو پل بھر میں ہزاروں جانیں لے چکے تھے۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا اس نے

ایسا کیوں کیا تھا؟ ہاں مگر۔۔ ان کے مشن کی سب سے بڑی کامیابی پر اس کا نام آچکا تھا۔ وہ بہت آسانی سے اپنی ساری محنت اس کے نام کر چکا تھا۔

☆☆☆

"میں تم چاروں سے فیکٹری میں ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ سفید رومال والا لڑکا"!

ان چاروں کو بیک وقت یہ پیغام موصول ہوا اور اگلے لمحات میں وہ چاروں فیکٹری میں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ زیاد جندل کے کندھے پر سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ جندل کا بازو خیام کے شانے کے گرد پھیلا ہوا تھا۔ جبکہ خیام نے اپنا سر ضرار کے کندھے پر ٹکایا ہوا تھا۔ اور رہا ضرار تو اس نے بھی پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اپنا بازو خیام کے شانے پر پھیلا دیا تھا۔ وہ چاروں مسلسل انتظار سے بے زار ہو چکے تھے۔ پہلے ہی انہیں یہ سفید رومال والا لڑکا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور اب جب انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہی تھا جو اس مشن کو لیڈ کر رہا تھا، انہیں مزید کوفت ہوئی تھی۔ وہ چھٹانک بھر کا لڑکا۔۔ آج تک انہیں اپنے اشاروں پر چلاتا آیا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کون ہو سکتا ہے وہ؟" زیاد نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔

"خدا جانے۔۔ اگر میرا کوئی شاگرد ہوا تو ٹانگیں توڑ دوں گا سالے کی۔" جندل نے ناک سکیڑی تھی۔

"ویسے ضرار۔۔ تم اس کے ساتھ رابطے میں رہے ہو۔ تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے؟" خیام کے پوچھنے پر ضرار نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نے اسے پہچاننے کی کوشش بھی کی ہے تو پہچان نہیں پایا۔ مجھے بس یہ معلوم ہے کہ وہ خنجر بہت اچھے چلاتا ہے اور اس کا نشانہ زبردست ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"زیاد۔۔ تم جا رہے ہو؟" جندل نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"ہاں۔۔ دیکھیں۔۔ ابھی کچھ دن تو یہیں ہوں۔" اس کے جواب پر خیام کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اس کا غم بانٹنا چاہتا تھا۔ ایک دوست کا حق ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ تھا کہ دونوں کے درمیان کھڑی سرد مہری کی ان لمبی دیواروں کو گرانے پر رضامند ہی نہیں تھا۔ وہ اگر اس کی طرف قدم اٹھاتا بھی تو منہ کے بل گرتا اور پھر شاید کبھی نہ اٹھ پاتا۔ وہ سب اسی حالت میں بیٹھے تھے جب کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سب چونک کر سیدھے ہوئے۔ کوئی فیکٹری میں قدم رکھ چکا تھا۔

اس کے سفید جاگرز میں مقید پاؤں دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ روشنی میں گردن پر آیا زخم نمایاں ہونے لگا تھا۔ سیاہ بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ سیاہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پورے اعتماد سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان سب کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ نگاہیں دروازے پر ٹکی تھیں۔ بالآخر ان کا انتظار ختم ہوا۔ دروازہ کھلا اور سفید جاگرز دروازے سے عین ایک قدم آگے ٹھہر گئے۔ ان کی نگاہیں اوپر اٹھیں تو اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔

وہاں بدر کھڑا تھا۔۔ مصعب الزرقاوی عرف بدر! چہرے پر بلا کی سنجیدگی، ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں اور زخمی سا چہرہ۔۔ وہ ان کے سامنے پورے اعتماد سے کھڑا تھا۔ ان چاروں نے گہری سانس لی پھر کرسیوں سے ٹیک لگا لی۔ انہیں ابھی مزید انتظار کرنا تھا۔

"آؤ بدر بیٹھو۔ تم بھی ہمارے ساتھ انتظار میں شامل ہو جاؤ۔" ضرار نے خوشدلی سے اسے اپنی طرف بلایا۔ بدر چند پل کے لیے سمجھ نہیں پایا اور پھر بہت جلد اسے گڑبڑ محسوس ہوئی۔ وہ لوگ اسے سنجیدہ نہیں لے رہے تھے۔

"کس کا انتظار کر رہے ہیں؟"

"سفید رومال والے لڑکے کا۔" جواب زیاد نے دیا۔ بدر نے سر کو جنبش دی پھر کمرے کے ایک طرف بڑھ گیا۔ ان سب کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اگلے لمحات میں وہ سفید رومال لیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے آرام سے رومال کو جھاڑا پھر اس سے چہرہ چھپایا۔ ہاتھ میں موجود پی کیپ سر پر ٹکائی پھر ٹھہر کر انہیں دیکھا۔ جندل نے آرام سے پلک جھپکی۔

"نہیں یہ تم پر اچھا نہیں لگ رہا۔ اسے اتار دو۔" جندل نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔ بدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اور انہی لمحات میں خیام بری طرح چونکا تھا۔

"اس کی آنکھوں کو دیکھو، غور سے دیکھو۔۔ یہ تو اس لڑکے کی آنکھیں ہیں۔" اس نے ان تینوں کو بدر کی آنکھوں کی طرف متوجہ کیا۔

"ہاں۔۔ بدر تمہاری آنکھیں اس لڑکے جیسی ہیں جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔" ضرار نے مسکرا کر کہا۔ خیام نے تپ کر ایک گھونسا اس کے کندھے پر رسید کیا۔

"اندھے۔۔ میں کہہ رہا ہوں مصعب ہی وہ لڑکا ہے!!" اس نے تپ کر کہا تھا۔ وہ تینوں سناٹے میں رہ گئے۔ بدر کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے آرام سے پہلے پی کیپ اتار کر میز پر رکھی، پھر اپنے چہرے سے رومال اتار دیا۔ وہ چاروں ساکت ہی تو ہو گئے تھے۔

"کون ہو تم؟" زیاد بڑبڑایا۔ بدر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں ہوں مصعب الزر قاوی! پیار سے بدر اور نفرت سے۔۔۔ الزر قاوی!!" اس کی بھاری آواز کئی پل ان کی سماعت سے ٹکراتی رہی تھی۔ جب جب انہیں لگا تھا کہ "کعب الزر قاوی" ان کے ساتھ ہے تب تب "مصعب الزر قاوی" وہاں موجود تھا۔ تب بھی جب مائک نے الزر قاوی کو مائیکل کے بدلے میں مانگا تھا، وہ مصعب الزر قاوی کی بات کر رہا تھا۔ اس رات جب خیام نے شیشے کی طرف دیکھا تھا تب شیشے کے پار ازا کے ہمراہ مصعب الزر قاوی کھڑا تھا۔ وہ ہر پل، ہر لمحہ ان کے ساتھ تھا۔ دلال کو جس الزر قاوی کی تلاش تھی وہ بھی مصعب ہی تھا۔ اس رات جندل جب زیرِ تفتیش تھا تب بھی وہاں شیشے کے پار مصعب ہی کھڑا تھا۔ یہ مشن۔۔ مصعب کو دیا گیا تھا۔ دس سال پہلے جب اسے تھائلینڈ بھیجا گیا تھا۔ اس نے دس سال لگائے تھے دشمن کی صفوں میں گھسنے میں۔۔ دس سالوں بعد اپنے کام کو اختتام تک پہنچانے کے لیے اس نے جو مجاہد مانگے تھے وہ اس کے اپنے بھائی تھے!

وہ ہر راز سے واقف تھا، وہ ہمیشہ انہیں کمانڈ کرتا آیا تھا۔۔ جب جب انہیں لگا کہ وہی ہیں جو اس کام کو اپنے طور سے کر رہے ہیں تب تب مصعب تھا جو اس کام کو اپنی مرضی کے مطابق کروا رہا تھا۔۔ ہر پلان اس کا پلان تھا، ہر کامیابی اس کی کامیابی تھی!! ازا سے وہی رابطے میں تھا، وہی اسے اب تک تاریکی میں گرنے سے بچاتا آیا تھا۔۔ معصوم بدر۔۔ جس نے الزر قاوی کے روپ میں یہ بساط بچھائی تھا جہاں ہر طرف موت کے پہرے تھے۔۔ اس مشن کو وہ لیڈ کر رہا تھا۔۔ اس کہانی کا ہیرو بھی وہ ہی تھا!!

"ایلسا کو تم نے مارا تھا۔ گارڈ کا قتل تمہارا پہلا قتل نہیں تھا۔" زیاد نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا تھا۔

"ہاں بالکل۔ ایلسا کی موت کا مجھے افسوس ہے مگر اس کا مرنا ضروری تھا کیونکہ بصورتِ دیگر مائک ایک لفظ منہ سے نہ نکالتا۔ ویسے بھی وہ جس طرح کی زندگی گزار رہی تھی اس سے موت اچھی۔ اور ہاں گارڈ کا قتل میرا پہلا قتل نہیں تھا وہ "بدر" کا پہلا قتل تھا۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا تھا۔

"اور کیا کیا کرتے آئے ہو تم؟" ضرار نے سوال داغا تھا۔

"وہ سب جو آپ لوگوں کو لگا کعب الزرقاوی کر رہے ہیں۔ مائک کو میں نے اغوا کروایا تھا، مارک کو میں نے مروایا تھا۔ اسٹیون کے خلاف ثبوت میں نے اکٹھے کیے تھے اور۔۔ سب سے بڑھ کر آپ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ میں ہوں۔ آپ لوگوں کو یہاں میں نے بلوایا ہے۔ کون کہاں جاب کرے گا، کس طرح کا روپ ڈھالے گا سب میں نے پلان کیا تھا۔۔ دس سال لگے ہیں مجھے اس کام میں اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔" وہ مسکرا دیا۔

"تم۔۔ تم اب تک ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتے آئے؟" خیام کے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔

"یہ میرے مشن کا چھوٹا سا حصہ تھا۔" اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکیں۔ وہ چاروں سُن بیٹھے رہے۔ سب سے پہلے جندل ہوش میں آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا جندل نے ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔ پیچھے کھڑے ضرار نے اسے کھینچ کر لات رسید کی تھی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا۔ پشت دیوار سے جا لگی۔ ایک لمحے کو اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا، وہ نہیں دیکھ پایا۔ خیام اپنا ہاتھ کام میں لا کر اس کے جبڑے کو تکلیف میں مبتلا کر چکا تھا۔

"اوئے تم تینوں۔۔ رکو۔۔ وہ پہلے ہی زخمی ہے۔" زیاد انہیں روکنے کے لیے جلدی سے اٹھا۔

"آج اس کی ہڈیاں توڑ کر رہیں گے تاکہ آئندہ ایسا واحیات کھیل نہ کھیلے یہ ہمارے ساتھ!" خیام نے غصے سے کہتے ہوئے اس کے سینے پر لات رسید کی تھی۔ ضرار اور جندل نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ اسے کسی مزاحمت کا موقع دیے بنا بری طرح مارنے میں مصروف تھے۔ زیاد کو اس معصوم پر رحم آیا تھا۔ حالات خراب

ہوتے دیکھ کر وہ ان تینوں کے آگے آیا تھا۔ فرش پر گرا بدر اپنی ٹانگیں سمیٹتا کروٹ پر لیٹ کر بری طرح درد سے کراہا تھا۔

"بس کرو، جان لو گے کیا اس کی؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے جندل کو پیچھے دھکیلا تھا۔

"ناں۔۔ آج یہ مرے گا، پکا مرے گا۔" خیام نے اٹل فیصلہ سنایا۔ زیاد نے چہرہ ترچھا کر کے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔

"بھائی ہے وہ تمہارا، کچھ تو شرم کرو!" اس نے دانت کچکچائے۔

"اس بھائی کو ٹکا شرم نہیں آئی جب یہ ہم سب سے جھوٹ بول رہا تھا؟" جندل اتاولا ہوا تھا۔

"ان سب کو چھوڑیں استاد جی، مجھے لے جائیں۔ میری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔" فرش پر گرا بدر کراہا تھا۔ زیاد نے گہری سانس لی پھر جھک کر اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"خبردار جو تم لوگوں نے آئندہ اس پر ہاتھ اٹھایا!" انداز تحکمانہ تھا۔

"لے جاؤ اسے۔ شکل نہیں دیکھنی مجھے اس کی۔" خیام نے بھی غصے سے کہا تھا۔ زیاد گہری سانس لیتا بدر کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ وہ نکلنے لگا تھا جب کچھ یاد آنے پر جندل نے اسے پکارا۔

"سنو، تمہیں کیسے معلوم یہ ہمارا بھائی ہے؟" اس نے مشکوک نگاہوں سے زیاد کو دیکھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔۔ سعاد کا پیغام آیا تھا۔" اس نے اطلاع دی اور پھر باہر نکل گیا۔ وہ تینوں گہری سانسیں لیتے اپنی کرسیوں پر گر گئے تھے۔ یہ چھٹانک بھر کا لڑکا واقعی ان کے ساتھ کھیل چکا تھا۔

☆☆☆

وہ تینوں کسی مجرم کی طرح سعاد کے سامنے ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ سعاد کسی تھانیدار کی طرح دونوں ہاتھ کمر پر باندھے ان کے روبرو کھڑے فرصت سے انہیں گھور رہی تھی۔ زیاد نہ ادھر کا نہ ادھر کا، بین بین کا راسطہ اختیار کر کے بیچ میں کھڑا تھا۔ جبکہ اس کے عقب میں بدر صوفے پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ بدر کے سرہانے کھڑی افق حیران پریشان نظروں سے ان سب کو تک رہی تھی۔

"تم تینوں کو ذرا شرم نہیں آئی اس معصوم کی یہ حالت کرتے ہوئے؟" اس نے غم و غصے سے پوچھا تھا۔

"ہاں تو اسے بھی دیکھیں، ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتا آیا ہے یہ۔" جندل نے احتجاج کیا تھا۔

"منہ بند رکھو اپنا، ایکدم بند! تم بھی تو یہی کرتے آئے تھے۔ بھائی ہے وہ تمہارا جندل بھائی!!" اس نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

"ہم اس کے بڑے بھائی ہیں، تبھی تو مارا ہے۔ اسے اس کی غلطی کا احساس ہونا چاہیے۔" خیام نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"بالکل۔۔ اور ہاں ہم نے تو اتنا مارا بھی نہیں جتنا اس نے زیاد سے مار کھائی ہوئی ہے۔"" ضرار اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔

"اوئے مجھے مت گھسیٹو بیچ میں۔" زیاد گڑبڑایا۔

"کیوں؟ یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔" جندل نے سارا الزام زیاد کے سر کیا۔

"اوئے اوئے میں نے کیا کیا ہے ہاں؟" وہ تلملایا تھا۔

”نہ تم اسے بچانے کی کوشش کرتے نہ بات یہاں تک پہنچتی!!“ ضرار نے ناک سکیڑی۔

”بہت خبیث ہو تم لوگ، بہت زیادہ“!!

”منہ بند رکھو تم چاروں اپنا!“ سعادا نہیں آپس میں لڑتا دیکھ کر چلائی تھی۔

”تم بیچ میں مت بولو!“ چاروں نے بیک وقت ہم آواز ہو کر کہا تھا۔ سعاد نے حیرت سے ان چاروں کو دیکھا تھا جو اپنی زبان کے بے اختیار پھسلنے پر گڑبڑا گئے تھے۔

”نکلو۔۔ پہلی فرصت میں نکلو ورنہ دھکے دے کر نکالوں گی!“ اس کا چہرہ مارے غصے کے لال پڑ چکا تھا۔ ضرار، خیام اور جندل نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر پلٹ گئے۔

”سعاد میرا یقین کرو، میں نے بدر کو نہیں مارا۔“ زیاد نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔ سعاد نے خفا خفا نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”فرسٹ ایڈ باکس لاؤ اور اس کے زخم دیکھو ذرا۔“ وہ بدر کے سرہانے بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں کیوں بھئی؟ اس کی بہن تم ہو، یہ کام تم ہی کرو۔“ وہ تلملایا۔ سعاد نے سر اٹھا کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔۔ صرف چند لمحات اور پھر وہ بھی کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ باہر وہ تینوں ایک دوسرے کے شانوں پر بازو پھیلائے اس کے منتظر تھے۔

”چچ چچ۔۔۔ بے چارہ۔۔ بیوی کے آگے ایک نہیں چلتی۔“ جندل نے افسوس کیا۔

”دربدر ہو گیا۔۔ شودا۔۔“ ضرار نے مسکراہٹ دبائی۔

"اور اب غداری کی سزا دینے کا وقت آگیا ہے دوستوں۔۔ٹوٹ پڑو!" خیام نے خاصی سنجیدگی سے کہا تھا۔زیاد نے جلدی سے راہداری کی طرف دوڑ لگادی تھی۔وہ تینوں تیزی سے اس کے پیچھے بھاگے تھے۔وہ عمارت جس کی لمبی سرمئی دیواروں ہمیشہ خاموش رہتی تھیں، اگلے لمحات میں زیاد کی چیخوں اور اس کے خبیث دوستوں کے قہقہوں سے گونج اٹھی تھیں۔

☆☆☆

وہ لب دانتوں میں دبائے مجرموں کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔بدر اپنی مرہم پٹی کروانے کے بعد کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔لیکن وہ تھکا ہوا تھا، جلدی سو گیا تھا۔اس نے الزر قاوی سر سے ملنا چاہا تھا مگر وہ وہاں موجود نہیں تھے تبھی وہ واپس گھر آگئی تھی۔تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ زیاد بھی وہیں آگیا تھا۔زخمی زخمی سا چہرہ لیے مجرموں کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے صوفے پر سمٹ کر بیٹھا زیاد۔۔اس کا دل کیا تھا وہ جندل، خیام اور ضرار کو رکھ کر ایک ایک لگادے۔

"درد ہو رہا ہے؟" وہ فرسٹ ایڈ باکس لاکر اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔۔زیادہ نہیں پتا میں۔بس یہ معمولی سے زخم ہیں۔" اس نے سعاد کی طرف رخ موڑ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔سعاد نے ٹھہر کر اس کے معمولی زخموں کو دیکھا۔دائیں رخسار پر خون کی ایک ٹیڑھی لکیر بنی ہوئی تھی۔بائیں آنکھ کے پاس بھی "معمولی" سا زخم تھا۔گردن پر خراشیں آئی تھیں۔پیشانی پر خون کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔صرف چہرے کا یہ حال تھا، وہ نہیں جانتی تھی باقی جسم پر اسے کتنے "معمولی" زخم آئے تھے۔

"زخم اتنے معمولی تھے تو خود دیکھ لیتے انہیں۔ میرے پاس کیوں آئے ہو؟" اس کے گال پر لگا خون صاف کرتے ہوئے طنز کیا گیا۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ۔۔۔ آج کل وہ بس اسے دیکھنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ وہ خود بدر کے ساتھ مصروف ہوتا تھا اور سعاد یہاں۔ کئی کئی دن ملاقاتیں نہیں ہوتی تھیں۔ پہلے وہ اسے اپنی زندگی کا حصہ سمجھتا تھا مگر اب۔۔ وہ دل پر بھاری بوجھ لیے بس اسے دیکھنا چاہتا تھا۔۔ بس کچھ وقت کے لیے۔۔ چپ چاپ۔۔ دم سادھے۔ اسے اپنے گال پر جلن سی محسوس ہوئی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس کے گال پر سنی پلاست لگا کر پیشانی کی طرف متوجہ ہوئی۔ زیاد نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چشمہ اتارا تھا۔ سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"تمہیں میرے چشمے سے کیا مسئلہ ہے؟" وہ خفا ہوئی۔ اس نے جواب نہیں دیا، بس چپ چاپ چشمہ ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اس کی خاموشی پر تپ گئی۔ زور سے اس کی پیشانی کے زخم کو دبایا۔ درد کی ایک ٹیس اس کے سر میں دوڑ گئی تھی۔

"آرام سے یار۔۔" وہ بلبلایا تھا۔ سعاد نے غصے سے اسے گھورا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا مگر حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً مسکراہٹ دبا گیا۔ وہ اس کی پیشانی پر آئے زخم پر مرہم لگا رہی تھی جب زیاد کو اپنے ناک سے کوئی چیز رینگتی محسوس ہوئی تھی۔ عجیب خارش کا سا احساس ہوا تھا۔ وہ بے چین ہوا۔ دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت ہونٹوں کے اوپر رکھی تو وہ نم محسوس ہوئی۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

"تم سب آخر اتنا لڑتے۔۔۔" پیشانی پر سنی پلاست لگا کر پیچھے ہٹتی سعاد کچھ کہتے کہتے رکی۔ ماتھے پر بل ڈالے اس کی انگشت شہادت کے پور پر چمکتی خون کی بوندوں کو دیکھا۔ گہرا سرخ انسانی خون جو بالکل تازہ تھا۔ زیاد اس سے

نظریں ملائے بنا تیزی سے واشروم کی طرف بھاگا تھا۔ وہ کم فہمی سے اس کی پشت تکتی رہی تھی۔ اٹھے کندھے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ وہیں بیٹھی کئی الجھنوں کا شکار اس کا انتظار کرنے لگی۔

وہ کافی دیر تک واپس نہ آیا تو وہ پریشانی میں اس کے پیچھے واشروم میں آئی تھی۔ دروازہ کھلا تھا، اس کی طرف پشت کیے وہ بیسن پر جھکا تھا۔ وہ چند پل متذبذب سی وہیں کھڑی رہی پھر اندر آئی۔ اندر قدم رکھتے ہی اسے ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔ سفید فرش پر خون کی بوندیں گری تھیں۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے زیاد کی پشت کو دیکھا تھا۔

"زیاد۔۔" اس کی آواز پر وہ بری طرح چونکا تھا۔ چونک کر سر اٹھایا تھا۔ آئینے میں اس کا عکس ابھرا تھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اسے لگا تھا کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ کر نچوڑ لیا ہو۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟" اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی معلوم ہوئی۔ زیاد نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پانی کے بہتے نل کو بند کیا پھر بنا اس سے نظریں ملائے باہر آ گیا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ ٹشو باکس سے ٹشو نکال رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا چھپا رہے ہو تم؟" اس کی آواز کانپ گئی۔ دل میں کئی اندیشوں نے جنم لیا۔

"کچھ نہیں ہوا یار۔ گلے میں انفیکشن ہو گیا ہے بس۔" اس نے بے زاری سے کہا تھا۔ اسے بے زاری دکھا کر ٹالنا چاہا تھا، وہ بھول گیا تھا وہ اس کے ہر انداز سے واقف تھی۔ اپنے عمل سے وہ اسے مزید تشویش میں مبتلا کر چکا تھا۔

"جھوٹ مت بولنا زیاد! میں۔۔۔ میں بات نہیں کروں گی تم سے۔۔!" کمزور سی دھمکی دیتے ہوئے وہ سسک اٹھی تھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی کو دیکھا پھر گہری سانس لی۔ پیشانی رگڑتے ہوئے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھا۔ چند لمحوں کے توقف سے ساری

بات اس کے گوش گزار دی۔ وہ حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے۔۔ اسے یقین کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ بڑے بڑے دعوے ضرور کر لیا کرتی تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اپنے نام کے بعد اس کا نام جب سے جڑا تھا وہ اس کے بنا جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے یہ سوچ ہی محال تھی اور وہ۔۔ وہ کتنی آسانی سے کہہ رہا تھا کہ اگر علاج کامیاب نہ ہوا تو میں تمہارا انتظار کروں گا !

”مجھے ایسے مت دیکھو سعاد۔“ وہ اس کی خوفزدہ سی نظریں خود پر محسوس کر کے نظریں چراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعاد نے سانس روکے اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بہت کرب سے گزر رہا تھا۔ جب سے اپنی بیماری کا علم ہوا تب سے وہ کسی کندھے کی تلاش میں تھا۔ وہ کسی کو اپنا درد سنانا چاہتا تھا۔۔ اپنی تکلیف بتانا چاہتا تھا۔ سعاد نے دھیرے سے اس کی گدی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے پر ٹکایا تھا۔ کندھا میسر ہونے پر وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پایا۔ اس نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی بس چپ چاپ اس کے کندھے پر سر رکھے آنسو بہانے لگا۔ دھیرے سے اس کا سر سہلاتی سعاد اپنے رخساروں پر نمی محسوس کرتی آنکھیں میچ گئی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے زیاد؟ مجاہد ہو کر موت سے ڈر رہے ہو؟“ وہ اس کا سر اپنے کندھے سے اٹھا کر اس کے رخساروں پر ہاتھ رکھتی پوچھ رہی تھی۔

”خوف موت کا نہیں ہے سعاد! خوف میدانِ جنگ میں شہید ہونے کے بجائے اسپتال کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کا ہے۔ میں ایسے مرنا نہیں چاہتا!“ وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گیا۔ سعاد کو لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں نچوڑ لیا ہو۔ اگر وہ اس کی یہ حالت نہ سمجھتی تو شاید اس وقت اس کے سینے سے لگی رو رہی ہوتی مگر وہ خود ایسی حالت میں تھا کہ وہ اپنا بوجھ اس تک منتقل نہیں کر سکتی تھی۔

”نہیں مرو گے تم! تمہارا علاج ہو گا اور دیکھنا تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اس مردِ مجاہد کی میدانِ کارزار میں اشد ضرورت ہے، اللہ اسے ضائع نہیں ہونے دیں گے۔“ وہ اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو چنتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”تم نے آخری وقت میں بابا کو دیکھا تھا سعاد؟ ان کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے سے نہیں ہٹتا۔ وہ خون میں لتھڑا وجود، میں اسے بھول نہیں پاتا۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ ڈر رہا ہوں سینیورا۔۔“ وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ آواز کانپ گئی تھی۔ آنکھوں میں ہنوز نمی کی دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی۔ سعاد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لیے تھے۔

”کچھ نہیں ہو گا تمہیں! اتنے ناامید مت ہو۔ جانے کتنے معصوم لوگوں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، اللہ ان معصوموں کی دعائیں رائگاں نہیں جانے دیں گے۔“ وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکتی اپنا لہجہ مضبوط کر کے کہہ رہی تھی۔ اسے کمزور نہیں پڑنا تھا، جہاں زیاد کمزور پڑ جائے وہاں وہ کمزور نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ خود کو ٹوٹنے نہیں دے سکتی تھی کیونکہ وہ اسے جوڑنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

”آئی ایم سوری سعاد۔۔۔ میرا ساتھ تمہارے لیے کبھی خوشیاں نہیں لایا۔“ وہ بکھرے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”خبردار جو آئندہ ایسی بات کی تم نے! منہ توڑ دوں گی تمہارا۔ تمہارا ساتھ ہی میرے لیے سب سے بڑی خوشی ہے۔ مجھے تم سے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ سمجھے تم؟!“ وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر نرم پڑی۔ ”کیا کر رہے ہو یار تم؟ اتنا اول فول کیوں سوچنے لگے ہو؟ جانتی ہوں تمہیں میری پروا ہے مگر میرا یقین کرو۔ میں نے تمہیں دعاؤں میں مانگا ہے، ہمارا ساتھ اتنا مختصر نہیں ہو گا۔ نہ اس

جہان میں نہ اگلے جہان میں!!" وہ اسے نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ وہ سمجھ کر سر کو جنبش دے گیا۔ الفاظ نے مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ آنکھیں خشک ہو گئیں۔ سعاد چند پل اسے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے اچک کر اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے تھے۔ اس کا لمس محسوس کر کے وہ بے اختیار ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ وہ دھیرے سے پیچھے ہٹی تھی۔

"مجھے بس تمہاری فکر ہے۔ کچھ ایسا ویسا مت سوچنا!" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے کہا گیا۔ وہ معصومیت سے سر اثبات میں ہلا گیا۔ "بیٹھو یہیں۔ میں آتی ہوں۔" اسے تاکید کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چہرہ ترچھا کر کے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ نگاہ اس کی پشت سے ہوتی اس کے پہلو میں گرے ہاتھوں پر ٹکی جو کانپ رہے تھے۔ وہ رونے جا رہی تھی۔۔ بہت سارا رونے جا رہی تھی!

کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آتے ہی اسے اپنے رخسار پر تیزی سے آنسو گرتے محسوس ہوئے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ دروازہ لاک کرتے ہوئے اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے سنبھالنا آسان تھا کیونکہ وہ جلدی سنبھل جاتا تھا۔ مگر خود کو سنبھالنا بے انتہا مشکل تھا کیونکہ اس کے معاملے میں وہ کمزور پڑ جاتی تھی۔ اور یہی ہوا تھا۔ واشروم میں آ کر پانی کا نل کھولتے ہی وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔ آنسو گرم سیال کی طرح بہنے لگے تھے۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اپنی سسکیوں کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ پھٹ پڑی تھی۔ سانس لینا محال لگا تھا۔۔ اور کیسا محسوس ہوتا ہے جب معلوم ہو کہ جسے آپ زندگی کہتے ہیں، زندگی اس سے ناراض کھڑی ہے؟ کیا جان نکلتی محسوس ہوتی ہے؟ کیا سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ کیا۔۔۔ زندگی ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے؟

☆☆☆

”میں جان چکی ہوں دلال کے خلاف ثبوت کہاں ملیں گے؟“ اس کی بات پر وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا جو سر جھکائے انگشت شہادت سے میز پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ چہرہ کافی حد تک لال پو چکا تھا۔ آواز نم سی تھی۔

”کیسے؟ میرا مطلب ہے کہاں؟“ وہ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے آگے ہوا۔

”ابراہم نے کہا تھا، راز اہلِ راز کے پاس ہوتے ہیں۔ یعنی کتابیں۔۔ مگر کونسی کتاب؟ ابراہم نے مجھے ایک کہانی بتائی تھی۔“ وہ زکام زدہ سی سانس خارج کرتی تمہید باندھ رہی تھی۔ وہ مکمل اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ ”ایک بحری کپتان سیاہ اور سفید پانیوں کے درمیان میں سفر کیا کرتا تھا۔ اس کا بحری جہاز ہمیشہ ان دو پانیوں کے درمیان متوازن رہتا۔ ایک رات۔۔ سمندر میں بلا کا طوفان آیا تھا۔ تڑاتڑ برستا آسمان، بپھری ہوئی لہریں۔۔ اس رات اس کپتان نے جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر اپنے خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگی تھیں کہ کسی طرح اس کا جہاز اس طوفان سے بچ جائے۔ اگر خدا اس کی بات نہیں مانے گا تو وہ۔۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کا منکر ہو جائے گا۔ اس کپتان کی دعائیں رائگاں گئیں۔ وہ جہاز جو ہمیشہ سیاہ اور سفید پانی کے درمیان میں متوازن رہتا تھا، اسے طوفانی لہروں نے سیاہ پانی میں دھکیل دیا۔ جہاز ڈوب گیا۔ وہ کپتان ہمیشہ کے لیے خدا کا منکر ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کوئی خدا ہوتا تو یقیناً اسے موقع پر بچا لیتا۔“ اس نے گہری سانس لے کر کرسی سے ٹیک لگائی۔ نگاہیں میز سے اٹھا کر اس کے چہرے پر ٹکائیں جو ہمیشہ کی طرح سفید رومال میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے فی الحال ازا کو اپنی حقیقت نہیں بتائی تھی۔

”جہاں خدا تمہاری ماننے سے انکار کر دے، وہاں خدا کو ماننے سے انکار کر دو!“ وہ کہہ کر تلخی سے ہلکا سا مسکرائی۔ ”اس کہانی کا مقصد یہی تھا۔ ابراہم یہودی ہے اور یہودیوں نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ وہ خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے وہ ہمیشہ خدا سے ضد لگاتے ہیں۔ اور یہ وہ پوائنٹ تھا جو میرے دماغ میں آیا تھا۔ مگر اصل میں اس

کہانی کا خدا اسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تم جانتے ہو وہ کپتان اس رات اپنے جہاز کے ڈوبنے کے باوجود خود طوفان سے محفوظ رہا تھا۔ وہ جس ساحل پر اترا تھا وہاں سے اس کی نئی زندگی شروع ہوئی تھی۔ آنے والے وقت میں وہ سمندروں کا سب سے خطرناک بحری قزاق بن چکا تھا۔ اور یہ سب۔۔ یہ اس سیاہ پانی میں جہاز کے ڈوبنے کے بعد ہوا۔ خدا نے اس کی نہیں مانی مگر خدا نے اسے وہ دیا جو اس کی مانگ سے بڑھ کر تھا۔ وہ سیاہ پانی اس بحری قزاق کے لیے بختوں والا ثابت ہوا۔

ایک کتاب۔۔ جو سمندر پر لکھی گئی ہو۔۔ ایک دروازہ جو سیاہ آب کے نام پر کھلے۔ وہیں تمہیں دلال کے خلاف ہر ثبوت ملے گا۔" اس نے دھیمی آواز میں نرم سے □ سے لہجے میں بات مکمل کی۔ وہ کئی پل سانس روکے اسے دیکھتا رہا۔ ازا اس کی محویت دیکھ کر ہلکا سا مسکراتی چہرہ موڑ گئی۔

"تم مجھے ہر بار حیران کر دیتی ہو۔" اس کے لہجے میں ستائش تھی۔

"میری نم آنکھوں کو دیکھ کر میری تعریف کر کے مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش مت کرو۔" اس نے منہ بسورا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"زیاد کی طرف سے میں معافی چاہتا ہوں ازا! وہ جذباتی ہو گیا ہے۔ اسے اگر تمہارے کارنامے معلوم ہوں تو دوبارہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہے۔"

"بہت اچھے۔۔ اب میری بات سنو۔ تم میرے چند سوالوں کا جواب دو گے، بنا کسی جھوٹ کے!" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتی آگے ہوئی۔ اس نے سر کو جنبش دے کر جواب دینے کی ہامی بھری۔

”خیام کے متعلق سب بتاؤ۔ ایک ایک بات!! مجھے سب جاننا ہے۔“ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر سر کو ذرا سی جنبش دی۔ اس کے پاس اب اسے سب بتانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ لائبریری میں کھڑا تھا۔ اونچی لمبی دیواریں اور چھتیں جن کے سائے میں چاروں طرف کتابوں کا جہان آباد تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے۔ دروازے کے باہر رات تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ ان کتابوں پر ڈالی تھی پھر اپنے قدم بڑھا دیے۔ سیاہ پینٹ پر سیاہ شرٹ اور جیکٹ پہنے، ماتھے پر سیاہ ہی پی کیپ ٹکائے ہم رنگ ہی جاگرز پہنے وہ مکمل رات کی تاریکی میں رنگا اپنے قدم اٹھا رہا تھا۔ کتابیں دم سادھے اپنی طرف آتے اس لمبے اونچے مرد کو تک رہی تھیں۔

دلال نے کہا تھا، راز اہلِ راز کے پاس ہی محفوظ ہوتے ہیں۔ اور اہلِ راز کتابیں ہوتی ہیں۔۔ خود میں ہزاروں تاریخیں سموئے اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کرتی کتابیں! وہ ان کتابوں سے ہی وہ راز لینے آیا تھا۔

”مگر وہاں ڈھیروں کتابیں ہوں گی سعاد! ہم کس کس کو کھنگالیں گے؟“

”سمندر۔۔ اس کتاب کو ڈھونڈو جو سمندر کی داستان خود میں سموئے ہوئے ہے۔“ جندل نے سرگوشی کی تھی۔ اس کے سست رفتار سے اٹھتے قدم تھم گئے۔ وہ راہداری کے وسط میں کھڑا تھا۔ دائیں بائیں کتابیں تھیں۔ اس نے نیلے رنگ کی جلد والی اس موٹی سی کتاب کو دیکھا۔ نیلا رنگ جو دھیرے دھیرے نیچے کو سرکتا گہرے سیاہ رنگ کا ہو رہا تھا۔ کتاب بہت پرانی تھی۔ اس نے کتاب کا نام پڑھنا چاہا مگر وہ مٹا مٹا سا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا۔

دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں کتاب کے اوپری حصے پر رکھیں اور انگوٹھے کی مدد سے زور دے کر اسے کتابوں کے درمیان سے اٹھانا چاہا۔ اسی وقت چرچراہٹ کی آواز آئی۔ وہ کتاب نہیں اٹھا پایا۔ دائیں بائیں دونوں طرف کی کتابیں ایک طرف کو ہوتی گئیں۔ اور وہ نیلی کتاب پیچھے کی طرف جاتی رہی یہاں تک کہ۔۔ اس کے سامنے ایک دروازہ تھا۔ جدیدیت کا پیکر پراسرار سا دروازہ جسے کھولنے کے لیے پہلے پاسورڈ لگانا تھا۔

اسے یقین ہو گیا تھا وہ بالکل درست جگہ پر تھا۔ دلال، واقعی سمندروں کا عاشق نکلا تھا۔ سمندر میں رہنے والے ہمیشہ اس دنیا سے کئی زمانوں کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ یہ دروازہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ دورِ جدید میں شاذونادر ہی کوئی شخص اپنے راز کو اس طرح چھپانے کا سوچے۔۔ مگر وہ دلال تھا۔۔ وہ قدیم ادوار میں جیتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر درمیان میں رکھی وہ کتاب اٹھالی۔ کتاب آرام سے اس کے ہاتھ میں آگئی۔ مسئلہ اب پاسورڈ کا تھا، جو یقیناً اس کتاب میں تھا۔

اس نے کتاب کھولی۔ پہلا صفحہ خالی تھا۔ کتاب کے ورق خاصے پرانے تھے۔ ان کا رنگ ہلکا پیلا اور میلا میلا سا تھا۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹا۔ کتاب کا نام یہاں بھی مٹا مٹا سا تھا۔ اس نے آنکھیں چھوٹی کر کے نام پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔ اس نے لکھاری کا نام پڑھنا چاہا۔ وہ کامیاب رہا۔ لکھاری کا نام تھا، "ابراہم وارلڈ!" وہ حیران ہوا۔ ابراہم وارلڈ کی شخصیت میں دور دور تک سمندر کی محبت نہیں تھی، پھر سمندر پر یہ بھاری بھرکم کتاب لکھنے کا مقصد کیا تھا؟ اگر دلال کو یہ کتاب لکھنی تھی تو اس کے لیے وہ نام کیوں چنا جو ایک ایسے شخص کا تھا جس نے شاذونادر ہی کبھی سمندر کی طرف رخ کیا ہو؟!

اس نے ٹھہر کر اگلا صفحہ پلٹا۔ سیاہ روشنائی سے بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا،

”اور تہہ در تہہ یہ نیلا پانی جب دھیرے دھیرے سیاہ ہونے لگتا ہے۔۔“ وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھ نہیں پایا۔ اس نے اگلا صفحہ پلٹا۔ ”اگر سیاہ اور سفید کے درمیان مرجُ البحرین ہوتا تو سرمئی کا کوئی وجود نہ ہوتا۔۔“ ہر ہر لفظ سے پراسراریت جھلک رہی تھی۔ وہ اپنے اردگرد سے انجان ہوتا جارہا تھا۔ اس کی پوری توجہ اس کتاب پر مرکوز تھی۔ یوں جیسے کوئی سحر ہو جس میں وہ جکڑا جارہا ہو۔ قدیم کتابیں، قدیم ادوار تو اسے بھی پسند تھے۔۔ اس کا یوں مسحور ہونا بنتا تھا۔

”یہ میری کہانی ہے۔ میری یعنی سمندروں سے محبت کرنے والے ایک عام سے انسان کی۔ اس کی شروعات وہاں سے ہوتی ہے جہاں مجھے سفید اور سیاہ میں سے ایک کو چننا تھا۔ میں نے سیاہ آب کو چنا اور ہمارا بحری جہاز ڈوب گیا۔“ ساتھ ہی نیچے ایک تصویر چسپاں تھیں۔ سیاہ پانیوں میں سرکش لہروں سے لڑتا جہاز جسے اگر ایک طرف پانی اپنی طرف کھینچ رہا تھا، تو دوسری طرف تڑاتڑ برستا آسمان اسے اپنی طرف دھکیل رہا تھا۔ اسے یہ منظر دیکھا دیکھا سا لگا تھا۔۔ یہ تصویر بلاشبہ بہت پرانی تھی مگر یہ منظر۔۔ اس نے اس منظر میں جدیدیت کا روپ بھی دیکھا تھا۔۔

اسی لمحے میں اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔ معاویہ کی پینٹنگ جو ازانے اس دن آرٹ گیلری سے خریدی تھی۔ وہ حیران ہوا، یہ منظر ہو بہو وہی تھا جسے معاویہ نے کینیوس پر اتارا تھا۔ لیکن یہ کتاب دلال کی لکھی ہوئی تھی، جو اس کے ساتھ ہوا اس کی عکاسی معاویہ نے کیسے کی تھی؟ کیا یہ محض اتفاق تھا؟ اس کا ذہن الجھ گیا۔ اس نے کتاب بند کر کے گہری سانس لی۔

”اگر سیاہ اور سفید کے درمیان مرجُ البحرین ہوتا تو سرمئی کا کوئی وجود نہ ہوتا۔۔“

”یہ میری کہانی ہے۔ میری یعنی سمندروں سے محبت کرنے والے ایک عام سے انسان کی۔ اس کی شروعات وہاں سے ہوتی ہے جہاں مجھے سفید اور سیاہ میں سے ایک کو چننا تھا۔ میں نے سیاہ آب کو چنا اور ہمارا بحری جہاز ڈوب گیا۔“

وہ ان الفاظ کو دہرانے لگا۔ سیا، سفید، سرمئی، مرجُ البحرین اور سیاہ آب!

دلال کا جہاز ڈوب گیا کیونکہ سیاہ پانی اور سفید پانی کے درمیان کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر ان دو پانیوں کے درمیان مرجُ البحرین کا وجود ہوتا تو عین ممکن تھا دلال کو سیاہ پانی کا رخ نہ کرنا پڑتا! وہ ان الفاظ کا مطلب سمجھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے ٹھہر کر دروازے کو دیکھا۔ اس نے اس طرح کے دروازوں کے بارے میں پڑھا تھا۔ انہیں اگر زبردستی کھولنے کی کوشش کی جائے تو دھماکہ ہوتا ہے اور اندر موجود ہر شے جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ ان پر پاسورڈ لگانے کی کوشش بھی ایک بار ہی کی جاسکتی ہے۔ غلط پاسورڈ کا مطلب اندر موجود تمام ثبوتوں سے ہاتھ دھونا!

وہ ان دو الفاظ کے درمیان میں اضطراب کی کیفیت میں کھڑا تھا۔ "مرجُ البحرین" یا "سیاہ آب"؟

اس نے سوچنے کے لیے وقت لیا۔ اگر مرج البحرین ہوتا تو دلال کو بحری جہاز نہ ڈوبتا! سیاہ آب میں اس کا جہاز ڈوب گیا۔ یعنی ایک وہ شے ہے جو وجود نہیں رکھتی اور ایک وہ جس سے اس کا اذیت ناک ماضی جڑا ہے۔ دلال کی شخصیت۔۔ نہیں ابراہم وارلڈ کی دیکھنی چاہیے کیونکہ کتاب اسی نے لکھی ہے۔ وہ شخص کسی ایسی شے کو یاد رکھنا چاہے گا جو اس کے ماضی سے جڑی ہو اور خاصی اذیت ناک ہو؟ ہرگز نہیں! رہ گیا مرجُ البحرین، تو یہی پاسورڈ تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھایا مگر پھر عین وقت پر رک گیا۔ کتاب ابراہم نے لکھی تھی مگر پاسورڈ لگانے والا دلال تھا! اور دلال انتقام کی خاطر ہر اس شے کو یاد رکھے گا جو اس کے اذیت ناک ماضی سے جڑی ہو۔ یعنی پاسورڈ تھا، "سیاہ آب"!

اس نے پاسورڈ لکھا اور بٹن دبا دیا۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اس نے قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔ اندر قدم رکھتے ہی اسے لگا وہ نئی دنیا میں آیا ہے۔۔ سمندر کی دنیا میں!

اس کے دائیں طرف ایک بڑا بحری جہاز تھا جس پر بحری قزاقوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ زیاد نے اسے بتایا تھا یہ لائبریری دس سال پہلے بنی تھی۔ یعنی جب دلال تھائی لینڈ آیا تھا۔ اس نے اپنے بحری جہاز کو یہاں چھپایا تھا۔ بائیں طرف دیواروں پر بڑے بڑے نقشے چسپاں تھے۔ سمندر کے نقشے! اس نے ایک اچٹتی نگاہ ان پر ڈالی پھر آگے آیا۔ نگاہ سامنے پڑتی ہی وہ ٹھٹھک کر رکا تھا۔ وہاں کوئی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی طرف پشت تھی۔ شانوں تک آتے بھورے بال ہمیشہ کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ سیاہ لانگ کوٹ میں وہ پوری چھپی ہوئی تھی۔ اس کی پشت سے ہی وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ۔۔ ازا تھی۔۔ ازا تاشفین! اس نے سانس روکے بنا پلک جھپکے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ دھڑکنیں منتشر ہوئی تھیں۔ وہ بھی اس کی موجودگی محسوس کر چکی تھی، لیکن پلٹنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

"مجھے یقین تھا تم مصعب کے ساتھ تھیں۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔ کہیں کوئی مان ٹوٹا تھا جس کی کرچیاں آنکھوں میں ابھری تھیں۔۔ اسے یہ بھی تو یقین تھا کہ ازا معصوم تھی۔۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ۔۔ دلال کے سائے میں پروان چڑھنے والی ازا، کبھی معصوم نہیں ہو سکتی تھی!

☆☆☆

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھا خالی میز کو تک رہا تھا۔ عقب میں کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کیبنٹ سے برتن نکال رہی تھی۔ وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے میز پر لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ ایک کے بعد ایک برتن میز پر سجاتی گئی۔ کھانا لگ چکا تو اس نے سر اٹھایا۔ سعاد اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی غلطی کیے بنا کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ حیران ہوا کہ اب وہ کچن میں کیا لینے گئی تھی جبکہ سب کچھ میز پر لگ چکا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر گزر گئی وہ نہیں آئی لیکن پھر عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

"شروع کرو تم۔" دھیمی آواز میں کہا گیا تھا۔

"تم بھی آؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کے جواب پر زیاد نے گہری سانس لی۔

"یہاں آؤ سکون میرے۔۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ چند پل بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کے پہلو میں کھڑے ہو کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس کے کہنے پر وہ کچھ بولنے لگی تھی مگر پھر خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ زیاد نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا جو اترا اترا سا تھا۔ وہ کمرے میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ جندل کا پیغام آیا۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔ اس نے سعاد کو اطلاع دینا چاہی مگر اس نے کمرہ لاک ہوا تھا۔ تبھی وہ بنا اطلاع کے چلا گیا تھا۔ اور پھر اب رات کو لوٹا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کچن میں گھس گئی تھی۔ اور اب اس کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔ سعاد اس کی نظریں مسلسل خود پر محسوس کر کے بے چین ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کی پلیٹ میں سالن ڈالا۔ روٹی اس کے سامنے رکھی۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر نوالہ بنایا۔

اور جس لمحے میں اس نے یہ نوالہ سعاد کی طرف بڑھایا تھا، اسے لگا تھا وہ رو دے گی۔ نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور نوالہ اپنے منہ میں رکھا۔ وہ اسے نگل نہیں سکی، نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے۔ زیاد نے دھیرے سے اس کی پشت سہلائی۔

"کیا ہو گیا ہے یار؟ کیوں رلانے پر تلی ہو؟" وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے سر نفی میں ہلا گئی۔ آنکھوں سے آنسو لڑھکتے گئے۔ زیاد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کے ہاتھ کو دبایا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا سکون میرے۔۔ خود کو ہلکان مت کرو۔" نہایت نرمی سے کہا گیا۔

"مت کہا کرو مجھے یہ۔۔مجھے۔۔مجھے عادت مت ڈالو اپنی زیاد!!میں نے کہا مجھے بھوک نہیں ہے تو چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔میں رو رہی ہوں، تو مجھے دلاسے مت دو۔مجھے یہ احساس مت دلاؤ کہ کوئی ہے جو ہر بار میری بکھری ذات کو سمیٹنے کے لیے تیار ہے۔۔مجھے خود کو خود سمیٹنے دو۔میں عادی ہو گئی ہوں تمہاری!!" وہ سسک اٹھی تھی۔وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔

"کوئی اپنی روح کے حصے کو کیسے نظر انداز کرے؟مجھے وہ کرنے کو مت کہو جو میرے اختیار میں نہیں۔تمہارے ساتھ ہوں، تو اس ساتھ کا احساس دلاؤں گا۔اپنا عادی بھی بناؤں گا۔۔ہر طرح کے برے خیال، اندیشے اور شک و شبہات اپنے دل سے نکال دو تم!" وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اپنے رخساروں کو رگڑا۔وہ کئی پل جواباً کچھ نہ بولی تو وہ ایک اور نوالہ بنانے لگا۔نوالہ اس کے منہ میں رکھا تو اسے نگلنے میں سعاد کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔وہ ہلکا مسکرا دیا تھا۔اس کی بیوی سمجھدار تھی، بات مان لیا کرتی تھی۔

"اب ایسے مت دیکھو مجھے۔میں ویسے بھی آج کل رات کا کھانا نہیں کھاتی، تمہاری وجہ سے بیٹھی ہوں۔" نوالہ چباتے زیاد نے اس کی بات پر کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"کیوں بھلا؟"

"وزن بڑھ گیا ہے میرا۔۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔زیاد کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔وہ بے اختیار چہرہ موڑ کر ہنس دیا تھا۔"ہنسو مت!!یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" وہ خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں بھئی؟میں نے کیا کیا ہے؟" وہ بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”تھوڑا رعب جما کر اپنے کام کروایا کرو ناں۔ سست ہوتی جارہی ہوں، سارا دن جب اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی ہو نگی تو وزن نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہو گا؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”بہت اچھے۔۔ آج سے تم میرے لیے دن میں تین وقت کھانا بناؤ گی، میرے کپڑے استری کرو گی اور باقی سارے کام جو ایک بیوی اپنے شوہر کے کرتی ہے۔ ٹھیک؟“ نرمی سے اسے دیکھا گیا۔

”رعب جماؤ رعب!! ایسے نکلوا لیے تم نے اپنے کام۔“ اس نے بچوں کی طرح منہ بسور کر ناک سکیڑی تھی۔

”مسز تاشفین! اگر آپ نے میرے کام نہیں کیے تو میں۔۔۔ میں خود کر لوں گا یار۔“ وہ کوئی دھمکی سمجھ نہ آنے پر بے اختیار ہنس کر کہتا کرسی سے ٹیک لگا گیا۔ سعاد نے منہ بسور کر اسے دیکھا پھر میز پر رکھے برتن سمیٹنے لگی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی، جو اس کی بیوی تھی، اس کی زندگی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جیتا تھا۔۔ جانے کب کیوں کیسے وہ اس سے اتنی محبت کرنے لگا تھا۔۔ شادی سے پہلے۔۔ ہاں وہ اس سے محبت کرتا تھا مگر کبھی یوں اس کے لیے دیوانہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے محترم تھی، اس کی محبت تھی۔۔

ان دونوں کا ساتھ یوں تھا کہ۔۔ اس کی زندگی اور موت اس کی بیوی کی زندگی پر اثرانداز ہو سکتی تھی۔۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا۔۔ وہ اسے۔۔ رلانا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ دھیرے سے اس کی طرف پلٹی تھی۔ سر اٹھا کر آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑی تھیں۔ اس کے سنجیدہ تاثرات۔۔ سپاٹ چہرہ۔۔ خیام کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ بے یقینی اور حیرت سے اسے دیکھے گیا۔

”ہاں میں اس کے ساتھ تھی، کیونکہ وہ واحد تھا جس نے میرے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی!“ ان کے درمیان میں ہمیشہ کی طرح ایک تیسرا شخص آ گیا۔ خیام نے پلک جھپک کر اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے آگے آیا تھا۔ اسے کلائی سے پکڑ کر دیوار سے لگایا تھا اور خود اس کے آگے کسی دیوار کی مانند کھڑا ہوا تھا۔

”ہم نے تمہارا اعتماد توڑا تو تم نے کیا کیا ازا؟ پاکیزہ اور سچی تو تم بھی نہیں ہو!“ بولتے ہوئے اس کی آواز تھوڑی سی بلند ہوئی تھی۔ اس نے ضبط سے مٹھیاں بھینچی تھیں۔ چہرہ ایکدم غصے سے سرخ پڑنے لگا تھا۔

”کم از کم میں تمہاری منافق نہیں ہوں خیام حنفی!“ وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ خیام اپنی جگہ ساکت ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پگلتی نمی، ضبط سے لال پڑتا چہرہ اور حقیقت جان لینے کے بعد کرب ظاہر کرتی آنکھیں۔۔ وہ ٹھہر ہی تو گیا تھا۔ تو کیا وہ حقیقت جان چکی تھی؟

”ازا۔۔“ اس کے لب بے یقینی کی سی کیفیت میں پھڑپھڑائے تھے۔

”نام مت لو میرا!“ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا تھا۔ وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ اگلے لمحات میں وہ اس کا گریبان پڑ چکی تھی۔ ضبط کی انتہا ختم ہوئی تھی، وہ مزید دل میں غبار جمع نہیں کر سکتی تھی تبھی پھٹ پڑی تھی۔ ”تم خیام حنفی! تم میرے ساتھ اچھے نہیں تھے ان کے ساتھ تو اچھے ہو جاتے جو تم پر جان چھڑکتے تھے! قاتل ہو تم قاتل!! سفاک قاتل!“ وہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے غرائی تھی۔ وہ کئی پل اس سے نظریں نہیں ملا پایا تھا۔ ”تم بچے تھے، ناسمجھ تھے معلوم نہیں تھا کیا کرنے جا رہے ہو؟ ٹھیک ہے سمجھ گئی میں۔ مگر کیا تب بھی بچے تھے جب بدر کو نام دیا تھا؟ جب اس سے اس کی شناخت چھینی تھی؟ کیا تم اتنے ناسمجھ تھے کہ نہیں جانتے تھے تم سعاد اور جندل کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہو؟ کیا تم تب بھی ناسمجھ تھے جب تم سعاد اور جندل سے جھوٹ بولتے آئے؟ جب تم نے اپنے مقصد کی خاطر سعاد کو استعمال کیا حالانکہ یہ طے تھا کہ تم اسے کبھی نہیں بتاؤ

گے کہ بدر اس کا بھائی ہے!! تم جانتے تھے اور تم اسے ساری زندگی استعمال کرنے والے تھے!!" اس کی آواز بلند ہوتی گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں، مکمل سناٹے میں ازا کی آواز کئی پل اس کی سماعت سے ٹکراتی رہی تھی۔

"تم نے سعاد کے یہاں آنے پر زیاد کو نیویارک صرف اس لیے بھیجا کیونکہ تم نہیں چاہتے تھے ان دونوں کی ملاقات ہو کیونکہ اس کے بعد سعاد ویسی ہی آزاد نہ ہوتی جیسی اب تک تھی! تم نہیں چاہتے تھے ان دونوں کی شادی ہو! تم تم خیام۔۔ کتنے خود غرض ہو تم؟! زیاد، جندل، سعاد۔۔ یہ لوگ تمہارے لیے سب کچھ نظر انداز کر دیتے ہیں اور تم؟ تمہیں جب موقع ملے گا انہیں استعمال کرو گے جیسے تم اب تک سب کے ساتھ کرتے آئے ہو!" اس نے جھٹکے سے اس کا گیربان چھوڑا تھا۔ دونوں کی آنکھوں نے دغا دی تھی، پانی کے صاف شفاف سے قطرے دونوں کے رخساروں پر گرے تھے۔

"تمہیں لگتا ہے وہ تینوں اس سب سے آگاہ نہیں۔۔۔ ازا؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"حیرت ہے مجھے ان تینوں پر جو یہ سب جاننے کے بعد بھی تم سے نفرت نہیں کرتے۔۔" وہ طنزیہ انداز میں کہتی تلخی سے ہنسی۔ خیام نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"کیونکہ میں نفرت کے قابل نہیں ہوں ازا!" اس نے اعتماد سے کہا تھا۔ وہ اس کے سامنے اپنی ذات کو بے مول ہونے نہیں دے سکتا تھا۔

"ہاں تم نفرت کے قابل نہیں ہو۔" اس نے تلخی سے کہا تھا۔ خیام کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ "تم محبت کے قابل ہو، تم سے محبت کی جا سکتی تھی۔۔ مگر میں نے۔۔ تم سے صرف نفرت کی ہے خیام حنفی! شدید نفرت!!" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے توڑ توڑ کر کہا گیا تھا۔ وہ لمحے میں اس کی ذات کو بے مول کر گئی تھی۔

"یہ مت کرو ازا۔۔ میں اتنا برا نہیں ہوں۔" ایک آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر گرا تھا۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس سے اس کا پسندیدہ شخص روٹھ گیا ہو۔

"تم بہت برے ہو خیام بہت برے! تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ تمہاری وجہ سے میں یہاں، اس موقع پر بالکل خالی ہاتھ کھڑی ہوں۔ میں اپنے بھائی کو موت کے منہ میں جاتا دیکھ رہی ہوں مگر وہ کام نہیں کر پا رہی جس میں اس کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ کاش تم ہماری زندگیوں میں نہ آتے خیام۔۔ کاش اس رات۔۔ میں تمہارے رونے کی آواز کو اپنے قہقہوں میں دبا دیتی۔" وہ سسک اٹھی تھی۔ آنسو تیزی سے رخسار بھگو رہے تھے۔

"میں سب ٹھیک کر دوں گا۔۔ میرا یقین کرو، میں اپنی لگائی آگ کو خود بجھاؤں گا۔" وہ بچہ اب خود سے روٹھے انسان کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ آنکھوں کے آگے آتی نمی کی دبیز تہہ بار بار ازا کا چہرہ دھندلا کر رہی تھیں۔

"میرا بچپن واپس لا سکتے ہو خیام؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں۔۔ میں ایسا وقت نہیں آنے دوں گا کہ تمہیں اپنا ماضی یاد آئے۔ تم بہت خوش رہو گی۔۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ ازا نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں دیکھتی ہوں تو وہ تاریک راتیں یاد آتی ہیں جو میں نے سمندر میں ان بحری قزاقوں کے ہمراہ گزاری تھیں۔" اس نے بہت آرام سے کہا تھا۔ آنکھوں میں پھگلتی نمی اب خشک ہو چکی تھی۔ وہ کم از کم خیام کے سامنے نہیں رو سکتی تھی۔۔ خیام جو اس کے الفاظ پر سُن ہی تو ہو گیا تھا۔

"ازا۔۔ تم۔۔"

”ہاں میں۔۔ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں واقعی پاکیزہ اور سچی نہیں ہوں۔ مجھے لگا مجھے کچھ یاد نہیں، میں کچھ نہیں جانتی مگر میں۔۔ سب جانتی تھی۔“ خیام کو یہ پوری چھت اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔ ”میں ہمیشہ پریشان رہی کہ۔۔ گھر کو جب آگ لگی تب مجھے بچانے والا ابراہم وارلڈ تھا تو پھر میرے ساتھ وہ سب کیوں ہوا؟ میں ابھی تک ابراہم وارلڈ کو اور دلال کو دو الگ انسان مانتی ہوں۔ کیونکہ خیام۔۔ ابراہم وارلڈ درندہ نہیں تھا۔ وہ پینٹنگ یاد ہے تمہیں؟ بابا کی پینٹنگ جس میں ایک جہاز ڈوب رہا ہے؟ وہ جہاز ابراہم وارلڈ کا تھا۔ ہم ایک بحری سفر پر نکلے تھے، ابراہم میرے گھر والوں سے مجھے ملوانا چاہتا تھا۔ اور اسی رات سمندر میں طوفان آیا تھا۔ تب اس ڈوبتے جہاز کو بچانے والا دلال تھا! اور پھر۔۔۔“ وہ آگے نہیں بول پائی۔ خیام سانس روکے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہیں غلط فہمی ہو سکتی ہے ازا۔۔ تم چھوٹی تھیں، تمہیں کیسے وہ سب یاد ہو سکتا ہے؟“ وہ اس کی بات کی نفی کر رہا تھا۔ اس کا دل یہ مان ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے ازا دلال کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی تھی! ازا نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر تیزی سے پلٹ گئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ تھوڑا آگے گئی جہاں کچھ دیر پہلے وہ کھڑی تھی۔ وہاں رکھا ایک بیگ اٹھایا اور پھر اسے لا کر خیام کے قدموں میں الٹ دیا۔ وہ سر جھکا کر اپنے قدموں میں بکھری چیزوں کو دیکھنے لگا۔ وہ کئی کاغذات تھے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے کلپ، پونیاں اور ہیئر بینڈ۔ وہ سامان کسی بچی کا تھا۔ ازا پنجوں کے بل نیچے بیٹھی۔ ان کاغذات کو اٹھایا پھر وہیں بیٹھے بیٹھے انہیں خیام کی طرف بڑھا دیا۔ خیام نے چپ چاپ اس کے ہاتھ سے وہ کاغذ تھام لیے۔

”میں ہمیشہ خوابوں میں ڈر جاتی تھی۔ اسکول لیول تک میرے ساتھ یہ مسئلہ رہا۔ میں اکیلی نہیں سو سکتی تھی۔ میں چیخیں مارنے لگتی، ان بحری قزاقوں کے قہقہے مجھے اپنے دماغ میں لگتے محسوس ہوتے تھے۔ کئی سالوں تک میرا علاج چلتا رہا تھا۔ یونیورسٹی لیول پر وہ خواب بند ہو گئے۔ مجھے ذہنی سکون ملا۔ میں ایک نارمل انسان کی زندگی جینے لگی۔ پھر

میں نے سب بھلا دیا۔ میں ان خوابوں کو بھول گئی کیونکہ دلال یہ چاہتا تھا! اس نے ہر وہ ثبوت ہی مٹا دیا جو مجھے میرا ماضی یاد دلائے!" اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ آواز رندھ گئی۔ اس نے سر جھکا کر آنسوؤں کو پینا چاہا مگر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ خیام نے ایک ایک کاغذ کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کی رپورٹس تھیں، ازا کی! وہ حیرت و بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔۔ وہ جان چکا تھا دلال کو Damnatio memorie کی اصطلاح کیوں پسند تھی؟ وہ ان معصوم لوگوں کے ذہنوں سے کیسے اپنا نام مٹا دیتا تھا جن کی زندگیوں کے ساتھ وہ کھیلتا آیا تھا!

"میں نہیں جانتی میں اس سب کا ذمہ دار کسے ٹھہراوں؟ کیا تمہیں؟ یا خود کو؟ میں نے دلال کی گرفت میں آتے ہی سمندر میں چھلانگ کیوں نہ ماردی؟! کم از کم میں اس سب سے نہ گزرتی! وہ چند دن جو میں نے ان بحری قزاقوں کے ساتھ سمندر میں گزارے میرے لیے عذاب کی مانند ہیں۔" وہ مٹھیاں بھینچے آہستہ سے انہیں فرش سے رگڑتی اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خیام نے ٹھہر کر آخری رپورٹ کو دیکھا۔ وہ بھی کسی سائیکاٹرسٹ کی بنائی ہوئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی پھر ازا کو دیکھا۔

"ازا۔۔ کیا تم دلال کے کردار کی گواہی دے سکتی ہو؟" وہ بہت سوچ سمجھ کر درست الفاظ کا انتخاب کر کے لایا تھا۔ ازا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس سے ایک قاتل اور درندے کے کردار کی گواہی مانگ رہا تھا۔ وہ اس سے اس کی پاکیزگی کا سوال کر رہا تھا۔

"وہ ایک درندہ ہے خیام۔۔ جسے ایک معصوم بچی بھا گئی تھی۔ اور وہ بچی اتنی بے بس ہے کہ آج اپنے ہی مجرم کے کردار کی گواہی دے رہی ہے!" کرب سے کہتی وہ سر جھکا گئی۔ خیام نے سکون کی سانس خارج کی تھی۔ کم از کم ازا کو بولتے ہوئے احتیاط کرنا چاہیے تھی۔ وہ اس کی جان ہی تو نکالنے لگی تھی!! وہ دھیرے سے ایک ٹانگ موڑ کر

دوسری کھڑی کر کے پنجوں کے بل نیچے بیٹھا۔ آرام سے درمیان میں گری چیزوں کو ایک طرف کیا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا۔

”کیا تم اس سب کے لیے مجھے ذمہ دار ٹھہرا سکتی ہو؟“ وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ وہ سر اٹھا کر کم فہمی سے اسے دیکھنے لگی جیسے اس کی بات نہیں سمجھ پائی ہو۔ ”مجھ پر غصہ کرنا، چلانا، بے انتہا نفرت کرنا۔۔ تمہاری تکلیف کم ہو جائے گی۔ زخم بھرنے لگیں گے۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

”تم مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو۔“ وہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ خیام نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”میں تمہاری نفرت برداشت کر لوں گا۔ بس مجھے ایک بار سب ٹھیک کرنے کا موقع دے دو۔۔“ وہ التجا کر رہا تھا۔

”تم ایک بار پھر صرف اپنا سوچ رہے ہو۔۔“ وہ تلخی سے مسکرائی۔

”تم واقعی جندل کو چاہتی ہو؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”اگر میں کہوں ہاں، تو؟“ وہ اس کا امتحان لے رہی تھی۔

”مگر وہ انکار کر چکا ہے۔۔“ وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔

”کیا تم بھی میرے انکار کے باوجود یہاں نہیں بیٹھے؟“

”ازا پلیز۔۔۔“ وہ بے بس ہوا۔ وہ باتوں میں ہرانا جانتی تھی۔

”اٹھ جاؤ خیام۔ ہر بار کہانیاں مکمل نہیں ہو جاتیں۔“ وہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔

”ہر بار ادھوراپن میرے حصے میں ہی کیوں؟“

”شکوہ کرو گے؟ ابھی سے؟“ دائیں ابرو اٹھائے پوچھا گیا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ملکہ تھی۔۔ وہ کیسے اس کے فیصلے پر اعتراض کر سکتا تھا۔

”کتنا انتظار کرنا ہے؟“ وہ اٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک ہونے تک!“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم مجھ سے نفرت کرتی رہو گی؟“

”ہاں، تم جان لو تم میری نفرت کے ہی قابل ہو!“ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ الفاظ ظالم نکلے۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر ہتھیلی سے اپنے رخسار رگڑتی آگے بڑھ گئی۔ وہ چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔۔ یہ دونوں بہن بھائی ہمیشہ سے ظالم تھے۔۔۔ اپنا فیصلہ سنا دیتے تھے۔۔ اور جاتے ہوئے معافی کی ہر امید قدموں تلے روند ڈالتے تھے۔

☆☆☆

”دلال کے خلاف جن ثبوتوں کو ہم ڈھونڈ رہے تھے وہ نہیں ملے۔ وہاں سب رکھا ہے، بحری جہاز، دلال کا خنجر۔۔اس کے ماضی سے جڑی ہر ایک چیز! مگر کوئی بھی چیز یہ ثابت نہیں کرتی کہ وہ دلال کی ہے۔یعنی ہم اب بھی خالی ہاتھ ہی ہیں۔“ خیام نے تفصیل بتا کر ایک نگاہ کعب پر اور دوسری مصعب پر ڈالی۔

”اگر ہم اسی طرح دلال کے خلاف ثبوتوں کی تلاش میں رہے تو وہ قاتل ہمیشہ آزاد رہے گا۔ میں بنا ثبوتوں کے اسے مارنے کی اجازت چاہتا ہوں! مجھے معلوم ہے یہ ناانصافی ہے مگر میرے پاس وہ ویڈیو اب بھی ہے جس میں ابراہم نے خود اپنے دلال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔“ مصعب نے کعب پر نگاہیں ٹکائے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ کر سر کو ہلکی سی جنبش دے گئے۔

”وہ ثبوت ناکافی ہیں مصعب! تم اس سے یہ ثابت کر سکتے ہو کہ ابراہم ہی دلال ہے مگر اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ دلال قاتل ہے“!

”ہم ہیں ناں یہ گواہی دینے کے لیے! اور کتنی زندگیاں برباد کرے گا وہ؟ آپ اسے یونہی آزاد نہیں رہنے دے سکتے سر!!“ وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

”مصعب! اگر تم اسی طرح اٹھ کر لوگوں کو مارنا شروع کر دو تو تم میں اور اس میں کیا فرق رہ جائے گا؟“ خیام نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اس فرق کو واضع کرنے کے چکر میں ہم مزید اور کتنے لوگوں کی جانیں گنوائیں گے؟“ اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

”میں جس کام سے آیا تھا وہ مکمل ہو چکا ہے۔ تم لوگ جلد یہاں کام وائنڈ اپ کرو۔ خبردار! دلال کے ساتھ دلال کے اصولوں کے مطابق مت لڑنا، تم منہ کی کھاؤ گے۔“ کعب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے انہیں نصیحت کی تھی۔ مصعب نے خفا نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

”اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟“ اس نے منہ بسورا تھا۔ اسے مصعب سے بدر بننے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”بچے مت بنو!“ کعب نے اسے گھوری سے نوازا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"میں نے افق کو بلایا ہے۔ وہ ازا کے ساتھ تھی، آرہی ہو گی۔" خیام نے اطلاع دی۔ انہیں افق کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحات میں وہ دروازے پر دی گئی دستک کا مثبت جواب ملنے پر اندر آرہی تھی۔

"آپ نے بلایا؟" وہ ایک اچٹتی نگاہ خیام اور بدر پر ڈال کر کعب کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں، میں جا رہا ہوں۔ تم یہیں رہو گی؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔ افق نے چور نگاہوں سے بدر کو دیکھا جس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں۔۔ میں تھوڑا گھومنا پھرنا چاہوں گی۔" وہ کھل کر مسکرائی۔

"ٹھیک۔ لیکن اس گھومنے پھرنے میں بدر تمہارے ساتھ نہیں ہو گا۔ وہ اپنی ٹریننگ مکمل کرنے سے پہلے اس عمارت سے ایک قدم باہر نہیں نکالے گا۔ خدا حافظ!" کعب نے حکم دیا تھا یا اطلاع وہ سمجھ نہیں پائی۔ ان دونوں کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ دھیرے سے سمٹ گئی۔ خیام کو اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ موڑنا پڑا تھا۔ کعب ایک سنجیدہ نگاہ افق پر ڈال کر آگے بڑھ چکے تھے۔ ان کے نکلتے ہی بدر نے جھلا کر زوردار لات میز پر ماری تھی۔ اور اگلے ہی پل اس کے پاؤں میں درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ وہ اپنا پاؤں پکڑ کر کراہا تھا۔

"یہ دادا اتنے کھڑوس کیوں ہیں آخر؟ میں بتا رہی ہوں میں باہر گھومنے جاؤں گی اور بدر کے ساتھ جاؤں گی!" وہ جھنجھلا کر اپنا فیصلہ سناتی دھم سے کرسی پر بیٹھی تھی۔ خیام نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر بدر کو۔ دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

"افق! بدر واقعی یہاں سے نہیں نکل سکتا۔" خیام نے نرمی سے کہا تھا۔

”لیکن اس کے استاد۔۔ زیاد تا شفین تو صبح جا رہے ہیں۔ پھر؟“ وہ بھنویں ملائے آنکھیں چھوٹی کیے پوچھ رہی تھی۔ بدر نے کن اکھیوں سے خیام کو دیکھا تھا۔

”پھر بدر میری شاگردی میں آئے گا!“ وہ مسکرایا۔۔ کھل کر۔ بدر کو اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگے تھے۔ وہ بلاوجہ نہیں مسکرا رہا تھا۔ وہ یقیناً ”بدر“ سے ”مصعب“ کا بدلہ لینے جا رہا تھا۔ بدر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی پر سر ٹکا دیا۔ خیام اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسکراتی نگاہ بدر پر ڈالی پھر افق پر۔۔

”چھپکلی!“ اس نے زیرِ لب کہا تھا۔ افق نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکراہٹ دباتا باہر نکل گیا۔ وہ حیرت سے یک ٹک اس کی پشت کو تکتی رہی پھر دروازہ بند ہونے پر بدر کی طرف مڑی۔

”تم نے انہیں بتایا ہے کہ میں چھپکلی سے چڑتی ہوں؟“ اس نے غصے سے بدر کو گھورا تھا۔

”نہیں۔۔ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔ تمہارے لیے جانے کتنی چھپکلیوں نے ان کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرمایا ہے۔“ وہ ناک سکیڑ کر چھت کو گھورتے ہوئے اونچی آواز میں بڑبڑایا تھا۔ افق کم فہمی سے اسے دیکھنے لگی۔ بدر ہنوز صدمے کے عالم میں چھت کو گھورتا رہا۔۔ اس کے ساتھ کچھ بھی اچھا ہونے نہیں جا رہا تھا۔ زیاد نے اگر دن میں تارے دکھائے تھے تو خیام رات میں سورج دکھانے جا رہا تھا۔۔ یقیناً یہی ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے زینے پر بیٹھی گہری سوچوں میں گم تھی۔ تاریک آسمان نے اس وسیع میدان پر اپنا سایہ کیا ہوا تھا۔ میدان کے ایک طرف کچھ فاصلے پر ہی زیاد اور سعاد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں سر اونچا کیے آسمان پر نجانے کیا ڈھونڈ رہے تھے۔ دوسری طرف خیام اور جندل واک کر رہے تھے۔ چلتے چلتے دونوں میں کوئی جھڑپ

ہو جاتی تو ایک دوسرے کو ایک دو مکے رسید کرنے میں انہیں دیر نہ لگتی۔ اس کے عقب میں راہداری تھی۔ خاموش اور ساکت سی راہداری۔۔ چند پل گزر گئے پھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کسی نے راہداری میں قدم رکھا۔ وہ سامنے نظریں ٹکائے سانس روکے ان قدموں کو گننے لگی۔ اسے یہ کام اچھا لگا تھا۔۔ مزہ آیا تھا۔ آنے والا جو بھی تھا اسے بس اچھا لگا تھا یوں قدم گننا۔۔ آٹھ نو۔۔ دس گیارہ۔۔ وہ رک گیا۔ اٹھتے قدم تھم گئے۔ وہ آرام سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ازا نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ وہ ضرار تھا، ضرار ولید !

ضرار کو وہ زیادہ نہیں جانتی تھی۔ مگر جب سے اس نے کمپنی سنبھالی تھی تو وہ مائک کے ساتھ آتا جاتا رہتا تھا۔ وہ ان سب میں شریف تھا۔ اچھا لڑکا! لیکن پھر اسے جندل یاد آ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اسے بھی کچھ اسی طرح کے القابات سے نوازتی تھی۔ ان دوستوں میں کوئی بھی شریف نہیں تھا۔۔ سب ایک سے بڑھ ایک خبیث تھے! اس نے سر جھٹکا پھر نگاہیں واپس سامنے مرکوز کیں۔ زیاد اور سعاد آسمان میں جانے کیا ڈھونڈنے کے بعد اب زمین پر نگاہیں گاڑے بیٹھے تھے۔ سعاد ہنستے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی جس پر زیاد نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"وہ دونوں ایک ساتھ اچھے لگتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ضرار نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا پھر سر کو جنبش دی۔

"جی بالکل۔۔ اور وہ دونوں بھی۔" ضرار کے خوشدلی سے کہنے پر ازا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے جندل اور خیام ایک دوسرے کے شانوں پر بازو پھیلائے اب آسمان پر بکھرے تارے گن رہے تھے۔ وہ بے اختیار کھکھلا کر ہنسی تھی۔ ضرار اسے ہنستا دیکھ کر سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔ اس کے کھکھلانے کی آواز ان دونوں کی سماعت سے ٹکرائی تو دونوں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگے۔

"بدر کے ساتھ بھی افق ہے۔ تمہیں نہیں لگتا تم اکیلے ہو گئے ہو ضرار؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں مجھے لگ رہا تھا پھر یہاں تمہیں دیکھ لیا۔ اب تسلی ہو گئی ہے کہ صرف میں اکیلا نہیں ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ازاہنس دی تھی۔ ہنستے ہوئے نگاہ سامنے اٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تینوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ اگلے لمحے میں جندل اور خیام نے فوراً اپنی نگاہوں کا رخ بدلا تھا۔ جندل دائیں طرف کھڑے بڑے درختوں کو دیکھ رہا تھا، درخت کچھ زیادہ ہی بڑے ہو گئے تھے۔ خیام بائیں طرف چھوٹے پودوں کو دیکھ رہا تھا جو رات کی تاریکی میں خاموش کھڑے تھے، پودے کچھ زیادہ ہی ہرے تھے۔ ازا کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ ضرار نے بغور ان رنگوں کو دیکھا پھر اس کی سمٹتی مسکراہٹ کو۔ اس نے جندل اور خیام کو دیکھا جو ابھی تک دائیں بائیں درختوں اور پودوں کو گھور رہے تھے۔ اسے ان تینوں کے لیے دکھ ہوا تھا مگر اس سلسلے میں وہ ان کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

"صبح زیادہ جا رہا ہے۔ تمہارے کیا ارادے ہیں؟" اس نے موضوع بدلنا چاہا۔

"یاد دلانے کے لیے شکریہ ضرار! مجھے کل کی ایک میٹنگ دیکھنی ہے۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل اب ہر شے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اس تاریک رات کی تاریکی سے اسے کوفت ہوئی تھی۔ ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی پھر پلٹ کر راہداری کی طرف بڑھ گئی۔ ضرار نے گہری سانس لی پھر جندل اور خیام کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں اب اپنی واک جاری کر چکے تھے۔ وہ ان دونوں کے پیچھے سے آیا تھا۔ دونوں کی گردنیں دبوچ کر ان کے سر ایک دوسرے کے سر میں دے مارے تھے۔ زوردار ٹکر ہوئی تھی۔ دونوں کو اپنے دماغ گھومتے محسوس ہوئے تھے۔

"خبیث انسان یہ کیا بے ہودگی ہے؟" جندل اپنا سر پکڑ کر چلایا تھا۔

”مانا کہ تم دونوں میں بہت محبت ہے مگر کیا لازمی ہے چیزوں کے بعد انسان بھی تم دونوں کو ایک ہی اچھا لگے ؟!“ وہ تپ کر پوچھ رہا تھا۔ زیاد اور سعاد بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور اب معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تم اس کا قصوروار مجھے۔۔۔۔“

”منہ بند کرو اپنا ورنہ رکھ کر ایک دوں گا کان کے نیچے۔“ اس نے خیام کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا تھا۔ وہ چپ چاپ معصومیت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”عجیب گدھے ہو۔ دنیا میں جتنی غلطیاں، جتنے گناہ ہوئے ہیں ناں تمہارے سر پر تھوپ دیتے ہیں، پھر خوش رہو گے تم!“ وہ سلگ اٹھا تھا۔

”اچھا بس اب اتنا غصہ مت۔۔“

”ایک لفظ اور کہا تو زبان کھینچ لوں گا تمہاری! خدا جانے کون سی محبت ہے تمہاری جو ہمیشہ اس کی طرفداری کرتے ہو؟ اگر شروع سے سیدھا کر کے رکھتے اسے تو یہ نوبت ہی نہ آتی!“ اس بار اس نے جندل کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”عجیب کوئی واحیات انسان ہو تم دونوں! گدھے ہو پورے گدھے۔ ایک دوسرے کی محبت میں کسی تیسرے کو پینا تم دونوں کو ہمیشہ سے پسند ہے!“ اس کا چہرہ غصے سے لال پڑ رہا تھا۔ سعاد حیرت سے اس کے غصے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلی بار ضرار کو ان دونوں کو ڈانٹتا دیکھ رہی تھی ورنہ وہ ان سب میں ٹھنڈے مزاج کا تھا۔

”تم لوگ مجھے بتاؤ گے یہاں لڑائی کس بات پر ہو رہی ہے؟“ زیاد نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

”بتاؤ اسے اب۔ ہڈیاں توڑ دے گا وہ تم دونوں کی!“ ضرار کے تنک کر کہنے پر وہ دونوں اپنے کان کھجاتے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ”جنگلی گدھے مل گئے ہیں مجھے۔ دل کر رہا ہے منہ توڑ دوں دونوں کا۔“ اس نے مکا بنا کر ہوا میں لہرایا۔

”بس ٹھیک ہے ناں اب۔۔ آؤ واک کرتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کھاؤ تھوڑا موڈ ٹھیک ہو گا۔“ خیام نے پیار سے اس کے شانے پر بازو پھیلایا۔

”تم دونوں کے ہوتے ہوئے کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا، کچھ بھی نہیں!“ اس نے افسوس سے کہا تھا۔

”بس کر دے بھائی زیاد کو بھنک بھی پڑ گئی ناں تو لاشیں گریں گی، لاشیں!“ جندل نے سرگوشی کی تھی۔ ضرار نے مڑ کر ایک نگاہ زیاد پر ڈالی جو بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے آنکھیں چھوٹی کیے مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

”عجیب گدھے ہو یار!“ وہ بڑبڑایا۔ جندل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اگلے لمحات میں ان دونوں کے ساتھ واک میں ضرار بھی شریک ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”ازا۔۔ آئی ایم سوری۔ مجھے غصے اور جذبات میں بھی وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ وہ اپنی غلطی کی معافی مانگ رہا تھا۔ سونے کی تیاری کرتی ازا اپنے عقب میں اس کی آواز سن کر ٹھٹھک کر رکی۔ مڑ کر اسے دیکھا جو جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے معذرت طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے رک کر گہری سانس لی پھر اسے بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ بیڈ کے کنارے پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے بال جوڑے میں باندھ کر اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"مجھے تھوڑا دکھ ہوا تھا مگر کوئی بات نہیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کمرے میں چند پل خاموشی چھائی رہی۔ ازا اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ وہ بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ کامیابی ملنے پر وہ بالآخر بول اٹھا تھا۔

"تمہیں ایک کہانی سناؤں؟" ازا نے چونک کر اسے دیکھا پھر ٹھہر کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"حضرت ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جانثار صحابی تھے۔ وہ غریب تھے مگر جس نے اللہ کی محبت جیسی دولت پالی ہو تو مزید کسی چیز کی چاہ نہیں رہتی۔ ان کی شجاعت اور بہادری کے قصے بہت مشہور تھے۔ وہ کمزور سے گھوڑے پر ننگی تلوار لے کر سادہ اور ہلکے کپڑوں میں جنگ کرتے تھے۔ اور مقابلے میں لوہے میں چھپے دشمن ہوتے تھے مگر مجال ہے کہ کبھی دشمن کے خوف کو خود پر حاوی ہونے دیا ہو۔ وہ اپنی بہادری سے دشمن پر دھاک بٹھا دیتے تھے۔ ان کی یہ جرات اور شجاعت ہی تھی کہ ہر میدان میں کامیاب ٹھہرتے۔

ایک بار حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو دشمن نے قید کر لیا۔ یہ خبر سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکلے۔ ابھی وہ دشمن کے لشکر کے پاس پہنچے ہی تھے کہ انہوں نے دیکھا دور سے ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ دھول کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ گھڑ سوار کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے، رفتار خاصی تیز ہے۔ وہ گھڑ سوار حضرت خالد بن ولید کے پاس پہنچ کر رکنے کے بجائے آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ جو شخص اس کی تلوار کے آگے آیا کٹتا چلا گیا۔ اس گھڑ سوار نے پل بھر میں اپنی تلوار سے دشمن کی صفوں کو چیر ڈالا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر حضرت خالد بن ولید بھی اپنے

ساتھیوں کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ وہ گھڑ سوار دشمن کے لشکر کے آخری سپاہی تک کے پاس گیا اور پھر واپس لوٹ آیا۔

جنگ کے اختتام پر حضرت خالد بن ولید نے اس گھڑ سوار کو بلایا۔ دیکھا کہ وہ چہرے پر نقاب لگائے ہوئے ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس پر اس نقاب پوش نے جواب دیا، میں ضرار کی بہن خولہ ہوں۔ اپنے بھائی کے قید ہونے کی خبر سن کر اس کی تلاش میں نکلی تھی۔ میں نے آخر تک دیکھ لیا ہے مگر میرا بھائی کہیں نہیں ہے۔ حضرت خالد حضرت خولہ کی بہادری پر حیران ہوئے۔ پھر جب حضرت ضرار کے مقام کی خبر ہوئی تو حضرت خولہ کے ہمراہ انہیں قید سے چھڑوانے کے لیے نکلے۔

یہ تھی ان بہن بھائیوں کی محبت! حضرت خولہ دشمن کی صفوں کو چیرتی جاتی تھیں اور یہ اشعار کہتی جاتی تھیں، این الضرار لا اراہ یومی

ولا یراہ معشری و قومی

ضرار کہاں ہیں میں آج انہیں نہیں دیکھتی ہوں اور نہ آج ان کو میرا خاندان اور قوم دیکھتی ہے۔

دوسری طرف حضرت ضرار دشمن کی قید میں اپنی بہن کو یاد کر کے یہ اشعار کہتے رہے تھے،

اے مُخبر میری قوم اور خولہ کو یہ خبر پہنچا دو کہ میں قیدی ہوں اور مشکوں میں بندھا ہوا ہوں۔ شام کے کافر و بے دین میرے گرد جمع ہیں اور تمام زرہ پہنے ہوئے ہیں۔ اے دل تو غم و حسرت کی وجہ سے مر جا اور اے جواں مردی کے آنسو میرے رخسار پر بہہ جا۔۔۔"

اس نے رک کر ازا کو دیکھا جو محویت سے اسے سن رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

”حضرت ضرار اور حضرت خولہ کی محبت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایسی بہنیں بہت کم ملتی ہیں۔ اب ایسے بہادر لوگ بھی کم ہی ملتے ہیں۔“ وہ دکھ سے کہہ رہا تھا۔

”اور۔۔ اور کچھ؟“ وہ مزید سننے کی خواہاں تھی۔ زیاد نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا پھر اس سے پوچھ بیٹھا۔

”تم نے یوم التعویر کے متعلق سنا ہے؟“ اس کے سوال پر وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ ”جنگ یرموک میں مسلمانوں کے لشکر کی تعداد کوئی چالیس ہزار سے ساٹھ ہزار کے درمیان تک تھی اور کفار کا لشکر لاکھوں کی تعداد میں تھا۔ یہ جنگ مسلمانوں اور رومیوں کے مابین ہوئی تھی۔ تب رومی ایک چال چلتے تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں ایک ساتھ ہزاروں تیر پھینکا کرتے تھے، تیروں کی اس بارش سے ہزاروں مسلمان زخمی ہوتے تھے۔ ایک دن۔۔ رومیوں نے یہی چال چلی۔ اشارہ ملنے پر ایک لاکھ کے لشکر نے ایک ساتھ بیک وقت مسلمانوں پر ایک لاکھ تیر چلا دیے۔ یہ تیر اتنی تعداد میں تھے کہ آسمان پر پوری آب و تاب سے چمکتا سورج بھی ان تیروں کے پیچھے چھپ گیا۔ مسلمانوں پر اولوں کی طرح تیروں کی بارش ہوتی رہی۔ اس دن سات سو مسلمانوں نے اپنی ایک ایک آنکھ اللہ کے راہ میں قربان کر دی۔ سات سو مسلمانوں کی ایک ایک آنکھ! اسی لیے اس دن کو یوم التعویر کہتے ہیں۔

تاریخ کے اوراق کھنگالو ناں از تو ایک سے بڑھ کر ایک عقل کو حیران کرنے والا قصہ ان پر درج ہے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ تو معجزات سے بھری پڑی ہے۔ مسلمانوں کی قربانیاں، ان کی شجاعت کے قصے۔۔ ان کی بہادری، ان کا عدل۔۔ سب کچھ حیران کر دیتا ہے۔ آج کے مسلمان تو اس دور کے مسلمانوں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ تب صدیق رضی اللہ عنہ جیسے دوست، فاروق رضی اللہ عنہ جیسے عادل، غنی رضی اللہ عنہ جیسے سخی اور حیا والے، علی رضی اللہ عنہ جیسے بہادر، شیر اور معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے اعلیٰ کردار کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ تبھی تو کہتے ہیں۔۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہمیں دیکھ لیں تو کہیں گے یہ کافر ہیں، منافق ہیں۔

اس وقت ہم جن کاموں کو جن گناہوں کو بہت چھوٹا سمجھ کر بار بار دہراتے رہتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کام کو کرنے کے خیال سے ہی پناہ مانگتے تھے۔ انہیں اپنے ایمان پر شک ہوتا تھا، روح کانپ اٹھتی تھی۔ وہ رجال تھے!! اور آج ہم قحط الرجال کا شکار ہیں۔" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے سر جھکایا تھا۔ ازا نے گہری سانس لی تھی۔

"آپ کو کبھی ڈر نہیں لگا بھائی؟ کبھی موت سے خائف نہیں ہوئے؟ خیام کے والد کو ان کے اپنے لوگوں نے جیل کی نذر کیا، جندل کے ماموں اپنے لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ کیا آپ کبھی اپنوں کے ہاتھوں مرنے سے ڈرے نہیں؟" وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ زیاد نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایک اللہ سے ڈرنے والے پھر کسی سے نہیں ڈرتے ازا! موت برحق ہے ہر حال میں آنی ہے اور پھر شہادت کی موت کی دعا تو ہمارے نبی نے بھی کی ہے۔ اور اپنوں نے غداری تو ہر دور میں کی ہے۔ اس سے اسامہ بن لا* دن، امیر المومنین عمر ثالث جیسے عظیم لوگ تک نہیں بچ سکے۔ امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ایک عظیم راہنما اور خطیب جنہیں برصغیر میں انگریزوں نے جیل میں بند کیا اور جب پاکستان میں آئے تو ختم نبوت کا نعرہ بلند کرنے پر اپنے ہی لوگوں نے جیل بھیج کر انگریزوں سے بدتر سلوک کیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد، تم نے ان کے بارے میں سنا ہے؟" وہ رک کر پوچھ رہا تھا۔ ازا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مولانا کہتے ہیں میں نے اپنی زندگی کے ہر ہفتے کا ساتواں دن جیل میں گزارا ہے۔ یعنی لوگ تفریح کے لیے تفریحی مقامات پر جاتے تھے اور مولانا جیل میں۔" وہ بات مکمل کر کے ہلکا سا مسکرایا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک ابھری۔

"ازا، وقت ملے تو مولانا ابو الکلام آزاد کو ضرور پڑھنا۔ یقین مانو یہ عظیم راہنما مجھے عرصے سے اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑے ہوئے ہے۔ میں ان کا نام سنوں تو عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ وہ ایک وسیع آسمان تھا جس کی

وسعتوں میں برصغیر سمایا تھا، اور ایک گہرا سمندر جس کی گہرائی میں گرو تو جانو وہ کیسا عظیم راہبر تھا۔" بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کچھ یاد آنے پر کرب ابھرا۔ "ہر وہ شخص جو انقلاب لانے کی کوشش کرتا ہے اس کی شخصیت کو متنازعہ کر دیا جاتا ہے۔ مولانا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔۔۔ تم انہیں ضرور پڑھنا ازا!! تم زمین کے حوصلے پر حیرت کا اظہار کرو گی کہ اس نے کیسے کیسے آسمانوں کو خود میں سمویا ہوا ہے۔" وہ دھیرے سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا گیا۔ ازا نے ہلکا سا مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ کتابیں پڑھتی تھی اور اب فرصت ملتے ہی زیاد کی بتائی گئی کتابیں پڑھنے کا خیال رکھتی تھی۔

"اور کچھ پوچھنا ہے؟" اس کے سوال پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ پل گزرے پھر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آپ کو دکھ نہیں ہوتا یہ سوچ کر کہ بابا آپ کو تنہا کر کے پوری زندگی موت سے بھاگتے رہے؟" اس کے سوال پر زیاد کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"تم سے کس نے کہا یہ؟"

"ان کی زندگی سے یہی تاثر ملتا ہے۔" اس نے کندھے اچکا دیے۔

"ازا۔۔ بابا موت سے نہیں بھاگ رہے تھے۔ بابا مجاہد تھے اور مجاہد کبھی موت کے خوف میں مبتلا نہیں ہوتا۔ بابا صرف اس لیے روپوش ہوئے تھے کیونکہ دلال مسلسل ان کے تعاقب میں تھا۔ عالیان، دحیہ اور سنان کے بعد کوئی اس سے بچ کر نکلا تھا تو وہ بابا تھے۔ اور اگر بابا روپوش نہ ہوتے، ہمیں اپنے ساتھ رکھتے تو دلال با آسانی ہم تک پہنچ جاتا۔ اور اس کے بعد ہم یہاں نہیں ہوتے۔ ہمارے ساتھ وہی ہوتا جو وہ بہت پہلے کرنا چاہتا تھا۔ بابا نے اپنی

اولاد کی خاطر۔۔۔ حزب اللہ کی خاطر گمنامی کی زندگی گزاری تھی۔۔" وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ازا نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"صبح میں چلا جاؤں گا۔ تمہیں کوئی بھی کام ہو سعاد سے رابطہ کرنا!" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے تاکید کی گئی۔ وہ مسکرا کر سر اثبات میں ہلا گئی۔ زیاد نے الوداعی نگاہ اس پر ڈالی پھر آگے بڑھ گیا۔

"بھائی۔۔" وہ دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ازا نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر ازا کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "بھائی۔۔ آپ جلد لوٹیں گے ناں؟ یقین مانیں اس دنیا میں آپ کے سوا میرے پاس کوئی نہیں۔" اس نے مدھم سا مسکراتے ہوئے اداسی سے کہا تھا۔ زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر سر کو ہلکی سی جنبش دے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ دوسری طرف ازا نڈھال سی ہو کر بیڈ پر گر گئی تھی۔ اسے یہ سب ایک برا خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔۔

کل ہی تو اسے اپنا بھائی، اپنا محافظ ملا تھا۔۔۔ وہ ابھی بھائی کی محبت کو، اس کے فراہم کردہ تحفظ کو محسوس بھی نہیں کر پائی تھی کہ وہ جا رہا تھا۔۔ جانے دوبارہ کب ان کی ملاقات تقدیر میں لکھی تھی۔ لکھی بھی تھی کہ نہیں۔۔؟!

☆☆☆

اگلے دن اسے جانا تھا۔ وہ رات اسے تاکید کر کے سویا تھا کہ صبح اسے جلدی جگا دے۔ فجر کی نماز دونوں نے ساتھ پڑھی تھی۔ نماز کے بعد وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ اس کے کام نپٹانے کے لیے اٹھنے لگی تھی جب وہ اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا چکا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ تلاوت کرتا رہا تھا۔ وہ مسحور سی اسے سنتی رہی تھی۔ وہ تلاوت

بہت اچھی کرتا تھا، اسے آج اندازہ ہوا تھا۔ تلاوت کے بعد وہ دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جبکہ وہ اس کا بیگ بنانے لگی۔

ٹھیک نو بجے وہ کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی۔ وہ صوفے پر لیٹا گہری نیند میں تھا۔ آنکھوں پر حسبِ عادت دایاں بازو ٹکا رکھا تھا۔ وہ آرام سے اس کی چھوڑی گئی تھوڑی سی جگہ پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو اس کی آنکھوں سے ہٹایا۔ سیاہ بال ماتھے پر بکھر گئے۔ اس نے آرام سے اس کی پیشانی کو چھوتے بال ہٹائے۔

"زیاد۔۔ اٹھو۔۔" جانے کیوں اسے اپنی آواز بھاری ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ آرام سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ زیاد ہلکا سا کسمسایا۔ "سینیور۔۔ اٹھ جائیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کی ناک دبائی تھی۔ سانس نہ آنے پر اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ اسے اپنے پہلو میں بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھہر گیا۔

"وقت ہو گیا؟"

"ہاں۔۔ سامان تیار کر دیا ہے میں نے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ بیٹھا۔

اگلے لمحات میں وہ مکمل تیار قد آور شیشے کے سامنے کھڑا تھا۔ عقب میں سعاد اس کی جیکٹ پکڑے کھڑی تھی۔ ساتھ ہی اس کی پی کیپ بھی تھام رکھی تھی۔ غمزدہ سی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے الوداع کرنا مشکل تھا۔۔ بہت مشکل۔۔ اسے لگ رہا تھا وہ رو دے گی۔ یہیں پھٹ پڑے گی۔

وہ اپنے بال بنا کر پلٹا۔ ہلکا سا مسکرا کر اسے دیکھا پھر جیکٹ کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ سعاد نے جیکٹ اسے پکڑا دی۔ وہ جیکٹ پہن کر ہٹا تو وہ جو اسے پی کیپ پکڑانے لگی تھی، وہ اس کے سامنے اپنا سر جھکا چکا تھا۔ سعاد ہلکا سا مسکرائی پھر پی کیپ اس کے سر پر ٹکائی۔

"بہت شکریہ سینیورا۔" اس نے خوشدلی سے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا۔۔ بہت سارا۔ جلدی آنا، رابطے میں رہنا۔ میں انتظار کروں گی۔" اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

"خود کو تنہا مت سمجھنا۔ تمہیں اللہ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔۔ میرے لیے دعا کرنا، تمہاری دعاؤں کی بہت ضرورت ہو گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔ بالکل ہلکا سا مسکراتے ہوئے۔۔ ذرا سا۔۔ اپنے ازلی انداز میں۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ چند پل خاموشی کی نذر ہوئے۔ چند پل آنکھیں بولتی رہیں۔ دھڑکنوں کا شور سنا گیا۔ کچھ سوچ کر زیاد دھیرے سے آگے بڑھا۔ آرام سے اس کے گرد بازو حمائل کر کے اسے خود سے لگایا تھا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھتی آنکھیں میچ گئی۔

"آئی ایم سوری۔۔ سوری فار ایوری تھنگ۔ مجھے تم سے لڑنا نہیں چاہیے تھا۔۔ تم پر غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔ تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔" وہ سسک اٹھی تھی۔

"اونہوں۔۔ تم لڑتے ہوئے، غصہ کرتے ہوئے اچھی لگتی ہو، میری پٹھانی! واپس آؤں گا تو ہم بہت سارا لڑیں گے۔" وہ اس کے گرد حصار مضبوط کرتا مسکرایا تھا۔ وہ چندپل کچھ بول نہیں پائی تھی۔ کچھ لوگوں کو اتنا اچھا نہیں ہونا چاہیے۔۔ خصوصاجب کچھ لوگوں سے مراد "زیاد" ہو۔ اس کے معاملے میں اسے اتنا نرم نہیں ہونا چاہیے۔۔ وہ اسے اچھا لگنے لگتا تھا۔

"Out beyond the ideas
of wrongdoing and rightdoing
there is a field

I will meet you there.."

اس کے کان میں مبہم سی سرگوشی ہوئی تھی۔ وہ سُن کھڑی رہی۔

"آئی ہیٹ یو، زیاد!!" دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک گیے۔

"آئی لو یو ٹو۔۔" مسکراتے ہوئے کہا گیا۔ دھیرے سے اس کے بالوں پر اپنے لب رکھ دیے۔ وہ چپ چاپ اس کی دھڑکنوں کا شور سنتی رہی۔ وہ اسے خود سے لگائے کھڑا رہا۔ کئی پل گزر گئے۔ وقت گزرنے کے احساس نے طلسم توڑا۔ وہ اس کے حصار سے نکل کر اسے دیکھنے لگی۔

"دیر ہو جائے گی۔ اب جاؤ۔" عجلت میں کہا گیا۔ زیاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر اس کا رخسار آہستہ سے سہلایا۔

"اللہ حافظ۔۔ جانِ من!" اس کے طرز تخاطب پر سعاد کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ وہ اس کے دہکتے رخسار دیکھ کر مسکرا دیا۔

"بس جانے سے پہلے یہی دیکھنا چاہتا تھا میں۔" وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ سعاد اسے گھور کر رہ گئی۔

"بہت برے ہو تم"!

"بہت اچھی ہو تم!" وہ ہلکا سا ہنسا۔ سعاد نے بغور ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی کو دیکھا۔ زیاد نے نظریں جھکائی تھیں۔ وہ اسے اپنی آنکھوں میں تیرتے آنسو نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ سعاد نے آرام سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے یونہی نظریں جھکائے اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنے انگوٹھے سے سہلانے لگا۔ اسی وقت ایک آنسو اس کی آنکھ سے گرا۔ وہ شاید اسی کی منتظر تھی، آرام سے رخسار پر لڑھکتے نمکین پانی کے اسے چھوٹے سے قطرے کو انگشت شہادت کے پور پر چن لیا تھا۔

”ایک بات یاد رکھنا زیاد۔۔ کوئی ہے جو تمہاری واپسی کا منتظر ہے۔ اگر تم نہ آئے تو یہ انتظار تمہارے مقدر میں لکھ دیا جائے گا۔“ وہ آرام سے اس کا گال سہلا رہی تھی۔۔ بالکل اسی کے انداز میں۔۔ اسے اندازہ تھا اس کی اس حرکت سے وہ خود کتنا پر سکون ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اس کی بات سمجھ گیا۔ سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ سعاد نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ”اللہ کی امان میں۔۔ سکون میرے!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ زیاد اس کے طرز تخاطب پر ہلکا سا مسکرایا۔ ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی پھر اپنا بیگ اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اس کے احساس میں گھری وہیں کھڑی رہی۔ وہ دروازے کے پاس جا کر رکا۔ پلٹ کر اسے دیکھنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ وہ نہیں پلٹ سکا۔ اندازہ تھا کہ ایک بار پلٹ کر دیکھنے والا وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ ہوش میں آئی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

خیام فائل کے اوراق پلٹتا ازا کی آفس کی طرف جا رہا تھا جب اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے پینٹ کی جیب میں رکھا موبائل نکالا پھر نمبر دیکھے بنا کال اٹھا کر موبائل کان سے لگایا۔ نظریں ہنوز فائل پر ٹکی تھیں۔

”آپ زیاد سے ملے؟“ سعاد کی نم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے اٹھتے قدم بے اختیار تھم گئے۔ اسے معلوم تھا وہ آج چلا جائے گا اور اب تک تو جا بھی چکا ہو گا مگر باوجود اس کے وہ اس سے ملنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ اور اب سعاد کے سوال پر اس کے پاس سوائے خاموشی کے کچھ نہیں تھا۔

”خدا کا واسطہ ہے خیام! وہ دوست ہے آپ کا۔ کم از کم اس وقت تو ایسے نہ کریں۔ وہ جا رہا ہے آپ اسے ایسے ہی نہیں بھیج سکتے۔ وہ دوست ہے آپ کا!!“ وہ سسک اٹھی تھی۔

"وہ مجھے معاف بھی تو نہیں کر رہا۔۔" خیام کی آواز بہت دھیمی تھی۔ وہ بمشکل سن پائی۔

"آپ نے معافی مانگی؟ وہ معاف نہیں کر رہا تو معافی تو آپ بھی نہیں مانگ رہے ناں! اس کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے، وہ معاف نہیں کر رہا تو نہ کرے۔ آپ تو اپنے حصے کا کام کریں۔ میرا یقین کریں خیام۔۔ کل رات۔۔ اس نے مجھ سے اگر کسی کے بارے میں بات کی ہے تو وہ بس اس کے دوست تھے! آپ۔۔ جندل اور ضرار۔۔" اس کی آواز کانپ گئی۔ وہ مزید بولنے کی ہمت نہ کر پائی تبھی کال کاٹ دی۔ خیام نے یک ٹک موبائل کی تاریک اسکرین کو دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے زیاد کا چہرہ لہرا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں وہ فائل وہیں پھینکتا تیزی سے واپسی کے راستے پر بھاگ رہا تھا۔

تیز رفتار، ماتھے پر بکھرے بال، سست پڑتی دھڑکنیں اور آنکھوں میں پھگلتی نمی۔۔ وہ بھاگتا ہوا پارکنگ ایریا میں آیا تھا۔ عجلت میں گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ صرف کچھ لمحات اور پھر اس کی گاڑی پوری رفتار سے کشادہ اور ہموار سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

"میرا نام زیاد تاشفین ہے۔ میں یہاں کل ہی آیا ہوں۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ یہ میرا بستر ہے!" اسے یاد آیا تھا ان کا پہلا جھگڑا بستر پر ہوا تھا۔ وہ بستر ان دونوں میں سے کسی کو نہیں ملا، دونوں نے پوری رات ٹھنڈ میں اونچے پہاڑ پر گزاری تھی۔ دونوں کو یقین تھا وہ ان کی آخری رات تھی۔

وہ ٹریفک کے اشارے پر رکا تھا۔ اس کے آس پاس پیچھے اور آگے کئی گاڑیاں اس کی طرح انتظار کی صف میں کھڑی تھیں۔ وہ آنکھوں میں پھگلتی نمی کو پیچھے دھکیلتا اپنی مکمل توجہ سڑک پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ اس کے کان کی لو سرخ پڑنے لگی تھی۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا زیاد! اگر تم نیچے نہ آئے تو یہاں سے تمہاری لاش سیدھا مراکش جائے گی!“ وہ سر اونچا کیے چھت پر کھڑے زیاد کو دیکھ کر چیختا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی گلابی کلپ تھا جسے وہ ہر پل ہر لمحہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جو بعد میں الزرقاوی سر نے اس سے لے لیا تھا۔ اسے یاد تھا اس نے پہلی بار اس کلپ کی وجہ سے زیاد کو پیٹا تھا۔ وہ رات خیام نے زیاد کی سسکیاں سنتے گزاری تھی جو جندل کے کندھے پر سر ٹکائے اپنا ایک ایک زخم اسے دکھا رہا تھا۔

اشارہ کھل گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھ گئیں۔ اس کی گاڑی بھی پوری رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ دو آنسو چپکے سے اس کے رخساروں پر لڑھک گئے۔ اس نے زکام زدہ سی سانس لے کر اپنی آنکھوں میں امڈتی نمی کو پیچھے دھکیلنا چاہا تھا۔

”میں نے تم سا خبیث دوست آج تک نہیں دیکھا۔ میں کہہ رہا ہوں ایک بار میں اٹھنے کے قابل ہو گیا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا!!“ اونچائی سے گرنے کے بعد اپنا پاؤں تڑوا کر بیٹھا زیاد خود پر ہنستے خیام کو دیکھ کر حلق کے بل چلایا تھا۔ اس نے اپنے قول کے مطابق عمل کیا تھا۔ وہ خود بستر سے اٹھا تو خیام کو اگلے دو ہفتوں تک کروٹ بدلنے تک کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

اس نے گاڑی ایئرپورٹ کے باہر روکی۔ پی کیپ اٹھا کر سر پر ٹکا کر وہ جلدی سے گاڑی سے نکلا۔ ایئرپورٹ پر فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو کر اندر کی طرف بھاگا تھا۔ دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اسے کوئی غرض نہیں تھی وہاں کتنے لوگ اس کے یوں اندھا دھند بھاگنے پر پلٹ پلٹ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ جانے کتنوں سے وہ ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

”اللہ جی بس ایک بار۔۔ اگر میری قسمت میں کوئی معجزہ ہے تو کر دیں۔۔ بس ایک بار مجھے اس سے معافی مانگنے دیں۔ زیاد کو روک لیں اللہ!“ اس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔ اس نے زیاد کو دیکھ لیا۔ وہ جندل سے گلے مل رہا تھا، ضرار کی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ خیام نے سانس روکے پلک جھپکی تھی۔

”قاتل ہو تم قاتل! نفرت ہے مجھے تم سے خیام حنفی شدید نفرت!!“ اس کے قدم اٹھے تھے۔ زیاد فاصلے پر کھڑا تھا، وہ یہ فاصلہ گھٹا رہا تھا۔ ”اپنی شکل مت دکھانا مجھے۔ ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا!“ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا۔

”زیاد۔۔“ وہ اسے پکار بیٹھا۔ اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالتا زیاد رک گیا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ پلٹ کر اس نے اپنی طرف آتے خیام کو دیکھا۔ ہاں، وہی تھا جس نے اسے پکارا تھا۔ جندل نے باری باری ان دونوں کو دیکھا پھر آرام سے زیاد کا بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”ہر بار تم ہی کیوں خیام حنفی؟! میرا گھر جلے، میرا خاندان اجڑے، میرا باپ مرے۔۔ تم ہر بار کیوں موجود ہوتے ہو خیام؟ تم ہی کیوں؟“ خیام کی گردن کے گرد اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ سانسیں تھمنے لگی تھیں۔

ایک۔۔ دو اور پھر تیسرا قدم۔۔ وہ اس کے شانے ہر بازو پھیلاتا اس کے گلے لگ چکا تھا۔ آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہنے لگے تھے۔

”مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں اپنے دوست کو نہیں کھو سکتا۔“ وہ سسک اٹھا تھا۔ زیاد کے ہاتھ پہلو میں گرے رہے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا سانس روکے بنا پلک جھپکے سامنے تکتا رہا۔ آنکھوں میں نمی چمکی۔ ”میری غلطی ہے۔۔ میرا

گناہ ہے۔۔ میں معافی مانگ رہا ہوں۔۔۔ مجھ سے نفرت مت کرنا زیاد۔۔!" اس کی نم بھاری آواز زیاد کی سماعت سے ٹکرا کر اسے توڑ رہی تھی۔ آنکھوں نے دغا کی، پلکوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا۔ ہاتھ بے اختیار ہوئے، پہلو میں گرے ہاتھ اس کی پشت پر رکھے۔ اگلے لمحے میں وہ بول اٹھا تھا۔ "بہت بڑے خبیث ہو تم سچ میں! جندل کو کہتے ہو عورتوں کی طرح روتا ہے، یقین کرو تمہاری یہ حرکت بھی مردوں والی نہیں ہے۔" ہنس کر کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے کئی آنسو گرتے چلے گئے تھے۔ خیام کو اپنی رگ وپے میں سکون اترتا محسوس ہوا تھا۔

"سوچ رہا ہوں تمہاری شکایت لگا دوں مگر کیا کروں دوست ہو، تمہیں مشکل میں دیکھا نہیں جاتا۔" سیب کو دانتوں سے کاٹتا زیاد افسوس سے کہہ رہا تھا۔ مجرموں کی طرح سر جھکا کر بیٹھا خیام بس اسے گھور کر رہ گیا۔

"تم جتنے بڑے کمینے ہو ناں وہ بس میں جانتا ہوں۔ خدا کی پناہ، اس شریف شکل کے پیچھے کتنا بڑا گدھا چھپا ہے!!" کالج کی دیوار پھلانگتا خیام اپنے پیچھے کھڑے زیاد کو گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جواباً زیاد نے معصومیت سے اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے سیڑھی کھینچ لی۔ اگلے پل میں خیام آرام سے نیچے آ رہا تھا۔۔ بہت آرام سے!

وہ خود پر ضبط کر کے خیام کی پشت تھپک کر پیچھے ہٹا۔ جندل نے مامتا بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا جو اپنی اپنی آستینوں سے اپنی آنکھیں رگڑ رہے تھے۔ ضرار اپنے دونوں ہاتھ اپنے گالوں پر رکھے نم آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھی وہ ابھی دونوں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا۔ گدھوں نے اسے رلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"میرے لیے دعا کرنا۔" وہ زکام زدہ سی سانس لے کر ہلکا سا مسکرایا۔ خیام نے لب دانتوں میں دبا کر سر کو جنبش دی۔ "سعاد کے ساتھ زیادہ سختی مت کرنا۔ بدر کے لیے ایک اچھے استاد ثابت ہونا اور ہاں افق، اسے حقیقت بتا دینا۔ سعاد کہتی ہے بھائی اگر ہمت کر لیں تو بہنیں سب بھلا کر انہیں خوش آمدید کہتی ہیں۔" وہ اس کے شانے پر

ہاتھ رکھے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ خیام چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس تمام عرصے میں بھی اس سے انجان نہیں رہا تھا۔ وہ واقف تھا، وہ کس درد سے گزر رہا ہے، وہ کیسا محسوس کر رہا ہے، اسے سب خبر تھی۔ شاید تبھی وہ ایک اچھا دوست تھا۔

"اور تم۔۔ تم نے معاف کر دیا ناں؟" وہ تسلی کرنا چاہتا تھا۔ زیاد نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"میں ازا کے معاملے میں تم پر شاید کبھی بھروسہ نہ کر پاؤں مگر ہاں۔۔ میں نے اپنی ہر تکلیف بھلا کر تمہیں معاف کر دیا۔ کیونکہ خیام۔۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ غم اور تکلیف، یہ میری زندگی کے بہترین ساتھی ہیں۔ یقین مانو اگر میں پچھلی تکالیف اور غموں کو ساتھ لیے پھروں گا تو آنے والے وقت میں یہ ساتھی میری جان لے لیں گے۔"

اس نے بے اختیار نظروں کا رخ بدلا تھا۔ فرش پر نگاہیں ٹکائے اس نے دھیرے سے اس کا شانہ دباتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"سنو میری بات! ہم نے ایک ہی میدان میں ایک ہی جنگ میں ایک ساتھ شہید ہونے کا وعدہ کیا ہے۔ میں تمہیں وعدہ خلافی نہیں کرنے دوں گا! زیاد تاشفین جیسے فرزندِ اسلام پر اسپتاپ کے بستر پر موت بالکل نہیں جچتی!" اس نے مکمل یقین سے کہا تھا۔ زیاد اس کی بات پر اداسی سے ہلکا سا مسکرا دیا۔۔ ذرا سا۔۔ اپنے ازلی انداز میں۔

"زیاد۔۔ وقت ہو گیا ہے۔" ضرار نے اسے فلائیٹ کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے سر کو جنبش دی۔ جندل نے اس کا بیگ اسے پکڑا دیا۔ اس نے ایک آخری نگاہ ان تینوں پر ڈالی۔ ان تینوں کی نگاہوں میں بہت کچھ تھا۔

ایک دوست کی محبت، دوست کو کھونے کا خوف۔۔ جدائی کا غم اور۔۔ انتظار۔۔ بے پناہ انتظار!

وہ الٹے قدم اٹھاتا پیچھے ہٹنے لگا۔ بہت ہمت جمع کر کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھالا۔ آنکھوں میں جمع ہوتی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ہاتھ بلند کیا۔

"فی امان اللہ دوستوں۔۔ مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔" اس نے ہاتھ لہرایا اور پھر پلٹ گیا۔ پلٹتے ہی اس کے رخسار پر ایک آنسو لڑھک گیا۔ اس نے لب دانتوں میں دباتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو اندر اتارا تھا۔ وہ تینوں اس کی پشت کو تکتے ساکت کھڑے تھے۔ جندل نے آرام سے خیام اور ضرار کے شانوں پر اپنے بازو پھیلائے تھے۔ ایک بات توطے تھی۔۔ وہ تینوں اپنے اس دوست کا بہت انتظار کرنے والے تھے۔۔ بہت زیادہ!

"ایک بات یاد رکھنا زیاد۔۔ کوئی ہے جو تمہاری واپسی کا منتظر ہے۔ اگر تم نہ آئے تو یہ انتظار تمہارے مقدر میں لکھ دیا جائے گا۔"

"میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گی بھائی! اگر کوئی خدا واقعی موجود ہے تو مجھے امید ہے وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ آپ ضرور لوٹیں گے، مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔"

"فی امان اللہ دوستوں۔۔ مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔"

مل نہ پائے گر اس جہان میں

مل ہی جائیں گے آسمان میں

عرش کے تلے سائبان میں

راہ وہ رہے بس دھیان میں

جس کے موڑ پر جنتِ بریں

سربلند ہوں دوستانِ دین!

☆☆☆

سعاد جائے نماز پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ خود کو فیروزی رنگ کی بڑی سی چادر میں چھپائے وہ یک ٹک اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ چہرہ مسلسل ضبط کی وجہ سے لال ہو رہا تھا۔ ناک اور گال ایکدم سرخ پڑ چکے تھے۔ آنکھوں میں الگ کہرام مچا تھا۔ نگاہوں کے سامنے بار بار ایک ہی چہرہ لہرا رہا تھا۔ اور پھر اس نے کیسے سوچ لیا تھا کہ اپنی زندگی کو الوداع کرنا آسان ہوتا ہے؟ اس نے ہزاروں بار خود جندل کو پستول تھما کر اسے اللہ کی راہ میں بھیجا تھا۔ مگر آج جندل نہیں زیاد تھا۔ اگر وہ کسی مشن پر جاتا تو اسے شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی یہ سوچ کر ہو رہی تھی کہ۔۔ اسپتال کے بستر پر اسے ایک ساتھی کی ضرورت ہوگی۔ یہ سچ تھا۔۔ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔۔

”سنو سعاد! تم محبت ہو میری اور جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں؟ محبت ایک چھوٹی سی خواہش ہوتی ہے اپنے ہمسفر کو صرف اس جہان میں نہیں اگلے جہان میں بھی اپنے ساتھ دیکھنے کی۔۔ بس اتنی سی ہے میری محبت! میں تمہارا ساتھ دونوں جہانوں میں چاہتا ہوں۔“ اس کی نرم دھیمی آواز سعاد کی سماعت سے ٹکرائی۔ ضبط کا بندھن ٹوٹا اور دو آنسو رخسار پر لڑھک گئے۔

”میری ایک معصوم سی خواہش ہے سعاد۔۔ مجھے اپنے بچوں کی ماں کے ساتھ اندلس دیکھنا ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ مسجدِ قرطبہ میں ایک نماز ادا کرنی ہے۔۔ مجھے الحمراء میں بارہ شیروں کے صحن میں تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ دعا کرو تمہارے معصوم شوہر کی یہ معصوم سی خواہش پوری ہو جائے۔“ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکائے معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ جواباً سعاد نے پاس رکھا کشن اٹھا کر اسے کے منہ پر دے مارا تھا۔

وہ دھیرے سے سجدے میں چلی گئی تھی۔ آنسو زاروقطار آنکھوں سے بہنے لگے تھے وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی تھی۔

”اللہ! جب آپ نے زیاد کو میرا ہمسفر بنایا تب مجھے یقین ہو گیا تھا آپ نے مجھے میری خطاؤں کے لیے معاف کر دیا ہے۔ میں جانتی ہوں میں نے آپ کے اس بندے کو بہت تکلیف پہنچائی ہے، میری وجہ سے وہ بہت سی اذیتوں سے گزرا ہے۔ وہ آپ کو بہت محبوب ہے شاید تبھی آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اللہ، میرے گناہوں کی سزا اسے مت دیں۔ مجھے میرے صبر سے زیادہ مت آزمائیں۔ میں بہت کمزور ہوں اللہ! میرے قدم ڈگمگا جائیں گے، مجھے تھام لیں۔ مجھے اس امتحان سے مت گزاریں۔ کوئی وسیلہ بنا دیں آپ تو سب کر سکتے ہیں ناں۔ آپ بس زیاد کو ٹھیک کر دیں۔ اسے تکلیف میں مت مبتلا کریں اللہ! میں مر جاؤں گی۔۔“ وہ سسک اٹھی تھی۔ زاروقطار آنسو بہاتی وہ ہچکیوں سے رو دی تھی۔

”آپ کا محبوب بندہ مجھے اپنی محبت کا اسیر کر چکا ہے۔ مجھ میں اسے کھونے کی ہمت نہیں ہے۔ ہمارا ساتھ اتنا مختصر مت کریں، زیاد کو اپنی امان میں لے لیں اللہ! آپ جانتے ہیں ناں میں نے ہمارے درمیان اس رشتے کے قائم ہونے سے پہلے کبھی اسے اپنی دعاؤں میں نہیں مانگا۔ آپ جانتے ہیں ناں میں نے اپنی زندگی کے ان دو سالوں کی ہر تاریک رات میں آپ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ میں نے اسے کبھی اپنی دعاؤں کا حصہ نہیں بنایا کیونکہ مجھے آپ سے حیا آتی تھی۔ آپ کی نافرمانی کے بعد ایک نامحرم کے لیے دعا کیسے کرتی؟! اللہ! اب وہ میرا شوہر ہے۔ آپ میرے دل کے حال سے واقف تھے، آپ نے اسے میرا ہمسفر بنا دیا۔ اللہ! وہ میرا لباس ہے، میرا محافظ ہے۔ اسے مجھ سے جدا مت کریں۔ مجھے اس بھری دنیا میں تنہا مت کریں۔ مجھ سے میری زندگی مت چھینیں اللہ۔۔ مجھ سے میرا زیاد مت چھینیں۔۔

وہ اچھا ہے، آپ کو محبوب ہے، آپ کی راہ میں ہر بار جان دینے کو تیار ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں آپ کی گناہگار بندی، آپ سے آپ کے محبوب بندے کو مانگ رہی ہوں۔ مجھے مایوس مت کریں اللہ! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔ اس کے معاملے میں مَیں بہت کمزور ہوں۔ میری دعا سن لیں اللہ"!

اس کی سسکیاں کمرے میں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ اپنے رب سے گڑگڑا کر مانگتی وہ لڑکی بہت تکلیف میں تھی۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے اور دل تھا کہ بس ابھی دھڑکنا بھول جائے گا۔ وہ زیاد کے معاملے میں واقعی بہت کمزور ثابت ہوئی تھی۔

"اور اگر میں چلا گیا تو؟"

"میں مر جاؤں گی۔"

"اتنی کمزور ہو؟"

"میری ہمت اور طاقت تم ہو۔ تم جاؤ گے تو میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گی بالکل۔"

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میں آخری سانس تک تمہارا ساتھ نبھاؤں گا"!

ہر طرف اس کے دعوے تھے، وعدے تھے۔ ہر طرف اسی کی آواز تھی، اسی کا احساس تھا۔۔ اس سب کے باوجود بس وہی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ سختی سے لب دانتوں میں دبائے اپنے ہاتھ رگڑ رہی تھی جب جندل اس کے پاس آ کر بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں نرمی سموئے گردن ترچھی کر کے اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیا تھا۔ ضبط کے مارے اس کا پورا چہرہ سرخ

پڑ چکا تھا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اور ایک حد تک اس میں کامیاب بھی رہی تھی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا پھر سر جھٹک کر نگاہیں سامنے ٹکائیں۔

"کیوں پریشان ہو ازا؟" وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"مسئلہ یہ نہیں ہے بھائی چلے گئے۔۔ مجھے دکھ ہے میں ان کی سب سے بڑی خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ جندل اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی نہیں!" اس نے عزم سے کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تمہیں اسلام سے کونسی چیز دور کر رہی ہے ازا؟" وہ سمجھ چکا تھا وہ زیاد کی کس خواہش کے متعلق بات کر رہی تھی، تبھی پوچھ رہا تھا۔

"میں نہیں جانتی۔ بس میں سمجھ نہیں پا رہی کہ دنیا کے ہزاروں مذاہب میں سے صرف اسلام ہی کیوں؟!" وہ الجھن کا شکار ہوئی تھی۔

"اسلام کے مقابلے پر کون سے مذاہب کو لا رہی ہو؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"یہودیت اور عیسائیت۔۔" اس نے سوچ کر جواب دیا۔ جندل نے سر کو جنبش دی۔

"اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کس طرح سے عیسائیت اور یہودیت سے بہتر ہے ٹھیک؟" وہ اپنا رخ ازا کی طرف کر کے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ ازا نے سمجھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ جندل نے بات شروع کرنے سے پہلے اس کے ہاتھوں کو دیکھا جنہیں وہ اس کے آنے سے پہلے رگڑ رہی تھی۔ وہ اب اپنے ہاتھ آزاد کر کے مکمل اس کی طرف متوجہ تھی۔ وہ ایک حد تک اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب رہا تھا۔

”یہودیت، یہود اپنے مذہب میں کسی دوسری قوم کے فرد کو داخل نہیں ہوتے دیتے۔ یعنی جو لوگ نسلی طور پر یہود ہیں بس وہی یہودیت کے سچے پیروکار ہیں۔ اگر کوئی دعوہ کرے وہ یہودیت پر ایمان لایا ہے تو اس کا یہ دعوہ قابلِ قبول نہیں۔ جبکہ عیسائیت اور اسلام میں سب کو دعوتِ عام ہے۔ اسلام میں داخل ہونے کے لیے کلمہ پڑھنا ہوتا ہے، زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق لازمی ہوتی ہے جبکہ عیسائیت میں اصطباغ اور اس طرح کی چند ایک رسوم ہیں۔ اب ان دونوں میں فرق دیکھیں۔۔ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں ہی اختلاف ہے۔ جیسے تین اقانیم والا عقیدہ کہ تین ایک ہیں مگر تین تین ہیں۔ عیسائی حضرات خدا کی وحدانیت کو ہی برقرار نہ رکھ سکے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے لیے تم دنیا کے کسی کونے میں چلی جاؤ، کسی بچے سے پوچھو یا بڑے سے۔۔ سب تمہیں ایک ہی پیغام دیں گے۔ گواہی دو کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں۔ بس!“ اس نے ذرا سا توقف کر کے ازا کو دیکھا جو بغور اسے سن رہی تھی۔ وہ چند لمحے ٹھہرا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

”بنیادی عقائد کے بعد ذرا ان کا رہن سہن دیکھ لو۔ مغرب کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ عورت مرد بنی ہوئی ہے اور مرد عورت بننا چاہتا ہے۔ خاندانی نظام تباہ ہے۔ بچے کو نہیں معلوم اس کا باپ کون ہے، ماں کو نہیں معلوم اس کی کوکھ میں کس کی اولاد پل رہی ہے؟ عورت اس قدر آزاد ہو گئی ہے کہ مغربی رہنماؤں کو یقین ہے کہ بہت جلد یہی عورت ان کی تباہی کا سبب بنے گی۔ مغربی معاشرہ ہر طرح سے اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ آنے والی نسلیں انسانوں کی نہیں درندوں کی ہیں جو معاشرے کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہیں۔

دوسری طرف اسلام کو دیکھو۔ اسلام خاندانی نظام کا علم بردار ہے۔ پہلے خلافت پھر خاندان! یعنی نیچے سے اوپر جاؤ، ایک بچے کی حفاظت اس کی ماں کے ذمے ہے۔ ماں کی حفاظت اس کے شوہر کے ذمے اور شوہر کی حفاظت خلافت کے ذمے۔۔ اسی طرح یہ مختلف خاندان مل کر ایک معاشرہ بناتے ہیں جسے اسلامی معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے

بعد اسلام نے عورت کو اس کے حقوق ویسے ہی دے دیے ہیں۔ مسلمان عورت کو اپنے حقوق کی خاطر سڑکوں پر آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ زنا کی سزا ایسی سخت ہے کہ ایک سچا مسلمان، مردِ مومن خوفِ خدا دل میں لیے کبھی اس کے قریب بھی نہ جائے۔۔ یہ واضع فرق ہے اسلام میں اور عیسائیت میں"!

"مگر آج جو برائیاں مغرب میں ہیں، وہی اسلامی معاشروں میں بھی نظر آتی ہیں۔" اس نے اعتراض اٹھایا تھا۔

"ہر قوم اپنے مذہب سے دور ہو جاتی ہے۔ یہ دور ہی ایسا ہے۔ یہودیت بس ربیوں تک محدود ہو گئی ہے اور عیسائیت بس راہبوں تک۔ اسلام بس مولویوں اور مفتیوں کے گھروں تک سکڑ گیا ہے۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے، اس میں کوئی مذہب وہ وصول نہیں کر رہا جو اسے ملنا چاہیے۔ ہر مذہب کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"کیا اسلام کے لیے بھی؟" اس کے سوال پر وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

"اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ تمام دنیا میں واحد سچا دین!" اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔

"مگر اسلام میں بہت سختیاں ہیں۔ یہ دین بہت مشکل ہے۔ دنیا کو چھوڑنا پڑتا ہے۔" اس نے ایک اور اعتراص اٹھایا تھا۔

"دنیا سے کٹ جانا رہبانیت ہے، یہ راہب تھے جو دنیا چھوڑ کر جنگلوں میں عبادت کے لیے گئے تھے۔ دنیا کے پیچھے دوڑنا یہودیت ہے، یہ یہود تھے جنہوں نے دین کو چھوڑ کر نفس پرستی کی تھی۔ اسلام میں نہ رہبانیت ہے نہ یہودیت! اسلام میں حنیفیت ہے، ایک اللہ پر ایمان اور اسی کی اطاعت۔۔! اسلام میں میانہ روی ہے۔ اسلام دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا سکھاتا ہے۔ اسلام مکمل ہے، مسلمانوں میں رہبانیت اور یہودیت سرایت کر گئی ہے۔۔!

اسلام اس معاملے میں بری الذمہ ہے۔۔!" وہ مسکرا دیا۔ ازا اس کے ان الفاظ پر بری طرح چونکی تھی۔ اس کے چونکنے پر بھی جندل کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

یہ انداز۔۔ یہ الفاظ خضر نعمانی کے تھے جو اس وقت جندل کے منہ سے نکلے تھے۔ اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ اس دن جب بدر نے خضر کو ٹریس کیا تھا تو وہ خیام کے گھر پہنچی تھی۔ اس دن جندل بھی وہیں تھا!! جندل یوسف زئی ہی تھا خضر نعمانی۔۔ وہ لڑکا جس کے جوابات کا اسے انتظار رہتا تھا۔ وہ لڑکا جس کی باتیں اسے مسحور کرتی تھیں۔ وہ یک ٹک جندل کو دیکھے گئی۔ اسے محویت سے خود کو تکتا پا کر جندل نے اس کے آگے چٹکی بجائی۔ وہ ہوش میں آئی، چونک کر اسے دیکھا۔

"تم۔۔ تم خضر نعمانی ہو ناں؟" اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ جندل نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ سانس روکے ازا کو دیکھ کر وہ مجرموں کی طرح نظریں چرا گیا۔ اس کا مان ٹوٹا تھا۔۔ یہ منظر اس کی آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھا تھا۔

"مجھے امید تھی۔۔۔ تم جھوٹ نہیں بولو گے۔۔" اس نے افسوس سے اسے دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جانے لگی تھی جب جندل نے اپنا بازو اس کے آگے پھیلا کر اسے روکا۔

"میری باتوں پر غور کرنا۔۔ اپنے بھائی کی خواہش پوری کرنی ہے تمہیں۔" اس نے ہلکا سا مسکرا کر کہا تھا۔ ازا نے ٹھہر کر اس کے بازو کو دیکھا۔ راہداری میں قدم رکھتا خیام یہ منظر دیکھ کر ٹھٹھک کر رکا۔ ازا ایک سخت اور خفا خفا سی نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ چکی تھی۔ جندل نے رک کر گہری سانس لی پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی دھن میں پلٹا تو خیام کو اپنے سامنے پایا۔ خیام۔۔ جو سخت نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”کیا؟“

”ازا کے سامنے نظر مت آنا آئندہ! ورنہ ٹانگیں دوڑ دوں گا۔“ وہ اسے دھمکا رہا تھا۔ جندل نے اس کی بات پر آنکھیں گھمائی تھیں، گویا اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لیا گیا تھا۔

”فکر مت کرو، میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا۔“ اس نے ایک تپاتی مسکراہٹ خیام کی طرف اچھالی پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ جبکہ پیچھے وہ اپنی جگہ سلگ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”ایک فیصلہ کن کھیل کے بارے میں کیا خیال ہے؟!“ لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر پیغام جگمگایا۔ وہ چند پل اس پیغام کو دیکھتی رہی پھر اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر تیزی سے باہر آئی تھی۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈال کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ان سب کے مشترکہ آفس میں آئی۔ آفس میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رکی۔ ٹھہر کر زیاد کی کرسی پر بیٹھے مصعب کو دیکھا۔ یہ جگہ اس کی تھی۔ مصعب کبھی سامنے نہ آتا اگر زیاد کو نہ جانا ہوتا۔ کعب کوئی بھی کام بلاوجہ نہیں کرتا تھا۔ تقدیر اس کے حق میں نہ ہوتی تو شاید اگلے کئی سال وہ اسی طرح اپنے بھائی کے لیے تڑپتی رہتی۔۔ وہی بھائی۔۔ جو اب ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اس کے شوہر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔

”کوئی کام ہے سعاد؟“ خیام اسے یوں ساکت کھڑے دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ جندل، ضرار، مصعب سب کی نگاہیں اس پر ٹکیں۔ اس نے سر نفی میں ہلا کر اپنے خیالوں کو جھٹکا پھر لیپ ٹاپ ”مصعب الزرقاوی“ کی میز پر رکھا۔

”دلال کا پیغام آیا ہے۔“ مصعب نے جھک کر اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا۔ وہ تینوں بھی تیزی سے اٹھ کر ان کی طرف آ گئے۔

”جواب لکھیں۔ بنا کسی تگو دو کے ہامی بھریں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ سعاد سر کو جنبش دے کر کرسی پر بیٹھی پھر جوابی پیغام لکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر گزری اور دوسرا پیغام آ گیا۔

”میں یہ کھیل الزرقاوی کے ساتھ کھیلوں گا!“ اس کے بعد ہی انہیں ایک لنک موصول ہوا۔ ان سب نے چونک کر مصعب کو دیکھا۔ وہ لب دانتوں میں دبائے اس لنک کو دیکھنے لگا۔

”پہلے اس سے کھیل کے متعلق پوچھنا چاہیے۔“ جندل نے مشورہ دیا۔

”ہمیں کیسے یقین ہو گا کہ دوسری طرف دلال ہی ہے؟“ ضرار نے پرسوچ نگاہوں سے پیغام کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جیسے دلال کو یقین ہے کہ دوسری طرف یہ کھیل کھیلنے کے لیے الزرقاوی ہی آگے آئے گا!“ خیام نے اس کی الجھن دور کی۔ مصعب نے چند پل سوچنے کے لیے لیے اور پھر وہ لنک کھول لیا۔ اسکرین ایک لمحے کے لیے تاریک ہو گئی۔ ان سب کا تجسس سے برا حال ہوا۔ صرف ایک منٹ بعد اسکرین پر ٹائمر نمودار ہوا۔ سرخ رنگ کے حروف لکھے نظر آئے۔

”سعاد۔ دلال آپ سے رابطہ کرنے میں کیسے کامیاب ہوا؟“ وہ ماتھے پر بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔ کام کے اوقات میں وہ کبھی بھی اسے آپی نہیں کہا کرتا تھا۔

"اس میں کیا مشکل ہے۔ ہیکرز جیسے ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں، اس نے بھی ویسے ہی کیا۔" سعاد نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

"وہ اب دوبارہ رابطہ کرے گا۔" ادھر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور ادھر سعاد کا موبائل بج اٹھا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر سعاد نے ستائش بھری نگاہوں سے مصعب کو دیکھا پھر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ مصعب نے موبائل پکڑ کر چپ چاپ کان سے لگا لیا۔

"الزر قاوی! مجھے سن رہے ہو؟" ابراہم کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ کیسا کھیل ہے؟" وہ سیدھا مدعے پر آیا۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی اور چہرہ ایکدم سپاٹ تھا۔

"تم جاننا چاہتے ہو ناں میں کہاں ہوں؟ کون ہوں؟ تم جتنے بھی زیادہ تیز ہو جاؤ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں تمہارے لیے ایک پہیلی بن چکا ہوں۔ اس پہیلی کو مل کر سلجھاتے ہیں، ٹھیک؟" اس کی مسکراتی آواز مصعب کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے بے اختیار مٹھیاں بھینچی تھیں۔ چہرہ ضبط کے مارے لال پڑ رہا تھا۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"یہ ٹائمر دیکھ رہے ہو؟ تین دھماکے ہونگے۔ تین سوال ہیں جن کا جواب تم دو گے۔ اگر ہار گئے تو ہر ایک گھنٹے بعد ایک دھماکہ ہو گا اور ہزاروں جانیں ضائع ہونگی۔ ایک بات یاد رکھنا، سوالوں کے جواب حل کرنے کے علاوہ ان دھماکوں کو روکنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" اس کی بات مکمل ہوتے ہی مصعب کی نگاہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ٹکی جہاں وقت شروع ہو چکا تھا۔ صرف ایک گھنٹہ!

"پہلا سوال۔" وہ مصعب کے جواب کا انتظار کیے بنا ذرا توقف سے بولا۔ "وہ لڑکا، جندل یوسف زئی! میں چاہتا تو اسے اس رات ہی مار دیتا۔ مجھے ایسا کرنے سے کس چیز نے روکا تھا؟!" مصعب کی نگاہیں بے اختیار جندل کی طرف اٹھیں جو سوال سن کر اضطراب کی کیفیت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ "صرف ایک گھنٹہ الزر قاوی! اس کے بعد ہر ایک منٹ میں ایک جان جائے گی۔ اور ذمہ دار تم ہو گے۔"

"مردوں کی طرح سامنے آؤ دلال! تم کسی بے گناہ کی جان نہیں لو گے!!" وہ کسی شیر کی طرح دھاڑا تھا۔

"کیا واقعی؟!" دلال کی ہنسی اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلنے لگی۔ اس نے فون بند کر کے میز پر اچھالا تھا۔ ضبط سے ہونٹ دانتوں میں دبائے مٹھیاں سختی سے بھینچ کر میز پر ماری تھیں۔ وہ سب اس کا یہ روپ دیکھ کر حیران تھے۔ انہوں نے آج تک شوخ اور معصوم بدر کو دیکھا تھا مگر آج ان کے سامنے مصعب الزر قاوی کھڑا تھا جس کا چہرہ غصے سے خون چھلکا رہا تھا۔

"مصعب، غصے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمیں بیٹھ کر کچھ سوچنا ہو گا۔" خیام نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"ارے کیا خاک ٹھیک ہو گا۔ وہ سائیکو ہے سائیکو، اس کا سوال ہی ایسا ہے جس کا نہ سر ہے نہ پیر! خدا کی قسم میں اس کی جان اپنے ہاتھوں سے لوں گا!!" وہ غصے سے دھاڑا تھا۔ خیام نے دائیں ابرو اٹھائے اسے دیکھا۔ وہ جواباً کچھ کہنے لگا تھا جب جندل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں ضرار کے ساتھ کمپنی جا رہا ہوں۔ وارلڈ ایک عرصہ وہیں رہا ہے، یقیناً وہاں سے کوئی ثبوت ملے گا۔ ہم اس دھماکے کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔" جندل نے پلان ترتیب دیا۔ مصعب نے سر کو جنبش دی پھر سعاد کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ دلال کو ٹریس کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ اندازہ لگائیں کہ اگلے گھنٹے میں کس جگہ لوگ کافی تعداد میں ہو سکتے ہیں؟!“ اس نے حکم صادر کیا۔ سعاد نے سر کو جنبش دی۔ جندل اسے ساتھ لیے ضرار کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ مصعب نے ٹھہر کر خیام کو دیکھا۔ ”مجھے وہ کتاب دیں جو آپ لائبریری سے لائے ہیں۔“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ خیام نے سر کو جنبش دی پھر وہ کتاب اپنی میز سے اٹھا کر مصعب کے سامنے رکھ دی۔ اس نے گہری سانس لے کر اسکرین پر لگے ٹائمر کو دیکھا پھر کتاب کھولی۔ خیام ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر پلٹ گیا۔

”آپ یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر کتاب پڑھیں گے!“ دروزہ کھولتا خیام اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ مڑ کر مصعب کو دیکھا جو حکم صادر کر کے کتاب پر جھک چکا تھا۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر اس کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے لمحات میں وہ دونوں کتاب پر جھکے دلال کے سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی چمچماتی گاڑی اپنی پوری رفتار سے سیاہ ہموار سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے اونچے درخت تیزی سے گزر رہے تھے۔ اسپتال اور اس کے درمیان فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا۔ ہر منظر تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ چہرے پر کرب تھا۔ دل بے چین تھا اور سوچوں کا طوفان تھا جس میں وہ گھرا ہوا تھا۔ اس نے دو سال جس مشن پر کام کیا تھا وہ اسے ادھورا چھوڑ کر آ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ذات ادھوری اور نامکمل سی ہو گئی ہو۔ سخت الجھن تھی، بے چینی تھی جو اسے مسلسل بے سکون کیے ہوئی تھی۔

اس کا ہاتھ دھیرے سے اپنی جیکٹ کی جیب میں گیا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں وہ خط موجود تھا۔ اسے الزرقاوی کے الفاظ یاد تھے۔ اسے اس بچے کو ڈھونڈنا تھا جس نے سالوں پہلے امیر المسلمین یوسف بن تاشفین کو پکارا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ کس دکھ اور تکلیف سے گزرا تھا۔ وہ جانتا تھا، اس بچے کو ڈھونڈنے وہ ایک اجنبی سرزمین پر گیا تھا مگر وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ رہا تھا۔ وہ بے اختیار سختی سے لب بھینچ گیا۔ آنکھیں دھیرے سے کھولیں۔ خط کو نگاہوں کے سامنے کیا۔

"میں اپنی تھمتی سانسوں کے تھمنے تک آپ کا منتظر رہوں گا امیر المسلمین! آگ کی لپیٹ میں آتا بحیرہ روم ایک بار پھر آپ کی قباپوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں اور بحیرہ روم۔۔۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں امیر المسلمین۔۔۔! آپ کیوں چلے گئے؟ لوٹ آئیں ناں۔۔۔!" وہ کئی پل ان الفاظ کو دیکھتا رہا جن سے بے پناہ تکلیف اور درد جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ آرام سے دھیرے سے اس نے ان الفاظ کو چھوا تھا۔

"تم نے امیر ابنِ تاشفین کے متعلق سنا ہے؟ یہ بتاؤ تم کیا انہی کی نسل میں سے ہو؟ یقین جانو مجھے بہت شوق کے امیر سے ملاقات کا۔ کیا شخصیت تھی وہ۔ مردِ مجاہد جس کی شمشیر صدا خدا کی راہ میں خون سے رنگین ہوئی، جس کی تکبیر نے پہاڑوں پر لرزا طاری کیا۔ ایسا کامل مومن کہ حق پر ڈٹا رہا۔ نہ دولت کی چاہ تھی نہ سلطنت کے ایوان اسے متاثر کر پائے تھے۔ وہ امیر چٹائی پر بیٹھتا تھا اور سوکھی روٹی کھاتا تھا۔ خدا پر یقین ایسا کہ سمندر سے ٹکرا گیا۔ جس کی شمشیر نے دوبار اندلس کو آزادی دلائی۔ جس نے اندلس سے طوائف الملوکی کو ختم کیا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں وہ کیسا عظیم مجاہد تھا زیاد!! اپنے نام کی لاج رکھنا، اس "تاشفین" پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔" جندل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ ذہن کی اسکرین پر جندل کا

چہرہ گھوم گیا۔ سمندر زیاد سمندر! وہ جندل ہی تو تھا جس کا بحری جہاز ڈوبا تھا۔ امیر البحر جسے سمندر بھی خود میں سمو نہیں پایا تھا۔

خیام زیاد کی تلاش میں تھا، جندل خیام کی تلاش میں تھا اور زیاد۔۔۔ زیاد جندل کی تلاش میں تھا!

ان کی کہانی کا یہ وہ موڑ تھا جہاں انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ تینوں۔۔ ایک دوسرے کی تلاش میں نکلے تھے۔ اس اجنبی سرزمین پر۔۔ وہ جس سفر پر نکلے تھے، اس کی منزل وہ تینوں خود ہی تھے!

اور ایک بات طے تھی۔۔ اس نے یہ سفر جن کے لیے شروع کیا تھا، زیاد تاشفین انہیں سفر کے اختتام میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہرگز نہیں!

”گاڑی واپس ایئرپورٹ کی طرف موڑو، فوراً!“ اس نے عجلت میں ڈرائیور سے کہا تھا۔ ڈرائیور نے چونک کر بیک ویو مرر سے اسے دیکھا۔

”سر معذرت کے ساتھ مگر سخت حکم ہے کہ آپ کو اسپتال پہنچایا جائے۔“ وہ معذرت خواہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ زیاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔

”میں خود جواب دے دوں گا انہیں، گاڑی موڑو!“ اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔

”سر پلیز۔۔“ ڈرائیور منمنایا۔ زیاد نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا گاڑی کا دروازہ کھولا اور چلتی گاڑی سے چھلانگ دی۔ وہ قلابازیاں کھاتا سڑک پر گرا تھا۔ اس کی پیشانی پر چوٹ آئی۔ ہاتھ بری طرح رگڑے گئے۔ بنا کسی پروا کے وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کی طرف بھاگا۔ ڈرائیور نے بوکھلا کر گاڑی آگے جا کر روک دی۔ جس وقت وہ گاڑی

موڑ رہا تھا زیاد اس وقت ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ زیاد کو ایئر پورٹ پہنچنے سے نہیں روک پایا تھا۔

☆☆☆

"مائک میری بات سنو تم! بنا وقت ضائع کیے فوراً اپنے آدمیوں سے رابطہ کرو۔ ان سے کہو یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ دلال کس جگہ پر دھماکہ کرنے جا رہا ہے؟ ہمارے پاس صرف چالیس منٹ رہتے ہیں، صرف چالیس منٹ مائک!" موبائل کان سے لگائے مائک کو ہدایات جاری کرتی وہ اپنے آفس کی طرف جا رہی تھی۔ ہیل کی ٹک ٹک خاموش راہداری میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔ مگر دلال یہ کام بہت رازداری سے کر رہا ہے، مشکل ہے ہمیں کچھ معلوم ہو۔" مائک بھی شدید الجھن کا شکار تھا۔

"تم کوشش تو کرو۔" وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئی۔ مائک نے گہری سانس لے کر کال کاٹ دی۔ موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے ازا کی نگاہ کچھ فاصلے پر پنجوں کے بل بیٹھ کر اپنے جاگرز کے تسمے باندھتے لڑکے پر ٹکی۔ اس کی رفتار سست پڑی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اس کے جوتوں کے تلوے پر غور کرنے لگی۔ اس کے جاگرز سفید رنگ کے تھے۔ سفید تلووں پر سیاہ رنگ کی ایک موٹی لکیر تھی جیسے کوئی پینٹ لگا ہو۔

"ازا۔۔ احتیاط کیا کرو۔" جھک کر اس کے سفید جاگرز پر لگی کیچڑ دیکھتے مصعب نے اسے گھورا تھا۔ اس کے جاگرز۔۔ ان پر یہ سیاہ پٹی نہیں تھی۔ وہ آگے آئی۔ وہ لڑکا تسمے باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ

جاگرز پر ڈالی پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ لڑکا واپس پلٹ گیا۔ آفس کا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو جندل اور ضرار وہیں موجود تھے۔ میز پر رکھے لیپ ٹاپ پر جھکے وہ دونوں کیمروں کی مدد سے پوری کمپنی کا جائزہ لے رہے تھے۔

"تم دونوں کو یقین ہے کہ دلال یہیں کمپنی میں ہے؟" اس نے الجھے الجھے سے انداز میں پوچھا تھا۔

"ایک حد تک یہ ممکن ہو سکتا ہے!" ضرار نے اس کی بات کی تائید کی۔ جندل نے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔

"کوئی بات ہے ازا؟" اس کے پوچھنے پر وہ بے اختیار سر اثبات میں ہلا گئی۔

"اگر دلال یہاں ہے تو اس کے آدمی بھی یہیں موجود ہونگے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہم دونوں کے جاگرز ایک ہی ہیں مگر اس کے جاگرز پر پینٹ لگا تھا؟ سیاہ رنگ کا پینٹ!" جندل اور ضرار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کمپنی میں حال ہی میں پینٹ کہاں ہوا ہے ازا؟" جندل نے عجلت میں پوچھا تھا۔ ازا نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحات میں وہ تینوں تیزی سے راہداری میں دوڑ رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر راہداری کے آخری سرے پر لائی تھی جہاں راستہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کے سامنے سفید رنگ کی دیوار تھی۔ اور فرش پر۔۔ سفید ٹائلز پر سیاہ رنگ کا پینٹ ہوا تھا۔ وہ پینٹ۔۔ جو حال ہی میں ہوا تھا۔

جندل اور ضرار نے بغور اس دیوار کو دیکھا پھر اس پینٹ کو۔ اگر اس لڑکے کے جوتے پر یہ پینٹ لگا تھا تو اس کا مطلب صاف تھا کہ خفیہ راستہ سامنے دیوار سے ہی کہیں سے کھلتا تھا۔ ان دونوں نے دیوار کو ٹٹولنا شروع کر دیا انہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ پانچ منٹ بعد ضرار ایک بالکل چھوٹا سا بٹن ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا جس کے دبتے ہی ایک آہنی دروازہ ان کے سامنے تھا۔

”ڈی ڈبلیو کا اصل ہیڈ کوارٹر۔۔ ہمیشہ سے وارلڈ گلاس کمپنی میں تھا!“ جندل نے دروازے کو تکتے ہوئے پراسرار لہجے میں کہا تھا۔

”تو بالآخر تم یہاں تک بھی پہنچ گئے۔“ آواز اجنبی تھی اور ان کے عقب سے آئی تھی۔ وہ تینوں چونک کر پلٹے تھے۔ ڈی ڈبلیو کے لباس میں ملبوس کئی آدمیوں نے ان پر اپنی پستولیں تانی تھیں۔ وہ گھیرے میں لیے جا چکے تھے۔ ان کے گرد تنگ محاصرہ قائم ہوا تھا۔

”دھماکہ۔۔ وارلڈ گلاس کمپنی میں ہو گا!“ ضرار نے سرگوشی کی۔ ازا نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ اس کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹے۔ جندل اور ضرار اس کے آگے دیوار کی مانند کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھ اپنی جیبوں میں موجود پستولوں تک گئے۔ جیسے ہی انہوں نے پستولیں نکال کر ایک لمحہ ضائع کیے بنا ٹریگر دبائے تھے، اسی وقت ازا تیزی سے وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی تھیں۔ وہ دونوں دیواروں کی اوٹ میں ہو کر مسلسل فائرنگ کرنے لگے تھے۔ راہداری میں اندھا دھند بھاگتی ازا تیزی سے باہری دروازے کی طرف آئی تھی۔ کمپنی سے باہر نکلتے ہی اس کا پاؤں مڑا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی سینڈل اتار کر دور پھینکی اور ننگے پاؤں ہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جان چکی تھی۔۔۔ دلال کہاں تھا؟! یہی چیز تھی جس نے اسے ان دونوں کو وہاں تنہا چھوڑ کر یوں فرار ہونے پر مجبور کیا تھا۔

دلال۔۔ ازا تاشفین کا منتظر تھا۔ وہیں۔۔ اسی جگہ جہاں وہ اسے للکار کر آئی تھی۔ جہاں وہ کئی برس ساتھ رہے تھے۔ اس کے اپنے گھر!

☆☆☆

•بیس منٹ قبل

”اور میں نے خواب دیکھا۔ سمندر کی بپھری لہروں کا شور۔۔ تڑاتڑ برستا آسمان اور بمشکل اپنا وجود برقرار رکھ کر مطلق العنان موجوں پر تیرتا بحری جہاز۔۔ مجھے یقین تھا وہ جہاز میرا ہے۔ سمندر پر حکمرانی میری تقدیر میں ہے۔ مجھے یقین تھا خدا کا فرمان میرے حق میں ہے۔ پھر۔۔ خواب ٹوٹ گیا۔ میں گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔۔ میں نے خدا کا فرمان بدلتے دیکھا تھا۔“ خیام سطور مکمل کر کے صفحہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ مصعب نے اسے روک دیا۔

”اسے دوبارہ پڑھیں۔ یہاں کچھ ہے، لکھاری کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔“ مصعب نے عجلت میں کہا اور دوبارہ کتاب پر جھک گیا۔ ان دونوں نے بار بار یہ الفاظ پڑھے تھے۔

”میں نے خدا کا فرمان بدلتے دیکھا۔ کیا یہ اسی جیسا نہیں؟ دلال نے پہلے جندل کو مارنا چاہا مگر پھر اسے زندہ رہنے دیا؟“ اس نے بھنویں ملائے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ خیام نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

”دلال یہودی ہے۔ یہود کا عقیدہ بود مصعب! اس عقیدے کے مطابق خدا اگر کوئی فیصلہ کرتا ہے اور پھر اس فیصلے میں کوئی غلطی دیکھے تو اس فیصلے کو بدل ڈالتا ہے۔ دلال نے یہی کیا ہے۔ اگر وہ خود کو خدا کہہ رہا ہے تو اس نے پہلے جندل کو مارنا چاہا مگر پھر اسے زندگی دے دی! وہ عقیدہ بود کے مطابق چل رہا ہے۔“ خیام بات کی تہہ تک پہنچا تھا۔

”لیکن کیوں؟!“ اور اس سوال پر پہنچ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ کئی پل خاموشی کی نذر ہوئے۔ خیام اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مصعب اضطراب کی کیفیت میں پہلو بدلتا ٹائمر کو دیکھنے لگا جس میں تیس منٹ باقی تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر کرسی پر سر ٹکا دیا۔ جانے کتنے معصوم لوگ تھے جو تیس منٹ کے بعد اس ظالم کے رحم و کرم پر ہونگے۔ اس

جیسا سفاک قاتل ان کی جان لینے سے پہلے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچتا۔ اس نے اگر کہا تھا ہزاروں لوگ مریں گے جن کا خون الزر قاوی کے سر ہو گا تو اس نے ہوا میں تیر نہیں چلائے تھے۔ وہ واقعی یہی کرنے جا رہا تھا۔

اور اسے روکنے کے لیے ان کے پاس اس سوال کو حل کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنی پیشانی کو ہلکا سا دباتا خیام کو دیکھنے لگا جو اضطراب کی کیفیت میں کمر پر ہاتھ رکھے ٹہل رہا تھا۔ وہ دائیں طرف جاتا، چند پل رکتا، دیوار کو گھورتا اور پھر واپس آجاتا۔ وہ یہی عمل بار بار دہرا رہا تھا۔ مصعب نے ٹھہر کر اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

”جندل اور دلال! دونوں سمندر کے عاشق ہیں۔ اگر غور کریں تو ہم دونوں کو رقیب کہہ سکتے ہیں؟ اور سوچیں ایک شخص اپنے محبوب کے متعلق سب سے زیادہ بھروسہ کس پر کرے گا؟ یقیناً اپنے رقیب پر! کیونکہ جس طرح وہ اپنے محبوب کو چاہتا ہے اسی طرح اس کا رقیب بھی اپنے محبوب سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ یہ بات اس کے لیے تکلیف دہ ہے مگر۔۔ وہ محبوب کے معاملے میں رقیب سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔

دلال نے جندل کو مارنا چاہا کیونکہ وہ اس کا رقیب تھا۔ اس نے جندل کو زندگی بخش دی کیونکہ۔۔ دلال کے بعد عین ممکن تھا جندل سمندروں کا امیر بنتا۔ جیسی محبت دلال نے سمندر سے کی تھی، ویسی ہی محبت جندل کے خون میں تھی!“ سوچ سوچ کر کہتے ہوئے آخر میں اس کی آواز جوش سے بلند ہو گئی۔ خیام نے اس کی بات سمجھ کر سر کو جنبش دی۔ مصعب نے جلدی سے فون اٹھا کر نمبر ملایا۔ پہلی ہی بیل پر کال اٹھا لی گئی گویا وہ اسی کا منتظر تھا۔

”سن رہا ہوں۔“ دلال کی مسکراتی آوز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”تمہارا عمل یہود کے عقیدہ بود کے مطابق تھا۔ جب تم نے جندل کو مارنا چاہا تھا تب تم سے غلطی ہوئی۔ تم بھول گئے سمندروں کے لیے وہ اتنی ہی محبت رکھتا ہے جتنی تم! وہ تمہارا رقیب تھا اور تمہارے بعد سمندر کو تمہاری طرح محبت وہی دے سکتا تھا۔ تم نے اپنا فیصلہ بدلا، غلط کو ٹھیک کیا اور جندل کو زندہ رہنے دیا۔ یہی ہے تمہارے سوال کا جواب!“ اس نے اعتماد سے کہتے کوئے اپنی بات مکمل کی۔ دوسری طرف چند پل خاموشی چھائی رہی پھر دلال کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

”بہت اچھے، تم میری سوچ سے زیادہ ہوشیار نکلے۔“ وہ اسے سراہے بنا نہ رہ سکا۔ بدر کی نگاہ بے اختیار اسکرین پر ٹکی جہاں وقت رک چکا تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی تھی۔ ”اب پھر دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔“ دلال ہنسا۔ مصعب نے نگاہ اٹھا کر سامنے کھڑے خیام کو دیکھا جو کتاب پر جھک چکا تھا۔

”ازاتا شفین! کس چیز نے مجھے اس سے محبت کرنے پر مجبور کیا؟ میں جانتا تھا وہ میری پیٹھ میں چھرا گھونپے گی، باوجود اس کے میں کیونکر اسے باہمت اور طاقتور بناتا گیا؟! یہ بات جانتے ہوئے کہ زیاد اس کا بھائی ہے میں نے کیونکر اسے اپنے گھر میں جگہ بنانے دی؟!“ اس کا سوال ختم ہوتے ہی اسکرین پر نیا ٹائم لگ چکا تھا۔ ان کے پاس دوبارہ صرف ایک گھنٹہ تھا۔ دلال نے کال کاٹ دی۔ مصعب گہری سانس لے کر سر ہاتھوں میں گرا گیا۔ یہ شخص۔۔ واقعی سائیکو تھا۔ انسانی جان جس کے لیے ایک تفریحی کھیل سے زیدہ کچھ نہیں تھی۔۔ کچھ بھی نہیں!

☆☆☆

تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی سعاد نے چونک کر سر اٹھایا۔ گردن ترچھی کر کے دائیں طرف اسکرین کو دیکھا پھر اپنی کرسی کا رخ اس طرف کیا۔ سرخ رنگ کا نشان تھا جو دلال کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل

نمودار ہوئے تھے۔ اسی اثناء میں اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ اس نے نمبر دیکھنے کی زحمت کیے بنا موبائل اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

"خیام آپ نے ازا کی گاڑی میں جو ٹریکر رکھوایا تھا اس کے مطابق ازا دلال کے گھر جا رہی ہے۔ اسے روکیں وہ مار دے گا ازا کو!!" وہ حواس باختہ ہو کر کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف ایئرپورٹ سے نکلتا زیاد اس کی بات سن کر ٹھٹھک کر رکا تھا۔ "ہم پہلا دھماکہ روک چکے ہیں مگر دوسرا اور تیسرا ابھی باقی ہے۔ ازا کو نہ روکا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے!! دلال ہر بار اس پر رحم نہیں کھائے گا خیام!" وہ پیشانی کو رگڑتے ہوئے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف فوراً کال کاٹ دی گئی تھی۔ اس نے چونک کر موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھا۔ "سینیور زیاد!" نام پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونکی تھی۔ زیاد۔۔ تھائیلنڈ لوٹ آیا تھا اور اب اس کی بے احتیاطی کی وجہ سے یقیناً دلال کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

وہ موبائل اٹھا کر تیزی سے اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ اڑی اڑی رنگت لیے وہ خیام اور مصعب کے پاس آئی تھی۔

"زیاد اور ازا۔۔۔ دلال کے گھر جا رہے ہیں۔" اس کی اطلاع پر ان دونوں نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

"زیاد؟ زیاد واپس آگیا ہے؟" خیام نے ماتھے پر بل ڈالے پوچھا۔ مصعب نے تیزی سے اپنا موبائل اٹھایا۔ کوئی نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگایا۔

"ہم نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں رکا۔ وہ اب تک تھائیلنڈ پہنچ چکا ہو گا۔" ایک لڑکے نے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی تھی۔

"اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو نامعقول!" اس نے غصے سے دانت کچکچائے تھے۔

"میں دیکھتا ہوں انہیں۔" خیام نے کرسی پر رکھی اپنی جیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ مصعب نے سر کو جنبش دی۔ اس نے کان میں آلہ لگایا، اپنی پستول اٹھا کر لوڈ کی پھر ایک الوداعی نگاہ ان پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

"خیام۔۔۔ ان کے لیے ہرگز اپنی جان خطرے میں مت ڈالنا!" مصعب کا حکم تھا۔ سعاد نے خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ خیام بے اختیار مسکرایا تھا۔ وہ یقیناً ان چاروں کو ابھی تک جان نہیں پایا تھا۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے لیے موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے سے پہلے ایک لمحے کو نہیں سوچتے تھے۔ وہ مسکراہٹ دباتا باہر نکل گیا۔

"آپ آجائیں اب ادھر۔" مصعب کے کہنے پر سعاد کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئی۔ مصعب کے ہمراہ وہ کتاب پر جھک گئی۔

"اور کبھی سمندر کو غور سے دیکھنا۔ کیا تم سمندر کے مقابلے پر کسی کو لا سکتے ہو؟ کیا کوئی سمندر سے زیادہ دلکش اور پراسرار ہے؟ کیا سمندر کے علاوہ کوئی ہے جسے دیکھ کر دل کی لہروں میں تلاطم برپا ہو؟ اگر تمہارا جواب نفی میں ہے تو تم غلط ہو۔ کبھی سمندر کے آگے بے بس اور کمزور سے پھولوں کو دیکھنا جو اس بے کراں سمندر کا زور برداشت نہیں کر پاتے اور بکھر جاتے ہیں، یہ کمزور اور نازک سے پھول۔۔۔ ان کی نازکی اور خوبصورتی سمندری لہروں کے وحشی پن اور پراسراریت کی ٹکر پر معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تمہارا دل بٹ جاتا ہے۔۔ کائنات ایک راز ہے میرے دوست! سمندر اس راز کی صرف ایک کلی ہے۔ تمہیں ہزاروں اور کلیاں ملیں گی جو تمہیں سحر زدہ کر دیں گے۔ اور سحر بھی ایسا کہ۔۔ جس کا نہ کوئی رد ہے نہ توڑ!" ان دونوں نے بار بار ان الفاظ کو پڑھا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ان الفاظ کے سحر میں ضرور جکڑے جاتے مگر فی الحال انہیں دلال کے سوال کا جواب ڈھونڈنا تھا۔

"ازا کی مثال اس پھول سی ہے جو اپنی خوبصورتی کی بنا پر سمندر کے مقابلے کا ہے۔ اس سفاک قاتل کو ایک معصوم سی بچی۔۔۔ بس اچھی لگ گئی تھی۔" مصعب نے ایک پہیلی سلجھائی تھی۔ اور اس کا یہ "بس" تھا جس نے سعاد کو چونکایا تھا۔

"وہ ازا کو اپنی ٹکر پر لانا چاہتا تھا، یہ ہماری غلط فہمی تھی۔ وہ ازا سے اس کی معصومیت چھیننا چاہتا تھا جس کی بنا پر وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ دلال تب تک ازا کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا جب تک۔۔ جب تک وہ اپنی معصومیت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ سمندر کے اوپر تیرتا پھول اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے مگر یہی پھول جب سمندر میں ڈوب جائے تو۔۔ پھول کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہتا! زیاد کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دینا۔۔ دلال ازا کو مارنا چاہتا ہے! وہ واحد ہے جو دلال کو انسان بناتی ہے۔ وہ واحد ہے جس نے اس سفاک قاتل کو ایک شفیق باپ بننے پر مجبور کیا۔ ازا کی موت کے ساتھ ہی۔۔ دلال بس دلال ہوگا۔ ایک درندہ۔۔ وحشی قاتل"!

ایک اور پہیلی سلجھ گئی۔ ایک اور انکشاف ہوا۔ پوری رفتار سے سڑک پر گاڑی دوڑاتے خیام نے سختی سے آنکھیں میچی تھیں۔ ایک سائیکو کی سائیکی اس سائیکو کی طرح بہت عجیب تھی۔۔ بہت زیادہ عجیب!

☆☆☆

اس نے گھر کے دروازے پر کوئی گارڈ نہیں دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا جیسے اندر اسی کا انتظار کیا جا رہا ہو۔ اس نے سر جھکا کر اپنے ننگے پاؤں کو دیکھا جو ٹھنڈ کی وجہ سے بالکل سفید پڑ چکے تھے، جیسے خون کی گردش رک چکی ہو۔ اس نے ٹھہر کر سختی سے آنکھیں میچیں پھر اپنے قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔ دائیں بائیں اونچے درخت تھے جو دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس لمبے ہموار راستے پر قدم بڑھاتی اپنی موت کی طرف جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے

پتھروں نے اس کے پاؤں کو زخمی کر دیا تھا۔ خون کی ننھی بوندیں قطرہ قطرہ سڑک پر گر رہی تھیں۔ شاید اب وہ زیاد کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی۔۔

اس نے کہا تھا تم اپنی راہ کے پھول ہٹا کر ان کی جگہ کانٹوں کو بچھاؤ گی ازا! اس نے یہی کیا تھا۔ یہ نوکیلے پتھروں کا راستہ اس کا اپنا چناؤ تھا۔ کچھ دنوں پہلے تک وہ پوری شان سے اپنی گاڑی ان راستوں سے گزار دیا کرتی تھی۔ آج وہ انہی راستوں پر قدم بڑھاتی اپنی ذات کو زخمی کر رہی تھی۔ وہ سُن ہوتے دماغ کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر جندل اور ضرار کا چہرہ گھوما تھا۔ اگلے لمحات میں اس نے خود کو بھاگتے پایا تھا۔ وہ پوری قوت سے بھاگ رہی تھی۔ پاؤں زخمی ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا اگلا قدم نرم قالین پر پڑا تھا۔ سرخ رنگ کا قالین۔۔۔ جس پر سرخ انسانی خون کے چند قطرے گرے۔ سفید پاؤں۔۔ جواب سرخ ہو چکے تھے۔ چہرے کی رنگت کفن جیسی سفید ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے کمرے کے دروازے کھلے ہوئے پائے تھے۔ دروازے پر دو گارڈز اسلحے سے لیس کھڑے تھے۔ وہ کمرے میں آ گئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی۔ گھوم کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ نگاہیں دائیں طرف کھڑکی کے پاس کھڑے دلال پر ٹکیں۔ دلال۔۔ جو کل تک ابراہم وارلڈ تھا!

”آپ میری جان لینا چاہتے ہیں ناں؟ لے لیں۔ دیکھیں خود چل کر یہاں تک آئی ہوں۔ ان معصوم اور بے گناہ لوگوں کی جانیں لے کر آپ کو کون سا سکون ملے گا ہاں؟!“ اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ دلال نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ لبوں پر ہلکی سی مسکان امڈ آئی۔

”تمہاری جان لینا چاہتا تو برسوں پہلے لے لیتا۔ میں بس اپنی۔۔ غلطی سدھارنا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے آگے آیا تھا۔ ازا سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔

"کیسی غلطی؟" اس کی آنکھوں سے دو آنسو بے جان ہو کر لڑھک گئے۔

"سرائیورز! میں نے بہت سے لوگوں کو سرائیو کرنے کا موقع دیا۔ مجھے انہیں مصعب حنفی کی طرح کچل دینا چاہیے تھا۔" اس کے لبوں پر دوڑتی زہریلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے ٹپکتے وحشی پن نے ازا کو سانس روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"مصعب حنفی۔۔۔" اس نے زیرِلب یہ نام دہرایا تھا۔ دلال دھیرے سے اس کے کان کے پاس جھکا تھا۔

"خیام حنفی کا بھائی جو میرے قدموں تلے کچلا گیا۔ اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی اور گوشت کے مسلے جانے کی آواز میری زندگی کا سب سے بہترین ساز ہے جو میں نے سنا ہے۔" وہ ہلکا سا ہنسا تھا۔ ازا نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔

"میں نفرت کے قابل نہیں ہوں ازا!" خیام حنفی کی التجا ازا کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا محال ہوا تھا۔ دلال نے ستائشی نظروں سے اس کی آنکھوں میں امڈتے خوف کو دیکھا تھا۔ "وہ یہاں آرہا ہے۔۔۔ تمہارے پیچھے۔۔۔ تمہارا بھائی بھی آرہا ہے۔" اس کا دماغ ٹھنکا تھا۔ دروازے پر کھڑے دو گارڈز کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ آنکھوں سے آنسو لڑھکتے گئے۔

"تم غلط ہو ازا تاشفین! تم واحد ہو جس نے مجھے قتال سے روکا ہوا ہے۔ تمہاری موت میرے لیے نئے راستے کھول دے گی۔ پھر ہزاروں مصعب حنفی ہونگے جو میرے قدموں تلے کچلے جائیں گے۔ ہزاروں مارک مجھ پر اپنی جان قربان کریں گے۔ اسٹیون جیسے کئی لوگ میرے ایک اشارے پر زہر پی لیں گے۔" حیرت انگیز انکشافات تھے جو ہتھوڑوں کی طرح اس کے سر پر برس رہے تھے۔ دلال۔۔۔ ہمیشہ سے ان سے ایک قدم آگے تھا۔۔۔ ہمیشہ!

”میں وہ ولن ہوں، جو کہانی کے آخر تک اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بالکل اس بحری جہاز کی طرح جس کا عکس تمہارے باپ نے اتارا تھا۔“ وہ آنکھیں چھوٹی کیے بغور ازا کے رخساروں پر گرتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔

”تم۔۔۔ تم بہت بری موت مرو گے دلال!“ وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ دلال نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے رخساروں پر گرتے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کے پوروں پر چنا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی جیسے اسے کسی اچھوت نے چھو لیا ہو۔ دلال نے ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی پھر پلٹ گیا۔

”قانتہ کو کیوں مارا تم نے؟“

”وہ بے وقوف عورت میرے راز جان چکی تھی۔ اس گند سے جان چھڑوانا لازم ہو گیا تھا۔“ اس کے الفاظ پر ازا ساکت ہوئی تھی۔ دلال نے گردن موڑ کر ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر قدم بڑھا دیے۔

”تم نے ابراہم وارلڈ کے ساتھ کیا کیا ہے دلال؟ میرا باپ کہاں ہے؟!“ اس کے عقب میں ازا کی کمزور سی آواز گونجی تھی۔ وہ ہلکا سا ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں اس کا اگلا قدم کمرے سے باہر اٹھا اور وہیں وہ دونوں گارڈز کمرے میں آئے تھے۔ بنا وقت ضائع کیے اپنی پستولیں سیدھی کر کے نشانہ لیا اور اگلے ہی لمحے میں ٹریگر دبا دیا۔ بیک وقت دو فائر ہوئے تھے۔ کانوں کو چیرنے والی آواز گونجی تھی۔ ازا کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ سرخ قالین پر قدم رکھتے دلال کی آنکھیں چمکیں۔ گاڑی سے باہر نکل کر اندر کی طرف بھاگتا زیاد۔۔ ایک لمحے کے لیے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اسے لگا۔۔ وہ سانس نہیں لے پائے گا۔

☆☆☆

• بیس منٹ قبل

اندھیر کوٹھڑی میں روشن دان سے چھن کر کے آتی ہلکی سی روشنی کو یک ٹک تکتی ان دو آنکھوں کی بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ اس لاغر سے انسان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے کمزور سے وجود کا بوجھ اٹھا سکے۔ وہ سارا سارا دن اسی طرح کونے میں دبکا اس روشنی کو تکتا رہتا تھا۔ بیس دن اندھیرے میں اور دس دن روشنی میں۔۔ دلال اسے ہرگز اندھا نہیں کرنا چاہتا تھا، یہ واضع تھا۔

یونہی یک ٹک روشنی کو تکتے ہوئے اس نے گہری سانس لی پھر آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ اس کے جھریوں زدہ رخسار پر لڑھک گیا۔ بند آنکھوں سے۔۔ اس کانچ سی خاموشی میں وہ محسوس کر سکتا تھا کہ زنجیر گری تھی۔ کچھ فاصلے پر ہلکی سی روشنی ہوئی تھی۔ کوئی دھیرے دھیرے زینے اتر رہا تھا۔ آواز بھاری بوٹوں کی تھی۔ یہ چاپ اس کے لیے بہت مانوس سی تھی۔ وہ برسوں سے اس چاپ کو سننے کا عادی ہو چکا تھا۔۔ اس کے پاس بس یہی ایک شخص آیا کرتا تھا۔۔ اسے اس قید خانے میں پھینکنے والا، اس کی بیٹی کا مجرم۔۔ دلال!

چند پل خاموشی سے گزرے۔ بھاری بوٹ قریب آ رہے تھے۔ چابی تالے میں لگی۔ لوہے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ وہ شخص اندر آیا۔ اپنے جوتوں کا رخ اس کی طرف کیا۔

"تمہاری بیٹی تم سے ملنا چاہتی ہے۔" بھاری آواز میں ادا کیے گئے الفاظ نے اس پر سکتہ طاری کیا تھا۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کھڑے دلال کو دیکھا تھا۔ بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ بس چپ چاپ عجیب سی نظروں سے دلال کو تکتا رہا۔ دلال اس کے خود کو تکنے پر ہلکا سا مسکرایا پھر پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔ "اونہوں۔۔ تمہارا حلیہ بہت خراب ہے۔ پہلے تم ذرا اپنے حلیے کو سنوارو۔ پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ۔ یہاں تک

کہ تم میں اتنی ہمت آجائے کہ تم باآسانی اپنے قدموں پر چل کر اپنی بیٹی کے پاس جاسکو۔" دلال نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اب کون سی۔۔۔چال چل رہے ہو؟" بھوک اور نقاہت کی وجہ سے اسے بولنے میں شدید تکلیف کا سامنا تھا۔ پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔

"مجھ پر یقین کرو۔۔ تم بہت اچھی جگہ اپنی بیٹی سے ملنے جارہے ہو۔۔ اپنی ازابیلا سے!" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی اور لہجے میں عجیب سی تلخی تھی۔ اس نے ایک نرم سی نگاہ اس کمزور سے وجود پر ڈالی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کے قدم گننے لگا۔ ایک دو۔۔ چار آٹھ۔۔ ٹھیک بیس قدم اٹھانے کے بعد وہ زینے چڑھ رہا تھا۔

ٹھیک بیس منٹ بعد اسے گھر سے باہر لایا گیا تھا۔ اس نے بغور سرخ قالین پر گرے سرخ انسانی خون کو دیکھا پھر زینے اترنے لگا۔ سامنے گاڑی کھڑی تھی۔ سورج کی ہلکی سی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ سرمئی رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس، نقاہت بھرا مگر چند لمحات پہلے کے مقابلے میں نکھرا نکھرا سا چہرہ۔۔ آنکھیں گہری اور ذہانت کی آئینہ دار۔۔ پیشانی کشادہ۔۔ تازہ کی گئی شیو۔۔ یہ چہرہ یہ وجود ابراہم وارلڈ کا تھا۔ وہی ابراہم وارلڈ جو فائرنگ کی آواز سن کر ٹھٹھک کر رکا تھا۔ ماتھے پر بل ڈالے اس نے مڑ کر تاریک راہداری کو دیکھا پھر چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اکیس منٹ چالیس سیکنڈ پر اس کی گاڑی دلال کی حویلی سے باہر نکل کر کشادہ اور ہموار سڑک پر آچکی تھی۔

☆☆☆

• پندرہ منٹ قبل

"تم ایک سائیکو ہو دلال! تمہیں ازا "بس" اچھی لگی کیونکہ تم نے اسے سمندر کے مقابلے پر سمجھا۔ ازا نے تمہارے اندر کے مردہ انسان کو زندہ کیا تھا۔ تم دنیا کے لیے وحشی درندے تھے مگر تم کبھی بھی ازا کے سامنے اپنا وحشی پن ظاہر نہیں کر سکے۔ تم دلال تم! تم ازا کو نہیں مار پائے۔ تم یہ تب تک نہیں کر سکے جب تک وہ تمہارے مقابلے پر نہ آگئی۔ زیاد کی حقیقت جانتے ہوئے بھی اسے ازا کی زندگی میں داخل ہونے دینا، کمپنی ازا کے نام کرنا۔۔ سب کا مقصد صرف ازا کو اپنے مقابلے پر لانا تھا۔ تم موقع ملتے ہی اس کی جان لے لو گے!" مصعب کی آواز تین لوگوں نے سنی تھی۔ سعاد، خیام اور دلال۔

"زبردست۔۔ تم مجھے حیران پر حیران کیے جا رہے ہو۔" دلال کی آواز میں ستائش تھی۔ مصعب نے ٹھہر کر اسکرین پر دیکھا جہاں ٹائمر رک چکا تھا۔ ایک اور دھماکہ روک لیا گیا تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

"تیسرے سوال پر آتے ہیں۔ آگ کے اس کھیل میں۔۔ مَیں نے خیام حنفی کو اپنی صف میں کیوں کھڑا کیا؟! میں اسے موقع پر مار سکتا تھا۔" اس کے سوال نے ان تینوں کو اپنی جگہ ساکت کیا تھا۔ ٹائمر شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اس بار دلال کو کال کاٹنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"میں تمہاری صف میں نہیں کھڑا دلال! میں تم جیسا نہیں ہوں!!" خیام چلایا تھا۔ سعاد نے خوفزدہ نظروں سے مصعب کو دیکھا تھا۔ دلال کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"تم نے بھی میری طرح کئی معصوم لوگوں کو آگ کی نذر کیا ہے خیام حنفی"!

"وہ میں نہیں تھا۔۔ تم تھے! تم وہاں آگ لگانا چاہتے تھے۔" اس کا چہرہ مارے ضبط کے سرخ پڑ چکا تھا۔

"حسد کی آگ نے تمہیں اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔" دلال نے اسے کچھ یاد دلانا چاہا تھا۔

”تم۔۔ تمہاری وجہ سے میں قاتل بنا۔ تمہاری وجہ سے میں نے ازا کی زندگی برباد کر دی۔ تم ہی تھے وہ جس کی وجہ سے میں نے اپنا بھائیوں جیسا دوست کھویا۔۔ تم۔۔ تم تھے جس نے مصعب کو اپنے قدموں تلے کچلا تھا۔“ اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ چہرے سے خون چھلکنے لگا تھا۔

”تمہارا بھائی۔۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں تمہیں بھی اس کے ساتھ اپنے قدموں تلے نہیں روند سکا۔ میں تمہاری ماں کی طرح تمہاری گردن پر خنجر نہیں پھیر سکا۔۔ اسے بالکل تکلیف نہیں ہوئی ہو گی۔۔ وہ خنجر بہت تیز تھا۔۔ سیدھا شاہ رگ پر چلا تھا۔۔“ وہ اپنی باتوں سے خیام کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔

”میری ماں کا نام مت لو!!“ وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ دائیں آنکھ سے ایک آنسو گال پر لڑھک گیا تھا۔

”تمہارا بھائی۔۔۔ وہ بہت پیارا تھا۔ بہت نرم اور نازک۔۔ اس کی ہڈیاں بہت آسانی سے چٹخ گئیں۔ اس کا گرم سرخ خون بہت تیزی سے بہہ گیا۔“ خیام کو لگا تھا وہ پھٹ پڑے گا۔ سعاد اپنے منہ پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے موبائل کو تک رہی تھی۔ مصعب سانس روکے دلال کی بات سن رہا تھا۔ ”اور تمہارا باپ۔۔ وہ قیدی۔۔ سنان حنفی! یقین مانو میں نے پوری کوشش کی کہ ایک ہی لمحے میں اس کا جسم گولیوں سے بھون ڈالا جائے۔ اگر وہ دو گولیوں پر ہی جان نہ دے دیتا تو یقیناً میں اپنی پستول کی تمام گولیاں اس کے جسم میں اتار کر اسے ابدی سفر پر بھیج دیتا۔ میں ہر گز اسے اس کے ”قاتل بیٹے“ سے نہیں ملنے دینا چاہتا تھا۔“ خیام کو اپنے رخسار پر نمی محسوس ہوئی تھی۔ آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی دبیز تہہ جمع ہونے لگی تھی۔ اسٹیرنگ پر اس کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی۔

”میں قاتل نہیں ہوں دلال!! تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے، میں قاتل نہیں ہوں!“ اس نے ضبط سے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"تم نے مجھے مایوس کیا الزر قاوی! میں یہ کھیل صرف تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا، تم خیام کو بیچ میں لے آئے۔ اب اس شہر میں قیامت برپا ہو گی اور تم اسے روک نہیں پاؤ گے۔ اور ہاں۔۔ تیسرے سوال کا جواب میں خود دے دیتا ہوں۔۔ سننا چاہو گے خیام؟" وہ ہلکا سا ہنسا۔ خیام نے جیکٹ کے بازو سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ مصعب نے ضبط سے مٹھیاں بھینچیں۔ سعاد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میں اپنے پیچھے ایک ایسے سروائیور کو رہنے دینا چاہتا تھا جو میرے کیے گئے قتل اپنے سر لے لے۔ اور اس کے لیے خیام حنفی سے بہتر میں نے کسی شخص کو نہیں پایا! تم چاہو تو زمین پلٹ دو اور آسمان گھما ڈالو۔ تم اس حقیقت کو نہیں بدل سکتے کہ حسد کی آگ میں تم نے کئی معصوموں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ تم بدتر نہیں بدترین ہو! تم اپنی لگائی گئی آگ کبھی نہیں بجھا سکو گے۔ تم حقیقت کو جھٹلا نہیں پاؤ گے۔ تمہارا دل گواہی دے گا تم قاتل ہو!! تم میں اور دلال میں بس ایک فرق ہے۔۔ دلال نے بنا کسی مقصد کے قتل و قتال جاری رکھا جبکہ تم۔۔ تم نے اس قتل و قتال کو ایک مقصد کا نام دے دیا۔" خیام کو لگا تھا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ اسے اپنے جسم میں خون کی گردش رکتی محسوس ہوئی۔ پیشانی کی رگیں ابھرنے لگیں۔ چہرہ خون جیسا سرخ ہو گیا۔ بہت کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک گئے۔ اس نے غصے سے اسٹیرنگ پر زور سے ہاتھ مارا۔ سر سیٹ پر ٹکاتے ہوئے اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ وہ پھٹ پڑا تھا۔

"تم خیام حنفی کی حقیقت سے کب آگاہ ہوئے؟" مصعب نے زکام زدہ سی سانس خارج کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جب میں نے اسے خود سے زیادہ ازاتا شفین کا وفادار پایا۔" دلال نے کال کاٹ دی تھی۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین ایکدم تاریک ہو گئی۔ اب کوئی پہیلی نہیں تھی، کوئی سوال نہیں تھا۔ اب بس۔۔ قیامت کا برپا ہونا باقی تھا۔ سعاد

گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ مصعب نے ضبط کے مارے سختی سے آنکھیں میچی تھیں۔ تھکے تھکے سے انداز میں اس نے وائرلیس اٹھایا تھا۔

"میں الزرقاوی۔۔۔ حزب اللہ کی صف اوّل کے مجاہدین کو میدانِ جنگ میں اترنے کا حکم دیتا ہوں!" حکم صادر ہوا تھا۔ آن کی آن میں کئی مجاہدین میدان میں اسلحے سے لیس کھڑے تھے۔ مصعب احکامات جاری کر رہا تھا۔ اس کی آواز بلند تھی، عزم سے بھرپور تھی۔ آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی اور رعب تھا۔ اگر دلال قیامت برپا کرنا چاہتا تھا تو۔۔۔ مصعب الزرقاوی کو منصف اور جلاد بننے کا پورا حق حاصل تھا۔

☆☆☆

مسلسل ایک گھنٹے سے کمپنی میں فائرنگ جاری تھی۔ دونوں جانب سے بھرپور مقابلہ جاری تھا۔ راہداری میں کئی لاشیں گری ہوئی تھیں۔ خون سفید فرش پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ دروازوں اور دیواروں میں کئی گولیاں پیوست ہو چکی تھیں۔ دیواروں کی اوٹ میں بیٹھے جوابی فائرنگ کرتے ضرار اور جندل، پسینے میں شرابور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے۔

کئی پستولیں خالی ہو چکی تھیں۔ میگزینیں بار بار بدلی جا رہی تھیں۔ کانوں کو چیرنے والی فائرنگ کی آواز کسی اور آواز کو سننے نہیں دے رہی تھی۔ ان دونوں نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر دوسری طرف دلال کے آدمی جیمرز لگا چکے تھے۔ وہ اس کمپنی میں مکمل طور پر محصور ہو چکے تھے۔ دوسری طرف سے فائرنگ جاری رہی۔ وہ دونوں لمحہ بھر کے لیے رکے۔ دیواروں پر سر ٹکائے دونوں نے تھکن سے آنکھیں موندیں۔ تنفس بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ان دونوں کو یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف دلال کے آدمی تھے اور تعداد اتنی کثیر کہ دو گرتے تو چار نکل آتے۔

انہوں نے جو فائرنگ روکی تو دوسری طرف بھی خاموشی چھا گئی۔ اس قدر خاموشی کہ وہ جو تیز تیز سانس لیتے اپنا تنفس بحال کر رہے تھے سانس روک کر بیٹھ گئے۔

”دلال سر کا حکم ہے، کمپنی سمیت انہیں ختم کر دو!“ ایک بھاری آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ چند دوڑتے قدم۔۔ بھاری بوٹ۔۔ جلدی جلدی صادر ہوتے احکامات۔۔ حکم واضع تھا۔ خون کی جو ندی بننے جا رہی تھی، اس میں سب سے پہلے ان دونوں کا خون گرنے والا تھا۔ دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا تھا۔

”آخری وقت تک لڑیں گے۔“ جندل نے اسے یاد دلایا۔ ضرار نے سر کو جنبش دی۔

”میرے تمام حق معاف کرنا جندل!“ اس کی آواز دھیمی تھی۔

”تم بھی۔۔“ جندل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ضرار نے سر کو جنبش دی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے ٹھہر کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے میں وہ دونوں نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ فائرنگ کی تیز آواز اور نعرہ تکبیر۔۔۔ دھماکے کی آواز میں ہر آواز دبتی چلی گئی۔ کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز گونجی تھی۔ آگ کے شعلے دور تک بلند ہوئے تھے۔ شیشے چکنا چور ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے سب تھم چکا تھا۔
خاموشی۔۔ سکوت۔۔۔ اندھیرا۔۔ تاریک فضا اور دور دور تک اٹھتے آگ کے شعلے۔۔ دلال جو قیامت برپا کرنا چاہتا تھا اس کی شروعات ہو چکی تھی۔ وہ جو خون کی ندی قائم کرنے جا رہا تھا اس میں پہلا خون۔۔ جندل اور ضرار کا گرا تھا۔

”اور جسے سمندر قبول نہ کرے، اسے آگ بھسم کر ڈالتی ہے۔“

☆☆☆

زیاد حواس باختہ اندر کی طرف بھاگا تھا۔ سرخ قالین پر گرے خون کو دیکھ کر اس کے دل میں کئی شبہات نے جنم لیا تھا۔ وہ اپنے ہر شک، ہر شبے کی نفی کرتا کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔ دماغ سُن ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ اس نے پوری طاقت سے کمرے کے بند دروازے پر لات ماری تھی۔ دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا۔ اس کی نگاہ سامنے اٹھی تھی۔ اس کے لیے سانس لینا محال ہوا تھا۔

ازا اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے تکلیف کے عالم میں نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پیٹ سے نکلتا خون پانی کی طرح فرش پر گر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ خون میں رنگ چکے تھے۔ کپڑے خون میں نہا چکے تھے۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

"ازا۔۔۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔

"بھائی۔۔ آگے مت۔۔ آئیں۔۔ بھائی نہیں۔۔" اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے بے ربط سے الفاظ نکلے تھے۔ زیاد تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ اسی لمحے میں کسی نے پیچھے سے اپنی پستول کی نال اس کے سر پر ماری تھی۔ اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا تھا۔ دوسرے آدمی نے زوردار لات اس کی کمر پر رسید کی تھی۔ وہ منہ کے بل سفید فرش پر گرا تھا۔ فرش پر گرتے ہی ازا کے بہتے خون سے اس کے ہاتھ رنگین ہوئے تھے۔ اس نے اٹھنا چاہا تھا مگر اسی وقت زوردار ڈنڈا اس کی کمر پر لگا تھا۔ اسے اپنا جسم ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں، آنکھوں میں نمی پگھلنے لگی تھی۔

"تم ہمیشہ اپنی بہن کی حفاظت کرو گے زیاد! وعدہ کرو۔"

”بھائیوں کو اپنی بہنوں کی حفاظت کے لیے وعدوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھوں گا! ازا میری گڑیا ہے بابا۔“

بیک وقت دو پستولوں کی نالیں اس کے پیٹ پر پڑی تھیں۔ اس کے منہ سے خون نکلا تھا۔ آنکھوں سے آنسو لڑھک کر رخسار پر گرے تھے۔ کسی نے اپنے بھاری بوٹ سے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تھی۔ اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا تھا۔ پیشانی سے خون کی لکیر نمودار ہوئی تھی۔ اسی وقت اسے ایک اور ٹھوکر لگی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا اس کی رگیں پھٹ گئی ہوں۔ منہ سے تیزی سے بہتا خون اس کی جان نکال رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا ازا مزید اپنے قدموں پر نہیں کھڑی رہ سکی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گری تھی۔ اس کا سر سفید فرش سے ٹکرایا تھا۔ پورا وجود خون میں نہا چکا تھا۔ زیاد نے تکلیف کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اسی آدمی نے زوردار ڈنڈا اس کے پیٹ پر رسید کیا۔ وہ آنکھیں میچتا کروٹ پر لیٹتا تکلیف سے کراہا تھا۔ شاید وہ ہمت کر لیتا۔۔ وہ پہلے سے جسم میں شدید درد کا شکار نہ ہوتا تو وہ اٹھ جاتا۔۔ مگر اس لمحے میں اسے درد سے اپنی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مر رہا تھا۔۔

”بھائی۔۔ آپ جلد لوٹیں گے ناں؟ یقین مانیں اس دنیا میں آپ کے سوا میرے پاس کوئی نہیں۔“ ازا کی مدھم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس نے نم آنکھوں سے نگاہیں ترچھی کر کے ازا کو دیکھا تھا جس کا سر دائیں طرف ڈھلک چکا تھا۔ اس کے وجود کے اردگرد خون تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر کنپٹی سے پھسلتا فرش پر گرا تھا۔ ایک آدمی نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی پھر اسے زور سے ٹھوکر مار کر پلٹ گیا۔ دوسرا آدمی اس سے پہلے ہی پلٹ چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ ٹوٹتے جسم کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ دھیرے سے کھسک کر ازا کے قریب ہوا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔

"ازا۔۔ازا۔۔۔ آنکھیں کھولو یار۔" اس کی آواز کانپ گئی۔ آنکھوں سے آنسو لڑھکتے گئے۔ اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ اتار کر اس کے پیٹ پر رکھی۔ زخم دبا کر خون روکنے کی کوشش کی۔ اس کے اپنے ہاتھ خون میں رنگنے لگے۔ اس نے اس لمحے میں خود کو بہت بے بس محسوس کیا تھا۔ "ازا۔۔ازا مجھے یہ دکھ مت دینا۔ اٹھو یار۔۔" وہ اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھتا سسک اٹھا تھا۔ وہ پورا اونچا مرد اپنی بہن کا سر گود میں رکھے پھٹ پڑا تھا۔ آنسو تیزی سے رخساروں پر بہتے گئے۔

ان لمحات میں اس نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ ان دو آدمیوں کے جاتے ہی کمرے میں چھت سے کوئی زہریلی گیس چھوڑی گئی تھی۔ وہ گیس دھیرے دھیرے کمرے میں پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ ازا پر جھک کر اس کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کرتے زیاد کے لیے سانس لینا محال ہوا تھا۔ اس نے چونک کر کمرے میں نگاہیں دوڑائیں جہاں گیس بہت تیزی سے پھیلتی جارہی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے ازا کو دیکھا۔ اسے کسی بھی صورت میں زہریلی گیس اپنے اندر نہیں لینی چاہیے تھی۔ کمرے میں دروازے کے سوا فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کھڑکی مکمل طور پر بند کر دی گئی تھی۔ وہ ہر طرح سے انہیں محصور کر چکے تھے۔

"مجھے معاف کر دینا ازا۔۔ میں تمہاری حفاظت نہیں کر پایا۔" اس نے زخمی سے لہجے میں کہا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جو کفن جیسا سفید پڑ چکا تھا۔ اس کے لیے دھیرے دھیرے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ درد سے ٹوٹتا جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ اس نے تھک کر دیوار پر سر ٹکا دیا تھا۔ آنکھیں موندتے ہوئے اس کے لب دھیرے سے پھڑ پھڑائے تھے۔

"یا الٰہی۔۔ انت ربی!" بند آنکھوں سے ذہن کی اسکرین پر سعاد کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ اکھڑتی سانسوں کے درمیان ایک دھیمی سی سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم نہ آئے تو یہ انتظار تمہارے مقدر میں لکھ دیا جائے گا۔۔ مجھے مایوس مت کرنا زیادہ۔۔یقین کرو میں تمہیں لمبا انتظار نہیں کرواؤں گی۔ تم نہ لوٹے تو جینا میرے لیے بھی محال ہو گا۔" اس کی سانسیں تھم گئیں۔ مدھم سی کچھ دھڑکنوں کے بعد اس کی ایک دھڑکن مِس ہو گئی۔ ہر سو خاموشی چھا گئی۔۔ گہری اور کانچ سی خاموشی۔۔

☆☆☆

نم آنکھیں رگڑ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گہری سانس لے کر اپنا تنفس بحال کیا پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔ چند پل ہی گزرے تھے کہ ایک گاڑی نے تیزی سے اسے کراس کیا تھا۔ وہ اس گاڑی کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹھکا تھا۔ یہ گاڑی ابراہم وارلڈ کی تھی۔ اس نے لب بھینچتے ہوئے اپنی گاڑی اس کے تعاقب میں ڈال دی۔ کشادہ ہموار سڑکوں پر پوری رفتار سے دوڑتی وہ دو گاڑیاں آگے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ خیام نے کئی بار اس کے برابر میں آنا چاہا مگر وہ ناکام رہا۔ ابراہم کی گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ اونچی نیچی ڈھلوانوں کو سر کرتے ایک جگہ پر رک گیا۔ سامنے اونچا پہاڑ تھا۔ ابراہم گاڑی وہیں روک کر تیزی سے گاڑی سے نکلا۔ خیام نے بھی جھٹکے سے گاڑی روکی اور اپنی پستول نکال کر اس کے پیچھے بھاگا۔ ابراہم پوری رفتار سے دوڑتا اس اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوا تھا۔ خیام نے تیزی سے اس کے پیچھے سے آکر اس کی گردن دبوچتے ہوئے زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا۔

"تم بے غیرت، درندے۔۔ اگر میں قاتل ہوں تو پھر تمہاری جان لیتے ہوئے یقین کرو میں ایک لمحے کے لیے نہیں سوچوں گا۔" وہ پے در پے اس کے جبڑے پر مکے رسید کر رہا تھا۔ ابراہم کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔

ہونٹوں کے کنارے پھٹ چکے تھے۔ خیام نے زوردار لات اس کے سینے پر رسید کی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پہاڑ کے عین کنارے پر کھڑا ہوا تھا۔

"آگے مت آنا۔۔ تم جو سمجھ رہے ہو وہ نہیں ہے۔۔ میں۔۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔۔" ابراہم کی آواز کانپ گئی تھی۔ وہ اس کی بات پر سر جھٹک کر ہلکا سا ہنسا۔

"اب تو اعتراف کر لو۔ اور کتنی بے غیرتی دکھاؤ گے ہاں؟ میں تمہاری جان لے لوں گا دلال!!" وہ بہت کوشش کے باوجود خود پر ضبط نہیں کر پایا تھا تبھی حلق کے بل چلا اٹھا تھا۔ اس نے بنا وقت ضائع کیے ابراہم کو ہاتھ میں پکڑی پستول کے نشانے پر لیا تھا۔ اسی اثناء میں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دے۔ خیام نے پلٹ کر ان سے ذرا فاصلے پر رکتی تین سے چار پولیس کی گاڑیوں کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے پولیس اہلکار اپنی گاڑیوں سے نکل کر اسے اپنی پستولوں کے نشانے پر لے چکے تھے۔

"خبردار! ہاتھ اٹھا دو۔ ابراہم وارلڈ کو کوئی مقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" ایک پولیس اہلکار نے بلند آواز میں کہا تھا۔ خیام نے طنزیہ نگاہوں سے ابراہم وارلڈ کو دیکھا جس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹا تھا۔ کمزور سے چھوٹے پتھر پر اسکا پاؤں پڑا اور پتھر نیچے لڑکھتا چلا گیا۔ ابراہم نے چونک کر نیچے دیکھا۔۔ وہاں ہر طرف۔۔ دور تک پھیلا ٹھاٹھیں مارتا بے کراں سمندر تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے خیام کو دیکھا جو دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"میں۔۔ میں دلال نہیں ہوں۔۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔۔ یہ اس کا کھیل ہے۔۔ وہ۔۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی خیام اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر پولیس اہلکاروں کو دیکھا جو تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔

"فائر!" آن کی آن میں پستولوں کے ٹریگر دبائے گئے۔ کئی گولیاں تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب خیام نے ابراہم سمیت پہاڑ سے چھلانگ لگادی تھی۔

وہ بلندی سے گرا تھا۔۔ بہت زیادہ بلندی سے۔۔ ہوا کو چیرتا۔۔ اونچائی سے وہ سمندر میں گرا تھا۔ ایک لمحے کے لیے پانی میں تلاطم برپا ہوا تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں شدید تکلیف محسوس ہوئی تھی گویا پانی پیٹ پھاڑ کر اس کے جسم کے اندر داخل ہو گیا ہو۔ پانی میں داخل ہوتے ہی تمام آوازیں تھم گئیں۔ اس نے یہاں ایک الگ جہان پایا۔ ایک لمحے کے لیے سب رکتا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بہت جلد اسے محسوس ہوا ابراہم اس کا بازو تھامے اسے جھنجھوڑ رہا ہے گویا اس کی مدد سے اوپر کو اٹھنا چاہ رہا ہے۔ اس نے اپنا پورا زور لگایا تھا۔ اس نے ابراہم کو دھکیلنا چاہا تھا۔ وہ شاید تیرنا جانتا تھا تبھی تیزی سے اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ خیام نے وہیں سے اس کی ٹانگ پکڑی تھی۔ اوپر کو اٹھتے ابراہم کے اوسان خطا ہوئے تھے۔ اس نے اپنا پورا زور لگایا مگر خیام کی گرفت سے اپنی ٹانگ آزاد نہیں کروا پایا۔ بہت جلد انہیں احساس ہوا تھا۔۔ پانی ان کے پھیپھڑوں میں داخل ہو رہا تھا۔ ان کے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔

اس نے وہیں ابراہم کو نیچے جاتے دیکھا تھا۔ وہ پانی میں گرتا جا رہا تھا۔۔ گہری اتھاہ گہرائیوں کی طرف جہاں سے لوٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔ خیام نے اوپر کو اٹھنے کی کوشش کی مگر جسم بے جان ہو چکا تھا۔ اس کی سانسیں رک رہی تھیں اور دھڑکنیں خطرناک حد تک سست پڑ چکی تھیں۔ ہر طرف پانی تھا۔۔ بے کراں سمندر تھا۔۔

سمندر اس کا دوست نہیں تھا، سمندر اس کے دوست کا دوست تھا۔ یہ جگہ اس کی نہیں تھی۔۔ یہ دنیا اس کے لیے نہیں بنی تھی۔ اس نے پھر سے اوپر کو اٹھنا چاہا مگر وہ مزید گہرائیوں کی طرف جانے لگا۔ اس کا جسم بے جان پڑ چکا تھا۔۔ وہ بس اتھاہ گہرائیوں کی طرف گرتا جا رہا تھا۔ تو کیا۔۔ وہ اپنی لگائی آگ سمندر کے پانی سے بجھانے جا رہا تھا؟

کیا قدرت کو اس کی ایسی موت منظور تھی؟ اس کے بھورے بال ماتھے سے چپک گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بے جان وجود نیلے پانی سے سیاہ پانی میں داخل ہونے لگا۔ اسے سب کچھ ختم ہوتا محسوس ہوا۔

بند ہوتی آنکھوں سے جو آخری چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر ابھرا تھا وہ سنان کا تھا۔۔ عربی سلطان جس پر کسی مغربی شہنشاہ کا گمان ہوتا تھا۔۔

جب وہ مکمل طور پر ہوش وحواس کھو رہا تھا تو کسی کی سرگوشی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"میرا شیر!!" اسے لگا سنان نے اسے اپنی نرم گرم سی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔۔ وہ پرسکون سا ان کی آغوش میں سمٹتا چلا گیا تھا۔

پہاڑ کی بلندی پر۔۔ حد نگاہ تک پھیلے سمندر پر سایہ کرکے کھڑے وسیع آسمان پر۔۔ ایک عقاب نے اونچی اڑان بھری تھی۔ زئی آیا تھا۔ آسمان کی وسعتوں کو طے کرتا عقاب۔۔ سمندر کی گہرائیوں میں گرتے عقاب پر افسوس کی نگاہ ڈال کر۔۔ بہت اونچی اور بلند اڑان بھرتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

افق ستائشی نظروں سے اپنے سامنے کھڑے جوکر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آئسکریم تھی جسے بھول کر وہ جوکر کی الٹی سیدھی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ آئسکریم پگھل کر اس کے ہاتھ سے پھسلتی اس کے گاؤن پر گری۔ جوکر نے آگے بڑھ کر تیزی سے اس کے ہاتھ سے آئسکریم لی اور دور پھینک دی۔ وہ چند پل کچھ سمجھ نہیں پائی۔ جوکر نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ایک دوسری آئسکریم اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے مسکراتے ہوئے آئسکریم لی پھر سر کو خم دے کر باہر آ گئی۔

وہ آئسکریم کھاتی فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ ارد گرد بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ اونچے مالز، ہوٹل اور ریستوران میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اس کے بالکل برابر سے دو چھوٹے سے بچے بھاگتے ہوئے گزرے تھے۔ اس نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز گونجی تھی۔ دھماکے کے شور میں ہر آواز دبتی چلی گئی تھی۔ ہزاروں چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ ایک۔۔ دو تین۔۔ یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے تھے۔ سب کچھ ختم ہوتا نظر آیا۔ افق نے خود کو بہت نیچے گہرائی میں گرتے محسوس ہوا تھا۔ آئیسکریم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔ خون کی چھوٹی سی ندی قائم ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے۔۔ ہر سُو خاموشی چھاگئی۔

شور و غل۔۔ انسان پیدا کرتا ہے۔ اور انسان ہی مر جائے تو ہر طرف کانچ سی خاموشی کا راج ہوتا ہے۔

قیامت برپا ہو چکی تھی۔۔ ہر طرف لاشیں تھیں۔ کٹی پھٹی۔۔ بکھری لاشیں!

☆☆☆

بے کراں سمندر۔۔ سمندر ہی آغاز ہے اور یہی اختتام۔ یہاں نہ کوئی کنارہ ہے نہ حد۔۔ بس بے حد ہے جیسے محبت۔ شفاف چمکتا پانی جس پر دھوپ کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ بحری جہاز معمول کی رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ نوجوان کپتان جہاز کے عرشے پر ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ سمندر کی طرف پشت تھی۔ سیاہ داڑھی سے دھوپ کی ہلکی اور ٹھنڈی سی کرنیں ٹکرا رہی تھیں۔ چہرہ روشنی کی وجہ سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈ سے کان لال پڑ رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں موجود بوسیدہ اور قدیم سی کتاب پر ٹکی تھیں۔ سمندر پر لکھی گئی ایک انمول کتاب۔۔ اس کے عقب میں سمندر تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا سمندر، ایک لمحے میں پر سکون اور دوسرے لمحے میں بپھرا ہوا اور وحشی۔

"وسیع آسمان ہے اور گہرا۔۔ سمندر! انسان جب کسی چیز کو ٹوٹ کر چاہتا ہے تو اس کے سوا ہر چیز سے بے پرواہو جاتا ہے۔ وہی منزل، وہی آغاز اور وہی اختتام ہوتا ہے۔ میں نے سمندر کو ٹوٹ کر چاہا ہے۔ جیسے لوگ زمین کو چاہتے ہیں۔ زمین کے ایک ٹکڑے کے لیے لوگ برسوں تلواروں کی جھنکاروں کے سائے میں سانسیں لیتے ہیں، خون دیتے ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ جان دے دیں گے بس زمین کے اس ایک ٹکڑے کے لیے۔ میں سمندر کے لیے لڑنا چاہتا ہوں۔ میں سمندر پر حکمرانی کرنا چاہتا ہوں۔ فرض تو کرو یہ سمندر میرے قبضے میں ہوں تو یہ زمین والے تو سسک سسک کر جان دے دیں گے۔ میں سمندر کے لیے۔۔۔ جان لینا چاہتا ہوں۔ میری لڑائی سمندر کی لڑائی ہے۔ طوفان آئے گا، لہریں وحشی پن دکھائیں گی، موجوں میں تلاطم برپا ہو گا، جیت۔۔ جیت سمندر کی ہو گی۔ سمندر میرے نام ہو گا"!

وہ کئی پل یک ٹک ان الفاظ کو دیکھتا رہا۔ بھنویں ملائے، آنکھیں چھوٹی کیے، نچلا لب دانتوں میں دباتے ہوئے وہ پلٹا تھا۔ ٹھہر کر اپنے سامنے حد نگاہ تک پھیلے سمندر کو دیکھا۔ ایک شخص۔۔ جسے سمندر سے محبت نہیں تو اس کے قلم کی نوک ان الفاظ پر ٹوٹ کیوں نہیں جاتی جو سمندر سے محبت کا اظہار کرتے ہیں؟ لکھاری نے یہ تمام کتاب سمندر پر لکھی تھی۔۔ بس تخیل تھا، جس میں سمندر بہت خوبصورت تھا۔ وہ کبھی بھی کھلی آنکھوں سے سمندر کو ویسا خوبصورت نہیں پاسکا جیسا اس کے تخیل نے تخلیق کیا تھا۔ وہ سمندر جو اس کے تخیل نے تخلیق کیا تھا، وہ سمندر جس پر حکمرانی کرنا اس کی خواہش تھی، وہ حقیقت میں وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔ مگر صرف لکھاری کے لیے!

یہ قدیم کتاب جس قاری کے ہاتھ میں تھی اس نے سمندر کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ سمندر کے لیے لڑ سکتا تھا۔ وہ اپنی جان پر کھیل سکتا تھا۔ اور اس کھیل کی ہر چال اس کتاب میں ترتیب دی گئی تھی۔ ایک کتاب وہ تھی جو بس

خواہشیں ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئی تھی اور ایک کتاب وہ تھی جو ان خواہشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پڑھی گئی۔

ابراہم وارلڈ نے یہ کتاب اپنی شخصیت کے مطابق بہت دھیمے اور نرم سے انداز میں تحریر کی تھی۔ دلال اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنی شخصیت کے مطابق لہو میں نہلا کر حقیقت کا سہرا پہنانے جارہا تھا۔

”کبھی سمندر کی گہرائی میں جاکر تو دیکھو، تم اپنے سامنے ایک نیا جہان پاؤ گے۔ یہ جہان تمہارے جہان سے بہت مختلف ہے، مگر غور کرو۔ یہاں تمہارے ہم عصر نام نہاد انسان تمہیں چیرنے پھاڑنے کے لیے موجود نہیں۔ تمہیں تنہائی میسر ہے، تم پرسکون ہو۔ تم سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جارہے ہو، تمہیں اپنا آپ بے جان سا ہوتا محسوس ہورہا ہے۔۔ غور کرو تمہارا بوجھ کم ہوتا جارہا ہے۔ تمہیں سانس لینے میں دشواری ہو گی، تم سانس روک لو۔ خود کو مت تھکاؤ بس چپ چاپ سمندر کو تمہیں سمیٹنے دو! اس کی آغوش کی نرمی محسوس کرو۔ یہ تمہیں خود میں سمیٹے گا اور پھر اپنے سر پر بٹھادے گا۔ ہاں یہ تمہیں دھیرے سے تمہارے جہان میں بھیج دے گا۔ اگر سمندر تمہیں قبول نہ کرے تو جان لو کہ۔۔ تمہارے اندر وہ آگ نہیں لگی جسے بجھانے کے لیے سمندر کو تمہیں اپنی آغوش میں سمیٹنا پڑے۔“

☆☆☆

اونچی لمبی سرمئی دیواروں کے پار حزب اللہ کے صفِ اوّل کے مجاہدین اسلحے سے لیس صف بستہ کھڑے تھے۔ حکم کا انتظار تھا۔ نگاہوں میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ وہ ہر طرح کے حالات کے لیے تیار تھے، وہ جان کا سودا کر کے آئے تھے۔ اپنے آفس میں مصعب وائرلیس جیکٹ کی جیب میں ڈال کر اپنی پستول لوڈ کر رہا تھا۔ سعاد کرسی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی اضطراب کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں دلال کے گھر جاؤں مصعب؟ پلیز۔۔مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔" اس نے گذارش کی تھی۔ پستول لے کر پلٹتا بدر اپنی جگہ رک گیا تھا۔ ہلکا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

"آپ کے ساتھ پانچ مزید لوگ ہونگے۔ وہاں جاکر حالات سے فوری طور پر آگاہ کریں اور میرے احکامات کا انتظار کریں۔" سنجیدگی سے حکم صادر کر کے وہ پلٹ چکا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ جب وہ چلا گیا تو وہ گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کے بعد میز کی طرف آئی۔ جلدی سے نقاب لگایا، اپنا موبائل کوٹ میں ڈالا پھر احتیاطاً پستول اٹھا کر باہر کو لپکی۔ وہ باہر آئی تو اس ایک منٹ میں مصعب جا چکا تھا۔ وہاں پانچ لوگ اس کے منتظر تھے۔ وہ جلدی سے آگے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ان پانچوں نے بھی اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیے تھے۔

عمارت کا اونچا دروازہ کھلا تھا اور آگے پیچھے چار گاڑیاں سڑک پر آئی تھیں۔ درمیان والی گاڑی میں مصعب تھا۔ گود میں لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ دائیں طرف سیٹ پر وائرلیس رکھا تھا۔ سنجیدہ نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ٹکی تھیں۔ دلال سے اس کا رابطہ منقطع ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا وہ دلال کا پلان کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ سعاد نے اسے شہر کے متعلق تمام معلومات دے دی تھیں اور اب اسے بس وہ جگہ دیکھنی تھی جہاں دھماکہ ہونا تھا۔ ہزاروں جانوں کا دارومدار اس کے ایک فیصلے پر تھا۔ اس کا ایک فیصلہ اور جانے کتنے بے گناہ دلال کی لگائی آگ کی لپیٹ میں آجاتے۔

کچھ سوچ کر اس نے وائرلیس اٹھایا۔ اور مشکل فیصلہ لے کر پیغام جاری کر دیا۔ اگلے لمحات میں وہ چاروں گاڑیاں اپنی پوری رفتار سے دائیں طرف سڑک پر مڑ چکی تھیں۔ اس نے فیصلہ لے لیا تھا۔ دلال وہاں دھماکہ کرے گا، جہاں افق ہوگی۔ اور اگر نہیں۔۔۔ تو وہ ہزاروں جانوں سے کھیلنے جا رہا تھا۔

آن کی آن میں وہ چاروں گاڑیاں سڑک کے عین وسط میں رکی تھیں۔ اسلحے سے لیس مجاہدین فوراً سے حرکت میں آئے تھے۔ اونچی عمارات، ہجوم میں گھری سڑکیں، بھرے مالز اور ریستوران۔ انہیں ایک حد تک یقین تھا دھماکہ یہیں ہونا تھا۔ مصعب وائرلیس پر احکامات جاری کر رہا تھا، وہ اس کے احکامات کے مطابق اپنی اپنی پوزیشن لے رہے تھے۔ لوگوں کو مالز سے، ریستوران سے نکالا جا رہا تھا۔ عمارتیں خالی کی جا رہی تھیں، لوگوں کو سڑکوں پر لایا جا رہا تھا۔ چیخ و پکار آسمان کو چھونے لگی تھی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ چکی تھی۔ لوگ جوق در جوق اس دائرے کے اندر آ رہے تھے جو حزب اللہ کے مجاہدین نے بنایا تھا۔ ان کی تیز نظریں ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کوئی بعید نہیں تھی یہ خودکش دھماکہ ہو۔ وہ ہر طرح سے احتیاط برت رہے تھے۔

سڑک کے کنارے پر تنہا کھڑے تیز آواز میں وائرلیس پر احکامات جاری کرتے مصعب کی نگاہیں افق کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ اس کی تلاش کے لیے نکلنا چاہتا تھا مگر یہاں ہزاروں جانوں کا معاملہ تھا۔ وہ گردن موڑ کر، گھوم کر ہر طرح سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔

"سب کچھ کنٹرول میں ہے سر!" اسے تسلی بھرا پیغام ملا۔ اس نے بے اختیار آنکھیں میچیں۔ اسی لمحے میں۔۔ اس نے ایک لمحے کے لیے جب آنکھیں بند کر کے کھولیں تو اس نے آئسکریم ہاتھ میں لیے پریشان حال سی افق کو مال کے زینے اترتے پایا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہرا مگر پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ حواس باختہ ہو کر اس کی طرف بھاگا تھا۔

اس کے تیز اٹھتے قدم۔۔ اردگرد کا ہر دھندلا ہوتا منظر۔۔ تھمتا شور۔۔ وہ سُن ہوتے دماغ کے ساتھ اس کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ذہن میں اجاگر ہوتے کئی شک و شبہات کی نفی کرتا وہ بس اس کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا قدم مال کے زینوں میں سے پہلے زینے پر پڑا۔

"افق!" وہ چلایا۔ افق نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ نہیں رکا، زینے چڑھتا گیا۔ جس لمحے میں اس نے تیزی سے اس کی کلائی پکڑ کر اسے جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تھا اسی لمحے میں مال میں موجود بم پھٹا تھا۔ کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز سنائی دی تھی۔ یکے بعد دیگرے اردگرد کی عمارات میں تین دھماکے ہوئے تھے۔ آگ کے شعلے تیزی سے بلند ہوئے تھے۔ لوگوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا نے اس خون آشام شام کو مزید خوفناک بنا دیا تھا۔ سب اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے نیچے کو جھکتے چلے گئے تھے۔

دھماکے کے زور سے انہیں دھکا آیا تھا اور وہ زینوں سے سڑک پر گرے تھے۔ دونوں کو اپنا سر چکراتا محسوس ہوا تھا۔ کانوں پر ہاتھ رکھے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کرتے مصعب نے ٹھہر کر افق کو دیکھا جو نیم بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر گری تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر افق کی طرف آیا تھا۔

"افق۔۔ افق آنکھیں کھولو۔" وہ پریشانی سے اس کا گال تھپتھپا رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ گال پر گہرا زخم آیا تھا۔ اسی لمحے میں ایک لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔

"خیام حنفی کی تلاش میں نکلنے والی ٹیم کی طرف سے خبر آئی ہے سر۔" اس نے نظریں جھکائے دھیمی آواز میں اطلاع دی تھی۔ مصعب نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ خیام کی طرف سے اطلاع کیوں آئی تھی؟ خیام خود کیوں نہیں آیا تھا؟

”کیا ہوا ہے خیام کو؟“ اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

”وہ دلال سمیت خود کو سمندر کے حوالے کر چکے ہیں۔ پولیس۔۔ ان کی لاش کی تلاش میں ہے سر!“ اس نے سر جھکایا تھا۔ اور مصعب۔۔ اسے لگا تھا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ دھڑکنیں سست پڑی تھیں۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں یک ٹک اس لڑکے کو دیکھے گیا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے پھسلتیں افق پر ٹکیں جو ہنوز ہوش و حواس سے بے گانہ تھی۔

”خیام حنفی اگر واقعی اپنی جان دے چکا ہے تو خبر دار! میں اپنے بھائی کی لاش دشمن کے حوالے نہیں ہونے دوں گا۔ انہیں ڈھونڈو، یہ الزرقاوی کا حکم ہے!“ اسے اپنی آواز بھاری ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے یہ الفاظ جانے کیسے ادا کر تو لیے تھے مگر اب اپنا دل رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ٹھہر کر افق کو دیکھا تھا۔ آرام سے اسے دیوار سے ٹیک لگا کر بٹھایا تھا۔ دو لڑکیاں تیزی سے اس کی طرف آئی تھیں۔ وہ انہیں افق کے پاس چھوڑ کر دیوانہ وار اپنی گاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو اس کی لگائی آگ کو سمندر کے پانی سے نہیں بجھانے دے گا، ہرگز نہیں!

زمین پلٹ جائے یا آسمان گھوم جائے، وقت ٹھہرے یا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گریں۔۔ خیام حنفی! تمہاری سزا تو زندگی ہے، تم مر نہیں سکتے۔ ہرگز نہیں!

☆☆☆

•دس منٹ قبل

وہ دونوں جیسے ہی نعرہ تکبیر بلند کرتے باہر نکلے تھے، کمپنی کے داخلی دروازے سے حزب اللہ کے مجاہدین اندر آئے تھے۔ پل بھر میں وہ سب ان دونوں کے گرد حصار قائم کر چکے تھے۔ فائرنگ کی آواز میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ سب ضرار اور جندل کو اپنے گھیرے میں لیے چاروں طرف سے پُرزور فائرنگ کر رہے تھے۔ دلال کے آدمیوں کو ان کی اچانک آمد اور پھر زوردار حملے کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔

”صورتحال کیا ہے؟“ وائرلیس پر مصعب کی آواز گونجی۔ ایک لڑکے نے وائرلیس جندل کی طرف بڑھایا۔

”وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ بم فٹ کیا جا چکا ہے، وقت کم ہے۔“ اس نے جلدی جلدی صورتحال مصعب کے گوش گزار کی۔

”بہت بہتر۔ عین وقت پر کمپنی سے نکلو!“ مصعب نے حکم جاری کیا۔ جندل نے سر کو جنبش دی پھر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اس دوران فائرنگ ہنوز جاری رہی۔ دلال کے آدمی پیچھے ہٹتے رہے، حزب اللہ کے مجاہدین آگے بڑھتے رہے۔ سفید ٹائلز پر خون بہتا رہا۔ لاشیں گرتی رہیں۔ اچٹتی نگاہ ان تمام مناظر پر ڈال کر جندل گھڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے درست وقت کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے گھڑی کو دیکھنے لگا۔

”مقابلہ سخت ہو رہا ہے جندل! دو گر رہے ہیں تو چار اٹھ رہے ہیں۔“ اپنی پستول کی میگزین بدلتے پسینے میں شرابور ضرار نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ جندل نے ٹھہر کر اپنی گھڑی کو دیکھا۔

”تین کی گنتی پر دوستوں! ہم پیچھے ہٹ رہے ہیں۔“ اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ اب منظر کچھ یوں تھا کہ وہ فائرنگ کرتے پیچھے ہٹ رہے تھے جبکہ دلال کے آدمی دیواروں کی اوٹ

میں ان کی جانب سے فائرنگ تھمنے کے منتظر تھے۔ کوئی بھی اپنی جان کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا اور یہیں وہ فائدے میں رہے۔ وہ سب کمپنی کے دروازے تک آ گئے۔ وقت ہونے پر جندل گنتی شروع کر چکا تھا۔

"بم کو روکو ورنہ کمپنی سے نکلو۔ یہاں رہے تو سب مارے جائیں گے!!" ایک آدمی چلایا تھا۔

"ضرار ابھی!" جندل نے عجلت میں کہا۔ ضرار نے گیس بم اندر کی طرف پھینکا۔ پل بھر میں ہر سو گیس پھیلنے لگی۔ وہ سب فائرنگ روک کر تیزی سے باہر نکلے۔

"تین۔۔۔ دو ایک!" اس کی گنتی مکمل ہوئی اور ساتھ ہی کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز گونجی۔ بیک وقت دو دھماکے ہوئے تھے۔ آگ کے شعلے بلند ہوئے تھے۔ شیشے چکنا چور ہوئے۔ تیزی سے بہتے انسانی خون نے آگ کو مزید بھڑکایا۔ مجاہدین کے ہمراہ اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھتے جندل اور ضرار نے مڑ کر کمپنی کو دیکھا۔ کچھ لمحات پہلے جو اونچی عمارت پوری شان سے اپنے قدم زمین پر جمائے کھڑی تھی، وہ اب آگ کی نذر ہو چکی تھی۔

ایک پلان دلال کا تھا۔۔۔ ایک احتیاط الزرقاوی نے کی تھی۔ اور فتح اللہ کی ہوئی تھی۔

"ہم کامیاب رہے سر!" وائرلیس پر اطلاع دی گئی۔

"سمندر کی طرف بڑھو۔ میرے بھائی کو ڈھونڈو!!" ایک اور حکم صادر کیا گیا۔ ضرار اور جندل نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ مصعب کی بات سمجھ نہیں پائے تھے۔ وہ خیام کی بات کر رہا تھا، خیام کہاں تھا؟!

☆☆☆

وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ، لڑکھڑاتے قدم، بھیگی آنکھیں اور سُن ہوتا ذہن۔۔۔ ہر سو چھائی قبرستان سی خاموشی نے اسے مزید خوفزدہ کیا تھا۔ وہ سرخ قالین پر

گرے خون کے قطروں کا تعاقب کرتی کمرے کے دروازے پر آئی تھی۔ لب سختی سے ہونٹوں سے کچل کر سانس روک کر اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ دھکیلا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ ایک لمحے کو وہ کچھ نہیں دیکھ پائی۔ پورا کمرہ زہریلی گیس سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ گیس دھیرے دھیرے کمرے سے نکلنے لگی یہاں تک کہ چند پل بعد اسے کمرے کی دیواریں نظر آنے لگیں۔ وہ مزید انتظار کیے بنا اندر آگئی۔ نگاہ سامنے اٹھی تو اسے لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ کر نچوڑ لیا ہو۔ اسے یہ بھاری چھت اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔

زیاد دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سر ایک طرف کو ڈھلک چکا تھا۔ چہرہ خون آلود تھا، کپڑے سرخ رنگ میں رنگ چکے تھے۔ ازا کا بے جان وجود بھی اس کے سامنے ہی تھا۔۔ خون میں ڈوبا وجود۔۔ سر زیاد کی گود میں رکھا تھا۔ خون مسلسل فرش پر بہہ رہا تھا۔۔ مسلسل بہتا سرخ انسانی خون!

وہ تیزی سے ان کے پاس آئی تھی۔ جھک کر ازا کی نبض دیکھی تھی۔ رگوں میں گردش کرتا خون اور آتی جاتی سانسیں محسوس کر کے اس نے شکر کی سانس لی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر کانپتا ہاتھ زیاد کی شاہ رگ پر رکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس نے اپنا ہاتھ تیزی سے کھینچ لیا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔۔ جو دغا کر چکا تھا۔

”زیاد تاشفین اور اس کی بہن اس کمرے میں ہیں۔ دونوں زخمی ہیں، جلدی سے ادھر آؤ۔ ہمیں انہیں یہاں سے نکالنا ہے۔“ اس کی سماعت سے کسی کی آواز ٹکرائی۔ دوڑتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دو سے تین آدمی اندر آئے۔ ٹھہر کر سعاد کو دیکھا جو بے حس و حرکت زیاد کے برابر میں بیٹھی تھی۔ سانس تک روک چکی تھی۔

"سعاد۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں؟" کسی نے اسے بلایا تھا۔ ایک لڑکا اس کی حالت دیکھ کر تیزی سے آگے آیا۔ جھک کر زیاد کی شاہ رگ پر ہاتھ رکھا۔ کچھ محسوس نہ ہونے پر اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ اس نے اس کی شاہ رگ پر ہلکا سا زور دیا۔ وہ اس بار۔۔۔ اس کی آتی جاتی سانسوں کو محسوس کر سکا تھا۔

"سعاد۔۔ یہ دونوں زندہ ہیں۔ اٹھیں، آپ کو ہمت کرنا ہوگی۔" ایک لڑکے نے نرمی سے کہا تھا۔ اس نے چونک کر اس لڑکے کو دیکھا۔ آنکھوں سے کئی آنسو رخساروں پر لڑھکتے نقاب میں جذب ہوتے گئے۔ "زیاد Systolic heart کا شکار ہے، اس کی نبض بہت ہلکی چل رہی ہے۔ اٹھیں جلدی۔" اس لڑکے نے عجلت میں کہا تھا۔ وہ سر کو جنبش دیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ان دونوں کو اسٹریچر پر ڈال چکے تھے۔ ہر طرف شور تھا، افراتفری تھی۔ ایمبولینس کا بجتا سائرن۔۔ مصعب کی رکتی گاڑی۔۔ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں ہر منظر دیکھ رہی تھی۔ مصعب نے حالات کا جائزہ لے کر ازا اور زیاد کو اسپتال بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ ایمبولینس اس کے ایک اشارے پر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ سعاد کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ مصعب نے ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر اپنی گاڑی کی ڈگی کھولی۔ اس سے پیٹرول کا بھاری کین نکالا۔

اگلے لمحات میں۔۔ اس نے مصعب کو دلال کے گھر پر پیٹرول چھڑکتے دیکھا تھا۔ وہ غصے میں تھا۔۔ شدید غصے میں۔۔ اس کا چہرہ ضبط کے مارے لال پڑ رہا تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے اس نے پیٹرول گرا کر پیٹرول کا کین دور اچھالا تھا۔ اپنی جیب سے لائٹر نکالتے ہوئے وہ سعاد کے پاس آیا تھا۔ تیزی سے اس کی کلائی پکڑ کر وہ قدم بڑھانے لگا تھا۔ وہ دونوں دلال کے گھر سے فاصلے پر جا رہے تھے۔ وہاں جہاں، مصعب کی لگائی گئی آگ کے شعلے نہ پہنچ سکیں۔ کچھ فاصلے پر جانے کے بعد وہ رک گیا۔ ہاتھ میں موجود لائٹر آن کیا۔ آگ کا ننھا سا شعلہ جلا۔ اس نے پوری

قوت سے وہ لائٹر دلال کے گھر کی طرف اچھال دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیٹرول نے آگ پکڑی تھی۔ آن کی آن میں پورا گھر آگ کی لپیٹ میں تھا۔

”یہ دنیا اور اس کے ظالم لوگ، انسان کو درندہ بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ سعاد مزید خود پر ضبط نہیں کر سکی تھی۔ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ آگ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ وہ عالیشان حویلی۔۔ دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا سمندر کے پاس آیا تھا۔ اس کی چال میں واضع لڑکھڑاہٹ تھی۔ آنکھوں کے کناروں پر نمی کی دبیز تہہ بچھ رہی تھی۔ اسے اپنا وجود بے جان سا محسوس ہو رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے۔۔ بے کراں سمندر تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا بپھرا ہوا سمندر، اس کا دوست، اس کا محبوب۔ سمندر ایسے دغا تو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ امیر البحر تھا ناں، سمندر اپنے امیر کا مان تو نہیں توڑ سکتا تھا۔

”تمہاری محبت میرے لیے زیاد کی نفرت سے زیادہ تکلیف دہ ہے جندل!“ ایک آنسو چپکے سے اس کے رخسار پر گرا تھا۔ وہ نیچے نم ریت پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔

”تم عورتوں کی طرح رونا مت شروع ہو جایا کرو۔ نہیں مر رہا میں، مروں گا تو تمہیں ساتھ لے کر مروں گا“!

”مجھے تکلیف ہوتی ہے۔۔ یہاں۔۔ یہاں درد ہوتا ہے جندل۔“ وہ اپنے دل کے مقام پر شہادت کی انگلی رکھ کر کہہ رہا تھا۔ ”میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ میں نا چاہتے ہوئے بھی سب کو تکلیف پہنچا دیتا ہوں۔ یہ لوگ موم سے ہیں، میں

انہیں توڑ کر رکھ دیتا ہوں۔ میں۔۔ میں ظالم ہوتا جا رہا ہوں یار۔" وہ سسک اٹھا تھا۔ اس بھورے بالوں والے لڑکے کے رخسار پر ایک آنسو لڑھک گیا تھا۔

"میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا مگر ہاں۔۔۔ مجھ جیسا خبیث دوست بس تمہاری قسمت میں لکھا گیا ہے۔ اسے خوش قسمتی کہو یا بد قسمتی۔۔ گزارہ تو کرنا پڑے گا۔ کیونکہ خیام بہت ملیں گے مگر خیام حنفی تو پھر بس ایک ہی ہے ناں۔" ہر جگہ وہ تھا۔ ہر جگہ اسی کی آواز تھی۔ ذہن پر، اعصاب پر وہی چھایا ہوا تھا۔ جندل کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ پانی کی ایک لہر اس کی طرف آئی تھی۔ وہ اس لہر کو دیکھ کر پھٹ پڑا تھا۔ سر جھکائے آنسو بہاتا وہ بلک بلک کر رو دیا تھا۔ برسوں پہلے کی طرح، وہ آج بھی سمندر کے سامنے خود پر ضبط نہیں کر پایا تھا۔ اس کی سسکیاں لہروں کے شور میں دبتی گئیں۔ اس کے آنسو سمندر کے پانی میں ملتے گئے۔ وہ بکھرا ہوا سا جندل۔۔۔ دھیرے دھیرے مزید بکھرنے لگا تھا۔

"میں برسوں بھائی کی بس ایک محبت بھری تھپکی کے لیے ترسا تھا۔ وہ بہت ظالم ہیں۔ دیکھیں پھر سے تنہا کر کے چلے گئے۔" اس نے اپنے عقب میں بدر کی آواز سنی تھی۔ بدر جو آرام سے اس کے برابر میں بیٹھ رہا تھا۔ اس کی آواز نم تھی، رخساروں پر تیزی سے آنسو گر رہے تھے۔ "جب وہ بری طرح زخمی ہوئے تھے، جب میں نے انہیں۔۔ اونچائی سے گرتے دیکھا تھا۔ تب مجھے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے ایک بھائی کی محبت ہی تو دیکھی ہے، وہ بھائی بھی موت مجھ سے چھین رہی تھی۔ میں ان کے سرہانے بیٹھ کر رویا تھا گڑگڑایا تھا۔ اور آج۔۔ آج میں اتنا بے بس ہوں کہ آخری بار ان کا چہرہ تک نہیں دیکھ سکتا۔ سمندر نے انہیں یوں سمیٹا ہے کہ میں اپنے بھائی کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ تمہارا سمندر بہت ظالم ہے لالا! یہ ہر بار مجھ سے میرے اپنوں کو چھین لیتا

ہے۔" وہ سسک اٹھا تھا۔ جندل نے آگے بڑھ اس کا سر اپنے کندھے پر رکھا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اس کا سر سہلاتا جندل، نم آنکھوں سے سمندر کو تک رہا تھا۔

"میں نے اس سے بہت محبت کی ہے بدر۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ موت اس کے بجائے میرے دروازے پر دستک دیتی۔ سمندر کی آغوش میں سمٹتے ہوئے میں پرسکون ہو جاتا۔ خیام ہر بار میری جگہ کیوں لے لیتا ہے؟ وہ سمندر کے پاس آیا ہی کیوں؟!" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔

"مجھے میرا بھائی چاہیے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں ان کے لیے کتنا تڑپا ہوں۔ خیام حنفی! میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس شخص کے لیے رویا ہوں۔ وہ یوں نہیں جاسکتے۔ مجھے یوں تنہا نہیں کر سکتے۔ مجھے میرا بھائی چاہیے!!" وہ ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ جندل نے زکام زدہ سی سانس لے کر اپنی آنکھوں کو رگڑا تھا۔ ٹھہر کر بدر کو دیکھا جس کے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔

"بدر۔۔ ادھر دیکھو۔" وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "خیام نے اپنی جان بہت عظیم مقصد کے لیے دی ہے۔ اس کی قربانی کو ضائع مت کرو۔ تمہیں اس کے بعد یوں بکھرنا نہیں ہے۔ خود کو سمیٹو اور سوچو کہ اگر خیام ہوتا تو کیا کرتا؟ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں، وہ تمہیں اس حالت میں دیکھتا تو سخت خفا ہوتا۔ تم اس کے پیچھے خود کو اس کے لیے رو کر ضائع نہیں کرو گے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے سمجھا رہا تھا۔ بدر نے چہرہ جھکا کر اپنے آنسوؤں کو اندر اتارا تھا۔

"میں۔۔ میں بس ایک بار انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سمندر انہیں لوٹا کیوں نہیں رہا؟ بس ایک بار۔۔" اس نے التجا کی تھی۔ دو آنسو اس کے رخساروں پر گرے تھے۔ جندل نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔ اپنے آنسوؤں پر بند باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے نگاہیں سمندر کی طرف دوڑائی تھیں۔۔ دھڑکنیں منتشر تھیں۔ آنکھیں نم تھیں۔

خیام تو جندل کی آتی جاتی سانسوں اور دل کی دھڑکنوں سا تھا ناں۔ یہ اندازہ لگانا ہی کٹھن تھا کہ وہ خود پر کیسے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ خیام کو کھو کر وہ کیسے سانس لے رہا تھا؟

اسی لمحے میں اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھی۔ اس نے ایک عقاب کو سمندر کی طرف نیچے آتے دیکھا۔ زئی آیا تھا۔ سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بلندی سے نیچے آیا۔ اتنا کہ اس کے پر سمندر کی وحشی لہروں نے نم کر دیے۔ اس نے ایک مخصوص جگہ پر گول چکر کاٹا اور پھر واپس بلندی کی طرف جانے لگا۔ جندل نے بغور اس مقام کو دیکھا تھا۔ تو کیا زئی نے دیکھا تھا، خیام کو سمندر میں گرتے؟

انسان کسی کو کتنا ہی کیوں نہ چاہ لے، ہزاروں دعوے کر لے کہ وہ جو چاہ ہے وہی جان ہے۔ وہ ہے تو جان ہے، جہان میں جان ہے۔ لیکن یہ سب دعوے ہی رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت نہیں رکتا۔ یہ مرے ہوؤں کو پیچھے چھوڑ کر زندوں کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایک کے جان سے جانے پر دوسرا جان نہیں دیتا۔ سچ یہ ہے کہ وہ جسے آپ محبت کہتے ہیں اس کے مرنے پر آپ "مر" نہیں جاتے۔ سانسیں چلتی رہتی ہیں، دل دھڑکتا رہتا ہے۔ ہاں زندگی میں ایک خلا سا رہتا ہے مگر وہ خلا بھی پُر ہو جاتا ہے۔ وقت ہر محبت بھلا دیا ہے، ہر زخم بھر دیتا ہے۔ یہ ایک قافلہ ہے جس میں انسان کو بس چلتے جانا ہے۔ جو رک گیا وہ بس وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ، کسی خیام حنفی کے جانے کے بعد کوئی جندل یوسف زئی جان سے نہیں جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ، کوئی مصعب الزرقاوی، کسی خیام حنفی کو واپس نہیں لا سکتا۔

سچ یہ ہے کہ۔۔ سمندر۔۔ کسی خیام حنفی کو نہیں لوٹاتا! وہ شخص جو عربی سلطان اور مغربی شہنشاہ تھا، وہ سمندر کو کیونکر نہ بھاتا؟!

☆☆☆

وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے خود کو ایک کھلے میدان میں پایا تھا۔ بہت لمبا اور حد نگاہ تک پھیلا میدان۔ دور دور تک کسی ذی نفس کا نشان نہیں تھا۔ کہیں کوئی سایہ نہیں تھا۔ بس سر پر سایہ کیے کھلا آسمان اور پاؤں تلے سخت بنجر زمین! اس نے دھیرے سے اپنے قدم آگے بڑھائے۔ ایک نوکیلا پتھر اس کے پاؤں پر چبھا۔ اسے محسوس ہوا وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس نے سختی سے لب بھینچ کر اپنا سفر جاری رکھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا اس کی منزل کونسی تھی اور یہ راہ۔۔ یہ راہ بھی تو اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ بس، اس خاک آلود زمین پر قدم بڑھا رہی تھی۔

کچھ دور اسے ایک سایہ نظر آیا۔ اس کے اٹھتے قدموں کی رفتار بڑھی۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس سائے کے پاس آئی۔ قریب پہنچنے پر اس نے معاویہ کو وہاں پایا۔ وہ ٹھٹھک کر رکی۔ کم فہمی سے معاویہ کو دیکھا جس کی نگاہوں میں اس کے لیے ماسوائے محبت کے کچھ نہ تھا۔

"بابا۔۔" اس کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔ اس نے پلک جھپکی تھی۔ بس ایک لمحہ اور اس ایک لمحے میں اس نے معاویہ کو کھو دیا۔ وہ تیزی سے دائیں طرف مڑی۔ اس نے وہاں زیاد کو دیکھا۔ سر جھکا کر اپنے آنسوؤں کو اندر اتارنے کی کوشش کرتا زیاد۔

"میں نے کہا تھا ازا، ہم تمہارا انتظار کرتے نہ رہ جائیں۔ خدارا لوٹ جاؤ۔ تم خالی ہاتھ آئی ہو ازا!" اس کی آواز نم تھی۔ سر اور نگاہیں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔ اسی اثناء میں اس نے زیاد کو دور جاتے دیکھا تھا۔ وہ اس میدان میں ایک بار پھر بالکل اکیلی تھی۔ وہ پریشانی سے ارد گرد دیکھنے لگی۔ اور بالآخر اس کی نگاہ کو کنارہ ملا۔ وہاں دور، خاک آلود زمین پر ایک شخص پنجوں کے بل بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

وہ اس شخص کو اس کی پشت سے پہچان نہیں پائی تھی۔ اس نے جو دیکھا تھا وہ بس اس کے ہلکے بھورے رنگ کے بال تھے۔ اچانک ہر سو اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے خود کو دور کسی گہری کھائی میں گرتے پایا تھا۔

”میرا نام ازاتا شفین ہے، کیا آپ اس نام سے چھٹکارہ حاصل کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟“ جہاز کے عرشے پر کھڑی وہ بچی مدد طلب نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑے اس لمبے اونچے مرد کو دیکھ رہی تھی۔

”مگر۔۔ تم خود سے اپنی شناخت کیوں چھیننا چاہتی ہو ازا؟“ وہ کم فہمی سے پوچھ رہا تھا۔

”میں نے بھائی اور بابا کو بات کرتے سنا تھا۔ وہ بحری قزاق! وہ ہمارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔ میرے گھر میں آگ لگانے والا بھی وہی ہے۔ خدارا مجھے اس نام سے چھٹکارہ دلا دیں۔ میں اپنی اصل پہچان کے ساتھ زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔“ اس کے سامنے کھڑی وہ چھوٹی سے بچی اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کر رہی تھی۔ شاید یہ یکے بعد دیگرے اس کے ساتھ گزرے حادثات کے سبب تھا۔ حالات اسے اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور بہادر بنا چکے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ تو کیا نام لینا چاہو گی تم؟ ازا۔۔ ازابیلا وارلڈ کیسا رہے گا؟“ اس نے پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔ محبت بھری نگاہیں ازا پر ٹکائے اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔۔ وہ۔ ابراہم وارلڈ!

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نم آنکھیں۔۔ کانپتے ہونٹ۔۔ لال پڑتا چہرہ۔۔ وہ ہوش میں آتے ہی سسک اٹھی تھی۔ وہ بھول گئی تھی، وہ جو یاد کرنا چاہتی تھی اسے یاد آچکا تھا۔ یہ مشینوں میں جکڑا وجود۔۔ یہ لڑکی ازاتا شفین، اس نے خود سے خود اپنی شناخت چھینی تھی۔ وہی تھی جس نے ابراہم وارلڈ سے اس کا نام مانگا تھا۔ اگر دلال کے بعد اس کا کوئی مجرم تھا تو وہ خود تھی۔ ہاں وہ یہیں بھول کر رہی تھی۔ وہ خود کو بھول رہی تھی، اسے اپنا آپ یاد آ گیا۔

اسے وہ بچی یاد آگئی جو موت سے ڈرتی تھی۔ جو موت کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیا کرتی تھی۔ جس شناخت کے چھن جانے کا ذمہ دار اس نے خیام کو ٹھہرایا تھا، اسی شناخت کے چھن جانے کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ خیام پر چیخنا، چلانا آسان تھا، خود کو ذمہ دار ٹھہرانا بہت مشکل تھا، بہت زیادہ مشکل۔

☆☆☆

وہ تھکے تھکے سے انداز میں قدم اٹھاتی اس کے کمرے میں آئی تھی۔ بکھرا بکھرا سا حلیہ، سرخ ہوتی آنکھیں، خون چھلکاتا چہرہ۔ زیاد کے وجود پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ کیوں لوٹا تھا؟ جب وہ اس کے جانے کا یقین کر چکی تھی تو وہ آخر آیا ہی کیوں؟! زکام زدہ سی سانس خارج کرتے ہوئے اسے دو آنسو اپنے رخسار پر لڑھکتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کے برابر میں کرسی رکھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ دھڑکنیں سست پڑ رہی تھی، وہ بکھر رہی تھی۔

نم آنکھوں سے اس کے زخمی چہرے کو تکتے ہوئے اس نے دھیرے سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ ہاتھ۔۔ جو بری طرح کسی کے سخت بوٹوں تلے کچلا گیا تھا۔ سفید پٹی میں جکڑا ہاتھ۔۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"سینیور۔۔ اٹھ جائیں۔۔" اس کے لب پھڑپھڑائے تھے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ وہ اس کی ہلکی سی سرگوشی پر اٹھ جایا کرتا تھا۔ آج اس کے رونے پر بھی یونہی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ "سینیور۔۔۔ اٹھیں یار میں اور برداشت نہیں کر پا رہی۔" دھیرے سے کہتی وہ سسک اٹھی تھی۔ آرام سے اس کے بازو پر سر ٹکاتے ہوئے وہ رو دی تھی۔ مزید خود پر، اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ مزید حوصلہ نہیں تھا۔

”وہ چلا گیا۔ زیاد، خیام چلا گیا۔ استاد جی چلے گئے زیاد۔۔“ دھیرے دھیرے سسکتی وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ اسے سانس لینے میں تکلیف ہوئی تھی۔ دھڑکنیں اس قدر سست پڑ گئی تھیں کہ اپنا وجود بے جان سا محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھے ہچکیوں سے روتی دھیرے دھیرے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے رونا تھا، بہت سارا رونا تھا۔ زیاد کے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ اس حرکت سے پہلے اس کا دماغ جاگا تھا۔ اس نے سعاد کی سسکیاں سنی تھیں۔ اس کے آنسوؤں کی نمی کو اپنے کندھے پر محسوس کیا تھا۔ وہ مزید کچھ نہ سن پایا، نہ محسوس کر پایا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولی تھیں۔ چند پل یونہی بے حس و حرکت لیٹے رہنے کے بعد آرام سے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ کر اس کا سر سہلایا تھا۔

سعاد نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ نم آنکھوں سے حیرت سے اسے دیکھا جو آنکھوں میں بے حد نرمی سموئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند پل ساکت رہی۔ بے حس و حرکت اور بالکل ساکت۔۔ اگلے لمحات میں اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگا۔ پہلے ایک، پھر بیک وقت دو۔۔ اور پھر گویا اس کا باندھا گیا کمزور سا بند ٹوٹ گیا۔ چہرہ جھکائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اس کے اس قدر رونے پر زیاد پریشان ہوا تھا۔

”سینیورا۔۔ کیوں رو رہی ہیں؟ ازا تو ٹھیک ہے ناں؟“ وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے رونے میں شدت آتی گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا تھا، وہ اس کی وجہ سے نہیں رو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے روتی تو اس کے اٹھنے پر سنبھل جاتی۔ اس کے رونے کی وجہ کچھ اور تھی۔۔ کیا کیا؟ اور پھر۔۔ اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہچکیوں کے درمیان سعاد نے اٹک اٹک کر وہ الفاظ ادا کر دیے جنہیں سن کر اسے اسپتال کی چھت اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔

"خیام چلا گیا زیاد۔۔۔ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔۔ سمندر نے اسے خود میں سمیٹ لیا۔" وہ تڑپی تھی۔ زیاد نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی بات جھٹلانا چاہتا تھا مگر اس کے رونے میں آتی شدت اور بکھری بکھری سی حالت کو وہ نظر انداز نہیں کر پایا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی بات کو جھٹلا نہیں پایا۔

"وہ کمزور نہیں تھا ناں۔۔ تبھی اسے زیر کرنے کے لیے سمندر یکجا ہوا۔ زیاد، استاد جی۔۔۔ استاد جی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔" سسک کر کہتی وہ روتے ہوئے اس کے کندھے پر سر رکھ چکی تھی۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا سُن ہوتے دماغ سے اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔ آنکھوں میں ابھی تک بے یقینی کے تاثر تھے۔ اسے یقین کرنے میں دقت ہو رہی تھی کہ ، خیام حنفی جا چکا تھا۔ خیام حنفی! موت تو زیاد کے دروازے پر دستک سے رہی تھی، وہ سب تو اسے الوداع کر رہے تھے۔ خیام، خیام کیوں بیچ میں آ گیا تھا؟! خیام حنفی، ہر بار دوسروں کی جگہ کیوں لے لیتا تھا؟!

"مجھے معاف کر دو میں اپنے دوست کو نہیں کھو سکتا۔"

"ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ جلد لوٹ کر آنا۔۔"

مل نہ پائے گر اس جہان میں

مل ہی جائیں گے آسمان میں

عرش کے تلے سائبان میں

راہ وہ رہے بس دھیان میں

جس کے موڑ پر جنتِ بریں

سربلند ہوں دوستانِ دین۔۔!

☆☆☆

”اٹھ گئیں آپ۔ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ افق کی شائستہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے ٹھہر کر افق کو دیکھا۔ وہ اس کے پہلو میں کھڑی نرمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عقب میں کھڑکی تھی جس سے چھن کر کے آتی روشنی کو وہ اپنی پشت پر روک چکی تھی۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے پر ڈالی۔ وہ اسپتال کے بستر پر تھی۔ دائیں ہاتھ پر ڈرپ لگی تھی۔ پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک ایک کر کے وہ تمام مناظر گھوم گئے۔ اس کا کمپنی سے بھاگنا، دلال کے گھر جانا۔ وہ گارڈز، فائرنگ کی آواز اور زیاد کا وہاں آنا۔ زیاد، وہ ایکدم چونکی تھی۔

”بھائی؟ بھائی کہاں ہیں؟“ اس نے خوفزدہ نظروں سے افق کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ سعاد آپی ان کے ساتھ ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ افق نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے تسلی نہیں ہوئی۔ وہ ٹھیک تھا تو یہاں کیوں نہیں تھا؟

”بھائی کو بلا دو پلیز۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔ افق کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ دھیرے سے سمٹ گئی۔ اس نے گہری سانس لے کر سر جھکایا تھا۔ ازا کا دل ایکدم زور سے دھڑکا تھا۔

”وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ آپ سے مل سکیں۔ کوئی بھی نہیں۔ اس وقت سب اتنا ٹوٹ چکے ہیں کہ کسی کو آپ یاد نہیں ہیں۔“ وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔ ازا نے کم فہمی سے اسے دیکھا تھا۔ ”اصل میں۔۔ خیام بھائی کی ڈیتھ ہو گئی

ہے۔“ اس نے افسوس سے کہا تھا۔ ازا کا وجود ساکت ہوا تھا۔ سانس روکے بنا پلک جھپکے اس نے افق کو دیکھا تھا جو مزید بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ ڈیتھ؟ خیام حنفی کی؟ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”میں ان سے بس ایک دو بار ہی ملی تھی۔ وہ بہت اچھے تھے۔ بدر اتنا زیادہ رو رہا تھا۔ ضرار بھائی یہ خبر سنتے ہی یہاں سے چلے گئے اور ابھی تک نہیں لوٹے۔ جندل بھائی کی کمر ٹوٹ چکی ہے، سعاد آپی کی حالت بھی اچھی نہیں۔ اور زیاد بھائی، وہ یقین نہیں کر پا رہے۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ خیام بھائی کا ان سب کے ساتھ کتنا گہرا تعلق تھا۔“ اس کے لبوں میں جنبش ہو رہی تھی مگر اس کی آواز ازا کی سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کا ذہن انہی الفاظ پر اٹک چکا تھا۔

”خیام بھائی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔“

کیا وہ مر چکا تھا؟ نہیں نہیں۔۔۔ وہ نہیں مر سکتا۔ وہ اسے توڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ اس کا انتظار کرے گا۔۔ وہ۔۔ خیام حنفی نہیں مر سکتا یار!! اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے۔ سر بے اختیار نفی میں ہلا۔ افق نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو روکا تھا۔

ایک لڑکا تھا جو مشکل کو ممکن بناتا تھا۔ ایک لڑکا تھا جو اس کے باپ کی کمپنی کا مینیجر تھا۔ خیام حنفی! اس سے پہلا تعارف وارلڈ نے کروایا تھا۔ دوسری بار وہ کمپنی میں ملے۔ وہ آئینہ ساز تھا، زیاد کا دشمن تھا۔ سفاک قاتل تھا، درندہ تھا۔ ڈیوڈ کی موت ہوئی۔ وہ لاوارثوں کے لیے لڑنے والا تھا۔ وہ حزب اللہ کا عظیم مجاہد تھا۔ وہ سخت تھا مگر اس کے لیے نرم ہو جایا کرتا تھا۔ وہ اسے ”مادام“ کہتا تھا۔ وہ اس کی فیوچر باس تھی۔ وہ زخمی تھا بے حد زخمی۔ وہ زخمی حالت میں بارش میں بھیگتا اسے بچانے آیا تھا۔ اس کا سفید پڑتا چہرہ وہ کبھی نہیں بھول پائی تھی۔ پھر اس نے سہارے کے

لیے اسٹک پکڑ لی۔ وہ مزید اچھا لگنے لگا۔ کھڑوس مینیجر جس کی شخصیت میں رعب تھا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ وہ ایک غلام تھا کہ ملکہ جس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ ملکہ کا وفادار غلام !

وہ جان دے رہا تھا اور وہ اسے تھپڑ مار چکی تھی۔ وہ سفید رومال اپنے چہرے سے ہٹا رہا تھا اور وہ سُن ہو گئی تھی۔ وہ اپنا کوٹ اس کے کندھے پر ڈال رہا تھا، اپنا سفید رومال اس کی گردن کے گرد لپیٹ رہا تھا۔ وہ اس کے عقب میں اس قدر قریب کھڑا تھا کہ وہ پلٹتی تو اس کے سینے سے ٹکراتی۔ وہ مسکرا رہا تھا، چہرہ موڑ کر ہنس رہا تھا۔ وہ اسے کلائی سے پکڑ کر دیوار سے لگا چکا تھا، وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکیل چکی تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ وہ التجا کر رہا تھا، وہ ظالم بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل نیچے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر جا چکی تھی۔۔ اور خیام؟ خیام اس کے بعد کہاں تھا؟!

وہ نہیں مر سکتا۔۔ خیام نہیں جا سکتا۔ وہ اسے معاف کر دے گی، وہ ایک بار لوٹ آئے۔ وہ زندہ ہے، وہ ضرور آئے گا!

”میں اس غلام جیسا تھا جو ملکہ کے ساتھ بہت وفادار ہو، جو قدم قدم پر ملکہ کے ساتھ ہو مگر ملکہ جس کی پہنچ سے بہت دور ہو۔“ آواز دھیمی تھی۔ اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔

”وہ تمہاری جان لے گا تو تم جانے دو گے ہاں؟ آئندہ تم نے یوں خودکشی کی کوشش کی تو یقین کرو خیام! اس بار تھپڑ مارا ہے اگلی بار جان لے لوں گی۔“ وہ غرائی تھی۔ وہ اپنا جھکا سر نہیں اٹھا پایا تھا۔

”میں نفرت کے قابل نہیں ہوں ازا!“ ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گرا تھا۔

"ہاں تم نفرت کے قابل نہیں ہو تم سے محبت کی جاسکتی تھی۔ مگر میں نے تم سے شدید نفرت کی ہے خیام حنفی!" وہ اپنے ہی الفاظ کی تلخی پر، کڑواہٹ پر تڑپ اٹھی تھی۔

"اجنبی کس قدر اپنے اپنے سے لگنے لگتے ہیں۔۔۔"

"مجھے اس رات سے آزاد کر دو ازا۔۔ میرے لیے دن بہ دن سانس لینا محال ہو رہا ہے۔ میں نے اپنا قرض لوٹانے کی کوشش کی۔۔ کہہ دو میں نے اپنا قرض لوٹا دیا۔" اس کے ضبط کی انتہا ہوئی۔ وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے بلک بلک کر رو دی تھی۔ اسے لگا تھا دلال اسے مارنے میں کامیاب نہیں رہا مگر خیام مار ڈالے گا۔ اس کے ساتھ ظلم ہوا تھا، وہ ظالم تھی۔ وہ اسے ایک موقع دے، وہ معافی مانگ لے گی۔ اس کے قدموں میں بیٹھ جائے گی۔ اپنے ہر لفظ کی تلخی کی سزا سہہ لے گی۔۔ وہ لوٹ کر تو آئے!! وہ آئے تو سہی!!

"تم بہت ظالم ہو خیام۔۔۔ تم ہر بار۔۔۔ ہر بار مجھے تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہو۔ میں۔۔ میں مجرم ہوں۔ میں اپنے ہر گناہ کا کفارہ ادا کروں گی۔ تم لوٹ آؤ، ایسے مت جاؤ پلیز!!" وہ سسک اٹھی تھی۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے اسے اپنے پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ تکیے پر رکھے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے وہ خود پر اختیار کھو چکی تھی۔ افق اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر باہر سے جندل کو بلا لائی تھی۔ کمرے میں قدم رکھتے جندل کو اس کی یہ بکھری سی حالت دیکھ کر اپنا دل کٹتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی سسکیاں، اس کے آنسو۔۔ خیام اس کے لاکھ خبردار کرنے کے باوجود اسے انتہا کی تکلیف میں مبتلا کر کے جا چکا تھا۔

"میں نے کہا تھا ازا کو کبھی دکھ مت دینا خیام! میں تمہاری جان لے لوں گا!!" اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر پلکوں سے جھول کر ناک کی ہڈی پر گر گیا۔ وہ کیا جان لیتا۔۔۔ خیام خود جان دے چکا تھا۔

☆☆☆

مصعب الزرقاوی! اسے سالوں پہلے جس کام کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ وہ کام مکمل کر چکا تھا۔ ابراہم وارلڈ کی موت کے ساتھ ہی دلال کا باب ختم ہو چکا تھا۔ ڈی ڈبلیو کی پوری فوج کو غیر قانونی قرار دے کر سلاخوں کے پیچھے بھیجا جا چکا تھا۔ اسکائی ٹو کی پانچوں کرسی پر بیٹھا دلال، اپنی موت کے ساتھ ہی اپنے تمام راز حزب اللہ کے حوالے کر چکا تھا۔ عدالت کی طرف سے اس کے تمام ساتھیوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ اور یہ سب منظرِ عام پر اگر مصعب لایا تھا تو عدالت میں کیس درج کروا کر دلال کے خلاف کیس جیتنے والی ازاتا شفین تھی۔ ان دونوں نے ایک بار پھر ساتھ کام کر کے دلال کی سالوں کی محنت کو برباد کر دیا تھا۔ جندل، زیاد، ضرار اور سعاد اس سب میں پیش پیش رہے تھے۔

دلال کے گھر کو مصعب پہلے ہی آگ کی نذر کر چکا تھا۔ وارلڈ گلاس کمپنی تباہ ہو چکی تھی۔ اب عمارت کے جو آثار باقی تھے ان پر انتھک محنت کی ضرورت تھی۔ سالوں کا عرصہ درکار تھا اس کمپنی کو واپس اسی مقام پر پہنچانے کے لیے۔ البتہ، وارلڈ گلاس کمپنی کی تمام دولت اور اثاثوں کی واحد مالک اب ازاتا شفین تھی۔ ازا، جو یہ سب مائک کے حوالے کر چکی تھی۔

دلال نے کہا تھا بار بارا کمپنی بہت جلد زوال کا شکار ہو گی۔ مگر دلال کی موت کے بعد اب جب کہ اس کی ٹکر پر وارلڈ گلاس کمپنی بھی نہیں تھی تو بار بارا کمپنی دن بہ دن مائک کی سربراہی میں عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بار بارا گروپ کا چیئر مین، مائک بار بارا دن رات کی محنت کے بعد وہ مارک اور اسٹیون کے پھیلائے گند کو صاف کرنے میں کامیاب ٹھہرا تھا۔ اس نے ازا کی طرف سے ملنے والے تحفے کا درست استعمال کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر چیئر مین کے انتخابات جیت چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھا۔ مصعب نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ کل تک ایک ناکام و نامراد،

نامر د انسان، آج اس کا شمار بینکاک کے کامیاب ترین لوگوں میں تھا۔ اور وہ کامیاب ترین انسان بہت ڈھٹائی سے اپنی کامیابی کا سہرا اپنے نام کرتا تھا کیونکہ وہی تھا جس نے مصعب کے ساتھ ڈیل کی تھی۔ اگر جو وہ اس وقت مصعب کو انکار کرنے کی جرات کر دیتا تو آج نہ مائک ہوتا نہ اس کی شہرت۔

دلال کی موت کے ساتھ ہی ہر پہیلی سلجھتی گئی تھی۔ قانتہ کا قتل، مارک اور اسٹیون کے مابین اختلافات، دونوں کی موت، ڈیوڈ کی موت غرض وہ ہر پہیلی سلجھا چکے تھے۔ جو باتیں وہ کبھی سمجھ نہ پائے وہ دلال مرتے مرتے خود سمجھا گیا۔ وہ بس ایک بحری قزاق تھا۔ ایک ایسا بحری قزاق جس نے ابراہم وارلڈ کی لکھی کتاب کے مطابق ہر پلان ترتیب دیا۔ ایک سائیکو، جس نے بنا کسی مقصد کے قتال کیا۔ ایک عاشق، جس نے اپنا بہایا خون سمندر کے نام کیا۔ ایک انسان، جو ایک معصوم بچی سے محبت کر بیٹھا۔ وہ نفرتوں کا قائل تھا تبھی محبت اسے ختم کر گئی۔ اسے محبت راس نہیں آئی تھی۔ اسے اس بچی کا اسی وقت گلا گھونٹ دینا چاہیے تھا، جب اس نے اسے اندلس کے ساحل پر پایا تھا۔ یہ اس کی پہلی غلطی تھی۔ اس نے اپنی فطرت کے خلاف کام کیا تھا۔

اس کی دوسری غلطی، اس نے اپنے پیچھے سروائیورز چھوڑے تھے۔ اندھیر تاریک راہوں میں اپنے پیاروں کے خون میں نہائے سروائیورز آنے والے وقت میں یا تو مضبوط ترین انسانوں کے روپ میں ابھرتے ہیں یا سفاک قاتلوں کے روپ میں۔ ایسے انسان جو برائی کے ہاتھ باندھتے ہیں یا پھر ایسے قاتل جو انتقام کی آگ میں اچھے اور برے کا فرق بھول جاتے ہیں۔ دلال بدقسمت تھا کہ اس کا چھوڑا گیا ہر سروائیور ایک مجاہد کے روپ میں اٹھا تھا۔ اگر وہ سفاک قاتل ہوتے تو دلال کے قدموں تلے کچلے جاتے۔ مگر وہ مجاہد تھے، انہوں نے دلال کو اپنے قدموں تلے روندا تھا۔ وہ اس کی سالوں کی محنت کو برباد کرنے میں کامیاب ٹھہرے تھے۔ اور آخر میں، انہوں نے اپنے مقصد کو پالیا۔

وہ جس مقصد کے لیے لڑے تھے اس میں محنت ان کی اور فتح اللہ کی تھی۔ انہوں نے حزب اللہ کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا تھا۔ وہ باب جس کا آغاز اور اختتام ایک ہی پیغام دیتا تھا؛

لا غالب— الا اللہ!

☆☆☆

نیلا آبی آسمان جو گذشتہ رات ہوئی بارش کے سبب دھلا دھلا سا معلوم ہو رہا تھا۔ سڑکوں کے کناروں پر بارش کا پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ سڑک کنارے اونچے لمبے درخت بھی بارش کے پانی میں نہائے ہوئے تھے۔ ایک تیز رفتار گاڑی سیاہ ہموار سڑک سے گزری۔ اس کی رفتار کی وجہ سے سڑک پر ٹھہرے پانی کے چھینٹے اڑ کر فٹ پاتھ پر چلتے آدمی کے کپڑوں پر گرے۔ اس نے رک کر غصے سے دور جاتی گاڑی کو دیکھا پھر اونچی آواز میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے اس لڑکے نے مبہم سا مسکراتے ہوئے یہ منظر دیکھا پھر بھورے رنگ کا آہنی دروازہ پار کر لیا۔

وہ اندر آیا تو اس گھر میں اس کے اپنوں کی رچی بسی خوشبو اس کی نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر اس خوشبو کا اندر اتارا تھا۔ چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گھر کے اندرونی حصے کی طرف آیا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس کی سماعت سے کسی بچی کے رونے کی آواز ٹکرائی۔ اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کندھے پر ٹکا سفری بیگ اتار کر صوفے پر رکھا پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس نے صوفوں کے پاس ٹہلتی اپنی بہن کو دیکھا جو مسلسل روتی اپنی بیٹی کو بہلانے میں مگن تھی۔ فیروزی رنگ کے خالص مشرقی لباس میں ملبوس، نماز کی چادر میں لپٹی وہ اسے بے حد پیاری لگی تھی۔

"السلام علیکم پیاری ہمشیرہ!" اس کی دھیمی آواز پر حرم چونک کر پلٹی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوئی تھیں، وجود منجمد سا ہوا تھا۔ سیاہ پینٹ پر سفید شرٹ اور سیاہ ہی جیکٹ پہنے، ماتھے پر سفید پی کیپ ٹکائے اس کے سامنے کھڑا یہ اونچا لمبا لڑکا ضرار ولید تھا۔ نگاہوں میں محبت اور نرمی تھی۔ لبوں پر گہری مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ وہ حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔ حرم کو یوں ساکت دیکھ کر ضرار اس کی گود میں لیٹی اپنی بھانجی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ "میری بھانجی تو مجھے دیں یار۔" مسکرا کر کہتا وہ اس کی گود سے اپنی بھانجی کو اٹھا چکا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں والی وہ چھوٹی سی بچی ایکدم اپنا رونا دھونا بھول چکی تھی۔ ضرار محبت سے اس کے گال چوم رہا تھا۔

"نام کیا ہے اس کا؟" وہ اس کے چھوٹے سے ہاتھ پر بوسہ دے رہا تھا۔

"خولہ۔۔ خولہ بنت احمد! ضرار کی بہن تو خولہ نہیں بن سکی مگر اس کی بھانجی ضرور خولہ بنے گی۔ وہی خولہ جس کی مثالیں تم مجھے دیا کرتے تھے۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ضرار نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔

"آپی، مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔ میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔" وہ اس کے شانے پر اپنا بایاں بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگائے کہہ رہا تھا۔ حرم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا جو ویسا ہی لاپرواہ تھا۔ ویسا ہی ہنس کر سب کچھ بھلا دینے والا۔

"بہت بڑے گورخر ہو تم!" وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔

”اب میری بھانجی کے سامنے مجھے جنگلی گدھا کہیں گی؟“ اس نے منہ بسورا۔ حرم ہلکا سا ہنس دی۔ ”ویسے دیکھیں تو اسے اللہ اللہ! یہ اتنی نازک سی معصوم کلی، بالکل اپنے ماموں پر گئی ہے۔ ماموں کی جان، میں قربان جاؤں اس پر۔“ وہ محبت سے کہتا خولہ کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کے پھولے پھولے نرم سے گال اسے بے حد پسند آئے تھے۔ وہ اس کے گال کھینچتا صوفے پر بیٹھا تھا۔ حرم بھی آرام سے اس کے برابر میں صوفے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ محبت بھری نظروں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا جو اپنی بھانجی پر محبتیں لٹانے میں مصروف تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ وہ دو سے تین ماہ بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عرصے بعد لوٹا ہو۔ وہ پہلے سے زیادہ سمجھدار، معصوم اور پیارا الگ رہا تھا۔ پہلے سے زیادہ نرم دل اور حساس۔۔ محبت کرنے والا ضرار!

”سعاد کو لائے ہو ساتھ؟ یہ لڑکی ہے کہاں؟ تین ماہ ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے نہ کوئی رابطہ نہ کچھ۔ تم اس کے ساتھ ہی تھے ناں؟“ وہ اب فکر مندی سے سعاد کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ خولہ کے ساتھ کھیلتا ضرار ایک لمحے کو ٹھہر گیا۔ چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا جس کی نگاہوں میں کئی سوال تھے۔ وہ بس ہلکا سا مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

”ہاں ہم ساتھ ہی تھے۔ وہ بھی کل یا پرسوں آ جائیں گی واپس۔ لیکن آپی۔۔ آپ اُس سعاد کو نہیں دیکھیں گی جو یہاں سے گئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ غصے کی تیز اور نالائق ہو چکی ہیں۔“ اس نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔ حرم نے کم فہمی سے اسے دیکھا تھا۔ بھنویں ملائے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھتے ہوئے اس سے تفصیل مانگی تھی۔ ”وہ نہ تو اسکیچ بناتی ہیں، نہ انہیں گھر داری کا شوق ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بند رہنا زیادہ مناسب خیال کرتی ہیں اور انہیں تنگ کرنے والوں کی ٹانگیں توڑ دیتی ہیں۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”آخر ایسا کیا ہوا ہے وہاں جو وہ بدل گئی ہے؟“ حرم فکر مند ہوئی۔ ضرار نے گہری سانس لے کر صوفے سے ٹیک لگائی۔

”انہوں نے شادی کرلی ہے، زیاد سے۔“ اس نے بہت آرام سے بتایا۔ حرم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ چند پل اسے ضرار کی بات سمجھنے میں لگے اور چند پل اس کی بات پر یقین کرنے میں۔

”کون زیاد؟ اور کب کیسے کیوں؟!“ وہ تقریباً چیخ ہی تو اٹھی تھی۔

”لمبی کہانی ہے تفصیل میں بتاؤں گا۔ پہلے ایک کپ کڑک سے چائے بنا دیں۔ اور احمد بھائی کہاں ہیں؟ انہیں بتائیں ان کا ہم زلف بھائی آیا ہے۔“ اس نے اپنی ٹانگیں میز پر سیدھی کرتے ہوئے کہا تھا۔ حرم اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جانتی تھی اب وہ بنا چائے کے ہر گز بھی اسے تفصیل نہیں بتائے گا۔ گہری سانس لے کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ضرار واپس خولہ کے ساتھ مشغول ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اپنی پوری رفتار سے اس وسیع میدان میں دوڑ رہے تھے۔ دائیں بائیں اونچے درخت اور خوبصورت پودے تھے جنہیں وہ تیزی سے اپنے پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے۔ دونوں کے درمیان دوڑ لگی تھی، مقابلہ سخت تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ اس سے آگے ہوتی مگر اگلے ہی لمحے وہ اسے پیچھے چھوڑ دیتا۔ پسینے میں شرابور، پوری ہمت جمع کر کے تیز رفتار سے بھاگتے ہوئے انہیں تقریباً بیس منٹ گزر چکے تھے۔ وہ دونوں تھکنے لگے تھے۔ مگر وہ بیماری کی وجہ سے اس سے زیادہ تھک رہا تھا۔ وہ اسے پیچھے چھوڑ چکی تھی، خود آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ چند پل اس کے برابر میں آنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر تھک کر رک گیا۔ وہ بھی کچھ آگے جا کر اس کی غیر موجودگی محسوس کر کے رک

گئی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے دونوں جھک کر اپنا تنفس بحال کر رہے تھے۔ گہری سانسیں لیتے ہوئے دونوں نے نگاہیں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر سر جھٹک کر ہنس دیے۔

"میں جیت گئی۔ تم ہار گئے۔" وہ خوشی سے کہتی اس کے پاس آرہی تھی جو پاس رکھی بینچ پر بیٹھ چکا تھا۔

"تم سے تو کب کا ہار چکا ہوں سینیورا!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ہلکا سا ہنس دی تھی۔ ٹشو سے چہرے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ زیاد بینچ سے ٹیک لگائے مسکراتے ہوئے اونچے لمبے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ فضا نم آلود تھی۔ نمی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بینچ سے ٹیک لگاتی سعاد نے ٹھہر کر اسے دیکھا جو جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے وہ کچھ بولنے والا تھا۔ وہ چپ چاپ اس پر نگاہیں ٹکائے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ اور اگلے لمحات میں وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تم نے زینب بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابو العاص آس کی کہانی سنی ہے؟" وہ پرسوچ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ سعاد نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ابو العاص حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے، وہ انہیں بہت محبوب رکھتی تھیں اور اپنا لڑکا تصور کرتی تھیں وہ نہایت متمول آدمی تھے۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا نہایت وسیع تجارتی کاروبار تھا ان کی دیانت اور امانت بھی بہت مشہور تھی، ان اوصاف کی وجہ سے حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ سے خواہش کی کہ حضرت فاطمہ ؓ زہرا کی بڑی بہن حضرت زینبؓ کو ان کے ساتھ بیاہ دیا جائے، آپ نزولِ وحی سے پہلے کسی معاملہ میں حضرت خدیجہؓ کی مخالفت نہ کرتے تھے، اس لیے ان کی خواہش کے مطابق زینبؓ کی شادی ابو العاص کے ساتھ کر دی۔

آنحضرت ﷺ کے دعوی نبوت کی سب سے اول حضرت خدیجہؓ نے تصدیق کی۔ آپ کے ساتھ آپ کی تمام صاحبزادیاں جن میں حضرت زینبؓ بھی شامل تھیں، نور اسلام سے مستنیر ہوئیں، لیکن زینبؓ کے شوہر ابوالعاص اپنے آبائی دین پر قائم رہے، اسی لیے جب ہجرت کا حکم ملا تو وہ ہجرت نہ کر سکیں۔

غزوۂ بدر میں ابوالعاص مشرکین مکہ کے ساتھ تھے اور مشرکین کے شکست کھانے کے بعد وہ بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ گرفتار ہوئے، جن جن لوگوں کے اعزہ گرفتار ہوئے تھے وہ سب فدیہ لیکر انہیں چھڑانے کے لیے آئے، گو حضرت زینبؓ مسلمان ہو چکی تھیں اور ابوالعاص مشرک تھے، تاہم وہ اب تک شوہر کے ساتھ تھیں اور ان کا دل ان کی محبت سے معمور تھا۔ شوہر کو قید و بند کی حالت میں نہ دیکھ سکیں، آنحضرت ﷺ عام قانون سے انہیں مستثنیٰ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے حضرت زینبؓ نے کچھ نقدی اور ایک ہار جو انہیں مرحوم ماں نے جہیز میں دیا تھا، شوہر کے فدیہ میں بھیجا، آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ ہار پیش ہوا، تو آپ نے پہچان لیا۔ اور حضرت خدیجہؓ کی یاد میں بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا، اگر تم لوگ بغیر اس ہار کو لیے ہوئے ابوالعاص کو چھوڑ سکتے ہو، تو چھوڑ دو اور ہار واپس کر دو۔ مسلمانوں نے نہایت خوشی کے ساتھ منظور کر لیا اور ابوالعاص رہا کر دیئے گئے۔ مگر یہ وعدہ لے لیا گیا کہ وہ زینبؓ کو جو اب تک مکہ میں تھیں، مدینہ پہنچا دیں۔

(مستدرک حاکم: ۳/۲۳۶، زینبؓ کے بھیجے جانے کی شرط کا ذکر ابوداؤد کتاب الجہاد باب فداء الاسیر بالمال میں ہے)

ابوالعاص رہائی کے بعد پھر اپنے تجارتی مشاغل میں مصروف ہو گئے تھے، فتح مکہ سے کچھ دنوں پیشتر قریش کا سامانِ تجارت لے کر شام گئے، وہاں سے واپسی میں راستہ میں مسلمانوں نے روک کر ان کا کل مال و متاع چھین لیا۔ جب مسلمان لوٹ گئے، تو ابوالعاص اپنا مال حاصل کرنے کے لیے خفیہ حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت زینبؓ کو

اب تک ان سے وہی محبت تھی، انہوں نے ان کو اپنے دامنِ حمایت میں لے لیا اور صبح کو جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے گئے، تو زینبؓ نے باآواز بلند اعلان کیا کہ مسلمانو! میں نے ابو العاص کو پناہ دیدی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد فرمایا لوگو تم نے کچھ سنا؟ سب نے عرض کیا ہاں۔ آپ نے ان کی بدگمانی دور کرنے کے لیے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے، اس سے پہلے مجھے اس واقعہ کا کوئی علم نہ تھا۔ ابو العاص مسلمانوں سے پناہ کا خواہاں ہے، اس کے بعد آپ کاشانۂ اقدس پر تشریف لائے اور حضرت زینبؓ سے فرمایا، جانِ پدر اپنے شوہر کی خاطر و مدارات میں کوئی کمی نہ کرو، مگر تم قانون اسلام کی رو سے ان پر حرام ہو۔ حضرت زینبؓ کو یہ ہدایت کر کے پھر باہر تشریف لائے اور مسلمانوں سے فرمایا کہ تم لوگ میری اور ابو العاص کی قرابت سے واقف ہو، ان کا جو مال تمہارے قبضہ میں ہے، اگر اس کو احسان کر کے واپس کر دو تو زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر نہ واپس کرو تو وہ خدا کا عطیہ اور تمہارا حق ہے،

مجھ کو کوئی اعتراض و اصرار نہیں ہے۔ اس کے جواب میں سب نے ایک زبان ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب واپس کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ ابو العاص کو ان کا کل مال واپس مل گیا۔ وہ یہ مال لے کر مکہ گئے اور جن جن لوگوں کا جو جو سامان تھا، سب کو پہنچادیا۔ اور حساب و کتاب چکانے کے بعد پوچھا، اب تو کسی کا مال باقی نہیں ہے؟ سب نے کہا نہیں خدا تم کو جزائے خیر دے ہم نے تم کو وعدہ وفا کرنے والا اور کریم پایا۔

سب کو مطمئن کرنے کے بعد کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا، اور کہا میں مدینہ ہی میں مسلمان ہو گیا ہوتا، لیکن محض اس خیال سے کہ تم لوگوں کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ میں نے تمہارا مال ہضم کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے اب تک رکا رہا۔ اب جبکہ خدا نے مجھ کو تمہارے حساب و کتاب اور تمہارے بار سے سبکدوش کر دیا، اس وقت میں نے اسلام ظاہر کیا۔

مکہ میں اسلام کا اعلان کر کے مدینہ واپس آئے اور یہاں باقاعدہ مشرف با اسلام ہوئے۔ ان کے قبول اسلام کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کے نکاح کی تجدید نہیں کی بلکہ گذشتہ نکاح بر قرار رکھا، لیکن بعض روایتوں کی رو سے تجدید فرمائی تھی۔

(تمام تفصیلات مستدرک حاکم: ۳/ ۲۲۷، ۲۲۶)

حضرت زینبؓ کا انتقال آنحضرت ﷺ کی حیات ہی میں ہو چکا تھا، ابو العاصؓ بھی ان کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہے، اور ذلحجہ ۱۳ھ میں انتقال کر گئے۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ)

سعاد! حضرت زینب نے اپنے شوہر کی واپسی کا بیس سال انتظار کیا۔ بیس سال!! اور جب وہ مسلمان ہوئے تو ایک سال بعد ہی حضرت زینب کا انتقال ہو گیا۔ تب ان کی وفات پر ابو العاص اتنا روئے کہ ارد گرد سب کو رلا دیا۔ اور پھر خود بھی کچھ عرصے میں ہی انتقال کر گئے۔ یہ تھی محبت! میں جب جب ان کی کہانی پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں، محبت کتنا خوبصورت سا جذبہ ہے۔ پاک اور معتبر سا۔۔ اور محبت کے لیے قربانیاں تو دیکھو۔ ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں سعاد ان لوگوں کے آگے!! کچھ بھی نہیں۔" اس نے گہری سانس لے کر مبہم سا مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔

سعاد نے ٹھہر کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھیں، ان میں نمی چمک رہی تھی۔ وہ جب جب اسے کہانیاں سناتا تھا، تب تب قدیم زمانوں کے سفر پر نکل جایا کرتا تھا۔ اندلس کی کہانی ہو، سمرقند اور بخارا کی، کوئی قدیم تاریخ یا مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان، کوئی پیارا سا قصہ۔۔ کچھ بھی ہو، اسے سناتے ہوئے زیاد کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ وہ اکثر حیران ہوتی تھی۔ آخر کوئی برسوں پہلے ہو چکے ایک واقعے، ایک حادثے پر کیونکر اپنی آنکھیں

نم کر سکتا ہے؟! کوئی حال میں ہوتے ہوئے ماضی کا درد کیسے محسوس کر سکتا ہے؟ پر سوچ نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے وہ اپنے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کو رگڑ رہی تھی۔ زیاد نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔

"تم نے اپنے لیے کونسی راہ چنی ہے سعاد؟ اب کیا کرنا ہے؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ اس پر مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی مرضی پوچھ رہا تھا۔

"میں۔۔ میں اپنا کام جاری نہیں رکھ پاؤں گی زیاد۔" اس نے لب دانتوں میں دباتے ہوئے سر جھکایا تھا۔ زیاد کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ کتنی مشکل سے یہ الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اس کے لیے اپنا کام چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ "خیام چاہتا تھا کہ ہم یہاں ساتھ کام مکمل کر لیں، اس کے بعد حالات کو دیکھتے ہوئے وہ آگے فیصلہ لے گا۔ وہ نہیں رہا تو میں یہاں کیا کروں گی؟! یہ میری جگہ کبھی بھی نہیں تھی، میں بس اپنے بھائی کو ڈھونڈنے آئی تھی۔ اس کے بعد خیام ہوتا تو میں کبھی کام سے منع نہ کرتی۔ مگر اب نہیں۔ میں نہیں کر پاؤں گی۔" وہ نم آنکھوں سے پھیکا سا مسکرائی۔

"میں تم پر زور نہیں ڈالوں گا، جیسے تمہیں ٹھیک لگے۔ مگر ہاں سعاد، ساتھیوں کے پیچھے رہ جانے پر قافلے رک نہیں جایا کرتا۔ سفر جاری رہتا ہے، کارواں چلتا رہتا ہے۔" وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"خیام، امیرِ کارواں تھا!" اس نے زکام زدہ سی سانس لے کر کہا تھا۔ زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔ "تم پریشان مت ہونا۔ میں پاکستان کو بہت یاد کر رہی ہوں۔ گھر جاؤں گی، حرم سے اور اپنی بھانجی سے ملوں گی۔ مجھے وہاں تم بالکل بھی یاد نہیں آؤ گے۔" اس نے آخر میں شرارت سے کہا تھا۔ زیاد اس کی بات پر مسکرا دیا۔

”تم وہاں ہر گز فارغ نہیں بیٹھو گی۔ پہلے پی ٹی ایس ڈی کا علاج کروانا اور یونیورسٹی میں داخلہ لینا۔ اپنی پڑھائی جاری کرو گی تم۔“ اس بار وہ حکم صادر کر رہا تھا۔ اس کی صحت پر وہ کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔

”علاج تک ٹھیک ہے سینیور مگر یہ کوئی پڑھنے کی عمر ہے؟ مجھ سے نہیں پڑھا جاتا اب۔“ اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ زیاد نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

”صرف تیس کی ہو تم۔ میں کوئی اعتراض نہیں سنوں گا۔“

”بتیس سینیور بتیس!“ اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ بچوں کی طرح ناک سکیڑ کر منہ بسور کر سامنے دیکھنے لگی۔ اس کا واپس جا کر کم از کم پڑھنے کا تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہر گز نہیں! زیاد اپنا بازو بینچ کے سرے پر پھیلائے بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے چہرہ ترچھا کر کے فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ منہ بسورے گھاس کو گھور رہی تھی۔ چہرہ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے سرخ پڑ رہا تھا۔ مزاج بگڑے ہوئے تھے تبھی گال پھولے پھولے لگ رہے تھے۔ وہ بے اختیار انگشت شہادت اور انگوٹھا اپنے لبوں پر رکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپا گیا۔

”قُرَّةُ عَيْنِي۔“ اس کے مسکرا کر کہنے پر سعاد نے کم فہمی سے اسے دیکھا۔

”میری آنکھوں کی ٹھنڈک کو عربی میں قُرَّةُ عَيْنِي کہتے ہیں۔ اس دن میں نے درست نہیں بتایا تھا۔ نور عین مطلب آنکھوں کا نور۔“ وہ تصحیح کر رہا تھا۔ سعاد نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔ اسی لمحے میں زیاد کا موبائل تھرتھرایا۔ اس نے جیکٹ کی جیب سے موبائل نکال کر روشن اسکرین پر جگمگاتے پیغام کو دیکھا۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ ایک نگاہ سعاد پر ڈال کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں جارہاہوں۔ تمہاری فلائٹ پانچ بجے کی ہے۔ اگر پانچ بجے تک نہ لوٹوں تو انتظار مت کرنا۔“ وہ عجلت میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے کچھ سمجھ نہ پائی۔ وہ واپس جارہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ نہ لوٹا تو اس کا انتظار نہ کرے اور چلی جائے؟ کون جانتا تھا وہ خود کب لوٹنے والا تھا؟! اگلے لمحے میں وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”زیاد! کوشش کرنا آجانا۔ میں انتظار کروں گی۔“ اس نے آواز لگائی تھی۔ موبائل جیب میں اڑس کر میدان کی طرف بھاگتے زیاد تک شاید اس کی بات پہنچ نہیں پائی۔ وہ دور جارہا تھا۔ پھر اس نے اسے گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر غیر محسوس انداز میں کان میں لگا آلہ آن کیا۔

”کہیں، سن رہی ہوں۔“

”کہاں ہو؟“ مانوس سی اور بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”ابھی تک تو سینیور زیاد کے ساتھ تھی۔ کچھ گھنٹوں میں پاکستان کے لیے نکلنے لگی ہوں۔“

”ذرا راستہ تو بدلو۔“ مسکراتے ہوئے کہا گیا۔ انداز ایسا تھا جیسے حکم دیا گیا ہو۔

”شوہر سے جھوٹ بولنے کا گناہ آپ کے سر ہو گا!“ مسکراہٹ دباتے ہوئے یقین دہانی چاہی۔

”یہ گناہ بھی اپنے سر لینے کو تیار ہوں!“ وہ آواز۔۔ بھاری شائستہ۔۔ اور بہت مانوس سی۔۔ سعاد کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اگلے لمحات میں وہ زیاد کو پیغام بھیج چکی تھی۔

”میرا انتظار مت کرنا۔ میں یہ ملک چھوڑ چکی ہوں!“ اسے یقین تھا وہ اس کی بات سمجھ جائے گا۔ ان کے راستے عارضی طور پر اکثر جدا ہو ہی جاتے تھے۔ مگر ایک بات یقینی تھی، ان کے جدا راستے ایک ہی منزل پر ملتے تھے۔

☆☆☆

اس کے پاؤں تیزی سے سائیکل کے پیڈلز کو گھما رہے تھے۔ دائیں بائیں موڑ کاٹتا سڑکوں پر سائیکل بھگاتا وہ پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اس کے سفید اسنیکرز میں مقید پاؤں کسی مشین کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ اسٹینڈ پر ٹکے مردانہ ہاتھ زخمی سے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی پشت پر چوٹ لگی تھی۔ سفید پینٹ پر ہم رنگ ہی شرٹ اور سیاہ جیکٹ پہنے، تمام تر معصومیت چہرے پر سجائے سڑکوں پر سائیکل دوڑاتا بدر۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش سا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے دائیں طرف موڑ کاٹا تھا۔ نگاہ سامنے فٹ پاتھ پر چلتے لڑکے پر ٹکی۔ آنکھوں میں شرارت بھری چمک ابھری۔ اس نے سائیکل کی رفتار مزید بڑھائی۔ اگلے لمحات میں وہ اس لڑکے کے برابر میں سائیکل دوڑا رہا تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا، دونوں بازو پھیلائے۔ اور پورے زور سے دایاں ہاتھ اس لڑکے کے سر پر جڑ دیا۔ اس لڑکے کا سر جھکا، موبائل ہاتھ سے چھوٹا۔ بدر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا بدر!!“ اپنا جھکا سر اٹھاتا وہ لڑکا چلا اٹھا تھا۔ سفید قمیض شلوار میں ملبوس، سیاہ شال کندھوں پر ڈالے مردانہ وجاہت کا پیکر۔۔ جندل یوسف زئی! وہی جندل جس کے کان غصے سے لال پڑ چکے تھے۔ بدر نے کچھ دور جا کر سائیکل روکی۔ رخ بدلا اور پھر واپس اس کی طرف آنے لگا۔

”تمہیں تھپڑ مارنے کا اپنا مزہ ہے لالا!“ اس نے ہنستے ہوئے جندل کے قریب سائیکل روکی۔ جندل نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا پھر جھک کر اپنا موبائل اٹھایا۔

”جانے سعاد آپی کو یہ گورخر کہاں سے معصوم لگتا ہے۔۔خبیث گدھا!“ وہ موبائل کی اسکرین صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔ بدر نے اپنی تعریف پر سر کو خم دیا تھا۔ جندل نے غصے سے اسے دیکھا۔ نگاہیں اس کے چہرے سے پھسلتیں اس کی سائیکل پر ٹکیں۔ سائیکل کے آگے ٹوکری خالی تھی۔ نہ وہاں اخباروں کا پلندہ تھا نہ گاجر کھاتا روفی۔۔روفی جو ہمیشہ بدر سے جندل کا بدلہ لے لیا کرتا تھا۔ اس نے گہری سانس لی تھی۔ بدر نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ اس کی سوچ پڑھ کر وہ لب دانتوں میں دباتا سر جھکا گیا۔

”کیا ضروری ہے ہر سفر میں چند ہمسفر ساتھ چھوڑ جائیں؟ کیا منزل تک ساتھ پہنچنا ممکن نہیں لالا؟“ وہ اپنی سائیکل گھسیٹتا جندل کے ہمراہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ جندل نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر سر ہلکا سا جھکایا۔

”یہ ممکن نہیں ہے بدر! جہاں موت آجائے وہاں ہر انسان بے بس ہے۔ وہاں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ تبھی تو کہتے ہیں، ہمسفر ساتھ رہتے ہیں جب تک موت انہیں جدا نہ کرے۔ پھر موت کے بعد اگلے جہان میں کوئی جدائی نہیں، جدائی کا تصور ہی نہیں ہے۔ یعنی وصال کے لیے ہجر کی چند راتیں تو کاٹنا پڑیں گی بدر۔“ وہ دھیمی آواز میں اسے سمجھا رہا تھا۔ بدر نے سمجھ کر سر کو جنبش دی۔

”گھر کب آرہے ہو؟“ جندل نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔

”یہ ملک، یہ شہر چھوڑنا آسان نہیں لالا۔ میں نے اپنی زندگی کے قیمتی برس یہاں گزارے ہیں۔ یہیں سے مصعب نامی عقاب نے اڑان بھرنا سیکھی ہے۔ میرے لیے اسے چھوڑنا کبھی آسان نہیں ہو گا۔ آپ لوگ جائیں۔ میں بیلا باجی کے ساتھ آؤں گا۔ وہ اس سلسلے میں میرے ساتھ ہیں۔ اپنا وطن چھوڑنا ان کے لیے بھی آسان نہیں۔“ وہ اداسی سے مسکرایا۔ جندل نے سر کو جنبش دی۔

”وہ جگہ جسے تم فتح کرو، آباد کرو، وہی تمہارا وطن ہے۔ مگر گھر۔۔بدر گھر مکینوں سے بنتے ہیں۔ تم ہر زمین کو اپنا وطن بنا سکتے ہو مگر ہر وطن میں تمہیں اپنا گھر نہیں ملے گا۔ گھر مکینوں سے بنتے ہیں، گھر۔۔گھر والوں سے بنتے ہیں۔ تمہارا گھر وہ ہے جہاں تمہاری بہن تمہاری منتظر ہو گی، تمہارا بھائی تمہاری راہ دیکھے گا۔ جہاں افق تمہار انتظار کرے گی بدر۔“ وہ نرمی سے اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے کہہ رہا تھا۔ بدر ہلکا سا مسکرا دیا۔

”میں۔۔میں خیام بھائی کو چھوڑ کر کیسے آؤں گا؟“ اس کی آنکھوں میں نمی چمکی۔ وہ آج بھی بس اس کے ذکر پر ہی اپنی آنکھیں نم کر بیٹھتا تھا۔ جندل نے ٹھہر کر اسے دیکھا پھر چہرہ موڑ لیا۔ اسے آج بھی بس اس کے ذکر پر ہی اپنے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔

”تم سیکھ جاؤ گے بدر۔ یادوں کو دفن کرنا، مرے ہوؤں کو پیچھے چھوڑنا، تم سیکھ جاؤ گے۔ جس راہ کا تم نے انتخاب کیا ہے وہاں ایک نہیں کئی پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دفن کرو گے۔ تم سیکھ جاؤ گے بدر۔“

”تم نے سیکھ لیا ہے لالا؟“ وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا پوچھ رہا تھا۔ جندل نے کرب بھری نظروں سے اسے دیکھا پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”مجھے بس وہی پیارا تھا۔ وہ تنہا کر گیا تو اب سب کی جدائی جھیل لوں گا۔ لیکن اس کا دیا گیا زخم کبھی بھر نہیں پائے گا۔ وہ میری آتی جاتی سانسوں میں بستا تھا۔“ وہ جندل تھا، خیام سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے ذرا جھجھک کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ بدر نے دکھی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر گہری سانس لے کر آنکھوں میں جمع ہوتے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔

”ایک درخواست ہے لالا۔“ اس کے پر سوچ انداز میں کہنے پر جندل نے چہرہ ترچھا کر کے اسے دیکھا۔ ”بیلا باجی سے ملتے جایئے گا۔ وہ آپ کی منتظر ہیں۔“ جندل نے سانس روکے اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چبھی تھیں۔ دل میں درد اٹھا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی نگاہوں کا رخ موڑ گیا۔

”میرا اس سے ملنا اسے ایک آس دے دے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا، میں اسے کسی امید میں نہیں باندھنا چاہتا۔“ اس کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

”آپ اپنے ساتھ ساتھ ان پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔“

”وہ سنبھل جائے گی۔ وہ مجھے بھول جائے گی۔“ وہ تکلیف سے مسکرایا تھا۔

”اور تم لالا؟“ بدر کو مشکل سوال کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے بدر؟“

”فرق پڑتا ہے لالا! تم آخر۔۔۔“

”یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ تمہیں کوئی اور بات کرنی ہے تو کرو ورنہ خاموشی سے یہ راستہ کاٹو۔“ اس کا لہجہ ترش ہوا تھا۔ بدر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگلے لمحات میں وہ اپنی سائیکل کے پیڈلز گھماتا دور جا رہا تھا۔ اس کے بہت پیچھے سست رفتار سے چلتا جندل گہری سوچ میں گم تھا۔ دور جاتے بدر نے اپنے دونوں بازو پھیلائے تھے۔ دائیں بائیں دونوں اطراف سے اس کا ہاتھ دو لڑکوں کے سر پر پڑا تھا۔ ان دونوں کے سر جھکے تھے۔ ان دونوں کی چیخوں نے بدر کو قلبی سکون میسر کیا تھا۔ وہ واپس اپنی نشست پر بیٹھتا تیزی سے پیڈلز گھماتا دور جانے لگا تھا۔

☆☆☆

"مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "غبارِ خاطر" میں لکھتے ہیں کہ فلسفہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی (Stocial) بے پروائی پیدا کر دیتا ہے، اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دیتا ہے، لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے۔ ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا، لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا۔ لاتاس علی مافات (جو کچھ کھو چکا، اس پر افسوس نہ کر۔)

سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم حیریت (PHYSICAL DETERMINISM) کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں ملتی۔ وہ یقین اور امید کے سارے چراغ گل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں تو کس کی طرف اٹھائیں؟

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے، یہی وہ دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا پھر اسے بند نہیں کرے گا۔ سائنس ثبوت دے دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے جنہیں

ثابت کر سکتے ہیں۔ اور اس لیے مان لیتے ہیں کہ ہمیں ایسی بھی باتیں چاہئیں جنہیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

By faith and faith alone embrace
believing where we can't prove..

•غبارِ خاطر

میں نے مذہب کے بغیر اپنی زندگی میں خلا سا محسوس کیا ہے۔ مذہب فطری ہوتا ہے۔ کسی ایسی ذات کسی ایسی شے کی انسان اشد ضرورت محسوس کرتا ہے جس پر وہ بس ایمان لے آئے۔ بس یقین کرے کہ ہاں وہ ہے تو ہے! کہاں ہے کیسے ہے؟ ہر جگہ ہے، شاہ رگ سے قریب ہے اور رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ کائنات کا خالق ہے۔ ایمان کے بغیر دل خالی سا محسوس ہوتا ہے اور پھر دل تو اللہ کا ہی گھر ہے ناں۔ میں نے اپنی زندگی کے قیمتی سال گمراہی کے اندھیروں میں گزارے ہیں۔ میں نے الحاد کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے مذہب کے بغیر انسانیت کو ختم ہوتے دیکھا ہے۔

مذہب سلیقہ سکھاتا ہے اور ایسا مذہب بس اسلام ہے۔ اسلام وہ فطری دین ہے جو ہر طرح سے مکمل اور ہر پہلو سے اچھا ہے، بہترین ہے۔ اسلام فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ برائیاں جو ہمارے ہاں عام ہیں اسلام فطرت کے عین مطابق ان کی نفی کرتا ہے، ان سے منع کرتا ہے۔ شراب نوشی، غلاظت اور گندگی سے بنا ایک گندا مشروب! زنا، معاشرے کو تباہ کرنے میں اعلیٰ کردار نبھانے والا گناہ! ہم جنس پرستی، انسانیت کو خاتمے کی طرف لے جانے والا ایک قابلِ نفرت عمل! عجیب و غریب قانون اور جانے کیا کیا؟ ایسے ایسے قانون، ایسی ایسی برائیاں جن کے تصور سے ہی روح کانپ اٹھے۔ اسلام ان سب کو حرام قرار دیتا ہے، ان سب سے منع کرتا ہے۔ اسلام بہت خوبصورت

ہے۔ اس میں جسمانی، روحانی پاکیزگی پے۔ نگاہ پاک ہے، خیالات پاک ہیں، زبان پاک ہے، جسم پاک ہے اور روح۔۔ مومن کی روح کتنی خوبصورت ہوتی ہے کبھی دیکھیں تو سہی! اسلام بہترین ہے، ہر طرح سے بہترین ہے۔ اس پر تنقید کرنا چھوڑ دیں، یہ ویسا نہیں ہے جیسا دکھایا جاتا ہے۔ اسلام تو بہت خوبصورت، بہت آسان دین ہے۔ ہاں زمانے کا تقاضہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ مگر یاد رہے یہ وہ زمانہ ہے جس کے لیے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس زمانے میں اسلام پر عمل کرنا ایسے ہو گا گویا ہتھیلی پر آگ کا شعلہ رکھنا۔۔ اسلام اجنبی ہو جائے گا۔ اور ایسے اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے۔ یاد رہے، اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے"!

کی بورڈ پر تیزی سے چلتی اس کی انگلیاں ایک لمحے کے لیے تھم سی گئیں۔ اس نے ٹھہر کر اسکرین کو دیکھا پھر دھیرے سے کرسی سے ٹیک لگالی۔ سفید اور سیاہ رنگ کے امتزاج سے بنے سلک کا حجاب اوڑھے وہ آنکھیں موندے کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ ازا تھی، ازا تاشفین! اس کی تلاش کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ آئی تھی۔ یہ حقیقت کتنی روح فرسا تھی کہ اسے موت کے دروازے سے واپس لوٹایا گیا تھا کیونکہ وہ منکر خدا تھی۔ اس کے رب کو یہ منظور نہیں تھا کہ ازا تاشفین اس کے حضوریوں پیش ہو کہ اپنی تمام زندگی اس نے اپنے رب کا انکار کیا ہو۔ اسے ایک اور موقع دیا گیا تھا اور اسی موقع کے سبب آج وہ "اجنبیوں" میں سے تھی۔ اجنبی، جن کے لیے خوشخبری ہے۔

"اسلام پر سب سے زیادہ تنقیدیوں کی جاتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل واضح ہے کہ ہمارے نبی نے ایک عرصے تک مکہ میں تبلیغِ دین جاری رکھی۔ مدینہ میں اپنی ریاست کے قیام کے بعد جب انہوں نے اتنی طاقت جمع کرلی کہ وہ کفار کا مقابلہ کر سکیں تو جہاد شروع کیا۔ جہاد کے حکم کو اکثر بہت معمولی سا سمجھ کر پس

پشت ڈال دیا جاتا ہے مگر یہ معمولی نہیں ہے۔ جہاد بہت اہم ہے!! آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قصے نہیں سنے؟ ان کی نمازیں قضا ہو جاتی تھیں جہاد میں! نماز جو اسلام کا دوسرا اہم رکن ہے۔ وہ حیدر رضی اللہ عنہ کی شجاعت، خالد رضی اللہ عنہ کی بہادری اور جرات، وہ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی دور اندیشی، خولہ اور ضرار رضی اللہ عنہ کی محبت۔۔ یہ سب کون تھے؟ یہ عظیم مجاہد تھے۔ عبد اللہ بن مبارک کا نام سنا ہے؟ اس عظیم مجاہد نے اپنی ساری عمر میدانِ کارزار میں کاٹ دی۔

تُف ہے ان لوگوں پر جو جہاد کو دہشتگردی کا نام دیتے ہیں۔ دہشتگردی تو وہ ہے جو ان مغربی اقوام نے مچا رکھی ہے۔ دہشتگردی دیکھنی ہے تو کشمیر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ ظلم کو دیکھو۔ تمہیں حیوان دیکھنے ہیں تو فلسطین میں اپنی بہنوں کی عزت لوٹتے درندوں کو دیکھو۔ تمہیں قتال دیکھنا ہے تم عراق میں کٹی پھٹی لاشوں کو دیکھو، شام میں بہتی خون کی نہروں کو دیکھو۔ ظالم تو یہ ہیں، قاتل تو یہ ہیں۔ جہاد انہی کے خلاف تو کرنا ہے۔ انسانیت کو اگر مٹنے سے بچایا جا سکتا ہے تو واحد طریقہ جہاد ہے۔ ہم نے مصالحت بھی کر لی، ہم نے معاہدے بھی کر کے دیکھ لیے مگر یہ جو سپر پاورز ہمارے سروں پر ڈنڈا لے کر کھڑے ہیں ہم ان سے اپنی بات نہیں منوا سکتے۔ ہم مسلمانوں کے لیے تحفظ نہیں مانگ سکتے حتیٰ کہ ہمارے اپنے ہی ملک میں، وہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا تھا اسی ملک میں ہماری بہنیں بس اپنے سروں پر چادر ٹکے رہنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ حیوانیت معاشرے میں طاعون کی طرح پھیل چکی ہے۔ اب بھی نہیں جاگے تو کب جاگیں گے؟

اٹھیں اور جگائیں اپنے بھائیوں کو، اپنے بیٹوں کو تیار کریں، اپنے شوہروں کو نکالیں۔ کہہ دیں کہ ہمیں حیا آتی ہے تم سے جب تم بے غیرتوں کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہو۔ تمہاری ماؤں کے سر ننگے ہیں، تمہاری بہنوں کی چادریں چھینی جا رہی ہیں، تمہاری بیٹیوں کی عزتیں لوٹی جا رہی ہیں اور تم بے غیرتوں کی طرح گھروں میں دبکے ہوئے ہو!

ہوش کرو کچھ! ہمیں تمہارے یہ ڈھلے چہرے نہیں پسند۔ ہمیں وہ چہرے پسند ہیں جن پر میدانِ کارزار کی تھکن ہو، ہمیں وہ لباس پسند ہے جو خون میں ڈوبا ہو، ہمیں وہ ہاتھ پسند ہیں جس میں کئی تلواریں ٹوٹیں۔۔ نکالیں انہیں، ان کی غیرت مر چکی ہے تو جگائیں انہیں!! ہر دور میں۔۔ عورت کی عزت کا دارومدار مرد کی غیرت و حمیت پر ہوتا ہے۔ اگر ان کی غیرت مر گئی تو عورت کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ اسلام کو دھچکا لگے گا۔ خدا کی راہ میں اپنے بیٹوں کو، بھائیوں کو اور شوہروں کو نکالیں اور کہیں کہ خبر دار! پیٹھ دکھا کر مت بھاگنا، ہم تمہیں سرخرو دیکھنا چاہتی ہیں۔

وہ جماعت، وہ تنظیم جس نے ہزاروں مجاہدوں کو متحد کیا ہے، جس نے ان مجاہدوں کو ایک چھت تلے جمع کیا ہے آج اس تنظیم کو آپ کی ضرورت ہے۔ حزب اللہ! حزب اللہ کے صف اول کے مجاہدین القدس جا رہے ہیں۔ القدس انہیں پکار رہا ہے۔ اگر اس مردہ قوم میں تھوڑی سی بھی غیرت باقی ہے تو اٹھیں اور اس کی تقلید میں قدم بڑھا دیں۔ یاد رہے۔۔ یہ راستہ وہاں تک جاتا ہے جہاں خدا کا عرش ہے۔ اس راہ میں آپ اجنبی ہونگے۔۔ اور بلاشبہ اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے۔"

آنکھیں موندے گہری سوچوں میں گم اس کے لبوں پر دھیرے سے مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ وہ بہت پر سکون تھی۔۔ وہ ایک مومنہ تھی، ایک مجاہدہ تھی۔ اس نے وہ پا لیا جس کی اسے جستجو تھی۔ وہ کامیاب رہی تھی۔

چند پل خاموشی سے گزرے۔ پھر اس نے گھنٹی کی آواز سنی۔ ایک بار دو بار حتیٰ کہ تین بار۔ اس کی ملازمہ یقیناً کہیں مصروف تھی۔ وہ گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے سے نکل کر لاؤنج پار کر کے وہ گھر کے دروازے تک آئی تھی۔ اس نے آرام سے دروازہ کھولا۔ نگاہ سامنے اٹھتے ہی اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ دروازے پر

گرفت سخت ہوئی۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے پر پلٹا تھا۔ نگاہیں ملی تھیں۔ وہ تیزی سے نگاہیں چرا گیا تھا۔

"کیوں آئے ہو؟" وہ خفا تھی۔ غصے میں تھی، ناراض تھی۔

"میں جا رہا ہوں۔" وہ فرش کو گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دھڑکنیں سست پڑ رہی تھیں۔

"جانتی ہوں۔ میرے دروازے پر کیوں آئے ہو جندل یوسف زئی؟!" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ جنڈل کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ وہ لال پڑتے چہرے سے غصے بھری نگاہوں سے اس کے جھکے سر کو دیکھ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری بیلا۔۔ میں تمہارا مان نہیں رکھ پایا۔" اس نے سر اٹھایا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کانپ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ کیا لڑکا تھا یہ؟ ایک طرف انکار بھی کرتا تھا اور دوسری طرف آنکھوں میں نمی بھی تھی؟

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی جندل!" سزا سنائی گئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"میں تمہیں خیام کے ساتھ خوش دیکھنا چاہتا تھا۔" اسے لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

"بہت بہتر! میں اس کے بغیر بھی خوش ہوں۔ تم جا سکتے ہو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پہلی بار اس کا یہ روپ دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی ہنستی مسکراتی بیلا نہیں تھی، یہ واقعی ازاتا شفین تھی۔

"بیلا۔۔۔" وہ بے بس ہوا تھا۔

”تم دونوں دوست اتنے ظالم کیوں ہو؟! دلوں سے کھیلتے ہو، جذبات کچلتے ہو، تم دونوں ہو کیا؟ ہم جیسے لوگوں کو خود جیسے انسان کیوں نہیں سمجھتے؟ ہم سے کھیلتے ہوئے ایک لمحے کو تو سوچا کرو کہ ہمیں بھی تکلیف ہوتی ہے!“ وہ پھٹ پڑی تھی۔

”خیام کو۔۔ کچھ مت کہو بیلا!“ وہ التجا کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”تم دونوں بس اچھے دوست ہو سکتے تھے!“ غصے سے کہتی وہ دروازہ بند کرنے لگی تھی۔

”بیلا۔۔۔ پلیز! بس معاف کر دو۔ میں ایسے نہیں جانا چاہتا۔ یہ بوجھ بہت بھاری ہے۔“ اس کی آواز بھاری ہوئی تھی۔

”اللہ سے دعا ہے تم ہر میدان میں کامیاب رہو۔ اللہ حافظ، جندل جوسف زئی!“ وہ چاہ کر بھی مسکرا نہیں پائی۔ نظریں چراتے ہوئے اس نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کے پار کھڑے جندل کو کہیں دل کے مقام پر ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔۔ اسے تکلیف ہوئی تھی، بہت زیادہ!

دوسری طرف دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ازا کو اپنے رخسار بھیگتے محسوس ہوئے تھے۔ یہ دونوں دوست، اپنی محبت میں تیسرے کا نقصان کیوں کرتے تھے؟ ایک جندل تھا جو خیام کی خاطر محبت کی قربانی دینے کو تیار تھا۔ ایک خیام تھا جو نہ ہو کر بھی ان کے درمیان موجود تھا۔۔ وہ تینوں ہمیشہ سے ایک تکون میں تھے۔ ایسا تکون جس کی کہانی کون جانے کیسے مکمل ہونے والی تھی۔ ہونی بھی تھی یا نہیں۔ کون جانے۔۔

☆☆☆

یہ ایک اندھیر کمرہ تھا۔ اندھیر اور تاریک۔۔ کمرے کا ماحول یخ ٹھنڈا تھا۔ کمرے سے باہر راہداری میں بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی دروازے کے پاس رکا۔ آرام سے دروازہ کھولا اور پھر اندر آ گیا۔ اس کے آتے ہی کمرے کے عین وسط میں رکھی میز کے پاس روشنی ہوئی۔ وہ آرام سے میز کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں میز پر رکھیں۔ نگاہیں سامنے ٹکائیں۔ سامنے کوئی دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ کمر پر باندھ رکھے تھے۔

"کیا سوچا ہے آپ نے؟" آواز بھاری تھی۔ اس کے سوال پر چند پل خاموشی چھائی رہی۔ گویا مقابل گہری سوچ میں گم تھا۔ چند پل خاموشی کی نذر ہوئے۔ وہ شخص آرام سے پلٹا۔ ٹھہر کر اسے دیکھا پھر آگے آ کر اس کے روبرو کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس بار وہ بھی روشنی کی زد میں آیا۔ کشادہ پیشانی، کھڑی ناک، سپاٹ چہرہ۔۔ سفید بال اور چہرے پر سجی داڑھی۔۔ سفید قمیض شلوار میں ملبوس وہ کعب الزرقاوی تھے۔

"حزب اللہ کا ہر مجاہد میرا بیٹا ہے اور میں اللہ کی راہ میں اپنے ہزاروں بیٹے قربان کر سکتا ہوں۔" نہایت سنجیدگی سے اور عزم سے کہا گیا تھا۔ کعب کے روبرو بیٹھے شخص کو یقین تھا، وہ جو کہہ رہے تھے وہ کرنے کی ہمت بھی رکھتے تھے۔

"مجھے حزب اللہ کے بہترین مجاہد دیں۔ القدس ہمیں پکار رہا ہے۔ فلسطینی مسلمان ہماری راہ تک رہے ہیں۔ ہماری حکومتیں آپس میں دست و گریباں ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے بازی لینا چاہتا ہے۔ ہماری فلسطینی بھائی اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ اگر آج ان کی مدد کے لیے نہ اٹھے تو بہت دیر ہو جائے گی۔ القدس۔۔ ہمیں پکار رہا ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ اول، نعرہ تکبیر کی آواز کے لیے ترس رہا ہے۔ ہمیں اسے مزید انتظار نہیں کروانا چاہیے۔ میں روز آخرت میں خدا کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔" درخواست کی گئی۔ کعب نے تسلی سے اس کی مکمل بات

سن کر سر کو جنبش دی پھر میز پر رکھی فائل اس کے آگے بڑھا دی۔ اس نے چپ چاپ فائل کو تھام کر اپنے سامنے رکھا پھر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

”ضرار بن ولید، جندل یوسف زئی، زیاد تاشفین، مصعب الزرقاوی اور انہیں کمانڈ کرے گا خیام حنفی!“ آواز بھاری اور شائستہ تھی۔ فائل کا ورق پلٹتے اس کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے چونک کر کعب کو دیکھا۔

”خیام حنفی۔۔وہ اندلسی مجاہد زندہ ہے؟!“ وہ الجھن کا شکار ہوا۔ ماتھے پر کم فہمی سے بل نمودار ہوئے۔ کعب نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ ان کی نگاہیں۔۔عقاب سی۔۔دھاک بتا دینے والی۔۔فائل کھلی ہوئی تھی۔ اندر موجود کاغذات میں سب سے اوپر رکھے کاغذ پر ”خیام حنفی“ کا نام جگمگا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی تصویر لگی تھی۔

ایک اندلسی مجاہد۔۔ہلکے بھورے رنگ کے بالوں والا لڑکا جو بیک وقت ایک عربی سلطان اور مغربی شہنشاہ لگتا تھا۔ عربوں کی سی غیرت اور جواں مردی جس کی رگوں میں دوڑتے خون میں بسی تھی۔

☆☆☆

اس نے جھک کر اپنے سفید جاگرز کے تسمے باندھے تھے۔ صوفے پر رکھی بھورے رنگ کی جیکٹ اٹھا کر کندھوں پر ڈالی تھی۔ جیب سے سیاہ ماسک نکال کر چہرے پر لگایا اور پھر سیاہ ہی پی کیپ سر پر ٹکا دی۔ وہ۔۔ضرار ولید!

اس نے خاکی رنگ کی شال اٹھا کر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھاڑا اور پھر اسے شانوں پر ڈال کر بکل ماری (خاص طریق سے شال کا ایک سرا کندھے پر الٹا)۔ ہلکا اور نازک سا سیاہ رنگ کا چشمہ اٹھا کر ناک پر ٹکایا۔ کلائی پر قیمتی رسٹ واچ باندھی۔ وہ۔۔جندل یوسف زئی!

اس نے سیاہ رنگ کا لانگ کوٹ اپنے شانوں پر ڈالا۔ گلے کے گرد سیاہ ہی مفلر لپیٹا۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں اڑسے اور پھر گردن کو دائیں بائیں حرکت دی۔ آنکھوں پر سیاہ گاگلز لگائے سیاہ بالوں والا وہ لڑکا۔۔ زیاد تاشفین!

سفید اسنیکرز کے تسمے باندھ کر سیاہ جینز کو نیچے سے تھوڑا موڑ کر وہ کھڑا ہوا۔ نیلے رنگ کا لانگ کوٹ دائیں بازو پر ڈالا۔ دایاں ہاتھ بالوں میں چلا کر سیاہ نرم بال پیشانی پر بکھیرے۔ لبوں کو گول کر کے سیٹی بجاتا وہ بگڑا امیر شہزادہ۔۔۔ مصعب الزرقاوی!

ان چاروں نے بیک وقت اپنے ہاتھ کانوں تک لے جا کر انگشت شہادت سے کانوں میں لگے آلوں کو آن کیا تھا۔ ساتھ ہی کلائیوں پر بندھی گھڑیوں کے بٹن دبائے تھے۔ اندھیر تاریک کمرے میں دیوار پر نسب بڑی سی اسکرین روشن ہوئی تھی۔ سیاہ جاگرز میں مقید پاؤں اسکرین سے کچھ فاصلے پر ٹھہرے تھے۔ دروازے کی طرف پشت کر کے دیوار پر نسب اسکرین پر نگاہیں ٹکا کر کھڑا لڑکا، اندھیر کمرے میں ہوئی ہلکی سی روشنی کی زد میں آیا تھا۔ اس کے ہلکے بھورے رنگ کے بال پیشانی پر گرے تھے۔ روشن اسکرین پر سب سے پہلے ضرار کا چہرہ نظر آیا۔

”میں اپنے راستے پر نکل چکا ہوں۔“ اس کا دمکتا چہرہ، عقب میں ایک بلند مینار تھا جس کے درمیان میں گھڑیال نسب تھا۔

”امیر البحر سمندر کے عین وسط میں کھڑے ہیں۔“ جندل کی شوخ آواز کمرے میں گونجی۔ ساتھ ہی ضرار کے برابر میں اس کا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا۔ وہ بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ عقب میں بے کراں سمندر تھا۔۔ بپھرا ہوا، وحشی سمندر!

”ناکام شاعر علم کے شہر میں کھڑا ہے۔ یہ بغداد ہے، میں دنگ ہوں۔“ جندل کے برابر میں زیاد کی تصویر اسکرین پر نمودار ہوئی۔ بغداد کی قدیم درسگاہ کے دروازے پر کھڑا ناکام شاعر!

”الزرقاوی پر بگڑے امیر شہزادے کا روپ کچھ خاص جچ نہیں رہا ویسے۔“ بچوں کی طرح ناک سکیڑتے مصعب کی تصویر نے زیاد کی تصویر کے برابر میں جگہ لی۔ اس کے عقب میں بینکاک کی کوئی بلند عمارت تھی جو روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔

اسکرین کا کچھ حصہ ابھی بھی تاریک تھا، جیسے ایک اور تصویر وہاں آنی تھی۔ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسکرین کو تکتے لڑکے نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے کان میں لگا آلہ آن کیا تھا۔

”آواز آ رہی ہے؟“ آواز بھاری اور نرم سی تھی۔ ذہانت کی آئینہ دار آنکھیں چمکی تھیں۔ لب دھیرے سے مسکراہٹ میں ڈھل گئے تھے۔ وہ، وارلڈ گلاس کمپنی کا مینیجر خیام حنفی تھا! اس کی تصویر مصعب کی تصویر کے برابر میں آ ٹکی۔ وہ سب اس کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ زبان گنگ رہ گئی۔ مسکراتی نگاہوں سے ان سب کے چہرے دیکھتے خیام نے پلٹ کر دور بیٹھی سعاد کو دیکھا جس نے اسے تھمب اپ کا اشارہ کیا تھا۔ وہ استاد شاگردہ۔۔۔ ایک بار پھر ان سب کے ساتھ کھیل چکے تھے۔

خیام حنفی۔۔۔ لوٹ آیا تھا۔ وہ اندلسی مجاہد، عربی سلطان اپنے وطن میں کھڑا تھا۔۔۔ اپنے اندلس میں۔۔۔ الحمرا کے قدیم تہہ خانوں میں۔۔۔ سرخ زمین پر!

☆☆☆

سرمئی رنگ کا آہنی دروازہ کھلا۔ سرخ و سفید پھولوں کا بکے اس کی طرف بڑھا دیا گیا۔ اس نے اچھنبے سے بکے کو دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شاپنگ بیگ اور بڑا سا ڈبہ اس کے قدموں میں رکھا گیا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے کوریئر والے کو دیکھا۔

"میم ازا تاشفین کے لیے!" پیشہ ورانہ انداز میں خبر دی گئی۔ اس نے سر کو جنبش دی۔ پھر بکے، شاپنگ بیگ اور وہ ڈبہ اٹھا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج سے گزر کر وہ کچن کو پار کر کے ازا کے کمرے کے پاس آئی۔ دروازے پر دستک دی پھر مثبت جواب ملنے پر وہ کمرے میں آ گئی۔

"میم یہ آپ کے لیے آیا ہے۔ نام نہیں معلوم۔" اس نے عجلت میں اطلاع دی۔ سنگھار میز کے قد آور آئینے کے سامنے کھڑی ازا پلٹی تھی۔ بھورے رنگ کے بال پھسل کر شانوں پر گرے تھے۔ نگاہیں ملازمہ کے ہاتھ میں موجود بکے پر ٹکیں۔ ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔ وہ دھیرے سے آگے آئی۔ بکے اس کے ہاتھوں سے لیا۔ پھولوں کو ناک کے قریب کر کے ان کی مہک سونگھی۔ گہری سانس لے کر سرخ و سفید پھولوں میں بسی خوشبو کو اندر اتارا۔ ملازمہ جانے کے لیے مڑ گئی۔ وہ وہیں بیڈ کے کنارے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ بکے میں موجود چھوٹا سا کارڈ اٹھایا اور اسے انگوٹھے اور شہادت کے درمیان میں پکڑا۔ نگاہیں اس پر لکھی چھوٹی سی عبارت پر ٹکیں۔

"اس ملکہ کے نام جو کبھی اپنوں کے اجنبی ہونے پر تڑپ اٹھتی ہے، اور کبھی کسی اجنبی کے اپنائیت بھرے احساس پر آنکھیں نم کر بیٹھتی ہے۔"

"ملکہ۔۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ آنکھوں میں خوشگوار حیرت ابھری۔ لب دھیرے سے مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ وہ زندہ تھا، وہ لوٹ آیا تھا۔۔ اس کا مینجیر۔۔ خیام حنفی!

"میم، کوریئر والا پیسے مانگ رہا ہے۔" ملازمہ نے کمرے کے دروازے سے سر نکالا یا۔ ازا نے چونک کر ہاتھ میں موجود کارڈ کو دیکھا جس کے کنارے پر چھوٹے سے حروف میں کچھ لکھا تھا۔

"پیسے میری سیلری سے کاٹ لیجئے گا، ابھی جیب خالی ہے۔" وہ بے اختیار ہنسی تھی۔ اسے ہنستے دیکھ کر ملازمہ پلٹ گئی تھی۔ اسے اس کا جواب مل چکا تھا جو یقیناً اثبات میں تھا۔ پھولوں کو ایک طرف رکھ کر ازا اس ڈبے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے وہ ڈبہ اور شاپنگ بیگ اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ بیگ میں سے بھورے رنگ کی ایک شال نکلی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے آرام سے شال کو اٹھا کر کھولا پھر دھیرے سے اسے اپنے شانوں پر پھیلا یا تھا۔ وہ اچانک سے عجیب اور منفرد سے احساس میں گھر گئی تھی۔ چند پل یونہی کھڑے رہنے کے بعد وہ ڈبے کی طرف متوجہ ہوئی۔ کچھ ہی پل میں ڈبہ کھل چکا۔ اندر سے سفید رنگ کی بلی نمودار ہوئی تھی۔ چھوٹی سی اور بہت معصوم سی۔۔ دودھ جیسی سفید رنگ کی بلی جس کی آنکھیں نیلے رنگ کی تھیں۔ اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔ لب بے اختیار مسکراہٹ میں ڈھلے تھے۔ بیڈ پر بیٹھ کر اس نے آرام سے اس بلی کو گود میں لیا تھا۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اس کاغذ کی طرف متوجہ ہوئی جو ڈبے کے اندر تھا۔

"اس بلی کا تعلق اندلس سے ہے۔ یہ اعلیٰ نسل کی بلی ہے۔ غصہ ہرگز نہیں کرتی، بہت پیار کرنے والی اور وفادار ہے۔ دودھ پیتی ہے۔ گھر میں رہنا پسند کرتی ہے۔ بہت شریف ہے، تنگ نہیں کرتی۔ میرے پاس اسے خریدنے کے پیسے نہیں تھے، میں نے اپنی گھڑی بیچی ہے۔ یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں یہ نہ لگے میں نے کوئی سڑک چھاپ بلی تمہیں بھیجی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تمہیں بلیاں پسند ہیں یا نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مصعب کو خرگوش پسند ہیں۔ تم دونوں کی فطرت ایک سی ہے۔ یہ بلی مجھے بہت پیاری لگی تبھی اسے خریدنے سے خود کو باز نہیں رکھ پایا۔ اس کا بہت خیال رکھنا ازا۔۔ مجھے اس کی نیلی آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

تمہارا مینیجر، خیام حنفی"!

وہ کئی پل سُن بیٹھی اس خط کو پڑھتی رہی تھی۔ اس خط میں سب کچھ اس بلی کے متعلق تھا۔ نہ اپنے متعلق کوئی خبر دی گئی تھی نہ اس کے متعلق کوئی خبر لینا ضروری سمجھا گیا تھا۔ شاید یہی اس کا انداز تھا۔ وہ زندہ تھا اور اس کا ثبوت اسے ایک بلی بھیج کر دے رہا تھا۔ کاش یہ بلی بے زبان جانور نہ ہوتی تو وہ اس سے پوچھتی، "اور خیام حنفی کیسا ہے؟"!

اس نے خط کو آرام سے ایک طرف رکھا پھر گود میں موجود بلی کی طرف متوجہ ہوئی۔ آرام سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اپنے رخسار نم ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر پلکوں سے جھولتا ہوا رخسار پر لڑھک گیا تھا۔ دھڑکنیں منتشر ہوئی تھیں۔ وہ یہاں نہیں تھا پھر بھی وہ اس کے احساس میں گھری تھی۔ اسے یقین تھا وہ زندہ ہے، وہ آئے گا اور وہ آ چکا تھا۔ دو اور آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکتے چلے گئے۔ اسی اثناء میں اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ملازمہ نے دروازے سے سر نکالا۔

"کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں اندر بٹھا دیا ہے۔" اسے اطلاع دی گئی۔ ازا نے عجلت میں ہتھیلی سے اپنے رخسار کو رگڑا۔ آرام سے بلی کو نیچے اتارا۔ کبڈ کے پاس آ کر قرمزی رنگ کا حجاب نکالا۔ سنگھار میز کے قد آور آئینے کے سامنے اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ حجاب باندھنے لگی۔

اگلے لمحات میں وہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خیام کی بھیجی گئی شال دائیں شانے پر ٹکی تھی۔ وہ سفید رنگ کی بلی اس کے ہمقدم تھی۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی اسے ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔ وہ لمبا اونچا مرد اس کی طرف پشت کیے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اسے جانے کیوں یہ شخص مانوس سا لگا تھا۔ وہ عجیب سے احساس میں گھری اس کے قریب آئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونکی تھی۔ اس شخص نے سر اٹھا کر

مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ یہ چہرہ، کشادہ پیشانی۔۔ گہری آنکھیں۔۔ سنجیدہ سا تاثر۔۔ یہ رعب دار شخصیت۔۔ وہ شخص دلال تھا! نوجوان کپتان دلال، ایک ماہر بحری قزاق!

"بیٹھ جاؤ ازا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے اسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا محال لگا تھا۔ اسے لگا تھا وہ گر جائے گی۔ وہ فوراً سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ حیرت و بے یقینی سے دلال کو تکتے ہوئے اس نے سانس روک لیا تھا۔ اور وہ ایسا ہی تھا، سانس روک دینے والا "بلی پیاری ہے۔!" اس نے ازا کے قدموں میں بیٹھی بلی کو بھرپور نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ گم سم سی اسے دیکھتی رہی۔

"تم۔۔ تم دلال ہو۔۔ اور جو مرا، وہ ابراہم وارلڈ تھا۔۔ میرا باپ!" اس کے لب دھیرے سے پھڑپھڑائے تھے۔ دلال کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"میں اسے اپنی قید میں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرے لیے ایک اور ڈھال ثابت ہوا۔" اس نے صوفے سے ٹیک لگائی۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر ازا کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیا جس پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔

"لیکن کیسے؟ دلال اور ابراہم وارلڈ۔۔ دو مختلف انسان ہیں۔" وہ الجھن کا شکار ہوئی۔ دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ پیشانی پر اس ٹھنڈ میں بھی پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

"پلاسٹک سرجریز، میک اپ۔۔ ماسک۔۔ تمہاری دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے ازا! تمہاری دنیا میں مجرم بس دلال تھا۔ تمہیں ابراہم وارلڈ کے خلاف کبھی کوئی ثبوت نہیں مل پایا کیونکہ اس کہانی میں بس وہی معصوم اور بے گناہ تھا۔ وہ تو ایک عرصے سے میری قید میں تھا اور پھر آخر میں خیام کے ہاتھوں سمندر میں مارا گیا۔" وہ سر جھٹک کر ہلکا سا ہنسا۔

"اور تم۔۔۔ تم کون ہو؟ تمہارا اصل چہرہ؟" اس کی آنکھوں میں نمی ٹھہرنے لگی تھی۔ اس کے قدموں میں بیٹھی بلی نے اس کے پاؤں چاٹے تھے۔ وہ دھیرے سے اپنے پاؤں سمیٹ چکی تھی۔

"میرا اگر کوئی نقصان ہوا تو بس یہی ہوا۔ میں اپنا اصل چہرہ کھو چکا ہوں۔ حزب اللہ نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اگر خیام وارلڈ کے ساتھ سمندر میں نہ کودتا تو شاید میں اپنی زندگی کے یہ پرسکون سے دن نہ دیکھ پاتا جب سب کو لگتا ہے دلال مر چکا ہے!" اس نے پرسکون سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"خیام زندہ ہے!" وہ جانے کیوں اسے بتا رہی تھی۔ اس کا تنہا دلال کے ساتھ ہونا ہی اسے وحشت میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

"جانتا ہوں۔ مگر میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ میں اپنی غلطی سدھارنے آیا ہوں ازا! میں اس کہانی کو وہیں ختم کرنے آیا ہوں جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔" مبہم سا مسکرا کر کہتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں گیا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا، ازا نے ٹھہر کر اس کے ہاتھ میں موجود سیاہ رنگ کی پستول کو دیکھا۔ پستول پر سائلنسر لگا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے مرنے جا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دلال کے چہرے پر ٹکیں جو صوفے سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے کچھ کہہ رہا تھا۔ "ایک وحشی بحری قزاق کو ایک معصوم بچی بھا گئی۔ اور پھر اس نے اپنی فطرت کے خلاف جا کر اسے زندہ رکھا۔ میں سب وہیں سے ٹھیک کروں گا، جہاں سے یہ غلط ہوا۔" اس نے آنکھیں کھولیں۔ مسکرا کر اسے دیکھا پھر اپنا بازو سیدھا کیا۔ وہ ازا کو اپنے نشانے پر لے چکا تھا۔

ازا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہوتیں اس کے عقب میں کھڑے لڑکے پر ٹکیں۔ مصعب الزرقاوی! وہ دلال کے عین پیچھے اس پر پستول تانے کھڑا تھا۔ ازا کی نگاہیں خود پر محسوس کر کے اس نے دھیرے سے انگشت شہادت اپنے لبوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

”خدا کی قسم میں تمہاری جان اپنے ہاتھوں سے لوں گا دلال!“ اسے مصعب کی اٹھائی گئی قسم یاد آئی۔ وہ اور مصعب، ان دونوں کی کہانی ہمیشہ سے ایک سی تھی۔ دونوں کی زندگیاں برباد کرنے والا دلال تھا۔ دونوں اپنوں سے دور اجنبیوں کے درمیان بس اس بحری قزاق کی وجہ سے تھے۔ وہ دونوں کہانی کے آغاز میں بھی ساتھ تھے اور اختتام میں بھی۔

اس نے ٹھہر کر مصعب کو دیکھا۔۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا، آنکھوں میں دلال کے لیے بلا کی نفرت تھی۔ اس کا ہاتھ۔۔ وہ دلال کو نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اور دلال۔۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے نشانے پر وہ خود تھی، ازاتا شفین!

اس کے لب دھیرے سے مسکراہٹ میں ڈھلے۔ گردن ترچھی کر کے اس نے گلاس وال کے پار اپنے باغیچے کو دیکھا تھا۔ باغیچے میں نئے پھول کھل رہے تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ ننھے پودوں کے پتے ہرے بھرے سے تھے۔ پتوں پر پانی کی بوندیں گری ہوئی تھیں۔ اس کی ملازمہ باغیچے میں کھڑی اس کے اگائے گئے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔

وہ خوش تھی، پرسکون تھی۔ اس لیے نہیں کہ مصعب اس کی حفاظت کے لیے کھڑا تھا۔ اگر وہ کھڑا تھا بھی تو دلال بھی وہیں موجود تھا۔ وہ بیک وقت زندگی و موت کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ خوش تھی کیونکہ وہ چُن لی گئی تھی۔ اسے تب موت نہیں آئی تھی جب وہ اپنے رب کی منکر تھی۔ اس کا رب اسے موقع دینا چاہتا تھا، اس کا روم روم اپنے رب کا شکر گزار تھا۔ وہ کتنا رحیم ہے ناں، اپنی بندی کو اپنے منکروں میں سے نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔۔ وہ اسے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے رب کو پا لیا تھا۔ اس نے دل سے گواہی تھی، ”یا الٰہی انت ربی“!

اس کی نگاہ اپنے باغیچے میں کھلتے واحد گلاب کے پھول پر گئی۔ سرخ گلاب! گہرا سرخ، انسانی خون جیسا سرخ۔ اس گلاب کی مہک سے اس کا پورا باغیچہ مہک اٹھتا تھا۔ اس گلاب پر، سفید اور سیاہ رنگ کی ایک تتلی بیٹھی تھی۔ تتلی جو

سرخ گلاب پر جھول رہی تھی۔ چند پل اور پھر وہ تتلی اڑ گئی۔ پر سکون اور مکمل سا منظر تھا۔ اس کے دل پر جیسے ٹھنڈی سی پھوار پڑی تھی۔ اس کے لبوں پر دوڑتی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ بھورے رنگ کی شال پر گرفت سخت ہوئی۔ وہ یک ٹک اپنے باغیچے کو دیکھے گئی۔

بیک وقت وہ دونوں حرکت میں آئے۔ بیک وقت دونوں پستولوں کے ٹریگر پر زور پڑا۔ دونوں پستولوں پر لگے سائلنسر نے فائرنگ کی آواز کا گلا گھونٹا۔ بیک وقت دونوں پستولوں میں سے گولیاں نکلیں۔ ازا کے قدموں میں بیٹھی سفید بلی سہم کر پیچھے ہٹی۔ سفید ٹائلز پر۔۔ خون کی چند بوندیں گریں۔ گرم۔۔ سرخ انسانی خون!

جب میں مر جاؤں

جب میرا تابوت

نکالا جا رہا ہو

تم ہرگز یہ مت سوچنا

میں اس دنیا کو یاد کر رہا ہوں۔

کوئی آنسو مت بہائے

نہ ہی غمگین ہو

میں نہیں گر رہا

کسی شیطان کی کھائی میں۔

جب تم دیکھو گے

میری لاش کو لے جایا جا رہا ہے

میرے جانے پر رونا مت

میں جا نہیں رہا

میں تو ابدی محبت تک پہنچ رہا ہوں۔

جب تم مجھے چھوڑ دو گے

قبر میں

الوداع مت کہنا

یاد رہے کہ قبر

صرف ایک پردہ ہے

جس کے پیچھے جنت ہے۔

تم صرف مجھے دیکھو گے

قبر میں اترتے ہوئے

اب مجھے اٹھتے ہوئے دیکھو

آخر کیسے اختتام ہو سکتا ہے۔

جب سورج غروب ہوتا ہے

یا چاند ڈوب جاتا ہے

یہ انجام کی طرح لگتا ہے

یہ غروب آفتاب کی طرح محسوس ہوتا ہے

لیکن حقیقت میں یہ ایک صبح ہے

جب قبر تمہیں بند کر دیتی ہے۔

پھر تمہاری روح کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔

کیا تم نے کبھی دیکھا ہے؟

زمین پر گرا ہوا بیج

جو اُگا نہ ہو۔۔

ایک نئی زندگی کے ساتھ

پھر تمہیں اپنے اٹھنے پر

کیوں شک ہے؟

تم بھی تو ایک بیج ہو

جس کا نام انسان ہے۔

کیا تم نے کبھی دیکھا ہے؟

ایک بالٹی کنویں میں گرائی جائے۔

خالی واپس آجائے

پھر روح کے لیے رونا کیوں؟

جبکہ یہ واپس آجاتی ہے

یوسف کی طرح کنویں سے۔

جب آخری بار

تم اپنا منہ بند کر لو گے

تب تمہارے الفاظ اور روح کا

ایسی دنیا سے تعلق ہو جائے گا

جہاں نہ تو کوئی جگہ ہو گی

اور نہ ہی وقت۔۔

ختم شد

☆☆☆☆